هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ (آل عمران)

بیانُ القُرآن

جلد چہارم

ترجمہ ومختصر تفسیر

الزُّمَر - تا - النَّاس

از

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خُدّامُ القُرآن لاہور

جملہ حقوق بحق مرکزی انجمن خدام القرآن اور دینِ حق ٹرسٹ محفوظ ہیں!

مذکورہ بالا دونوں ادارے ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی کتابوں' تحریروں اور اقتباسات کے ضمن میں اجازت دیتے ہیں کہ کوئی شخص یا پبلشر اگر ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے علمی مواد کو شائع کرنا چاہتا ہے تو وہ اشاعت سے قبل چند ضوابط کی پابندی کرتے ہوئے' قیمتاً فروخت کرنے یا مفت تقسیم کرنے کے لیے' تحریری اجازت بلا معاوضہ مذکورہ بالا دونوں اداروں میں سے کسی ایک سے ضرور حاصل کرلے۔ اگر کوئی فرد / پبلشر معین کردہ ضوابط کی خلاف ورزی کرے گا تو اُس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔

نام کتاب : بیان القرآن (جلد چہارم) طبع جدید

مبنی بر "دورۂ ترجمۂ قرآن" از ڈاکٹر اسرار احمدؒ (۱۹۹۸ء)

ترتیب و تدوین:

حافظ خالد محمود خضر' ایم ایس سی' فاضل قرآن اکیڈمی

لیفٹیننٹ کرنل (ر) عاشق حسین' ایجوکیشن کور

اشاعت اوّل تا چہارم (مارچ 2021ء تا نومبر 2022ء) ــــــــ 9,000

اشاعت پنجم (مئی 2023ء) ــــــــ 2200

قیمت (فی جلد) ــــــــ 2,400 روپے

(مکمل سیٹ: چار جلد) ــــــــ 9,600 روپے

ISBN: 978-969-606-073-4

زیر اہتمام:

شعبہ مطبوعات' قرآن اکیڈمی' لاہور

publications@tanzeem.org

فون: 38939321(042)

شائع کردہ:

مکتبہ خُدّامُ القُرآن لاہور

36-K ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 3-35869501(042)

maktaba@tanzeem.org

مطبع: مکتبہ جدید پریس' لاہور

ترتیب

۳۹ اَلزُّمَر	5	۵۷ اَلْحَدِیْد	349
۴۰ اَلْمُؤْمِن	39	۵۸ اَلْمُجَادَلَة	389
۴۱ حٰمٓ اَلسَّجْدَة	69	۵۹ اَلْحَشْر	405
۴۲ اَلشُّوْرٰی	95	۶۰ اَلْمُمْتَحِنَة	424
۴۳ اَلزُّخْرُف	126	۶۱ اَلصَّفّ	437
۴۴ اَلدُّخَان	147	۶۲ اَلْجُمُعَة	452
۴۵ اَلْجَاثِیَة	157	۶۳ اَلْمُنٰفِقُوْن	464
۴۶ اَلْاَحْقَاف	172	۶۴ اَلتَّغَابُن	476
۴۷ مُحَمَّد	191	۶۵ اَلطَّلَاق	491
۴۸ اَلْفَتْح	211	۶۶ اَلتَّحْرِیْم	503
۴۹ اَلْحُجُرٰت	233	۶۷ اَلْمُلْك	515
۵۰ قٓ	249	۶۸ اَلْقَلَم	525
۵۱ اَلذّٰرِیٰت	266	۶۹ اَلْحَآقَّة	537
۵۲ اَلطُّوْر	277	۷۰ اَلْمَعَارِج	543
۵۳ اَلنَّجْم	288	۷۱ نُوْح	553
۵۴ اَلْقَمَر	303	۷۲ اَلْجِنّ	560
۵۵ اَلرَّحْمٰن	315	۷۳ اَلْمُزَّمِّل	569
۵۶ اَلْوَاقِعَة	331	۷۴ اَلْمُدَّثِّر	577

۷۵	اَلْقِیٰمَة	589	
۷۶	اَلدَّهْر	597	
۷۷	اَلْمُرْسَلٰت	604	
۷۸	اَلنَّبَا	610	
۷۹	اَلنّٰزِعٰت	615	
۸۰	عَبَس	622	
۸۱	اَلتَّكْوِیْر	628	
۸۲	اَلْاِنْفِطَار	633	
۸۳	اَلْمُطَفِّفِیْن	637	
۸۴	اَلْاِنْشِقَاق	643	
۸۵	اَلْبُرُوْج	651	
۸۶	اَلطَّارِق	655	
۸۷	اَلْاَعْلٰی	657	
۸۸	اَلْغَاشِیَة	664	
۸۹	اَلْفَجْر	669	
۹۰	اَلْبَلَد	676	
۹۱	اَلشَّمْس	681	
۹۲	اَلَّیْل	686	
۹۳	اَلضُّحٰی	693	
۹۴	اَلَمْ نَشْرَح	698	
۹۵	اَلتِّیْن	702	
۹۶	اَلْعَلَق	705	
۹۷	اَلْقَدْر	709	
۹۸	اَلْبَیِّنَة	712	
۹۹	اَلزِّلْزَال	716	
۱۰۰	اَلْعٰدِیٰت	719	
۱۰۱	اَلْقَارِعَة	721	
۱۰۲	اَلتَّكَاثُر	723	
۱۰۳	اَلْعَصْر	725	
۱۰۴	اَلْهُمَزَة	727	
۱۰۵	اَلْفِیْل	730	
۱۰۶	قُرَیْش	732	
۱۰۷	اَلْمَاعُوْن	734	
۱۰۸	اَلْكَوْثَر	736	
۱۰۹	اَلْكٰفِرُوْن	738	
۱۱۰	اَلنَّصْر	740	
۱۱۱	اَللَّهَب	742	
۱۱۲	اَلْاِخْلَاص	745	
۱۱۳	اَلْفَلَق	747	
۱۱۴	اَلنَّاس	751	
	دعائے ختمِ قرآن	754	
	کلمۂ تشکر	758	

سُوْرَۃُ الزُّمَرِ

تمہیدی کلمات

سورۂ صٓ کے اختتام پر زیر مطالعہ گروپ کی پہلی پانچ سورتیں مکمل ہو چکی ہیں۔ اس گروپ کے اندران پانچ سورتوں (سورۂ سبا تا سورۂ صٓ) پر مشتمل ایک ضمنی گروپ بنتا ہے جس کے بالکل وسط میں سورۂ یٰسٓ ہے۔ یعنی سورۂ سبا اور سورۂ فاطر (یہ دونوں سورتیں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے شروع ہوتی ہیں) ایک طرف ہیں جبکہ سورۃ الصّٰفّٰت اور سورۂ صٓ (ان دونوں سورتوں کے آغاز میں حرف ''ص'' مشترک ہے) دوسری طرف' جبکہ عین وسط میں سورۂ یٰسٓ ہے۔

اس گروپ کی بقیہ آٹھ سورتیں (سورۃ الزمر تا سورۃ الاحقاف) ایک لحاظ سے گزشتہ گروپ کی سورۃ الفرقان سے لے کر سورۃ السجدۃ تک کی آٹھ سورتوں سے مشابہت رکھتی ہیں۔ مذکورہ آٹھ سورتوں میں بھی ایک سورۃ (الفرقان) حروفِ مقطعات کے بغیر ہے جبکہ باقی سات سورتوں کا آغاز حروفِ مقطعات سے ہوتا ہے۔ یعنی سورۃ الشعراء اور سورۃ القصص کا آغاز طٰسٓمٓ سے' سورۃ النمل کا طٰسٓ سے اور باقی چار سورتوں (العنکبوت' الروم' لقمان اور السجدۃ) کا آغاز الٓمّٓ سے ہوتا ہے۔ اسی طرح زیر مطالعہ گروپ کی آٹھ سورتوں میں بھی ایک سورۃ (الزمر) ایسی ہے جس کے آغاز میں حروفِ مقطعات نہیں ہیں' جبکہ باقی ساتوں سورتیں حروفِ مقطعات (حٰمٓ) سے شروع ہو رہی ہیں۔ حٰمٓ سے آغاز ہونے کی وجہ سے ان سورتوں کو ''حوامیم'' بھی کہا جاتا ہے۔ ان میں سورۃ الشوریٰ البتہ ایک ایسی سورت ہے جس کی دوسری آیت بھی حروفِ مقطعات (عٓسٓقٓ) پر مشتمل ہے۔ مضمون کے اعتبار سے یہ آٹھوں سورتیں ایک خاص ترتیب (sequence) میں ہیں۔ واضح رہے کہ اس سلسلۂ حوامیم میں معنوی طور پر سورۃ الزمر بھی شامل ہے۔ ان میں سے پہلی چار سورتوں کا مرکزی مضمون ''توحیدِ عملی'' ہے۔

''توحیدِ عملی'' چونکہ بہت اہم مضمون ہے' اس لیے ضروری ہے کہ اسے اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے۔ عقیدے کے طور پر توحید کو تو ہم سب جانتے ہیں' یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا اور یہ ماننا کہ وہ اکیلا اور تنہا ہے (لَا ضِدَّ لَہٗ وَلَا نِدَّ لَہٗ وَلَا مِثْلَ لَہٗ وَلَا مِثَالَ لَہٗ وَلَا مَثِیْلَ لَہٗ)۔ اُس کا کوئی کُفو نہیں' اُس جیسا کوئی نہیں' نہ تو ذات میں اور نہ ہی صفات کے اعتبار سے۔ اسی عقیدہ کی وضاحت ہمیں بہت جامع اور خوبصورت انداز میں سورۃ الاخلاص میں ملتی ہے:

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝١ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝٢ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝٣ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝٤﴾

عقیدۂ توحید کا عملی پہلو ''توحید فی العمل'' ہے' جس کے لیے امام ابن تیمیہؒ نے ''توحید فی الطلب'' کی خوبصورت اصطلاح استعمال کی ہے۔ ''طلب'' کا تعلق انسان کی عملی زندگی سے ہے۔ کسی انسان کی ''طلب'' کے انتخاب اور معیار سے عملی زندگی میں اس کی ترجیحات کا پتا چلتا ہے۔ اس لحاظ سے ہر انسان گویا ''طالب'' ہے اور ہر انسان اپنا کوئی نہ کوئی مطلوب بھی رکھتا ہے۔ سورۃ الحج کی آیت ۷۳ میں بُتوں اور ان کے پجاریوں کے حوالے سے طالب اور مطلوب کے اس رشتے کی اہمیت اور نوعیت کو ﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ

وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۴۳﴾ کے الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے۔ بہرحال ایک ذی شعور مخلوق ہونے کی حیثیت سے لازمی ہے کہ ہر انسان کا کوئی مطلوب' کوئی آئیڈیل یا کوئی آدرش ہو' جسے وہ اپنا مقصدِ حیات سمجھے۔ مگر عملی طور پر ایسا نہیں ہے۔ عملی طور پر انسانوں کی عظیم اکثریت کا کوئی اعلیٰ مقصدِ حیات ہے ہی نہیں اور وہ محض اپنی جبلت (instinct) کے محرکات کے تحت حیوانی سطح پر زندگی گزار رہے ہیں۔ جس طرح حیوانات اپنی جبلی خواہشات پوری کرتے ہیں اسی طرح وہ بھی کھاتے پیتے ہیں' بچے پیدا کرتے ہیں اور ان کی پرورش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی مقصد ان کی زندگی میں نہیں ہے۔ قرآن کی رائے میں ایسے لوگ انسان نہیں' حیوان ہیں' بلکہ حیوانوں سے بھی بدتر ہیں: ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ﴾ (الاعراف:۱۷۹)

اس زاویہ سے دیکھا جائے تو انسان کہلانے کا مستحق صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو محض اپنی جبلی خواہشات کا غلام بن کر نہ رہ گیا ہو بلکہ اُس نے اس سطح سے برتر ہو کر اپنی زندگی کا کوئی اعلیٰ مقصد متعین کر رکھا ہو۔ اس حوالے سے جو اصل مقام و مرتبہ ایک انسان کے شایانِ شان ہے وہ یہ ہے کہ اُس کا مقصدِ حیات اُس کا خالق اور اس کا مالک ہو۔ یعنی صرف اللہ ہی اس کا مقصود ہو' وہی اس کا محبوب ہو اور وہی اس کا مطلوب ہو: لَا مَطْلُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ، لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ، لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ۔ زندگی میں ہر ہر قدم اور ہر ہر موڑ پر اس کی نگاہیں اس شان سے اللہ کی رضامندی کی متلاشی ہوں کہ اس کی زندگی اس فرمانِ الٰہی کی عملی تصویر بن جائے: ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ (الانعام) ''آپ کہیے میری نماز' میری قربانی' میری زندگی اور میری موت اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔''

یہ ہے توحیدِ عملی یا توحید فی الطلب کا اصل مفہوم و مدعا۔ لیکن جو شخص صرف ''عقیدۂ توحید'' کا دعوے دار ہے اور عملی طور پر وہ توحید پر کاربند نہیں' وہ شرک فی العمل کا مرتکب ہے۔ سورۃ الفرقان میں ہم یہ آیت پڑھ چکے ہیں: ﴿اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿۴۳﴾﴾ ''کیا آپ نے دیکھا اُس شخص کو جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا لیا ہے؟ تو (اے نبی ﷺ) کیا آپ ایسے شخص کی ذِمّہ داری لے سکتے ہیں!'' ایسا شخص کہتا تو خود کو موحِد ہے اور وہ نظریۂ توحید پر ایمان کا دعویٰ بھی کرتا ہے' مگر عملی زندگی میں وہ اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے اللہ کے احکام کو پامال کرنے سے دریغ نہیں کرتا اور حلال و حرام کے ضمن میں حدود اللہ کی سرے سے کوئی پروا نہیں کرتا۔ ایسے ہی شخص کو حضور ﷺ نے ''درہم و دینار کا بندہ'' قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ((تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ...)) [1] یہ ایک ایسا کردار ہے جس کا نام تو عبداللہ یا عبدالرحمٰن ہے' زبان سے وہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا اقرار بھی کرتا ہے' اس کلمہ توحید کے ورد کا اہتمام بھی کرتا ہے اور مسجد میں جا جا کر باجماعت نمازیں بھی پڑھتا ہے' مگر اُس کی عملی زندگی میں توحید کہیں نظر نہیں آتی۔ عملی زندگی میں اُس نے اپنا مقصدِ حیات حصولِ دولت کو بنا رکھا ہے' اُس کی فکر کا محور اور اس کی ساری دوڑ دھوپ کا ہدف ہی یہ ہے کہ اسے دولت ملنی چاہیے' جہاں سے بھی ملے' جیسے بھی ملے۔ جائز طریقے سے ملے یا ناجائز طور سے۔ گویا اُس نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ اصل میں وہ ''عبداللہ'' یا ''عبدالرحمٰن'' نہیں ''عبدالدینار'' ہے اور عملی طور پر اُس کا معبود اللہ نہیں بلکہ روپیہ' دینار یا ڈالر ہے۔

اس میدان میں ہم مسلمان ایک لحاظ سے ہندوؤں سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔ ہندو دولت حاصل کرنے کے لیے دولت کی

۱۔ صحیح البخاری' کتاب الجهاد و السیر' باب الحراسة فی الغزو فی سبیل الله۔

دیوی لکشمی بائی کی پوجا کرتے ہیں' وہ سمجھتے ہیں کہ اس کی کرپا ہو جائے گی تو دولت کے دروازے کھل جائیں گے۔ ہم دیوی بنانے اور اس کو پوجنے کو تو شرک تصور کرتے ہیں' مگر براہِ راست دولت کی پوجا کو روا سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ہندو دولت کی دیوی کے پجاری بنے تھے' لیکن ہم براہِ راست دولت کے پجاری بن گئے۔

توحیدِ عملی کا پہلا نکتہ توحید فی العبادت ہے۔ یعنی بندگی اور اطاعت کُل کی کُل اللہ کے لیے ہو' باقی سب اطاعتیں اس اطاعت کے تابع ہوں۔ ماں' باپ اور استاد کی اطاعت ضرور ہو' مگر شریعت کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے۔ حاکم کا حکم بھی مانا جائے مگر صرف وہ جو اللہ کے کسی حکم کے خلاف نہ ہو۔ اس حوالے سے بنیادی اصول اور قانون یہ ہوگا: ((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ))[۲] یعنی مخلوق میں سے ایسی اطاعت کسی کی نہیں ہو سکتی جس سے خالق کی معصیت لازم آتی ہو۔ اگر ایسا ہوا تو یہ شرک ہوگا' کیونکہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں جس کسی کو بھی ''مُطاع'' مانا گیا' وہ چاہے کسی کا اپنا نفس ہو' حاکم وقت ہو' کوئی ادارہ ہو یا جو کوئی بھی ہو' وہ ''طاغوت'' ہے۔ سورۃ الزمر میں یہ مضمون بہت تکرار سے آئے گا کہ ایک بندہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرے تو اُس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے کرے۔

آیات ۱ تا ۸

سُوْرَةُ الزُّمَرِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۷۵ رُكُوْعَاتُهَا: ۸

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝۱ اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ
مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝۲ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا
نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ۝۳ لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ
مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۴ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ
الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَ يُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ
مُّسَمًّى ؕ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۝۵ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ اَنْزَلَ
لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ؕ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ
ثَلٰثٍ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝۶ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ
غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۚ وَ لَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَ اِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ؕ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ
اُخْرٰى ؕ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۷
وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْۤا

۲۔ المعجم الاوسط للطبرانی: ۱۸۱/۴۔

اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا ۖ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۝

آیت ۱ ﴿تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝۱﴾ ''اس کتاب کا نازل کیا جانا ہے اُس اللہ کی طرف سے جو زبردست' کمال حکمت والا ہے۔''

سورۃ الزمر اور سورۃ المؤمن کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے۔ چنانچہ ان دونوں سورتوں کا آغاز بھی ایک جیسے الفاظ سے ہو رہا ہے' صرف ''الحکیم'' اور ''العلیم'' کا فرق ہے۔ جیسے کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ زیر مطالعہ ضمنی گروپ کی ان آٹھ سورتوں میں سے پہلی سورت یعنی سورۃ الزمر کے آغاز میں حروفِ مُقطّعات نہیں ہیں جبکہ باقی ساتوں سورتیں (سورۃ المؤمن تا سورۃ الاحقاف) حٰمٓ کے حروف سے شروع ہوتی ہیں۔

آیت ۲ ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ پر یہ کتاب اُتاری ہے حق کے ساتھ''

﴿فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝۲﴾ ''پس بندگی کرو اللہ کی اپنی اطاعت کو اُس کے لیے خالص کرتے ہوئے۔''

اس حکم کے برعکس آج عملی طور پر ہماری زندگیوں کا نقشہ یہ ہے کہ اللہ کی بندگی بھی ہو رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ طاغوت کو بھی پوجا جا رہا ہے۔ ایک طرف نمازیں پڑھی جا رہی ہیں' حج اور عمرے ادا کیے جا رہے ہیں جبکہ دوسری طرف حرام خوری بھی جاری ہے اور سودی کاروبار بھی چل رہا ہے۔ اللہ کو ایسی آلودہ (polluted) بندگی کی ضرورت نہیں۔ وہ تو اپنے بندوں سے خالص بندگی کا تقاضا کرتا ہے۔

آیت ۳ ﴿اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ﴾ ''آگاہ ہو جاؤ کہ اطاعتِ خالص اللہ ہی کا حق ہے۔''

اللہ کے ہاں صرف دین خالص ہی مقبول ہے۔ اللہ کو یہ ہرگز منظور نہیں کہ اُس کا کوئی بندہ اُس کی بندگی بھی کرے اور اپنی بندگی کا کچھ حصّہ کسی دوسرے کے لیے بھی مختص کر لے۔ اللہ تعالیٰ بہت غیور ہے' وہ شراکت کی بندگی کو واپس اس بندے کے مُنہ پر دے مارتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میرا بننا ہے تو خالصتاً میرے بنو: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠﴾ (البقرہ:۲۰۸) ''اے اہلِ ایمان! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ''۔ اللہ تعالیٰ کے کچھ احکام ماننے اور کچھ نہ ماننے کے حوالے سے سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں بہت سخت وعید آئی ہے:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۸۵﴾

''تو کیا تم (ہماری) کتاب کے ایک حصّے کو مانتے ہو اور ایک حصّے کا انکار کر دیتے ہو؟ تو نہیں ہے کوئی سزا اس کی جو تم میں سے یہ حرکت کرے سوائے دنیا کی زندگی میں ذلّت و رسوائی کے' اور قیامت کے روز وہ لوٹا دیے جائیں گے شدید ترین عذاب کی طرف۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔''

سیاق و سباق کے لحاظ سے اگرچہ اس آیت کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں لیکن آج ہمارے لیے بھی اللہ تعالیٰ کا حکم اور قانون یہی ہے۔ بلکہ یہ آیت ہمارے لیے آئینے کی حیثیت رکھتی ہے جس میں آج ہم اپنی تصویر واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ دنیا کی جس رسوائی کا ذکر اس آیت میں ہوا ہے وہ آج ہمارے ماتھے پر جلی حروف میں لکھی ہوئی صاف نظر آ رہی ہے۔ اس وقت مسلمان تعداد میں ڈیڑھ سو کروڑ

سے بھی زائد ہیں مگر عزت نام کی کوئی چیز اس وقت ان کے پاس نہیں ہے۔ بین الاقوامی معاملات میں کسی کو ان سے ان کی رائے پوچھنا بھی گوارا نہیں۔

﴿وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ﴾ ''اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا کچھ اور کو اولیاء بنایا ہوا ہے۔''

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ﴾ ''(وہ کہتے ہیں کہ) ہم تو ان کو صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔''

یعنی اصل میں تو ہم اللہ ہی کو پوجتے ہیں' جبکہ دوسرے معبودوں کو تو ہم اللہ تک پہنچنے اور اس کا قُرب حاصل کرنے کا صرف وسیلہ سمجھتے ہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ؕ﴾ ''یقیناً اللہ فیصلہ کر دے گا ان کے مابین ان تمام چیزوں میں جن میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ۝۳﴾ ''اللہ ہرگز ہدایت نہیں دیتا جھوٹے اور ناشکرے لوگوں کو۔''

آیت ۴ ﴿لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ﴾ ''اگر اللہ کا واقعی ارادہ ہوتا کہ کسی کو اولاد بنائے تو وہ چُن لیتا اپنی مخلوق میں سے جسے چاہتا''

اللہ کی نہ تو کوئی اولاد ہے اور نہ ہی اس کے ہاں اولاد کا کوئی تصور ہے۔ وہ اکیلا خالق ہے اور باقی ہر چیز اُس کی مخلوق ہے' فرشتے بھی اُس کی مخلوق ہیں۔ اُسے کسی کو بیٹا یا بیٹی بنانے کی کوئی ضرورت یا حاجت نہیں ہے۔

﴿سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۴﴾ ''وہ پاک ہے۔ وہ اللہ ہے اکیلا اور (کُل کائنات پر) چھایا ہوا۔''

کُل کائنات اور تمام مخلوقات پر اُس کی حکومت قائم ہے۔ وہ سب پر قابو رکھنے والا اور غالب ہے۔

آیت ۵ ﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ﴾ ''اُس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ۔''

یعنی یہ کائنات ایک نہایت منظم' بامقصد اور نتیجہ خیز تخلیق ہے' یہ کوئی کارِ عبث نہیں ہے۔

﴿يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ﴾ ''وہ رات کو لپیٹ دیتا ہے دن پر اور دن کو لپیٹ دیتا ہے رات پر''

یہ مضمون قرآن حکیم میں تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ متعدد مقامات پر یہی الفاظ دہرائے گئے ہیں' جبکہ بعض جگہوں پر ﴿يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ﴾ کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ بہرحال مقصود اس سے یہ حقیقت واضح کرنا ہے کہ رات اور دن کے اُلٹ پھیر کا یہ منضبط اور منظم نظام بے مقصد اور عبث نہیں ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے عالَمِ نباتات کے نظامِ تنفس (respiration system) کی مثال لی جا سکتی ہے جو کُلی طور پر دن رات کے ادلنے بدلنے کے ساتھ متعلق و مشروط ہے' یا پھر روئے زمین پر پھیلے ہوئے پورے نظامِ زندگی کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اس گردشِ لیل و نہار کا مرہونِ منت ہے۔ غرض اس کائنات کی کوئی چیز یا کوئی تخلیق بھی بے مقصد و بے کار نہیں۔ اور اگر ایسا ہے' اور یقیناً ایسا ہی ہے' تو پھر انسان اور انسان کی تخلیق کیونکر

بے مقصد و بے کار ہو سکتی ہے' جس کے لیے یہ سب کچھ پیدا کیا گیا ہے؟

یہاں پر ہر ذی شعور انسان کے ذہن میں یہ سوال خود بخود پیدا ہونا چاہیے کہ جب کائنات اور اس کی تمام چیزیں انسان کے لیے پیدا کی گئی ہیں تو آخر انسان کا مقصدِ تخلیق کیا ہے؟ ایک حدیث میں الفاظ آئے ہیں: ((فَإِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَأَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْآخِرَةِ))[۳] یعنی دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔ بہر حال اگر عقل اور منطق کی عینک سے بھی دیکھا جائے تو بھی آخرت کے تصور کے بغیر انسان کی تخلیق کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ خصوصاً انسان کو نیکی اور بدی کا جو شعور ودیعت ہوا ہے وہ ایک ایسی دنیا کا تقاضا کرتا ہے جہاں اچھائی کا نتیجہ واقعی اچھا نکلے اور بُرائی کا انجام واقعی بُرا ہو۔ جبکہ اس دنیا میں ہر جگہ اور ہر وقت ایسا ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ چنانچہ انسان کی اخلاقی حس (moral sense) کے نتیجہ خیز ہونے کے لیے بھی ایک دوسری زندگی کا ظہور ناگزیر ہے۔

﴿وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ﴾ ''اور اُس نے مسخر کر دیا سورج اور چاند کو۔''

﴿كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ﴾ ''یہ سب کے سب چل رہے ہیں ایک وقتِ معیّن تک کے لیے۔''

﴿اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۝۵﴾ ''آگاہ ہو جاؤ! وہ زبردست ہے' بہت بخشنے والا۔''

آیت ۶ ﴿خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾ ''اُس نے پیدا کیا تمہیں ایک جان سے' پھر اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا''

جو لوگ نظریہ ارتقاء (evolution theory) کو مانتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید کے ساتھ اس کے بعض اجزاء کی مطابقت ہے' وہ اس کی تعبیریوں کرتے ہیں کہ ابتدا میں پیدا کیے جانے والے حیوانات (lower animals) میں نَر اور مادہ کی تقسیم نہیں تھی۔ جیسے ایبا (Amoeba) ہے جو دو حصّوں میں تقسیم ہو کر اپنے جیسے ایک نئے وجود کو جنم دے دیتا ہے۔ اس کے بعد اگلے مرحلے پر ان کا خیال ہے کہ ایسے جانور پیدا کیے گئے جن کے اندر بیک وقت مذکر اور مؤنث دونوں جنسیں (sexes) موجود تھیں۔ جیسے کہ برسات کے موسم میں زمین سے نکلنے والے کینچوؤں (earth worms) میں سے ہر ایک کیڑا مذکر و مؤنث دونوں جنسوں کا حامل (hermaphrodite) ہوتا ہے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ دونوں جنسوں میں مزید تفریق ہوئی اور پھر تیسرے مرحلے میں دونوں جنسیں علیحدہ علیحدہ پیدا ہونا شروع ہوئیں۔

﴿وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ؕ﴾ ''اور تمہارے لیے مویشیوں میں سے آٹھ جوڑے اتار دیے''

مویشیوں کے آٹھ جوڑوں کے بارے میں قبل ازیں ہم سورۃ الانعام (آیت ۱۴۳' ۱۴۴) میں بھی پڑھ چکے ہیں۔ ان میں اونٹ نر اور مادہ' گائے نر اور مادہ' بھیڑ نر اور مادہ اور بکری نر اور مادہ آٹھ مویشی شامل ہیں جو اُس وقت عرب میں عموماً پائے جاتے تھے۔

﴿يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ﴾ ''وہ پیدا کرتا ہے تمہیں تمہارے ماؤں کے پیٹوں میں ایک خلق کے بعد دوسری خلق''

یہاں پر خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ سے تخلیق کے مختلف مراحل مراد ہیں۔ ان مراحل کا ذکر قرآن میں متعدد مقامات پر نُطفَة'

۳۔ تخریج الاحیاء للعراقی: ۲۵۲/۳۔

عَلَقَة ، مُضْغَة ، مُضْغَة مُخَلَّقَة وَّغَيْرِ مُخَلَّقَة اور خَلْقًا اٰخَرَ کے الفاظ سے ہوا ہے۔ البتہ سورۃ المؤمنون کے پہلے رکوع کی آیات اس موضوع پر قرآن کے ذروۂ سنام کا درجہ رکھتی ہیں۔

﴿فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ﴾ ''(یہ تخلیق ہوتی ہے) تین اندھیروں کے اندر''

ماں کے پیٹ میں بچے کی تخلیق کا یہ عمل تین پردوں کے اندر ہوتا ہے۔ یعنی ایک پردہ تو پیٹ کی بیرونی دیوار (abdominal wall) کا ہے۔ دوسرا پردہ رحم (uterus) کی موٹی دیوار ہے' جبکہ تیسرا پردہ رحم کے اندر کی وہ جھلی (مشیمہ) ہے جس کے اندر بچہ لپٹا ہوتا ہے۔ اس میں غور طلب نکتہ یہ ہے کہ تین پردوں کی یہ بات قرآن مجید نے صدیوں پہلے اُس وقت کی جس وقت علم جنینیات (Embryology) کے بارے میں انسان کی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر کیتھ ایل مور (جسے ایمبریالوجی پر دنیا بھر میں سند مانا جاتا ہے) نے تسلیم کیا ہے کہ قرآن نے علم جنین کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں وہ واقعتاً حیران کن ہیں اور یہ کہ ماں کے پیٹ کے اندر انسانی تخلیق کے مختلف مراحل کی جو تعبیر قرآن نے کی ہے اس سے بہتر تعبیر ممکن ہی نہیں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ تین پردوں کے اندر انسان کی تخلیق فرماتا ہے۔ اس کے اعضاء اور اس کی شکل کو جیسے چاہتا ہے بناتا ہے۔

﴿ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝۶﴾ ''وہ ہے اللہ تمہارا رب' اُسی کی بادشاہی ہے' اُس کے سوا کوئی معبود نہیں' تو تم لوگ کہاں سے پھرائے جا رہے ہو!''

آیت ۷ ﴿اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۪﴾ ''اگر تم کفر کرتے ہو تو یقیناً اللہ تم سے بے نیاز ہے۔''

وہ غنی ہے' اسے تمہاری کوئی احتیاج نہیں' تمہاری طرف سے انکار یا کفرانِ نعمت کی صورت میں اس کی سلطنت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔

﴿وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ﴾ ''لیکن وہ اپنے بندوں کے لیے کفر پر راضی نہیں ہے۔''

اگرچہ اُس نے انسان کو اختیار دے رکھا ہے: ﴿اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝۳﴾ (الدھر) کہ تم چاہو تو شکر گزار بندے بنو اور چاہو تو کفرانِ نعمت کی روش اختیار کرو۔ یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہے' مگر یہ جان رکھو کہ اُسے اپنے بندوں کی طرف سے کفر کا رویہ ہرگز پسند نہیں ہے۔

﴿وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ؕ﴾ ''اور اگر تم شکر کرو تو وہ تم سے راضی ہوگا۔''

اگر تم اُس کا شکر ادا کرتے رہو' اس کی حمد و ثنا کے ترانے گاتے رہو اور اس کی بندگی کی روش اختیار کیے رکھو تو وہ تم سے خوش رہے گا۔ وہ اسی طرزِ عمل کو پسند کرتا ہے۔

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ﴾ ''اور نہیں اٹھائے گی بوجھ اٹھانے والی کوئی جان کسی دوسرے کے بوجھ کو۔''

﴿ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ﴾ ''پھر تمہارا لوٹنا ہے تمہارے رب ہی کی طرف''

﴿فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؕ﴾ ''پھر وہ تمہیں بتا دے گا جو کچھ کہ تم کرتے رہے تھے۔''

﴿اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۷﴾ ''یقیناً وہ جاننے والا ہے سینوں کے اندر چھپی ہوئی باتوں کا۔''

جو راز تمہارے سینوں کے اندر مخفی ہیں وہ ان سے بھی باخبر ہے۔

آیت ۸ ﴿وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ﴾ ''اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کو پکارتا ہے اُس کی طرف رجوع کرتے ہوئے''

﴿ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ﴾ ''پھر جب وہ عطا کر دیتا ہے اسے کوئی نعمت اپنی طرف سے تو وہ جس چیز کے لیے پہلے اُس کے حضور دعائیں کر رہا تھا سب بھول جاتا ہے''

خَوَّلَ کے لفظی معنی اوڑھانے اور لپیٹنے کے ہیں۔ اردو لفظ ''خول'' اسی سے مشتق ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کے گرد اپنی نعمت کا خول بنا دیتا ہے' اسے اپنی نعمت اوڑھا دیتا ہے یا اپنی نعمت کے اندر اسے لپیٹ لیتا ہے۔

﴿وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا﴾ ''اور وہ اللہ کے مدِمقابل ٹھہرا لیتا ہے''

یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کے بعد وہ قبل ازاں مانگی ہوئی اپنی دعاؤں کو بھول جانے اور اللہ تعالیٰ سے اعراض کرنے پر ہی بس نہیں کرتا' بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اللہ کے مدِمقابل جھوٹے معبود بنانے کی جسارت بھی کر گزرتا ہے۔

﴿لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ﴾ ''تاکہ بہکائے لوگوں کو اُس کے راستے سے۔''

﴿قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا ۖ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ مزے اڑا لو اپنے کفر کے ساتھ تھوڑی دیر' یقیناً تم آگ والوں میں سے ہو!''

کفر کی جو روش تم نے اختیار کر رکھی ہے' اس کے ساتھ دنیا کی چند روزہ زندگی میں جو عیش کر سکتے ہو کر لو' اس کے بعد تمہارا مستقل ٹھکانہ جہنم ہے۔ بالآخر اسی کی آگ میں تمہیں جھونک دیا جائے گا۔ (اعاذنا اللہ من ذٰلک!)

آیات ۹ تا ۲۰

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ قُلْ هَلْ
يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۹ قُلْ يٰعِبَادِ ع ۱۵
الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ؕ
اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۱۰ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ
الدِّيْنَ ۝۱۱ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۱۲ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ
يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۱۳ قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ ۝۱۴ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ؕ قُلْ اِنَّ
الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ اَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝۱۵
لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَ مِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ؕ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ؕ يٰعِبَادِ
فَاتَّقُوْنِ ۝۱۶ وَ الَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَ اَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ

عِبَادِ ﴿۱۷﴾ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۸﴾ اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ؕ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ﴿۱۹﴾ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۙ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ﴿۲۰﴾

آیت ۹ ﴿اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ﴾ ’’بھلا وہ شخص جو بندگی کرنے والا ہے رات کی گھڑیوں میں‘ سجود و قیام کرتے ہوئے‘ وہ آخرت سے ڈرتا رہتا ہے‘ اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار بھی ہے!‘‘

ان الفاظ کے بعد کی عبارت محذوف ہے اور یہ اسلوب اس سورت میں بار بار آتا ہے۔ آگے چل کر متعدد آیات ایسی ملیں گی جہاں جملوں کو نامکمل چھوڑ دیا گیا ہے کہ سننے یا پڑھنے والا اپنے علم‘ ذہن اور ذوق کے مطابق خود مکمل کر لے۔ چنانچہ یہاں پر کَمَنْ هُوَ غَافِلٌ؟ کے الفاظ سے اس جملے کو مکمل کیا جا سکتا ہے کہ کیا ایک ایسا شخص جو اللہ کا فرمانبردار ہے‘ وہ اپنی راتوں کی گھڑیاں اللہ کے حضور اس کیفیت میں گزارتا ہے کہ کبھی سجدے میں پڑا ہوا ہے اور کبھی حالتِ قیام میں ہے‘ اُس کے دل میں آخرت کا خوف بھی ہے اور اپنے رب کی رحمت کی امید بھی‘ کیا وہ ایک ایسے شخص کے برابر ہو جائے گا جو بالکل غفلت میں پڑا ہوا ہے؟

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ کیا برابر ہو سکتے ہیں وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے؟‘‘

﴿اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۹﴾﴾ ’’حقیقی نصیحت اور سبق تو وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جو عقل مند ہیں۔‘‘

آیت ۱۰ ﴿قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ؕ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے کہ اے میرے وہ بندو جو ایمان لائے ہو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو۔‘‘

تم لوگ اللہ پر ایمان لائے ہو تو اب تمہیں ہر وقت اللہ کی رضا جوئی کی فکر ہونی چاہیے۔ لہٰذا اللہ جو کام کرنے کا حکم دے وہ کرو اور جس سے وہ منع کرے اس سے باز رہو۔ یہاں پر مسلمانوں کو نبی اکرم ﷺ کی وساطت سے مخاطب کیا گیا ہے۔ یہاں پر یہ نکتہ ایک دفعہ پھر ذہن نشین کر لیں کہ مکّی سورتوں میں اہلِ ایمان کو مخاطب کرنے کا یہی انداز ملتا ہے‘ جبکہ یٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ سے براہِ راست خطاب کا اسلوب صرف مدنی سورتوں میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں اہلِ ایمان سے براہِ راست خطاب کرنے کے بجائے حضور ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اے نبی ﷺ! آپ میری طرف سے میرے اہلِ ایمان بندوں کو یہ پیغام پہنچا دیں:

﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ﴾ ’’جو لوگ احسان کی روش اختیار کریں گے‘ ان کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے۔‘‘

﴿وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ؕ﴾ ’’اور اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔‘‘

اگر مکّہ میں رہتے ہوئے تمہارے لیے توحید پر کاربند رہنا ممکن نہیں رہا تو یہاں سے ہجرت کر جاؤ۔

﴿اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۝۱۰﴾ ''یقیناً صبر کرنے والوں کو اُن کا اجر پورا پورا دیا جائے گا بغیر حساب کے۔''

اجر کے حوالے سے یہاں پر یُوَفّٰی کا اصول بھی بتایا گیا ہے اور بِغَیْرِ حِسَابٍ کی نوید بھی سنائی گئی ہے۔ یعنی پورا پورا بدلہ دینے کے بعد اللہ تعالیٰ کا مزید فضل بھی ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل کے معاملے میں حساب کا کوئی سوال ہی نہیں!

آیت ۱۱ ﴿قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ۝۱۱﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے مجھے تو حکم ہوا ہے کہ مَیں بندگی کروں اللہ کی اُس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔''

یہ وہی الفاظ ہیں جو اس سے پہلے آیت ۲ میں بھی آ چکے ہیں۔ یہ مضمون اس سورت کا عمود ہے اور اس میں بار بار آئے گا۔ چنانچہ اس مضمون کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اس حوالے سے بنیادی طور پر یہ نکتہ ذہن نشین کر لیجیے کہ ہر چیز کی طرح عبادت کا بھی ایک ظاہر ہے اور ایک اس کی اصل حقیقت ہے۔ عبادت کا ظاہر اس کی رسومات ہیں۔ ''رسم'' کسی شے کی ظاہری شکل کو کہا جاتا ہے۔ مثلاً یہ لکھائی میں جو حروف اور الفاظ استعمال ہوتے ہیں ان کی ظاہری اشکال کو ''رسم'' (رسم الخط) کہتے ہیں۔ جیسے قرآن کا موجودہ رسم الخط ''رسمِ عثمانی'' کہلاتا ہے۔ اب اگر نماز کی مثال لیں تو نماز میں کھڑے ہونا' اللہ کی حمد و تسبیح کرنا' رکوع و سجدہ کرنا مراسمِ عبادت ہیں۔ بعض دوسرے مذاہب میں اپنے معبود کے سامنے مؤدّب کھڑے ہونا' سلیوٹ کرنا اور ہاتھ جوڑنا وغیرہ ان کی عبادت کے مراسم ہیں۔ چنانچہ عرفِ عام میں مراسمِ عبودیت (عبادت کی ظاہری شکل و صورت) کو ہی ''عبادت'' سمجھا جاتا ہے جبکہ عبادت کی اصل حقیقت کچھ اور ہے۔

اب عبادت کی اصل حقیقت کو یوں سمجھیں کہ یہ بھی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک جسد ہے اور ایک اس کی روح۔ دراصل عبادت کا جسد ''اطاعت'' ہے۔ لیکن عبادت کے حوالے سے اطاعت کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے لفظ ''عبادت'' کے لغوی معنی کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔ عبادت کا لفظ ''عبد'' سے مشتق ہے اور عبد کے معنی غلام کے ہیں۔ عبد یا غلام اپنے آقا کی ہمہ تن اور ہمہ وقت اطاعت (غلامی) کا پابند ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس سے پہلے ہم یہ لفظ دو مرتبہ غلامی اور کُلّی اطاعت کے معنی میں پڑھ چکے ہیں۔ سورۃ المؤمنون میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے بارے میں فرعون کا یہ قول نقل ہوا ہے: ﴿وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ۝۴۷﴾ کہ ان کی قوم تو ہماری غلام ہے۔ اسی طرح سورۃ الشعراء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس مکالمے کا حوالہ آ چکا ہے جس میں آپؑ نے فرعون کو مخاطب کر کے فرمایا تھا: ﴿وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝۲۲﴾ ''اور یہ احسان جو تُو مجھے جتلا رہا ہے (کیا یہ اس کا بدلہ ہے) کہ تُو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے؟'' اب ظاہر ہے بنی اسرائیل فرعون یا قبطیوں کی پرستش یا پُوجا تو نہیں کرتے تھے' وہ ان کی نماز نہیں پڑھتے تھے اور انہیں سجدہ بھی نہیں کرتے تھے۔ البتہ وہ ان کے غلام تھے اور اس حیثیت میں ان کی ''اطاعت'' کے پابند تھے۔ لہٰذا متذکرہ بالا دونوں آیات میں عبد کا لفظ کُلّی اطاعت یا غلامی کے مفہوم میں ہی استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ اطاعت یا غلامی دراصل عبادت کا جسد ہے جبکہ اس کی روح ''محبّت'' ہے۔ یعنی اگر کسی کی محبّت کے جذبے سے سرشار ہو کر اُس کی اطاعت کی جائے تو وہ اس کی عبادت ہوگی' جبکہ جبری اطاعت عبادت نہیں ہو سکتی۔ مثلاً ۱۹۴۷ء سے پہلے برصغیر میں ہم لوگ انگریز کی اطاعت کرتے تھے' لیکن ہماری اس اطاعت کو عبادت نہیں کہا جا سکتا' اس لیے کہ یہ جبری اطاعت تھی۔

امام ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد حافظ ابن قیمؒ نے عبادت کی تعریف یوں کی ہے: العبادة تجمع أصلَين : غايةَ الحُبِّ مع غايةِ الذُّلِّ والخُضوع یعنی اللہ کی عبادت دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہے: اس کے ساتھ غایت درجے کی محبت اور اس کے سامنے غایت درجے کا تذلّل اور عاجزی کا اظہار۔ دوسرے لفظوں میں اللہ کی عبادت کا مطلب یہ ہے کہ انسان حد درجے کی محبت کے ساتھ خود کو اللہ کے سامنے بچھا دے اور اس کا مطیع و منقاد ہو جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر اس کی کُلّی اطاعت کرنا اصل عبادت ہے‘ جبکہ مراسم عبادت کی حیثیت عبادت کے ’’ظاہر‘‘ کی ہے۔

آیت زیر مطالعہ کا مضمون گویا اس سورت کا عمود ہے کہ اللہ کی عبادت کرو اُس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔ اس ضمن میں یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ اللہ کی اطاعت سے آزاد کسی دوسرے کی مستقل بالذات اطاعت تو شرک ہے ہی‘ لیکن اگر کسی نے اللہ کی اطاعت کے ساتھ کسی اور کی اطاعت کو بھی شریک کر لیا تو ایسی جزوی یا مشترکہ اطاعت اللہ کو قبول نہیں۔ ایسی اطاعت اللہ کی طرف سے ایسے اطاعت گزار کے منہ پر دے ماری جائے گی۔ اس حوالے سے سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۰۸ کا یہ حکم بہت واضح ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠﴾ ’’اے اہلِ ایمان! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ!‘‘ یعنی اللہ کو کُلّی اطاعت مطلوب ہے۔ کسی کی پچیس فی صد‘ پچاس فی صد یا پچھتر (۷۵) فی صد اطاعت اسے قبول نہیں۔

یہ تو ہے عبادت کی اصل روح اور اطاعت کی اصل کیفیت جو اللہ کو مطلوب ہے۔ لیکن ایک ہم ہیں جو یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم پانچ یا دس فیصد اطاعت پر ہی اللہ کو (نعوذ باللہ) ٹرخا دیں گے اور وہ اسی معیار کی اطاعت پر ہمیں جنّت اور اس کی نعمتوں سے نواز دے گا۔ دراصل ہماری اسی ٹیڑھی سوچ کی وجہ سے آج ہمارے ذہنوں سے زندگی کے تمام گوشوں میں اللہ کی کُلّی اطاعت اور کُلّی بندگی کا تصور نکل چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی کے اسی تصور کو زیر مطالعہ سورتوں کے گروپ میں ایک خاص ترتیب سے اجاگر کیا گیا ہے‘ اس طرح کہ اس مضمون کی جڑیں اس پہلی سورت میں ملیں گی اور اس کی چوٹی چوتھی سورت یعنی سورۃ الشوریٰ میں جا کر نظر آئے گی۔

آیت ۱۲ ﴿وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۱۲﴾ ’’اور مجھے حکم ہوا ہے کہ سب سے پہلا فرماں بردار میں خود بنوں۔‘‘ ایسا ممکن نہیں کہ میں تم لوگوں کو تو اللہ کی فرماں برداری کی دعوت دوں اور خود مجھے اس کی پروا نہ ہو۔

آیت ۱۳ ﴿قُلْ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۱۳﴾ ’’کہہ دیجیے کہ مجھے خود اندیشہ ہے ایک بڑے دن کے عذاب کا اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں۔‘‘

میں خود بھی تو اللہ کا بندہ ہوں‘ اور اس حیثیت سے اس کی کُلّی اطاعت کا پابند ہوں۔ اس ضمن میں میرے لیے کوئی استثناء نہیں‘ اور اگر بالفرض میں بھی اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بھی اللہ کے عذاب کا اندیشہ ہوگا۔ یہ شرطیہ فقرہ ہے اور یوں سمجھیں کہ اس کے درمیان کا ’’اگر‘‘ گویا ایک پہاڑ ہے جسے پھلانگنا ناممکنات میں سے ہے۔ دراصل یہ انداز مخالفین کو معاملے کی سنجیدگی کا احساس دلانے کے لیے اختیار فرمایا گیا ہے‘ ورنہ حضور ﷺ کے لیے اس کا ہرگز کوئی امکان نہیں تھا۔

آیت ۱۴ ﴿قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ ۝۱۴﴾ ’’کہہ دیجیے کہ میں تو اللہ ہی کی بندگی کرتا ہوں اُس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔‘‘

نوٹ کیجیے! اس مضمون کو یہاں بار بار دہرایا جا رہا ہے۔ اور ہر بار پڑھنے سے اس میں ایک نیا حسن نظر آتا ہے اور ایک نئی تاثیر کا

احساس ہوتا ہے۔ جب کہ ہم انسانوں کی دنیا میں کسی عبارت کے اندر الفاظ یا مضمون کی تکرار اُس تحریر یا تصنیف کا بہت بڑا عیب بن جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی فصاحت و بلاغت کا معجزہ ہے کہ اُس کے ہاں تکرار سے کلام کا حسن اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ یہاں اس مضمون کی غیر معمولی تکرار کی غرض و غایت کو سمجھنے اور اس اسلوبِ خاص میں تاکید (emphasis) کی شدت کو محسوس کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے لیے سورت کے آغاز سے لے کر آیت زیر مطالعہ تک مذکورہ مضمون سے متعلقہ آیات کو ایک مرتبہ پھر سے ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ آغاز میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ فَاعۡبُدِ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ ۝۲ اَلَا لِلّٰہِ الدِّیۡنُ الۡخَالِصُ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ پر یہ کتاب اتاری ہے حق کے ساتھ' پس بندگی کرو اللہ کی اُس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ اطاعتِ خالص اللہ ہی کا حق ہے''۔ اس کے بعد آیت ۱۱ ملاحظہ کیجیے: ﴿قُلۡ اِنِّیۡۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ ۝۱۱﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے مجھے حکم ہوا ہے کہ مَیں بندگی کروں اللہ کی اُس کے لیے اطاعت کو خالص کرتے ہوئے''۔ اور اب زیر مطالعہ آیت کا مضمون دیکھیے: ﴿قُلِ اللّٰہَ اَعۡبُدُ مُخۡلِصًا لَّہٗ دِیۡنِیۡ ۝۱۴﴾ ''کہہ دیجیے کہ مَیں تو اللہ ہی کی بندگی کرتا ہوں اُس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے''۔ گویا تکرار پر تکرار ہے' اصرار پر اصرار ہے اور تاکید پر تاکید ہے۔

آیت ۱۵ ﴿فَاعۡبُدُوۡا مَا شِئۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖ ؕ﴾ ''تو تم جس کو چاہو پوجو اُس کے سوا!''

﴿قُلۡ اِنَّ الۡخٰسِرِیۡنَ الَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَہۡلِیۡہِمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ﴾ ''آپ کہہ دیجیے کہ اصل میں خسارے میں رہنے والے وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو خسارے میں ڈالا قیامت کے دن۔''

یہاں پر تو وہ حرام خوری کے ذریعے خود بھی مزے میں ہیں اور اپنے اہل و عیال کو بھی عیش و عشرت کا سامان مہیا کر رہے ہیں۔ لیکن اس روش کو اپنا کر وہ اپنے اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ کوئی بھلائی یا خیر خواہی نہیں کر رہے' بلکہ حقیقت میں وہ خود کو اور ان کو جہنم کا ایندھن بنانے کے اسباب پیدا کر رہے ہیں۔ سورۃ التحریم' آیت ۶ میں اہلِ ایمان کو اس حوالے سے خصوصی طور پر حکم دیا گیا ہے: ﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ وَ اَہۡلِیۡکُمۡ نَارًا...﴾ ''اے اہلِ ایمان! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے.....'' لیکن اس کے برعکس جو شخص خود کو اور اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ کا مستحق بنا لے اس سے بڑھ کر اور کون گھاٹے میں ہوگا!

﴿اَلَا ذٰلِکَ ہُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِیۡنُ ۝۱۵﴾ ''آگاہ ہو جاؤ یہی تو کھلا خسارا ہے۔''

آیت ۱۶ ﴿لَہُمۡ مِّنۡ فَوۡقِہِمۡ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَ مِنۡ تَحۡتِہِمۡ ظُلَلٌ ؕ﴾ ''اُن کے لیے ان کے اوپر سے بھی آگ کے بادل ہوں گے تہہ بر تہہ اور نیچے سے بھی آگ کے بھبکے ہوں گے تہہ بر تہہ۔''

﴿ذٰلِکَ یُخَوِّفُ اللّٰہُ بِہٖ عِبَادَہٗ ؕ﴾ ''یہ وہ شے ہے جس سے اللہ ڈراتا ہے اپنے بندوں کو۔''

﴿یٰعِبَادِ فَاتَّقُوۡنِ ۝۱۶﴾ ''اے میرے بندو! پس تم مجھ سے ڈرو۔''

میری ان وعیدوں سے ڈر کر تم اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچانے کی کوشش کرو۔

آیت ۱۷ ﴿وَ الَّذِیۡنَ اجۡتَنَبُوا الطَّاغُوۡتَ اَنۡ یَّعۡبُدُوۡہَا﴾ ''اور وہ لوگ جنہوں نے طاغوت سے کنارہ کشی کر لی (اس طرح) کہ اُس کی بندگی نہ کی''

طاغوت کا لفظ قرآن مجید میں متعدد بار آیا ہے۔ سب سے پہلے ہم نے یہ لفظ سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں پڑھا تھا: ﴿فَمَنۡ

يَكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى﴾ (آیت ۲۵۶) ''تو جو کوئی بھی طاغوت کا انکار کرے اور پھر اللہ پر ایمان لائے تو اُس نے بہت مضبوط حلقہ تھام لیا''۔ لفظ طاغوت کا مادہ ''طغی'' ہے اور اس کے معنی سرکشی کے ہیں۔ اسی مادہ سے اردو لفظ ''طغیانی'' مشتق ہے۔ دریا اپنے کناروں کے اندر بہہ رہا ہو تو بہت خوبصورت منظر پیش کرتا ہے لیکن جب وہ اپنی ''حدود'' سے باہر نکل آئے تو ہم کہتے ہیں کہ دریا میں طغیانی آ گئی ہے۔ اسی طرح انسان اگر اللہ کی بندگی کی حد میں رہے تو وہ اللہ کا بندہ ہے' اُس کا خلیفہ ہے اور اشرف المخلوقات ہے۔ لیکن اگر بندگی کی حدود سے تجاوز کر جائے تو وہ ''طاغوت'' ہے۔ پھر چاہے ان حدود کو پھلانگنے کے بعد وہ اپنے نفس کا بندہ بن جائے یا کسی اور کو اپنا مُطاع بنا لے' خود حاکم بن بیٹھے یا اللہ کے علاوہ کسی اور کی حاکمیت کا طوق اپنے گلے میں ڈال لے' اللہ کی نظر میں وہ طاغوت ہی ہے۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ میں ان لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے کنارہ کشی کر لی اس سے کہ وہ طاغوت کی اطاعت یا بندگی کریں:

﴿وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ﴾ ''اور انہوں نے رجوع کر لیا اللہ کی طرف' اُن کے لیے بشارت ہے' تو (اے نبی ﷺ!) میرے ان بندوں کو بشارت دے دیجیے۔''

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ! اب اگلی آیت بہت اہم ہے' اس میں ان بندوں کی صفت بیان کی گئی ہے جنہیں بشارت دی جا رہی ہے۔

آیت ۱۸ ﴿الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ﴾ ''جو بات کو توجہ سے سنتے ہیں' پھر اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں۔''

یعنی یہ دین جس کی طرف اللہ تمہیں بلا رہا ہے اس کے بھی مختلف مدارج ہیں۔ پہلا درجہ اسلام ہے' اس سے اونچا درجہ ایمان اور پھر سب سے اونچا درجہ احسان ہے۔ درجہ احسان پر فائز لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (المائدۃ) کی بشارت سنائی ہے۔ چنانچہ ہمیں چاہیے کہ دین کے معاملے میں زیادہ سے زیادہ محنت کریں اور ہر لحہ بہتر سے بہتر درجے پر پہنچنے کی فکر میں رہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارا طرزِ عمل اس کے برعکس ہے۔ دُنیوی معاملات میں تو ہمارا ماٹو بقول حالی یہ ہے کہ:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں — اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں!

جبکہ دین کے معاملے میں نہ صرف یہ کہ ہم کم سے کم پر گزارا کرنا چاہتے ہیں بلکہ پسپائی اختیار کرنے کی فکر میں ہر وقت کسی گنجائش اور رعایت کی تلاش میں رہتے ہیں۔ حالانکہ ایک بندۂ مؤمن کو چاہیے کہ دنیا کے معاملے میں تو کم سے کم پر گزارا کرے اور دین کے معاملے میں ہمیشہ عزیمت کا راستہ اختیار کرنے کی فکر میں رہے۔

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ ''یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو عقل مند ہیں۔''

آیت ۱۹ ﴿اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ﴾ ''تو کیا وہ شخص جس پر ثابت ہو چکا ہے عذاب کا فیصلہ!''

اس کے بعد یہ جملہ گویا محذوف ہے: كَمَنْ هُوَ فِي الْجَنَّةِ؟ یعنی جو شخص عذاب کا مستحق ہو چکا ہے کیا وہ اُس شخص کے برابر ہو جائے گا جو کہ جنت میں جانے والا ہے؟

﴿اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ﴿۱۹﴾﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) کیا آپ اُس کو بچا سکیں گے جو آگ میں ہے؟''

یہ وہ لوگ ہیں جو عذاب سے متعلق اللہ کے قانون کی زد میں آ چکے ہیں۔ اتمامِ حُجّت ہو جانے کے بعد ان کے دلوں پر مہریں لگا دی گئی ہیں۔ وہ گمراہی میں اس حد تک آگے جا چکے ہیں کہ اب ایمان کی طرف ان کی واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ چنانچہ اب وہ آگ کا ایندھن بننے والے ہیں اور اس مرحلے پر آپؐ ان کو اس بھیانک انجام سے نہیں بچا سکتے۔

آیت ۲۰ ﴿لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۙ﴾ ''لیکن وہ لوگ جو اپنے ربّ کا تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان کے لیے ہوں گے بالا خانوں پر بالا خانے (ایک دوسرے کے اوپر) چُنے ہوئے۔''

اللہ تعالیٰ انہیں جنّت میں کئی کئی منزلہ رہائش گاہیں (skyscrapers) عطا فرمائے گا۔

﴿تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ﴾ ''ان کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔''

﴿وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ﴿۲۰﴾﴾ ''یہ اللہ کا وعدہ ہے' اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔''

آیات ۲۱ تا ۳۵

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا
مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي
الْاَلْبَابِ ﴿۲۱﴾ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ ع ۲۲
قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۲﴾ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا
مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ
اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۲۳﴾ اَفَمَنْ
يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَقِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۲۴﴾
كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۵﴾ فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا
الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۲۸﴾
ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ
مَثَلًا ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۹﴾ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ ع ۳
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ
اِذْ جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ

الجزء الرابع والعشرون (۲۴)

هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۳۳﴾ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۴﴾ لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ عَمِلُوْا وَيَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۳۵﴾

آیت ۲۱ ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ﴾ ''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے اُتارا آسمان سے پانی' پھر اس کو چلا دیا چشموں کی شکل میں زمین میں''

﴿ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ﴾ ''پھر اس کے ذریعے سے وہ نکالتا ہے کھیتی جس کے مختلف رنگ ہیں''

﴿ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا﴾ ''پھر وہ پک کر تیار ہو جاتی ہے' پھر تم اسے دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہو گئی ہے''

﴿ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا ؕ﴾ ''پھر وہ اسے چورا چورا کر دیتا ہے۔''

کچھ عرصہ پہلے جس کھیت میں فصل لہلہا رہی تھی اب وہاں خاک اُڑ رہی ہے اور خشک بھوسے کے کچھ تنکے ہیں جو اِدھر اُدھر بکھرے نظر آ رہے ہیں۔

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۲۱﴾﴾ ''یقیناً اس میں یاددہانی (اور سبق) ہے ہوشمند لوگوں کے لیے۔''

یعنی اگر غور سے دیکھا جائے تو فصل کے اُگنے' نشوونما پا کر پوری طرح تیار ہونے' پک کر سوکھ جانے اور پھر کٹ کر چورا چورا ہو جانے میں انسانی زندگی ہی کے مختلف مراحل کا نقشہ نظر آتا ہے۔ جس طرح فصل کے اُپجنے پر کسان خوش ہوتا ہے اسی طرح ہمارے ہاں بچے کی پیدائش پر خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ پھر وہ بچہ پرورش پا کر جوان ہوتا ہے' اس کے بعد آہستہ آہستہ بالوں میں سفیدی آنے لگتی ہے۔ جوانی کی طاقت گھٹنا شروع ہو جاتی ہے' قویٰ کمزور پڑنے لگتے ہیں اور پھر ایک دن اُسے قبر میں اتار دیا جاتا ہے' جہاں وہ مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ موسمی فصلوں اور انسانوں کا life cycle ایک سا ہے۔ دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ فصل کے اُگنے سے لے کر کٹنے تک چند ماہ کا عرصہ درکار ہے جبکہ انسانی زندگی میں یہ دورانیہ پچاس ساٹھ سال کا ہے۔ بہرحال ''زندگی'' دونوں جگہ مشترک ہے۔ سائنسی نقطہ نظر سے بھی دیکھیں تو نباتاتی زندگی (Botany) اور حیوانی زندگی (Zoology) دونوں حیاتیات (Biology) ہی کی شاخیں ہیں۔

آیت ۲۲ ﴿اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ﴾ ''بھلا وہ شخص کہ جس کے سینے کو اللہ نے کھول دیا ہے اسلام کے لیے اور وہ اپنے رب کی طرف سے نُور پر ہے!''

یہاں بھی وہی حذف کا اسلوب ہے۔ چنانچہ اس جملے کے بعد یہاں پر کَمَنْ هُوَ فِي الظُّلُمٰتِ کا جملہ محذوف مانا جائے گا۔ یعنی ایک وہ شخص ہے جسے اندرونی بصیرت حاصل ہے اور اُس کا دل ایمان کے نور سے جگمگا رہا ہے' کیا وہ اس شخص کی طرح ہو جائے گا جو اندھیروں میں بھٹک رہا ہے؟

﴿فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''تو ہلاکت اور بربادی ہے اُن لوگوں کے لیے جن کے دل سخت ہو گئے ہیں اللہ کے ذکر سے۔''

ان کے دل نرمی اور گداز سے محروم ہو چکے ہیں' چنانچہ اب نہ تو ان کے دلوں میں اللہ کے ذکر کا ذوق ہے اور نہ ہی اس کی

طرف رجوع کرنے کا شوق۔

﴿اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۲﴾﴾ ''یہ لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔''

آیت ۲۳ ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ﴾ ''اللہ نے بہترین کلام نازل کیا ہے کتاب کی صورت میں' جس کے مضامین باہم مشابہ ہیں اور بار بار دہرائے گئے ہیں''

ہمارے ہاں لوگ عام طور پر لفظ ''حدیث'' کے صرف ایک ہی مفہوم سے آشنا ہیں جو کہ اس لفظ کا اصطلاحی مفہوم ہے' یعنی فرمانِ رسول ﷺ کو اصطلاحاً حدیث کہا جاتا ہے۔ جبکہ اس لفظ کے لغوی معنی بات یا کلام کے ہیں اور قرآن میں لفظ ''حدیث'' اسی مفہوم میں آیا ہے۔ جیسے سورۃ المرسلات میں فرمایا گیا: ﴿فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۰﴾﴾ کہ اس قرآن کے بعد اب یہ لوگ بھلا اور کس بات پر ایمان لائیں گے؟ چنانچہ آیت زیر مطالعہ میں اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ کا مطلب ہے: بہترین کلام۔

مُّتَشَابِهًا سے مراد قرآن کے الفاظ' اس کی آیات اور اس کے مضامین کا باہم مشابہ ہونا ہے۔ یہ مشابہت قرآن کے اہم مضامین کی تکرار کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ قصہ آدمؑ و ابلیس قرآن میں سات مقامات پر مذکور ہے۔ بظاہر سب مقامات پر یہ قصہ ایک سا معلوم ہوتا ہے مگر ہر جگہ سیاق و سباق کے حوالے سے اس میں کوئی نہ کوئی نئی بات ضرور سامنے آتی ہے۔ اگر ایک شخص اپنے معمول کے مطابق سات روز میں قرآن مجید ختم کرتا ہو تو وہ ہر روز کہیں نہ کہیں اس قصے کی تلاوت کرے گا۔ اس لحاظ سے اس قصے کی تفصیلات' متعلقہ آیات اور ان آیات کے الفاظ اسے باہم مشابہ محسوس ہوں گے۔ اسی طرح بعض سورتوں کی بھی آپس میں گہری مشابہت ہے اور اسی مشابہت کی بنا پر انہیں جوڑوں میں تقسیم کیا گیا ہے —— مَثَانِيَ کا معنی ہے دہرائی ہوئی یا جوڑوں کی صورت میں۔

﴿تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ﴾ ''اس (کی تلاوت) سے اُن لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔''

متقی لوگ جب قرآن مجید کو پڑھتے ہیں تو ان پر اللہ رب العزت کا خوف طاری ہو جاتا ہے اور اس خوف کی وجہ سے ان کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔

﴿ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ﴾ ''پھر اُن کی کھالیں اور اُن کے دل اللہ کی یاد کے لیے نرم پڑ جاتے ہیں۔''

یعنی ان کے بدن اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف جھک پڑتے ہیں۔

﴿ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ﴾ ''یہ اللہ کی ہدایت ہے جس سے وہ ہدایت بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے۔''

﴿وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۲۳﴾﴾ ''اور جس کو اللہ گمراہ کر دے پھر اُس کے لیے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔''

جس کی گمراہی پر اللہ ہی کی طرف سے مہر ثبت ہو چکی ہو پھر اسے کون ہدایت دے سکتا ہے؟

آیت ۲۴ ﴿اَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْۗءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ﴾ ''بھلا وہ شخص جو اپنے چہرے پر روکے گا بدترین عذاب قیامت کے دن!''

یہاں پھر وہی حذف کا اسلوب ہے کہ بھلا ایک شخص جس کا چہرہ قیامت کے دن بدترین عذاب کی زد میں ہوگا اور آگ کے تھپیڑوں کو اپنے چہرے پر روکنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہ ہوگا' کیا وہ اس شخص کے برابر ہو جائے گا جو ﴿فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴿۸۹﴾﴾ (الواقعۃ) کے مزے لے رہا ہوگا؟

﴿وَقِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۲۴﴾﴾ ''اور کہہ دیا جائے گا اُن ظالموں سے کہ اب چکھو مزہ اس کا جو کچھ کمائی تم کرتے رہے تھے۔''

انہیں جتلا دیا جائے گا کہ یہ تمہارے اپنے اعمال ہی ہیں جنہوں نے آج یہاں آگ کی شکل اختیار کر لی ہے۔

آیت ۲۵ ﴿كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۵﴾﴾ ''(اے نبی ﷺ!) جھٹلایا تھا انہوں نے بھی جو ان سے پہلے تھے' تو اُن پر آن دھمکا عذاب وہاں سے جہاں سے انہیں گمان تک نہیں تھا۔''

آیت ۲۶ ﴿فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ﴾ ''تو اللہ نے انہیں دنیا کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھا دیا۔''

﴿وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾﴾ ''اور آخرت کا عذاب تو بہت بڑا ہے۔ کاش کہ انہیں معلوم ہوتا!''

آیت ۲۷ ﴿وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ﴾ ''اور ہم نے انسانوں کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں بیان کر دی ہیں''

مختلف احکام و مسائل کو قرآن میں کھول کھول کر اور اسلوب بدل بدل کر بیان کر دیا گیا ہے۔

﴿لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾﴾ ''شاید کہ وہ سبق حاصل کریں۔''

آیت ۲۸ ﴿قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۲۸﴾﴾ ''(ہم نے اسے بنا دیا ہے) قرآنِ عربی' اس میں کوئی کجی نہیں ہے' شاید کہ وہ تقویٰ کی روش اختیار کریں۔''

ہم نے اس قرآن کو فصیح و بلیغ عربی میں اتارا ہے۔ اس کی زبان بہت سادہ اور سلیس ہے۔ اس حوالے سے سورۃ القمر میں یہ آیت چار مرتبہ دہرائی گئی ہے: ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝﴾ ''اور ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان بنا دیا ہے' تو ہے کوئی اس سے نصیحت حاصل کرنے والا؟''

آیت ۲۹ ﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ۭ﴾ ''اللہ نے مثال بیان فرمائی ہے ایک شخص کی جس میں آپس میں ضد رکھنے والے بہت سے آقا شریک ہیں اور ایک وہ شخص ہے جو پورے طور پر ایک ہی آقا کا غلام ہے۔''

یہ تمثیل ''توحیدِ عملی'' کا مفہوم واضح کرنے کے لیے بیان فرمائی جا رہی ہے۔ یہ دو غلاموں کی حالت کا تقابل ہے۔ ایک غلام کے کئی آقا ہیں اور وہ بھی ضدی' مختلف الاغراض اور مختلف مزاج رکھنے والے۔ اور دوسرا غلام وہ ہے جس کا ایک ہی آقا ہے۔ مقامِ غور ہے کہ اگر چار آپس میں ضد رکھنے والے اور تُند خُو آدمیوں نے مل کر ایک غلام خرید رکھا ہے تو اُس غلام کی جان تو ہر وقت مصیبت میں پھنسی

رہے گی۔ ایک آقا اسے بیٹھنے کا کہے گا تو دوسرا اٹھنے کا حکم دے گا۔ تیسرا کوئی اور فرمائش کرے گا اور چوتھا کچھ اور کہے گا۔ وہ بے چارا ایک کو خوش کرنے کی کوشش کرے گا تو دوسرا ناراض ہو جائے گا۔ الغرض ایسے غلام کے لیے ایک وقت میں اپنے سب آقاؤں کو خوش رکھنا کسی طور بھی ممکن نہیں۔ اس کے برعکس اگر کسی غلام کا ایک ہی آقا ہو تو اس کے لیے اپنے اس آقا کو خوش کرنا اور مطمئن رکھنا بہت آسان ہوگا۔ اس مثال کی اہمیت انتظامی امور کے حوالے سے بھی سمجھی جا سکتی ہے۔ اگر کسی ملک یا ادارے کا ایک مقتدر سربراہ ہوگا تو اس کا نظام درست رہے گا' لیکن جہاں متوازی حکم چلانے والے کئی سربراہ ہوں گے تو وہاں لازمی طور پر فساد مچ جائے گا۔

اب اس مثال کی روشنی میں شرک اور توحید کے معاملے کو دیکھیں تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اگر تم ایک اللہ کے بندے بن کر رہو گے تو سکون اور چین سے رہو گے۔ اگر مختلف شخصیات اور دیوی دیوتاؤں کے پجاری بنو گے تو مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ ایک کو خوش کرو گے تو دوسرا ناراض ہو جائے گا۔ آخر کس کس معبود کی پوجا کرو گے؟ کتنے آقاؤں کے حضور نذرانے پیش کرو گے؟ اور کہاں کہاں جا کر پیشانی رگڑو گے؟ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

﴿هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ﴾ ''کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں مثال میں؟''

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۲۹﴾ ''کُل تعریف اللہ کے لیے ہے' لیکن ان کی اکثریت علم نہیں رکھتی۔''

یعنی بات واضح ہو گئی کہ توحید ہی صحیح راستہ ہے' لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہیں یا جانتے بوجھتے ناسمجھ بنے بیٹھے ہیں۔

آیت ۳۰ ﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ۝۳۰﴾ ''(اے نبی ﷺ!) یقیناً موت آپ پر بھی وارد ہو گی اور یہ سب بھی مرنے والے ہیں۔''

آیت ۳۱ ﴿ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ۝۳۱﴾ ''پھر تم قیامت کے دن اپنے رب کے پاس آپس میں جھگڑو گے۔''

اس جھگڑے کی نوعیت کچھ یوں ہو گی کہ حضور ﷺ شہادت دیں گے کہ اے اللہ! میں نے تیرا پیغام کما حقہ ان تک پہنچا دیا تھا۔ ممکن ہے وہاں ان میں سے کچھ لوگ انکار کریں کہ نہیں نہیں یہ بات ان تک نہیں پہنچی تھی اور بحث و تکرار کی نوبت آ جائے۔ ابلاغِ رسالت کے بارے میں پیغمبروں کی گواہی اور متعلقہ اُمتوں کے افراد سے جواب طلبی کے حوالے سے سورۃ الاعراف کی یہ آیت بہت اہم ہے: ﴿فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۶﴾ ''ہم اُن سے بھی پوچھیں گے جن کی طرف رسولوں کو بھیجا گیا تھا اور اُن سے بھی پوچھیں گے جنہیں رسول بنا کر بھیجا تھا''۔ چنانچہ وہاں سب پیغمبروں سے پوچھا جائے گا کہ کیا آپ لوگوں نے ہمارا پیغام اپنی اپنی قوموں تک پہنچا دیا تھا؟ جواب میں تمام پیغمبر گواہی دیں گے کہ اے اللہ! ہم نے پہنچا دیا تھا۔ اسی لیے حضور اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر موجود لوگوں سے استفسار فرمایا تھا: ((اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ)) کہ کیا میں نے اللہ کا پیغام تم لوگوں تک پہنچا دیا؟ جواب میں پورے مجمعے نے یک زبان ہو کر کہا تھا: نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَ اَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ![۴]

۴۔ صحیح مسلم' کتاب الحج' باب حجۃ النبی ﷺ۔

حضور ﷺ! ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے تبلیغ' امانت اور نصیحت کا حق ادا کر دیا! اس کے بعد حضور ﷺ نے اپنی انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھائی اور اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے کہا: ((اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ! اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ! اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ!)) کہ اے اللہ! تو بھی گواہ رہ' یہ لوگ تسلیم کر رہے ہیں کہ میں نے ان تک تیرا پیغام پہنچا دیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ((أَلَا لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) [۶] کہ اب جو لوگ موجود ہیں ان کا فرض ہے کہ یہ پیغام ان لوگوں تک پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ اس طرح آپؐ نے یہ فریضہ اُمت کی طرف منتقل فرما دیا۔ اللہ کے رسول ﷺ کے اس فرمان کے بعد یوں سمجھیں کہ اب یہ پوری اُمت اللہ کے رسولؐ کی رسول ہے (سورۂ یٰسٓ کی آیت ۱۴ کے تحت اس اصطلاح کی وضاحت کی جا چکی ہے)۔ یعنی اللہ کے رسول ﷺ نے جو پیغام ان تک پہنچایا ہے اب انہوں نے اسے پوری نوعِ انسانی تک پہنچانا ہے۔

حضور ﷺ کی اُمت کے اس اعزاز اور فریضہ کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دو مقامات پر فرمایا ہے' ہجرت سے متصلاً قبل سورۃ الحج میں اور ہجرت سے متصلاً بعد سورۃ البقرۃ میں۔ سورۃ الحج کی آخری آیت میں یوں فرمایا: ﴿هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ ۚ﴾ ''اُس نے تمہیں چُن لیا ہے اور دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ اپنے جدِ امجد ابراہیمؑ کی ملّت پر۔ اُسی نے تمہارا نام مسلم رکھا' اس سے پہلے بھی (تمہارا یہی نام تھا) اور اس (کتاب) میں بھی' تاکہ پیغمبر تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو''۔ سورۃ البقرۃ میں اسی مضمون کو ان الفاظ میں پھر سے دہرایا گیا: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ﴾ (آیت ۱۴۳) ''اور (اے مسلمانو!) اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک اُمتِ وَسط بنایا ہے' تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو''۔ دونوں مقامات پر الفاظ ایک سے آئے ہیں صرف الفاظ کی ترتیب تبدیل ہوئی ہے۔

آیت ۳۲ ﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَي اللّٰهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَاۗءَهٗ ۭ﴾ ''اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے اور جھٹلائے سچی بات کو جبکہ وہ اس کے پاس آ گئی ہو!''

یہ دونوں خصوصیات ایک ہی شخص کے کردار میں بھی ہو سکتی ہیں کہ وہ اللہ پر جھوٹ بھی باندھ رہا ہو اور اللہ کی طرف سے جو حق اس کے پاس آیا ہے اس کی تکذیب یا نفی بھی کر رہا ہو۔ اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دو الگ الگ کرداروں کا ذکر ہو۔ یعنی ایک وہ شخص جو اپنی کسی بات کو اللہ کی طرف منسوب کر کے دعویٰ کرے کہ مجھ پر وحی آئی ہے۔ ظاہر ہے ایسے شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اسی درجے کا ظالم وہ شخص بھی ہوگا جس کے پاس اللہ کا کلام پہنچ جائے جو کہ سراسر حق ہے اور وہ اس حق کو جھٹلا دے۔

﴿اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝۳۲﴾ ''تو کیا جہنم ہی میں ٹھکانہ نہیں ہے ایسے کافروں کا!''

اب اگلی آیت میں اس کے برعکس کردار کا ذکر ہے:

آیت ۳۳ ﴿وَالَّذِيْ جَاۗءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖ﴾ ''اور وہ شخص جو سچائی لے کر آیا اور وہ جس نے اس کی تصدیق کی''

۶۔ صحیح البخاری' کتاب الاضاحی' باب من قال الاضحی یوم النحر۔ وصحیح مسلم' کتاب القسامۃ والمحاربین والقصاص والدیات' باب تغلیظ تحریم الدماء والاعراض والاموال۔

گزشتہ آیت کی طرح یہاں بھی دونوں احتمالات موجود ہیں۔ یعنی یہ الگ الگ دو کردار بھی ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دونوں خوبیاں کسی ایک ہی شخص میں پائی جائیں کہ وہ راست باز بھی ہے اور حق کی تصدیق کرنے والا بھی۔ لیکن اس آیت کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ یہاں وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ سے مراد حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں جو اللہ کی طرف سے حق اور سچائی لے کر آئے ہیں اور وَصَدَّقَ بِهٖ سے مراد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے اس سچائی کی بلا حیل و حجت تصدیق کی۔

﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝۳۳﴾ ''یہی لوگ ہیں کہ جو متقی ہیں۔''

آیت ۳۴ ﴿لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ ذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ۝۳۴﴾ ''ان کے لیے اپنے رب کے پاس وہ سب کچھ ہے جو یہ چاہیں گے۔ یہی بدلہ ہے نیکوکاروں کا!''

آیت ۳۵ ﴿لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ عَمِلُوْا﴾ ''تاکہ اللہ اُن سے دور کر دے اُن کے بُرے اعمال کو''

ظاہر بات ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام تو معصوم ہیں۔ ان سے اگر بر بنائے طبع بشری کسی غلط بات کا امکان پیدا ہو بھی جائے تو اللہ تعالیٰ انہیں اس کے صدور سے محفوظ رکھتا ہے۔ لیکن انبیاءؑ کے علاوہ تو ہر شخص سے غلطی اور خطا کا امکان ہے۔ چنانچہ اوپر کی آیات میں جن متقین اور محسنین کا ذکر ہے اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں اور لغزشوں کو معاف فرما کر ان کے نامہ ہائے اعمال کو بُرائیوں اور گناہوں سے بالکل پاک کر دے گا۔

﴿وَيَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۳۵﴾ ''اور اُن کو اجر عطا فرمائے اُن کے بہترین اعمال کے حساب سے۔''

ظاہر بات ہے کہ ہر نیک شخص کے تمام نیک اعمال ایک جیسے نہیں ہوتے، یعنی نیکیوں کی بھی درجہ بندی ہے۔ کوئی نیکی بہت اعلیٰ درجے کی ہے تو کوئی نسبتاً نچلے درجے کی۔ لہٰذا مذکورہ لوگوں کے اعمال کی جزا دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ ان کے بلند ترین درجے کے اعمال کو مدِنظر رکھے گا اور ان ہی اعمال کی مطابقت سے جنت میں انہیں مقام و مرتبہ عطا فرمائے گا، جبکہ ان کے بُرے اعمال کے منفی اثرات سے انہیں پاک کر دے گا۔

آیات ۳۶ تا ۴۱

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ۭ وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝۳۶ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِي انْتِقَامٍ ۝۳۷ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۭ قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ۭ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۭ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝۳۸ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۳۹ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝۴۰ اِنَّآ

اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالۡحَقِّ‌ۚ فَمَنِ اهۡتَدٰى فَلِنَفۡسِهٖ‌ۚ وَمَنۡ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيۡهَا‌ۚ وَمَاۤ اَنۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِوَكِيۡلٍ ﴿۴۱﴾ ع

آیت ۳۶ ﴿اَلَيۡسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبۡدَهٗ‌ؕ﴾ ''کیا اللہ کافی نہیں ہے اپنے بندے کے لیے؟''

یہاں بالخصوص نبی اکرم ﷺ اور تبعاً اہلِ ایمان کی تسلی مقصود ہے کہ آپ لوگ مطمئن رہیں' اللہ تعالیٰ آپ کی مدد اور حفاظت کے لیے کافی ہے۔ لیکن بات میں زور پیدا کرنے کے لیے سوالیہ انداز اختیار فرمایا گیا ہے۔

﴿وَيُخَوِّفُوۡنَكَ بِالَّذِيۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ‌ؕ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ کو ڈراتے ہیں اُن سے جو اُس کے علاوہ (ان کے معبود) ہیں۔''

یہ لوگ اپنے جھوٹے معبودوں کی طرف سے آپ ﷺ کو دھمکیاں دیتے ہیں کہ آپ پر ان کی کوئی پھٹکار پڑ جائے گی۔ اسی طرح سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی آپؑ کی قوم نے دھمکی دی تھی کہ آپ نے ہمارے سارے معبودوں کی نفی کر کے انہیں ناراض کر دیا ہے' اب آپ پر ان کی پھٹکار پڑے گی اور ان کی طرف سے آپ کی پکڑ ہوگی۔ ان کے جواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا تھا (الانعام:۸۱) کہ ''میں ان سے کیونکر ڈروں جن کو تم نے شریک ٹھہرایا ہے جبکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے اللہ کے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہرایا ہے جن پر اُس نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی!'' یعنی بدبختو! مجھے تم ان پتھر کے بُتوں سے کیا ڈراتے ہو' جب کہ ڈرنا تو تم لوگوں کو چاہیے کہ تم اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہو!

﴿وَمَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ هَادٍ ﴿۳۷﴾﴾ ''اور جس کو اللہ گمراہ کر دے تو اُس کے لیے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے۔'' جس کی گمراہی پر اللہ تعالیٰ مہر لگا دے اس کی راہنمائی کرنے والا کوئی نہیں۔

آیت ۳۷ ﴿وَمَنۡ يَّهۡدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ مُّضِلٍّ‌ؕ﴾ ''اور جس کو اللہ ہدایت دے دے تو اُسے گمراہ کرنے والا کوئی نہیں۔''

﴿اَلَيۡسَ اللّٰهُ بِعَزِيۡزٍ ذِى انۡتِقَامٍ ﴿۳۷﴾﴾ ''تو کیا اللہ زبردست' انتقام لینے والا نہیں ہے؟''

آیت ۳۸ ﴿وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ‌ؕ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو تو وہ یقیناً یہی کہیں گے کہ اللہ نے!''

﴿قُلۡ اَفَرَءَيۡتُمۡ مَّا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ اَرَادَنِىَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلۡ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ﴾ ''تو ان سے کہیے کہ ذرا غور کرو! جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا' اگر اللہ نے میرے لیے کسی تکلیف کا فیصلہ کر لیا ہے تو کیا وہ (تمہارے معبود) اُس تکلیف کو دور کر سکیں گے؟''

دراصل مشرکینِ مکہ اللہ تعالیٰ کو سب سے بڑے معبود کے طور پر تو مانتے تھے لیکن ساتھ ہی انہوں نے بہت سے چھوٹے معبود بھی بنا رکھے تھے۔ چنانچہ اس آیت میں ان کے اسی عقیدے کے مطابق ایک منطقی سوال کیا گیا ہے کہ اگر تمہارا بڑا معبود ''اللہ'' کسی معاملے میں کوئی فیصلہ کر لے تو اس کے بعد کیا اس بڑے کا حکم چلتا ہے یا اس کے مقابلے میں تمہارے یہ چھوٹے معبود بھی اپنی مَن مرضی کرتے ہیں؟ اور اگر بالفرض اللہ تعالیٰ نے میرے لیے کسی ضرر کا فیصلہ کر لیا ہے تو کیا تمہارے یہ معبود اس کے اس فیصلے کے آڑے آ سکتے ہیں؟

﴿اَوْ اَرَادَنِیْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ﴾ ''یا اگر اُس نے میرے لیے رحمت کا کوئی فیصلہ کرلیا ہے تو کیا وہ اُس کی رحمت کو روک سکتے ہیں؟''

﴿قُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ عَلَیْهِ یَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۳۸﴾﴾ ''آپؐ کہہ دیجیے کہ میرے لیے تو اللہ ہی کافی ہے! اور اُسی پر توکّل کرتے ہیں توکّل کرنے والے۔''

آیت ۳۹ ﴿قُلْ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ﴾ ''آپؐ کہیے کہ اے میری قوم کے لوگو! تم اپنی جگہ پر جو کر سکتے ہو کرلو'' تم لوگ اپنی پوری قوت مجتمع کرلو اور پھر میرے خلاف جو تدبیریں بروئے کار لا سکتے ہو' جو سازشیں کر سکتے ہو اور جو اقدام کر سکتے ہو کر گزرو!

﴿اِنِّیْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾﴾ ''میں بھی اپنی سی محنت کر رہا ہوں' پس عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔''

آیت ۴۰ ﴿مَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ وَیَحِلُّ عَلَیْهِ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ ﴿۴۰﴾﴾ ''کہ کس پر آتا ہے وہ عذاب جو اُسے رسوا کر دے اور اُس پر وہ عذاب نازل ہو جائے جو ہمیشہ رہنے والا ہو!''

آیت ۴۱ ﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ پر یہ کتاب نازل کر دی ہے لوگوں کے لیے حق کے ساتھ۔''

﴿فَمَنِ اهْتَدٰی فَلِنَفْسِهٖ ۚ﴾ ''تو جو کوئی ہدایت کا راستہ اختیار کرتا ہے وہ اپنے ہی بھلے کے لیے کرتا ہے۔''

﴿وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا ۚ﴾ ''اور جو کوئی گمراہی اختیار کرتا ہے تو اس کا وبال اُسی پر آئے گا۔''

﴿وَمَاۤ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِوَكِیْلٍ ﴿۴۱﴾﴾ ''اور آپ ان کے ذمہ دار نہیں ہیں۔''

آپ ﷺ ان لوگوں کے انجام کے بارے میں جوابدہ نہیں ہیں۔ آپؐ کی ذمہ داری ان تک اللہ کا پیغام پہنچانے کی حد تک ہے اور قیامت کے دن اسی کے بارے میں آپؐ سے پوچھا جائے گا۔

آیات ۴۲ تا ۵۲

اَللّٰهُ یَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا ۚ فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰى عَلَیْهَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا یَمْلِكُوْنَ شَیْـًٔا وَّلَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۴۳﴾ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِیْعًا ؕ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۵﴾ قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَیْنَ عِبَادِكَ فِیْ مَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّ

مِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ۝ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ۡ ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ ۭ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۭ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ اَوَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ ع

آیت ۴۲ ﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا﴾ ''اللہ قبض کر لیتا ہے جانوں کو اُن کی موت کے وقت''

﴿وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ﴾ ''اور جن کی موت نہیں آئی ہوتی اُن کو بھی اُن کی نیند کی حالت میں۔''

يَتَوَفّٰى (فعل مضارع) وفی مادہ سے باب تفعّل ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کو پورا پورا قبضے میں لے لینا۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۵۵ میں یہ لفظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے آیا ہے اور وہاں لغوی اعتبار سے اس کی تشریح کی جا چکی ہے۔ اس کے بعد قرآن حکیم کے اس مطالعہ کے دوران جہاں بھی اس مادہ سے کوئی لفظ آیا میں نے خصوصی طور پر اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس لفظ کی بنیاد پر قادیانیوں نے لوگوں کے ذہنوں میں جو اشکالات پیدا کر رکھے ہیں ان کا منطقی جواب مل سکے۔ چنانچہ اس کا مفہوم یوں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی موت کے وقت اُن کی جانوں اور اُن کے شعور کو قبض کر لیتا ہے۔

نیند کی کیفیت میں انسان کا فہم و شعور اور اختیار و ارادہ سلب کر لیا جاتا ہے مگر روح موجود رہتی ہے۔ جبکہ موت کی حالت میں روح اور شعور دونوں چلے جاتے ہیں، صرف جسم پیچھے رہ جاتا ہے۔ چونکہ اس مادے میں کسی چیز کو مکمل اور پورے کا پورا لینے کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لیے لفظ تَوَفّی کا بتمام و کمال اطلاق تو حضرت مسیح علیہ السلام کے (روح، شعور اور جسم سمیت) رفعِ آسمانی کے حوالے سے ہوتا ہے۔ جبکہ نیند کے حوالے سے یہ لفظ استعارۃً بولا جاتا ہے۔

﴿فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ﴾ ''تو جس کی موت کا وہ فیصلہ کر چکا ہو اُس کو اپنے پاس روکے رکھتا ہے اور دوسروں کو واپس بھیج دیتا ہے ایک وقتِ معیّن تک کے لیے۔''

یعنی سونے والا جب نیند سے بیدار ہوتا ہے تو اُس کا فہم و شعور اور اختیار و ارادہ واپس آ جاتا ہے اور ایک وقتِ معیّن یعنی اس کی موت تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ انسان کو ہر روز موت اور مرنے کے بعد اٹھائے جانے کا مشاہدہ کراتا رہتا ہے۔

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝﴾ ''یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔''

آیت ۴۳ ﴿اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَاۗءَ ۭ﴾ ''کیا انہوں نے اللہ کے سوا کوئی سفارشی بنا رکھے ہیں؟''

﴿قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ۝﴾ ''(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ ان سے کہیے اگرچہ انہیں

سرے سے کوئی اختیار ہی نہ ہو اور نہ ہی انہیں کچھ سمجھ ہو (پھر بھی وہ تمہاری شفاعت کریں گے)؟''

آیت ﴿ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ۭ ﴾ ''آپ کہیے کہ شفاعت کُل کی کُل اللہ کے اختیار میں ہے۔''

قیامت کے دن جو کوئی بھی کسی کی شفاعت کرے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ہی کرے گا' اور پھر کسی شفاعت کا قبول کرنا یا نہ کرنا بھی اُسی کے اختیار میں ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے کوئی بات اللہ سے منوالے۔

﴿ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ ''آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اُسی کے لیے ہے۔ پھر تم اُسی کی طرف لوٹا دیے جاؤ گے۔''

آیت ﴿ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ ﴾ ''اور جب ذکر کیا جاتا ہے اکیلے اللہ کا تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل کُڑھنے لگتے ہیں۔''

یہ اصلاً تو کُفّار کا ذکر ہے' مگر مسلمانوں میں سے بھی جو مشرکانہ ذوق رکھتے ہیں ان کا یہی حال ہے کہ اگر کہیں صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کی بات ہو رہی ہو تو انہیں یہ اچھا نہیں لگتا۔ کسی تقریر یا وعظ میں اگر ساری گفتگو توحید پر ہی ہو تو عام طور پر لوگ گھبرا جاتے ہیں کہ یہ کیا بات ہوئی؟ یہ کیسی تقریر ہے جس میں نہ تو اولیاء اللہ کی کرامات کا ذکر کیا جا رہا ہے اور نہ ہی شانِ نبوت بیان ہو رہی ہے!

﴿ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴾ ''اور جب اُس کے سوا دوسروں کا ذکر کیا جاتا ہے تب وہ خوش ہو جاتے ہیں۔''

آیت ﴿ قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ﴾ ''آپ کہیے: اے اللہ! آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے! غائب اور حاضر کے جاننے والے!''

﴿ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴾ ''یقیناً تُو فیصلہ کرے گا اپنے بندوں کے مابین اُن تمام چیزوں میں جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔''

آیت ﴿ وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْۗءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ ﴾ ''اور اگر ان ظالموں کے پاس وہ سب کچھ ہوتا جو بھی زمین میں ہے اور اس کے ساتھ اتنا اور بھی ہوتا تو وہ قیامت کے دن بُرے عذاب سے بچنے کے لیے وہ سب فدیہ میں دے دیتے۔''

روزِ محشر اگر ان کے پاس تمام روئے زمین کی دولت ہو بلکہ اتنی اور بھی ہو تو وہ چاہیں گے کہ وہ سب کچھ دے دیں اور انہیں کسی طرح جہنّم کے عذاب سے بچا لیا جائے۔ انسان کی اس کیفیت کا مشاہدہ تو یہاں دنیا میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ جب کبھی انسان کی جان پر بن جاتی ہے تو وہ ایک گھونٹ پانی کے لیے اپنا سب کچھ دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ بہرحال یہاں یہ اسلوب صرف انسانوں کے سمجھانے کے لیے آیا ہے' ورنہ اُس دن نہ تو کسی کے پاس کچھ دینے کو ہوگا اور نہ ہی کوئی کسی کو کچھ دے سکے گا۔

﴿ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ﴾ ''اور (اُس روز) اُن کے سامنے اللہ کی طرف سے وہ کچھ آ جائے گا جس کا انہیں گمان بھی نہیں تھا۔''

آج وہ سمجھتے ہیں کہ جہنم اور اس کے عذابوں کی حقیقت کچھ بھی نہیں' بلکہ ان کا خیال ہے کہ جس طرح بچوں کو کوئی بات منوانے کے لیے فرضی چیزوں سے ڈرایا جاتا ہے اسی طرح ہمیں بھی خالی ڈراوے دیے جا رہے ہیں اور جہنم کا 'ہوا' دکھایا جا رہا ہے۔ لیکن اُس دن جہنم کو اس کے تمام تر عذابوں اور سختیوں کے ساتھ ان کے سامنے لایا جائے گا اور پھر ان سے پوچھا جائے گا: ﴿اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ؕ﴾ (الانعام: ۳۰) کہ جو کچھ اب تم اپنے سامنے دیکھ رہے ہو کیا یہ حقیقت نہیں؟ تو اُس وقت وہ تسلیم کریں گے کہ ہاں کیوں نہیں' ہمارے پروردگار کی قسم! واقعی یہ تو ایک حقیقت ہے۔

آیت ۴۸ ﴿وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۴۸﴾ ''اور ان کے سامنے آ جائیں گے اُن کی کمائی کے سارے بُرے نتائج اور ان کو گھیرے میں لے لے گی وہ چیز جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔''

آیت ۴۹ ﴿فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ۚ﴾ ''تو جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے''

﴿ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ﴾ ''پھر جب ہم اسے لپیٹ دیتے ہیں اپنی نعمت میں''

﴿قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ ؕ﴾ ''تو وہ کہتا ہے مجھے تو یہ ملا ہے اپنے علم کی بنیاد پر۔''

وہ کہتا ہے کہ یہ تو میری سمجھ' ذہانت و فطانت اور منصوبہ بندی کا کمال ہے۔ میں نے بہت پہلے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ عنقریب اس چیز کی ڈیمانڈ آنے والی ہے' چنانچہ میں نے بروقت فیکٹری لگا لی اور یوں میرے وارے نیارے ہو گئے۔ یہ مضمون سورۃ القصص کے آٹھویں رکوع میں قارون کے حوالے سے بڑی وضاحت کے ساتھ آ چکا ہے۔ اس نے بھی اپنی دولت کے بارے میں کہا تھا: ﴿اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ﴾ (آیت ۷۸) کہ یہ سب کچھ تو مجھے میری ذہانت و فطانت کی وجہ سے ملا ہے۔

﴿بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۴۹﴾ ''بلکہ یہ تو ایک آزمائش ہے' لیکن ان کی اکثریت علم نہیں رکھتی۔''

آیت ۵۰ ﴿قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ ''ان سے پہلوں نے بھی یہی بات کہی تھی''

مثلاً قارون بھی ایسے ہی دعوے کیا کرتا تھا۔

﴿فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۵۰﴾ ''تو جو کچھ بھی انہوں نے کمائی کی تھی وہ ان کے کسی کام نہ آ سکی۔''

جب اللہ تعالیٰ نے قارون کو اس کے محل سمیت زمین میں دھنسا دیا تو اپنی اس دولت کے بَل پر وہ اللہ کے عذاب سے بچ نہ پایا۔

آیت ۵۱ ﴿فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۚ﴾ ''پس انہیں اس کے بدنتائج پہنچ گئے جو وہ کماتے تھے۔''

﴿وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَآءِ﴾ ''اور ان میں سے بھی جو لوگ ظلم (شرک) کی روش اختیار کریں گے''

﴿سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝۵۱﴾ ''ان کو پہنچ کر رہیں گے ان کے کرتوتوں کے بُرے نتائج' اور وہ (اللہ کو) عاجز کر دینے والے نہیں ہیں۔''

آیت ۵۲ ﴿اَوَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ﴾ ''کیا یہ جانتے نہیں کہ اللہ ہی ہے جو کشادہ کر دیتا ہے رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے (جس کے لیے چاہتا ہے)۔''

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۵۲﴾ ''یقیناً اس میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو ماننے والے ہیں۔''

آیات ۵۳ تا ۶۳

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾ وَ اَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَ اَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَ اتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَ اِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۵۷﴾ اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَ كُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۹﴾ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۶۰﴾ وَ يُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۫ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۱﴾ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۫ وَّ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۶۲﴾ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۳﴾ ع

آیت ۵۳ ﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے: اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے!‘‘

قُلْ يٰعِبَادِيَ کا اندازِ تخاطب اس سورت میں یہاں دوسری مرتبہ آیا ہے۔ اس سے پہلے آیت ۱۰ میں ارشاد ہوا: ﴿قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ؕ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے: اے میرے وہ بندو جو ایمان لائے ہو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو‘‘۔ اب یہاں گویا پھر سے یاددہانی کرائی جا رہی ہے کہ اب تک کی زندگی اگر تم لوگوں نے غفلت میں گزار دی ہے تو اب بھی وقت ہے‘ اب بھی ہوش میں آ جاؤ! اور اگر تم نے اب تک اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے تو:

﴿لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ﴾ ’’اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا‘ یقیناً اللہ سارے گناہ معاف فرما دے گا۔‘‘(۷)

لیکن اس معافی کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ اُس کے حضور خلوصِ دل سے توبہ کرو‘ حرام خوری چھوڑ دو‘ معصیت کی روش ترک کر دو اور آئندہ کے لیے اپنے اعمال کو درست کر لو۔ ایسی توبہ کا انعام اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ملے گا کہ تمہارے پچھلے تمام گناہ معاف ہو جائیں گے۔ سورۃ الفرقان میں اس بارے میں بہت واضح حکم موجود ہے: ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ

۷۔ توبہ کے موضوع پر یہ قرآن مجید کی عظیم ترین آیت ہے ـــــ توبہ ۔کے حوالے سے ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی کتاب ’’توبہ کی عظمت اور تاثیر‘‘ کا مطالعہ ان شاء اللہ بہت مفید رہے گا۔ (مرتب)

یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۷۰﴾ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ یَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾

''سوائے اُس کے جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اس نے نیک عمل کیے' تو ایسے لوگوں کی بُرائیوں کو اللہ نیکیوں سے بدل دیتا ہے' اور اللہ غفور ہے' رحیم ہے۔ اور جس نے توبہ کی اور نیک اعمال کیے تو یہی شخص توبہ کرتا ہے اللہ کی جناب میں جیسا کہ توبہ کرنے کا حق ہے''۔ چنانچہ سابقہ گناہوں کی معافی توبہ سے ممکن ہے' لیکن توبہ وہی قبول ہوگی جس کے بعد انسان کے اعمال درست ہو جائیں' اور اگر ایسا نہ ہوا تو رسمی اور زبانی توبہ بے معنی ہے۔

﴿اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۵۳﴾﴾ ''یقیناً وہ بہت بخشنے والا' نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

آیت ۵۴ ﴿وَاَنِیْبُوْۤا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ﴾ ''اور اپنے رب کی طرف رجوع کرو' اور اُس کے فرمانبردار بن جاؤ''

﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۵۴﴾﴾ ''اس سے پہلے کہ تم پر عذاب مسلط ہو جائے' پھر تمہاری کہیں سے مدد نہیں کی جائے گی۔''

آیت ۵۵ ﴿وَاتَّبِعُوْۤا اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ ''اور پیروی کرو اس کے بہترین پہلو کی جو نازل کیا گیا ہے تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے''

یہ مضمون اس سے پہلے آیت ۱۸ میں بھی آ چکا ہے' وہاں پر ﴿فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ گویا قرآن جو راستہ تم لوگوں کو دکھا رہا ہے اس میں بھی مختلف درجات ہیں۔ ان درجات کا ذکر سورۃ التوبہ کی اس آیت میں بھی ہوا ہے: ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ﴾ (آیت ۱۰۰) ''اور پہلے پہل سبقت کرنے والے مہاجرین اور انصار میں سے' اور وہ جنہوں نے ان کی پیروی کی نیکی کے ساتھ''۔ سورۃ النساء کی آیت ۶۹ میں بھی چار مدارج کا ذکر ہے۔ ان میں پہلا درجہ انبیاء کرام علیہم السلام کا ہے' دوسرے درجے پر صِدِّیقین ہیں' تیسرے درجے پر شہداء اور چوتھے پر صالحین۔ سورۃ الحدید میں یہ مضمون زیادہ واضح انداز میں بیان ہوا ہے۔ بہرحال آیت زیر مطالعہ میں قرآن کے اتباع میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کو پانے کی ترغیب دی گئی ہے۔

﴿مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۵﴾﴾ ''اس سے پہلے کہ تم پر عذاب اچانک آ دھمکے اور تمہیں اس کا گمان تک نہ ہو۔''

آیت ۵۶ ﴿اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ یّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْۢبِ اللّٰهِ﴾ ''مبادا کہ اُس وقت کوئی جان یہ کہے کہ ہائے افسوس اس کوتاہی پر جو مجھ سے اللہ کی جناب میں ہوئی''

ہائے میری بدقسمتی کہ میں زندگی بھر اپنے دھندوں میں اس طرح مگن رہا کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کو پہچان ہی نہ سکا۔ میرے سامنے اللہ کا دین مغلوب تھا مگر میں اس کی سربلندی کے لیے جدوجہد کرنے کے بجائے اپنی عیش و عشرت کے مواقع ڈھونڈنے اور اپنا معیارِ زندگی بلند کرنے میں لگا رہا۔ میں نے دنیا کے مال و متاع کو ہی اپنا معبود سمجھ لیا اور عمر بھر اسی کے لیے اپنا تن من دھن کھپاتا رہا۔

﴿وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِیْنَ ﴿۵۶﴾﴾ ''اور میں تو مذاق اڑانے والوں ہی میں شامل رہا۔''

مَیں نے اللہ تعالیٰ' اُس کے دین اور آخرت کی باتوں کو نہ کبھی دھیان سے سنا اور نہ ہی کبھی سنجیدگی سے ان پر غور کیا' بلکہ میں تو ہمیشہ ان باتوں کا مذاق ہی اڑاتا رہا۔

آیت ۵۷ ﴿اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۵۷﴾ ''یا وہ یہ کہے کہ اگر اللہ نے مجھے ہدایت دی ہوتی تو میں بھی متقین میں سے ہو جاتا!''

اگر کوئی شخص ایسے کہے گا تو گویا وہ اپنے اس اختیار کی نفی کرے گا جو اُسے انسان کی حیثیت سے دنیا میں عطا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تو اسے اشرف المخلوقات بنایا تھا اور اختیار دیا تھا: ﴿اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝۳﴾ (الدھر) کہ چاہو تو میرے شکر گزار بندے بن کر رہو اور چاہو تو نافرمان اور ناشکرے بن جاؤ۔

آیت ۵۸ ﴿اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۵۸﴾ ''یا جب وہ عذاب کو دیکھے تو یوں کہے کہ اگر مجھے ایک بار لوٹنا نصیب ہو جائے تو میں محسنین میں سے ہو جاؤں!''

یعنی اگر مجھے ایک دفعہ دنیا میں دوبارہ جانے کا موقع مل جائے تو مَیں صرف مسلم' صرف مؤمن یا صرف متقی ہی نہیں بنوں گا بلکہ محسنین کی صف میں جگہ بنا لوں گا۔

آیت ۵۹ ﴿بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۵۹﴾ ''کیوں نہیں! تیرے پاس میری آیات آئی تھیں تو تُو نے ان کو جھٹلا دیا تھا اور تکبر کیا تھا اور تُو کافروں میں سے تھا۔''

آیت ۶۰ ﴿وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ؕ﴾ ''اور قیامت کے دن تم دیکھو گے اُن لوگوں کو جنہوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا تھا کہ اُن کے چہرے سیاہ ہوں گے۔''

﴿اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝۶۰﴾ ''تو کیا جہنّم ہی میں ٹھکانہ نہیں ہے ایسے متکبرین کا؟''

آیت ۶۱ ﴿وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۚ﴾ ''اور اللہ نجات دے گا اُن لوگوں کو جنہوں نے تقویٰ کی روش اختیار کی تھی (اور انہیں پہنچا دے گا) ان کی کامیابی کی جگہوں پر۔''

جنّت میں ان کے درجات اور مراتب کے مطابق اللہ تعالیٰ انہیں ان کے مقامات تک پہنچا دے گا۔ انبیاء کرام علیہم السلام اپنے مراتب پر پہنچیں گے اور اسی طرح صدیقین' شہداء اور صالحین اپنے اپنے مقامات کو پالیں گے۔

﴿لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۶۱﴾ ''نہ اُن کو کوئی تکلیف چھو سکے گی اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔''

آیت ۶۲ ﴿اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۫ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝۶۲﴾ ''اللہ ہی ہر شے کا خالق ہے' اور وہی ہر چیز پر نگہبان ہے۔''

آیت ۶۳ ﴿لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''اُسی کے لیے ہیں تمام کنجیاں آسمانوں کی اور زمین کی۔''

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۶۳﴾ ''اور جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا وہی ہیں گھاٹے میں رہنے والے۔''

اب اس سورت کے آخری دو رکوع ہمارے زیر مطالعہ ہوں گے۔ یہ دونوں رکوع اس لحاظ سے بہت اہم ہیں کہ ان میں توحید فی العبادت کا مضمون بہت پُرجلال انداز میں بیان ہوا ہے۔

آیات ۶۴ تا ۷۰

قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَ لَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَ اِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۵﴾ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۶﴾ وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ السَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ﴿۶۸﴾ وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَ وُضِعَ الْكِتٰبُ وَ جِايْۗءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۶۹﴾ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۰﴾ ع

آیت ۶۴ ﴿قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ﴿۶۴﴾﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجئے کہ اے جاہلو! کیا تم مجھے بھی یہ مشورہ دے رہے ہو کہ میں اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کروں؟''

یہ انداز اس آیت کے علاوہ پورے قرآن میں اور کہیں نہیں پایا جاتا اور یہ خاص اسلوب دراصل مشرکینِ مکہ کے اس دباؤ کا جواب ہے جو انہوں نے حضور ﷺ پر ''کچھ لو اور کچھ دو'' کی پالیسی اختیار کرنے کے لیے ڈال رکھا تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ آپ اپنے موقف میں کچھ نرمی پیدا کریں اور ہمارے معبودوں میں سے کچھ کو تسلیم کر لیں تو اس کے جواب میں ہم بھی آپ کی کچھ باتیں مان لیں گے بلکہ آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیں گے۔ اس طرح ایک درمیانی راہ نکل آئے گی اور جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ ان کے اس مطالبے کا جواب بہت سخت انداز میں دیا جا رہا ہے۔ واضح رہے کہ عربی میں 'جاہل' اس شخص کو کہتے ہیں جو علم اور عقل کے بجائے جذبات اور خواہشات کی پیروی کرتا ہے۔

آیت ۶۵ ﴿وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) آپ کی طرف تو وحی کی جا چکی ہے اور جو (رسول) آپ سے پہلے تھے اُن کی طرف بھی (وحی کر دی گئی تھی)''

آگے اس وحی کا لُبِّ لُباب بیان کیا جا رہا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

﴿لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۵﴾﴾ ''اگر آپ بھی (بالفرض) شرک کریں گے تو آپ کے سارے اعمال بھی ضائع ہو جائیں گے اور آپ بھی نہایت خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔''

یہ سخت اسلوب دراصل حضور ﷺ کے لیے نہیں بلکہ مشرکین کے لیے ہے۔ آپؐ کو مخاطب کر کے دراصل انہیں سنانا مقصود ہے

کہ قانونِ خداوندی اس سلسلے میں بہت واضح اور اٹل ہے۔ شرک جو کوئی بھی کرے گا اُسے اس کی سزا ضرور ملے گی' کسے باشد! اللہ کا قانون کسی کے لیے تبدیل نہیں کیا جاتا: ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۶۲﴾﴾ (الاحزاب) ''اور تم ہرگز نہیں پاؤ گے اللہ کے طریقے میں کوئی تبدیلی!''

آیت ۶۶ ﴿بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۶﴾﴾ ''بلکہ آپؐ صرف اللہ ہی کی بندگی کیجیے اور بن جایئے شکر گزار بندوں میں سے!''

آیت ۶۷ ﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ﴾ ''اور انہوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جیسے کہ اس کی قدر کا حق تھا''

یہ لوگ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت' اُس کی قوت اور اُس کی صفات کا اندازہ نہیں کر پائے۔ اس معاملے میں یہ بہت اہم نکتہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اگرچہ ہم انسان اللہ تعالیٰ کے علم' اُس کی قدرت اور اُس کی دوسری صفات کو ناپ تول نہیں سکتے' اگر ہم اس کی کوشش بھی کریں گے تو یوں سمجھیں کہ اس کوشش کی مثال سنار کی ترازو میں نُنوں کے وزن کو تولنے جیسی ہوگی' لیکن ہم یہ تو جان سکتے ہیں کہ وہ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ہستی ہے۔ اس آیت کے مصداق وہ لوگ ہیں جن کے اذہان اللہ کو عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ماننے سے بھی عاجز ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ کی قدرت اور عظمت کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

﴿وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ۭ﴾ ''اور زمین پوری کی پوری اُس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور آسمان اُس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔''

کیا اس کیفیت کا اندازہ کرنا انسانی فکر اور سوچ کے بس کی بات ہے؟ آسمانوں کی پہنائیاں! کائنات میں موجود کہکشاؤں' ستاروں اور سیاروں کی تعداد! ایک ایک کہکشاں کی وسعت! ایک ایک ستارے کی جسامت! ان کہکشاؤں اور ستاروں کے باہمی فاصلے! ان فاصلوں اور وسعتوں کو ناپنے کے لیے انسان کے فرض کیے ہوئے نوری سالوں کے پیمانے! ایک نوری سال کے فاصلے کا تصور! اور پھر اربوں کھربوں نوری سالوں کی وسعتوں کا تخیل! اور پھر یہ تصور کہ یہ سب کچھ لپٹا ہوا ہوگا اللہ تعالیٰ کے داہنے ہاتھ میں!! بہرحال یہ ایسا موضوع ہے جس پر سوچتے ہوئے انسانی فکر اور اس کی قوتِ متخیلہ بھی تھک ہار کر رہ جاتی ہے۔ اور انسان کی عقل جو اللہ کی تخلیق کی ہوئی کائنات کے کسی ایک کونے کا احاطہ کرنے سے بھی عاجز ہے' وہ اللہ کی قدرت کا کیا اندازہ کرے گی!

﴿سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۷﴾﴾ ''وہ پاک ہے اور بہت بلند و بالا اُس تمام شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔''

آیت ۶۸ ﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ﴾ ''اور صور میں پھونکا جائے گا تو بے ہوش ہو جائیں گے جو کوئی بھی ہیں آسمانوں میں اور زمین میں' سوائے اُن کے جنہیں اللہ چاہے گا۔''

یہ منظر بہت دہشت ناک ہوگا۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ فرشتوں کے علاوہ باقی تمام فرشتے بھی صور کی اس آواز سے بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے۔ دراصل یہ تین نفخے ہوں گے۔ پہلا نفخہ وہ ہوگا جسے قرآن میں ''السَّاعة'' بھی کہا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں شدید زلزلے' ہلچل اور طوفان کی صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ سورج اور چاند آپس میں ٹکرا جائیں گے۔ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگیں گے۔ پھر دوسرا نفخہ ہوگا جس کے نتیجے میں تمام جانداروں پر موت طاری ہو جائے گی۔ اس آیت میں اسی دوسرے نفخہ کا ذکر ہے۔ اس کے بعد نفخہ ثالثہ کی کیفیت یوں ہوگی:

﴿ثُمَّ نُفِخَ فِيهِ أُخْرَىٰ فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنظُرُونَ ﴿٦٨﴾﴾ ''پھر اس (صور) میں دوبارہ پھونکا جائے گا تو اچانک وہ سب کے سب کھڑے ہو جائیں گے دیکھتے ہوئے۔''

اس تیسرے نفخ کے نتیجے میں تمام انسان دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔ یہ گویا بعث بعد الموت کا نفخہ ہوگا اور اسی کا نام قیامت (کھڑے ہونا) ہے۔

آیت ﴿وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا﴾ ''اور زمین جگمگا اُٹھے گی اپنے رب کے نُور سے''

اس وقت کی کیفیت کو سورۃ الفرقان میں یوں بیان فرمایا گیا ہے: ﴿وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَاءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلَائِكَةُ تَنزِيلًا ﴿٢٥﴾﴾ ''اور جس دن آسمان پھٹ جائے گا بادلوں کی مانند اور فرشتے نازل کیے جائیں گے لگاتار''۔ پھر اللہ تعالیٰ زمین پر نزول فرمائیں گے اور فرشتے صفیں باندھے نیچے اتریں گے: ﴿وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿٢٢﴾﴾ (الفجر)۔

﴿وَوُضِعَ الْكِتَابُ﴾ ''اور اعمال نامہ لا کر رکھ دیا جائے گا''

لوگوں کے اعمال نامے کا سرِ محشر لا کر رکھے جانے کی صورتِ حال کا نقشہ سورۃ الکہف کی آیت ۴۹ میں یوں کھینچا گیا ہے: ﴿وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَيَقُولُونَ يَا وَيْلَتَنَا مَالِ هَٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا﴾ ''اور رکھ دیا جائے گا اعمال نامہ، چنانچہ تم دیکھو گے مجرموں کو کہ وہ لرزاں و ترساں ہوں گے اس سے جو کچھ اس میں ہوگا اور کہیں گے: ہائے ہماری شامت! یہ کیسا اعمال نامہ ہے کہ اس نے نہ تو کسی چھوٹی چیز کو چھوڑا ہے اور نہ کسی بڑی کو، مگر اس کو محفوظ کر کے رکھا ہے''۔ اس کے بعد کی کیفیت کا نقشہ آگے دکھایا جا رہا ہے:

﴿وَجِيءَ بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ﴾ ''اور لائے جائیں گے انبیاء اور شہید''

یہاں ''شہید'' سے مراد اوّلاً تو رسول ہیں کہ وہ اپنی اپنی اُمتوں پر سب سے پہلے گواہی دیں گے۔ سورۃ الحج کی آخری آیت میں حضور ﷺ کی اپنی اُمت پر گواہی کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ﴾ ''تاکہ پیغمبر تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو''۔ لیکن یہاں انبیاء کے ذکر کے بعد شہید کا لفظ خصوصی طور پر اس لیے لایا گیا ہے کہ وہاں اُن لوگوں کو بھی گواہ کے طور پر بلایا جائے گا جو انبیاء و رسل علیہم السلام کی طرف سے تبلیغ کرتے رہے ہوں گے۔ جیسے عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم میں سے چھ چوٹی کے صحابہ وہ ہیں جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تبلیغ کے نتیجے میں ایمان لائے۔ اسی طرح حضور ﷺ نے بہت سے علاقوں اور قبیلوں کی خواہش پر اپنے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو قرآن اور دین کی تعلیم کے لیے بھیجا۔ ایسے مبلّغ اور معلّم صحابہؓ زیادہ تر اصحابِ صُفّہ رضی اللہ عنہم میں سے تھے۔ ان صحابہؓ نے حضور ﷺ کی طرف سے جن لوگوں کو دعوت دی تھی، قیامت کے دن اُن پر وہ گواہی دیں گے کہ اے اللہ! تیرے نبی ﷺ نے تیرے دین کا جو پیغام ہم تک پہنچایا تھا ہم نے وہ ان لوگوں تک پہنچا دیا تھا۔

پھر حضور ﷺ کے بعد دین کی دعوت و تبلیغ کی یہ ذمہ داری آپؐ کی اُمت کی طرف منتقل ہو گئی اور اس لحاظ سے آج ہم سب اس ذمہ داری کے مکلّف ہیں۔ چنانچہ ہمیں وہاں بطور گواہ بلایا جائے گا کہ محمد (ﷺ) کی طرف سے اللہ کا جو دین تم تک وراثتاً پہنچا تھا کیا تم لوگوں نے اسے آگے نوعِ انسانی تک پہنچا دیا تھا؟ اگر خدانخواستہ ہم یہ گواہی دینے میں ناکام رہے تو ان تمام لوگوں کی گمراہی اور ضلالت کا وبال بھی ہماری گردن پر آئے گا جو ہمارے حلقہ اثر اور دائرۂ اختیار میں تھے اور ہم انہیں دعوت نہیں دے سکے تھے۔ لیکن

اگر ہم نے اپنی استطاعت کے مطابق یہ حق ادا کر دیا ہوگا تو ہم اس گواہی سے سرخرو ہوں گے اور وہ لوگ اپنے اعمال کے لیے اللہ کے ہاں خود جوابدہ ہوں گے۔ بہر حال اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت کا منظر دکھایا گیا ہے جو سرِ محشر سجائی جائے گی۔ تمام بنی نوع انسان کا اعمال نامہ بھی لا کر اس عدالت کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ پھر انبیاء و رُسل علیہم السلام اور دوسرے گواہوں کو بھی لایا جائے گا۔

﴿وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٦٩﴾﴾ ''اور ان کے مابین فیصلہ کر دیا جائے گا حق کے ساتھ اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

آیت ۷۰ ﴿وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُونَ ﴿٧٠﴾﴾ ''اور پورا پورا دے دیا جائے گا ہر جان کو جو کچھ کہ اُس نے عمل کیا ہوگا' اور اللہ خوب جانتا ہے جو عمل یہ لوگ کر رہے ہیں۔''

اس موضوع سے متعلق قرآن مجید کے مختلف مقامات پر جو اشارے ملتے ہیں ان سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میدانِ حشر اسی زمین پر ہوگا۔ اس کے لیے زمین کو کھینچ کر پھیلا دیا جائے گا' جیسا کہ سورۃ الانشقاق کی اس آیت میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ﴿٣﴾﴾ پھر اسے بالکل ہموار اور چٹیل میدان کی شکل دے دی جائے گی' اس طرح کہ: ﴿لَا تَرَىٰ فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا ﴿١٠٧﴾﴾ (طٰہٰ) ''تم نہیں دیکھو گے اس میں کوئی ٹیڑھ اور نہ کوئی ٹیلا''۔ پھر یہیں پر اللہ تعالیٰ کا نزول ہوگا اور یہیں پر فرشتے اتریں گے: ﴿وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿٢٢﴾﴾ (الفجر) اور یہیں پر حساب کتاب ہوگا۔ گویا قصۂ زمین برسرِ زمین چکایا جائے گا۔

فیصلوں کے بعد اہلِ جنّت کو جنّت کی طرف لے جایا جائے گا اور اہلِ جہنّم کو جہنّم کی طرف۔ یہ میدانِ حشر کا آخری منظر ہوگا جس کا نقشہ اگلے رکوع میں بڑے پُرجلال انداز میں کھینچا جا رہا ہے۔ اس لحاظ سے یہ قرآن مجید کا خاص مقام ہے۔

آیات ۷۱ تا ۷۵

وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا فُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ
خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَتْلُونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِ رَبِّكُمْ وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ
هَٰذَا ۚ قَالُوا بَلَىٰ وَلَٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿٧١﴾ قِيلَ ادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ
خَالِدِينَ فِيهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ ﴿٧٢﴾ وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۖ
حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا
خَالِدِينَ ﴿٧٣﴾ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ
حَيْثُ نَشَاءُ ۚ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ﴿٧٤﴾ وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِّينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُونَ
بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْحَقِّ وَقِيلَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٧٥﴾

آیت ۷۱ ﴿وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا ۖ﴾ ''اور ہانک کر لے جائے جائیں گے کافر جہنّم کی طرف گروہ در گروہ۔''

اس طرح کہ ایک اُمّت کے بعد دوسری اُمّت اور پھر تیسری اُمّت۔ غرض تمام اُمتوں کے مجرم لوگ اپنے اپنے لیڈروں کی قیادت میں جہنّم کی طرف لے جائے جائیں گے۔ سورۂ ہود میں فرعون اور اُس کی قوم کے حوالے سے ایک نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے: ﴿يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾﴾ ''قیامت کے دن وہ آئے گا آگے چلتا ہوا اپنی قوم کے، پھر وہ آگ کے گھاٹ پر انہیں اتار دے گا۔ اور وہ بہت ہی بُرا گھاٹ ہے جس پر وہ اتارے جائیں گے''۔ تو یوں اہلِ جہنّم کو گروہ در گروہ جہنّم کی طرف ہانک کر لے جایا جائے گا۔

﴿حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا﴾ ''یہاں تک کہ جب وہ پہنچ جائیں گے جہنّم پر تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے''

جیسے جیل کے دروازے صرف نئے قیدیوں کے داخلے کے لیے ہی کھولے جاتے ہیں، اسی طرح جہنّم کے بند دروازے بھی مجرموں کی آمد پر ہی کھولے جائیں گے۔

﴿وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَاۤ﴾ ''اور اس کے داروغہ اُن سے کہیں گے''

ان مجرمین کی آمد پر جہنّم پر مامور فرشتے ان سے پوچھیں گے:

﴿اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ﴾ ''کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے رسول نہیں آئے تھے جو تمہیں سناتے تھے تمہارے رب کی آیات اور تمہیں خبردار کرتے تھے تمہاری آج کے دن کی اس ملاقات سے!''

﴿قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۱﴾﴾ ''وہ کہیں گے کیوں نہیں! لیکن کافروں پر عذاب کا حکم ثابت ہو کر رہا۔''

یعنی پیغمبروں نے تو دعوت و تبلیغ کا حق ادا کر دیا، لیکن یہ لوگ انکار اور کفر پر اڑے رہے اور یوں انہوں نے خود کو عذاب کا مستحق ثابت کر دکھایا۔

آیت ۷۲ ﴿قِيْلَ ادْخُلُوْۤا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۷۲﴾﴾ ''کہہ دیا جائے گا ان سے کہ داخل ہو جاؤ جہنّم کے دروازوں میں، اس میں ہمیشہ رہنے کے لیے۔ تو بہت بُرا ہے یہ ٹھکانہ متکبرین کا۔''

پیغمبروں کی دعوت کے جواب میں جو اکڑفوں تم لوگ دکھاتے رہے تھے اس کی وجہ سے آج تم اس انجام سے دوچار ہوئے ہو۔

آیت ۷۳ ﴿وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ؕ﴾ ''اور لے جایا جائے گا ان لوگوں کو جنّت کی طرف جو اپنے رب کا تقویٰ اختیار کیے رہے تھے گروہ در گروہ۔''

﴿حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا﴾ ''یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور اس کے دروازے (پہلے ہی) کھولے جا چکے ہوں گے''

یہاں پر ''و'' بہت معنی خیز ہے۔ اس ''و'' کی وجہ سے فقرے میں یہ مفہوم پیدا ہو رہا ہے کہ جنّت کے دروازے پہلے سے ہی

کھلے ہوں گے۔ یعنی اہلِ جنّت کا انتظار کھلے دروازوں کے ساتھ ہو رہا ہوگا۔ اس حوالے سے سورۂ صٓ کی آیت ۵۰ میں ﴿مُفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ۝۵۰﴾ کے الفاظ بھی اسی مفہوم کو واضح کرتے ہیں۔

﴿وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ﴾ ''اور اس کے داروغہ ان سے کہیں گے: آپ پر سلام ہو' آپ لوگ کتنے پاکباز ہیں!''

﴿فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ۝۷۳﴾ ''اب داخل ہو جایئے اس میں ہمیشہ ہمیش رہنے کے لیے۔''

آیت ۷۴ ﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ﴾ ''اور وہ کہیں گے کہ کُل حمد اور کُل شکر اُس اللہ کے لیے ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ پورا کر دیا''

﴿وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ﴾ ''اور ہمیں اس زمین کا وارث بنا دیا کہ اب ہم گھر بنا لیں جنّت میں جہاں چاہیں۔''

﴿فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝۷۴﴾ ''تو بہت ہی اچھا ہوگا اجر عمل کرنے والوں کا!''

گواہوں نے گواہیاں دے دیں' آخری فیصلے صادر کر دیے گئے' سزا پانے والوں کو جہنّم کی طرف بھیج دیا گیا' کامیاب ہونے والوں کو جنّت میں پہنچا دیا گیا۔

اب آخری آیت میں گویا عدالتِ محشر کا اختتامی منظر (ڈراپ سین) دکھایا جا رہا ہے:

آیت ۷۵ ﴿وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ﴾ ''اور تم دیکھو گے فرشتوں کو کہ وہ عرشِ الٰہی کو گھیرے ہوئے ہوں گے' اپنے ربّ کی تسبیح بیان کر رہے ہوں گے اُس کی حمد کے ساتھ۔''

﴿وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ﴾ ''اور ان کے مابین حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا''

یہاں پر بَيْنَهُمْ سے کچھ مفسرین نے تو انسان ہی مراد لیے ہیں اور ان کی رائے یہ ہے کہ یہاں گویا وہی بات دہرائی گئی ہے جو قبل ازیں چھٹے رکوع میں بایں الفاظ بیان ہو چکی ہے: ﴿وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝۶۹﴾۔ لیکن ایک دوسری رائے کے مطابق یہاں پر وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کے فیصلوں کے بعد فرشتوں کے درمیان بھی فیصلہ کر دیا جائے گا۔

قبل ازیں سورۂ صٓ کی آیت ۶۹ کے ضمن میں یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ فرشتے غافل ہستیاں ہیں۔ ان میں سے ہر کوئی اپنی سوچ اور اپنی رائے رکھتا ہے۔ اس بنا پر ان میں اختلافات بھی ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کے بارے میں بحث کرتے ہوئے ان میں سے ہر کوئی اپنی اپنی رائے دیتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے فلاں فیصلے میں یہ حکمت ہے' وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ اس جملے کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آخر میں فرشتوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کا بھی حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا۔

﴿وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۷۵﴾ ''اور پکارا جائے گا کہ کُل کی کُل حمد اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے!''

یعنی آخر میں وہی اللہ تعالیٰ کی جے بلند کی جائے گی کہ کُل شکر اور کُل تعریف اللہ کے لیے ہے' جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے!

سُوْرَۃُ الْمُؤْمِنِ

تمہیدی کلمات

سورۃ المؤمن کا دوسرا نام ''سورۂ غافر'' بھی ہے۔ غافر (معاف کرنے والا) اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے جو اس سورت کی تیسری آیت میں آیا ہے۔ اسی طرح اس سے اگلی سورت یعنی سورۂ حٰمٓ السّجدۃ کا دوسرا نام سورۂ فُصِّلَت ہے۔ ان دو سورتوں کے علاوہ کئی اور سورتیں بھی ایسی ہیں جن کے دو دو نام ہیں۔ مثلاً سورۂ بنی اسرائیل کا دوسرا نام سورۃ الاسراء ہے' جو اس کی پہلی آیت سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ سے لیا گیا ہے۔ عرب ممالک میں چھپنے والے قرآن مجید کے نسخوں میں ان سورتوں کے نام الاسراء' غافر اور فُصِّلَتْ ہی لکھے جاتے ہیں۔

جیسا کہ قبل ازیں سورۃ الزمر کے تعارف میں بھی ذکر ہو چکا ہے' سورۃ الزمر اور سورۃ المؤمن کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے۔ اس لحاظ سے ان میں ایک مشابہت یہ بھی ہے کہ دونوں کے آغاز کی آیات (سورۃ الزمر کی پہلی اور سورۃ المؤمن کی دوسری آیت) ایک جیسی ہیں' ان میں صرف ''الحکیم'' اور ''العلیم'' کا فرق ہے ـــــ سورۃ المؤمن ان سات سورتوں میں سے پہلی سورت ہے جن کا آغاز حٰمٓ سے ہوتا ہے۔ اس نسبت سے ان سورتوں کو ''حوامیم'' کہا جاتا ہے۔ ان میں سے سورۃ الشوریٰ کو البتہ یہ تخصیص بھی حاصل ہے کہ اس کی دوسری آیت بھی حروفِ مقطعات (عٓسٓقٓ) پر مشتمل ہے اور یوں اس کے آغاز میں پانچ حروفِ مقطعات ہیں۔ سورۃ المؤمن کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں جو اسمائے حُسنیٰ آئے ہیں ان میں سے اکثر مرکب اضافی کی صورت میں ہیں۔ مثلاً غَافِرِ الذَّنْبِ' قَابِلِ التَّوْبِ اور شَدِیْدِ الْعِقَابِ۔

سورۃ الزمر سے مکّی سورتوں کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے ان کا مرکزی مضمون یا عمود توحید ہے۔ البتہ اس کے ساتھ ساتھ ان سب سورتوں میں مکّی سورتوں کے عام مضامین مثلاً آخرت' رسالت' تذکیر بآلاء اللہ اور تذکیر بایّام اللہ بھی تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ علاوہ ازیں اس گروپ کی پہلی چار سورتیں (سورۃ الزمر تا سورۃ الشوریٰ) ''توحیدِ عملی'' کے حوالے سے بہت اہم ہیں۔

''توحیدِ عملی'' سے متعلق تفصیلی گفتگو اس سے پہلے سورۃ الزمر کے تمہیدی کلمات میں بھی کی جا چکی ہے۔ ہمارے ہاں خطبۂ جمعہ میں بالعموم یہ الفاظ پڑھے جاتے ہیں: یَا اَیُّھَا النَّاسُ وَحِّدُوا اللّٰہَ! یعنی اے لوگو! توحید کو اور کامل کرو' اور کامل کرو اور توحید اپنے عمل میں لاؤ! اس لیے کہ توحید صرف ایک عقیدہ یا زبان سے چند الفاظ ادا کر دینے کا ہی نام نہیں' بلکہ یہ بندۂ مؤمن کی عملی زندگی کا منشور ہے۔ چنانچہ ایک بندۂ مؤمن کو اس منشور کا ایک ایک نکتہ ہر وقت اپنے ذہن میں مستحضر رکھنے اور جہادِ زندگانی کے گھمسان میں اپنا ایک ایک قدم اس سے راہنمائی حاصل کر کے اٹھانے کی ضرورت ہے۔ لغوی اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو باب تَفْعِیْل میں لفظ ''توحید'' بطور مصدر ''تدریج'' کے مفہوم کا حامل نظر آتا ہے۔ یعنی اس وزن پر دوسرے الفاظ مثلاً تعلیم' تبلیغ' ترویج وغیرہ کے اندر محنت اور مشقت سے کسی عمل کو مسلسل جاری رکھنے کا جو مفہوم پایا جاتا ہے لغوی طور پر وہی مفہوم لفظ توحید کے اندر بھی مضمر ہے۔ چنانچہ یوں

سمجھیں کہ ''توحید'' عمر بھر کا ریاض ہے اور اس پر کاربند رہنے کے لیے محنتِ شاقہ اور جہدِ مسلسل کی ضرورت ہے۔

زیر مطالعہ گروپ کی پہلی چار سورتیں (سورۃ الزمر' سورۃ المؤمن' سورۂ حٰمٓ السّجدۃ اور سورۃ الشوریٰ) توحید عملی کے مضمون کی وجہ سے آپس میں جڑی ہوئی ہیں۔ سورتوں کے اس نظم کے حوالے سے اس ''بیان القرآن'' کے ابتدا میں تعارفِ قرآن کے تحت تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ مختصراً اسے یوں سمجھ لیں کہ قرآن کی ہر آیت اپنی جگہ حکمت کا ایک موتی ہے۔ یہ موتی جب ایک لڑی (سورت) کی شکل میں پروئے جاتے ہیں تو ان کا حسن اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ جس طرح آیات کے موتیوں کو پرونے سے سورتیں بنتی ہیں اسی طرح مضامین کی مشابہت اور مماثلت کی بنا پر سورتوں کے گروپس بنتے ہیں۔ سورۃ الزمر کی آیت ۲۳ میں قرآن مجید کو اسی لیے کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا کہا گیا ہے کہ اس کے مضامین اور الفاظ کی آپس میں گہری مشابہت ہے۔ البتہ جس طرح کسی خوبصورت ہار کو دیکھنے سے بظاہر اس کے موتی ہی نظر آتے ہیں اور ان موتیوں کو باہم مربوط کرنے والی ڈور نظروں سے پوشیدہ رہتی ہے اسی طرح مختلف گروپس کی سورتوں کو باہم جوڑنے والے مضامین بھی عام طور پر نظروں سے اوجھل رہتے ہیں اور انہیں تلاش کرنے کے لیے محنت اور تدبر درکار ہے۔ بہرحال زیر مطالعہ گروپ کی پہلی چار سورتوں کے خوبصورت ہار کو جس ڈور نے باہم مربوط کر رکھا ہے وہ توحیدِ عملی کا مضمون ہے۔

اب ان چار سورتوں کے مرکزی مضمون (توحیدِ عملی) کے اندر موجود ایک خاص ترتیب اور تدریج کو بھی سمجھ لیجیے۔ ان سورتوں میں ''توحیدِ عملی'' کے تقاضوں کو ایک فرد سے تدریجاً اجتماعیت کی طرف بڑھایا گیا ہے۔ سب سے پہلے سورۃ الزمر میں توحید عملی کے ظاہری پہلو (عبادت) پر زور دیا گیا ہے۔ یعنی اللہ کی عبادت کرو' اپنی اطاعت کو اُس کے لیے خالص کرتے ہوئے۔ پھر سورۃ المؤمن میں توحیدِ عملی کے داخلی پہلو یعنی دعا کے بارے میں تاکید آئی ہے۔ اس اعتبار سے ان دونوں سورتوں کو آپس میں جوڑنے والی ڈور ''دین'' کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کرنے کا وہ حکم ہے جو دونوں سورتوں میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ سورۃ الزمر میں ﴿فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ﴾ کے الفاظ کی تکرار ہے' جبکہ سورۃ المؤمن میں ﴿فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ کے الفاظ بار بار دہرائے گئے ہیں۔ اس طرح ان دونوں سورتوں میں توحیدِ عملی کو عبادت اور دعا کی صورت میں معاشرے کے پہلے درجے یعنی انفرادی سطح پر متعارف کرایا گیا ہے۔ پھر سورۂ حٰمٓ السّجدۃ میں دعوتِ توحید کی ترغیب دی گئی ہے تاکہ دعوت و تبلیغ کی بھرپور تحریک کے ذریعے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو توحید کا قائل کیا جائے اور ان کے دلوں میں توحید کا سبق جاگزیں کرایا جائے۔ اور جب لوگوں کی ایک معقول تعداد عملی طور پر توحید پر کاربند ہو جائے تو پھر ان لوگوں کو منظم کر کے نظامِ توحید کے قیام کی جدّوجہد کے لیے تیار کیا جائے۔ اس ترتیب کے حوالے سے ہم دیکھیں گے کہ سورۂ حٰمٓ السّجدۃ میں دعوتِ توحید کی بات ہوگی اور پھر سورۃ الشوریٰ میں معاشرے کے اندر اجتماعی طور پر نظامِ توحید کے قیام (اقامتِ دین) کا حوالہ آئے گا۔

آیات ۱ تا ۹

سُوْرَةُ الْمُؤْمِنِ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۸۵ رُكُوْعَاتُهَا: ۹

حٰمٓ ۚ﴿۱﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۙ﴿۲﴾ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ

الْعِقَابِ ۙ ذِی الطَّوْلِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ اِلَیْهِ الْمَصِیْرُ ۝ مَا یُجَادِلُ فِیْۤ اٰیٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِیْنَ
كَفَرُوْا فَلَا یَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِی الْبِلَادِ ۝ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ الْاَحْزَابُ مِنْۢ
بَعْدِهِمْ ۪ وَ هَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۭ بِرَسُوْلِهِمْ لِیَاْخُذُوْهُ وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِیُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ
فَاَخَذْتُهُمْ ۫ فَكَیْفَ كَانَ عِقَابِ ۝ وَ كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّهُمْ
اَصْحٰبُ النَّارِ ۝ اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَ مَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ یُؤْمِنُوْنَ
بِهٖ وَ یَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّ عِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا
وَ اتَّبَعُوْا سَبِیْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ ۝ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِیْ وَعَدْتَّهُمْ وَ
مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّیّٰتِهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ وَ قِهِمُ
السَّیِّاٰتِ ؕ وَ مَنْ تَقِ السَّیِّاٰتِ یَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ ع

آیت ۱ ﴿حٰمٓ ①﴾ ''ح' م۔''

آیت ۲ ﴿تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ②﴾ ''نازل کیا جانا ہے اس کتاب کا اُس اللہ کی جانب سے جو زبردست ہے' صاحبِ علم ہے۔''

آیت ۳ ﴿غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ ۙ ذِی الطَّوْلِ ؕ﴾ ''(وہ اللہ کہ جو) بخشنے والا ہے گناہ کا' قبول کرنے والا ہے توبہ کا' سزا دینے میں بہت سخت ہے' وہ بہت طاقت اور قدرت والا ہے۔''

یہاں اللہ تعالیٰ کی چار شانوں کا ذکر مرکب اضافی کی صورت میں ہوا ہے۔ آگے چل کر بھی اس سورت میں اسمائے حسنیٰ کے حوالے سے یہ انداز اور اسلوب نظر آئے گا۔

﴿لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ اِلَیْهِ الْمَصِیْرُ ③﴾ ''اُس کے علاوہ کوئی معبود نہیں' اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

یہاں یہ اہم نکتہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ اس سورت میں ''توبہ'' اور ''استغفار'' کا ذکر بار بار آئے گا' بلکہ اس حوالے سے فرشتوں کا ذکر بھی آئے گا کہ وہ بھی بندوں کے لیے استغفار کرتے ہیں۔ سورۃ المؤمن کا سورۃ الزمر کے ساتھ چونکہ جوڑے کا تعلق ہے اس لیے ان دونوں سورتوں کے بنیادی اور مرکزی مضمون میں بھی مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس مماثلت کے حوالے سے قبل ازیں تمہیدی کلمات میں بھی وضاحت کی جا چکی ہے کہ سورۃ الزمر کا مرکزی مضمون ''توحید فی العبادۃ'' ہے اور سورۃ المؤمن کا مرکزی مضمون ''توحید فی الدعاء'' ہے۔ ''دعا'' کے بارے میں حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ))[1] یعنی دعا عبادت کا جوہر ہے۔ ایک دوسری حدیث میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں: ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ))[2] کہ دعا ہی اصل عبادت ہے۔ اس لحاظ سے توحید فی العبادۃ اور توحید فی الدعاء آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ جس طرح عبادت کے حوالے سے سورۃ الزمر میں بار بار ''مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ'' کی تکرار

۱۔ سنن الترمذی' کتاب الدعوات' باب منه۔

۲۔ سنن الترمذی' کتاب تفسیر القرآن' باب ومن سورة البقرة۔ وسنن ابی داؤد' کتاب الصلاة' باب الدعاء۔

ہے‘ اسی طرح اس سورت میں ﴿فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ کی بار بار تاکید ہے۔ یعنی دعا کرو اللہ سے اُس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔ ایسا نہ ہو کہ دعا تو اللہ سے مانگو اور اطاعت کسی اور کی کرو۔ اگر ایسا ہوگا تو یہ انتہائی بے تکی حرکت ہوگی۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کو جزوی اطاعت قبول نہیں اسی طرح اُسے اس شخص کی دعا سننا بھی منظور نہیں جو اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ کسی اور کی اطاعت کا طوق بھی اپنی گردن میں ڈالے ہوئے ہے۔ چنانچہ ایسے شخص کو چاہیے کہ جس ’’معبود‘‘ کی وہ اطاعت کرتا ہے‘ دعا بھی اُسی سے کرے۔

آج ہم پاکستانیوں کو من حیث القوم اس تناظر میں اپنی حالت کا بغور جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ آج ہم ہر میدان میں ذلیل و رسوا کیوں ہو رہے ہیں اور روز بروز ہمارے قومی و ملکی حالات بد سے بدتر کیوں ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں نہ صرف ہمارا ملک دولخت ہو گیا بلکہ بدترین شکست کا داغ بھی ہمارے ماتھے پر لگ گیا۔ آج ہماری حالت پہلے سے بھی بدتر ہے۔ اس وقت ہمارے باقی ماندہ ملک کی سلامتی بھی ڈانواں ڈول ہے۔ انتہائی خضوع و خشوع کے ساتھ مانگی گئی ہماری دعائیں بھی قبول نہیں ہوتیں اور رو رو کر کی گئی فریادیں بھی نہیں سنی جاتیں۔ یہ دراصل کوئی غیر متوقع اور غیر معمولی صورتِ حال نہیں بلکہ ہمارے اجتماعی و قومی رویے کا منطقی نتیجہ ہے۔ اور یہ رویہ یا طرزِ عمل کیا ہے؟ آج ہم نے اپنی ترجیحات بدل لی ہیں‘ ہماری اطاعت اللہ کے لیے خالص نہیں رہی‘ بلکہ ہم اللہ کی اطاعت کو چھوڑ کر بہت سی دوسری اطاعتوں کے غلام بن گئے ہیں۔ ہم نے اللہ کے نام پر یہ ملک اس وعدے کے ساتھ حاصل کیا تھا کہ اس ملک میں ہم اللہ کے دین کا بول بالا کریں گے‘ مگر آج ہم اللہ کے ساتھ کیے گئے اس وعدے سے پھر چکے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں وہ ہماری دعائیں کیونکر سنے گا؟ کیوں وہ ہماری فریاد رسی کرے گا اور کیوں ہماری مدد کو پہنچے گا؟ چنانچہ آج اصولی طور پر ہمیں چاہیے کہ ہم دعائیں بھی اُسی ’’سپر پاور‘‘ سے کریں جس کی اطاعت کا طوق اپنی گردنوں میں ڈالے پھرتے ہیں۔

آیت ۴ ﴿مَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا يَغُرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ۝۴﴾ ’’نہیں جھگڑتے اللہ کی آیات میں مگر وہی لوگ جو کفر کرتے ہیں‘ تو (اے نبی ﷺ!) زمین میں ان کی چلت پھرت آپ کو دھوکے میں نہ ڈالے۔‘‘

یہاں حضور ﷺ کو مخاطب کر کے سب مسلمانوں کو سمجھانا مقصود ہے کہ اے مسلمانو! ان غیر مسلموں کے مادی وسائل‘ اُن کی طاقت‘ ترقی اور ٹیکنالوجی تمہیں مرعوب نہ کرے۔ دیکھو! کسی دنیوی ’’سپر پاور‘‘ کے دھوکے میں آ کر کہیں تم اللہ کی قدرت اور طاقت کو بھول نہ جانا!

آیت ۵ ﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّالْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ﴾ ’’ان سے پہلے نوحؑ کی قوم نے جھٹلایا تھا اور ان کے بعد بہت سی دوسری قوموں نے بھی۔‘‘

﴿وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۢ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ﴾ ’’اور ہر قوم نے اپنے رسول کے متعلق ارادہ کیا کہ اُسے پکڑ لے (اور قتل کر دے)‘‘

﴿وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ ۭ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝۵﴾ ’’اور وہ باطل (دلیلوں) کے ساتھ جھگڑتے رہے تاکہ اس کے ذریعے حق کو پسپا کر دیں‘ بالآخر میں نے انہیں پکڑ لیا‘ تو کیسی رہی میری سزا؟‘‘

آیت ۶ ﴿وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَي الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۝۶﴾ ’’اور اسی طرح ان کافروں پر بھی

آپ کے رب کی بات پوری ہو چکی ہے کہ یہ سب کے سب جہنمی ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کے جس قانون کی زد میں زمانہ ماضی کے کفار آئے تھے اب وہی قانون مشرکین عرب پر بھی لاگو ہو چکا ہے۔

آیت ۷ ﴿اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ﴾ ''وہ (فرشتے) جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ جو اس کے اردگرد ہیں''

اس آیت کو پڑھتے ہوئے سورۃ الزمر کی آخری آیت کو ذہن میں رکھیے جس میں میدانِ حشر میں عدالتِ الٰہی کا اختتامی منظر دکھایا گیا تھا: ﴿وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ﴾ ''اور تم دیکھو گے فرشتوں کو کہ وہ گھیرے ہوئے ہوں گے عرش کو اور اپنے رب کی تسبیح بیان کر رہے ہوں گے حمد کے ساتھ''۔ چنانچہ یہاں ان حاملینِ عرش اور ان کے ساتھی ملائکہ کا ذکر دوبارہ ہو رہا ہے کہ:

﴿يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ﴾ ''وہ سب تسبیح کر رہے ہوتے ہیں اپنے رب کی حمد کے ساتھ اور اُس پر پورا یقین رکھتے ہیں''

﴿وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''اور اہل ایمان کے لیے استغفار کرتے ہیں۔''

﴿رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا﴾ ''اے ہمارے پروردگار! تیری رحمت اور تیرا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے''

﴿فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ﴾ ''پس بخش دے تُو ان لوگوں کو جنہوں نے توبہ کی اور تیرے راستے کی پیروی کی''

اے پروردگار! ہم تجھ سے کیا عرض کریں؟ تجھے ہر شے کا علم ہے' تیری رحمت پہلے ہی ہر چیز کو اپنی گود میں لیے ہوئے ہے۔ پھر بھی ہم تجھ سے تیری رحمت کی درخواست کرتے ہیں اور اہل زمین میں سے جو مؤمنین اور نیک لوگ ہیں ان کے لیے استغفار کرتے ہیں۔ اے پروردگار! تُو ان کی خطائیں بخش دے اور ان کے گناہوں سے درگزر فرما! اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے دن مؤمنین کے حق میں فرشتے بھی شفاعت کریں گے۔ یہ شفاعتِ حقہ ہے۔

﴿وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝۷﴾ ''اور ان کو جہنم کے عذاب سے بچا لے۔''

آیت ۸ ﴿رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ﴾ ''اے ہمارے پروردگار! اور انہیں داخل فرمانا اُن رہنے والے باغات میں جن کا تُو نے ان سے وعدہ کیا ہے''

﴿وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۸﴾ ''اور (ان کو بھی) جو نیک ہوں ان کے آباء واجداد ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے۔ تُو یقیناً زبردست ہے' کمالِ حکمت والا ہے۔''

آیت ۹ ﴿وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ۭ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ۭ﴾ ''اور انہیں بچا لے برائیوں سے۔ اور جسے تُو نے اس دن برائیوں سے بچا لیا تو اُس پر تُو نے بڑا رحم کیا۔''

﴿وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۹﴾ ''اور یقیناً یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔''

آیات ۱۰ تا ۲۲

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُنَادَوۡنَ لَمَقۡتُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ مِنۡ مَّقۡتِکُمۡ اَنۡفُسَکُمۡ اِذۡ تُدۡعَوۡنَ اِلَی الۡاِیۡمَانِ
فَتَکۡفُرُوۡنَ ﴿۱۰﴾ قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثۡنَتَیۡنِ وَ اَحۡیَیۡتَنَا اثۡنَتَیۡنِ فَاعۡتَرَفۡنَا بِذُنُوۡبِنَا فَہَلۡ اِلٰی
خُرُوۡجٍ مِّنۡ سَبِیۡلٍ ﴿۱۱﴾ ذٰلِکُمۡ بِاَنَّہٗۤ اِذَا دُعِیَ اللّٰہُ وَحۡدَہٗ کَفَرۡتُمۡ ۚ وَ اِنۡ یُّشۡرَکۡ بِہٖ تُؤۡمِنُوۡا ؕ
فَالۡحُکۡمُ لِلّٰہِ الۡعَلِیِّ الۡکَبِیۡرِ ﴿۱۲﴾ ہُوَ الَّذِیۡ یُرِیۡکُمۡ اٰیٰتِہٖ وَ یُنَزِّلُ لَکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ رِزۡقًا ؕ وَ مَا
یَتَذَکَّرُ اِلَّا مَنۡ یُّنِیۡبُ ﴿۱۳﴾ فَادۡعُوا اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ وَ لَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۱۴﴾
رَفِیۡعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الۡعَرۡشِ ۚ یُلۡقِی الرُّوۡحَ مِنۡ اَمۡرِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ لِیُنۡذِرَ یَوۡمَ
التَّلَاقِ ﴿۱۵﴾ یَوۡمَ ہُمۡ بٰرِزُوۡنَ ۚ لَا یَخۡفٰی عَلَی اللّٰہِ مِنۡہُمۡ شَیۡءٌ ؕ لِمَنِ الۡمُلۡکُ الۡیَوۡمَ ؕ لِلّٰہِ
الۡوَاحِدِ الۡقَہَّارِ ﴿۱۶﴾ اَلۡیَوۡمَ تُجۡزٰی کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا کَسَبَتۡ ؕ لَا ظُلۡمَ الۡیَوۡمَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیۡعُ
الۡحِسَابِ ﴿۱۷﴾ وَ اَنۡذِرۡہُمۡ یَوۡمَ الۡاٰزِفَۃِ اِذِ الۡقُلُوۡبُ لَدَی الۡحَنَاجِرِ کٰظِمِیۡنَ ؕ مَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ
حَمِیۡمٍ وَّ لَا شَفِیۡعٍ یُّطَاعُ ﴿۱۸﴾ یَعۡلَمُ خَآئِنَۃَ الۡاَعۡیُنِ وَ مَا تُخۡفِی الصُّدُوۡرُ ﴿۱۹﴾ وَ اللّٰہُ یَقۡضِیۡ
بِالۡحَقِّ ؕ وَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ لَا یَقۡضُوۡنَ بِشَیۡءٍ ؕ اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ﴿۲۰﴾ ع
اَوَ لَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ کَانُوۡا ہُمۡ
اَشَدَّ مِنۡہُمۡ قُوَّۃً وَّ اٰثَارًا فِی الۡاَرۡضِ فَاَخَذَہُمُ اللّٰہُ بِذُنُوۡبِہِمۡ ؕ وَ مَا کَانَ لَہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ
وَّاقٍ ﴿۲۱﴾ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَانَتۡ تَّاۡتِیۡہِمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ فَکَفَرُوۡا فَاَخَذَہُمُ اللّٰہُ ؕ اِنَّہٗ قَوِیٌّ
شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۲۲﴾

گزشتہ آیات میں مؤمنینِ صادقین کے حالات کا نقشہ دکھایا گیا ہے کہ قیامت کے دن حاملینِ عرش ملائکہ ان کی مغفرت کے لیے دعائیں کر رہے ہوں گے۔ نہ صرف ان کے لیے بلکہ وہ ان کے آباء واَجداد اور اہل وعیال کے لیے بھی سفارش کریں گے کہ ان میں سے اگر کوئی جنت کے نچلے درجے میں ہے تو اے پروردگار! تُو اس کے درجات کو بھی بلند فرما دے تاکہ وہ اپنے ان عزیز واقارب کے ساتھ مل جائے جنہیں بلند تر درجات عطا ہوئے ہیں۔ اب ان آیات میں اس کے برعکس کُفّار ومشرکین کے حالات کا منظر دکھایا جا رہا ہے:

آیت ۱۰ ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُنَادَوۡنَ لَمَقۡتُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ مِنۡ مَّقۡتِکُمۡ اَنۡفُسَکُمۡ﴾ ''جن لوگوں نے کفر کیا تھا انہیں پکارا جائے گا کہ آج تم جس قدر اپنی جانوں سے بے زار ہو گئے ہو اللہ کی بیزاری تم سے اس سے کہیں بڑھ کر تھی''

﴿اِذۡ تُدۡعَوۡنَ اِلَی الۡاِیۡمَانِ فَتَکۡفُرُوۡنَ ﴿۱۰﴾﴾ ''جب تمہیں ایمان کی دعوت دی جاتی تھی اور تم کفر کرتے تھے۔''

آج عذاب کی حالت میں تمہاری جان پر بنی ہوئی ہے اور تم اپنی جانوں سے بیزار ہو کر موت کی دعائیں کر رہے ہو۔ مگر یاد کرو وہ

وقت جب اللہ کا رسول تمہیں اللہ کی طرف اور قرآن کی طرف بلا رہا تھا اور تمہیں ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ کا راستہ دکھا رہا تھا تو تم مسلسل انکار کیے جا رہے تھے۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ تم سے جس قدر بیزاری محسوس کر رہا تھا وہ تمہاری اس بیزاری سے کہیں زیادہ تھی جو تم لوگ آج اپنی جانوں سے محسوس کر رہے ہو۔

آیت ۱۱ ﴿قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ﴾ ''وہ فریاد کریں گے: اے ہمارے رب! تُو نے ہمیں دو دفعہ مارا اور دو دفعہ زندہ کیا''

﴿فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝۱۱﴾ ''تو اب ہم نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے' تو کیا اب یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی راہ ہے؟''

یعنی اگر ہم اس سے پہلے اتنے مراحل سے گزر آئے ہیں تو اب اس مرحلے سے بھی گزرنے کا کوئی طریقہ تو ہوگا۔ تو اے پروردگار! ایک دفعہ ہمیں اس عذاب سے جان چھڑانے کا موقع بھی فراہم کر دے۔

تخلیقِ انسانی اور حیاتِ انسانی کی حقیقت کے ضمن میں اس آیت کا مضمون پورے قرآن میں ذروۂ سنام کا درجہ رکھتا ہے۔ اگرچہ یہ مضمون قرآن مجید میں متعدد بار آ چکا ہے لیکن اس قدر واضح انداز میں اور کہیں نہیں آیا۔ مثلاً سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا: ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۲۸﴾ ''تم کیسے کفر کرتے ہو اللہ کا' حالانکہ تم مُردہ تھے تو اُس نے تمہیں زندہ کیا' پھر وہ تمہیں مارے گا' پھر زندہ کرے گا' پھر تم اُسی کی طرف لوٹا دیے جاؤ گے''۔ اگرچہ سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں بھی دو احیاء اور دو اموات کا ذکر ہے مگر مختلف مفسرین نے ان الفاظ کی تاویل مختلف انداز میں کی ہے۔ البتہ آیت زیرِ مطالعہ اپنے مفہوم میں اس قدر واضح ہے کہ اس کی وضاحت کے لیے کسی تعبیر اور تاویل کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ اس آیت کے حوالے سے یہاں حیاتِ انسانی کے مختلف اَدوار کو اچھی طرح سے سمجھ لیجیے۔

ہر انسان کی پہلی تخلیق اُس وقت عمل میں آئی جب عالَمِ ارواح میں اس کی روح پیدا کی گئی۔ عالَمِ ارواح کی یہ زندگی پورے شعور کے ساتھ تھی۔ اسی لیے تو وہاں تمام ارواح سے وہ عہد لیا گیا تھا جس کا ذکر سورۃ الاعراف کی آیت ۱۷۲ میں ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚ﴾ کے الفاظ کے ساتھ ہوا ہے۔ اس عہد کے وقت حضرت آدم علیہ السلام کی رُوح سے لے کر دنیا کے آخری انسان کی روح تک تمام ارواح حاضر و موجود تھیں۔ عالَمِ ارواح میں ارواح کے اس عظیم الشان اجتماع کی کیفیت ایک حدیث میں ''جُنُوْدٌ مُجَنَّدَة''[۳] (لشکروں کے لشکر) کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ مذکورہ عہد لینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام ارواح کو موت کی نیند سلا دیا۔ یہ ہر انسان کی پہلی موت (اماتۂ اولیٰ) تھی جو عالَمِ ارواح میں اس پر وارد ہوئی۔ اس طرح تمام ارواح کو گویا ایک کولڈ سٹوریج میں محفوظ کر دیا گیا۔ چنانچہ جو ارواح ابھی تک دنیا میں نہیں آئیں وہ ابھی تک اسی کیفیت میں ہیں۔ علامہ اقبالؔ نے اس کیفیت کا عجیب نقشہ کھینچا ہے مگر یہ ایسی تفصیل کا موقع نہیں۔

پھر جب عالَمِ خلق (ماں کے پیٹ) میں کسی انسان کے جسم کا لوتھڑا تیار ہو جاتا ہے تو اس کی روح کو عالَمِ ارواح سے اس لوتھڑے

۳۔ صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب الارواح جنود مجندة۔ وصحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب الارواح جنود مجندة۔

میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اس جسم میں منتقل ہونے کے بعد جب روح ''آنکھ'' کھولتی ہے تو یہ اس روح کا ''احیائے اوّل'' ہے۔ اس کے بعد وہ انسان ماں کے پیٹ سے دنیا میں وارد ہوتا ہے۔ ایک معیّن عرصے تک دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے اور اس کے بعد مر جاتا ہے۔ چنانچہ دُنیوی زندگی کی یہ موت اس انسان یا روح کی دوسری موت (اماتۃ ثانیہ) ہے۔ اس موت کے بعد وہ روح عالَمِ برزخ میں چلی جاتی ہے' جبکہ جسم اپنی اصل کی طرف لوٹ جاتا ہے یعنی مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح پوری نوعِ انسانی کی ارواح اپنی اپنی باری پر زندہ ہو کر دنیا میں آتی جائیں گی اور یہاں اپنے اپنے جسم کے ساتھ زندگی گزار کر ''دوسری موت'' کے بعد عالَمِ برزخ کو سدھارتی جائیں گی۔

اس کے بعد جب قیامت برپا ہو گی تو ہر انسان کی روح کو ایک دفعہ پھر اس کے دنیوی جسم سے ملا کر زندہ کر دیا جائے گا۔ یہ تمام انسانوں کا ''احیائے ثانی'' ہو گا۔ چنانچہ جب میدانِ حشر میں اللہ تعالیٰ کی عدالت لگے گی تو مجرم لوگ آیت زیر مطالعہ کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے ہمیں دو مرتبہ موت دی اور دو دفعہ زندہ کیا۔ عالَمِ ارواح سے دنیا کی زندگی تک اور دنیا کی موت کے بعد قیامت کے اس دن تک کئی ادوار ہم پر گزر چکے' تو اے ہمارے پروردگار! اب ایک دور اور سہی۔ ایک مرتبہ پھر ہم پر کرم فرمایا جائے اور ہمیں ایک موقع اور دے دیا جائے۔ یعنی وہ لوگ اپنی سابقہ زندگی کے مختلف ادوار کو دلیل بنا کر ایک اور دور کی رعایت حاصل کرنے کی درخواست کریں گے۔

آیت ۱۲ ﴿ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ﴾ ''یہ اس لیے ہے کہ جب اکیلے اللہ کو پکارا جاتا تھا تو تم انکار کرتے تھے۔''

﴿وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ۭ﴾ ''اور اگر اس کے ساتھ شرک کیا جاتا تو تم مان لیتے۔''

﴿فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ۝۱۲﴾ ''تو اب کُل اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے جو بہت بلند' بہت عظمت والا ہے۔''

آیت ۱۳ ﴿هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ رِزْقًا ۭ﴾ ''وہی ہے جو تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور اتارتا ہے تمہارے لیے آسمان سے روزی۔''

اللہ تعالیٰ آسمان سے بارش برساتا ہے اور بارش کا پانی زمین سے روزی پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔

﴿وَمَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ ۝۱۳﴾ ''اور نہیں نصیحت حاصل کرتا مگر وہی جو رجوع کرتا ہے (اللہ کی طرف)۔''

آیت ۱۴ ﴿فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝۱۴﴾ ''پس تم پکارو اللہ کو اُسی کے لیے اطاعت کو خالص کرتے ہوئے' خواہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔''

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کے یہ کلمات سورۃ الزمر اور اس سورت کے درمیان مماثلت اور مشابہت کی علامت ہیں۔ دونوں سورتوں میں یہ کلمات بار بار آئے ہیں۔ ظاہر ہے توحید خالص کا عملی مظاہرہ اللہ تعالیٰ کے نافرمانوں اور طاغوتی کارندوں کو تو کبھی بھی اچھا نہیں لگے گا۔ وہ تو چاہیں گے کہ ''اللہ کا حصّہ اللہ کو دیا جائے اور قیصر کا حصّہ قیصر کو!'' یعنی توحید کا ذکر بھی ہوتا رہے اور کاروبارِ شرک بھی چلتا رہے۔ کبھی کبھار کوئی حکم اللہ کا بھی مان لیا جائے' مگر ساتھ ہی ساتھ دوسرے خداؤں اور حاجت رواؤں کو بھی خوش رکھا جائے۔

آیت ۱۵ ﴿رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ﴾ ''(وہی اللہ ہے) درجات کو بلند کرنے والا' عرش کا مالک۔''

یہاں پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی شان کا بیان مرکب اضافی کی شکل میں ہوا ہے۔

﴿یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ لِیُنْذِرَ یَوْمَ التَّلَاقِ ﴿۱۵﴾﴾ ''وہ القا کرتا ہے روح کو اپنے امر میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے تاکہ وہ خبردار کر دے (لوگوں کو) ملاقات کے دن سے۔''

تاکہ اللہ تعالیٰ کے وہ بندے لوگوں کو یاد دہانی کرائیں کہ ایک دن انہوں نے اپنے رب کے حضور حاضر ہونا ہے۔ یہاں پر الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِہٖ سے وحی مراد ہے۔ فرشتۂ وحی اور انسانی روح تینوں کا تعلق عالمِ امر سے ہے لہٰذا ''روح'' کا لفظ ان تینوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

آیت ۱۶ ﴿یَوْمَ ھُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا یَخْفٰی عَلَی اللّٰہِ مِنْھُمْ شَیْءٌ ؕ﴾ ''جس روز یہ سامنے نکل کھڑے ہوں گے ان کی کوئی چیز بھی اللہ سے مخفی نہیں ہوگی۔''

﴿لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ ؕ﴾ ''(اُس روز پوچھا جائے گا:) کس کے لیے ہے بادشاہی آج کے دن؟

﴿لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَھَّارِ ﴿۱۶﴾﴾ ''(جواب ملے گا:) اکیلے اللہ کے لیے ہے جو تمام کائنات پر چھایا ہوا ہے۔''

آیت ۱۷ ﴿اَلْیَوْمَ تُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا کَسَبَتْ ؕ﴾ ''آج ہر جان کو وہی بدلہ دیا جائے گا جو اُس نے کمایا۔''

﴿لَا ظُلْمَ الْیَوْمَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۷﴾﴾ ''آج کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ یقیناً اللہ جلد حساب چکا دینے والا ہے۔''

آیت ۱۸ ﴿وَاَنْذِرْھُمْ یَوْمَ الْاٰزِفَۃِ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) انہیں خبردار کر دیجیے اس نزدیک آ جانے والے دن سے''

﴿اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَی الْحَنَاجِرِ کٰظِمِیْنَ ؕ﴾ ''جبکہ دل حلق میں آ پھنسیں گے اور وہ غم کو دبا رہے ہوں گے۔''

﴿مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَّلَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ ﴿۱۸﴾﴾ ''ان ظالموں کا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی ایسا سفارشی ہوگا جس کی بات مانی جائے۔''

آیت ۱۹ ﴿یَعْلَمُ خَآئِنَۃَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ ﴿۱۹﴾﴾ ''وہ جانتا ہے نگاہوں کی چوری کو بھی اور جو کچھ سینوں میں چھپا ہے اس کو بھی۔''

آیت ۲۰ ﴿وَاللّٰہُ یَقْضِیْ بِالْحَقِّ ؕ﴾ ''اور اللہ فیصلہ کرے گا حق کے ساتھ۔''

﴿وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ لَا یَقْضُوْنَ بِشَیْءٍ ؕ﴾ ''اور جن کو یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کسی چیز کا بھی فیصلہ نہیں کریں گے۔''

﴿اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ﴿۲۰﴾﴾ ''یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا سب کچھ دیکھنے والا ہے۔''

آیت ۲۱ ﴿اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیْنَ کَانُوْا مِنْ قَبْلِھِمْ ؕ﴾ ''کیا یہ زمین میں گھومے پھرے نہیں ہیں کہ دیکھتے کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے!''

﴿کَانُوْا ھُمْ اَشَدَّ مِنْھُمْ قُوَّۃً وَّاٰثَارًا فِی الْاَرْضِ﴾ ''وہ کہیں زیادہ بڑھ کر تھے ان سے قوت میں اور زمین میں آثار کے حوالے سے بھی''

انہوں نے زمین میں بڑی بڑی عمارتیں اور بہت سی دوسری ایسی یادگاریں بنائیں جو ان کے بعد بھی ان کی نشانیوں کے طور پر

موجود رہی ہیں۔ اقوامِ ماضی کے ایسے بہت سے آثار آج بھی دنیا میں جا بجا موجود ہیں جنہیں ہم آثارِ قدیمہ کہتے ہیں۔

﴿فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ﴾ ''تو اللہ نے ان کو پکڑا ان کے گناہوں کی پاداش میں۔''

﴿وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۲۱﴾﴾ ''اور پھر کوئی نہ ہوا انہیں اللہ سے بچانے والا۔''

آیت ۲۲ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ﴾ ''یہ اس لیے ہوا کہ ان کے پاس آتے رہے ان کے رسول بہت واضح نشانیوں کے ساتھ''

﴿فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۲﴾﴾ ''لیکن انہوں نے کفر کیا تو اللہ نے انہیں پکڑ لیا' یقیناً وہ بہت طاقتور' سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''

آیات ۲۳ تا ۲۷

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۳﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَ قَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿۲۴﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَ اسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ ؕ وَ مَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۲۵﴾ وَ قَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ﴿۲۶﴾ وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَ رَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۲۷﴾ ع

آیت ۲۳ ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۳﴾﴾ ''اور ہم نے بھیجا تھا موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور کھلی سند کے ساتھ''

آیت ۲۴ ﴿اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ﴾ ''فرعون' ہامان اور قارون کی طرف''

﴿فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿۲۴﴾﴾ ''تو انہوں نے کہا کہ یہ تو ایک جادوگر ہے انتہائی جھوٹا۔''

یہی الفاظ مشرکینِ مکہ نے حضور ﷺ کے لیے کہے تھے جو سورۂ ص کی آیت ۴ میں نقل ہوئے ہیں۔

آیت ۲۵ ﴿فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ ؕ﴾ ''تو جب وہ آیا ان کے پاس ہماری طرف سے حق لے کر تو انہوں نے کہا کہ جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائیں ان کے بیٹوں کو قتل کر دو اور ان کی بیٹیوں کو زندہ رکھو۔''

﴿وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۲۵﴾﴾ ''لیکن کافروں کا داؤ بھٹک کر ہی رہ جاتا ہے۔''

اس سے پہلے ہم سورۃ الاعراف کے پندرھویں رکوع میں بھی سردارانِ قومِ فرعون کے اس مطالبے کے بارے میں پڑھ چکے ہیں کہ آپ موسیٰؑ کو کب تک ڈھیل دیتے رہیں گے؟ لوگ دھڑا دھڑ اس پر ایمان لا رہے ہیں' روز بروز اس کی طاقت بڑھتی جا رہی ہے اور اس کے نتیجے میں ملک کے اندر فساد پھیل رہا ہے۔ آپ اسے قتل کیوں نہیں کروا دیتے؟ لیکن جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے کہ

فرعون ایک وقت تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف کوئی سخت اقدام کرنے سے کتراتا رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گویا اپنا بڑا بھائی سمجھتا تھا اور اس تعلق کی وجہ سے وہ دل میں آپ کے لیے نرم گوشہ رکھتا تھا۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے حضرت موسیٰؑ کی پیدائش سے لے کر بحیثیتِ رسولؑ فرعون کے سامنے آنے تک کے واقعات کو ایک دفعہ پھر سے ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ ان تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت رعمسیس دوم فرعون برسرِ اقتدار تھا۔ حضرت موسیٰؑ کو دریا سے نکال کر جب اس کے محل میں لایا گیا تو اس کی بیوی نے کسی طرح اسے قائل کر لیا کہ اس بچے کو قتل نہ کیا جائے۔ اس موقع پر فرعون کی بیوی کے اپنے شوہر کے ساتھ مکالمے کو سورۃ القصص میں یوں نقل کیا گیا ہے: ﴿وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ ۭ لَا تَقْتُلُوْهُ ۡ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا﴾ (آیت ۹) ''اور فرعون کی بیوی نے کہا کہ یہ آنکھوں کی ٹھنڈک ہے میرے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔ تم اسے قتل مت کرو، ممکن ہے کہ یہ ہمیں کوئی فائدہ پہنچائے یا ہم اسے بیٹا ہی بنا لیں''۔ غالب گمان یہی ہے کہ وہ خاتون حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا ہی تھیں جن کا ذکر سورۃ التحریم میں آیا ہے۔ اس وقت تک فرعون بے اولاد تھا۔ بعد میں اس کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ چنانچہ فرعون کا حقیقی بیٹا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سگے بھائیوں کی طرح اکٹھے رہے اور ایک ساتھ جوانی کی عمر کو پہنچے۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ایک قبطی کا قتل ہو گیا تو آپؑ مدین چلے گئے۔ مدین سے آپؑ کی واپسی کے زمانے میں بڑا فرعون اگرچہ زندہ تھا مگر بڑھاپے کی وجہ سے اس نے تمام امورِ سلطنت اپنے بیٹے (منفتاح) کو سونپ رکھے تھے۔ اس طرح عملی طور پر اس کا بیٹا ہی حکمران تھا جو ایک طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھائی اور بچپن کا ساتھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے بڑے بڑے سرداروں کے پُرزور مطالبے کے باوجود بھی وہ کئی سال تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف انتہائی اقدام کرنے سے گریز کرتا رہا۔ پھر جب اُس نے کسی سخت اقدام کو ناگزیر سمجھا بھی تو آپؑ کی ذات کے بجائے آپؑ کی قوم کو نشانہ بنانے کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کے تحت اس نے ایک دفعہ پھر حکم دے دیا کہ بنی اسرائیل کے ہاں پیدا ہونے والے لڑکوں کو قتل کر دیا جائے اور صرف ان کی بیٹیوں کو ہی زندہ رہنے دیا جائے۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ اس تحریک کو کچلنے اور بنی اسرائیل کی طاقت کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ چنانچہ آیت زیرِ مطالعہ میں اس کے اسی منصوبے کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے مخالفین کی کوئی چال بھی اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

آیت ۲۶ ﴿وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ﴾ ''اور فرعون نے کہا: مجھے چھوڑو کہ میں موسیٰؑ کو قتل کر دوں اور وہ (بچاؤ کے لیے) پکار لے اپنے رب کو۔''

فرعون کے اس فقرے کے اندر بہت سی اَن کہی تفصیلات کی جھلک بھی نظر آ رہی ہے۔ اوّلاً اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک فرعون بھانپ چکا تھا کہ پانی سر سے گزرنے کو ہے اور یہ کہ اس مرحلے پر اگر موسیٰؑ کو قتل کر کے راستے سے نہ ہٹایا گیا تو یہ طوفان اس کے اقتدار سمیت مصر کی ''عظیم الشان تہذیب'' اور ''مثالی روایات'' کو بھی بہا لے جائے گا۔ ثانیاً اس فقرے سے اس کی بے چارگی بھی عیاں ہو رہی ہے۔ وہ مطلق العنان بادشاہ تھا مگر اس کے باوجود اس نے اپنے وزراء اور اُمراء سے اس قرارداد کی منظوری کی درخواست کی۔ اس کی ضرورت اسے کیوں محسوس ہوئی؟ دراصل وہ دیکھ رہا تھا کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی دعوت سے ہر طبقے کے لوگ متاثر ہو رہے ہیں۔ اس لیے اسے اندیشہ تھا کہ اگر اس تجویز پر تمام درباریوں کو اعتماد میں نہ لیا گیا تو ردِّعمل کے طور پر کہیں سے کوئی بغاوت بھی جنم لے سکتی ہے۔

﴿اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یُّبَدِّلَ دِیۡنَکُمۡ اَوۡ اَنۡ یُّظۡہِرَ فِی الۡاَرۡضِ الۡفَسَادَ ﴿۲۶﴾﴾ ''مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تمہارا دین بدل دے گا یا زمین میں فساد برپا کر دے گا۔''

''دین'' سے مراد یہاں نظامِ حکومت ہے اور فرعون کو اب سب سے بڑا اندیشہ یہی تھا کہ مصر کا اقتدارِ اعلیٰ ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔

فرعون کی مذکورہ قرارداد کی اطلاع حضرت موسیٰ علیہ السلام تک پہنچی تو آپؑ نے خود کو اللہ تعالیٰ کی پناہ میں دینے کے عزم کا اظہار کیا:

آیت ۲۷ ﴿وَ قَالَ مُوۡسٰۤی اِنِّیۡ عُذۡتُ بِرَبِّیۡ وَ رَبِّکُمۡ مِّنۡ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤۡمِنُ بِیَوۡمِ الۡحِسَابِ ﴿۲۷﴾﴾ ''اور موسیٰؑ نے کہا کہ میں پناہ پکڑتا ہوں اپنے اور تمہارے رب کی ہر اُس متکبر شخص کے مقابلے میں' جو یومِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا۔''

اب آئندہ آیات میں ''مؤمنِ آلِ فرعون'' کا واقعہ بیان ہو رہا ہے جو اس سورت کا خاص مضمون ہے۔ وہ فرعون کے دربار میں بہت بڑے مرتبے پر فائز تھے۔ ظاہر ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ اُن تک بھی پہنچی ہوگی۔ اس دعوت کے جواب میں اللہ نے ان کا سینہ کھول دیا اور وہ ایمان لے آئے۔ البتہ مصلحت کے تحت انہوں نے اپنے ایمان کا اظہار نہ کیا۔ پھر ایک موقع پر جب فرعون نے اپنی کابینہ کے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کی تجویز رکھی تو اس مردِ حق سے خاموش نہ رہا گیا۔ چنانچہ فرعون کی اس تجویز کے جواب میں انہوں نے بھرے دربار میں ایک بہت مدلّل اور مؤثر تقریر کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس ''حق گوئی و بے باکی'' کی پذیرائی یوں فرمائی کہ ان کی پوری تقریر کو قرآن مجید کا حصہ بنا دیا۔ وہ نہ نبی تھے اور نہ رسول' لیکن ان کی طویل تقریر جس شان سے اللہ تعالیٰ نے نقل فرمائی ہے اس کی کوئی مثال قرآن میں کسی نبی یا رسول کے حوالے سے بھی نہیں ملتی۔ ان کے اس خصوصی اعزاز سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کس شان سے اپنے بندوں کی قدر افزائی فرماتا ہے۔

آیات ۲۸ تا ۳۷

وَ قَالَ رَجُلٌ مُّؤۡمِنٌ ۚ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ یَکۡتُمُ اِیۡمَانَہٗۤ اَتَقۡتُلُوۡنَ رَجُلًا اَنۡ یَّقُوۡلَ رَبِّیَ اللّٰہُ وَ قَدۡ جَآءَکُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ مِنۡ رَّبِّکُمۡ ؕ وَ اِنۡ یَّکُ کَاذِبًا فَعَلَیۡہِ کَذِبُہٗ ۚ وَ اِنۡ یَّکُ صَادِقًا یُّصِبۡکُمۡ بَعۡضُ الَّذِیۡ یَعِدُکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِیۡ مَنۡ ہُوَ مُسۡرِفٌ کَذَّابٌ ﴿۲۸﴾ یٰقَوۡمِ لَکُمُ الۡمُلۡکُ الۡیَوۡمَ ظٰہِرِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ۫ فَمَنۡ یَّنۡصُرُنَا مِنۡۢ بَاۡسِ اللّٰہِ اِنۡ جَآءَنَا ؕ قَالَ فِرۡعَوۡنُ مَاۤ اُرِیۡکُمۡ اِلَّا مَاۤ اَرٰی وَ مَاۤ اَہۡدِیۡکُمۡ اِلَّا سَبِیۡلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾ وَ قَالَ الَّذِیۡۤ اٰمَنَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ مِّثۡلَ یَوۡمِ الۡاَحۡزَابِ ﴿۳۰﴾ۙ مِثۡلَ دَاۡبِ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوۡدَ وَ الَّذِیۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ ؕ وَ مَا اللّٰہُ یُرِیۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعِبَادِ ﴿۳۱﴾ وَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ یَوۡمَ التَّنَادِ ﴿۳۲﴾ۙ یَوۡمَ تُوَلُّوۡنَ مُدۡبِرِیۡنَ ۚ مَا لَکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ عَاصِمٍ ۚ وَ مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ ہَادٍ ﴿۳۳﴾ وَ لَقَدۡ جَآءَکُمۡ یُوۡسُفُ مِنۡ قَبۡلُ بِالۡبَیِّنٰتِ فَمَا زِلۡتُمۡ فِیۡ شَکٍّ مِّمَّا جَآءَکُمۡ بِہٖ ؕ حَتّٰۤی اِذَا ہَلَکَ قُلۡتُمۡ لَنۡ

يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ ۣ﴿۳۴﴾ الَّذِيْنَ
يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ؕ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ
كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿۳۵﴾ وَ قَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْۤ
اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ﴿۳۶﴾ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى وَ اِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ؕ وَ كَذٰلِكَ
زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ صُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَ مَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ﴿۳۷﴾ ع

آیت ۳۴ ﴿وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗۤ﴾ ''اور آلِ فرعون میں سے ایک مؤمن مرد نے' جو ابھی تک اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا' کہا:''

اس مرحلے پر اس مردِ مؤمن نے صورتِ حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے کلمۂ حق زبان پر لانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ اس نے تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر بھرے دربار میں اس مطلق العنان فرعون کے سامنے کھڑے ہو کر ''حق گوئی و بے باکی'' کی ایسی مثال قائم کی کہ اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اور جملے گویا ع ''موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے!'' اور پھر ان موتیوں کو اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے جاں نثارانِ حق کی آنکھوں کی طراوت کے لیے صفحاتِ قرآن کی زینت بنا دیا۔ چنانچہ فرعون نے جونہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کی قرارداد پیش کی' یہ مردِ مؤمن فوراً بول اٹھا اور اس نے فرعون اور تمام اہلِ دربار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

﴿اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ﴾ ''کیا تم قتل کرنا چاہتے ہو ایک شخص کو محض اس لیے کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے!''

کیا کسی شخص کا اللہ کو رب ماننا تمہارے نزدیک اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی پاداش میں تم اس کی جان کے درپے ہو گئے ہو؟

ایک مرتبہ جب مشرکینِ مکہ نے حضور ﷺ کی سرِ عام ہجو کی اور آپؐ پر حملہ آور ہوئے تو اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بیچ میں آ گئے اور انہوںؓ نے مشرکینِ مکہ کو مخاطب کر کے یہی الفاظ دہرائے تھے: اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ [۴] ''کیا تم لوگ ایک شخص (محمد ﷺ) کی جان کے درپے صرف اس لیے ہو رہے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے!''

﴿وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ؕ﴾ ''حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے واضح نشانیاں لے کر آیا ہے۔''

﴿وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ﴾ ''اور اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کا وبال اُسی پر آئے گا۔''

﴿وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ؕ﴾ ''اور اگر وہ سچا ہوا تو تمہیں وہ بعض باتیں پہنچ کر رہیں گی جن کے بارے میں وہ تمہیں وعید سنا رہا ہے۔''

ایسی صورت میں تم پر عذابِ الٰہی کی مار پڑے گی اور تم تباہ و برباد کر دیے جاؤ گے۔

۴۔ صحیح البخاری' کتاب المناقب' باب قول النبی ﷺ ﴿لو کنت متخذا خلیلًا﴾ وکتاب تفسیر القرآن' ح:۳۶۷۸' ۴۸۱۵۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴿۲۸﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ راہ یاب نہیں کرتا اس کو جو حد سے بڑھنے والا' بہت جھوٹا ہو۔''

آیت ۲۹ ﴿یٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْیَوْمَ ظٰهِرِیْنَ فِی الْاَرْضِ﴾ ''اے میری قوم کے لوگو! آج تو تمہارے ہاتھ میں حکومت ہے اور تم ہر طرح سے زمین میں غالب ہو۔''

آج تو تم ایک عظیم الشان سلطنت کے مالک ہو اور پوری دنیا میں تمہاری طاقت کا ڈنکا بج رہا ہے۔

﴿فَمَنْ یَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا﴾ ''لیکن اگر کہیں ہم پر اللہ کا عذاب آ گیا تو اس سے بچانے کے لیے ہماری مدد کون کرے گا؟''

﴿قَالَ فِرْعَوْنُ مَاۤ اُرِیْكُمْ اِلَّا مَاۤ اَرٰی﴾ ''فرعون نے کہا: مَیں تو تمہیں وہی کچھ دکھا رہا ہوں جو مجھے نظر آ رہا ہے''

مجھے تو یہ نظر آ رہا ہے کہ اگر اب بھی موسیٰ کا قصہ پاک نہ کیا گیا تو پانی ہمارے سروں سے گزر جائے گا اور یہ مصر کے طول و عرض میں فساد برپا کر دے گا۔ اس طرح جو تباہی آئے گی وہ ہمارا سب کچھ برباد کر کے رکھ دے گی۔ اس فقرے کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مَیں نے تو تمہارے سامنے اپنی وہی رائے پیش کی ہے جو مجھے مناسب نظر آتی ہے —— مردِ مؤمن کی کھری کھری باتوں کے جواب میں فرعون کا یہ معذرت خواہانہ ردِّ عمل حیران کن ہے۔ فرعون کی مطلق العنانی کا تصور ذہن میں رکھیے اور پھر اس مختصر سے جملے کے ایک ایک لفظ سے ٹپکتی ہوئی بے بسی اور بے چارگی ملاحظہ کیجیے۔

﴿وَمَاۤ اَهْدِیْكُمْ اِلَّا سَبِیْلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾﴾ ''اور مَیں نہیں راہنمائی کر رہا تمہاری مگر کامیابی کے راستے کی طرف۔''

آیت ۳۰ ﴿وَقَالَ الَّذِیْۤ اٰمَنَ یٰقَوْمِ﴾ ''اور مردِ مؤمن نے (اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے) کہا: اے میری قوم کے لوگو!''

﴿اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ مِّثْلَ یَوْمِ الْاَحْزَابِ ﴿۳۰﴾﴾ ''مجھے اندیشہ ہے تم پر ایسے دن کا جیسے دن پہلی قوموں پر آئے تھے۔''

آیت ۳۱ ﴿مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ﴾ ''جیسا کہ معاملہ ہوا تھا قومِ نوحؑ کا اور قومِ عاد اور قومِ ثمود اور ان کے بعد کی قوموں کا۔''

﴿وَمَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ﴿۳۱﴾﴾ ''اور اللہ تو اپنے بندوں پر کسی ظلم کا ارادہ نہیں رکھتا۔''

یہ تو خود بندے ہی ہیں جو رسولوں کی تکذیب اور اپنی کوتاہیوں اور شرارتوں کی وجہ سے عذابِ الٰہی کو دعوت دیتے ہیں' ورنہ اللہ عزّوجل تو کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

آیت ۳۲ ﴿وَیٰقَوْمِ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ یَوْمَ التَّنَادِ ﴿۳۲﴾﴾ ''اور اے میری قوم کے لوگو! مجھے اندیشہ ہے تم پر چیخ و پکار کے دن کا۔''

جس دن ہر طرف فریاد و فغاں اور چیخ و پکار مچی ہوگی اور لوگ ایک دوسرے کو پکار رہے ہوں گے۔

آیت ۳۳ ﴿یَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِیْنَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ﴾ ''جس دن تم پیٹھ موڑ کر بھاگو گے' لیکن اللہ کی پکڑ

سے تمہیں بچانے والا کوئی نہیں ہوگا۔''

﴿وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝۳۳﴾ ''اور جسے اللہ ہی گمراہ کر دے پھر اُسے ہدایت دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔''

آیت ۳۴ ﴿وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ﴾ ''اور (دیکھو!) اس سے پہلے تمہارے پاس یوسفؑ آئے تھے واضح نشانیاں لے کر''

تمہارے اسی ملک مصر میں اس سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام بھی اللہ تعالیٰ کے نبی کی حیثیت سے تمہارے آباء واجداد کے پاس آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تاویل الاحادیث کا علم عطا کیا تھا۔ انہوں نے بادشاہ کو اس کے خواب کی تعبیر بتلا کر آنے والی قحط سالی کے تدارک کی تدبیر بھی بتائی تھی اور اس طرح اس ملک کو تباہی سے بچایا تھا۔ اس کے باوجود تمہاری قوم نے نہ تو ان کی نصیحتوں پر کان دھرا اور نہ ہی انہیں اللہ کا نبی مانا۔ اس آیت سے ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے درمیان بنی اسرائیل میں کوئی اور نبی نہیں آئے۔ اگر حضرت یوسفؑ کے بعد کوئی اور نبی بھی آئے ہوتے تو مؤمنِ آلِ فرعون اُن کا بھی ذکر کرتے۔ البتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک چودہ سو سال کے دوران بنی اسرائیل میں بغیر کسی وقفے کے مسلسل نبوت رہی۔ یہاں حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں یہ نکتہ بھی مدِنظر رہے کہ آپؑ رسول نہیں' صرف نبی تھے۔

﴿فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ؕ﴾ ''لیکن تم شکوک وشبہات میں ہی پڑے رہے ان تعلیمات کے بارے میں جو وہ تمہارے پاس لے کر آئے تھے۔''

﴿حَتّٰۤى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ؕ﴾ ''یہاں تک کہ جب وہ فوت ہو گئے تو تم نے کہا کہ اب ان کے بعد اللہ کسی اور کو رسول بنا کر نہیں بھیجے گا۔''

یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی میں تو انہیں اللہ کا پیغمبر تسلیم نہ کیا مگر فوت ہونے پر ان کا ذکر پیغمبر کے طور پر ہی کیا۔

﴿كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ ۝۳۴﴾ ''اسی طرح اللہ گمراہ کر دیتا ہے ان لوگوں کو جو حد سے بڑھنے والے اور شکوک وشبہات میں مبتلا رہنے والے ہوں۔''

آیت ۳۵ ﴿الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ؕ﴾ ''جو اللہ کی آیات کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر کسی سند کے جو اُن کے پاس آئی ہو۔''

﴿كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ﴾ ''بڑی بیزاری کی بات ہے یہ اللہ کے نزدیک بھی اور اہلِ ایمان کے نزدیک بھی۔''

﴿كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝۳۵﴾ ''اسی طرح اللہ مہر لگا دیا کرتا ہے ہر اُس شخص کے دل پر جو متکبر اور سرکش ہو۔''

اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کے بعد پھر ایسے لوگوں کو ایمان کی دولت نصیب نہیں ہوتی۔

مؤمنِ آلِ فرعون کی اس تقریر کو پڑھتے ہوئے فرعون کے دربار کا نقشہ ذہن میں لائیے اور در و دیوار کے درمیان سے اُبھرنے

والی اس تصویر کو غور سے دیکھئے! فرعون نظریں زمین پر گاڑے بُت بنا بیٹھا ہے۔ اس کے دائیں بائیں سب کے سب درباری مبہوت ہو چکے ہیں' پورے دربار میں سناٹے کا عالم ہے۔ فضا میں صرف ایک آواز گونج رہی ہے اور وہ ہے حق کی آواز! مردِ مؤمن پُر جلال انداز میں اپنی تقریر جاری رکھے ہوئے ہے۔ تقریر نہایت مؤثر اور مربوط ہے۔ اس میں عقلی دلائل بھی ہیں اور تاریخی شواہد بھی۔ دعوت کا انداز بھی ہے اور عبرت کا سامان بھی۔ ماحول پر گہری سنجیدگی طاری ہو چکی ہے۔ اس صورتِ حال میں فرعون کرے تو کیا کرے۔ نہ تو اسے چپ رہنے کا یارا ہے اور نہ بولنے کا حوصلہ۔ اندیشہ ہائے دور دراز کے جھرمٹ میں اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ ''فرعون'' ہے۔ پھر کچھ دیر کے بعد جب وہ اس کیفیت سے باہر آتا بھی ہے تو مردِ مؤمن کو جواب دینے کے بجائے اپنے وزیر سے مخاطب ہونا مناسب سمجھتا ہے:

آیت ۳۶ ﴿وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝۳۶﴾ ''اور فرعون نے کہا: اے ہامان! میرے لیے ایک بلند عمارت بنواؤ تا کہ میں پہنچ جاؤں راستوں تک۔''

آیت ۳۷ ﴿اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى﴾ ''یعنی آسمان کے راستوں تک' پھر میں جھانک کر دیکھوں موسیٰ کے الٰہ کو''

یہ موسیٰ جس الٰہ کا ذکر کرتا ہے میں اُس تک پہنچ کر خود اُسے دیکھنا چاہتا ہوں۔

﴿وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ۭ﴾ ''اور میرا گمان تو یہ ہے کہ وہ جھوٹا ہے۔''

﴿وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْۗءُ عَمَلِهٖ﴾ ''اور اس طرح فرعون کے لیے اس کا بُرا عمل بھی مزین کر دیا گیا''

یعنی فرعون کی نگاہوں میں اُس کی بدعملی خوشنما بنا دی گئی۔

﴿وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ۝۳۷﴾ ''اور اسے روک دیا گیا سیدھی راہ سے۔ اور فرعون کی یہ چال نہیں تھی مگر تباہ ہونے کے لیے۔''

فرعون کی بے بسی کی ایک تصویر تو ہم قبل ازیں آیت ۲۹ میں دیکھ آئے ہیں: ﴿مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۝۲۹﴾ کہ دیکھو بھئی! یہ تو میری رائے ہے' مجھے جو بات صحیح محسوس ہوئی وہ میں نے آپ لوگوں کے سامنے رکھ دی۔ اب آیت زیر مطالعہ میں جو منظر دکھایا گیا ہے اس میں وہ پہلے سے بھی زیادہ بے بس نظر آ رہا ہے۔ یہ جملے بولتے ہوئے نہ تو اس نے مردِ مؤمن کی کسی بات کا جواب دیا اور نہ ہی وہ اس سے نظریں ملا سکا۔ ایک طویل خاموشی کے بعد اس نے بات کی بھی تو اپنے وزیر سے کی اور بات بھی نہایت بے تکی اور لایعنی کی! کہ مجھے کوئی اونچا سا مینار بنا دو تا کہ میں اس پر چڑھ کر موسیٰ کے معبود کو دیکھ سکوں! واہ رے بادشاہ سلامت واہ! اسے کہتے ہیں کھسیانی بلّی کھمبا نوچے!

اللہ تعالیٰ کے وجود کے خلاف ایسی ہی ایک ''پختہ دلیل'' موجودہ دور کے لال بجھکڑوں کو بھی سوجھی تھی جب انہوں نے کہا تھا کہ ہم تو چاند تک بھی ہو آئے ہیں' ہمیں تو کہیں کوئی خدا نظر نہیں آیا۔ مردِ مؤمن نے بہر حال فرعون کی اس فضول اور بے محل بات کو نظر انداز کر کے کمال سنجیدگی سے اپنی تقریر کو جاری رکھا:

آیات ۳۸ تا ۵۰

وَ قَالَ الَّذِیْۤ اٰمَنَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِیْلَ الرَّشَادِ ﴿۳۸﴾ یٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا
مَتَاعٌ ۫ وَّ اِنَّ الْاٰخِرَةَ هِیَ دَارُ الْقَرَارِ ﴿۳۹﴾ مَنْ عَمِلَ سَیِّئَةً فَلَا یُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَ مَنْ
عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ یُرْزَقُوْنَ فِیْهَا بِغَیْرِ
حِسَابٍ ﴿۴۰﴾ وَ یٰقَوْمِ مَا لِیْۤ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَ تَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَى النَّارِ ﴿۴۱﴾ تَدْعُوْنَنِیْ لِاَكْفُرَ
بِاللّٰهِ وَ اُشْرِكَ بِهٖ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ ۫ وَّ اَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِیْزِ الْغَفَّارِ ﴿۴۲﴾ لَا جَرَمَ اَنَّمَا
تَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ لَیْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِی الدُّنْیَا وَ لَا فِی الْاٰخِرَةِ وَ اَنَّ مَرَدَّنَاۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اَنَّ
الْمُسْرِفِیْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴿۴۳﴾ فَسَتَذْكُرُوْنَ مَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ ؕ وَ اُفَوِّضُ اَمْرِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۴۴﴾ فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَ حَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ﴿۴۵﴾
اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِیًّا ۚ وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ
الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾ وَ اِذْ یَتَحَآجُّوْنَ فِی النَّارِ فَیَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا
فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِیْبًا مِّنَ النَّارِ ﴿۴۷﴾ قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا كُلٌّ فِیْهَاۤ ۙ اِنَّ اللّٰهَ
قَدْ حَكَمَ بَیْنَ الْعِبَادِ ﴿۴۸﴾ وَ قَالَ الَّذِیْنَ فِی النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ یُخَفِّفْ عَنَّا
یَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ﴿۴۹﴾ قَالُوْۤا اَوَ لَمْ تَكُ تَاْتِیْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَیِّنٰتِ ؕ قَالُوْا بَلٰى ؕ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ
وَ مَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ﴿۵۰﴾ ع ۵

آیت ۳۸ ﴿وَقَالَ الَّذِیْۤ اٰمَنَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِیْلَ الرَّشَادِ ﴿۳۸﴾﴾ ''اور کہا اُس مؤمن نے کہ اے میری قوم کے لوگو! تم میری پیروی کرو، مَیں تمہاری راہنمائی کروں گا نیکی کے راستے پر۔''

یہ گویا فرعون کی اس بات کا جواب ہے جو اُس نے کہا تھا: ﴿وَمَاۤ اَهْدِیْكُمْ اِلَّا سَبِیْلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾﴾ ''اور میں تمہاری راہنمائی نہیں کر رہا مگر کامیابی کے راستے کی طرف''۔ جواب میں مردِ مؤمن نے فرعون ہی کے الفاظ دہراتے ہوئے اہلِ دربار کو مخاطب کیا ہے کہ اگر کوئی ''سبیل الرشاد'' کی بات کرتا ہے تو آؤ مَیں تمہیں بتاتا ہوں کہ ''سبیل الرشاد'' کیا ہے۔ تم میری بات مانو، میرے پیچھے آؤ، مَیں تمہاری راہنمائی کرتا ہوں کہ بھلائی اور کامیابی کیا ہوتی ہے اور کون سا راستہ رشد و ہدایت اور فلاح و کامیابی کی طرف جاتا ہے۔

آیت ۳۹ ﴿یٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا مَتَاعٌ ۫ وَّ اِنَّ الْاٰخِرَةَ هِیَ دَارُ الْقَرَارِ ﴿۳۹﴾﴾ ''اے میری قوم کے لوگو! یہ دنیا کی زندگی تو بس (چند روزہ) برتنے کا سامان ہے اور مستقل رہنے کی جگہ تو آخرت ہے۔''

آیت ۴۰ ﴿مَنْ عَمِلَ سَیِّئَةً فَلَا یُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ﴾ ''جس نے کوئی بدی کمائی ہوگی تو اُسے بدلہ ملے گا اُسی کے مانند۔''

﴿وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾ ''اور جو کوئی نیک عمل کرے گا' چاہے مرد ہو یا عورت' لیکن ہو وہ مؤمن''

﴿فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۴۰﴾ ''تو وہی لوگ جنّت میں داخل ہوں گے' وہاں انہیں رزق ملے گا بغیر حساب کے۔''

آیت ۴۱ ﴿وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ۝۴۱﴾ ''اور اے میری قوم کے لوگو! مجھے کیا ہے کہ مَیں تمہیں پکار رہا ہوں نجات کی طرف اور تم مجھے دعوت دے رہے ہو آگ کی!''

تم اللہ کے رسولؑ کو قتل کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے ہو اور مجھ سے چاہتے ہو کہ میں بھی اس گناہ میں تمہارے ساتھ شریک ہو کر جہنّم کا مستحق بن جاؤں' جبکہ میں چاہتا ہوں کہ تم سب میرے ساتھ آؤ' میرا راستہ اپناؤ' اللہ کے حضور توبہ کرو اور جہنّم سے نجات پا کر جنّت میں چلے جاؤ۔

آیت ۴۲ ﴿تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ﴾ ''تم مجھے دعوت دے رہے ہو اس بات کی کہ میں اللہ کا کفر کروں اور شریک ٹھہراؤں اس کے ساتھ جس کا مجھے کوئی علم نہیں''

﴿وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ۝۴۲﴾ ''اور مَیں تمہیں بلا رہا ہوں اُس ذات کی طرف جو زبردست ہے' بخشش کرنے والا ہے۔''

آیت ۴۳ ﴿لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْاٰخِرَةِ﴾ ''بلاشبہ جن (معبودوں) کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو' اُن کے لیے کوئی دعوت نہ دنیا میں ہے اور نہ آخرت میں''

یہ سب تمہارے خود ساختہ معبود ہیں۔ نہ تو دنیا میں کہیں ان کی رسائی ہے اور نہ ہی آخرت میں انہیں کوئی اختیار ہے۔

﴿وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَى اللّٰهِ﴾ ''اور یہ کہ ہم سب کو لوٹنا تو اللہ ہی کی طرف ہے''

یاد رکھو! خواہی نخواہی ہمیں ایک دن حاضر تو اللہ ہی کے حضور ہونا ہے۔

﴿وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۝۴۳﴾ ''اور جو حد سے گزرنے والے ہیں وہی جہنّمی ہیں۔''

آیت ۴۴ ﴿فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ﴾ ''تو عنقریب تم یاد کرو گے (یہ باتیں) جو میں تم سے کہہ رہا ہوں۔''

میں جانتا ہوں کہ تم میری ان باتوں کو نہیں مانو گے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تم موسیٰؑ اور اس کی قوم کے خلاف اپنی ساری چالیں چل کر رہو گے۔ مگر یاد رکھو! اگر تم نے ایسا کیا تو یقیناً تم اپنی تباہی اور بربادی کو دعوت دو گے۔ بہرحال میری یہ باتیں تمہیں اُس وقت ضرور یاد آئیں گی جب تمہارا بھیانک انجام تمہارے سامنے آن کھڑا ہوگا۔

﴿وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾ ''اور مَیں تو اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔''

یہ مردِ مؤمن کی تقریر کے اختتامی الفاظ ہیں۔ اس جملے کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ فرعون کے دربار میں کلمۂ حق بلند کرنے کے بعد مردِ مؤمن ذہنی طور پر کسی بھی سزا کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔ انہیں اندازہ تھا کہ اس ''گستاخی'' کے بعد انہیں قتل کر دیا جائے گا۔

چنانچہ انہوں نے اپنی تقریر کا اختتام اس خوبصورت جملے پر کیا۔ سورۂ یٰسٓ میں بھی ایک مردِ مؤمن کی ''حق گوئی و بے باکی'' کا ذکر ہوا ہے' جس نے اپنی قوم کو رسولوں کی پیروی کرنے کا مشورہ دیا تھا اور اپنے ایمان کا ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا تھا۔ اس ''اعلانِ بغاوت'' کے نتیجے میں اس کو اسی لمحے شہید کر دیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسی وقت اسے جنّت میں داخل فرما دیا تھا۔ قرآن حکیم میں اس کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ﴿قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۝۲۶ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝۲۷﴾ (یٰسٓ) ''اُس نے کہا: کاش! میری قوم کو معلوم ہو جاتا میرے رب نے جس طرح میری مغفرت فرمائی ہے اور جس طرح مجھے باعزّت لوگوں میں شامل کر لیا ہے!'' مؤمن آلِ فرعون نے بھی اپنی شہادت کے امکان کو دیکھتے ہوئے کمال اطمینان سے اپنا معاملہ اللہ ربّ العزت کو سونپ دیا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۴۴﴾ ''اللہ یقیناً اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔''

اسے یقین تھا کہ اللہ اپنے بندوں کے حالات سے خوب واقف ہے' وہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے۔ وہ جسے چاہے ظلم و زیادتی کا شکار ہونے سے بچا سکتا ہے۔

آیت ۴۵ ﴿فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا﴾ ''تو بچا لیا اللہ نے اُس کو ان کی چالوں کی برائیوں سے''

یہاں پر ہٗ کی ضمیر کا مرجع مؤمنِ آلِ فرعون بھی ہو سکتا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی۔ بعض مفسّرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد مؤمن آلِ فرعون ہے کہ اللہ نے اسے فرعون کے انتقام کا نشانہ بننے سے بچا لیا' لیکن اکثر حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس سے حضرت موسیٰؑ مراد ہیں۔ چونکہ اس بات کا آغاز فرعون کی اس قرارداد سے ہوا تھا جو اُس نے حضرت موسیٰؑ کو قتل کرنے کی اجازت کے لیے اپنے درباریوں کے سامنے پیش کی تھی۔ اس لیے زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ اس پوری تفصیل کے اختتام پر آیت زیر مطالعہ میں فرعون کے مذکورہ منصوبے کی ناکامی پر تبصرہ کیا گیا ہے کہ مؤمن آلِ فرعون کی اس تقریر کے بعد دربار کا ماحول ایسا نہ رہا کہ اس میں حضرت موسیٰؑ کے قتل کی قرارداد پاس ہو سکتی۔ چنانچہ فرعون اور اس کے درباری اس بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکے اور یوں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اُن کے شر سے محفوظ رکھا۔

﴿وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۝۴۵﴾ ''اور گھیر لیا آلِ فرعون کو بدترین عذاب نے۔''

آیت ۴۶ ﴿اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ﴾ ''آگ ہے جس پر وہ پیش کیے جاتے ہیں صبح و شام۔''

یہ قرآن مجید کی دوسری آیت ہے جس سے عذابِ قبر سے متعلق دلیل ملتی ہے۔ (نیز ملاحظہ ہو: سورۃ الفرقان کی آیت ۶۹ کی تشریح۔)

﴿وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝۴۶﴾ ''اور جس دن قیامت قائم ہوگی (اُس دن کہہ دیا جائے گا کہ) داخل کرو فرعون کی قوم کو شدید ترین عذاب میں۔''

اس آیت کے مفہوم کے مطابق آلِ فرعون کو شدید ترین عذاب میں تو قیامِ قیامت کے بعد داخل کیا جائے گا' لیکن اس سے پہلے قبر کی زندگی کے دوران صبح و شام انہیں آگ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے —— عذابِ قبر کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کے فرمودات بہت واضح ہیں۔ آپؐ کا فرمان ہے: ((اِنَّمَا الْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ اَوْ حُفْرَةٌ مِنْ حُفَرِ النَّارِ))[۵]

۵۔ سنن الترمذی' کتاب صفة القیامة والرقائق والورع' ح: ۲۴۶۰۔

''قبر یا تو جنّت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا جہنّم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا''۔ منکرینِ حدیث البتہ عذابِ قبر کی نفی کرتے ہیں۔ دراصل قبر کا معاملہ ایک دوسرے جہان کا معاملہ ہے جو عالمِ غیب ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ قبر سے مراد وہ مخصوص گڑھا نہیں جہاں میت کو دفن کیا جاتا ہے' بلکہ اس سے مراد عالمِ برزخ ہے۔ سورۃ المُطفّفِین میں عالمِ برزخ کی دو کیفیات عِلِّیِّین اور سِجِّین کا ذکر ملتا ہے۔ اس عالم میں انسان نیم شعوری کی کیفیت میں ہوتا ہے۔ اگر کوئی خوش قسمت ''عِلِّیِّین'' میں ہے تو وہاں جنّت کی کھڑکی کھلی ہوتی ہے اور وہ جنّت کی ٹھنڈی ہواؤں کے مزے لے رہا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ''سِجِّین'' میں جہنّم کی کھڑکی میں سے آگ کی لپٹ آ رہی ہوتی ہے۔

آیت ۴۷ ﴿وَاِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا﴾ ''اور جب وہ آگ میں ایک دوسرے سے جھگڑیں گے تو کمزور لوگ بڑے بننے والوں سے کہیں گے''

﴿اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ ۝۴۷﴾ ''ہم تو تمہاری پیروی کرتے تھے' تو کیا تم لوگ ہم سے آگ کے عذاب کا کوئی حصّہ کم کروا سکتے ہو؟''

دنیا میں تو تمہارا ہر جگہ حکم چلتا تھا۔ تو اگر یہاں پر بھی تمہارا کچھ اختیار ہے تو ہمارے عذاب میں کچھ کمی کروا دو۔ آخر ہم تمہاری پیروی کر کے ہی اس حال کو پہنچے ہیں۔

آیت ۴۸ ﴿قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ﴾ ''وہ بڑے بننے والے کہیں گے کہ ہم سبھی اس کے اندر پڑے ہوئے ہیں''

یعنی ابوجہل اور عتبہ بن ابی معیط جیسے بڑے بڑے سردار اپنی بے بسی اور بے چارگی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے پیروکاروں سے یوں معذرت کریں گے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ۝۴۸﴾ ''اللہ نے تو اپنے بندوں کے مابین فیصلہ کر دیا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری فیصلہ ہو چکا ہے اور ہم تم سب چونکہ مجرم تھے اس لیے اس عذاب کے مستحق ٹھہرے ہیں۔

آیت ۴۹ ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ۝۴۹﴾ ''اور کہیں گے وہ لوگ جو آگ میں ہوں گے جہنّم کے داروغوں (فرشتوں) سے' آپ اپنے رب سے دعا کریں کہ وہ ہم سے بس ایک دن ہی عذاب میں تخفیف کر دے۔''

آیت ۵۰ ﴿قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ﴾ ''وہ جواب میں کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس رسولؑ نہیں آتے رہے تھے واضح نشانیوں (اور واضح تعلیمات) کے ساتھ؟''

﴿قَالُوْا بَلٰى ۭ﴾ ''وہ کہیں گے: ہاں (آئے تو تھے)!''

﴿قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۝۵۰﴾ ''وہ کہیں گے: تو اب تم خود ہی پکارو! اور کافروں کی دعا نہیں ہے مگر بھٹک کر رہ جانے والی۔''

دنیا کی زندگی میں جن لوگوں نے کفر و انکار کی روش اختیار کی تھی آج اُن کی دعا بالکل صدا بصحرا ثابت ہوگی۔ ان لوگوں کی دعا کا

نہ کوئی اثر ہوگا اور نہ ہی اس کی کہیں شنوائی ہوگی۔ بالکل یہی کیفیت ان لوگوں کی بھی ہے جو دنیا میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں تو مانگتے ہیں مگر ساتھ ہی اپنی حرام خوری بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ باطل کی چاکری بھی کیے جا رہے ہیں' طاغوت کے حمایتی بھی بنے ہوئے ہیں اور اپنی سوچ اور فکر کو باطل طور طریقوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے نت نئی راہیں بھی تلاش کرتے رہتے ہیں۔ گویا ان کی وفاداری اور دوستی تو شیطان اور اس کے چیلوں سے ہوتی ہے مگر دعا اللہ سے کرتے ہیں۔ اس حوالے سے یہ حدیث پہلے بھی بیان ہو چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کا ذکر فرمایا جو بڑا طویل سفر کر کے (حج یا عمرہ کے لیے) آتا ہے۔ اس کے کپڑے بھی میلے ہو چکے ہیں اور بال بھی غبار آلودہ ہیں۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر ''یارب! یارب!'' پکارتا ہے۔ لیکن اُس کا کھانا بھی حرام کا ہے' اُس کا پینا بھی حرام کا ہے' اُس نے جو کپڑے پہن رکھے ہیں وہ بھی حرام کمائی کے ہیں' اور اس کے جسم نے حرام غذا سے نشوونما پائی ہے ــــ تو اُس کی دعا کیونکر قبول ہو؟ ((فَاَنّٰی یُسْتَجَابُ لِذٰلِکَ!))(۶)

۱۹۷۱ء کی جنگ کے دوران ہم نے دیکھا کہ پاکستان کی نصرت کے لیے حرمین شریفین میں قنوتِ نازلہ پڑھی جاتی تھی اور گڑگڑا کر دعائیں مانگی جاتی تھیں' مگر اللہ تعالیٰ نے ہمارے کرتوتوں کی وجہ سے اپنے گھر کے اندر مانگی گئی ان دعاؤں کو بھی ٹھکرا دیا اور جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔

لفظ ''کافر'' کو اس کے وسیع مفہوم کے تناظر میں رکھ کر غور کیجیے کہ اس کی زد کہاں کہاں پڑتی ہے۔ اس کا مصداق قانونی کُفار کے علاوہ وہ لوگ بھی ٹھہرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور نافرمانی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے سورۂ آل عمران کی آیت ۹۷ کے آخر میں سنائی گئی وعید بہت واضح ہے۔ مذکورہ آیت میں حج کا حکم دینے کے بعد فرمایا گیا: ﴿وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ ''اور جس نے کفر کیا تو (وہ جان لے کہ) اللہ بے نیاز ہے تمام جہان والوں سے''۔ یعنی جس نے صاحبِ استطاعت ہو کر بھی حج ادا نہیں کیا اُس نے گویا کفر کیا۔ اسی طرح تارکِ صلوٰۃ کے بارے میں حضور ﷺ کا بہت مشہور فرمان ہے: ((مَنْ تَرَکَ الصَّلَاۃَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ کَفَرَ جِهَارًا))(۷) ''جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی اُس نے علانیہ کفر کیا۔''

پس ایک کفر تو وہ ہے جس سے ایک مسلمان باقاعدہ مرتد ہو کر سزا کا مستحق ٹھہرتا ہے اور ایک کفر یہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے کسی خاص حکم کی نافرمانی سے سرزد ہوتا ہے اور جس کو کسی صاحبِ نظر نے ''جودم غافل سودم کافر'' کا عنوان دیا ہے۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو آج پوری دنیا کے مسلمان اس کفر کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ آج دنیا بھر میں مسلمانوں کا کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں جہاں اللہ تعالیٰ کے قانون کی حکمرانی ہو' جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان تو اس بارے میں یہ ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ (المائدۃ) ''جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں''۔ چنانچہ ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ اس حوالے سے آج ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ہم جس ملک کے شہری ہیں کیا وہاں شریعت اسلامی کی حکمرانی ہے؟ کیا ہمارے دیوانی و فوجداری معاملات قرآن کے قانون کے مطابق طے پا رہے ہیں؟ کیا ہمارا نظامِ معیشت اللہ کی مرضی کے مطابق چل رہا ہے؟ اور اگر ایسا نہیں ہے' اور یقیناً نہیں ہے' تو کیا ہم سورۃ المائدۃ کی مذکورہ آیت کے مصداق نہیں بن چکے ہیں؟

۶۔ صحیح مسلم' کتاب الزکاۃ' باب قبول الصدقۃ من الکسب الطیب وتربیتھا۔

۷۔ المعجم الاوسط للطبرانی: ۳۴۳/۳۔ الترغیب والترھیب للمنذری: ۲۶۱/۱۔ مجمع الزوائد للھیثمی: ۳۰۰/۱۔ الجامع الصغیر للسیوطی' ح: ۸۵۸۷۔ عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ۔

آیات ۵۱ تا ۶۰

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴿۵۱﴾ يَوْمَ لَا
يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۵۲﴾ وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى
وَ اَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ ﴿۵۳﴾ هُدًى وَّ ذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۵۴﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ
اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۵۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ
فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۙ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ
اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿۵۶﴾ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ
النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَ مَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ۙ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ
لَا الْمُسِيْٓءُ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۸﴾ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ
لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ
سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴿۶۰﴾ ع

آیت ۵۱ ﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴿۵۱﴾﴾ ''ہم لازماً مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور اُن لوگوں کی جو ایمان لائے دنیا کی زندگی میں بھی' اور اُس دن بھی (مدد کریں گے) جس دن گواہ کھڑے ہوں گے۔''

آیت ۵۲ ﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ﴾ ''جس دن کہ ظالموں کو اُن کی معذرت کچھ فائدہ نہ دے گی''
﴿وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۵۲﴾﴾ ''اور اُن کے لیے لعنت ہوگی اور اُن کے لیے بہت بُرا گھر ہوگا۔''

آیت ۵۳ ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَاَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ ﴿۵۳﴾﴾ ''اور ہم نے موسیٰؑ کو ہدایت دی تھی اور ہم نے وارث بنایا تھا بنی اسرائیل کو کتاب کا۔''

آیت ۵۴ ﴿هُدًى وَّذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۵۴﴾﴾ ''جو ہدایت اور یاددہانی تھی ہوشمندوں کے لیے۔''

آیت ۵۵ ﴿فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ صبر کیجیے! یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے''
﴿وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ﴾ ''اور اپنے قصور کی معافی چاہیں''

اگر آپ خیال کرتے ہیں کہ کسی درجے میں بھی آپ سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے تو اللہ سے استغفار کیجیے۔ یہاں پر حضور ﷺ کے حوالے سے لفظ ''ذنب'' کے مفہوم اور اس کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی روحانی کیفیات اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ مستقل استحضار کا مخصوص انداز اور معیار ہے۔ اگر استحضار کے اس مخصوص معیار میں کسی لمحے کوئی کمی آ جائے تو اپنے احساس کی شدت کی وجہ سے انہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ یہ گویا ''حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ

المُقرّبین'' والا معاملہ ہے۔یعنی مقربینِ بارگاہ کا مقام اتنا بلند ہے کہ عام آدمی کے معیار کی نیکی ان کے معاملے میں شاید کوتاہی شمار ہوجائے۔

﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ﴿٥٥﴾﴾ ''اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کیجیے شام کو بھی اور صبح کو بھی۔''

آیت ۵۶ ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ﴾ ''یقیناً وہ لوگ جو اللہ کی آیات میں جھگڑے ڈالتے ہیں بغیر کسی سند کے جو اُن کے پاس آئی ہو''

﴿إِنْ فِي صُدُورِهِمْ إِلَّا كِبْرٌ مَّا هُم بِبَالِغِيهِ﴾ ''نہیں ہے اُن کے دلوں میں کچھ مگر تکبّر جس تک وہ پہنچنے والے نہیں ہیں۔''

ان کے دلوں میں صرف بڑائی کی خواہش ہے جو کبھی پوری نہیں ہوگی۔

﴿فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۖ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴿٥٦﴾﴾ ''پس آپ اللہ کی پناہ طلب کیجیے یقیناً وہ سب کچھ سننے والا ہر چیز کو دیکھنے والا ہے۔''

آیت ۵۷ ﴿لَخَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ﴾ ''آسمانوں اور زمین کی تخلیق یقیناً زیادہ بڑا کام ہے انسانوں کی تخلیق سے''

اس مفہوم کو جتنا آج ہم سمجھ سکتے ہیں آج سے چودہ سو سال پہلے انسان نہیں سمجھ سکتا تھا۔اس لیے کہ زمین و آسمان کی وسعتوں کے بارے میں آج کا انسان جو کچھ جانتا ہے اُس دور کا انسان تو اس کے مقابلے میں بہت کم جانتا تھا۔یہ کائنات اس قدر وسیع و عریض ہے کہ سائنس کی تمام تر ترقی اور بڑی بڑی ٹیلی سکوپس (telescopes) ایجاد کر لینے کے باوجود آج کے سائنس دان یہ تک نہیں جان سکے کہ اس کائنات کا نقطۂ آغاز کہاں ہے اور یہ ختم کہاں پر ہوتی ہے۔تو جس اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اتنی وسیع کائنات تخلیق کی ہے اُس کے لیے تمہاری تخلیق کیا معنی رکھتی ہے!

﴿وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٥٧﴾﴾ ''لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔''

آیت ۵۸ ﴿وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ﴾ ''اور برابر نہیں ہو سکتے اندھے اور آنکھوں والے''

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الْمُسِيءُ ۚ﴾ ''اور (نہ برابر ہو سکتے ہیں) وہ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے اور وہ جو بدکار ہیں۔''

﴿قَلِيلًا مَّا تَتَذَكَّرُونَ ﴿٥٨﴾﴾ ''بہت ہی کم ہے جو کہ تم سبق حاصل کرتے ہو۔''

آیت ۵۹ ﴿إِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٥٩﴾﴾ ''(اور دیکھو!) یقیناً قیامت آکر رہے گی اس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن اکثر لوگ ماننے والے نہیں ہیں۔''

آیت ۶۰ ﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ ''اور تمہارا رب کہتا ہے کہ مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔''

ابتدا میں بتایا گیا تھا کہ اس سورت کا مرکزی مضمون دعا ہے۔چنانچہ نوٹ کیجیے یہاں پھر فرمایا جا رہا ہے کہ اگر تم میرے بندے

ہوتو مجھ سے مانگو! انسان کا معاملہ یہ ہے کہ اُس سے مانگا جائے تو اس پر گراں گزرتا ہے جبکہ اللہ سے اگر نہ مانگا جائے تو وہ ناراض ہوتا ہے۔ گویا عطائے خداوندی خود سائلوں کی تلاش میں رہتی ہے ع ''ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں!'' نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ رات کے پچھلے پہر اللہ تعالیٰ سمائے دنیا تک نزول فرماتے ہیں اور ایک ندا ہوتی ہے: هَلْ مِنْ سَائِلٍ فَأُعْطِيَهُ، هَلْ مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَأَغْفِرَلَهُ ، هَلْ مِنْ تَائِبٍ فَأَتُوبَ عَلَيْهِ ، هَلْ مِنْ دَاعٍ فَأُجِيبَهُ (۸) ''ہے کوئی مانگنے والا کہ میں اسے عطا کروں؟ ہے کوئی گناہوں کی معافی مانگنے والا کہ میں اسے معاف کروں؟ ہے کوئی توبہ کرنے والا کہ میں اس کی توبہ قبول کروں؟ ہے کوئی پکارنے والا کہ میں اس کی پکار قبول کروں؟''

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ۝۶۰﴾ ''یقیناً وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کی بنا پر اعراض کرتے ہیں وہ داخل ہوں گے جہنّم میں ذلیل وخوار ہو کر۔''

قبل ازیں عبادت اور دعا کے لازم وملزوم ہونے کے بارے میں گفتگو ہو چکی ہے اور اس حدیث کا ذکر بھی ہو چکا ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ دعا ہی اصل عبادت ہے۔ چنانچہ اس آیت میں یہ نکتہ مزید واضح ہو گیا ہے۔ یہاں پر پہلے دعا کا ذکر کیا گیا ہے (اُدْعُوْنِيْٓ) اور پھر اسی کے لیے عبادت کا لفظ لایا گیا ہے۔ گویا اس آیت میں دعا اور عبادت مترادف الفاظ کے طور پر آئے ہیں۔

آیات ۶۱ تا ۶۸

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝۶۱ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝۶۲ كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ كَانُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝۶۳ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶۴ هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶۵ قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ ۫ وَ اُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶۶ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا ۚ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَ لِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۶۷ هُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۚ فَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۶۸ ع ۱۲

آیت ۶۱ ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ﴾ ''اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے رات

۸۔ صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین وقصرها، باب الترغیب فی الدعاء والذکر فی آخر اللیل ... ومسند احمد، کتاب باقی مسند المکثرین، باب باقی مسند السابق، ح ۹۲۲۰۔ راوی: حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ۔ واللفظ له۔

بنائی ہے تا کہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور دن بنا دیا ہے دیکھنے کے لیے۔''

اُس نے رات کو تاریک بنایا ہے تا کہ تم اس میں آرام کرو اور دن کو روشن بنایا ہے تا کہ تم اس میں کام کرو۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۶۱﴾﴾ ''یقیناً اللہ تو اپنے بندوں پر بہت فضل کرنے والا ہے' لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔''

آیت ۶۲ ﴿ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۖ﴾ ''وہ ہے اللہ تمہارا رب جو ہر چیز کا خالق ہے۔''

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۲﴾﴾ ''اُس کے سوا کوئی معبود نہیں' تو کہاں سے تم پھرائے جا رہے ہو!''

آیت ۶۳ ﴿كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ كَانُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۶۳﴾﴾ ''اسی طرح وہ لوگ بھی اُلٹے پھرائے گئے تھے جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے۔''

آیت ۶۴ ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً﴾ ''اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے بنا دیا زمین کو ٹھہرنے کی جگہ اور آسمان کو چھت''

﴿وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ﴾ ''اور تمہاری صورت گری کی' تو کیا ہی عمدہ تمہاری صورتیں بنائیں''

﴿وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ﴾ ''اور تمہیں رزق بہم پہنچایا پاکیزہ چیزوں سے۔''

﴿ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ﴾ ''وہ ہے اللہ تمہارا رب!''

﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۴﴾﴾ ''تو بہت بابرکت ہے اللہ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔''

آیت ۶۵ ﴿هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ ''وہ زندہ و جاوید ہستی ہے اُس کے سوا کوئی معبود نہیں''

ایک وہی ذات ہے جو خود زندہ ہے' صرف اُسی کی حیات ذاتی ہے۔ باقی زندگی جہاں بھی ہے' جس شکل میں بھی ہے اُسی کی عطا کردہ ہے۔ ہمیں بھی زندگی کے یہ چار دن اُسی نے مستعار دیے ہیں۔ ع ''عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن!''

﴿فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۭ﴾ ''پس اُسی کو پکارو! اُس کے لیے اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔''

نوٹ کیجیے' پھر وہی حکم دہرایا جا رہا ہے کہ دُعا اُسی سے مانگو' وہ قبول بھی کرے گا' مگر شرط یہ ہے کہ تمہاری اطاعت خالص اُسی کے لیے ہونی چاہیے۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۵﴾﴾ ''کُل حمد اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔''

آیت ۶۶ ﴿قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے: مجھے تو روک دیا گیا ہے کہ مَیں بندگی کروں اُن کی جن کو تم پکار رہے ہو اللہ کے سوا''

آیت ۶۰ کی طرح یہاں بھی عبادت (اَعْبُدَ) اور دعا (تَدْعُوْنَ) کے الفاظ ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔

﴿لَمَّا جَآءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ ۡ﴾ ''جبکہ میرے پاس آ چکی ہیں واضح تعلیمات میرے رب کی طرف سے''

﴿وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۶﴾﴾ ''اور مجھے تو حکم ہوا ہے کہ میں سرِ تسلیم خم کر دوں تمام جہانوں

کے پروردگار کے سامنے۔''

جہاں تک سورۃ المؤمن میں توحیدِ عملی کے داخلی پہلو یعنی دعا کے مضمون کا تعلق ہے وہ اس سورت کی آیت ۶۵ پر اختتام پذیر ہو چکا ہے۔ اس کے بعد اس سورت میں بھی انہی مضامین کی جھلک نظر آئے گی جو عام طور پر مکّی سورتوں میں آئے ہیں۔ البتہ یہاں پر یہ مضامین قدرے مختلف اسلوب اور ترتیب میں نظر آئیں گے۔ ان ہی مضامین میں سے ایک انسان کی تخلیق کا ذکر ہے:

آیت ۶۷ ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ﴾ ''وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا پہلے مٹی سے' پھر نطفے سے' پھر علقہ سے''

عَلَقَہ کے لغوی معنی ایسی چیز کے ہیں جو کسی دوسری چیز کے ساتھ معلّق ہو۔ اس لفظ میں بچے کی تخلیق کے حوالے سے دوسرے مرحلے کی کیفیت بیان ہوئی ہے جب نطفہ رحمِ مادر کی دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی ایک جونک کی سی شکل اختیار کر لیتا ہے ـــــ لفظ ''عَلَقَہ'' کی مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ المؤمنون کی آیت ۱۴ کی تشریح۔

﴿ثُمَّ یُخْرِجُكُمْ طِفْلًا﴾ ''پھر وہ تمہیں نکال لیتا ہے ایک بچے کی حیثیت سے''

﴿ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ﴾ ''پھر (تمہیں پروان چڑھاتا ہے) تاکہ تم پہنچ جاؤ اپنی جوانی کو''

﴿ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُیُوْخًا ۚ﴾ ''پھر (تمہیں مزید عمر دیتا ہے) تاکہ تم ہو جاؤ بوڑھے۔''

یعنی حیاتِ انسانی کا دورانیہ (life cycle) عام طور پر اسی نہج پر چلتا ہے۔

﴿وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ﴾ ''اور تم میں سے بعض وہ بھی ہیں جنہیں اس سے پہلے ہی وفات دے دی جاتی ہے''

بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو بڑھاپے کی عمر تک نہیں پہنچ پاتے۔ کوئی بچپن میں فوت ہو جاتا ہے اور کوئی جوانی میں۔

﴿وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ ''اور (بعض کو مہلت دیتا ہے) تاکہ تم ایک وقتِ معیّن کو پہنچ جاؤ اور (یہ اس لیے ہے) تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔''

چاہے کوئی بچپن میں ہی انتقال کر جائے' کوئی جوانی میں فوت ہو یا کوئی بہت طویل عمر پالے' ہر شخص نے اپنی موت تک بہرصورت زندہ رہنا ہے اور ہر شخص کی موت کا وقت اللہ کے ہاں مقرر اور طے شدہ ہے۔

آیت ۶۸ ﴿هُوَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۚ﴾ ''وہی ہے جو زندہ رکھتا ہے اور موت وارد کرتا ہے۔''

﴿فَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ﴾ ''چنانچہ (اُس کے امر کی شان تو یہ ہے کہ) جب وہ کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔''

آیات ۶۹ تا ۷۸

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِ اللّٰهِ ؕ اَنّٰى یُصْرَفُوْنَ ۙ﴿۶۹﴾ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ
اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ۚ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۷۰﴾ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ؕ یُسْحَبُوْنَ ۙ﴿۷۱﴾ فِی

الْحَمِيْمِ ۙ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ﴿۷۲﴾ ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۳﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ
قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـًٔا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۴﴾ ذٰلِكُمْ
بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ﴿۷۵﴾ اُدْخُلُوْۤا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۷۶﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ
بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ
مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ؕ وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ
بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۷۸﴾ ع

آیت ۶۹ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''کیا تم نے غور نہیں کیا اُن لوگوں کے حال پر جو اللہ کی آیات کے بارے میں جھگڑتے ہیں!''

اَلَمْ تَرَ کا لفظی ترجمہ تو یہ ہوگا کہ کیا تم نے دیکھا نہیں؟ لیکن اس کا مفہوم یہی ہے کہ کیا تم نے غور نہیں کیا؟

﴿اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ ﴿۶۹﴾﴾ ''وہ کہاں سے پھرائے جا رہے ہیں؟''

یعنی وہ حق کے قریب پہنچ کر واپس پلٹ گئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں محمد ﷺ کا دور نصیب ہوا' آپؐ کے ساتھ ایک شہر اور ایک جگہ اکٹھے رہنے کا موقع ملا۔ لیکن ان کی بدقسمتی ملاحظہ کیجیے کہ اللہ تعالیٰ کے اتنے بڑے انعام کے باوجود بھی یہ لوگ ہدایت سے محروم رہ گئے۔ مقامِ عبرت ہے! دیکھو یہ لوگ کہاں تک پہنچ کر ناکام لوٹے ہیں: ؎

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا!

آیت ۷۰ ﴿الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَاۤ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۰﴾﴾ ''وہ لوگ کہ جنہوں نے جھٹلایا کتاب کو اور اُن چیزوں کو جن کے ساتھ ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو' تو عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔''

بس کچھ ہی وقت کی بات ہے' اصل حقیقت ان پر منکشف ہو جائے گی۔

آیت ۷۱ ﴿اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ؕ يُسْحَبُوْنَ ﴿۷۱﴾﴾ ''جب ان کی گردنوں میں طوق پڑے ہوں گے اور وہ زنجیروں میں جکڑے ہوں گے' (اس حالت میں) انہیں گھسیٹا جائے گا۔''

آیت ۷۲ ﴿فِي الْحَمِيْمِ ۙ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ﴿۷۲﴾﴾ ''کھولتے پانی میں' پھر انہیں آگ میں جھونک دیا جائے گا۔''

آیت ۷۳ ﴿ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۳﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''پھر ان سے کہا جائے گا: کہاں ہیں وہ جنہیں تم شریک بنایا کرتے تھے اللہ کے سوا؟''

﴿قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـًٔا ؕ﴾ ''وہ کہیں گے: سب گم ہو گئے ہم سے' بلکہ ہم نہیں پکار رہے تھے اس سے پہلے کسی بھی شے کو۔''

اے اللہ! آج اس وقت ہم پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ جنہیں معبود سمجھ کر ہم پکارا کرتے تھے ان کا تو کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

﴿كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ۝۷۴﴾ ''اسی طرح اللہ بھٹکا دیتا ہے کافروں کو۔''

آیت ۷۵ ﴿ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ۝۷۵﴾ ''یہ سب اس لیے ہوا کہ تم زمین میں ناحق اِتراتے تھے اور اس لیے بھی کہ تم اکڑا بھی کرتے تھے۔''

تم لوگ دنیا کے مال و متاع پر خواہ مخواہ اکڑفوں دکھاتے تھے۔ گویا تم ہلدی کی گانٹھ مل جانے پر پنساری بن بیٹھے تھے۔ حالانکہ دنیا میں تمہارا وہ سارا مال و متاع ہمارا ہی عطا کیا ہوا تھا جس پر اترانے اور فخر جتلانے کا تمہیں کوئی حق نہیں تھا۔

آیت ۷۶ ﴿اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ﴾ ''اب داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں میں' اس میں ہمیشہ رہنے کے لیے۔''

﴿فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝۷۶﴾ ''تو یہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے متکبرین کا۔''

اب اگلی آیت میں حضور ﷺ سے خطاب کر کے آپؐ کی وساطت سے تمام مسلمانوں کو تسلی دی جا رہی ہے:

آیت ۷۷ ﴿فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ صبر کیجیے' یقیناً اللہ کا وعدہ حق ہے۔''

اللہ کا وعدہ ہے کہ اُس کا دین ضرور غالب ہوگا: ﴿مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝۲﴾ (طٰہٰ) ''ہم نے یہ قرآن آپؐ پر اس لیے تو نازل نہیں کیا کہ آپؐ ناکام ہو جائیں''۔ (معاذ اللہ!)

﴿فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ﴾ ''تو اگر ہم آپؐ کو دکھا دیں اس میں سے کچھ جس کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں یا ہم آپؐ کو وفات دے دیں''

یہ مضمون قرآن حکیم میں متعدد بار آ چکا ہے کہ جس عذاب کے بارے میں انہیں خبردار کیا جا رہا ہے وہ ان پر آپؐ کی زندگی میں بھی آ سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان پر وہ بُرا وقت آپؐ کے دنیا سے چلے جانے کے بعد آئے۔

﴿فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ۝۷۷﴾ ''پھر ان کو ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔''

مجھے انہیں پکڑنے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ وہ بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ انہوں نے آنا تو بہر حال میرے ہی پاس ہے۔

آیت ۷۸ ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۭ﴾ ''اور ہم نے بہت سے رسول بھیجے آپؐ سے پہلے' ان میں سے کچھ وہ بھی ہیں جن کا ذکر ہم نے آپؐ سے کیا ہے اور کچھ وہ بھی ہیں جن کا ذکر ہم نے آپؐ سے نہیں کیا۔''

یعنی ان رسولوں میں سے بعض کے حالات آپ ﷺ کو سنا دیے ہیں اور بعض کے نہیں سنائے۔

﴿وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ﴾ ''اور کسی بھی رسول کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ کوئی نشانی لے آتا مگر اللہ کے اِذن سے۔''

کبھی کوئی رسول اپنی مرضی اور ذاتی کوشش سے اپنی قوم کو کوئی معجزہ نہیں دکھا سکا۔ یہ مضمون اکثر مکی سورتوں میں آیا ہے۔ گویا اس مضمون کی ڈور کا تسلسل زیر مطالعہ مکی سورتوں میں بھی نظر آ رہا ہے۔

﴿فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِیَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۷۸﴾﴾ ''پھر جب اللہ کا حکم آ گیا تو فیصلہ چکا دیا گیا حق کے ساتھ اور اُس وقت خسارے میں پڑ گئے جھٹلانے والے۔''

آیات ۷۹ تا ۸۵

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَ لَكُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ وَ لِتَبْلُغُوْا عَلَیْهَا حَاجَةً فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَیْهَا وَ عَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَ یُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ ۫ فَاَیَّ اٰیٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ﴿۸۱﴾ اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَ اَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِی الْاَرْضِ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۸۳﴾ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَ كَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِیْنَ ﴿۸۴﴾ فَلَمْ یَكُ یَنْفَعُهُمْ اِیْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ فِیْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ ع

آیت ۷۹ ﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۹﴾﴾ ''اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے چوپائے بنا دیے تاکہ تم سواری کرو ان میں سے بعض پر اور ان میں سے بعض کا تم گوشت بھی کھاتے ہو۔''

آیت ۸۰ ﴿وَلَكُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ﴾ ''اور ان میں تمہارے لیے اور بھی بہت سی منفعتیں ہیں''

یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ النحل میں بہت تفصیل سے آ چکا ہے۔

﴿وَلِتَبْلُغُوْا عَلَیْهَا حَاجَةً فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَیْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۸۰﴾﴾ ''اور تاکہ ان پر سوار ہو کر تم اپنی وہ ضرورتیں پوری کرو جو تمہارے دل میں ہوتی ہیں اور اُن پر بھی اور کشتیوں پر بھی تمہیں سوار کرایا جاتا ہے۔''

آیت ۸۱ ﴿وَیُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ ۫ فَاَیَّ اٰیٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ﴿۸۱﴾﴾ ''اور وہ تمہیں اپنی آیات دکھاتا رہتا ہے' تو تم اللہ کی کون کون سی آیات کا انکار کرو گے؟''

گزشتہ تین آیات میں آیاتِ آفاقیہ کا ذکر ہوا۔ اب آگے ''ایام اللہ'' یعنی عبرت آموز تاریخی حقائق کا تذکرہ ہے۔

آیت ۸۲ ﴿اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ﴾ ''تو کیا یہ لوگ زمین میں گھومے پھرے نہیں کہ غور کرتے کہ کیسا انجام ہوا اُن کا جو ان سے پہلے تھے!''

﴿كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِی الْاَرْضِ﴾ ''وہ ان سے کہیں زیادہ تھے تعداد میں اور زیادہ شدید تھے طاقت میں بھی اور زمین میں نشانات چھوڑنے کے اعتبار سے بھی''

﴿فَمَآ اَغۡنٰی عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا یَكۡسِبُوۡنَ ﴿۸۲﴾﴾ ''تو اُن کے کچھ کام نہ آیا وہ سب کچھ جو وہ کماتے رہے تھے۔''

ان کے یہ سارے کارنامے اور ساری کمائی انہیں اللہ کے عذاب سے نہ بچا سکی۔

آیت ۸۳ ﴿فَلَمَّا جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ﴾ ''تو جب آ گئے اُن کے پاس اُن کے رسول واضح نشانیاں لے کر''

اَلۡبَیِّنٰتِ سے مراد حسی معجزات بھی ہیں اور واضح تعلیمات اور دلائل بھی۔

﴿فَرِحُوۡا بِمَا عِنۡدَهُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ وَحَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ یَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۸۳﴾﴾ ''تو وہ اِتراتے رہے اسی پر جو بھی علم اُن کے پاس تھا اور گھیرے میں لے لیا انہیں اُسی چیز نے جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے۔''

وہ لوگ اپنے آبائی عقائد و توہمات پر جمے رہے اور انہی کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے رہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اس حق کا بھی مذاق اڑایا جو اُن کے رسولوں نے ان کے سامنے پیش کیا اور عذاب کی وعیدوں کا بھی جس سے انہیں خبردار کیا گیا۔ بالآخر انہیں اپنے کرتوتوں کی سزا مل کر رہی۔

آیت ۸۴ ﴿فَلَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحۡدَهٗ﴾ ''پھر جب انہوں نے دیکھ لیا ہمارا عذاب تب انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے اللہ واحد پر''

تب کہنے لگے کہ اب ہم توحید کے قائل ہو گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرتے ہیں۔

﴿وَكَفَرۡنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشۡرِكِیۡنَ ﴿۸۴﴾﴾ ''اور ہم نے انکار کیا ان (معبودوں) کا جنہیں ہم اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے رہے تھے۔''

آیت ۸۵ ﴿فَلَمۡ یَكُ یَنۡفَعُهُمۡ اِیۡمَانُهُمۡ لَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا ؕ﴾ ''تو پھر اُن کا ایمان لانا اُن کے لیے ہرگز مفید نہیں ہوا جبکہ انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا۔''

عذاب کے واضح آثار سامنے آ جانے کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور ایسے وقت کا ایمان اللہ کے ہاں قابلِ قبول نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اٹل قانون ہے اور اس قانون سے استثناء نوعِ انسانی کی پوری تاریخ میں صرف ایک ہی قوم کو ملا اور وہ تھی حضرت یونس علیہ السلام کی قوم۔ اس استثناء کا ذکر ہم سورۂ یونس کی آیت ۹۸ میں پڑھ چکے ہیں۔ دراصل حضرت یونس علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کی واضح اجازت آنے سے پہلے ہی اپنی قوم کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ چنانچہ نبیؑ کے کھاتے میں جو debit آیا وہ قوم کے لیے credit بن گیا۔ جدید اکاؤنٹنگ کے ماہرین خوب جانتے ہیں کہ ایک طرف کا debit دوسری طرف کا credit کیسے بن جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم نے عذاب کے واضح آثار دیکھ لینے کے بعد توبہ کر لی اور ان کی یہ توبہ اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالی۔

﴿سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِیۡ قَدۡ خَلَتۡ فِیۡ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الۡكٰفِرُوۡنَ ﴿۸۵﴾﴾ ''یہ اللہ کا وہ دستور ہے جو اُس کے بندوں میں جاری رہا ہے' اور اُس وقت کافر لوگ خسارے میں رہے۔''

واقعہ یہ ہے کہ اصل خسارہ تو کافروں ہی کے لیے ہے۔

سُوْرَۃُ حٰمٓ السَّجْدَۃِ

تمہیدی کلمات

سورۂ حٰمٓ السجدۃ کا دوسرا نام سورۂ فُصِّلَت ہے۔ دراصل ''السجدۃ'' کے نام سے قرآن مجید میں دو سورتیں ہیں اور دونوں ہی حروفِ مقطعات سے شروع ہوتی ہیں۔ سورۃ الاحزاب سے متصلاً قبل کی سورۃ السجدۃ الٓمّٓ سے شروع ہوتی ہے' اس نسبت سے اس کا پورا نام الٓمّٓ السجدۃ ہے۔ لیکن چونکہ عام طور پر وہ صرف ''السجدۃ'' کے نام سے معروف ہے' اس لیے ان دونوں میں فرق واضح کرنے کے لیے زیر مطالعہ سورت کو حٰمٓ السجدۃ کہا جاتا ہے۔

سورۂ حٰمٓ السجدۃ کا مرکزی مضمون ''دعوتِ توحید'' ہے۔ دعوت کے فلسفے کو سمجھنے کے لیے ایک ایسے شخص کا تصور ذہن میں لائیے جس نے عقیدۂ توحید کو اختیار کر کے اپنے دل و دماغ کو باطل نظریات اور مشرکانہ خیالات سے پاک کر لیا ہے۔ نورِ توحید سے اس کا سینہ منور ہو گیا ہے اور اُس نے خود کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پوری طرح جھکا لیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ وہ شخص کسی معاشرے کا حصہ ہے اور کسی بھی معاشرے میں رہتے ہوئے ایک توحید پرست شخص کے سامنے توحید کے حوالے سے درج ذیل دو صورتوں میں سے ایک صورت ضرور ہو گی۔ یا تو اس معاشرے میں اللہ کا دین غالب ہو گا اور وہاں اسلامی حکومت ہو گی' یا پھر وہاں اللہ کا دین مغلوب ہو گا۔ دین کے غلبے کی صورت میں تو ایک توحید پرست شخص کے لیے اللہ کی بندگی اختیار کرنا اور ہمہ تن اللہ کا بندہ بن کر رہنا آسان ہو گا۔ اور ایسی صورت میں اس سے تقاضا بھی یہی ہے۔ خلافت راشدہ کے دور میں معاشرے کی صورتِ حال ایسی ہی تھی۔ یعنی مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا نقشہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کے دین کے عین مطابق تھا۔ چنانچہ اس نظام کے تحت عام لوگ بڑی آسانی اور سہولت سے اللہ کی اطاعت اور بندگی میں اپنی زندگیاں گزار رہے تھے۔ لیکن اگر کسی معاشرے یا ملک میں باطل نظام غالب اور اللہ کا دین مغلوب ہو تو ایک مؤمن یا موحد شخص کے لیے اپنی پوری زندگی کو اللہ کی اطاعت اور بندگی میں ڈھالنا ممکن ہی نہیں۔ ایسی صورت میں کوئی بھی شخص اللہ کی بندگی پانچ' دس یا پندرہ فی صد تک یعنی جزوی طور پر ہی کر سکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایک توحید پرست شخص اگر ایسے معاشرے میں رہنے پر مجبور ہے جہاں باطل کا غلبہ ہے اور ملک میں مجموعی طور پر کفر کا نظام قائم ہے تو ایسی صورت میں وہ کیا کرے؟ چنانچہ ایک موحد شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسی صورتِ حال کو ذہنی طور پر تسلیم (reconcile) نہ کرے۔ وہاں رہتے ہوئے وہ احتجاج (protest) کی کیفیت میں زندگی بسر کرے' ہر وقت اس باطل نظام کو بدلنے اور اللہ کے دین کو غالب کرنے کی فکر میں رہے اور عملی طور پر اس کے لیے ہر ممکن جدّ و جُہد کرتا رہے۔ اس جدّ و جُہد کے حوالے سے اس کے لیے لازم ہو گا کہ وہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضروریاتِ زندگی کم سے کم اور ناگزیر حد (subsistence level) تک پوری کرنے کے بعد اپنی تمام تر صلاحیتیں' اپنا وقت اور اپنے وسائل باطل نظام کو اُکھاڑ پھینکنے اور اللہ کے دین کو غالب

کرنے کی کوشش میں کھپا دے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کی یہ جِدّ و جُہد اور کوشش گویا باطل نظام کے تحت زندگی بسر کرنے کے گناہ کا کفارہ بن جائے گی۔

نظریاتی طور پر اس نکتے کو سمجھ لینے کے بعد اب یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ عملی طور پر اس جِدّ و جُہد کی ترتیب و تدریج کیا ہوگی۔ ظاہر ہے یہ کام کسی اکیلے آدمی کے بس کا تو ہے نہیں' اکیلا چنا تو بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ باطل نظام کو اکھاڑ پھینکنا بہر حال کوئی آسان کام نہیں۔ اس کام کے لیے طاقت ناگزیر ہوگی اور طاقت حاصل کرنے کے لیے جمعیت درکار ہوگی۔ جبکہ جمعیت کی تشکیل کے لیے دعوت الی اللہ کو عام کرنے کی ضرورت ہوگی اور یہی سورۂ حٰمٓ السجدۃ کا مرکزی مضمون ہے۔ اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ ربّ العزت کے دین کی طرف بلانے کے کام کا بیڑا اہر اُس شخص کو اٹھانا ہوگا جس نے توحید کو ایک نظریہ کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ گویا ہر موحد شخص کو اپنے نظریے کا داعی بن کر میدانِ عمل میں اترنا ہوگا' دوسروں کو قائل کرنا ہوگا اور اپنے ساتھ ملانا ہوگا' تاکہ غلبۂ حق یا اقامتِ دین کی جِدّ و جُہد کے لیے جمعیت اور طاقت مہیّا ہو سکے۔

دعوت الی اللہ کے بارے میں ایک اہم بات یہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ دعوت کا آلہ اور ذریعہ (medium) قرآن مجید ہے۔ اس حوالے سے داعیانِ حق کے لیے قرآن میں بار بار تاکید آئی ہے کہ وہ انذار اور تبشیر کا ذریعہ بھی قرآن کو بنائیں' تذکیر و تذکر کے لیے بھی قرآن سے رجوع کریں اور خود اپنے تزکیۂ نفس کے لیے بھی قرآن ہی کا سہارا ڈھونڈیں۔ غرض وہ دعوت کے ہر ہر موڑ اور ہر ہر مرحلے پر ہدایت و رہنمائی قرآن سے حاصل کریں۔ قرآن حکیم میں اس حوالے سے قرآن کا ذکر بار بار آیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں قرآن کا ذکر سولہ مرتبہ ہوا ہے۔ گویا اس سورت کا تانا بانا ہی قرآن کے ذکر سے بُنا گیا ہے۔ اسی طرح سورۃ الفرقان میں بھی قرآن کے ذکر کی تکرار ملتی ہے۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ اس حوالے سے تیسرے نمبر پر ہے' چھ رکوعوں پر مشتمل اس مختصر سی سورت میں چھ مرتبہ قرآن کا حوالہ آیا ہے۔

یہاں پر یہ نکتہ بھی مدِّنظر رکھنا چاہیے کہ زیر مطالعہ سورتوں کا مرکزی مضمون ''توحیدِ عملی'' ہے اور ''دعوت'' کا یہ مضمون بھی اسی مضمون کا تسلسل ہے۔ اس تسلسل کو ذہن میں تازہ رکھنے کے لیے زیر مطالعہ سورتوں کے مضامین کی اس ترتیب کو ایک دفعہ پھر سے دہرا لیجیے کہ سورۃ الزمر اور سورۃ المؤمن میں توحیدِ عملی کا مضمون انفرادی سطح پر بیان ہوا ہے۔ سورۃ الزمر میں توحید فی العبادت پر زور دیا گیا ہے جبکہ سورۃ المؤمن میں توحید فی الدعاء کے حوالے سے تاکید ہے۔ البتہ عبادت اور دعا کے ساتھ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کی شرط ان دونوں سورتوں میں بار بار دہرائی گئی ہے۔ اس کے بعد سورۂ حٰمٓ السجدۃ اور سورۃ الشوریٰ میں توحیدِ عملی کا مضمون بتدریج اجتماعیت کی طرف بڑھتا ہے۔ اجتماعیت کے حصول کے لیے چونکہ جِدّ و جُہد کا آغاز دعوت سے ہوتا ہے' اس لیے سورۂ حٰمٓ السجدۃ کا مرکزی مضمون دعوت اِلی اللہ ہے۔ البتہ اس مرکزی مضمون کے ساتھ ساتھ مکّی سورتوں کے عام مضامین اور بعض علمی نکات بھی اس سورت میں ملیں گے۔

آیات ۱ تا ۱۲

سُوْرَةُ حٰمٓ السَّجْدَةِ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۵۴ رُكُوْعَاتُهَا: ۶

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۲﴾ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳﴾

بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝٤ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ
اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ۝٥ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ
مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۗ وَوَيْلٌ
لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۝٦ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝٧ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝٨ قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ
يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۗ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝٩ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَ
بٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ۗ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝١٠ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى
السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ۗ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ۝١١
فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ۗ وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا
بِمَصَابِيْحَ ۖ وَحِفْظًا ۗ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝١٢ ع

آیت ۱ ﴿حٰمٓ ۝١﴾ ''ح' م۔''

آیت ۲ ﴿تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝٢﴾ ''(اس کتاب کا) اتارا جانا ہے اُس ہستی کی طرف سے جو بے حد مہربان' نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی رحمت ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی مانند بھی ہے اور اس رحمت میں دوام اور تسلسل بھی ہے۔

آیت ۳ ﴿كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ﴾ ''یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات خوب کھول کھول کر بیان کر دی گئی ہیں''

یعنی قرآن مجید میں ہر چیز اور ہر موضوع کو تفصیل کے ساتھ علیحدہ علیحدہ (discretely) بیان کر دیا گیا ہے۔ اس سورت کا دوسرا نام (فُصِّلَتْ) اسی جملے سے لیا گیا ہے۔

﴿قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝٣﴾ ''قرآنِ عربی کی صورت میں' ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہوں (یا علم رکھنا چاہیں)۔''

آیت ۴ ﴿بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ﴾ ''بشارت دینے والی اور آگاہ کر دینے والی۔''

یہ کتاب بشارتیں بھی دیتی ہے اور خبردار بھی کرتی ہے۔ حضور ﷺ بھی تبشیر اور انذار کا حق قرآن مجید کے ذریعے سے ہی ادا فرماتے تھے۔ جیسا کہ سورۂ مریم میں فرمایا گیا: ﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ۝٩٧﴾ ''پس ہم نے تو آسان کر دیا ہے اس (قرآن) کو آپؐ کی زبان میں' تاکہ آپؐ بشارت دیں اس کے ساتھ متقین کو اور خبردار کریں اسی کے ذریعے جھگڑالو قوم کو۔''

﴿فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝٤﴾ ''تو ان کی اکثریت نے اعراض کیا اور وہ سنتے ہی نہیں ہیں۔''

آیت ۵ ﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ﴾ ''اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل پردوں میں ہیں اس چیز سے

جس کی طرف آپ ہمیں بلا رہے ہیں‘‘

﴿وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ﴾ ’’اور ہمارے کانوں میں بوجھ ہے‘‘

مشرکینِ مکہ رسول اللہ ﷺ سے ایسی باتیں ادب و احترام کے دائرے میں نہیں بلکہ آپؐ کو تنگ کرنے کے لیے گستاخانہ اور استہزائیہ انداز میں کرتے تھے۔ وہ لوگ مختلف طریقوں سے آپؐ کے سامنے اپنے اس موقف کو بار بار دہراتے رہتے تھے کہ آپؐ جس قدر چاہیں اپنے آپ کو ہلکان کر لیں‘ آپؐ کی یہ باتیں ہمارے دلوں میں اتر کر اپنا اثر نہیں دکھا سکتیں۔ آپؐ کی ان باتوں کو نہ تو ہم سنتے ہیں اور نہ ہی ان کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں‘ بلکہ ایسی باتیں سننے کے حوالے سے ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور ہمارے کان بہرے ہو گئے ہیں۔ اس لیے بہتر ہو گا کہ آپؐ خواہ مخواہ ہمیں تنگ نہ کریں۔

﴿وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ۝۵﴾ ’’اور ہمارے اور آپؐ کے درمیان تو ایک پردہ حائل ہے‘ تو آپ اپنا کام کریں‘ ہم اپنا کام کر رہے ہیں۔‘‘

یہ گویا ان کی طرف سے چیلنج تھا کہ آپؐ جو کچھ کر سکتے ہیں کر لیں‘ جتنا چاہیں زور لگا لیں ہم آپؐ کی اس دعوت کو چلنے نہیں دیں گے۔

آیت ۶ ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ ’’آپؐ کہہ دیجیے کہ مَیں تو بس ایک انسان ہوں تمہاری طرح کا‘‘

مخالفین کی طرف سے چیلنج کا گستاخانہ انداز دیکھئے اور حضور ﷺ کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔ یعنی مَیں نے تم لوگوں کے سامنے نہ تو خدائی کا دعویٰ کیا ہے اور نہ ہی مَیں نے کہا ہے کہ میں فرشتہ ہوں۔ مَیں تو بس ایک انسان ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میرے پاس اللہ ربّ العالمین کی طرف سے وحی آتی ہے۔

﴿يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾ ’’میری طرف وحی کی جا رہی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے‘‘

ان سورتوں کا مرکزی مضمون چونکہ توحید ہے‘ اس لیے سورت کے آغاز میں ہی اس مضمون کو نمایاں کیا جا رہا ہے۔

﴿فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۭ﴾ ’’تو اُسی کی طرف سیدھا رکھو اپنے رخ کو اور اس سے استغفار کرو۔‘‘

جو خطائیں اور غلطیاں اس سے پہلے ہو چکی ہیں ان کی معافی مانگو اور کفر و شرک کے عقائد سے توبہ کرو۔

﴿وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۝۶﴾ ’’اور بڑی تباہی اور ہلاکت ہو گی مشرکین کے لیے۔‘‘

آیت ۷ ﴿الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ﴾ ’’وہ لوگ جو خود کو پاک کرنے کی کوشش نہیں کرتے‘‘

یہاں یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ حضور ﷺ کے مکی دور میں زکوٰۃ کا کوئی نظام نہیں تھا۔ یہ نظام تو ہجرت کے بعد مدینہ میں جا کر قائم ہوا تھا۔ چنانچہ اگر لفظ زکوٰۃ مکی سورتوں میں آئے تو اس کے لغوی معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ لفظ زکوٰۃ کے لغوی معنی چونکہ پاکیزگی کے ہیں اس لیے اس جملے کا مفہوم یہی ہو گا کہ جو لوگ اپنے تزکیۂ نفس کی کوشش نہیں کرتے۔

﴿وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۷﴾ ’’اور وہ آخرت کے منکر ہیں۔‘‘

آیت ۸ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝۸﴾ ’’بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے‘ ان کے لیے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہو گا۔‘‘

آیت ۹ ﴿قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) آپ ان سے کہیے کہ کیا تم

لوگ کفر کر رہے ہو اُس ہستی کا جس نے زمین کو بنایا دو دنوں میں؟''

﴿وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ ''اور تم اس کے لیے مدِمقابل ٹھہرا رہے ہو! وہ ہے تمام جہانوں کا ربّ۔''

اَنْدَاد کا واحد 'نِدّ'' ہے جس کے معنی مدِمقابل کے ہیں۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا ہے تو اس کا مالک اور اصل حاکم بھی وہی ہے۔ لہٰذا دنیا میں اگر کوئی حاکم بنے گا تو اسے اللہ کا تابع اور ماتحت بن کر رہنا ہوگا۔ اس حیثیت سے وہ اللہ کا خلیفہ ہوگا۔ لیکن اگر کوئی اللہ کی اطاعت سے آزاد ہو کر حاکم بن بیٹھے اور خود کو مطلق اقتدار (sovereignty) کا حق دار سمجھنے لگے تو وہ گویا اللہ کا مدِمقابل ہے' چاہے وہ ایک فرد ہو یا کسی ملک کے کروڑوں عوام ہوں۔

آیت ۱۰ ﴿وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا﴾ ''اور اس میں اُس نے بنائے پہاڑوں کے لنگر اس کے اوپر سے''

﴿وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ۭ﴾ ''اور اس میں برکات پیدا کیں اور اس میں اندازے مقرر کیے اس کی غذاؤں کے' چار دنوں میں۔''

یعنی دو دنوں میں زمین کو پیدا کیا جو بذاتِ خود ایک بہت بڑی تخلیق ہے' پھر مزید دو دنوں میں اس کے اوپر سے اس پر پہاڑ جما دیے اور زمین کی مٹی کو روئیدگی کے قابل بنایا۔ زمین ابتدا میں تو آگ کے ایک کُرّے کی شکل میں تھی۔ آہستہ آہستہ یہ ٹھنڈی ہوئی۔ پہلے پہل اس کی مٹی میں صرف inorganic compounds پائے جاتے تھے۔ ہوتے ہوتے organic compounds پیدا ہوئے۔ اس کے بعد اس میں وہ صلاحیت اور اہلیت پیدا ہوئی کہ یہ زندگی کا گہوارہ بن سکے۔ یہ سارا عمل چار دنوں میں مکمل ہوا۔ یہ آیت بہ حال آیاتِ متشابہات میں سے ہے' ابھی تک ہم ان چار دنوں کی حقیقت اور تفصیل کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔

﴿سَوَاۗءً لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ ۝﴾ ''تمام سائلین کے لیے برابر۔''

زمین کی مختلف صلاحیتوں' اس کی پیداوار اور اس کے غذائی ذخائر پر ان سب کا حق برابر ہے جنہیں ان کی ضرورت ہے۔ اس میں کسی کے لیے کوئی خاص حصہ نہیں رکھا گیا۔

آیت ۱۱ ﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَاۗءِ وَهِيَ دُخَانٌ﴾ ''پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا' اور ابھی وہ ایک دھواں سا تھا''

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب آسمان ایک دھویں کی شکل میں تھا اور ابھی سات آسمانوں کی الگ الگ صورتیں وجود میں نہیں آئی تھیں۔ ان آیات میں کائنات کی تخلیق کے ابتدائی مرحلے سے متعلق کچھ اشارے پائے جاتے ہیں۔ سائنسی شواہد کے مطابق Big Bang کے بعد آگ کا ایک بہت ہی بڑا گولا وجود میں آیا۔ پھر اس گولے میں مزید دھماکے ہوئے اور اس طرح اس مادے کے جو حصے علیحدہ ہوئے ان سے کہکشائیں بننا شروع ہوئیں۔

﴿فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ۭ﴾ ''تو اُس نے آسمان اور زمین سے کہا کہ تم دونوں چلے آؤ خوشی سے یا جبراً!''

﴿قَالَتَآ اَتَيْنَا طَاۗىِٕعِيْنَ ۝﴾ ''ان دونوں نے کہا کہ ہم حاضر ہیں پوری آمادگی کے ساتھ۔''

آیت ۱۲ ﴿فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ﴾ ''پھر اُس نے ان کو سات آسمانوں کی شکل دے دی' دو دنوں میں۔''

قرآن حکیم میں سات مقامات پر یہ ذکر ملتا ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق چھ دنوں میں ہوئی لیکن یہ قرآن کا واحد مقام ہے جہاں نہ صرف ان چھ دنوں کی مزید تفصیل (break up) دی گئی ہے بلکہ اس تخلیقی عمل کی ترتیب (sequence) کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے۔ یعنی پہلے زمین بنی اور سات آسمان اس کے بعد وجود میں آئے۔ لیکن ابھی تک ہم نہ تو مذکورہ چھ دنوں کے مفہوم کو سمجھ سکے ہیں اور نہ ہی زمین و آسمان کے تخلیقی عمل کی ترتیب سے متعلق سائنٹیفک انداز میں کچھ جان سکتے ہیں۔ بہرحال ہمارا ایمان ہے کہ مستقبل میں کسی وقت سائنس ضرور ان معلومات تک رسائی حاصل کرے گی اور انسان اس حقیقت کی تہہ تک ضرور پہنچ جائے گا کہ زمین و آسمان کے وجود میں آنے کی صحیح ترتیب وہی ہے جو قرآن نے بیان فرمائی ہے۔

﴿وَاَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا﴾ ''اور اُس نے وحی کر دیا ہر آسمان پر اس کا حکم''

سات آسمان بنانے کے بعد ہر آسمان پر اس سے متعلق تفصیلی احکامات بھیج دیے گئے۔

﴿وَزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ ۖ وَحِفْظًا ؕ﴾ ''اور ہم نے آسمانِ دُنیا کو چراغوں سے مزین کر دیا اور اس کی خوب حفاظت کی۔''

چراغوں سے مراد ستارے ہیں۔ ستارے زمین سے قریب ترین آسمان کے لیے باعثِ زینت بھی ہیں اور شیاطین جن کی سرگرمیوں کے خلاف حفاظتی چوکیوں کا کام بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ جو شیاطین جن غیب کی خبریں حاصل کرنے کے لیے ممنوعہ حدود میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں ان پر ان ستاروں سے میزائل داغے جاتے ہیں۔ (اس موضوع پر مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سورۃ الحجر کی آیت ۱۷ اور سورۃ الانبیاء کی آیت ۳۲ کی تشریح۔)

﴿ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴿۱۲﴾﴾ ''یہ اُس ہستی کا بنایا ہوا اندازہ ہے جو زبردست ہے اور کُل علم رکھنے والا ہے۔''

آیات ۱۳ تا ۲۵

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ﴿۱۳﴾ اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ
بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا
بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَ قَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا
قُوَّةً ؕ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَجْحَدُوْنَ ﴿۱۵﴾
فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا فِیْۤ اَیَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِیْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؕ
وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰی وَ هُمْ لَا یُنْصَرُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَ اَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَیْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰی عَلَی
الْهُدٰی فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَ نَجَّیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا
یَتَّقُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَیَوْمَ یُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَی النَّارِ فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ ﴿۱۹﴾ حَتّٰۤی اِذَا مَا جَآءُوْهَا
شَهِدَ عَلَیْهِمْ سَمْعُهُمْ وَ اَبْصَارُهُمْ وَ جُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَ قَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ

شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ؕ قَالُوْۤا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْۤ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّ هُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَ لَاۤ اَبْصَارُكُمْ وَ لَا جُلُوْدُكُمْ وَ لٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَ ذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۚ وَ اِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ ﴿۲۴﴾ وَ قَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ ع

آیت ۱۳ ﴿فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ﴿۱۳﴾﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) اگر یہ لوگ اعراض کریں تو آپ کہہ دیجیے کہ مَیں نے تو تمہیں خبردار کر دیا ہے ایک ایسی خوفناک کڑک سے جیسی کہ قومِ عاد اور قومِ ثمود کی کڑک تھی۔''

مَیں نے تو تم لوگوں کو آگاہ کر دیا ہے کہ جیسے قومِ عاد اور قومِ ثمود پر عذاب آیا تھا' تمہاری تکذیب کے باعث ویسا ہی کوئی عذاب تم پر بھی ٹوٹ سکتا ہے۔

آیت ۱۴ ﴿اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ﴾ ''جبکہ ان کے پاس رسول آئے ان کے سامنے سے بھی اور ان کے پیچھے سے بھی''

یہاں پر قومِ عاد اور قومِ ثمود کا ذکر کر کے عرب کا وہ پورا علاقہ مراد لیا گیا ہے جہاں مختلف قوموں کی طرف پے در پے پیغمبر آئے۔ ان پیغمبروں اور ان کی اقوام کا ذکر قرآن میں بہت تکرار سے آیا ہے۔

﴿اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ﴾ ''(اس دعوت کے ساتھ) کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔''

﴿قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً﴾ ''(جواب میں ہر قوم کے) لوگوں نے یہی کہا کہ اگر ہمارا رب چاہتا تو فرشتوں کو نازل کر دیتا''

﴿فَاِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۴﴾﴾ ''پس جو چیز دے کر آپ بھیجے گئے ہیں ہم تو اس کا انکار کرتے ہیں۔''

آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ کو اللہ نے کوئی خاص پیغام دے کر ہماری طرف بھیجا ہے تو آپ اس حوالے سے ہمارا جواب بھی سن لیں اور وہ یہ کہ آپ کے دعوے کے مطابق جس چیز کے ساتھ بھی آپ کو بھیجا گیا ہے ہم اسے ماننے سے انکار کرتے ہیں۔

آیت ۱۵ ﴿فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ ''عاد کا معاملہ یہ تھا کہ انہوں نے زمین میں بہت تکبر کیا بالکل ناحق''

﴿وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ﴾ ''اور انہوں نے کہا کہ کون ہے ہم سے بڑھ کر قوت میں؟''

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ﴾ ''کیا انہوں نے غور نہیں کیا تھا کہ وہ اللہ جس نے انہیں پیدا کیا وہ ان سے بہت بڑھ کر ہے قوت میں!''

اگر انہیں اپنے مدِمقابل کوئی اور قوم اس وقت دنیا میں نظر نہیں آ رہی تھی تو کیا انہیں اللہ کی طاقت بھی نظر نہیں آ رہی تھی؟ ایک وہ طاقتور ہستی تو بہرحال موجود تھی جس نے انہیں پیدا کیا تھا۔

﴿وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝۱۵﴾ ''اور وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے۔''

آیت ۱۶ ﴿فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ﴾ ''تو ہم نے ان پر چھوڑ دی بہت زور کی ہوا نحوست کے دنوں میں''

سورۃ الحاقّہ میں تُند و تیز ہوا کے اس عذاب کا ذکر یوں آیا ہے: ﴿سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ﴾ (آیت ۶) یعنی انتہائی تیز اور شدید ہوا کا یہ جھکڑ ان لوگوں پر سات راتوں اور آٹھ دن تک مسلسل چلتا رہا۔

﴿لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ ''تاکہ ہم انہیں مزہ چکھائیں رسوا کن عذاب کا اس دنیا کی زندگی میں۔''

﴿وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝۱۶﴾ ''اور آخرت کا عذاب تو کہیں زیادہ رسوا کن ہوگا اور وہاں کوئی ان کی مدد کرنے والا نہیں ہوگا۔''

آیت ۱۷ ﴿وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ﴾ ''اور جو قومِ ثمود تھی ان کو ہم نے ہدایت کی راہ دکھائی''

ان کی طرف ہم نے اپنا رسول بھی بھیجا اور اونٹنی کی صورت میں انہیں واضح معجزہ بھی دکھا دیا۔

﴿فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى﴾ ''لیکن انہوں نے ہدایت کے مقابلے میں اندھے پن کو ہی پسند کیا''

ہماری واضح تعلیمات ان تک پہنچ گئی تھیں، لیکن اس کے باوجود انہوں نے حقائق کی طرف سے اپنی آنکھیں بند ہی رکھیں۔

﴿فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۱۷﴾ ''تو انہیں بھی آ پکڑا ذلّت کے عذاب کی ہولناک کڑک نے ان کے کرتوتوں کی پاداش میں۔''

آیت ۱۸ ﴿وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝۱۸﴾ ''اور ہم نے نجات دے دی اُن کو جو (ان میں سے) ایمان لائے تھے اور جنہوں نے تقویٰ کی روش اختیار کی تھی۔''

آیت ۱۹ ﴿وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝۱۹﴾ ''اور جس دن اللہ کے یہ دشمن جمع کیے جائیں گے آگ کی طرف تو ان کی درجہ بندی کی جائے گی۔''

ظاہر ہے کردار و اعمال کے حوالے سے اہلِ جہنم سب برابر نہیں ہوں گے۔ ہر مجرم کا عذاب اس کے جرم کے مطابق ہوگا۔ چنانچہ وہاں جرائم اور سزاؤں کی اقسام کے مطابق اہلِ جہنم کو الگ الگ جماعتوں اور گروہوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

آیت ۲۰ ﴿حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۲۰﴾ ''یہاں تک کہ جب یہ وہاں پہنچیں گے تو ان کے خلاف گواہی دیں گے ان کے کان، ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں اس بارے میں جو کچھ کہ وہ کرتے رہے تھے۔''

''شہادت'' کے بارے میں یہ بات بتکرار واعادہ بیان کی جا چکی ہے کہ شہادت کسی کے خلاف ہوتی ہے اور کسی کے حق میں۔ چنانچہ شَهِدَ کے بعد اگر عَلٰی کا صلہ ہو تو اس کے معنی کسی کے خلاف گواہی دینے کے ہوں گے (جیسا کہ آیت زیر مطالعہ میں آیا ہے) جبکہ شَهِدَ کے ساتھ ''ل'' کا صلہ آنے کی صورت میں کسی کے حق میں گواہی کا مفہوم نکلے گا۔ مثلاً: ﴿كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۠﴾ (المائدۃ:۸) اور ﴿كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ (النساء:۱۳۵)۔ ان دونوں آیات میں لفظ اللہ کے ساتھ ''ل'' اللہ کے لیے گواہی کا مفہوم دے رہا ہے' کہ تم لوگ اللہ کے لیے کھڑے ہو کر گواہی دینے والے بن جاؤ! بقول اقبالؔ: ع ''دے تو بھی محمد (ﷺ) کی صداقت کی گواہی!''

آیت ۲۱ ﴿وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ؕ﴾ ''اور وہ کہیں گے اپنی کھالوں سے کہ تم نے کیوں ہمارے خلاف گواہی دی؟''

﴿قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ ''وہ کہیں گی کہ ہمیں بھی اُس اللہ نے بولنے کی صلاحیت عطا کر دی ہے جس نے ہر شے کو قوتِ گویائی عطا کی ہے''

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اس کے حسبِ حال ''زبان'' عطا کر رکھی ہے جس سے وہ اللہ کی تسبیح کرتی ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کے یہ الفاظ اس حوالے سے بہت واضح ہیں: ﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ﴾ (آیت ۴۴) ''اور کوئی چیز نہیں مگر یہ کہ وہ تسبیح کرتی ہے اُس کی حمد کے ساتھ لیکن تم لوگ نہیں سمجھ سکتے ان کی تسبیح کو۔''

﴿وَهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۲۱﴾ ''اور اُسی نے تمہیں پیدا کیا پہلی مرتبہ اور اُسی کی طرف تم لوٹا دیے جاؤ گے۔''

آیت ۲۲ ﴿وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَآ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ﴾ ''اور تم (اس خیال سے) پردہ داری نہیں کرتے تھے کہ تمہارے خلاف گواہی دیں گے تمہارے اپنے کان' تمہاری اپنی آنکھیں اور تمہاری اپنی کھالیں''

انسان دنیا میں جرائم کرتے ہوئے لوگوں سے چھپنے کی کوشش کرتا ہے' مگر خود اپنے ہی اَعضاء و جوارح سے کیونکر چھپ سکتا ہے؟

﴿وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۲۲﴾ ''بلکہ تمہیں تو یہ گمان ہو گیا تھا کہ بہت سی باتیں تو اللہ کے علم میں ہی نہیں ہیں جو تم کر رہے ہو۔''

گویا ایسے جُہلاء بھی اس دنیا میں پائے جاتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے کرتوتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو کچھ معلوم نہیں۔ قبل ازیں اس حوالے سے مشائین (ارسطو اور اس کے پیروکاروں) کا ذکر بھی گزر چکا ہے جن کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ عالمِ کُلّیات ہے' وہ جزئیات کا عالم نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کائنات اور اس کی اشیاء کے متعلق قوانین بنا دیے ہیں اور وہ انہی قوانین کو جانتا ہے' جبکہ ان قوانین کے تحت رونما ہونے والے واقعات و حادثات کی جزئیات سے اسے کوئی سروکار نہیں —— اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ!

آیت ۲۳ ﴿وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ﴾ ''اور تمہارا یہی وہ گمان ہے جو تم نے اپنے رب کے بارے میں کیا تھا' جس نے تمہیں غارت کیا ہے''

اس حوالے سے ہمیں خود اپنے بارے میں بھی غور کرنا چاہیے۔ اگرچہ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری ایک ایک حرکت کو دیکھتا اور جانتا ہے، لیکن اپنے اس ایمان کے مطابق ہمارے دلوں میں اس بارے میں یقین پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم غلط کام کرتے ہوئے اس حقیقت سے لاپرواہی برت جاتے ہیں کہ اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے، ورنہ اگر واقعی کسی کے دل میں یقین ہو کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے تو بھلا وہ کوئی غلط حرکت کیسے کر سکتا ہے۔

﴿فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۲۳﴾ ''تو آج تم ہو گئے خسارہ پانے والوں میں۔''

آیت ۲۴ ﴿فَاِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۚ﴾ ''تو اب اگر یہ لوگ صبر کریں (یا نہ کریں) پس ان کا ٹھکانہ آگ ہی ہے۔''

﴿وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ ۝۲۴﴾ ''اور اگر وہ معافی مانگیں تو اب انہیں معاف نہیں کیا جائے گا۔''

قیامت کے دن وہ چاہیں گے کہ انہیں معافی مانگنے پر چھوڑ دیا جائے مگر اُس وقت یہ ممکن نہیں ہوگا۔ معافی مانگنے اور استغفار کرنے کا موقع تو دنیا میں ہے۔ انفرادی طور پر ہر آدمی کی موت کے وقت تک اور اجتماعی طور پر قیامت کے آثار نمایاں ہونے تک توبہ کا دروازہ کھلا ہے، لیکن اس کے بعد عالمِ برزخ یا عالمِ آخرت میں توبہ کا کوئی سوال نہیں۔

آیت ۲۵ ﴿وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ﴾ ''اور ہم نے ان کے لیے ایسے ساتھی مقرر کر دیے جنہوں نے ان کو مزین کر کے دکھائی ہر وہ چیز جو اُن کے سامنے تھی اور جو اُن کے پیچھے تھی''

جیسے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ساتھ فرشتے مقرر کر رکھے ہیں ایسے ہی ہر انسان کے ساتھ شیاطین جن بھی لگا دیے گئے ہیں۔ انسانوں کے ساتھ فرشتوں کی موجودگی کا ذکر قرآن میں متعدد بار آیا ہے۔ سورۃ الانعام کی آیت ۶۱ میں ﴿وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭ﴾ کے الفاظ میں یہ اشارہ موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعے سے انسانوں کی حفاظت کا انتظام فرماتا ہے۔ اسی طرح ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے (کراماً کاتبین) اس کے اعمال کا ریکارڈ رکھنے کے لیے بھی مقرر کیے گئے ہیں۔ ان فرشتوں کا ذکر سورۃ الانفطار میں اس طرح آیا ہے: ﴿وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝۱۰ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝۹ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝۱۱﴾ اسی طرح انسانوں کے ساتھ شیاطین جن بھی ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کے ساتھ ایک ساتھی جنّات (شیاطین) میں سے اور ایک ساتھی ملائکہ میں سے مقرر نہ کر دیا گیا ہو''۔ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت فرمایا: اے اللہ کے رسول! آپ کے ساتھ بھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((وَاِيَّايَ، لٰكِنْ اَعَانَنِيَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فَاَسْلَمَ)) [1] ''ہاں! میرے ساتھ بھی (ایک شیطان ہے) مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر نصرت عطا فرمائی ہے اور میں نے اُسے مسلمان کر لیا ہے''۔ یعنی میں نے اسے اپنا تابع بنا لیا ہے اور اب وہ مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ بہرحال اس آیت میں غلط کار انسانوں کے ان شیطان ساتھیوں کا ذکر ہے جو دنیا میں ان کے غلط عقائد اور بُرے اعمال کو خوش نما بنا کر انہیں دکھاتے رہتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ گناہوں کی لذت اور دنیا کی رنگینیوں میں ہی گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔

﴿وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۚ﴾ ''اور ان پر سچ ثابت ہوئی (اللہ

۱۔ مختصر المقاصد للزرقانی، ح ۹۰۵۔

کے عذاب کی) بات‘ (اور وہ شامل ہو گئے) ان اُمتوں میں جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں جنوں اور انسانوں کی۔‘‘

ان پر بھی بالآخر وہی بات پوری ہو کر رہی جو جنوں اور انسانوں کے ان گروہوں پر پوری ہوئی تھی جو ان سے پہلے تھے۔ یعنی وہ اللہ کے عذاب کے مستحق قرار پائے۔

﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ۝۲۵﴾ ’’یقیناً وہ خسارہ پانے والے لوگ تھے۔‘‘

آیات ۲۶ تا ۳۶

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝۲۶ فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۲۷ ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ ۭ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝۲۸ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ۝۲۹ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝۳۰ نَحْنُ اَوْلِيٰۗؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝۳۱ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ۝۳۲ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۳۳ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ ادْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝۳۴ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝۳۵ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۳۶

اب اگلی آیت میں قرآن مجید کا ذکر بہت عظیم الشان انداز میں ہو رہا ہے:

آیت ۲۶ ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ﴾ ’’اور کہا اُن لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا کہ مت سنو اس قرآن کو اور اس (کی تلاوت کے دوران) میں شور مچایا کرو‘‘

رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا آلہ اور ذریعہ چونکہ قرآن تھا اس لیے منکرینِ حق نے آپس میں ایک دوسرے کو یہ مشورہ دینا شروع کر دیا کہ جب محمد (ﷺ) قرآن پڑھا کریں تو تم لوگ اسے مت سنا کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے دلوں پر اس کا اثر ہو جائے اور اس کی وجہ سے تم اپنے آبائی دین سے برگشتہ ہو جاؤ۔ اس لیے جب بھی وہ تمہیں قرآن سنانے کی کوشش کریں تم شور مچانا (hooting) شروع کر دیا کرو تاکہ اس کی آواز کسی کے کان میں نہ پڑے۔ حضور ﷺ کی زبان مبارک سے قرآن مجید کی تلاوت چونکہ غیر معمولی تاثیر کی حامل تھی اور اس کی وجہ سے آپؐ کی دعوت کا پیغام تیزی سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر رہا تھا‘ اس لیے مشرکینِ مکہ اس عمل کو روکنے کے لیے اپنے زعم میں گویا ایک جامع منصوبہ بندی کے ساتھ خم ٹھونک کر آپؐ کے مقابلے میں آ گئے۔

اس حوالے سے یہ نکتہ بھی اچھی طرح سے سمجھ لیجیے کہ قرآن کا پڑھنا پڑھانا' سننا سنانا اور سیکھنا سکھانا چونکہ شیطان پر بہت بھاری ہے اس لیے جہاں کہیں بھی یہ کام مؤثر انداز میں ہو رہا ہوگا شیطانی قوتیں اسے روکنے کے لیے اپنی پوری طاقت کے ساتھ میدان میں آجائیں گی۔ البتہ اگر کہیں قرآن کا کوئی پروگرام محض رسمی انداز میں ہو رہا ہو' یعنی اس میں علمی اور عقلی سطح پر کوئی مؤثر پیغام لوگوں تک نہ پہنچ رہا ہو تو ایسی تقریبات' ٹی وی پروگرامز اور قرآنی سیمینارز پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ دورِ حاضر میں ٹی وی پروگرام ''الہدیٰ'' کی بندش اس کی زندہ مثال ہے۔ یہ پروگرام ''پی ٹی وی'' کا مقبول ترین ہفتہ وار دینی پروگرام تھا' جو بہت اہتمام کے ساتھ پورے ملک میں ایک ہی وقت پر ٹیلی کاسٹ ہوتا تھا (اُس وقت ابھی کیبل نیٹ ورک کا آغاز نہیں ہوا تھا)۔ اس میں مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب پیش کیا جاتا تھا۔ جب یہ پروگرام بہت مؤثر انداز میں چلنا شروع ہوا اور قرآن کا اصل پیغام ایک تدریج اور منطقی ترتیب کے ساتھ گھر گھر پہنچنے لگا تو شیطانی قوتیں ''لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ'' کا نعرہ لگا کر سامنے آ کھڑی ہوئیں اور انہوں نے اس پروگرام کو بند کرا کے ہی دم لیا۔ یہ پروگرام اس حد تک مقبول ہوا تھا کہ بھارت میں بھی بڑے ذوق وشوق سے دیکھا جاتا تھا —— بلکہ پی ٹی وی پر اس پروگرام کی بندش کے بعد یہ بھارت میں کیبل نیٹ ورک پر دکھایا جانے لگا تھا' بلکہ کبھی کبھی ''دوردرشن'' پر بھی پیش کر دیا جاتا تھا۔ لیکن اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ''پی ٹی وی'' پر میرے پروگراموں پر پابندی لگا دی گئی تھی۔

﴿لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝۲۶﴾ ''تاکہ تم غالب رہو۔''

ان کا آپس میں ایک دوسرے کے لیے یہی مشورہ تھا کہ اگر تم اپنی ''سیادت'' کو برقرار رکھنا چاہتے ہو تو خود کو اور اپنے عوام کو اس قرآن سے دور رکھو۔ بالکل یہی انداز منافقین کے اس مشورے میں بھی نظر آتا ہے جو انہوں نے غزوۂ احزاب کے موقع پر مدینہ کے عام لوگوں کو دینا شروع کیا تھا۔ ان کا مشورہ تھا: ﴿يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ﴾ (الاحزاب:۱۳) کہ اے اہلِ یثرب! تمہارے یہاں ٹھہرنے کی اب کوئی صورت نہیں ہے' لہٰذا اب تم واپس پلٹ جاؤ۔ بہرحال حضور ﷺ کی زبان مبارک سے قرآن کے پیغام کو گھر گھر پہنچتے دیکھ کر مشرکین نے بجا طور پر محسوس کیا کہ اگر اس دعوت کو بروقت نہ روکا گیا تو پھر عرب کی سرزمین میں ان کے لیے کوئی ٹھکانہ نہیں بچے گا۔

آیت ۲۷ ﴿فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا﴾ ''تو ہم لازماً مزہ چکھائیں گے ان کافروں کو بہت سخت عذاب کا''

یہ بہت سخت جواب ہے اور اس جملے کا اسلوب بھی بہت زوردار ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ یہ میرا کلام ہے' اسے میں نے ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ﴾ (البقرۃ:۱۸۵) کی حیثیت سے نازل فرمایا ہے۔ اگر یہ لوگ میری اس عظیم نعمت کو ٹھکرا رہے ہیں اور میرے بندوں تک اس کے ابلاغ کو روکنے کی سازشیں کر رہے ہیں تو میں انہیں اس بغاوت اور سرکشی کا مزہ ضرور چکھاؤں گا۔

﴿وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۲۷﴾ ''اور ہم انہیں سزا دیں گے ان کے بدترین اعمال کے حساب سے۔''

یعنی ان کی سزا معین کرتے ہوئے ان کے سب سے بُرے اعمال کو بطور ''معیار'' مدِنظر رکھا جائے گا۔

آیت ۲۸ ﴿ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ﴾ ''یہ ہے بدلہ اللہ کے دشمنوں کا (یعنی) آگ!''

یہ لوگ قرآن کے دشمن ہیں تو قرآن چونکہ اللہ کا کلام ہے اس لیے یہ اللہ کے دشمن ہیں۔ اور اللہ کے دشمنوں کی سزا آتشِ دوزخ

کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے!

﴿لَهُمْ فِيهَا دَارُ الْخُلْدِ﴾ ''اُن کے لیے اسی میں ہمیشگی کا ٹھکانہ ہوگا۔''

﴿جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۲۸﴾﴾ ''یہ بدلہ ہوگا اس کا کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے تھے۔''

آیت ۲۹ ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ﴾ ''اور جو کافر ہیں وہ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ذرا ہمیں دکھا دے جنوں اور انسانوں میں سے وہ لوگ جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا''

وہاں جہنم میں بڑے بڑے سرداروں اور لیڈروں کے خلاف ان کے عوام واویلا کر رہے ہوں گے۔ وہ کہیں گے کہ اے پروردگار! اس وقت ہم ان لوگوں کو دیکھنا چاہتے ہیں جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا۔ وہ لوگ جو ہمیں قرآن سننے سے روکتے رہے' جنہوں نے ہماری عقلوں پر پردے ڈال دیے تھے' جنہوں نے محمد (ﷺ) کے بارے میں ہمیں ورغلایا' ان کے بارے میں ہمارے دلوں میں طرح طرح کے شکوک وشبہات پیدا کیے' اور ہمارے اور ان کی دعوت کے درمیان آڑ بن گئے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس وقت انہیں ہمارے سامنے لایا جائے تاکہ:

﴿نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿۲۹﴾﴾ ''ہم انہیں اپنے قدموں کے نیچے روندیں' تاکہ وہ ہو جائیں سب سے نیچے والے۔''

اگلی سات آیات اپنے مضمون کے لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ ''مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب'' کے پہلے حصے کا چوتھا درس انہی آیات پر مشتمل ہے۔ منتخب نصاب کے اس حصے میں چار جامع اسباق ہیں اور ان چاروں اسباق یا دروس میں مضمون کے اعتبار سے ایک خاص ترتیب اور تدریج پائی جاتی ہے۔ ان میں پہلا درس سورۃ العصر پر مشتمل ہے: ﴿وَالْعَصْرِ ۝۱ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝۲ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝۳﴾۔ یہ سورت قرآن حکیم کی تین مختصر ترین سورتوں میں سے ایک ہے۔ اس میں اُخروی نجات کے لیے چار شرائط بیان کی گئی ہیں۔ اس کے بعد دوسرا درس آیۂ البر (سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷) پر مشتمل ہے۔ اس آیت میں وہی چار نکات قدرے وضاحت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں جن کا ذکر سورۃ العصر میں ہوا ہے۔ تیسرے درس کے لیے سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کو منتخب کیا گیا ہے۔ اس رکوع میں یہی مضمون ذرا مختلف انداز میں حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو نصیحتوں کے حوالے سے بیان ہوا ہے۔ اس طرح سورۃ العصر کا مضمون ایک خاص ترتیب اور تدریج کے ساتھ چوتھے درس (زیر مطالعہ سورت کی آیات ۳۰ تا ۳۶) میں اپنے نقطۂ عروج تک پہنچ گیا ہے۔ چنانچہ ان سات آیات کے اندر آپ کو سورۃ العصر کے چاروں موضوعات (ایمان' اعمالِ صالحہ' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر) میں سے ہر ایک کی چوٹی نظر آئے گی' اور پھر انہی سات آیات کے عین درمیان میں وہ آیت بھی (آیت ۳۳) آئے گی جو اس سورت کا عمود ہے۔ اس آیت کی مثال ایک بہت بڑے شہر کے سی ہے جو ان سات آیات کے خوبصورت ہار کے عین وسط میں اپنی خصوصی آب وتاب کے ساتھ جگمگا رہا ہے۔ اس تمہید کے بعد آیئے اب ان آیات کا مطالعہ کرتے ہیں:

آیت ۳۰ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ ''بیشک وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے''

اللہ پر ایمان لانا آسان ہے مگر اس پر جمے رہنا آسان نہیں ہے۔ یہ تبھی ممکن ہے جب انسان کو اللہ پر پوری طرح توکل ہو وہ ہر حالت میں اس کی رضا پر راضی رہے۔ نہ اپنی کسی حالت کے بارے میں اس کی زبان پر حرفِ شکایت آئے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے کسی فیصلے پر اس کے دل میں ملال پیدا ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کے آگے اُس کا سرِ تسلیم بلا حیل و حجت جھکتا چلا جائے اور وہ اپنے تن من دھن کو ہتھیلی پر رکھے اس کے در اطاعت پر ہمہ وقت کمر بستہ کھڑے رہ کر عملی طور پر ثابت کر دے کہ: ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ (الانعام) ''یقیناً میری نماز' میری قربانی' میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے''۔ اس استقامت کی اہمیت ایک حدیث سے بہت اچھی طرح واضح ہوتی ہے۔ حضرت سفیان بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے اسلام کے بارے میں ایسی بات بتا دیں کہ آپؐ کے سوا کسی اور سے کچھ دریافت کرنے کی ضرورت نہ رہے۔'' (یعنی مجھے اسلام کی حقیقت ایک جملے میں بتا دیجیے تاکہ میں اسے گرہ میں باندھ لوں۔) جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ))(۲) ''کہو میں اللہ پر ایمان لایا اور پھر اس پر جم جاؤ!'' اگر واقعی کوئی شخص غور کرے تو اس استقامت میں اسے قیامت مضمر دکھائی دے گی۔ (واضح رہے کہ استقامت اور قیامت کا سہ حرفی مادہ ایک ہی ہے۔) یہ قیامت ہی تو ہے کہ ایک بندہ اللہ تعالیٰ کو نظریاتی طور پر اپنا رب مان لینے کے بعد عملی طور پر ساری دنیا سے بے نیاز ہو جائے اور اپنے ایک ایک عمل سے ثابت کر دے کہ میرا پروردگار' میرا حاجت روا' میرا سہارا' میرا مشکل کشا' میرے نفع و نقصان کا مالک صرف اور صرف اللہ ہے۔ دل کا یہ یقین اور عمل کا یہ رنگ گویا چوٹی ہے اس ایمان اور عمل صالح کی جس کا ذکر سورۃ العصر میں نجاتِ اُخروی کی پہلی دو شرائط کے طور پر ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ کے الفاظ میں ہوا ہے۔

اب اگلی آیت میں ان خوش قسمت لوگوں کا اللہ کے ہاں مقام ملاحظہ کیجیے جو اپنی دُنیوی زندگی میں ایمان و عمل کی اس چوٹی یعنی استقامت تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں:

﴿تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۰﴾﴾ ''ان پر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے کہ آپ لوگ ڈرو نہیں اور غمگین نہ ہو اور خوشیاں مناؤ اُس جنّت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جا تا رہا ہے۔''

فرشتوں کا نزول ان لوگوں پر کب ہوتا ہے؟ اس حوالے سے یہ امر تو متفق علیہ ہے کہ موت کے قریب ایسے لوگوں کو خوش آمدید کہنے اور بشارت دینے کے لیے فرشتے نازل ہوتے ہیں' لیکن دُنیوی زندگی کے دوران بھی اہلِ ایمان کی مدد کے لیے فرشتوں کا آنا ثابت ہے۔ جیسے میدانِ بدر میں اہلِ ایمان مجاہدین کی مدد کے لیے فرشتے نازل ہوئے: ﴿اِذْ یُوْحِیْ رَبُّکَ اِلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ اَنِّیْ مَعَکُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (الانفال: ۱۲) ''(یاد کریں) جب آپؐ کا ربّ وحی کر رہا تھا فرشتوں کو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں' تو تم (جاؤ اور) اہلِ ایمان کو ثابت قدم رکھو''۔ چنانچہ مؤمنینِ صادقین پر ملائکہ کا نزول اثنائے حیات میں بھی ہوتا ہے۔

آیت ۳۱ ﴿نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ﴾ ''ہم ہیں تمہارے رفیق دُنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔''

۲۔ مسند احمد' کتاب مسند المکیین' باب حدیث سفیان بن عبداللہ الثقفی' ح: ۱۴۸۶۹۔ یہ حدیث صحیح مسلم (کتاب الایمان) میں ((قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰہِ فَاسْتَقِمْ)) کے الفاظ کے ساتھ آئی ہے' جبکہ امام ترمذی اور امام ابن ماجہ کی نقل کردہ روایت میں الفاظ یہ ہیں: ((قُلْ رَبِّیَ اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقِمْ)) ''کہو میرا رب اللہ ہے اور پھر اس پر جم جاؤ!''

ان الفاظ سے یہ مفہوم خود بخود واضح ہو رہا ہے کہ فرشتے حیاتِ دُنیوی کے دوران بھی ان خوش قسمت لوگوں کی ہمت بندھاتے ہیں اور انہیں یہ پیغام جانفزا پہنچاتے ہیں۔

﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنفُسُكُمْ﴾ ''اور تمہارے لیے اس (جنت) میں وہ سب کچھ ہوگا جو تمہارے جی چاہیں گے''

تمہارے جی وہاں جو کچھ چاہیں گے وہ سب کچھ ہمارے علم میں ہے' کیونکہ تمہارے نفسوں کے تقاضوں اور تمہاری خواہشات کو بھی ہم نے خود ہی پیدا کیا ہے۔ لہٰذا ہم تمہاری خواہشات کی تسکین کا مکمل سامان وہاں فراہم کریں گے۔

﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ۝٣١﴾ ''اور تمہارے لیے اس میں وہ سب کچھ بھی ہوگا جو تم مانگو گے۔''

تمہارے نفسوں کے تقاضوں کے مطابق تو سب کچھ وہاں پہلے سے ہی مہیا ہو چکا ہوگا۔ البتہ مانگنے اور طلب کرنے کے حوالے سے ہر شخص کا اپنی ذہنی سطح کے مطابق ایک معیار اور مخصوص ذوق ہوتا ہے۔ بچہ اپنی پسند کی کوئی چیز مانگے گا' ایک سادہ لوح دیہاتی اپنے معیار کی کوئی چیز طلب کرے گا' جبکہ ایک حکیم و فلسفی اپنے ذوق کے مطابق سوال کرے گا۔ غرض جو کوئی جو کچھ مانگے گا وہ سب کچھ اس کے سامنے حاضر کر دیا جائے گا۔

آیت ۳۲ ﴿نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ ۝٣٢﴾ ''یہ ابتدائی مہمان نوازی ہوگی اُس ہستی کی طرف سے جو غفور اور رحیم ہے۔''

جنت کی جن نعمتوں کا ذکر ہمیں قرآن و حدیث میں ملتا ہے ان کا تعلق اہلِ جنت کی ابتدائی مہمان نوازی (نُزُل) سے ہے۔ جہاں تک ان کی اصل ضیافت کا تعلق ہے اس کی کیفیت ہمارے احاطہ شعور میں نہیں آ سکتی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ : أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِينَ مَالَا عَيْنٌ رَأَتْ، وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ ...))[۳] ''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے (جنت میں) وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا' نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل پر اس کا گمان ہی گزرا.....'' پھر آپ ﷺ نے سورۃ السجدۃ کی یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ۝١٧﴾ ''پس کوئی انسان نہیں جانتا کہ ان (اہلِ جنت) کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے' وہ بدلہ ہوگا ان کے اعمال کا۔''

اب اس کے بعد وہ آیت آ رہی ہے جو اپنے مضمون کے اعتبار سے اس سورت کا عمود ہے اور جس کو قبل ازیں ان سات آیات کے ہار کے درمیان ایک جگمگاتے ہیرے سے تشبیہہ دی گئی تھی۔

آیت ۳۳ ﴿وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّن دَعَآ إِلَى اللّٰهِ﴾ ''اور اُس شخص سے بہتر بات اور کس کی ہوگی جو بلائے اللہ کی طرف''

جس خوش قسمت شخص کو ایمان کے بعد ''استقامت'' کا مقام حاصل ہو چکا ہو' اُسے بھلا اب کس بات کی دُھن ہوگی؟ کیا وہ اب بھی مال و دولتِ دنیا کے پیچھے دوڑے گا؟ یا کیا حکومت اور اقتدار کے حصول کی خواہش اب بھی اس کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچے گی؟ نہیں! ہرگز نہیں! اس ''متاعِ غرور'' کو تو وہ ٹھکرا کر بہت آگے نکل آیا ہے۔ مسندِ استقامت پر رونق افروز ہونے کے بعد دنیا و مافیہا کے بارے میں اس کی ترجیحات بہت واضح ہو چکی ہیں۔ اب تو وہ خوب سمجھتا ہے کہ یہ سب آنی جانی چیزیں ہیں' آج ہیں تو کل نہیں ہیں۔

۳۔ صحیح البخاری' کتاب بدء الخلق' باب ما جاء فی صفة الجنة وانها مخلوقة۔ وصحیح مسلم' کتاب الجنة وصفة نعیمها واهلها۔ واللفظ له۔

اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ دنیا اور اس کے لوازمات کی بہتات سے مسئولیت بڑھتی ہے اور حسابِ آخرت مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اب اس کے دل میں ایک ہی تڑپ ہے اور وہ ہے دعوت الی اللہ کی تڑپ۔ اب اس کی دوڑ دھوپ اور جِدّ و جُہد کا اگر کوئی ہدف ہے تو بس یہی کہ میں زیادہ سے زیادہ انسانوں کو راہِ ہدایت پر لے آؤں۔

﴿وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۳۳﴾﴾ ''اور وہ نیک عمل کرے اور کہے کہ مَیں مسلمانوں میں سے ہوں۔''

اعمالِ صالحہ کا مفہوم ''استقامت'' کے اندر بھی پوشیدہ ہے' لیکن یہاں پر اس کا علیحدہ ذکر بھی آ گیا ہے' اس لیے کہ دعوت الی اللہ اور عملِ صالح لازم و ملزوم ہیں۔ اگر ایک داعی کا اپنا عمل درست نہیں ہوگا تو نہ صرف یہ کہ اس کی دعوت مؤثر نہیں رہے گی بلکہ وہ دعوت کی بدنامی کا باعث بھی بنے گا۔

آیت ۳۴ ﴿وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ ؕ﴾ ''اور (دیکھو!) اچھائی اور بُرائی برابر نہیں ہوتے۔''

اب کون کہے گا کہ یہ دونوں برابر ہیں۔ چنانچہ بات اس نکتے سے شروع کی جا رہی ہے جو سب کے ہاں متفق علیہ اور مسلّم ہے۔

﴿اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ ''تم مدافعت کرو بہترین طریقے سے''

لوگ بے شک آپ کو گالیاں دیں' مگر آپ انہیں دعائیں دو' اگر کوئی آپ کو پتھر مارے تو آپ جواب میں اسے پھول پیش کرو۔ یہ وہ حکمت عملی ہے جو کبھی ناکام نہیں ہوتی۔ اس طرزِ عمل کے سامنے بڑے سے بڑا کٹھور دل انسان بھی نرم پڑ جاتا ہے۔ یہاں اس مضمون کے حوالے سے یہ نکتہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ اگلی سورت یعنی سورۃ الشوریٰ میں اس تصویر کا دوسرا رخ بھی نظر آئے گا۔ لیکن یاد رہے کہ سورۃ الشوریٰ میں سختی کا جواب سختی سے دینے کی بات اقامتِ دین کے حوالے سے ہوئی ہے جبکہ یہاں دعوتِ دین کے مرحلے کی حکمتِ عملی بتائی جا رہی ہے۔ دونوں مرحلوں پر پالیسی کے اس فرق کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ بہرحال ''دعوت'' کے مرحلے کی پالیسی یہی ہے کہ جب تم دعوت کو لے کر چلو تو ایسے بے ضرر انسان بن جاؤ کہ بدھ مت کے بھکشو نظر آؤ۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے اسی حکمتِ عملی کے بارے میں فرمایا تھا کہ تم سانپ کی مانند چوکنے اور فاختہ کی طرح بے ضرر بنو! یعنی ایک داعی کو ایسا احمق اور بدھو نہیں ہونا چاہیے کہ دوسرے اسے ضرر پہنچا جائیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ خود اُس کی ذات سے کسی دوسرے کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس حوالے سے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہمارے سامنے ہے۔ آپؐ نے گالیاں دینے والوں کو ہمیشہ دعائیں دیں' بلکہ آپؐ نے تو ابوجہل جیسے دشمنوں کی ہدایت کے لیے بھی اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں ؎

سلام اُس پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دیں
سلام اُس پر کہ جس نے خوں کے پیاسوں کو قبائیں دیں!

زیر مطالعہ موضوع یعنی ''دعوتِ توحید'' کی اہمیت کو اقامتِ دین کی جِدّ و جُہد کے حوالے سے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ توحیدِ عملی کے تدریجی مراحل کو اپنے ذہن میں ایک مرتبہ پھر سے تازہ کر لیں۔ اب تک ہم انفرادی سطح پر توحیدِ عملی کے دو پہلوؤں کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ سورۃ الزمر میں توحید کا خارجی یا ظاہری پہلو بیان ہوا ہے کہ عبادت صرف اللہ کی کرو اُس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔ اس کے بعد سورۃ المؤمن میں توحید کے داخلی پہلو کا ذکر آیا تھا کہ دعا صرف اللہ سے کرو' اور وہ بھی اُس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔ اب سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں توحید کو انفرادی سطح سے اجتماعیت کی طرف بڑھانے کی بات ہو رہی ہے۔ گویا ''توحید'' ایک فرد سے نکل کر دوسرے افراد تک پہنچنا شروع ہوگی اور دعوت کے ذریعے ''متعدی'' صورت اختیار کر کے معاشرے

میں پھیلتی چلی جائے گی۔ سورۂ آل عمران میں اس بنیاد پر باقاعدہ ایک جماعت قائم کرنے کی ضرورت اور اہمیت ان الفاظ میں بیان فرمائی گئی ہے: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ ''اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دے' نیکی کا حکم دیتی رہے اور بدی سے روکتی رہے۔ اور یہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔''

بہرحال زیر مطالعہ آیات کا موضوع دعوتِ توحید ہے اور اس حوالے سے داعیانِ حق کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ تم برائی کا جواب ہمیشہ نیکی اور خوش اخلاقی سے دو۔ اگر تم یہ روش اختیار کرو گے:

﴿فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝﴾ ''تو (تم دیکھو گے کہ) وہی شخص جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے وہ گویا گرم جوش دوست بن جائے گا۔''

انسان آخر انسان ہے۔ اگر کوئی شخص ہر وقت آپ کی مخالفت پر ہی کمربستہ ہے اور آپ ہیں کہ ہمیشہ اُس کی بھلائی کے لیے کوشاں ہیں تو آخر وہ کب تک اپنے منفی طرزِ عمل پر کاربند رہے گا۔ بالآخر اسے آپ کے اخلاق کے سامنے ہتھیار ڈالنا ہی پڑیں گے۔

آیت ۳۵ ﴿وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ﴾ ''اور یہ مقام نہیں حاصل ہو سکتا مگر اُن ہی لوگوں کو جو بہت صبر کرتے ہوں۔''

اس خاص مقام تک صرف وہی لوگ پہنچ سکتے ہیں جن میں صبر کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہو اور وہ اپنی عملی زندگی میں بھی ہمیشہ صبر کی روش پر کاربند ہوں۔

﴿وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝﴾ ''اور یہ نہیں دیا جاتا مگر اُن ہی کو جو بڑے نصیب والے ہوں۔''

یہ حَظٍّ عَظِيْمٍ کیا ہے اور اس کا حقیقی معیار کیا ہے؟ ہر انسان کے لیے اس کا صحیح ادراک حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ اس سے پہلے یہ لفظ ہم سورۃ القصص کے آٹھویں رکوع میں قارون کے حوالے سے بھی پڑھ آئے ہیں۔ قارون کے ٹھاٹھ باٹھ اور خدم و حشم سے متاثر ہو کر دنیادار لوگوں نے حسرت بھرے انداز میں کہا تھا: ﴿اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝﴾ (القصص) کہ یقیناً یہ شخص بڑا صاحبِ نصیب ہے۔ لیکن پھر جب وہ اپنے گھر بار سمیت زمین میں دھنسا دیا گیا تو ان ہی لوگوں نے اس پر شکر و اطمینان کا اظہار کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر بڑی مہربانی کی کہ انہیں قارون جیسا مال و منال نہ دیا' ورنہ انہیں بھی اسی طرح زمین میں دھنسا دیا جاتا۔ چنانچہ ایک بندۂ مؤمن کے لیے اصل کامیابی' حقیقی فوز و فلاح اور ''حظِ عظیم'' اسی عمل اور اسی کردار میں ہے جس کی نشاندہی اس آیت میں کی گئی ہے۔

آیت ۳۶ ﴿وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ﴾ ''اور اگر کبھی تمہیں شیطان کی طرف سے کوئی چوک لگنے لگے تو اللہ کی پناہ طلب کر لیا کرو۔''

اگر کبھی کسی کے ناروا سلوک اور مخالفانہ رویے پر غصہ آ جائے تو فوراً سمجھ لو کہ یہ شیطان کی اُکساہٹ ہے' شیطان تم پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے۔ چنانچہ ایسی کیفیت میں فوراً اللہ کی پناہ طلب کر لیا کرو' کیونکہ صرف اُسی کی پناہ میں آ کر تم شیطان کے وار سے بچ سکتے ہو۔

﴿اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝﴾ ''یقیناً وہی ہے سب کچھ سننے والا' سب کچھ جاننے والا۔''

یہ آیت سورۃ الاعراف (آیت ۲۰۰) میں بھی آ چکی ہے۔ وہاں ﴿اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ کے الفاظ ہیں۔ گویا یہاں اللہ تعالیٰ کی مذکورہ صفات (السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ) کے بارے میں زیادہ زور اور تاکید کا انداز پایا جاتا ہے۔

آیات ۳۷ تا ۴۶

وَ مِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَ النَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ؕ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَ اسْجُدُوْا لِلّٰهِ
الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۳۷﴾ فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ
بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَ هُمْ لَا يَسْـَٔمُوْنَ ﴿۳۸﴾ السجدة وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا
عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ؕ اِنَّ الَّذِيْۤ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۹﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ؕ اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْۤ
اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۴۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ﴿۴۱﴾ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ لَا مِنْ
خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ﴿۴۲﴾ مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ؕ اِنَّ
رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۴۳﴾ وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْ لَا فُصِّلَتْ
اٰيٰتُهٗ ؕ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ؕ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَآءٌ ؕ وَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْۤ
اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّ هُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ؕ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۴۴﴾ ع وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى
الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ
مُرِيْبٍ ﴿۴۵﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۴۶﴾

آیت ۳۷ ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ؕ﴾ ''اور اُسی کی نشانیوں میں سے ہیں رات' دن' سورج اور چاند۔''

﴿لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ﴾ ''تم سورج کو سجدہ مت کرو اور نہ چاند کو''

﴿وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۳۷﴾﴾ ''بلکہ اُس اللہ کو سجدہ کرو جس نے ان سب کو پیدا کیا' اگر تم واقعتاً اُسی کی بندگی کرتے ہو۔''

آیت ۳۸ ﴿فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْـَٔمُوْنَ ﴿۳۸﴾﴾ ''پس (اے نبی ﷺ!) اگر وہ استکبار کریں تو (پروا نہیں) وہ جو آپ کے رب کے پاس ہیں وہ دن رات اُس کی تسبیح میں لگے ہوئے ہیں اور وہ (اس سے) تھکتے نہیں۔''

اگر یہ لوگ تکبر کی بنا پر مجھے سجدہ کرنے کو تیار نہیں تو مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے پاس تو فرشتوں کی فوجیں ہیں جو دن رات مسلسل میری تسبیح اور حمد میں لگے رہتے ہیں۔ اس بارے میں فرشتوں کا یہ بیان ہم سورۃ البقرہ کی آیت ۳۰ میں پڑھ چکے ہیں:

﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾ ''اور ہم آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس میں لگے ہوئے ہیں۔''

آیت ۳۹ ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً﴾ ''اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ تم زمین کو دیکھتے ہو کہ وہ دبی پڑی ہے''

یعنی زمین کی وہ کیفیت کہ جب وہ بنجر اور ویران ہوتی ہے اور اس پر روئیدگی وغیرہ کا نام ونشان تک نہیں ہوتا۔

﴿فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ﴾ ''پھر جب ہم اس پر پانی برسا دیتے ہیں تو اس میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور وہ اُبھر آتی ہے۔''

بارش کے برستے ہی زمین سے طرح طرح کے نباتات اُگنے لگتے ہیں جیسے کہ مُردہ زمین میں جان پڑ گئی ہو۔

﴿اِنَّ الَّذِيْٓ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ اِنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۳۹﴾ ''یقیناً وہ (اللہ) جس نے اس کو زندہ کیا ہے وہی مُردوں کو بھی زندہ کرے گا۔ یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

آیت ۴۰ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ۭ﴾ ''جو لوگ ہماری آیات کے بارے میں کج روی اختیار کرتے ہیں وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔''

﴿اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ﴾ ''تو کیا وہ شخص جو آگ میں جھونک دیا جائے گا وہ بہتر ہوگا یا وہ کہ جو قیامت کے دن امن کی حالت میں آئے گا!''

﴿اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۴۰﴾ ''تم کیے جاؤ جو بھی کرنا چاہتے ہو، وہ خوب دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔''

قبل ازیں ہم آیت ۵ میں مشرکین کی طرف سے حضور ﷺ کے لیے اس کھلے چیلنج کے بارے میں پڑھ چکے ہیں۔ ان کا کہنا تھا: فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ کہ آپ جو کرنا چاہتے ہیں کر لیں، ہم بھی آپ کی ہر کوشش کا توڑ کریں گے اور آپ کی اس دعوت کو چلنے نہیں دیں گے۔ زیر مطالعہ جملے میں دراصل اسی چیلنج کا جواب ہے۔

آیت ۴۱ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاۗءَهُمْ ۚ﴾ ''یقیناً وہ لوگ جنہوں نے اس یاددہانی کا انکار کیا جبکہ یہ ان کے پاس آ گئی۔''

اس سے آگے اس مفہوم کے الفاظ محذوف ہیں کہ ''اب ان لوگوں کی شامت آنے والی ہے''۔ نوٹ کیجیے کہ اس سورت میں یہاں تیسری مرتبہ قرآن کا ذکر آیا ہے۔ (اس سے پہلے آیت ۱۳ اور آیت ۲۶ میں بھی قرآن کا ذکر آ چکا ہے۔) یہاں قرآن کو ''الذکر'' یعنی یاددہانی قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب تو اس گواہی کو اُجاگر کر کے تمہارے سامنے لا رہی ہے جو پہلے سے تمہاری فطرت کے اندر مخفی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اُس کی محبت تو تمہاری ارواح کے اندر پہلے سے موجود تھی لیکن تمہاری عدم توجہی کی وجہ سے اس معرفت پر غفلت اور ذہول کے پردے پڑ گئے تھے، جس کے نتیجے میں تم اپنی فطرت کی اصل پہچان کو بھول کر اللہ ہی کو بھول گئے تھے۔ سورۃ الحشر کی آیت ۱۹ میں اہلِ ایمان کو اسی حوالے سے تاکید کی گئی ہے: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ

اَنۡفُسَهُمۡ ؕ﴾ کہ اے اہلِ ایمان! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو نتیجتاً اللہ نے انہیں ایسا کر دیا کہ وہ خود اپنے آپ ہی کو بھول گئے۔ چنانچہ یہاں قرآن کو ''الذکر'' کہہ کر گویا اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ یہ کتاب انسانی فطرت میں مضمر معرفتِ خداوندی کے ابدی سبق کی یاد دہانی کے لیے آئی ہے۔ لیکن وہ لوگ جنہوں نے اس یاد دہانی کا انکار کر دیا ہے اب ان کی شامت آنے والی ہے۔

﴿وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيۡزٌ ۝۴۱﴾ ''اور (انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ) بلاشبہ یہ ایک زبردست کتاب ہے۔''

آیت ۴۲ ﴿لَّا يَاۡتِيۡهِ الۡبَاطِلُ مِنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَلَا مِنۡ خَلۡفِهٖ ؕ﴾ ''باطل اس پر حملہ آور ہو ہی نہیں سکتا' نہ اس کے سامنے سے اور نہ ہی اس کے پیچھے سے۔''

اس دورۂ ترجمہ قرآن کے دوران بار بار میں مثالیں دیتا رہا ہوں کہ قرآن مجید کس طرح اپنی حفاظت کرتا ہے اور کس طرح ان لوگوں کے عزائم کو ناکام بناتا ہے جو اس کی آیات کو اپنے مفادات کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں یا کسی آیت کی تعبیر اپنی مرضی سے کرنا چاہتے ہیں۔

﴿تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ حَكِيۡمٍ حَمِيۡدٍ ۝۴۲﴾ ''اس کا اتارا جانا ہے ایک حکیم اور حمید ہستی کی طرف سے۔''

آیت ۴۳ ﴿مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدۡ قِيۡلَ لِلرُّسُلِ مِنۡ قَبۡلِكَ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) نہیں کہا جاتا آپ سے مگر وہی کچھ جو آپ سے پہلے رسولوں سے کہا گیا تھا۔''

﴿اِنَّ رَبَّكَ لَذُوۡ مَغۡفِرَةٍ وَّذُوۡ عِقَابٍ اَلِيۡمٍ ۝۴۳﴾ ''یقیناً آپ کا رب مغفرت والا بھی ہے اور دردناک سزا دینے والا بھی۔''

آیت ۴۴ ﴿وَلَوۡ جَعَلۡنٰهُ قُرۡاٰنًا اَعۡجَمِيًّا﴾ ''اور اگر ہم نے اسے عجمی قرآن بنایا ہوتا''

نوٹ کیجیے یہ پانچویں مرتبہ قرآن کا ذکر آیا ہے اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ اگر ہم نے اس قرآن کو عربی زبان کے بجائے کسی عجمی زبان میں نازل کیا ہوتا:

﴿لَّقَالُوۡا لَوۡلَا فُصِّلَتۡ اٰيٰتُهٗ ؕ﴾ ''تو یہ کہتے کہ اس کی آیات واضح کیوں نہیں کی گئیں!''

﴿ءَاَعۡجَمِىٌّ وَّعَرَبِىٌّ ؕ﴾ ''کیا کتاب عجمی اور مخاطب عربی؟''

ایسی صورت میں اس پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا تھا کہ جس کتاب کی اوّلین مخاطب ایک عربی قوم ہے وہ خود کسی اور زبان میں ہے!

﴿قُلۡ هُوَ لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا هُدًى وَّشِفَآءٌ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے کہ یہ ہدایت اور شفا ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔''

﴿وَالَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ فِىۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَقۡرٌ﴾ ''اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے''

﴿وَّهُوَ عَلَيۡهِمۡ عَمًى ؕ﴾ ''اور یہ (قرآن) ان کے حق میں اندھاپن ہے۔''

یعنی یہ لوگ قرآن کی حقیقت کو نہیں دیکھ پا رہے۔

﴿اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۴۴﴾﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جو پکارے جاتے ہیں بہت دور کی جگہ سے۔''

انہیں قرآن کی باتیں عجیب اور نامانوس لگتی ہیں۔ قرآن کی تعلیمات کے بارے میں انہیں ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے انہیں کوئی بہت دور سے پکار رہا ہو۔

آیت ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ﴾ ''اور ہم نے موسیٰؑ کو بھی کتاب دی تھی، تو اس میں بھی اختلاف کیا گیا۔''

﴿وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ﴾ ''اور اگر آپؐ کے رب کی طرف سے ایک بات پہلے سے طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے مابین فیصلہ کر دیا جاتا۔''

اللہ تعالیٰ کی تقویم میں ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے، اسی طرح ان کے فیصلے کا بھی اللہ تعالیٰ نے ایک وقت طے کر رکھا ہے۔ اگر یہ وقت پہلے سے طے نہ ہوتا تو ان کا فیصلہ اب تک چکا دیا جاتا۔

﴿وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۴۵﴾﴾ ''اور یقیناً وہ اس کے بارے میں خلجان انگیز شک میں مبتلا ہیں۔''

یہاں مِنْهُ سے مراد قرآن مجید ہے۔ یعنی پہلے انہوں نے خواہ مخواہ اختلافات کھڑے کیے۔ لیکن جب ہم نے ان اختلافات کی وضاحت کے لیے یہ کتاب بھیج دی تو اب وہ اس کے بارے میں ایسے شک و شبہ میں مبتلا ہو گئے ہیں جس نے انہیں سخت خلجان اور الجھن میں ڈال دیا ہے اور وہ اس میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

آیت ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ؕ﴾ ''جو کوئی نیک عمل کرتا ہے تو اپنے ہی لیے کرتا ہے، اور جو کوئی برا کام کرتا ہے تو اس کا وبال اسی پر آئے گا۔''

﴿وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۴۶﴾﴾ ''اور آپ کا رب کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے اپنے بندوں کے حق میں۔''

آیات ۴۷ تا ۵۴

اِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ؕ وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ اَيْنَ شُرَكَآءِيْ ۙ قَالُوْٓا اٰذَنّٰكَ ۙ مَا مِنَّا مِنْ شَهِيْدٍ ﴿۴۷﴾ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَدْعُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَظَنُّوْا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ﴿۴۸﴾ لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ ۫ وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوْسٌ قَنُوْطٌ ﴿۴۹﴾ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ ۙ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا ۫ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۰﴾ وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ ﴿۵۱﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۵۲﴾ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي

الجزء الخامس والعشرون (۲۵)

الْاٰفَاقِ وَ فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ اَوَلَمْ یَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ﴿۵۳﴾ اَلَاۤ اِنَّهُمْ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ ؕ اَلَاۤ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ ﴿۵۴﴾

آیت ۴۷ ﴿اِلَیْهِ یُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ؕ﴾ ''اُسی کی طرف لوٹتا ہے قیامت کا علم۔''

یعنی قیامت کا علم صرف اُسی کے پاس ہے۔

﴿وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ﴾ ''اور نہیں نکلتے کوئی پھل اپنے غلافوں سے اور نہ کسی مادہ کو حمل ہوتا ہے اور نہ ہی وہ اس کو جنتی ہے' مگر اُسی کے علم سے۔''

یعنی صرف قیامت ہی نہیں بلکہ تمام امورِ غیب کا علم اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے۔ مزید برآں اللہ تعالیٰ جزئیات کا بھی اتنا تفصیلی علم رکھتا ہے کہ اُس کی نگاہ سے کسی شخص کا کوئی چھوٹا سا عمل بھی مخفی نہیں رہ سکتا۔

واضح رہے کہ یہاں پر اُنثٰی کا لفظ اپنے مفہوم کے اعتبار سے انسانوں کے علاوہ تمام حیوانات کی ماداؤں کا احاطہ بھی کرتا ہے۔

﴿وَیَوْمَ یُنَادِیْهِمْ اَیْنَ شُرَكَآءِیْ ؕ﴾ ''اور جس دن وہ ان کو پکارے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک؟''

﴿قَالُوْۤا اٰذَنّٰكَ ۙ مَا مِنَّا مِنْ شَهِیْدٍ ﴿۴۷﴾﴾ ''وہ کہیں گے: ہم نے تو آپ سے عرض کر دیا ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس کی گواہی دینے والا نہیں۔''

اُس وقت وہ بے بسی کے عالم میں یہ بھی نہیں کہہ سکیں گے کہ دنیا میں ہم نے واقعتاً کچھ سہارے ڈھونڈ کر ان سے امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔

آیت ۴۸ ﴿وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَدْعُوْنَ مِنْ قَبْلُ﴾ ''اور وہ سب گم ہو جائیں گے اُن سے جنہیں وہ پکارا کرتے تھے اس سے پہلے''

اُس دن کی سختی کو دیکھ کر گویا اُن کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ جائیں گے۔

﴿وَظَنُّوْا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِیْصٍ ﴿۴۸﴾﴾ ''اور وہ یقین کر لیں گے کہ اب ان کے لیے کوئی جائے فرار نہیں۔''

آیت ۴۹ ﴿لَا یَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَیْرِ ۫﴾ ''انسان بھلائی مانگنے سے نہیں تھکتا''

یہاں بھلائی (خیر) سے مراد دنیوی نعمتوں اور مال و دولت کی فراوانی ہے۔ کسی انسان کے پاس جتنی چاہے دولت ہو اور جس قدر چاہے نعمتیں اسے میسر ہوں' پھر بھی مزید حاصل کرنے کی اس کی خواہش کبھی ختم نہیں ہوتی۔

﴿وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَیَئُوْسٌ قَنُوْطٌ ﴿۴۹﴾﴾ ''اور اگر کہیں اسے کوئی تکلیف پہنچ جائے تو بالکل مایوس و دل شکستہ ہو جاتا ہے۔''

آیت ۵۰ ﴿وَلَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ﴾ ''اور اگر اسے ہم اپنی رحمت کا مزہ چکھا دیں اس کے بعد کہ اُسے کوئی تکلیف پہنچی تھی''

﴿لَیَقُوْلَنَّ هٰذَا لِیْ ۙ﴾ ''تو وہ ضرور کہے گا کہ ہاں یہ تو میرا حق ہے''

سختی کا وقت گزر جانے کے بعد حالات بہتر ہو جانے پر وہ بڑے فخر سے دعوے کرے گا کہ میں نے اپنے ناخنِ تدبیر سے تمام

عقدے حل کر لیے ہیں اور اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بالآخر میں نے اپنے تمام مسائل پر قابو پا لیا ہے۔

﴿وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً﴾ ''اور میں نہیں سمجھتا کہ یہ قیامت وغیرہ کوئی قائم ہونے والی شے ہے۔''

﴿وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ﴾ ''اور اگر مجھے لوٹا ہی دیا گیا میرے رب کی طرف''

یہ ہو بہو وہی الفاظ ہیں جو سورۃ الکہف کی آیت ۳۶ میں ایک مالدار اور آسودہ حال شخص کے حوالے سے نقل ہوئے ہیں۔ ان دونوں مکالموں میں صرف رُدِدْتُ اور رُجِعْتُ کا فرق ہے۔ یہ جملہ دراصل ایک ایسے مادیت پسند انسان کی سوچ کی عکاسی کرتا ہے جو دنیا کی زندگی کو ہی اصل زندگی سمجھتا ہے اور ہمہ تن اسی کی زیب و زینت میں گم ہے۔ ایسے شخص کو اگر کسی وقت آخرت کی فکر پریشان کرتی ہے تو وہ اس خیال سے خود کو تسلی دے لیتا ہے کہ قیامت برپا ہونے کی یہ تمام باتیں اوّل تو محض ایک ڈھکوسلا ہیں' لیکن اگر بالفرض قیامت آ ہی گئی اور مجھے دوبارہ زندہ ہو کر اللہ کے حضور پیش ہونا ہی پڑا تو:

﴿اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى﴾ ''یقیناً میرے لیے اُس کے پاس بہتری ہی ہوگی۔''

اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں مجھے دولت اور عزّت دی ہے' اولاد عطا کی ہے اور طرح طرح کی دوسری نعمتوں سے بھی مجھے نواز رکھا ہے تو اس کا یہی مطلب تو ہے کہ میں اس کا منظورِ نظر ہوں اور وہ مجھ پر مہربان ہے۔ چنانچہ اس زندگی کے بعد بھی اگر کوئی زندگی ہے تو میں وہاں بھی اسی طرح اللہ تعالیٰ کا منظورِ نظر ہی رہوں گا' وہ وہاں بھی مجھ پر اسی طرح مہربان رہے گا اور جس طرح میں یہاں اس دنیا میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا ہوں وہاں بھی اسی طرح مزے اڑاؤں گا۔

﴿فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا﴾ ''تب ہم پوری طرح سے جتلا دیں گے ان کافروں کو جو کچھ بھی اعمال انہوں نے کیے ہوں گے۔''

﴿وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝۵۰﴾ ''اور انہیں ہم لازماً مزا چکھائیں گے بہت ہی گاڑھے عذاب کا۔''

﴿وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ﴾ ''اور جب ہم انسان پر نعمتوں کی بارش کر دیتے ہیں تو وہ رخ پھیر لیتا ہے اور اپنا پہلو بدل لیتا ہے۔''

﴿وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ ۝۵۱﴾ ''اور جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بڑی لمبی لمبی دعائیں کرنے لگتا ہے۔''

﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ان سے کہیے: کیا تم نے غور کیا کہ اگر یہ (قرآن) واقعی اللہ ہی کی طرف سے ہو' پھر تم نے اس کا کفر کیا''

بے شک تم لوگ قرآن کو اللہ کا کلام ماننے کے لیے تیار نہیں ہو' لیکن تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لو کہ اگر یہ واقعی اللہ کا کلام ہو اور تم لوگ اس کے منکر ہو رہے ہو تو:

﴿مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ۝۵۲﴾ ''تو کون ہوگا اس سے بڑھ کر بھٹکا ہوا جو دور کی مخالفت میں پڑا ہو!''

یہ بالکل وہی اسلوب ہے جو اس سے پہلے سورۂ سبا کی اس آیت میں اختیار فرمایا گیا ہے: ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ

﴿تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۛ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ﴾ (آیت ۴۶) ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے کہ میں تمہیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں' یہ کہ تم کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لیے دو دو ہو کر یا اکیلے اکیلے' پھر غور کرو' نہیں ہے تمہارے ساتھی کو جنون کا کوئی عارضہ۔''

اب یہاں آخری مرتبہ پھر قرآن مجید کا ذکر آ رہا ہے اور یہ استدلال ہمارے اس موجودہ سائنسی دور کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔

آیت ۵۳ ﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ﴾ ''عنقریب ہم انہیں دکھائیں گے اپنی نشانیاں آفاق میں بھی اور ان کی اپنی جانوں کے اندر بھی''

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اپنی جانوں اور زمین و آسمان کے اندر اللہ تعالیٰ کی نشانیاں مبرہن انداز میں ان لوگوں کے سامنے آتی چلی جائیں گی۔

﴿حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ﴾ ''یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے۔''

اس آیت میں دراصل معلومات کے اس explosion کی طرف اشارہ ہے جو سائنسی ترقی کے باعث آج کے دور میں ممکن ہوا ہے۔ موجودہ دور سائنس کا دور ہے۔ اس دور کی تاریخ زیادہ سے زیادہ دو سو برس پرانی ہے اور سائنسی ترقی میں یہ برق رفتاری جو آج ہم دیکھ رہے ہیں اسے شروع ہوئے تو ابھی نصف صدی ہی ہوئی ہے۔ چنانچہ پچھلی نصف صدی سے سائنسی ترقی کے سبب مسلسل حیرت انگیز انکشافات ہو رہے ہیں اور آئے روز نت نئی ایجادات سامنے آ رہی ہیں۔ ان سائنسی معلومات کے اکتشافات اور حقائق کے بے نقاب ہونے سے بتدریج قرآن مجید کا حق ہونا ثابت ہوتا چلا جا رہا ہے۔

دورۂ ترجمہ قرآن کے آغاز میں ''تعارفِ قرآن'' کے تحت اعجازِ قرآن کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ ان تمام پہلوؤں کا احصاء اور احاطہ کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ نزولِ قرآن کے وقت اعجازِ قرآن کے جس پہلو نے اہلِ عرب کو سب سے زیادہ متأثر بلکہ مسحور کیا تھا وہ اس کی فصاحت' بلاغت اور ادبیت تھی۔ اُس وقت قرآن نے عرب بھر کے شعراء' خطباء اور فصحاء کو ان کے اپنے میدان میں چیلنج کیا کہ اگر تم لوگ دعویٰ کرتے ہو کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے تو تم اس جیسی ایک سورت بنا کر دکھاؤ۔ یہ چیلنج انہیں اس میدان میں دیا گیا تھا جس کے شہسوار ہونے پر انہیں خود اپنے اوپر ناز تھا اور جس کے نشیب و فراز کو وہ خوب اچھی طرح سے سمجھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس چیلنج کا جواب نہ دے سکے۔

نزولِ قرآن کے وقت عربوں کے ہاں چونکہ شاعری اور سخن وری و سخن فہمی کا بہت چرچا تھا اس لیے اس دور میں قرآن نے اپنے اسی ''اعجاز'' کو نمایاں کیا تھا۔ آج جبکہ سائنس کا دور ہے تو آج اعجازِ قرآن کے سائنسی پہلو کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ قرآن نے انسان کو کائنات میں بکھری ہوئی آیاتِ الٰہیہ کا مشاہدہ کرنے اور ان پر غور کرنے کی بار بار دعوت دی ہے' لیکن ظاہر بات ہے کہ اس میدان میں چودہ سو سال پہلے کے مشاہدے اور آج کے مشاہدے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پرانے زمانے کا انسان کائنات کے عجائبات کو ننگی آنکھ سے دیکھتا تھا جبکہ آج کے انسان کو بہت بڑی بڑی ٹیلی سکوپس' الیکٹرانک مائیکروسکوپس اور نہ جانے کون کون سی سہولیات میسر ہیں۔ بہرحال آج خصوصی محنت اور کوشش سے یہ حقیقت دنیا کے سامنے لانے کی ضرورت ہے کہ جن حقائق تک سائنس آج پہنچ پا رہی ہے قرآن نے بنی نوع انسان کو چودہ صدیاں پہلے ان سے متعارف کرا دیا تھا۔ لیکن مقامِ افسوس ہے کہ ابھی تک کسی

مسلمان اسکالر کو قرآن اور سائنسی معلومات کا تقابلی مطالعہ (comparative study) کر کے یہ ثابت کرنے کی توفیق نہیں ہوئی کہ اب تک کے تمام سائنسی انکشافات قرآن کی فراہم کردہ معلومات کے عین مطابق ہیں۔ حال ہی میں فرانسیسی سرجن ڈاکٹر موریس بوکائی [Maurice Bucaile (1920-1998)] نے ''بائبل' قرآن اور سائنس'' (The Bible, The Quran and Science) کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے' جس میں اس نے ثابت کیا ہے کہ اب تک جو بھی سائنسی حقائق دنیا کے سامنے آئے ہیں وہ نہ صرف قرآن میں دی گئی تفصیلات کے عین مطابق ہیں بلکہ ان سب کے مطالعہ سے قرآن کی حقانیت بھی ثابت ہوتی ہے۔ اپنی اسی تحقیق کی بدولت موصوف سرجن کو ایمان کی دولت بھی نصیب ہوئی۔

قرآن کی بعض آیات تو اگرچہ آج بھی سائنسی حوالے سے تحقیق طلب ہیں' لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اب تک سامنے آنے والے سائنسی انکشافات کی روشنی میں قرآن کی متعلقہ آیات وعبارات کے مفاہیم ومطالب مزید نکھر کر سامنے آئے ہیں۔ بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ قرآن کے بعض الفاظ کے جو معانی پرانے زمانے میں سمجھے گئے تھے وہ غلط ثابت ہوئے ہیں اور ان کی جگہ ان الفاظ کے زیادہ واضح اور زیادہ منطقی معانی سامنے آئے ہیں۔ مثلاً لفظ عَلَقَہ کا وہ مفہوم جو قبل ازیں سورۃ المؤمنون کی آیت ۱۴ کے ضمن میں بیان ہوا ہے زیادہ بہتر اور درست ہے۔ اور لفظ ''فائدہ'' اور ''فؤاد'' کی وہ وضاحت جو سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۳۶ کے تحت دی گئی ہے زیادہ واضح اور منطقی ہے۔

اسی طرح اجرامِ سماویہ کے بارے میں قرآنی الفاظ ﴿وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝۴۰﴾ (یٰسٓ) کا وہ مفہوم جو آج کے انسان کو معلوم ہوا ہے وہ پرانے زمانے کے انسان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا' بلکہ انسانی تاریخ شاہد ہے کہ اجرامِ فلکی اور ان کی گردش سے متعلق مختلف زمانوں میں مختلف موقف اختیار کیے گئے۔ کسی زمانے میں انسان سمجھتا تھا کہ زمین ساکن ہے اور سورج حرکت میں ہے۔ پھر اسے یوں لگا جیسے سورج ساکن ہے اور زمین اس کے گرد گھومتی ہے۔ حتیٰ کہ آج کے انسان نے اپنی تحقیق وجستجو سے یہ ثابت کر دیا کہ سچ یہی ہے: ﴿وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝﴾ کہ یہ سب ہی اپنے اپنے مدار میں گھوم رہے ہیں۔ بلکہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ متحرک ہے' حتیٰ کہ ہر ایٹم (atom) کے اندر اس کے اجزاء (الیکٹرانز' پروٹانز اور نیوٹرانز) بھی بے تابانہ مسلسل گردش میں ہیں۔ اقبالؔ نے اپنے اس شعر میں اسی حقیقت کی ترجمانی کی ہے: ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں ثبات اِک تغیر کو ہے زمانے میں!

موجودہ دور میں اگرچہ مسلمانوں کو قرآن اور سائنس کے حوالے سے خصوصی اہتمام کے ساتھ تحقیق وتدقیق کرنے کی ضرورت ہے' لیکن ایسی کسی تحقیق کے دوران خواہ مخواہ تکلف کرنے اور زبردستی کھینچ تان کر کے قرآن کے دوراز کار مفاہیم نکالنے کی کوشش میں نہیں رہنا چاہیے۔ بلکہ جہاں پر عقلی اور سائنسی طور پر بات سمجھ میں نہ آئے وہاں تسلیم کر لینا چاہیے کہ ابھی بات واضح نہیں ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یقین رکھنا چاہیے کہ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے: ﴿كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ﴾ (آل عمران:۷)۔ ایک وقت ضرور آئے گا کہ جو بات آج واضح نہیں ہے وہ واضح ہو جائے گی' اور خارج کی دنیا میں اس حوالے سے جو حقائق بھی منکشف ہوں گے وہ قرآن کے الفاظ کے عین مطابق ہوں گے۔ ان شاء اللہ! البتہ جن سائنسی حقائق کی اب تک قرآن کے ساتھ مطابقت ثابت ہو چکی ہے انہیں عام کر کے قرآن کی حقانیت کے سائنٹفک ثبوت کے طور پر لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

آیت زیر مطالعہ میں فعل مضارع (سَنُرِیۡہِمۡ) سے پہلے ''س'' کی وجہ سے اس لفظ کے مفہوم میں خصوصی طور پر مستقبل کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی مستقبل میں ہم انہیں اپنی ایسی نشانیاں دکھائیں گے جن سے قرآن کی حقانیت واضح ہو جائے گی۔ اس ''مستقبل'' کا احاطہ کرنے کی کوشش میں اگر چشمِ تصور کو جنبش دی جائے تو اس کی حدود نزولِ قرآن کے دَور کی فضاؤں سے لے کر زمانۂ قیامت کی دہلیز تک وسعت پذیر نظر آئیں گی۔ آج وقت کی شاہراہ پر انسانی علم کی برق رفتاری کا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہر آنے والے دن کے ساتھ انسانی تحقیق کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ خلاء کی پہنائیوں کے راز اس کے سامنے ایک ایک کر کے بے نقاب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ سمندروں کی اتھاہ گہرائیاں اس کی عمیق نظری کے سامنے سرنگوں ہیں۔ قطب شمالی (Arctic) اور قطب جنوبی (Antarctic) سمیت زمین کا چپہ چپہ ہر پہلو سے نت نئی تحقیق کی زد میں آ چکا ہے۔ غرض سائنسی ترقی کا یہ ''جن'' کہکشاؤں کی بلندیوں سے لے کر تحت الثریٰ کی گہرائیوں تک معلومات کے خزانے اکٹھے کر کے بنی نوعِ انسان کے قدموں میں ڈالتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن الحمدللہ! اس تحقیق کے ذریعے سے اب تک جو حقائق بھی سامنے آئے ہیں وہ سب کے سب قرآن کی حقانیت پر گواہ بنتے چلے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے علم و تحقیق کا یہ قافلہ وقت کی شاہراہ پر اپنا سفر قیامت تک جاری رکھے گا۔ ہمارا ایمان ہے کہ اس سفر کے دوران ایجاد و دریافت کے میدان میں انسان کو جو کامیابیاں بھی نصیب ہوں گی اور انفس و آفاق کی دنیاؤں کے جو جو راز بھی منکشف ہوں گے وہ سب کے سب بالآخر قرآن حکیم کی حقانیت پر مہرِ تصدیق ثبت کرتے چلے جائیں گے۔

﴿اَوَلَمۡ یَکۡفِ بِرَبِّکَ اَنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ ﴿۵۳﴾﴾ ''کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ آپ کا ربّ ہر چیز پر گواہ ہے!''

کائنات کی ہر چیز اس کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ لیکن اس نے قرآن میں صرف اسی حد تک حقائق کا ذکر کیا ہے جس حد تک انسان انہیں سمجھ سکتا ہے اور اسی انداز میں ان کا ذکر کیا ہے جس انداز میں انسانی فہم و شعور کی رسائی ان تک ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے وہ حقائق جن تک آج کے انسان کی تدریجاً رسائی ہوئی ہے اگر وہ آج سے پندرہ سو سال پہلے من و عن بیان کر دیے جاتے تو اس وقت انہیں کون سمجھ سکتا تھا۔

آیت ﴿اَلَاۤ اِنَّہُمۡ فِیۡ مِرۡیَۃٍ مِّنۡ لِّقَآءِ رَبِّہِمۡ ؕ﴾ ''آگاہ ہو جاؤ! یہ لوگ اپنے رب کے ساتھ ملاقات سے متعلق شک میں پڑے ہوئے ہیں۔''

﴿اَلَاۤ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیۡءٍ مُّحِیۡطٌ ﴿۵۴﴾﴾ ''آگاہ ہو جاؤ! بے شک وہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔''

سُوْرَۃُ الشُّوْرٰی

تمہیدی کلمات

سورۃ الشوریٰ کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ نکتہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ توحیدِ عملی کا وہ مضمون جو سورۃ الزمر سے شروع ہوا تھا' سورۃ المؤمن اور سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں ایک خاص ترتیب و تدریج سے آگے بڑھتا ہوا اس سورت میں آ کر ''اجتماعی عملی توحید'' کی شکل میں اپنے نقطۂ عروج (climax) پر پہنچ رہا ہے۔ چنانچہ اس مضمون کا صحیح ادراک اور شعور حاصل کرنے کے لیے توحیدِ عملی اور اجتماعیت کے باہمی ربط و لزوم کے بارے میں جاننا بھی ضروری ہے۔ اس حوالے سے یہ حقیقت تو بہرحال کسی تعارف کی محتاج نہیں کہ فرد اور معاشرے کا وجود ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہے۔ انسان ایک متمدن حیوان ہے' وہ اکیلا زندگی بسر نہیں کر سکتا' اس لیے دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنا اس کی مجبوری ہے۔ چنانچہ جب بہت سے انسان مل جل کر رہتے ہیں تو ایک اجتماعی نظام تشکیل پاتا ہے۔ پھر اس اجتماعی نظام کے اندر حسبِ ضرورت چھوٹے چھوٹے کئی نظام اور شعبے وجود میں آ جاتے ہیں' جیسے کہ آج ہر معاشرے میں عائلی نظام' معاشرتی نظام' معاشی نظام' سیاسی نظام وغیرہ موجود ہیں۔

اس تمہید کے حوالے سے موضوع کے بارے میں سمجھنے کا اصل نکتہ یہ ہے کہ جب تک کسی انسانی اجتماعیت میں موجود تمام نظام اللہ کی حاکمیت کے تابع نہ ہو جائیں تب تک اجتماعی سطح پر توحید قائم نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اگر کسی معاشرے میں انفرادی طور پر تمام لوگ توحید پرست بھی ہوں لیکن معاشرے کے اجتماعی نظام پر باطل کا غلبہ ہو تو اس معاشرے کو اسلامی معاشرہ نہیں کہا جا سکتا۔ ایسی صورت میں ان تمام توحید پرست افراد پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے معاشرے یا ملک سے باطل نظام کو اکھاڑ پھینکنے اور وہاں اللہ کا نظام قائم کرنے کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہیں۔ ان لوگوں کی انفرادی توحید بھی تب ہی قابلِ قبول ہو گی جب وہ اپنے تَن مَن دھن سے باطل نظام کا قلع قمع کرنے کے لیے اپنی جدّ و جہد مسلسل جاری رکھیں گے۔ لیکن اگر وہ باطل نظام کے تحت اطمینان کے ساتھ گزر بسر کر رہے ہوں' دن رات اپنے کیریئرز سنوارنے' کاروبار بڑھانے اور جائیدادیں بنانے میں مصروف و مشغول ہوں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ طاغوت کی اطاعت کو قبول کر کے اللہ کی حاکمیت کا انکار کر چکے ہیں۔ اس حالت میں اگر وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند بھی ہوں اور بہت سے دوسرے نیک اعمال کا اہتمام بھی کرتے ہوں تو بھی وہ اللہ کے ہاں سرخرو نہیں ہو سکتے۔

سورۃ الشوریٰ کے حوالے سے ایک اہم بات یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ معاشرے میں اجتماعی سطح پر توحید کے نفاذ کے لیے ''اقامتِ دین'' کی اصطلاح صرف اسی سورت (آیت ۱۳) میں آئی ہے۔ چنانچہ اقامتِ دین کے موضوع پر یہ سورت قرآن حکیم کا ذروۂ سنام ہے۔

آیات ۱ تا ۹

سُوْرَةُ الشُّوْرٰى مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۵۳ رُكُوْعَاتُهَا: ۵

حٰمٓ ۝۱ عٓسٓقٓ ۝۲ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَ اِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۳ لَهٗ
مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ هُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝۴ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ
فَوْقِهِنَّ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ
الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝۵ وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ۖ وَ مَآ اَنْتَ
عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝۶ وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا وَ
تُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَ فَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ۝۷ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ
لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ وَ الظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّ
لَا نَصِيْرٍ ۝۸ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَ هُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى ۫ وَ هُوَ عَلٰى
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۹

آیت ۱ ﴿حٰمٓ ۝۱﴾ ''ح' م۔''

آیت ۲ ﴿عٓسٓقٓ ۝۲﴾ ''ع' س' ق۔''

سورۃ الشوریٰ قرآن مجید کی ان دو سورتوں میں سے ایک ہے جن کے آغاز میں پانچ پانچ حروفِ مقطعات آئے ہیں' لیکن اس زمرے میں بھی یہ سورت اس لحاظ سے منفرد و یکتا ہے کہ اس کے آغاز میں حروفِ مقطعات کی دو آیات ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر اس سورت سے بھی خصوصی نسبت ہے اور اس کی وجہ بھی سورۃ الحدید کے ساتھ میری نسبت ہی ہے۔ دراصل مضامین کے حوالے سے مدنی قرآن میں جو مقام سورۃ الحدید کا ہے بعینہٖ وہی مقام سورۃ الشوریٰ کا مکی قرآن میں ہے۔ سورۃ الشوریٰ حجم (۵۳ آیات) کے لحاظ سے سورۃ الحدید (۲۹ آیات) سے تقریباً دوگنا ہے' اور مکی قرآن چونکہ حجم کے اعتبار سے مدنی قرآن سے دوگنا ہے اس لیے ان دونوں سورتوں کے مابین حجم کے اس تناسب سے بھی یہی لگتا ہے کہ مکی قرآن کے اندر سورۃ الشوریٰ گویا سورۃ الحدید کا بدل ہے۔

آیت ۳ ﴿كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۳﴾ ''(اے نبی ﷺ!) اسی طرح وحی کرتا ہے آپ کی طرف اور ان کی طرف بھی کرتا رہا ہے جو آپ سے پہلے تھے وہ اللہ جو بہت زبردست' بہت حکمت والا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے دراصل آپؐ کے مخاطبین کو بتایا جا رہا ہے کہ یہ مضامین جس طرح آپؐ کی طرف وحی کیے جا رہے ہیں اسی طرح آپؐ سے پہلے آنے والے انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی وحی کیے جا چکے ہیں۔ كَذٰلِكَ میں وحدتِ مدعا کی طرف بھی اشارہ ہے اور طریقۂ وحی کی یکسانیت کی طرف بھی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کو انہی باتوں کی تعلیم دی ہے جن کی تعلیم

آپؐ کو دی جا رہی ہے۔ اس کی وضاحت آگے آیت ۱۳ میں آ رہی ہے: ﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ ...﴾ نیز اس تعلیم کے لیے پہلے بھی کئی طریقہ اختیار فرمایا جو آپؐ کے لیے اختیار فرمایا ہے' یعنی وحی کا نزول۔ اس کی وضاحت آیت ۵۱ میں آ رہی ہے۔ مذکورہ آیت میں وحی کی اقسام کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کن کن طریقوں سے انسانوں پر وحی بھیجتا رہا ہے۔ وحی کی ان اقسام کا ذکر میں نے اپنے لیکچر ''تعارفِ قرآن'' میں بھی کیا ہے' جو ''بیان القرآن'' حصہ اول میں بھی شامل ہے۔

آیت ۴ ﴿لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝۴﴾ ''اُسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور وہ بہت بلند و بالا' بہت عظمت والا ہے۔''

آیت ۵ ﴿تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ﴾ ''قریب ہے کہ آسمان اپنے اوپر سے پھٹ پڑیں''

آسمان فرشتوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے ہیں۔ اتنے بڑے اجتماع کی وجہ سے آسمان پھٹنے کے قریب ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ آسمانوں میں کوئی ایک بالشت برابر بھی جگہ خالی نہیں کہ جہاں کوئی فرشتہ سربسجود نہ ہو یا قیام میں مصروف نہ ہو۔ سورۃ المدثر (آیت ۳۱) میں فرشتوں کی کثرتِ تعداد سے متعلق ان الفاظ میں اشارہ فرمایا گیا ہے: ﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۭ﴾ کہ آپ ﷺ کے ربّ کے لشکروں کے بارے میں سوائے خود اُس کے اور کوئی نہیں جانتا۔

﴿وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ﴾ ''اور فرشتے تسبیح کرتے ہیں اپنے رب کی حمد کے ساتھ اور زمین میں جو (اہلِ ایمان) ہیں ان کے لیے استغفار کرتے ہیں۔''

سورۃ المؤمن کی آیت ۷ میں بھی ہم پڑھ آئے ہیں کہ حاملینِ عرش اور ان کے ساتھی فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرتے ہیں اور اہلِ ایمان کے لیے مغفرت اور رحمت کی دعائیں کرتے ہیں۔

﴿اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝۵﴾ ''آگاہ ہو جاؤ! یقیناً اللہ ہی بخشنے والا' رحم کرنے والا ہے۔''

آیت ۶ ﴿وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ﴾ ''اور جن لوگوں نے اُس کے سوا دوسرے مددگار بنا رکھے ہیں''

﴿اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ۣ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝۶﴾ ''اللہ ان پر نگران ہے' اور (اے نبی ﷺ!) آپ ان کے ذمہ دار نہیں ہیں۔''

وہ سمجھتے ہیں کہ قیامت کے دن وہ معبود اُن کی شفاعت کریں گے اور ان کے ذریعے سے انہیں اللہ کا قُرب حاصل ہو جائے گا' لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ ان کے سارے افعال کی نگرانی کر رہا ہے اور ان کا نامۂ اعمال تیار ہو رہا ہے۔ ان کا محاسبہ اور مواخذہ کرنا اُسی کا کام ہے۔

آیت ۷ ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا﴾ ''اور اسی طرح ہم نے وحی کیا ہے آپؐ کی طرف یہ قرآن عربی''

آیت ۳ کی طرح یہاں پر بھی وحی کے ذکر کے ساتھ لفظ كَذٰلِكَ آیا ہے۔ اس کی وضاحت قبل ازیں کی جا چکی ہے۔

﴿لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا﴾ ''تاکہ آپؐ خبردار کر دیں بستیوں کے مرکز اور اس کے اردگرد رہنے والوں کو''

بالکل یہی الفاظ سورۃ الانعام کی آیت ۹۲ میں بھی آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی قوم پر اتمامِ حُجت کرنے کا یہ وہی طریقہ اور

اصول ہے جس کا ذکر سورۃ القصص کی آیت ۵۹ میں اس طرح ہوا ہے: ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا﴾ ''اور نہیں تھا آپؐ کا ربّ بستیوں کو ہلاک کرنے والا جب تک کہ وہ ان کی مرکزی بستی میں کوئی رسول نہ بھیج دیتا''۔ جزیرہ نمائے عرب کی ''اُمّ القریٰ'' یعنی مرکزی بستی چونکہ مکّہ ہے اس لیے مذکورہ اصول کے تحت اس مرکزی بستی میں نبی آخر الزماں ﷺ کو مبعوث فرمایا گیا۔ بلکہ ایک اعتبار سے تو مکّہ پوری دنیا کا ''اُمّ القریٰ'' ہے۔ اس لیے کہ حَوْلَ کے معنی اردگرد کے ہیں اور ''اردگرد'' کی حدود کسی خاص نقطے تک محدود نہیں کی جاسکتیں۔ چنانچہ ایک مرکزی مقام کے اردگرد کے دائرے کو اگر بڑھاتے جائیں تو یہ دائرہ پوری دنیا تک پھیل جائے گا۔ اس نکتے کی وضاحت اس سے پہلے سورۃ الانعام کی آیت ۹۲ کے تحت بھی گزر چکی ہے۔

﴿وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ﴾ ''اور آپؐ خبردار کردیں اُس جمع ہونے والے دن سے جس میں کوئی شک نہیں۔''

﴿فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ۝۷﴾ ''(اُس دن) ایک گروہ جنّت میں جائے گا اور ایک گروہ جہنّم میں۔''

آیت ۸ ﴿وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ ''اور اگر اللہ چاہتا تو انہیں ایک ہی اُمّت بنا دیتا''

اللہ ایسے بھی کرسکتا تھا کہ دنیا کے تمام انسان مؤمن ہوتے۔

﴿وَّلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَاۗءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ﴾ ''لیکن اللہ داخل کرتا ہے اپنی رحمت میں جس کو چاہتا ہے۔''

ان الفاظ کا ترجمہ یوں بھی ہوسکتا ہے: ''لیکن اللہ داخل کرتا ہے اپنی رحمت میں اُس کو جو چاہتا ہے''۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی رحمت یا مغفرت اور جنّت کی نعمتیں صرف اسی کو عطا کرتا ہے جو ان کی خواہش رکھتا ہو اور اپنی محنت کی صورت میں ان کی قیمت بھی ادا کرنے کو تیار ہو۔ اس حوالے سے سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۱ کے یہ الفاظ بھی ہر اہلِ ایمان کے پیش نظر رہنے چاہئیں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰي مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ﴾ ''یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں اہلِ ایمان سے ان کی جانیں بھی اور ان کے مال بھی اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنّت ہے۔''

﴿وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝۸﴾ ''اور جو ظالم (کافر و مشرک) ہوں گے ان کے لیے نہ کوئی حمایتی ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔''

آیت ۹ ﴿اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ ۚ﴾ ''کیا انہوں نے اللہ کے سوا کوئی اور حمایتی بنا لیے ہیں؟''

یہاں پر پھر وہی بات دہرائی گئی ہے جو پیچھے ہم آیت ۶ میں پڑھ آئے ہیں۔

﴿فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ﴾ ''سو حمایتی تو صرف اللہ ہی ہے''

اے کم عقلو! اللہ کو چھوڑ کر تم کدھر بھٹک رہے ہو؟ اصل حمایتی، مددگار اور کارساز تو بس وہی ہے۔ اُسی کو اپنا سہارا بناؤ اور اُسی کو اپنا ولی مانو! اس حوالے سے سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۵۷ کے یہ الفاظ اہلِ ایمان کے لیے بہت بڑی خوشخبری کی حیثیت رکھتے ہیں: ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ﴾ ''اللہ ولی ہے اہلِ ایمان کا، وہ انہیں (گمراہیوں کے) اندھیروں سے نکال کر (ہدایت کی) روشنی کی طرف لاتا ہے۔''

﴿وَهُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى ۡ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۹﴾ ''اور وہی ہے جو زندہ کرے گا مُردوں کو، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

آیات ۱۰ تا ۲۰

وَ مَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَ اِلَيْهِ
اُنِيْبُ ۝۱۰ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّ مِنَ الْاَنْعَامِ
اَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ؕ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝۱۱ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۱۲ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ
الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَعِيْسٰۤى
اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ اَللّٰهُ
يَجْتَبِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝۱۳ وَ مَا تَفَرَّقُوْۤا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ
الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّ
الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝۱۴ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَ اسْتَقِمْ كَمَاۤ
اُمِرْتَ ۚ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ
بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ ؕ لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ
يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝۱۵ وَ الَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ
حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ عَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۝۱۶ اَللّٰهُ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ
الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ؕ وَ مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ۝۱۷ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا
يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ؕ اَلَاۤ اِنَّ الَّذِيْنَ
يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ۝۱۸ اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ هُوَ الْقَوِيُّ
الْعَزِيْزُ ۝۱۹ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا ع
نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ۝۲۰

آیت ۱۰ ﴿وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ﴾ ”اور جس بات میں بھی تم اختلاف کرو تو اُس کا فیصلہ اللہ ہی کی طرف ہے۔“

یعنی تمہارے مابین جو بھی اختلاف ہو اُس کے فیصلے کا حق اللہ ہی کے پاس ہے۔ یہاں سے اس سورت کے ”مضمون خاص“ یعنی اقامتِ دین کی تمہید شروع ہو رہی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں پہلا نکتہ یہ بتایا گیا کہ اس کائنات کا اصل حاکم اللہ ہے اور حاکمیت صرف اور صرف اُسی کے لیے ہے: Sovereignty belongs to HIM and HIM alone. اس نکتے کو اقبالؔ نے یوں بیان کیا ہے: ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے حکمراں ہے اک وہی باقی بُتانِ آزری

آیت کے ان الفاظ کے مفہوم کے مطابق انسانوں کے باہمی اختلافات کے فیصلوں کے لیے اللہ کا حکم آخری حکم کا درجہ رکھتا ہے اور اسی حقیقت کی تعمیل کا نام اللہ کی حاکمیت ہے۔ اگر کسی معاشرے کا پورا نظام اللہ کی حاکمیت کے تحت آ جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہاں اللہ کا دین قائم ہو گیا اور توحید بالفعل اس معاشرے میں نافذ ہو گئی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اُس کے قانون کے مطابق باقاعدہ ایک حکومت قائم ہو جانے کا نام ''اقامتِ دین'' ہے' جو زیر مطالعہ آیات کا مرکزی مضمون ہے۔

﴿ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ۝۱۰﴾ ''وہ ہے اللہ میرا رب' اُسی پر مَیں نے توکّل کیا ہے اور اُسی کی طرف مَیں رجوع کرتا ہوں۔''

آیت ۱۱ ﴿فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا فرمانے والا ہے۔''

﴿جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ﴾ ''اُس نے تمہاری ہی نوع سے تمہارے جوڑے بنا دیے اور چوپایوں سے بھی جوڑے (بنائے)۔''

جان داروں کی ہر نوع (species) میں نر بھی ہیں اور مادہ بھی۔

﴿يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ؕ﴾ ''اسی میں وہ تمہاری افزائش کرتا ہے۔''

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ﴾ ''اُس کی مثال کی سی بھی کوئی شے نہیں۔''

اُس کی ہستی بالکل یکتا (absolutely unique) ہے۔ یہ اپنی طرز کا ایک منفرد اور حساس موضوع ہے جس کے اظہار کے لیے خصوصی اسلوب درکار ہے۔ لیکن ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہماری زبان میں مطلق نفی (absolute negation) کے لیے کوئی لفظ اور اسلوب ہے ہی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ اُس جیسی کوئی شے نہیں یا اُس کی مثال کی سی کوئی شے نہیں۔ لَا مِثْلَ لَهٗ وَلَا مِثَالَ لَهٗ' وَلَا ضِدَّ لَهٗ وَلَا نِدَّ لَهٗ۔ بہرحال یوں سمجھ لیں کہ اس مفہوم میں جتنے مترادفات چاہے استعمال کر لیے جائیں' توحید کے اظہار و بیان کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

﴿وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝۱۱﴾ ''اور وہی ہے سب کچھ سننے والا' سب کچھ دیکھنے والا ہے۔''

آیت ۱۲ ﴿لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ﴾ ''اُسی کے لیے ہیں آسمانوں اور زمین کی تمام کُنجیاں۔''

﴿يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ﴾ ''وہ کشادہ کر دیتا ہے رزق جس کے لیے چاہتا ہے اور (جس کو چاہتا ہے) ناپ تول کر دیتا ہے۔''

﴿اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۱۲﴾ ''یقیناً وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔''

وہ خوب جانتا ہے کہ کس کے لیے رزق میں کشادگی بہتر ہے اور کس کو بقدرِ ضرورت دینا مناسب ہے۔

اگلی آیت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں ''اقامتِ دین'' کی اصطلاح آئی ہے۔ اس لحاظ سے یہ آیت اس سورت کا عمود ہے اور اس مضمون کے اعتبار سے یہ مقام پورے قرآن میں ذروۂ سنام (climax) کا درجہ رکھتا ہے۔

آیت ۱۳ ﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا﴾ ''(اے مسلمانو!) اللہ نے تمہارے لیے دین میں وہی کچھ مقرر کیا ہے جس کی وصیت اُس نے نوحؑ کو کی تھی''

یہ براہِ راست اُمت سے خطاب ہے۔ مکّی سورتوں میں چونکہ عام طور پر اہلِ ایمان کو ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' کے الفاظ سے براہِ راست مخاطب نہیں کیا جاتا اس لیے یہاں جمع کا یہ صیغہ (شَرَعَ لَكُمْ) استعمال فرمایا گیا ہے۔ مکّی سورتوں میں اس حوالے سے ہمیں دوسرا اسلوب یہ بھی ملتا ہے کہ صیغہ واحد میں حضور ﷺ کو مخاطب کر کے اہلِ ایمان کو پیغام پہنچایا جاتا ہے۔

﴿وَالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى وَعِیْسٰٓى﴾ ''اور جس کی وحی ہم نے (اے محمد ﷺ) آپ کی طرف کی ہے' اور جس کی وصیت ہم نے کی تھی ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو''

﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ﴾ ''کہ قائم کرو دین کو۔''

اس آیت سے ایک تو یہ معلوم ہوا ہے کہ حضرات نوح' ابراہیم' موسیٰ' عیسیٰ علیہم السلام اور محمد رسول اللہ ﷺ کا' یعنی تمام پیغمبروں کا دین ایک ہی ہے۔ یہی مضمون سورۃ الانبیاء میں اس طرح آیا ہے: ﴿اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ﴾ ''یقیناً یہ تمہاری اُمت' ایک ہی اُمت ہے اور میں تم سب کا رب ہوں' لہٰذا تم لوگ میری ہی بندگی کرو''۔ یعنی تمام انبیاء و رُسلؑ اور ان کی اُمتوں کا دین ایک ہی تھا۔ ان کے درمیان اگر کوئی فرق یا اختلاف تھا تو وہ شریعتوں میں تھا۔ دوسری اہم بات اس آیت میں یہ بیان کی گئی ہے کہ اقامتِ دین کا فریضہ ان تمام پیغمبروں کو سونپا گیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپؑ کی قوم کو اس سلسلے میں جو حکم ملا تھا اس کا ذکر قرآن میں موجود ہے کہ تم لوگ ارضِ فلسطین کو فتح کرنے کے لیے جہاد کرو۔ ظاہر ہے اس خطہ پر قبضہ کرنے کا مقصد اللہ کے دین کو وہاں بالفعل نافذ کرنا تھا۔ چنانچہ اقامتِ دین کی جدّوجُہد ماقبل اُمتوں پر بھی فرض تھی۔

بہرحال اَقِیْمُوا الدِّیْنَ کے حکم کا خلاصہ یہی ہے کہ زبان سے صرف عقیدۂ توحید کا اقرار کر لینا کافی نہیں' بلکہ اس عقیدے کا رنگ اپنے اعمال پر بھی چڑھاؤ' اور نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی طور پر اپنے معاشرے کی اعلیٰ ترین (ریاستی اور حکومتی) سطح پر اس کی تنفیذ و تعمیل کو یقینی بناؤ۔ واضح رہے کہ مترجمین نے بالعموم ﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ﴾ کا ترجمہ کیا ہے: ''کہ دین کو قائم رکھو!'' یہ بھی درست ہے' کیونکہ اقامتِ دین کے حوالے سے کسی معاشرے میں دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو وہاں دین قائم ہے یا قائم نہیں ہے۔ چنانچہ اس حکم کا منشاء یہ ہے کہ اگر دین پہلے قائم ہے تو اسے قائم رکھو اور اگر قائم نہیں ہے تو اسے قائم کرو۔ مثلاً خیمہ اگر کھڑا ہے تو اسے گرنے سے بچانا ہے اور اگر پہلے سے کھڑا نہیں ہے تو اسے کھڑا (erect) کرنا ہے۔

﴿وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ؕ﴾ ''اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔''

یعنی تم لوگ اپنے دین کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دو۔ ایسا نہ ہو کہ کسی ایک معاملے میں تو تم اللہ کا حکم مانو اور کسی دوسرے معاملے میں کسی اور کی خوشنودی کے طالب بن جاؤ۔ اسی رویّے اور طریقے کو تفرقہ کہا جاتا ہے جس سے یہاں منع کیا جا رہا ہے۔ سورۃ الانعام کی آیت ۱۵۹ کے الفاظ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ ...﴾ میں بھی ایسے ہی تفرقے کی طرف اشارہ ہے۔ البتہ فروعی مسائل میں ایک دوسرے کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے' یہ تفرقہ نہیں ہے۔ مثلاً مَیں اگر رفع یدین کرتا ہوں اور میرے کئی ساتھی امام ابوحنیفہؒ کے موقف کو زیادہ صحیح سمجھتے ہوئے رفع یدین کے بغیر نماز پڑھتے ہیں تو ایسے اختلاف میں کوئی حرج نہیں' جبکہ بنیادی طور پر دین میں

تفریق یا تفرقے کا طرزِ عمل نہ اپنایا جائے اور اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی اور سلفی سب کے سب ایک ہی دین یعنی اسلام کے ماننے والے ہیں۔ اسی طرح مختلف پیغمبروں کی شریعتوں میں بھی اختلاف ہوسکتا ہے، مثلاً اب شریعتِ محمدی ﷺ کا زمانہ ہے، اس سے پہلے شریعتِ موسویؑ کا دور تھا، اور اس سے پہلے کوئی اور شریعت تھی۔ لیکن یہ نکتہ بہرحال واضح رہنا چاہیے کہ تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کا دین ایک ہی تھا یعنی اسلام۔

﴿كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) بہت بھاری ہے مشرکین پر یہ بات جس کی طرف آپ ان کو بلا رہے ہیں۔''

مشرکین کی زندگی تو اسی تفریق و تقسیم پر چل رہی ہے۔ وہ تو اس نظریے پر عمل پیرا ہیں کہ ''جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو اور جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو''۔ ہمارے ہاں بھی ایسی ہی تقسیم پر دنیا کے معاملات چل رہے ہیں کہ جو حکومت کا حق ہے وہ حکومت کو دو اور جو مولوی کا حق ہے وہ مولوی کو دو۔ اور فرض کریں اگر علماء بھی اس تقسیم پر راضی ہو جائیں کہ چلیں ہمارا کام تو چل ہی رہا ہے تو ایسی صورتِ حال میں دین کی تو گویا نفی ہو جائے گی، کیونکہ دین تو اللہ تعالیٰ کی کُلّی اطاعت کا نام ہے۔ چنانچہ جس کسی نے بھی دین میں کسی ایسی تفریق یا تقسیم پر اپنے دل کو مطمئن کر لیا اس کا گویا اللہ سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں رہا۔ چنانچہ مشرکین جو اللہ اور بتوں کے درمیان اپنے ''دین'' کی تقسیم پر مطمئن ہیں انہیں توحیدِ خالص کی دعوت بُری تو لگے گی۔ مشرکین کے اس بغض و عناد کا ذکر سورۃ التوبہ: ۳۳ اور سورۃ الصّف: ۹ میں اس طرح ہوا ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝﴾ ''وہی تو ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول کو الہدیٰ اور دینِ حق دے کر تاکہ غالب کرے اسے کُل کے کُل دین (نظامِ زندگی) پر، خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار گزرے''۔ ظاہر ہے نظامِ توحید کے قیام اور دینِ حق کے غلبے کی صورت میں مشرکین کے دلوں میں کُڑھن تو بہت ہوگی، لیکن اللہ تعالیٰ نے تو اپنے رسول ﷺ کو بھیجا ہی اسی لیے ہے کہ وہ اللہ کے دین کو پورے نظامِ زندگی پر غالب کر دے۔

﴿اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ ''اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی طرف (آنے کے لیے) چُن لیتا ہے''

یہ اللہ کی شانِ عطا ہے کہ کبھی کبھی وہ کسی راہ چلتے مسافر کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ صوفیاء کے ہاں اس حوالے سے ''سالک مجذوب'' اور ''مجذوب سالک'' کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ ''سالک مجذوب'' اللہ تعالیٰ کے وہ مقرب بندے ہیں جو ''سلوک'' کی کئی کئی کٹھن منازل طے کر کے قرب و جذب کے مقام تک رسائی حاصل کر پاتے ہیں۔ ''صدیقین'' عام طور پر محنت و ریاضت کے اسی راستے سے مقامِ قرب تک پہنچتے ہیں۔ ان کے برعکس ''مجذوب سالک'' وہ خوش نصیب لوگ ہوتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کسی خاص موقع پر بلا تمہید اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ ایسے لوگ ''مقامِ قُرب'' پر فائز ہو جانے کے بعد منازلِ سلوک طے کرتے ہیں اور یہ مقام و مرتبہ اکثر و بیشتر ''شہداء'' کے حصے میں آتا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے اسی طرح اپنی طرف کھینچ لیا تھا، ورنہ اس ''حسین اتفاق'' سے پہلے نہ تو آپؓ کا مزاج اس ''مقامِ شوق'' سے کچھ مطابقت رکھتا تھا اور نہ ہی آپؓ کے معمولات و مشاغل میں ایسے کسی ''رجحان'' کا رنگ پایا جاتا تھا۔ (صدیقین اور شہداء کے اصطلاحی مفہوم کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ مریم کی آیت ۴۱ کی تشریح۔)

﴿وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝۱۳﴾ ''اور وہ اپنی طرف ہدایت اُسے دیتا ہے جو خود رجوع کرتا ہے۔''

آیت ۱۴ ﴿وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا ۢ بَيْنَهُمْ ؕ﴾ ''اور انہوں نے تفرقہ نہیں کیا مگر اس کے بعد

کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا' آپس میں ضِدم ضِدا کے باعث۔''

عرب میں حضور ﷺ کی دعوتِ اقامتِ دین کے مخاطبین بنیادی طور پر دو گروہ تھے' یعنی مشرکین اور اہلِ کتاب۔ ان میں مشرکین کا تو اس دعوت کو ماننا بہت مشکل تھا اور یہ تلخ حقیقت پچھلی آیت میں واضح بھی کر دی گئی ہے کہ آپ کی یہ دعوت مشرکین پر بہت شاق گزر رہی ہے۔ البتہ اہلِ کتاب کا اس دعوت پر ایمان لے آنا نسبتاً زیادہ قرینِ قیاس تھا' کیونکہ وہ تورات و انجیل جیسی الہامی کتابوں سے واقف تھے اور وحی' ملائکہ اور آخرت پر بھی ایمان رکھتے تھے۔ لیکن زیر مطالعہ آیت میں حضور ﷺ کو بتایا جا رہا ہے کہ آپؐ اہلِ کتاب سے بھی مثبت ردِّ عمل کی توقع نہ رکھیں۔ کیونکہ ان دونوں گروہوں کی طرف سے اب تک کی مخالفت کسی لاعلمی کی وجہ سے نہیں ہوئی ہے' بلکہ اللہ تعالیٰ کا اصل پیغام تو ان تک پہنچ چکا ہے' بات پوری طرح واضح ہو کر ان کے دلوں میں اُتر چکی ہے۔ اس صورتِ حال میں ان کا انکار اور ان کی مخالفت محض باہمی تعصب اور ضد بازی کی بنا پر ہے' کہ ہم محمد (ﷺ) کے پیروکار بن کر انہیں خود سے بڑا کیونکر تسلیم کر لیں اور اپنے آپ کو انؐ کے سامنے چھوٹا کیسے بنا لیں؟ اہلِ کتاب خود آپس میں بھی ایک دوسرے کی مخالفت اسی تعصب کی بنیاد پر کرتے ہیں' جس کا ذکر سورۃ البقرۃ میں اس طرح آیا ہے: ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ﴾ (آیت ۱۱۳) ''یہودی کہتے ہیں کہ نصاریٰ کسی بنیاد پر نہیں ہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہودی کسی بنیاد پر نہیں ہیں' حالانکہ دونوں ہی کتاب پڑھ رہے ہیں۔''

عہد نامہ قدیم (Old Testament) یہودیوں اور عیسائیوں میں مشترک ہے۔ اس کے باوجود ان کی باہمی مخاصمت کا یہ عالم ہے کہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کو بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ یروشلم کی ''سمت'' پر اگرچہ دونوں گروہوں کا اتفاق ہے' لیکن باہمی عناد کی بنا پر ایک گروہ شرقی حصے کو قبلہ مانتا ہے جبکہ دوسرا غربی حصے کو۔ اس صورت حال میں حضور ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ تعصب کے مرض میں مبتلا ہیں' اس لیے آپؐ ان میں سے کسی گروہ سے کسی مثبت رویے کی توقع نہ رکھیں' ورنہ آپؐ کو مایوسی ہوگی۔ بلکہ آپؐ ان کی طرف سے انتہائی سخت اور منفی ردِّ عمل کے لیے خود کو تیار رکھیں۔ اس میں دراصل حضور ﷺ کے لیے بین السطور یہ پیغام بھی ہے کہ اقامتِ دین کی جدّ و جُہد ایک طویل اور جاں گداز عمل ہے۔ اس لیے آپؐ موافق حالات اور جلد کامیابی کی توقع نہ رکھیں۔

﴿وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ﴾ ''اور اگر ایک بات آپ کے رب کی طرف سے پہلے سے ایک وقتِ معیّن کے لیے طے نہ پا چکی ہوتی تو ان کے مابین (اختلافات کا) فیصلہ چکا دیا جاتا۔''

﴿وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۴﴾﴾ ''اور جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے ان کے بعد وہ اس کے متعلق ایک خلجان آمیز شک میں مبتلا ہیں۔''

یہ نکتہ خاص طور پر بہت اہم اور لائقِ توجہ ہے کہ ''وارثانِ کتاب'' کے اذہان و قلوب میں اُلجھن میں ڈالنے والے شکوک و شبہات کیوں ڈیرے جما لیتے ہیں؟ دراصل ہوتا یوں ہے کہ شروع شروع میں سب معاملات بالکل ٹھیک چلتے رہتے ہیں' مگر چوتھی یا پانچویں نسل تک آتے آتے معاملات اس وقت بگڑنے لگتے ہیں جب نوجوان اپنے علماء کو باہم دست و گریباں ہوتے دیکھتے ہیں اور ان کے دامنِ حیات کو متاعِ عمل سے خالی پاتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال سے بیزار ہو کر علماء کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ''کتاب'' سے بھی بدظن ہونے لگتے ہیں۔ یہ نوجوان خود تو کتاب کے علوم و معارف تک رسائی حاصل کرنے کی زحمت نہیں اٹھاتے لیکن اس مفروضے کو

اپنے دلوں میں ضرور بٹھا لیتے ہیں کہ جب کتاب کے ''علماء'' کے کردار و عمل میں روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی کوئی روشنی اس کتاب کے اندر سرے سے موجود ہی نہیں۔

آیت ۱۵ ﴿فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ اسی کی دعوت دیتے رہیے''

یہاں ذٰلِكَ کا اشارہ اوپر آیت ۱۳ میں اَقِيْمُوا الدِّيْنَ کے حکم کی طرف ہے کہ آپؐ ان لوگوں کو اقامتِ دین کی جِدّوجُہد کے لیے مسلسل دعوت دیتے رہیے۔

﴿وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ﴾ ''اور جمے رہیے جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے''

آپ ﷺ کی رسالت کا مقصد اور مشن ہی چونکہ اقامتِ دین ہے اس لیے آپؐ غلبۂ حق کی جِدّوجُہد کی اس راہ میں پوری استقامت اور تندہی کے ساتھ کھڑے رہیں۔ آپؐ کے مخالفین تو چاہیں گے کہ آپؐ کچھ نرم پڑنے کو تیار ہوں تو وہ بھی نرم پڑ جائیں: ﴿وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝﴾ (القلم)۔ مگر آپ ﷺ ہماری ہدایت و مشیت کے مطابق اپنے موقف پر جم کر کھڑے رہیں اور اس سفر میں کسی بھی موڑ پر کسی حال میں' کبھی کوئی سمجھوتہ (compromise) نہ کریں: ﴿وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۡ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾ (الکہف:۲۹) ''اور آپؐ ان سے کہہ دیجیے کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے' تو اب جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔''

﴿وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ﴾ ''اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجیے۔''

یہی بات پانچ چھ سال بعد سورۃ البقرۃ کے اندر ان الفاظ میں پھر سے دہرائی گئی: ﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ﴾ (آیت ۱۲۰) ''(اے نبی ﷺ!) یہ یہودی اور نصرانی آپ سے ہرگز راضی نہیں ہوں گے جب تک کہ آپؐ ان کے طریقے کی پیروی نہ کریں''۔ پرانے نظام کے ساتھ تو ان لوگوں کے مفادات وابستہ ہیں' آپؐ کی دعوت کو آگے بڑھتا دیکھ کر انہیں اپنی سیادتیں اور چودھراہٹیں خطرے میں نظر آ رہی ہیں۔ وہ تو چاہیں گے کہ آپؐ ان کے پیچھے چلیں اور ان کی لیڈرشپ قائم رہے۔ آج بھی اپنے اپنے مفادات کو بچانے کی روش اقامتِ دین کی جِدّوجُہد میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ آج بھی اگر اللہ کا کوئی بندہ اس دعوت کا علم بلند کر کے ''مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ'' کا نعرہ لگاتا ہے تو اربابِ جُبّہ و دستار کو اپنی مسندوں' خانقاہوں اور گدیوں کا مستقبل خطرے میں نظر آنے لگتا ہے۔ چنانچہ ان کے ''خاموش ردِّعمل'' سے ایسی جِدّوجُہد کے عَلَم برداروں کو یہ پیغام آپ سے آپ ہی موصول ہو جاتا ہے کہ ''ہم تمہارے پیچھے کیوں چلیں' تم ہمارے پیچھے کیوں نہ چلو؟'' یاد رہے کہ اپنے مضمون (اقامتِ دین) کے اعتبار سے زیرِ مطالعہ تین آیات (۱۳' ۱۴ اور ۱۵) بہت اہم ہیں۔

﴿وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ﴾ ''اور آپؐ کہہ دیجیے کہ میں تو اس کتاب پر ایمان لایا ہوں جو اللہ نے نازل کی ہے۔''

قبل ازیں سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں دعوت کے حوالے سے قرآن مجید کا چھ مرتبہ ذکر آ چکا ہے۔ اب یہاں اس آیت میں سورۂ حٰمٓ السجدۃ کے مضمون کا گویا خلاصہ آ گیا ہے کہ دعوت چلے گی تو اس کتاب کے بل پر اور کسی کو استقامت نصیب ہو گی تو بھی اسی کتاب کے ذریعے سے۔ چنانچہ اس کی تلاوت کو اپنا معمول بنائیے' اس کے معانی و مفہوم کو دل میں اتاریے اور دوسروں تک پہنچائیے۔ قرآن

حکیم میں حضور ﷺ کو بھی بار بار اسی کی یاد دہانی کرائی گئی ہے: ﴿اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ﴾ (العنکبوت:۴۵) ''تلاوت کرتے رہا کریں اس کی جو وحی کی گئی ہے آپ کی طرف کتاب میں سے۔''

﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَكُمْ ؕ﴾ ''اور (آپؐ کہہ دیجیے کہ) مجھے حکم ہوا کہ مَیں تمہارے درمیان عدل قائم کروں۔''

آپ ﷺ ان پر واضح کر دیجیے کہ مَیں صرف وعظ کہنے اور میٹھی میٹھی باتیں سنا کر لوگوں کا دل بہلانے کے لیے نہیں آیا' بلکہ مَیں معاشرے میں عدل وانصاف قائم کرنے اور نظامِ توحید کو عملی طور پر نافذ کرنے کے لیے آیا ہوں۔ اس جملے کے حوالے سے ہمیں بہت واضح طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ حضور ﷺ کا اصل مشن کیا تھا اور آپؐ کے اتباع کے تقاضے پورے کرنے کے لیے آج ہمارے اوپر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

حضور ﷺ کے اتباع کے تقاضے میلاد کی محفلیں سجا لینے یا بڑے بڑے جلوس نکال لینے سے پورے نہیں ہوں گے۔ اس کے لیے سب غلط کاریاں چھوڑ کر خود کو دین کے احکام کا پابند بنانا ہوگا اور پھر اپنے تن من دھن کے ساتھ عدلِ اجتماعی (نظامِ توحید) کو معاشرے میں قائم کرنے کے لیے جدوجُہد کرنے والوں کی صف میں شامل ہونا ہوگا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ بننے کے بعد اپنے پہلے خطاب میں دراصل حضور ﷺ کے اتباع کے اسی تقاضے ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَكُمْ﴾ کے حوالے سے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا تھا: لوگو! تم میں سے ہر کمزور شخص میرے نزدیک طاقتور ہوگا جب تک کہ میں اسے اس کا حق نہ دلوادوں اور تم میں سے ہر قوی شخص میرے نزدیک کمزور ہوگا جب تک کہ مَیں اس سے حق دار کا حق وصول نہ کرلوں۔

﴿اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ﴾ ''اللہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے' ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں۔''

﴿لَا حُجَّةَ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ یَجْمَعُ بَیْنَنَا ۚ﴾ ''ہمارے درمیان کسی حُجّت بازی کی ضرورت نہیں' اللہ ہمیں جمع کر دے گا۔''

اللہ تعالیٰ یا تو ہمیں اسی دنیا میں اکٹھا کر دے گا اور اگر یہاں یہ ممکن نہ ہوا تو آخرت میں تو ہم اکٹھے ہو ہی جائیں گے۔ اس فقرے کا مفہوم سمجھنے کے لیے ان تنظیموں اور گروہوں کا تصوّر ذہن میں لائیے جو سب اخلاص اور نیک نیتی سے اقامتِ دین کی جدوجُہد میں مصروف ہیں۔ ظاہر ہے ان میں سے ہر جماعت کا اپنا منصوبہ اور اپنا طریقہ کار ہے۔ ان سب کی مثال دراصل منیٰ سے میدانِ عرفات جانے والے حُجّاج کے قافلوں جیسی ہے' جہاں لاکھوں لوگ ہزاروں قافلوں میں مختلف راستوں اور مختلف شاہراہوں پر گامزن ہوتے ہیں۔ ان کے راستے بے شک مختلف ہیں مگر منزل سب کی ایک ہے۔ یہ قافلے جیسے جیسے اپنی منزل کی طرف بڑھتے جاتے ہیں ویسے ویسے ان کے مابین فاصلہ کم ہوتا چلا جاتا ہے' حتیٰ کہ میدانِ عرفات میں پہنچ کر وہ سب ایک ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اقامتِ دین کی جدوجُہد کرنے والی مختلف جماعتیں اور تنظیمیں جوں جوں اپنی منزل کی طرف بڑھیں گی ان کے باہمی اختلافات کم ہوتے چلے جائیں گے اور منزلِ مقصود پر پہنچ کر یہ سب اکٹھے ہو جائیں گے۔ اور اگر بالفرض وہ دنیا میں اکٹھے نہ ہو سکے تو بھی روزِ محشر تو سب اکٹھے ہو جائیں گے۔

چنانچہ ان سب کو آپس میں تنقید کرنے کے بجائے زیرِ مطالعہ آیت کے الفاظ میں ایک دوسرے سے یوں کہنا چاہیے کہ دیکھو بھئی

ہم سب اللہ کی رضا کے متلاشی ہیں۔ ہمارا رب بھی اللہ ہے اور تمہارا بھی۔ باقی جہاں تک ہمارے باہمی اختلاف کا تعلق ہے اس حوالے سے ہمیں آپس میں کوئی حجت بازی نہیں کرنی چاہیے۔ تم لوگ اپنی سوچ اور نظریے کے مطابق جدّ و جُہد کرتے جاؤ' ہم اپنے طریق کار اور لائحہ عمل کے مطابق کوشش جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ہم سب اپنی اپنی کوششوں کے لیے ماجور ہوں گے۔ تم لوگوں کو تمہاری جدّ و جُہد کا صلہ مل جائے گا اور ہم اپنی محنت کا پھل پالیں گے۔ لیکن چونکہ ہم سب اپنے مشن اور اپنی جدّ و جُہد میں مخلص ہیں اس لیے آج نہیں تو کل ہم سب ایک ہو جائیں گے۔ اگر ہمارا طریق کار غلط ہوا تو ایک دن حقیقت ہم پر واضح ہو جائے گی اور ہم رجوع کر لیں گے اور اگر آپ لوگوں کے لائحہ عمل میں کوئی کمی ہوئی تو کبھی نہ کبھی آپ کو بھی وہ نظر آ ہی جائے گی اور آپ بھی ضرور اس کی تلافی کر لیں گے' اِن شاء اللہ!

﴿وَاِلَیْہِ الْمَصِیْرُ ﴿۱۵﴾﴾ ''اور اُسی کی طرف سب کو لوٹنا ہے۔''

وہاں اللہ کی عدالت میں سب انسان اکٹھے کھڑے ہوں گے اور وہاں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔

آیت ۱۶ ﴿وَالَّذِیْنَ یُحَآجُّوْنَ فِی اللّٰہِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِیْبَ لَہٗ﴾ ''اور وہ لوگ جو اللہ کے بارے میں حجت بازی میں لگے رہے' اس کے بعد کہ اُس کی دعوت پر لبیک کہہ دی گئی ہے''

یعنی اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ تو روزِ اوّل ہی سے استقامت کے پہاڑ بنے کھڑے ہیں اور اب تو انتظار ہے وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْھُمْ بِاِحْسَانٍ کے قافلے کا کہ ہر طرف سے لوگ جوق در جوق اور فوج در فوج دین میں داخل ہوں۔ لیکن جو لوگ اب بھی ٹس سے مس نہیں ہو رہے اور ہٹ دھرمی کی اپنی پرانی مسندیں سنبھالے حجت بازی کیے جا رہے ہیں:

﴿حُجَّتُھُمْ دَاحِضَۃٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ﴾ ''اُن کی حجت بازی اُن کے ربّ کے نزدیک بالکل پسپا ہے''

﴿وَعَلَیْھِمْ غَضَبٌ وَّلَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ﴿۱۶﴾﴾ ''اور اُن پر اللہ کا غضب ہے اور اُن کے لیے بہت سخت عذاب بھی ہے۔''

آیت ۱۷ ﴿اَللّٰہُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ ؕ﴾ ''اللہ ہی ہے جس نے اتاری ہے کتاب بھی اور میزان بھی حق کے ساتھ۔''

قرآن میں صرف دو ہی مقامات ایسے ہیں جہاں کتاب اور میزان کے الفاظ ایک ساتھ اکٹھے آئے ہیں۔ ایک تو آیت زیر مطالعہ اور دوسری سورۃ الحدید کی یہ آیت: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ (آیت ۲۵) ''ہم نے بھیجے اپنے رسول واضح دلیلوں کے ساتھ اور ہم نے نازل کی ان کے ساتھ کتاب اور میزان تاکہ قائم رہیں لوگ عدل پر''۔ میزان دراصل دین حق کے عملی نظام کا نام ہے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ ''کتاب'' ہر ایک کا حق مقرر کرتی ہے اور ''میزان'' ناپ تول کر کے یہ حق حقدار کو دیتی ہے۔ چنانچہ آیتِ زیر مطالعہ کے ان الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں دین بھی دیا ہے اور نظام بھی۔ اگر نظام نہ ہوتا تو دین کے مطابق فیصلے کیسے ہوتے اور پھر ان فیصلوں پر عمل درآمد کیونکر ہوتا؟

﴿وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ قَرِیْبٌ ﴿۱۷﴾﴾ ''اور تمہیں کیا معلوم کہ قیامت قریب ہی ہو!''

''السَّاعۃ'' سے مراد قیامت کی گھڑی ہے' اگرچہ انفرادی سطح پر دیکھا جائے تو ہر شخص کی موت ہی گویا اس کی قیامت ہے۔ جیسا

کہ ایک حدیث میں آتا ہے: ((مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ))[1] ''جس کو موت آ گئی پس اس کی قیامت تو قائم ہو گئی''۔ مقامِ غور ہے کہ اس حوالے سے ہمیں کس قدر مشکل صورتِ حال کا سامنا ہے۔ ایک طرف ہم میں سے ہر ایک کی ''قیامت'' اس کے سر پر کھڑی ہے اور دوسری طرف اللہ کی ''میزان'' کو نصب کرنے کی بھاری ذمہ داری ہے جو ہم سب کے کندھوں پر آن پڑی ہے۔ اب اگر ہم نے ابھی اور اسی وقت اس ذمہ داری کا احساس نہ کیا اور اس کے لیے فوری طور پر ہم اپنا تن من دھن لگا دینے کے لیے میدانِ عمل میں نہ اترے تو نہ معلوم ہم میں سے کس کس کی مہلتِ عمل کچھ کیے بغیر ہی ختم ہو جائے۔ آج ہم میں سے کون کہہ سکتا ہے کہ اسے کل کا سورج بھی دیکھنا نصیب ہو گا یا نہیں! اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم مزید وقت ضائع کیے بغیر اس جدّ و جُہد میں جُت جائیں۔ اس فیصلے کے لیے تاخیر اور تاجیل میں وقت ضائع کرنا سب سے بڑی حماقت ہے۔

آیت ۱۸ ﴿يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ﴾ ''اس (قیامت) کے لیے جلدی تو وہی مچا رہے ہیں جو اس پر ایمان نہیں رکھتے۔''

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ؕ﴾ ''اور جو لوگ ایمان رکھتے ہیں وہ تو اس سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ وہ حق ہے۔''

قیامت کے تصوّر سے اللہ کے مقرب بندوں کے خوف کی کیفیت کا ذکر سورۃ النور میں یوں آیا ہے: ﴿يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝﴾ ''وہ لرزاں و ترساں رہتے ہیں اس دن کے تصوّر سے جس دن الٹ جائیں گے دل اور نگاہیں۔''

﴿اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ۝۱۸﴾ ''آگاہ ہو جاؤ جو لوگ قیامت کے بارے میں جھگڑتے ہیں وہ بڑی دور کی گمراہی میں پڑ چکے ہیں۔''

آیت ۱۹ ﴿اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ﴾ ''اللہ اپنے بندوں کے حق میں بہت مہربان ہے وہ رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔''

لفظ ''لَطِيْفٌ'' میں لطف و کرم اور شفقت و مہربانی کے علاوہ باریک بین ہونے کا مفہوم بھی ہے۔ یعنی وہ بڑی باریک بینی کے ساتھ ان کی دقیق ترین ضروریات پر بھی نگاہ رکھتا ہے۔

آیت زیر مطالعہ کے مندرجہ بالا الفاظ کو اقامتِ دین کی جدّ و جُہد کے سیاق و سباق میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یعنی اقامتِ دین کی جدّ و جُہد میں تمہیں یہ فکر نہیں ہونی چاہیے کہ ہم کھائیں گے کہاں سے، پہنیں گے کیا اور ہماری دوسری ضروریات کیسے پوری ہوں گی؟ اس حوالے سے قبل ازیں (سورۃ العنکبوت، آیت ۶۰ کے ذیل میں) متی کی انجیل سے حضرت مسیح علیہ السلام کے وعظ کا درج ذیل اقتباس ہم پڑھ چکے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام اپنے شاگردوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی جان کی فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے؟ اور نہ اپنے بدن کی کہ کیا پہنیں گے؟ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو

۱۔ تخریج الکشاف للزیلعی: ۴۳۶/۱۔ وتخریج الاحیاء للعراقی: ۷۹/۴۔ سلسلة الاحادیث الضعیفة للالبانی، ح: ۱۱۶۶۔ راوی: انس بن مالک رضی اللہ عنہ۔

نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے۔ نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں تو بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو غور سے دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے نہ کاتتے ہیں۔ تو بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی ساری شان وشوکت کے ان میں سے کسی کے مانند ملبس نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے کل تنور میں جھونکی جائے گی ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو! تم کو کیوں نہ پہنائے گا؟ اس لیے فکرمند ہو کر یہ نہ کہو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے یا کیا پہنیں گے؟ کیونکہ ان سب چیزوں کی تلاش میں غیر قومیں رہتی ہیں اور تمہارا آسمانی باپ جانتا ہے کہ تم ان سب چیزوں کے محتاج ہو۔ بلکہ تم پہلے اس کی بادشاہی اور اس کی راست بازی کو تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تم کو مل جائیں گی۔ پس کل کے لیے فکر نہ کرو کیونکہ کل کا دن اپنے لیے آپ فکر کر لے گا۔ آج کے لیے آج ہی کا دکھ کافی ہے۔'' (متی' باب ۶: ۲۵ تا ۳۴' بحوالہ تدبر قرآن' جلد پنجم' ص ۶۰)

اس میں کیا شک ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کا رازق بھی ہے اور وہ اپنے بندوں کی ایک ایک حاجت سے باخبر اور ان کی ایک ایک خواہش سے آگاہ بھی ہے۔ آپ ایک دفعہ یکسو ہو کر فیصلہ تو کرو' کہ اب اپنے آپ کو اس کام کے لیے وقف کر دینا ہے۔ پھر دیکھنا اللہ تعالیٰ تمہاری ضروریات کا خیال کیسے رکھتا ہے۔ اس کا وعدہ ہے: ﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝۲ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ﴾ (الطلاق: ۳) ''اور جو کوئی اللہ کا تقویٰ اختیار کرتا ہے تو وہ اس کے لیے (مشکلات سے) نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے' اور وہ اسے وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا''۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس راستے میں طرح طرح کی آزمائشوں اور سختیوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ لیکن جب بندہ اس مرحلے میں بھی صبر واستقامت کے مظاہرے سے اپنی وفاداری اور یکسوئی ثابت کر دے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے لیے نئے نئے راستے کھول دیتا ہے اور ان راستوں پر چلنا اس کے لیے آسان کر دیتا ہے۔

﴿وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝۱۹﴾ ''اور وہ تو بہت قوی ہے' بہت زبردست ہے۔''

آیت ۲۰ ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ﴾ ''جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہوتا ہے تو ہم اُس کے لیے اس کی کھیتی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔''

اس مضمون کا کلائمکس سورۂ بنی اسرائیل میں بایں الفاظ بیان ہوا ہے: ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝۱۸﴾ ''جو کوئی طلب گار بنتا ہے جلدی والی (دنیا) کا' ہم اس کو جلدی دے دیتے ہیں اس میں جو کچھ ہم چاہتے ہیں' جس کے لیے چاہتے ہیں' پھر ہم مقرر کر دیتے ہیں اس کے لیے جہنم' وہ داخل ہوگا اس میں ملامت زدہ' دھتکارا ہوا۔''

﴿وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ۝۲۰﴾ ''اور جو کوئی دنیا کی کھیتی کا طالب بن جاتا ہے تو ہم اس کو اس میں سے کچھ دے دیتے ہیں' اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔''

آیات ۲۱ تا ۳۵

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ وَ لَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ
بَيْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾ تَرَى الظّٰلِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا وَهُوَ
وَاقِعٌۢ بِهِمْ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ
رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿۲۲﴾ ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ وَ مَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ
فِيْهَا حُسْنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۲۳﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۚ فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ
يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ ؕ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَ يُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۲۴﴾
وَ هُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ يَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَ
يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ يَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ
شَدِيْدٌ ﴿۲۶﴾ وَ لَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَ لٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ؕ
اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۲۷﴾ وَ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ؕ وَ
هُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۸﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ وَهُوَ
عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾ ع وَ مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ يَعْفُوْا ع
عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۰﴾ وَ مَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا
نَصِيْرٍ ﴿۳۱﴾ وَ مِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۳۲﴾ اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ
عَلٰى ظَهْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۳۳﴾ اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَ يَعْفُ عَنْ
كَثِيْرٍ ﴿۳۴﴾ وَّ يَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ﴿۳۵﴾

نوٹ ۵ ﴿اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ﴾ ''کیا ان کے کچھ ایسے شریک ہیں جنہوں نے ان کے لیے دین کا کوئی ایسا راستہ طے کر دیا ہو جس کا اذن اللہ نے نہیں دیا؟''

شرک کے حوالے سے یہ نکتہ قرآن مجید میں بار بار دہرایا گیا ہے کہ مشرک لوگ جنہیں اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں اللہ نے ان کے لیے نہ تو کوئی سند اتاری ہے اور نہ ہی کسی الہامی کتاب میں ان کے لیے کوئی دلیل موجود ہے۔ اس سورت کا عمود چونکہ نظامِ شریعت (میزان) سے متعلق ہے اس لیے یہاں شرک کا ابطال اس مضمون کی دلیل کے ساتھ بالکل منفرد انداز میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو اپنے بندوں کے لیے ایک مکمل ضابطۂ حیات نازل کیا ہے۔ تو ذرا یہ لوگ بھی بتائیں کہ ان کے معبودوں نے ان کے لیے زندگی میں کیا

راہنمائی فراہم کی ہے؟ کیا ان معبودوں نے بھی اپنے پجاریوں کو باقاعدہ کوئی کتاب دی ہے؟ کیا لات' منات اور ہُبل نے بھی اپنے عقیدت مندوں کے لیے کوئی شریعت وضع کی ہے یا انہیں باقاعدہ کوئی نظام دیا ہے؟ اور اگر ان نام نہاد معبودوں نے اپنا کوئی دین یا ضابطہ حیات اپنے ماننے والوں کو کبھی دیا ہی نہیں تو وہ کس حیثیت سے آخر معبود بنے بیٹھے ہیں؟ اور ان کے پجاری آخر کس بنیاد پر ان کی پوجا کیے جا رہے ہیں؟

﴿وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۗ وَإِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٢١﴾﴾ ''اور اگر ایک قطعی حکم پہلے سے طے نہ ہو چکا ہوتا تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور ظالموں کے لیے تو بہت دردناک عذاب ہے۔''

آیت ۲۲ ﴿تَرَى الظّٰلِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا﴾ ''تم دیکھو گے ان ظالموں کو کہ وہ اپنے کرتوتوں کے سبب ڈر رہے ہوں گے''

قیامت کے دن کُفار و مشرکین اپنے غلط عقائد اور بُرے اعمال کے سبب خوف زدہ ہوں گے۔ دراصل نیکی و بدی کے بارے میں انسان کا ضمیر بہت حساس ہے: ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ﴿١٤﴾﴾ (القیامۃ) ''بلکہ انسان اپنے نفس پر خود گواہ ہے''۔ یہ آیت بہت واضح انداز میں ہمیں بتاتی ہے کہ انسانی ضمیر اپنے اندر کی گہرائیوں میں جھانک کر بغیر کسی مصلحت اور تعصب کے غلط اور درست کی نشاندہی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چنانچہ قیامت کے دن تمام غلط کار انسان اپنے اعمال کو دیکھتے ہوئے حساب و کتاب سے پہلے ہی خوف سے کانپ رہے ہوں گے۔

﴿وَهُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۗ﴾ ''اور وہ ان کے اوپر پڑنے والا ہوگا۔''

ان کے عقائد و افعال کا وبال ان کے سروں پر گرنے والا ہوگا۔ لیکن دوسری طرف اہلِ ایمان کی کیفیت اس کے برعکس ہوگی:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ﴾ ''اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمالِ صالحہ پر کاربند رہے وہ جنتوں کے باغات میں ہوں گے۔''

﴿لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۗ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿٢٢﴾﴾ ''اُن کے لیے اُن کے ربّ کے پاس وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے۔ یہی (ان کے لیے) بہت بڑی فضیلت ہوگی۔''

آیت ۲۳ ﴿ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۗ﴾ ''یہ ہے وہ (انجامِ نیک) جس کی بشارت دے رہا ہے اللہ اپنے اُن بندوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے۔''

﴿قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ مَیں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا''

مَیں سالہا سال سے تم تک یہ پیغام پہنچانے کا فریضہ سرانجام دے رہا ہوں مگر مَیں نے کبھی تم لوگوں سے اس کا کوئی صلہ یا انعام طلب نہیں کیا۔

﴿اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ۗ﴾ ''سوائے قرابت داری کے لحاظ کے۔''

اہلِ تشیع نے ان الفاظ کا یہ مطلب نکال لیا ہے کہ حضور ﷺ کی طرف سے اپنے قرابت داروں (حضرت علی' حضرت فاطمہ اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہم) سے محبت کا تقاضا کیا گیا ہے۔ لیکن جس وقت مکہ معظمہ میں سورۃ الشوریٰ نازل ہوئی اُس وقت حضرت علی و

فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی تک نہیں ہوئی تھی۔ سیاق وسباق میں اس آیت کا درست اور منطقی مفہوم یہ ہے کہ میں تم لوگوں سے کسی اور صلے کا تقاضا نہیں کرتا' لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تم لوگ (یعنی قریش) اُس قرابت داری کا تو لحاظ کرو جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ آخر میں تمہارے قبیلے اور تمہاری برادری کا ایک فرد ہوں اور عرب روایات کے مطابق اس تعلق اور قرابت کے خصوصی حقوق متعین ہیں۔ چنانچہ عرب تہذیب وروایات کے مطابق تمہاری شرافت ونجابت سے مجھے یہ توقع تھی کہ تم لوگ میرے معاملے میں قرابت داری کے فطری تقاضوں کا لحاظ رکھو گے' لیکن مقامِ افسوس ہے کہ تم لوگوں نے ضِدم ضِدا میں ان تمام تقاضوں کو بھی بالائے طاق رکھ دیا ہے اور قرابت داری کے میرے فطری اور بنیادی حقوق کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔

﴿وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ۝۲۳﴾ ''اور جو کوئی بھلائی کمائے گا تو ہم اُس کے لیے اس بھلائی میں خوبی کا اضافہ کرتے رہیں گے۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا' بہت قدردان ہے۔''

آیت ۲۴ ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا ۚ﴾ ''کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے اللہ کے اوپر جھوٹ گھڑ لیا ہے؟''

یعنی یہ کہ محمد (ﷺ) نے قرآن خود بنا کر اللہ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

﴿فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰي قَلْبِكَ ۭ﴾ ''تو اگر اللہ چاہے تو آپ کے قلب پر مہر لگا دے۔''

یہ خطاب بظاہر محمد رسول اللہ ﷺ سے ہے لیکن اصل میں مخالفین کو سنانا مقصود ہے کہ یہ قرآن وحی کی صورت میں محمد (ﷺ) کے قلب پر نازل ہو رہا ہے۔ یہ خالص ایک وہبی صلاحیت ہے اور آپؐ کو اس بارے میں ہرگز کوئی اختیار نہیں ہے۔ کجا یہ کہ آپؐ خود اس کو گھڑیں یا تصنیف کریں۔ چنانچہ اگر اللہ چاہے تو یہ صلاحیت آپؐ سے واپس لے کر آپؐ کے قلب پر مہر کر دے اور آپؐ پر وحی آنا بند ہو جائے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں یہی مضمون اس طرح آیا ہے: ﴿وَلَىِٕنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ۝۸۶﴾ ''اور (اے نبی ﷺ) اگر ہم چاہیں تو لے جائیں اس (قرآن) کو جو ہم نے وحی کیا ہے آپ کی طرف' پھر آپ نہ پائیں گے اپنے لیے اس پر ہمارے مقابلے میں کوئی مددگار۔''

﴿وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ۭ﴾ ''اور اللہ باطل کو مٹا دیتا ہے اور حق کا حق ہونا ثابت کر دیتا ہے اپنے کلمات سے۔''

یہ اللہ تعالیٰ کی سُنّت اور اس کا اٹل قانون ہے' لیکن اس کے ظہور میں اللہ کی مشیت کے مطابق وقت لگتا ہے۔ جیسے حضور ﷺ کی دعوت کے حوالے سے اللہ کی اس سُنّت کا ظہور پہلی دفعہ غزوۂ بدر کے میدان میں اس وقت عمل میں آیا جبکہ دعوت کو شروع ہوئے چودہ برس گزر چکے تھے۔ چنانچہ غزوۂ بدر کے ذریعے حق و باطل کے مابین فرق کو واضح اور مبرہن کر کے نہ صرف یومِ بدر کو یوم الفرقان (الانفال: ۴۱) قرار دیا گیا بلکہ اس غزوہ کا بنیادی مقصد بھی احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ہی بتایا گیا: ﴿لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۸﴾ (الانفال) ''تاکہ سچا ثابت کر دے حق کو اور جھوٹا ثابت کر دے باطل کو' خواہ یہ مجرموں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔''

﴿اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۲۴﴾ ''یقیناً وہ واقف ہے اس سے بھی جو کچھ سینوں کے اندر پوشیدہ ہے۔''

آیت ۲۵ ﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝۲۵﴾ ''اور وہی ہے کہ جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور اُن کی بہت سی برائیوں سے درگزر کرتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔''

آیت ۲۳ ﴿وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ﴾ ''اور وہ دعائیں قبول کرتا ہے ان لوگوں کی جو ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں اور اپنے فضل سے انہیں (ایمان و اعمالِ صالحہ میں) ترقی بھی دیتا ہے۔''

﴿وَالْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۝۲۶﴾ ''اور کافروں کے لیے بہت سخت عذاب ہے۔''

آیت ۲۷ ﴿وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ﴾ ''اور اگر اللہ کشادہ کر دیتا رزق اپنے سب بندوں کے لیے تو وہ زمین میں سرکشی کرتے''

یقیناً اللہ تعالیٰ کے خزانے بہت وسیع ہیں' لیکن اگر وہ ان خزانوں کو سب کے لیے کھول دیتا اور ہر کسی کو اس کی خواہش اور مرضی کے مطابق بافراغت اور باسہولت رزق ملنا شروع ہو جاتا تو انسانوں کی اکثریت اللہ سے سرکشی پر اُتر آتی۔ کیونکہ اب جب کہ دو وقت کی روٹی کمانے کے لیے دن رات مشقت میں جُتے رہنے کے باوجود بھی ان میں سے اکثر اللہ کے نافرمان ہیں تو فکرِ معاش سے فراغت تو ان کو بالکل ہی باغی بنا دیتی۔

﴿وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ۝۲۷﴾ ''لیکن اللہ نازل کرتا ہے ایک اندازے کے مطابق جو چاہتا ہے۔ یقیناً وہ اپنے بندوں (کے حالات) سے باخبر' ان کو دیکھنے والا ہے۔''

آیت ۲۸ ﴿وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ؕ﴾ ''اور وہی ہے جو بارش برساتا ہے اس کے بعد کہ لوگ مایوس ہو چکے ہوتے ہیں اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے۔''

خشک سالی میں فصلوں کی آبیاری کا وقت ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر جب کسانوں کے دلوں میں مایوسی کے سائے گہرے ہونے لگتے ہیں تو اچانک اللہ کی رحمت کا ظہور ہوتا ہے اور بادل بارش کی نوید لے کر پہنچ جاتے ہیں۔

﴿وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ۝۲۸﴾ ''اور وہی ہے جو (اپنے بندوں کا) مددگار ہے اور وہ اپنی ذات میں آپ ستودہ صفات ہے۔''

آیت ۲۹ ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ﴾ ''اور اُس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور ان دونوں میں اُس نے جو جان دار پھیلا دیے ہیں۔''

یعنی آسمانوں میں فرشتے جبکہ زمین اور اس کی فضا میں موجود بے شمار مخلوقات اس کی نشانیوں میں سے ہیں۔

﴿وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ۝۲۹﴾ ''اور وہ جب چاہے ان سب کو جمع کرنے پر قادر ہے۔''

اُس نے اپنی مرضی اور مشیت سے ان سب کو زمین و آسمان کی وسعتوں میں پھیلا رکھا ہے۔ البتہ جب وہ چاہے گا ان سب کو اپنے حضور حاضر کر لے گا۔

آیت ۳۰ ﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۝۳۰﴾ ''اور تم پر جو بھی مصیبت آتی ہے وہ درحقیقت تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی (اعمال) کے سبب آتی ہے اور (تمہاری خطاؤں میں سے) اکثر کو تو وہ معاف بھی کرتا رہتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ انسانوں کے ساتھ عمومی طور پر عفو و درگزر کا معاملہ فرماتا ہے اور ہر کسی کو ہر غلطی پر نہیں پکڑتا۔ البتہ بعض اوقات بعض

نافرمانیوں کی سزا وہ متعلقہ افراد کو دنیا ہی میں دے دیتا ہے۔

آیت ۳۱ ﴿وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ﴾ ''اور تم زمین میں (اللہ کو) عاجز کرنے والے نہیں ہو۔''

یہاں اس فقرے کے بعد ''وَلَا فِي السَّمَآءِ'' کے الفاظ گویا محذوف ہیں۔ جیسا کہ سورۃ العنکبوت میں فرمایا: ﴿وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ﴾ (آیت ۲۲) ''اور تم اُسے عاجز کرنے والے نہیں ہو زمین میں اور نہ آسمان میں''۔ بہرحال اللہ کی مشیت کو کوئی نہیں روک سکتا' وہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ہے۔ وہ جو ارادہ کر لیتا ہے کر گزرتا ہے' اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔

﴿وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۳۱﴾ ''اور تمہارے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی کارساز ہے اور نہ مددگار۔''

آیت ۳۲ ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ۳۲﴾ ''اور اُس کی نشانیوں میں سے سمندروں میں (چلنے والے) پہاڑوں کے مانند جہاز بھی ہیں۔''

آیت ۳۳ ﴿اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ ۭ﴾ ''اگر وہ چاہے تو ہوا کو ساکن کر دے سو وہ کھڑے کے کھڑے رہ جائیں سمندر کی سطح پر۔''

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۳۳﴾ ''یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ہر ایک صبر کرنے والے اور شکر کرنے والے کے لیے۔''

آیت ۳۴ ﴿اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ ۳۴﴾ ''یا وہ (چاہے تو) تباہ کر دے ان (جہازوں) کو لوگوں کے گناہوں کی پاداش میں' لیکن وہ بہت سی خطاؤں سے درگزر فرماتا رہتا ہے۔''

آیت ۳۵ ﴿وَّيَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا ۭ مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ۳۵﴾ ''اور تاکہ جان لیں وہ لوگ جو ہماری آیات میں کٹ حجتی کر رہے ہیں کہ ان کے لیے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔''

آیات ۳۶ تا ۴۳

فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۳۶ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۳۷ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۳۸ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۳۹ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۴۰ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۴۱ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۴۲ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۴۳ ع

گزشتہ آیات میں مکّی سورتوں کے عمومی مضامین مثلاً مشرکین کے ساتھ ردّوکدح' آخرت کی جزا وسزا اور اللہ کی نشانیوں اور نعمتوں کا تذکرہ تھا' لیکن اس کے بعد موضوع پھر سے سورت کے عمود یا مرکزی مضمون کی طرف لوٹ رہا ہے۔ چنانچہ آئندہ آٹھ آیات میں وہ اوصاف بیان کیے گئے ہیں جو اقامتِ دین کی جدّوجُہد کرنے والے افراد کی سیرت کے لیے ناگزیر ہیں۔ انہی اوصاف کو اپنانے سے دراصل ایک ایسے مردِ مؤمن کے کردار کا نقشہ تیار ہوتا ہے جو اس میدانِ کارزار میں قدم رکھتے ہوئے طے کر لیتا ہے کہ: ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ (الانعام) ''میری نماز' میری قربانی' میری زندگی اور میری موت اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے''۔ اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے علمبردار افراد کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان اوصاف کو اپنائے بغیر ان کے کردار وعمل میں وہ مضبوط ''جان'' پیدا نہیں ہوگی جو اس ''معرکۂ روح و بدن'' میں پیش کرنے کے لیے درکار ہے۔ اسی ضرورت اور شرط کو اقبالؔ نے یوں بیان کیا ہے: ؎

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے!

آیئے اب ہم ایک ایک کر کے ان اوصاف کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی ہدایت ملاحظہ ہو:

آیت ۳۶ ﴿فَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ﴾ ''پس جو کچھ بھی تمہیں دیا گیا ہے وہ دنیا ہی کی زندگی کا سازوسامان ہے۔''

﴿وَمَا عِنْدَ اللّٰہِ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّہِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ﴿۳۶﴾﴾ ''اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے اُن لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر توکّل کرتے ہیں۔''

گویا اس منزل کے مسافروں کو سب سے پہلے اپنی ترجیحات بدلنا ہوں گی اور ایسی سوچ اپنانا ہوگی جس کے مطابق دنیا و مافیہا انہیں ہیچ نظر آئے اور اس کے مقابلے میں آخرت کی زندگی ان کا اصل مقصود و مطلوب بن جائے۔ اگر دنیا کی محبت دل کے کسی گوشے میں چھپی رہ گئی تو وہ اس میدان کے بڑے سے بڑے شہسوار کو بھی کبھی نہ کبھی ضرور اڑنگا لگا کر مُنہ کے بَل گرائے گی۔ چنانچہ آدمی سب سے پہلے یہ طے کرے کہ وہ طالبِ آخرت ہے یا طالبِ دنیا؟ اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے علمبرداروں کا پہلا وصف یہاں یہ بیان ہوا ہے کہ وہ دنیا سے بے رغبتی اختیار کر کے آخرت کو اپنا مقصود و مطلوب بنا لیتے ہیں' جبکہ آیت کے اختتامی الفاظ کے مطابق ان کا دوسرا وصف یہ ہے: ﴿وَعَلٰی رَبِّہِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ﴾ یعنی وہ ہر حال اور ہر کیفیت میں اپنے رب پر ہی توکّل کرتے ہیں۔

آیت ۳۷ ﴿وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ﴾ ''اور وہ لوگ کہ جو اجتناب کرتے ہیں بڑے بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کے کاموں سے''

ظاہر ہے اس مقدّس فریضہ کو نبھانے کا حلف اٹھانے والے رضا کار اگر اپنے دامنِ کردار کو ایسی نجاستوں سے بچا کر نہیں رکھیں گے تو وہ اس میدان میں آگے کیسے بڑھ سکیں گے۔ یہی مضمون سورۃ النساء میں ہم ان الفاظ میں پڑھ چکے ہیں: ﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبَآئِرَ مَا تُنْھَوْنَ عَنْہُ نُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَنُدْخِلْکُمْ مُّدْخَلًا کَرِیْمًا ﴿۳۱﴾﴾ ''اگر تم اجتناب کرتے رہو گے ان بڑے بڑے گناہوں سے جن سے تمہیں روکا جا رہا ہے تو ہم تمہاری چھوٹی بُرائیوں کو تم سے دور کر دیں گے اور تمہیں داخل کریں گے بہت باعزّت

جگہ پر''۔ صغائر اور کبائر کے حوالے سے یہ نکتہ اچھی طرح سے ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ ایک بندۂ مؤمن کو کبائر کے معاملے میں غیر معمولی طور پر حساس ہونا چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں عمومی روش یہ ہے کہ ہم صغائر کے بارے میں تو بہت زیادہ باریک بین بننے کی کوشش کرتے ہیں' چھوٹے چھوٹے مسائل کے بارے میں وضاحتیں اور فتوے بھی طلب کرتے رہتے ہیں' مگر کبائر سے متعلق لاپرواہی برتتے ہیں۔ حالانکہ صغائر تو ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ﴾ (ھود: ۱۱۴) کے اصول کے تحت ساتھ ہی ساتھ معاف ہوتے رہتے ہیں اور سورۃ النساء کی متذکرہ بالا آیت میں بھی یہی بشارت دی جا رہی ہے کہ اگر تم لوگ کبائر سے بچتے رہو گے تو تمہارے صغائر ہم خود معاف کر دیں گے۔ لیکن اس کے باوجود کبائر سے متعلق لاپرواہی اور صغائر کے بارے میں ''حساسیت'' کا عمومی رویہ ہمارے معاشرے میں ایک متعدی بیماری کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس حوالے سے ہماری مشابہت بنی اسرائیل کی اس کیفیت کے ساتھ ہو چکی ہے جس کے بارے میں حضرت مسیح علیہ السلام نے انہیں فرمایا تھا کہ ''تم لوگ مچھر چھانتے ہو اور سموچے اونٹ نگل جاتے ہو''۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کے راستے میں نکلنے والے مجاہدین کے لیے ضروری ہے کہ وہ تقویٰ کی روش پر کاربند رہیں اور کبائر و فواحش سے اپنا دامن بچا کر رکھیں۔

﴿وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾﴾ ''اور جب انہیں غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔''

غَفَرَ کے معنی ڈھانپ دینے کے ہیں۔ اس معنی میں اس آہنی خود کو مِغْفَر کہا جاتا ہے جس سے دورانِ جنگ تلوار وغیرہ کے وار سے بچنے کے لیے سر کو ڈھانپا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے مغفرت سے مراد اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مہربانی ہے جو بندے کے گناہوں کو ڈھانپ لیتی ہے۔ لہٰذا مؤمنینِ صادقین کا یہاں جو وصف بتایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ غصے کا اظہار کرنے کے بجائے اسے پی جاتے ہیں۔ اشتعال کی حالت میں وہ کوئی اقدام نہیں کرتے بلکہ اپنے فیصلے ہمیشہ سوچ سمجھ کر کرتے ہیں اور انتقام لینے کے بجائے معاف کرنے کی حکمت عملی کو ترجیح دیتے ہیں۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۳۴ میں بھی متقین کی تعریف میں یہی صفت بیان کی گئی ہے: ﴿وَالْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ﴾ کہ وہ اپنے غصے کو پی جانے والے اور دوسروں کی غلطیوں کو معاف کرنے والے لوگ ہیں۔ چونکہ غصہ اور غصے کی کیفیت میں انسان کا اشتعال شیطانی اثرات کی بنا پر ہوتا ہے اس لیے سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی آیت ۳۶ میں دی گئی یہ ہدایت غصے اور اس کے منفی اثرات سے بچنے کا بہترین نسخہ ہے: ﴿وَاِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۳۶) ''اور اگر کبھی تمہیں شیطان سے کوئی چوک لگنے لگے تو اللہ کی پناہ طلب کر لیا کرو'' ——— اب آگے چلیے اگلے وصف کی طرف:

آیت ۳۸ ﴿وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪﴾ ''اور وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کی پکار پر لبیک کہا اور نماز قائم کی۔''

یہ کون سی پکار ہے؟ اس حوالے سے یہ اہم نکتہ ذہن میں رکھئے کہ اس سورت میں اب تک جمع کے صیغے میں فعل امر ایک ہی مرتبہ آیا ہے' یعنی ﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ﴾ اور جمع کے صیغے میں اب تک ایک ہی مرتبہ فعل نہی آیا ہے' یعنی ﴿وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ﴾۔ چنانچہ یہی وہ پکار یا حکم ہے جس کی استجابت کا ذکر یہاں ہوا ہے' یعنی: ﴿اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ؕ﴾ (آیت ۱۳) ''دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو''۔ اور اسی کے بارے میں حضور ﷺ کو آیت ۱۵ میں مخاطب کر کے فرمایا گیا تھا: ﴿فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ

وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ﴾ کہ آپؐ کی دعوت کا عمود اور مرکزی پیغام اقامتِ دین ہے‘ اسی کی طرف آپؐ نے لوگوں کو بلانا ہے‘ اسی کی ضرورت اور اہمیت کو ان کے اذہان میں نقش (hammer) کرنا ہے۔ یہی آپؐ کا مشن ہے اور یہی آپؐ کی دعوت کا اصل ہدف۔ آپؐ اپنے اسی مشن اور اسی موقف پر ڈٹے رہیے اور مخالفین کی مخالفت کی بالکل پروا نہ کیجیے۔

بلاشبہ یہ مشن بہت عظیم ہے اور اسی نسبت سے اس کی جدّوجُہد کے لیے خصوصی سیرت و کردار کے حامل مردانِ کار درکار ہیں۔ چنانچہ آیاتِ زیرِ مطالعہ میں ان اوصاف کا تذکرہ ہے جو اس مشن کے علمبرداروں کی شخصیات کے لیے ناگزیر ہیں۔ نماز کی پابندی کے بعد اگلا وصف بیان ہوا:

﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۖ﴾ ’’اور ان کا کام آپس میں مشورے سے ہوتا ہے۔‘‘

ظاہر ہے اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے لیے اجتماعیت درکار ہے اور اجتماعی زندگی میں فیصلے کرنے اور مختلف امور نپٹانے کے لیے باہمی مشاورت بہت ضروری ہے۔ لیکن کسی اجتماعیت کے اندر اگر مؤثر مشاورتی نظام موجود نہیں ہوگا اور کوئی ایک فرد دوسروں پر اپنی مرضی ٹھونسنے کا طرزِ عمل اپنانے کی کوشش کرے گا تو اس سے نہ صرف اجتماعی جدّوجُہد کو نقصان پہنچے گا بلکہ خود اس اجتماعیت کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے گا۔

جماعتی زندگی میں مشاورت کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ غزوۂ اُحد میں جن صحابہ کرامؓ سے درّہ چھوڑنے کی غلطی سرزد ہوئی ان کے بارے میں حضور ﷺ کو حکم دیا گیا: ﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ﴾ (آلِ عمران:۱۵۹) کہ نہ صرف آپؐ انہیں معاف کر دیں اور ان کے لیے مغفرت کی دعا کریں بلکہ انہیں مشورے میں بھی شامل رکھیں۔ مشاورت کے عمل سے اجتماعیت کو تقویت ملتی ہے۔ اس سے ساتھیوں کے مابین مشترکہ سوچ اور باہمی اعتماد پیدا ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کو جماعت کے اندر اپنی موجودگی کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے کہ اس کی بات سنی جاتی ہے۔

حضور ﷺ خود بھی صحابہؓ سے مشورے کو بہت اہمیت دیتے تھے‘ بلکہ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوا کہ حضورؐ نے اپنی رائے پر صحابہؓ کی رائے کو ترجیح دیتے ہوئے فیصلہ صادر فرمایا۔ مثلاً غزوۂ بدر کے موقع پر حضور ﷺ نے لشکر کے کیمپ کے لیے ایک جگہ کا انتخاب فرمایا۔ مگر جب کیمپ لگ چکا تو کچھ صحابہؓ نے آپؐ سے اجازت لے کر رائے دی کہ بعض وجوہات کی بنا پر دوسری جگہ کیمپ کے لیے زیادہ موزوں تھی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے صحابہؓ کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کیمپ اکھاڑ کر صحابہؓ کی مجوزہ جگہ پر لگانے کا حکم دے دیا۔ بہرحال اقامتِ دین کی جدّوجُہد میں مصروف جماعت کے نظم و نسق کا تقاضا ہے کہ اس جماعت میں مشاورت کا خصوصی اہتمام رکھا جائے۔

﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳۸﴾ ’’اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔‘‘

دعوت و اقامتِ دین کی جدّوجُہد میں مصروف لوگوں کو جہاں اپنے وقت اور اپنی جانوں کی قربانی دینا پڑے گی‘ وہاں اس راستے میں انہیں اپنا مال بھی خرچ کرنا پڑے گا۔ چنانچہ متعلقہ لوگوں کے اوصاف میں سے ایک وصف یہ بھی گنوا دیا گیا کہ وہ اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے ’’انفاق‘‘ بھی کرتے ہیں۔

قرآن کو غور سے پڑھنے والا شخص جانتا ہے کہ اس کے بہت سے مضامین ایک جیسے الفاظ کے ساتھ دہرا دہرا کر بیان ہوئے

ہیں۔ خاص طور پر مکی سورتوں میں ملتی جلتی آیات مختلف اسالیب کے ساتھ بار بار آئی ہیں۔ اسی لیے قرآن کو کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا (الزمر: ۲۳) کا نام بھی دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہر سورت کا ایک خاص مرکزی مضمون یا عمود بھی ہے جسے مضامین کے تنوع اور تکرار میں سے تلاش کرنے کے لیے غور و فکر اور تدبر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ سورۃ الشوریٰ پر اگر اس پہلو سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس سورت میں اگرچہ دوسری مکی سورتوں کے تمام مضامین بھی وارد ہوئے ہیں' لیکن اس کا مرکزی مضمون یا عمود ''اقامتِ دین'' ہے۔ اور اس مضمون کے اعتبار سے اس سورت کی زیر مطالعہ آیات پورے قرآن میں منفرد اور ممتاز حیثیت کی حامل ہیں۔ ان آیات کی اس اہمیت کے پیش نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون سے متعلق جن نکات کا ہم اب تک مطالعہ کر چکے ہیں انہیں ایک مرتبہ پھر سے ذہن میں تازہ کر لیا جائے۔

چنانچہ اعادہ کے لیے ایک دفعہ پھر آیت ۱۰ کی طرف رجوع کریں جس میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا تصور ان الفاظ میں واضح کیا گیا ہے: ﴿وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ﴾ یعنی تمہارے باہمی اختلافات میں حکم دینے کا اختیار صرف اللہ ہی کو ہے۔ یہ وہی بات ہے جو اس سے پہلے ہم سورۂ یوسف میں بھی پڑھ چکے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے جیل کے ساتھیوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ﴾ (آیت ۴۰) یعنی حاکمیت کا اختیار صرف اور صرف اللہ کے پاس ہے' اُس نے حکم دیا ہے کہ اُس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو' یہی دینِ قیم ہے۔ اس کے بعد آیت ۱۳ سے لے کر آیت ۲۱ تک ۹ آیات میں اقامت دین کا مضمون بہت جامع انداز میں بیان ہوا ہے۔ لیکن ان میں سے بھی پہلی تین آیات اپنی جامعیت کے لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ آیت ۱۳ میں فرمایا گیا: ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ﴾ کہ دین کو قائم کرو اور اس معاملے میں اختلاف میں نہ پڑو۔ یعنی جزئیات اور فروعات میں اختلاف کا ہونا اور بات ہے' لیکن دین کی اصل وحدت اور دین کے غلبہ کے لیے کی جانے والی جدّوجُہد میں تفرقہ بازی نہیں ہونی چاہیے۔ پھر اس کے بعد آیت ۱۵ میں حضور ﷺ کے لیے یہ حکم اس حوالے سے بہت اہم ہے: ﴿وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ﴾ کہ آپؐ اللہ کے حکم کے مطابق اپنے موقف پر ڈٹے رہیے اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کیجیے۔ پھر اسی آیت کے یہ الفاظ تو گویا اس مضمون کی شہ سرخی کا درجہ رکھتے ہیں: ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ﴾ کہ آپؐ اعلان کر دیجیے کہ مَیں تم لوگوں کے درمیان عدل قائم کرنے کے لیے آیا ہوں۔ مَیں تم لوگوں کو صرف نصیحتیں کرنے اور وعظ سنانے کے لیے نہیں آیا بلکہ معاشرے میں اجتماعی طور پر عدل و انصاف کا نظام قائم کرنا میرا فرضِ منصبی ہے۔ پھر اس سلسلے کی آخری بات آیت ۲۱ میں یوں فرمائی گئی: ﴿اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ﴾ کہ کیا ان کے شریکوں میں بھی کوئی ایسا ہے جس نے ان کو دین عطا کیا ہے اور ان کے لیے کوئی جامع نظام اور کوئی ضابطہ حیات وضع کیا ہے؟ یعنی وہ ذات تو صرف اللہ ہی کی ہے جس نے اپنے بندوں کو دینِ حق عطا کیا ہے جو ان کے لیے مکمل اور کامل ضابطہ حیات ہے۔ [سورۃ المائدۃ کی آیت ۳ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی کاملیت کی سند ان الفاظ میں عطا فرمائی ہے: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ﴾]

پھر آیت ۳۶ سے آیت ۴۳ تک آٹھ آیات میں وہ اوصاف بیان کیے گئے ہیں جو اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے علمبرداروں کو اپنی شخصیات میں پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ان میں بھی پہلی تین آیات بہت جامع اور اہم ہیں۔ ان تین آیات میں جن اہم نکات کا

ابھی ہم نے مطالعہ کیا ہے ان میں پہلا نکتہ یہ ہے کہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے اور اس کے مقابلے میں دنیا و مافیہا کی کوئی وقعت و اہمیت نہیں ہے۔ چنانچہ غلبۂ دین کی جدّوجُہد کے لیے نکلنے والے ہر شخص کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ دنیا کے لیے اس کی محنت صرف بنیادی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کی حد تک محدود رہے گی‘ جبکہ اس کا اصل مقصود و مطلوب آخرت کی زندگی اور اس زندگی کی کامیابی ہے۔ ثانیاً اس جدّوجُہد میں توکّل صرف اور صرف اللہ کی ذات پر ہوگا۔ مادی وسائل‘ اپنی ذہانت‘ طاقت اور صلاحیت پر تکیہ نہیں کیا جائے گا۔ ثالثاً تقویٰ‘ تزکیۂ نفس اور اصلاحِ کردار کی طرف خصوصی توجہ دی جائے گی۔ اس کے لیے کبائر اور فواحش سے کنارہ کشی اختیار کرنی ہوگی اور غُصّہ سمیت تمام باطنی خبائث سے بھی اپنے سینوں کو پاک کرنا ہوگا۔

پھر جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے اقامتِ دین کی جدّوجُہد پر کمربستہ ہو جائیں‘ انہیں اللہ تعالیٰ سے قلبی رشتہ جوڑنے اور یہ رشتہ قائم رکھنے کے لیے نماز کا التزام کرنا ہوگا۔ ان کے تمام فیصلے باہمی مشاورت سے طے ہوں گے اور اس جدّوجُہد میں ان کو اپنا وقت‘ اپنا مال‘ اپنی صلاحیتیں غرض اپنا وہ سب کچھ کھپا دینے کے لیے ہر وقت تیار رہنا ہوگا جو اللہ نے انہیں دیا ہے۔

زیر مطالعہ سورتوں میں انسانی سیرت و کردار سے متعلق جو ہدایات آئی ہیں ان کے بارے میں یہ نکتہ بھی مدِّنظر رہنا چاہیے کہ صحابہؓ کے کردار کے وہ تمام پہلو جو مدنی دور میں نمایاں ہوئے ان کی تمہید مکّی دور میں ہی اٹھائی گئی تھی اور مدینہ پہنچنے سے پہلے ہی ان ہدایات و احکام کے ذریعے ان لوگوں کو عملی میدان کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لیا گیا تھا۔

اب اگلی پانچ آیات میں مردانِ حق کے جس وصف کا ذکر خصوصی اہتمام سے کیا جا رہا ہے وہ ’’بدلہ‘‘ لینے کی حکمت عملی ہے۔ یہ حکمت عملی بظاہر سورۂ حٰمٓ السجدۃ کے اس حکم سے متضاد نظر آتی ہے جس میں لوگوں کی زیادتیوں کو برداشت کرنے اور عفو و درگزر سے کام لینے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس ظاہری تضاد یا حکمت عملی کی تبدیلی کے فلسفے کو یوں سمجھیں کہ سورۂ حٰمٓ السجدۃ کا مرکزی مضمون ’’دعوت‘‘ ہے جبکہ سورۃ الشوریٰ کا مرکزی مضمون ’’اقامتِ دین‘‘ ہے۔ دعوت کے لیے تو ظاہر ہے خوشامد بھی کرنا پڑتی ہے‘ لوگوں کے دروازوں پر بھی جانا پڑتا ہے اور ان کی جلی کٹی باتیں بھی سننا پڑتی ہیں۔ اس لیے سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں لوگوں کی زیادتیوں کو برداشت کرنے اور گالیاں سن کر دعائیں دینے کا سبق دیا گیا ہے۔ لیکن زیر مطالعہ سورت میں اقامتِ دین اور عملی جدّوجُہد (active resistance) کے تناظر میں سختی کا جواب سختی سے دینے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں دی گئی ہدایات کی روشنی میں دعوت کا مرحلہ کامیابی سے طے کرنے کے بعد غلبۂ دین کی تحریک مسلّح تصادم (armed conflict) کے مرحلے میں داخل ہو گئی ہے۔ یہ مرحلہ تیغ بکف‘ سر پر کفن باندھ کر میدان میں اترنے اور جان ہتھیلی پر رکھ کر باطل کو للکارنے کا مرحلہ ہے۔ چنانچہ اب صورتِ حال کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ حکمتِ عملی بھی بدل رہی ہے اور شمعِ توحید کے پروانوں کو ممکنہ حالات کے پیشِ نظر نئی ہدایات دی جا رہی ہیں۔

آیت ۳۹ ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝۳۹﴾ ’’اور وہ لوگ کہ جب ان پر زیادتی ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔‘‘

یعنی اقامتِ دین کی جدّوجُہد جب ’’قتال‘‘ کے مرحلے میں داخل ہو جائے تو پھر اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا حکم ہے۔ سورۃ البقرۃ میں اس حکمتِ عملی کو یوں بیان فرمایا گیا ہے: ﴿وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ﴾ (آیت ۱۹۱) ’’اور قتل کر دو انہیں جہاں کہیں بھی تم انہیں پاؤ اور نکال باہر کرو انہیں وہاں سے جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا‘‘۔ گویا

جب ایک دفعہ آگے بڑھ کر باطل کو چیلنج کر دیا گیا تو پھر فیصلہ کن فتح تک اس جنگ کو سختی سے جاری رکھنے کا حکم ہے۔ یہی وجہ تھی کہ غزوۂ بدر میں پکڑے گئے قیدیوں کو فدیہ لے کر رہا کیے جانے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے (سورۃ الانفال کی آیات ۶۷، ۶۸ میں) ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا گیا۔ ان قیدیوں کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے' بلکہ آپؓ کو تو اصرار تھا کہ ہر مسلمان اپنے رشتے دار اور عزیز قیدی کو خود اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔ اس حوالے سے آپؓ کی دلیل یہی تھی کہ اگر آج ان لوگوں کو چھوڑ دیا گیا تو کل وہ پھر ہمارے مقابلے میں آ جائیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس خدشے کی اُس وقت تصدیق بھی ہو گئی جب فدیہ پر رہائی پانے والے قیدیوں میں سے اکثر و بیشتر اگلے سال غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کے خلاف پھر سے آ کھڑے ہوئے تھے۔ عام مفسرین کے نزدیک سورۃ الانفال کی مذکورہ آیات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کی تائید میں نازل ہوئیں۔

آیت ۴۰ ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ﴾ ''اور کسی بُرائی کا بدلہ ویسی ہی بُرائی ہے''

یہاں تقابل کے لیے سورۂ حٰمٓ السجدۃ کا یہ حکم ایک مرتبہ پھر ملاحظہ ہو: ﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ (آیت ۳۴) ''اور دیکھو! اچھائی اور برائی برابر نہیں ہوتے' لہٰذا تم مدافعت کرو اُس طریقے سے جو بہترین ہو''۔ اب بظاہر تو ان دونوں احکام میں تضاد (contrast) نظر آتا ہے' لیکن قرآن کے ایسے مقامات کا مطالعہ اگر حضور ﷺ کی تحریک کے مختلف ادوار کے زمینی حقائق کی روشنی میں کیا جائے اور اس حوالے سے مکّی اور مدنی اَدوار کے حالات کے فرق کو مدِ نظر رکھا جائے تو تمام شبہات خود بخود دُور ہو جاتے ہیں۔ مکّہ میں رہتے ہوئے اگر ﴿كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ﴾ (النساء:۷۷) کی حکمت عملی اپنانے کی ہدایت تھی تو یہ اُس وقت کا تقاضا تھا۔ اور اگر مدینہ میں آ کر ﴿وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ﴾ کا حکم جاری ہوا ہے تو یہ اس مرحلے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اپنے سیاق و سباق کے اعتبار سے آیت زیر مطالعہ کا مفہوم یہ ہے کہ جب دشمن کے ساتھ تمہارا دو بدو مقابلہ شروع ہو جائے تو جس قدر زیادتی تم پر مخالف فریق کرے اس قدر زیادتی ان پر تم بھی کر سکتے ہو۔ اگر وہ اشہرِ حُرم کی حرمت کو بٹہ لگاتے ہیں تو تم بھی اس ماہ کے تقدس کے احترام میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر مت بیٹھے رہو۔

﴿فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَي اللّٰهِ ۭ﴾ ''پس جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے تو اُس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔''

یہ معاف کرنا اگر اس اعتبار سے ہو کہ اس میں متعلقہ شخص کی اصلاح کا امکان ہو تو اسی میں بہتری ہے۔

﴿اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝۴۰﴾ ''یقیناً اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔''

ظالموں کے لیے البتہ کوئی معافی نہیں' ان سے تو بہر حال بدلہ ہی لیا جائے گا۔ اس حکمت عملی کے بارے میں ہم سورۃ البقرۃ میں بھی پڑھ چکے ہیں: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ (آیت ۱۷۹) ''اور اے ہوشمندو! قصاص میں ہی تمہارے لیے زندگی ہے۔''

آیت ۴۱ ﴿وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝۴۱﴾ ''اور جو کوئی بدلہ لے اس کے بعد کہ اس پر ظلم کیا گیا ہو تو ان لوگوں پر کوئی الزام نہیں ہے۔''

سورۃ النساء کی آیت ۱۴۸ میں یہی اصول ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: ﴿لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْۗءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ

ظُلِمَ ط﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کو بالکل پسند نہیں کہ کوئی شخص کوئی بری بات بلند آواز سے کہے مگر مظلوم اس سے مستثنیٰ ہے' بدلہ لینا بہرحال مظلوم کا حق ہے۔ اگر وہ اپنے اوپر ہونے والی زیادتی کا بدلہ ہی لینا چاہتا ہے تو اسے معاف کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ دیکھئے ان آیات کا اسلوب اور انداز سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی مذکورہ آیات کے اسلوب سے کس قدر مختلف ہے۔ اسی ''تضاد'' کی بنیاد پر پروفیسر منٹگمری واٹ (۱۹۰۹ء۔۲۰۰۶ء) نے Muhammad at Mecca اور Muhammad at Medina دو کتابیں لکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مکہ کے اندر جب محمد عربی (ﷺ) کی ایک حکمت عملی ناکام ہوگئی تو انہوں نے مدینہ جا کر اپنا لائحہ عمل بالکل ہی تبدیل کرلیا۔ اس بے چارے ''دانشور'' کی نظریں تعصب کی عینک کے باعث حضور ﷺ کی تحریک کے دو مراحل کے فرق کو نہیں دیکھ سکیں۔ وہ اس سادہ سی بات کو بھی نہیں سمجھ سکا کہ پہلا مرحلہ تیاری کا مرحلہ تھا جبکہ دوسرا عملی جدّوجُہد کا۔

مکّی دور میں ''ہاتھ بندھے رکھنے'' کا حکم دراصل ایک سوچی سمجھی حکمت عملی (strategy) کا حصّہ تھا' جس کے تحت جاں نثارانِ توحید کو صبر و مصابرت کی بھٹی میں سے گزارنا مقصود تھا تاکہ میدانِ کارزار میں اترنے سے پہلے ان کے جذبے ضبط و برداشت کی آنچ سہہ سہہ کر پختہ اور ان کے دست و بازو آزمائش و ابتلا کی سختیاں جھیلنے کے عادی ہو جائیں۔ اقبالؔ نے اس حکمت عملی کو اس طرح بیان کیا ہے: ؎

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی　　اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی!

مدنی دور میں جب ''بندھے ہوئے ہاتھ'' کھول دیے گئے تو حالات یکسر بدل گئے۔ چنانچہ میدانِ بدر میں جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا سامنا اپنے سابق آقا اُمیّہ بن خلف سے ہوا تو چشمِ فلک کوئی اور ہی منظر دیکھ رہی تھی۔ اب اُمیّہ کی گردن کا مقدر نشانہ بننا تھا جبکہ ''اقدام'' کا اختیار تیغِ بلالیؓ کے پاس تھا۔

آیت ۴۲ ﴿اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ﴾ ''اصل میں الزام تو اُن پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں''
﴿وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۴۲﴾ ''اور زمین کے اندر سرکشی کرتے ہیں بغیر کسی حق کے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

عدل و انصاف کی راہ میں اصل رکاوٹ تو وہ لوگ ہیں جو زمین میں سرکشی دکھاتے ہیں' جو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو تسلیم کرنے کے بجائے خود حاکم بن بیٹھتے ہیں اور عوام الناس کے حقوق پر شب خون مارتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں انسانی معاشرے میں عدل و انصاف کی اہمیت کا اندازہ اُن تاکیدی احکام سے لگایا جاسکتا ہے جو پورے قرآن میں بہت تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۸ میں اللہ تعالیٰ کی شان ﴿قَاۗىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ ۭ﴾ کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے کہ وہ عدل و انصاف قائم کرنے والا ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۳۵ میں فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاۗءَ لِلّٰهِ﴾ ''اے اہلِ ایمان کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے گواہ بن کر''۔ اور پھر سورۃ المائدۃ کی آیت ۸ میں یہی الفاظ اس ترتیب میں دہرائے گئے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاۗءَ بِالْقِسْطِ ۡ﴾ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بن جاؤ''۔ پھر زیر مطالعہ سورت کی آیت ۱۵ میں حضور ﷺ سے فرمایا گیا کہ آپؐ انہیں بتا دیجیے: ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ﴾ کہ مجھے

تمہارے درمیان عدل قائم کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔

آیت ۴۳ ﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۴۳﴾﴾ ''اور ہاں جو کوئی صبر کرے اور معاف کر دے تو یہ واقعتاً بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے۔''

بدلہ لینا اگرچہ مظلوم کا حق ہے' لیکن کسی خاص صورتِ حال میں اگر وہ صبر سے کام لیتے ہوئے اپنا یہ حق معاف کرنا چاہے تو بے شک یہ عزیمت کے اوصاف میں سے ہے۔

یہاں پر سیرت و کردار سے متعلق خصوصی اوصاف کا ذکر ختم ہوا۔ اس کے بعد کی آیات میں مکی سورتوں کے عمومی مضامین آ رہے ہیں۔

آیات ۴۴ تا ۵۰

وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ
هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۴﴾ وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ
طَرْفٍ خَفِيٍّ ؕ وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ اَهْلِيْهِمْ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ﴿۴۵﴾ وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ
دُوْنِ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۶﴾ اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ
يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّ مَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ﴿۴۷﴾ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ
اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَ اِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ
بِهَا ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ﴿۴۸﴾ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ﴿۴۹﴾ اَوْ
يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾

آیت ۴۴ ﴿وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ﴾ ''اور جس کو اللہ نے ہی گمراہ کر دیا ہو تو اس کے بعد اس کے لیے کوئی مددگار نہیں۔''

جس کی گمراہی پر اللہ تعالیٰ نے ہی مہر ثبت کر دی ہو تو ایسے شخص کا ایسا کوئی حمایتی اور دوست ممکن نہیں جو اسے راہِ راست پر لے آئے۔

﴿وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۴﴾﴾ ''اور تم دیکھو گے ظالموں کو کہ جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو کہیں گے: کیا واپس لوٹ جانے کا بھی کوئی راستہ ہے؟''

آیت ۴۵ ﴿وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ؕ﴾ ''اور تم دیکھو گے انہیں کہ وہ پیش کیے جائیں گے اس (جہنم) پر' نگاہیں زمین میں گاڑے ہوں گے ذلت کی وجہ سے' دیکھ رہے ہوں گے کن انکھیوں سے۔''

اسی کیفیت میں وہ لوگ ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے ہوں گے۔

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ﴾ ''اور (اُس وقت) اہلِ ایمان کہیں گے کہ واقعتاً تباہ و برباد ہونے والے تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو قیامت کے دن خسارے میں مبتلا کیا۔''

﴿اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ۝۴۵﴾ ''آگاہ ہو جاؤ! یہ ظالم تو ہمیشہ قائم رہنے والے عذاب میں رہیں گے۔''

آیت ۴۶ ﴿وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور ان کے لیے کوئی مددگار نہیں ہوں گے جو ان کی مدد کر سکیں اللہ کے مقابلے میں۔''

﴿وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ۝۴۶﴾ ''اور جسے اللہ نے ہی گمراہ کر دیا ہو' پھر اس کے لیے کوئی راستہ نہیں ہے۔''

اب اس کے بعد پھر اقامتِ دین سے متعلق دو عظیم آیات آ رہی ہیں۔

آیت ۴۷ ﴿اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ﴾ ''(اے اہلِ ایمان!) اپنے رب کی پکار پر لبیک کہو' اس سے پہلے کہ اللہ کے حکم سے وہ دن آ جائے جسے لوٹایا نہ جا سکے گا۔''

یہ اسی ''استجابت'' کا ذکر ہے جس کے بارے میں قبل ازیں ہم آیت ۳۸ میں پڑھ چکے ہیں۔ وہاں یہ ذکر اصحابِ عزیمت کی مدح کے طور پر آیا تھا' لیکن یہاں اب اس کے لیے ترغیب و تشویق کا انداز ہے کہ اے لوگو! اب جبکہ تم نے یہ تمام احکام پڑھ لیے ہیں' غلبۂ دین کے حوالے سے تم نے اپنے فرائض کو سمجھ لیا ہے' اس ضمن میں اپنے رب کی مرضی و منشا بھی تمہیں معلوم ہو چکی ہے' تو اب آؤ! آگے بڑھو! اور اپنے رب کی پکار پر فوراً لبیک کہو!

دراصل تم میں سے ہر کسی نے اپنی اپنی زندگی کے لیے بڑے بڑے منصوبے بنا رکھے ہیں۔ چنانچہ اگر کسی کو اپنے اس ''فرض'' کی ادائیگی کا احساس ہو بھی جاتا ہے تو بھی اس کا دل انہی منصوبوں میں اٹکا رہتا ہے کہ بس میں یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچا لوں' اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو لوں' وہ فرض نبھا لوں' تو خود کو دین کے لیے وقف کر دوں گا۔ مگر تم خوب جانتے ہو کہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں' یہ کسی وقت بھی آ سکتی ہے۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ موت تمہارے سامنے آن کھڑی ہو' تم ﴿اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ﴾ کے حکم پر کان دھرو! اور اپنے رب کی اس پکار پر لبیک کہتے ہوئے دوسروں کے قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھو! اور اپنی مدتِ مہلت ختم ہونے سے پہلے پہلے کرنے کا یہ اصل کام کر لو!

﴿مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ۝۴۷﴾ ''نہیں ہو گی تمہارے لیے اُس دن کوئی جائے پناہ اور نہیں ہو گا تمہارے لیے کوئی موقعِ انکار۔''

یعنی تم اپنے کرتوتوں میں سے کسی کا انکار نہیں کر سکو گے۔ ان الفاظ کا یہ مفہوم بھی ہے کہ جو کچھ بھی تمہارے ساتھ کیا جائے گا تم اس پر نہ تو کوئی احتجاج کر سکو گے اور نہ ہی اپنی حالت کو تبدیل کرنا تمہارے بس میں ہو گا۔

آیت ۴۸ ﴿فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ﴾ ''پھر اگر یہ لوگ اعراض کریں تو (اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو ان پر کوئی داروغہ بنا کر نہیں بھیجا۔''

یعنی اگر یہ لوگ اب بھی اپنے رب کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے لیے کمربستہ نہ ہوں تو ان کی اس کوتاہی کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہوگی۔

﴿اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ﴾ ''نہیں ہے آپ پر کوئی ذمہ داری مگر صاف صاف پہنچا دینے کی۔''

﴿وَاِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ﴾ ''اور جب ہم انسان کو اپنی رحمت کا کوئی مزہ چکھاتے ہیں تو وہ اس پر اتراتا ہے۔''

﴿وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ﴿۴۸﴾﴾ ''اور اگر ان پر آ پڑے کوئی برائی ان کے اپنے ہاتھوں کے کرتوتوں کی بدولت تو انسان بالکل ناشکرا بن جاتا ہے۔''

آیت ۴۹ ﴿لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے۔''

یہ مضمون قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے' لیکن اس کے لیے عام طور پر یہ جملہ آتا ہے: ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ﴾ لیکن اس سورت کے مرکزی مضمون (اقامتِ دین) کے حوالے سے یہاں خاص طور پر مُلک (حکومت واقتدار) کا لفظ آیا ہے۔

﴿يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ﴿۴۹﴾﴾ ''وہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے بیٹیاں دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بیٹے دیتا ہے۔''

آیت ۵۰ ﴿اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ﴾ ''یا وہ انہیں ملا کر دیتا ہے بیٹے اور بیٹیاں۔''

﴿وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾﴾ ''اور جس کو چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے۔ یقیناً وہ سب کچھ جاننے والا ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔''

وہ اپنی مرضی ومنشا میں قادرِ مطلق ہے' جس کو جو چاہے عطا کر دے' لیکن وہ جس کو جو عطا کرتا ہے اپنے علم وحکمت کی بنیاد پر عطا کرتا ہے۔

اگلی آیات میں وحی کی حقیقت اور اس کی اقسام بیان ہوئی ہیں۔ اس موضوع پر یہ قرآن کا اہم ترین مقام ہے۔

آیات ۵۱ تا ۵۳

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿۵۱﴾ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَ

اِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۵۲ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ۝۵۳

آیت ۵۱ ﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ﴾ ''اور کسی بشر کا یہ مقام نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے''

اللہ تو ہر چیز پر قادر ہے' وہ جو چاہے کرے' مگر کسی انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ اس سے ہم کلام ہو۔

﴿اِلَّا وَحْيًا﴾ ''سوائے وحی کے''

یہ وحی کی پہلی قسم ہے جسے ''القاء'' یا ''الہام'' کہا جاتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے براہِ راست بندے تک اپنا پیغام پہنچا دیتا ہے اور متعلقہ بات اُس کے دل میں ڈال دیتا ہے۔ شہد کی مکھی کی طرف وحی کرنا (النحل: ۶۹)' ہر آسمان میں اس سے متعلقہ پیغام پہنچانا (حٰمٓ السجدۃ: ۱۲) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں القاء کرنا (القصص: ۷) اس وحی کی مثالیں ہیں جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔

﴿اَوْ مِنْ وَّرَاۗيِٕ حِجَابٍ﴾ ''یا (پھر وہ بات کرتا ہے) پردے کی اوٹ سے''

یہ وحی کی دوسری قسم ہے' جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا: ﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۝۱۶۴﴾ (النساء)۔

﴿اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَاۗءُ ۭ﴾ ''یا وہ بھیجتا ہے کسی پیغام بَر (فرشتے) کو' پھر وہ وحی کرتا ہے اللہ کے حکم سے جو وہ چاہتا ہے۔''

یہ وحی کی تیسری قسم ہے' جیسے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے سے پورا قرآن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر نازل ہوا۔

﴿اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝۵۱﴾ ''وہ بہت بلند و بالا ہے' کمال حکمت والا ہے۔''

اُس کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ وہ کسی انسان سے براہِ راست بغیر حجاب کے کلام کرے' اور وہ کمال حکمت والا ہے' اُس نے اپنی حکمت کے مطابق انسانوں تک پیغام رسانی (communication) کا جو طریقہ چاہا اختیار فرمایا۔

آیت ۵۲ ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ﴾ ''اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) اسی طرح ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے ایک روح اپنے امر میں سے۔''

یہاں پر قرآن کو رُوحًا مِّنْ اَمْرِنَا کہا گیا ہے۔

اگلی آیت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ آپؐ کو ایمان کہاں سے ملا؟ اس مضمون کے اعتبار سے یہ قرآن حکیم کا اہم ترین مقام ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی مثال ایمان کی دہکتی ہوئی بھٹی کی سی ہے کہ جو بھی آپؐ کے قریب آ گیا ایمان کی دولت سے مالا مال ہو گیا۔ البتہ جس طرح ایک خراب موصل (bad conductor) بھٹی کے سامنے ہونے کے باوجود بھی ''اتصالِ حرارت'' کے عمل سے محروم رہتا ہے اسی طرح بعض بدنصیب انسان (منافقین) آپؐ کی قربت میں رہنے کے باوجود بھی ایمان سے محروم رہے۔

﴿مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ﴾ ''(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی

ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے‘‘

آپ ﷺ نے دنیا کے معروف اور روایتی طریقے سے نہ تو تعلیم حاصل کی تھی اور نہ ہی آپ نے تورات یا کوئی اور کتاب پڑھی تھی۔ اس لحاظ سے آپ ’’اُمّیین‘‘ میں سے تھے۔

﴿وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ﴾ ’’لیکن اس (قرآن) کو ہم نے ایسا نُور بنایا ہے جس کے ذریعے سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں۔‘‘

یعنی قرآن کے ذریعے سے حضور ﷺ کے ایمان نے ایک حقیقی اور واقعی شکل اختیار کر لی۔ فطرتِ انسانی کے اندر موجود ایمان کی خفتہ (dormant) کیفیت کے بارے میں اس مطالعہ قرآن کے دوران قبل ازیں متعدد بار گفتگو ہو چکی ہے۔ ظاہر ہے روحِ محمدی ﷺ میں تمام انسانی ارواح سے زیادہ قوی ایمان موجود تھا۔ آپ کی روح کے ایمان کی کیفیت سورۃ النُّور کے پانچویں رکوع میں بیان کی گئی مثال کے مطابق ’’نورٌ عَلٰی نُوْرٍ‘‘ کی سی تھی۔ ہمارے علماء نے اس کی تعبیریوں کی ہے کہ آپ کی روح کے اندر اجمالی ایمان پہلے سے موجود تھا‘ جبکہ آپ کو تفصیلی ایمان قرآن سے ملا۔ میں اس کی تعبیر یوں کرتا ہوں کہ آپ کی روح مبارک کے اندر بالقوۃ (potentioal) ایمان پہلے سے موجود تھا جو خفتہ (dormant) حالت میں تھا۔ قرآن نے اس ایمان کو فعال (active) کر دیا۔ یعنی قرآن کے نور سے آپ کا ایمان جگمگا اٹھا اور آپ کی ذات کے اندر ’’نورٌ عَلٰی نُوْرٍ‘‘ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس کے بعد آپ بنی نوعِ انسان کو راہِ ہدایت دکھانے کے لیے مینارۂ نُور بن گئے۔

﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۵۲﴾ ’’اور آپ یقیناً سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتے ہیں۔‘‘

جیسے کہ ساحل پر موجود روشنی کا مینار جہازوں کو بندرگاہ تک پہنچنے کا راستہ دکھاتا ہے۔

﴿صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ﴾ ’’اُس اللہ کے راستے کی طرف جس کی ملکیت ہے ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ شے جو زمین میں ہے۔‘‘

﴿اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ۝۵۳﴾ ’’آگاہ ہو جاؤ! تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹ جائیں گے۔‘‘

سُوْرَةُ الزُّخْرُفِ

تمہیدی کلمات

سورۃ الزخرف اور سورۃ الدخان ایک بہت حسین جوڑے کی شکل میں آئی ہیں۔ دونوں سورتوں کی دو ابتدائی آیات مشترک ہیں۔ اس کے علاوہ ان دونوں میں ایک معنوی نسبت یہ بھی ہے کہ سورۃ الزخرف کی چوتھی آیت میں قرآن کا تعارف ''اُمّ الکتاب'' کے حوالے سے کرایا گیا ہے اور سورۃ الدخان کی آیت ۳ میں لیلۂ مبارکہ میں ''اُمّ الکتاب'' سے قرآن کے نزول کا ذکر ہے۔ ''اُمّ الکتاب'' دراصل اللہ تعالیٰ کا علم قدیم ہے جس کا ذکر سورۃ الواقعہ کی آیت ۷۸ میں کِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ اور سورۃ البروج کی آخری آیت میں لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ کے نام سے ہوا ہے۔

آیات ۱ تا ۱۴

سُوْرَةُ الزُّخْرُفِ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۸۹ رُكُوْعَاتُهَا: ۷

حٰمٓ ﴿۱﴾ وَ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۳﴾ وَ اِنَّهٗ فِيْۤ اُمِّ
الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿۴﴾ اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ ﴿۵﴾ وَ
كَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶﴾ وَ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۷﴾
فَاَهْلَكْنَاۤ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَّ مَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿۹﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ
فِيْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰﴾ وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً
مَّيْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَالَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ
مَا تَرْكَبُوْنَ ﴿۱۲﴾ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَ تَقُوْلُوْا
سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۴﴾

آیت ۱ ﴿حٰمٓ ①﴾ ''ح م۔''

آیت ۲ ﴿وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ②﴾ ''قسم ہے اِس کتاب کی جو بالکل واضح ہے۔''

یہاں پر چونکہ قرآن کی قسم کا ''جوابِ قسم'' یا مُقسَم علیہ محذوف ہے اس لیے اس قسم کا مُقسَم علیہ بھی سورۂ یٰسٓ کی آیت میں وارد الفاظ ﴿اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۳﴾ ہی کو مانا جائے گا۔ یہ نکتہ قبل ازیں سورۂ یٰسٓ کی آیت ۳ کے ضمن میں واضح کیا جا چکا ہے کہ سورۂ یٰسٓ کے آغاز میں قرآن کی قسم چونکہ حضور ﷺ کی رسالت کی گواہی کے طور پر کھائی گئی ہے اس لیے قرآن کے ان تمام مقامات پر جہاں قرآن کی قسم کا مُقسَم علیہ محذوف ہے وہاں اس قسم کا مُقسَم علیہ منطقی طور پر ان ہی الفاظ ﴿اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۳﴾ کو ہونا چاہیے۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ کا مفہوم یوں ہوگا کہ یہ کتابِ مبین گواہ ہے کہ اے محمد (ﷺ) آپ اللہ کے رسول ہیں!

آیت ۳ ﴿اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۳﴾ ''ہم نے اس کو بنایا ہے قرآن عربی تاکہ تم سمجھ سکو۔''

آیت ۴ ﴿وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝۴﴾ ''اور یہ اُمّ الکتاب میں ہے ہمارے پاس بہت بلند و بالا' بہت حکمت والی!''

یعنی اصل قرآن تو ''اُمّ الکتاب'' میں ہے۔ دنیا کو اس کی عربی زبان میں مصدقہ نقول فراہم کی گئی ہیں۔ اسی ''اُمّ الکتاب'' کو سورۃ الواقعہ کی آیت ۷۸ میں کِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ اور سورۃ البروج کی آخری آیت میں لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ بھی کہا گیا ہے۔

آیت ۵ ﴿اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ ۝۵﴾ ''کیا ہم اس ذکر کا رخ تمہاری طرف سے اس لیے پھیر دیں کہ تم حد سے بڑھنے والے لوگ ہو!''

ہم نے اپنی یہ کتابِ ہدایت ایک عظیم الشان نعمت کے طور پر تمہاری طرف نازل کی' جو نصیحت و یاددہانی پر مشتمل ہے' مگر تم نے اس کی ناقدری کرتے ہوئے اس کی طرف سے روگردانی کی ہے۔ تو کیا ہم تمہارے اس رویے کی وجہ سے اپنی اس نعمت کو ہی اُٹھا لیں؟ نہیں! ابھی ہم تم لوگوں کو مزید مہلت دینا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ابھی یہ کتاب تمہیں پڑھ کر سنائی جاتی رہے گی۔

آیت ۶ ﴿وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ۝۶﴾ ''اور ہم نے کتنے ہی نبی بھیجے پہلوں میں بھی۔''

آیت ۷ ﴿وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۷﴾ ''اور نہیں آیا کوئی بھی نبی ان کے پاس مگر وہ اس کا مذاق ہی اُڑاتے رہے۔''

آیت ۸ ﴿فَاَهْلَكْنَآ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا﴾ ''پھر ہم نے انہیں ہلاک کر دیا جو اِن سے بہت زیادہ بڑھ کر تھے قوت میں''

ہم نے ماضی میں بہت سی ایسی قوموں کو بھی نیست و نابود کر دیا جو قریشِ مکہ سے کہیں بڑھ کر زور آور تھیں اور ان کی پکڑ بہت مضبوط تھی۔ تو یہ کس کھیت کی مولی ہیں؟

﴿وَمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۸﴾ ''اور پہلے لوگوں کی مثالیں گزر چکی ہیں۔''

اقوامِ ماضی کے تفصیلی واقعات اور ان کے انجام کے بارے میں حقائق ان لوگوں کو بار بار بتائے جا چکے ہیں۔

آیت ۹ ﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۝۹﴾ ''اور اگر آپ ان سے پوچھیں گے کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو تو وہ لازماً یہی کہیں گے کہ انہیں بنایا ہے اُس ہستی نے جو العزیز اور العلیم ہے۔''

آیت ۱۰ ﴿الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۱۰﴾ ''جس نے تمہارے

لیے زمین کو بچھونا بنا دیا اور پھر اس میں تمہارے لیے راستے بنا دیے تا کہ تم منزل تک پہنچ سکو۔''

تا کہ تم ان قدرتی راستوں کی مدد سے اپنی منزلوں تک پہنچ سکو۔ مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں پر غور کر کے ہدایت کی منزل مقصود پانے میں کامیاب ہو جاؤ۔

آیت ۱۱ ﴿وَالَّذِیْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ﴾ ''اور وہ کہ جس نے اُتارا آسمان سے پانی ایک اندازے کے مطابق۔''

﴿فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا﴾ ''تو اس سے ہم نے مُردہ زمین کو اُٹھا کھڑا کیا۔''

اللہ تعالیٰ نے بارش کے پانی سے بنجر زمین میں زندگی کے آثار پھیلا دیے' اسے حیاتِ تازہ بخش دی۔

﴿كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ۝۱۱﴾ ''اسی طرح (ایک روز) تمہیں بھی نکال لیا جائے گا۔''

تمہیں بھی روزِ محشر اسی طرح زندہ کر کے تمہاری قبروں سے نکال کھڑا کیا جائے گا۔

آیت ۱۲ ﴿وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا﴾ ''اور وہ کہ جس نے بنائے ہیں تمام مخلوقات کے جوڑے''

﴿وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ۝۱۲﴾ ''اور تمہارے لیے بنائی ہیں کشتیاں بھی اور چوپائے بھی جن پر تم سواری کرتے ہو۔''

آیت ۱۳ ﴿لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ﴾ ''تا کہ تم جم کر بیٹھو ان کی پیٹھوں پر''

﴿ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ﴾ ''پھر اپنے رب کے انعام کا ذکر کرو جب کہ تم ان کے اوپر جم کر بیٹھ جاؤ''

﴿وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۝۱۳﴾ ''اور تم کہو کہ پاک ہے وہ ذات جس نے ان (سواریوں) کو ہمارے بس میں کر دیا ہے' اور ہم تو انہیں قابو میں لانے والے نہیں تھے۔''

آیت ۱۴ ﴿وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۝۱۴﴾ ''اور یقیناً ہم اپنے رب ہی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔''

آیات ۱۵ تا ۲۵

ع ۱۵ وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۵ اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ ۝۱۶ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝۱۷ اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِی الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِی الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ۝۱۸ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ ۝۱۹ وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝۲۰ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ۝۲۱ بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝۲۲ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا

وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ قٰلَ اَوَ لَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۲۴﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۵﴾ ع

آیت ۱۵ ﴿وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ؕ﴾ ''اور انہوں نے اُس کے بندوں میں سے اُس کا ایک جزو ٹھہرایا۔''

یعنی اُس کے بعض بندوں کو اُس کی اولاد قرار دے دیا۔ انسان کی اولاد دراصل اس کا جزو ہی ہوتا ہے۔ باپ کے جسم سے ایک سیل (spermatozone) نکل کر ماں کے جسم کے سیل (ovum) سے ملتا ہے اور ان دو cells کے ملاپ سے بچے کی تخلیق ہوتی ہے ـــــ cells ماں اور باپ کے اپنے اپنے جسموں کے جزو ہی ہوتے ہیں۔

﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾﴾ ''یقیناً انسان بہت کھلا ناشکرا ہے۔''

آیت ۱۶ ﴿اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ ﴿۱۶﴾﴾ ''کیا اُس نے بنا لی ہیں اپنی مخلوق میں سے بیٹیاں اور تمہیں پسند کر لیا ہے بیٹوں کے ساتھ!''

یہ مضمون بہت تکرار کے ساتھ قرآن مجید میں آیا ہے۔

آیت ۱۷ ﴿وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا﴾ ''اور جب ان میں سے کسی کو اُس کی بشارت دی جاتی ہے جس کی مثال وہ رحمٰن کے لیے بیان کرتا ہے''

وہ بڑی بے شرمی سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیٹیاں منسوب کرتے ہیں' لیکن جب خود ان میں سے کسی کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اُس کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے:

﴿ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۱۷﴾﴾ ''تو اُس کے چہرے پر سیاہی چھا جاتی ہے اور وہ غم کے گھونٹ پی رہا ہوتا ہے۔''

آیت ۱۸ ﴿اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ﴿۱۸﴾﴾ ''کیا وہ جو پرورش پاتی ہے زیور میں اور بحث میں اپنا موقف واضح نہیں کر سکتی!''

بچیاں پیدائشی طور پر نازک ہوتی ہیں' وہ بچپن سے ہی کھلونوں اور گڑیوں کے ساتھ کھیلتی ہیں اور زیورات میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ بحث و تکرار کے موقع پر اپنا مدعا بھی واضح انداز میں بیان نہیں کر سکتیں۔ اس کے برعکس لڑکے بچپن سے ہی نسبتاً مضبوط اور جفاکش ہوتے ہیں۔ وہ فطری طور پر ہتھیاروں کے کھلونوں سے کھیلنا اور مارشل گیمز میں حصہ لینا پسند کرتے ہیں۔

آیت ۱۹ ﴿وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ﴾ ''اور انہوں نے فرشتوں کو' جو کہ رحمٰن کے مقرب بندے ہیں (اس کی) بیٹیاں قرار دے دیا ہے۔''

﴿اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ ﴿۱۹﴾﴾ ''کیا یہ لوگ موجود تھے ان کی تخلیق کے وقت؟ ان کی یہ گواہی (کہ فرشتے مؤنث ہیں) لکھ لی جائے گی اور پھر ان سے باز پُرس ہوگی۔''

آیت ۲۰ ﴿وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ﴾ ''اور وہ کہتے ہیں کہ اگر رحمٰن چاہتا تو ہم ان کی بندگی نہ کرتے۔''

﴿مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۭ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝۲۰﴾ ''ان کے پاس اس کے لیے کوئی علمی سند نہیں ہے' وہ تو محض اٹکل کے تیر چلا رہے ہیں۔''

آیت ۲۱ ﴿اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ۝۲۱﴾ ''کیا ہم نے انہیں اس سے پہلے کوئی کتاب دی ہے جسے وہ مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں؟''

کیا ان لوگوں کے پاس ہماری نازل کردہ کوئی کتاب ہے جس سے یہ اپنی اس ملائکہ پرستی کے لیے دلیل پکڑتے ہوں؟ یا ان کے معبودانِ باطل لات' منات' عُزّیٰ اور ہُبل میں سے کسی نے ان پر کوئی کتاب یا صحیفہ نازل کر رکھا ہے؟ سورۂ ماقبل (الشوریٰ) کی آیت ۲۱ میں بھی اس سے ملتا جلتا سوال کیا گیا ہے: ﴿اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ۭ﴾ ''کیا ان کے ایسے شرکاء ہیں جنہوں نے ان کے لیے دین میں کچھ ایسا طے کر دیا ہو جس کا اللہ نے حکم نہیں دیا؟''

آیت ۲۲ ﴿بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَاۗءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝۲۲﴾ ''بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو اپنے آباء واَجداد کو پایا ایک راستے پر اور اب ہم ان ہی کے نقشِ قدم پر ہدایت یافتہ ہیں۔''

آیت ۲۳ ﴿وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) اسی طرح ہم نے نہیں بھیجا آپ سے پہلے کسی بستی میں کسی خبردار کرنے والے کو مگر اُس کے خوشحال لوگوں نے یہی کہا''

﴿اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَاۗءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۝۲۳﴾ ''کہ ہم نے پایا ہے اپنے آباء واَجداد کو ایک راستے پر اور اب ہم ان ہی کے نقشِ قدم کی اقتدا کر رہے ہیں۔''

آیت ۲۴ ﴿قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَاۗءَكُمْ ۭ﴾ ''اُس (خبردار کرنے والے) نے کہا کہ خواہ میں لایا ہوں تمہارے پاس زیادہ ہدایت والی چیز اُس کے مقابلے میں جس پر تم نے اپنے آباء واَجداد کو پایا!''

ہر قوم کی طرف جو نبی بھیجا گیا اُس نے اپنی قوم سے سوال کیا کہ خواہ میں تمہیں اس راستے سے زیادہ صحیح راستہ بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے جب بھی تم انہی کے نقشِ قدم کی پیروی کرو گے اور اُسی ڈگر پر چلتے جاؤ گے؟

﴿قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝۲۴﴾ ''انہوں نے کہا کہ ہم اُس کے جس کے ساتھ آپ بھیجے گئے ہیں' منکر ہیں۔''

یوں ہر قوم کے لوگ پوری ڈھٹائی کے ساتھ سینہ تان کر اپنے نبیؑ کا انکار کرتے رہے۔

آیت ۲۵ ﴿فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۲۵﴾ ''تو ہم نے اُن سے انتقام لیا' تو دیکھ لو پھر کیسا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا!''

آیات ۲۶ تا ۳۵

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَاۗءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ۝۲۶ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ۝۲۷ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝۲۸ بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَاۗءِ وَاٰبَاۗءَهُمْ

حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۹﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّ اِنَّا بِهٖ
كٰفِرُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿۳۱﴾ اَهُمْ
يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ
فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ وَ رَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا
يَجْمَعُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَ لَوْ لَاۤ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ
سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ لِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ﴿۳۴﴾
وَزُخْرُفًا ؕ وَ اِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۵﴾ ع

آیت ۲۶ ﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖۤ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۶﴾﴾ ''اور یاد کرو جب ابراہیمؑ نے کہا تھا اپنے والد اور اپنی قوم سے کہ یقیناً میں بیزار ہوں اُن سے جنہیں تم پوجتے ہو۔''

آیت ۲۷ ﴿اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ﴿۲۷﴾﴾ ''سوائے اُس ہستی کے جس نے مجھے پیدا کیا ہے' تو یقیناً وہی مجھے راستہ دکھائے گا۔''

آیت ۲۸ ﴿وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾﴾ ''اور اُس نے اسی بات کو باقی رکھا اپنے پیچھے (اپنی اولاد میں) بھی تاکہ وہ (اللہ ہی کی جناب میں) رجوع کیے رہیں۔''

یہی بات سورۃ البقرۃ میں یوں بیان ہوئی ہے: ﴿وَوَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ
فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾﴾ ''اور اسی کی وصیت کی تھی ابراہیمؑ نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوبؑ نے بھی' کہ اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لیے یہی دین پسند فرمایا ہے' پس تم ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان!''

آیت ۲۹ ﴿بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۹﴾﴾ ''لیکن میں نے ان لوگوں کو اور ان کے آباء و اجداد کو کچھ ساز و سامان دے دیا' یہاں تک کہ ان کے پاس آ گیا حق اور ایک واضح کر دینے والا رسول۔''

آیت ۳۰ ﴿وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۰﴾﴾ ''اور جب حق ان کے پاس آیا تو انہوں نے کہا کہ یہ تو جادو ہے اور ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔''

آیت ۳۱ ﴿وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿۳۱﴾﴾ ''اور کہنے لگے کہ کیوں نہیں اتارا گیا یہ قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی عظیم شخص پر؟''

یہاں اصل مرکب توصیفی ''رَجُلٍ عَظِيْمٍ'' ہے' لیکن ان دو الفاظ کے درمیان ''مِنَ الْقَرْيَتَيْنِ'' آ جانے سے ''رجل'' کی صفت (عظیم) آخر پر چلی گئی ہے۔ قرآن کے اسلوب کے مطابق الفاظ کی یہ تقدیم و تاخیر مخصوص صوتی آہنگ کے باعث ہوتی ہے جس کی مثالیں قرآن میں جا بجا ملتی ہیں۔

مکہ اور طائف نزولِ قرآن کے زمانے میں (پاکستان کے راولپنڈی اور اسلام آباد کی طرح) جڑواں شہر (twin cities)

سمجھے جاتے تھے۔ دونوں شہروں کے لوگوں کے آپس میں گہرے مراسم تھے۔ مکہ کے اکثر سرداروں کی طائف میں بڑی بڑی جائیدادیں تھیں۔ ان میں ولید بن مغیرہ کا ذکر روایات میں خاص طور پر آتا ہے کہ طائف میں اس کے بہت سے باغات اور مکانات تھے۔ مذکورہ جملہ دراصل اس پس منظر میں کسا گیا تھا کہ ان دونوں شہروں کی بڑی شخصیات کو چھوڑ کر اللہ کو رسول بنانے اور اس پر اپنی کتاب نازل کرنے کے لیے آخر قریش کا ایک یتیم ہی کیوں پسند آیا ہے!

آیت ۳۲ ﴿اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ﴾ ''کیا آپ کے رب کی رحمت کو یہ لوگ تقسیم کریں گے؟''

نبوت اور وحی اللہ کی رحمت کا بہت بڑا مظہر ہے۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہماری اس رحمت کا حقدار کون ہے اور ہم یہ فیصلہ اپنی مشیت و حکمت کے مطابق کرتے ہیں کہ اس بلند مرتبے پر کسے فائز ہونا ہے۔ چنانچہ ہم نے خود اس منصب کے لیے محمد (ﷺ) کا انتخاب فرمایا ہے اور آپ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے۔ ہمارے اس فیصلے پر اعتراض کرنے کا حق انہیں کس نے دیا ہے؟

﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ ''ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کا سامان دُنیا کی زندگی میں تقسیم کر دیا ہے''

﴿وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ﴾ ''اور ان میں سے بعض کو بعض پر ہم نے درجات میں فوقیت دے دی ہے''

کسی کو کھاتے پیتے والدین کے گھر پیدا کر کے پیدائشی طور پر خوشحال بنا دیا ہے تو کسی کو اس حال میں رکھا ہے کہ اسے دن بھر مشقت کر کے بھی دو وقت کا کھانا میسر نہیں ہوتا۔

﴿لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ﴾ ''تاکہ بعض لوگ دوسروں کو خدمت گار بنا سکیں۔''

اگر وہ سب کو ایک جیسا بنا دیتا تو کوئی کسی کی ملازمت کیوں کرتا؟ اور مختلف کام کرنے والے مزدور کہاں سے ملتے؟ بہر حال اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی اسی درجہ بندی کی بدولت دنیا میں ہر قسم کا کام کرنے والے پیشہ ور لوگ دستیاب ہیں اور اسی وجہ سے یہ کارخانۂ تمدن چل رہا ہے۔

﴿وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝۳۲﴾ ''اور آپ کے رب کی رحمت کہیں بہتر ہے ان چیزوں سے جو یہ لوگ جمع کر رہے ہیں۔''

سورۂ یونس میں بالکل یہی الفاظ قرآن مجید کے بارے میں ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۵۷ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝۵۸﴾ ''اے لوگو! آ گئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے اور تمہارے سینوں (کے امراض) کی شفا اور اہلِ ایمان کے حق میں ہدایت اور (بہت بڑی) رحمت۔ (اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ یہ (قرآن) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے (نازل ہوا) ہے۔ تو چاہیے کہ لوگ اس پر خوشیاں منائیں۔ وہ کہیں بہتر ہے ان چیزوں سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔''

آیت ۳۳ ﴿وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ ''اور اگر یہ (اندیشہ) نہ ہوتا کہ تمام لوگ ایک ہی اُمت بن جائیں گے''

یعنی اگر تمام لوگوں کے کافر اور منکر ہو جانے کا خدشہ نہ ہوتا:

﴿لَجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ﴿۳۳﴾﴾ ''تو جو لوگ رحمٰن کا کفر کرتے ہم ان کے لیے بنا دیتے ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی اور سیڑھیاں بھی جن پر وہ چڑھتے۔''

آیت ۳۴ ﴿وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ﴿۳۴﴾﴾ ''اور ان کے گھروں کے دروازے اور وہ تخت بھی (چاندی کے ہوتے) جن پر وہ تکیے لگا کر بیٹھتے۔''

آیت ۳۵ ﴿وَزُخْرُفًا ؕ﴾ ''اور سونے کی بھی (بنا دیتے)۔''

یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا کی ان چیزوں کی سرے سے کوئی وقعت ہے ہی نہیں۔ اس حوالے سے یہ حدیث نبویؐ قبل ازیں متعدد بار دہرائی جا چکی ہے کہ اگر دنیا و مافیہا کی وقعت اللہ کی نگاہ میں مچھر کے پَر کے برابر بھی ہوتی تو دنیا میں وہ کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ دیتا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا کی دولت اور زیب و زینت کی کوئی اہمیت ہے ہی نہیں' اس لیے وہ تو اپنے سرکش اور نافرمان انسانوں کو بھی طرح طرح کی نعمتوں سے نوازتا رہتا ہے۔

﴿وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ﴾ ''اور یہ سب کچھ تو بس دنیا کی زندگی کا ساز و سامان ہے۔''

کسی کا محل سونے کا ہو یا چاندی کا' وہ اسے اپنے ساتھ قبر میں تو نہیں لے جا سکتا۔ دنیا کا ساز و سامان جو کچھ بھی ہو' جتنا کچھ بھی ہو یہیں اسی دنیا میں چھوڑ کر انسان آخرت کو سدھار جائے گا۔

﴿وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۵﴾﴾ ''اور آخرت (کی کامیابی) آپ کے رب کے نزدیک صرف اہلِ تقویٰ کے لیے ہے۔''

آیات ۳۶ تا ۴۵

وَ مَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴿۳۶﴾ وَ اِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ
السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۷﴾ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكَ بُعْدَ
الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ﴿۳۸﴾ وَ لَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ
مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۹﴾ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِى الْعُمْىَ وَ مَنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۰﴾ فَاِمَّا
نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ﴿۴۱﴾ اَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِيْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ﴿۴۲﴾
فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِيْۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۳﴾ وَ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَ لِقَوْمِكَ ۚ
وَ سَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ
اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴿۴۵﴾ ع

آیت ۳۶ ﴿وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴿۳۶﴾﴾ ''اور جو کوئی منہ پھیر لے رحمٰن کے

ذکر سے اُس پر ہم ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں' تو وہ اس کا ساتھی بنا رہتا ہے۔''

آیت ۳۷ ﴿وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۳۷﴾ ''اور وہ (شیاطین) ان کو روکتے ہیں سیدھے راستے سے' اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں۔''

ایسے لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کی منصوبہ بندی بڑی کامیاب ہے' کاروبار خوب جم رہا ہے' دولت تیزی سے بڑھ رہی ہے' پہلے ایک فیکٹری تھی' پھر دو ہوئیں اور اب تین ہو گئی ہیں۔ وہ اپنی انہی کامیابیوں پر نازاں و فرحاں مسلسل دنیا سمیٹنے میں لگے رہتے ہیں۔

آیت ۳۸ ﴿حَتّٰٓى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ۳۸﴾ ''یہاں تک کہ جب وہ ہمارے پاس آئے گا تو (اپنے ساتھی شیطان سے) کہے گا کہ کاش میرے اور تمہارے درمیان مشرق و مغرب کا فاصلہ ہوتا' تُو تو بہت ہی بُرا ساتھی ہے!''

آیت ۳۹ ﴿وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ۳۹﴾ ''اور جب کہ تم ظلم کرتے رہے ہو تو آج کے دن یہ بات تمہیں کچھ فائدہ نہیں دے گی کہ تم سب عذاب میں شریک ہو۔''

اپنے ظلم کے نتیجے میں تم اور تمہارے شیطان ساتھی جہنّم کا عذاب اکٹھے بھگتو گے' مگر ان شیاطین کا عذاب میں تمہارے ساتھ شریک ہونا تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔ اس سے تمہارے اپنے عذاب میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

آیت ۴۰ ﴿اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِي الْعُمْيَ وَمَنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۴۰﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) کیا آپ بہروں کو سنائیں گے یا آپ اندھوں کو راہ دکھائیں گے' اور ان کو جو کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں!''

آیت ۴۱ ﴿فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ۴۱﴾ ''تو اگر ہم آپ کو لے بھی جائیں' تب بھی ان سے تو ہم انتقام لے کر ہی رہیں گے۔''

اگر ہم آپ کو اپنے پاس بلا لیں تب بھی انہیں تو ان کے جرائم کی سزا مل کر ہی رہے گی۔

آیت ۴۲ ﴿اَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِيْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ۴۲﴾ ''یا (یہ بھی ہو سکتا ہے کہ) ہم آپ کو دکھا دیں وہ کچھ جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے' ہمیں یقیناً ان پر پوری قدرت حاصل ہے۔''

ہم چاہیں تو آپ کی زندگی میں ہی ان پر فیصلہ کن عذاب لے آئیں اور چاہیں تو آپ کے بعد ان پر گرفت کریں۔

آیت ۴۳ ﴿فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِيْٓ اُوْحِيَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۴۳﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ مضبوطی سے تھام لیجیے اس کو جو آپ کی طرف وحی کیا گیا ہے' یقیناً آپ سیدھے راستے پر ہیں۔''

اسی فعل سے اسم الفاعل (مُسْتَمْسِكُوْنَ) اس سے قبل آیت ۲۱ میں مشرکین کے حوالے سے آ چکا ہے کہ کیا ان کے پاس اللہ کی دی ہوئی کوئی کتاب ہے جس کو وہ مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں؟ پھر یہی لفظ نبی اکرم ﷺ کے خطبۂ حجۃ الوداع میں بھی آیا ہے۔ آپ نے فرمایا: ((تَرَكْتُ فِيْكُمْ اَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا : كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ رَسُوْلِهٖ))[1] ''میں آپ لوگوں کے

۱۔ رواہ مالک بن انس مرسلاً فی الموطأ۔ بحوالہ مشکاۃ المصابیح' کتاب الایمان' باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ۔

درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں' اگر تم ان کو مضبوطی سے تھامے رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے' اور وہ ہیں: اللہ کی کتاب اور اُس کے رسول کی سُنّت۔''

آیت ۴۴ ﴿وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ۝۴۴﴾ ''اور یہ (قرآن) آپ کے لیے بھی یاددہانی ہے اور آپ کی قوم کے لیے بھی' اور عنقریب آپ سب سے پوچھ گچھ ہوگی۔''

یہ قرآن گویا آپ کا وظیفہ ہے۔ آپ اسے ہمیشہ پڑھتے رہیے اور آپ کی قوم کی ہدایت وفلاح بھی اسی میں ہے۔

آیت ۴۵ ﴿وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ﴾ ''اور آپ پوچھ لیجیے ان سے جن کو ہم نے آپ سے پہلے بھیجا تھا اپنے رسولوں میں سے''

یعنی عالمِ ارواح میں تو آپ ﷺ کی ملاقات تمام انبیاء ورسل علیہم السلام سے رہی تھی۔ معراج کے موقع پر بھی بیت المقدس میں آپ نے تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی امامت کرائی تھی۔ آپ ان میں سے کسی سے بھی پوچھ لیجیے۔

﴿اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ۝۴۵﴾ ''کیا ہم نے رحمٰن کے سوا کوئی اور بھی ایسے معبود بنائے ہیں کہ جن کی پوجا کی جائے؟''

آپ جس سے بھی پوچھیں گے ایسی کوئی گواہی آپ کو نہیں ملے گی اور نہ ہی کسی نبی کی تعلیمات سے ایسی کسی بات کا کہیں سراغ ملے گا۔

آیات ۴۶ تا ۵۶

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّيْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۴۶ فَلَمَّا
جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ ۝۴۷ وَ مَا نُرِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا ۫ وَ
اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝۴۸ وَ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ
عِنْدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ۝۴۹ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ۝۵۰ وَ نَادٰى فِرْعَوْنُ
فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا
تُبْصِرُوْنَ ۝۵۱ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ۬ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ۝۵۲ فَلَوْلَاۤ اُلْقِيَ عَلَيْهِ
اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ۝۵۳ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا
قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝۵۴ فَلَمَّاۤ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۵۵ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّ مَثَلًا
لِّلْاٰخِرِيْنَ ۝۵۶ ع

آیت ۴۶ ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ﴾ ''اور ہم نے بھیجا تھا موسیٰؑ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اُس کے سرداروں کی طرف''

ان سے مراد وہ ابتدائی نشانیاں ہیں جنہیں لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے دربار میں گئے تھے' یعنی عصا اور یدِ بیضا۔

﴿فَقَالَ اِنِّیْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۶﴾﴾ ''تو اُس نے کہا کہ (دیکھو) میں تمام جہانوں کے پروردگار کا بھیجا ہوا ہوں۔''

آیت ۴۷ ﴿فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰیٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا یَضْحَكُوْنَ ﴿۴۷﴾﴾ ''تو جب وہ آیا ان کے پاس ہماری نشانیاں لے کر تو وہ ان (نشانیوں) پر ہنسنے لگے۔''

آیت ۴۸ ﴿وَمَا نُرِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ اِلَّا هِیَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا﴾ ''اور نہیں دکھاتے تھے ہم انہیں کوئی نشانی مگر وہ اپنی بہن (اپنے جیسی پہلی نشانی) سے زیادہ بڑی ہوتی تھی''

یعنی ہم ان کو ایک سے ایک بڑھ کر نشانیاں دکھاتے رہے۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی مزید سات نشانیوں کی طرف اشارہ ہے۔ ان میں ایک بہت بڑی نشانی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں سے مقابلہ تھا' جس میں شکست کھا کر وہ ایمان لے آئے۔ مزید برآں مصر میں شدید قحط' ہولناک طوفانِ باد و باراں' ٹڈی دل کا خوفناک حملہ' چیچڑیوں اور کھٹملوں کی بہتات' مینڈکوں کا اُمڈا ہوا سیلاب' کنوؤں اور چشموں کے پانی کا خون میں تبدیل ہو جانا' ایسی نشانیاں تھیں جن کا ظہور یکے بعد دیگرے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیشگی اعلان کے بعد ہوتا اور آنے والی آفت اُس وقت تک نہ ٹلتی جب تک حضرت موسیٰ علیہ السلام اُسے ٹالنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا نہ کرتے۔ ان نشانیوں کا ذکر سورۃ الاعراف کے سولہویں رکوع میں ہوا ہے۔

﴿وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۴۸﴾﴾ ''اور ہم انہیں پکڑتے رہے اس عذاب کے ذریعے' شاید کہ وہ باز آ جائیں۔''

یہ اللہ تعالیٰ کا ایک خاص اصول اور قانون ہے کہ لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے بڑے عذاب سے پہلے ان پر چھوٹے چھوٹے عذاب بھیجے جاتے ہیں۔ اس اصول کا ذکر سورۃ السجدۃ میں اس طرح ہوا ہے: ﴿وَلَنُذِیْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰی دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''اور ہم لازماً چکھائیں گے انہیں مزہ چھوٹے عذاب کا بڑے عذاب سے پہلے' شاید کہ یہ لوگ پلٹ آئیں''۔ نوٹ کیجیے ان دونوں آیات کے اختتامی الفاظ ایک سے ہیں۔

آیت ۴۹ ﴿وَقَالُوْا یٰۤاَیُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ﴾ ''اور (ہر عذاب کے موقع پر) وہ کہتے: اے جادوگر! تم اپنے رب سے ہمارے لیے دعا کرو اُس عہد کی بنا پر جو اُس نے تم سے کر رکھا ہے۔''

سورۃ الاعراف میں یہ واقعات تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ جب وہ لوگ ایک عذاب سے تنگ آ جاتے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دعا کی درخواست کرتے اور وعدہ کرتے کہ اگر ہماری یہ تکلیف دور ہو گئی تو:

﴿اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۳۴﴾﴾ ''ہم ضرور ہدایت پر آ جائیں گے۔''

سورۃ الاعراف میں ان کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ﴿لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۱۳۴﴾﴾ ''اگر تم نے ہم سے اس عذاب کو ہٹا دیا تو ہم لازماً تمہاری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو بھی لازماً تمہارے ساتھ بھیج دیں گے۔''

آیت ۵۰ ﴿فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ یَنْكُثُوْنَ ﴿۵۰﴾﴾ ''پھر جب ہم دُور کر دیتے تھے ان سے وہ عذاب تو اُسی وقت وہ وعدے سے پھر جاتے تھے۔''

آیت ۵۱ ﴿وَنَادٰی فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ﴾ ''اور فرعون نے اپنی قوم میں ڈھنڈورا پٹوادیا''

﴿قَالَ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ﴾ ''اُس نے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! کیا مصر کی حکومت میری نہیں ہے؟''

نوٹ کیجیے! یہ سیاسی شرک' شرک کی بدترین قسم ہے۔ حاکمیت صرف اللہ کی ہے' اس کے علاوہ جو کوئی بھی حاکمیت کا مدعی ہو' چاہے وہ ایک فرد ہو' ایک قوم ہو یا پوری نسل انسانی' وہ اللہ کے ساتھ برابری کا دعویدار ہے۔ اور فرعون نے خدائی کا دعویٰ اسی مدعیت کے ساتھ اور اسی مفہوم میں کیا تھا' ورنہ وہ زمین و آسمان کے خالق ہونے کا دعویدار تو ہرگز نہیں تھا۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ جس طرح تمام انسان پیدا ہوتے ہیں وہ بھی اسی طرح پیدا ہوا ہے اور سب کی نظروں کے سامنے پلا بڑھا ہے۔ چنانچہ اُس کے خدائی کے دعوے کی اصل حقیقت یہی تھی کہ وہ حاکمیتِ مُطلَقہ کا دعویدار تھا' جو کہ صرف اور صرف اللہ کا حق ہے۔

Divine Rights of the Kings کا ذکر آپ کو اہلِ یورپ کی تاریخ میں بھی ملے گا۔ ان کے ہاں بھی قدیم زمانے سے یہ تصور چلا آ رہا ہے کہ بادشاہوں کو خدائی اختیارات حاصل ہیں' ان کا اختیار مطلق ہے' وہ final legislative authority ہیں۔ ان کی مرضی ہے وہ جو چاہیں قانون بنا دیں۔ جبکہ یہ سوچ اور یہ دعویٰ بدترین شرک ہے' جسے اہلِ یورپ نے دورِ حاضر میں جمہوریت کے نام سے عوام الناس میں تقسیم کر دیا ہے۔ چنانچہ جو گندگی کسی زمانے میں فرعون یا نمرود کے سر پر ٹنوں کے حساب سے لدی ہوتی تھی اسے انہوں نے تولوں اور ماشوں میں تقسیم کر کے اپنے ہر شہری کی جیب میں ڈال دیا ہے' کہ یہ لو ووٹ کی اس پرچی کے بل پر اب تم میں سے ہر ایک حکومت میں حصہ دار ہے۔ اب تم اپنی اکثریت کے ذریعے جو قانون چاہو بنا لو۔ علامہ اقبال نے اپنی نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں اس شیطانی فریب کو خوب بے نقاب کیا ہے۔ ابلیس کا ایک مشیر (اقبال کے الفاظ میں) دوسرے مشیر سے کہتا ہے: ؎

خیر ہے سلطانیٔ جمہور کا غوغا کہ شر؟ تُو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر!

کہ اب دنیا میں سلطانیٔ جمہور (عوام کی حکمرانی) کے نام پر جو شور و غوغا اٹھا ہے وہ ابلیسی نظام کے لیے ایک بہت بڑا فتنہ اور خطرہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسان ہمارے سب ہتھکنڈوں کا توڑ ڈھونڈنے پر تُلا بیٹھا ہے۔ اگر انسانوں کا بنایا ہوا عوامی حاکمیت کا یہ سکّہ دنیا میں چل گیا تو ہمارا کاروبار تو ٹھپ ہو کر رہ جائے گا۔ اس کی اس بات پر دوسرا مشیر کہتا ہے: ؎

ہوں' مگر میری جہاں بینی بتاتی ہے مجھے جو ملوکیت کا اک پردہ ہو کیا اس سے خطر!

کہ میں اس ''فتنے'' کی اصلیت سے خوب باخبر ہوں' بہرحال تشویش کی کوئی بات نہیں۔ یہ جمہوریت بھی ملوکیت ہی کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے: ؎

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر!

اصل میں جب ہم نے دیکھا کہ انسان اپنے ''بنیادی حقوق'' کے بارے میں کچھ زیادہ ہی حساس ہوتا چلا جا رہا ہے تو ہم نے ''شاہی'' کو ''جمہوری'' لباس پہنا کر اس کے سامنے لا کھڑا کیا ہے کہ لو بھئی اب تو تمہارا عام شخص بھی حاکم بن گیا ہے' اب تو ہر شہری کو شاہی اختیار میں سے برابر کا حصہ مل گیا ہے۔ لہٰذا سلطانیٔ جمہور کا یہ شوشہ ہماری ''ابلیسیت'' کے لیے کوئی خطرہ نہیں بلکہ ہمارا اپنا ہی تیار کردہ منصوبہ ہے۔

ملوکیت اور جمہوریت کی حقیقت کو اس مثال سے سمجھنا چاہیے کہ گندگی تو گندگی ہی ہے چاہے ٹنوں کے حساب سے کسی ایک شخص کے سر پر لاد دی جائے یا ایک کروڑ انسانوں میں تولہ تولہ ماشہ ماشہ تقسیم کر دی جائے۔ چنانچہ فرعون کو اسی ''خدائی'' کا دعویٰ تھا اور اس

نے اپنی ''خدائی'' کا ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے اعلان کیا کہ لوگو! دیکھو کیا مصر کی حکومت میرے قبضے میں نہیں ہے؟

﴿وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ﴾ ''اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟''

اس فقرے کا مفہوم ہمارے ہاں عام طور پر یوں سمجھ لیا جاتا ہے جیسے فرعون نے اپنے محل کے نیچے بہنے والے دریا کا ذکر کیا تھا جبکہ اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ ملک کے اندر آب پاشی کا پورا نظام جس پر تمہاری معیشت کا انحصار ہے' میرے حکم کے تابع ہے۔ میں جسے چاہوں اور جس قدر چاہوں پانی مہیا کروں۔ جس کو چاہوں کم پانی دوں' جس کو چاہوں زیادہ دوں اور جسے چاہوں پانی سے محروم کر دوں' مجھے کوئی روکنے والا نہیں ہے۔

﴿اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۱﴾﴾ ''تو کیا تم دیکھتے نہیں؟''

آیت ۵۲ ﴿اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ﴾ ''کیا میں بہتر نہیں ہوں اس سے جو ایک بے عزّت آدمی ہے؟''

میں مصر کی حکومت اور اس کے معاشی وسائل کا بلاشرکتِ غیرے مالک ہوں۔ کیا یہ موسیٰ میرا مقابلہ کر سکتا ہے جو محض ہماری محکوم قوم کا ایک فرد ہے!

﴿وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ﴿۵۲﴾﴾ ''اور صاف بات بھی نہیں کر سکتا!''

یہ خطابت پر بھی قادر نہیں ہے اور اپنا مدعا واضح طور پر بیان نہیں کر سکتا۔

آیت ۵۳ ﴿فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ﴾ ''تو کیوں نہیں اتارے گئے اس پر سونے کے کنگن؟''

اگر یہ واقعی اللہ کا فرستادہ ہے تو اللہ نے اسے سونے کے کنگن کیوں نہ مہیا کیے کہ ایک بادشاہ کے مقابلے میں جا رہا ہے' کم از کم یہ سونے کے کنگن ہی پہنتے جاؤ۔

﴿اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ﴿۵۳﴾﴾ ''یا اس کے ساتھ فرشتے چلے آ رہے ہوتے صفیں باندھے ہوئے!''

آیت ۵۴ ﴿فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ۭ﴾ ''تو (اس طرح) اُس نے اپنی قوم کی مت ماردی اور انہوں نے اُسی کا کہنا مانا۔''

یہاں پر لفظ اِسۡتَخَفَّ بہت اہم اور معنی خیز ہے۔ لغوی اعتبار سے اس کا مفہوم یہ ہے کہ اُس نے ان کو بالکل ہی خفیف اور ہلکا سمجھا۔ مراد یہ ہے کہ اُس نے اُن کی عقل ہی گنوا دی' ان کو بے وقوف بنا لیا۔ اسی طرح آج کے سیاسی شعبدہ باز (demagogs) اپنے عوام کو نت نئے طریقوں سے بے وقوف بناتے ہیں۔ کوئی ان کے سامنے روٹی کپڑا اور مکان کی ڈگڈگی بجاتا ہے تو کوئی اس مقصد کے لیے کسی دوسرے نعرے کا سہارا لیتا ہے۔ بقول اقبال ابلیس کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ میں جب چاہوں ہر قسم کے انسانوں کو بے وقوف بنا سکتا ہوں: ؎

کیا امامانِ سیاست' کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہُو!

چنانچہ جب ابلیس یا ابلیس کا کوئی چیلہ عوام الناس کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر وہ اندھوں کی طرح اپنے ''محبوب لیڈر'' کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ پھر نہ تو وہ سامنے کے حقائق کو دیکھتے ہیں اور نہ ہی کسی علمی و عقلی دلیل کو لائقِ توجہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح فرعون نے بھی اپنے اقتدار کے رعب و داب کی ڈگڈگی بجا کر اپنی قوم کو ایسا متاثر کیا کہ وہ آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے ہو لیے۔ یہاں فَاَطَاعُوْهُ کے لفظ میں ان کے اسی رویّے کی عکاسی کی گئی ہے۔

﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۴﴾﴾ ''یقیناً وہ لوگ خود بھی نافرمان ہی تھے۔''

آیت ۵۵ ﴿فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۵﴾﴾ ''تو جب انہوں نے ہمیں غُصّہ دلایا تو ہم نے ان سے انتقام لیا' پس ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔''

آیت ۵۶ ﴿فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ﴿۵۶﴾﴾ ''چنانچہ ہم نے انہیں بنا دیا ماضی کی داستان اور بعد والوں کے لیے ایک نشانِ عبرت۔''

آیات ۵۷ تا ۶۵

وَ لَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ﴿۵۷﴾ وَ قَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ؕ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ﴿۵۸﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَ جَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۵۹﴾ وَ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۱﴾ وَ لَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۶۲﴾ وَ لَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَ لِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۶۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۴﴾ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿۶۵﴾

آیت ۵۷ ﴿وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ﴿۵۷﴾﴾ ''اور جب (قرآن میں) ابنِ مریم کی مثال بیان کی جاتی ہے تو اس پر آپ کی قوم چلّانے لگتی ہے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر پر مشرکینِ مکّہ کی چیخ و پکار ایک تو سورۃ الانبیاء کی اس آیت کے حوالے سے تھی: ﴿اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿۹۸﴾﴾ ''یقیناً تم لوگ اور جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو سب جہنّم کا ایندھن ہیں۔ تمہیں اس میں پہنچ کر رہنا ہے''۔ وہ کہتے تھے کہ اللہ کے سوا جتنے معبود لوگوں نے بنا رکھے ہیں اگر وہ سب جہنّم کا ایندھن بنیں گے تو پھر عیسیٰؑ بھی تو ان ہی میں شامل ہوں گے' کیونکہ انہیں بھی تو دُنیا میں پوجا گیا ہے۔ حالانکہ اللہ کے مقابلے میں اگر فرشتوں' اللہ کے مقرب بندوں' جنّات اور بُتوں وغیرہ کی پرستش کی گئی ہے تو جہنّم میں جھونکے جانے کا مصداق ملائکہ' انبیاء اور اولیاء اللہ تو نہیں ٹھہرتے۔ ظاہر ہے جو باطل ہوگا وہی جہنّم میں جھونکا جائے گا۔ البتہ مشرکینِ مکّہ اسی دلیل کی بنیاد پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر پر شدّت کے ساتھ چیخنا چلّانا شروع کر دیتے تھے۔

دوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر پر مشرکینِ مکّہ کے مخصوص ردِّ عمل کا باعث ان کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں یہ موقف بھی تھا کہ آپؐ حضرت عیسیٰؑ کی تعریف و توصیف کے پردے میں نصرانیت کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ اس حوالے سے ان کا دعویٰ یہ تھا کہ جس

طرح ہم لات وعزیٰ وغیرہ کی پوجا کرتے ہیں اسی طرح عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو پوجتے ہیں۔ تو ایسا کیوں ہے کہ عیسائیوں کے معبود کی تو آپ تعریف کرتے ہیں اور ہمارے معبودوں کی مذمت؟ اس وجہ سے وہ لوگ حضور ﷺ پر عیسائیت کو قبول کر لینے اور عیسائیت کی تبلیغ کرنے کے الزامات لگاتے تھے۔ بلکہ جب مکہ میں مسلمانوں نے نماز پڑھنا شروع کی تو مشرکینِ مکہ نے حضور ﷺ اور مسلمانوں پر یہ الزام بھی لگا دیا کہ یہ لوگ ''صابی'' ہو گئے ہیں۔ صابی لوگ عراق میں آباد تھے اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے پیروکاروں کی نسل میں سے تھے۔ اگرچہ انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اصل دین کو تو بگاڑ دیا تھا لیکن ''نماز'' کسی نہ کسی شکل میں ان کے ہاں موجود تھی۔ چنانچہ نماز کی اس مشابہت کے باعث مشرکینِ مکہ نے حضور ﷺ پر صابی ہونے کا الزام بھی لگایا تھا۔ بہرحال مذکورہ دو وجوہات کی بنا پر مشرکینِ مکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر پر شدید ردِّ عمل کا اظہار کرتے تھے۔

آیت ۵۸ ﴿وَقَالُوْٓاءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ۭ﴾ ''اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ؟''

﴿مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ۭ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ۝۵۸﴾ ''یہ باتیں وہ آپ سے نہیں کرتے مگر صرف جھگڑنے کو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہیں ہی جھگڑالو لوگ۔''

آیت ۵۹ ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۝۵۹﴾ ''وہ تو بس ہمارا ایک بندہ تھا جس پر ہم نے خاص انعام فرمایا اور ہم نے اُس کو ایک نشانی بنا دیا بنی اسرائیل کے لیے۔''

بنی اسرائیل کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بہت سی نشانیاں تھیں۔ آپؑ بن باپ کے پیدا ہوئے اور اپنی پیدائش کے فوراً بعد پنگھوڑے میں ہی آپؑ نے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ اس کے علاوہ آپ کو خلقِ حیات اور احیاءِ موتیٰ سمیت اور بھی بہت سے معجزات عطا ہوئے تھے۔

آیت ۶۰ ﴿وَلَوْ نَشَاۗءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰۗىِٕكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ۝۶۰﴾ ''اور اگر ہم چاہیں تو تم میں سے فرشتے بنا دیں جو زمین میں تمہارے جانشین ہوں۔''

آیت ۶۱ ﴿وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ﴾ ''اور یقیناً وہ قیامت کی ایک علامت ہے''

یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے ورودِ اوّل میں بنی اسرائیل کے لیے نشانی یعنی مجسم معجزہ تھے' جبکہ اپنے ورودِ ثانی میں آپؑ کا نزول قیامت کی علاماتِ کبریٰ میں سے ہوگا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول اور قُربِ قیامت کے زمانے کی کیفیت احادیث میں تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔

﴿فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝۶۱﴾ ''تو اس (قیامت) کے بارے میں تم ہرگز شک نہ کرو اور میری پیروی کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔''

آیت ۶۲ ﴿وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۶۲﴾ ''اور (دیکھو) شیطان تمہیں روک نہ دے' بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔''

یعنی ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں اس صراطِ مستقیم کی پیروی سے روک دے جس کی طرف میں بلا رہا ہوں۔ یہ مت بھولو کہ شیطان اس صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے والوں کا کھلا دشمن ہے اور انہیں گمراہ کرنے کے لیے ہر طرح کے حربے آزماتا ہے۔

آیت ۶۳ ﴿وَلَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ﴾ ''اور جب آئے عیسیٰؑ واضح نشانیاں لے کر تو انہوں نے کہا کہ میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں''

یہاں پر ''حکمت'' کا لفظ بہت اہم ہے۔ اس حوالے سے قبل ازیں بھی بتایا جا چکا ہے کہ انجیل میں ''کتاب'' (شریعت) نہیں تھی' صرف حکمت تھی' جبکہ تورات ''کتاب'' پر مشتمل تھی۔ اس میں احکامِ شریعت تو تھے' حکمت نہیں تھی۔ دراصل نزولِ تورات کے زمانے میں نسلِ انسانی کا اجتماعی شعور ابھی اس قابل نہیں ہوا تھا کہ انہیں حکمت کی تلقین کی جاتی۔ اس لیے اس میں صرف احکام (commandments) دے دیے گئے تھے کہ یہ کرو اور یہ مت کرو۔ یعنی صرف اوامر و نواہی (do's and don'ts) کا ذکر کیا گیا تھا۔ حکمت کے لیے بعد میں انجیل آئی۔ البتہ قرآن میں کتاب (شریعت) بھی ہے اور حکمت بھی ہے۔ یعنی آخری کتاب ہونے کے حوالے سے یہ ماسبق تمام کتابوں کی جامع ہے۔

﴿وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝۶۳﴾ ''اور تاکہ میں واضح کر دوں تمہارے لیے بعض وہ چیزیں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو' پس تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔''

آیت ۶۴ ﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝۶۴﴾ ''یقیناً اللہ ہی ہے جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے' پس تم اُسی کی بندگی کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔''

آیت ۶۵ ﴿فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ﴾ ''پھر ان میں سے کئی گروہ باہم اختلافات میں مبتلا ہو گئے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں دو بڑے گروہوں کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ یہودی آپؑ کی مخالفت میں اس حد تک چلے گئے کہ انہوں نے آپؑ کو جادوگر' مرتد اور ولد الزنا (نقلِ کفر' کفر نباشد) قرار دے دیا۔ ان کے مقابلے میں عیسائیوں نے دوسری انتہا پر جا کر آپؑ کو (نعوذ باللہ) اللہ کا بیٹا بنا دیا اور آپؑ کے بارے میں یہ عقیدہ بھی گھڑ لیا کہ آپؑ اپنے نام لیواؤں کی طرف سے خود سولی پر چڑھ گئے ہیں اور یوں آپؑ کی یہ ''قربانی'' آپؑ کے ہر ماننے والے کے گناہوں کا کفارہ بن گئی ہے۔ بہرحال یہ دونوں رویے انتہائی غلط ہیں۔

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ۝۶۵﴾ ''پس تباہی اور بربادی ہے ان ظالموں کے لیے ایک دردناک دن کے عذاب سے۔''

آیات ۶۶ تا ۸۹

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۶۶ اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَىِٕذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ۝۶۷ يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۝۶۸ اَلَّذِيْنَ ع ۱۲
اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝۶۹ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ۝۷۰ يُطَافُ عَلَيْهِمْ
بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ ۚ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَاَنْتُمْ فِيْهَا

خٰلِدُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْۤ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۲﴾ لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ
مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۳﴾ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَ هُمْ فِيْهِ
مُبْلِسُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۶﴾ وَ نَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا
رَبُّكَ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ﴿۷۷﴾ لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۸﴾ اَمْ
اَبْرَمُوْۤا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ ﴿۷۹﴾ اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰىهُمْ ؕ بَلٰى وَ
رُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۸۰﴾ قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ سُبْحٰنَ
رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَ يَلْعَبُوْا حَتّٰى
يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۸۳﴾ وَ هُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ؕ وَ هُوَ
الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۴﴾ وَ تَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ۚ وَ عِنْدَهٗ
عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۵﴾ وَ لَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ
شَهِدَ بِالْحَقِّ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾ وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۸۷﴾
ع ۱۳ وَ قِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَ قُلْ سَلٰمٌ ؕ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

آیت ۶۶ ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۶﴾﴾ ''یہ لوگ کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں سوائے قیامت کے کہ وہ آ جائے ان پر اچانک اور انہیں خبر بھی نہ ہو!''

آیت ۶۷ ﴿اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۷﴾﴾ ''بہت گہرے دوست اُس دن ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے' سوائے متقین کے۔''

دنیا کی تمام دوستیاں اُس دن دشمنیوں میں بدل جائیں گی' سوائے مؤمنینِ صادقین کی باہمی دوستیوں کے۔

آیت ۶۸ ﴿يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَاۤ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۶۸﴾﴾ ''(اُن سے کہا جائے گا:) اے میرے بندو! آج تم پر نہ تو کوئی خوف ہے اور نہ ہی تم رنجیدہ ہو گے۔''

آیت ۶۹ ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿۶۹﴾﴾ ''یعنی وہ لوگ جو ہماری آیات پر ایمان لائے اور فرماں بردار تھے۔''

آیت ۷۰ ﴿اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ﴿۷۰﴾﴾ ''داخل ہو جاؤ جنّت میں تم بھی اور تمہاری بیویاں بھی' تمہارا اعزاز و اکرام کیا جائے گا۔''

آیت ۷۱ ﴿يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّ اَكْوَابٍ ۚ﴾ ''گردش کرائے جائیں گے ان پر سونے کی طشتریاں اور پیالے۔''

﴿وَ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَ تَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَ اَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۷۱﴾﴾ ''اور وہاں ہو گا وہ سب کچھ جس کی

طلب ہوگی انسان کے نفس کو اور جس سے نگاہیں لذت حاصل کریں گی' اور تم اب اس میں ہمیشہ ہمیش رہو گے۔''

جنت کے پھول' باغیچے' مناظر اور اہلِ جنت کی بیویاں غرض وہاں کی ہر چیز انتہائی حسین اور دلکش ہوگی۔

آیت ۷۲ ﴿وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۷۲﴾ ''اور یہ وہ جنت ہے جس کے تم وارث بنائے گئے ہو اُن اعمال کی بنا پر جو تم کرتے تھے۔''

یعنی جنت میں تمہارا داخلہ اور اس کی تمام نعمتیں تمہارے نیک اعمال کا بدلہ ہیں جو تم دنیا میں کرتے رہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کی قدردانی اور قدر افزائی کا ایک شاہانہ انداز ہے جو قرآن میں جا بجا ملتا ہے۔ دوسری طرف بندوں کے اس اعتراف کا ذکر بھی قرآن میں تکرار کے ساتھ آیا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت کا نتیجہ ہے۔ اس ضمن میں اہلِ جنت کا اعتراف سورۃ الاعراف میں بایں الفاظ نقل ہوا ہے: ﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۣ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ﴾ (آیت ۴۳) ''اور وہ کہیں گے کُل شکر اور کُل تعریف اُس اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں یہاں تک پہنچایا' اور ہم خود سے یہاں تک نہیں پہنچ سکتے تھے اگر اللہ ہی نے ہمیں نہ پہنچا دیا ہوتا۔''

آیت ۷۳ ﴿لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝۷۳﴾ ''اس میں تمہارے لیے بکثرت پھل موجود ہیں جن میں سے تم کھاتے ہو۔''

آیت ۷۴ ﴿اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۝۷۴﴾ ''(اس کے برعکس) جو مجرم ہوں گے وہ جہنم کے عذاب میں ہمیشہ رہیں گے۔''

آیت ۷۵ ﴿لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ۝۷۵﴾ ''وہ ان سے ہلکا نہ کیا جائے گا اور وہ اسی میں پڑے رہیں گے بالکل ناامید ہو کر۔''

انہیں جہنم سے چھٹکارا پانے کا کوئی امکان نظر نہیں آئے گا۔

آیت ۷۶ ﴿وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ ۝۷۶﴾ ''اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔''

آیت ۷۷ ﴿وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۭ﴾ ''اور وہ ندا کریں گے کہ اے مالک! اب تو آپ کا رب ہمارا کام ہی تمام کر دے۔''

مالک سے یہاں مراد جہنم کا داروغہ ہے۔ اہلِ جہنم اسے مخاطب کر کے فریاد کریں گے کہ اب ہم سے عذاب کی سختی مزید نہیں جھیلی جاتی۔ آپ اپنے رب سے کہیں کہ وہ ہمیں موت دے کر ہمارا قصہ تمام کر دے۔

﴿قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ۝۷۷﴾ ''وہ جواب دے گا کہ تمہیں تو اب ہمیشہ (یہیں) رہنا ہے۔''

آیت ۷۸ ﴿لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ۝۷۸﴾ ''ہم تو تمہارے پاس حق لے کر آئے تھے لیکن تمہاری اکثریت حق کو ناپسند کرتی ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے ذریعے تمہارے پاس سچا دین اور سچی تعلیمات پہنچادی تھیں' لیکن تم میں سے اکثر لوگ حق سے بیزار ہی رہے' جس کا نتیجہ آج تمہارے سامنے ہے۔

آیت ۷۹ ﴿اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ ﴿۷۹﴾﴾ ''کیا انہوں نے کوئی قطعی فیصلہ کر لیا ہے؟ تو ہم بھی ایک قطعی فیصلہ کیے لیتے ہیں۔''

حق و باطل کی اس کشمکش میں مشرکینِ مکہ نے اگر حق کو نہ ماننے کا ہی فیصلہ کر لیا ہے تو پھر ہم بھی ان کے بارے میں فیصلہ کر لیتے ہیں۔

آیت ۸۰ ﴿اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ ۭ﴾ ''کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی خفیہ باتوں اور رازدارانہ مشوروں کو سنتے نہیں ہیں!''

﴿بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۸۰﴾﴾ ''کیوں نہیں (ہم سب کچھ سن رہے ہیں) اور ہمارے ایلچی ان کے پاس ہی لکھ رہے ہوتے ہیں۔''

ہماری خفیہ ایجنسی کے کارندے ہر وقت چوکنا رہتے ہیں اور لحہ بہ لحہ ساری رپورٹ تیار کرتے ہیں۔

آیت ۸۱ ﴿قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۱﴾﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ ان سے کہیے کہ اگر رحمٰن کا کوئی بیٹا ہوتا تو سب سے پہلا اس کی عبادت کرنے والا میں ہوتا۔''

کہ جب میں خدائے رحمٰن کو اپنا معبود مانتا ہوں اور اس کی پرستش کرتا ہوں' اگر واقعتاً اس کا کوئی بیٹا ہوتا تو اس کی پرستش کرنے میں مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ یہ نفی کا بہت تیکھا انداز ہے۔ اس اسلوب کو ''تعلیق بالمحال'' کہا جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ نہ تو اللہ تعالیٰ کی کوئی اولاد ہے اور نہ ہی ایسا ہونے کا کوئی امکان ہے' اس لیے اس کی اولاد کو پوجنے کا بھی کوئی امکان نہیں۔ ''تعلیق بالمحال'' کا یہی اسلوب اس حدیث میں بھی پایا جاتا ہے: ((لَوْ عَاشَ اِبْرَاهِيْمُ لَكَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا))[۲] ''اگر ابراہیم زندہ رہتا تو وہ صدیق نبی ہوتا۔''

ایک دفعہ ٹورنٹو (کینیڈا) میں ایک قادیانی نے میرے ساتھ بحث کے دوران نبوت کے تسلسل کو ثابت کرنے کے لیے اسی حدیث کا حوالہ دیا تھا۔ اس حدیث میں حضور ﷺ کے بیٹے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے' جو حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے پیدا ہوئے اور بچپن میں ہی فوت ہو گئے۔ ان کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر وہ زندہ رہتے تو وہ نبی ہوتے۔ اللہ کی مشیت کے مطابق ان کے زندہ رہنے کا کوئی امکان نہیں تھا' اس لیے نہ تو انہوں نے زندہ رہنا تھا اور نہ ہی نبوت کے سلسلے کو آگے چلنا تھا۔ بہرحال مذکورہ قادیانی نے اس حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ نبوت ختم نہیں ہوئی۔ میں نے اس کے جواب میں دلیل کے طور پر اسی آیت کا حوالہ دیا تھا: ﴿قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ۝﴾ کہ یہاں جو حضور ﷺ سے کہلوایا جا رہا ہے کہ اگر رحمٰن کا کوئی بیٹا ہوتا تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرنے والا ہوتا۔ تو کیا حضور ﷺ کا اللہ کے علاوہ کسی اور کو پوجنے کا کچھ بھی امکان تھا؟ اس پر اس نے تسلیم کیا کہ آپ کی یہ دلیل واقعتاً مضبوط ہے۔

آیت ۸۲ ﴿سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۸۲﴾﴾ ''پاک ہے آسمانوں اور زمین کا رب'

۲۔ صحیح الجامع الصغیر للالبانی' ح: ۵۲۷۲۔ عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ۔

عرش کا مالک' ان تمام چیزوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔''

آیت ۸۳ ﴿فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ ان کو چھوڑ دیجئے' یہ مین میخ نکالتے رہیں اور لہو و لعب میں پڑے رہیں''

﴿حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ۝۸۳﴾ ''یہاں تک کہ یہ ملاقات کر لیں اپنے اُس دن سے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔''

آیت ۸۴ ﴿وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۝۸۴﴾ ''اور وہی ہے جو آسمان میں بھی الٰہ ہے اور زمین میں بھی الٰہ ہے۔ اور وہ بہت حکمت والا' ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

یعنی پوری کائنات میں ہر جگہ اُسی کا اقتدار ہے۔ بائبل میں عیسائیوں کی جو Lord's Prayer ہے اس کا مفہوم اس آیت کے بہت قریب ہے:

Thy Kingdom come
Thy will be done on Earth as it is in Heavens

کہ اے اللہ! تیری ہی سلطنت اور تیری حاکمیت قائم ہو جائے اور تیری مرضی جیسے آسمانوں پر پوری ہو رہی ہے ویسے ہی زمین پر بھی پوری ہو۔ بہر حال الٰہ تو آسمانوں میں بھی وہی ہے اور زمین پر بھی وہی ہے۔ لیکن زمین پر انسانوں کو اس نے تھوڑی سی آزادی دے رکھی ہے کہ اگر کوئی انسان چاہے تو وہ نافرمانی اور ناشکری کی روش بھی اختیار کر سکتا ہے۔ بس زمین پر جو بھی فساد نظر آ رہا ہے وہ اس ''ذرا سی'' آزادی کا نتیجہ ہے۔ سورۃ الروم کی اس آیت میں یہی حقیقت بیان کی گئی ہے: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ﴾ (آیت ۴۱) چنانچہ بحر و بر میں اگر ہر جگہ فساد ہی فساد نظر آتا ہے تو وہ لوگوں کے کرتوتوں کے سبب ہے' ورنہ حکومت تو زمین پر بھی اللہ ہی کی ہے۔

آیت ۸۵ ﴿وَتَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ﴾ ''اور بہت بابرکت ہے وہ ذات جس کے اختیار میں ہے بادشاہی آسمانوں کی اور زمین کی اور ان دونوں کے درمیان کی ساری چیزوں کی۔''

فرعون کا خدائی کا دعویٰ تو صرف مصر کی حکومت تک محدود تھا' مگر اللہ کی حکومت واقعتاً آسمانوں اور دنیا و مافیہا پر محیط ہے۔

﴿وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۸۵﴾ ''اور اُسی کے پاس ہے قیامت کا علم' اور اُسی کی طرف تم لوٹا دیے جاؤ گے۔''

آیت ۸۶ ﴿وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۸۶﴾ ''اور کوئی اختیار نہیں رکھتے کسی بھی شفاعت کا جن کو یہ پکار رہے ہیں اللہ کے سوا' سوائے اُس کے کہ جو حق کی گواہی دیں اور وہ جانتے ہوں۔''

ظاہر بات ہے وہاں تو کوئی غلط بات زبان سے نہیں نکال سکے گا' لہٰذا وہاں پر گواہی صرف حق ہی کی ہو گی۔

آیت ۸۷ ﴿وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ ''اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ ان کو کس نے پیدا کیا تو کہیں گے اللہ نے!''

یعنی اگر آپ ﷺ ان سے پوچھیں کہ خود ان کو کس نے پیدا کیا ہے تو کہیں گے کہ اللہ نے۔ اس فقرے کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ اگر آپؐ ان سے ان کے معبودوں کے بارے میں پوچھیں کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے تو بھی وہ جواب میں کہیں گے کہ انہیں بھی اللہ نے ہی بنایا ہے۔

﴿فَاَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ ﴿۸۷﴾﴾ ''تو پھر یہ کہاں سے پھیر دیے جاتے ہیں!''

آیت ۸۸ ﴿وَقِیْلِهٖ یٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾﴾ ''اور قسم ہے نبی (ﷺ) کے اس قول کی کہ اے میرے رب! یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان نہیں لا رہے۔''

یہ اللہ تعالیٰ کے حضور فریاد کا انداز ہے جو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یہاں نقل ہوا ہے کہ اے میرے پروردگار! میری یہ قوم ہٹ دھرمی اور ضد پر اتر آئی ہے۔ نہ تو یہ لوگ میری باتوں کو سنتے ہیں اور نہ ہی بطور نبی کے میری تصدیق کرنے کو تیار ہیں۔

آیت ۸۹ ﴿فَاصْفَحْ عَنْهُمْ﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ ان سے درگزر کیجیے''

میرے خیال کے مطابق یہ سورۃ ۴ نبویؐ سے ۸ نبویؐ کے درمیانی عرصے میں نازل ہوئی ہے۔ اس وقت تک چونکہ حضور ﷺ کی دعوت کو شروع ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا' اس لیے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ ان کی طرف سے اپنا رُخ پھیر لیں اور فی الحال انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں۔

﴿وَقُلْ سَلٰمٌ ؕ﴾ ''اور کہیے سلام ہے!''

اگر یہ لوگ آپ ﷺ سے اُلجھتے ہیں' دعوت کے جواب میں آپؐ سے استہزاء کرتے ہیں تو آپؐ ان کو سلام کہہ کر نظر انداز کر دیں۔ سورۃ الفرقان میں ہم نے ''عباد الرحمٰن'' کی جو صفات پڑھی ہیں ان میں ایک صفت یہ بھی ہے: ﴿وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾﴾ ''اور جب ان سے مخاطب ہوتے ہیں جاہل لوگ تو وہ ان کو سلام کہہ دیتے ہیں۔''

﴿فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾﴾ ''تو بہت جلد یہ لوگ جان جائیں گے۔''

اب وہ وقت زیادہ دور نہیں جب حقیقت ان پر منکشف ہو جائے گی۔ بہت جلد حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا ثابت ہونے والا ہے۔

سُوْرَةُ الدُّخَانِ

آیات ۱ تا ۱۶

سُوْرَةُ الدُّخَانِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۵۹ رُكُوْعَاتُهَا: ۳

حٰمٓ ﴿۱﴾ وَ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ﴿۳﴾ فِيْهَا يُفْرَقُ
كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ﴿۴﴾ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ؕ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿۵﴾ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّهٗ هُوَ
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶﴾ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ۘ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۷﴾ لَاۤ اِلٰهَ
اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸﴾ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ﴿۹﴾
فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۰﴾ يَّغْشَى النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱﴾ رَبَّنَا
اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ
تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ﴿۱۵﴾ يَوْمَ
نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ﴿۱۶﴾

آیت ۱ ﴿حٰمٓ ①﴾ ''ح' م۔''

آیت ۲ ﴿وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ②﴾ ''قسم ہے اس روشن کتاب کی۔''

جیسا کہ سورۃ الزخرف کے آغاز میں عرض کیا گیا' سورۃ الدخان کی سورۃ الزخرف کے ساتھ نسبتِ زوجیت ہے اور اس کی ایک علامت یہ ہے کہ دونوں سورتوں کی دو ابتدائی آیات مشترک ہیں اور ان کا اسلوب بھی ایک جیسا ہے۔ چنانچہ سورۃ الزخرف کی طرح یہاں اس آیت میں بھی قرآن کی قسم کا جوابِ قسم یا مقسم علیہ محذوف ہے۔ اس ضمن میں یہ وضاحت قبل ازیں کی جا چکی ہے کہ ایسے مقامات پر مقسم علیہ گویا وہی حقیقت ہے جس کا ذکر سورۂ یٰسٓ کے آغاز میں ہو چکا ہے: ﴿یٰسٓ ① وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ② اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ③﴾۔ چنانچہ یہاں پر اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ کو مقدر (understood) مانتے ہوئے آیت زیر مطالعہ کا مفہوم یوں ہوگا: ''اے محمد (ﷺ) یہ کتابِ مبین گواہ ہے کہ آپؐ اللہ کے رسولؐ ہیں''۔ گویا یہ روشن اور واضح کتاب' یہ قرآن آپؐ کی رسالت کا قطعی ثبوت ہے۔

آیت ۳ ﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾ ''یقیناً ہم نے اس کو نازل کیا ہے ایک مبارک رات میں''

یہ مضمون سورۃ القدر میں واضح تر انداز میں آیا ہے: ﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ①﴾ کہ ہم نے اسے ''لیلۃ القدر'' میں نازل

فرمایا۔ چونکہ قرآن مجید میں عام طور پر اہم مضامین کم از کم دو مرتبہ آئے ہیں اس لیے اس خاص رات کا ذکر بھی دو مرتبہ آیا ہے۔ وہاں ''لیلۃ القدر'' کے نام سے اور یہاں ''لیلۃ مبارکۃ'' کے نام سے۔

﴿اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝۳﴾ ''یقیناً ہم خبردار کر دینے والے ہیں۔''

رسالت اور انزالِ کُتب کا اصل مقصد لوگوں کا انذار (خبردار کرنا' آگاہ کرنا) ہے۔ جیسے سورۃ المدثر میں حضور ﷺ کو حکم دیا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲﴾ ''اے چادر اوڑھنے والے اٹھئے اور (لوگوں کو) خبردار کیجیے''۔ دنیا کی زندگی اصل زندگی نہیں ہے۔ یہ تو اصل ''کتابِ زندگی'' کے دیباچے کی مانند ہے۔ اصل زندگی تو موت کے بعد شروع ہونے والی ہے۔ چنانچہ اسی حوالے سے لوگوں کو خبردار (warn) کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسل علیہم السلام اور الہامی کتب کے ذریعے ہدایت کے ایک سلسلے کا اہتمام فرمایا تاکہ ان میں اصل اور ہمیشہ کی زندگی کو بہتر بنانے کا شعور پیدا ہو اور وہ اس کے لیے تیاری کر سکیں: ﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۶۴﴾ (العنکبوت) ''یہ دنیا کی زندگی تو کھیل اور تماشے کے سوا کچھ نہیں' جبکہ آخرت کا گھر ہی اصل زندگی ہے۔ کاش کہ انہیں معلوم ہوتا!''

آیت ۴ ﴿فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝۴﴾ ''اس رات میں تمام پُرحکمت امور کے فیصلے صادر کیے جاتے ہیں۔''

اس سے پہلے ہم سورۃ السجدۃ میں پڑھ چکے ہیں کہ تدبیرِ کائنات کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی منصوبہ بندی ایک ہزار سال کی ہوتی ہے: ﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَاۗءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝۵﴾ ''وہ تدبیر کرتا ہے اپنے امر کی آسمان سے زمین کی طرف' پھر وہ (امر) چڑھتا ہے اس کی طرف' (یہ سارا معاملہ طے پاتا ہے) ایک دن میں جس کی مقدار تمہاری گنتی کے حساب سے ایک ہزار برس ہے''۔ البتہ انسانی معاملات کے حوالے سے یہ رات (لیلہ مبارکہ) گویا اللہ تعالیٰ کی کائناتی سلطنت (Cosmic Empire) کے سالانہ بجٹ سیشن کا درجہ رکھتی ہے —— لفظ فرق کے لغوی معنی علیحدہ کر دینے کے ہیں۔ چنانچہ یُفْرَقُ کا درست مفہوم یہ ہوگا کہ فیصلے جاری (issue) کر دیے جاتے ہیں۔ یعنی یہ وہ رات ہے جس میں تمام سال کے فیصلے طے کر کے تعمیل و تنفیذ (implementation) کے لیے ملائکہ کے حوالے کر دیے جاتے ہیں جو اس عظیم سلطنت کی ''سول سروس'' کا درجہ رکھتے ہیں۔ گزشتہ آیت کے مطابق یہ وہی رات ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو لوحِ محفوظ یا اُمّ الکتاب سے آسمانِ دنیا پر اتارا۔

آیت ۵ ﴿اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ۭ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۝۵﴾ ''طے شدہ احکام ہماری طرف سے۔ یقیناً ہم ہی ہیں (رسولوں کو) بھیجنے والے۔''

آیت ۶ ﴿رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۶﴾ ''رحمت کے طور پر آپ کے رب کی طرف سے۔ یقیناً وہی ہے سب کچھ سننے والا' سب کچھ جاننے والا۔''

یہ تمام فیصلے یقیناً اللہ تعالیٰ کی رحمت پر مبنی ہوتے ہیں۔ خاص طور پر قرآن کا نزول اور نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت تو نوعِ انسانی کے لیے اللہ تعالیٰ کی عظیم رحمت کا مظہر ہے۔

آیت ۷ ﴿رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝۷﴾ ''آسمانوں اور زمین کا رب اور جو کچھ ان

کے مابین ہے۔ اگر تم یقین کرنے والے ہو!''

یقیناً ساری کائنات کا پروردگار اور مالک اللہ ہی ہے۔ اس حقیقت کو مان لینا تو آسان ہے لیکن دل کی گہرائیوں میں اس کا یقین بٹھانا انسان کے لیے بہت مشکل ہے۔ انسان کا نفس اس سلسلے میں اسے قدم قدم پر دھوکہ دیتا ہے کہ فلاں چیز میری ہے اور فلاں چیز کا مالک میں ہوں۔ بہرحال ہمیں دل سے یقین کر لینا چاہیے کہ ہر چیز اللہ کی ہے اور وہی ہر شے کا مالک ہے: ؎

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست در حقیقت مالکِ ہر شے خداست!

گویا ہر انسان کی جان' اس کا جسم' جسم کے اعضاء اور زیر استعمال اشیاء وغیرہ اس کے پاس چند روز کے لیے امانت ہیں۔ حقیقت میں ان سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ آخرت میں ان میں سے ایک ایک امانت کا حساب لیا جائے گا اور اس حساب کے دوران انسان کے اپنے اعضاء اپنے مالک حقیقی کے سامنے اس کے خلاف گواہیاں دیں گے۔

آیت ۸ ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ﴾ ''اُس کے سوا کوئی معبود نہیں' وہی زندہ رکھتا ہے اور وہی مارتا ہے۔''

﴿رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَاۗىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝﴾ ''وہ تمہارا بھی رب ہے اور تمہارے پہلے آباء و اجداد کا بھی رب ہے۔''

آیت ۹ ﴿بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ۝﴾ ''لیکن یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے کھیل رہے ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ جب اہلِ مکہ کے سامنے قرآن پیش کرتے تھے تو ان میں سے اکثر لوگ اسے کلام اللہ ماننے کے بجائے اس کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار کرتے تھے۔ پھر اسی بنا پر وہ حضور ﷺ کا مذاق بھی اڑاتے تھے کہ دیکھیں جی! یہ کہتے ہیں کہ ان کے پاس آسمان سے وحی آتی ہے۔

آیت ۱۰ ﴿فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَاۗءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾ ''تو آپؐ انتظار کیجیے اُس دن کا جس دن آسمان لائے گا واضح دھواں۔''

اس آیت کے مفہوم کے بارے میں مفسرین کے درمیان شدید اختلاف ہے اور یہ اختلاف صحابہ کرامؓ کے زمانے میں بھی پایا جاتا تھا۔ حضرت علیؓ' ابن عمرؓ' ابن عباسؓ اور ابوسعید خدریؓ اور حسن بصریؒ جیسے اکابر کی رائے ہے کہ اس سے وہ دھواں مراد ہے جو قیامت سے پہلے نمودار ہوگا۔ ایک حدیث میں حضور ﷺ نے قیامت سے فوراً پہلے نمودار ہونے والی جن دس نشانیوں کا ذکر فرمایا ہے ان میں دھویں (دُخان) کا ذکر بھی ہے۔ اس کے برعکس حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بڑی شدت کے ساتھ یہ رائے ہے کہ حضور ﷺ کی نبوت کے ابتدائی سالوں میں مکہ میں جو قحط پڑا تھا اس آیت میں اس قحط کے بارے میں پیشگی خبردار کیا گیا ہے۔ صحرائی علاقوں میں اگر طویل مدت تک بارش نہ ہو تو پوری فضا گرد سے اَٹ جاتی ہے اور آسمان کی طرف دیکھنے سے یوں لگتا ہے جیسے دھویں کے بادل چھا رہے ہیں۔ قحط کا یہ عذاب دراصل اسی قانونِ خداوندی کے تحت اہلِ مکہ پر مسلط ہوا تھا جس کا ذکر سورۃ الانعام میں اس طرح ہوا ہے: ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۝﴾ ''اور ہم نے بھیجا ہے (دوسری) اُمتوں کی طرف بھی آپؐ سے قبل (رسولوں کو)' پھر ہم نے پکڑا انہیں سختیوں اور تکلیفوں سے شاید کہ وہ عاجزی کریں''۔ تابعین میں سے مجاہدؒ' قتادہؒ' ابراہیم نخعی وغیرہ (رحمہم اللہ) حضرات نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ بہرحال میں نے یہاں جلیل القدر صحابہؓ کی آراء بیان کر دی ہیں۔ ان صحابہؓ کے عظیم مراتب کے پیش نظر ان آراء میں

محاکمہ کرنا میرے نزدیک درست نہیں۔

آیت ۱۱ ﴿یَّغْشَی النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۱﴾﴾ ''وہ ڈھانپ لے گا لوگوں کو۔ یہ ایک دردناک عذاب ہوگا۔''

آیت ۱۲ ﴿رَبَّنَا اکْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾﴾ ''(اُس وقت لوگ کہیں گے:) اے ہمارے رب! اس عذاب کو ہم سے دور کر دے، ہم ایمان لانے والے ہیں۔''

آیت ۱۳ ﴿اَنّٰی لَهُمُ الذِّكْرٰی وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۳﴾﴾ ''کہاں ہے ان کے لیے یاددہانی کی استعداد جبکہ آچکا ہے ان کے پاس ایک واضح کر دینے والا رسول!''

آیت ۱۴ ﴿ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ﴿۱۴﴾﴾ ''پھر انہوں نے منہ پھیر لیا اُس کی طرف سے اور کہا کہ یہ تو سکھایا پڑھایا ہوا مجنون ہے۔''

معاذ اللہ! نقلِ کفر کفر نباشد! وہ حضور ﷺ کے بارے میں ایسی ہی باتیں کرتے تھے۔ کبھی کہتے کہ ان کو یہ باتیں کسی اور نے سکھائی ہیں اور کبھی کہتے کہ ان پر آسیب اور جنات وغیرہ کا اثر ہو گیا ہے اور ان کا دماغی توازن ٹھیک نہیں رہا۔ معاذ اللہ!

آیت ۱۵ ﴿اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِیْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾ ''ہم دور کر دیں گے اس عذاب کو تھوڑی دیر کے لیے، تو تم لوٹ کر وہی کچھ کرو گے جو پہلے کر رہے تھے۔''

جیسے آلِ فرعون کے معاملے میں ہم سورۃ الاعراف کے سولہویں رکوع میں پڑھ چکے ہیں کہ ان پر پے در پے سات عذاب بھیجے گئے تھے۔ ہر مرتبہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ وہ ان کے لیے دعا کریں اور ہر بار وعدہ کیا کہ اگر یہ عذاب ٹل گیا تو وہ ایمان لے آئیں گے۔ مگر جب عذاب ٹل جاتا تو وہ اپنے وعدے سے پھر جاتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس آیت کو اپنے مذکورہ موقف کے حق میں بطور دلیل پیش کرتے ہیں کہ اگر اس دھویں سے مراد قبل از قیامت کا دھواں ہوتا تو اس کے دور کیے جانے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ اس لیے اس سے مراد اسی نوعیت کا عذاب ہے جو کسی رسول کی بعثت کے بعد لوگوں کو خوابِ غفلت سے جگانے کے لیے بھیجا جاتا ہے اور جس کا مقصد اور اصول سورۃ السجدۃ میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: ﴿وَلَنُذِیْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰی دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''اور ہم انہیں لازماً چکھائیں گے قریب کے کچھ چھوٹے عذاب بڑے عذاب سے پہلے تاکہ یہ باز آجائیں۔''

آیت ۱۶ ﴿یَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰی ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ﴿۱۶﴾﴾ ''جس دن ہم پکڑیں گے بڑی پکڑ (اُس دن) یقیناً ہم پورا پورا انتقام لیں گے۔''

آیات ۱۷ تا ۳۳

وَ لَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِیْمٌ ﴿۱۷﴾ اَنْ اَدُّوْۤا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۸﴾ وَّ اَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَی اللّٰهِ ۚ اِنِّیْۤ اٰتِیْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۱۹﴾ وَ اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ﴿۲۰﴾ وَ اِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ فَاعْتَزِلُوْنِ ﴿۲۱﴾ فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنَّ هٰۤؤُلَآءِ

قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۲۲﴾ فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ اِنَّهُمْ جُنْدٌ
مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۴﴾ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ﴿۲۵﴾ وَّ زُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِیْمٍ ﴿۲۶﴾ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِیْهَا
فٰكِهِیْنَ ﴿۲۷﴾ كَذٰلِكَ ۫ وَ اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ ﴿۲۸﴾ فَمَا بَكَتْ عَلَیْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ وَ مَا
كَانُوْا مُنْظَرِیْنَ ﴿۲۹﴾ وَ لَقَدْ نَجَّیْنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِیْنِ ﴿۳۰﴾ مِنْ فِرْعَوْنَ ؕ اِنَّهٗ
كَانَ عَالِیًا مِّنَ الْمُسْرِفِیْنَ ﴿۳۱﴾ وَ لَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰی عِلْمٍ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۳۲﴾ وَاٰتَیْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰیٰتِ
مَا فِیْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِیْنٌ ﴿۳۳﴾

آیت ۱۷ ﴿وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِیْمٌ ﴿۱۷﴾﴾ ''اور ہم نے آزمایا تھا ان سے پہلے قومِ فرعون کو بھی' اور ان کے پاس بھی ایک بہت معزز رسول آیا تھا۔''

آیت ۱۸ ﴿اَنْ اَدُّوْۤا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۸﴾﴾ ''(اس پیغام کے ساتھ) کہ تم اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کر دو۔ یقیناً میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ میں اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا ایک معزز اور امانت دار رسول ہوں اور تمہاری طرف اللہ کا یہ پیغام لے کر آیا ہوں کہ تم بنی اسرائیل کو آزاد کر کے میرے ساتھ جانے کی اجازت دے دو۔

آیت ۱۹ ﴿وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَی اللّٰهِ ۚ اِنِّیْۤ اٰتِیْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۱۹﴾﴾ ''اور یہ کہ تم اللہ کے مقابلے میں سرکشی نہ کرو۔ مَیں تمہارے پاس لے کر آیا ہوں ایک واضح سند۔''

اگر تم لوگ میری مخالفت کرو گے تو یہ گویا اللہ کی مخالفت اور اس کے خلاف سرکشی ہوگی۔ اس لیے کہ مَیں اللہ کا نمائندہ ہوں اور اُسی کے پیغامات تم تک پہنچا رہا ہوں۔

آیت ۲۰ ﴿وَاِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ﴿۲۰﴾﴾ ''اور مَیں نے پناہ پکڑ لی ہے اپنے اور تمہارے رب کی اس بات سے کہ تم مجھے سنگسار کرو۔''

آیت ۲۱ ﴿وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ فَاعْتَزِلُوْنِ ﴿۲۱﴾﴾ ''اور اگر تم لوگ میری بات نہیں مانتے ہو تو مجھ سے دور رہو!''

تمہاری سازشوں کے خلاف چونکہ میں نے اپنے رب کی پناہ حاصل کر لی ہے اس لیے اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو بھی میرے خلاف کوئی عملی اقدام کرنے سے باز رہنا۔

آیت ۲۲ ﴿فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۲۲﴾﴾ ''پھر اُس نے اپنے ربّ کو پکارا کہ یہ مجرم لوگ ہیں!''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکم دیا:

آیت ۲۳ ﴿فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۲۳﴾﴾ ''پس میرے بندوں کو لے کر راتوں رات نکل جاؤ' آگاہ رہو کہ تمہارا پیچھا کیا جائے گا۔''

آیت ۲۴ ﴿وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ﴾ ''اور چھوڑ دینا سمندر کو ساکن!''

ہم سمندر کو پھاڑ کر تمہارے لیے راستہ بنا دیں گے‘ اس راستے سے گزر جانے کے بعد اسے اسی طرح ساکن چھوڑ دینا۔

﴿اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ۝۲۴﴾ ’’یہ ایک لشکر ہیں جو غرق کیے جائیں گے۔‘‘

فرعون کا لشکر تمہارا تعاقب کرے گا اور اُسی راستے سے گزرنے کی کوشش کرے گا‘ لیکن ہم اس کو غرق کر دیں گے۔

آیت ۲۵ ۝۲۶ ﴿كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝۲۵ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ۝۲۶﴾ ’’انہوں نے کتنے ہی باغوں‘ چشموں‘ کھیتوں اور شاندار رہائش گاہوں کو چھوڑا۔‘‘

آیت ۲۷ ﴿وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ۝۲۷﴾ ’’اور کیسی کیسی نعمتوں کو جن میں وہ عیش کیا کرتے تھے۔‘‘

آیت ۲۸ ﴿كَذٰلِكَ ۫ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝۲۸﴾ ’’یوں ہی ہوا‘ اور ہم نے وارث بنا دیا ان چیزوں کا دوسرے لوگوں کو۔‘‘

آیت ۲۹ ﴿فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ۝۲۹﴾ ’’تو نہ اُن پر آسمان رویا اور نہ زمین اور نہ ہی انہیں کوئی مہلت دی گئی۔‘‘

آیت ۳۰ ﴿وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ۝۳۰﴾ ’’اور ہم نے نجات دے دی بنی اسرائیل کو ذلت آمیز عذاب سے۔‘‘

آیت ۳۱ ﴿مِنْ فِرْعَوْنَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝۳۱﴾ ’’یعنی فرعون سے‘ یقیناً وہ بڑا ہی سرکش‘ حد سے نکل جانے والوں میں سے تھا۔‘‘

ایک طرف تو وہ معصیت کے ارتکاب میں حد سے بڑھا ہوا تھا اور دوسری طرف اس کی سرشت میں سرکشی بھی بہت تھی۔

آیت ۳۲ ﴿وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰي عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝۳۲﴾ ’’اور ہم نے علم رکھنے کے باوجود اُن (بنی اسرائیل) کو اقوامِ عالم پر ترجیح دی تھی۔‘‘

بنی اسرائیل کی تمام خرابیاں اور کوتاہیاں ہمارے علم میں تھیں۔ اس کے باوجود ہم نے دنیا کی تمام اقوام پر انہیں فضیلت دے کر برگزیدہ کیا تھا۔ بنی اسرائیل کی اس فضیلت کا ذکر قرآن حکیم میں بار بار آیا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں یہ آیت دو مرتبہ (۴۷ اور ۱۲۲) آئی ہے: ﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ ’’اے بنی اسرائیل! یاد کرو میرے اس انعام کو جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ میں نے تمہیں فضیلت عطا کی جہان والوں پر۔‘‘

قرآن کریم (خصوصی طور پر سورۃ البقرۃ) میں بنی اسرائیل کے بڑے بڑے جرائم بھی گنوائے گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی مہربانی کی وجہ یہ تھی کہ ان کا سوادِ اعظم مسلسل توحید سے چمٹا رہا تھا۔ اگرچہ گاہے بگاہے ان میں مشرکانہ نظریات و اوہام بھی پنپتے رہے لیکن ان کی اکثریت بہرحال توحید پر قائم رہی۔ مثلاً ایک زمانے میں ان کے درمیان ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتا تھا لیکن اس دور میں بھی مجموعی طور پر ان میں سے اکثر لوگ توحید پرست ہی رہے۔

آیت ۳۳ ﴿وَاٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ ۝۳۳﴾ ’’اور ہم نے انہیں بہت سی ایسی نشانیاں دیں جن میں بہت واضح آزمائش تھی۔‘‘

اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل کو بار بار ایسی آزمائشوں سے دوچار کیا گیا جو ان کے لیے ''بَلَآءً حَسَنًا'' (الانفال:۱۷) کا درجہ رکھتی تھیں۔ یعنی ایسی آزمائشیں جو انسان کی بھلائیوں کو بڑھانے اور اچھائیوں کو نکھارنے کا باعث بنتی ہیں۔

آیات ۳۴ تا ۵۹

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۳۴﴾ اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَ مَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۶﴾ اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ وَّ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۛ اَهْلَكْنٰهُمْ ۖ اِنَّهُمْ كَانُوْا
مُجْرِمِيْنَ ﴿۳۷﴾ وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۳۸﴾ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ
وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۰﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى
عَنْ مَّوْلًى شَيْـًٔا وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ ۗ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۲﴾ اِنَّ ع ۱۵
شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ﴿۴۳﴾ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ﴿۴۴﴾ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ﴿۴۵﴾ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ﴿۴۶﴾ خُذُوْهُ
فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ ﴿۴۸﴾ ذُقْ ۚ اِنَّكَ
اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ﴿۴۹﴾ اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ﴿۵۱﴾ فِيْ
جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۵۲﴾ يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۵۳﴾ كَذٰلِكَ ۫ وَ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ
عِيْنٍ ﴿۵۴﴾ يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۵۵﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ۚ
وَ وَقٰىهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۵۶﴾ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۵۷﴾ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ
لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۸﴾ فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع ۱۶

آیت ۳۴ ﴿اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۳۴﴾﴾ ''یہ لوگ تو یہی کہہ رہے ہیں۔''

هٰٓؤُلَآءِ سے یہاں اہلِ مکہ مراد ہیں۔ چونکہ یہ مکی سورت ہے اس لیے بنی اسرائیل کا ذکر کرنے کے بعد اب مشرکینِ مکہ کے اقوال وعقائد پر تبصرہ ہونے جا رہا ہے۔

آیت ۳۵ ﴿اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ ﴿۳۵﴾﴾ ''کچھ نہیں مگر ہماری یہ پہلی موت ہی ہوگی اور ہم (دوبارہ) اٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔''

کہ بس ہماری موت کے ساتھ ہی ہماری زندگی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔ اس کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کے عقیدے کو ہم نہیں مانتے۔

آیت ۳۶ ﴿فَاْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۶﴾﴾ ''تو لاؤ ذرا ہمارے آباء واجداد کو اگر تم سچے ہو!''

اپنے موقف کے حمایت میں وہ لوگ یہ دلیل دیتے کہ اگر تم بعث بعد الموت کے عقیدے کو سچ مانتے ہو تو ذرا ہمارے فوت شدہ

آباء واَجداد کو زندہ کر کے دکھاؤ!

آیت ۳۷ ﴿اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ وَّالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ﴾ ''کیا یہ بہتر ہیں یا تُبَّع کی قوم اور وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے؟''

یمن کے قدیم بادشاہ ''تُبَّع'' کہلاتے تھے۔ جس طرح پرانے زمانے میں مصر کے بادشاہوں کا لقب ''فرعون'' اور عراق کے بادشاہوں کا لقب ''نمرود'' تھا اسی طرح یمن کے بادشاہوں کا لقب ''تُبَّع'' تھا۔

﴿اَهْلَكْنٰهُمْ ۫ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۝۳۷﴾ ''ہم نے ان سب کو ہلاک کر دیا' بے شک وہ سب کے سب مجرم تھے۔''

آیت ۳۸ ﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝۳۸﴾ ''اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے مابین ہے محض کھیل کے طور پر تو تخلیق نہیں فرمایا۔''

آیت ۳۹ ﴿مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۹﴾ ''اور ہم نے نہیں بنایا ان دونوں کو مگر حق کے ساتھ' مگر ان لوگوں کی اکثریت علم نہیں رکھتی۔''

آیت ۴۰ ﴿اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۴۰﴾ ''یقیناً فیصلے کا دن ان سب کا وقتِ معیّن ہے۔''

آیت ۴۱ ﴿يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝۴۱﴾ ''جس دن کوئی دوست کسی دوست کے کچھ کام نہیں آ سکے گا اور نہ ہی ان کی کوئی مدد کی جائے گی۔''

آیت ۴۲ ﴿اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝۴۲﴾ ''سوائے اُس کے جس پر اللہ رحم فرما دے۔ یقیناً وہی ہے زبردست' بہت رحم فرمانے والا۔''

آیت ۴۳ ﴿اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۝۴۳﴾ ''یقیناً زقوم کا درخت۔''

آیت ۴۴ ﴿طَعَامُ الْاَثِيْمِ ۝۴۴﴾ ''گنہگاروں کا کھانا ہے۔''

آیت ۴۵ ﴿كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ۝۴۵﴾ ''پگھلے ہوئے تانبے کی طرح' کھولے گا پیٹوں کے اندر۔''

اس درخت کا ذکر اس سے پہلے سورۃ الصافات کے دوسرے رکوع میں بھی ہو چکا ہے۔ اس کے شگوفے نہایت بدشکل' بدذائقہ اور بدبودار ہوں گے' لیکن اہلِ جہنّم اس کو کھانے پر مجبور ہوں گے۔ جب وہ بھوک سے بے حال ہو کر اس کو کھائیں گے تو وہ ان کے پیٹوں میں پگھلے ہوئے تانبے کی طرح جوش مارے گا۔

آیت ۴۶ ﴿كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ۝۴۶﴾ ''جیسے گرم پانی کھولتا ہے۔''

آیت ۴۷ ﴿خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ۝۴۷﴾ ''(پھر کہا جائے گا:) پکڑو اس کو اور دھکیلتے ہوئے لے جاؤ اسے عین جہنّم کے بیچوں بیچ۔''

آیت ۴۸ ﴿ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ ۝۴۸﴾ ''پھر انڈیل دو اس کے سر کے اوپر کھولتے ہوئے پانی کا عذاب۔''

آیت ۴۹ ﴿ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ﴿۴۹﴾﴾ ''اب چکھو! تم تو بڑے طاقتور، بہت معزز تھے نا!''

ہاں اے ابوجہل! تمہیں اپنی سرداری اور جتھے داری پر بڑا فخر تھا نا! اور ولید بن مغیرہ! تم بھی تو اپنی دولت اور جوان بیٹوں کے بل پر بڑے اکڑتے تھے نا! آج جہنم کی آگ، زقوم کے کھانے اور کھولتے ہوئے پانی کے عذاب کا مزا چکھو! اب یہی تم لوگوں کا مقدر ہے۔

آیت ۵۰ ﴿اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾﴾ ''یقیناً یہی ہے وہ چیز جس کے بارے میں تم شک کرتے تھے۔''

آیت ۵۱ ﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ﴿۵۱﴾﴾ ''(اس کے برعکس) متقین بڑی امن والی جگہ میں ہوں گے۔''

آیت ۵۲ ﴿فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۵۲﴾﴾ ''باغات اور چشموں میں۔''

آیت ۵۳ ﴿يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۵۳﴾﴾ ''باریک اور موٹے ریشم کا لباس پہنیں گے، ایک دوسرے کی طرف رخ کیے ہوئے (بیٹھے ہوں گے)۔''

ان کا نیچے کا لباس موٹے ریشم کا جبکہ اوپر کا لباس باریک ریشم کا ہوگا۔

آیت ۵۴ ﴿كَذٰلِكَ ۭ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿۵۴﴾﴾ ''اسی طرح ہوگا، اور ہم ان سے بیاہ دیں گے بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں۔''

آیت ۵۵ ﴿يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۵۵﴾﴾ ''وہ طلب کریں گے اس میں ہر طرح کے پھل اطمینان کے ساتھ۔''

جنّت کے پھلوں میں سے جس پھل کی وہ خواہش کریں گے وہ ان کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔

آیت ۵۶ ﴿لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ۚ وَوَقٰىهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۵۶﴾﴾ ''وہ نہیں چکھیں گے اس میں موت سوائے اس پہلی موت کے، اور اللہ نے انہیں بچا لیا ہے جہنّم کے عذاب سے۔''

دنیا میں انہیں جو موت آئی تھی وہی ان کی آخری موت ہوگی، اب انہیں موت کی سختی کا کبھی سامنا نہیں کرنا پڑے گا اور جنّت میں ان کا قیام ہمیشہ ہمیش کے لیے ہوگا۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنے ان بندوں میں شامل کر لے، آمین!

آیت ۵۷ ﴿فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۵۷﴾﴾ ''یہ فضل ہوگا آپ کے رب کی طرف سے۔ یقیناً یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔''

بلاشبہ اس میں ان کی نیکیوں اور محنت کا بھی حصہ ہوگا، لیکن اُس دن کی کامیابی نیک اعمال کی کثرت کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے خصوصی فضل کے بغیر ممکن نہیں ہوگی۔

آیت ۵۸ ﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۸﴾﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) ہم نے اس قرآن کو آسان کر دیا ہے آپ کی زبان پر، تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔''

قرآن کی زبان بہت فصیح و بلیغ ہونے کے باوجود بڑی سادہ اور آسان ہے۔ بعض مصنفین دقیق اور ثقیل الفاظ استعمال کر کے قارئین پر اپنی علمیت کی دھاک بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ عربی کی کتاب ''مقاماتِ حریری'' پڑھیں تو اس میں آپ کو بھاری

بھر کم اور نامانوس الفاظ کی کثرت سے محسوس ہوگا کہ شاید کتاب لکھنے سے مصنف کا مقصود صرف اپنے ذخیرۂ الفاظ کا مظاہرہ کرنا ہی ہے۔ بہر حال قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس کا مقصد بنی نوعِ انسان کو ہدایت دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو (نعوذ باللہ) قرآن کی عبارت کے ذریعے سے اپنی زبان دانی کی مہارت کا مظاہرہ کرنا مقصود نہیں تھا۔ چنانچہ اس کتاب میں اگر ایک طرف ہمیں فصاحت و بلاغت کی معراج نظر آتی ہے تو دوسری طرف اس کی عبارت میں سہلِ ممتنع اور سادگی کا اعجاز بھی دکھائی دیتا ہے۔

آیت ۵۹ ﴿فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ۝۵۹﴾ ''تو آپؐ انتظار کیجیے، یہ بھی انتظار کر رہے ہیں۔''

یہی لفظ (فَارْتَقِبْ) قبل ازیں آیت ۱۰ میں بھی آیا ہے، جہاں دھویں کے عذاب کا ذکر ہے۔ گویا یہاں ایک دفعہ پھر اسی عذاب کے بارے میں پیشگی طور پر خبردار کر دیا گیا ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے نزدیک اہلِ مکہ پر خشک سالی اور قحط کی صورت میں آنے والا تھا۔

سُوْرَةُ الْجَاثِيَةِ

سورۃ الجاثیہ اور اس کے بعد والی سورت یعنی سورۃ الاحقاف کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے۔ ان دونوں سورتوں کے درمیان ایک نسبت یہ بھی ہے کہ ان کے آغاز کی دو آیات مشترک ہیں۔

آیات ۱ تا ۱۳

سُوْرَةُ الْجَاثِيَةِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۳۷ رُكُوْعَاتُهَا: ۴

حٰمٓ ۚ﴿۱﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ
لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳﴾ وَ فِيْ خَلْقِكُمْ وَ مَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ
النَّهَارِ وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ تَصْرِيْفِ
الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۵﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَ
اللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۶﴾ وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿۷﴾ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ
مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۸﴾ وَ اِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْـًٔا اتَّخَذَهَا
هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹﴾ مِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ ۚ وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْـًٔا
وَّ لَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰﴾ هٰذَا هُدًى ۚ وَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ﴿۱۱﴾ ع اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ
الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ
وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾

آیت ۱ ﴿حٰمٓ ۚ﴿۱﴾﴾ ''ح' م۔''

آیت ۲ ﴿تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾﴾ ''اس کتاب کا اُتارا جانا ہے اُس اللہ کی طرف سے جو زبردست' کمال حکمت والا ہے۔''

آیت ۳ ﴿اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳﴾﴾ ''یقیناً آسمانوں اور زمین میں (بہت سی) نشانیاں ہیں ماننے والوں کے لیے۔''

آیت ﴿وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝۴﴾ ''اور تمہاری تخلیق میں' اور جو اُس نے پھیلا دیے ہیں (زمین میں) جاندار اُن میں بھی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین کریں۔''

آیت ﴿وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ﴾ ''اور رات اور دن کے اختلاف میں' اور اس میں جو اللہ آسمان سے رزق اُتارتا ہے''

رزق سے مراد یہاں بارش کا پانی ہے جو زمین سے روزی کے نکلنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ بارش کے پانی کا نزول گویا انسانوں اور دوسرے جانداروں کے لیے رزق کا نزول ہے۔

﴿فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ ''پھر زندہ کر دیتا ہے اس سے زمین کو اس کی موت کے بعد''

وہ زمین جو بنجر اور بے آب و گیاہ پڑی تھی بارش کے برستے ہی ہریالی اور طرح طرح کے نباتات کے لباس میں ملبوس نظر آنے لگتی ہے۔

﴿وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۵﴾ ''اور ہواؤں کے چلنے میں' نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں۔''

یہاں پر سورۃ البقرۃ کی وہ آیت ایک دفعہ پھر سے ذہن میں تازہ کر لیں جسے میں نے ''آیت الآیات'' کا عنوان دیا تھا:

﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۖ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۱۶۴﴾

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں' اور رات اور دن کے اُلٹ پھیر میں' اور اُن کشتیوں (اور جہازوں) میں جو سمندر میں (یا دریاؤں میں) لوگوں کے لیے نفع بخش سامان لے کر چلتی ہیں' اور اُس پانی میں کہ جو اللہ نے آسمان سے اتارا ہے' پھر اس سے زندگی بخشی زمین کو اس کے مُردہ ہو جانے کے بعد' اور ہر قسم کے حیوانات (اور چرند پرند) اس کے اندر پھیلا دیے' اور ہواؤں کی گردش میں' اور ان بادلوں میں جو معلّق کر دیے گئے ہیں آسمان اور زمین کے درمیان' نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں۔''

گویا سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں جو نشانیاں بیان ہوئی ہیں ان میں سے اکثر کا ذکر زیر مطالعہ تین آیات میں آ گیا ہے۔

آیت ﴿تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ﴾ ''یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم پڑھ کر سنا رہے ہیں آپ کو حق کے ساتھ۔''

﴿فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝۶﴾ ''تو اب اللہ اور اُس کی آیات کے بعد اور کون سی بات ہے جس پر یہ لوگ ایمان لائیں گے؟''

اگر یہ لوگ کائنات میں موجود آیاتِ آفاقی کا بچشمِ سر مشاہدہ کرنے اور قرآن کی آیات کو سننے کے بعد بھی ایمان نہیں لائے تو اور کس معجزے کو دیکھ کر ایمان لائیں گے؟ ایمان کی دولت تو صرف اسے ہی نصیب ہوتی ہے جو خود طالبِ ہدایت ہو۔ بلاشبہ قرآن ہر طالبِ ہدایت کے لیے ایک بہت بڑا معجزہ' سراجِ منیر اور منبعِ رشد و ہدایت ہے۔ لیکن اگر کسی کے دل میں ہدایت کی طلب ہی نہ ہو تو وہ بڑے سے بڑا معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائے گا۔

آیت ۷ ﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝۷﴾ ''بربادی ہے ہر جھوٹ گھڑنے والے گنہگار کے لیے۔''

آیت ۸ ﴿يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ﴾ ''وہ سنتا ہے اللہ کی وہ آیات جو اُسے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں' پھر وہ اڑ جاتا ہے ضد پر تکبر کرتے ہوئے جیسے کہ اُس نے انہیں سنا ہی نہ ہو۔''

﴿فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۸﴾ ''تو آپ اسے ایک دردناک عذاب کی بشارت دے دیجیے۔''

یہ دراصل سردارانِ قریش کے رویّے کا ذکر ہے۔ ان میں سے اکثر کا یہی حال تھا۔

آیت ۹ ﴿وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْـًٔا ِۨ اتَّخَذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۹﴾ ''اور جب ہماری آیات میں سے کوئی بات اُس کے علم میں آتی ہے تو وہ اس کا مذاق اڑاتا ہے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے اہانت آمیز عذاب ہوگا۔''

آیت ۱۰ ﴿مِنْ وَّرَاۗىِٕهِمْ جَهَنَّمُ ۚ﴾ ''ان کے پیچھے جہنم ہے۔''

یعنی جہنم ان کی منتظر ہے ——— وَرَاء کا لفظ ہر اُس چیز کے لیے بولا جاتا ہے جو آدمی کی نظر سے اوجھل ہو خواہ آگے ہو یا پیچھے ہو۔ لہٰذا ان الفاظ کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''ان کے آگے جہنم ہے'' جس میں وہ گرنے والے ہیں۔

﴿وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْـــًٔا﴾ ''اور جو کچھ انہوں نے کمایا ہے وہ ان کے ذرا بھی کام نہیں آ سکے گا''

دُنیا میں انہوں نے جو کچھ کمایا ہے اور مال و دولت جمع کیا ہے' یہ سب کچھ انہیں جہنم سے نہ بچا سکے گا۔

﴿وَلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَاۗءَ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۱۰﴾ ''اور نہ وہ جن کو انہوں نے اللہ کے سوا مددگار بنا رکھا ہے' اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہوگا۔''

اللہ کے سوا انہوں نے جو جھوٹے معبود بنا رکھے ہیں اور ان کی سفارش اور شفاعت کا انہیں زعم بھی ہے' وہ بھی اُس دن انہیں جہنم کے عذاب سے نہیں بچا سکیں گے۔

آیت ۱۱ ﴿هٰذَا هُدًى ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ۝۱۱﴾ ''یہ (قرآن) ہے ہدایت۔ اور جن لوگوں نے اپنے رب کی آیات کا کفر کیا ان کے لیے بہت ہی دردناک عذاب ہوگا۔''

آیت ۱۲ ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ﴾ ''اللہ ہی ہے جس نے مسخر کر دیا تمہارے لیے سمندر کو تاکہ اس میں کشتیاں چلیں اُس کے حکم سے''

﴿وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۲﴾ ''تاکہ تم تلاش کرو اُس کا فضل اور تاکہ تم شکر ادا کرو۔''

اللہ کا فضل تلاش کرنے سے یہاں تجارت کے ذریعے روزی تلاش کرنا مراد ہے' جبکہ کشتیاں اور جہاز سمندروں اور دریاؤں میں سامانِ تجارت کی نقل و حمل کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔

آیت ۱۳ ﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ﴾ ''اور اُس نے مسخر کر دیا تمہارے لیے اپنی طرف سے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب کچھ۔''

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۱۳﴾ ''یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیں۔''

اس مفہوم کی تمام آیاتِ قرآنی کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ان میں بنی نوعِ انسان کے لیے دعوتِ تسخیر ہے کہ اللہ نے تو زمین و آسمان کی ہر ہر چیز کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے' اب یہ تمہاری ہمت پر منحصر ہے کہ تم اپنے علم اور ٹیکنالوجی کے بَل بوتے پر کس کس مقام اور کون کون سی چیز تک رسائی حاصل کرتے ہو۔ نیز ایسی آیات کے الفاظ میں نسلِ انسانی کے مستقبل کی ترقی کی جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ مستقبل میں نہ معلوم اللہ تعالیٰ انسان کو ترقی کی کون کون سی منازل طے کرائے گا۔

آیات ۱۴ تا ۲۳

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًۢا بِمَا كَانُوْا
يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَ
لَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلَى
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ ۚ وَ اٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْيًۢا
بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۷﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى
شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ
مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۭ وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَ اللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹﴾ هٰذَا بَصَآئِرُ
لِلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ
نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ ۭ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۲۱﴾ ع ۱۸
وَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا
يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ
قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۭ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۳﴾

آیت ۱۴ ﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ اہلِ ایمان سے کہہ دیجیے کہ وہ ذرا درگزر کریں اُن لوگوں سے جو اللہ کے دنوں کی توقع نہیں رکھتے''

اس آیت کے مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سورت مکی دَور کے تقریباً وسط میں نازل ہوئی ہے۔ گویا اُس وقت حضور ﷺ کی دعوت کو شروع ہوئے پانچ چھ سال ہی ہوئے تھے' یعنی ابھی اہلِ مکہ پر اتمامِ حُجّت نہیں ہوا تھا اور ابھی ان کے لیے مزید مہلت درکار تھی۔ چنانچہ اہلِ ایمان کو تلقین کی جا رہی ہے کہ وہ مشرکین کے مخالفانہ رویّے سے دلبرداشتہ نہ ہوں۔ یہ جہالت میں ڈوبے ہوئے گمراہ لوگ ہیں' انہیں ''ایام اللہ'' کے بارے میں کوئی کھٹکا اور اندیشہ ہے ہی نہیں۔ انہیں ادراک ہی نہیں کہ جس عذاب نے ماضی کی بڑی بڑی اقوام کو نیست و نابود کر دیا تھا وہ ان پر بھی آ سکتا ہے۔ لہٰذا ابھی آپ لوگ ان سے درگزر کریں اور ان کے معاملے میں جلدی کرتے ہوئے یہ نہ سوچیں کہ نہ معلوم اللہ نے انہیں اس قدر ڈھیل کیوں دے رکھی ہے اور یہ کہ ان پر عذابِ موعود آ کیوں نہیں جاتا؟ اصل بات

یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ابھی مزید مہلت دینا چاہتا ہے۔

﴿لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿١٤﴾﴾ ''تاکہ اللہ بدلہ دے ایک قوم کو اُن کی اپنی کمائی کے مطابق۔''

آیت ۱۵ ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا ۖ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ ﴿١٥﴾﴾ ''جس کسی نے اچھا کام کیا تو اُس نے اپنے ہی (بھلے کے) لیے کیا' اور جس کسی نے برا کام کیا تو اس کا وبال بھی اُسی پر ہوگا' پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹا دیے جاؤ گے۔''

آیت ۱۶ ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ﴾ ''اور ہم نے بنی اسرائیل کو عطا کی کتاب' حکومت اور نبوت''

﴿وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿١٦﴾﴾ ''اور ہم نے انہیں عطا کیں بہت سی پاکیزہ چیزیں' اور قوموں پر فضیلت دی۔''

ان لوگوں کا نسبی تعلق اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہے' لیکن جس قوم کا نام بنی اسرائیل ہے وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہے۔ حضرت یعقوبؑ کا لقب ''اسرائیل'' (اللہ کا بندہ) تھا اور آپؑ کے بارہ بیٹوں کی اولاد سے بارہ قبیلے وجود میں آئے جو بنی اسرائیل کہلائے۔ قرآن حکیم میں بنی اسرائیل کو فضیلت سے نوازے جانے کا ذکر تکرار سے آیا ہے۔ اس فضیلت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان کے ہاں نبوت کا وہ سلسلہ جو دو پیغمبروں (حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام) سے شروع ہوا' چودہ سو برس تک بغیر کسی وقفے اور انقطاع کے جاری رہا۔ اس دوران ان کے ہاں پے در پے نبی آئے اور نبوت کی کڑی کے ساتھ کڑی یوں ملتی گئی کہ ایک مسلسل زنجیر بن گئی۔ پھر جس طرح اس زنجیر کا آغاز دو پیغمبروں سے ہوا تھا اسی طرح اس کا اختتام بھی دو پیغمبروں یعنی حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر ہوا۔ بہر حال جتنے انبیاء بنی اسرائیل کی طرف آئے' دنیا میں کسی اور قوم کی طرف اتنے انبیاء نہیں آئے۔ اقوامِ عالم پر بنی اسرائیل کی یہ فضیلت آج بھی قائم ہے۔

بنی اسرائیل کے حوالے سے ہمارے لیے اصل سمجھنے کی بات یہ ہے کہ وہ لوگ جب دین کی طرف پیٹھ پھیر کر' دنیا میں منہمک ہو گئے' عیاشیوں میں پڑ گئے اور آخرت کو بھول گئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضیلت کی حامل اس قوم پر ذلت اور مسکنت تھوپ دی گئی: ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ﴾ اور اس فیصلے کا اعلان قرآن میں دو مرتبہ (البقرۃ: ۶۱ اور آل عمران: ۱۱۲) کیا گیا۔ چنانچہ تاریخ میں بنی اسرائیل آج ہمارے لیے عبرت کا سامان ہے۔ ہم پر بھی اللہ تعالیٰ نے اپنا خصوصی فضل اور احسان فرمایا کہ ہمیں اس نے اپنے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت بنایا اور اپنی آخری کتاب سے نوازا۔ مگر ہم نے بھی جب دین کی طرف سے پیٹھ پھیر لی اور آخرت کو بھول کر دنیا ہی کو اپنا اوڑھنا' بچھونا بنا لیا تو ہمارے حصے میں بھی ویسی ہی ذلت و مسکنت آئی۔ چنانچہ آج دنیا میں ڈیڑھ سو کروڑ مسلمان ہیں مگر اقوامِ عالم کے درمیان ان کی حیثیت یہ ہے کہ ع ''کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی؟'' آج بین الاقوامی معاملات کے بارے میں کسی بھی فورم پر مسلمان ممالک کی رائے پوچھنے کی زحمت تک گوارا نہیں کی جاتی۔ بلکہ اب تو مسلمانوں کے اپنے معاملات کی باگ ڈور بھی غیروں کے ہاتھوں میں ہے۔ اس موضوع پر مزید معلومات کے لیے میری انگریزی تقریر Turmoil in Muslim

Ummah سے استفادہ کیا جا سکتا ہے' جبکہ اُردو میں تو اس موضوع پر میری بہت سی تقاریر دستیاب ہیں۔ *

آیت ۱۷ ﴿وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ﴾ ''اور ہم نے انہیں عطا کیں دین کے معاملہ میں واضح ہدایات۔''

یہاں ''امر'' سے مراد دین و شریعت ہے۔ یعنی ان کے انبیاء کو وحی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام ضروری ہدایات مسلسل ملتی رہیں۔ اس کے علاوہ انہیں تورات' زبور اور انجیل جیسی کتابیں بھی عطا گئیں۔

﴿فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْيًۢا ۢ بَيْنَهُمْ ۭ﴾ ''اور انہوں نے نہیں اختلاف کیا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا' محض باہمی ضِدم ضِدا کے سبب سے۔''

کتاب اللہ کی واضح تعلیمات ان لوگوں تک پہنچ چکی تھیں۔ اس کے باوجود ضد بازی کی بنیاد پر ان کے اندر شدید اختلافات پیدا ہو گئے اور انہی اختلافات کی وجہ سے یہ قوم مختلف گروہوں میں بٹ گئی۔ پہلے یہودی اور نصاریٰ الگ الگ ہوئے اور پھر ان دونوں گروہوں کے اندر باہمی ضِدم ضِدا کے باعث مزید کئی کئی فرقے بن گئے۔ دراصل کسی بھی قوم کی صفوں میں اختلاف کی بنیادی وجہ غلبہ حاصل کرنے کی وہ خواہش (urge to dominate) ہوتی ہے جو اس کے ہر دھڑے میں پائی جاتی ہے۔ ان اختلافات سے تفرقہ بازی جنم لیتی ہے جس کے باعث بالآخر اس قوم کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔

﴿اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝۱۷﴾ ''یقیناً آپ کا رب فیصلہ کر دے گا ان کے مابین قیامت کے دن ان تمام باتوں کا جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔''

آیت ۱۸ ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰي شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا﴾ ''پھر (اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو قائم کر دیا دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر' تو آپ اسی کی پیروی کریں''

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی آخر الزماں ﷺ تک تمام انبیاء و رسل علیہم السلام اسی دین کی دعوت کے لیے مبعوث ہوئے۔ سورۃ الشوریٰ میں اس نکتے کی وضاحت ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى ۭ..﴾ (آیت ۱۳) ''(اے مسلمانو!) اُس نے تمہارے لیے دین میں وہی کچھ مقرر کیا ہے جس کی وصیت اُس نے نوحؑ کو کی تھی اور جس کی وحی ہم نے (اے محمد ﷺ) آپ کی طرف کی ہے اور جس کی وصیت ہم نے کی تھی ابراہیمؑ کو' موسیٰؑ کو' اور عیسیٰؑ کو.....'' بہر حال ''امر اللہ'' یعنی اللہ کا دین تو شروع سے ایک ہی ہے۔ البتہ ہر زمانے کے تقاضوں کے لحاظ سے شریعتیں مختلف رہی ہیں' مثلاً شریعتِ موسویؑ کے بعض احکام شریعتِ محمدیؐ کے بعض احکام سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ آیت زیر مطالعہ کا مفہوم لفظ ''شَرِيْعَةٍ'' کے حوالے سے یہ ہے کہ اے محمد (ﷺ) بنی اسرائیل کے بعد ہم نے آپ کو اپنے دین کا آخری اور تکمیلی ایڈیشن شریعتِ محمدیؐ کے نام سے اس سند کے ساتھ عطا کیا ہے کہ: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ﴾ (المائدۃ:۳) ''آج کے دن مَیں نے تمہارے لیے تمہارے دین کی تکمیل فرما دی ہے اور تم پر اتمام فرما دیا ہے اپنی نعمت کا اور تمہارے لیے میں نے پسند کر لیا ہے اسلام کو بحیثیت دین کے''۔ چنانچہ اب آپ اور آپ کے پیروکار اسی شریعت کا اتباع کریں۔

* اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی کتاب ''سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں کا ماضی' حال اور مستقبل' لائقِ مطالعہ ہے۔ (مرتب)

﴿وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾﴾ ''اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کیجیے جن کے پاس کوئی علم ہی نہیں ہے۔''

آیت ﴿اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ﴾ ''یہ لوگ اللہ کے مقابلے میں آپ کے کچھ بھی کام نہیں آسکیں گے۔''

یہ مضمون قرآن میں متعدد بار آ چکا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں یوں فرمایا گیا: ﴿وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿۷۳﴾ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ﴿۷۴﴾ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾﴾ ''اور یہ لوگ اس بات پر تُلے ہوئے ہیں کہ آپ کو پھسلا دیں اس وحی سے جو ہم نے آپ کی طرف کی ہے تاکہ اس کے علاوہ آپ کوئی اور چیز گھڑ کر ہم سے منسوب کر دیں' اور اگر آپ (بالفرض) ایسا کرتے تب تو یہ لوگ آپ کو اپنا دوست بنا لیتے۔ اور اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو عین ممکن تھا کہ آپ ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک ہی جاتے۔ (اگر ایسا ہو جاتا تو) تب ہم آپ کو دگنی سزا دیتے زندگی میں اور دگنی سزا دیتے موت پر' پھر نہ پاتے آپ اپنے لیے ہمارے مقابلے میں کوئی مددگار۔''

﴿وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹﴾﴾ ''اور یقیناً یہ ظالم (مشرک) لوگ ایک دوسرے کے مددگار ہیں' جبکہ اللہ مددگار ہے متقین کا۔''

آیت ﴿هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۲۰﴾﴾ ''یہ ہیں آنکھیں کھولنے والی باتیں لوگوں کے لیے اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کے لیے جو ان پر یقین کریں۔''

آیت ﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ﴾ ''جو لوگ بُری باتوں کا ارتکاب کر رہے ہیں کیا انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم انہیں ان لوگوں کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے؟''

﴿سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۭ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''کہ ان کی زندگی اور موت ایک جیسی ہو جائے؟ بہت بُرا فیصلہ ہے جو یہ لوگ کر رہے ہیں!''

قیامت کے حساب اور آخرت کی زندگی کے بارے میں عقلی اور منطقی سطح پر یہ ایک مضبوط دلیل ہے۔ اگر دنیا کے نیکوکاروں کو کوئی جزا و انعام نہ ملے' مجرموں کو اپنے جرائم کی سزا نہ بھگتنی پڑے اور نیک و بد سب برابر ہو جائیں تو اس سے بڑا ظلم بھلا اور کیا ہوگا؟ دنیا میں کچھ لوگ تو وہ ہیں جو حرام و حلال کی تمیز ختم کر کے اور جائز و ناجائز کی پابندیوں سے بے نیاز ہو کر عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دوسری طرف اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جو زندگی کے ہر معاملے میں ہمیشہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ وہ اپنے فائدے کے لیے کسی کا حق نہیں مارتے۔ وہ فاقوں سے رہنا برداشت کر لیتے ہیں مگر حرام نہیں کھاتے۔ اب فرض کریں کہ اگر دنیا کی زندگی ہی آخری زندگی ہو' نہ آخرت ہو اور نہ ہی مرنے کے بعد بے لاگ حساب و کتاب کا کوئی مرحلہ درپیش ہو' نہ نیک اور دیانت دار لوگوں کے لیے کوئی جزا ہو اور نہ بُرے لوگوں کے لیے کوئی سزا' تو ایسی صورت میں قاتلوں' لٹیروں اور ظالموں کے تو گویا وارے

نیارے ہو گئے' جبکہ نیک' شریف اور دیانتدار قسم کے لوگ سراسر گھاٹے میں رہ گئے۔ اس لیے اگر قیامت قائم نہیں ہوتی' نیکوکاروں کو ان کے نیک اعمال کی جزا نہیں ملتی اور بدکاروں کو ان کے کرتوتوں کا خمیازہ نہیں بھگتنا پڑتا تو یہ بنی نوعِ انسان کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہوگا۔ چنانچہ جو آخرت کو نہیں مانتا وہ دراصل اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کا ہی منکر ہے۔

آیت ۲۲ ﴿وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾﴾ ''اور اللہ نے تو آسمان اور زمین کو حق (عدل) کے ساتھ پیدا کیا ہے تاکہ پورا پورا بدلہ دیا جائے ہر جان کو جو کچھ اُس نے کمایا ہو' اور ان پر کوئی ظلم نہ ہو۔''

آیت ۲۳ ﴿اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ﴾ ''کیا آپ نے دیکھا اُس شخص کو جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے؟''

اس سے قبل یہ مضمون سورۃ الفرقان کی آیت ۴۳ میں بھی آ چکا ہے۔ یہاں اس کا اعادہ دراصل زیر مطالعہ آٹھ سورتوں (سورۃ الزمر تا سورۃ الاحقاف) کے مرکزی مضمون کے سیاق و سباق میں ہوا ہے۔ چنانچہ آیت کا مفہوم سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس مضمون کے ذیلی عنوانات کی ترتیب کو ایک دفعہ پھر سے ذہن میں تازہ کر لیا جائے۔ ان آٹھ سورتوں میں سے پہلی چار سورتوں (الزمر تا الشوریٰ) میں ''توحیدِ عملی'' کا مضمون ایک خاص ترتیب اور تدریج کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ سورۃ الزمر میں تکرار کے ساتھ تاکید کی گئی ہے کہ اللہ کی بندگی کرو اُس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے: ﴿قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴿۱۱﴾﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے: مجھے حکم ہوا ہے کہ میں بندگی کروں اللہ کی اس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے''۔ اللہ کی اطاعت سے منہ موڑ کر کسی اور کی اطاعت کرنا شرک ہے اور مخلوق میں سے کسی کی ایسی اطاعت کرنا بھی شرک ہے جس سے خالق کی معصیت کا ارتکاب ہوتا ہو۔ اس کے بعد سورۃ المؤمن میں توحیدِ عملی کے داخلی پہلو (دعا) کو اُجاگر کیا گیا ہے اور بار بار حکم دیا گیا ہے: ﴿فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ کہ اللہ سے دعا کرو اُس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔ اس طرح ان دونوں سورتوں میں توحیدِ عملی کا مضمون اپنے خارجی اور داخلی دونوں پہلوؤں سے ایک فرد کی حد تک مکمل ہو گیا ہے۔

اس کے بعد اگلی دو سورتوں (سورۂ حٰمٓ السجدۃ اور سورۃ الشوریٰ) میں توحیدِ عملی کو فرد سے اجتماعیت کی طرف بڑھایا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں توحید کی دعوت کو لوگوں تک پہنچانے کا حکم دیا گیا ہے اور اس دعوت کی فضیلت کو اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۳﴾﴾ ''اور اُس شخص سے بہتر بات اور کس کی ہوگی جو بلائے اللہ کی طرف اور وہ نیک عمل کرے اور کہے کہ میں بھی مسلمانوں میں سے ہوں!'' اس دعوت کا ذریعہ (medium) چونکہ قرآن ہے اس لیے اسی نسبت سے سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں قرآن کی عظمت کا ذکر تکرار کے ساتھ (چھ مرتبہ) آیا ہے۔ اس کے بعد سورۃ الشوریٰ کا مرکزی مضمون اقامتِ دین ہے۔ تدریج کے حوالے سے اس کی وضاحت یوں ہوگی کہ جو لوگ توحید کی دعوت پر لبّیک کہیں انہیں منظم کر کے ایک قوت میں تبدیل کیا جائے۔ پھر یہ سب لوگ مل کر باطل کے تسلط کو ختم کرنے اور معاشرے میں اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے جدّوجُہد کریں۔ اس طرح ان چار سورتوں میں ''توحیدِ عملی'' کے مضمون کو فرد سے لے کر ایک ترتیب اور تدریج کے ساتھ اجتماعی نظام کی سطح تک مکمل کر دیا گیا ہے۔

اس کے بعد سورۃ الزخرف اور سورۃ الجاثیہ میں اس مضمون (توحید فی الاطاعت) کے تقابل کے طور پر شرک فی الاطاعت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ سورۃ الزخرف میں اجتماعیت کی بلند ترین سطح یعنی حاکمیت کی سطح کے شرک کا حوالہ ہے جبکہ سورۃ الجاثیہ میں (خصوصی طور پر آیت زیر مطالعہ میں) انفرادی سطح کے شرک کا ذکر ہے۔ جہاں تک اجتماعیت کی سطح پر شرک کا تعلق ہے اس کو یوں سمجھئے کہ ''انسانی حاکمیت'' کا تصور شرک کی بدترین شکل ہے' کیونکہ حاکم مطلق تو صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ سورۂ یوسف میں ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۴۰) کہ اختیارِ مطلق تو صرف اللہ ہی کا ہے۔ اس حوالے سے سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت کا یہ اعلان: ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ﴾ ''اور نہیں ہے اُس کا کوئی شریک بادشاہی میں'' اور سورۃ الکہف کی آیت ۲۶ کے یہ الفاظ ﴿وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾﴾ ''اور وہ شریک نہیں کرتا اپنے حکم میں کسی کو بھی'' اپنے معانی و مفہوم میں بہت واضح ہیں۔ اب ایسے واضح احکام کے بعد اگر کوئی انسان ''حاکمیتِ مطلق'' کا دعویٰ کرے تو یہ گویا خدائی کا دعویٰ ہے اور یوں یہ شرک کی بدترین شکل ہے۔ اسی شرک کا علمبردار نمرود تھا اور اسی جرم کا مرتکب فرعون بھی ہوا تھا۔ سورۃ الزخرف میں فرعون کے نعرۂ شرک کا ذکر یوں آیا ہے: ﴿وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۱﴾﴾ ''اور فرعون نے اپنی قوم میں ڈھنڈورا پٹوا دیا' اس نے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! کیا مصر کی حکومت میری نہیں ہے اور یہ تمام نہریں میرے حکم کے تحت نہیں بہتی ہیں؟ تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟''

شرک فی الاطاعت کا دوسرا پہلو انفرادی ہے' جس کا ذکر آیت زیر مطالعہ میں آیا ہے۔ اس آیت میں ایک ایسے شخص کی مثال بیان ہوئی ہے جس نے اپنی زندگی میں اللہ کے حکم کے مقابلے میں اپنے نفس کی خواہش پر چلنے کا طرزِ عمل اپنا رکھا ہے اور وہ اپنے نفس کے تقاضوں اور اس کی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے حلال و حرام کی تمیز روا نہیں رکھتا۔ ایسے شخص نے اپنے عمل سے گویا ثابت کر دیا ہے کہ اُس کا معبود اللہ نہیں' بلکہ اُس کا نفس ہے۔ اور وہ حقیقت میں اللہ کا نہیں اپنے نفس کا ''بندہ'' ہے۔ حضور ﷺ نے ایسے ہی شخص کو درہم و دینار کا بندہ قرار دیا ہے۔ آپؐ کا فرمان ہے: ((تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ)) [1] ''ہلاک ہو جائے درہم و دینار کا بندہ''۔ یہ دراصل وہ شخص ہے جو دولت کی محبت میں اللہ تعالیٰ کے احکام اور حلال و حرام کی تمیز کو بالکل پسِ پشت ڈال چکا ہے۔ اب اس کے والدین نے اس کا نام ''عبد الرحمٰن'' ہی کیوں نہ رکھا ہو' لیکن اس کے عمل سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ اصل میں وہ ''عبد الدینار'' ہے۔

بہرحال سورۃ الزخرف میں شرک فی الاطاعت کا ذکر معاشرے کی بلند ترین سطح یعنی ریاست اور حاکمیت کی سطح پر ہوا ہے' جبکہ زیر مطالعہ سورت کی اس آیت میں اس کی دوسری انتہا یعنی انفرادی سطح کے شرک کا بیان ہے۔ شرک کی باقی تمام صورتیں ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہیں۔ آیت میں استفسار کے اسلوب سے زورِ کلام خاص طور پر زیادہ ہو گیا ہے کہ کیا آپ نے کبھی ایسے شخص کی عبرتناک حالت پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے؟

﴿وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ﴾ ''اور اللہ نے اُسے گمراہ کر رکھا ہے اُس کے علم کے باوجود''

ہو سکتا ہے وہ کوئی بہت بڑا عالم ہو یا اعلیٰ پائے کا محقق ہو یا کوئی نامور سائنسدان ہو' مگر جس انسان نے اپنے نفس کا بندہ بن کر رہنا قبول کر لیا ہو اُس کی علمی اہلیت' تحقیقی استعداد اور سائنٹیفک اپروچ اُسے نہ تو اللہ کی اطاعت کی راہ دکھا سکتی ہے' اور نہ ہی اس کے دل کو

۱۔ صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب الحراسة فی الغزو' ح: ۲۸۸۷۔

ایمان اور اللہ کی معرفت کے نور سے منور کر سکتی ہے۔ ایسے بدقسمت لوگوں پر ہدایت کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے جاتے ہیں: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۠﴾ (البقرۃ:۷)۔ سورۃ البقرۃ کی اس آیت کے الفاظ سے ملتے جلتے الفاظ دیکھیے یہاں بھی آ گئے ہیں:

﴿وَّخَتَمَ عَلٰي سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰي بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۭ﴾ ''اور اللہ نے اُس کی سماعت اور اُس کے دل پر مہر لگا دی ہے اور اُس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔''

اس مہر اور اس پردے کی کیفیت کا عملی مشاہدہ کرنا ہو تو آج کے سائنسدانوں کو دیکھ لیجیے۔ انہوں نے سات سمندروں کے پانیوں کو کھنگال مارا ہے، روئے ارضی کے ذرّے ذرّے کی چھان پھٹک وہ کر چکے ہیں۔ خلا کی وسعتوں کے اندر دور دور تک وہ جھانک آئے ہیں۔ غرض سائنسی کرشموں کے سبب انہوں نے کائنات کے بڑے بڑے رازوں کو طشت از بام کر دیا ہے، لیکن اس پوری کائنات میں اگر انہیں نظر نہیں آیا تو ایک اللہ نظر نہیں آیا! مذکورہ ''پردہ'' ان کی آنکھوں پر اس قدر دبیز ہو چکا ہے کہ اس پوری کائنات میں کائنات کے خالق کا انہیں کہیں سراغ نہیں ملا۔

﴿فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۲۳﴾ ''تو اللہ کے (اس فیصلے کے) بعد اب کون اُسے ہدایت دے سکتا ہے، تو کیا تم لوگ نصیحت حاصل نہیں کرتے؟''

آیات ۲۴ تا ۳۷

وَ قَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَ مَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝۲۴ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۲۵ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۲۶ ع وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَىِٕذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ۝۲۷ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۭ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۲۸ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۲۹ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۝۳۰ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۣ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝۳۱ وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ۝۳۲ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۳۳ وَ قِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ

كَمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَأْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۳۴﴾ ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۳۵﴾ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۶﴾ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۷﴾ ع ۴

آیت ۲۴ ﴿وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا﴾ ''وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہے (کوئی اور زندگی) سوائے ہماری دنیا کی زندگی کے' ہم خود ہی مرتے ہیں اور خود ہی جیتے ہیں''

اس ایک جملے میں یوں سمجھئے کہ دہریت اور مادّیت (Materialism) کی پوری حقیقت سمو دی گئی ہے۔ اس فلسفے کے مطابق اس کائنات کی اصل اور سب سے بڑی حقیقت مادّہ (matter) ہے' مادّے کے علاوہ کسی اور شے کا کوئی وجود نہیں' مادّے کی اپنی صفات ہیں' کائنات میں جہاں کہیں بھی کوئی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی تبدیلی آتی ہے وہ مادّے کی ہیئت میں تبدیلیوں (physical and chemical changes) کے باعث ہی ممکن ہے۔ یہ کائنات مادّے سے خود ہی وجود میں آئی تھی اور مادّے کے اٹل قوانین کے باعث خود ہی چل رہی ہے۔ انسانی زندگی بھی انہی اٹل قوانین کے تابع ہے۔ انہی لگے بندھے قوانین کے تحت انسان پیدا ہوتے ہیں' اپنی طبعی عمر کے مطابق زندہ رہتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ نہ تو مرنے کے بعد انسان دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس زندگی کے بعد کسی اور زندگی کا کوئی امکان ہے۔ یہ فلسفۂ دہریت کے بنیادی نکات ہیں' جبکہ تجربیت پسندی بحیثیت نظریہ علم (Empiricism) اور منطقی اثباتیت (Logical Positivism) بھی اسی فلسفے کی ذیلی شاخیں ہیں اور مذکورہ نکات ان سب کے ہاں مشترک ہیں۔

﴿وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ﴾ ''اور ہمیں نہیں ہلاک کرتا مگر زمانہ''

کہ ہم تو محض زمانے کی گردش سے ہلاک ہوتے ہیں۔ نہ تو کوئی اللہ ہے جو انسانوں کی موت کے پروانے جاری کرتا ہو اور نہ ہی کسی فرشتے وغیرہ کا کوئی وجود ہے جو آ کر کسی کی جان قبض کرتا ہو۔

﴿وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۲۴﴾﴾ ''حالانکہ ان کے پاس (اس بارے میں) کوئی علم نہیں ہے' وہ تو صرف ظن سے کام لے رہے ہیں۔''

محض اٹکل کے تیر تکے چلا رہے ہیں۔

آیت ۲۵ ﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۵﴾﴾

''اور جب انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں ہماری روشن آیات تو نہیں ہوتی ان کی کوئی دلیل سوائے اس کے کہ وہ کہتے ہیں کہ (زندہ کر کے) لے آؤ ہمارے آباء و اجداد کو اگر تم سچے ہو!''

اس ضمن میں ان کے پاس واحد حجت اور دلیل یہی ہوتی ہے کہ چلو اگر تم ہمارے فوت شدہ آباء و اجداد کو زندہ کر کے ہمارے پاس لے آؤ تو ہم بعث بعد الموت کے تمہارے دعوے کو مان لیں گے۔

آیت ۲۶ ﴿قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے کہ اللہ ہی تمہیں زندہ کرتا ہے' پھر وہی تمہیں موت دے گا''

کہ میں نے تو کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں کسی کو زندہ کروں گا۔ ہر کسی کی زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ اب وہ حضرات جو اس کائنات اور انسانی زندگی کو مادّیت اور دہریت کی عینک سے دیکھتے ہیں' انہیں یہ بات بھلا کیونکر سمجھ میں آسکتی ہے کہ ہم اس سے پہلے ایک زندگی اور ایک موت کے مراحل طے کر کے اس دنیا میں آئے ہیں! (وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو: سورۃ المؤمن' تشریح آیت ۱۱)

﴿ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۲۶﴾ ''پھر تمہیں جمع کرے گا قیامت کے دن جس میں کوئی شک نہیں' لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔''

آیت ۲۷ ﴿وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی۔''

﴿وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ۝۲۷﴾ ''اور جس دن قیامت قائم ہوگی اُس دن جھٹلانے والے بڑے خسارے میں ہوں گے۔''

جو لوگ حق کو باطل قرار دے رہے ہیں' روزِ محشر انہیں عظیم خسارے کا سامنا کرنا ہوگا۔

آیت ۲۸ ﴿وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۚ﴾ ''اور تم دیکھو گے کہ ہر اُمت گھٹنوں کے بل پڑی ہوگی۔''

﴿كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ﴾ ''ہر اُمت کو بلایا جائے گا اُس کے اعمال نامے کی طرف۔''

وہاں سرِ محشر باری باری ندا ہوگی کہ فلاں قوم کو لے آیا جائے اور ان کا اعمال نامہ پیش کیا جائے۔

﴿اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۲۸﴾ ''آج تمہیں بدلہ دیا جائے گا اُن اعمال کا جو تم کرتے رہے ہو۔''

آیت ۲۹ ﴿هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ﴾ ''یہ ہمارا (تیار کردہ) اعمال نامہ ہے جو تمہارے اوپر حق کے ساتھ گواہی دے گا۔''

یہ وہ ریکارڈ ہے جس میں ہم نے تمہارے ایک ایک عمل کو محفوظ کر رکھا ہے۔ یہ ابھی تمہاری ایک ایک حرکت کی ٹھیک ٹھیک تفصیل بتا دے گا اور تمہارے خلاف بالکل ٹھیک ٹھیک گواہی دے گا۔

﴿اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۲۹﴾ ''جو کچھ تم کیا کرتے تھے ہم اُسے لکھواتے جا رہے تھے۔''

اس ''لکھنے'' کے مفہوم میں بہت وسعت اور جامعیت ہے۔ عام طور پر ہمارا ذہن لکھنے کے انسانی طور طریقوں کی طرف جاتا ہے۔ لیکن ان طریقوں میں بھی دیکھتے ہی دیکھتے ایسی تبدیلیاں آچکی ہیں جن کے بارے میں زمانہ ماضی میں کبھی ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ ہم قلم اور دوات سے لکھا کرتے تھے مگر آج اس سے کہیں بہتر لکھائی کمپیوٹر کے ذریعے سے ہو جاتی ہے۔ پھر آڈیو/ویڈیو ریکارڈنگ بھی تحریر ہی کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کے ہاں کی لکھائی کا تصور ہمارے ذہن سے بہت بالا ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہر انسان کی زندگی کے ایک ایک عمل اور ایک ایک لمحے کی تفصیلی روداد تیار ہو رہی ہے۔ وقت آنے پر بس ایک اشارہ ہوگا اور متعلقہ انسان کی زندگی کی مکمل تصویر سامنے آجائے گی۔

آیت ۳۰ ﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''پس جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے ہوں گے''

﴿فَیُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِیْ رَحْمَتِهٖ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِیْنُ ۝۳۰﴾ ''تو ان کو داخل کر دے گا ان کا پروردگار اپنی رحمت میں۔ یہ بہت واضح کامیابی ہوگی۔''

آیت ۳۱ ﴿وَاَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۫﴾ ''اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا''

﴿اَفَلَمْ تَكُنْ اٰیٰتِیْ تُتْلٰى عَلَیْكُمْ﴾ ''(ان سے اللہ پوچھے گا کہ) کیا تمہیں میری آیات پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں؟''

اس آیت میں اگرچہ کُفار کا ذکر ہے' لیکن اس مفہوم کی آیات کے حوالے سے یہ اہم نکتہ مدِنظر رہے کہ ہم بھی جب قرآن سنتے ہیں تو اپنے اور پڑھ کر سنانے والے کے بارے میں اس جملے کا مفہوم ضرور یاد رکھنا چاہیے۔ اسی طرح ان سطور کو پڑھنے والے ہر قاری کے ذہن میں بھی یہ تصور ضرور ہونا چاہیے کہ قرآن کا پیغام اُس تک پہنچ گیا ہے اور وہ اس کے بارے میں ضرور مسئول ہوگا۔

﴿فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ ۝۳۱﴾ ''تو تم نے استکبار کیا اور تم مجرم لوگ تھے۔''

ہماری آیات کے آگے سر جھکانے اور ہمارے احکام کو تسلیم کرنے کے بجائے تم نے استکبار کا رویہ اپنایا' اس لحاظ سے واقعی تم بہت بڑے مجرم تھے۔

آیت ۳۲ ﴿وَاِذَا قِیْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَیْبَ فِیْهَا﴾ ''اور جب کہا جاتا کہ اللہ کا وعدہ سچ ہے اور قیامت آنے میں کوئی شک نہیں''

﴿قُلْتُمْ مَّا نَدْرِیْ مَا السَّاعَةُ﴾ ''تو تم کہتے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا ہوتی ہے''

السّاعۃ (قیامت کی موعودہ گھڑی) کا ذکر سن کر تم کہا کرتے تھے کہ ہم کسی ساعت واعت کو نہیں جانتے۔ تمہارے یہ گستاخانہ جملے ہمارے پاس ریکارڈ میں موجود ہیں۔

﴿اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا﴾ ''ہاں ہمیں ایک گمان سا تو ہوتا ہے''

لیکن کبھی کبھی تم قیامت کا ذکر سن کر یوں بھی کہا کرتے تھے کہ ہاں قیامت کے قائم ہونے اور آخرت کی زندگی کے بارے میں ہمیں گمان سا تو ہوتا ہے' ایک خیال سا تو آتا ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ نیکی و بدی کے فرق اور سزا و جزا کی منطق کو تم لوگ خوب سمجھتے تھے۔ تم جانتے تھے کہ پیشہ ور مجرم اور نیک لوگ برابر نہیں ہو سکتے۔ کبھی کسی مظلوم کی بے بسی کو دیکھ کر تمہارے ذہن میں یہ سوال بھی چپک جاتا تھا کہ اس بے چارے کی کہیں تو دادرسی ہونی چاہیے اور کبھی کبھی تمہارا ضمیر تمہیں یہ بھی یاد دلایا کرتا تھا کہ ظالموں کو قرار واقعی سزا دلوانے کے لیے کوئی مؤثر اور قطعی نظام تو ضرور ہونا چاہیے۔ لیکن پھر دُنیوی مفادات کی یلغار کو اپنے سامنے پا کر ایسی ہر سوچ کو مفروضہ قرار دے کر تم جھٹک دیا کرتے تھے۔

﴿وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ ۝۳۲﴾ ''اور ہم اس کا یقین کرنے والے نہیں ہیں۔''

یہاں پر ''یقین'' کا لفظ بہت اہم اور معنی خیز ہے۔ دراصل ''آخرت'' کو ایک رسمی نظریے کے طور پر تسلیم کر لینا کافی نہیں۔ اس ''ایمان'' کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے اس کے بارے میں دل میں گہرا یقین ہونا بہت ضروری ہے۔ جب تک دل میں بعث بعد الموت اور آخرت کا پختہ یقین نہیں ہوگا انسان کا کردار درست نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات میں متقین کی صفات کے حوالے سے جہاں غیب اور الہامی کتب پر ''ایمان لانے'' کی شرط کا ذکر ہے وہاں آخرت کے بارے میں ''یقین رکھنے'' کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے: ﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴﴾۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کے بارے میں دل کے اندر گہرا یقین رکھے بغیر مقامِ تقویٰ تک پہنچنا ممکن ہی نہیں۔ چنانچہ آج اگر ہم اپنے گریبانوں میں جھانکیں تو وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ کے الفاظ میں ہمیں اپنی باطنی کیفیت کی جھلک بھی نظر آئے گی۔ ہم موروثی مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک عقیدے کے درجے میں تو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن کیا دوبارہ جی اٹھنے اور اللہ کی عدالت میں پیش ہونے کا پختہ یقین ہمارے دلوں میں موجود ہے؟ اس سوال کا جواب ہم میں سے ہر شخص کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں جھانک کر تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ یقین کی مطلوبہ کیفیت تک کیسے پہنچا جائے تو اس کا جواب ہمیں سورۃ الحدید کے مطالعہ کے دوران ملے گا۔

آیت ۳۳ ﴿وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا﴾ ''اور ان کے سامنے آجائیں گے ان کے وہ تمام بُرے اعمال جو انہوں نے کیے تھے''

﴿وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۳۳﴾ ''اور انہیں گھیرے میں لے لے گی وہی چیز جس کا وہ استہزا کیا کرتے تھے۔''

دنیا میں وہ لوگ جہنم کا مذاق اڑایا کرتے تھے، چنانچہ وہی جہنم انہیں اپنی آغوش میں لینے کے لیے وہاں موجود ہوگی۔

آیت ۳۴ ﴿وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا﴾ ''اور ان سے کہہ دیا جائے گا کہ آج ہم تمہیں اسی طرح نظر انداز کر دیں گے جیسے تم نے اس دن کی ملاقات کو نظر انداز کر رکھا تھا''

﴿وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝۳۴﴾ ''اور تمہارا ٹھکانہ اب آگ ہے اور تمہارے لیے کوئی مددگار نہیں ہے۔''

چنانچہ اب تمہارے رونے دھونے اور چیخنے چلّانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اب تمہیں اس عذاب سے چھڑانے کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔

آیت ۳۵ ﴿ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ﴾ ''یہ اس لیے کہ تم نے اللہ کی آیات کو مذاق بنا لیا تھا اور دنیا کی زندگی نے تمہیں دھوکے میں ڈالے رکھا۔''

﴿فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ۝۳۵﴾ ''تو آج انہیں نکالا نہیں جائے گا اس سے اور نہ ہی انہیں موقع دیا جائے گا کہ وہ توبہ کر لیں۔''

اب ان کے لیے موقع نہیں ہوگا کہ معافی مانگ کر اپنے ربّ کو راضی کر لیں۔ توبہ کا موقع تو دنیا میں تھا اور وہ موقع وہ لوگ کھو چکے ہوں گے۔

آیت ۳۶ ﴿فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۳۶﴾ ''پس کُل تعریف اور کُل شکر اللہ ہی کے لیے ہے جو آسمانوں کا اور زمین کا رب ہے اور تمام جہانوں کا ربّ ہے۔''

آیت ۳۷ ﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۳۷﴾ ''اور اُسی کے لیے ہے بڑائی آسمانوں اور زمین میں۔ اور وہی ہے زبردست' حکمت والا۔''

اللہ اکبر! یقیناً اللہ سب سے بڑا ہے! وہ آسمانوں میں بھی سب سے بڑا ہے اور وہ زمین میں بھی سب سے بڑا ہے۔ مگر زمین میں عملی طور پر اُسے بڑا نہیں مانا جا رہا۔ زمین میں اللہ کے بندے اللہ سے بغاوت کر چکے ہیں۔ وہ اللہ کے قوانین کو پسِ پشت ڈال کر اپنی مرضی کی قانون سازی کر رہے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ کسی ملک کے عوام ہی اس کے اقتدارِ اعلیٰ (sovereignty) کے اصل مالک ہیں۔ لیکن یاد رکھیے! ''حاکمیت'' کا یہی دعویٰ سب سے بڑا کفر اور سب سے بڑا شرک ہے' چاہے یہ دعویٰ فردِ واحد کرے یا پوری قوم مل کر کرے۔ اس حوالے سے بائبل میں موجود Lord's Prayer کے یہ الفاظ بہت اہم ہیں۔ اس دعا میں اسی دعوے کو ختم کرنے' اسی کفر و شرک کو مٹانے اور آسمانوں کی طرح زمین پر بھی اللہ کی مرضی نافذ کرنے کا ذکر ہے:

Thy Kingdom come
Thy will be done on Earth
As it is in Heavens

کہ اے اللہ! تیری بادشاہت آئے۔ تیری مرضی جیسے آسمانوں میں پوری ہو رہی ہے ویسے ہی زمین پر بھی پوری ہو۔ آسمانوں کی مخلوق تو تیرے احکام کو من و عَن تسلیم کرتی ہے۔ سورج تیری مرضی کے مطابق رواں دواں ہے۔ چاند تیرے حکم کا تابع ہے اور تمام کہکشائیں تیری مشیت کے سامنے سرنگوں ہیں' لیکن ایک زمین ہے کہ جس کے بحر و بَر کو انسان نے اپنے کرتوتوں کے سبب فساد سے بھر دیا ہے: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ﴾ (الروم: ۴۱)..... اس لیے ضروری ہے کہ اللہ کی مرضی جیسے آسمانوں پر نافذ ہے ویسے ہی زمین پر بھی نافذ ہو۔ زمین پر بھی اللہ کے حکم کو سپریم لاء کا درجہ حاصل ہو' اسی قانون کے مطابق فیصلے ہوں۔ اسی کیفیت کا نام ''اقامتِ دین'' ہے' جس کے لیے ''تنظیم اسلامی'' جِدّ و جُہد میں مصروف ہے۔

سُوْرَةُ الْاَحْقَافِ

آیات ۱ تا ۱۴

سُوْرَةُ الْاَحْقَافِ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۳۵ رُكُوْعَاتُهَا: ۴

حٰمٓ ۚ﴿۱﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا
بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ﴿۳﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ
مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ؕ
اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴﴾ وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ
يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۵﴾ وَ
اِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّ كَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۶﴾ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا
بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ
اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًا
بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۸﴾ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَ مَآ اَدْرِيْ مَا
يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ؕ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ وَ مَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۹﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ
اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ كَفَرْتُمْ بِهٖ وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ
وَاسْتَكْبَرْتُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ
كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ؕ وَ اِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ﴿۱۱﴾ وَ مِنْ
قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّ رَحْمَةً ؕ وَ هٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْا ۖ وَ بُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ
لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۳﴾ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

ع

آیت ۱ ﴿حٰمٓ ۝۱﴾ ''ح م۔''

آیت ۲ ﴿تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝۲﴾ ''اس کتاب کا اتارا جانا ہے اُس اللہ کی طرف سے جو زبردست' کمال حکمت والا ہے۔''

قبل ازیں سورۃ الجاثیہ کی آیت ۲ کے ضمن میں بھی ذکر ہو چکا ہے کہ سورۃ الجاثیہ اور سورۃ الاحقاف کے آغاز کی آیات مشترک ہیں۔

آیت ۳ ﴿مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ﴾ ''اور ہم نے نہیں پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے مابین ہے مگر حق کے ساتھ''

یہ ایک مستحکم نظام اور ایک بامقصد تخلیق ہے۔ ہم نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ سورۃ الدخان میں اس بارے میں یوں فرمایا گیا ہے: ﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝۳۸﴾ ''اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے مابین ہے محض کھیل کے طور پر تو تخلیق نہیں فرمایا۔''

﴿وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ﴾ ''اور ایک اجل معین کے لیے''

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ۝۳﴾ ''اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ اعراض کر رہے ہیں اس سے جس سے انہیں خبردار کیا جا رہا ہے۔''

اس جملے میں الفاظ کی ترتیب دراصل یوں ہے: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْرِضُوْنَ عَمَّآ اُنْذِرُوْا۔ لیکن ایک مخصوص صوتی آہنگ (rhythm) برقرار رکھنے کے لیے یہاں الفاظ میں تقدیم و تاخیر کی گئی ہے۔ میں ''تعارفِ قرآن'' پر اپنے لیکچرز میں قرآن کے صوتی آہنگ پر گفتگو کرتے ہوئے یہ وضاحت کر چکا ہوں کہ ہم معروف معنوں میں جسے شاعری کہتے ہیں قرآن ویسی شاعری تو نہیں ہے لیکن ایک خاص آہنگ اور روانی کی وجہ سے قرآن کی آیات میں blank verse کا سا انداز پایا جاتا ہے اور جملوں میں الفاظ کی تقدیم و تاخیر ہو جاتی ہے۔ اور غالباً یہ قرآنی اسلوب ہی دنیا میں blank verse کے رواج کا باعث بنا ہے۔

آیت ۴ ﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ان سے کہیے کہ کبھی تم نے غور بھی کیا کہ جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو' مجھے دکھاؤ تو سہی کہ انہوں نے کیا پیدا کیا ہے زمین میں؟''

﴿اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۭ﴾ ''یا اُن کی کوئی شراکت ہے آسمانوں میں؟''

﴿اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۴﴾ ''لاؤ میرے پاس کوئی کتاب اس سے پہلے کی یا کوئی ایسی روایت جس کی بنیاد علم پر ہو اگر تم سچے ہو!''

اپنے ان معبودوں کے بارے میں مجھ سے کسی الہامی ثبوت یا علمی اور منطقی دلیل سے بات کرو۔

آیت ۵ ﴿وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ ''اور اُس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ کے سوا اُسے پکارتا ہے جو اُس کو جواب ہی نہیں دے سکتا قیامت کے دن تک''

وہ نہ تو ان کی دعاؤں کو سن سکتے ہیں اور نہ قبول کر سکتے ہیں۔

﴿وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝۵﴾ ''اور وہ ان کی دعا سے غافل ہیں۔''

وہ ان کے پکارنے سے بے خبر ہیں۔ انہیں تو پتا ہی نہیں کہ کوئی ان سے دعا مانگ رہا ہے۔ مشرکین اللہ تعالیٰ کے سوا جن معبودوں کو پکارتے ہیں ان میں کچھ تو بے جان اور بے عقل مخلوقات ہیں۔ ان کا تو اپنے پکارنے والوں کی دعاؤں سے بے خبر ہونا ظاہر ہی ہے۔ ان کے علاوہ کچھ بزرگ انسانوں کو بھی پکارا جاتا ہے۔ وہ اللہ کے ہاں اس عالم میں ہیں کہ جہاں انسانی آوازیں ان تک نہیں پہنچتیں۔ فرض کیجیے ایک شخص کسی بڑے ولی اللہ کو اپنی مدد کے لیے پکار رہا ہے تو علیین میں موجود اُس کی روح کو کیا معلوم کہ دنیا میں اس کا کوئی معتقد اُسے پکار رہا ہے۔

آیت ۶ ﴿وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۝۶﴾ ''اور جب لوگوں کو جمع کیا جائے گا تو وہ ان کے دشمن بن جائیں گے اور وہ ان کی عبادت کے منکر ہوں گے۔''

قیامت کے دن وہ پیغمبر، وہ فرشتے اور وہ اولیاء اللہ جن کو لوگ مدد کے لیے پکارتے ہیں اور ان سے دعا کرتے ہیں، وہ اپنے ان ''عقیدت مندوں'' سے ناراضگی اور دشمنی کا اظہار کریں گے کہ انہوں نے اللہ کے سامنے انہیں شرمسار کیا کہ انہیں اللہ کا مدِمقابل ٹھہرایا۔ اس معاملے کی ''حساسیت'' کا اندازہ اس سے لگائیں کہ ایک مرتبہ ایک صحابیؓ نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایسے الفاظ ادا کیے: مَا شَاءَ اللّٰهُ وَمَا شِئْتَ یعنی جو اللہ چاہے اور جو آپؐ چاہیں! اس پر آپؐ نے فوراً انہیں ٹوک دیا اور فرمایا: ((اَجَعَلْتَنِي لِلّٰهِ نِدًّا؟))[1] ''کیا تم نے مجھے اللہ کا مدِمقابل بنا دیا ہے؟'' کیونکہ مشیت تو صرف اور صرف اللہ کے لیے ہے۔

آیت ۷ ﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷﴾ ''اور جب انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں ہماری آیاتِ بینات، تو یہ کافر کہتے ہیں حق کے بارے میں، جبکہ وہ ان کے پاس آ گیا، کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔''

آیت ۸ ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ﴾ ''کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے اس کو گھڑ لیا ہے؟''

کیا ان کا خیال ہے کہ محمد ﷺ نے قرآن کو خود تصنیف کیا ہے؟

﴿قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ان سے کہیے کہ اگر میں نے اس کو گھڑ لیا ہے تو تم مجھے اللہ (کی پکڑ) سے ذرا بھی نہیں بچا سکتے۔''

سورۃ الحاقّہ میں یہ مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝۴۴ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝۴۵ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝۴۶﴾ کہ اگر بالفرض محمد (ﷺ) کوئی چیز گھڑ کر ہماری طرف منسوب کر دیں تو ہم ان کا دایاں ہاتھ پکڑیں گے اور پھر ان کی رگِ جاں کو کاٹ دیں گے۔ ظاہر ہے اس اسلوب میں جو غصّہ ہے وہ اُن لوگوں پر ہے جو حضور ﷺ پر ایسا الزام لگانے کی جسارت کرتے تھے۔

۱۔ ان الفاظ میں یہ حدیث علامہ محمد بن عبدالوہاب نے ''کتاب التوحید'' میں نسائی کے حوالے سے درج کی ہے۔ جبکہ مسند احمد میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ((أَجَعَلْتَنِي وَاللّٰهَ عَدْلًا؟)) ''کیا تُو نے مجھے اور اللہ کو برابر کر دیا؟'' (مرتب)

﴿هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ﴾ ''وہ خوب جانتا ہے جن باتوں میں تم لگے ہوئے ہو۔''

اللہ تعالیٰ تمہاری یہ گفتگو بھی سن رہا ہے اور وہ تمہارے دلوں میں چھپے ہوئے خیالات سے بھی آگاہ ہے۔

﴿كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۭ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝۸﴾ ''وہ کافی ہے بطور گواہ میرے اور تمہارے مابین' اور وہ خوب بخشنے والا' بہت رحم فرمانے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے میرے پاس وحی بھیجی ہے اور وہ خوب جانتا ہے کہ میں اُس کا رسول ہوں۔

آیت ۹ ﴿قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ﴾ ''(اے نبی ﷺ! ان سے یہ بھی) کہیے کہ میں کوئی نیا رسول تو نہیں ہوں''

بِدْعًا کے معنی نیا نویلا یا نرالا ہونے کے ہیں۔ لفظ ''بدعت'' بھی اسی مادہ سے مشتق ہے۔ بدعت سے اصطلاحاً وہ چیز مراد ہے جو اصل میں دین کا حصہ نہ ہو بلکہ کسی وجہ سے دین میں رائج کر دی گئی ہو۔ بہر حال یہاں حضور ﷺ سے کہلوایا جا رہا ہے کہ میرا رسولؐ بن کر آنا کوئی نئی بات نہیں ہے' بلکہ میں تو آخری رسولؐ ہوں۔ بہت سے رسولؐ مجھ سے پہلے بھی دنیا میں آ چکے ہیں۔ سورۂ آلِ عمران میں حضور ﷺ کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ﴾ (آیت ۱۴۴) ''اور محمد (ﷺ) اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں' ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں''۔ سورۃ المائدۃ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی بالکل یہی الفاظ آئے ہیں: ﴿مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ﴾ (آیت ۷۵) ''مسیحؑ ابن مریم اور کچھ نہیں سوائے اس کے کہ وہ ایک رسولؑ تھے' انؑ سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے تھے۔''

﴿وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ۭ﴾ ''اور مجھے یہ معلوم نہیں کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا اور نہ یہ کہ تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔''

اس سے آخرت کا معاملہ مراد نہیں ہے' کیونکہ آخرت کے بارے میں تو آنحضور ﷺ کو بہت واضح انداز میں بتا دیا گیا تھا: ﴿وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝۴﴾ (الضحیٰ) یعنی آپؐ کے لیے آخرت یقیناً دنیا سے بہت بہتر ہوگی۔ بلکہ آیت زیر مطالعہ کا اشارہ اس کش مکش کی طرف ہے جو حضور ﷺ اور مشرکینِ مکہ کے درمیان مسلسل جاری تھی۔ جیسے حضور ﷺ ایک اُمید لے کر طائف تشریف لے گئے تھے لیکن وہاں جو کچھ ہوا وہ آپؐ کی توقعات کے بالکل برعکس تھا۔ نبوت کے دسویں سال جب جناب ابوطالب کا انتقال ہو گیا تو آپؐ کے اپنے قبیلے بنو ہاشم نے بھی آپؐ سے اظہارِ براءت کر دیا۔ اس کے بعد مکہ میں دُنیوی اعتبار سے آپؐ کا کوئی حلیف یا حمایتی نہ رہا۔ ان حالات میں آپؐ طائف تشریف لے گئے۔ آپؐ کا خیال تھا کہ اہل طائف میں سے اگر کوئی بڑا سردار ایمان لے آیا تو میں اپنی دعوت کا مرکز وہاں منتقل کر لوں گا۔ لیکن اہلِ طائف کا رویہ اہلِ مکہ سے بھی بدتر نکلا۔ لہٰذا مکہ کے ماحول میں جاری کشیدگی کے حوالے سے یہاں آپؐ سے کہلوایا جا رہا ہے کہ اس چپقلش کے اندر آئندہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے کیا پیش آنے والا ہے اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہونے والا ہے مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔

﴿اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۹﴾ ''میں تو بس اُسی کی پیروی کر رہا ہوں جو میری طرف وحی کی جا رہی ہے' اور میں نہیں ہوں مگر ایک کھلا خبردار کر دینے والا۔''

آیت ۱۰ ﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ بِهٖ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ان سے کہیے کہ کیا تم نے سوچا بھی

ہے کہ اگر یہ (قرآن) واقعتاً اللہ کی طرف سے ہوا اور تم نے اس کا انکار کر دیا (تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا)؟''

تم لوگ مجھے الزام دیتے ہو کہ میں نے یہ قرآن خود گھڑ لیا ہے' لیکن جب تمہیں چیلنج دیا گیا کہ اس جیسی کتاب تم بھی بنا کر دکھاؤ بلکہ ایک سورت ہی بنا لاؤ تو تم اس چیلنج کا جواب نہیں دے سکے' اس لیے دل سے تم بھی مانتے ہو کہ یہ کتاب انسانی تصنیف نہیں ہے۔ بہر حال اگر تم اسے اللہ کا کلام نہیں مانتے تو یہ بات اچھی طرح سے سوچ لو کہ اگر واقعتاً یہ اللہ ہی کا کلام ہوا تو تمہارے اس انکار کا کیا نتیجہ نکلے گا؟

﴿وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ﴾ ''اور گواہی دے چکا ہے ایک گواہ بنی اسرائیل میں سے ایک ایسی ہی کتاب کی۔''

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کے مابین اختلاف ہے۔ اس بارے میں ایک رائے تو یہ ہے کہ اس سے عام اہلِ کتاب مؤمنین مراد ہیں' جبکہ کچھ مفسرین کا خیال ہے کہ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے۔ بظاہر یہ دوسری رائے زیادہ معتبر معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ عہد نامہ قدیم' کتاب استثناء کے اٹھارہویں باب کی آیات ۱۸' ۱۹ میں جو پیشین گوئی درج ہے اس میں یہ الفاظ ہیں: ''اے موسیٰؑ میں ان کے بھائیوں میں سے تیرے مثل ایک پیغمبر اٹھاؤں گا اور اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا''۔ ان الفاظ کے مطابق تو مثلہٖ کا یہی مفہوم واضح ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مثل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی صاحبِ شریعت رسول ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قرآن کی شکل میں آخری اور کامل شریعت عطا کی گئی ہے۔ جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صاحبِ کتاب رسول تو ہیں لیکن صاحبِ شریعت نہیں ہیں۔ سورۃ الزخرف کی آیت ۶۳ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ﴾ کہ میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں۔ سورۃ الزخرف کی اس آیت کے ضمن میں یہ وضاحت بھی گزر چکی ہے کہ انجیل میں احکام اور شریعت نہیں صرف حکمت ہے' جبکہ تورات اور قرآن قانون اور شریعت کی حامل کتابیں ہیں۔

﴿فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ﴾ ''پس وہ تو ایمان لے آیا اور تم استکبار کر رہے ہو!''

یہود میں ایسے علماء بھی تھے (اگرچہ ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی) جو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے۔ جیسے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جو یہود کے بہت بڑے عالم تھے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۰﴾ ''بے شک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

آیت ۱۱ ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ﴾ ''اور کہا اُن لوگوں نے جنہوں نے کفر کی روش اختیار کی' اُن لوگوں کے بارے میں جو ایمان لائے کہ اگر یہ (قرآن) کوئی خیر ہوتا تو یہ لوگ اس کی طرف ہم سے سبقت نہ لے جاتے۔''

یہ سردارانِ قریش کے موقف کا حوالہ ہے کہ ہم بڑے ہیں' دانشور ہیں اور ہر اعتبار سے معاشرے کے سرکردہ لوگ ہیں۔ جب ہم اس دین کی طرف مائل نہیں ہوئے اور ہمیں اس قرآن میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں بھلائی کی کوئی بات ہے ہی نہیں' ورنہ یہ غریب غرباء اور گھٹیا لوگ اس معاملے میں ہم سے سبقت حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر

ایمان لانے والوں میں اگرچہ حضرت عثمان بن عفان، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم جیسے لوگ بھی تھے جن کا تعلق اونچے گھرانوں سے تھا، مگر ابتدا میں زیادہ تر نادار اور مزدور لوگ ہی حضور ﷺ پر ایمان لائے تھے، جن میں کوئی غلام بھی تھے اور شروع شروع میں یہی لوگ زیادہ تر آپؐ کے اردگرد موجود ہوتے تھے۔

چنانچہ جس طرح حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے سرداروں کو اعتراض تھا کہ آپؑ کے پیروکار نچلے طبقے کے لوگ ہیں (ہود:۲۷) اسی طرح مکہ کے سرداروں کو بھی نادار اور غلام اہلِ ایمان کی موجودگی میں حضور ﷺ کی محفل میں بیٹھنا گوارا نہیں تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان مزدوروں، غلاموں اور کمتر حیثیت کے لوگوں کے درمیان آکر بیٹھنا ہمارے شایانِ شان نہیں۔ ہاں ان لوگوں کو اگر آپؐ اپنی محفل سے اٹھا دیں تو پھر ہم آپؐ کے پاس آکر آپؐ کی بات سننے پر غور کر سکتے ہیں۔ اس حوالے سے سورۃ الانعام میں اللہ تعالیٰ نے ان مؤمنینِ صادقین کے بارے میں حضور ﷺ سے فرمایا: ﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾﴾ ”اور مت دھتکاریئے آپؐ ان لوگوں کو جو پکارتے ہیں اپنے ربّ کو صبح وشام اور اُس کی رضا کے طالب ہیں۔ آپؐ کے ذمے ان کے حساب میں سے کچھ نہیں ہے اور نہ آپؐ کے حساب میں سے ان کے ذمے کچھ ہے، تو اگر (بالفرض) آپؐ انہیں دور کریں گے تو آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔“

﴿وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ﴿۱۱﴾﴾ ”اور چونکہ انہوں نے اس (قرآن) کے ذریعے سے ہدایت نہیں پائی تو اب کہیں گے کہ یہ تو گھڑی ہوئی پرانی چیز ہے۔“

آیت ۱۲ ﴿وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ﴾ ”حالانکہ اس سے پہلے موسیٰؑ کی کتاب موجود ہے راہنمائی کرنے والی اور رحمت!“

﴿وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا﴾ ”اور یہ کتاب اس کی تصدیق کرنے والی ہے عربی زبان میں“

یعنی قرآن مصدق ہے تورات اور انجیل کا، اور قرآن کی یہ تصدیق دو پہلو سے ہے۔ ایک طرف تو قرآن ان کتابوں کی اس لحاظ سے تصدیق کرتا ہے کہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہیں۔ یہ تصدیق ہمیں قرآن میں جا بجا ملتی ہے۔ مثلاً سورۃ المائدۃ (آیت ۴۴) میں فرمایا: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ﴾ کہ ہم نے تورات نازل کی تھی اس میں ہدایت بھی تھی اور نور بھی تھا۔ اور پھر سورۃ المائدۃ میں ہی آگے آیت ۴۶ میں انجیل کی تصدیق ہے: ﴿وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ﴾ کہ ہم نے عیسیٰؑ ابن مریم کو انجیل عطا کی، یہ بھی ہدایت اور نور کا منبع ہے۔ چنانچہ قرآن ایک تو ان دونوں کتابوں کے منزل من اللہ ہونے کی تصدیق کرتا ہے (اگرچہ ان دونوں میں تحریف کر دی گئی) جبکہ اس تصدیق کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ تورات اور انجیل میں جو پیشین گوئیاں تھیں قرآن ان کا مصداق بن کر آیا ہے۔

﴿لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا﴾ ”تاکہ خبردار کر دے ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کی روش اختیار کی“

خبردار اور متنبہ کر دینے کی ذمہ داری ہی کی وجہ سے قرآن کو سادہ اور سلیس زبان میں نازل کیا گیا اور سمجھنے کے لیے آسان بنا دیا گیا تاکہ ہر شخص تک اس کا پیغام پہنچ جائے۔

﴿وَبُشْرٰی لِلْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۲﴾﴾ ''اور بشارت بن جائے احسان کی روش اختیار کرنے والوں کے لیے۔''

''محسنین'' وہ لوگ ہیں جو اسلام کے درجے سے بتدریج آگے بڑھتے ہوئے ایمان اور پھر احسان کے درجے تک پہنچ جائیں۔

آیت ۱۳ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ ''بے شک جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر جم گئے''

نوٹ کیجیے یہ وہی الفاظ ہیں جو اس سے پہلے ہم سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی آیت ۳۰ میں پڑھ آئے ہیں۔ وہاں بھی میں نے عرض کیا تھا اور اب پھر دہرا رہا ہوں کہ اس ''استقامت'' کو صرف ایک لفظ مت سمجھئے' غور کریں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ اس ''استقامت'' میں ایک ''قیامت'' مضمر ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنا رب مان کر ہر حال میں اس کی رضا پر راضی رہنا' اس کی رضا کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لینا' اسی پر توکل کرنا' اس کے احکامات کی پابندی کرنا اور اس کی طرف سے عائد کردہ جملہ ذمہ داریوں کو نبھانے میں اپنا تن من دھن داؤ پر لگا دینا وغیرہ سب اس استقامت میں شامل ہے۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ (آیت ۳۰) کے مطالعہ کے دوران ہم حضرت سفیان بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث پڑھ چکے ہیں کہ انہوں نے حضور ﷺ سے درخواست کی تھی کہ مجھے اسلام کے بارے میں کوئی ایک بات ایسی بتا دیجیے جسے میں پلے باندھ لوں اور میرے لیے وہ کافی ہو جائے۔ اس کے جواب میں حضور ﷺ نے فرمایا: ((قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ)) ''کہو کہ میں ایمان لایا اللہ پر' پھر اس پر جم جاؤ!'' بہر حال اللہ پر ایمان لانے کے بعد استقامت یہی ہے کہ انسان کا دل اس سوچ پر جم جائے کہ اللہ ہی میرا پروردگار ہے اور وہی حاجت روا' وہی مشکل کشا ہے اور وہی میری دعاؤں کا سننے والا ہے' اور پھر انسان خود کو اللہ کے لیے وقف کر دے۔ ایک بندۂ مؤمن کی اسی کیفیت کا نقشہ سورۃ الانعام کی اس آیت میں دکھایا گیا ہے: ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ ''آپ کہیے: میری نماز' میری قربانی' میری زندگی اور میری موت اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔''

﴿فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۱۳﴾﴾ ''تو اُن پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ حزن سے دوچار ہوں گے۔''

ملاحظہ کیجیے سورۂ یونس کی آیت ۶۲ میں ''اولیاء اللہ'' کے مخصوص مقام و مرتبہ کے حوالے سے بھی بالکل یہی الفاظ آئے ہیں: ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾﴾ ''آگاہ ہو جاؤ! اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔ گویا جو لوگ ایمان لائے اور پھر ایمان پر مستقیم ہو گئے وہ اولیاء اللہ ہیں اور آخرت میں انہیں کسی قسم کے خوف اور حزن و ملال کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

آیت ۱۴ ﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾﴾ ''یہی لوگ جنّت والے ہیں' اس میں ہمیشہ رہنے والے۔ یہ جزا ہوگی اُن اعمال کی جو وہ کرتے رہے۔''

جیسا کہ پہلے بھی کئی مرتبہ ذکر ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی قدر افزائی کے لیے جنّت میں داخلے اور اس کی نعمتوں کو ان کے اعمال کا صلہ قرار دیتا ہے' جبکہ اللہ کے یہ نیک بندے جنّت میں پہنچ کر اللہ کا شکر کرتے ہوئے اعتراف کریں گے کہ یہ سب کچھ اللہ کے فضل کے سبب ہی ممکن ہوا' اور یہ کہ وہ اپنے اعمال کے بل بوتے پر یہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتے تھے: ﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ

هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ﴾ (الاعراف: ۴۳) ''اور وہ کہیں گے کُل شکر اور کُل تعریف اُس اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں یہاں تک پہنچایا' اور ہم خود سے یہاں تک نہیں پہنچ سکتے تھے اگر اللہ ہی نے ہمیں نہ پہنچا دیا ہوتا۔''

بہرحال یہ اللہ کا اپنے بندوں پر بے پایاں فضل ہے کہ وہ قرآن میں بار بار ان کے نیک اعمال کی قدردانی فرماتا ہے کہ تم لوگوں نے ﴿اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝۳﴾ (الدھر) کے اختیار کے باوجود میرے شکرگزار بندے بن کر زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا اور اس پر مشقتیں اور تکلیفیں برداشت کیں' چنانچہ میں نے بھی تمہاری مدد کرتے ہوئے اس راستے پر تمہارے لیے آسانیاں پیدا کر دیں' تمہیں آگے بڑھنے کی توفیق عطا کی اور آج میں تمہارے ان اعمال کا بدلہ تمہیں جنت کی ابدی اور دائمی نعمتوں کی صورت میں عطا کر رہا ہوں۔

آیات ۱۵ تا ۲۰

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ۭ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۭ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ۭ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۱۵ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ۭ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ۝۱۶ وَالَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدٰنِنِيْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِيْ ۚ وَهُمَا يَسْتَغِيْثٰنِ اللّٰهَ وَيْلَكَ اٰمِنْ ۖ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَيَقُوْلُ مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۷ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ۝۱۸ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝۱۹ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَي النَّارِ ۭ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ۝۲۰ ع

آیت ۱۵ ﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ۭ﴾ ''اور ہم نے تاکید کی انسان کو اُس کے والدین کے بارے میں حسنِ سلوک کی۔''

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کے احکام قرآن میں بہت تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل کے اس حکم میں اس حوالے سے خصوصی تاکید پائی جاتی ہے:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝۲۳﴾

''اور فیصلہ کر دیا ہے آپ کے رب نے کہ تم نہیں عبادت کرو گے کسی کی سوائے اُس کے اور والدین کے ساتھ احسان (کرو گے)۔ اگر پہنچ جائیں تمہارے پاس بڑھاپے کو ان میں سے کوئی ایک یا دونوں' تو مت کہو ان کو اُف بھی اور مت جھڑکو ان کو' اور بات کرو ان سے نرمی کے ساتھ۔''

اولاد کے لیے اگرچہ والد اور والدہ دونوں قابلِ احترام ہیں اور دونوں ہی ان کے حسنِ سلوک کے مستحق ہیں لیکن بچے کی پیدائش اور پرورش میں ماں کی مشقت اور ذمہ داری چونکہ زیادہ ہے اس لیے اولاد کی طرف سے خدمت اور حسنِ سلوک کے حوالے سے اس کا حق بھی فائق ہے۔ چنانچہ سورۂ لقمان میں ماں کے خصوصی حق کا ذکر یوں فرمایا گیا: ﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ﴾ ''اور ہم نے وصیت کی انسان کو اُس کے والدین کے بارے میں' اس کو اٹھائے رکھا اس کی ماں نے (اپنے پیٹ میں) کمزوری پر کمزوری جھیل کر' پھر اس کا دودھ چھڑانا ہوا دو سال میں۔''

والدہ کے خصوصی حق کی وضاحت ایک حدیث میں بھی ملتی ہے۔ ایک صحابیؓ نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا: یارسول اللہ! میرے حسنِ سلوک کا سب سے بڑھ کر مستحق کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''تمہاری والدہ!'' انہوںؓ نے پھر پوچھا کہ اس کے بعد کون؟ آپؐ نے فرمایا: ''پھر تمہاری والدہ!'' یہ سوال انہوں نے چار مرتبہ دہرایا۔ جواب میں آپؐ نے تین مرتبہ فرمایا: تمہاری والدہ۔ جبکہ چوتھی مرتبہ آپؐ نے فرمایا: ''پھر تمہارا والد!''(۲) البتہ اس حوالے سے یہ نکتہ مدِنظر رہنا چاہیے کہ والدہ کے حق کی یہ فوقیت اخلاقی اعتبار سے ہے جبکہ قانونی طور پر والد کا حق ہی فائق ہے۔ مثلاً اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ جنت ماں کے قدموں میں ہے: ((اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّهَاتِ))(۳) لیکن اگر میاں بیوی میں علیحدگی ہو جائے تو اسلامی قانون اولاد پر والد ہی کا حق تسلیم کرتا ہے۔

﴿حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ﴾ ''اُس کی ماں نے اُسے اٹھائے رکھا (پیٹ میں) تکلیف جھیل کر اور اُسے جنا تکلیف کے ساتھ۔''

﴿وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ﴾ ''اور اُس کا یہ حمل اور دودھ چھڑانا ہے (لگ بھگ) تیس مہینے میں۔''

ان دو جملوں میں ان تمام اضافی تکالیف اور مشقتوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے جو والد کے مقابلے میں صرف والدہ کو برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ بچے کی پیدائش اور پرورش میں والد بالواسطہ طور پر حصہ لیتا ہے جبکہ والدہ اس پورے عمل میں براہِ راست کردار ادا کرتی ہے۔ دورانِ حمل کی گوناگوں پریشانیوں' وضع حمل کی جان لیوا تکلیفوں اور رضاعت و پرورش کی صبر آزما مشقتوں کو وہ تن تنہا جھیلتی ہے۔

﴿حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ﴾ ''یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری قوت کو پہنچتا ہے اور چالیس برس کا ہو جاتا ہے''

بچے کی جسمانی بلوغت تو سولہ سترہ سال کی عمر میں ہو جاتی ہے' لیکن یہاں ذہنی اور نفسیاتی بلوغت اور پختگی کا ذکر ہوا ہے اور اس کی

۲۔ صحیح البخاری' کتاب الادب' باب من احق الناس بحسن الصحبة۔ و صحیح مسلم' کتاب البر و الصلة و الآداب' باب بر الوالدین...

۳۔ الجامع الصغیر للسیوطی' ح: ۳۶۴۲۔ راوی: انس بن مالک ؓ۔

کم از کم حد چالیس سال بتائی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو چالیس برس کی عمر میں منصبِ نبوت پر فائز کیا جاتا رہا ہے' جیسا کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نبوت چالیس برس کی عمر میں ملی۔ البتہ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق کچھ استثناء کی مثالیں بھی ہیں۔ مثلاً حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بچپن میں ہی حکمت عطا کر دی گئی تھی' جیسا کہ سورۂ مریم کی اس آیت سے واضح ہے: ﴿وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝۱۲﴾ ''اور ہم نے اُسے عطا کر دی حکمت و دانائی بچپن میں ہی''۔ اور ایسا ہی معاملہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی تھا۔ لیکن عام قاعدہ کے تحت ذہنی و نفسیاتی بلوغت (maturity) کی حد چالیس سال ہی ہے۔ اور اس حوالے سے آیت زیر مطالعہ میں ایک بچے کی مثال دی گئی ہے کہ جب وہ اپنی زندگی کے ابتدائی مراحل طے کر کے چالیس برس کی عمر میں ذہنی پختگی کو پہنچ جاتا ہے تو:

﴿قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ﴾ ''وہ کہتا ہے: اے میرے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں شکر کر سکوں تیرے انعامات کا جو تُو نے مجھ پر اور میرے والدین پر فرمائے۔''

﴿وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۭ﴾ ''اور یہ کہ میں ایسے اعمال کروں جنہیں تُو پسند کرے اور میرے لیے میری اولاد میں بھی اصلاح فرما دے۔''

اس دعا کا اسلوب خصوصی طور پر لائقِ توجہ ہے۔ دعا صرف یہ نہیں کہ میری اولاد کی اصلاح فرما دے اور انہیں نیک بنا دے' بلکہ الفاظ کے مفہوم کی اصل روح یہ ہے کہ میری نسل میں میرے لیے اصلاح فرما دے' ان میں میرے لیے بہتری پیدا فرما دے۔ اس لیے کہ بچے اگر صالح اور نیک ہوں گے تو اپنے والدین کے لیے مغفرت کی دعا کریں گے۔ اگر والدین نے اولاد کی اچھی تربیت کی ہوگی تو ان کے نیک اعمال میں سے والدین کو بھی صدقہ جاریہ کے طور پر حصہ ملتا رہے گا۔ یوں اولاد کی بہتری اور اصلاح گویا والدین کے لیے بھی فائدہ مند ہوگی۔ بالکل یہی مفہوم اس دعا کا بھی ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝۷۴﴾ (الفرقان) ''اور وہ لوگ کہ جو کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہمیں ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما' اور ہمیں متقیوں کا امام بنا۔''

﴿اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۱۵﴾ ''میں تیری جناب میں توبہ کرتا ہوں اور یقیناً میں (تیرے) فرمانبرداروں میں سے ہوں۔''

آیت ۱۶ ﴿اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ۭ﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جن سے ہم ان کے بہترین اعمال قبول فرمائیں گے' اور ہم ان کی خطاؤں سے بھی درگزر فرمائیں گے' (اور وہ ہوں گے) جنّت والوں میں سے۔''

﴿وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ۝۱۶﴾ ''یہ وہ سچا وعدہ ہے جو اُن سے کیا جاتا تھا۔''

ان آیات میں ایک ایسے شخص کے کردار کی تصویر دکھائی گئی ہے جو اپنے والدین کا نیک اور صالح بیٹا ہے۔ شعور کی پختگی کو پہنچتے پہنچتے اس کے دل و دماغ میں خیالات و نظریات کا جو ہیولا تیار ہوا ہے اس کا خوبصورت عکس اوپر آیت ۱۵ کے دعائیہ الفاظ سے جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بعد آئندہ آیات میں جس کردار کی تصویر دکھائی جا رہی ہے وہ اس کے برعکس ہے۔

آیت ﴿وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَاۤ اَتَعِدٰنِنِیْۤ اَنْ اُخْرَجَ﴾ ''اور ایک وہ شخص ہے جو اپنے والدین سے کہتا ہے کہ میں بیزار ہوں آپ دونوں سے' کیا آپ مجھے اس سے ڈراتے ہیں کہ میں نکال کھڑا کیا جاؤں گا (زندہ کر کے قبر سے)؟''

والدین مسلمان ہیں' نیک سیرت ہیں' لیکن بیٹا آوارہ اور ذہنی طور پر گمراہ ہو چکا ہے۔ وہ نہ اللہ کو مانتا ہے' نہ آخرت پر یقین رکھتا ہے۔ وہ اپنے والدین سے تو تکار کرتا ہے کہ یہ آپ مجھے کیا ہر وقت حساب کتاب کی دھمکیاں دیتے رہتے ہیں! اُف ہے آپ لوگوں پر! میں آپ کے ان ڈھکوسلوں کی خود ساختہ تفصیلات سن سن کر تنگ آ گیا ہوں! بس آپ لوگ مجھے مزید سمجھانا چھوڑ دیں! میں کسی آخرت واخرت کو نہیں مانتا!

﴿وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِیْ﴾ ''حالانکہ مجھ سے پہلے کتنی ہی نسلیں گزر چکی ہیں!''

اب تک نسل در نسل کروڑوں' اربوں لوگ اس دنیا میں آئے اور چلے گئے۔ اُن میں سے تو آج تک کوئی اُٹھ کر نہ آیا۔ ایک وقت میں ان سب کا زندہ ہونا اور پھر ایک ایک کا حساب کتاب ہونا بالکل بعید از قیاس ہے۔ میں ایسی دقیانوسی باتوں کو ماننے والا نہیں ہوں۔

﴿وَهُمَا یَسْتَغِیْثٰنِ اللّٰهَ وَیْلَكَ اٰمِنْ ۫ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ﴾ ''اور وہ دونوں اللہ کی دہائی دے کر کہتے ہیں: بربادی ہو تیری' ایمان لے آ! یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے۔''

﴿فَیَقُوْلُ مَا هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ﴾ ''لیکن وہ کہتا ہے: یہ کچھ نہیں مگر پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔''

یہ دوبارہ زندہ ہونے اور آخرت کی باتیں بس فرضی کہانیاں ہیں جو پچھلے زمانے سے سینہ بہ سینہ نقل ہوتی چلی آ رہی ہیں۔

آیت ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ حَقَّ عَلَیْهِمُ الْقَوْلُ﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی بات صادق آئی''

یعنی ایسے لوگ اللہ کے کلمۂ عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں۔

﴿فِیْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ؕ﴾ ''(یہ بھی شامل کر دیے جائیں گے) اُن قوموں میں جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں جنوں اور انسانوں میں سے۔''

﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِیْنَ﴾ ''یقیناً یہی لوگ ہیں خسارے والے۔''

آیت ﴿وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا﴾ ''اور ہر ایک کے لیے درجے (اور مقامات) ہوں گے ان کے اعمال کے اعتبار سے۔''

﴿وَلِیُوَفِّیَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ﴾ ''اور تاکہ وہ پورا پورا دے انہیں ان کے اعمال کا بدلہ اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔''

آیت ﴿وَیَوْمَ یُعْرَضُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ؕ﴾ ''اور جس دن یہ کافر پیش کیے جائیں گے آگ پر۔''

﴿اَذْهَبْتُمْ طَیِّبٰتِكُمْ فِیْ حَیَاتِكُمُ الدُّنْیَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا﴾ ''(اُس وقت ان سے کہا جائے گا:) تم اپنے حصے کی اچھی چیزیں اپنی دنیا کی زندگی میں لے چکے اور ان سے تم نے خوب فائدہ اٹھا لیا۔''

تم دنیا میں خوب عیش کر چکے ہو' حلال و حرام کی تمیز سے بالاتر ہو کر تم نے وہاں بہت مزے اڑائے ہیں۔

﴿فَالْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ﴾

''تو آج تمہیں ذلت کا عذاب دیا جائے گا بسبب اس تکبر کے جو تم زمین میں ناحق کرتے رہے ہو اور بسبب ان نافرمانیوں کے جو تم کرتے رہے ہو۔''

آیات ۲۱ تا ۲۸

وَ اذْكُرْ اَخَا عَادٍ ؕ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَ قَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖۤ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۲۱﴾ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۲﴾ قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۫ وَ اُبَلِّغُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَلٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ؕ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ؕ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۴﴾ ۙ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰۤى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۲۵﴾ وَ لَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَاۤ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْـِٕدَةً ۫ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَ لَاۤ اَبْصَارُهُمْ وَ لَاۤ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۲۶﴾ ع وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَ صَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَوْ لَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ؕ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَ ذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَ مَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۸﴾

آیت ۲۱ ﴿وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ ؕ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ﴾ ''اور ذرا تذکرہ کیجیے قومِ عاد کے بھائی (ہودؑ) کا' جب اُس نے خبردار کیا اپنی قوم کو اَحقاف میں''

جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی ساحلی علاقے کو پرانے زمانے میں ''اَحقاف'' کہا جاتا تھا جہاں قومِ عاد آباد تھی' اب یہ علاقہ ریگ و رِیگِ صحرا کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

﴿وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖۤ﴾ ''اور اس سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی بہت سے خبردار کرنے والے گزر چکے تھے''

یعنی ایسے خبردار کرنے والے اُس سے پہلے بھی گزر چکے تھے اور اس کے بعد بھی آتے رہے ـــــ اللہ تعالیٰ کی اس سُنّت کے بارے میں قبل ازیں بھی کئی مرتبہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ کسی قوم میں پہلے بہت سے انبیاء علیہم السلام بھیجے جاتے تھے اور پھر آخر میں اتمامِ حُجّت کے لیے ایک رسولؐ کو مبعوث کیا جاتا تھا۔ وہ سب کے سب ایک ہی دعوت دیتے تھے۔

﴿اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ﴾ ''کہ مت عبادت کرو کسی کی سوائے اللہ کے!''

﴿اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۲۱﴾﴾ ''مجھے اندیشہ ہے تم پر ایک بڑے دن کے عذاب کا۔''

آیت ۲۲ ﴿قَالُوۡۤا اَجِئۡتَنَا لِتَاۡفِکَنَا عَنۡ اٰلِہَتِنَا ۚ﴾ ''انہوں نے کہا: کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہمیں بہکا کر ہمارے معبودوں سے برگشتہ کر دو؟''

﴿فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۲۲﴾﴾ ''تو جس عذاب کی دھمکی تم ہمیں دے رہے ہو وہ ہم پر لے آؤ اگر تم سچوں میں سے ہو!''

آیت ۲۳ ﴿قَالَ اِنَّمَا الۡعِلۡمُ عِنۡدَ اللّٰہِ ۫﴾ ''اُس نے کہا کہ اس کا علم تو اللہ کے پاس ہے''

یعنی عذاب کے بارے میں تو اللہ ہی جانتا ہے کہ اگر آئے گا تو کب آئے گا اور کس صورت میں آئے گا۔ مجھے اس بارے میں کچھ علم نہیں۔

﴿وَ اُبَلِّغُکُمۡ مَّاۤ اُرۡسِلۡتُ بِہٖ﴾ ''اور میں تو تمہیں پہنچا رہا ہوں وہ پیغام جو اُس نے مجھے دے کر بھیجا ہے''

میری ذمہ داری تو صرف اللہ کا پیغام تم لوگوں تک واضح طور پر پہنچا دینے اور اس کے مطابق تمہیں خبردار کر دینے کی حد تک ہے۔

﴿وَ لٰکِنِّیۡۤ اَرٰىکُمۡ قَوۡمًا تَجۡہَلُوۡنَ ﴿۲۳﴾﴾ ''لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ بالکل جہالت کی روش اختیار کر رہے ہو۔''

یہ تمہاری جہالت کی انتہا ہے کہ میری یہ باتیں سننے اور ان پر غور کرنے کے بجائے بغیر سوچے سمجھے تم ان کی نفی کرنے پر تُل گئے ہو۔

آیت ۲۴ ﴿فَلَمَّا رَاَوۡہُ عَارِضًا مُّسۡتَقۡبِلَ اَوۡدِیَتِہِمۡ ۙ﴾ ''پھر جب انہوں نے اس (عذاب) کو دیکھا بادل کی صورت میں اپنی وادیوں کی طرف بڑھتے ہوئے''

﴿قَالُوۡا ہٰذَا عَارِضٌ مُّمۡطِرُنَا ؕ﴾ ''تو انہوں نے کہا: یہ تو بادل ہے جو ہم کو سیراب کرنے والا ہے۔''

وہ اسے دیکھ کر خوشیاں منانے لگے کہ ابھی بارش ہوگی اور جل تھل ایک ہو جائیں گے۔

﴿بَلۡ ہُوَ مَا اسۡتَعۡجَلۡتُمۡ بِہٖ ؕ﴾ ''نہیں! بلکہ یہ تو وہ شے ہے جس کے بارے میں تم نے جلدی مچا رکھی تھی!''

تم لوگ خود ہی کہتے تھے نا کہ لے آؤ ہم پر عذاب اگر لا سکتے ہو' تو دیکھ لو:

﴿رِیۡحٌ فِیۡہَا عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۲۴﴾﴾ ''یہ وہ جھکڑ ہے جس میں بہت دردناک عذاب ہے۔''

اس تیز ہوا کے جھکڑ کی کیفیت سورۃ الحاقہ میں اس طرح بیان ہوئی ہے: ﴿سَخَّرَہَا عَلَیۡہِمۡ سَبۡعَ لَیَالٍ وَّ ثَمٰنِیَۃَ اَیَّامٍ ۙ حُسُوۡمًا ۙ فَتَرَی الۡقَوۡمَ فِیۡہَا صَرۡعٰی ۙ کَاَنَّہُمۡ اَعۡجَازُ نَخۡلٍ خَاوِیَۃٍ ﴿۷﴾﴾ ''اللہ نے مسلط کیے رکھا اسے ان پر سات راتیں اور آٹھ دن' نیست و نابود کر دینے کے لیے' پس تم دیکھتے اس قوم کو اس میں پچھڑے ہوئے جیسے وہ گری ہوئی کھجوروں کے تنے ہوں۔''

آیت ۲۵ ﴿تُدَمِّرُ کُلَّ شَیۡءٍۭ بِاَمۡرِ رَبِّہَا﴾ ''تباہ و برباد کرتا ہے ہر شے کو اپنے رب کے حکم سے''

دمر کے مادہ میں کسی درخت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ چونکہ وہ بڑے قد آور لوگ تھے اس لیے ان

کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور اسی لیے سورۃ الحاقہ کی مذکورہ بالا آیت میں انہیں زمین پر پڑے ہوئے کھجور کے تنوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔

﴿فَاَصْبَحُوْا لَا یُرٰٓی اِلَّا مَسٰکِنُهُمْ ؕ﴾ ''پھر وہ ایسے ہو گئے کہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا سوائے اُن کے مسکنوں کے۔''

ان کے عالی شان گھر اور ان کی بڑی بڑی حویلیاں تو نظر آ رہی تھی مگر ان کے مکینوں کی کچھ خبر نہیں تھی۔

﴿کَذٰلِكَ نَجْزِی الْقَوْمَ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۲۵﴾﴾ ''اسی طرح ہم بدلہ دیا کرتے ہیں مجرم قوم کو۔''

آیت ۲۶ ﴿وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِیْمَاۤ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِیْهِ﴾ ''اور ہم نے جو تمکن انہیں دیا تھا ایسا تمکن ہم نے تمہیں نہیں دیا ہے''

قریشِ مکہ کو مخاطب کر کے بتایا جا رہا ہے کہ جو طاقت اور شان و شوکت قومِ عاد کو عطا ہوئی تھی اور جو وسائل انہیں میسّر تھے تم لوگوں کے پاس تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ قبل ازیں سورۃ الاعراف کی آیت ۶۹ کے ضمن میں بھی ذکر ہو چکا ہے کہ تہذیب و تمدن کے اعتبار سے قومِ عاد اپنے زمانے کی بہت ترقی یافتہ قوم تھی۔ شداد اسی قوم کا بادشاہ تھا جس نے خصوصی طور پر ایک شہر بسا کر اسے جنتِ ارضی کا نام دیا تھا۔ قومِ عاد کا علاقہ اب لق و دق صحرا کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس صحرا میں شداد کے مذکورہ شہر کی باقیات زیرِ زمین سیٹلائیٹ کے ذریعے سے دریافت ہو چکی ہیں۔ حتیٰ کہ شہر کی فصیل پر بنے ہوئے ۳۰ کے قریب ستون بھی گن لیے گئے ہیں۔ اسی طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ تمام نشانیاں ایک ایک کر کے دنیا کے سامنے آتی چلی جائیں گی جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔

﴿وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۫﴾ ''اور ہم نے انہیں کان' آنکھیں اور دل (یا عقلیں) عطا کیے تھے۔''

﴿فَمَاۤ اَغْنٰی عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَاۤ اَبْصَارُهُمْ وَلَاۤ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَیْءٍ﴾ ''تو اُن کے کچھ بھی کام نہ آئے اُن کے کان' نہ اُن کی آنکھیں اور نہ ہی اُن کے دل (عقلیں)''

﴿اِذْ كَانُوْا یَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۲۶﴾﴾ ''جبکہ وہ انکار ہی کرتے رہے اللہ کی آیات کا اور اُن کو گھیر لیا اسی چیز نے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔''

آیت ۲۷ ﴿وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰی﴾ ''اور ہم نے ہلاک کیا ہے بہت سی ایسی بستیوں کو جو تمہارے اردگرد آباد تھیں''

وہ تمام اقوام جن کے انجام کا ذکر قرآن میں تکرار کے ساتھ آیا ہے جزیرہ نمائے عرب کے اردگرد کے علاقوں میں آباد تھیں۔ احقاف یعنی قومِ عاد کا علاقہ مکہ سے جنوب مشرق میں واقع تھا۔ قومِ ثمود کا علاقہ (مدائن صالح) مکہ سے شمال میں تھا اور شمال ہی کے رخ میں حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا علاقہ مدین تھا۔ جبکہ بحیرۂ مُردار (Dead Sea) کے ساحل پر حضرت لوط علیہ السلام کی قوم آباد تھی۔ اس قوم کے شہروں کے کھنڈرات بھی بحیرۂ مردار کے اندر سے دریافت ہو چکے ہیں۔

﴿وَصَرَّفْنَا الْاٰیٰتِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۲۷﴾﴾ ''اور ہم نے پھیر پھیر کر اُن کو اپنی آیات سنائیں تا کہ وہ رجوع کریں۔''

آیت ۲۸ ﴿فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ؕ﴾ ''تو کیوں نہ مدد کی اُن کی اُن ہستیوں نے جن کو انہوں نے اللہ کے سوا معبود بنا رکھا تھا تقرب (الی اللہ) کا ذریعہ سمجھتے ہوئے!''

ان کا خیال تھا کہ ان کے معبود انہیں اللہ کے قریب کرنے کا ذریعہ بنیں گے اور ہر مشکل میں ان کی مدد کریں گے۔

﴿بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ﴾ ''بلکہ وہ سب تو اُن سے گم ہو گئے''

جب ان پر عذاب آیا تو ان کے معبودوں میں سے کوئی بھی ان کے کام نہ آیا اور انہیں یوں لگا جیسے کہ حقیقت میں ان کے معبودوں کا کوئی وجود تھا ہی نہیں' بس بقول میر درد: ع ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا' جو سنا افسانہ تھا!''

﴿وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۸﴾﴾ ''اور یہ تھا اُن کا جھوٹ اور جو کچھ وہ افترا کر رہے تھے۔''

آئندہ آیات میں ان جنّات کا ذکر ہوا ہے جو رسول اللہ ﷺ سے قرآن سن کر ایمان لے آئے اور پھر اپنی قوم کی طرف مبلغ بن کر لوٹے۔ یہ واقعہ حضور ﷺ کے طائف سے واپسی کے سفر کے دوران پیش آیا۔ وہ ایام حضور ﷺ کے لیے یقیناً بہت سخت تھے۔ ایک طرف آپؐ اہلِ طائف کے رویّے کی وجہ سے دل گرفتہ تھے تو دوسری طرف مکہ واپس جانے کے لیے بھی حالات سازگار نہیں تھے۔ اس صورت حال میں آپؐ نے چند دن وادیٔ نخلہ میں قیام فرمایا۔ وہاں ایک دن آپؐ فجر کی نماز ادا فرما رہے تھے کہ جنوں کی ایک جماعت کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نماز میں حضور ﷺ امام تھے اور آپؐ کے آزاد کردہ غلام اور مُنہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ مقتدی تھے۔ وادی کی کھلی فضا' فجر کا وقت اور اللہ کے رسول ﷺ کی زبانِ اطہر سے ''قرآن الفجر'' (بنی اسرائیل: ۷۸) کی طویل قراءت! قریب سے گزرتے ہوئے جنّات ٹھٹک کر رہ گئے۔ آپؐ قرآن پڑھتے رہے اور وہ سنتے رہے۔ قراءت ختم ہوئی تو ان کی دنیا بدل چکی تھی' وہ سب کے سب ایمان لے آئے' بلکہ واپس جا کر انہوں نے اپنی قوم میں فوراً تبلیغ بھی شروع کر دی۔ جنّات کا یہ واقعہ ہمارے لیے اس لحاظ سے لائقِ عبرت ہے کہ جنّات نے ایک ہی مرتبہ قرآن سنا اور وہ نہ صرف ایمان لے آئے بلکہ قرآن کے داعی اور مبلغ بھی بن گئے' لیکن ہم بار بار قرآن سنتے ہیں اور ہر بار گویا ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتے ہیں۔ نہ تو قرآن ہمارے دلوں میں اترتا ہے اور نہ ہی ہماری زندگیوں میں اس سے کوئی تبدیلی آتی ہے۔

آیات ۲۹ تا ۳۵

وَ اِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَ اِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۰﴾ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَ اٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۱﴾ وَ مَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۲﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۭ بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۳﴾ وَ يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ۭ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ۭ قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا ۭ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۴﴾ فَاصْبِرْ كَمَا

صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَ لَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ ع

آیت ۲۹ ﴿وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) جب ہم نے آپ کی طرف متوجہ کر دیا جنّات کی ایک جماعت کو کہ وہ قرآن سننے لگے۔''

﴿فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ﴾ ''تو جب وہ وہاں پہنچے تو انہوں نے کہا: چپ ہو جاؤ!''

تلاوت قرآن کی سماعت کے بارے میں خود قرآن کا بھی یہی حکم ہے: ﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾﴾ (الاعراف) ''اور جب قرآن پڑھا جا رہا ہو تو اسے پوری توجہ کے ساتھ سنا کرو اور خاموش رہا کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ طبعاً نیک اور شریف قسم کے جنّات تھے۔ اگلی آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے اہلِ کتاب جن تھے۔ چنانچہ وہ فوراً ہی اللہ کے کلام کو پہچان گئے اور اس کو پورے ادب و احترام سے سننے لگے۔

﴿فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿۲۹﴾﴾ ''پھر جب (قراءت) ختم ہوئی تو وہ پلٹے اپنی قوم کی طرف خبردار کرنے والے بن کر۔''

آیت ۳۰ ﴿قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى﴾ ''انہوں نے کہا: اے ہماری قوم کے لوگو! ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل ہوئی ہے''

گویا وہ جنّات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اُمتی تھے۔ یہاں پر جنّات کے اس قول کے حوالے سے یہ نکتہ لائقِ توجہ ہے کہ تورات کے بعد جو ''کتاب'' نازل ہوئی وہ قرآن ہے۔ اگرچہ ہم عرفِ عام میں انجیل کو بھی کتاب کہہ دیتے ہیں لیکن وہ اصطلاحی مفہوم میں باقاعدہ ''کتاب'' نہیں تھی' اس لیے کہ اس میں شریعت نہیں تھی۔ دراصل لفظ ''کتاب'' میں لغوی اعتبار سے شریعت (قوانین' احکام' فرائض وغیرہ) کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں احکام کی فرضیت کا ذکر اکثر ''کتب'' کے مشتقات کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۰۳ میں نماز کے اوقات کے حوالے سے ''كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا'' کے الفاظ آئے ہیں' پھر سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۳۵ میں ''کتاب'' کا لفظ ''عدت'' کے مترادف کے طور پر آیا ہے: ﴿حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ﴾۔ اور ''كُتِبَ عَلَيْكُمْ'' کے الفاظ تو قرآن میں بہت تکرار سے آئے ہیں۔

ظاہر ہے مذکورہ جنّات اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اُمتی تھے تو وہ لازماً انجیل کو بھی جانتے ہوں گے۔ لیکن انہوں نے اس کا ذکر کرنے کے بجائے صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حوالہ دیا کہ آپؑ کے بعد اب ایک کتاب نازل ہوئی ہے جس کی تلاوت ہم سن کر آئے ہیں۔ اس سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے لفظ ''کتاب'' کا اطلاق تورات پر ہوتا ہے یا پھر قرآن پر' اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شریعتِ موسویؑ کے بعد جو شریعت آئی ہے وہ شریعتِ محمدیؐ ہے۔

﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۰﴾﴾ ''تصدیق کرتی ہوئی اُس کی جو اس کے

سامنے موجود ہے (یعنی تورات)' راہنمائی کرتی ہے حق کی طرف اور ایک سیدھے راستے کی طرف۔''

''طریقِ مستقیم'' کا بھی وہی مفہوم ہے جو ''صراطِ مستقیم'' کا ہے۔ طریق اور صراط دونوں کے لغوی معنی راستے کے ہیں۔ اسی طرح لفظ سبیل بھی راستے کے معنی دیتا ہے اور ''سواء السبیل'' کے معنی بھی سیدھے راستے کے ہیں۔

آیت ۳۱ ﴿يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ﴾ ''اے ہماری قوم کے لوگو! اللہ کی طرف پکارنے والے کی پکار پر لبیک کہو''

﴿وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۳۱﴾ ''اور اس پر ایمان لے آؤ تاکہ (اللہ) تمہارے گناہوں کو بخش دے اور تمہیں ایک دردناک عذاب سے بچا لے۔''

آیت ۳۲ ﴿وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ﴾ ''اور جو کوئی لبیک نہیں کہتا اللہ کی طرف پکارنے والے کی پکار پر تو وہ اللہ کو عاجز کرنے والا نہیں ہے زمین میں''

﴿وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۳۲﴾ ''اور نہیں ہوں گے اُس کے لیے اللہ کے مقابلے میں دوسرے مددگار۔ یہی لوگ کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں۔''

یہاں پر ''دَاعِيَ اللّٰهِ'' کے حوالے سے یہ نکتہ ذہن میں مستحضر رکھنے کی ضرورت ہے کہ جب تک دنیا میں نبوت کا سلسلہ جاری تھا انبیاء و رسل علیہم السلام ہی ''اللہ کے داعی'' تھے۔ لیکن اب حضور ﷺ کے بعد آپؐ کے اُمتیوں کو ''دَاعِيَ اللّٰهِ'' کی حیثیت سے لوگوں کو قرآن کی طرف بلانا ہے' انہیں اقامت دین کا بھولا ہوا سبق یاد دلانا ہے اور اس جدّوجُہد میں اپنا تن من دھن کھپانے کے لیے انہیں اس طرح آمادہ کرنا ہے کہ ہر بندۂ مؤمن کی زندگی سورۃ الانعام کی اس آیت کی تصویر بن جائے: ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۱۶۲﴾ ''آپؐ کہیے: میری نماز' میری قربانی' میری زندگی اور میری موت اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔''

اس کام کے لیے اب چونکہ کوئی نبی نہیں آئے گا' اس لیے ''دعوت الی اللہ'' کا یہ مقدس فریضہ اس اُمت کو سونپ دیا گیا ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ﴾ (البقرۃ:۱۴۳) ''اور (اے مسلمانو!) اسی طرح ہم نے تمہیں ایک اُمتِ وسط بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسولؐ تم پر گواہ ہو''۔ سورۂ آلِ عمران میں اس ذِمّہ داری کی مزید وضاحت اس طرح فرمائی گئی: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ﴾ (آیت ۱۱۰) ''تم وہ بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کے لیے برپا کیا گیا ہے' تم نیکی کا حکم کرتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر۔''

آیت ۳۳ ﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓي اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۭ﴾ ''کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق فرمائی اور ان کی تخلیق سے تھکا نہیں' وہ اس پر قادر ہے کہ مُردوں کو زندہ کر دے!''

یہ عقلی دلیل ہے اس شخص کے لیے جو اللہ کو ''خالق'' تو مانتا ہے مگر بعث بعد الموت پر یقین نہیں رکھتا۔ سورۂ قٓ کی آیت ۱۵ میں

بھی ایسے ''فلسفیوں'' سے سوال کیا گیا ہے: ﴿اَفَعَیِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ﴾ کہ کیا ہم کائنات اور اس کی مخلوقات کو ایک دفعہ تخلیق کرنے کے بعد تھک گئے ہیں؟ کیا اب ہماری تخلیقی سرگرمیاں معطل ہوگئی ہیں؟ اور کیا مزید نئی چیزیں بنانے کی ہماری صلاحیت اب ختم ہو کر رہ گئی ہے؟

﴿بَلٰٓی اِنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۳۳﴾﴾ ''کیوں نہیں' یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

آیت ۳۴ ﴿وَیَوْمَ یُعْرَضُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا عَلَی النَّارِ ؕ اَلَیْسَ ھٰذَا بِالْحَقِّ ؕ﴾ ''اور جس روز پیش کیے جائیں گے یہ کافر آگ پر' (اور ان سے پوچھا جائے گا:) کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟''

کہ دنیا میں تو تم لوگ بعث بعد الموت کی باتوں کو ڈھکوسلے سمجھتے تھے' آخرت اور اس کی سزا و جزا کی خبروں کو فرضی کہانیاں قرار دیتے تھے جبکہ جہنم اور اس کے عذاب کی وعیدیں تمہیں محض جھوٹے ڈراوے لگتے تھے۔ آج تم دوبارہ زندہ ہو کر ''آخرت'' کے عالم میں پہنچ چکے ہو' اب تم آخرت کے تمام مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ دیکھو! یہ ہے جہنم کی آگ تمہارے سامنے جس کے بارے میں تمہیں بار بار خبردار کیا گیا تھا۔ اب بتاؤ کیا یہ حقیقت ہے یا تمہارا وہم؟

﴿قَالُوْا بَلٰی وَرَبِّنَا ؕ﴾ ''وہ کہیں گے: کیوں نہیں! ہمارے پروردگار کی قسم (یہ حق ہے)!''

﴿قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا کُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ ﴿۳۴﴾﴾ ''اللہ فرمائے گا: تو اب چکھو عذاب کا مزہ اپنے اس کفر کی پاداش میں جو تم کرتے رہے ہو۔''

اب آخر میں حضور ﷺ کو مخاطب کر کے خصوصی ہدایت دی جا رہی ہے:

آیت ۳۵ ﴿فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ ''تو (اے محمد ﷺ!) آپ بھی صبر کیجیے جیسے اولوالعزم رسولؑ صبر کرتے رہے ہیں''

''اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ'' کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ ان سے مراد وہ پانچ پیغمبر ہیں جن کا ذکر قبل ازیں سورۃ الشوریٰ کی اس آیت میں ہوا ہے: ﴿شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِہٖٓ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰی...﴾ (آیت ۱۳) ''(اے مسلمانو!) تمہارے لیے دین میں اُس نے وہی کچھ مقرر کیا ہے جس کی وصیت اُس نے نوحؑ کو کی تھی اور جس کی وحی ہم نے (اے محمد ﷺ!) آپ کی طرف کی ہے اور جس کی وصیت ہم نے کی تھی ابراہیمؑ کو اور موسیٰؑ کو اور عیسیٰؑ کو.....'' گویا حضرت محمد ﷺ کے علاوہ حضرت نوحؑ' حضرت ابراہیمؑ' حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ علیہم الصلوٰۃ والسلام کے نام اس فہرست میں شامل ہیں۔ البتہ بعض علماء حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ کو بھی ان کے ساتھ شامل کرتے ہیں اور اس طرح ان کے نزدیک ''اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ'' کی تعداد سات ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں میں ہر پیغمبر کی شخصیت کا کوئی خاص پہلو امتیازی شان کا حامل نظر آتا ہے۔ مثلاً دعوت و تبلیغ کے میدان میں عزم اور استقامت کے لحاظ سے حضرت نوحؑ سب سے آگے ہیں۔ آپؑ نے ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم کو دعوت دی اور ان کی طرف سے ہر قسم کی مخالفت اور تکلیف کو برداشت کیا: ﴿فَلَبِثَ فِیْھِمْ اَلْفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا ؕ﴾ (العنکبوت: ۱۴)۔ اسی طرح ذاتی تکلیف اور بیماری پر صبر کرنے کے اعتبار سے حضرت ایوبؑ کا

مرتبہ بہت بلند ہے اور اس لحاظ سے ''صبرِ ایوبؑ'' ضرب المثل کے طور پر مشہور ہے۔

﴿وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ﴾ ''اور ان کے لیے جلدی نہ کیجیے!''

اس سے پہلے سورۃ الزخرف کے اختتام پر بھی ایسی ہی ہدایت دی گئی ہے: ﴿فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ ؕ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ ان سے درگزر کیجیے اور کہیے سلام ہے' تو بہت جلد یہ لوگ جان جائیں گے''۔ پھر سورۃ الدخان کے آخر میں بھی فرمایا گیا ہے: ﴿فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ﴿۵۹﴾﴾ ''تو آپؐ انتظار کیجیے یقیناً وہ بھی انتظار کر رہے ہیں''۔ ایک ہی گروپ کی ان سورتوں میں ایک جیسے الفاظ اور مفہوم کی حامل ان آیات کی تکرار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان سورتوں کے نزول کے زمانے میں مکہ کے حالات اہلِ ایمان کے لیے واقعتاً بہت سخت تھے اور ان کے لیے ایک ایک دن گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ ان حالات میں ممکن ہے کبھی حضور ﷺ کے دل میں بھی یہ خیال آتا ہو' لیکن اہلِ ایمان کے ذہنوں میں ایسے سوالات کا آنا بالکل قرینِ قیاس ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دشمنانِ حق کو ہم پر ظلم و ستم ڈھانے کی کھلی چھوٹ آخر کیوں دے رکھی ہے؟ ان لوگوں پر پہلی نافرمان قوموں کی طرح عذاب کیوں نہیں ٹوٹ پڑتا؟ بلالؓ پر تشدد کرتے ہوئے اُمیہ بن خلف کے ہاتھ کیوں شل نہیں ہو جاتے؟ اللہ تعالیٰ تو عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے۔ وہ اپنے ان باغیوں کو اتنی ڈھیل کیوں دیے جا رہا ہے؟ چنانچہ اس انتہائی نازک صورت حال میں حضور ﷺ کو مخاطب کر کے گویا اہلِ ایمان کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ مشرکینِ مکہ پر عذاب کا وقت ابھی نہیں آیا' ابھی اللہ کی مشیت میں ان لوگوں کو کچھ اور مہلت دینا مقصود ہے۔ لہٰذا تم لوگ صبر سے کام لو اور کچھ دیر مزید انتظار کرو!

﴿كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ؕ﴾ ''جس دن یہ لوگ دیکھیں گے اُس (عذاب) کو جس کی انہیں وعید سنائی جا رہی ہے (تو ایسے محسوس کریں گے) گویا نہیں رہے تھے (دنیا میں) مگر دن کی ایک گھڑی۔''

﴿بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۳۵﴾﴾ ''یہ پہنچا دینا ہے! کیا سوائے نافرمان لوگوں کے کوئی اور بھی ہلاک کیا جائے گا؟''

یعنی ہمارے رسولؐ کی ذمہ داری تو ان لوگوں تک اللہ کا یہ پیغام پہنچا کر حجت قائم کر دینے کی حد تک ہے' جو انہوں نے ادا کر دی ـــــ اب ہلاک تو وہی ہوں گے جنہوں نے اس دعوتِ حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور نافرمانی کی روش اختیار کی۔

سُوْرَۃُ مُحَمَّدٍ

تمہیدی کلمات

سورۃ الاحقاف کے اختتام پر مکّی مدنی سورتوں کے پانچویں گروپ کی تیرہ مکّی سورتوں (سورۂ سبا تا سورۃ الاحقاف) کا مطالعہ مکمل ہوگیا۔ اب ہم اس گروپ کی تین مدنی سورتوں کا مطالعہ کریں گے۔ ان میں پہلی دو سورتیں یعنی سورۂ محمد (ﷺ) اور سورۃ الفتح تو ہم وزن ہیں اور ان میں باہم جوڑے کا تعلق بھی ہے' جبکہ تیسری سورت یعنی سورۃ الحجرات کو سورۃ الفتح کا ضمیمہ کہا جا سکتا ہے' اگرچہ سورۃ الحجرات مسلمانوں کی سیاسی وملی زندگی کے استحکام کے لیے ہدایات کے اعتبار سے قرآن حکیم کی اہم ترین سورت ہے۔

سورۂ محمد اور سورۃ الفتح کی باہمی نسبت ان دونوں کی ترتیب کے اس ربط سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ان میں پہلی سورت کی نسبت حضور ﷺ کی مسلّح جِدّوجُہد کے آغاز سے ہے جبکہ دوسری کا تعلق اس جِدّوجُہد کے اختتام سے۔ یعنی سورۂ محمد کا نزول حضور ﷺ کی انقلابی جِدّوجُہد کے مرحلۂ تصادم کے آغاز (غزوۂ بدر) سے متصلاً قبل ہوا جبکہ سورۃ الفتح اس مرحلے کی آخری فتح یعنی فتح مکّہ سے متصلاً قبل نازل ہوئی۔

سورۂ محمد کا دوسرا نام ''سورۃ القتال'' بھی ہے۔ اپنے زمانۂ نزول کے اعتبار سے یہ گویا سورۃ البقرۃ کا ضمیمہ ہے۔ سورۃ البقرۃ کی بیشتر آیات ہجرت کے بعد سے لے کر غزوۂ بدر تک کے زمانہ میں نازل ہوئیں اور اس کے مکمل ہونے کے فوراً بعد اور غزوۂ بدر سے متصلاً قبل سورۂ محمد اُس وقت نازل ہوئی جب حضور ﷺ کی تحریک ''اقدام'' کے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ اس مرحلے کا آغاز سورۃ الحج کے اس حکم سے ہوا: ﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ﴾ (آیت ۳۹) ''اب اجازت دی جا رہی ہے (قتال کی) ان لوگوں کو جن پر جنگ مسلط کی گئی ہے' اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے۔''

اس سے پہلے مکّی دور کے دوران مسلمان صبرِ محض (passive resistance) اور ہاتھ باندھے رکھنے کی حکمت عملی پر عمل پیرا تھے اور اس دور میں انہیں اپنے دفاع میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ چنانچہ جب حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ کپڑے اتار دو تو آپؓ نے اتار دیے' پھر جب کہا گیا کہ دہکتے ہوئے انگاروں پر پُشت کے بَل لیٹ جاؤ تو آپؓ نے اس حکم کی بھی بلا حیل وحُجّت تعمیل کی۔ اسی طرح ابوجہل علی الاعلان آلِ یاسر رضی اللہ عنہم کو وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا کرتا تھا لیکن کسی مسلمان کو مداخلت کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

بہرحال سورۃ الحج کی مذکورہ آیت کے نزول کے بعد حکمت عملی یکسر تبدیل ہوگئی۔ اب تو گویا سر بکف ہو کر میدان میں نکلنے کا حکم تھا۔ یہ حکم ان لوگوں کے لیے بہت بھاری تھا جن کے دلوں میں روگ تھا۔ چنانچہ منافقین اصلاح اور صلح جوئی کے نام پر جہاد وقتال کے خلاف ہر وقت ہرزہ سرائی کرتے رہتے تھے کہ اس لڑائی بھڑائی کا کیا فائدہ؟..... اگر کوئی دشمن گُڑ کھلانے سے مرجائے تو اسے زہر دینے

کی بھلا کیا ضرورت ہے؟..... ہمیں تو اپنے دعوت وتبلیغ کے کام کو جاری رکھنا چاہیے..... قریشِ مکہ کے خلاف مہم جوئی کرنا اچھا قدم نہیں..... ان کے تجارتی قافلوں کے تعاقب جیسی چھیڑ چھاڑ کرنے کے خطرناک نتائج نکلیں گے..... وغیرہ وغیرہ۔ وہ اس طرح کی باتیں دراصل اپنے بچاؤ کے لیے کرتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ کسی امتحان میں پڑیں اور ان کا اصل چہرہ بے نقاب ہو۔ سورۃ البقرۃ کے دوسرے رکوع میں ان کے کردار کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے: ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝﴾ ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ مت فساد کرو زمین میں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ آگاہ ہو جاؤ! حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں' مگر انہیں شعور نہیں۔''

منافقین کی طرف سے پیدا کردہ منفی پروپیگنڈے کے اسی ماحول میں سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نازل ہوئی۔ اسلوب کے اعتبار سے یہ سورت پورے قرآن میں بالکل منفرد ہے۔ دوسری سورتوں کی طرح سورۂ محمدؐ کے آغاز میں حروفِ مقطعات یا حمد یہ الفاظ یا قرآن کی تنزیل وعظمت کے بارے میں تعارفی کلمات پر مبنی کوئی اسلوب بھی نہیں پایا جاتا' بلکہ اس کا آغاز بغیر کسی تمہید کے بالکل یک لخت (abruptly) ہوتا ہے اور وہ بھی لفظ اَلَّذِیْنَ سے' جو کہ کسی جملے کے آغاز کے لیے عام اسلوب نہیں ہے۔ اسی طرح اس سورت کا اختتام بھی عام سورتوں کے انداز سے ہٹ کر اچانک اختتامیہ کلمات کے بغیر ہی ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس سورت کی ہر آیت کا بھی یہی انداز ہے۔ یعنی اس کی ہر آیت یک لخت شروع ہوتی ہے اور اسی طرح یک لخت ختم ہو جاتی ہے۔ دوسری اکثر سورتوں کے اسلوب کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ عام طور پر ان کی آیات کا اختتام اسمائے حُسنیٰ یا اللہ تعالیٰ کی صفات کے ذکر پر ہوتا ہے' لیکن اس سورت کی آیات میں یہ اسلوب بھی نظر نہیں آتا۔ گویا اپنے اسلوب اور انداز کے اعتبار سے یہ ایک بالکل ہی منفرد سورت ہے۔

آیات ۱ تا ۱۵

سُوْرَةُ مُحَمَّدٍ مَدَنِيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۳۸ رُكُوْعَاتُهَا: ۴

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝۱ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ اَصْلَحَ بَالَهُمْ ۝۲ ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَ اَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ۝۳ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۗ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۚ ذٰلِكَ ۛ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝۴ سَيَهْدِيْهِمْ وَ يُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝۵ وَ يُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ۝۶ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝۷ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝۸ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ

کی بھلا کیا ضرورت ہے؟..... ہمیں تو اپنے دعوت وتبلیغ کے کام کو جاری رکھنا چاہیے..... قریشِ مکہ کے خلاف مہم جوئی کرنا اچھا اقدام نہیں..... ان کے تجارتی قافلوں کے تعاقب جیسی چھیڑ چھاڑ کرنے کے خطرناک نتائج نکلیں گے..... وغیرہ وغیرہ۔ وہ اس طرح کی باتیں دراصل اپنے بچاؤ کے لیے کرتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ کسی امتحان میں پڑیں اور ان کا اصل چہرہ بے نقاب ہو۔ سورۃ البقرۃ کے دوسرے رکوع میں ان کے کردار کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے: ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ⑪ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ⑫﴾ ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ مت فساد کرو زمین میں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ آگاہ ہو جاؤ! حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں' مگر انہیں شعور نہیں۔''

منافقین کی طرف سے پیدا کردہ منفی پروپیگنڈے کے اسی ماحول میں سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نازل ہوئی۔ اسلوب کے اعتبار سے یہ سورت پورے قرآن میں بالکل منفرد ہے۔ دوسری سورتوں کی طرح سورۂ محمدؐ کے آغاز میں حروفِ مقطعات یا حمد یہ الفاظ یا قرآن کی تنزیل وعظمت کے بارے میں تعارفی کلمات پر مبنی کوئی اسلوب بھی نہیں پایا جاتا' بلکہ اس کا آغاز بغیر کسی تمہید کے بالکل یک لخت (abruptly) ہوتا ہے اور وہ بھی لفظ اَلَّذِیْنَ سے' جو کہ کسی جملے کے آغاز کے لیے عام اسلوب نہیں ہے۔ اسی طرح اس سورت کا اختتام بھی عام سورتوں کے انداز سے ہٹ کر اچانک اختتامیہ کلمات کے بغیر ہی ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس سورت کی ہر آیت کا بھی یہی انداز ہے۔ یعنی اس کی ہر آیت یک لخت شروع ہوتی ہے اور اسی طرح یک لخت ختم ہو جاتی ہے۔ دوسری اکثر سورتوں کے اسلوب کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ عام طور پر ان کی آیات کا اختتام اسمائے حسنیٰ یا اللہ تعالیٰ کی صفات کے ذکر پر ہوتا ہے' لیکن اس سورت کی آیات میں یہ اسلوب بھی نظر نہیں آتا۔ گویا اپنے اسلوب اور انداز کے اعتبار سے یہ ایک بالکل ہی منفرد سورت ہے۔

آیات ۱ تا ۱۵

سُوْرَةُ مُحَمَّدٍ مَّدَنِيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۳۸ رُكُوْعَاتُهَا: ۴

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ① وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ اَصْلَحَ بَالَهُمْ ② ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَ اَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ③ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۗ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۚ ذٰلِكَ ۛ وَ لَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ④ سَيَهْدِيْهِمْ وَ يُصْلِحُ بَالَهُمْ ⑤ وَ يُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ⑥ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ⑦ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ⑧ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ

اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ۝۹ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۫ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ۝۱۰ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۝۱۱ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ ع
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ
وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۝۱۲ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ ۚ
اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ۝۱۳ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ
وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ۝۱۴ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ
وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ
مُّصَفًّى ؕ وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ؕ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَ
سُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ۝۱۵

آیت ۱ ﴿اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝۱﴾ ''جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا (اور خود بھی رکے) اللہ نے ان کی ساری جدّوجُہد کو رائیگاں کر دیا۔''

صَدَّ یَصُدُّ کے بارے میں قبل ازیں بھی وضاحت کی جا چکی ہے کہ یہ فعل لازم بھی ہے اور متعدّی بھی۔ یعنی اس کے معنی خود رُکنے اور باز رہنے کے بھی ہیں اور دوسرے کو روکنے کے بھی۔ یہ آیت اپنے مفہوم میں اہلِ ایمان کے لیے ایک بہت بڑی خوش خبری ہے کہ دعوتِ حق کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے اب تک مخالفینِ حق نے جو جدّوجُہد بھی کی ہے وہ سب اَکارت ہو چکی ہے اور تمام تر مخالفتوں کے باوجود انقلابِ نبویؐ کا قافلہ عنقریب اپنی منزلِ مقصود پر خیمہ زن ہونے والا ہے۔

آیت ۲ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ﴾ ''اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے اور جو ایمان لائے اُس شے پر جو نازل کی گئی محمد (ﷺ) پر اور وہ حق ہے ان کے ربّ کی طرف سے''

﴿كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ۝۲﴾ ''اللہ نے دور کر دیں ان سے ان کی خطائیں اور ان کے حال کو سنوار دیا۔''

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مسلسل آزمائشوں کی بھٹیوں میں سے گزار کر ان کی شخصیات کو کُندن بنا دیا۔ اس کی نظرِ رحمت سے ان کی سیرتیں ایمان و یقین کے نور سے جگمگانے لگیں اور ان کے کردار، اخلاق و عمل کی خوشبو سے مہک اٹھے۔

آیت ۳ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ﴾ ''یہ اس لیے کہ جن لوگوں نے کفر کیا انہوں نے باطل کی پیروی کی'' ﴿وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ﴾ ''اور جو لوگ ایمان لائے انہوں نے حق کی پیروی کی، جو اُن کے ربّ کی طرف سے آیا ہے۔''

﴿كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ۝۳﴾ ''اسی طرح اللہ لوگوں کے لیے ان کی مثالیں بیان کرتا ہے۔''

اگلی آیت مشکلات القرآن میں سے ہے۔ اس کی بنیادی وجہ الفاظ کی وہ تقدیم وتاخیر ہے جو ہمیں قرآن کی آیات میں بعض جگہ نظر آتی ہے۔ جیسا کہ کئی مرتبہ وضاحت کی جا چکی ہے' الفاظ کی یہ تقدیم وتاخیر قرآن کا خاص اسلوب ہے اور اس کا مقصد کلام کی روانی میں ایک خاص ردھم اور آہنگ کو قائم رکھنا ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں جہاں کہیں بھی ایسا معاملہ ہو وہاں مفہوم کے درست ادراک کے لیے الفاظ کی اصل ترتیب کے بارے میں گہرے غور وفکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس آیت کے مطالعے کے لیے بھی خصوصی توجہ درکار ہے۔

آیت ۴ ﴿فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ ''تو (اے مسلمانو!) جب تمہاری مڈبھیڑ ہو کافروں سے''

اب جبکہ تمہاری جدّ وجہد مسلح تصادم کے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے اور تم لوگ تلوار کا جواب تلوار سے دینے کے لیے میدان میں اُتر پڑے ہو تو جب ان کافروں سے تمہارے مقابلہ کی نوبت آئے:

﴿فَضَرْبَ الرِّقَابِ﴾ ''تو ان کی گردنیں مارنا ہے!''

اب میدانِ کارزار میں تمہاری پہلی ترجیح یہی ہونی چاہیے کہ جو دشمنِ حق تمہارے سامنے آئے وہ بچ کر نہ جائے۔ لہٰذا ان کی گردنیں اُڑاؤ' انہیں قتل کرو!

﴿حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ﴾ ''یہاں تک کہ جب تم انہیں اچھی طرح سے کچل دو تب انہیں مضبوطی کے ساتھ باندھو''

یعنی اس مرحلے پر تم بچے کھچے لوگوں کو قیدی بنا سکتے ہو۔

﴿فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا﴾ ''پھر اس کے بعد (تم انہیں چھوڑ سکتے ہو) احسان کر کے یا فدیہ لے کر' یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے۔''

اس آیت کے الفاظ میں تقدیم وتاخیر کے اسلوب پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ الفاظ کی اصل ترتیب یوں ہے: ''فَضَرْبَ الرِّقَابِ، حَتّٰى اِذَا اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ، حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً''۔ گویا اس جملے کے مطابق مقابلے کے مختلف مراحل کی ترتیب یہ ہوگی: پہلے ان کی گردنیں مارو' جب ان کی طاقت اچھی طرح کچل ڈالی جائے تب انہیں قید میں مضبوط باندھو۔ پھر جب جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے تو اس کے بعد انہیں چھوڑا جا سکتا ہے' چاہے احسان کر کے چھوڑ دو یا فدیہ لے کر۔

آیت کے درست مفہوم تک پہنچنے کے لیے اس اہم فلسفے کو بھی سمجھنا ضروری ہے جو یہاں ''حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا'' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ اس کے لیے انگریزی کے دو الفاظ war اور battle کو ذہن میں رکھئے۔ war سے مراد دو فریقوں کی باہمی محاذ آرائی اور کشمکش ہے جو ایک فریق کے فتح یاب اور دوسرے کے سرنگوں ہونے تک جاری رہتی ہے' جبکہ battle سے مراد اس محاذ آرائی کے دوران متعلقہ فریقوں کے درمیان ہونے والا کوئی خاص معرکہ ہے۔ گویا ایک جنگ (war) کے دوران میں کئی لڑائیاں (battles) ہو سکتی ہیں۔ اب رسول اللہ ﷺ کی جدّ وجہد کے حوالے سے اس نکتے کو یوں سمجھئے کہ مدنی دور

میں غلبۂ دین کی جنگ (war) چھ سال تک مسلسل جاری رہی ـــــ اس میں صرف صلح حدیبیہ کی وجہ سے کچھ مدت کے لیے ایک وقفہ آیا تھا ـــــ اس جنگ کے دوران غزوۂ بدر (Battle of Badar)، غزوۂ اُحد (Battle of Uhad)، غزوۂ احزاب (Battle of Ahzaab)، غزوۂ بنی مصطلق (Battle of Bani Mustalaq) اور بہت سی دوسری لڑائیاں لڑی گئیں۔ لیکن جنگ (war) نے مکمل طور پر ہتھیار اُس وقت ڈالے جب پورے جزیرہ نمائے عرب میں اللہ کا دین اس حد تک غالب ہو گیا کہ اس کے مقابلے میں باطل کی طرف سے کسی قسم کی کوئی مزاحمت باقی نہ رہی۔

چنانچہ زیر مطالعہ آیت میں جو حکمت بیان ہوئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اقامتِ دین کی جدّوجہد کے آخری مرحلے یعنی مسلح تصادم میں جب باطل قوتوں کو علی الاعلان للکارا جا چکا ہو اور مردانِ حق اپنے سروں پر کفن باندھ کر میدانِ کارزار میں اُتر پڑے ہوں تو یہ پنجہ آزمائی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک باطل پوری طرح سرنگوں نہ ہو جائے۔ اس دوران کسی مہم یا کسی لڑائی میں پکڑے جانے والے قیدیوں کو کسی بھی شرط پر آزاد کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ انہیں اگلے معرکے میں دوبارہ اپنے مقابلے میں آنے کا موقع دے رہے ہیں۔ جیسے غزوۂ بدر میں کفار کے ستر (۷۰) جنگجوؤں کے مارے جانے سے ان کی طاقت کو ایک حد تک تو نقصان پہنچا تھا، مگر ان کی جنگی صلاحیت پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ ان کے ۷۰ قیدیوں کی آزادی ان کے لیے پھر سے تقویت کا باعث بن گئی اور فدیہ دے کر آزاد ہونے والے قیدیوں میں سے اکثر افراد اگلے سال مسلمانوں کے مقابلے کے لیے پھر سے میدان میں تھے۔

دوسری طرف اس حوالے سے ایک نکتہ یہ بھی ذہن نشین کر لیجیے کہ غزوۂ بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنے سے متعلق حضور ﷺ کا فیصلہ ایک اجتہاد تھا، جس کا تعلق جانچ (judgement) سے تھا۔ یعنی اس معاملے میں حضور ﷺ کا اندازہ تھا کہ کفار کی طاقت کچلی جا چکی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک ابھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ بہرحال اجتہاد کی دونوں صورتیں (خطا اور صواب) ہی اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہیں اور دونوں پر ہی اجر بھی ملتا ہے۔ البتہ اجتہاد میں تصویب کی صورت میں دہرے اجر کا وعدہ ہے۔ آیت زیر مطالعہ میں چونکہ قیدیوں کو فدیے کے عوض رہا کرنے کا اختیار دیا گیا تھا اس لیے حضور ﷺ نے اس اختیار کی رو سے مذکورہ فیصلہ فرمایا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو بہتر طور پر معلوم تھا کہ کفر کی جنگی صلاحیت ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اسی لیے سورۃ الانفال (جو اس سورت کے بعد نازل ہوئی) میں حضور ﷺ کے اس فیصلے سے متعلق یہ تبصرہ نازل ہوا تھا: ﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۡ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝﴾ ''کسی نبی کے لیے یہ روا نہیں کہ اُس کے قبضے میں قیدی ہوں جب تک کہ وہ (کافروں کو قتل کر کے) زمین میں خوب خوں ریزی نہ کر دے۔ تم دنیا کا ساز و سامان چاہتے ہو اور اللہ کے پیش نظر آخرت ہے، اور اللہ عزیز اور حکیم ہے''۔ ﴿لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ ''اگر اللہ کی طرف سے ایک بات پہلے سے طے نہ ہو چکی ہوتی تو جو کچھ (فدیہ وغیرہ) تم نے لیا ہے اس کے باعث تم پر بڑا سخت عذاب آتا''۔ یہاں ''کِتٰب'' سے مراد آیت زیر مطالعہ کا یہ حکم ہے جس میں فدیہ کے عوض قیدیوں کو چھوڑنے کی اجازت دی گئی ہے۔ مطلب یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورۂ محمد (ﷺ) کی آیت ۴ کا حکم پہلے سے نازل نہ ہو چکا ہوتا تو فدیہ لینے کی وجہ سے تم پر سخت گرفت ہوتی۔ ﴿فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ ''تو اب کھاؤ جو تمہیں ملا ہے غنیمت میں سے (کہ وہ تمہارے لیے) حلال اور طیّب (ہے)، اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ یقیناً اللہ بخشنے والا، رحم فرمانے والا ہے۔''

سورۃ الانفال کی یہ آیت بھی مشکلات القرآن میں سے ہے اور اس کو سمجھنے کے لیے بھی آیت زیر مطالعہ کی درست تفہیم ضروری ہے۔ بہر حال آیت زیر مطالعہ کے حکم کا خلاصہ یہ ہے کہ جب دشمن سے تمہارا مقابلہ ہو تو انہیں خوب قتل کرو' پھر جب کفر کی کمر پوری طرح ٹوٹ جائے تو ان کے بچے کھچے زندہ افراد کو قیدی بھی بنایا جا سکتا ہے۔ پھر جب دشمن کی طرف سے مزاحمت بالکل ختم ہو جائے اور اس کے خلاف تمہاری جنگ اپنے منطقی انجام کو پہنچ جائے تو قیدیوں کو آزاد کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں' چاہے ان کے عوض فدیہ لے لو یا احسان کرتے ہوئے بلا معاوضہ انہیں رہا کر دو۔

﴿ذٰلِكَ ۭ وَلَوْ يَشَاۗءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ ۙ﴾ ''یہ ہے (اس بارے میں حکم)' اور اگر اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے بدلہ لے لیتا''

﴿وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ۭ﴾ ''لیکن اللہ آزماتا ہے تمہارے بعض لوگوں کو بعض دوسروں کے ذریعے سے۔''

اللہ تعالیٰ ان کفار سے خود بھی انتقام لے سکتا تھا۔ وہ چاہتا تو میدانِ بدر میں کفار کے ایک ہزار نفوس پر مشتمل لشکر کو آنِ واحد میں بھسم کر کے رکھ دیتا۔ لیکن اس نے تمہارے تین سو تیرہ افراد کو ایک ہزار کے طاقت ور لشکر کے مقابلے میں لا کر تمہارے صبر و ایمان اور جذبۂ استقامت کا امتحان لینا پسند کیا۔

﴿وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝﴾ ''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو گئے تو اللہ اُن کے اعمال کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔''

اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا انہیں بھرپور صلہ دے گا۔

آیت ۵ ﴿سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝﴾ ''وہ ان کی راہنمائی کرے گا اور ان کے احوال کو سنوار دے گا۔''

آیت ۶ ﴿وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ۝﴾ ''اور داخل کرے گا انہیں جنت میں جس کی ان کو پہچان کرا دی ہے۔''

یعنی جنت اور اس کی نعمتوں کا قرآن میں تفصیلی تعارف کرا دیا گیا ہے۔

آیت ۷ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝﴾ ''اے اہلِ ایمان! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور وہ تمہارے قدموں کو جما دے گا۔''

یہ اللہ تعالیٰ کا بہت اہم قانون ہے۔ اگر تم لوگ اللہ کے فرماں بردار بندے بن کر رہو گے' اسی سے مدد مانگو گے' اسی پر توکل کرو گے اور اُس کے دین کے غلبے کی جدّوجُہد کو اپنی زندگی کا مشن بنا لو گے تو وہ تمہیں بے سہارا اور بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا' بلکہ ایسی صورت میں ہر جگہ' ہر گھڑی اُس کی مدد آپ لوگوں کے شامل حال رہے گی۔ لیکن اس کے برعکس اگر تم لوگ اللہ کے دشمنوں کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھاؤ گے' ان کی وفاداریوں کا دم بھرو گے' انہیں اپنا حمایتی اور مددگار سمجھو گے' تو اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دے گا۔ پھر تم اللہ سے رو رو کر بھی دعائیں کرو گے تو اُس کے حضور تمہاری شنوائی نہیں ہو گی۔

اس کی عملی مثال ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں سامنے آئی تھی۔ اس جنگ کے دوران پاکستان کی کامیابی کے لیے مسجد الحرام اور مسجد نبویؐ کے اندر تواتر کے ساتھ قنوتِ نازلہ پڑھی جاتی رہی' مگر عین اُسی وقت ہمارے حکمرانوں کی حالت یہ تھی کہ وہ مدد اور حمایت کے لیے اللہ کے دشمنوں کے سامنے سجدہ ریز ہو کر ان کی مدد کا انتظار کر رہے تھے۔ یعنی دعائیں تو اللہ سے مانگی جا رہی تھیں لیکن

بھروسا امریکہ کے ساتویں بحری بیڑے پر تھا۔ لہٰذا دنیا نے دیکھ لیا کہ حرمین شریفین کے اندر مانگی گئی دعائیں بھی اللہ تعالیٰ کے حضور درجہ قبولیت حاصل نہ کر سکیں اور سقوطِ ڈھاکہ کا بدترین سانحہ رونما ہو کر رہا۔ اس صورتِ حال کا تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ قومی و ملکی سطح پر اتنی بڑی ہزیمت اور ذلت اٹھانے کے بعد بھی ہم نے اپنی روش تبدیل نہیں کی۔ چنانچہ آج بھی ہماری حالت یہ ہے کہ ہم نے بدستور اللہ کے باغیوں کے سامنے مدد کے لیے ہاتھ پھیلا رکھے ہیں۔ ہمارے حکمران آج بھی انہی کو اپنا سرپرست سمجھتے ہیں اور انہی کی مدد پر بھروسا کیے بیٹھے ہیں۔ ادھر پورے ملک کی معیشت ہے کہ بڑے دھڑلے سے سود پر چل رہی ہے۔ گویا ملک کے اندر ہم نے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کے ساتھ کھلم کھلا اعلانِ جنگ کر رکھا ہے۔ ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ ہماری دعائیں بھلا کیونکر سنے گا اور کیونکر اُس کی مدد ہمارے شاملِ حال ہوگی؟

بہرحال آیات زیر مطالعہ میں اس حوالے سے ہمارے لیے راہنمائی بھی ہے اور خوشخبری بھی کہ اگر تم اللہ کی اطاعت میں مخلص رہو گے اس کے دین کے جھنڈے کو تھامے رکھو گے اور اقامتِ دین کی جدّوجُہد میں اپنا تن من دھن لگانے کے لیے آمادہ رہو گے تو وہ تمہاری مدد کے لیے ہر جگہ تمہارے ساتھ موجود ہوگا اور تمہارے دشمنوں کے مقابلے میں تمہارے قدم جمائے رکھے گا۔

آیت ۸ ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝۸﴾ ''اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تو اُن کے لیے ناکامی ہے اور وہ ان کے تمام اعمال کو برباد کر دے گا۔''

تَعْس کا معنی ٹھوکر کھا کر مُنہ کے بَل گرنا ہے' گویا ناکام و نامراد اور ذلیل و رسوا ہونا۔ اور اس سے مراد ہلاکت بھی ہے۔ یعنی جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کی وہ دنیا کی زندگی میں بھی خائب و خاسر اور ذلیل و رسوا ہوں گے' ٹھوکریں کھا کر مُنہ کے بَل گرنا ان کا مقدر ہوگا۔ قیامت کے دن ایسے لوگ راندۂ درگاہ کر دیے جائیں گے اور حصولِ دنیا کے لیے کی جانے والی ان کی تمام جدّوجُہد ان کے کسی کام نہیں آ سکے گی۔

آیت ۹ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ۝۹﴾ ''یہ اس لیے کہ انہوں نے اُس چیز کو ناپسند کیا جو اللہ نے نازل کی تو اُس نے ان کے تمام اعمال کو ضائع کر دیا۔''

ایسے لوگوں کے نامہ ہائے اعمال میں جو نیک اعمال ہوں گے وہ بھی سب کے سب ضائع کر دیے جائیں گے۔ جیسے مشرکین میں سے بعض لوگ غریبوں کو کھانا کھلاتے تھے اور حاجیوں کی مہمان نوازی کا خصوصی اہتمام کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ بہت نیکی کے کام کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کو سورۃ التوبہ کی آیت ۱۹ میں دوٹوک انداز میں بتا دیا گیا: ﴿اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ﴾ ''کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجدِ حرام کو آباد رکھنے کو برابر کر دیا ہے اُس شخص (کے اعمال) کے جو ایمان لایا اللہ پر اور یومِ آخرت پر اور اُس نے جہاد کیا اللہ کی راہ میں؟ یہ برابر نہیں ہو سکتے اللہ کے نزدیک''۔ بہرحال یہ اللہ کا حتمی فیصلہ اور اٹل قانون ہے کہ اگر کوئی اللہ کے نازل کردہ قرآن کو ناپسند کرتا ہے تو اُس کے تمام نیک اعمال بھی برباد ہو جائیں گے اور توشۂ آخرت کے طور پر اُس کے پاس کچھ بھی نہ بچے گا۔

آیت ۱۰ ﴿اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ﴾ ''تو کیا یہ زمین میں گھومے پھرے نہیں کہ وہ دیکھتے کہ کیا انجام ہوا اُن لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے!''

﴿دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ۝۱۰﴾ ''اللہ نے اُن پر ہلاکت کو مسلط کر دیا' اور ان کافروں کے لیے بھی ان ہی کی مثالیں ہوں گی۔''

جن نتائج سے پہلے گزرنے والی کافر اقوام دوچار ہوئیں ویسے ہی ہلاکت خیز نتائج ان کافروں کا مقدر ہیں۔

آیت ۱۱ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۝۱۱﴾ ''یہ اس لیے کہ اللہ مولیٰ (پشت پناہ) ہے اہلِ ایمان کا اور یہ کہ کافروں کا کوئی مولیٰ ہے ہی نہیں۔''

اسی آیت کے الفاظ سے رسول اللہ ﷺ نے وہ نعرہ اخذ فرمایا تھا جس سے میدانِ اُحد میں کُفّار کے نعرے کا جواب دیا گیا تھا۔ میدانِ اُحد میں وقتی طور پر مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تو اس دوران رسول اللہ ﷺ کچھ صحابہؓ کے ساتھ جبلِ اُحد پر تشریف لے گئے تھے۔ اُس وقت ابوسفیان اور خالد بن ولید (بعد میں دونوں حضرات ایمان لا کر صحابہؓ میں شامل ہوئے) سمیت بہت سے سردارانِ قریش پہاڑ کے دامن میں موجود تھے۔ ان میں سے ابوسفیان نے حضور ﷺ اور مسلمانوں کو مخاطب کر کے پُرجوش انداز میں نعرہ بلند کیا تھا: اُعْلُ هُبَل، اُعْلُ هُبَل! (ہُبل کی جے! یعنی آج ہمارے بُت ہُبل کا بول بالا ہوا —— رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ اس نعرے کا جواب ان الفاظ سے دیں: اَللّٰهُ اَعْلٰى وَاَجَلّ! یعنی اللہ ہی سب سے بلند مرتبہ اور بزرگ و برتر ہے' اُسی کا بول بالا ہے! اس کے جواب میں ابوسفیان نے ایک اور نعرہ لگایا: لَنَا الْعُزّٰى وَلَا عُزّٰى لَكُمْ کہ ہمارے لیے تو عزیٰ جیسی دیوی مدد کے لیے موجود ہے لیکن تمہاری تو کوئی عزیٰ ہی نہیں ہے۔ حضور ﷺ نے مسلمانوں کو اس کا جواب اس نعرے سے دینے کا حکم دیا: اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰى لَكُمْ کہ ہمارا مولیٰ (مددگار' پشت پناہ اور کارساز) تو اللہ ہے' جبکہ تمہارا تو کوئی مولیٰ ہے ہی نہیں۔ (۱)

آیت ۱۲ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ﴾ ''یقیناً اللہ داخل کرے گا اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے ان باغات میں جن کے دامن میں نہریں بہتی ہوں گی۔''

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۝۱۲﴾ ''اور جو کافر ہیں وہ (دنیا میں) عیش کر رہے ہیں اور ایسے کھا رہے ہیں جیسے حیوانات کھاتے ہیں اور اُن کا ٹھکانہ آگ ہے۔''

آیت ۱۳ ﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِىَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ ۚ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) کتنی ہی ایسی بستیاں تھیں جو کہیں زیادہ قوت کی حامل تھیں آپ کی اُس بستی سے جس نے آپ کو نکالا ہے۔''

قریش نے اپنی طاقت کے زعم میں اللہ کے رسول ﷺ کو مکہ سے نکل جانے پر مجبور تو کر دیا ہے' لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان سے پہلے دنیا میں ان کے شہر سے کہیں بڑے بڑے شہر آباد تھے اور ان شہروں کے باسی ان سے کہیں بڑھ کر طاقت و شوکت کے حامل تھے' مگر:

﴿اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ۝۱۳﴾ ''انہیں ہم نے ہلاک کر دیا' پس اُن کا کوئی مددگار نہ ہوا۔''

۱۔ صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب ما یکره من التنازع والاختلاف فی الحرب ... ح:۳۰۳۹ وکتاب المغازی' باب غزوة أحد' ح:۴۰۴۳۔

آیت ۱۴ ﴿اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ ''تو بھلا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہے''

یعنی اس کی سرشت اور فطرت بھی نیک ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت اس کو دی ہے وہ اس ہدایت پر بھی قائم ہے۔

﴿كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ۝۱۴﴾ ''وہ اُس شخص جیسا ہو جائے گا جس کے لیے اس کے بُرے اعمال مزین کر دیے گئے ہیں اور انہوں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی ہے۔''

ایسے لوگوں کو وہی کچھ نظر آتا ہے جو اُن کی خواہشات کا آئینہ انہیں دکھاتا ہے اور ظاہر ہے یہ آئینہ تو کالے کرتوتوں کو بھی خوشنما بنا کر ہی دکھاتا ہے۔ اسی وجہ سے فرعون نے اہلِ مصر کی تہذیب و روایات کو مثالی ﴿بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ۝۶۳﴾ (طٰہٰ) قرار دیا تھا۔

آیت زیر مطالعہ میں جن دو کرداروں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں باہم کوئی مقابلہ یا موازنہ ہے ہی نہیں۔ ایک طرف اللہ کے وہ بندے ہیں جو اپنے رب کی طرف سے بینہ پر ہیں۔ یقیناً وہ کامیاب ہونے والے لوگ ہیں۔ جبکہ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو اپنے نفس کی غلامی اور اپنی خواہشات کی پیروی میں زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ بہرحال ناکام و نامراد ہیں۔

آیت ۱۵ ﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ﴾ ''مثال اُس جنت کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے متقین سے۔''

﴿فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّاۗءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ﴾ ''اُس میں نہریں ہیں پانی کی جس میں کوئی بُو نہیں۔''

﴿وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ﴾ ''اور دودھ کی نہریں ہیں جس کا ذائقہ تبدیل نہیں ہوتا۔''

﴿وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ﴾ ''اور ایسی شراب کی نہریں ہیں جو سراپا لذت ہے پینے والوں کے لیے۔''

﴿وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ۭ﴾ ''اور نہریں ہیں صاف شفاف شہد کی۔''

﴿وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ۭ﴾ ''اور (مزید برآں) ان کے لیے ہوں گے اس میں ہر قسم کے پھل اور مغفرت ہوگی ان کے رب کی طرف سے۔''

تو بھلا وہ لوگ جو ان جنتوں کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے کیا وہ:

﴿كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوْا مَاۗءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَاۗءَهُمْ ۝۱۵﴾ ''اُن جیسے ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ آگ میں رہنے والے ہیں اور انہیں پلایا جائے گا کھولتا ہوا پانی جو اُن کی انتڑیوں کو کاٹ کر رکھ دے گا۔''

آیات ۱۶ تا ۱۹

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ حَتّٰٓى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَاۗءَهُمْ ۝۱۶ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ۝۱۷ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَاۗءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَاۗءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ۝۱۸ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ ۝۱۹ ع

اب یہاں سے اس سورت کا اصل مضمون شروع ہو رہا ہے۔ جیسا کہ قبل ازیں بھی بتایا جا چکا ہے کہ اس سورت کا مرکزی مضمون ''قتال فی سبیل اللہ'' ہے اور اسی نسبت سے اس کا دوسرا نام ''سورۃ القتال'' ہے۔ اس مضمون کے تحت آئندہ آیات میں ان لوگوں کی باطنی کیفیات کی جھلکیاں بھی نظر آئیں گی جن کے دلوں میں روگ تھا اور قتال کے ذکر سے ان پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی تھی۔

آیت ۱۶ ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو آپ کی بات کو بڑی توجہ سے سنتے ہیں۔''

﴿حَتّٰٓى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۭ﴾ ''یہاں تک کہ جب وہ آپ کے پاس سے نکل کر باہر جاتے ہیں تو اُن لوگوں سے پوچھتے ہیں جنہیں علم دیا گیا ہے کہ ابھی انہوں (محمد ﷺ) نے کیا کہا تھا؟''

یعنی آج حضور ﷺ نے یہ جو ایک نئی بات کہہ دی ہے کہ ہمیں جنگ کے لیے تیار ہونا ہے اور قریش کے تجارتی قافلوں کا تعاقب کرنا ہے' یہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ اُوْتُوا الْعِلْمَ سے یہاں اہلِ ایمان بھی مراد ہو سکتے ہیں اور اہلِ کتاب یہودی بھی۔ یعنی منافقین یہ بات ان مسلمانوں سے پوچھتے جنہیں وہ زیادہ سمجھدار سمجھتے تھے یا یہ کہ یہی بات وہ لوگ یہودیوں سے جا کر پوچھتے جنہیں اس سے پہلے کتاب کا علم دیا گیا تھا۔

﴿اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَاۗءَهُمْ ۝۱۶﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے اور وہ اپنی خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں۔''

جہاد و قتال کے تصور سے ان کے دلوں کی گھبراہٹ اور ایثار و قربانی کی باتوں کو قبول کرنے سے ان کی ہچکچاہٹ درحقیقت اس منافقت کی علامت ہے جو ان کے دلوں میں پیدا ہو چکی ہے۔

آیت ۱۷ ﴿وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ۝۱۷﴾ ''اور وہ لوگ جو ہدایت پر ہیں اللہ نے ان کی ہدایت میں اور اضافہ کر دیا ہے اور انہیں ان کے حصے کا تقویٰ عطا فرمایا ہے۔''

جب سے رسول اللہ ﷺ کی تحریک مرحلۂ قتال میں داخل ہوئی ہے اہلِ ایمان کے جوشِ ایمانی' ذوقِ شہادت اور تقویٰ میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

آیت ۱۸ ﴿فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَاۗءَ اَشْرَاطُهَا ۚ﴾ ''تو یہ لوگ اب کس چیز کے منتظر ہیں سوائے قیامت کے کہ وہ آ دھمکے ان پر اچانک؟ پس اس کی علامات تو ظاہر ہو ہی چکی ہیں۔''

قیامت کی سب سے بڑی نشانی تو خود محمد عربی ﷺ کی بعثت ہے کہ آپ آخری رسول ہیں۔ ایک موقع پر آپ ﷺ نے اپنی دو انگلیوں کو آپس میں ملا کر فرمایا: ((بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ)) (۲) ''میں اور قیامت ان دو انگلیوں کی مانند (جڑے ہوئے) بھیجے گئے ہیں''۔ ظاہر ہے آپ ﷺ آخری نبی ہیں تو آپ کے بعد اب قیامت ہی کو آنا ہے۔ حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے

۲۔ صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب قول النبی ﷺ بعثت انا والساعة کھاتین۔ وصحیح مسلم' کتاب الفتن وأشراط الساعة' باب قرب الساعة۔

روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اَنَا آخِرُ الْاَنْبِیَاءِ وَاَنْتُمْ آخِرُ الْاُمَمِ))[۳] ''میں آخری نبی ہوں اور تم آخری اُمت ہو۔''

﴿فَاَنّٰی لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ﴿۱۸﴾﴾ ''تو جب وہ ان پر آدھمکے گی تو اُس وقت ان کا نصیحت حاصل کرنا کس کام کا ہوگا؟''

آیت ۱۹ ﴿فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ﴾ ''بس جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اپنی خطاؤں کے لیے (اللہ سے) استغفار کرو''

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ کی ایک تاویل تو یہ ہے کہ یہ خطاب اگرچہ صیغۂ واحد میں نبی اکرم ﷺ سے ہے لیکن حقیقت میں آپؐ کی وساطت سے یہ ہدایت آپؐ کی اُمت کے لیے ہے۔ البتہ بعض علماء نے اس اسلوب کی وضاحت حضور ﷺ کے ''تعلق مع اللہ'' کے حوالے سے بھی کی ہے۔ اگر کسی عام بندۂ مؤمن کو اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت سے چند لمحات کے لیے تعلق مع اللہ میں انشراح کی کیفیت نصیب ہو جائے تو اُس کے لیے یہ کیفیت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ لیکن حضور ﷺ کے لیے تو ظاہر ہے ہر وقت ہی انشراح کی کیفیت رہتی تھی اور اس کیفیت کی شدت (intensity) میں کسی ایک لمحے کے لیے ذرا سی بھی کمی کو آپؐ بہت بڑی کوتاہی سمجھتے تھے۔ چنانچہ یہاں لفظ ''ذَنب'' کے حوالے سے آپؐ کے اسی احساس کی طرف اشارہ ہے۔ گویا یہ ''حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْن'' والا معاملہ ہے۔ یعنی بعض اوقات ایک عام مسلمان کے معیار کی نیکی کسی مقربِ بارگاہ کے معیارِ عمل کے سامنے کوتاہی یا گناہ کے درجے میں شمار ہوتی ہے۔ بہرحال نہ تو مقربینِ بارگاہ کے تعلق مع اللہ کا معاملہ عام مسلمانوں کا سا ہے اور نہ ہی ان کے معاملے میں لفظ ''ذَنب'' کی تعریف (definition) کا وہ مفہوم درست ہے جس سے عام طور پر ہم لوگ واقف ہیں۔

اس معاملے میں میری ایک ذاتی رائے بھی ہے جس کا ذکر اگلی سورت یعنی سورۃ الفتح کی آیت ۲ کے ضمن میں بھی آئے گا۔ میری رائے میں یہاں پر لفظ ''ذَنب'' کا تعلق اس ''اجتماعیت'' سے ہے جس کے سربراہ حضور ﷺ تھے۔ پچھلے کئی برسوں سے حضور ﷺ اپنے اہلِ ایمان ساتھیوں کے ساتھ غلبۂ دین کے لیے جدّوجُہد میں مصروف تھے۔ ظاہر ہے اس اجتماعی جدّوجُہد میں شریک افراد سے کہیں کوئی غلطی بھی سرزد ہو جاتی ہوگی اور کسی معاملے میں کبھی کوئی کوتاہی بھی رہ جاتی ہوگی۔ اگرچہ ایسی غلطیاں اور کوتاہیاں دوسروں سے ہوتی ہوں گی مگر تحریک اور جدّوجُہد کے قائد چونکہ حضور ﷺ تھے اس لیے ان کا ذکر یہاں آپ ﷺ کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ جیسے جنگ میں پوری فوج حصہ لیتی ہے' ایک ایک سپاہی لڑتا ہے لیکن فتح کا سہرا سپہ سالار کے سر بندھتا ہے' اسی طرح اگر کسی فوج کو شکست سے دوچار ہونا پڑے تو بھی اس فوج کے کمانڈر ہی کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔

﴿وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ﴾ ''اور اہلِ ایمان مَردوں اور عورتوں کے لیے بھی (استغفار کریں)۔''

﴿وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ ﴿۱۹﴾﴾ ''اور اللہ خوب جانتا ہے تمہارے لوٹنے کی جگہ کو اور تمہارے مستقل ٹھکانے کو۔''

۳۔ سنن ابن ماجه' کتاب الفتن' باب فتنة الدجال وخروج عیسی ابن مریم...

آیات ۲۰ تا ۲۸

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ لَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّ ذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ؕ فَاَوْلٰى لَهُمْ ۚ﴿۲۰﴾ طَاعَةٌ وَّ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۫ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۫ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ﴿۲۱﴾ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَ تُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ﴿۲۲﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَ اَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ ﴿۲۳﴾ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ؕ وَ اَمْلٰى لَهُمْ ﴿۲۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ ۚ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ﴿۲۶﴾ فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ﴿۲۷﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَ كَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿۲۸﴾ ع

آیت ۲۰ ﴿وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ﴾ ''اور یہ لوگ جو ایمان کے دعویدار ہیں' کہتے ہیں کہ (قتال کے بارے میں) کوئی سورت کیوں نازل نہیں ہوئی؟''

زیر مطالعہ مضمون کے حوالے سے اس سورت کی یہ آیت خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ہجرت کے فوراً بعد رسول اللہ ﷺ نے مدینہ سے باہر قریشِ مکہ کے خلاف مہمات بھیجنا شروع کر دیں۔ غزوۂ بدر سے پہلے ایسی آٹھ مہمات کا بھیجا جانا تاریخ سے ثابت ہے۔ ان میں سے چار مہمات کا شمار تو غزوات میں ہوتا ہے کہ ان میں حضور ﷺ خود بھی تشریف لے گئے تھے۔ ان مہمات کے ذریعے سے آپؐ نے خصوصی طور پر مندرجہ ذیل دو مقاصد حاصل کیے:

(الف): مکہ کی تجارتی شاہراہ سے ملحقہ علاقوں میں مسلح دستوں کی نقل و حرکت سے قریشِ مکہ کو آپؐ نے ایک مؤثر پیغام پہنچا دیا کہ تمہاری شہ رگ (life line) اب ہر طرح سے ہمارے قبضہ میں ہے اور ہم جب چاہیں تمہاری مکمل معاشی ناکہ بندی کر سکتے ہیں۔

(ب): جن علاقوں میں آپؐ نے مہمات بھیجیں یا آپؐ خود تشریف لے گئے وہاں کے اکثر قبائل کو آپؐ نے اپنا حلیف بنا لیا' اور جو قبائل آپؐ کے حلیف نہ بھی بنے انہوں نے قریشِ مکہ اور مسلمانوں کے تنازعہ میں غیر جانبدار رہنے کے معاہدے کر لیے۔ یوں اس پورے علاقے سے قریشِ مکہ کا اثر و رسوخ روز بروز کم ہونا شروع ہو گیا اور انہیں جزیرہ نمائے عرب میں صدیوں سے قائم اپنی سیاسی اجارہ داری کی بساط لپٹتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

اس حوالے سے یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ حضور ﷺ کی طرف سے مذکورہ مہمات کی منصوبہ بندی ابتدائی اقدام (initiative) کی نئی حکمت عملی کے تحت کی جا رہی تھی۔ قریشِ مکہ کی طرف سے آپؐ کے قیامِ مکہ کے دور کی زیادتیاں اپنی جگہ' لیکن ہجرت کے بعد سے اب تک انہوں نے کوئی بھی جارحانہ اقدام نہیں کیا تھا۔ اُس وقت تک جارحانہ اقدام سے متعلق قرآن میں بھی کوئی

واضح ہدایت نہیں آئی تھی۔ سورۃ الحج کی آیت ۳۹ میں جو حکم تھا وہ اذن اور اجازت کے درجے میں تھا' اس حکم میں بھی جارحانہ اقدام کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ بلکہ ایک رائے کے مطابق تو اُس وقت تک یہ حکم نازل بھی نہیں ہوا تھا' کیونکہ سورۃ الحج کو بعض لوگ مدنی سورت مانتے ہیں' اور اگر یہ رائے درست ہو تو پھر یہ بھی امکان ہے کہ سورۃ الحج اس دور کے بعد نازل ہوئی ہو۔ دوسری طرف سورۃ البقرۃ اس وقت تک مکمل نازل ہو چکی تھی اور اس میں قتال کے بارے میں احکام بھی موجود ہیں' مگر وہ احکام زیادہ سے زیادہ اس نوعیت کے ہیں:

﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ (البقرۃ: ۱۹۰) کہ جو لوگ آپ سے لڑتے ہیں آپ لوگ ان کے خلاف لڑو!

اس پس منظر میں منافقین کی طرف سے حضور ﷺ کے مذکورہ اقدامات کے خلاف ''لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ'' کے اعتراض کا مفہوم بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ ان کا موقف تھا کہ جب قریش کی طرف سے کوئی حریفانہ اقدام نہیں ہو رہا تو ہماری طرف سے ان کی تجارتی شاہراہ پر چھاپے مار کر اور ان کے قافلوں کا تعاقب کر کے خواہ مخواہ جنگی ماحول پیدا کرنے کا کوئی جواز نہیں' اور اگر یہ اقدامات ایسے ہی ضروری تھے تو ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کوئی واضح حکم کیوں نازل نہیں کیا؟ اور اگر قرآن میں ایسا کوئی حکم نازل نہیں ہوا تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حضور ﷺ خود اپنی مرضی سے یہ مہم جوئی کر رہے ہیں۔

﴿فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ﴾ ''پھر جب ایک محکم سورت نازل کر دی گئی اور اس میں قتال کا حکم آ گیا''

اس سے مراد زیر مطالعہ سورت یعنی سورۂ محمد (ﷺ) ہے اور اس سورت کا دوسرا نام ''سورۃ القتال'' اسی آیت سے ماخوذ ہے۔

﴿رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ؕ﴾ ''تو اب آپ دیکھیں گے اُن لوگوں کو جن کے دلوں میں روگ ہے کہ یہ لوگ آپؐ کی طرف ایسے دیکھیں گے جیسے وہ شخص دیکھتا ہے جس پر موت کی غشی طاری ہو رہی ہوتی ہے۔''

﴿فَاَوْلٰى لَهُمْ ۝۲۰﴾ ''تو بربادی ہے ان کے لیے!''

دراصل یہ لوگ قتال سے جی چراتے ہیں۔ قبل ازیں اپنے بچاؤ کے لیے ان کی دلیل یہ تھی کہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا کوئی واضح حکم نازل نہیں ہوا۔ اب جبکہ اللہ نے قتال کے بارے میں واضح حکم نازل کر دیا ہے تو ان کی یہ دلیل ختم ہو گئی ہے۔

آیت ۲۱ ﴿طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۭ﴾ ''اطاعت لازم ہے اور کوئی بھلی بات کہی جا سکتی ہے۔''

ان کے لیے پسندیدہ روش اطاعت اور قولِ معروف کی تھی۔ یہ لوگ جب ایمان کے دعوے دار ہیں تو ان پر اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت لازم ہے۔ ایمان کے دعوے کے ساتھ ساتھ یہ لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے خلاف دلیل بازی نہیں کر سکتے۔ ہاں اگر کسی معاملے میں یہ لوگ معروف طریقے سے کوئی مفید مشورہ دینا چاہتے تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔

﴿فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۭ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۝۲۱﴾ ''تو جب کوئی فیصلہ طے پا جائے تو پھر اگر وہ اللہ سے (اپنے ایمان کے وعدے میں) سچے ثابت ہوں' تبھی اُن کے لیے بہتری ہے۔''

آیت ۲۲ ﴿فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ۝۲۲﴾ ''پس تم سے اس کے سوا کچھ متوقع نہیں ہے کہ اگر تم لوگوں کو حکومت مل جائے تو تم زمین میں فساد مچاؤ گے اور اپنے رحمی رشتے کاٹو گے۔''

عام طور پر اس آیت کے دو ترجمے کیے جاتے ہیں۔ دوسرے ترجمے کے مطابق آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر تم لوگ قتال سے منہ موڑو گے تو تم سے یہی توقع کی جاسکتی ہے کہ تم زمین میں فساد مچاؤ گے اور خونی رشتوں کے تقدس کو پامال کرو گے۔ اوپر آیت کے تحت جو ترجمہ اختیار کیا گیا ہے وہ شیخ الہندؒ کے ترجمے کے مطابق ہے اور مجھے اسی سے اتفاق ہے۔ شیخ الہندؒ کے ترجمے کے اصل الفاظ یہ ہیں: ''پھر تم سے یہ بھی توقع ہے کہ اگر تم کو حکومت مل جائے تو خرابی ڈالو ملک میں اور قطع کرو اپنی قرابتیں''۔ یعنی اس مرحلے پر جبکہ تم لوگوں نے تربیت کے ضروری مراحل ابھی طے نہیں کیے ہیں' ابھی تم آزمائشوں کی بھٹیوں میں سے گزر کر کندن نہیں بنے ہو اور تزکیۂ باطن اور تقویٰ کے مطلوبہ معیار تک نہیں پہنچے ہو' ایسی حالت میں اگر تم لوگوں کو جزیرہ نمائے عرب میں اقتدار مل جائے تو اس کا نتیجہ ''فساد فی الارض'' کے سوا اور بھلا کیا نکلے گا!

اس آیت کے مخاطب دراصل مدینہ اور اس کے اطراف و جوانب کے وہ لوگ ہیں جو ہجرت کے فوراً بعد ابھی تازہ تازہ ایمان لائے تھے' انہوں نے ابتدائی دور کے اہلِ ایمان کی طرح اس راستے میں کڑی آزمائشوں کا سامنا نہیں کیا تھا اور اس لحاظ سے ان کے کردار و عمل میں ابھی مطلوبہ پختگی اور استقامت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس کا عملی ثبوت غزوۂ اُحد کے موقع پر اس وقت سامنے آ گیا جب مسلمانوں کی صفوں سے ایک تہائی لوگ اچانک بہانہ بنا کر طے شدہ لائحہ عمل سے لاتعلق ہو کر اپنے گھروں میں جا بیٹھے۔ گویا اُس وقت اہلِ ایمان کے اندر اتنی بڑی تعداد میں ضعیف الاعتقاد مسلمان اور منافقین موجود تھے۔

اس اہم نکتے پر آج ان تمام دینی جماعتوں کو بھی خصوصی توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے جو اپنی دانست میں غلبۂ دین کے لیے اقتدار حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔ اگر یہ جماعتیں اپنے کارکنوں کی مناسب تربیت پر توجہ نہیں دیں گی اور ان کے اندر اخلاص اور للّٰہیت کے پاکیزہ جذبات پروان چڑھانے کے لیے مؤثر اقدامات نہیں کریں گی تو انہیں اقتدار ملنے کے نتیجے میں اصلاح کی بجائے الٹا فساد پیدا ہوگا اور ایسی صورتِ حال دین اور غلبۂ دین کی جدّ و جُہد کے لیے بدنامی کا باعث بنے گی۔ کیونکہ فاسق و فاجر قسم کے لوگوں اور لادینی قوتوں کے پیدا کردہ فساد کو تو دنیا کسی اور زاویے سے دیکھتی ہے' لیکن اگر کسی دینی جماعت کے اقتدار کی چھتری کے نیچے ''فساد فی الارض'' کی کیفیت پیدا ہوگی تو اس سے جماعت کی شہرت کے ساتھ دین بھی بدنام ہوگا۔

آیت ۲۳ ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ ۝۲۳﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے' پس ان کے کانوں کو بہرا اور ان کی نگاہوں کو اندھا کر دیا ہے۔''

آیت ۲۴ ﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰي قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ۝۲۴﴾ ''کیا یہ لوگ قرآن پر تدبر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قفل پڑ چکے ہیں!''

اگر یہ لوگ قرآن کے احکام پر غور و فکر کرتے اور اس کے بین السطور پیغام کو سمجھنے کی کوشش کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ غلبۂ دین کی جدّ و جُہد میں جن جن مراحل سے ان کو سابقہ پڑ رہا ہے ان تمام مراحل کے بارے میں تو انہیں پہلے سے ہی متنبہ کر دیا گیا تھا۔ ذرا دیکھیں سورۃ العنکبوت کی ان آیات میں راہِ حق کی آزمائشوں سے متعلق کیسے دوٹوک انداز میں بتا دیا گیا ہے: ﴿اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝۲﴾ ''کیا لوگوں نے یہ سمجھا تھا کہ وہ چھوڑ دیے جائیں گے صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہ جائے گا!'' ﴿وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ

الْكٰذِبِيْنَ ﴿۳﴾ ''اور ہم نے تو اُن کو بھی آزمایا تھا جو ان سے پہلے تھے' چنانچہ اللہ ظاہر کر کے رہے گا اُن کو جنہوں نے سچ بولا اور ان کو بھی جو جھوٹے ہیں''۔ ﴿وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ﴿۱۱﴾﴾ (العنکبوت) ''اور یقیناً اللہ ظاہر کر کے رہے گا سچے اہلِ ایمان کو' اور ظاہر کر کے رہے گا منافقین کو بھی۔''

آیت ۲۵ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ ۙ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ۭ وَاَمْلٰى لَهُمْ ﴿۲۵﴾﴾ ''یقیناً وہ لوگ جو پھر گئے اپنی پیٹھوں کے بل' اس کے بعد کہ ان پر ہدایت واضح ہو چکی' شیطان نے ان کے لیے (ارتداد کا یہ مرحلہ) آسان کر دیا ہے اور انہیں لمبی لمبی امیدیں دلائی ہیں۔''

''طولِ امل'' کے اس شیطانی چکر میں پڑ کر انسان آخرت کو بالکل ہی فراموش کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے جس شخص نے لمبی لمبی امیدیں قائم کر کے اپنی زندگی میں بڑے بڑے منصوبے بنا رکھے ہوں' اس کے دل میں شہادت کی تمنا کیسے پیدا ہو سکتی ہے' اور ایسا شخص میدانِ جنگ میں جانا بھلا کیونکر پسند کرے گا!

آیت ۲۶ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ﴿۲۶﴾﴾ ''یہ اس لیے ہوا کہ انہوں نے ان لوگوں سے جنہیں اللہ کا نازل کیا ہوا (قرآن) ناپسند ہے' کہا کہ ہم بعض امور میں تمہاری اطاعت جاری رکھیں گے۔ اور اللہ کو ان کی خفیہ باتوں کا خوب علم ہے۔''

اللہ کے نازل کردہ قرآن کو ناپسند کرنے والے مشرکین اور یہود تھے' جنہیں منافقین مسلسل اپنی وفاداریوں کا یقین دلاتے رہتے تھے کہ ہم بظاہر محمد (ﷺ) پر ایمان لا کر مسلمانوں میں شامل تو ہو گئے ہیں مگر آپ لوگوں سے ہمارا رشتہ بدستور قائم رہے گا اور تمام اہم معاملات میں صلاح مشورہ ہم آئندہ بھی آپ لوگوں سے ہی کیا کریں گے۔ منافق تو کہتے ہی اس شخص کو ہیں جو اپنا رشتہ دونوں طرف جوڑنے کی کوشش میں رہے۔ سورۃ النساء میں منافقین کی اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے: ﴿مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۡ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ﴾ (آیت ۱۴۳) ''یہ اس کے مابین مذبذب ہو کر رہ گئے ہیں' نہ تو یہ ان کی جانب ہیں اور نہ ہی اُن کی جانب ہیں''۔ جبکہ سورۃ البقرۃ میں ان کے دوغلے پن کا پردہ ان الفاظ میں چاک کیا گیا ہے: ﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾﴾ ''اور جب یہ اہلِ ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان رکھتے ہیں' اور جب یہ خلوت میں ہوتے ہیں اپنے شیطانوں کے پاس تو کہتے ہیں کہ ہم تو آپ کے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے تو ہم محض مذاق کر رہے ہیں۔''

آیت ۲۷ ﴿فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ﴿۲۷﴾﴾ ''تو کیا حال ہوگا (ان کا اُس وقت) جب فرشتے ان کی جانیں قبض کریں گے ضربیں لگاتے ہوئے ان کے چہروں پر اور ان کی پیٹھوں پر۔''

آیت ۲۸ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ﴾ ''یہ اس لیے کہ انہوں نے پیروی کی اُس چیز کی جو اللہ کو ناراض کرنے والی ہے''

﴿وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿۲۸﴾﴾ ''اور انہوں نے ناپسند کیا اُس کی رضا کو' تو اُس نے ان کے تمام اعمال اکارت کر دیے۔''

قتال کے اس مرحلے پر ان لوگوں کا نفاق کھل کر سامنے آ گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مسجد نبویؐ میں رسول اللہ ﷺ کی اقتدا میں پڑھی گئی نمازوں سمیت ان کے اب تک کے تمام نیک اعمال ضائع کر دیے۔

آیات ۲۹ تا ۳۸

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ﴿۲۹﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَ لَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۰﴾ وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَ نَبْلُوَاَخْبَارَكُمْ ﴿۳۱﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ شَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ﴿۳۲﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ﴿۳۴﴾ فَلَا تَهِنُوْا وَ تَدْعُوْۤا اِلَى السَّلْمِ ۖ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ۚ وَ اللّٰهُ مَعَكُمْ وَ لَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۵﴾ اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ؕ وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَ لَا يَسْـَٔلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ﴿۳۶﴾ اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ ﴿۳۷﴾ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ الْغَنِيُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ ﴿۳۸﴾ ع

آیت ۲۹ ﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ﴿۲۹﴾﴾ ''کیا سمجھ رکھا تھا ان لوگوں نے جن کے دلوں میں روگ ہے کہ اللہ ان کے کھوٹ کو ظاہر نہیں کرے گا؟''

ان کا تو یہی خیال تھا کہ ان کے دوغلے پن کے بارے میں کسی کو خبر نہیں ہوگی اور ان کے سینوں کے کھوٹ بے نقاب نہیں ہوں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے تو ان کے نفاق کو ظاہر کرنا ہی تھا۔ سورۃ العنکبوت میں اللہ تعالیٰ نے دوٹوک الفاظ میں فرما دیا تھا: ﴿وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ﴿۱۱﴾﴾ ''اور یقیناً اللہ ظاہر کر کے رہے گا سچے اہلِ ایمان کو اور ظاہر کر کے رہے گا منافقین کو بھی۔''

آیت ۳۰ ﴿وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ﴾ ''اور اگر ہم چاہیں تو آپ کو یہ لوگ دکھا دیں اس طرح کہ آپ ان کے چہروں سے انہیں پہچان لیں گے۔''

انگریزی کی مشہور کہاوت ہے face is the index of mind یعنی انسان کے دل کی کیفیت کا عکس اس کے چہرے پر عیاں ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک صادق الایمان شخص کے چہرے اور ایک منافق کے چہرے کی شناخت چھپ تو نہیں سکتی۔

﴿وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ﴾ ''اور آپ انہیں لازماً پہچان لیں گے (ان کی) گفتگو کے انداز سے۔''

چہرے کی طرح انسان کی گفتگو کا انداز بھی اس کے دل کی کیفیت کی غمازی کرتا ہے۔ ایک سچے اور کھرے انسان کی گفتگو اور

ایک منافق شخص کی گفتگو کے اطوار و انداز میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۰﴾﴾ ''اور اللہ تمہارے اعمال کو خوب جانتا ہے۔''

آیت ۳۱ ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَنَبْلُوَا۟ اَخْبَارَكُمْ ﴿۳۱﴾﴾ ''اور ہم تمہیں لازماً آزمائیں گے یہاں تک کہ ہم ظاہر کر دیں انہیں جو تم میں سے جہاد کرنے والے اور صبر کرنے والے ہیں اور ہم پوری تحقیق کر لیں تمہارے حالات کی۔''

حَتّٰى نَعْلَمَ کا لفظی ترجمہ تو یوں ہوگا کہ ہم معلوم کر لیں' لیکن اہلِ سنّت کے عقیدے کے مطابق اللہ تعالیٰ کا علم قدیم ہے اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو پہلے سے اُس کے علم میں نہ ہو۔ اس لیے ان الفاظ کی ترجمانی یونہی ہوگی کہ ہم تمہیں آزمائیں گے یہاں تک کہ ہم ظاہر کر دیں اور سب کو دکھا دیں کہ تم میں سے مجاہدین کون ہیں اور صبر کرنے والے کون؟ یہ آیت پڑھتے ہوئے سورۃ البقرۃ کی اس آیت کو بھی ذہن میں تازہ کر لیں: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ﴾ (آیت ۱۵۵) ''اور ہم تمہیں لازماً آزمائیں گے کسی قدر خوف اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور ثمرات کے نقصان سے''۔ سورۃ البقرۃ کی اس آیت کے نزول کے وقت چونکہ قتال کا حکم نہیں آیا تھا اس لیے اس میں آزمائشوں اور سختیوں کا ذکر تو ہے لیکن قتال کا ذکر نہیں ہے۔ اس لیے یوں سمجھئے کہ آیت زیر مطالعہ گویا سورۃ البقرۃ کی مذکورہ آیت کی توسیع (extension) ہے' جس میں قتال کے حوالے سے خصوصی طور پر فرمایا گیا ہے کہ اب ہم تم میں سے واقعتاً جہاد کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کو چھان پھٹک کر الگ کرنا چاہتے ہیں۔

آیت ۳۲ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ﴿۳۲﴾﴾ ''یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور جو روکتے رہے دوسروں کو اللہ کے راستے سے اور وہ رسولؐ کی مخالفت میں سرگرم رہے اس کے بعد کہ ان کے لیے ہدایت واضح ہو چکی تھی' وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ اور وہ ان کے اعمال کو اکارت کر دے گا۔''

گزشتہ آیات میں منافقین کے حبطِ اعمال کا ذکر تھا' اب آیت زیر مطالعہ میں کفارِ مکّہ کے اعمال کی بربادی کا بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ اپنے زعم میں بیت اللہ کے متولی ہونے اور حاجیوں کی خدمت بجالانے جیسی نیکیوں پر پھولے نہیں سماتے' لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان کی سند کے بغیر ان کا کوئی عمل بھی قابل قبول نہیں ہے۔ سورۃ التوبہ کی اس آیت میں ان لوگوں کو اس حوالے سے براہِ راست مخاطب کیا گیا ہے: ﴿اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۱۹) ''کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کو آباد رکھنے کو برابر کر دیا ہے اس شخص (کے اعمال) کے جو ایمان لایا اللہ پر اور یومِ آخرت پر اور اس نے جہاد کیا اللہ کی راہ میں؟''

آیت زیر مطالعہ میں ''اللہ کے راستے سے روکنے اور اللہ اور رسول کی مخالفت'' کے حوالے سے مشرکینِ مکّہ کی اس طویل اور جاں گسل ''جدّ و جہد'' کی طرف بھی اشارہ ہے جس میں پچھلے اٹھارہ برسوں سے وہ اپنا تن من دھن کھپا رہے تھے۔ آخر انہوں نے بھی تو اپنے ''دین'' کے لیے جنگیں لڑی تھیں اور ان جنگوں میں انہوں نے جان و مال کی قربانیاں بھی دی تھیں۔ صرف جنگِ بدر میں انہوں

نے اپنے ۷۰ جنگجو قربان کیے تھے۔ اس جنگ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ان کا جذبہ انفاق بھی دیدنی تھا۔ نو سو اونٹ توانہوں نے صرف لشکر کی غذائی ضروریات (نو یا دس اونٹ روزانہ کے حساب سے) پوری کرنے کے لیے مہیا کیے تھے۔ اس ایک مد کے اخراجات سے ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے ''دین'' کے راستے میں کیسی کیسی قربانیاں دیں اور اپنے زعم میں کتنی بڑی بڑی نیکیاں کمائیں تھیں۔ بہرحال آیت زیر مطالعہ میں ان پر واضح کیا جارہا ہے کہ اپنے زعم میں تم لوگوں نے جو بڑی بڑی نیکیاں کما رکھی ہیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے کفر اور اللہ و رسولؐ سے تمہاری مخالفت کی وجہ سے وہ سب برباد کر دی ہیں۔

آیت ۳۳ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۳﴾﴾ ''اے اہلِ ایمان! تم لوگ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو اور کہیں اپنے اعمال ضائع نہ کر بیٹھنا۔''

اب تک تو تم لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم پر ''آمَنَّا وَصَدَّقْنَا'' کہتے آئے ہو اور اللہ کے دین کے لیے جان و مال کی قربانیاں بھی دیتے آئے ہو۔ لیکن اب قتال کا جو نیا اور مشکل مرحلہ آرہا ہے اس مرحلے میں تم لوگوں سے اب مزید قربانیوں کا مطالبہ ہے۔ چونکہ ایمان کا اولین تقاضا تو یہی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا جس وقت جو حکم ہو اس کی تعمیل کی جائے' اس لیے دیکھنا! اس مرحلے میں تم سے کہیں کوئی کوتاہی سرزد نہ ہونے پائے۔ اگر خدانخواستہ اس مرحلے پر تم لوگوں نے پیٹھ دکھادی تو اس سے تمہارے تمام گزشتہ اعمال بھی ضائع ہو جائیں گے۔

آیت ۳۴ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ﴿۳۴﴾﴾ ''یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور وہ اللہ کے راستے سے رکے رہے (اور دوسروں کو بھی روکتے رہے) پھر وہ مر گئے اس حالت میں کہ کافر ہی رہے تو ایسے لوگوں کو اللہ ہرگز نہیں بخشے گا۔''

آیت ۳۵ ﴿فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ ۠﴾ ''تو (اے مسلمانو!) تم لوگ ڈھیلے نہ پڑو اور صلح و سلامتی کی دعوت مت دو'' یاد رکھو! غلبۂ دین کی جدوجہد کا یہ مرحلہ تم سے سرفروشی کا تقاضا کرتا ہے۔ اس مرحلے میں اب تمہیں دشمنوں سے صلح و سلامتی کے لیے مذاکرات کرنے اور جنگ سے بچنے کی حکمتِ عملی اپنانے کی باتیں زیب نہیں دیتیں۔ تمہاری تحریک اب جس مرحلے میں داخل ہو چکی ہے اس مرحلے پر اب صلح و سلامتی کے پرچار کا موقع نہیں' بلکہ جانیں قربان کرنے کا وقت ہے۔

﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ۠ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۵﴾﴾ ''اور تم لوگ ہی غالب ہو گے' اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہارے اعمال کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔''

آیت ۳۶ ﴿اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ﴾ ''یہ دنیا کی زندگی تو محض کھیل ہے اور کچھ جی کا بہلانا ہے۔''

آخرت کی زندگی کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کی حیثیت لہو و لعب سے زیادہ کچھ نہیں۔ اسی حقیقت کو سورۂ آلِ عمران میں اس طرح واضح کیا گیا ہے: ﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾﴾ ''اور یہ دنیا کی زندگی تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ صرف دھوکے کا سامان ہے۔''

﴿وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ ﴾ ''اور اگر تم لوگ ایمان لاؤ اور تقویٰ اختیار کیے رہو تو وہ تمہیں تمہارے اجر عطا کرے گا۔''

﴿وَلَا يَسْئَلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ﴿۳۶﴾﴾ ''اور تم سے تمہارے اموال نہیں مانگے گا۔''

قرآن میں ''انفاق فی سبیل اللہ'' کے بارے میں بہت تلقین اور تاکید آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان سے بار بار ان کے اموال کا براہِ راست مطالبہ بھی کیا ہے: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ...﴾ (البقرۃ:۲۴۵) ''کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے.....!'' اور انفاق سے گریز کی روش کی سخت الفاظ میں مذمت بھی کی ہے: ﴿وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ﴾ (البقرۃ:۱۹۵) ''خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور مت ڈالو اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں۔''

بہرحال قرآن میں اس موضوع پر جتنا بھی اصرار و تکرار ہے وہ ترغیب و تشویق کے انداز میں ہے' اس میں جبر اور زبردستی کا پہلو بالکل نہیں ہے۔ حضور ﷺ کی عظیم الشان انقلابی جدوجہد کا یوں تو ہر انداز ہی مثالی اور قابلِ تعریف ہے' لیکن زیر بحث موضوع کے حوالے سے آپؐ کی اس تحریک کا جو پہلو خصوصی طور پر لائقِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ اس میں کہیں ''ایمرجنسی'' کی صورتِ حال نظر نہیں آتی ہے۔ کسی بھی مرحلے میں کسی کا مال ''بحق سرکار'' ضبط نہیں کیا گیا' اور نہ ہی کسی معرکے کے لیے لوگوں کی پکڑ دھکڑ ہوئی۔ ''نفیرِ عام'' بھی پوری تحریک کے دوران صرف ایک موقع (غزوۂ تبوک) پر ہوئی' ورنہ لوگوں کو متحرک کرنے کے لیے ہمیشہ ترغیب و تشویق کا ہی انداز اپنایا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ۭ﴾ (الانفال:۶۵) ''اے نبی (ﷺ)! ترغیب دلایئے اہلِ ایمان کو قتال کی''۔ بہرحال ترغیب کے لیے اہلِ ایمان کو اجر و ثواب کا وعدہ دیا گیا اور انہیں ''شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن'' کا سبق پڑھایا گیا' لیکن کبھی زور زبردستی نہیں کی گئی۔ اس سیاق و سباق میں آیت زیر مطالعہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے زبردستی تمہارے اموال نہیں مانگتا یا تم سے سارے کا سارا مال دے ڈالنے کا مطالبہ نہیں کرتا۔

آیت ۳۷ ﴿اِنْ يَّسْئَلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ ﴿۳۷﴾﴾ ''اگر وہ تم سے ان (اموال) کے بارے میں مطالبہ کرے اور اس معاملے میں تم پر تنگی کرے تو تم بخل سے کام لو گے اور وہ ظاہر کر دے گا تمہارے (دلوں کے) کھوٹ کو۔''

منافقین کے ساتھ عملی طور پر ایسا ہوتا بھی رہا کہ جب بھی کبھی مشکل حالات سے سابقہ پڑا' ان کے دلوں کا کھوٹ فوراً ان کی زبانوں پر آ گیا۔ جیسے غزوۂ احزاب کے موقع پر منافقین کے اندر کی خباثت ان الفاظ کے ساتھ ان کی زبانوں پر آ گئی تھی: ﴿مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲﴾﴾ (الاحزاب:۱۲) کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے تو ہمیں دھوکہ دیا ہے اور مستقبل کے بارے میں اب تک ہمیں سبز باغ ہی دکھائے جاتے رہے ہیں۔

آیت ۳۸ ﴿هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ﴾ ''تم وہ لوگ ہو کہ تمہیں بلایا جا رہا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔''

﴿فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ﴾ ''پس تم میں سے کوئی وہ بھی ہے جو بخل سے کام لیتا ہے' اور جو کوئی بھی بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلسل ترغیب کے باوجود جو لوگ انفاق فی سبیل اللہ سے جی چراتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس معاملے میں بخل کر کے وہ کسی اور کا نہیں بلکہ اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں اور نقصان بھی ایسا جس کی تلافی ممکن نہیں۔ دنیا کے چھوٹے چھوٹے مفادات کی خاطر آخرت کے دائمی اور ابدی اجر و ثواب سے خود کو محروم کر لینا اور ایک کے بدلے سات سو ملنے کے وعدۂ

خداوندی کو لائقِ التفات نہ سمجھنا کوئی معمولی نقصان تو نہیں ہے۔

﴿وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ﴾ ''اور اللہ غنی ہے اور محتاج تو تم ہی ہو۔''

اللہ تعالیٰ تو غنی اور بے نیاز ہے' اُسے کسی چیز کی ضرورت نہیں' وہ تو صرف تمہارے امتحان کے لیے تم سے کہتا ہے کہ مجھے قرض دو۔ اور اگر وہ تمہارے صدقات کو شرفِ قبولیت بخشتا ہے ﴿وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ﴾ (التوبۃ: ۱۰۴) تو ایسا وہ محض تمہارے اعزاز و اکرام کے لیے کرتا ہے۔

﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ﴿۳۸﴾﴾ ''اور اگر تم پیٹھ پھیر لو گے تو وہ تمہیں ہٹا کر کسی اور قوم کو لے آئے گا' پھر وہ تمہاری طرح نہیں ہوں گے۔''

یہ دوٹوک اور فیصلہ کن انداز ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ اس حکم کا اطلاق ان لوگوں پر بھی ہوا ہوگا جنہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کی معیت میں رہتے ہوئے منافقت کی بنا پر پیٹھ موڑ لی تھی۔ ظاہر ہے وہ لوگ جب اس آیت کے مصداق بنے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں راندۂ درگاہ کر دیا اور ان کی جگہ نبی اکرم ﷺ کے لیے سچے ''جاں نثار'' اہلِ ایمان ساتھی فراہم کر دیے۔ لیکن اس کے بعد اس آیت کے مخاطب و مصداق دراصل ''اہلِ عرب'' ہیں جو اُمتِ مُسلمہ کے مرکزہ (nucleus) کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس نکتے کو یوں سمجھئے کہ حضور ﷺ کی بعثتِ اصلی یا بعثتِ خصوصی ''اُمّیین'' یعنی بنو اسماعیل اور ان کے تابع مشرکینِ عرب کے لیے تھی۔ بنیادی طور پر تو وہی لوگ تھے جن کے سپرد حضور ﷺ کا مشن اس واضح حکم کے ساتھ ہوا تھا: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ﴾ (البقرۃ: ۱۴۳) ''(اے مسلمانو!) اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک اُمتِ وَسط بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں''۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ میں براہِ راست خطاب دراصل حضور ﷺ کے ''اہلِ عرب'' اُمّتیوں سے ہے کہ اگر تم نے اس مشن سے مُنہ موڑ لیا تو اللہ تعالیٰ تمہیں ہٹا کر کسی اور قوم کو اس منصب پر فائز کر دے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس آیت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی مشیت کا ظہور بتمام و بکمال تیرہویں صدی عیسوی میں اس وقت ہوا جب ہلاکو خان کے ذریعے سلطنتِ عباسیہ کو تاخت و تاراج کر دیا گیا۔ اس ہنگامے میں تاتاریوں کے ہاتھوں بلا مبالغہ کروڑوں مسلمان قتل ہوئے۔ ۱۲۵۸ء میں سقوطِ بغداد کا سانحہ اس انداز میں رونما پذیر ہوا کہ شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ تاتاری سپاہیوں نے بنو عباس کے آخری خلیفہ مستعصم باللہ کو گھسیٹ کر محل سے باہر نکالا اور کسی جانور کی کھال میں لپیٹ کر اسے گھوڑوں کے سموں تلے روند ڈالا۔ یوں انتہائی عبرتناک طریقے سے عربوں کو اُمتِ مُسلمہ کی قیادت سے معزول کر دیا گیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد اللہ تعالیٰ کی مشیت کے عین مطابق معجزانہ طور پر ان ہی تاتاریوں کی اولاد میں سے ترکانِ تیموری' ترکانِ صفوی' ترکانِ سلجوقی اور ترکانِ عثمانی جیسی قومیں مسلمان ہو کر اسلام کی علمبردار بن گئیں۔ ؎

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے (اقبالؔ)

بالآخر اُمتِ مُسلمہ کی قیادت کا سہرا سلطنتِ عثمانیہ (The Great Ottoman Empire) کے نام سے ترکانِ عثمانی کے سر باندھ دیا گیا اور اس طرح خلافتِ عثمانیہ کا جھنڈا عالمِ اسلام پر چار سو سال (۱۹۲۴ء) تک لہراتا رہا۔

سُوْرَۃُ الْفَتْحِ

تمہیدی کلمات

سورۃ الفتح صلح حدیبیہ کے فوراً بعد نازل ہوئی۔ غزوۂ احزاب (۵ ہجری) کے بعد رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مخاطب کر کے فرمادیا تھا: ((لَنْ تَغْزُوْكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ)) کہ اب قریش میں تم پر چڑھائی کرنے کے لیے دم نہیں رہا' آئندہ تم لوگ ان پر چڑھائی کرو گے۔ ۶ ہجری میں حضور ﷺ نے عمرہ کرنے کا ارادہ فرمایا تو چودہ سو (بعض روایات کے مطابق ۱۸۰۰) صحابہؓ بھی آپؐ کے ساتھ عمرہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ چنانچہ آپؐ صحابہؓ کے ساتھ حالتِ احرام میں سفر کرتے ہوئے حدیبیہ کے مقام پر پہنچ گئے۔ آپؐ کے اس اقدام نے قریشِ مکہ کو ایک بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا۔ قریشِ مکہ مسلمانوں کو عمرہ کرنے سے روک بھی نہیں سکتے تھے' کیونکہ بیت اللہ کے طواف سے کسی کو روکنا عرب روایت ہی کے خلاف تھا۔ دوسری طرف انہیں یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ مسلمان اتنی بڑی تعداد میں دندناتے ہوئے مکہ میں داخل ہوں' پورے شہر میں آزادی سے گھومیں پھریں اور تمام قبائل میں یہ تاثر پھیلائیں کہ پچھلے اٹھارہ سال سے جاری کش مکش میں وہ جیت گئے ہیں اور قریش کو شکست ہو گئی ہے۔ چنانچہ چار و ناچار قریش نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی قیمت پر بھی مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے اور اپنے اس فیصلے کے بارے میں انہوں نے مسلمانوں کو باقاعدہ آگاہ کر دیا۔

ان حالات میں حضور ﷺ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو بات چیت کے لیے مکہ بھیجا تو قریش نے ان کو مکہ ہی میں روک لیا۔ اس دوران میں انؓ کے بارے میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ قریش نے انہیں شہید کر دیا ہے۔ اس پر حضور ﷺ نے صحابہؓ سے ایک خصوصی بیعت کا اہتمام فرمایا۔ اس بیعت کے ذریعے موقع پر موجود تمام صحابہؓ نے عہد کیا کہ وہ یہاں سے واپس نہیں جائیں گے اور آپ ﷺ کے حکم پر اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔ تاریخ میں اس بیعت کو بیت رضوان' بیعت عَلٰی اَنْ لَا نَفِرَّ یا بیعت علی الموت کا نام دیا گیا ہے۔ اس بیعت کے وقت آپ ﷺ ایک درخت کے نیچے تشریف فرما تھے' اس لیے اسے ''بیعت الشجرہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ جب اس بیعت کی خبر مکہ پہنچی تو قریش کو اس صورتِ حال کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا پڑا۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ مسلمانوں میں کوئی ایک فرد بھی پیچھے ہٹنے والا نہیں ہے اور یہ بھی کہ جب یہ لوگ کوئی عہد کرتے ہیں تو اسے ہر صورت نبھاتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے مذاکرات کے لیے سفارتی کوششیں تیز کر دیں۔ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی واپس بھیج دیا اور قریش کی طرف سے سہیل بن عمرو کی قیادت میں ایک وفد بھی صلح کی بات چیت کرنے کے لیے حضور ﷺ کے کیمپ میں پہنچ گیا۔ یہ مذاکرات بالآخر صلح پر منتج ہوئے جسے تاریخ میں ''صلح حدیبیہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اس صلح نامہ کی اوّلین شرط یہ تھی کہ دس سال تک فریقین کے درمیان جنگ بند رہے گی۔ دوسرے یہ کہ قبائلِ عرب میں سے جو قبیلہ بھی فریقین میں سے کسی ایک کا حلیف بن کر اس معاہدے میں شامل ہونا چاہے گا اُسے اس کا اختیار ہو گا۔ تیسرے یہ کہ محمد ﷺ

اور آپؐ کے ساتھی اس وقت عمرہ ادا کیے بغیر واپس چلے جائیں گے اور آئندہ سال وہ عمرے کے لیے آکر تین دن تک مکہ میں ٹھہر سکتے ہیں' بشرطیکہ پرتلوں میں ایک ایک تلوار کے سوا کوئی سامانِ حرب ساتھ نہ لائیں۔ ان تین دنوں کے لیے اہلِ مکہ شہر خالی کر دیں گے۔ مسلمان واپس جاتے ہوئے یہاں سے کسی شخص کو اپنے ساتھ لے جانے کے مجاز نہ ہوں گے۔

بظاہر اس صلح کی شرائط بہت غیر متوازن تھیں۔ ان شرائط سے یوں لگتا تھا جیسے مسلمانوں کو جھک کر صلح کرنی پڑی ہے' بلکہ بعض شرائط سے تو مسلمانوں کی سبکی کا تاثر بھی ملتا تھا۔ مثلاً ایک شرط یہ تھی کہ اگر کوئی مسلمان مدینہ سے مکہ آ جائے تو قریش اسے واپس نہیں کریں گے' لیکن اگر کوئی مسلمان' مکہ سے مدینہ چلا جائے تو مسلمانوں کو اسے واپس کرنا ہوگا۔ اتفاق سے اسی شرط کے حوالے سے عین موقع پر مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش بھی آن پڑی۔ ہوا یوں کہ جونہی صلح نامہ کی تحریر مکمل ہوئی تو ایک مسلمان نوجوان ابوجندل رضی اللہ عنہ قریش کی قید سے فرار ہو کر مسلمانوں کے کیمپ میں آ پہنچے۔ حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ سہیل بن عمرو کے بیٹے تھے جو مذاکرات کے لیے قریش کا سفیر تھا اور اس وقت تک مسلمانوں کے کیمپ ہی میں موجود تھا۔ اس نے معاہدے کے مطابق اپنے بیٹے کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ متعلقہ شرط کے مطابق مسلمان حضرت ابوجندلؓ کو واپس کرنے کے پابند تھے۔ ادھر ابوجندلؓ دہائی دے رہے تھے کہ انہیں دوبارہ ان قصائیوں کے حوالے نہ کیا جائے۔ ادھر چونکہ معاہدے کی شرائط طے ہو چکی تھیں اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجندلؓ کو واپس بھیجنے کا فیصلہ فرمایا۔ آپؐ نے فرمایا: ''ابوجندل! تم صبر کرو' ہم معاہدہ کر چکے ہیں اور ہم پر معاہدے کی پابندی لازم ہے''۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر حضرت ابوجندلؓ کو سہیل بن عمرو کے سپرد کر دیا گیا۔ اس وقت مسلمانوں کی صفوں میں ایسی رقت آمیز صورتِ حال پیدا ہو گئی جسے برداشت کرنا ان کے لیے آسان نہیں تھا۔ مسلمانوں کا پورا لشکر مضطرب تھا۔ کوئی شخص بھی اُن مصلحتوں کو نہیں سمجھ رہا تھا جنہیں نگاہ میں رکھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ شرائط قبول فرما رہے تھے۔ اسی جذباتی کیفیت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ مکالمہ بھی کر بیٹھے جس کا انہیں ساری عمر شدید رنج رہا۔ حضرت عمرؓ نے حضورؐ سے پوچھا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ حضورؐ نے جواب دیا: ہاں ہم حق پر ہیں۔ حضرت عمرؓ نے پھر پوچھا: کیا آپؐ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟ آپؐ نے مسکرا کر جواب دیا: ہاں میں اللہ کا رسولؐ ہوں۔ حضرت عمرؓ نے پھر پوچھا کہ ہم اس قدر دب کر کیوں صلح کر رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ میں وہی کر رہا ہوں جس کا مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

اسی طرح کا واقعہ اس دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی پیش آیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ صلح نامہ لکھ رہے تھے' جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم املا کروا رہے تھے۔ جب حضورؐ نے یہ فقرہ لکھوایا کہ یہ ''صلح نامہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور قریشِ مکہ کے مابین طے پایا ہے'' تو اس پر سہیل بن عمرو نے اعتراض کر دیا کہ ہم چونکہ آپ کو اللہ کا رسول نہیں مانتے اس لیے آپ ''رسول اللہ'' کے الفاظ عبارت سے حذف کرا دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر فرمایا کہ تم مانو یا نہ مانو' میں اللہ کا رسول ہوں اور ساتھ ہی آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ ''رسول اللہ'' کے الفاظ حذف کر کے عبارت یوں لکھی جائے کہ یہ صلح نامہ محمد بن عبداللہ اور قریش کے مابین طے پایا ہے۔ اس پر حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ آپؐ کے نام کے ساتھ لکھے ہوئے ان الفاظ کو میں اپنے ہاتھ سے نہیں مٹا سکتا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ''رسول اللہ'' کے الفاظ کو خود اپنے ہاتھوں سے حذف کر کے معاہدے کی عبارت مکمل کرائی۔ اگرچہ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا مذکورہ طرزِ عمل غیرتِ حق اور حمیتِ دینی کا مظہر تھا' لیکن ایسے مواقع کے لیے عام قاعدہ یہی ہے کہ ''اَلْاَمْرُ فَوْقَ الْاَدَب'' یعنی حکم کو ادب پر ترجیح دی جائے۔

صلح نامہ پر فریقین کے دستخط ہو جانے کے بعد حضور ﷺ نے اسی جگہ پر احرام کھولنے اور قربانی کے جانور ذبح کرنے کا حکم دیا۔ حضور ﷺ کے اتباع میں اگرچہ سب نے احرام بھی کھول دیے اور قربانی کے جانور بھی ذبح کر دیے لیکن عملی طور پر اُس وقت ہر مسلمان دل گرفتہ اور شدتِ غم سے نڈھال تھا۔ یہ وہ صورتِ حال تھی جس میں یہ سورت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی دلجوئی کے لیے خصوصی طور پر اس کے آغاز میں ایک بہت بڑی خوشخبری کا اعلان فرمایا: ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ﴾ یعنی اے مسلمانو! تم لوگ تو سمجھ رہے ہو کہ تمہیں بہت دب کر صلح کرنی پڑی ہے لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس صلح نامہ کے پردے میں ہم نے اپنے رسول ﷺ کو ایک عظیم الشان فتح عطا فرمائی ہے۔ بعد میں آنے والے حالات سے ثابت بھی ہو گیا کہ صلح حدیبیہ مسلمانوں کے لیے واقعی فتح مبین تھی۔ بہرحال اس میں سب سے بڑی کامیابی تو یہی تھی کہ قریشِ مکہ نے مسلمانوں سے معاہدہ کر کے انہیں اپنے برابر کا ایک فریق تسلیم کر لیا تھا۔

آیات ۱ تا ۱۰

سُوْرَةُ الْفَتْحِ مَدَنِيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۲۹ رُكُوْعَاتُهَا: ۴

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ﴿۱﴾ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ يَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۙ﴿۲﴾ وَّ يَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ﴿۳﴾ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ؕ وَ لِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ﴿۴﴾ لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ يُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ۙ﴿۵﴾ وَّ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَ الْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ لَعَنَهُمْ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۶﴾ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۷﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۙ﴿۸﴾ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ ؕ وَ تُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ﴿۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۰﴾ ع

آیت ۱ ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ﴾ ”یقیناً ہم نے آپؐ کو ایک بڑی روشن فتح عطا فرمائی ہے۔“

آیت ۲ ﴿لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ﴾ ”تاکہ اللہ بخش دے آپ کی کوئی کوتاہیاں جو پیچھے ہوئیں اور جو بعد میں ہوئیں“

رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے لفظ ''ذنب'' کی وضاحت کے لیے سورۂ محمد (ﷺ) کی آیت ۱۹ کی تشریح ملاحظہ ہو۔ یہاں بھی ذَنۡبِكَ (آپ کی کوتاہیوں) سے مراد وہ خامیاں اور کوتاہیاں ہیں جو غلبۂ اسلام کی اس جدّوجُہد میں رہ گئی تھیں جو رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں مسلمان کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان ساری کمزوریوں اور کوتاہیوں سے درگزر کر کے محض اپنے فضل سے ان کی تلافی کر دی ہے اور آپؐ کے لیے فتح و نصرت کا دروازہ کھول دیا ہے۔

﴿وَيُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكَ وَيَهۡدِيَكَ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا ۙ﴾ ''اور تا کہ اللہ اپنی نعمت کا اتمام فرما دے آپؐ پر اور آپؐ کی راہنمائی کرے سیدھے راستے کی طرف۔''

بظاہر اس فقرے سے بھی لفظ ''ذنب'' کی طرح اشکال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تو پہلے ہی سیدھی راہ پر تھے بلکہ ﴿وَاِنَّكَ لَتَهۡدِىۡۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۙ﴾ (الشوریٰ) کا مصداق تھے اور آپؐ کے تمام اہلِ ایمان ساتھی بھی پچھلے اٹھارہ برسوں سے سربکف ہو کر اسی راہِ ہدایت پر گامزن تھے تو پھر یہاں ﴿وَيَهۡدِيَكَ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا ۙ﴾ کے فرمان کا کیا مفہوم ہے؟ اس بارے میں مفسرین کی بہت سی آراء ہیں' جن کی تفصیل بیان کرنا یہاں ممکن نہیں۔ بہرحال میرے نزدیک اس کی توجیہہ وہی ہے جو میں قبل ازیں سورۂ محمد کی آیت ۱۹ کے ضمن میں لفظ ''ذنب'' کی وضاحت کے حوالے سے بیان کر چکا ہوں کہ اے نبی ﷺ! آپ اپنے اہلِ ایمان ساتھیوں کے ساتھ اقامتِ دین کے لیے جو مسلسل جدّوجُہد کر رہے ہیں' اس حوالے سے اگر اہلِ ایمان میں سے کسی سے اب تک کسی قسم کی کوئی کوتاہی ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ اس فتح مبین کی برکت سے ایسی تمام کوتاہیوں کی تلافی فرما دے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کرنے کے لیے آپ لوگوں کی یہ جدّوجُہد تیر کی طرح سیدھی اپنے ہدف کی طرف تیزی سے بڑھے گی اور ''اظہارِ دینِ حق'' کا عملی مظاہرہ اب بہت جلد دنیا کی نظروں کے سامنے آ جائے گا۔ گویا اس مقام پر آپ ﷺ کو سیدھا راستہ دکھانے کا مطلب فتح و کامرانی کا راستہ دکھانا ہے۔

جہاں تک آیت زیر مطالعہ میں ''اتمامِ نعمت'' کے وعدے کا تعلق ہے تو اس سے مراد دراصل دین کا اِتمام ہی ہے جس کے بارے میں یہ خوشخبری ہم سورۃ المائدۃ کی آیت ۳ میں پڑھ آئے ہیں: ﴿اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِيۡنَكُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِىۡ وَرَضِيۡتُ لَكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِيۡنًا ؕ﴾ ''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کی تکمیل فرما دی ہے' اور تم پر اپنی نعمت کا اتمام فرما دیا ہے' اور تمہارے لیے میں نے اسلام کو بحیثیت دین کے پسند کر لیا ہے''۔ البتہ اس اہم مضمون کے درست ادراک کے لیے ضروری ہے کہ دین کے اتمام کی دونوں صورتیں پیش نظر رہیں۔ اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ قرآن حکیم میں تمام احکامِ دین بیان کر دیے گئے اور شریعت مکمل ہو گئی۔ لیکن دین اسلام چونکہ ایک ضابطہ حیات ہے اس لیے عملی طور پر اس کی تکمیل تب ہی ممکن تھی جب اس کے تحت باقاعدہ ایک حکومت قائم ہوتی اور معاشرے کے اندر اس کے تمام قوانین کی تنفیذ کا مظاہرہ اور نمونہ عملی طور پر سامنے آتا۔ اسی کیفیت کا نام دراصل ''اظہارِ دین'' ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں تین مقامات (التوبۃ:۳۳' الفتح:۲۸' اور الصف:۹) پر ﴿لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ ؕ﴾ کے الفاظ میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے ''مقصد'' کے طور پر بیان ہوا ہے۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ میں یہاں خصوصی طور پر اسی ''نعمت'' کے اتمام کی طرف اشارہ ہے کہ اے نبی ﷺ! آپ کے ساتھیوں کی اگلی پچھلی کوتاہیوں کی تلافی کے لیے ہم نے آپؐ کو یہ ''فتح مبین'' عطا کر دی ہے۔ اب آپؐ کی جدّوجُہد تیزی کے ساتھ اپنے ہدف کی طرف بڑھے گی اور

جزیرہ نمائے عرب میں بہت جلد ''اظہارِ دینِ حق'' کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے آجائے گا۔

آیت ۳ ﴿وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۝۳﴾ ''اور اللہ آپ کی مدد کرے گا' بہت زبردست مدد۔''

اب آپؐ کی جدّوجُہد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی مدد شامل ہوگی جسے کوئی شکست نہیں دے سکے گا۔

آیت ۴ ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ۭ﴾ ''وہی ہے جس نے اہلِ ایمان کے دلوں میں سکینت نازل کردی تاکہ وہ اضافہ کرلیں اپنے ایمان میں مزید ایمان کا۔''

یہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ سکینت اور طمانیت ہی تھی جس کے باعث صحابہ کرامؓ اپنی جانیں قربان کردینے کے فیصلے پر پورے سکونِ قلب کے ساتھ جازم رہے۔ پھر اسی سکینت کے سہارے صحابہ کرامؓ اس کڑے امتحان سے بھی سرخرو ہوکر نکلے جو اس خاص موقع پر انہیں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے حوالے سے درپیش تھا۔ اس موقع پر اصل صورتِ حال یہ تھی کہ صحابہؓ میں سے کوئی ایک فرد بھی صلح کے حق میں نہیں تھا' لیکن اس کے باوجود اس دوران ان کے نظم وضبط کا یہ عالم رہا کہ بغیر کسی ایک استثناء کے پوری جماعت نے حضور ﷺ کے حکم پر سرِ تسلیم خم کردیا۔

بادیٔ النظر میں یہ کہنا ذرا عجیب لگتا ہے کہ ''صحابہؓ میں سے کوئی بھی صلح کے حق میں نہیں تھا' لیکن تاریخی حقائق بہرحال ایسی ہی صورتِ حال کی گواہی دیتے ہیں۔ چنانچہ سیرت کی کتابوں میں ایسی روایات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صلح نامہ پر دستخط ہوجانے کے بعد جب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانو! اب اٹھو' احرام کھول دو اور یہیں پر قربانیاں کردو' تو آپؐ کے کہنے پر کوئی ایک مسلمان بھی نہ اٹھا۔ آپؐ نے اپنا یہ حکم پھر دہرایا تو پھر بھی کوئی نہ اٹھا۔ حتیٰ کہ آپؐ نے تیسری مرتبہ فرمایا کہ لوگو اٹھو! احرام کھول دو اور قربانی کے جانور ذبح کردو' تو آپؐ کے تیسری مرتبہ فرمانے پر بھی کوئی تعمیل کے لیے نہ اٹھا۔ بلاشبہ صحابہؓ کا یہ ''توقف'' اضطراری کیفیت کے باعث تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ان کے لیے امتحان کی کوئی صورت ہے' اس کے بعد شاید کوئی نیا حکم آجائے گا اور صورتِ حال بدل جائے گی۔ دراصل یہ صورتِ حال صحابہؓ کی سمجھ سے باہر تھی کہ جو احرام انہوں نے حضور ﷺ کی اقتدا میں عمرے کے لیے باندھے ہیں وہ عمرہ ادا کیے بغیر میدانِ حدیبیہ میں ہی کھول دیے جائیں۔ بہرحال حضور ﷺ کے تیسری مرتبہ حکم دینے پر بھی جب کوئی احرام کھولنے کے لیے نہ اٹھا تو آپؐ دل گرفتہ ہوکر اپنے خیمے میں تشریف لے گئے۔ اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا آپؐ کے ساتھ تھیں۔ جب آپؐ نے تمام صورتِ حال انہیں بتائی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ آپؐ اپنی زبان مبارک سے کچھ نہ فرمائیں' بس آپؐ اپنا احرام کھول دیں اور قربانی کا جانور ذبح کردیں۔ چنانچہ آپ ﷺ کے احرام کھولنے اور جانور ذبح کرنے پر سب مسلمانوں نے احرام کھول دیے اور اپنے اپنے جانور ذبح کردیے۔ صحابہؓ کے مذکورہ ردِعمل سے یہ حقیقت بہرحال عیاں ہوتی ہے کہ اس موقع پر وہ سب کے سب ''صلح'' کو خوش آمدید کہنے کے بجائے اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے زیادہ پُرعزم تھے۔

﴿وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۴﴾ ''اور آسمانوں اور زمین کے تمام لشکر تو اللہ ہی کے ہیں۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا' کمال حکمت والا ہے۔''

آیت ۵ ﴿لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ۭ﴾ ''تاکہ وہ داخل کرے اہلِ ایمان مَردوں اور عورتوں کو اُن باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی'

جن میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے اور دور کر دے ان سے ان کی بُرائیوں کو۔''

﴿وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝۵﴾ ''اور یہی ہے اللہ کے نزدیک بڑی کامیابی۔''

آیت ۶ ﴿وَّيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ۭ﴾ ''اور (تاکہ) اللہ سزا دے منافق مَردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مَردوں اور مشرک عورتوں کو جو اللہ کے بارے میں بہت بُرے گمان رکھنے والے ہیں۔''

یہ الفاظ سورۃ الاحزاب کی آخری آیت کے الفاظ سے گہری مشابہت رکھتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ دونوں سورتیں ایک ہی زمانہ میں نازل ہوئی ہیں۔ سورۃ الاحزاب ۵ ہجری میں نازل ہوئی تھی جبکہ سورۃ الفتح ۶ ہجری میں۔

﴿عَلَيْهِمْ دَاۗىِٕرَةُ السَّوْءِ ۚ﴾ ''انہی پر مسلّط ہے بُرائی کا دائرہ۔''

یعنی بُرائی کے پھیر میں وہ خود ہی آ گئے ہیں۔

﴿وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝۶﴾ ''اور اللہ ان پر غضبناک ہوا ہے اور اُس نے ان پر لعنت فرمائی ہے اور ان کے لیے جہنّم تیار کر رکھی ہے۔ اور وہ بہت بُری جگہ ہے لوٹنے کی۔''

آیت ۷ ﴿وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝۷﴾ ''اور آسمانوں اور زمین کے لشکر کُل کے کُل اللہ ہی کے اختیار میں ہیں۔ اور اللہ زبردست ہے' کمال حکمت والا۔''

آیت ۴ کے آخر پر بھی ہو بہو یہی الفاظ آئے ہیں۔ صرف یہ فرق ہے کہ آیت ۴ کا اختتام ''عَلِيْمًا حَكِيْمًا'' پر ہوتا ہے' جبکہ یہ آیت ''عَزِيْزًا حَكِيْمًا'' پر ختم ہو رہی ہے۔

آیت ۸ ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝۸﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو بھیجا ہے گواہی دینے والا' بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر۔''

یعنی محمد رسول اللہ ﷺ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں استغاثہ کے گواہ (prosecution witness) کے طور پر پیش ہو کر گواہی دیں گے کہ اے اللہ! تیرا دین جو مجھ تک پہنچا تھا میں نے وہ اپنی اُمّت کے لوگوں تک پہنچا دیا تھا' اب یہ لوگ اس کے بارے میں خود جوابدہ ہیں۔ اس عدالت اور اس میں ہونے والی گواہیوں کا نقشہ سورۃ النساء میں اس طرح کھینچا گیا ہے: ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰي هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا ۝۴۱﴾ ''تو اُس دن کیا صورتِ حال ہوگی جب ہم ہر اُمّت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور (اے نبی ﷺ!) آپ کو لائیں گے ان پر گواہ بنا کر!''

آیت ۹ ﴿لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ ۭ﴾ ''تاکہ (اے مسلمانو!) تم ایمان رکھو اللہ اور اُس کے رسول پر اور رسول کی مدد کرو اور اُس کی تعظیم کرو۔''

﴿وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝۹﴾ ''اور تاکہ تم اللہ کی تسبیح کرو صبح و شام۔''

اس آیت کے پہلے حصے میں ایمان کے حوالے سے اللہ اور اُس کے رسول کا ذکر ہے' اس کے بعد دوسرے فقرے ﴿وَتُعَزِّرُوْهُ

وَتُوَقِّرُوْهُ ؕ﴾ میں ہٗ کی دونوں ضمیریں ''رسول ﷺ'' کے لیے ہیں' اور اس کے بعد وَتُسَبِّحُوْهُ میں ہٗ کی ضمیر اللہ کے لیے ہے۔

آیت ۱۰ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) یقیناً وہ لوگ جو آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ حقیقت میں اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔''

﴿يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ﴾ ''ان کے ہاتھوں کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہے۔''

اس بیعت کے اندر گویا تین ہاتھ تھے۔ رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ' بیعت کرنے والے شخص کا ہاتھ اور اللہ کا ہاتھ۔

﴿فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ﴾ ''تو اب جو کوئی اس کو توڑے گا تو اس کے توڑنے کا وبال اپنے اوپر ہی لے گا۔''

﴿وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۰﴾﴾ ''اور جو کوئی پورا کرے گا اس معاہدے کو جو وہ اللہ سے کر رہا ہے تو وہ اسے اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔''

اس آیت کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے سورۃ التوبہ کی اس آیت کو ایک مرتبہ پھر سے دہرالیں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۟ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ﴾ (آیت ۱۱۱) ''یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں اہلِ ایمان سے ان کی جانیں بھی اور ان کے مال بھی اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے۔ وہ جنگ کرتے ہیں اللہ کی راہ میں' پھر قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں' یہ وعدہ اللہ کے ذمے ہے سچا تورات' انجیل اور قرآن میں۔ اور اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو وفا کرنے والا کون ہے؟ پس خوشیاں مناؤ اُس بیع پر جس کا سودا تم نے اُس کے ساتھ کیا ہے''۔ اب ان دونوں آیات کے باہمی ربط و تعلق کو اس طرح سمجھیں کہ سورۃ التوبہ کی اس آیت میں ایک ''بیع'' (سودے) کی ترغیب دی گئی ہے جبکہ زیر مطالعہ آیت میں اس بیع کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ سورۃ التوبہ کی مذکورہ بالا آیت میں بھی ب ی ع مادہ سے باب مفاعلہ ﴿بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ﴾ آیا ہے اور یہاں آیت زیر مطالعہ میں بھی ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ﴾ لفظ بیعت دراصل بیع سے ہی مشتق ہے۔ عربوں کے ہاں رواج تھا کہ دو فریق جب خرید و فروخت (بیع) کا کوئی معاملہ کرتے تو سودا پکا ہو جانے پر آپس میں مصافحہ کرتے تھے۔ یہ مصافحہ دراصل ''بیع'' طے ہو جانے کا اعلان سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے ایسے مصافحے کو ''بیعت'' کا نام دے دیا گیا۔

سورۃ التوبہ کی مذکورہ بالا آیت میں اللہ اور بندے کے مابین ہونے والی بیع و شراء میں بندے کی مجبوری یہ ہے کہ وہ اس سودے کی بیعت براہِ راست اللہ کے ہاتھ پر نہیں کر سکتا۔ اس لیے اسے یہ ''بیعت'' اللہ کے کسی نمائندے یعنی کسی انسان کے ہاتھ پر ہی کرنی پڑے گی اور اس طرح عملی طور پر اس سودے یا بیع میں تین فریق شامل ہوں گے' یعنی اللہ' سودا کرنے والا شخص اور وہ شخص جس کے ہاتھ پر اس سودے کی بیعت ہوگی۔ آج بالفرض اگر میں اپنا مال و جان اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا فیصلہ کرتا ہوں تو میرے اور اللہ کے درمیان چونکہ غیب کا پردہ حائل ہے اس لیے مجھے یہ معلوم کرنے کے لیے کوئی ''انسان'' ہی ڈھونڈنا پڑے گا کہ میں اپنی جان کب اور کیسے قربان کروں؟ اور اپنا مال کس طریقے سے کہاں خرچ کروں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ ''انسان'' اللہ کے رسول ﷺ کی شکل میں میسر تھا' انہوں نے اپنے مال و جان کے سودے کی ''بیعت'' حضور ﷺ کے ہاتھ پر کر رکھی تھی۔ چنانچہ جب حضورؐ انہیں بتاتے تھے

کہ اب اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ کارزار میں پہنچ جاؤ اور اب اپنے اموال حاضر کر دو تو صحابہؓ خوشی خوشی آپؐ کے ہر حکم پر لبیک کہتے تھے۔ بلکہ وہ تو منتظر رہتے تھے کہ کب حضورؐ انہیں حکم دیں اور کب انہیں اللہ کی امانت کو لوٹانے کی سعادت نصیب ہو۔

صحابہ کرامؓ کے قلوب و اذہان کی اس کیفیت کی تصویر سورۃ الاحزاب کی اس آیت میں دکھائی گئی ہے: ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۡ﴾ (آیت ۲۳) ''اور اہلِ ایمان میں کچھ جواں مرد لوگ وہ ہیں جنہوں نے سچا کر دکھایا وہ وعدہ جو انہوں نے اللہ سے کیا تھا' ان میں وہ بھی ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے ہیں اور ان میں کچھ وہ ہیں جو انتظار کر رہے ہیں''۔ گویا اللہ کے ساتھ مذکورہ سودے (بیع و شراء) کے بعد وہ جواں مرد اپنی جانیں اور اپنے مال اللہ کے حضور پیش کرنے کے لیے مسلسل بے تاب و بے قرار رہتے تھے۔ کسی شاعر نے اس خوبصورت مضمون کو تغزل کے رنگ میں یوں ادا کیا ہے:۔

دبالِ دوش ہے سر جسمِ ناتواں پہ مگر لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لیے!

کہ اے محبوب! ہم تو اپنے جسمِ ناتواں پر اپنے سر کے اس ''بوجھ'' کو صرف اس لیے اٹھائے پھر رہے ہیں کہ تُو جب چاہے اور جہاں چاہے بس اسی وقت وہیں پر ہم تیری راہ میں اسے قربان کر دیں۔ اب تو ہم زندہ ہی اس ''انتظار'' میں ہیں کہ کب تیرا اشارہ ہو اور کب ہم اپنے سر کو کٹوا کر تیری امانت کے اس بوجھ سے سبکدوش ہوں۔

اب رسول اللہ ﷺ کے بعد قیامت تک کے زمانے کے لیے بھی اس لائحہ عمل کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے حضور ﷺ کے بعد اس نوعیت کی بیعت جس کسی کے ہاتھ پر بھی ہوگی وہ حضورؐ کا کوئی اُمتی ہی ہوگا۔ لہٰذا اس کی اطاعت مستقل بالذّات اطاعت نہیں ہوگی بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے دائرے کے اندر رہ کر ہوگی۔ چنانچہ اب اس نوعیت کی بیعت کسی ایسے داعی کے ہاتھ پر ہی ہونی چاہیے جو صرف اور صرف اللہ کے نام پر کھڑا ہو اور لوگوں کو قرآن اور دین کے نام پر پورے خلوص سے دعوت دے۔ پھر وہ اس دعوت پر لبیک کہنے والے افراد کو اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے لیے ایک جمعیت کی شکل میں منظم کرنے کی کوشش بھی کرے۔ ظاہر ہے ''جمعیت'' کے بغیر اقامتِ دین کے لیے مؤثر اور منظم جدّوجُہد ممکن نہیں۔

جہاں تک جماعت سازی کے طریق کار کا تعلق ہے آج اس کے لیے بہت سے طریقے رائج ہیں۔ بعض تنظیمیں فارم کے ذریعے رکنیت سازی کرتی ہیں' بعض دستخطی مہم چلا کر ممبرز بناتی ہیں۔ کئی جماعتیں اپنے امیر کا انتخاب استصوابِ رائے کے ذریعے سے کرتی ہیں' پھر کہیں دو سال کے لیے امیر منتخب ہوتا ہے اور کہیں چار سال کے لیے' وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب طریقے جائز اور مباح ہیں' لیکن جماعت سازی کا منصوص' مسنون اور ماثور طریقہ بیعت کا طریقہ ہی ہے۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خندق کھودنے میں مصروف تھے تو وہ سب مل کر بلند آواز میں یہ شعر پڑھتے تھے:

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا [1]

کہ ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمد ﷺ کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کر رکھی ہے اور اب یہ جہاد جاری رہے گا جب تک ہماری جان میں جان ہے۔

۱۔ صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب التحریض علی القتال۔ وصحیح مسلم' کتاب الجهاد والسیر' باب غزوة الاحزاب وهی الخندق۔

جماعت سازی کے لیے بیعت کا طریقہ نصِ قرآنی اور نصِ حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں مختلف مواقع پر صحابہؓ سے بیعت لی۔ حضور ﷺ کے بعد خلافتِ راشدہ کا سلسلہ بھی بیعت کی بنیاد پر چلا۔ خلیفہ کے انتخاب کے لیے جب طے شدہ طریقہ کار کے مطابق مشاورت ہو جاتی اور ایک فیصلہ کر لیا جاتا تو اس فیصلے پر باقاعدہ اعتماد کا اظہار لوگ بیعت کے ذریعے سے ہی کرتے تھے۔ پھر آگے چل کر جب خلافت کے بارے میں مسلمانوں میں اختلافات پیدا ہوئے تب بھی حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنی اپنی جمعیتوں کی تشکیل بیعت کی بنیاد پر ہی کی تھی۔ حتیٰ کہ دورِ ملوکیت میں بھی مسلمان بادشاہ عوام سے اعتماد کا ووٹ بھی بیعت کے ذریعے سے ہی لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ پچھلی صدی میں مسلمانوں کے اندر جتنی جہادی تحریکیں اُٹھیں، ان کی رکنیت سازی بھی بیعت کی بنیاد پر کی گئی۔ مثلاً سید احمد بریلویؒ کی سکھوں کے خلاف، مہدی سوڈانی کی انگریزوں کے خلاف اور سنوسیوں کی اطالویوں کے خلاف جہادی تحریکوں کو بیعت کی بنیاد پر ہی منظم کیا گیا۔ صوفیاء کے ہاں بھی اپنے مریدین کے تزکیۂ نفس کے لیے ''بیعتِ ارشاد'' کا سلسلہ رائج ہے۔

بہرحال اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے لیے تنظیم سازی اور جمعیت ناگزیر ہے، کیونکہ اکیلا چنا تو بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ البتہ کسی داعی کی دعوت پر لبّیک کہنے سے پہلے اس کی شخصیت، اس کے معمولات و معاملات، معیارِ تقویٰ، دین و دنیا کے بارے میں اس کے علم و شعور، اقامتِ دین کے لیے اس کی جدّوجُہد کے طریق کار وغیرہ کے بارے میں اچھی طرح سے تحقیق کر لیجیے۔ پھر جب کسی شخصیت کے بارے میں دل مطمئن ہو جائے کہ واقعی وہ اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے بارے میں مخلص ہے اور باقی ضروری شرائط پر بھی پورا اُترتا ہے تو اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس کا ساتھ دیجیے اور اس مقصد کے حصول کے لیے اللہ عزّوجل اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کے اندر رہتے ہوئے اُس کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم کیجیے، کیونکہ ''سمع واطاعت'' کے بغیر نہ تو کوئی جمعیت قائم ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کے بغیر کوئی تنظیم اپنے ہدف کے حصول کے لیے مؤثر جدّوجُہد کر سکتی ہے۔

آیات ۱۱ تا ۱۷

سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُوْلُوْنَ
بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ
اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ۭ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝۱۱ بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ
وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۚ وَكُنْتُمْ قَوْمًۢا
بُوْرًا ۝۱۲ وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ۝۱۳ وَلِلّٰهِ مُلْكُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا
رَّحِيْمًا ۝۱۴ سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ
اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ۭ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ

تَحْسُدُوْنَنَا ؕ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵﴾ قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ
اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا
حَسَنًا ۚ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶﴾ لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى
حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ؕ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ
ع جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۷﴾

دوسرے رکوع کی یہ آیات صلح حدیبیہ کے بعد حضور ﷺ کے واپسی کے سفر کے دوران نازل ہوئیں' بالکل اسی طرح جس طرح غزوۂ تبوک سے واپسی پر سورۃ التوبہ کی کچھ آیات نازل ہوئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت کے تحت بعد میں نازل ہونے والی ان آیات کو پہلے سے جاری سلسلہ کلام کو منقطع کر کے یہاں پر رکھا گیا ہے۔ آیات کے تسلسل میں تقدیم و تاخیر کا بالکل یہی انداز اس سے پہلے ہم سورۃ التوبہ کے آغاز میں بھی دیکھ چکے ہیں۔ چنانچہ ان آیات کے مطالعہ سے پہلے یہ بات نوٹ کر لیجیے کہ پہلے رکوع کا مضمون یہاں پر منقطع ہو رہا ہے اور اس مضمون کا تسلسل اب تیسرے رکوع کے مضمون کے ساتھ جا کر ملے گا۔

آیت ۱۱ ﴿سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ﴾ ''عنقریب آپؐ سے کہیں گے وہ لوگ جو پیچھے رہ جانے والے تھے دیہاتیوں میں سے''

گویا رسول اللہ ﷺ کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ آپؐ کے مدینہ پہنچتے ہی اردگرد کے قبائل سے بادیہ نشین آپؐ کے پاس آ آ کر عذر پیش کریں گے کہ:

﴿شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ﴾ ''ہمیں مشغول رکھا ہمارے اموال اور اہل و عیال (کی دیکھ بھال) نے' چنانچہ آپ ہمارے لیے استغفار کیجیے۔''

حضور ﷺ نے تمام مسلمانوں پر عمرے کے لیے نکلنا لازم قرار نہیں دیا تھا۔ لیکن آپؐ نے اعلانِ عام کروایا تھا کہ جو کوئی عمرے کے لیے جا سکتا ہے ضرور چلے۔ بہرحال جو لوگ استطاعت کے باوجود آپؐ کے ساتھ نہیں گئے تھے یہ ان کی منافقت کا ذکر ہے کہ وہ آپؐ کے سامنے اپنی نام نہاد مصروفیات کے بہانے بنائیں گے۔

﴿يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ﴾ ''یہ لوگ اپنی زبانوں سے وہ کچھ کہہ رہے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے۔''

﴿قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ؕ﴾ ''آپؐ (ان سے) کہیے کہ کون ہے جو کچھ اختیار رکھتا ہو تمہارے بارے میں اللہ کی طرف سے کچھ بھی اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانے کا ارادہ کرے یا تمہیں نفع پہنچانے کا ارادہ کرے؟''

اللہ تعالیٰ کا تمہارے بارے میں نفع یا نقصان کا جو بھی ارادہ ہو وہ تمہاری کسی تدبیر سے تبدیل نہیں ہو سکتا۔ اپنے گھروں میں رہ کر تم لوگ اللہ کی تقدیر کو نہیں بدل سکتے تھے۔ تمہارے گھروں میں اگر کوئی خیر آنا تھی تو وہ تمہاری عدم موجودگی میں بھی آ سکتی تھی اور اگر کوئی

شر تمہارے مقدر میں لکھا تھا تو وہ تمہاری موجودگی میں بھی آ سکتا تھا۔ لہٰذا ہمارے ساتھ نہ جانے کے جواز میں تمہارے سب دلائل بے معنی اور فضول ہیں۔

﴿بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝۱۱﴾ ''بلکہ جو کچھ تم کرتے رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

اب وہ بات بتائی جا رہی ہے جو اصل میں ان کے دلوں میں تھی۔

آیت ۱۲ ﴿بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا﴾ ''بلکہ تم لوگوں نے یہ گمان کیا کہ اب رسولؐ اور اہلِ ایمان اپنے گھر والوں کی طرف کبھی بھی لوٹ کر نہیں آئیں گے''

تمہارا خیال تھا کہ ان لوگوں کا دماغ چل گیا ہے جو خود چل کر موت کے مُنہ میں جا رہے ہیں اور یہ کہ قریشِ مکہ انہیں جیتے جی کبھی واپس نہیں آنے دیں گے۔

﴿وَزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۚ﴾ ''اور یہ بات تمہارے دلوں میں خوشنما بنا دی گئی اور تم نے بہت بُرا گمان کیا۔''

﴿وَكُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا ۝۱۲﴾ ''اور تم ہو ہی تباہ ہونے والے لوگ۔''

اس سے پہلے سورۂ محمد میں منافقین کے جس طرزِ عمل کا ذکر ہوا تھا وہ ۲ ہجری کا دور تھا جبکہ ابھی قتال کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ اُس دور میں وہ لوگ ''اقدام'' سے متعلق حضور ﷺ کی حکمت عملی کے مقابلے میں صلح جوئی اور امن پسندی کی باتیں کرتے تھے۔ اب ان آیات میں ان کی ۶ ہجری کے زمانے کی سوچ کی عکاسی کی گئی ہے۔

آیت ۱۳ ﴿وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ۝۱۳﴾ ''اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسولؐ پر ایمان نہ رکھے تو ہم نے ان کافروں کے لیے جہنّم تیار کر رکھی ہے۔''

آیت ۱۴ ﴿وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ﴾ ''اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے۔''

﴿يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ﴾ ''وہ بخشے گا جس کو چاہے گا اور عذاب دے گا جس کو چاہے گا۔''

﴿وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۱۴﴾ ''اور اللہ بہت بخشنے والا' نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

آیت ۱۵ ﴿سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ﴾ ''(اے مسلمانو!) عنقریب یہی پیچھے رہنے والے کہیں گے' جب تم لوگ غنیمتیں حاصل کرنے کے لیے جاؤ گے' کہ ہمیں بھی اجازت دیجیے کہ ہم آپ کے ساتھ چلیں۔''

اس آیت میں فتح خیبر کی طرف اشارہ ہے۔ خیبر یہودیوں کا بہت بڑا گڑھ تھا۔ مسلمانوں سے بدعہدی کی بنا پر جن دو یہودی قبائل (بنوقینقاع اور بنونضیر) کو مدینہ سے نکالا گیا تھا وہ بھی خیبر میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ اس علاقے میں انہوں نے بڑے بڑے قلعے بنا کر عسکری اعتبار سے خود کو بہت مضبوط کر لیا تھا۔ یہ لوگ ہر وقت مسلمانوں کے خلاف طرح طرح کی سازشوں کی منصوبہ بندیاں کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد جب قریش کی طرف سے جنگ وغیرہ کا کوئی خطرہ نہ رہا تو اگلے ہی سال یعنی

۷ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے ان کی سرکوبی کے لیے پوری طاقت کے ساتھ خیبر پر چڑھائی کا فیصلہ کیا۔ یہاں ان آیات کے ذریعے مسلمانوں کو پیشگی (۶ ہجری میں) مطلع کیا جا رہا ہے کہ جب اگلے سال تم لوگ خیبر کی طرف پیش قدمی کرو گے تو اس کی فتح کو یقینی سمجھتے ہوئے اور وہاں سے بہت بڑے اموالِ غنیمت کی توقع کرتے ہوئے یہ منافقین بھی اس مہم پر تمہارے ساتھ جانے کے لیے تم سے اجازت مانگیں گے۔

﴿یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّبَدِّلُوْا کَلٰمَ اللّٰہِ ؕ﴾ ''یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے کلام کو تبدیل کر دیں!''

گویا یہ لوگ اللہ کے اس حکم کو خلافِ واقعہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ خیبر کی مہم پر حضور ﷺ کے ساتھ صرف انہی لوگوں کو جانے کی اجازت دی جائے گی جو حدیبیہ کی مہم پر آپؐ کے ساتھ گئے تھے اور بیعتِ رضوان میں شریک ہوئے تھے' جیسا کہ آگے آیات ۱۸' ۱۹ میں بصراحت ارشاد ہوا ہے۔

﴿قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا کَذٰلِکُمْ قَالَ اللّٰہُ مِنْ قَبْلُ ۚ﴾ ''آپؐ کہیے کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں جاؤ گے' یہ بات اللہ پہلے ہی فرما چکا ہے۔''

ان الفاظ کا اشارہ اسی سورت کی آیات ۱۸' ۱۹ کی طرف ہے' جو اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں۔

﴿فَسَیَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ؕ﴾ ''اس پر وہ کہیں گے: بلکہ آپ لوگ ہم سے حسد کر رہے ہیں۔''

اس پر وہ آپ لوگوں پر الزام دھریں گے کہ آپ لوگ حسد کی بنا پر ہمیں اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتے کہ ہم بھی کہیں تمہیں حاصل ہونے والے اموالِ غنیمت میں حصہ دار نہ بن جائیں۔

﴿بَلْ کَانُوْا لَا یَفْقَہُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۱۵﴾﴾ ''بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ فہم ہی نہیں رکھتے مگر بہت کم۔''

آیت ۱۶ ﴿قُلْ لِّلْمُخَلَّفِیْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰی قَوْمٍ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ تُقَاتِلُوْنَہُمْ اَوْ یُسْلِمُوْنَ ۚ﴾ ''ان بدوؤں میں سے جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے آپؐ ان سے کہہ دیجیے کہ عنقریب تمہیں بلایا جائے گا ایک ایسی قوم کے ساتھ مقابلے کے لیے جو بہت طاقتور ہوگی' یا تو تم ان سے قتال کرو گے یا وہ اطاعت قبول کر لیں گے۔''

ان الفاظ میں جنگوں کے اس طویل سلسلے کی طرف اشارہ ہے جو چند سال بعد سلطنتِ روما اور سلطنتِ ایران کے خلاف شروع ہونے والا تھا۔ گویا یہ انقلابِ محمدیؐ کی بین الاقوامی سطح پر پیش قدمی کے بارے میں پیشین گوئی ہے کہ جزیرہ نمائے عرب کا پورا علاقہ تمہارے زیر تسلط آ جانے کے بعد عنقریب تمہارا ٹکراؤ سلطنتِ روما اور سلطنتِ ایران کی ایسی افواج سے ہوگا جن کی تعداد لاکھوں میں ہے اور وہ اپنے زمانے کے جدید ترین سامانِ حرب سے لیس ہیں۔ چنانچہ اے نبی ﷺ! آپ ان اعراب سے کہیں کہ توسیع و تصدیر انقلاب کے اس مرحلے میں تم لوگوں کو بھی اپنی سابقہ کوتاہیوں کی تلافی کرنے کا موقع دیا جائے گا۔

﴿فَاِنْ تُطِیْعُوْا یُؤْتِکُمُ اللّٰہُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ﴾ ''تو اُس وقت اگر تم اطاعت کرو گے تو اللہ تمہیں بہت اچھا اجر دے گا۔''

اگر تم لوگ ان معرکوں میں اللہ رب العزت اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا دم بھرتے ہوئے اُس کے رسولؐ کے مشن کے علمبردار بنو گے تو اللہ تعالیٰ سے اس کا بہت اچھا صلہ پا لو گے۔

﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶﴾﴾ ''لیکن اگر تم نے (اس موقع پر بھی) پیٹھ دکھادی جیسے کہ تم نے پہلے پیٹھ دکھائی تھی تو وہ تمہیں بہت دردناک عذاب دے گا۔''

یہاں پر یہ اہم نکتہ نوٹ کر لیجئے کہ ﴿تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ﴾ کے الفاظ میں کسی قوم کے ساتھ مقابلے میں تین ممکنہ صورتوں کا ذکر ہے۔ ''تُقَاتِلُوْنَهُمْ'' میں مخالف فریق کے ساتھ مقابلے اور جنگ کی طرف اشارہ ہے جبکہ ''يُسْلِمُوْنَ'' میں ان کے اسلام لانے یا اطاعت قبول کرنے کی دونوں صورتیں شامل ہیں۔ چنانچہ عرب سے باہر مسلمانوں کا جہاں کہیں بھی کوئی معرکہ ہوتا تھا اس میں ان کی طرف سے مخالف فریق کے سامنے یہی تین نکات پیش کیے جاتے تھے۔

آیت ۱۷ ﴿لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ؕ﴾ ''ہاں کسی اندھے پر کوئی تنگی نہیں اور نہ ہی کسی لنگڑے پر اور نہ ہی کسی مریض پر کوئی تنگی ہے۔''

اگر جسمانی لحاظ سے کوئی معذور شخص جہاد میں حصہ نہیں لیتا تو اس کی معذوری کے پیش نظر اس پر اس حوالے سے کوئی سختی نہیں کی جائے گی۔

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ﴾ ''اور جو اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گا تو وہ داخل کرے گا اس کو ان باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔''

﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۷﴾﴾ ''اور جو کوئی پیٹھ پھیر لے تو اسے وہ ایک دردناک عذاب سے دوچار کرے گا۔''

آیات ۱۸ تا ۲۶

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾ وَّ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۹﴾ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَ كَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَ يَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۲۰﴾ وَّ اُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۱﴾ وَ لَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ﴿۲۲﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۖۚ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾ وَ هُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ﴿۲۴﴾ هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ الْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ؕ وَ لَوْ لَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَ نِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ

رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۲۵﴾ اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَ كَانُوْۤا اَحَقَّ بِهَا وَ اَهْلَهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۲۶﴾

اب آئندہ آیات میں اسی مضمون کا تسلسل ہے جو پہلے رکوع میں ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ﴾ (آیت ۱۰) کے الفاظ سے شروع ہوا تھا۔ جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے کہ حکمتِ الٰہی کے پیش نظر اس مضمون کا سلسلہ درمیان سے منقطع کر کے بعد میں نازل ہونے والی آیات کو وہاں جگہ دے دی گئی اور اب آیت ۱۸ سے دوبارہ وہی مضمون شروع ہو رہا ہے۔

آیت ۱۸ ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ ''اللہ راضی ہو گیا اہلِ ایمان سے جب کہ وہ آپؐ سے بیعت کر رہے تھے درخت کے نیچے تو اللہ کے علم میں تھا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا''

یعنی بیعت کے وقت تو ان کے دلوں میں فقط ذوقِ شہادت اور جوشِ جہاد تھا۔ صلح کی بات چیت تو اُن کی بیعت کے بعد شروع ہوئی تھی۔

﴿فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾﴾ ''تو اللہ نے ان پر سکینت نازل کر دی اور انہیں (بدلے میں) ایک قریبی فتح بخشی۔''

یہ اشارہ ہے فتح خیبر کی طرف جو حدیبیہ سے واپسی کے بعد جلد ہی ظہور میں آ گئی۔ ان الفاظ میں اس امر کی صراحت ہے کہ یہ انعام ان ہی لوگوں کے لیے مخصوص تھا جو بیعتِ رضوان میں شریک تھے۔ چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ صفر ۷ھ میں خیبر پر چڑھائی کے لیے نکلے تو آپؐ نے صرف انہی اصحاب کو ساتھ لیا۔

آیت ۱۹ ﴿وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۹﴾﴾ ''اور بہت سے اموالِ غنیمت جو وہ حاصل کریں گے۔ اور اللہ زبردست، حکمت والا ہے۔''

آیت ۲۰ ﴿وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ﴾ ''(اے مسلمانو!) اللہ تم سے وعدہ کرتا ہے بہت سے اموالِ غنیمت کا جنہیں تم حاصل کرو گے، پس یہ (فتح) تو اُس نے تمہیں فوری طور پر عطا کر دی ہے''

اس سے مراد صلح حدیبیہ ہے، جس کا ذکر سورت کے آغاز میں بایں الفاظ ہوا: ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ﴿۱﴾﴾ ''یقیناً ہم نے آپؐ کو ایک بڑی روشن فتح عطا فرمائی ہے۔''

﴿وَ كَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ﴾ ''اور اُس نے روک لیا لوگوں کے ہاتھوں کو تم سے۔''

ظاہر ہے اگر جنگ ہوتی اور قریش بھی اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے تو کچھ نہ کچھ نقصان مسلمانوں کا بھی ضرور ہوتا۔

﴿وَ لِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَ يَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۲۰﴾﴾ ''تاکہ یہ اہلِ ایمان کے لیے ایک نشانی بن جائے اور وہ تمہاری راہنمائی فرمائے سیدھے راستے کی طرف۔''

تا کہ اس کے بعد اقامتِ دین کے لیے تمہاری اجتماعی جدّ و جُہد کامیابی کے مراحل جلد از جلد طے کرے اور اللہ تعالیٰ اسے تیر کی طرح سیدھا اس کے آخری ہدف اور منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔

آیت ۲۱ ﴿وَّاُخْرٰی لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ؕ﴾ ''اور کچھ (فتوحات) اور بھی ہیں جن پر ابھی تمہیں قدرت حاصل نہیں ہوئی' اللہ ان کا بھی احاطہ کیے ہوئے ہے۔''

یعنی اس کے فوراً بعد تمہیں خیبر کی فتح حاصل ہوگی اور اس کے بعد مکّہ بھی فتح ہو جائے گا۔ ان کے علاوہ سرزمین عرب سے باہر بھی بہت سی فتوحات اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے گھیر رکھی ہیں۔ ان فتوحات کے بارے میں دوسرے رکوع (آیت ۱۶) میں بھی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ یاد رہے کہ تیسرے رکوع کی یہ آیات دوسرے رکوع کی آیات سے پہلے نازل ہوئی ہیں۔

﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا ﴿۲۱﴾﴾ ''اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

آیت ۲۲ ﴿وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا یَجِدُوْنَ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا ﴿۲۲﴾﴾ ''اور اگر یہ کافر (قریشِ مکّہ) تم سے جنگ کرتے تو لازماً پیٹھ پھیر جاتے اور پھر نہ پاتے وہ اپنے لیے کوئی حمایتی اور نہ کوئی مددگار۔''

آیت ۲۳ ﴿سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ﴾ ''یہ اللہ کا وہ دستور ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے۔''

یعنی یہ اللہ کا قانون ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں اور ان کے اہلِ ایمان ساتھیوں کی مدد کرتا ہے۔ چنانچہ اگر قریشِ مکّہ اس موقع پر آپؐ کے ساتھ جنگ کرتے تو اللہ تعالیٰ اپنی سُنّت کے مطابق آپ لوگوں کی مدد کرتا اور ایسی صورت میں انہیں پیٹھ دکھانا پڑتی اور شکست ان کا مقدر بنتی۔

﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا ﴿۲۳﴾﴾ ''اور تم ہرگز نہیں پاؤ گے اللہ کے قانون میں کوئی تبدیلی۔''

آیت ۲۴ ﴿وَهُوَ الَّذِیْ كَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ﴾ ''اور وہی ہے جس نے روک دیے اُن کے ہاتھ تمہاری طرف بڑھنے سے اور تمہارے ہاتھ اُن کی طرف بڑھنے سے مکّہ کی وادی میں'

﴿مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَیْهِمْ ؕ﴾ ''اس کے بعد کہ اُس نے تمہیں ان پر فتح دے دی تھی۔''

یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے قریشِ مکّہ کے حوصلے پست کر دیے گئے تھے جس کی وجہ سے ان کے لیے مسلمانوں کا مقابلہ کرنا ممکن نہ رہا اور انہوں نے اپنی تمام تر طاقت کے باوجود مسلمانوں کو اپنے برابر کا فریق تسلیم کرتے ہوئے ان سے صلح کر لی۔ اس صلح میں اگلے سال مسلمانوں کے عمرہ کرنے اور اس دوران مکّہ شہر کو تین دن کے لیے مکمل طور پر خالی کر دینے جیسی شرائط بھی شامل تھیں۔ دیکھا جائے تو قریشِ مکّہ کے لیے مسلمانوں کو اپنا ہم پلّہ سمجھتے ہوئے صلح کرنا اور پھر ایسی شرائط تسلیم کر لینا موت کا سامنا کرنے سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ بہرحال اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے انہیں اندرونی طور پر اس قدر کمزور کر دیا تھا کہ وہ یہ سب کچھ قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے اور اس کے مقابلے میں وہ مسلمانوں سے صرف ایک یہ بات منوا سکے کہ اس سال عمرہ ادا کیے بغیر واپس چلے جائیں تا کہ وقتی طور پر ان کی ''ناک'' مکمل طور پر کٹنے سے بچ جائے۔

﴿وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرًا ﴿۲۴﴾﴾ ''اور جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔''

آیت ﴿هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ؕ﴾ ''وہی لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تمہیں روکے رکھا مسجدِ حرام تک جانے سے اور قربانی کے جانور بھی روکے گئے اپنی جگہ پہنچنے سے۔''

یہ ان جرائم کا تذکرہ ہے جن کا ارتکاب قریشِ مکّہ نے اس پورے واقعے کے دوران کیا تھا۔ انہوں نے نہ صرف مسلمانوں کو احرام کی حالت میں ہوتے ہوئے بھی بیت اللہ کے طواف سے روکا بلکہ ان کے قربانی کے جانوروں کو بھی قربان گاہوں تک نہ پہنچنے دیا۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود اللہ تعالیٰ نے فریقین کے ہاتھوں کو ایک دوسرے کی طرف بڑھنے سے روک دیا اور اس ممکنہ جنگ کو ٹال دیا۔ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے میں جو حکمت کارفرما تھی اب اس کا ذکر ہو رہا ہے:

﴿وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ﴾ ''اور اگر نہ ہوتے (مکّہ میں موجود) ایسے مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں جنہیں تم نہیں جانتے تھے' اندیشہ تھا کہ تم لوگ انہیں بھی کچل دیتے تو ان کے بارے میں تم پر الزام آتا بے خبری میں (تو جنگ نہ روکی جاتی)۔''

عین موقع پر جنگ کو روکنے میں دراصل یہ حکمت پوشیدہ تھی کہ اُس وقت تک مکّہ میں بہت سے ایسے اہلِ ایمان افراد موجود تھے جو کسی نہ کسی وجہ سے ہجرت نہیں کر سکے تھے۔ اس میں ضُعفاء بھی تھے' مریض بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں۔ ان لوگوں کا ذکر سورۃ النساء کے چودھویں رکوع میں بھی آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی معذوری کو دیکھتے ہوئے انہیں معاف کر دے گا اور ہجرت نہ کر سکنے کی بنا پر ان سے مؤاخذہ نہیں کرے گا۔ چنانچہ ایسے لوگوں کی شہر میں موجودگی کی صورت میں جب جنگ کی چکّی چلتی تو یہ بے گناہ لوگ بھی اس میں پس جاتے اور اُلٹا مسلمانوں پر ان سے متعلق الزام بھی آتا کہ انہوں نے اپنے ہی اہلِ ایمان ساتھیوں کو قتل کر دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسی لیے ممکنہ جنگ کو روک دیا اور مسلمانوں کو بغیر لڑے صلح کی شکل میں فتح دے دی۔

﴿لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ﴾ ''(جنگ اس لیے روکی گئی) تاکہ اللہ داخل کرے اپنی رحمت میں جس کو چاہے۔''

﴿لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۲۵﴾ ''اگر وہ (اہلِ ایمان) علیحدہ ہو چکے ہوتے تو ان (اہلِ مکّہ) میں سے جو کافر تھے ان کو ہم ایک دردناک عذاب کا مزہ چکھا دیتے۔''

اگر وہ کمزور اور معذور اہلِ ایمان اُس وقت تک مکّہ سے نکل چکے ہوتے تو ہم یہ جنگ ہونے دیتے اور مسلمانوں کے ہاتھوں قریشِ مکّہ کو ان کے جرائم کی بدترین سزا دلواتے۔

آیت ﴿اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ﴾ ''جب ان کافروں نے اپنے دلوں میں حمیت بٹھائی' جاہلیت کی حمیت''

قریشِ مکّہ نے اس موقع پر جس حمیت کا مظاہرہ کیا وہ سراسر حمیتِ جاہلی تھی۔ ان کے دلوں میں قوم پرستی' آباء پرستی اور روایت پرستی کا تعصب کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اسی تعصب کی بنا پر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ان لوگوں کو عمرہ ادا کرنے کی اجازت نہیں دیں گے جو اپنے باپ دادا کے دین سے پھر کر ''بے دین'' ہو چکے تھے۔

﴿فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ''تو اللہ نے سکینت نازل کر دی اپنے رسولؐ پر اور اہلِ ایمان پر''

﴿وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ؕ﴾ ''اور اُس نے لازم کر دیا ان پر تقویٰ کی بات کو اور وہ اس کے زیادہ حق دار بھی ہیں اور اس کے اہل بھی ہیں۔''

﴿وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۲۶﴾﴾ ''اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔''

آیات ۲۷ تا ۲۹

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۲۷﴾ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۲۸﴾ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۫ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾ ع

آیت ۲۷ ﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ﴾ ''اللہ نے اپنے رسولؐ کو بالکل سچا خواب دکھایا حق کے ساتھ۔''

یہ اُس خواب کا ذکر ہے جس کی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ نے عمرے کا قصد فرمایا تھا اور مسلمانوں کو ساتھ چلنے کے لیے ترغیب دی تھی۔ حضور ﷺ نے خواب میں خود کو مسلمانوں کے ساتھ عمرہ کرتے ہوئے دیکھا تھا اور آپؐ نے اپنے اس خواب کا تذکرہ صحابہؓ سے سرِعام کیا تھا۔ چونکہ رسول کا خواب بھی وحی کے درجے میں ہوتا ہے اس لیے جب صلح حدیبیہ کے نتیجے میں عمرہ اگلے سال پر ملتوی ہو گیا تو ایسی صورت میں حضور ﷺ کے خواب کے بارے میں وضاحت ضروری تھی۔ مبادا کسی کے ذہن میں یہ شبہ جنم لیتا کہ 'نعوذ باللہ' حضور ﷺ کا خواب سچا نہیں تھا۔ اس ضمن میں جب حضور ﷺ سے سوال کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ مَیں نے یہ تو کہا تھا ہم عمرہ کریں گے لیکن یہ نہیں کہا تھا کہ ضرور اسی سال کریں گے۔ آیت زیر مطالعہ میں پیشگی خبر دی جا رہی ہے کہ تم لوگ اللہ رب العزت کے رسول ﷺ کے خواب کے عین مطابق عمرہ ادا کرو گے۔ چنانچہ اگلے ہی سال ۷ ہجری کو آپ ﷺ نے مسلمانوں کے ہمراہ عمرہ کیا۔ تاریخ میں یہ عمرہ ''عمرۃ القضاء'' کے نام سے مشہور ہے۔

﴿لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ﴾ ''(اے مسلمانو!) تم لازماً داخل ہو گے مسجد الحرام میں' ان شاء اللہ' پورے امن کے ساتھ''

﴿مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ﴾ ''اپنے سروں کو منڈواتے ہوئے اور بالوں کو ترشواتے ہوئے' (اُس وقت) تمہیں کوئی اندیشہ نہیں ہوگا۔''

اگلے سال یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔ اگلے سال جب مسلمان عمرہ ادا کرنے کے لیے مکّہ میں داخل ہوئے تو پورا شہر خالی تھا۔ قریش اپنے گھروں کو چھوڑ کر تین دن کے لیے پہاڑوں پر چلے گئے تھے۔ اس دوران مسلمان مکّہ میں مقیم رہے اور انہوں نے پورے اطمینان سے عمرہ ادا کیا۔

﴿فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۲۷﴾﴾ ''تو اللہ وہ کچھ جانتا ہے جو تم نہیں جانتے' تو اس کے علاوہ اس نے (تمہارے لیے) ایک قریب کی فتح بھی رکھی ہے۔''

اس سے فتح خیبر مراد ہے جس کا ذکر اس سے پہلے آیت ۱۵ کے ضمن میں بھی ہو چکا ہے۔ یعنی اگلے سال جب تم لوگ قضا عمرہ ادا کرنے کے لیے جاؤ گے تو اس سے پہلے تم یہودیوں کے گڑھ خیبر کو فتح کر کے اس کے غنائم سمیٹ چکے ہو گے۔

اب وہ عظیم آیت آ رہی ہے جو اس سے پہلے ہم سورۃ التوبہ (آیت ۳۳) میں بھی پڑھ چکے ہیں۔ اس کے بعد یہ الفاظ سورۃ الصف (۲۸ ویں پارے) کی آیت ۹ میں بھی آئیں گے۔ سورۃ التوبہ اور سورۃ الصف میں یہ آیت جوں کی توں آئی ہے' جبکہ زیر مطالعہ سورت میں اس کا آخری حصہ ﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا﴾ مختلف ہے۔

آیت ۲۸ ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ﴾ ''وہی ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسولؐ کو الہدیٰ اور دینِ حق دے کر''

اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول محمد عربی ﷺ کو قرآن حکیم دے کر بھیجا ہے جو نوعِ انسانی کے لیے ہدایتِ کاملہ ہے: ؎

نوعِ انساں را پیامِ آخریں حاملِ اُو رحمۃ لّلعالمیں! (اقبالؔ)

مزید برآں ان کو سچا اور کامل دین بھی عطا فرمایا ہے' جو عادلانہ نظامِ زندگی کا خاکہ پیش کرتا ہے۔

﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ﴾ ''تاکہ وہ غالب کر دے اسے کُل کے کُل نظامِ زندگی پر۔''

گویا قبل ازیں اس سورت کی آیت ۲ اور آیت ۲۰ میں جس سیدھے راستے ﴿صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا﴾ کا ذکر ہے وہ راستہ ''اظہارِ دینِ حق'' کی منزل کی طرف جاتا ہے اور اسی ہدف کو حاصل کرنے کا حکم سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ میں اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ کے الفاظ میں ہوا کہ تم دین کو قائم کرو! پھر سورۃ الشوریٰ کی آیت ۲۱ میں جھوٹے معبودوں کے ابطال کی جو دلیل دی گئی ہے اور ان کے مقابلے میں معبودِ حقیقی کی جو شان بیان ہوئی ہے وہ بھی ''الدِّیْن'' (نظامِ زندگی) کے حوالے سے ہے۔ ملاحظہ ہوں متعلقہ آیت کے یہ الفاظ: ﴿اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ﴾ ''کیا ان کے لیے ایسے شرکاء ہیں جنہوں نے ان کے لیے دین میں کچھ ایسا طے کر دیا ہو جس کا اللہ نے حکم نہیں دیا؟'' یعنی اللہ عزّ وجل کی شان تو یہ ہے کہ اُس نے انسانوں کو دینِ حق دیا ہے' ایک مکمل ضابطۂ حیات اور عادلانہ نظامِ زندگی دیا ہے' تو کیا اُس کا کوئی شریک بھی ایسا ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ اس نے بھی اپنے ماننے والوں کو کوئی نظامِ زندگی دیا ہے؟ بہر حال اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد ہی ''اظہارِ دینِ حق'' بتایا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے الہدیٰ اور دینِ حق دے کر اپنے رسولؐ کو بھیجا ہی اس لیے ہے کہ وہ اس ''الدِّین'' کو پورے نظامِ زندگی پر غالب کر دے۔

﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۲۸﴾﴾ ''اور کافی ہے اللہ مددگار کے طور پر۔''

عام طور پر لفظ شَہِید کا ترجمہ ''گواہ'' کیا جاتا ہے' لیکن یہاں پر خصوصی طور پر شہید کا ترجمہ ''مددگار'' ہوگا۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۳ میں بھی یہ لفظ اسی مفہوم میں آیا ہے' جہاں قرآن جیسی ایک سورت بنانے کا چیلنج دینے کے بعد فرمایا گیا: ﴿وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ کہ بلا لو اس کام کے لیے اپنے تمام مددگاروں کو اللہ کے سوا۔ ''شَہِدَ یَشْہَدُ'' کے معنی کسی موقع یا وقوعہ پر حاضر ہونے کے ہیں۔ ''گواہی'' کے معنی اس لفظ میں اسی حاضری کے مفہوم کی وجہ سے آئے ہیں' کیونکہ کسی واقعے کی صحیح گواہی کا اہل تو وہی شخص ہو سکتا ہے جو وہاں اُس وقت موقع پر حاضر ہو۔ جبکہ اسی ''حاضری'' کی وجہ سے اس لفظ میں ''مددگار'' کے معنی بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے آپ کی مدد وہی شخص کر سکے گا جو آپ کے ساتھ موجود ہوگا۔ اس کے مقابلے میں ایک ایسا شخص جو آپ کا بہت اچھا دوست ہو' آپ کے ساتھ مخلص بھی ہو' مگر جب آپ کو مدد کی ضرورت ہو اس وقت آپ کے پاس موجود ہی نہ ہو تو وہ آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ چنانچہ سیاق وسباق کے اعتبار سے یہاں لفظ شہید کے معنی مددگار کے ہیں۔

آیت ۲۹ ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ﴾ ''محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو ان کے ساتھ ہیں' وہ کافروں پر بہت بھاری اور آپس میں بہت رحم دل ہیں''

آیت کے اس ٹکڑے کا ترجمہ دو طرح سے کیا جاتا ہے۔ اگر پہلا فقرہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ پر مکمل کر دیا جائے اور وَالَّذِيْنَ سے دوسرا فقرہ شروع کیا جائے تو آیت کا مفہوم وہی ہوگا جو اوپر ترجمے میں اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو ان کے ساتھی ہیں وہ کفار پر بہت بھاری اور آپس میں بہت رحم دل ہیں۔ لیکن اگر پہلے فقرے کو وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ تک پڑھا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ کے رسول محمد (ﷺ) اور آپؐ کے ساتھی ایک وحدت اور ایک جماعت ہیں۔ اس طرح دوسرے فقرے میں بیان کی گئی دو خصوصیات اس جماعت کی خصوصیات قرار پائیں گی۔ یعنی اللہ کے رسول ﷺ اور آپؐ کے ساتھی کفار پر بہت بھاری اور آپس میں بہت شفیق ومہربان ہیں۔

اہل ایمان کی اس شان کا ذکر زیر مطالعہ آیت کے علاوہ سورۃ المائدۃ (آیت ۵۴) میں بھی ہوا ہے۔ وہاں مؤمنینِ صادقین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا: ﴿اَذِلَّةٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ﴾ ''وہ اہلِ ایمان کے حق میں بہت نرم ہوں گے' کافروں پر بہت بھاری ہوں گے''۔ علامہ اقبالؔ نے اپنے اس شعر میں اسی مضمون کی ترجمانی کی ہے: ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن!

یہاں پر یہ نکتہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ یہ آیت بیعت کے تذکرے کے بعد آئی ہے۔ اس ترتیب سے گویا یہ یاددہانی کرانا مقصود ہے کہ ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ﴾ کے الفاظ میں جس جماعت کا ذکر ہوا ہے وہ بیعت کی بنیاد پر وجود میں آئی تھی۔ اس حوالے سے حضور ﷺ کی سیرت سے جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص آپؐ پر ایمان لاتا' آپؐ اس سے بیعت لیتے تھے' یہ ایمان کی بیعت تھی۔ لیکن سیرت کے مطالعے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اہلِ مکہ میں سے آپؐ نے کسی سے ایمان کی بیعت کبھی نہیں لی' بلکہ اہلِ مکہ میں سے جو کوئی ایمان لانا چاہتا وہ کلمۂ شہادت پڑھتا اور بس حلقۂ اسلام میں داخل ہو جاتا۔ اس کے لیے کسی علامتی اقدام کی کبھی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ ہاں اگر کوئی شخص باہر سے آتا تو اس سے آپؐ ایمان کی بیعت لیتے تھے۔

اس کے علاوہ مکّی دور میں آپ ﷺ نے دو بیعتوں کا خصوصی طور پر اہتمام فرمایا تھا۔ یعنی بیعتِ عَقبہ اولیٰ اور بیعتِ عَقبہ ثانیہ۔ ان میں بیعتِ عَقبہ ثانیہ وہ بیعت ہے جس کی بنیاد پر مسلمان باقاعدہ ایک ''جماعت'' بنے تھے۔ اس بات کی گواہی اس بیعت کے الفاظ بھی دیتے ہیں۔ یہ الفاظ ایک متفق علیہ روایت کے مطابق حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے اس طرح نقل ہوئے ہیں:

بَايَعْنَا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ ، فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ ، وَعَلَى الْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ ، وَعَلَى لَا نُنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ ، وَعَلَى أَنْ نَقُولَ بِالْحَقِّ أَيْنَمَا كُنَّا ، لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ (۲)

''ہم نے اللہ کے رسول ﷺ سے بیعت کی کہ ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے' خواہ آسانی ہو یا مشکل' خواہ ہماری طبیعت آمادہ ہو یا ہمیں اس پر جبر کرنا پڑے' اور خواہ دوسروں کو ہمارے اوپر ترجیح دے دی جائے۔ ہم اصحابِ اختیار سے جھگڑیں گے نہیں' لیکن سچ بولیں گے جہاں کہیں بھی ہم ہوں گے' اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے بے خوف رہیں گے۔''

غور کیجیے' اس بیعت کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرہ کس قدر اہم اور سبق آموز ہے۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ ہم نے بیعت کی تھی اللہ کے رسول ﷺ سے کہ ہم آپؐ کا ہر حکم سنیں گے اور مانیں گے۔ خواہ مشکل ہو' خواہ آسانی ہو' خواہ اس کے لیے ہماری طبیعتیں آمادہ ہوں' خواہ ہمیں اپنی طبیعتوں پر جبر کرنا پڑے اور خواہ ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے..... یعنی ہم کبھی شکایت نہیں کریں گے کہ ہم آپؐ کے پرانے ساتھی ہیں جبکہ آپؐ ہمارے اوپر ایک نووارد کو امیر کیوں مقرر کر رہے ہیں؟ بس یہ آپؐ کا اختیار ہوگا کہ آپؐ جس کو چاہیں امیر مقرر کریں' آپؐ جو فیصلہ چاہیں کریں..... اور یہ کہ ہم آپؐ کے مقرر کردہ امیر سے کبھی جھگڑا نہیں کریں گے..... اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان بھی بہت واضح ہے:

((مَنْ أَطَاعَنِي فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ ، وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ ، وَمَنْ أَطَاعَ أَمِيرِي فَقَدْ أَطَاعَنِي ، وَمَنْ عَصَى أَمِيرِي فَقَدْ عَصَانِي)) (۳)

''جس نے میری اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔''

اطاعتِ امیر کے حوالے سے یہ نکتہ بھی مدِنظر رہنا چاہیے کہ جماعتی زندگی میں ''امیر'' صرف ایک نہیں ہوتا بلکہ مختلف سطحوں پر اوپر نیچے بہت سے ''اُمراء'' ہوتے ہیں۔ جیسے فوج کا ایک سپہ سالار ہوتا ہے' اس کے نیچے مختلف رجمنٹس' بٹالینز' کمپنیز اور پلاٹونز کے اپنے اپنے کمانڈرز ہوتے ہیں' اسی طرح ایک تنظیم کا ایک مرکزی امیر ہوگا' پھر صوبائی اُمراء' ڈویژنل اُمراء' ضلعی اُمراء ہوں گے اور ان سب اُمراء کا سلسلہ وار سمع وطاعت کا نظام ہوگا۔

۲۔ صحيح البخاري' كتاب الاحكام' باب كيف يبايع الامام الناس۔ وكتاب الفتن' باب قول النبي ﷺ سترون بعدي امورًا تنكرونها۔ وصحيح مسلم' كتاب الامارة' باب وجوب طاعة الامير في غير معصية...

۳۔ صحيح البخاري' كتاب الاحكام' باب قول الله تعالى: اطيعوا الله واطيعوا الرسول واولى الامر منكم۔ وصحيح مسلم' كتاب الامارة' باب وجوب طاعة الامراء في غير معصية وتحريمها في المعصية۔

حضور ﷺ کی مذکورہ بیعت کی یہ آخری شق بھی بہت اہم ہے کہ ہم جہاں کہیں بھی ہوں گے حق بات ضرور کہیں گے اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہیں کریں گے۔ یعنی مشورہ مانگا جائے گا تو بے لاگ مشورہ دیں گے' اپنی رائے کو چھپا کر نہیں رکھیں گے ـــــ اس حوالے سے یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ایک مامور کی ذمہ داری صرف مشورہ دینے کی حد تک ہے۔ اس کے بعد امیر جو فیصلہ بھی کرے اسے دل و جان سے تسلیم کرنا اس پر لازم ہے' جیسا کہ سورۂ محمد (ﷺ) کی آیت ۲۱ کے الفاظ ﴿فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۚ﴾ سے واضح ہوتا ہے کہ جب فیصلہ ہو جائے تو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت لازم ہے۔

بہر حال جب منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ میں اقدام کا مرحلہ آنے کو تھا' Passive Resistance تبدیل ہو رہی تھی Active Resistance میں' تو مسلمانوں میں ایک باقاعدہ جماعت کا نظم وجود میں آیا اور اس نظم کی بنیاد بیعتِ عَقَبہ ثانیہ بنی۔ آیت زیر مطالعہ کے الفاظ ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ﴾ میں اسی جماعت اور اسی نظم کی طرف اشارہ ہے۔

﴿تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ﴾ ''تم دیکھو گے انہیں رکوع کرتے ہوئے' سجدہ کرتے ہوئے' وہ (ہر آن) اللہ کے فضل اور اُس کی رضا کے متلاشی رہتے ہیں''

﴿سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ﴾ ''اُن کی پہچان اُن کے چہروں پر (ظاہر) ہے سجدوں کے اثرات کی وجہ سے۔''

سجدوں کے نشان سے عام طور پر پیشانی کا گٹہ مراد لے لیا جاتا ہے جو بعض نمازیوں کے چہروں پر کثرتِ سجود کی وجہ سے پڑ جاتا ہے۔ لیکن یہاں اس سے اصل مراد ایک نمازی اور متقی مؤمن کے چہرے کی وہ نورانیت اور خاص کیفیت ہے جو اُس کے عمل و کردار کی غمازی کرتی محسوس ہوتی ہے۔

﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ﴾ ''یہ ہے اُن کی مثال تورات میں۔''

یعنی محمد رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ تمثیل تورات میں بیان ہوئی ہے۔ اگرچہ یہود و نصاریٰ نے تورات اور انجیل میں قطع و برید کر کے حضور ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ کے بارے میں پیشین گوئیوں کو بالکل مسخ کر دیا ہے' تاہم آج بھی تورات اور انجیل دونوں میں ایسی چیزیں موجود ہیں جن کا مصداق نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً کتاب استثناء' باب ۳۳' آیت ۲ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بنی اسرائیل کو وصیت ملاحظہ ہو: ''خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا' دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لیے تھی۔''

﴿وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۾ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰي سُوْقِهٖ﴾ ''اور انجیل میں ان کی مثال یوں ہے کہ جیسے ایک کھیتی ہو جس نے نکالی اپنی کونپل' پھر اس کو تقویت دی' پھر وہ سخت ہوئی' پھر وہ اپنے تنے پر کھڑی ہو گئی۔''

﴿يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ ﴾ ''یہ کاشتکار کو بڑی بھلی لگتی ہے''

یہ ایک کھیتی کی مثال ہے۔ بیج کو جب زمین میں دبایا جاتا ہے تو اس سے ایک چھوٹی سی نرم و نازک کونپل پھوٹتی ہے' پھر وہ آہستہ

آہستہ بڑھتی ہے' پھر اس کا تنا بنتا ہے اور اس کے بعد وہ ایک مضبوط پودے کی صورت میں بغیر کسی سہارے کے کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس طرح جب ایک کھیتی کے تمام پودے اپنے جوبن پر ہوں اور فصل خوب لہلہا رہی ہوتی ہے تو اسے دیکھ کر کاشتکار کا دل بھی خوشی سے جھوم اٹھتا ہے۔

﴿لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۭ﴾ ''تاکہ ان سے کافروں کے دل جلائے۔''

اس آخری جملے میں گویا واضح کر دیا گیا کہ اس مثال یا تشبیہ کے پردے میں جس کھیتی کی بات ہو رہی ہے وہ دراصل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت ہے اور اس کھیتی کے کاشتکار خود اللہ کے رسول ﷺ ہیں۔ چشم تصور سے اس جماعت کے ماضی میں جھانکیں تو ہمیں چند سال پہلے کا وہ نقشہ نظر آئے گا جب سرزمینِ مکہ میں دعوت کے بیج سے ایک ایک کر کے اس کھیتی کی نرم و نازک کونپلیں نمودار ہو رہی تھیں۔ اس وقت ان کونپلوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ اپنے بل پر کھڑی ہو سکتیں۔ جناب ابوطالب کے انتقال کے وقت مکہ میں بمشکل ڈیڑھ سو مسلمان تھے۔ خود حضور ﷺ کے قبیلے نے آپ سے تعلق توڑ لیا تھا اور قبیلے کی حمایت کے بغیر مکہ میں رہنا بھی بظاہر آپ کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ اسی صورتِ حال کے پیش نظر آپ اپنی دعوت اور تحریک کے متبادل مرکز کی تلاش میں طائف تشریف لے گئے تھے۔ لیکن وہاں سے بہت تکلیف دہ حالت میں خالی ہاتھ واپس آنا پڑا تھا۔ طائف سے واپسی تک صورت حال اس حد تک گمبھیر ہو چکی تھی کہ آپ کو مکہ میں داخل ہونے کے لیے ایک مشرک مطعم بن عدی کی امان لینا پڑی تھی۔ ایک صورتِ حال وہ تھی جو کل سرزمینِ مکہ میں اہلِ ایمان کو برداشت کرنا پڑی تھی اور ایک منظر یہ تھا جس کا نظارہ آج حدیبیہ کا میدان کر رہا تھا' جہاں چودہ سو یا اٹھارہ سو مجاہدین کی سربکف جمعیت سر کٹانے کے لیے بے تاب و بے قرار تھی۔ ان کا نظم و ضبط' ان کا جذبۂ ایثار' بیعت علی الموت کے لیے ان کا جوش و خروش' پھر جنگ کے ٹل جانے اور جانوں کے بچ جانے پر ان کا ملال اور بظاہر دب کر صلح کرنے پر ان کا رنج۔ غرض ان کی ہر ادا نرالی اور ان کا ہر انداز انوکھا تھا۔ یہ تھی وہ کھیتی جو آج حدیبیہ کے میدان میں لہلہاتی ہوئی دشمنوں کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔ اس کھیتی کے جوبن کی اس نرالی شان کو آج ملائکہ مقربین بھی رشک بھری نظروں سے دیکھتے ہوں گے اور اس کے ''نگہبان'' کے اندازِ نگہبانی کی تحسین کے لیے اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کے ترانے الاپتے ہوں گے۔

''لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ'' کے الفاظ میں ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی اس کھیتی پر جس کا دل جلتا ہو قرآن حکیم اس کے ایمان کی نفی کر رہا ہے۔ صحابہؓ سے بغض ہو اور دعویٰ ایمان کا ہو تو اس دعویٰ میں کوئی صداقت نہیں۔

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝۲۹﴾ ''اللہ نے وعدہ کیا ہے اُن لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے' مغفرت اور اجرِ عظیم کا۔''

تفسیرِ عثمانی میں یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ اگرچہ حضور ﷺ کے تمام صحابہؓ ایمان اور عملِ صالح کا حق ادا کر چکے تھے' پھر بھی یہاں مِنْهُمْ کی قید لگا کر ان پر واضح کر دیا گیا کہ اس کیفیت پر موت تک قائم رہنا بھی ضروری ہے' مبادا کہ بعد میں کسی کے اندر کسی قسم کا کوئی تزلزل پیدا ہو جائے۔ انسان چونکہ طبعاً کمزور واقع ہوا ہے' اس لیے اگر اس کو کامیابی کا یقین دلا دیا جائے تو اطمینان کی وجہ سے اس میں تساہل پیدا ہو جاتا ہے' جبکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ اللہ کے ہاں بلند مقام حاصل کر لینے کے باوجود بھی انسان آخری دم تک ''بین الخوف والرجاء'' کی کیفیت میں رہے۔

سُوْرَۃُ الْحُجُرٰتِ

تمہیدی کلمات

سورۃ الحجرات اٹھارہ آیات اور دو رکوعوں پر مشتمل ایک مختصر سورت ہے۔ جیسا کہ قبل ازیں سورۂ محمد (ﷺ) کے تمہیدی کلمات میں بھی بتایا جا چکا ہے کہ سورۂ محمد اور سورۃ الفتح کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے' جبکہ سورۃ الحجرات کی حیثیت سورۃ الفتح کے ضمیمے کی سی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں سورۃ الفتح کی بعض آیات کی وضاحت ملتی ہے۔ مثلاً سورۃ الفتح میں ﴿وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ ؕ﴾ کے الفاظ میں اللہ کے رسول ﷺ کی تعظیم و توقیر اور حمایت و نصرت کا حکم دیا گیا ہے جبکہ سورۃ الحجرات میں اس حوالے سے عملی ہدایات دی گئی ہیں۔ اسی طرح سورۃ الفتح میں رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ کے الفاظ میں اہلِ ایمان کی شخصیات کی ایک مستحکم (consolidated) جھلک دکھائی گئی ہے جبکہ سورۃ الحجرات میں ایک بندۂ مؤمن کے کردار کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کے علاوہ اس سورت میں غلبۂ دین کی جدّوجُہد کے حوالے سے جہاد کی اہمیت' دین میں جہاد کی اصل حیثیت' اسلامی ریاست کی دستوری بنیاد' اہلِ ایمان پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حقوق' مسلمانوں کے باہمی حقوق اور مسلمان معاشرے کی اجتماعی زندگی کے خدوخال جیسے اہم اور بنیادی مسائل بھی بیان ہوئے ہیں۔

گویا اسلامی ریاست کے اصولوں اور اسلامی معاشرے سے متعلق بنیادی ہدایات کے اعتبار سے سورۃ الحجرات قرآن کی اہم ترین اور جامع ترین سورت ہے۔ اس اعتبار سے یوں سمجھئے کہ اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرے سے متعلق جو تفصیلی ہدایات سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ میں دی گئی ہیں ان کا لُبِّ لُباب اور خلاصہ سورۃ الحجرات کی اٹھارہ آیات میں سمو دیا گیا ہے۔

آیات ۱ تا ۵

سُوْرَۃُ الْحُجُرٰتِ مَدَنِیَّۃٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اٰیَاتُهَا: ۱۸ رُكُوْعَاتُهَا: ۲

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝۱ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝۲ اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰی ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ۝۳ اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ۝۴ وَ لَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْهِمْ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۵

آیت ① ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ①﴾ ''اے اہلِ ایمان! مت آگے بڑھو اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) سے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا' سب کچھ جاننے والا ہے۔''

یہ آیت گویا اسلامی ریاست کے آئین کی بنیاد ہے۔ اسلامی ریاست کے آئین کی پہلی شق یہ ہے کہ حاکمیت اللہ کی ہے اور اقتدارِ مطلق کا مالک صرف اکیلا وہ ہے۔ اس نظری و اعتقادی حقیقت کی تعمیل و تنفیذ کا طریقہ اس آیت میں بتایا گیا ہے۔ یعنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے جو حدود قائم کر دی ہیں ان حدود سے کسی بھی معاملے میں تجاوز نہیں ہوگا۔ اس آیت کے مفہوم کو پاکستان کے ہر دستور میں ان الفاظ کے ساتھ شامل رکھا گیا ہے: No Legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah۔ یہ شق گویا اسلامی ریاست کے آئین کے لیے اصل الاصول کا درجہ رکھتی ہے۔ چنانچہ آئین پاکستان میں اس شق کے شامل ہونے سے اصولی طور پر تو پاکستان ایک اسلامی ریاست بن گیا' لیکن عملی طور پر اس ''ذمہ داری'' سے جان چھڑانے کے لیے کمال یہ دکھایا گیا کہ ان الفاظ کے ساتھ ایک ہاتھ سے آئین کے اندر اسلام داخل کر کے دوسرے ہاتھ سے نکال لیا گیا۔ آئینِ پاکستان کو قرآن و سنّت کے مطابق بنانے کے مقصد کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل (Islamic Ideological Council) تشکیل دی گئی اور اسے بظاہر یہ اہم اور مقدس فریضہ سونپا گیا کہ وہ پارلیمنٹ کی ''قانون سازی'' پر گہری نظر رکھے گی اور اس ضمن میں کسی کوتاہی اور غلطی کی صورت میں حکومت کو رپورٹ پیش کرے گی۔ یہاں تک تو معاملہ ٹھیک تھا' لیکن اس میں منافقت یہ برتی گئی کہ آئین کی رو سے حکومت کو نظریاتی کونسل کی سفارشات پر عمل کرنے کا پابند نہیں کیا گیا۔ چنانچہ کونسل نے اقتصادیات اور غیر سودی بینکاری کے حوالے سے بہت مفید سفارشات مرتب کی ہیں۔ بہت سے دوسرے معاملات میں بھی تحقیقاتی رپوٹیں حکومتوں کو بھجوائی ہیں۔ کونسل کی سفارشات جمع ہوتے ہوتے الماریاں بھر گئیں' لیکن کسی حکومت نے ان میں سے کسی ایک سفارش کو بھی تنفیذ کے حوالے سے لائقِ اعتناء نہ سمجھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کونسل کی تمام تحقیقات اور سفارشات کُلّی طور پر لاحاصل مشق (exercise in futility) ثابت ہوئیں۔

بہر حال زیر مطالعہ آیت کی رو سے جب کسی ریاست کے آئین میں مذکورہ شق شامل کر لی جائے گی تو اصولی طور پر وہ ریاست اسلامی ریاست بن جائے گی۔ اس کے بعد اس ریاست کے قانون ساز ادارے کو چاہے پارلیمنٹ کہیں' مجلس ملّی کہیں یا کانگرس کا نام دیں' اس کی قانون سازی کا دائرۂ اختیار (legislative authority) قرآن و سنّت کی بالادستی کے باعث محدود ہو جائے گا۔ یعنی اس ''قدغن'' کے بعد وہ مقنّنہ اپنے ملک کے لیے صرف قرآن و سنّت کے دائرے کے اندر رہ کر ہی قانون سازی کر سکے گی۔ اس دائرے کے اندر جو قانون سازی کی جائے گی وہ جائز اور مباح ہوگی اور اس دائرے کی حدود سے متجاوز ہوتا ہوا کوئی بھی قانون ناجائز اور ممنوع قرار پائے گا' چاہے اس قانون کو مقنّنہ کے تمام ارکان ہی کی حمایت حاصل کیوں نہ ہو۔ اسلامی مقنّنہ کی اس ''محدودیت'' کو اس مثال سے سمجھیں کہ کسی دعوت میں بلائے گئے مہمانوں کی تواضع روح افزا شربت سے کی جائے' سیون اَپ سے یا دودھ سوڈا وغیرہ سے' اس بارے میں فیصلہ تو کثرتِ رائے سے کیا جا سکتا ہے' لیکن تمام میزبان اپنے سو فیصد ووٹوں سے بھی مہمانوں کو کوئی ایسا مشروب پلانے کا فیصلہ نہیں کر سکتے جس کا پینا قرآن و سنّت میں ممنوع قرار دیا جا چکا ہے۔ اس نکتے کو رسول اللہ ﷺ نے اس مثال کے ذریعے

نہایت عمدگی سے واضح فرمایا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ((مَثَلُ الْمُؤْمِنِ وَمَثَلُ الْإِيْمَانِ كَمَثَلِ الْفَرَسِ فِيْ آخِيَتِهٖ ، يَجُوْلُ ثُمَّ يَرْجِعُ إِلٰى آخِيَتِهٖ ...)) [1] یعنی ''مؤمن کی مثال اور ایمان کی مثال اُس گھوڑے کی سی ہے جو اپنے کھونٹے کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ وہ گھومنے پھرنے کے بعد پھر اپنے کھونٹے پر واپس لوٹ آتا ہے.....'' ظاہر ہے مؤمن تو وہی ہے جو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھتا ہے اور ان کے احکام کو مانتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے احکام کے کھونٹے سے بندھ چکا ہے' اب وہ اس کھونٹے کے گرد اگرد ایک دائرے میں اپنی مرضی سے چر پھر سکتا ہے' لیکن اس دائرے کی حدود کا تعین اس کھونٹے کی رسّی (حدود اللہ) کے اندر موجود گنجائش کی بنیاد پر ہی ہوگا۔ اس کے برعکس ایک وہ شخص ہے جو مادر پدر آزاد ہے۔ وہ نہ اللہ کو مانتا ہے' نہ رسولؐ کو جانتا ہے اور نہ ہی ان کے احکام کو پہچانتا ہے' وہ اپنی مرضی کا مالک ہے' جو چاہے کرے اور جس چیز کو چاہے اپنے لیے ''جائز'' قرار دے لے۔ چنانچہ ایسے افراد اگر کسی ملک یا ریاست کے قانون ساز ادارے میں بیٹھے ہوں گے تو وہ کثرتِ رائے سے اپنی ریاست اور قوم کے لیے جو قانون چاہیں منظور کر لیں۔ وہ چاہیں تو ہم جنس پرستی کو جائز قرار دے دیں اور چاہیں تو مرد کی مرد سے شادی کو قانونی حیثیت دے دیں۔

اب اس کے بعد جو چار آیات آ رہی ہیں وہ اہلِ ایمان پر اللہ کے رسول ﷺ کے حقوق کا تعین کرتی ہیں۔ حضور ﷺ کی تعظیم' آپؐ کی محبت اور آپؐ کے اتباع کا جذبہ گویا ایک مسلمان معاشرے کی تہذیب اور اس کے تمدن کی بنیاد ہے۔ اس بارے میں ایک عمومی حکم ﴿وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ ؕ﴾ ہم سورۃ الفتح میں پڑھ آئے ہیں۔ اس حکم کی شرح گویا اب اگلی آیات میں بیان ہو رہی ہے۔

آیت ۱ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ﴾ ''اے اہلِ ایمان! اپنی آواز کبھی بلند نہ کرنا نبی (ﷺ) کی آواز پر اور نہ انہیں اس طرح آواز دے کر پکارنا جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو بلند آواز سے پکارتے ہو''

﴿اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝۲﴾ ''مبادا تمہارے سارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔''

خبردار! نبی کریم ﷺ کی تعظیم و توقیر کا معاملہ بہت نازک اور حساس ہے۔ اس معاملے میں ہمیشہ چوکنا اور ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو نبی کریم ﷺ کی شان میں کسی معمولی سی بے ادبی سے تم میں سے کسی کے تمام نیک اعمال ضائع ہو جائیں اور وہ اسی زعم میں رہے کہ میں تو پکا سچا مسلمان ہوں' ہمیشہ کبائر سے بچ کر رہتا ہوں' میں نے کبھی چوری نہیں کی' ڈاکا نہیں ڈالا' اور کبھی زنا کاری کا نہیں سوچا۔

آیت ۳ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ؕ﴾ ''بے شک وہ لوگ جو اپنی آوازوں کو پست رکھتے ہیں اللہ کے رسولؐ کے سامنے' یہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے جانچ پرکھ کر چُن لیا ہے تقویٰ کے لیے۔''

پچھلی آیت میں جو حکم منفی انداز میں دیا گیا ہے اسی حکم کو اب شاباش کے لیے مثبت انداز میں دہرایا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو

۱۔ صحیح ابن حبان' ح:۶۱۶۔ الترغیب والترھیب للمنذری : ۱۱۹/۴۔ مجمع الزوائد للھیثمی : ۲۰۴/۱۰۔ مشکاۃ المصابیح' کتاب الاطعمۃ' باب الضیافۃ۔

اپنے رسول ﷺ کے ادب کے حوالے سے آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل اس قدر پسند آیا ہے کہ اس بنیاد پر اُس نے ان کے دلوں کو تقویٰ کے نور سے خصوصی طور پر منور کرنے کے لیے منتخب کر لیا ہے۔

﴿لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۳﴾ ''ان کے لیے مغفرت بھی ہے اور بہت بڑا اجر بھی۔''

آیت ۴ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۴﴾ ''بے شک وہ لوگ جو آپؐ کو پکارتے ہیں حجروں کے پیچھے سے ان میں سے اکثر وہ ہیں جو عقل نہیں رکھتے۔''

بعض اوقات جب حضور ﷺ اپنے حجرۂ مبارک میں تشریف فرما ہوتے تو بدو قسم کے لوگ باہر کھڑے ہو کر آپؐ کو آوازیں دینا شروع کر دیتے: ''یَا مُحَمَّدُ اُخْرُجْ اِلَیْنَا''۔ حضور ﷺ کے گھر تشریف لے جانے' آرام فرمانے اور گھر سے باہر رونق افروز ہونے کے اپنے معمولات تھے۔ لہٰذا یہاں دوٹوک انداز میں بتا دیا گیا کہ وقت بے وقت گھر سے باہر کھڑے ہو کر لوگوں کا آپؐ کو بے باکانہ انداز میں آوازیں دینے کا یہ طرزِ عمل اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔ کسی کو گھر سے باہر بلانے کا یہ انداز اور طریقہ عام معاشرتی آداب کے بھی خلاف ہے۔

آیت ۵ ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۵﴾ ''اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ آپؐ خود ان کے پاس نکل کر آ جاتے تو یہ اُن کے حق میں بہتر ہوتا۔ بہر حال اللہ بہت بخشنے والا' بہت رحم کرنے والا ہے۔''

چونکہ یہ لوگ آدابِ معاشرت سے ناآشنا ہیں اور یہ خلافِ ادب حرکت وہ جان بوجھ کر نہیں کرتے رہے ہیں اس لیے اپنے گزشتہ طرزِ عمل کے حوالے سے تو انہیں معافی کی توقع رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ غفور اور رحیم ہے' لیکن آئندہ کسی سے ایسی کوئی حرکت سرزد نہیں ہونی چاہیے۔

آیات ۶ تا ۱۰

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۶ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَ زَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۷ۙ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۸ وَ اِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۹ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَ ع اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۱۰

آئندہ آیات میں آٹھ خصوصی احکام کا ذکر ہے۔ ان میں دو بڑے احکام ہیں اور چھ چھوٹے۔ بڑے اور چھوٹے کی یہ تقسیم میں نے اس بنیاد پر کی ہے کہ ان میں دو احکام ایسے ہیں جن میں سے پہلے حکم کے لیے تین اور دوسرے کے لیے دو آیات مختص کی گئی ہیں' جبکہ بعد کے چھ احکام مجموعی طور پر دو آیات میں بیان ہوئے ہیں' یعنی ان میں سے تین تین احکام کو ایک ایک آیت میں جمع کر دیا گیا ہے۔ ان تمام احکام کا تعلق اسلامی معاشرے اور غلبۂ دین کے لیے کھڑی ہونے والی تنظیم کو مضبوط اور مربوط رکھنے سے ہے۔ اگر کوئی تنظیم خود مضبوط و مربوط نہیں ہوگی تو ظاہر ہے اس کی جدّوجُہد بھی کمزور اور غیر مؤثر رہے گی۔ بہرحال ان آٹھ احکام میں ایسے اصول دے دیے گئے ہیں جو کسی معاشرے اور جماعت کے لیے مفید ہو سکتے ہیں اور ان باتوں سے بچنے کی ترغیب دی گئی ہے جن سے کسی معاشرہ یا تنظیم کی وحدت میں رخنے پڑ سکتے ہیں۔ دو بڑے احکام میں سے پہلا حکم یہ ہے:

آیت ۶ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا﴾ ''اے اہلِ ایمان! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق شخص کوئی بڑی خبر لے کر آئے تو تم تحقیق کر لیا کرو''

اگر خبر دینے والا شخص تمہارے خیال کے مطابق ''متقی'' نہیں ہے تو اس خبر کے مطابق کوئی اقدام کرنے سے پہلے اچھی طرح سے تحقیق کر لیا کرو۔ ہو سکتا ہے اس نے آپ کو غلط اطلاع دی ہو کہ فلاں قبیلہ تم لوگوں پر حملے کی تیاری کر رہا ہے اور آپ تحقیق کیے بغیر اس قبیلے پر خواہ مخواہ چڑھائی کر دو۔

﴿اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰي مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۝۶﴾ ''مبادا کہ تم جا پڑو کسی قوم پر نادانی میں اور پھر تمہیں اپنے کیے پر نادم ہونا پڑے۔''

تاریخِ عالم گواہ ہے کہ افواہوں کی بنیاد پر کیے گئے اکثر اقدامات سے قوموں اور ملکوں کے مابین بڑے بڑے جھگڑوں نے جنم لیا ہے۔ اس لیے افواہوں کی بنیاد پر کوئی اقدام نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں اگر خبر لانے والا شخص صاحبِ تقویٰ اور قابلِ اعتماد ہو تو دوسری بات ہے۔

آیت ۷ ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۭ﴾ ''اور جان لو کہ تمہارے مابین اللہ کا رسول موجود ہے۔''

انسانی سطح پر حضور ﷺ کے مختلف لوگوں کے ساتھ مختلف رشتے تھے۔ مثلاً بعض خواتین کے آپؐ شوہر اور بعض کے باپ تھے۔ مَردوں میں سے بعض کے آپؐ داماد تھے' بعض کے بھتیجے اور بعض کے سسر تھے۔ چنانچہ اس حساس معاملے میں دوٹوک انداز میں متنبہ کر دیا گیا کہ خبردار! تم میں سے کوئی کسی وقت یہ حقیقت نہ بھولنے پائے کہ محمد بن عبداللہ جو تمہارے درمیان موجود ہیں یہ اللہ کے رسول (ﷺ) ہیں۔ لہٰذا آپؐ کی یہ حیثیت تم میں سے ہر ایک کے سامنے ہر حال میں مقدم رہنی چاہیے۔ آپؐ کا کوئی رشتہ دار محض اپنے کسی مخصوص رشتے کی بنا پر آپؐ کے ساتھ کوئی معاملہ کرنے کا کبھی خیال بھی ذہن میں نہ لائے۔

﴿لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ﴾ ''اگر وہ تمہارا کہنا مانا کریں اکثر معاملات میں تو تم لوگ مشکل میں پڑ جاؤ''

چنانچہ تم ہر معاملے میں رسول اللہ ﷺ کی مرضی اور منشاء کو پیشِ نظر رکھا کرو۔ آپؐ سے یہ توقع نہ رکھو کہ آپؐ فیصلے کرتے ہوئے تم لوگوں کی مرضی کا خیال رکھیں گے۔

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ ''لیکن (اے نبی ﷺ کے ساتھیو!) اللہ نے تمہارے نزدیک ایمان کو بہت محبوب بنا دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں کے اندر کھبا دیا ہے''

﴿وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ﴾ ''اور اُس نے تمہارے نزدیک بہت ناپسندیدہ بنا دیا ہے کفر، فسق اور نافرمانی کو۔''

﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۙ﴾ ''یہی لوگ ہیں جو صحیح راستے پر ہیں۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان کے حوالے سے قرآن کی یہ آیت خصوصی اہمیت اور عظمت کی حامل ہے۔

آیت ۸ ﴿فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ؕ﴾ ''اللہ کی طرف سے بہت بڑے فضل اور انعام کی بنا پر۔''

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۸﴾ ''اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا' کمال حکمت والا ہے۔''

اس کے بعد اب دوسرا حکم دیا جا رہا ہے:

آیت ۹ ﴿وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ﴾ ''اور اگر اہلِ ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دیا کرو۔''

اہلِ ایمان بھی تو آخر انسان ہیں۔ ان کے درمیان بھی اختلافات ہو سکتے ہیں اور کسی خاص صورتِ حال میں اختلافات بڑھ کر جنگ اور قتال پر بھی منتج ہو سکتے ہیں۔ جیسے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان یا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلافات جنگ کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ چنانچہ اگر کہیں ایسی صورتِ حال پیدا ہو تو اُمّتِ مُسلمہ کے تمام افراد پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ متحارب فریقین کے درمیان صلح کروائیں۔ اگر مسلمانوں کے دو فریق آپس میں لڑ رہے ہوں تو باقی مسلمان خاموش تماشائی بن کر نہیں بیٹھ سکتے' کیونکہ اگر ان کے درمیان صلح نہ کرائی گئی تو مسلمانوں کی جمعیت اور طاقت میں رخنہ پڑے گا جس کی وجہ سے بالآخر مسلمانوں کی مجموعی طاقت اور غلبۂ دین کی جدّوجُہد کو نقصان پہنچے گا۔ اس لحاظ سے کسی بھی ملک یا خطہ کے مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں کو ختم کرانا باقی مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے۔

﴿فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ﴾ ''پھر اگر ان میں سے ایک فریق دوسرے پر زیادتی کر رہا ہو تو تم جنگ کرو اس کے ساتھ جو زیادتی کر رہا ہے''

اگر فریقین میں صلح کرا دی گئی' لیکن اس کے بعد بھی ان میں سے ایک فریق اس صلح کی پابندی نہیں کر رہا اور دوسرے فریق پر زیادتی کیے جا رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پوری اُمّتِ مُسلمہ پر زیادتی کر رہا ہے اور پوری ملّتِ اسلامیہ کو چیلنج کر رہا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں پوری ملّت کی ذمہ داری ہے کہ وہ زیادتی کرنے والے فریق کے خلاف بھرپور طاقت استعمال کرے۔

﴿حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ﴾ ''یہاں تک کہ وہ لوٹ آئے اللہ کے حکم کی طرف۔''

﴿فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۹﴾ ''پھر اگر وہ لوٹ آئے تو ان دونوں کے درمیان صلح کرا دو عدل کے ساتھ اور دیکھو! انصاف کرنا۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔''

کہیں ایسا نہ ہو کہ زیادتی کرنے والے فریق کے خلاف طاقت کے استعمال کے دوران تم لوگ انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھو۔ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ طاقت کا یہ استعمال صرف انصاف کے تقاضے پورے کرنے کی حد تک ہو۔ ظاہر ہے ایک زیادتی کو روکنے کے لیے مزید کسی زیادتی کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

آیت ۱۰ ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ﴾ ''یقیناً تمام اہلِ ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں' پس اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو۔''

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝۱۰﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔''

جیسا کہ قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے' ان دو بڑے احکام کے بعد اب چھ چھوٹے احکام اگلی دو آیات میں جمع کر دیے گئے' اس طرح کہ ہر آیت میں تین احکام ہیں۔ کسی معاشرے یا کسی تنظیم کے اندر انفرادی اور اجتماعی سطح پر جہاں بڑے بڑے اختلافات پیدا ہوتے ہیں وہاں ایسی غلط فہمیاں بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں جو بظاہر بہت چھوٹی محسوس ہوتی ہیں' لیکن اگر انہیں معمولی سمجھتے ہوئے بروقت ان کا تدارک نہ کیا جائے تو منفی عوامل کی وجہ سے دلوں میں زخم بن جاتے ہیں۔

آیات ۱۱' ۱۲

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۱۱ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۲

آیت ۱۱ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ﴾ ''اے اہلِ ایمان! تم میں سے کوئی گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے' ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں''

ممکن ہے مدِمقابل شخص کی کوئی خوبی اس کے ظاہری عیب کے مقابلے میں بہت بڑی ہو۔ مثلاً آپ جس شخص کی بھدی ناک یا چھوٹے کان کا مذاق اڑا رہے ہوں ممکن ہے اس کے دل کا تقویٰ تمہارے تقویٰ کے مقابلے میں دس گنا زیادہ ہو۔ یا ممکن ہے وہ تمہارے مقابلے میں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے ہزار گنا زیادہ محبت کرتا ہو۔

﴿وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ﴾ ''(اسی طرح) عورتیں بھی دوسری عورتوں کا مذاق نہ اڑائیں' ہوسکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں۔''

گویا پہلے حکم میں مسلمان مَردوں اور عورتوں کو اپنے اپنے حلقوں میں ایک دوسرے کا مذاق اور تمسخر اڑانے سے منع کیا گیا ہے۔

اب اس سلسلے کا دوسرا حکم ملاحظہ ہو:

﴿وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ ''اور اپنے آپ کو عیب مت لگاؤ''

اپنے بھائی بندوں پر عیب لگانے سے منع کرنے کا یہ بہت ہی بلیغ انداز ہے کہ اپنے آپ کو عیب نہ لگاؤ۔ یعنی کسی کو عیب لگانے سے پہلے یہ ضرور سوچ لو کہ وہ تمہاری اپنی ہی ملّت کا ایک فرد ہے اور اپنی ملّت کے کسی فرد کو عیب لگانا گویا خود اپنے آپ ہی کو عیب لگانے کے مترادف ہے۔

﴿وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ﴾ ''اور نہ آپس میں ایک دوسرے کے چڑانے والے نام رکھا کرو۔''

یہ تیسرا حکم ہے کہ کسی فرد یا کسی گروہ کے اصل نام کو چھوڑ کر اُس کے لیے کوئی ایسا نام نہ رکھ لو جو اُسے پسند نہ ہو۔ یہ ایک مذموم اور ناپسندیدہ حرکت ہے۔

﴿بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ﴾ ''ایمان کے بعد تو بُرائی کا نام بھی بُرا ہے۔''

تم تو وہ لوگ ہو جن کے دل ایمان کے نور سے منور ہو چکے ہیں۔ یہ بہت بڑی فضیلت ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو نوازا ہے۔ ایسے اعلیٰ مقام و مرتبے پر فائز ہو جانے کے بعد ایسی گھٹیا حرکات کا ارتکاب اب تمہارے شایانِ شان نہیں۔

﴿وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۱۱﴾ ''اور جو باز نہیں آئیں گے وہی تو ظالم ہیں۔''

پچھلے فقرے میں معیوب روش کو ترک کرنے کے لیے ترغیب و تشویق کی جھلک تھی جبکہ ان الفاظ میں اس روش سے تائب ہو کر باز نہ آنے والوں کے لیے زجر و توبیخ کا انداز پایا جاتا ہے۔ ممکن ہے کوئی شخص بادیٔ النظر میں مذکورہ بُرائیوں کو معمولی سمجھے، لیکن کسی معاشرے یا تنظیم میں ایسی برائیوں کا عادتاً رائج ہو جانا انتہائی نقصان دہ ہے۔

گزشتہ آیت میں جن تین برائیوں کا ذکر ہوا ہے ان کا ارتکاب عام طور پر دوسرے فریق کے روبرو کیا جاتا ہے، جبکہ اگلی آیت میں تین ایسے رذائل سے بچنے کا حکم دیا جا رہا ہے جو عموماً کسی فرد کی پیٹھ پیچھے سرزد ہوتے ہیں۔

آیت ۱۲ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ ''اے اہلِ ایمان! زیادہ گمان کرنے سے بچو، بے شک بعض گمان گناہ ہوتے ہیں''

کسی کے بارے میں خواہ مخواہ کوئی بات فرض کر کے یا کسی سنی سنائی بات کو بنیاد بنا کر کوئی بُرا گمان اپنے دل میں بٹھا لینا اور منفی رائے قائم کر لینا، جبکہ متعلقہ شخص نے نہ تو ویسا کوئی اقدام کیا ہو اور نہ ہی اُس کے عملی رویّے سے ویسی کسی بات کی تصدیق ہوتی ہو، یہ ہے اس گمان کی نوعیت جس سے یہاں منع کیا جا رہا ہے۔ ایسے گمان کو بدگمانی یا سوئے ظن کہا جاتا ہے اور یہ بہتان اور تہمت کے زمرے میں آتا ہے۔

﴿وَّلَا تَجَسَّسُوْا﴾ ''اور ایک دوسرے کے حالات کی ٹوہ میں نہ رہا کرو''

عام طور پر ریاستی اور حکومتی سطح پر جاسوسی کے باقاعدہ محکمے بھی ہوتے ہیں اور ظاہر ہے ضرورت کے تحت ایسا کوئی محکمہ ایک اسلامی حکومت کے تحت بھی قائم ہو سکتا ہے، لیکن اس حوالے سے جو بات معیوب اور ممنوع ہے وہ افراد کی سطح پر ایک دوسرے کے حالات کے بارے میں خواہ مخواہ کا تجسس ہے۔ جیسے بعض لوگ عادتاً دوسروں کے معاملات کی ٹوہ میں رہتے ہیں اور کُرید کُرید کر جاننے کی کوشش

کرتے ہیں کہ فلاں گھر کے اندر کیا ہو رہا ہے؟ فلاں دو بھائیوں کے معاملات کیا ہیں؟ اور کیا وجہ ہے کہ ابھی تک ان میں کوئی جھگڑا وغیرہ نہیں ہوا؟

﴿وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ﴾ ''اور تم میں سے کوئی دوسرے کی غیبت نہ کرے۔''

اس حکم کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی غیر حاضری میں اس کی بُرائی بیان نہ کرے' خواہ وہ بُرائی اس شخص میں بالفعل پائی بھی جاتی ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے غیبت کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے: ((ذِكْرُكَ اَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ)) ''تمہارا اپنے بھائی کا ذکر اس انداز سے کرنا جسے وہ ناپسند کرے''۔ آپؐ سے پوچھا گیا: ''دیکھئے' اگر میرے بھائی میں وہ بُرائی واقعتاً پائی جاتی ہو جس کا میں ذکر کرتا ہوں (پھر بھی یہ غیبت ہے)؟'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اِنْ كَانَ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدِ اغْتَبْتَهٗ' وَاِنْ لَّمْ يَكُنْ فِيْهِ فَقَدْ بَهَتَّهٗ)) (۲) ''اگر وہ بُرائی اس میں موجود ہے جس کا تم ذکر کر رہے ہو تو تم نے اُس کی غیبت کی ہے' اور اگر وہ بُرائی اس میں موجود ہی نہیں تب تو تم نے اس پر بہتان لگا دیا۔''

﴿اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ﴾ ''کیا تم میں سے کوئی شخص پسند کرے گا کہ اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ یہ تو تمہیں بہت ناگوار لگا!''

یعنی مُردہ بھائی کے گوشت کھانے والی بات یا مثال سے تو تمہیں بہت گھن محسوس ہوتی ہے۔ لیکن یاد رکھو! اگر تم اپنے کسی مسلمان بھائی کی غیبت کرتے ہو تو اخلاقی سطح پر یہ حرکت اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے ہی مترادف ہے۔ کیونکہ ایسی حرکت کا ارتکاب کر کے آپ اپنے بھائی کی عزّت پر ایسی حالت میں حملہ کرتے ہیں جب وہ اس کا دفاع بھی نہیں کر سکتا۔ اگر تم اُس کے سامنے اس کی بُرائی بیان کرتے تو وہ تمہارے الزامات کا ضرور جواب دیتا اور سو طرح سے اپنا دفاع کرتا۔ بہر حال کسی کی عدم موجودگی میں اسے بُرا بھلا کہنا ایسے ہے جیسے اُس کی لاش آپ کے سامنے ہو اور آپ اس کی بوٹیاں نوچ رہے ہوں۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' اللہ توبہ کا بہت قبول فرمانے والا اور بہت رحم فرمانے والا ہے۔''

اس کے بعد اس سورت کا تیسرا حصّہ شروع ہو رہا ہے جو بہت اہم اور عظیم مضامین پر مشتمل ہے۔ یہاں پر ضمنی طور پر یہ نکتہ بھی نوٹ کر لیں کہ گزشتہ بارہ آیات میں اہلِ ایمان کو پانچ مرتبہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ میں مخاطب کیا گیا ہے۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ پورے مکّی قرآن میں يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کا صیغہ گویا ہے ہی نہیں۔ بہر حال اب اس مدنی سورت میں بھی خطاب کا رخ نوعِ انسانی کی طرف پھیرا جا رہا ہے:

آیات ۱۳ تا ۱۸

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا

۲۔ صحیح مسلم' کتاب البر والصلة' باب تحریم الغیبة' ح ۲۵۸۹۔

وَ لٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ اِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾ قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۶﴾ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾ ع

آیت ۱۳ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى﴾ ''اے لوگو! ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے ایک مرد اور ایک عورت سے''

تم میں سے چاہے کوئی مؤمن ہے یا کوئی کافر و مشرک لیکن تم سب آدمؑ اور حوا کی ہی اولاد ہو۔

﴿وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ﴾ ''اور ہم نے تمہیں مختلف قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا ہے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔''

ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کی بنا پر اگر تمام انسان ایک رنگ اور ایک جیسی شکل و صورت کے حامل ہوتے تو ان کی پہچان مشکل ہو جاتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو دوسرے سے مختلف بنایا ہے اور پھر انہیں رنگ، نسل، زبان وغیرہ کی بنیاد پر مختلف قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا ہے، تا کہ کروڑوں، اربوں انسانوں کی پہچان اور تعارف میں کسی سطح پر کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

یہاں دراصل اس اہم نکتے کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ انسانوں کے درمیان رنگ و نسل کا فرق اور اقوام و قبائل میں ان کی تقسیم، اعلیٰ و ادنیٰ کی تمیز و تفریق کے لیے نہیں بلکہ ان کی باہمی جان پہچان اور تعارف کے لیے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع میں اس مضمون کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی:

((يَا أَيُّهَا النَّاسُ! أَلَا إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ ، أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى أَعْجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ ، وَلَا لِأَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ وَلَا أَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ ، إِلَّا بِالتَّقْوٰى)) (۳)

''لوگو! آگاہ ہو جاؤ، یقیناً تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ خبردار! نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر۔ اور نہ کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر۔ فضیلت کی بنیاد صرف تقویٰ ہے۔''

ایچ جی ویلز (۱۸۶۶ء۔۱۹۴۶ء) اپنی کتاب ''A Concise History of the World'' میں حضور ﷺ کے خطبہ مبارک کے یہ الفاظ نقل کرنے کے بعد گھٹنے ٹیک کر آپؐ کو خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ چنانچہ عیسائی ہونے کے باوجود اُس نے لکھا ہے:

۳۔ مسند احمد، کتاب باقی مسند الانصار، باب حدیث رجل من اصحاب النبی، ح ۲۲۹۷۸۔ عن ابی نضرۃ رضی اللہ عنہ۔

''اگرچہ انسانی اخوت' مساوات اور حریت کے وعظ تو دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے تھے اور ایسے وعظ ہمیں مسیح ناصری کے ہاں بھی بہت ملتے ہیں' لیکن یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہ محمد (ﷺ) ہی تھے جنہوں نے تاریخ انسانی میں پہلی بار ان اصولوں پر ایک معاشرہ قائم کیا۔''

H.G.Wells کے اس تبصرے سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ حضور ﷺ کا بہت بڑا مداح تھا' بلکہ اُس نے اپنی اسی کتاب میں حضور ﷺ کی شخصیت پر بہت رکیک حملے بھی کیے ہیں۔ اس حوالے سے اس کا انداز سلمان رشدی ملعون سے ملتا جلتا ہے' لیکن اپنے تمام تر تعصب کے باوجود اُسے حضور ﷺ کے حوالے سے تاریخ کی یہ عظیم حقیقت تسلیم کرنا پڑی۔ مقامِ افسوس ہے کہ بعد کے ایڈیٹرز نے مصنف کے اس اعترافی بیان کو مذکورہ کتاب سے خارج کر دیا ہے۔ اس لیے مذکورہ اقتباس کی تصدیق کے خواہش مند حضرات کو کسی لائبریری سے اس کتاب کا کوئی پرانا ایڈیشن تلاش کرنا پڑے گا۔

﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ﴾ ''یقیناً تم میں سب سے زیادہ باعزت اللہ کے ہاں وہ ہے جو تم میں سب سے بڑھ کر متقی ہے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾﴾ ''یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا' ہر چیز سے باخبر ہے۔''

آیت ۱۴ ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ﴾ ''یہ بدو کہہ رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔''

﴿قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا﴾ ''(اے نبی ﷺ ان سے) کہہ دیجیے: تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو' بلکہ تم یوں کہو کہ ہم مسلمان (اطاعت گزار) ہو گئے ہیں''

''لَمْ تُؤْمِنُوْا'' میں نفی جحد بلَم کا نہایت مؤکد اسلوب ہے' یعنی یہاں مضارع سے پہلے لَمْ تاکیدی نفی کے لیے آیا ہے۔ چنانچہ ''لَمْ تُؤْمِنُوْا'' میں جو خاص تاکید پائی جاتی ہے وہ ''مَا آمَنْتُمْ'' جیسے الفاظ میں نہیں۔

﴿وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ ''اور ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

اس آیت میں جو نکتہ بیان ہوا ہے وہ اسلامی معاشرے کی رکنیت اور اسلامی ریاست کی شہریت کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے۔ ایمان دراصل ایک نظریے کا نام ہے جو دل کے اندر چھپا ہوتا ہے۔ دنیا میں کسی بھی طریقے یا ذریعے سے کسی شخص کے ایمان کی تصدیق یا تردید نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اسلامی معاشرے کے افراد یا اسلامی ریاست کے شہریوں کی قانونی حیثیت کا تعین ''اسلام'' کی بنیاد پر ہوگا نہ کہ ''ایمان'' کی بنیاد پر۔ البتہ آخرت میں اللہ کے ہاں ہر شخص کے معاملات کا فیصلہ ایمان کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ چنانچہ ہمارے ہاں مردم شماری کے فارم کے اندر مذہب کے خانے میں کسی کے لیے ''مسلم'' کا لفظ لکھ دینے سے متعلقہ شخص کو قانونی طور پر تو مسلمان تسلیم کر لیا جائے گا لیکن دنیا میں قانونی طور پر مسلمان بن جانے سے اللہ کے ہاں چھوٹ نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ تو ہر شخص کے دل میں ایمان کی کیفیت کو دیکھے اور پرکھے گا۔ جیسا کہ حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَاَمْوَالِكُمْ ، وَلٰكِنْ يَنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَاَعْمَالِكُمْ)) [۴] ''اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے اموال کو نہیں دیکھتا' بلکہ وہ تو تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے''۔ چنانچہ دُنیوی قانون کے تقاضوں اور نجاتِ اُخروی کے حوالے سے ایمان

۴۔ صحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب تحریم الظلم وخذله واحتقاره...

اور اسلام کے فرق کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

﴿وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ﴾ ''لیکن اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے رہو گے تو وہ تمہارے اعمال میں سے کچھ بھی کم نہیں کرے گا۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۴﴾ ''یقیناً اللہ بہت بخشنے والا' بہت مہربان ہے۔''

اگرچہ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق اعمال کا دارومدار ایمان پر ہے' یعنی جب تک کسی کے دل میں ایمان نہیں اللہ کے ہاں اُس کا کوئی عمل قابلِ قبول نہیں' لیکن اللہ تعالیٰ غفورٌ رحیم ہے' اُس نے اپنی شانِ غفاری و رحیمی کے طفیل تم لوگوں کو خصوصی رعایت عطا کی ہے' چنانچہ اگرچہ تم نے ایمان کا ابھی صرف زبانی اقرار ہی کیا ہے اور یہ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں راسخ نہیں ہوا پھر بھی اس اقرار کے بعد اگر تم لوگ اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو شرفِ قبولیت بخشتا رہے گا۔ اس حوالے سے یہ اہم قانونی اور اصولی نکتہ ضرور مدِنظر رہنا چاہیے کہ یہاں جس اطاعت کا ذکر ہے اس سے مراد کُلّی اطاعت ہے' کیونکہ ﴿اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۪﴾ (البقرۃ:۲۰۸) کے واضح حکم کے بعد اسلام میں جزوی داخلہ اور اللہ تعالیٰ کی جزوی اطاعت قابلِ قبول ہی نہیں۔

آیت زیر مطالعہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں ایمان کو اسلام سے علیحدہ کر دیا گیا ہے اور یہ قرآن مجید کا واحد مقام ہے جہاں مسلمانوں کے ایک گروہ کو واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ تا حال ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اس سے بعض لوگوں کو یہ مغالطہ بھی ہوا کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے' حالانکہ اس بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ منافقین کا تو کوئی عمل بھی اللہ کے ہاں قابلِ قبول نہیں' جبکہ یہاں متعلقہ لوگوں کو یقین دہانی کرائی جا رہی ہے کہ اگر تم لوگ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے رہو گے تو تمہارے اعمال میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ اس حکم کا درست مفہوم سمجھنے کے لیے ان حالات کے بارے میں جاننا ضروری ہے جن حالات میں یہ آیت نازل ہوئی۔

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو جزیرۃ العرب میں غلبہ عطا فرما دیا تو کُفار و مشرکین کے تمام قبائل پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اب ان میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رہی۔ دوسری طرف سورۃ التوبہ کی ابتدائی آیات میں ان کے لیے یہ الٹی میٹم بھی نازل ہو چکا تھا: ﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ﴾ (آیت ۵) ''اور جب یہ محترم مہینے گزر جائیں تو قتل کرو ان مشرکین کو جہاں پاؤ' اور پکڑو ان کو' اور گھیراؤ کرو ان کا' اور ان کے لیے ہر جگہ گھات لگا کر بیٹھو''۔ ۹ ہجری کے حج کے موقع پر یہ الٹی میٹم ہر خاص و عام تک پہنچا بھی دیا گیا تھا۔ اس کے بعد متعلقہ لوگوں کے پاس صرف چار ماہ کا وقت تھا۔ ان حالات میں ان قبائل کے پاس اطاعت قبول کرنے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ بچا ہی نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے یہی راستہ اپنایا اور حضور ﷺ کی اطاعت قبول کرنے کے لیے آپؐ کی خدمت میں اپنے اپنے وفد بھیجنے شروع کر دیے۔ اس طرح اس سال مدینہ میں وفود کا تانتا بندھ گیا۔ گویا ہر قبیلہ اسلامی حکومت کی اطاعت قبول کرنے اور اسلام میں داخل ہونے کے لیے دوسروں پر سبقت لے جانا چاہتا تھا۔ اس صورت حال کا نقشہ سورۃ النصر میں یوں دکھایا گیا ہے: ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝۱ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝۲﴾

اطاعت قبول کرنے والے ان لوگوں میں تین طرح کے افراد تھے۔ کچھ تو ظاہر ہے خلوصِ نیت سے ایمان لانے والے تھے اور کچھ منافق اور دھوکہ باز جو ہوا کا رخ دیکھ کر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرنے پر مجبور تھے۔ لیکن ان دو اقسام کے درمیان تیسری قسم کے کچھ لوگ بھی تھے' جن کے دلوں میں نہ تو دھوکے کی نیت تھی اور نہ ہی ایمان لانے کا سچا جذبہ تھا۔ یعنی وہ مثبت اور منفی دو انتہاؤں کے درمیان ''زیرو پوائنٹ'' پر کھڑے تھے۔ آیت زیر مطالعہ میں دراصل ان ہی لوگوں کا ذکر ہے۔ ان لوگوں کو نہ صرف اطمینان دلایا گیا کہ اگر تم لوگ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے رہو گے تو تمہارے اعمال میں کچھ کمی نہیں کی جائے گی' بلکہ آگے آیت ۷ میں انہیں خوشخبری بھی سنا دی گئی کہ اگر تم خلوصِ دل سے اطاعت کے اس راستے پر چلتے رہو گے تو تمہارے دلوں میں سچا اور حقیقی ایمان بھی پیدا ہو جائے گا۔

دراصل ایمانِ حقیقی اور عملِ صالح باہم لازم و ملزوم ہیں۔ ایک طرف دل میں ایمانِ حقیقی کی موجودگی اگر اعمالِ صالحہ کے صدور کا باعث بنتی ہے تو دوسری طرف اعمالِ صالحہ کی مداومت بھی ایمان کی تقویت کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہے۔ لیکن واضح رہے کہ اس حوالے سے ٹھوس نتائج کے لیے دل میں مضبوط ارادے اور نیت کا موجود ہونا ناگزیر ہے۔ یعنی دل میں پختہ نیت ہو کہ مجھے ایک سچا اور پکا مؤمن بننا ہے' مؤمن بن کر جینا ہے اور مؤمن کی حیثیت سے اس دنیا سے کوچ کرنا ہے۔ لیکن اس ضمن میں اس تلخ حقیقت کو بھی تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ آج کل کے ماحول میں اوّل تو ایسی نیت یا آرزو کا دل میں پیدا ہونا ہی مشکل ہے' اور اگر کسی دل میں یہ آرزو پیدا ہو ہی جائے تو اس کا زندہ رہنا محال ہے۔ کیونکہ آج کا معاشرہ اور خارج کا موجودہ ماحول ایسی مثبت سوچ کو غذا فراہم نہیں کرتا اور ظاہر ہے جس ماحول میں آکسیجن نہیں ہوگی وہاں کوئی تنفس کیسے زندہ رہ سکے گا۔ اقبالؔ نے اس صورت حال کو اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے: ؎

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!

بلکہ ہمارا موجودہ معاشرہ تو اس حوالے سے منفی کردار کے لیے غیر معمولی طور پر حساس اور فعّال ہے۔ ایسی کوئی آرزو کسی دل میں ابھی پوری طرح آنکھیں بھی نہیں کھولنے پاتی کہ ماحول کی تمام منفی قوتیں اپنے اپنے ہتھیار سجا کر اس جانِ ناتواں کے محاصرے کے لیے پہنچ جاتی ہیں۔ اس میں سب سے مؤثر کردار ''اپنوں'' کی ایسی نصیحتوں کا ہوتا ہے کہ دیکھو اپنے گھر بار کی بھی کچھ فکر کرو! کیوں تم اپنا بنا بنایا کیریئر تباہ کرنے پر تُل گئے ہو؟ کیا تمہیں اپنے مستقبل اور اپنے بیوی بچوں کا بھی خیال نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس دباؤ کا فطری اور منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ وہ ''نوزائیدہ آرزو'' لمحہ بہ لمحہ کمزور ہونے لگتی ہے اور بالآخر سسک سسک کر دم توڑ جاتی ہے' اِلّا یہ کہ کسی کے ارادے میں غیر معمولی خلوص و استقامت ہو اور اللہ کی خصوصی توفیق و نصرت بھی اس کے شاملِ حال ہو۔

بہر حال آیت زیر مطالعہ کے حوالے سے یہ بحث تو اسلام اور ایمان کے فرق سے متعلق تھی۔ لیکن اگر کوئی یہ جاننا چاہے کہ حقیقی مؤمن کسے کہتے ہیں تو وہ ''مؤمن'' کی اس تعریف (definition) کو اپنے پیش نظر رکھے جو اگلی آیت میں بیان کی گئی ہے۔ (اس مضمون کی وضاحت قبل ازیں سورۃ الانفال کی آیات ۲' ۳ اور ۷۴ کے ضمن میں بھی کی جا چکی ہے۔)

آیت ۱۵ ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا﴾ ''مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اُس کے رسولؐ پر' پھر شک میں ہرگز نہیں پڑے''

یعنی ایسے لوگوں کا ایمان اُن کے دلوں میں راسخ ہو کر یقین کی ایسی صورت اختیار کر گیا ہے کہ ان کے دلوں کے اندر شک کی کوئی گنجائش رہی ہی نہیں۔ جیسے قبل ازیں آیت ۷ میں صحابہؓ کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ ''لیکن (اے نبی ﷺ کے ساتھیو!) اللہ نے تمہارے نزدیک ایمان کو بہت محبوب بنا دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں کے اندر رچا بسا دیا ہے۔''

جب تک ایمان دل میں راسخ نہیں ہوا اور ابھی صرف زبان پر ہے (آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ...) تو یہ اسلام ہے۔ اسی لیے اسلام کی بنیاد جن پانچ چیزوں پر بتائی گئی ہے: (بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ... الحدیث) ان میں یقینِ قلبی شامل نہیں ہے' بلکہ نظریاتی طور پر صرف توحید و رسالت کی گواہی دے کر اور اس کے بعد نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج کا التزام کر کے اسلام کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ لیکن ایمان اس سے اوپر کی منزل ہے۔ گویا مذکورہ پانچ شرائط (پہلی شرط کا تعلق نظریے سے جبکہ باقی چار کا تعلق عمل سے ہے) پوری کر کے جو شخص ''مسلمان'' ہو گیا اُسے ''مؤمن'' بننے کے لیے کچھ اضافی شرائط بھی پوری کرنا ہوں گی اور آیت زیر مطالعہ کی رو سے یہ اضافی دو شرائط ہیں' یعنی ''شہادت'' کے ساتھ یقینِ قلبی (لَمْ يَرْتَابُوْا) کی کیفیت کا اضافہ ہو گا اور اعمال کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کا:

﴿وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''اور انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔''

﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝۱۵﴾ ''یہی لوگ ہیں جو (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔''

گویا کسی شخص کو ''حقیقی مؤمن'' بننے کے لیے مذکورہ ساتوں شرائط پوری کرنا ہوں گی۔ پہلی پانچ شرائط ''اسلام'' میں داخل ہونے کے لیے جبکہ آخری دو شرائط ''ایمان'' کی منزل حاصل کرنے کے لیے۔ اسلام اور ایمان کے اس فرق کو اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ ایک مؤمن لامحالہ ''مسلم'' تو ہو گا ہی لیکن ہر ''مسلم'' مؤمن نہیں ہو سکتا۔

اسلام اور ایمان کی اس بحث میں لائقِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ زبان سے: ''آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ...'' کا دعویٰ کرنا تو آسان ہے مگر دل میں حقیقی ایمان پیدا کرنا اور پھر اس ایمان کے تقاضے پورے کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنی ''ایمانی کیفیت'' کا جائزہ لیتا رہے۔ خصوصی طور پر اس حوالے سے یہ حقیقت تو ہمیں کسی لمحے بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ہم باطل نظام کے تحت زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس حالت میں اگر ہم اس نظام کو ذہنی طور پر قبول کر کے اس کی چاکری کرنا شروع کر دیں گے' یعنی اس نظام کے تحت اپنی معیشت کی ترقی اور اپنے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کی فکر میں لگ جائیں گے تو ایسی صورت میں ہمیں اپنے ایمان کی خیر لینے کی ضرورت ہو گی۔

دراصل کسی ملک یا معاشرے میں غلبۂ باطل کی صورت میں ایک بندۂ مؤمن کے لیے لازم ہے کہ وہ اس نظام کے تحت حالتِ احتجاج میں رہتے ہوئے زندگی بسر کرے۔ اور ((اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ))[۵] کے مصداق باطل نظام کے تحت وہ ایسے رہے جیسے ایک قیدی جیل کے اندر رہتا ہے۔ یعنی اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات پوری کرنے میں وہ اپنی کم سے کم توانائی صَرف کرے

۵۔ صحیح مسلم' کتاب الزھد' عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ' ح:۲۹۵۶۔

اوران ضروریات کو بھی کم سے کم معیار (subsistance level) پر رکھے جبکہ اپنا باقی وقت اور اپنی بہترین صلاحیتیں نظامِ باطل کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے اور اللہ کے دین کو غالب کرنے کی جدوجہد میں کھپا دے۔ ع ''گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں!'' اگر باطل نظام کے تحت رہتے ہوئے ایک مردِ مسلمان کی زندگی کے شب و روز کا نقشہ ایسا نہیں تو بے شک قانونی طور پر وہ اپنے ملک کا ایک مسلمان شہری ہے' اپنے مسلمان باپ کی وراثت کا حقدار ہے' مسلمان عورت سے شادی کر سکتا ہے اور اس طرح کے دوسرے تمام قانونی حقوق سے بھی مستفید ہو سکتا ہے' لیکن ایسا ''مسلمان'' اللہ کے ہاں ''مؤمن'' شمار نہیں ہو سکتا۔

اس آیت کے بارے میں یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ اس کا آغاز ''اِنَّمَا'' سے ہو رہا ہے اور آخر پر ''اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ'' کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی آیت کا آغاز بھی اسلوبِ حصر سے ہو رہا ہے اور اختتام پر بھی اسلوبِ حصر آیا ہے۔ اس اعتبار سے آیت کا مفہوم یوں ہوگا کہ مؤمن تو ہیں ہی صرف وہ لوگ جن کے دلوں میں ایمان نے ''یقین'' کی شکل اختیار کر لی اور پھر انہوں نے اپنے جان و مال کو اللہ کی راہ میں کھپا دیا۔ اور صرف یہی لوگ ہیں جو اپنے ایمان کے دعوے میں سچے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ' اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ۔ آمین' ثم آمین!

آیت کے آخر میں ان مؤمنین کو جو سرٹیفکیٹ (اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ) عطا ہوا ہے اس کی اہمیت کو سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۹ کی روشنی میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ سورۃ التوبہ کی مذکورہ آیت میں اہلِ ایمان کو صادقین کے ساتھ شامل ہونے (کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ) کا حکم دیا گیا ہے' جبکہ آیت زیر مطالعہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ ''صادقین'' کون ہیں۔ اس نکتے کو اس طرح سمجھیں کہ آیت زیر مطالعہ میں مؤمنین صادقین کی دو نشانیاں (ایمانِ حقیقی اور جہاد فی سبیل اللہ) ہماری راہنمائی کے لیے بتائی گئی ہیں کہ مسلمانو! اٹھو! اس ''چراغ'' کی روشنی میں ''مؤمنینِ صادقین'' کو تلاش کرو اور پھر ان کے مشن کی جدوجہد میں ان کے دست و بازو بن جاؤ! حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ میری اُمت میں سے ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((لَا یَزَالُ مِنْ اُمَّتِیْ اُمَّۃٌ قَائِمَۃٌ بِاَمْرِ اللّٰہِ ، لَا یَضُرُّھُمْ مَنْ خَذَلَھُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَھُمْ، حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰہِ وَھُمْ عَلٰی ذٰلِکَ)) [۶] ''میری اُمت میں سے ایک گروہ اللہ کے حکم کو قائم کرنے والا ہمیشہ موجود رہے گا۔ ان کا ساتھ چھوڑ دینے والے اور ان کی مخالفت کرنے والے ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے' یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ جائے گا' اور وہ اسی پر قائم ہوں گے''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''مؤمنین صادقین'' آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم انہیں تلاش کریں اور ﴿کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ﴾ کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے ان کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں' تاکہ ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ۭ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ﴾ (الفتح: ۲۹) کی طرز پر ایک مضبوط ''حزب اللہ'' تشکیل پا سکے۔ ظاہر ہے افراد کے اتحاد کے بغیر نہ تو کوئی جمعیت وجود میں آ سکتی ہے' نہ اقامتِ دین کی جدوجہد آگے بڑھ سکتی ہے اور نہ ہی ''اظہارِ دینِ حق'' کی شانِ تکمیلی کا ظہور ممکن ہو سکتا ہے۔

آیت ۱۶ ﴿قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰہَ بِدِیْنِکُمْ ۭ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ان سے کہیے: کیا تم اللہ کو جتلانا چاہتے ہو اپنا دین؟''

مثل مشہور ہے ''تھوتھا چنا باجے گھنا''۔ یعنی جو برتن خالی ہوگا وہ کھنکھنانے پر بھرے ہوئے برتن کی نسبت زیادہ آواز دے گا۔

۶۔ صحیح البخاری' کتاب المناقب' باب سؤال المشرکین ان یریھم النبی ﷺ آیۃ فاراھم انشقاق القمر' ح ۳۶۴۱۔

ان لوگوں کے دل چونکہ حقیقی ایمان سے خالی تھے اس لیے وہ اپنے ایمان کا بڑھ چڑھ کر پرچار کرتے تھے اور حضور ﷺ پر احسان دھرتے تھے کہ دیکھیں! ہم تو لڑے بھڑے بغیر اسلام لے آئے ہیں اس لیے اب ہمارے حقوق بھی زیادہ ہونے چاہئیں۔

﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ﴾ ''اور اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۶﴾﴾ ''اور اللہ تو ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

اگر حقیقی ایمان ان کے دلوں میں راسخ ہوتا تو انہیں یہ بھی یقین ہوتا کہ اللہ عالم الغیب ہے' دنیا و مافیہا کی ہر چیز اُس کے علم میں ہے' اس لیے اس کے سامنے کسی کو اپنے ایمان کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

آیت ۱۷ ﴿يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ پر احسان دھر رہے ہیں کہ وہ اسلام لے آئے ہیں!''

﴿قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ﴾ ''ان سے کہیے کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ دھرو۔''

﴿بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾﴾ ''بلکہ اللہ تم پر احسان دھرتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کے راستے پر ڈال دیا ہے' اگر تم سچے ہو۔''

اللہ تعالیٰ نے تمہیں توفیق دی کہ تم اسلام لے آئے۔ ابھی تم لوگ ایمان کے راستے پر آئے ہو۔ اگر تم اپنے اسلام کے دعوے میں سچے ہو گئے' نماز کی پابندی کرو گے' رمضان کے روزے رکھو گے' زکوٰۃ ادا کرو گے اور اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرو گے تو ان اعمال کی نورانیت سے تمہارے دلوں کے اندر ایمان بھی پیدا ہو جائے گا۔ اس آیت میں اسلام اور ایمان کا فرق بہت واضح ہو گیا ہے۔ متعلقہ لوگوں کے دعوے کے حوالے سے یہاں دو دفعہ اسلام کا لفظ آیا ہے۔ لیکن بعد میں جب اللہ کی توفیق کے حوالے سے بات ہوئی ہے تو ایمان کا ذکر کیا گیا ہے: ﴿بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ﴾ یعنی یہ تو اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اُس نے تمہیں اسلام لانے کی توفیق دی اور یوں اُس نے تمہیں ایمان کی شاہراہ پر ڈال دیا۔ اگر تم صدقِ دل سے اسلام لائے ہو تو یہ شاہراہ ضرور تمہیں ایمان کی منزل تک لے جائے گی۔ لیکن اگر تم منافق ہو یا صرف جان بچانے کے لیے اسلام کی پناہ میں آئے ہو تو قانونی طور پر بے شک تمہارا شمار مسلمانوں میں ہو جائے گا لیکن اللہ کے ہاں نہ تمہارا اسلام قبول ہو گا اور نہ ایمان۔

جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہوا ہے' اس ضمن میں قانون یہی ہے کہ جو کوئی بھی زبان سے توحید و رسالت کی گواہی دے کر مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے گا اسے مسلمان تسلیم کر لیا جائے گا۔ اسی قانون کے تحت غزوۂ تبوک تک تمام منافقین کو بھی مسلمان تسلیم کیا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ حضور ﷺ نے رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کی نماز جنازہ بھی پڑھائی۔ البتہ غزوۂ تبوک کے بعد ان کی منافقت کا پردہ چاک کیا گیا اور ان کی بنائی ہوئی مسجد (مسجد ضرار) بھی گرا دی گئی۔

آیت ۱۸ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾﴾ ''یقیناً اللہ جانتا ہے آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزیں۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اُسے بھی دیکھ رہا ہے۔''

سُوْرَۃُ قٓ

تمہیدی کلمات

سورۂ قٓ سے مکّی مدنی سورتوں کے چھٹے گروپ اور ساتویں (آخری) منزل کا آغاز ایک ساتھ ہو رہا ہے۔ اس اعتبار سے یہ مقام بھی گویا قِران السَّعدین ہے۔ قبل ازیں سورۂ یونس کے آغاز کو بھی میں نے اس لحاظ سے قِران السَّعدین قرار دیا تھا کہ وہاں پر بھی مکّی مدنی سورتوں کے نئے گروپ اور نئی منزل کا آغاز ایک ساتھ ہوتا ہے' بلکہ وہاں تو سورتوں کے گروپ اور منزل کے اعداد بھی برابر ہیں۔ یعنی سورۂ یونس کے آغاز کے ساتھ مکّی مدنی سورتوں کا تیسرا گروپ اور تیسری منزل ایک ساتھ شروع ہوتے ہیں' جبکہ یہاں پر مکّی مدنی سورتوں کے چھٹے گروپ اور ساتویں منزل کا آغاز ایک ساتھ ہوتا ہے۔

یہاں ضمنی طور پر منازل (احزاب) کی تقسیم کے بارے میں بھی چند اہم نکات نوٹ کر لیجیے۔ اس ضمن میں یاد رکھنے کا پہلا نکتہ یہ ہے کہ یہ تقسیم ہفتے کے سات دنوں کے حساب سے کی گئی ہے تاکہ اگر کوئی شخص ایک ہفتے میں قرآن مجید ختم کرنا چاہے تو وہ ہر روز ایک منزل (حزب) تلاوت کر لے' جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے اکثر حضرات نے رات کے نوافل میں تلاوت کا یہی معمول اپنا رکھا تھا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ تمام منازل میں قرآن کی مقدار بالکل برابر نہیں بلکہ تقریباً برابر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منازل خالصتاً سورتوں کے حساب سے بنائی گئی ہیں اور مقدار برابر کرنے کے لیے پاروں کی تقسیم کی طرح سورتوں کو تقسیم نہیں کیا گیا۔ اس حوالے سے تیسری اہم بات یہ ہے کہ منازل کی تقسیم میں سورتوں کی تعداد کے اعتبار سے ایک خاص ''حسنِ ترتیب'' پایا جاتا ہے۔ یعنی پہلی منزل میں تین سورتیں ہیں (اس گنتی میں سورۃ الفاتحہ شامل نہیں کہ وہ قرآن حکیم کے لیے بمنزلہ مقدمہ کے ہے اور سورۃ الحجر کی آیت ۸۹ کی رو سے خود ایک قرآن ہے)' دوسری منزل میں پانچ سورتیں' تیسری منزل میں سات' چوتھی میں نو' پانچویں میں گیارہ' چھٹی میں تیرہ' جب کہ ساتویں منزل میں پینسٹھ سورتیں شامل ہیں (۶۵ کا عدد ۱۳ کا حاصل ضرب ہے)۔ گویا منزل بہ منزل سورتوں کی تعداد میں ایک خاص ''عددی نسبت'' کارفرما ہے جس کی وجہ سے اعداد کی ایک خوبصورت سیڑھی بنتی نظر آتی ہے۔ اور چوتھا اہم نکتہ یہ کہ ساتویں یا آخری منزل میں چونکہ سورتوں کی تعداد زیادہ ہے اس لیے اس منزل کو ''حزبِ مفصّل'' بھی کہا جاتا ہے۔

مکّی مدنی سورتوں کا چھٹا گروپ جس کا آغاز سورۂ قٓ سے ہو رہا ہے' سات مکّی (سورۂ قٓ تا سورۃ الواقعہ) اور دس مدنی (سورۃ الحدید تا سورۃ التحریم) سورتوں پر مشتمل ہے۔ اس گروپ میں مکّی اور مدنی قرآن کا حجم تقریباً برابر ہے۔ یعنی سورۂ قٓ سے سورۃ الواقعہ تک مکّی قرآن کا حجم تقریباً ایک پارے کے برابر ہے' جبکہ سورۃ الحدید سے سورۃ التحریم تک مدنی قرآن تقریباً سوا پارے کے برابر ہے' اس کے بعد مکّی مدنی سورتوں کا ساتواں اور آخری گروپ زیادہ تر مکّی قرآن پر مشتمل ہے۔ مکّی اور مدنی قرآن کے حجم کے اعتبار سے سورتوں کے پہلے دو گروپس اور آخری دو گروپس میں باہم ایک بہت خوبصورت ''مناسبت'' پائی جاتی ہے۔ اس مناسبت کو یوں

سمجھیں کہ جس طرح پہلا گروپ تقریباً تمام تر مدنی قرآن پر مشتمل ہے (اس میں صرف سورۃ الفاتحہ مکّی ہے' باقی سورۃ البقرۃ تا سورۃ المائدۃ تقریباً سوا چھ پارے مدنی قرآن ہے) اسی طرح آخری گروپ اکثر و بیشتر مکّی قرآن پر مشتمل ہے (اس گروپ میں بالاتفاق تو صرف آخری دو سورتوں یعنی ''معوّذتین'' کو ہی مدنی مانا گیا ہے)۔ پھر جس طرح دوسرا گروپ مکّی اور مدنی قرآن کے حجم کے اعتبار سے متوازن ہے (اس گروپ میں سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف دو مکّی سورتیں ہیں' جبکہ سورۃ الانفال اور سورۃ التوبہ دو ہی مدنی سورتیں ہیں) اسی طرح آخری سے پہلا یعنی چھٹا گروپ بھی اس لحاظ سے متوازن ہے کہ اس میں تقریباً ایک پارہ مکّی قرآن (سورۂ قٓ تا سورۃ الواقعہ) اور تقریباً سوا پارہ مدنی قرآن (سورۃ الحدید تا سورۃ التحریم) ہے۔

چھٹے گروپ کی مکّی سورتوں کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ لسانی اور ادبی محاسن کے اعتبار سے قرآن مجید کا خوبصورت ترین حصّہ ان سورتوں پر مشتمل ہے۔ قرآن کا مخصوص صوتی آہنگ جسے میں Divine Music سے تعبیر کرتا ہوں' ان سورتوں میں تیز ردھم کے ساتھ اپنے عروج پر دکھائی دیتا ہے' جبکہ چھوٹی چھوٹی آیات میں خوبصورت الفاظ نگینوں کی طرح چمکتے دمکتے نظر آتے ہیں۔ ان ہی سورتوں میں سورۃ الرحمٰن بھی شامل ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے ''عروس القرآن'' (قرآن کی دلہن) قرار دیا ہے۔ بہرحال فصاحت' بلاغت اور ادبی خوبیوں کے اعتبار سے ان سورتوں کو قرآن کے ذروۂ سنام (climax) کا درجہ حاصل ہے۔ ان میں سورۂ قٓ بہت جامع اور اپنے مزاج کے اعتبار سے منفرد سورت ہے۔ باقی چھ سورتیں باہم جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ یعنی سورۃ الذاریات اور سورۃ الطور کا جوڑا' سورۃ النجم اور سورۃ القمر (ان میں چاند اور ستارے کی نسبت بھی ہے) کا جوڑا' اور سورۃ الرحمٰن اور سورۃ الواقعہ کا جوڑا۔

زیر مطالعہ (آخری) منزل کی مکّی سورتوں (سورۂ قٓ سے آخر تک) سے متعلق دو باتیں جو قبل ازیں بھی کئی مرتبہ دہرائی جا چکی ہیں یہاں موقع کی مناسبت سے ایک دفعہ پھر سے ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ پہلی بات یہ کہ یہ تمام سورتیں حضور ﷺ کے مکّی دور کے ابتدائی چار برسوں میں نازل ہوئی ہیں اور دوسری یہ کہ ان سورتوں کا مرکزی مضمون ''انذارِ آخرت'' ہے۔ اس حوالے سے یہ نکتہ بھی مدِّنظر رہنا چاہیے کہ حضور ﷺ کو دعوت و تبلیغ کے ضمن میں جو پہلا حکم ملا تھا وہ انذار کا تھا۔ سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات کے نزول کے ساتھ حضور ﷺ کی نبوت کا ظہور ہوا۔ ان آیات میں کوئی حکم نہیں آیا تھا۔ اس کے بعد حضور ﷺ کو پہلا حکم سورۃ المدثر کی ان آیات میں دیا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲﴾ ''اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے! اب اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ اور لوگوں کو خبردار کرو''۔ یعنی لوگوں کو یاد دلاؤ کہ ان کی دنیوی زندگی ہی بس اصل زندگی نہیں ہے کہ وہ کھائیں' پئیں' عیش کریں اور اس دنیا سے چلے جائیں' بلکہ انہیں اللہ تعالیٰ نے ایک خاص مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور جس اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے اُسی نے یہ کائنات پیدا کی ہے۔ نہ تو یہ کائنات ہمیشہ رہنے والی ہے اور نہ ہی کسی انسان کی زندگی دائمی ہے۔ انسانی زندگی کی مہلت محدود مدّت کے لیے ہے۔ ایک وقت آئے گا جب یہ دنیا ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ ہو کر اپنے خالق و مالک کے حضور پیش ہونا ہے اور دنیوی زندگی کے حوالے سے ایک بے لاگ محاسبے کا سامنا کرنا ہے۔ اسی محاسبے کے بعد سزا یا جزا کا فیصلہ ہونا ہے۔ اس حوالے سے قرآن حکیم میں اس حقیقت کو بار بار دہرایا گیا ہے کہ جن لوگوں کے دل آخرت سے غافل ہیں ان پر اس ''انذار'' کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ غالبؔ کا یہ شعر گویا انہی لوگوں کی ذہنی کیفیت کا ترجمان ہے: ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

اسی وجہ سے قرآن حکیم میں ''انذارِ آخرت'' پر خصوصی زور دیا گیا ہے اور اسی وجہ سے ''عقیدۂ آخرت'' کے لیے صرف ''ایمان'' کے لفظ کو کافی نہیں سمجھا گیا۔ یعنی جہاں دوسرے عقائد کے لیے ''ایمان'' کا مطالبہ ہے وہاں ''آخرت'' کے لیے عام طور پر یقین (حقیقی ایمان) کا مطالبہ کیا گیا ہے: ﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴﴾ (البقرۃ)۔ عقیدۂ آخرت کی ایک خصوصی اہمیت یہ بھی ہے کہ انسان کی سیرت اور شخصیت کے اندر عملی اعتبار سے حقیقی مثبت تبدیلی اسی عقیدے کی بنا پر آتی ہے۔ بہرحال چھٹے اور ساتویں گروپ یعنی آخری منزل کی مکی سورتوں کا مرکزی مضمون ''انذارِ آخرت'' ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ان میں بہت مختصر انداز میں ''انباء الرسل'' کا تذکرہ بھی ہے اور مکی سورتوں کے عمومی مضامین کی جھلکیاں بھی۔

آیات ۱ تا ۱۵

سُوْرَةُ قٓ مَكِّيَّةٌ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اٰيَاتُهَا: ۴۵ — رُكُوْعَاتُهَا: ۳

قٓ ۟ وَ الْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝۱ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ
عَجِيْبٌ ۝۲ ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝۳ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ
مِنْهُمْ ۚ وَ عِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ۝۴ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ۝۵
اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَ زَيَّنّٰهَا وَ مَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝۶ وَ الْاَرْضَ
مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝۷ تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰى لِكُلِّ
عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝۸ وَ نَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّ حَبَّ الْحَصِيْدِ ۝۹ وَ النَّخْلَ
بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۝۱۰ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَ اَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۭ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۝۱۱
كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ اَصْحٰبُ الرَّسِّ وَ ثَمُوْدُ ۝۱۲ وَ عَادٌ وَّ فِرْعَوْنُ وَ اِخْوَانُ لُوْطٍ ۝۱۳ وَّ
اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَ قَوْمُ تُبَّعٍ ۭ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ۝۱۴ اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ۭ
بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝۱۵ ع ۱

آیت ۱ ﴿قٓ ۟ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝۱﴾ ''ق، قسم ہے عظیم الشان قرآن کی۔''

قرآن کی تین سورتیں ایسی ہیں جن کے آغاز میں صرف ایک ایک حرفِ مقطعہ ہے۔ ان میں سورۂ قٓ کے علاوہ تیئسویں پارے کی سورۂ صٓ اور انتیسویں پارے کی سورۃ القلم (سورۂ نٓ) شامل ہیں۔ بہت سی دوسری سورتوں کے آغاز کی طرح اس سورت کے آغاز میں بھی قرآن مجید کی قسم کا مُقسَم علیہ محذوف ہے۔ بہرحال چونکہ سورۂ یٰسٓ کے آغاز میں قرآن حکیم کی قسم کا مُقسَم علیہ موجود ہے اس لیے اس قسم کا مُقسَم علیہ بھی وہی ہوگا' یعنی ﴿اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۳﴾ (یٰسٓ)۔ چنانچہ اس آیت کا مفہوم یوں ہوگا کہ (اے محمد ﷺ) قسم ہے اس عظیم الشان قرآن کی' بے شک آپ مرسلین میں سے ہیں۔ اس قسم کے فوراً بعد دوسری آیت میں حضور ﷺ کا تعارف انذارِ آخرت کے حوالے سے کرایا گیا ہے جو اس سورت کا مرکزی مضمون ہے۔

آیت ۲ ﴿بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ﴾ ''بلکہ انہیں بہت عجیب محسوس ہوا ہے کہ ان کے پاس آیا ہے ایک خبردار کرنے والا ان ہی میں سے''

مُنْذِر کے معنی ہیں: انذار کرنے والا' خبردار (warn) کرنے والا۔

﴿فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝۲﴾ ''تو کافروں نے کہا یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے۔''

آیت ۳ ﴿ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ﴾ ''کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے (تو ہم پھر سے زندہ کیے جائیں گے؟)''

﴿ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝۳﴾ ''یہ لوٹایا جانا تو بہت دور کی بات ہے۔''

مر کر مٹی ہو جانے کے بعد ہمارا دوبارہ زندہ ہونا بالکل انہونی سی بات ہے' یہ بعید از قیاس دعویٰ کر کے یہ صاحب بہت دُور کی کوڑی لائے ہیں۔

آیت ۴ ﴿قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ﴾ ''ہم خوب جانتے ہیں کہ زمین ان میں سے کیا چیز کم کرتی ہے۔''

''ہم'' کے صیغے کے ساتھ یہ شاہانہ اندازِ بیان ہے۔ انسانوں کے دفن ہونے کے بعد زمین ان کے جسموں کے ساتھ کیا معاملہ کرتی ہے' ہر انسان کا کون سا عضو کیسے ضائع ہوتا ہے اور پھر ان کے اجزاء کس کس صورت میں کہاں کہاں جاتے ہیں' ہمیں ایک ایک چیز کا علم ہے۔

﴿وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ۝۴﴾ ''اور ہمارے پاس تو ایک محفوظ رکھنے والی کتاب بھی موجود ہے۔''

ہمارے پاس ایک ایک چیز کا ریکارڈ موجود ہے۔ ان کے جسموں کو ہم نے مٹی سے پیدا کیا تھا اور ان کی موت کے بعد ان کے تمام اجزاء کو ہم مٹی میں ہی محفوظ رکھتے ہیں۔ قیامت کے دن اسی مٹی سے ہم انہیں نکال لیں گے: ﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۝۵۵﴾ (طٰہٰ)۔ اس کے علاوہ ان کے ایک ایک عمل کی پوری تفصیل بھی ہم نے لکھ رکھی ہے اور ان کی ارواح بھی ہمارے پاس عِلِّیّین یا سِجِّین میں موجود ہیں۔ غرض ان کی کوئی چیز بھی ہمارے علم یا قبضے سے باہر نہیں ہے۔

آیت ۵ ﴿بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ﴾ ''بلکہ انہوں نے جھٹلا دیا حق کو جب کہ وہ ان کے پاس آیا''

﴿فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ۝۵﴾ ''سو اب وہ ایک بڑی اُلجھن میں مبتلا ہو گئے ہیں۔''

ایک طرف تو جواب دہی اور احتساب کی باتیں ماننے کے لیے ان کی طبیعتیں آمادہ نہیں اور دوسری طرف اس بارے میں قرآن کی زبان میں حضور ﷺ کے دلائل ایسے قوی ہیں کہ انہیں جھٹلانا ان کے لیے ممکن نہیں۔ بس یہی اُلجھن ہے جس میں یہ لوگ پھنس چکے ہیں۔ اس کائنات کی ایک ایک چیز اس حقیقت پر گواہ ہے اور اس کا مربوط و مستحکم نظام بھی زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس کا خالق ایک علیم و حکیم ہستی ہے۔ پھر انسان کے اندر پائی جانے والی ''اخلاقی حس'' بھی اس کے اچھے بُرے اعمال کے ٹھوس اور حتمی نتائج کا تقاضا کرتی ہے جس کے لیے ایک دوسری زندگی کی ضرورت ہے۔ ان تمام حقائق و شواہد کی موجودگی میں ایک صاحبِ عقل اور ذی شعور انسان کیسے کہہ سکتا ہے کہ یہ کائنات بس ''رام کی لیلا'' ہے اور انسان کی اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی نہیں ہے۔ چنانچہ منکرینِ آخرت کے لیے ان حقائق کو تسلیم کیے بغیر چارہ بھی نہیں' لیکن ان کی طبیعتیں ہیں کہ احتساب کے لیے تیار بھی نہیں۔ یہ انسان کی وہی نفسیاتی اُلجھن ہے جس کا ذکر غالبؔ نے اس شعر میں کیا ہے جو میں نے ابھی آپ کو سنایا ہے: ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

ان لوگوں کے قلوب واذہان میں منفی خیالات ونظریات اس قدر راسخ ہو چکے ہیں کہ اب ان سے پیچھا چھڑانا ان کے لیے ممکن نہیں رہا۔ دراصل انسان اپنے لڑکپن کی عمر میں جن عقائد ونظریات کا اثر قبول کرتا ہے وہ ساری عمر کے لیے اس کی شخصیت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ انسان کی اس کمزوری کا نقشہ ایک انگریزی نظم The Cage میں بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں دکھایا گیا ہے۔ یہ نظم میں نے اپنے انٹرمیڈیٹ کے زمانے میں پڑھی تھی۔ اس نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنی ان عادات کے ''پنجرے'' کا قیدی ہے جنہیں وہ لڑکپن کی عمر میں ایک ایک کر کے اپناتا ہے۔ گویا اس پنجرے کی سلاخیں اپنے لیے وہ خود تیار کرتا ہے۔ بقول شاعر:

"I built these bars when I was young"

''اس پنجرے کی سلاخیں میں نے اس وقت تیار کی تھیں جب میں جوان تھا''۔ جوانی میں انسان کے قویٰ مضبوط ہوتے ہیں۔ اس وقت وہ جو کچھ سیکھتا ہے وہ اس کے ذہن پر نقش کالحجر بن جاتا ہے اور پھر اپنی باقی عمر وہ ان عادات ونظریات کا قیدی بن کر پنجرے میں قید پرندے کی مانند گزار دیتا ہے۔ چنانچہ یہ منکرینِ آخرت بھی اپنے غلط عقائد ونظریات کے خود ساختہ پنجروں کے قیدی ہیں۔ ان پنجروں کی سلاخیں وہ اس قدر مضبوط کر چکے ہیں کہ اب انہیں توڑ کر باہر نکلنا ان کے لیے ممکن نہیں رہا۔

آیت ۶ ﴿اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝۶﴾ ''تو کیا انہوں نے دیکھا نہیں آسمان کی طرف جو ان کے اوپر ہے کہ ہم نے اسے کیسے بنایا ہے اور کیسے اسے مزین کیا ہے اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے۔''

اس آیت کی کماحقہٗ تشریح تو کوئی ماہرِ فلکیات ہی کر سکتا ہے۔ بہرحال آج کا انسان خوب جانتا ہے کہ ستاروں' سیاروں اور کہکشاؤں کا نظام بہت محکم ومربوط ہے اور یہ کہ اس نظام میں کسی رخنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

آیت ۷ ﴿وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ﴾ ''اور زمین کو ہم نے پھیلا دیا ہے اور ہم نے اس میں لنگر ڈال دیے ہیں''

ماہرینِ طبقات الارض (Geologists) بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ زمین کی گردش کے دوران اس کا توازن (isostacy) برقرار رکھنے میں پہاڑوں کا انتہائی اہم کردار ہے۔

﴿وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝۷﴾ ''اور ہم نے اس میں ہر طرح کی بڑی ہی رونق والی چیزیں (جوڑوں کی شکل میں) پیدا کر دیں۔''

آیت ۸ ﴿تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝۸﴾ ''(یہ اللہ کی نشانیاں ہیں) سمجھانے اور یاد دہانی کرانے کو ہر اُس بندے کے لیے جو رجوع رکھے ہوئے ہو۔''

عَبْدٍ مُّنِيْبٍ سے ایسا بندہ مراد ہے جس کی روح اور فطرت کا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف ہو۔ مطلب یہ کہ اگر کسی انسان کی فطرتِ سلیم اور روح زندہ ہو تب ہی یہ ''بصائر'' اس کے لیے مفید ہوں گے۔ ایسی صورت میں اسے کائنات میں بکھری اللہ کی نشانیاں نظر بھی آئیں گی اور ان نشانیوں سے اس کے دل میں خالق حقیقی کی ''یاد'' بھی تازہ ہوتی رہے گی۔ لیکن اگر کسی انسان کی فطرت مسخ اور روح

مردہ ہو چکی ہو تو اس کا ''دیکھنا'' اور ''سننا'' اس کے لیے ہرگز مفید نہیں ہوگا۔

سورۃ الغاشیہ کی ان آیات کا انداز بھی اس حوالے سے بہت بصیرت افروز ہے:

﴿اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ﴿۱۸﴾ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ﴿۱۹﴾ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ﴿۲۰﴾﴾

''کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں اونٹوں کو کہ کیسے پیدا کیے گئے ہیں؟ اور آسمان کو کہ کیسے بلند کیا گیا ہے؟ اور پہاڑوں کو کہ کیسے گاڑ دیے گئے ہیں؟ اور زمین کو کہ کیسے بچھا دی گئی ہے؟''

یعنی پوری کائنات میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں موجود ہیں' جو انسان کو قدم قدم پر یاد دلاتی ہیں کہ ہر چیز کا خالق اور صورت گر وہی ہے: ﴿هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ (الحشر:۲۴) ''وہی ہے اللہ' پیدا کرنے والا' وجود بخشنے والا' صورتیں بنانے والا' تمام اچھے نام اُسی کے ہیں۔''

اقبال نے ''آیاتِ خداوندی'' کے مشاہدے کی دعوت ان الفاظ میں دی ہے: ؎

کھول آنکھ' زمیں دیکھ' فلک دیکھ' فضا دیکھ　　مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

آیت ۹ ﴿وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا﴾ ''اور ہم نے آسمان سے اُتارا برکت والا پانی''

لفظ ''برکت'' میں کسی چیز کی خفتہ صلاحیت کو ترقی دینے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ قبل ازیں بھی متعدد بار وضاحت ہو چکی ہے کہ بارش کا پانی زمین کی قوتِ نمو کو جلا بخشتا ہے اور اس کی روئیدگی کو اجاگر کرنے کا باعث بنتا ہے اور اسی پہلو سے یہ مبارک ہے۔

﴿فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِیْدِ ﴿۹﴾﴾ ''تو ہم نے اُگایا اس کے ذریعے سے باغات کو اور ان فصلوں کو جو کٹ جاتی ہیں۔''

الفاظ کی یہ ترتیب منطقی اور بہت خوبصورت ہے۔ جَنّٰت سے درختوں کے باغات مراد ہیں اور درختوں کو کاٹا نہیں جاتا' صرف ان کے پھل اُتارے جاتے ہیں۔ دوسری طرف اناج کی فصل (جیسے گندم کی فصل) پودوں سمیت کاٹ لی جاتی ہے' اس لیے اس کے لیے حَبَّ الْحَصِیْدِ کی ترکیب آئی ہے۔

آیت ۱۰ ﴿وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِیْدٌ ﴿۱۰﴾﴾ ''اور کھجوروں کے بلند و بالا درخت جن کے خوشے ہیں تہ برتہ۔''

آیت ۱۱ ﴿رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْیَیْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا ؕ﴾ ''یہ سب رزق ہے بندوں کے لیے' اور اسی (پانی) سے ہم زندہ کر دیتے ہیں مُردہ زمین کو۔''

﴿كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ﴿۱۱﴾﴾ ''اسی طریقے سے نکلنا ہوگا (تمہارا بھی)۔''

جس طرح بارش کے پانی کے باعث خشک اور بنجر زمین سے طرح طرح کی نباتات اُگ آتی ہیں اسی طرح تم بھی ہمارے حکم سے زندہ ہو کر زمین سے نکل آؤ گے۔

آیت ۱۲ ﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ ﴿۱۲﴾﴾ ''جھٹلایا تھا ان سے پہلے بھی نوحؑ کی قوم نے' کنویں والوں نے اور قومِ ثمود نے۔''

یہ انباء الرسل کا تذکرہ ہے لیکن انتہائی مختصر انداز میں۔

آیت ۱۳ ﴿وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ ﴿۱۳﴾﴾ ''اور قومِ عاد' فرعون اور لوطؑ کے بھائیوں نے۔''

آیت ۱۴ ﴿وَّاَصْحٰبُ الْاَیْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ؕ﴾ ''اور بَن والوں اور قومِ تُبّع نے۔''

بَن والوں سے یہاں اہلِ مدین مراد ہیں جن کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ ''تُبّع'' شاہانِ یمن کا لقب تھا۔ قبل ازیں سورۃ الدخان کی آیت ۳۷ میں بھی ہم قومِ تُبّع کا ذکر پڑھ آئے ہیں ۔

﴿كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِیْدِ ﴿۱۴﴾﴾ ''ان سب نے رسولوں کو جھٹلایا تو وہ مستحق ہو گئے میری وعید کے۔''

پیغمبروں کو جھٹلا کر وہ لوگ عذاب کی وعیدوں کے مصداق بن گئے۔

آیت ۱۵ ﴿اَفَعَیِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ؕ﴾ ''تو کیا ہم پہلی مرتبہ پیدا کر کے عاجز آ گئے ہیں!''

کیا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہماری تخلیقی صلاحیتیں (creative potential) اب ختم ہو کر رہ گئی ہیں اور اب ہم انہیں دوبارہ پیدا نہیں کر سکیں گے۔ یہی مضمون سورۃ الاحقاف میں اس طرح آیا ہے:

﴿اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ یَعْیَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنْ یُّحْیِۦَ الْمَوْتٰی ؕ بَلٰۤی اِنَّهٗ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۳۳﴾﴾

''کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق فرمائی اور ان کی تخلیق سے تھکا نہیں' وہ اس پر قادر ہے کہ مُردوں کو زندہ کر دے! کیوں نہیں' یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

﴿بَلْ هُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ﴿۱۵﴾﴾ ''بلکہ یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں نئی تخلیق سے متعلق۔''

ہماری خلاقی کی قدرت میں تو کوئی کمی نہیں آئی' البتہ یہ لوگ اپنے ذہنوں کی تنگی کی وجہ سے پریشان ہیں اور مبتلائے شک ہیں کہ انہیں مرنے کے بعد دوبارہ کیسے زندہ کر لیا جائے گا!

آیات ۱۶ تا ۳۵

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚۖ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ﴿۱۶﴾ اِذْ یَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الْیَمِیْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ ﴿۱۷﴾ مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ ﴿۱۸﴾ وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِیْدُ ﴿۱۹﴾ وَ نُفِخَ فِی الصُّوْرِ ؕ ذٰلِكَ یَوْمُ الْوَعِیْدِ ﴿۲۰﴾ وَ جَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّ شَهِیْدٌ ﴿۲۱﴾ لَقَدْ كُنْتَ فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ ﴿۲۲﴾ وَ قَالَ قَرِیْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَیَّ عَتِیْدٌ ﴿۲۳﴾ اَلْقِیَا فِیْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِیْدٍ ﴿۲۴﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ مُعْتَدٍ مُّرِیْبِ ﴿۲۵﴾ الَّذِیْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِیٰهُ فِی الْعَذَابِ الشَّدِیْدِ ﴿۲۶﴾ قَالَ قَرِیْنُهٗ رَبَّنَا مَاۤ اَطْغَیْتُهٗ

وَ لٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۲۶﴾ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَ قَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ﴿۲۸﴾ مَا
يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۲۹﴾ يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ وَتَقُوْلُ
هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ﴿۳۰﴾ وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ ﴿۳۱﴾ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ
حَفِيْظٍ ﴿۳۲﴾ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَ جَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِ ﴿۳۳﴾ ادْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ
الْخُلُوْدِ ﴿۳۴﴾ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَ لَدَيْنَا مَزِيْدٌ ﴿۳۵﴾

آیت ۱۶ ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ﴾ ''اور ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم خوب جانتے ہیں جو اُس کا نفس وسوسے ڈالتا ہے۔''

یہ اُس قوتِ شر کا ذکر ہے جو انسان کے اندر ہے۔ نفسِ انسانی کے شر کا ذکر سورۂ یوسف میں یوں آیا ہے: ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۳﴾﴾ ''اور میں اپنے نفس کو بری قرار نہیں دیتا' یقیناً (انسان کا) نفس تو بُرائی ہی کا حکم دیتا ہے سوائے اُس کے جس پر میرا ربّ رحم فرمائے۔ یقیناً میرا ربّ بہت بخشنے والا' نہایت رحم کرنے والا ہے''۔ فطری طور پر انسان کے اندر داعیہ خیر بھی ہے اور داعیہ شر بھی۔ انسان کی اندرونی قوتِ شر کو سورۂ یوسف کی اس آیت میں ''نفسِ اَمّارہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ فرائیڈ اسے id یا libido کہتا ہے۔ دوسری طرف انسان کے اندر خیر کی قوت اس کی روح ہے جس کا مسکن قلبِ انسانی ہے۔ انسان کی روح اسے بلندی کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔ اس داعیہ یا قوت کو فرائیڈ super ego کا نام دیتا ہے' یعنی ego (انسانی انا) کا اعلیٰ درجہ۔ فرائیڈ کے دیے ہوئے یہ عنوانات تو کسی حد تک ہمارے لیے قابلِ قبول ہیں' لیکن ان عنوانات کی تشریح جو اُس نے کی ہے اسے ہم درست نہیں سمجھتے۔ اس کی وجہ وہی ہے جو اس حوالے سے کئی مرتبہ پہلے بھی بیان ہو چکی ہے کہ مغربی سائنسدان اور فلاسفر سب کے سب ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ وہ صرف ''عالمِ خلق'' یعنی اسباب و علل کی دنیا سے واقف ہیں اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ مادی دنیا کے اَسرار و رموز کو وہ خوب سمجھتے ہیں۔ اس میدان میں انہوں نے تحقیق و تفتیش کے ایسے معیار قائم کیے ہیں کہ انسانی عقل واقعی دنگ رہ جاتی ہے۔ لیکن دوسری طرف ''عالمِ امر'' کے بارے میں وہ بالکل اندھے اور کورے ہیں۔ یعنی ان کے ہاں روح' وحی اور فرشتے وغیرہ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''انسان'' کے بارے میں ان کے فلسفیانہ تجزیے اکثر درست نہیں ہوتے۔ بہرحال آیت زیر مطالعہ میں انسان کے اندر موجود قوتِ شر (نفسِ اَمّارہ) کا ذکر ہے کہ انسان کا نفس اسے جو پٹیاں پڑھاتا ہے اس کی تفصیلات اس کے خالق سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿۱۶﴾﴾ ''اور ہم تو اُس سے اُس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔''

ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کے اس قُرب کی کیفیت اور نوعیت کے بارے میں ہم کچھ نہیں جان سکتے' بقول شاعر یہ قُرب ''بے تکیف و بے قیاس'' ہے: ؎

اتصالے بے تکیف بے قیاس ہست ربّ الناس را با جانِ ناس

سورۃ الحدید کی آیت ۴ میں بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اس قُرب کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا

کُنۡتُمۡ ؕ﴾ کہ تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ہم اس ''معیت'' کا تصور نہیں کر سکتے۔ اسی طرح قرآن میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اور چہرے کا ذکر بھی ہے' اس کا چہرہ کیسا ہے؟ ہم نہیں جانتے۔ اس کا ہاتھ کیسا ہے؟ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ اللہ تعالیٰ رات کے آخری حصے میں آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے۔ وہ کیسے نزول فرماتا ہے؟ ہم اس کی کیفیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ ایسے معاملات میں خواہ مخواہ کا تجسس ہمیں فتنوں میں مبتلا کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔ اس حوالے سے ہمیں آخری بات یہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ''عالمِ امر'' اور اس کی کیفیات ہماری سمجھ سے وراء الوراء ہیں۔ ہم اپنے حواسِ خمسہ اور عقل و شعور کے ذریعے جو علم حاصل کر سکتے ہیں اس کا تعلق ''عالمِ خلق'' سے ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اسی ''دائرے'' میں رہتے ہوئے' سوچیں سمجھیں' تحقیق کریں' نتائج اخذ کریں اور ان نتائج کو بروئے کار لائیں۔ دوسری طرف ''عالمِ امر'' سے متعلق جو معلومات وحی کے ذریعے ہم تک پہنچیں انہیں من و عن تسلیم کر لیں۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۳۶ کے الفاظ ﴿اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ﴾ میں اسی طرزِ عمل کی طرف ہماری راہنمائی کی گئی ہے۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ کے حوالے سے ہمارے لیے بس یہ جان لینا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری رگِ جان سے بھی زیادہ ہمارے قریب ہے۔ اس قُرب کی منطق اور کیفیت کے بارے میں ہمیں عقل کے گھوڑے دوڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔

آیت ۱۷ ﴿اِذۡ یَتَلَقَّی الۡمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الۡیَمِیۡنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیۡدٌ ﴿۱۷﴾﴾ ''جبکہ لیتے جاتے ہیں دو لینے والے جو دائیں طرف اور بائیں طرف بیٹھے ہوتے ہیں۔''

یعنی اللہ تعالیٰ خود بھی ہر جگہ' ہر آن موجود ہے۔ اس کے علاوہ اُس نے ہر انسان کے دائیں بائیں دو فرشتے بھی مقرر کر رکھے ہیں جو اُس کے ہر فعل اور عمل کو ریکارڈ کر رہے ہیں۔ سورۃ الانفطار' آیت ۱۱ میں ان فرشتوں کو 'کِرَامًا کَاتِبِیۡنَ' کا نام دیا گیا ہے۔

آیت ۱۸ ﴿مَا یَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَیۡهِ رَقِیۡبٌ عَتِیۡدٌ ﴿۱۸﴾﴾ ''وہ کوئی لفظ بھی نہیں بولتا ہے مگر اُس کے پاس ایک مستعد نگران موجود ہوتا ہے۔''

یعنی کوئی انسان جو لفظ بھی اپنی زبان سے بولتا ہے متعلقہ فرشتہ اس کو فوراً ریکارڈ کر لیتا ہے اور ظاہر ہے فرشتوں کی یہ ریکارڈنگ بھی عالمِ امر کی چیز ہے' اس لیے اس کی کیفیت بھی ہمارے تصور میں نہیں آ سکتی۔ ریکارڈنگ کے شعبے میں گزشتہ چند دہائیوں میں انسانی سطح پر جو ترقی دیکھنے میں آئی ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب انسان کی ''ریکارڈنگ'' کا معیار یہ ہے اور اس معیار میں مزید ترقی بھی رُکنے کا نام نہیں لے رہی تو اللہ کی قدرت سے جو ریکارڈنگ ہو رہی ہے اُس کا معیار کیا ہوگا!

آیت ۱۹ ﴿وَجَآءَتۡ سَکۡرَةُ الۡمَوۡتِ بِالۡحَقِّ ؕ﴾ ''اور بالآخر موت کی بے ہوشی کا وقت آن پہنچا حق کے ساتھ۔''

موت کا آنا تو قطعی اور برحق ہے' اس سے کسی کو انکار نہیں۔ اللہ کے منکر تو بہت ہیں لیکن موت کا منکر کوئی نہیں۔

﴿ذٰلِکَ مَا کُنۡتَ مِنۡهُ تَحِیۡدُ ﴿۱۹﴾﴾ ''یہی ہے نا وہ چیز جس سے تو بھاگا کرتا تھا!''

اس بات کا انسان کی نفسیات کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ یہ ہر انسان کی نفسیاتی کمزوری ہے کہ موت کو برحق جانتے ہوئے بھی وہ اس کے تصور کو حتی الوسع اپنے ذہن سے دور رکھنے کی کوشش میں رہتا ہے۔ وقتی طور پر اگر کسی عزیز کی موت اور تجہیز و تکفین کے موقع پر اپنی موت اور قبر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آتا بھی ہے تو انسان فوری طور پر اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر روزمرہ کے معمولات میں خود کو مصروف کر لیتا ہے۔

آیت ﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ﴿٢٠﴾﴾ ''اور صُور میں پھونکا جائے گا۔ یہ ہے وعدے کا دن!''

پہلے انفرادی موت کی بات کی گئی تھی۔ اب اس آیت میں پوری دنیا کی اجتماعی موت کا ذکر ہے۔ جب کسی شخص کو موت آتی ہے تو اس کے لیے تو گویا وہی قیامت ہے۔ اس لیے انسان کی انفرادی موت کو قیامتِ صُغریٰ اور تمام انسانوں کی اجتماعی موت کو قیامتِ کُبریٰ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ گزشتہ آیت میں قیامتِ صُغریٰ کا بیان تھا' اب یہاں قیامتِ کُبریٰ کا نقشہ دکھایا جا رہا ہے۔

آیت ﴿وَجَاۗءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَاۗىِٕقٌ وَّشَهِيْدٌ ﴿٢١﴾﴾ ''اور ہر جان آئے گی (اس حالت میں کہ) اس کے ساتھ ہوگا ایک دھکیلنے والا اور ایک گواہ۔''

دنیا میں ہر انسان کے ساتھ جو دو فرشتے (کِرَامًا کَاتِبِیْنَ) مامور ہیں وہی قیامت کے دن اسے لا کر اللہ کی عدالت میں پیش کریں گے۔ ان میں سے ایک فرشتہ اس کا اعمال نامہ اٹھائے ہوئے ہوگا جب کہ دوسرا اسے عدالت کی طرف دھکیل رہا ہوگا۔

آیت ﴿لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا﴾ ''(اللہ فرمائے گا: اے انسان!) تُو اس دن سے غفلت میں رہا تھا نا!''

﴿فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاۗءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿٢٢﴾﴾ ''تو آج ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا ہے' تو آج تمہاری نگاہ کتنی تیز ہو گئی ہے۔''

دنیا میں رہتے ہوئے بہت سے حقائق تمہارے لیے پردۂ غیب میں تھے۔ وہاں تجھ سے مطالبہ تھا کہ ان حقائق پر بغیر دیکھے ایمان لاؤ۔ آج غیب کا پردہ اٹھا دیا گیا ہے اور اب تمہاری نظر ہر چیز کو دیکھ سکتی ہے' حتیٰ کہ آج تم اپنے ساتھ آنے والے فرشتوں کو بھی دیکھ رہے ہو۔

آیت ﴿وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ﴿٢٣﴾﴾ ''اور اُس کا ساتھی کہے گا: (پروردگار!) یہ جو میری تحویل میں تھا' حاضر ہے!''

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں ''ساتھی'' سے فرشتہ مراد ہے' لیکن میں ان لوگوں سے متفق ہوں جو اس سے شیطان مراد لیتے ہیں۔ دراصل خیر اور شر کی قوتیں انسان کے اندر بھی موجود ہیں اور خارج میں بھی۔ اندر سے انسان کا نفس اسے بُرائی پر اُبھارتا ہے' جبکہ خارج میں ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان بھی مامور ہے جو اُس کے نفس میں ہر وقت وسوسہ اندازی کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح ہر انسان کے اندر اس کی روح ''داعیٔ خیر'' کے طور پر موجود ہے جبکہ خارج میں اس حوالے سے فرشتے اس کی مدد کرتے ہیں۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی آیات ۳۰ اور ۳۱ میں ان فرشتوں کے بارے میں ہم پڑھ آئے ہیں جو نیکی کے کاموں میں انسان کی پشت پناہی کرتے ہیں: ﴿نَحْنُ اَوْلِيٰۗؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ﴾۔ فرشتوں کی معیت کے باعث ہی کوئی نیک کام کر کے ہمیں خوشی اور طمانیت محسوس ہوتی ہے۔ ایسے مواقع پر فرشتے دراصل ہمیں بشارت اور شاباش دے رہے ہوتے ہیں جس کے اثرات ہماری روح پر طمانیت کی صورت میں مرتب ہوتے ہیں۔

آیت ﴿اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿٢٤﴾﴾ ''(اللہ تعالیٰ فرمائے گا:) جھونک دو جہنّم میں ہر ناشکرے سرکش کو۔''

یہ حکم گویا اس انسان اور اس کے ساتھی شیطان دونوں کے لیے ہوگا۔

آیت ۲۵ ﴿مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِ ۙ﴾ ''جو خیر سے روکنے والا' حد سے بڑھنے والا اور شکوک وشبہات میں مبتلا رہنے والا ہے۔''

آیت ۲۶ ﴿الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ ''جس نے اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ بھی بنالیا تھا۔''

﴿فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ۝﴾ ''تو جھونک دو اس کو بڑے سخت عذاب میں۔''

اس انسان کا شیطان یہ سمجھ رہا ہوگا کہ اس کی اپنی حیثیت ''سرکاری کارندے'' کی ہے جو مجرم کو سزا کے لیے لے کر آیا ہے' لیکن دونوں کو جہنم رسید کرنے کا حکم سن کر وہ فوراً اپنی صفائی میں چلّانا شروع کر دے گا۔

آیت ۲۷ ﴿قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ۝﴾ ''اُس کا ساتھی (شیطان) کہے گا: پروردگار! میں نے اس کو سرکش نہیں بنایا' بلکہ یہ خود ہی بہت دور کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا۔''

گویا وہ چاہے گا کہ جو انسان اس کی تحویل میں دیا گیا تھا اُسے سزا کے لیے وصول کر لیا جائے اور خود اس کی جان بخشی کر دی جائے۔

آیت ۲۸ ﴿قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ۝﴾ ''(اللہ فرمائے گا:) اب میرے سامنے جھگڑا مت کرو' جبکہ میں پہلے ہی تمہاری طرف وعید بھیج چکا ہوں۔''

کہ میں نے تو جن وانس پر ''انذار'' کے حوالے سے اتمامِ حجت کر دیا تھا۔ سورۃ الاحقاف میں ان جنّات کے بارے میں ہم پڑھ آئے ہیں جو حضور ﷺ سے قرآن سن کر ایمان لائے اور پھر داعیانِ حق بن کر اپنی قوم کو خبردار کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ گویا قرآن کا پیغام اور انذار جنّات تک بھی پہنچا دیا گیا ہے۔

آیت ۲۹ ﴿مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝﴾ ''میرے حضور میں بات تبدیل نہیں کی جا سکتی اور میں اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔''

چنانچہ اب میرے قانون کے تمام تقاضے پورے کیے جائیں گے۔

آیت ۳۰ ﴿يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ﴾ ''جس دن ہم پوچھیں گے جہنم سے کہ کیا تُو بھر گئی؟''

﴿وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ۝﴾ ''اور وہ کہے گی کیا کچھ اور بھی ہے؟''

یعنی وہ کہے گی کہ ابھی تو میرے اندر بہت گنجائش ہے۔ ابھی مزید جنوں اور انسانوں کو میرے اندر ڈالا جائے تاکہ میں بھر جاؤں۔

آیت ۳۱ ﴿وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ ۝﴾ ''اور جنّت قریب لائی جائے گی اہلِ تقویٰ کے لیے' کچھ بھی دُور نہیں ہوگی۔''

آیت ۳۲ ﴿هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ﴾ ''(ان سے کہا جائے گا:) یہ ہے جس کا وعدہ تم لوگوں سے کیا جاتا تھا''

﴿لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ ۝﴾ ''ہر اُس شخص کے لیے جو (اللہ کی طرف) رجوع کرنے والا اور حفاظت کرنے والا ہو۔''

یعنی اس امانت کی حفاظت کرنے والا جو ہم نے اس کے سپرد کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں جو روح پھونکی ہے وہ اس کے پاس اللہ کی امانت ہے' جیسا کہ سورۃ الاحزاب کی اس آیت سے واضح ہوتا ہے: ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ (آیت ۷۲) ''ہم نے اس امانت کو پیش کیا آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر تو ان سب نے انکار کر دیا اس کو اٹھانے سے اور وہ اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسے اُٹھالیا''۔ چنانچہ ''حَفِيْظ'' سے ایسا شخص مراد ہے جس نے اس امانت کا حق ادا کیا اور اپنی روح کو گناہ کی آلودگی سے محفوظ رکھا۔ سورۃ الشعراء میں ایسی محفوظ اور پاکیزہ روح کو ''قلبِ سلیم'' کا نام دیا گیا ہے: ﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۞ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۞﴾ ''جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ بیٹے۔ سوائے اُس کے جو آئے اللہ کے پاس قلبِ سلیم لے کر''۔ اس مضمون کی مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الاحزاب کی آیت ۷۲ کی تشریح۔

آیت ۳۳ ﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ﴾ ''جو ڈرتا رہا رحمٰن سے غیب میں ہونے کے باوجود۔''

﴿وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِ ۞ ۳۳﴾ ''اور لے کر آیا رجوع کرنے والا دل۔''

قلبِ منیب سے بھی یہاں قلبِ سلیم ہی مراد ہے۔ یہ ایسے شخص کا ذکر ہے جو دنیا میں اللہ رب العزت کا فرمانبردار بندہ بن کر رہا۔ اللہ کی امانت کو اُس نے پوری حفاظت اور سلامتی کے ساتھ رکھا اور صحیح سلامت واپس لوٹایا۔

آیت ۳۴ ﴿اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ۞ ۳۴﴾ ''(ان سے کہا جائے گا:) داخل ہو جاؤ اس (جنّت) میں سلامتی کے ساتھ' اب یہ ہمیشہ رہنے کا دن ہے۔''

اب ایسا کوئی مرحلہ نہیں آئے گا کہ تمہیں جنّت سے نکلنا پڑے۔

آیت ۳۵ ﴿لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ۞ ۳۵﴾ ''ان کے لیے اس میں وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے' اور ہمارے پاس مزید بھی بہت کچھ ہے۔''

قرآن کے مختلف مقامات پر جنّت کی نعمتوں کا جو تعارف ملتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنّت کی نعمتوں کے تین درجے ہیں۔ نفسِ انسانی کے بنیادی تقاضوں کی تسکین کا بھرپور سامان تو جنّت میں پہلے سے موجود ہوگا۔ اس کے علاوہ ہر شخص اپنی پسند' ذوق اور خواہش کے مطابق جو کچھ طلب کرے گا وہ بھی اُسے فراہم کیا جائے گا۔ ظاہر ہے ہر شخص کی طلب اپنے ذوق اور معیار کے مطابق ہو گی۔ ایک سادہ لوح دیہاتی اپنی پسند کے مطابق کوئی چیز مانگے گا اور ایک حکیم و فلسفی اپنے ذوق کی تسکین چاہے گا۔ البتہ اس حوالے سے کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو کچھ بھی طلب نہیں کریں گے' وہ لوگ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (الکہف:۲۸) کے مصداق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات اور اُس کی رضا کے طالب ہوں گے۔ جیسے رابعہ بصریؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک مرتبہ جذب کے عالم میں ایک مشعل اور پانی کا لوٹا لیے گھر سے نکلیں۔ لوگوں کے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ مَیں اس آگ سے جنّت کو جلانے نکلی ہوں اور اس پانی سے مَیں جہنّم کی آگ کو بجھا دینا چاہتی ہوں تاکہ لوگ اللہ سے خالص اُس کی ذات کے لیے محبت کریں نہ کہ جنّت کے لالچ اور جہنّم کے خوف کی وجہ سے اسے چاہیں۔ بہرحال جنّت میں وہ لوگ بھی ہوں گے جنہیں اللہ کی رضا کے علاوہ کچھ نہیں چاہیے ہوگا۔ جبکہ ان دو اقسام کے علاوہ تیسری قسم کی نعمتیں وہ ہوں گی جو انسانی تصوّر سے بالاتر ہیں اور آیت زیر مطالعہ کے الفاظ ''وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ'' میں انہی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے۔ سورۃ السجدۃ میں جنّت کی ان نعمتوں کا ذکر اس طرح ہوا ہے: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ﴾ (آیت ۱۷) ''پس کوئی جان یہ نہیں جانتی کہ ان (اہلِ جنّت) کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا

ہے''۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی ہے:

((قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ : اَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَالَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ، فَاقْرَءُوْا اِنْ شِئْتُمْ : فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَا اُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ)) (۱)

''اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے (جنّت میں) وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا' نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا گمان ہی گزرا۔ (پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:) اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: ''پس کوئی جان یہ نہیں جانتی کہ ان (اہلِ جنّت) کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے۔''

آیات ۳۶ تا ۴۵

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ؕ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿۳۶﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَ هُوَ شَهِيْدٌ ﴿۳۷﴾ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّ مَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴿۳۸﴾ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴿۳۹﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴿۴۰﴾ وَ اسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿۴۱﴾ يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴿۴۲﴾ اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ ﴿۴۳﴾ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ؕ ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ ﴿۴۴﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَ مَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ۣ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴿۴۵﴾ ع ۲ ۱۷

آیت ۳۶ ﴿وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ؕ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿۳۶﴾﴾

''اور کتنی ہی قوموں کو ہم نے ان سے پہلے ہلاک کیا ہے جو قوت میں ان سے بڑھ کر تھیں' سو انہوں نے ملکوں کے ملک فتح کیے! پھر کیا وہ کوئی جائے فرار پا سکے؟''

نَقَّبَ کا معنی ہے نقب لگانا' یعنی دیوار میں سوراخ کرنا' جبکہ نَقَّبَ فِي الْاَرْضِ (باب تفعیل) کا مفہوم ہے: بھاگ دوڑ کرتے ہوئے کسی ملک میں جا گھسنا' یعنی کسی علاقے کو فتح کر لینا۔ وہ لوگ اتنے زور آور تھے کہ اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے مختلف علاقوں میں گھستے چلے گئے اور ملکوں پر ملک فتح کرتے چلے گئے' لیکن جب اللہ کی پکڑ آئی تو انہیں بھاگنے کو جگہ نہ ملی۔

آیت ۳۷ ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ﴿۳۷﴾﴾ ''یقیناً اس میں یاد دہانی ہے اُس کے لیے جس کا دل ہو یا جو توجّہ سے سنے حاضر ہو کر۔''

۱۔ صحیح البخاری' کتاب بدء الخلق' باب ما جاء فی صفة الجنة وانها مخلوقة۔ وصحیح مسلم' کتاب الجنة وصفة نعیمها واهلها۔

اپنے مضمون کے اعتبار سے یہ قرآن مجید کا بہت اہم مقام ہے۔ یاددہانی کے حوالے سے اس آیت میں دو طرح کے لوگوں کا ذکر ہوا ہے۔ یہ یاددہانی یا تو ان لوگوں کے لیے مفید ہے جو ''دل'' رکھتے ہیں' یا پھر وہ جو پوری توجہ سے اس کو سنیں۔ گویا یہاں قرآن کی ہدایت تک پہنچنے کے دو الگ الگ طریقوں اور راستوں (approaches) کا ذکر ہے۔ ایک ان لوگوں کا راستہ ہے جو دل رکھتے ہیں۔ یہ دراصل وہ لوگ ہیں جن کی روح زندہ ہے۔ روح کا مسکن چونکہ قلبِ انسانی ہے اس لیے جس انسان کی روح زندہ ہوگی اس کا دل بھی زندہ ہوگا۔ ایسے دل کو دلِ بیدار' دلِ زندہ یا قلبِ سلیم کہا جاتا ہے۔ میر دردؔ نے اپنے اس شعر میں دل کی اسی ''زندگی'' کا ذکر کیا ہے: ؎

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے![۲]

چنانچہ ایک زندہ دل شخص جب قرآن سنے گا تو اس شخص کی روح یوں لپک کر قرآنی پیغام تک پہنچ جائے گی جیسے پٹرول دور سے آگ پکڑ لیتا ہے۔ اس کیفیت کو سورۃ النُّور کی آیت ۳۵ میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: ﴿یَکَادُ زَیْتُهَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ﴾ ''قریب ہے کہ اس کا روغن خود بخود روشن ہو جائے' چاہے اسے آگ نے ابھی چھوا بھی نہ ہو''۔ گویا ایک پاکیزہ روح نورِ وحی تک پہنچنے کے لیے بے قرار ہوتی ہے۔ بقولِ اقبال: ؎

مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز
نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لیے!

حافظ ابن قیمؒ نے اس بارے میں بڑی خوبصورت بات لکھی کہ بہت سے لوگ قرآن کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس کرتے ہیں جیسے قرآن ان کے دل پر نقش ہے اور وہ اس کی عبارت کو مصحف سے نہیں بلکہ اپنی لوحِ قلب سے پڑھ رہے ہیں۔ یعنی سلیم الفطرت لوگوں کی ارواح کو قرآن حکیم کے ساتھ خصوصی ہم آہنگی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ جب قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں تو ان کی روحوں میں ایک مانوس قسم کا ارتعاش (sympathetic vibration) پیدا ہوتا ہے۔ گویا ان کی ارواح قرآنی الفاظ و آیات کے ساتھ پہلے سے ہی مانوس ہیں۔ بقول غالبؔ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!

ایسے لوگوں کو قرآن کی ہدایت تک پہنچنے کے لیے کسی مہلت یا تگ و دو کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قبولِ حق میں ایک لمحے کا توقف بھی نہیں کیا تھا۔

اس کے برعکس وہ لوگ جن کی ارواح پر غفلت اور مادیت کے پردے پڑ چکے ہوں' ان کے لیے اس آیت میں دوسرا طریقہ بتایا

۲۔ علامہ اقبال کے کلام میں بھی جا بجا دلِ بیدار' دلِ زندہ' دلِ مردہ' دلِ بینا اور قلبِ سلیم وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ ''بالِ جبریل'' میں انہوں نے ''دلِ بیدار'' کے بارے میں کیا خوب کہا ہے ؎

دلِ بیدار فاروقی' دلِ بیدار کراری مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری
دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک نہ تیری ضرب ہے کاری' نہ میری ضرب ہے کاری!
(حاشیہ از مرتّب)

گیا ہے: ﴿اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ﴾۔ یعنی ان لوگوں کو خصوصی توجہ کے ساتھ محنت کرنا ہوگی' تب کہیں جا کر ''گوہرِ مقصود'' تک ان کی رسائی ہوگی۔ مطالعۂ قرآن کے ہمارے منتخب نصاب میں ایمان کی بحث کے تحت دو درس (درس ۶ اور ۷) ایسے ہیں جو انہی دو طریقوں کی الگ الگ نمائندگی کرتے ہیں۔ ان میں پہلا درس سورۂ آل عمران کی آیات ۱۹۰ تا ۱۹۵ پر مشتمل ہے۔ ان آیات میں آیاتِ آفاقی کے مشاہدے کی بنیاد پر تفکر و تدبر کی دعوت دی گئی ہے:

﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾﴾

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں ہوش مند لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ جو اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں' کھڑے بھی' بیٹھے بھی اور اپنے پہلوؤں پر بھی اور مزید غور و فکر کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں۔ اے ہمارے ربّ! تُو نے یہ سب کچھ بے مقصد تو پیدا نہیں کیا ہے۔ تُو پاک ہے (اس سے کہ کوئی عبث کام کرے)' پس تُو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا!''

لیکن یہ تفکر و تدبر تب نتیجہ خیز ہوگا جب اس کے ساتھ اللہ ربّ العالمین کے ذکر کا بھی اہتمام کیا جائے گا۔ گویا ایمان و ہدایت کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے ذکر اور فکر دونوں کو ایک ساتھ لے کر چلنا ہوگا' جیسا کہ اقبالؔ نے کہا ہے ؎

فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر　　فکر را کامل نہ دیدم جز بہ ذکر
جز بہ قرآں ضیغمی روباہی است　　فقرِ قرآں اصل شاہنشاہی است!

یعنی فقرِ قرآن تو ذکر اور فکر کے امتزاج کا نام ہے جبکہ مَیں ذکر کے بغیر فکر کو ناقص اور نامکمل دیکھتا ہوں۔ اگر کوئی شیر بھی ہو تو قرآن کے بغیر وہ لومڑی کی طرح ہوگا' اصل شہنشاہ تو وہ ہے جسے فقرِ قرآنی مل گیا۔

اس ضمن میں ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ہاں ذکر اور فکر کے الگ الگ حلقے بن چکے ہیں۔ ان میں سے ہر حلقے کے لوگ اپنے طور طریقوں میں اس قدر مگن ہیں کہ انہیں دوسروں سے کچھ سروکار نہیں۔ ایک طرف مفکّرین ہیں جو فلسفہ و فکر پر بڑی بڑی کتابیں رقم کر رہے ہیں' کیسی کیسی تفسیریں لکھتے جاتے ہیں' مگر وہ ذکر کی لذّت سے بالکل ناآشنا ہیں۔ دوسری طرف ذاکرین ہیں جو ذکر کی روح پرور محفلیں سجاتے ہیں لیکن انہیں فکر و تدبر سے کوئی واسطہ نہیں۔ ظاہر ہے گاڑی کے ان دونوں پہیّوں میں ہم آہنگی ہوگی تو اُمّت کا قافلہ منزل کی طرف گامزن ہوگا۔ بہرحال سورۂ آلِ عمران کی مذکورہ آیات میں ذکر و فکر کے ذریعے ہدایت کی ''منزلِ مقصود'' تک پہنچنے کا طریقہ بتایا گیا ہے' جبکہ دوسرے طریقے کی نشاندہی سورۃ النور کے پانچویں رکوع (منتخب نصاب کے درس ۷) میں کی گئی ہے کہ اپنے قلب کو صاف کر لیجیے' اس کی تمام کدورتیں دور کر دیجیے تو اس کے آئینے میں قرآن خود بخود منعکس ہو کر اسے منوّر (نُوْرٌ عَلٰی نُوْر) کر دے گا اور یوں نورِ فطرت اور نورِ وحی کے امتزاج سے نورِ ایمان کی تکمیل ہو جائے گی۔

آیت ۳۸ ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾ ''اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے مابین ہے پیدا کیا چھ دنوں میں۔''

﴿وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴿۳۸﴾﴾ ''اور ہم پر کوئی تکان طاری نہیں ہوئی۔''

یہ مضمون موجودہ تورات میں کچھ اس طرح بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دنوں میں زمین و آسمان کو پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کر کے تھکن دور کی۔ اسی وجہ سے یہود یوں اور عیسائیوں کے ہاں ''ویک اینڈ'' کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دن کام کرنے کے بعد ساتویں دن آرام کیا تھا' لہٰذا تم لوگ بھی چھ دن کام کر کے ساتویں دن آرام کرو۔ اس آیت میں دراصل تورات کے اس تصور کی نفی کی گئی ہے۔ چنانچہ اسلام میں ''ویک اینڈ'' کا کوئی تصور نہیں۔ اس حوالے سے یہ تاریخی حقیقت واضح رہنی چاہیے کہ اصل تورات بخت نصر کے حملے میں گم ہو گئی تھی اور دوبارہ اس کو یادداشتوں کی مدد سے مرتب کیا گیا تھا۔ مرتبین چونکہ عام انسان تھے' نبی نہیں تھے' اس لیے ان کی یادداشتوں نے ٹھوکریں کھائیں اور بہت سی غلط باتیں بھی اس میں شامل کر دی گئیں۔

آیت ۳۹ ﴿فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ﴾ ''تو (اے نبی ﷺ) آپ صبر کیجیے اُس پر جو یہ لوگ کہہ رہے ہیں''

﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴿۳۹﴾﴾ ''اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے سورج کے طلوع ہونے سے قبل اور غروب ہونے سے قبل۔''

جیسا کہ قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے' زیر مطالعہ سورتیں مکی دور کے ابتدائی چار سال کے دوران نازل ہوئی تھیں۔ اُس وقت تک پنج گانہ نماز کا باقاعدہ نظام وضع نہیں ہوا تھا۔ پنج گانہ نماز تو معراج کے موقع پر (۱۰ نبوی میں) فرض ہوئی تھی۔ اس سے پہلے تو بس صبح وشام اللہ کا ذکر کرنے کی بار بار تلقین وتاکید کی جاتی تھی' جیسا کہ سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۳۰ میں بھی بالکل یہی الفاظ آئے ہیں یا اس سے بھی پہلے سورۃ المزمل میں رات کی نماز اور اس میں تلاوتِ قرآن کا حکم آ چکا تھا۔ بعد میں جب باقاعدہ اوقات کے ساتھ پانچ نمازوں کا نظام وضع ہوا تو ان دو اوقات میں دو نمازیں فرض ہو گئیں' یعنی قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ کے اوقات میں فجر کی نماز اور قَبْلَ الْغُرُوْبِ کے وقت میں نمازِ عصر۔

آیت ۴۰ ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ﴾ ''اور رات کے حصوں میں بھی اس کی تسبیح بیان کرو۔''

﴿وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴿۴۰﴾﴾ ''اور سجدوں (نمازوں) کے بعد بھی۔''

یہ گویا نماز سے فارغ ہونے کے بعد کی تسبیح وتحمید کا حکم ہے۔ نمازوں کے بعد کے اذکار کی تفصیلات احادیث میں ملتی ہیں' جیسے تسبیحِ فاطمہؓ (۳۳ مرتبہ سبحان اللہ' ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۳ یا ۳۴ بار اللہ اکبر پڑھنا) کی مداومت سے متعلق احادیث میں ترغیب آئی ہے۔

آیت ۴۱ ﴿وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿۴۱﴾﴾ ''اور کان لگائے رکھو جس دن پکارنے والا پکارے گا بہت قریب کی جگہ سے۔''

یعنی اس دن کے منتظر رہو جب صُور میں پھونکا جائے گا اور ہر شخص کو اس کی آواز بہت قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوگی۔ صُور کی آواز ایسی زوردار اور خوفناک ہوگی کہ اس سے ہر جان دار کی موت واقع ہو جائے گی۔ اس کے بعد سب انسانوں کو زندہ کر کے محشر میں جمع کرنے کے لیے پھر صُور پھونکا جائے گا۔ یہاں اسی دوسرے صور کا ذکر ہے۔

آیت ۴۲ ﴿يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ؕ﴾ ''جس دن کہ وہ سنیں گے ایک چنگھاڑ حق کے ساتھ۔''

﴿ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴿۴۲﴾﴾ ''وہ ہوگا نکلنے کا دن۔''

یعنی وہ زمین سے مُردوں کے نکلنے کا دن ہوگا۔

آیت ۴۳ ﴿اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ﴾ ''یقیناً ہم ہی زندہ رکھتے ہیں اور ہم ہی موت وارد کرتے ہیں۔''

﴿وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ ﴿۴۳﴾﴾ ''اور ہماری ہی طرف (سب کو) پلٹ کر آنا ہے۔''

واضح رہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ اپنی شانِ جلالت کا زیادہ اظہار کرنا چاہتا ہے وہاں اپنے لیے جمع کا صیغہ پسند فرماتا ہے۔

آیت ۴۴ ﴿يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ؕ﴾ ''جس دن زمین اُن پر سے پھٹ جائے گی اور وہ تیزی سے نکل پڑیں گے۔''

﴿ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ ﴿۴۴﴾﴾ ''یہ (سب کا) جمع کر دینا ہمارے لیے بہت آسان ہے۔''

آیت ۴۵ ﴿نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں''

﴿وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ۣ﴾ ''اور آپ ان پر کوئی زبردستی کرنے والے نہیں ہیں۔''

آپؐ کا کام ان سے جبراً بات منوانا نہیں ہے۔ ہم نے آپؐ کو اس اختیار کے ساتھ نہیں بھیجا کہ آپؐ انہیں زبردستی حق کی طرف لے آئیں۔

﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴿۴۵﴾﴾ ''پس آپ تذکیر کرتے رہیے اِس قرآن کے ذریعے سے ہر اُس شخص کو جو میری وعید سے ڈرتا ہے۔''

جس شخص کی روح مردہ نہ ہو چکی ہوگی اور اس میں تھوڑی سی بھی جان ہوگی اور جس کے اندر اخلاقی حس دم نہ توڑ چکی ہوگی اور بھلائی کی معمولی سی رمق بھی باقی ہوگی وہ آپ ﷺ کی باتیں سن کر قرآن کی تذکیر اور یاددہانی سے ضرور فائدہ اٹھائے گا۔ یہاں پر ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ﴾ کے الفاظ میں حضور ﷺ کو خصوصی طور پر ہدایت دی جا رہی ہے کہ آپؐ تبلیغ و تذکیر، انذار و تبشیر اور لوگوں کے تزکیۂ نفس کا ذریعہ قرآن ہی کو بنائیں۔ اس حکم کے مقابلے میں آج اُمّتِ مُسلمہ کی مجموعی حالت یہ ہے کہ مسلمانوں نے خود کو قرآن سے بالکل ہی بے نیاز کر لیا ہے اور دعوت و تبلیغ، وعظ و نصیحت اور تربیت و تزکیہ کے دیگر ذرائع اختیار کر لیے ہیں۔

سُوْرَةُ الذّٰرِیٰتِ

تمہیدی کلمات

سورۃ الذّاریات کا آغاز چار قسموں سے ہو رہا ہے۔ اس انداز سے شروع ہونے والی یہ قرآن مجید کی دوسری سورت ہے۔ اس سے پہلے ۲۳ ویں پارے میں سورۃ الصّٰفّٰت ہے جس کے آغاز میں بالکل اسی انداز میں تین قسمیں کھائی گئی ہیں:

﴿وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۝۱ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۝۲ فَالتّٰلِیٰتِ ذِكْرًا ۝۳ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۝۴﴾

''قسم ہے اُن (فرشتوں) کی جو قطار در قطار صفیں باندھے حاضر رہتے ہیں۔ پھر قسم ہے اُن کی جو ڈانٹنے والے ہیں۔ پھر قسم ہے اُن کی جو تلاوت کرنے والے ہیں ذکر کی۔ یقیناً تمہارا اِلٰہ ایک ہی ہے۔''

سورۃ الصّٰفّٰت کا تعلق سورتوں کے جس گروپ سے ہے اس گروپ کا مرکزی مضمون توحید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت کے آغاز کی تین قسموں کے مُقسَم علیہ کا تعلق بھی توحید سے ہے: ﴿اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۝۴﴾ کہ یقیناً تمہارا اِلٰہ ایک ہی ہے۔ زیر مطالعہ گروپ کی سورتوں کا مرکزی مضمون چونکہ انذارِ آخرت ہے اس لیے سورۃ الذّاریات کی قسموں کے بعد قیامت اور جزا و سزا کے واقع ہونے کی تصدیق کی گئی ہے: ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝۵ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ ۝۶﴾

جس طرح سورۃ الصّٰفّٰت کی قسموں کے بارے میں تقریباً سب علمائے تفسیر کا اتفاق ہے کہ وہ قسمیں فرشتوں کے بارے میں ہیں، اسی طرح سورۃ الذّٰرِیٰت کی قسموں کے بارے میں بھی تقریباً سب مفسرین متفق ہیں کہ ان میں ہواؤں کا ذکر ہے۔

آیات ۱ تا ۲۳

سُوْرَةُ الذّٰرِیٰتِ مَكِّیَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ | اٰیَاتُهَا: ۶۰ رُكُوْعَاتُهَا: ۳

وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا ۝۱ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۝۲ فَالْجٰرِیٰتِ یُسْرًا ۝۳ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۝۴ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ
لَصَادِقٌ ۝۵ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ ۝۶ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۝۷ اِنَّكُمْ لَفِیْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝۸
یُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ۝۹ قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ۝۱۰ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ۝۱۱ یَسْـَٔلُوْنَ اَیَّانَ
یَوْمُ الدِّیْنِ ۝۱۲ یَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ یُفْتَنُوْنَ ۝۱۳ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ؕ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ
تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝۱۴ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ۝۱۵ اٰخِذِیْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ
ذٰلِكَ مُحْسِنِیْنَ ۝۱۶ كَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَهْجَعُوْنَ ۝۱۷ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ ۝۱۸ وَفِیْۤ
اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝۱۹ وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۝۲۰ وَفِیْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا

تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَ فِی السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَ مَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ فَوَ رَبِّ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَاۤ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ﴿۲۳﴾ ع ۱۸

آیت ۱ ﴿وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا ۙ﴿۱﴾﴾ ''قسم ہے اُن ہواؤں کی جو بکھیرنے والی ہیں جیسے کہ بکھیرا جاتا ہے۔''

ہوائیں بہت سی چیزوں کو بکھیرتی ہیں۔ مثلاً پودوں کے پھولوں کے زردانے (pollens) ہواؤں کی مدد سے ایک پودے سے دوسرے تک پہنچ کر اسے بارور کرتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے درختوں کے بیج ہواؤں کے دوش پر سفر کرتے ہوئے دور دراز علاقوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ یوں ہوائیں پودوں کے پھلنے پھولنے اور جنگلات کے بڑھانے میں بھی مدد دیتی ہیں۔

آیت ۲ ﴿فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۙ﴿۲﴾﴾ ''پھر بوجھ اٹھا کر لانے والی ہیں۔''

ہوائیں اربوں کھربوں ٹن پانی سمندر سے اٹھا کر بادلوں کی شکل میں ہزاروں میل دور لے جاتی ہیں اور پھر مختلف علاقوں میں بارش برساتی ہیں۔

آیت ۳ ﴿فَالْجٰرِیٰتِ یُسْرًا ۙ﴿۳﴾﴾ ''پھر نرمی سے چلنے والی ہیں۔''

کبھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اس طرح چلتی ہے کہ اس کے ہلکے ہلکے جھونکے نباتات و حیوانات سب کے لیے بہت فرحت بخش ہوتے ہیں۔

آیت ۴ ﴿فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۙ﴿۴﴾﴾ ''پھر اللہ کے امر کو تقسیم کرنے والی ہیں۔''

اس سے مراد بارش کے پانی کی تقسیم ہے۔ بادل کی شکل میں سمندر کے پانی کو ہوائیں مختلف علاقوں میں اڑائے پھرتی ہیں' مگر کس جگہ بارش ہوگی اور کس جگہ نہیں ہوگی اور جہاں ہوگی وہاں کس قدر ہوگی' یہ سب کچھ تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس امر (حکم) کی تقسیم ہواؤں کے ذریعے سے ہی ہوتی ہے۔ اس تقسیم کا مشاہدہ ہم آئے دن کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض علاقوں میں بارش سے جل تھل ہو جاتا ہے اور کچھ علاقے پانی کی ایک ایک بوند کو ترستے رہ جاتے ہیں اور کالی گھٹائیں ان کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔

ان آیات میں ہواؤں کی قسمیں کھا کر اور پھر ان کے ذریعے طے پانے والے بعض امور کا ذکر کر کے دراصل کائنات کے محکم نظام پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ اگر انسان اس بارے میں غور کرے گا تو وہ ضرور اس نتیجے پر پہنچ جائے گا کہ یہ کائنات اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے بنائی ہے: ((اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَةِ))[1] ''یہ دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔''

آیت ۵ ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۙ﴿۵﴾﴾ ''جو وعدہ تمہیں دیا جا رہا ہے وہ یقیناً سچ ہے۔''

آیت ۶ ﴿وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ ﴿۶﴾﴾ ''اور جزا و سزا ضرور واقع ہو کر رہے گی۔''

یہ کائنات اور اس کا نظام گواہ ہے کہ بعث بعد الموت' نفخۂ اولیٰ' نفخۂ ثانیہ وغیرہ سے متعلق جو خبریں تمہیں دی جا رہی ہیں وہ یقیناً سچی ہیں اور جس عذاب کی تمہیں وعید سنائی جا رہی ہے اس میں کچھ شک و شبہ نہیں۔ قیامت ضرور قائم ہوگی اور اس دن تمام انسانوں کو پھر سے ضرور زندہ کیا جائے گا اور انہیں ان کے اعمال کا بدلہ مل کر رہے گا۔

۱۔ تخریج الاحیاء للعراقی ۲۵۲/۳۔ حافظ عراقی نے اس حدیث کو منقطع قرار دیا ہے۔

آیت ۷ ﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۝۷﴾ ''اور قسم ہے جالی دار آسمان کی۔''

یہ اس منظر کی طرف اشارہ ہے جو رات کے وقت تاروں بھرا آسمان پیش کرتا ہے۔

آیت ۸ ﴿اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝۸﴾ ''یقیناً تم لوگ ایک جھگڑے کی بات میں پڑ گئے ہو۔''

یعنی آخرت کے بارے میں تم ایک اختلاف میں پڑ گئے ہو اور تمہاری بات ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

آیت ۹ ﴿يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ۝۹﴾ ''اس سے وہی پھیرا جاتا ہے جو پھیر دیا گیا ہے۔''

تم میں سے بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو وحی کے اس پیغام کی طرف دھیان ہی نہیں دیتے اور جزا و سزا کے متعلق مختلف باتیں بناتے رہتے ہیں۔ حالانکہ جزا و سزا کا معاملہ ایک بدیہی حقیقت ہے اور اس کو تسلیم کرنے سے وہی شخص باز رہے گا جو راندۂ درگاہ ہے اور خیر و سعادت کے راستوں سے پھیر دیا گیا ہے۔

آیت ۱۰ ﴿قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ۝۱۰﴾ ''ہلاک ہو جائیں یہ اٹکلیں دوڑانے والے۔''

آیت ۱۱ ﴿الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ۝۱۱﴾ ''جو اپنی غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔''

انہیں نہ تو اپنے مقصدِ تخلیق کی خبر ہے اور نہ اپنے انجام کی فکر۔ حتیٰ کہ وہ اپنے اس عہد کو بھی بھولے ہوئے ہیں جو عالم ارواح میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا تھا۔ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۷۲ میں اس عہد کا ذکر اس طرح ہوا ہے:

﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا ۚ﴾

''اور یاد کرو جب نکالا آپ کے رب نے تمام بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی نسل کو اور ان کو گواہ بنایا خود ان کے اوپر (اور سوال کیا) کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں! ہم اس پر گواہ ہیں۔''

انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس عہد کا ''عرفان'' اس کی روح کے اندر موجود ہوتا ہے۔ لیکن دنیوی زندگی کے دوران بعض لوگوں کی ارواح غفلت میں اس قدر ڈوب جاتی ہیں کہ انہیں اپنے رب سے کیا ہوا یہ عہد یاد ہی نہیں رہتا۔ زیر مطالعہ آیت میں ایسے ہی لوگوں کا ذکر ہے۔

آیت ۱۲ ﴿يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ۝۱۲﴾ ''وہ پوچھتے ہیں کب آئے گا وہ جزا و سزا کا دن!''

مشرکین یہ سوال طنزیہ انداز میں کرتے تھے کہ آپؐ کہتے رہتے ہیں کہ جزائے اعمال کا دن آ کر رہے گا' تو آخر کب تک آئے گا وہ روزِ جزا؟ چنانچہ ان کے اس سوال کا جواب بھی انہیں اسی انداز میں دیا جا رہا ہے:

آیت ۱۳ ﴿يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ۝۱۳﴾ ''جس دن یہ لوگ آگ پر سینکے جائیں گے۔''

چونکہ مشرکین یہ سوال غیر سنجیدہ انداز میں کرتے تھے اس لیے جواب میں ان کے لیے ڈانٹ کا انداز پایا جاتا ہے۔

آیت ۱۴ ﴿ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ۭ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝۱۴﴾ ''(اُس دن ان سے کہا جائے گا:) اب چکھو مزا اپنی شرارت کا۔ یہ ہے وہ (عذاب) جس کی تم جلدی مچایا کرتے تھے۔''

تم لوگ ہمارے رسولؐ کو چیلنج کیا کرتے تھے نا کہ لے آؤ ہم پر عذاب اگر لا سکتے ہو۔ چنانچہ یہ ہے آج تمہارے اس

مطالبے کا جواب۔ اب چکھو اس عذاب کا مزا!

آیت ۱۵ ﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝۱۵﴾ ''یقیناً اہلِ تقویٰ باغات اور چشموں کے اندر ہوں گے۔''

آیت ۱۶ ﴿اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ۝۱۶﴾ ''وہ (شکریے کے ساتھ) لے رہے ہوں گے جو کچھ ان کا رب انہیں دے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس سے پہلے نیکوکار تھے۔''

یہ لوگ دنیا کی زندگی میں اپنے نیک اعمال کی وجہ سے درجہ احسان تک پہنچے ہوئے تھے۔

آیت ۱۷ ﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝۱۷﴾ ''رات کا تھوڑا ہی حصہ ہوتا تھا جس میں وہ سوتے تھے۔''

ان لوگوں کی راتوں کا بیشتر حصہ اپنے رب کے حضور حاضری میں گزرتا تھا۔ سورۃ الفرقان میں ''عباد الرحمٰن'' کے اس معمول کا ذکر اس طرح آیا ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝۶۴﴾ ''اور وہ لوگ راتیں بسر کرتے ہیں اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام کرتے ہوئے۔''

آیت ۱۸ ﴿وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝۱۸﴾ ''اور سحری کے اوقات میں وہ استغفار کرتے تھے۔''

آیت ۱۹ ﴿وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝۱۹﴾ ''اور ان کے اموال میں سائل اور محتاج کا حق ہوا کرتا تھا۔''

انہوں نے اس حقیقت کو قبول کر رکھا تھا کہ ان کے پاس اللہ رب العالمین کا دیا جو کچھ بھی ہے اس میں فقراء و مساکین کا بھی حصہ ہے اور وہ متعلقہ لوگوں کا حق ان تک پہنچایا بھی کرتے تھے۔

آیت ۲۰ ﴿وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝۲۰﴾ ''اور زمین میں (ہر چہار طرف) نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے۔''

سورۃ البقرۃ آیت ۱۶۴ (آیت الآیات) میں اللہ تعالیٰ کی ان نشانیوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ ہوا ہے۔

آیت ۲۱ ﴿وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝۲۱﴾ ''اور تمہاری اپنی جانوں میں بھی (نشانیاں ہیں)۔ تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟''

یعنی انسان کے جسم اور جسم کے ایک ایک نظام کے اندر اللہ تعالیٰ کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ وہ ان نشانیوں پر غور کرے۔ مرزا بیدلؔ نے اس خوبصورت شعر میں اسی مضمون کی ترجمانی کی ہے: ؎

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن درآ
تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درآ!

اے انسان! بڑے ستم کی بات ہے اگر تجھے تیری خواہشِ نفس کسی باغ کی سیر کے لیے کھینچ کر لے جاتی ہے جبکہ خود تیری اپنی چمک دمک کسی پھول سے کم نہیں ہے۔ کبھی اپنے دل کا دروازہ کھول کر اس چمن کی سیر کے لیے بھی آؤ جو تمہاری روح کے اندر اللہ تعالیٰ نے مہکا رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اپنی تخلیق اور اپنے وجود پر غور کرے اور اس اعتبار سے اپنے مقام و مرتبہ کو پہچانے۔ بقول مرزا بیدلؔ: ؎

ہر دو عالم خاک شد تا بست نقشِ آدمی
اے بہارِ نیستی از قدرِ خود ہوشیار باش!

(اس شعر کی تشریح سورۃ النحل کی آیت ۴۰ کے تحت بیان ہوئی ہے۔)

آیت ۲۲ ﴿وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ۝۲۲﴾ ''اور آسمان میں تمہارا رزق ہے اور وہ بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارا رزق بھی طے شدہ ہے اور تمہارے جنّت یا دوزخ میں جانے کا فیصلہ بھی اُسی کی مشیت سے ہونا ہے۔

آیت ۲۳ ﴿فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ۝۲۳﴾ ''تو آسمانوں اور زمین کے رب کی قسم یقیناً یہ حق ہے' بالکل ایسے جیسے (اِس وقت) تم بات چیت کر رہے ہو۔''

یعنی بعث بعد الموت شدنی ہے' برحق ہے' قیامت آ کر رہے گی۔

آیات ۲۴ تا ۴۶

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝۲۴ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝۲۵ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ۝۲۶ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝۲۷ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝۲۸ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ۝۲۹ قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۝۳۰ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝۳۱ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۝۳۲ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ۝۳۳ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ۝۳۴ فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۳۵ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۳۶ وَتَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝۳۷ وَفِيْ مُوْسٰٓى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝۳۸ فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝۳۹ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيْمٌ ۝۴۰ وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ۝۴۱ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ۝۴۲ وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ۝۴۳ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝۴۴ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ۝۴۵ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝۴۶

الجزء السابع والعشرون (۲۷)

آیت ۲۴ ﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝۲۴﴾ ''کیا آپؐ کے پاس ابراہیمؑ کے معزز مہمانوں کی خبر پہنچی ہے!''

یہ اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جب فرشتے انسانی شکلوں میں مہمان بن کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گھر آئے تھے۔

آیت ۲۵ ﴿اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ﴾ ''جب وہ اُس کے ہاں داخل ہوئے تو انہوں نے سلام کہا۔''
﴿قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝۲۵﴾ ''اس نے بھی (جواب میں) سلام کہا (اور دل میں کہا کہ) یہ تو کوئی اجنبی لوگ ہیں۔''

آیت ۲۶ ﴿فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ۝۲۶﴾ ''پھر وہ چپکے سے اپنے گھر والوں کی طرف گیا اور ایک (بھنا ہوا) موٹا تازہ بچھڑا لے آیا۔''

سورۂ ہود (آیت ۶۹) میں ''عِجْلٍ حَنِيْذٍ'' (بھنا ہوا بچھڑا) کے الفاظ آئے ہیں۔ پرانے زمانے کی دعوتیں اسی انداز سے ہوا کرتی تھیں کہ جانور ذبح کیا اور گھی میں تل کر یا بھون کر پورے کا پورا مہمانوں کے سامنے حاضر کر دیا۔

آیت ۲۷ ﴿فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝۲۷﴾ ''پھر اسے ان کی طرف بڑھایا اور کہا کہ آپ لوگ کھاتے نہیں؟''

آیت ۲۸ ﴿فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ﴾ ''تو اُس نے ان کی طرف سے دل میں اندیشہ محسوس کیا۔''

مہمانوں کے کھانا تناول نہ کرنے پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اندیشہ لاحق ہوا کہ شاید یہ لوگ میرے دشمن ہیں' مجھے نقصان پہنچانا چاہتے ہیں اور اسی لیے میرا نمک کھانے سے احتراز کر رہے ہیں۔ پرانے زمانے کے لوگ دشمنی میں بھی شرافت دکھاتے تھے۔ اگر کسی کا نمک کھا لیا جاتا تو اس کے بعد اسے نقصان پہنچانے کا نہیں سوچا جاتا تھا۔

﴿قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ﴾ ''انہوں نے کہا: آپ ڈریں نہیں۔''
﴿وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝۲۸﴾ ''اور انہوں نے اسے بشارت دی ایک صاحبِ علم بیٹے کی۔''

صاحبِ علم بیٹے سے مراد حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں جن کی پیدائش کی بشارت فرشتوں نے دی۔

آیت ۲۹ ﴿فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ۝۲۹﴾ ''اس پر اُس کی بیوی سامنے آئی بڑبڑاتی ہوئی اور اس نے اپنا ماتھا پیٹ لیا اور کہنے لگی: بڑھیا بانجھ (بچہ جنے گی کیا)؟''

کہ میں تو ساری عمر بانجھ رہی ہوں اور اب تو میری عمر بھی ماں بننے کی نہیں رہی' تو کیا اب میرے ہاں بیٹا پیدا ہوگا؟

آیت ۳۰ ﴿قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ﴾ ''انہوں نے کہا: ایسا ہی فرمایا ہے آپ کے رب نے۔''

فرشتے جو انسانی شکل میں تھے انہوں نے جواب دیا: یقیناً ایسے ہی ہوگا۔ ہم اپنی طرف سے یہ خبر نہیں دے رہے' بلکہ یہ آپ کے رب کا فیصلہ ہے۔

﴿اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۝۳۰﴾ ''یقیناً وہ بہت حکمت والا بھی ہے اور سب کچھ جاننے والا بھی۔''

آیت ۳۱ ﴿قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝۳۱﴾ ''ابراہیم نے پوچھا: اے ایلچیو! پھر آپ لوگوں کا مقصد کیا ہے؟''

آپ کا قصد اور ارادہ کیا ہے؟ کیا خصوصی مہم آپ کو درپیش ہے؟

آیت ۳۲ ﴿قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۝۳۲﴾ ''انہوں نے کہا: ہم بھیجے گئے ہیں ایک مجرم قوم کی طرف۔''

آیت ۳۳ ﴿لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ۝۳۳﴾ ''تاکہ ہم ان پر بارش برسائیں کنکریوں کی۔''

آیت ۳۴ ﴿مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ۝۳۴﴾ ''جو نشان زدہ ہیں آپ کے رب کے پاس حد سے بڑھ جانے والوں کے لیے۔''

اللہ تعالیٰ نے ہر کنکری کو ان کے ایک خاص فرد کے لیے مخصوص کر رکھا ہے جو اس کے لیے گولی (bullet) کا کام کرے گی۔

آیت ۳۶ ﴿فَاَخۡرَجۡنَا مَنۡ كَانَ فِيۡهَا مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۞ ۳۶﴾ ''پھر ہم نے نکال لیے جو بھی اس بستی میں تھے اہلِ ایمان۔''

آیت ۳۷ ﴿فَمَا وَجَدۡنَا فِيۡهَا غَيۡرَ بَيۡتٍ مِّنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ۞ ۳۷﴾ ''تو نہیں پایا ہم نے اس میں سوائے ایک گھر کے کسی کو مسلمانوں میں سے۔''

یعنی حضرت لوط علیہ السلام کے ایک گھر کے سوا اس پوری قوم میں اور کوئی بھی مسلمان نہیں تھا۔

آیت ۳۷ ﴿وَتَرَكۡنَا فِيۡهَاۤ اٰيَةً لِّلَّذِيۡنَ يَخَافُوۡنَ الۡعَذَابَ الۡاَلِيۡمَ ۞ ۳۷﴾ ''اور ہم نے اس میں ایک نشانی چھوڑ دی ان لوگوں کے لیے جو ڈرتے ہوں دردناک عذاب سے۔''

قومِ لوط کی بستیاں (سدوم اور عاموره) سمندر کے کنارے پر آباد تھیں' جو اب بحیرۂ مُردار (Dead Sea) کہلاتا ہے۔ ان بستیوں کے بارے میں یہی اندازہ تھا کہ جب زلزلے سے یہ علاقہ تلپٹ ہوا ہوگا تو یہ بستیاں سمندر میں غرق ہوگئی ہوں گی۔ اب اس کی تصدیق بھی ہوگئی ہے اور بحیرۂ مُردار کی تہہ میں ان شہروں کے کھنڈرات کو دریافت بھی کر لیا گیا ہے۔ یہاں نشانی سے مراد یہی کھنڈرات ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے رہتی دنیا تک لوگوں کی عبرت کے لیے ظاہر فرما دیا ہے۔

آیت ۳۸ ﴿وَفِىۡ مُوۡسٰۤى اِذۡ اَرۡسَلۡنٰهُ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ بِسُلۡطٰنٍ مُّبِيۡنٍ ۞ ۳۸﴾ ''اور موسیٰؑ کے معاملے میں بھی (نشانی ہے) جب ہم نے اسے بھیجا فرعون کی طرف کھلی سند دے کر۔''

آیت ۳۹ ﴿فَتَوَلّٰى بِرُكۡنِهٖ﴾ ''تو اُس نے مُنہ موڑ لیا اپنی شان و شوکت کے گھمنڈ میں''

﴿وَقَالَ سٰحِرٌ اَوۡ مَجۡنُوۡنٌ ۞ ۳۹﴾ ''اور کہا کہ یہ ساحر ہے یا مجنون ہے۔''

یعنی فرعون نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہی القابات دیے تھے جو اہلِ مکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دے رہے تھے۔

آیت ۴۰ ﴿فَاَخَذۡنٰهُ وَجُنُوۡدَهٗ فَنَبَذۡنٰهُمۡ فِى الۡيَمِّ وَهُوَ مُلِيۡمٌ ۞ ۴۰﴾ ''سو ہم نے پکڑا اُس کو اور اُس کے لشکروں کو اور انہیں پھینک دیا سمندر میں اور وہ ملامت زدہ تھا۔''

آیت ۴۱ ﴿وَفِىۡ عَادٍ اِذۡ اَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمُ الرِّيۡحَ الۡعَقِيۡمَ ۞ ۴۱﴾ ''اور قومِ عاد میں بھی (نشانی ہے) جب ہم نے اُن پر ایک ایسی ہوا چھوڑ دی تھی جو ہر خیر سے خالی تھی۔''

عَقِیم کے معنی بانجھ کے ہیں' یعنی ایسا مرد یا ایسی عورت جس کے اولاد پیدا نہ ہوتی ہو۔ قبل ازیں آیت ۲۹ میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے۔ اس مفہوم میں اَلرِّیۡحَ الۡعَقِیۡمَ سے مراد ایسی ہوا ہے جو ہر قسم کی خیر سے خالی تھی۔

آیت ۴۲ ﴿مَا تَذَرُ مِنۡ شَىۡءٍ اَتَتۡ عَلَيۡهِ اِلَّا جَعَلَتۡهُ كَالرَّمِيۡمِ ۞ ۴۲﴾ ''وہ نہیں چھوڑتی تھی کسی شے کو جس پر وہ آ جاتی تھی مگر اُس کو چورا چورا کر کے رکھ دیتی تھی۔''

آیت ۴۳ ﴿وَفِىۡ ثَمُوۡدَ اِذۡ قِيۡلَ لَهُمۡ تَمَتَّعُوۡا حَتّٰى حِيۡنٍ ۞ ۴۳﴾ ''اور اسی طرح ثمود کے معاملے میں بھی (نشانی ہے) جب ان سے کہا گیا کہ ایک خاص وقت تک کے لیے تم فائدہ اٹھا لو (دنیا کی نعمتوں سے)۔''

آیت ۴۴ ﴿فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ﴾ ''تو انہوں نے سرکشی کی اپنے رب کے حکم سے''
﴿فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝۴۴﴾ ''تو ان کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک چنگھاڑ نے انہیں آ پکڑا۔''

آیت ۴۵ ﴿فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ۝۴۵﴾ ''تو نہ ان میں کھڑے ہونے کی سکت رہی اور نہ ہی اس قابل رہے کہ بدلہ لیتے۔''
یعنی نہ تو وہ اُٹھ ہی سکے اور نہ اپنا بچاؤ ہی کر سکے۔

آیت ۴۶ ﴿وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ﴾ ''اور قومِ نوحؑ کو بھی اس سے پہلے (ہم نے پکڑا)۔''
﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝۴۶﴾ ''یقیناً وہ بھی بڑے ہی نافرمان لوگ تھے۔''
نوٹ کیجیے یہاں حضرت شعیب علیہ السلام کے سوا ان سب پیغمبروں کا ذکر آ گیا ہے جن کے حالات طویل مکّی سورتوں میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ یعنی سورۃ الاعراف اور سورۂ ہود میں ایک ایک پیغمبر کا واقعہ عموماً ایک ایک رکوع میں بیان ہوا ہے لیکن یہاں ان کا ذکر ایک ایک دو دو آیات میں آیا ہے۔ گویا بعد میں نازل ہونے والی طویل مکّی سورتوں میں انباء الرسل کی تفصیل بیان ہوئی ہے جبکہ زیر مطالعہ مکّی سورتوں میں ان پیغمبروں کا ذکر انتہائی مختصر انداز میں آیا ہے۔

آیات ۴۷ تا ۶۰

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ۝۴۷ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ۝۴۸ وَمِنْ
كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝۴۹ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۵۰
وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۵۱ كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝۵۲ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۝۵۳
فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ۝۵۴ وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۵۵ وَمَا خَلَقْتُ
الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝۵۶ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ۝۵۷
اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ۝۵۸ فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا
يَسْتَعْجِلُوْنِ ۝۵۹ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ يَّوْمِهِمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ۝۶۰ ع

آیت ۴۷ ﴿وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ۝۴۷﴾ ''اور آسمان کو ہم نے بنایا اپنے ہاتھوں سے اور ہم (اس کو) توسیع دینے والے ہیں۔''
اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ کا ترجمہ عام طور پر ''ہم بڑی ہی وسعت رکھنے والے ہیں'' یا ''ہم بڑی قدرت والے ہیں'' کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن لغوی اعتبار سے اس کا یہ ترجمہ زیادہ مناسب اور زیادہ جامع ہے جو اوپر متن میں اختیار کیا گیا ہے۔ اَوْسَع یُوسِعُ باب افعال ہے، جس کا مطلب ہے کشادہ کرنا، وسعت دینا۔ وَسِعَ ثلاثی مجرد ہے، جس سے اسم الفاعل وَاسِعٌ آتا ہے۔ چنانچہ ﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ

عَلِیۡمٌ﴾ کا مطلب ہے: اللہ بڑی وسعت والا ہے‘ اس کے خزانے لامحدود ہیں۔ جبکہ مُوۡسِعٌ باب افعال سے اسم الفاعل ہے اور اس کے معنی ہوں گے: وسعت دینے والا۔ اس لحاظ سے یہاں ﴿اِنَّا لَمُوۡسِعُوۡنَ﴾ کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اس کائنات کو مسلسل وسعت بخش رہے ہیں‘ اسے وسیع سے وسیع تر کیے جا رہے ہیں۔ اور یہ وہی بات ہے جو آج ہمیں سائنس کی مدد سے معلوم ہوئی ہے۔ آج سے نصف صدی پہلے تک انسان کو یہ سب کچھ معلوم نہیں تھا مگر آج ہم جانتے ہیں کہ کائنات میں ہر گھڑی نئے نئے ستارے پیدا ہو رہے ہیں‘ ہر آن نئی نئی کہکشائیں وجود میں آ رہی ہیں اور یہ کائنات مسلسل پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ ''Expanding Universe'' کے اس تصور کو اقبالؔ نے اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے: ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کُن فَیَکُوۡن

تو اللہ تعالیٰ کی شانِ کُنۡ فَیَکُوۡن کا ظہور مسلسل جاری ہے۔ اسی مفہوم کو سورۂ فاطر کی پہلی آیت میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: ﴿یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ ؕ﴾ ''وہ اپنی تخلیق میں جو چاہتا ہے اضافہ کرتا رہتا ہے''۔ چنانچہ وہ آسمانوں کو یعنی کائنات کو مسلسل وسعت دیے جا رہا ہے۔

آیت ۴۸ ﴿وَ الۡاَرۡضَ فَرَشۡنٰہَا فَنِعۡمَ الۡمٰہِدُوۡنَ ﴿۴۸﴾﴾ ''اور زمین کو ہم نے (فرش کی مانند) بچھا دیا‘ پس ہم کیا ہی خوب بچھانے والے ہیں!''

آیت ۴۹ ﴿وَ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَیۡنِ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۴۹﴾﴾ ''اور ہم نے ہر شے کے جوڑے بنائے ہیں شاید کہ تم نصیحت اخذ کرو۔''

''جوڑوں'' کی تخلیق میں ہمارے لیے کس کس پہلو سے نصیحت کا سامان ہے؟ یہ جاننے کے لیے تحقیق کا میدان بہت وسیع ہے۔ یہاں پر اس حوالے سے صرف یہ نکتہ سمجھ لیجیے کہ اس مفہوم کی آیات آخرت سے متعلق عقلی دلیل فراہم کرتی ہیں۔ یعنی جب ہر شے کا جوڑا ہے تو دنیا کا بھی تو جوڑا ہونا چاہیے اور ظاہر ہے دنیا کا جوڑا آخرت ہے۔

آیت ۵۰ ﴿فَفِرُّوۡۤا اِلَی اللّٰہِ ؕ اِنِّیۡ لَکُمۡ مِّنۡہُ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۵۰﴾﴾ ''تو دوڑو اللہ کی طرف‘ یقیناً میں تم لوگوں کے لیے اُس کی طرف سے صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں۔''

اگر اللہ تعالیٰ کا پیغام تم تک پہنچ گیا ہے اور میری باتیں تمہاری سمجھ میں آ گئی ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے میں دیر نہ کرو۔ ممکن ہے فرشتے کو تمہاری جان قبض کرنے کا حکم بھی مل چکا ہو اور تمہاری مہلتِ عمل ختم ہونے کا وقت بالکل قریب آ لگا ہو۔

آیت ۵۱ ﴿وَ لَا تَجۡعَلُوۡا مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ ؕ﴾ ''اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ ٹھہراؤ۔''

﴿اِنِّیۡ لَکُمۡ مِّنۡہُ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۵۱﴾﴾ ''یقیناً میں اُس کی جانب سے تمہارے لیے واضح طور پر خبردار کرنے والا ہوں۔''

آیت ۵۲ ﴿کَذٰلِکَ مَاۤ اَتَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا قَالُوۡا سَاحِرٌ اَوۡ مَجۡنُوۡنٌ ﴿۵۲﴾﴾ ''اسی طرح (ہوتا آیا ہے کہ) نہیں آیا تھا ان سے پہلے لوگوں کے پاس کوئی رسول مگر انہوں نے یہی کہا تھا کہ یہ ساحر ہے یا مجنون ہے۔''

آیت ۵۳ ﴿اَتَوَاصَوۡا بِہٖ ۚ﴾ ''کیا وہ ایک دوسرے کو وصیت کر گئے تھے اس کی؟''

یعنی جو باتیں آج سے صدیوں پہلے کے لوگ اپنے پیغمبروں سے کہتے تھے‘ عین وہی باتیں قریشِ مکہ آج ہمارے آخری رسول ﷺ سے کہہ رہے ہیں۔ کیا ان کی ہر نسل دوسری نسل کو یہ باتیں وصیت میں بتا کر جاتی رہی ہے؟

﴿بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿۵۳﴾﴾ ’’بلکہ یہ ہیں ہی سرکش لوگ!‘‘

ان کے رویّے کی یکسانی اور ایک ہی طرزِ جواب کی مسلسل تکرار کی وجہ یہ ہے کہ طغیان و سرکشی ان سب کا مشترک وصف ہے۔ چنانچہ اپنے اپنے پیغمبروں کے خلاف ان کے اعتراضات بھی ایک جیسے ہیں۔

آیت ۵۴ ﴿فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ﴿۵۴﴾﴾ ’’پس (اے نبی ﷺ!) آپ ان سے رُخ پھیر لیں‘ آپ پر کوئی ملامت نہیں ہے۔‘‘

یعنی اگر وہ آپ ﷺ کی مخالفت میں یہاں تک آ گئے ہیں کہ آپؐ کو شاعر‘ ساحر‘ مجنون اور معلَّم (سکھایا ہوا) تک کہہ رہے ہیں اور آپؐ کی دعوت سے مسلسل اعراض کر رہے ہیں تو اب آپ بھی اپنی توجہ ان کی طرف سے ہٹا لیجیے۔ آپ محکم دلائل کے ساتھ ان پر اتمامِ حجت کر چکے ہیں۔ اگر یہ لوگ راہِ راست پر نہ آئے تو اس کی جواب دہی آپ سے نہیں ہوگی۔ لہٰذا آپ انہیں چھوڑ کر اُن لوگوں کی طرف اپنی توجہ مرکوز کریں جو آپؐ کی بات کو سننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔

آیت ۵۵ ﴿وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۵﴾﴾ ’’اور آپؐ تذکیر کرتے رہیے‘ کیونکہ یہ تذکیر اہلِ ایمان کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔‘‘

آپ ﷺ تعلیم و تبلیغ کی صورت میں تذکیر و یاددہانی کا سلسلہ جاری رکھیں۔ یہ سرکش لوگ اگر اس تذکیر کو نظر انداز کر رہے ہیں تو کچھ مضائقہ نہیں‘ اہلِ ایمان کے لیے تو یہ بہت مفید ہے۔ آپ سے قرآن سن سن کر اہلِ ایمان کے ایمان میں برابر اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

آیت ۵۶ ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾﴾ ’’اور مَیں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر صرف اس لیے کہ وہ میری بندگی کریں۔‘‘

شیخ سعدیؒ نے اس مفہوم کی ترجمانی اس طرح کی ہے: ؎

زندگی آمد برائے بندگی زندگی بے بندگی شرمندگی!

یہ آیت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں تخلیقِ انسانی کی غایت بیان کی گئی ہے۔ کائنات کی تخلیق کے حوالے سے عام طور پر ایک سوال یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس تخلیق کا سبب کیا ہے؟ یہ ایک مشکل اور پیچیدہ سوال ہے جس کے جواب میں ہر زمانے کے فلاسفر اور حکماء نے اپنی اپنی آراء دی ہیں۔ یہ ان تفاصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ ایک عام شخص کے لیے تخلیقِ کائنات کے سبب کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا ضروری نہیں اور اس لاعلمی کی وجہ سے اسے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ بھی نہیں۔ البتہ اپنی تخلیق کی غرض و غایت کے بارے میں جاننا ہر انسان کے لیے ضروری ہے۔ اگر انسان کو اپنی غایتِ تخلیق ہی کا علم نہیں ہوگا تو گویا اس کی ساری زندگی رائیگاں جائے گی۔ چنانچہ اس آیت میں بنی نوع انسان کو ان کی غایتِ تخلیق واضح طور پر بتا دی گئی ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ’’بندگی‘‘ کے لیے پیدا کیا ہے۔

بندگی یا عبادت کے بارے میں قبل ازیں بھی مَیں نے کئی مرتبہ وضاحت کی ہے کہ اس کے تین حصے ہیں: اوّلاً ہمہ تن اطاعت' ثانیاً اطاعت کی روح یعنی اللہ تعالیٰ کی غایت درجے کی محبت۔ عبادت اصلاً ان دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہے (اَلْعِبَادَۃُ تَجْمَعُ اَصْلَیْنِ: غَایَۃَ الْحُبِّ مَعَ غَایَۃِ الذُّلِّ وَالْخُضُوْعِ)۔ جبکہ تیسری چیز مراسمِ عبودیت ہے' جس کی حیثیت عبادت کے ظاہر یا جسم کی ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کی حالت (قنوت) میں کھڑے ہونا (قیام)' رکوع' سجدہ' حمد یہ کلمات ادا کرنا' نماز وغیرہ مراسمِ عبودیت ہیں اور ان کی اپنی اہمیت ہے۔ اگر ہم عبادت کی اس تعریف (اللہ تعالیٰ کی ہمہ تن اطاعت) کی روشنی میں آج اپنی حالت کا جائزہ لیں تو یہ تلخ حقیقت واضح ہوگی کہ ہم میں سے جو لوگ اپنے زعم میں شب و روز پابندی کے ساتھ اللہ ربّ العزت کی عبادت پر کمربستہ ہیں وہ بھی زیادہ سے زیادہ دس یا پندرہ فیصد تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر رہے ہیں۔ اس کا واضح تر مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگیوں کا غالب حصہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اطاعت سے نکلا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں اس پر کافرانہ نظام کا غلبہ ہے اور اس نظام کے تحت رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی ہمہ تن اطاعت ممکن ہی نہیں۔ ان حالات میں ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت یا عبادت کے تقاضوں سے کیسے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب جاننے کے خواہش مند حضرات اس موضوع پر میری کتب اور تقاریر سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

آیت زیر مطالعہ کے حوالے سے یہاں پر مختصراً یہ سمجھ لیں کہ مادی و علمی لحاظ سے انسان جس قدر چاہے ترقی کر لے اگر وہ اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت یا بندگی کے قالب میں ڈھالنے سے قاصر رہا تو انسانی سطح پر اس کی ساری زندگی بیکار اور رائیگاں ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے ان اشعار میں انسان کی اسی ناکامی کی طرف اشارہ کیا ہے: ؎

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا!

آیت ۵۷ ﴿مَآ اُرِیْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ﴾ ''مَیں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا''
﴿وَّمَآ اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ ۝۵۷﴾ ''اور نہ مَیں یہ چاہتا ہوں کہ یہ مجھے کھلائیں' پلائیں۔''

آیت ۵۸ ﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِیْنُ ۝۵۸﴾ ''یقیناً اللہ ہی سب کو رزق دینے والا' قوت والا' زبردست ہے۔''

آیت ۵۹ ﴿فَاِنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا یَسْتَعْجِلُوْنِ ۝۵۹﴾ ''پس ان ظالموں کا پیمانہ بھی لبریز ہو چکا ہے جس طرح ان کے ساتھیوں کا پیمانہ لبریز ہوا تھا' سو یہ مجھ سے جلدی نہ مچائیں۔''

''ذَنُوب'' ایسے ڈول کو کہتے ہیں جو پانی وغیرہ سے لبالب بھرا ہوا ہو۔ مراد یہ کہ زمانہ ماضی میں عذاب کا شکار ہونے والی اقوام کی طرح ان کفار و مشرکین کی بداعمالیوں کا ڈول بھی لبریز ہو چکا ہے اور یہ ڈول اب کسی وقت بھی کھینچا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اگر فوری طور پر ان کی پکڑ نہیں بھی ہو رہی تو اس سے وہ یہ نہ سمجھیں کہ انہیں یونہی چھوڑ دیا جائے گا۔

آیت ۶۰ ﴿فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ یَّوْمِهِمُ الَّذِیْ یُوْعَدُوْنَ ۝۶۰﴾ ''تو ہلاکت اور بربادی ہے ان کافروں کے لیے اُس دن سے جس کا اُن سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔''

سُوْرَةُ الطُّوْرِ

تمہیدی کلمات

سورۃ الطور کے آغاز میں پانچ قسموں کا ذکر ہے۔ ان قسموں کے مفہوم کا تعین کرنا مشکلات القرآن میں سے ہے۔ سورۃ الطور اور سورۃ الذاریات کے درمیان نسبتِ زوجیت اور گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔ مثلاً دونوں سورتوں کے آغاز کا اسلوب بھی ایک جیسا ہے۔ دونوں کے آغاز میں پے در پے قسمیں کھائی گئی ہیں اور دونوں کی قسموں کا مُقسَم علیہ بھی ایک ہے۔ سورۃ الذاریات کی قسموں کے بعد فرمایا گیا: ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝۵ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝۶﴾ جبکہ سورۃ الطور کی قسموں کے مُقسَم علیہ کا ذکر یوں ہوا: ﴿اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝۷ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝۸﴾۔ اس کے بعد سورۃ الذاریات میں جنّت اور دوزخ کی کیفیات کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور بالکل اسی انداز سے یہ مضمون سورۃ الطور میں بھی آیا ہے۔ پھر سورۃ الذاریات کے دوسرے رکوع میں نہایت اختصار کے ساتھ انباءُ الرسل کا تذکرہ ہے جبکہ سورۃ الطور میں اس کے مقابل تذکیر بالآءِ اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور اس کی صفاتِ کاملہ کا ذکر ہے۔

آیات ۱ تا ۲۸

سُوْرَةُ الطُّوْرِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۴۹ رُكُوْعَاتُهَا: ۲

وَ الطُّوْرِ ۝۱ وَ كِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۝۲ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۝۳ وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ۝۴ وَ السَّقْفِ
الْمَرْفُوْعِ ۝۵ وَ الْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۝۶ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝۷ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝۸ يَّوْمَ
تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۝۹ وَّ تَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۝۱۰ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۱۱ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ
خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ۝۱۲ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ۝۱۳ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا
تُكَذِّبُوْنَ ۝۱۴ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ۝۱۵ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ
عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۶ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَعِيْمٍ ۝۱۷ فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ
رَبُّهُمْ ۚ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝۱۸ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۹ مُتَّكِـِٕيْنَ
عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ۝۲۰ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ
اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ مَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ۝۲۱ وَ
اَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ۝۲۲ يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ ۝۲۳ وَ

يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿۲۴﴾ وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۵﴾
قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ وَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ اِنَّا
كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ﴿۲۸﴾

آیت ۱ ﴿وَالطُّوْرِ ۙ﴿۱﴾﴾ ''قسم ہے طور کی۔''

طور عام پہاڑ کو بھی کہا جاتا ہے' لیکن ''الطُّور'' سے مراد وہ خاص پہاڑ (طورِ سینین)[1] ہے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے تھے۔

آیت ۲ ﴿وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۙ﴿۲﴾﴾ ''اور اُس کتاب کی قسم جو لکھی ہوئی ہے۔''

اس بارے میں غالب گمان یہی ہے کہ اس سے مراد تورات ہے' کیونکہ تورات پتھر کی تختیوں پر لکھی ہوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئی تھی' جبکہ قرآن قلبِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر براہِ راست نازل ہوا تھا۔

آیت ۳ ﴿فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۙ﴿۳﴾﴾ ''کشادہ ورق میں۔''

یعنی وہ تختیاں خوب کشادہ تھیں جن پر تورات کی عبارت تحریر تھی۔ گویا یہ تین قسمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات سے متعلق ہیں۔ کوہِ طور پر آپؑ کو مکالمۂ الٰہی سے سرفراز فرمایا گیا اور آپؑ کو ایک ایسی کتاب عطا کی گئی جو کشادہ تختیوں پر لکھی ہوئی تھی۔

آیت ۴ ﴿وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ۙ﴿۴﴾﴾ ''اور قسم ہے آباد گھر کی۔''

''البَیْتِ الْمَعْمُوْر'' سے بعض مفسرین بیت اللہ مراد لیتے ہیں کہ اس میں طواف اور عبادت کے لیے ہر وقت لوگ موجود رہتے ہیں۔ بعض دوسرے مفسرین کی رائے میں اس سے مراد خانہ کعبہ کے عین اوپر ساتویں آسمان میں فرشتوں کا کعبہ ہے جو ہر وقت ''معمور'' رہتا ہے' جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے۔ اس کے علاوہ بعض مفسرین کی رائے میں اس سے دنیا مراد ہے جو طرح طرح کی مخلوق سے معمور ہے اور مجھے ذاتی طور پر اس رائے سے اتفاق ہے۔ اس لیے کہ بعد والی قسم اسی مفہوم سے مناسبت رکھتی ہے۔

آیت ۵ ﴿وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ۙ﴿۵﴾﴾ ''اور قسم ہے اونچی چھت کی۔''

اس سے آسمان مراد ہے۔ پچھلی آیت کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ یہ دنیا ایک گھر کی مانند ہے جس میں انسان آباد ہیں اور آسمان اس گھر کی چھت ہے۔

آیت ۶ ﴿وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۙ﴿۶﴾﴾ ''اور قسم ہے اُبلتے ہوئے سمندر کی۔''

اس سے سمندر کی وہ کیفیت مراد ہے جسے ہم اپنی زبان میں ''موج زن سمندر'' یا ''ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر'' کہہ کر بیان کرتے ہیں۔ سمندر کو دیکھنے سے واقعتاً ایسے محسوس بھی ہوتا ہے جیسے یہ جوش سے اُبل رہا ہے۔ بہرحال جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے ان قسموں کے معانی و مفاہیم کے بارے میں مفسرین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ البتہ ان قسموں کا مُقسَم علیہ وہی ہے جو کہ سورۃ الذّاریات کی قسموں کا مُقسَم علیہ ہے۔

۱۔ اس کا تذکرہ سورۃ التّین میں بایں الفاظ ہوا ہے: ﴿وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۙ﴿۲﴾﴾ ''اور قسم ہے طورِ سینین کی!''

آیت ۷ ﴿اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝۷﴾ ''آپؐ کے ربّ کا عذاب یقیناً واقع ہو کر رہے گا۔''

اس سے قیامت کا سخت دن مراد ہے جس کے اٹل ہونے کی حقیقت کو سورۃ الشوریٰ کی آیت ۴۷ میں ﴿یَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ﴾ ''وہ دن جسے لوٹایا نہ جا سکے گا'' کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

آیت ۸ ﴿مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝۸﴾ ''اسے کوئی روکنے والا نہ ہوگا۔''

آیت ۹ ﴿یَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۝۹﴾ ''جس روز کہ آسمان بُری طرح لرزے گا۔''

آیت ۱۰ ﴿وَّتَسِیْرُ الْجِبَالُ سَیْرًا ۝۱۰﴾ ''اور پہاڑ چل رہے ہوں گے جیسے چلا جاتا ہے۔''

پہاڑوں پر زمین کی گرفت برقرار نہیں رہے گی اور وہ ٹوٹ کر فضا میں بادلوں کی طرح اُڑتے پھریں گے۔

آیت ۱۱ ﴿فَوَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ۝۱۱﴾ ''پس ہلاکت و بربادی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔''

آیت ۱۲ ﴿الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ خَوْضٍ یَّلْعَبُوْنَ ۝۱۲﴾ ''وہ لوگ جو خوش گپیوں میں مصروف کھیل رہے ہیں۔''

آیت ۱۳ ﴿یَوْمَ یُدَعُّوْنَ اِلٰی نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ۝۱۳﴾ ''جس دن ان کو دھکے دے دے کر جہنّم کی طرف دھکیلا جائے گا۔''

آیت ۱۴ ﴿هٰذِهِ النَّارُ الَّتِیْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۝۱۴﴾ ''(اور کہا جائے گا:) یہ ہے وہ آگ جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔''

آیت ۱۵ ﴿اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ۝۱۵﴾ ''کیا یہ جادو ہے یا تم دیکھ نہیں رہے ہو؟''

اب بتاؤ! کیا تم اپنے سامنے واقعی جہنّم کو دیکھ رہے ہو یا اس کو بھی تم جادو کا کھیل ہی سمجھتے ہو؟

آیت ۱۶ ﴿اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَیْكُمْ ؕ﴾ ''اب داخل ہو جاؤ اس میں' تم خواہ صبر کرو یا نہ کرو' اب تمہارے حق میں برابر ہے۔''

اب تمہارے جزع فزع کرنے اور چیخنے چلّانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اب یہاں کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔ تمہارے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس میں خاموشی سے داخل ہو جاؤ اور اس کی سختیوں کو صبر سے برداشت کرو۔

﴿اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۶﴾ ''تمہیں بدلے میں وہی کچھ تو مل رہا ہے جو کچھ تم عمل کیا کرتے تھے۔''

آیت ۱۷ ﴿اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَعِیْمٍ ۝۱۷﴾ ''یقیناً متقی لوگ باغات اور نعمتوں میں ہوں گے۔''

آیت ۱۸ ﴿فٰكِهِیْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۚ﴾ ''وہ مزے کر رہے ہوں گے ان نعمتوں کے ساتھ جو اُن کے ربّ نے انہیں عطا کی ہوں گی۔''

﴿وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ ۝۱۸﴾ ''اور بچا لے گا انہیں ان کا ربّ جہنّم کے عذاب سے۔''

آیت ۱۹ ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِیْٓـًٔا ۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۹﴾ ''اور کھاؤ پیو رچتا پچتا' اُن اعمال کا صلہ جو تم کرتے رہے ہو۔''

قبل ازیں بھی متعدد مرتبہ ذکر ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ جنّت کی قدر افزائی کے لیے جنّت اور اس کی نعمتوں کو ان کے اعمال کا صلہ قرار دیا جائے گا' جبکہ اہلِ جنّت بار بار یہ اقرار کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار! یہ تیرا فضل ہے جو تُو نے ہمیں بخش دیا اور جنّت کی نعمتوں سے سرفراز فرمایا' ورنہ ہم اس قابل ہرگز نہ تھے۔

آیت ﴿مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ﴾ ''وہ تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے ان تختوں پر جو برابر بچھے ہوں گے صف در صف۔''

﴿وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ۝۲۰﴾ ''اور انہیں ہم بیاہ دیں گے بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں کے ساتھ۔''

آیت ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ﴾ ''اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اُن کی اولاد نے بھی ان کی پیروی کی ایمان کے ساتھ' ہم ملا دیں گے ان کے ساتھ ان کی اس اولاد کو'

قبل ازیں اس مضمون کا ذکر سورۃ المؤمن میں حاملینِ عرش اور ان کے ساتھی فرشتوں کی دعا کے ضمن میں بھی آ چکا ہے۔ وہ اللہ کے حضور مؤمنین کے لیے یوں دعا کر رہے ہوں گے: ﴿رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۸﴾ ''اے ہمارے پروردگار! انہیں داخل فرمانا اُن رہنے والے باغات میں جن کا تُو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور (ان کو بھی) جو نیک ہوں ان کے آباء و اَجداد' ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے۔ تُو یقیناً زبردست ہے' کمالِ حکمت والا ہے''۔ اب زیر مطالعہ آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے اس کریمانہ فیصلے کا خود اعلان فرما رہے ہیں کہ ہم اہلِ جنّت کی اولاد کو اُن کے ساتھ ملا دیں گے۔ یعنی نچلے درجے کی جنّت کے مستحق افراد کو بھی ان کے والدین کے برابر لے آئیں گے جو اعلیٰ درجات کی جنّتوں میں متمکن ہوں گے۔

﴿وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ﴾ ''اور ہم اُن کے عمل میں سے کوئی کمی نہیں کریں گے۔''

یعنی اگر کوئی شخص اعلیٰ درجے کی جنّت میں ہے اور اس کے اہل و عیال نسبتاً نچلے درجے میں ہیں تو یہ نہیں ہوگا کہ اس شخص کو اس کے اہل و عیال کے پاس نچلے درجے میں بھیج دیا جائے بلکہ اس کے اہل و عیال کے درجات بلند کر کے اس کے برابر کر دیا جائے گا۔ گویا اہلِ جنّت کے اکرام کے لیے یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل ہوگا کہ ان کے رشتے داروں میں سے جو کوئی کم سے کم درجے کی جنّت کا بھی مستحق ہو جائے گا اسے ترقی دے کر ان کے اعلیٰ جنتوں والے رشتے داروں سے ملا دیا جائے گا تاکہ انہیں آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب ہو۔

﴿كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ۝۲۱﴾ ''ہر انسان اپنی کمائی کے عوض رہن ہوگا۔''

آیت ﴿وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ۝۲۲﴾ ''اور ہم انہیں دیے چلے جائیں گے پھل اور گوشت جس سے وہ چاہیں گے۔''

آیت ﴿يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ ۝۲۳﴾ ''اس میں وہ ایک دوسرے سے چھین رہے ہوں گے وہ جام جن (کے مشروب) میں نہ تو کوئی بے ہودگی ہوگی اور نہ ہی گناہ میں ڈالنے والی کوئی بات۔''

یہ اہلِ جنّت کی دوستانہ محفلوں کی رونق اور چہل پہل کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے کہ وہ خوش طبعی کے انداز میں ایک دوسرے سے جام چھین رہے ہوں گے۔ اہلِ جنّت کو جو مشروب ملے گا اس میں کیف و سرور تو ہوگا لیکن دنیا کی شراب کی طرح بے ہودگی کی کوئی کیفیت نہیں ہوگی۔

آیت ﴿وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ ۝۲۴﴾ ''اور اُن پر گردش میں رہیں گے نوجوان لڑکے

ان کی خدمت کے لیے وہ ایسے ہوں گے جیسے موتی ہوں غلافوں میں رکھے ہوئے۔''

آیت ۲۵ ﴿وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ۝۲۵﴾ ''اور وہ (اہلِ جنّت) ایک دوسرے کی طرف رخ کر کے باہم سوال کریں گے۔''

آیت ۲۶ ﴿قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ۝۲۶﴾ ''وہ کہیں گے کہ ہم پہلے اپنے اہل وعیال میں ڈرتے ہوئے رہتے تھے۔''

دنیا میں اپنے اہل وعیال اور عزیز واقارب کے درمیان معمول کی زندگی بسر کرتے ہوئے ہمیں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نہ معلوم ہمارے اعمال اللہ تعالیٰ کے ہاں شرفِ قبولیت حاصل کر بھی پائیں گے یا نہیں۔ نہ معلوم نیک اعمال کی قبولیت کے لیے مطلوبہ معیار کا اخلاص ہمارے دلوں میں ہے بھی یا نہیں۔ کہیں ہم سے کوئی ایسی غلطی سرزد نہ ہو جائے جو ہماری ساری محنت کو بھی اکارت کر دے۔ ایسے اندیشے اور خدشے ہر لحہ ہمیں دامن گیر رہتے تھے۔

آیت ۲۷ ﴿فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ۝۲۷﴾ ''تو اللہ نے بڑا احسان کیا ہم پر اور ہمیں بچا لیا لُو کے عذاب سے۔''

آیت ۲۸ ﴿اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ۭ﴾ ''یقیناً ہم پہلے سے اُس کو پکارا کرتے تھے۔''

البتہ یہ ضرور تھا کہ اپنی دنیوی زندگی میں ہم اپنی مغفرت کے لیے اللہ تعالیٰ سے مسلسل دعائیں کرتے رہتے تھے۔

﴿اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ۝۲۸﴾ ''یقیناً وہ بہت ہی اچھا سلوک کرنے والا، بہت رحم فرمانے والا ہے۔''

آیات ۲۹ تا ۴۹

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ۝۲۹ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ
الْمَنُوْنِ ۝۳۰ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ۝۳۱ اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ
قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۝۳۲ اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝۳۳ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا
صٰدِقِيْنَ ۝۳۴ اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝۳۵ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ
بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ۝۳۶ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ۝۳۷ اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ
يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝۳۸ اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ ۝۳۹ اَمْ
تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ۝۴۰ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ۝۴۱ اَمْ يُرِيْدُوْنَ
كَيْدًا ۭ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ۝۴۲ اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا
يُشْرِكُوْنَ ۝۴۳ وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاۗءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ۝۴۴ فَذَرْهُمْ حَتّٰى
يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ۝۴۵ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ

يُبْصَرُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَ اِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَاصْبِرْ
لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۴۸﴾ وَ مِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَ
ع اِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴿۴۹﴾

آیت ۲۹ ﴿فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ﴿۲۹﴾﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ تذکیر کرتے رہیے پس آپ اپنے رب کے فضل سے نہ کاہن ہیں اور نہ مجنون۔''

یہ خطاب اگرچہ حضور ﷺ سے ہے لیکن اصل میں سنانا ان لوگوں کو مقصود ہے جو آپؐ کے ایسے نام رکھتے تھے۔ ان لوگوں کو نظر انداز کر کے حضور ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ آپؐ ان کی فضول باتوں پر بالکل توجہ نہ دیں اور لوگوں کو مسلسل تذکیر اور یاددہانی کرتے رہیں۔ اس سے ملتا جلتا مضمون قبل ازیں گزشتہ سورت (الذّاریات) میں بھی آ چکا ہے۔ وہاں فرمایا گیا تھا: ﴿فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ﴿۵۴﴾ وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۵﴾﴾ ''پس (اے نبی ﷺ!) آپ ان سے رخ پھیر لیں' آپ پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ اور آپ تذکیر کرتے رہیے' کیونکہ یہ تذکیر اہلِ ایمان کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔''

آپؐ تذکیر و تبلیغ کا عمل مسلسل جاری رکھیے۔ کیا خبر کسی دل میں ایمان کی کوئی کلی کھلنے والی ہو' کیا خبر آپؐ کے کسی دشمن کا دل بھی موم ہونے والا ہو۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا واقعہ اس حقیقت کا گواہ ہے کہ تذکیر آہستہ آہستہ دلوں کو متاثر کرتی رہتی ہے اور پھر کسی وقت اچانک وہ گھڑی آ پہنچتی ہے جب دل میں ایمان کی کلی کھل اٹھتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اگرچہ حضور ﷺ کی مخالفت میں ہر وقت پیش پیش رہتے تھے لیکن چونکہ سخن شناس تھے اس لیے کلامِ الٰہی سننے کے لیے متجسس بھی رہتے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضور ﷺ رات کو صحنِ کعبہ میں قیام اللّیل کے دوران قرآن مجید کی تلاوت فرمایا کرتے تو کبھی کبھی حضرت عمرؓ چھپ کر حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے تلاوت سنتے اور کلامِ الٰہی کی تاثیر کو اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کرتے تھے۔ گویا حضور ﷺ کی تذکیر اور قرآن کی تاثیر تدریجاً ان کے دل میں گھر کر رہی تھی۔ اسی تدریجی عمل کے باعث آپؓ کے خیالات و جذبات میں اندر ہی اندر ایک مثبت تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ اُس کے بعد مشیتِ الٰہی سے وہ واقعہ رونما ہوا جس کے باعث اس خاموش تبدیلی کو اظہار کا موقع ملا اور آپؓ کو ایمان کی دولت نصیب ہو گئی۔ اُس دن تو آپؓ گھر سے حضور ﷺ کو قتل کرنے کی نیت سے نکلے تھے۔ راستے میں اپنی بہن فاطمہؓ بنت خطاب اور اپنے بہنوئی حضرت سعیدؓ بن زید سے اُلجھ پڑے۔ آپؓ کے تشدد کا سامنا کرتے ہوئے بہن نے جب ڈٹ کر کہا کہ عمر تم جو چاہے کر لو' اب ہم اپنے دین کو چھوڑنے والے نہیں! تو آپؓ اپنی بہن کے اس غیر معمولی عزم اور حوصلے کے سامنے ڈھیر ہو گئے۔ پھر کیا تھا' آپؓ کے دل کا ''بند'' یکدم کھل گیا اور آپؓ نے حق کو اعلانیہ قبول کر لیا۔

آیت ۳۰ ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴿۳۰﴾﴾ ''کیا ان کا کہنا ہے کہ یہ ایک شاعر ہے' جس کے لیے ہم منتظر ہیں گردشِ زمانہ کے؟''

مشرکینِ مکہ آپس میں ایک دوسرے کو یہ کہہ کر تسلی دیتے تھے کہ محمد (ﷺ) محض ایک شاعر ہیں۔ ان کے شاعرانہ کلام سے متاثر ہونے میں جلدی مت کرو' کچھ دیر انتظار کرو گے (wait and see)' تو ان کے دعووں کی اصل حقیقت خود بخود کھل کر سامنے

آ جائے گی۔ ہمیں قوی اُمید ہے کہ بہت جلد یہ خود ہی گردشِ زمانہ کی لپیٹ میں آ جائیں گے۔

آیت ۳۱ ﴿قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِیْنَ ۳۱﴾ ''آپ کہیے کہ اچھا تم انتظار کرو، مَیں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔''

آیت ۳۲ ﴿اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۳۲﴾ ''کیا ان کی عقلیں انہیں یہی کچھ سکھا رہی ہیں یا یہ ہیں ہی سرکش لوگ؟''

مشرکین کے ایمان نہ لانے کی یہ دو ہی ممکنہ وجوہات تھیں۔ یا تو واقعتاً انہیں بات سمجھ نہیں آ رہی تھی اور ان کی عقلیں انہیں یہی سکھاتی تھیں کہ محمد (ﷺ) جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ محض شاعری اور ان کا مَن گھڑت کلام ہے۔ دوسرا امکان یہ تھا کہ بات ان کی سمجھ میں بھی آتی تھی اور ان کے دل گواہی بھی دیتے تھے کہ یہ سب کچھ درست ہے مگر وہ اپنی سرکشی، ضد اور عناد کی وجہ سے انکار پر جمے رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں یہ ساری باتیں وہ عقل سے نہیں بلکہ سراسر ضد، عناد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر کر رہے تھے۔ دراصل نفسِ انسانی کی سرکشی بھی دریا کی طغیانی کی طرح ہے جس کے سامنے منطق، تدبیر، کوشش وغیرہ کسی کی نہیں چلتی۔ بقول الطاف حسین حالی: ؎

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام — کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے!

آیت ۳۳ ﴿اَمْ یَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ﴾ ''کیا ان کا کہنا ہے کہ یہ اس (محمد ﷺ) نے خود گھڑ لیا ہے؟''

تَقَوَّلَ باب تفعّل سے ہے اور اس کے معنی تکلّف کر کے کچھ کہنے کے ہیں، یعنی قرآن کے بارے میں مشرکین کا یہ کہنا تھا کہ محمد (ﷺ) محنت و ریاضت کے ذریعے یہ کلام خود ''موزوں'' کرتے ہیں۔

﴿بَلْ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ۳۳﴾ ''بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) یہ ماننے والے نہیں ہیں۔''

آیت ۳۴ ﴿فَلْیَاْتُوْا بِحَدِیْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِیْنَ ۳۴﴾ ''تو وہ لے آئیں اس جیسی کوئی ایک بات اگر وہ سچے ہیں۔''

یہ وہ چیلنج ہے جو قرآن نے بار بار انہیں دیا کہ اگر تم واقعتاً یہ سمجھتے ہو کہ یہ کلام محمد (ﷺ) کا اپنا بنایا ہوا ہے تو ایسا ہی کلام تم بھی اس کے مقابلے میں بنا کر لے آؤ۔ آخر تمہارے درمیان بڑے بڑے خُطباء، ادباء اور شعراء موجود ہیں، ان سب کو اکٹھا کرو اور کوشش کر کے دیکھ لو۔

آیت ۳۵ ﴿اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۳۵﴾ ''کیا یہ بغیر کسی کے بنائے ہوئے خود بن گئے ہیں یا یہ خود ہی خالق ہیں؟''

یہ فلسفے کا بہت گہرا مسئلہ ہے۔ ظاہر ہے کوئی شے بغیر کسی کے بنائے ہوئے خود بخود تو بنتی نہیں ہے۔ چنانچہ کسی بھی چیز کی تخلیق کے حوالے سے دو ہی صورتیں ممکن ہیں، یعنی یا تو اس چیز کو کسی نے تخلیق کیا ہے یا اس چیز نے اپنے آپ کو خود تخلیق کیا ہے۔ چنانچہ یہ منطقی سوال ان کے سامنے رکھا گیا کہ اگر تم اس حقیقت سے آگاہ ہو کہ تم نے خود اپنے آپ کو تخلیق نہیں کیا تو پھر خود بخود ثابت ہو جاتا ہے کہ کسی دوسری ہستی نے تمہیں پیدا کیا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ ہستی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

آیت ۳۶ ﴿اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ۝۳۶﴾ ''کیا آسمانوں اور زمین کو انہوں نے بنایا ہے؟ بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) یہ یقین نہیں رکھتے۔''

چلو اپنی تخلیق کی بحث کو چھوڑو، تم ذرا یہ بتاؤ کہ زمین و آسمان تم نے بنائے ہیں؟ اگر تم تسلیم کرتے ہو کہ تم نے نہیں بنائے تو پھر مان کیوں نہیں لیتے کہ خود تمہارا خالق اور تمام مخلوق سمیت پوری کائنات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ وہ حقائق ہیں جو دو اور دو چار کی طرح مسلّم ہیں، لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ یقین سے محروم ہیں۔

آیت ۳۷ ﴿اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَۜيْطِرُوْنَ ۝۳۷﴾ ''کیا ان کے قبضہ قدرت میں آپؐ کے ربّ کے خزانے ہیں یا یہ داروغہ ہیں؟''

اس آیت کو پڑھتے ہوئے مشرکینِ مکّہ کا وہ اعتراض بھی ذہن میں تازہ کر لیں جس کا ذکر سورۃ الزخرف کی آیت ۳۱ میں ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اگر وحی بھیجنا تھی اور اپنا کلام دنیا میں نازل کرنا ہی تھا تو اس کے لیے اُس کی نظر بنو ہاشم کے ایک یتیم شخص ہی پر کیوں پڑی جو نہ تو سرمایہ دار ہے اور نہ ہی مکّہ کے قبائلی نظام کے اعلیٰ عہدوں (hierarchy) میں سے کوئی عہدہ اس کے پاس ہے! عرب کے قبائلی معاشرے میں کسی شخصیت کے ''بڑے'' ہونے کا ایک معیار یہ بھی تھا کہ وہ کسی بڑے عہدے پر فائز ہو۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اُسی زمانے میں مقدماتِ قتل کے فیصلے کرنے پر مامور تھے۔ یہ قبائلی نظام کا بہت بڑا اور انتہائی حساس نوعیت کا عہدہ تھا جس پر حضرت ابوبکرؓ اس زمانے میں فائز تھے۔ اس کے علاوہ آپؓ بہت بڑے تاجر اور سرمایہ دار بھی تھے۔ اُس زمانے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سرمائے کی مالیت چالیس ہزار درہم کے لگ بھگ تھی۔ اس حوالے سے یہ حقیقت بھی تاریخ کا حصّہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد آپؓ نے یہ سارا سرمایہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں لٹا دیا اور جب آپؓ ہجرت کے لیے مدینہ روانہ ہوئے تو پیچھے گھر والوں کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔

بہرحال مشرکینِ مکّہ بار بار یہ اعتراض کرتے تھے کہ آخر اللہ تعالیٰ نے اس منصب کے لیے ان دو بڑے شہروں (مکّہ اور طائف) میں سے کسی بڑی شخصیت کو کیوں منتخب نہیں کیا: ﴿وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝۳۱﴾ (الزخرف) ''اور کہنے لگے کہ کیوں نہیں اتارا گیا یہ قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی عظیم شخص پر؟'' اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: ﴿اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ﴾ (الزخرف: ۳۲) ''کیا آپ کے رب کی رحمت کو یہ لوگ تقسیم کریں گے؟'' آیت زیر مطالعہ میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اسی نوعیت کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے خزانے کیا ان لوگوں کے قبضہ قدرت میں ہیں؟ اور کیا اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے فیصلے کرنے میں ان لوگوں کی مرضی و منشا کا پابند ہے؟

آیت ۳۸ ﴿اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ﴾ ''کیا ان کے پاس کوئی ایسی سیڑھی ہے جس کے ذریعے سے یہ آسمان کی خبریں سن لیتے ہیں؟''

﴿فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝۳۸﴾ ''(اگر ایسا ہے) تو ان کا سننے والا کوئی واضح دلیل لائے۔''

آیت ﴿اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۳۹﴾﴾ ''کیا اُس کے لیے تو بیٹیاں ہیں اور تمہارے لیے بیٹے؟''

آیت ﴿اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۰﴾﴾ ''کیا آپ ان لوگوں سے کوئی اجرت طلب کر رہے ہیں کہ یہ تاوان کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں؟''

یہاں پر پے در پے سوالات کا انداز خصوصی تاثیر کا حامل ہے۔ یہ مقام زورِ خطابت' فصاحت' بلاغت' ادبیت اور عذوبت کے حوالے سے گویا قرآن مجید کی معراج ہے۔ ظاہر بات ہے ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے۔

آیت ﴿اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۱﴾﴾ ''کیا ان کے پاس غیب کا علم ہے جسے یہ لکھ رہے ہیں؟''

آیت ﴿اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ؕ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ﴿۴۲﴾﴾ ''کیا یہ لوگ کوئی چال چلنا چاہتے ہیں؟ اصل میں تو یہ کافر خود ہی چال کا شکار ہو گئے ہیں۔''

یہ لوگ ایک منصوبہ بندی کے تحت ہمارے رسول ﷺ اور قرآن کے خلاف جھوٹی باتیں پھیلا رہے ہیں تاکہ عوام ان سے متاثر نہ ہوں۔ لیکن ان کی یہ باتیں اس قدر بودی ہیں کہ خود ان کے اپنے دل بھی ان کو نہیں مانتے۔ ان کی سازشوں کو اللہ تعالیٰ اسی طرح ناکام کرتا رہتا ہے' جیسا کہ سورۃ الطارق میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ﴿۱۵﴾ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ﴿۱۶﴾﴾ ''یہ لوگ تو اپنی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں اور میں اپنی تدبیر کر رہا ہوں۔''

آیت ﴿اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۴۳﴾﴾ ''کیا ان کے لیے اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ بھی ہے؟ پاک ہے اللہ اس سے جو شرک یہ کر رہے ہیں۔''

آیت ﴿وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ﴿۴۴﴾﴾ ''اور اگر کبھی یہ دیکھیں آسمان کا کوئی ٹکڑا گرتا ہوا تو کہیں گے کہ یہ تو بادل ہیں تہ برتہ۔''

ان کی حالت تو یہ ہے کہ اگر آسمان کا کوئی ٹکڑا بھی عذابِ الٰہی بن کر ان پر گر رہا ہو تو اسے بھی یہ لوگ بارش برسانے والا بادل ہی سمجھیں گے۔ جیسا کہ قومِ عاد کے لوگوں نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے عذاب کو دیکھ کر کہا تھا: ﴿هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا﴾ (الاحقاف:۲۴) ''یہ تو بادل ہے جو ہم کو سیراب کرنے والا ہے''۔ یہ بادل برسیں گے تو ہمارے علاقے میں جل تھل کر دیں گے۔

آیت ﴿فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ﴿۴۵﴾﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) چھوڑے رکھیے ان کو یہاں تک کہ وہ اپنے اُس دن سے دوچار ہوں جس میں ان پر بجلی کی کڑک گرے گی۔''

''چھوڑ دیجیے'' کے مفہوم میں یہ حکم ابتدائی زمانے کی سورتوں میں تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ جیسے سورۃ المعارج میں فرمایا گیا: ﴿فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۲﴾﴾ ''تو (اے پیغمبر ﷺ!) ان کو باطل میں پڑے رہنے اور کھیل لینے دو یہاں تک کہ جس دن کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ ان کے سامنے آموجود ہو''۔ سورۃ القلم میں فرمایا گیا: ﴿فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ؕ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۴﴾﴾ ''تو آپ مجھ کو اس کلام کے جھٹلانے والوں سے سمجھ لینے دیں۔ ہم ان کو آہستہ آہستہ ایسے طریق سے پکڑیں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوگی''۔ اس حکم کے تکرار کا مطلب یہی ہے کہ اے

نبی ﷺ! آپ ان لوگوں کے تمسخر، استہزاء اور دیگر مخالفانہ ہتھکنڈوں کو بالکل خاطر میں نہ لائیں اور تبلیغ و تذکیر کے حوالے سے اپنا مشن جاری رکھیں۔ ان لوگوں کے معاملے کو آپ مجھ پر چھوڑ دیں، ان سے مَیں خود نمٹ لوں گا۔

آیت ۴۶ ﴿يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝۴۶﴾ ''جس دن ان کی چالیں ان کے کسی کام نہ آ سکیں گی اور نہ ہی ان کی کوئی مدد ہی ہو گی۔''

ان کی ساری چالیں ناکام ہو جائیں گی اور کوئی مددگار ان کی مدد کو نہ پہنچ سکے گا۔

آیت ۴۷ ﴿وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۴۷﴾ ''اور ان ظالموں کے لیے اُس (آخرت کے عذاب) کے علاوہ بھی ایک عذاب ہے لیکن ان کی اکثریت علم نہیں رکھتی۔''

اس عذاب سے یا تو قحطِ مکّہ کا عذاب مراد ہے جس کا ذکر سورۃ الدُّخان میں ہے اور یا پھر غزوۂ بدر کے دن کا عذاب جس دن مکّہ کے ستّر سردار مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔

آیت ۴۸ ﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ﴾ ''(اور اے نبی ﷺ) آپ اپنے ربّ کے فیصلے کا انتظار کیجیے۔''

ابتدائی مکّی دور کی سورتوں میں یہ حکم بار بار آیا ہے۔ خصوصاً زیر مطالعہ گروپ کی سورتوں اور ۲۹ ویں پارے کی سورتوں میں تو فَاصْبِرْ یا وَاصْبِرْ کے صیغے کی بہت تکرار ملتی ہے۔ سورۃ النحل میں فرمایا گیا: ﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ (آیت ۱۲۷) ''آپ صبر کیجیے اور آپ کا صبر تو اللہ ہی کے سہارے پر ہے''۔ سورۃ الاحقاف میں حضور ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (آیت ۳۵) ''پس آپ بھی صبر کیجیے جیسے ہمارے اولوالعزم پیغمبروں نے صبر کیا تھا''۔ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم کی زیادتیاں برداشت کیں۔ سورۃ المزمّل میں ارشاد ہوا: ﴿وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ﴾ (آیت ۱۰) ''اور اس پر صبر کیجیے جو یہ لوگ آپ کے خلاف باتیں بنا رہے ہیں''۔ سورۃ المدثّر میں فرمایا گیا: ﴿وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝۷﴾ ''اور آپ اپنے رب کے لیے صبر کریں''۔ غرض ابتدائی مکّی دور کی سورتوں میں رسول اللہ ﷺ کو براہِ راست مخاطب کر کے بار بار ہدایت کی جاتی رہی کہ آپ ﷺ صبر کا دامن مضبوطی سے تھامے رہیں۔ عربی میں ''صبر'' کے بعد اگر ''ل'' آ جائے جیسے کہ آیت زیر مطالعہ میں ہے، تو اس کے معنی انتظار کرنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ کا ترجمہ اسی مفہوم کے پیش نظر کیا گیا ہے۔

﴿فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا﴾ ''بے شک آپ ہماری نگاہوں میں ہیں۔''

آپ ﷺ مسلسل ہماری نظروں کے سامنے ہیں، ہم آپ کے حالات سے پوری طرح باخبر ہیں۔ ہم آپ کی نگہبانی کر رہے ہیں، آپ کو آپ کے حال پر نہیں چھوڑ دیا۔ بالکل یہی مضمون سورۂ یونس کی آیت ۶۱ میں بھی آیا ہے:

﴿وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ﴾

''اور (اے نبی ﷺ!) نہیں ہوتے آپ کسی بھی کیفیت میں اور نہیں پڑھ رہے ہوتے آپ قرآن میں سے کچھ، اور (اے مسلمانو!) تم نہیں کر رہے ہوتے کوئی بھی (اچھا) عمل مگر یہ کہ ہم تمہارے پاس موجود ہوتے ہیں جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو۔''

﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۴۸﴾﴾ ''اور آپ (ﷺ) تسبیح کرتے رہیں اپنے رب کی حمد کے ساتھ جب آپ کھڑے ہوں۔''

اس بارے میں عام رائے یہی ہے کہ یہ حضور ﷺ کی تہجد کی نماز کی طرف اشارہ ہے' کیونکہ آغاز میں تو وہی ایک نماز تھی۔ جیسا کہ سورۃ المزمل کی ان آیات میں قیام اللیل کا ذکر ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ﴿۱﴾ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۲﴾ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ﴿۳﴾ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ﴿۴﴾﴾

''اے کپڑا اوڑھنے والے! رات کو قیام کیا کرو مگر (ساری رات نہیں بلکہ) کم۔ (یعنی) نصف رات یا اس سے کچھ کم کر لو۔ یا اس پر کچھ زیادہ کر لو اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو۔''

آیت ۴۹ ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ﴾ ''اور رات کے ایک حصے میں بھی آپ اُس کی تسبیح کریں''

گویا تہجد کے علاوہ بھی رات کے مختلف حصوں میں حضور ﷺ کو تسبیح و تحمید کرنے کی ہدایت کی جا رہی ہے۔ ابتدائی دور کی ان سورتوں میں جن اوقات کو اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے مخصوص کرنے کے احکام دیے گئے ہیں' بعد میں جب پانچ اوقات کی نماز فرض ہوئی تو وہی اوقات مختلف نمازوں کے اوقات قرار پائے۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق مغرب اور عشاء کی نمازیں فرض ہوئیں' کیونکہ غروبِ آفتاب سے رات شروع ہو جاتی ہے اور عشاء کی نماز بھی رات کے ایک حصے میں ہی ادا کی جاتی ہے۔

﴿وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴿۴۹﴾﴾ ''اور ستاروں کے پیٹھ موڑتے وقت بھی (آپ تسبیح کیجیے)۔''

جب ستاروں کا قافلہ کوچ کرتا ہے تو صبح کی آمد آمد ہوتی ہے۔ اس سے صبح صادق کا وقت مراد ہے اور بعد میں اس وقت پر نمازِ فجر فرض ہوئی۔

سُوْرَةُ النَّجْمِ

تمہیدی کلمات

مکّی مدنی سورتوں کے چھٹے گروپ کی تین سورتوں کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں۔ان میں سورۂ قٓ منفرد ہے جبکہ سورۃ الذّاریات اور سورۃ الطور جوڑے کی شکل میں ہیں۔ان میں سے سورۃ الذاریات میں انباء الرسل کے انداز میں مختلف پیغمبروں کا ذکر ہے' جبکہ سورۃ الطور میں قیامت کے احوال' جنّت' دوزخ اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور قدرتوں کا ذکر ہے۔اس کے بعد سورۃ النجم اور سورۃ القمر بھی جوڑے کی صورت میں ہیں۔ان دونوں سورتوں میں بعض مضامین بہت مشکل ہیں۔ان دونوں کی باہمی مناسبت اور مشابہت ان کی آغاز کی آیات سے ظاہر ہوتی ہے۔سورۃ النجم کی پہلی آیت میں ستارے کے گرنے کا ذکر ہے' جبکہ سورۃ القمر کی پہلی آیت میں چاند کے پھٹنے کا حوالہ آیا ہے۔

آیات ۱ تا ۱۸

سُوْرَةُ النَّجْمِ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۶۲ رُكُوْعَاتُهَا: ۳

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۙ﴿۱﴾ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۚ﴿۲﴾ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ؕ﴿۳﴾ اِنْ هُوَ
اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۙ﴿۵﴾ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰى ۙ﴿۶﴾ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ؕ﴿۷﴾
ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۙ﴿۸﴾ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۚ﴿۹﴾ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ؕ﴿۱۰﴾ مَا كَذَبَ
الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ؕ﴿۱۱﴾ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ؕ﴿۱۲﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۙ﴿۱۳﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ
الْمُنْتَهٰى ۚ﴿۱۴﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ؕ﴿۱۵﴾ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۙ﴿۱۶﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا
طَغٰى ؕ﴿۱۷﴾ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ؕ﴿۱۸﴾

آیت ۱ ﴿وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۙ﴿۱﴾﴾ ''قسم ہے ستارے کی جبکہ وہ گرتا ہے۔''

هَوٰى يَهْوِيْ هَوِيًّا کا اصل معنی ہے: اوپر سے نیچے گرنا۔ یہاں اس سے ستاروں کا اُفق سے غائب ہونا' ڈوب جانا یا فنا ہو جانا مراد ہو سکتا ہے۔(اس پر قدرے تفصیلی بحث سورۃ الواقعہ میں ''مَوَاقِعِ النُّجُوْم'' کے ضمن میں آئے گی۔) اَلْهَوِيَّة گہرے کنویں کو اور هَاوِيَة دوزخ کو کہا جاتا ہے۔جبکہ اسی مادہ سے هَوِيَ يَهْوٰى هَوًى کا معنی ہے: خواہش کرنا۔یہ لفظ (الْهَوٰى) آگے آیت ۳ میں آ رہا ہے۔

آیت ۲ ﴿مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۚ﴿۲﴾﴾ ''(اے لوگو!) تمہارے یہ ساتھی نہ تو بھٹکے ہیں اور نہ ہی بہکے ہیں۔''

قرآن حکیم میں قسم بالعموم شہادت کے لیے آتی ہے۔ یہاں ستاروں کے غروب یا سقوط کی قسم کھا کر قریش کو مخاطب کر کے بتایا جا رہا ہے کہ تمہارے یہ ساتھی (محمد رسول اللہ ﷺ) نہ تو غلط فہمی کی بنا پر راستے سے بہکے ہیں اور نہ اپنے قصد و اختیار سے جان بوجھ کر غلط راستے پر چلے ہیں۔

آیت ۲ ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝۳﴾ ''اور یہ (جو کچھ کہہ رہے ہیں) اپنی خواہشِ نفس سے نہیں کہہ رہے ہیں۔''

آیت ۴ ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝۴﴾ ''یہ تو صرف وحی ہے جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔''

اگلی آیات میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کا ذکر ہے جنہوں نے نبی مکرم ﷺ کو اس کلام کی تعلیم دی۔ یہ مضمون دوسری مرتبہ تیسویں (۳۰) پارے کی سورۃ التکویر میں آیا ہے۔ دونوں عبارتوں میں ایک خوبصورت مماثلت یہ ہے کہ وہاں بھی حضور ﷺ کا ذکر صَاحِبُكُمْ کے لفظ سے کیا گیا ہے:

﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۝۲۲ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝۲۳ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ۝۲۴ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝۲۵﴾ (التکویر)

''اور (مکہ والو!) تمہارے یہ رفیق دیوانے نہیں ہیں۔ بے شک انہوں نے اس (جبرائیلؑ) کو کھلے اُفق پر دیکھا ہے۔ اور وہ غیب کے معاملے میں بخیل نہیں ہیں۔ اور یہ ہرگز کسی شیطانِ رجیم کا قول نہیں ہے۔''

حضرت جبرائیل علیہ السلام جب وحی لے کر آتے تو وہ حضور ﷺ کو نظر نہیں آتے تھے اور نہ ہی وحی کو آپؐ اپنے کانوں سے سُن سکتے تھے۔ فرشتے اور وحی دونوں کا تعلق چونکہ عالمِ امر سے ہے اس لیے ان کا نزول بھی آپؐ کی شخصیت کے اس حصے پر ہوتا تھا جو عالمِ امر سے متعلق تھا' یعنی آپؐ کی روحِ مبارک۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیں کہ انسانی روح کا مسکن چونکہ قلبِ انسانی ہے اس لیے وحی کا نزول براہِ راست حضور ﷺ کے قلبِ مبارک پر ہوتا تھا: ؎

نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو رُوح سنے اور روح سنائے!

تاہم حضرت جبرائیل علیہ السلام کا حضور ﷺ کے پاس انسانی شکل میں آنا بھی ثابت ہے۔ روایات میں یہ وضاحت بھی ملتی ہے کہ حضرت جبرائیلؑ جب انسانی شکل میں آپؐ کے پاس آتے تو عموماً خوبصورت نوجوان صحابی حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں آتے جو بہت عظیم انسان تھے۔ اس حوالے سے ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ انسانی شکل میں حضرت جبرائیلؑ کی حضور ﷺ سے جو گفتگو ہوتی وہ ''وحی متلو'' یعنی قرآن میں شامل نہیں ہے۔ مثلاً ''حدیثِ جبریلؑ'' میں حضرت جبرائیلؑ کے ساتھ حضور ﷺ کے مکالمے کی تفصیل درج ہے۔ اس موقع پر حضرت جبرائیلؑ انسانی شکل میں حضور ﷺ کے پاس آئے اور آپؐ سے دین کے بارے میں چند بنیادی سوالات پوچھے۔ آپؐ نے ان سوالات کے جوابات دیے۔ ان کے چلے جانے کے بعد آپؐ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بتایا کہ یہ جبرائیلؑ تھے جو تم لوگوں کو تمہارا دین سکھانے کے لیے آئے تھے۔ اس حدیث کا مضمون اس قدر اہم ہے کہ محدثین نے اسے ''اُمُّ السُّنَّہ'' قرار دیا ہے' لیکن اس حدیث کے مندرجات قرآن میں شامل نہیں۔

البتہ حضور ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو دو مرتبہ ان کی اصلی شکل میں بھی دیکھا ہے۔ پہلی مرتبہ تو آپ ﷺ نے انہیں آغازِ نبوت کے زمانے میں دیکھا تھا۔ یہ واقعہ ''فترتِ وحی'' کے دنوں میں پیش آیا۔ (پہلی وحی کے بعد وحی کا سلسلہ کچھ عرصہ کے لیے

منقطع رہا' اس وقفے کو ''فترتِ وحی'' کہا جاتا ہے۔) ایک دن آپ ﷺ غارِ حرا سے اُتر رہے تھے تو آپؐ نے ایک آواز سنی ''یا محمد!'' آپؐ نے اِدھر اُدھر دیکھا تو کوئی بھی نہیں تھا۔ آپؐ نے سمجھا کہ شاید مجھے دھوکہ ہوا ہے' لیکن دوسرے ہی لمحے وہی آواز پھر سنائی دی۔ اس مرتبہ بھی آپؐ کو جب کوئی انسان دکھائی نہ دیا تو آپؐ کو کچھ خوف محسوس ہوا۔ تیسری مرتبہ جب آپؐ نے پھر وہی آواز سنی تو آپؐ نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اوپر دیکھنے سے آپؐ کو حضرت جبرائیلؑ اپنی اصلی ملکوتی شکل میں اس طرح نظر آئے کہ پورا اُفق بھرا ہوا تھا۔

دوسری مرتبہ آپ ﷺ نے حضرت جبرائیلؑ کو معراج کے موقع پر سدرۃ المنتہیٰ کے قریب دیکھا۔ آئندہ آیات میں اسی مشاہدے کا ذکر ہے۔ حضرت جبرائیلؑ جب حضور ﷺ کو سفرِ معراج پر لے جانے کے لیے آئے تو وہ انسانی شکل میں تھے اور آپؐ کے لیے جو سواری (براق) وہ لے کر آئے تھے وہ بھی کوئی محسوس و مرئی قسم کی مخلوق تھی۔ لیکن جب آپؐ ساتویں آسمان پر سدرۃ المنتہیٰ کے پاس پہنچے تو وہاں حضرت جبرائیلؑ اصل ملکوتی شکل میں ظاہر ہوئے۔ اس مقام پر انہوں نے آگے جانے سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں یہاں سے آگے بڑھوں گا تو میرے پَر جل جائیں گے: ؎

اگر یک سرِ موئے برتر قدم فروغِ تجلّی بسوزد پرم

اس مضمون کے حوالے سے یہاں سمجھنے کا اصل نکتہ یہ ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی اصل ملکوتی شکل میں حضور ﷺ سے ملاقات کرانے اور پھر اس ملاقات کا قرآن مجید میں ذکر کرنے کا مقصد نزولِ وحی کے سلسلے کے درمیانی رابطے (link) کی سند فراہم کرنا ہے۔ اس نکتہ لطیف کو ''اصولِ حدیث'' کے حوالے سے سمجھنا چاہیے۔ محدثین نے احادیث کی صحت (authenticity) کی تحقیق کے لیے جو اصول وضع کیے ہیں ان میں ایک بنیادی اصول یہ بھی ہے کہ جس شخص کی کسی دوسری شخصیت سے روایت منقول ہے اس کی اس شخصیت سے شعور کی عمر اور شعور کی کیفیت میں ملاقات بھی ثابت ہونا ضروری ہے۔ اگر ایسی ملاقات ثابت نہ ہو سکے تو متعلقہ راوی کی روایت قابلِ قبول نہیں سمجھی جاتی۔ مثلاً اگر ایک تابعیؒ کی کسی صحابیؓ سے کوئی روایت منقول ہے مگر حقائق ثابت کرتے ہیں کہ جب وہ صحابیؓ فوت ہوئے تو متعلقہ تابعی کی عمر صرف چھ سال تھی' یعنی اس وقت ان کی عمر ایسی نہ تھی کہ وہ بات کو سمجھ کر کسی دوسرے کو بتا سکتے' تو ایسی صورت میں متعلقہ تابعی کی وہ روایت محدثین کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ چنانچہ حدیثِ رسولؐ کی صحت (authenticity) کے لیے اگر متعلقہ راویوں کی ملاقات کا ثابت ہونا ضروری ہے تو ایسا ہی ثبوت اللہ تعالیٰ کی حدیث (اللہ تعالیٰ نے قرآن کو سورۃ الزمر کی آیت ۲۳ میں اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ قرار دیا ہے) کی روایت کے حوالے سے بھی دستیاب ہونا چاہیے —— چنانچہ قرآن مجید کی روایت کی تصدیق و توثیق یوں ہوگی: قرآن کیا ہے؟ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اللہ سے اُس کا کلام کس نے سنا؟ جبرائیلؑ نے سنا۔ جبرائیلؑ سے کس نے سنا؟ جبرائیلؑ سے محمد (ﷺ) نے سنا۔ تو کیا جبرائیلؑ اور محمد (ﷺ) کی ملاقات ثابت ہے؟ جی ہاں! ان کے درمیان دو مرتبہ کی ملاقات قرآن سے ثابت ہے —— چنانچہ وحی کی ''روایت'' کا درمیانی رابطہ (link) ثابت کرنے کے لیے حضور ﷺ کی حضرت جبرائیلؑ سے اصل ملکوتی شکل میں ملاقات کی ''سند'' انتہائی اہم ہے جو یہ آیات فراہم کر رہی ہیں۔

آیت ۵ ﴿عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی ۝۵﴾ ''انہیں سکھایا ہے اُس نے جو زبردست قوت والا ہے۔''

''شَدِیْدُ الْقُوٰی'' سے یہاں حضرت جبرائیل علیہ السلام مراد ہیں' یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کو یہ قرآن جبرائیلؑ نے سکھایا ہے جو زبردست قوت والا ہے۔

آیت ۵ ﴿ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰی ۙ﴾ ''جو بڑا زور آور ہے۔ پس وہ سیدھا ہوا۔''

آیت ۷ ﴿وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی ؕ﴾ ''اور وہ افق اعلیٰ پر تھا۔''

یعنی حضور ﷺ نے حضرت جبرائیلؑ کو افق پر اپنی اصلی شکل میں دیکھا۔

آیت ۸ ﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ۙ﴾ ''پھر وہ قریب آیا اور جھک پڑا۔''

آیت ۹ ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی ۚ﴾ ''بس دو کمانوں کے برابر (فاصلہ رہ گیا) یا اس سے بھی قریب۔''

آیت ۱۰ ﴿فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰی ؕ﴾ ''پھر اُس نے وحی کی اللہ کے بندے کی طرف جو وحی کی۔''

''اَوْحٰی'' کا فاعل اللہ تعالیٰ بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں ترجمہ یوں ہوگا: ''پس اللہ نے وحی کی اپنے بندے کی طرف جو وحی کی۔''

جس وحی کا یہ ذکر ہے وہ ''وحیٔ رسالت'' تھی' جبکہ پہلی وحی جو سورۃ العلق کی ابتدائی آیات پر مشتمل تھی ''وحیٔ نبوت'' تھی۔ اس وحی سے حضور ﷺ کی نبوت کا ظہور ہوا: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ۲ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ۳ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ۴ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ۵﴾ ان پانچ آیات میں نہ تو آپؐ کو کوئی حکم دیا گیا تھا اور نہ ہی کوئی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ اس کے بعد کئی ماہ تک کوئی وحی نہیں آئی۔ اس عارضی وقفے کو ''فترتِ وحی'' کا دور کہا جاتا ہے۔ پھر ایک دن جب آپ ﷺ غارِ حرا سے واپس آ رہے تھے تو وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر آیات زیر مطالعہ میں ہو رہا ہے۔ یعنی آپؐ نے حضرت جبرائیلؑ کو اُن کی اصل مَلَکی شکل میں اُفق پر دیکھا۔ اس منظر سے آپؐ خوفزدہ ہو گئے اور اسی گھبراہٹ کی حالت میں آپؐ گھر پہنچے۔ گھر پہنچتے ہی آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو کمبل اوڑھانے کا فرمایا۔ اس کیفیت میں جب آپؐ کمبل اوڑھے لیٹے تھے تو یہ وحی نازل ہوئی' جس میں آپؐ کو رسالت کی ذمہ داری سونپ دی گئی: ﴿یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ۱ قُمْ فَاَنْذِرْ ۪ۙ۲ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۪ۙ۳﴾ (المدثر) ''اے کمبل میں لپٹ کر لیٹنے والے! اب کھڑے ہو جاؤ اور لوگوں کو خبردار کرو۔ اور اپنے رب کی بڑائی (کا اعلان) کرو!'' یعنی آپ ﷺ کی اس دعوت کا نقطۂ آغاز تو ''اِنذار'' ہے' مگر دنیا میں اس کا ہدف ''تکبیرِ ربّ'' ہے۔ پس آپؐ اپنے رب کی بڑائی بیان کریں' اُس کی بڑائی منوائیں اور اُس کی بڑائی کو نافذ کریں۔

آیت ۱۱ ﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی ؕ۱۱﴾ ''جو کچھ انہوں نے دیکھا' ان کے دل و دماغ نے اسے جھٹلایا نہیں۔''

یعنی دل میں کسی قسم کا شک پیدا نہیں ہوا۔ یہ خیال نہیں آیا کہ یہ وہم ہو سکتا ہے یا خواب ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ اکثر ہوتا ہے' انسان جب کوئی غیر معمولی واقعہ یا انوکھا منظر دیکھتا ہے تو ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ ع ''آنچہ می بینم بیداریست یارب یا بخواب!'' (اے اللہ! یہ جو میں دیکھ رہا ہوں یہ بیداری میں دیکھ رہا ہوں یا خواب میں!) لیکن اس واقعہ کے بارے میں حضور ﷺ کا معاملہ ایسا نہیں تھا۔ آپؐ کی آنکھوں نے جو دیکھا آپؐ کے دل نے اسے تسلیم کیا اور اس کی تصدیق کی۔ گویا اس انتہائی غیر معمولی واقعہ کے بارے میں آپ ﷺ کے دل اور آپؐ کی نگاہوں کے درمیان کوئی تضاد و اختلاف نہیں تھا۔

آیت ۱۲ ﴿اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی ؕ۱۲﴾ ''تو کیا تم اس سے جھگڑتے ہو اس چیز پر جسے وہ دیکھتا ہے!''

اس بارے میں جو تفصیل محمد (ﷺ) بیان کر رہے ہیں تم لوگ اس میں شکوک و شبہات کا اظہار کر رہے ہو۔ لیکن وہ تو یہ سب

کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں اور وہ تم سے آنکھوں دیکھا واقعہ ہی بیان کر رہے ہیں۔ بقولِ اقبال: ع ''قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید'' کہ قلندر جو بھی بیان کرتا ہے اپنا مشاہدہ ہی بیان کرتا ہے۔ (جب کہ یہاں تو معاملہ قلندر کا نہیں' پیغمبر ﷺ کا ہے!)

آیت ۱۳ ﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿۱۳﴾﴾ ''اور انہوں نے تو اس کو ایک مرتبہ اور بھی اُترتے دیکھا ہے۔''

یعنی حضور ﷺ نے حضرت جبرائیلؑ کو دو مرتبہ اصلی شکل وصورت میں دیکھا ہے۔ دوسری مرتبہ کہاں دیکھا؟

آیت ۱۴ ﴿عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿۱۴﴾﴾ ''سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔''

یہ ساتویں آسمان پر وہ مقام ہے جس سے آگے کسی مخلوق کو جانے کی اجازت نہیں۔ اس انتہائی حد کی علامت بیری کا وہ درخت ہے جسے آیت میں ''سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس مقام کی کیفیت اور نوعیت ہمارے تصور سے ماوراء ہے۔ معراج کے موقع پر ''سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى'' پر حضرت جبرائیلؑ اپنی اصل ملکوتی شکل میں ظاہر ہوئے اور آگے جانے سے معذرت کر لی۔

آیت ۱۵ ﴿عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ﴿۱۵﴾﴾ ''جنّت الماویٰ بھی اس کے پاس ہی ہے۔''

''جنّت الماویٰ'' سب سے اونچے درجے کی جنّت ہے' جو ساتویں آسمان پر سدرۃ المنتہیٰ کے قریب ہے۔ قیامت کے دن اہلِ جنّت کو جہاں ''نُزُل'' پیش کیا جائے گا وہ جنّت تو زمین پر واقع ہوگی۔ اس کے بعد ان میں سے ہر شخص کے اپنے اپنے ایمان وخلوص کی گہرائی اور انفاقِ جان ومال کے تناسب کے حساب سے درجہ بدرجہ ترقی ہوتی جائے گی حتیٰ کہ کچھ خوش قسمت لوگ جنّت الماویٰ میں پہنچ جائیں گے۔ (اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ!)

آیت ۱۶ ﴿اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴿۱۶﴾﴾ ''جبکہ چھائے ہوئے تھا سدرہ پر جو چھائے ہوئے تھا۔''

یعنی تم انسانوں کو کیا بتایا جائے کہ اس بیری کے درخت کی اس وقت کیا کیفیت تھی۔ تم اس کیفیت کو نہیں سمجھ سکتے ہو۔ وہ انوار و تجلیاتِ الٰہیہ کے نزول کی ایسی کیفیت تھی جو نہ تو کسی زبان سے ادا ہو سکتی ہے اور نہ ہی کسی قسم کے الفاظ اس کی تعبیر کر سکتے ہیں۔

آیت ۱۷ ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿۱۷﴾﴾ ''(اُس وقت محمد ﷺ کی) آنکھ نہ تو کج ہوئی اور نہ ہی حد سے بڑھی۔''

یہاں پر دونوں انتہائی کیفیات کی نفی کر دی گئی۔ انسان کی فطری اور طبعی کمزوری ہے کہ اگر اسے اچانک بہت تیز روشنی کا سامنا کرنا پڑے تو وہ نظروں کو اس سے پھیرنے اور ہٹانے کی کوشش کرتا ہے یا پلک جھپک لیتا ہے۔ اس حوالے سے یہاں بتایا گیا کہ حضور ﷺ نے انوار و تجلیاتِ الٰہیہ کا کھلی آنکھوں سے براہِ راست مشاہدہ کیا اور نگاہ جما کر دیکھا۔ لیکن اس مشاہدے میں حدِ ادب سے تجاوز بھی نہیں کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس آیت کو اکثر و بیشتر لوگ سمجھ نہیں سکے' جبکہ میں نے اس کے مفہوم کو علامہ اقبالؔ کے اس شعر کی مدد سے سمجھا ہے: ؎

عینِ وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا　　گرچہ بہانہ جُو رہی میری نگاہِ بے ادب!

یہ ''بالِ جبریل'' کی نظم ''ذوق وشوق'' کا شعر ہے۔ یہ نظم بلاشبہ علامہ اقبال کی شاعرانہ استعداد کی معراج ہے' اگرچہ اُمّتِ مُسلمہ کے لیے پیغام کے اعتبار سے ان کی آخری عمر (۱۹۳۶ء) کی نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' نقطۂ عروج کا درجہ رکھتی ہے۔ اس شعر میں علامہ کہتے ہیں کہ میں وصال کے دوران ادب کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر محبوب کے حسن کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا مگر نظریں جما کر براہِ راست

دیکھنے کا مجھ میں حوصلہ نہ تھا۔ یہاں اقبال اپنی نظر کی ''بے ادبی'' کو خود تسلیم کر رہے ہیں اور حدِ ادب سے تجاوز کرنے کی شدید خواہش کا بھی اعتراف کر رہے ہیں' لیکن ساتھ ہی وہ اپنی معذوری کا بھی اعتراف کر رہے ہیں کہ ایسا کرنے کا حوصلہ ان میں نہیں تھا۔ گویا صرف وہ حوصلے کے فقدان کی وجہ سے ''بے ادبی'' کے ارتکاب سے بچے رہے۔ اب اس شعر میں پیش کیے گئے تصوّر کی روشنی میں غور کریں تو آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ حضور ﷺ کے تحمل اور حوصلے کا یہ عالم تھا کہ آپؐ نے اُن انوار و تجلیات کو براہِ راست دیکھا اور جم کر مشاہدہ کیا۔ لیکن دوسری طرف آپؐ کے ضبط اور ''ادب'' کا کمال یہ تھا کہ ''حوصلہ'' ہوتے ہوئے بھی آپؐ کی طرف سے ایک خاص حد سے سرِ مُو تجاوز نہ ہوا۔

آیت ۱۸ ﴿لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی ﴿۱۸﴾﴾ ''انہوں نے اپنے رب کی عظیم ترین آیات کو دیکھا۔''

معراج کے موقع پر حضور ﷺ کے مشاہدے سے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی دو آراء پائی جاتی ہیں۔ کچھ صحابہؓ کا خیال ہے کہ حضور ﷺ نے اللہ کو دیکھا' جبکہ دوسری رائے یہ ہے کہ آپؐ نے اللہ کو نہیں دیکھا بلکہ انوارِ الٰہیہ کا مشاہدہ کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس بات کے قائل تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے شبِ معراج میں اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تو یہاں تک فرمایا کرتی تھیں کہ ''جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا تھا وہ اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا افترا کرتا ہے''۔ صحیح مسلم (کتاب الایمان) میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے عبداللہ بن شقیقؒ کی دو روایتیں منقول ہیں۔ ایک روایت میں حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ مَیں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: هَلْ رَاَیْتَ رَبَّکَ ''کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا تھا؟'' حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا: ((نُوْرٌ اَنّٰی اَرَاہُ؟)) ''ایک نُور تھا' مَیں اُسے کیسے دیکھتا؟'' دوسری روایت میں حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ میرے اس سوال کا جواب آپ ﷺ نے یہ دیا کہ ((رَاَیْتُ نُوْرًا)) ''میں نے ایک نُور دیکھا تھا''۔ علامہ ابن القیمؒ نے ''زاد المعاد'' میں رسول اللہ ﷺ کے پہلے ارشاد کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ''میرے اور رؤیتِ باری تعالیٰ کے درمیان ایک نُور حائل تھا''۔ جبکہ دوسرے ارشاد کا مطلب وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ''میں نے اپنے رب کو نہیں بلکہ بس ایک نُور دیکھا''۔ البتہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منسوب روایات میں رؤیتِ باری تعالیٰ کا اثبات ملتا ہے۔ آیت زیر مطالعہ اس حوالے سے یہ واضح کرتی ہے کہ آپ ﷺ نے اللہ کی عظیم آیات کا مشاہدہ کیا۔ چنانچہ یہ آیت اوّل الذکر رائے کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہے کہ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی آیات کا مشاہدہ کیا نہ کہ خود اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔ سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں سفرِ معراج کے پہلے حصے (مسجد حرام تا مسجد اقصیٰ) کا ذکر ہوا' وہاں بھی یہ ارشاد ہوا ہے کہ ہم اپنے بندے کو اس لیے لے گئے تھے ﴿لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا﴾ ''تاکہ اُس کو اپنی نشانیاں دکھائیں''۔ لیکن وہاں ''زمینی آیات'' کے مشاہدے کی بات ہوئی ہے' جبکہ ان آیات میں سفرِ معراج کے دوسرے مرحلے کے دوران سدرۃ المنتہیٰ کے مقام کی آیات و تجلیات کے مشاہدے کا ذکر ہے۔ یہ مقام کسی مخلوق کی رسائی کی آخری حد ہے۔ اس سے آگے ''حریم ذات'' ہے' جہاں کسی غیر کا کوئی دخل ممکن نہیں۔ اس مقام خاص اور اس آخری حد پر لے جا کر حضور ﷺ کو خاص الخاص آیاتِ الٰہیہ کا مشاہدہ کرایا گیا جنہیں آیت زیر مطالعہ میں ''آیاتُ الکُبریٰ'' کہا گیا ہے۔

آیات ۱۹ تا ۳۲

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَ الْعُزّٰى ﴿۱۹﴾ وَ مَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ﴿۲۰﴾ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَ لَهُ الْاُنْثٰى ﴿۲۱﴾ تِلْكَ
اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴿۲۲﴾ اِنْ هِيَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ
سُلْطٰنٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ﴿۲۳﴾
اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى ﴿۲۴﴾ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَ الْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾ وَ كَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ
شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَرْضٰى ﴿۲۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ
بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ﴿۲۷﴾ وَ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا
الظَّنَّ ۚ وَ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ﴿۲۸﴾ فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَ لَمْ
يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۲۹﴾ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ
سَبِيْلِهٖ ۪ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ﴿۳۰﴾ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ
اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَ يَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ﴿۳۱﴾ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ
وَ الْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ
اِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴿۳۲﴾

آیت ۱۹ ﴿اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ﴿۱۹﴾﴾ ''تو کیا تم لوگوں نے لات اور عُزّٰی کے بارے میں غور کیا ہے؟''

اب یہاں سے مکّی سورتوں کے عمومی مضامین کا آغاز ہو رہا ہے۔

آیت ۲۰ ﴿وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ﴿۲۰﴾﴾ ''اور جو تیسری ایک اور (دیوی) منات ہے؟''

یعنی کبھی تم لوگوں نے اپنی ان تین دیویوں کی حقیقت کے بارے میں بھی سوچا ہے؟

آیت ۲۱ ﴿اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ﴿۲۱﴾﴾ ''کیا تمہارے لیے بیٹے ہیں اور اُس کے لیے بیٹیاں؟''

تم اپنے لیے تو بیٹے پسند کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ کو تم نے الاٹ بھی کی ہیں تو بیٹیاں!

آیت ۲۲ ﴿تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴿۲۲﴾﴾ ''یہ تو بہت بھونڈی تقسیم ہے!''

آیت ۲۳ ﴿اِنْ هِيَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ﴾ ''یہ کچھ نہیں ہے سوائے اس کے کہ کچھ نام ہیں جو رکھ لیے ہیں تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے''

﴿مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ﴾ ''اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نہیں اُتاری۔''

﴿اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ﴾ ''یہ لوگ نہیں پیروی کر رہے مگر ظن و تخمین کی اور اپنی خواہشاتِ نفس کی۔''

یعنی ان لوگوں نے اپنی خواہشاتِ نفس اور wishful thinkings کو عقائد کی شکل دے دی ہے اور کچھ فرضی نام رکھ کر ان کی پوجا شروع کر دی ہے۔

﴿وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ﴿۲۳﴾﴾ ''جب کہ ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے الہدیٰ آ چکا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے اپنی کتاب بھی نازل کی ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ کو بھی بھیجا ہے۔

آیت ۲۴ ﴿اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى ﴿۲۴﴾﴾ ''کیا انسان کو وہی کچھ مل جائے گا جس کی وہ آرزو کرتا ہے؟''

آیت ۲۵ ﴿فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾﴾ ''پس آخرت اور دنیا' سب اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔''

یعنی دنیا اور آخرت سے متعلق اختیارِ مطلق اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

آیت ۲۶ ﴿وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا﴾ ''اور کتنے ہی فرشتے ہیں آسمانوں میں جن کی شفاعت کسی کام نہیں آئے گی''

﴿اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰٓى ﴿۲۶﴾﴾ ''مگر اس کے بعد کہ اللہ جس کے لیے چاہے اجازت بخشے اور (سفارش) پسند کرے۔''

آسمانوں کے فرشتے اہلِ ایمان کے لیے تو دعا کرتے ہیں: ﴿يَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (المؤمن:۷) کہ پروردگار! تُو اہلِ ایمان کی مغفرت فرما دے۔ لیکن ان مشرکین کے لیے نہ کوئی دعا کرے گا اور نہ ہی شفاعت۔

آیت ۲۷ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ﴿۲۷﴾﴾ ''یہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے انہوں نے فرشتوں کے مؤنث نام رکھ دیے ہیں۔''

اور پھر اپنے خیال کے مطابق ان ہی ناموں پر انہوں نے اپنے لیے دیویاں گھڑ لی ہیں۔

آیت ۲۸ ﴿وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ﴾ ''اور ان کے پاس اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ وہ نہیں پیروی کر رہے مگر صرف گمان کی۔''

یعنی فرشتوں کے مؤنث نام رکھنے اور پھر ان ناموں کے مطابق دیویاں بنا کر ان کی پوجا کرنے کے بارے میں ان کے پاس نہ تو کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ ہی اللہ کی اتاری ہوئی کسی کتاب سے کوئی سند۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ یہ لوگ محض اپنے ظن وتخمین اور وہم وگمان کی پیروی کر رہے ہیں۔

﴿وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ﴿۲۸﴾﴾ ''اور ظن تو حق سے کچھ بھی مستغنی نہیں کر سکتا۔''

یعنی گمان کسی درجے میں بھی حق کا بدل نہیں ہو سکتا اور وہ حق کی جگہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا —— حق یا تو وہ الہامی علم (revealed knowledge) ہے جو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے لوگوں تک پہنچایا ہے یا پھر انسان کا وہ اکتسابی علم (acquired knowledge) جو وہ اپنے حواس سے حاصل ہونے والی ٹھوس معلومات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر حاصل کرتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ' عِلْمُ الْاَدْيَانِ وَعِلْمُ الْاَبْدَانِ۔ (اس موضوع پر مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو: سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۳۶ کی تشریح۔) اس کے علاوہ جن علوم کی بنیاد ظن وتخمین پر ہے' حق کے مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

آیت ۲۹ ﴿فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۲۹﴾﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ اعراض کر لیجیے ہر اُس شخص سے جس نے روگردانی کی ہے ہمارے ذکر سے اور دنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں ہے۔''

آپ ﷺ ہر ایسے شخص کو نظر انداز کر دیں اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں جو صرف اور صرف دنیا کا طالب ہے اور اپنے اُس مطلوب کی دھن میں اس نے ہماری یاد سے پیٹھ موڑ لی ہے۔ ایسے شخص کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ کا قانون اٹل ہے جس کی وضاحت سورۂ بنی اسرائیل کی ان آیات میں کر دی گئی ہے:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾﴾

''جو کوئی عاجلہ (دنیا) کا طلب گار بنتا ہے ہم اس کو جلدی دے دیتے ہیں اس میں سے جو کچھ ہم چاہتے ہیں' جس کے لیے چاہتے ہیں' پھر ہم مقرر کر دیتے ہیں اس کے لیے جہنّم۔ وہ داخل ہوگا اس میں ملامت زدہ' دھتکارا ہوا۔ اور جو کوئی آخرت کا طلب گار ہو' اور اس کے لیے اس کے شایانِ شان کوشش کرے اور وہ مؤمن بھی ہو تو یہی لوگ ہوں گے جن کی کوشش کی قدر افزائی کی جائے گی۔''

آیت ۳۰ ﴿ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ؕ﴾ ''یہ ہے ان کے علم کی رسائی کی حد۔''

ان کے علم کی رسائی بس دنیا تک ہی ہے اور وہ اسی میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ علم آخرت ان کے چھوٹے اور محدود ذہنوں کی پہنچ میں ہے ہی نہیں۔ حالانکہ انسان کا ذہنی ظرف ذرا بھی وسیع ہو تو وہ اپنے غور و فکر سے اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ انسان جو کہ اشرف المخلوقات ہے اس کی زندگی اتنی بے وقعت نہیں ہو سکتی کہ اسے ''چار دن'' کی زندگی کا عنوان دے کر فضول خواہشات کی نذر کر دیا جائے۔ بہر حال یہ بات عقل اور منطق ہی کے خلاف ہے کہ انسان جیسی اشرف المخلوقات اور مسجودِ ملائک ہستی کی زندگی محض تیس' چالیس یا پچاس برس کے دورانیے تک ہی محدود ہو۔ اس حوالے سے علامہ اقبال کا فلسفہ بہت بصیرت افروز اور مبنی بر حقیقت ہے۔ علامہ کے نزدیک انسانی زندگی وقت کے ایسے جاودانی تسلسل کا نام ہے جسے پیمانہ امروز و فردا سے ناپنا ممکن ہی نہیں: ؎

تُو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ جاوداں' پیہم دواں' ہر دم جواں ہے زندگی!

﴿اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۙ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ﴿۳۰﴾﴾ ''یقیناً آپ (ﷺ) کا ربّ خوب جانتا ہے اُن کو بھی جو اُس کی راہ سے بھٹک گئے ہیں اور وہ خوب جانتا ہے اُن کو بھی جو ہدایت پر ہیں۔''

آیت ۳۱ ﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۙ﴾ ''اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے''

آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

﴿لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا﴾ ''تاکہ وہ بدلہ دے اُن کو جنہوں نے بُرائیاں کمائی ہیں ان کے اعمال کا''

﴿وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ﴿۳۱﴾﴾ ''اور بدلہ دے اُن کو جنہوں نے نیک کام کیے ہیں اچھا۔''

آیت ۳۲ ﴿اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ﴾ ''وہ لوگ جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی سے بچتے ہیں سوائے کچھ آلودگی کے۔''

یہاں پر لَمَم سے مراد صغائر ہیں[1]۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ النساء آیت ۳۱ اور سورۃ الشوریٰ آیت ۳۷ میں بھی آ چکا ہے اور اب یہاں تیسری مرتبہ آیا ہے۔ مذکورہ آیات کے ضمن میں اس مضمون کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی جا چکی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے بارے میں بہت زیادہ متفکر بھی نہ ہوا جائے اور دوسروں سے درگزر سے بھی کام لیا جائے۔

یہاں اس حوالے سے میں آپ کی توجہ اس تلخ حقیقت کی طرف دلانا چاہتا ہوں کہ ہمارے معاشرے میں ہر شخص کسی نہ کسی دلیل کے ساتھ ایک دو کبائر کو اپنے لیے ''جائز'' قرار دے لیتا ہے (اِلّا ماشاء اللہ)۔ فیکٹری کا مالک کہتا ہے کہ کیا کریں جی! سود کے بغیر تو ہمارے ملک میں کاروبار کا کوئی تصور ہی نہیں۔ اب مجبوری ہے' کیا کریں! فیکٹری بند کر کے تو نہیں بیٹھ سکتے نا۔ سرکاری ملازم کہتا ہے کہ سکولوں کی فیسیں' گھر کا کرایہ' یوٹیلیٹی بلز کہاں سے ادا کروں؟ تنخواہ میں تو کسی طرح بھی گزارا ممکن نہیں۔ اب اگر رشوت نہیں لیں گے تو ظاہر ہے بھوکوں مریں گے! غرض ہر شخص نے اپنے ضمیر کے سامنے اپنی مجبوری کا رونا رو کر کبائر میں سے کم از کم ایک گناہ کو اپنا لیا ہے اور ضمیر کی تسلی کے لیے اپنی تمام تر ترجیحات صغائر سے ''پرہیز'' کی طرف منتقل کر دی ہیں۔ اس حوالے سے یہ لوگ صغائر سے متعلق مسائل بھی دریافت کرتے ہیں' پھر ان مسائل پر بحثیں بھی ہوتی ہیں اور ان کے بارے میں دوسروں پر اعتراضات بھی کیے جاتے ہیں' بلکہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑوں کی وجہ سے ''مَن دیگرم تو دیگری'' (مَیں اور ہوں' تم اور ہو) کے فتوے بھی صادر کیے جاتے ہیں۔ اس معاملے میں کوئی بھی اللہ کا بندہ یہ نہیں سوچتا (اِلّا ماشاء اللہ!) کہ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔ میں اس چند روزہ زندگی کی آسانیوں اور عیاشیوں کے بدلے اصل زندگی کو تو قربان نہ کروں۔ اگر ایک کام سے جائز طور پر گزارا نہیں ہوتا تو کوئی دوسرا کام کر لوں' یا اپنی ضروریات کو سکیڑ کر کم وسائل کے ساتھ زندگی بسر کر لوں' مگر حرام تو نہ کھاؤں!

﴿اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ؕ﴾ ''یقیناً آپ کا ربّ بہت ہی وسیع مغفرت والا ہے۔''

اُس کا دامنِ مغفرت بہت وسیع ہے۔ اہلِ ایمان بندے اگر کبائر و فواحش سے اجتناب کرتے رہیں تو وہ ان کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں پر گرفت نہیں کرے گا اور اپنی رحمتِ بے پایاں کی وجہ سے ان کو معاف فرما دے گا۔

﴿هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ﴾ ''وہ تمہیں خوب جانتا ہے' جبکہ اُس نے تمہیں زمین سے اٹھایا اور جب کہ تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں جنین کی شکل میں تھے۔''

﴿فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۝۳۲﴾ ''تو تم خود کو بہت پاکباز نہ ٹھہراؤ۔ وہ اُسے خوب جانتا ہے جو تقویٰ اختیار کرتا ہے۔''

یعنی اپنے نفس کی پاکی کے دعوے نہ کرو' وہی بہتر جانتا ہے کہ واقعتاً متقی کون ہے۔ دراصل اپنی پرہیزگاری کا ڈھنڈورا پیٹنے کی

۱۔ عربی میں 'لَمَم'' کا لفظ کسی چیز کی تھوڑی سی مقدار' یا اس کے خفیف سے اثر' یا اُس کے محض قرب' یا اُس کے ذرا سی دیر رہنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مفسرین نے ''لَمَم'' کی تفسیر میں کئی قول نقل کیے ہیں۔ بعض کے نزدیک گناہ کے جو خیالات دل میں آئیں مگر ان پر عمل نہ کیا جائے وہ ''لَمَم'' ہیں۔ بعض نے صغیرہ گناہ مراد لیے ہیں۔ بعض نے کہا کہ آدمی جس گناہ پر اصرار نہ کرے یا اُسے اپنی عادت نہ بنا لے یا جس گناہ سے توبہ کر لے وہ مراد ہیں۔ بعض نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ آدمی عملاً کسی بڑے گناہ کے قریب تک پہنچ جائے مگر اس کا ارتکاب نہ کرے۔ (حاشیہ از مرتب)

ضرورت اس شخص کو ہی محسوس ہوتی ہے جس کا دل ''تھوتھا چنا باجے گھنا'' کے مصداق تقویٰ سے خالی ہو۔ جہاں تقویٰ کی روح کو نظر انداز کیا جا رہا ہوگا وہاں سارا زور تقویٰ کے مظاہر پر ہوگا۔ اندر سے حرام خوری جاری ہوگی اور اس کو چھپانے کے لیے اوپر سے چھوٹی چھوٹی دینی علامات کو اپنا کر تقویٰ کا لبادہ اوڑھ رکھا ہوگا۔

آیات ۳۳ تا ۶۲

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى ﴿۳۳﴾ وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ﴿۳۴﴾ اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ﴿۳۵﴾ اَمْ لَمْ
يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ﴿۳۶﴾ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى ﴿۳۷﴾ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿۳۸﴾ وَاَنْ
لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ﴿۴۰﴾ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ﴿۴۱﴾ وَاَنَّ
اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴿۴۲﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ﴿۴۳﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ﴿۴۴﴾ وَاَنَّهٗ خَلَقَ
الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۴۵﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ﴿۴۶﴾ وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ﴿۴۷﴾ وَاَنَّهٗ
هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى ﴿۴۸﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ﴿۴۹﴾ وَاَنَّهٗٓ اَهْلَكَ عَادَا ِۨالْاُوْلٰى ﴿۵۰﴾ وَثَمُوْدَا فَمَآ
اَبْقٰى ﴿۵۱﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى ﴿۵۲﴾ وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ﴿۵۳﴾
فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴿۵۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ﴿۵۵﴾ هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ﴿۵۶﴾ اَزِفَتِ
الْاٰزِفَةُ ﴿۵۷﴾ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ﴿۵۸﴾ اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَتَضْحَكُوْنَ
وَلَا تَبْكُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ﴿۶۱﴾ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ﴿۶۲﴾

آیت ۳۳ ﴿اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى ﴿۳۳﴾﴾ ''پھر (اے نبی ﷺ!) کیا آپ نے اُس شخص کو بھی دیکھا جس نے پیٹھ موڑ لی؟''

آیت ۳۴ ﴿وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ﴿۳۴﴾﴾ ''تھوڑا سا دیا اور پھر سخت ہو گیا۔''

عام مفسرین کی رائے یہ ہے کہ ان آیات میں ولید بن مغیرہ کا تذکرہ ہے' مجھے بھی اس رائے سے اتفاق ہے۔ تاریخ میں اس شخص کے بارے میں جو معلومات ملتی ہیں ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر ایمان لانے کے قریب پہنچ چکا تھا' مگر پھر اچانک اسے اپنی چودھراہٹ یاد آ گئی۔ حق جوئی کی خواہش پر عصبیت کا جذبہ غالب آ گیا اور یوں اس نے اپنی سوچ دوبارہ بدل لی۔ یہاں اُس کے اسی رویے کا ذکر ہے۔ سورۃ المدثر میں اس شخص کا تذکرہ قدرے تفصیل سے آیا ہے۔

آیت ۳۵ ﴿اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ﴿۳۵﴾﴾ ''کیا اُس کے پاس غیب کا علم ہے کہ وہ دیکھ رہا ہے!''

آیت ۳۶ ﴿اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ﴿۳۶﴾﴾ ''کیا اُسے خبر نہیں پہنچی اس بارے میں جو کچھ موسیٰؑ کے صحیفوں میں تھا؟''

آیت ۳۷ ﴿وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى ﴿۳۷﴾﴾ ''اور ابراہیمؑ کے (صحیفوں میں تھا) جس نے وفا کی انتہا کر دی!''

صُحُفِ ابراہیمؑ اور صُحُفِ موسیٰؑ کا ذکر سورۃ الاعلیٰ میں بھی آیا ہے: ﴿اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۸﴾ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ

وَمُوْسٰی ﴿۳۶﴾ ''یہی بات پہلے صحیفوں میں (مرقوم) ہے' (یعنی) ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں میں''۔ صُحفِ موسیٰؑ تو عہد نامہ قدیم (Old Testament) کی پہلی پانچ کتابوں کی شکل میں آج بھی موجود ہیں' البتہ صُحفِ ابراہیمؑ کے بارے میں کسی کو کچھ خبر نہیں۔ اس حوالے سے میرا گمان ہے (واللہ اعلم) کہ ہندوؤں کے اُپنشد صُحفِ ابراہیمؑ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ (اس موضوع پر مزید تفصیل سورۂ طٰہٰ کی آیت ۹۸ کے تحت ملاحظہ ہو۔) حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے صحیفوں میں سے جس بات کا یہاں حوالہ دیا جا رہا ہے وہ یہ ہے:

آیت ۳۸ ﴿اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ﴿۳۸﴾﴾ ''کہ نہیں اٹھائے گی کوئی جان کسی دوسری جان کے بوجھ کو۔''

قیامت کے دن ہر شخص اپنی ذمہ داریوں کے لیے خود جواب دہ ہوگا۔ وہاں کوئی کسی کی مدد کو نہیں آئے گا' جیسا کہ سورۂ مریم کی اس آیت میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے: ﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿۹۵﴾﴾ کہ اُس دن ہر شخص اکیلا حاضر ہوگا۔ ماں باپ' اولاد' عزیز و اقارب میں سے کوئی اس کے ساتھ نہیں ہوگا۔

آیت ۳۹ ﴿وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ﴿۳۹﴾﴾ ''اور یہ کہ انسان کے لیے نہیں ہے مگر وہی کچھ جس کی اُس نے سعی کی ہوگی۔''

انسان کو جو کچھ کرنا ہوگا اپنی محنت اور کوشش کے بل پر کرنا ہوگا' خواہشوں اور تمناؤں سے کچھ نہیں ہوگا۔ قبل ازیں آیت ۲۴ میں سوال کیا گیا تھا کہ ''کیا انسان کو وہی کچھ مل جائے گا جس کی وہ تمنا کرے گا؟'' یہ آیت گویا مذکورہ سوال کا جواب ہے۔

آیت ۴۰ ﴿وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰی ﴿۴۰﴾﴾ ''اور یہ کہ اُس کی سعی عنقریب اُسے دکھا دی جائے گی۔''

سورۃ الزلزال میں اس مضمون کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ﴿۷﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴿۸﴾﴾ ''تو جس نے ذرّہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا' اور جس نے ذرّہ برابر بُرائی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔''

آیت ۴۱ ﴿ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰی ﴿۴۱﴾﴾ ''پھر اُس کو بدلہ دیا جائے گا پورا پورا بدلہ۔''

آیت ۴۲ ﴿وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی ﴿۴۲﴾﴾ ''اور یہ کہ بالآخر پہنچنا تمہارے رب ہی کی طرف ہے۔''

آیت ۴۳ ﴿وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰی ﴿۴۳﴾﴾ ''اور یہ کہ وہی ہے جو ہنساتا بھی ہے اور رلاتا بھی ہے۔''

یعنی اچھے بُرے حالات' خوشی' غم' تکلیف' بیماری سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔

آیت ۴۴ ﴿وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ﴿۴۴﴾﴾ ''اور یہ کہ وہی ہے جو مارتا بھی ہے اور زندہ بھی رکھتا ہے۔''

آیت ۴۵ ﴿وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰی ﴿۴۵﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰی ﴿۴۶﴾﴾ ''اور یہ کہ وہی ہے جس نے پیدا کیے ہیں جوڑے نر اور مادہ کے' ایک ہی بوند سے جبکہ وہ ٹپکائی جاتی ہے۔''

آیت ۴۶ ﴿وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰی ﴿۴۷﴾﴾ ''اور یہ کہ اُسی کے ذِمّے ہے دوبارہ اٹھانا۔''

یہاں یہ نکتہ بہت اہم اور لائقِ توجہ ہے کہ انسانوں کو دوبارہ اٹھانا اللہ تعالیٰ نے اپنے ذِمہ لیا ہے۔ گویا انسانوں کو دوبارہ زندہ کر کے ان کا احتساب کرنا اللہ تعالیٰ کے انصاف کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر وہ انسانوں کو دوبارہ نہیں اٹھاتا اور ان کو ان کے اچھے بُرے

اعمال کا بدلہ نہیں دیتا تو نیکوکار لوگوں کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہو جائے گا۔ اس لیے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی بھی آزمائشوں اور مصیبتوں میں گزاری۔ ساری زندگی وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے رہے، حرام خوریوں سے بچنے کے لیے روکھی سوکھی کھا کر گزارا کرتے رہے۔ اگر انہیں ان کی محنتوں اور قربانیوں کا صلہ نہیں ملتا تو اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوگا؟

آیت ۴۸ ﴿وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى ﴿۴۸﴾﴾ ''اور یہ کہ اُسی نے دولت دی اور اُسی نے خزانہ دیا۔''

اَقْنٰی چونکہ باب افعال سے ہے، جس کی خصوصیات میں ''سلب ماخذ'' بھی ہے، چنانچہ اس کا ترجمہ اَفْقَرَ بھی کیا گیا ہے۔ یعنی اُس نے کسی کو غنی اور کسی کو فقیر بنا دیا۔

آیت ۴۹ ﴿وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ﴿۴۹﴾﴾ ''اور یہ کہ وہی شِعریٰ کا بھی ربّ ہے۔''

الشِّعریٰ وہ ستارہ تھا جس کی مختلف اقوام میں پوجا کی جاتی تھی۔ یہ ستارہ اس حیثیت سے اہلِ عرب کے ہاں بھی معروف تھا۔ اس لیے انہیں بتایا گیا کہ جسے تم لوگ الٰہ مانتے ہو اس کا رب بھی اللہ ہی ہے۔ تمہاری قسمت کے فیصلے یہ ستارہ نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔

آیت ۵۰ ﴿وَاَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا ِۨ الْاُوْلٰى ﴿۵۰﴾﴾ ''اور یہ کہ اُسی نے ہلاک کیا تھا عادِ اُولیٰ کو۔''

''عادِ اولیٰ'' سے مراد قدیم قومِ عاد ہے، جس کی طرف حضرت ہود علیہ السلام مبعوث کیے گئے۔ یہ قوم اَحقاف کے علاقے میں آباد ہوئی۔ اس قوم پر جب عذاب بھیجنے کا فیصلہ ہوا تو حضرت ہودؑ اپنے اہلِ ایمان ساتھیوں کے ہمراہ اس علاقے سے ہجرت کر گئے۔ ان لوگوں کی نسل سے جو قوم وجود میں آئی وہ ''ثمود'' کہلائی۔ لیکن وہ لوگ چونکہ قومِ عاد ہی کی نسل سے تھے اس لیے انہیں ''عادِ ثانیہ'' بھی کہا جاتا ہے۔

آیت ۵۱ ﴿وَثَمُوْدَا ۡ فَمَاۤ اَبْقٰى ﴿۵۱﴾﴾ ''اور ثمود کو بھی، پس کسی کو باقی نہ چھوڑا۔''

آیت ۵۲ ﴿وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ﴾ ''اور قومِ نوحؑ کو بھی (ہلاک کیا) ان سے پہلے۔''

﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى ﴿۵۲﴾﴾ ''یقیناً وہ تو ان سے بڑھ کر ظالم اور ان سے بڑھ کر سرکش تھے۔''

آیت ۵۳ ﴿وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ﴿۵۳﴾﴾ ''اور (اُسی نے) الٹی ہوئی بستیوں کو پٹخ دیا۔''

اس سے سدوم اور عامورہ یعنی حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی بستیاں مراد ہیں۔

آیت ۵۴ ﴿فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴿۵۴﴾﴾ ''اور پھر اس کو ڈھانپ لیا جس چیز نے ڈھانپ لیا۔''

پہلے شدید زلزلے نے ان آبادیوں کو تلپٹ کیا اور اس کے بعد ان پر کنکروں کی بارش ہوئی۔ یہاں اس آیت میں اس بارش کی طرف اشارہ ہے یعنی کنکروں کی بارش نے اس علاقے کو ڈھانپ لیا۔

آیت ۵۵ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ﴿۵۵﴾﴾ ''تو تم اپنے رب کی کون کون سی قدرتوں کے بارے میں شک کرو گے؟''

آیت ۵۶ ﴿هٰذَا نَذِیْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ﴿۵۶﴾﴾ ''یہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ایک خبردار کرنے والے ہیں، پہلے خبردار کرنے والوں (کے زمرے) میں سے۔''

نذیر کے معنی ہیں: ڈرانے والا، آگاہ کرنے والا، خبردار (warn) کرنے والا اور النُّذُر اسی کی جمع ہے۔

آیت ۵۷ ﴿اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ۝۵۷﴾ ''قریب آ چکی ہے وہ آنے والی۔''

آیت ۵۸ ﴿لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ۝۵۸﴾ ''نہیں ہے اس کو اللہ کے سوا کوئی کھولنے والا۔''

قیامت برپا کرنے کا اختیار صرف اللہ ہی کے پاس ہے۔ گویا اس وقت قیامت کسی کشتی کی طرح ''لنگر انداز'' ہے' اللہ تعالیٰ جب چاہے گا اس کا لنگر اٹھا کر اسے برپا کر دے گا۔ پھر یہ کہ اس کے وقوع کا علم بھی اللہ ہی کے پاس ہے۔ اللہ کے سوا کوئی کھول کر نہیں بتا سکتا کہ قیامت کب آئے گی۔ اور جب وہ وقتِ معیّن آ جائے گا تو اللہ کے سوا کوئی اس کو ٹالنے اور دور کرنے پر قادر نہ ہوگا۔

آیت ۵۹ ﴿اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ۝۵۹﴾ ''تو کیا تم لوگوں کو اس کلام کے بارے میں تعجّب ہو رہا ہے؟''

هٰذَا الْحَدِيْثِ سے مراد یہاں قرآن مجید ہے' یعنی کیا تم لوگ قرآن کے بارے میں تعجب کر رہے ہو؟

آیت ۶۰ ﴿وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ ۝۶۰﴾ ''اور تم ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو!''

آیت ۶۱ ﴿وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ۝۶۱﴾ ''اور تم خوش فعلیاں کر رہے ہو!''

آیت ۶۲ ﴿فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ۝۶۲﴾ ''پس سجدہ کرو اللہ کے لیے اور اُسی کی بندگی کرو!''

روایات میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے پہلی مرتبہ یہ سورت حرمِ کعبہ میں قریش کے ایک بڑے مجمع کے سامنے تلاوت فرمائی تھی۔ اس مجمع میں اہلِ ایمان بھی تھے اور مشرکین کے خواص و عوام بھی۔ اس کلام کی شدّتِ تاثیر کا یہ عالَم تھا کہ جب آپ ﷺ نے اسے سنانا شروع کیا تو مخالفین کو اس پر شور مچانے کی ہمت نہ ہوئی اور حضور ﷺ نے جب یہ آخری آیت تلاوت فرمانے کے بعد سجدہ کیا تو آپؐ کے ساتھ مسلم و کافر سبھی سجدہ میں گر گئے۔ بعد میں مشرکین کو سخت پریشانی لاحق ہوئی کہ یہ ہم نے کیا کیا۔ آخر کار انہوں نے اپنے سجدے کے جواز میں یہ بات بتائی کہ ہم نے تو لات' عُزّیٰ اور منات کے ذکر (آیت ۱۹ اور ۲۰) کے بعد محمد (ﷺ) کی زبان سے یہ کلمات بھی سنے تھے: تلک الغُرانِقَةُ العُلٰی' وانَّ شفَاعتَهُن لتُرجٰی (یہ بلند مرتبہ دیویاں ہیں' اور ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے)۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ کلمات سننے کے بعد ہم نے سمجھا کہ محمد (ﷺ) نے ہماری دیویوں کو بھی تسلیم کر لیا ہے' لہٰذا اب ان کے ساتھ ہمارا جھگڑا ختم ہو گیا ہے۔ حالانکہ اس پوری سورت کے سیاق و سباق میں ان فقروں کی کوئی جگہ ممکن ہی نہیں جن کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ ان کے کانوں نے سنے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مشرکین کے سجدہ میں گر جانے کا واقعہ کلامِ الٰہی کی غیر معمولی تاثیر اور خصوصی طور پر اس سورت کے پُرجلال اندازِ خطابت کے باعث پیش آیا تھا۔ ہمارا معاملہ تو یہ ہے کہ ہم کلام اللہ کے ادبی جمال' اس کی فصاحت و بلاغت کی لطافتوں اور خطابت کی چاشنی کا صحیح ادراک نہیں کر سکتے۔ مگر اس کے اوّلین مخاطبین تو اہلِ زبان تھے۔ پھر نزولِ قرآن کے زمانے کے عرب معاشرے میں سخن گوئی اور سخن فہمی کا مجموعی ذوق بھی عروج پر تھا۔ وہ لوگ قرآن مجید کے ادبی و لسانی محاسن کو خوب سمجھتے تھے' بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے بڑے بڑے شعراء' ادباء اور خُطباء قرآن مجید کے اعجازِ بیان کے سامنے سرنگوں ہو چکے تھے۔ ظاہر ہے اچھے کلام کی تاثیر سے تو کسی کو بھی انکار نہیں۔ خود حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً))[۲] ''یقیناً بہت سے اشعار حکمت پر مبنی ہوتے ہیں''۔ نیز فرمایا: ((اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ

۲۔ صحیح البخاری' کتاب الادب' باب مایجوز من الشعر والرجز والحداء... وسنن الترمذی' کتاب الادب' باب ماجاء ان من الشعر حکمة۔

لَسِحْرًا))[۳] ''یقیناً بہت سے خطبات جادو کی سی تاثیر رکھتے ہیں''۔ زورِ خطابت اور تاثیر کے اعتبار سے اگرچہ قرآن مجید کی ہر آیت ہی لاجواب ہے مگر سورۃ النجم اس حوالے سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کے تناظر میں مذکورہ واقعہ کی توجیہہ یہ ہے کہ جب حضور ﷺ نے اس سورت کی تلاوت شروع کی تو تمام حاضرینِ مجمع دم بخود ہو کر سننے میں محو ہو گئے۔ حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرہ ان کی روحوں کی گہرائیوں تک اترتا گیا۔ خصوصاً مشرکین کی کیفیت تو ایسی تھی کہ تلاوت کے اختتام تک وہ گویا مبہوت ہو چکے تھے۔ چنانچہ اختتامِ تلاوت پر جب حضور ﷺ اور مجمع میں موجود اہلِ ایمان سجدہ میں گئے تو ﴿فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ﴾ کے حکم کی تاثیر، ہیبت اور جلالت کی تاب نہ لاتے ہوئے سب کے سب مشرکین بھی بے اختیار سجدے میں گر گئے۔ گویا وہ اسی طرح سجدے میں گرا دیے گئے (واللہ اعلم!) جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں آئے ہوئے جادوگر سجدوں میں گرا دیے گئے تھے: ﴿وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجِدِيْنَ ۝۴۶﴾ (الاعراف)۔ واضح رہے کہ سورۃ الاعراف کی اس آیت میں فعل مجہول (اُلْقِيَ) استعمال ہوا ہے۔ یعنی ایسے لگا جیسے انہیں کسی نے پکڑ کر سجدے میں گرا دیا ہو۔

۳۔ صحیح البخاری، کتاب الطب، باب ان من البیان سحرًا۔ وصحیح مسلم، کتاب الجمعة، باب تخفیف الصلاة والخطبة۔

سُوْرَةُ الْقَمَرِ

آیات ۱ تا ۸

سُوْرَةُ الْقَمَرِ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۵۵ رُكُوْعَاتُهَا: ۳

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ ۝۱ وَ اِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَ يَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝۲ وَ كَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ۝۳ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۝۴ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۝۵ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ ۝۶ خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ۝۷ مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ؕ يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ۝۸

آیت ۱ ﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝۱﴾ ”قیامت کی گھڑی قریب آ چکی اور چاند شق ہو گیا۔“

جیسا کہ قبل ازیں بھی کئی بار ذکر ہو چکا ہے کہ قیامت کی نشانیوں میں سب سے قطعی اور یقینی نشانی حضور ﷺ کی بعثت ہے۔ اس حوالے سے حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ))[1] ”مجھے اور قیامت کو ان دو انگلیوں کی طرح (جڑا ہوا) بھیجا گیا ہے“۔ اس لحاظ سے اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ کا مفہوم یہ ہے کہ اب جبکہ آخری رسولؐ بھی دنیا میں آ چکے ہیں تو سمجھ لو کہ قیامت کا وقت بہت قریب آ لگا ہے۔ سورۃ السجدۃ کی آیت ۵ میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک دن ہمارے ہزار برس کے برابر ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو حضور ﷺ کے وصال کو ابھی صرف ڈیڑھ دن ہی ہوا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق حضور ﷺ کی بعثت کے بعد اب قیامت بالکل سامنے ہے۔ حضرت اسرافیلؑ اپنے مُنہ کے ساتھ صُور لگائے بالکل تیار کھڑے ہیں۔ بس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اشارے کی دیر ہے۔ جونہی اشارہ ہوگا وہ صُور میں پھونک ماردیں گے۔ قُربِ قیامت کے اس مفہوم کو سورۃ المعارج میں یوں بیان کیا گیا ہے: ﴿اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝۶ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۝۷﴾ ”یہ لوگ تو قیامت کو بہت دُور سمجھ رہے ہیں، جبکہ ہم اسے بہت قریب دیکھ رہے ہیں۔“

آیت میں چاند کے پھٹنے کا ذکر ایک خرقِ عادت واقعہ کے طور پر ہوا ہے۔ روایات کے مطابق اُس وقت حضور ﷺ منیٰ میں تشریف فرما تھے۔ چاند کی چودھویں رات تھی۔ آپؐ کے اردگرد ہر طرح کے لوگ تھے۔ کسی نے کہا کہ آپؐ کی طرف سے کوئی نشانی

۱۔ صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب قول النبی ﷺ بعثت انا والساعة کھاتین۔ ح: ۶۵۰۴ و ۶۵۰۵۔ وصحیح مسلم، کتاب الفتن واشراط الساعة، باب قرب الساعة، ح: ۸۶۷ و ۲۹۵۱۔

ہونی چاہیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: چاند کی طرف دیکھو۔ لوگوں کو متوجہ کر کے آپ ﷺ نے انگلی کا اشارہ کیا اور چاند پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ ایک ٹکڑا سامنے کی پہاڑی کے ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف چلا گیا اور پھر اگلے ہی لمحے دونوں ٹکڑے قریب آ کر دوبارہ جڑ گئے۔ آپ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا: دیکھو اور گواہ رہو! کفار نے کہا کہ محمد (ﷺ) نے ہم پر جادو کر دیا تھا' اس لیے ہماری آنکھوں نے دھوکہ کھایا۔ بعد میں باہر سے آنے والے لوگوں نے بھی اس کی شہادت دی۔ میرے نزدیک یہ معجزہ نہیں تھا بلکہ ایک ''خرقِ عادت'' واقعہ تھا۔ اس نکتے کی وضاحت اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ کی جا چکی ہے کہ ہر رسول کو ایک معجزہ دیا گیا جو با قاعدہ دعوے کے ساتھ دکھایا گیا۔ اس لحاظ سے حضور ﷺ کا معجزہ قرآن ہے۔ البتہ خرقِ عادت واقعات حضور ﷺ سے بے شمار نقل ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے اگر اولیاء اللہ سے کرامات کا ظہور ہوتا ہے تو حضور ﷺ کی کرامات تو ہزار گنا بڑی ہوں گی۔

اس واقعہ پر بہت سے اعتراضات بھی ہوئے ہیں۔ اس بنیاد پر بھی کہ اس سے متعلق دنیا میں کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں۔ اسی لیے سرسید احمد خان مرحوم اور ان کے مکتبہ فکر کے لوگوں نے آیت کے متعلقہ الفاظ کی مختلف تاویلات کی ہیں۔ بہر حال جہاں تک تاریخی ثبوت نہ ہونے کا تعلق ہے اس بارے میں یہ حقیقت بھی مدِنظر رہنی چاہیے کہ یہ واقعہ رونما ہونے کے وقت آدھی دنیا میں تو دن کی روشنی ہو گی۔ لیکن جن علاقوں میں چاند دیکھا جا سکتا تھا ان علاقوں کے لوگ بھی تو ظاہر ہے اس وقت ٹکٹکی باندھے چاند کو نہیں دیکھ رہے تھے کہ ان میں سے اکثر اس واقعے کے عینی شاہد بن جاتے۔ پھر یہ منظر بھی صرف لمحے بھر کا تھا اور اس دوران چاند کی روشنی میں بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا کہ لوگ چونک کر دیکھتے۔ البتہ ایک تاریخی روایت کے مطابق برصغیر میں مالابار کے ساحلی علاقے کے ایک ہندو راجہ نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ بعد میں جب عرب تاجروں کے ذریعے اُس تک اسلام کی دعوت اور قرآنی تعلیمات پہنچیں تو اُس نے نہ صرف ایک چشم دید گواہ کے طور پر اس واقعہ کی تصدیق کی بلکہ وہ ایمان بھی لے آیا۔ واللہ اعلم!

آیت ۲ ﴿وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝۲﴾ ''اور اگر وہ دیکھیں گے کوئی نشانی تب بھی وہ اعراض ہی کریں گے اور کہیں گے یہ تو جادو ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے۔''

آیت ۳ ﴿وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ﴾ ''اور انہوں نے تکذیب کی اور اپنی خواہشات کی پیروی کی''

﴿وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ۝۳﴾ ''اور (اللہ کا) ہر امر ایک وقتِ معیّن کے لیے قرار پا چکا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی منصوبہ بندی میں ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ کوئی کام اللہ کے طے شدہ وقت سے نہ تو پہلے انجام پا سکتا ہے اور نہ ہی اس سے مؤخر ہو سکتا ہے۔ انسان کا کام ہے کہ وہ کوشش کرتا رہے اور نتائج اللہ پر چھوڑ دے۔ جیسے یہ طے شدہ امر ہے کہ اللہ کے دین کا غلبہ دنیا میں ہو کر رہے گا' مگر اللہ کی مشیت میں اس کے لیے کون سا وقت مقرر ہے ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ چنانچہ ہمیں چاہیے کہ ہم اقامتِ دین کی جدّوجُہد کو فرضِ عین اور اپنی اخروی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہوئے اس میں اپنا تن من دھن لگانے کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہیں۔ سیرتِ نبویؐ سے اس جدّوجُہد کے منہج کو سمجھیں' اس کے آداب سیکھیں' اس کی شرائط معلوم کریں اور پورے خلوصِ نیت کے ساتھ اس کے لیے محنت کریں۔ اس محنت اور جدّوجُہد کے دوران ہمیں نتائج کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں تو یہ محنت اللہ کی رضا کے لیے کرنی ہے۔ اگر ہماری اس محنت کے نتائج ہماری زندگیوں میں ظاہر نہیں ہوتے تو کوئی پروا نہیں' ہم دین کو غالب کرنے کے مکلّف نہیں' ہم تو صرف اس کے لیے جدّوجُہد کرنے کے مکلّف ہیں۔ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا اللہ کے ذمے ہے۔ اگر

ہم نے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق خلوصِ نیت سے اس راستے میں محنت کی تو اللہ تعالیٰ کے ہاں ہم ضرور سرخرو ہوں گے۔

اس فلسفے کو اچھی طرح سے نہ سمجھنے کی وجہ سے اقامتِ دین کی جدّوجُہد میں لوگ غلطیاں کرتے ہیں۔ جب ان کی جدّوجُہد کے خاطر خواہ نتائج سامنے نہیں آتے تو وہ عجلت اور بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہیں اور مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے الٹے سیدھے طریقے اپناتے ہیں۔ ایسی ہی غلطیوں سے تحریکیں غلط راستوں پر چل پڑتی ہیں اور اس وجہ سے دین الٹا بدنام ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ایک بہت اہم نکتہ یہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے دوران غور وفکر کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھنا چاہیے۔ حضور ﷺ کے بعد اب نہ تو کوئی شخصیت معصوم عن الخطا ہے اور نہ ہی کسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہِ راست راہنمائی مل سکتی ہے۔ ظاہر ہے اب یہ کام اجتہاد اور غور وفکر سے ہی چلنا ہے اور اجتہاد میں غلطی کا ہر وقت امکان رہتا ہے۔ چنانچہ انفرادی و اجتماعی سطح پر انسانوں سے غلطیاں سرزد ہونے کے امکان کے پیشِ نظر فیصلوں پر نظرِ ثانی کی گنجائش بھی رکھنی چاہیے اور اس کے لیے ذہنی طور پر ہر وقت تیار بھی رہنا چاہیے۔

آیت ۴ ﴿وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۙ﴾ ''اور ان کے پاس وہ خبریں آ چکی ہیں جن میں تنبیہ ہے۔''

گزشتہ اقوام کے اپنے پیغمبروں کو جھٹلانے اور پھر اس کے نتیجے میں عذابِ الٰہی کے ذریعے تباہ ہو جانے کی خبریں (انباء الرسل) ان لوگوں کو تفصیل سے بتائی جا چکی ہیں۔ ان خبروں میں مشرکینِ مکہ کے لیے یقیناً کافی تنبیہ و تہدید اور سامانِ عبرت موجود ہے۔

آیت ۵ ﴿حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ ۡ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۙ﴾ ''کامل دانائی (کی باتیں)' لیکن ان خبردار کرنے والوں سے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا۔''

آیت ۶ ﴿فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ۘ﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ ان سے صرفِ نظر کر لیجیے۔''

﴿يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ ۙ﴾ ''جس دن ایک پکارنے والا پکارے گا ایک بہت ناگوار چیز کی طرف۔''

جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے' ابتدائی مکّی دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں حضور ﷺ کو ملتے جلتے الفاظ میں یہ ہدایت بار بار دی گئی ہے کہ آپؐ صبر کریں' آپؐ درگزر سے کام لیں' انہیں نظر انداز کر دیں' وغیرہ وغیرہ۔

آیت ۷ ﴿خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ ﴾ ''(اُس وقت) ان کی نگاہیں زمین میں گڑی ہوں گی۔''

﴿يَّخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ۙ﴾ ''یہ اپنی قبروں سے ایسے نکل کر آئیں گے جیسے ٹڈی دل پھیلا ہوا ہو۔''

ظاہر ہے ہزاروں سال سے انسان اس زمین میں دفن ہو رہے ہیں اور قیامت تک ان کی تعداد کتنی ہو جائے گی' ہم اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جب حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آخری فوت ہونے والے انسان تک سب کے سب زمین سے نکل کر ایک ہی سمت دوڑے چلے جا رہے ہوں گے تو وہ ٹڈی دل کی طرح نظر آئیں گے۔

آیت ۸ ﴿مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ؕ﴾ ''دوڑتے ہوئے آئیں گے پکارنے والے کی طرف۔''

﴿يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ۘ﴾ ''کافر کہیں گے کہ یہ تو بڑا سخت دن ہے۔''

ہر شخص کو اپنی قبر سے اٹھتے ہی اندازہ ہو جائے گا کہ اس کے ساتھ کیسا معاملہ پیش آنے والا ہے۔ جیسا کہ سورۃ القیامہ میں فرمایا گیا: ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ﴿۱۴﴾﴾ کہ ہر انسان اپنے بارے میں بہت اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کیا ہے۔ ''من آنم کہ من دانم!'' چنانچہ کفار و مشرکین اپنی قبروں سے نکلتے ہی روزِ حشر کی سختیوں کے بارے میں چیخ و پکار شروع کر دیں گے۔

آیات ۹ تا ۱۷

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَ قَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ ﴿۹﴾ فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴿۱۰﴾ فَفَتَحْنَاۤ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ﴿۱۱﴾ وَّ فَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُیُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰۤى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ﴿۱۲﴾ وَ حَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّ دُسُرٍ ﴿۱۳﴾ تَجْرِیْ بِاَعْیُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ﴿۱۴﴾ وَ لَقَدْ تَّرَكْنٰهَاۤ اٰیَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۵﴾ فَكَیْفَ كَانَ عَذَابِیْ وَ نُذُرِ ﴿۱۶﴾ وَ لَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۷﴾

آیت ۹ ﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ﴾ ''جھٹلایا تھا ان سے پہلے نوحؑ کی قوم نے''

اب یہاں سے اس سورت میں انباء الرسل کا تذکرہ شروع ہو رہا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے' سورۃ النجم اور سورۃ القمر کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سورۃ النجم میں ''تذکیر بآلاء اللہ'' (اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور نعمتوں کے ذریعے تذکیر) کا انداز تھا' جبکہ اس سورت میں ''تذکیر بایام اللہ'' اور انباء الرسل کا تذکرہ ہے۔ بالکل یہی تقسیم اور یہی انداز اس سے پہلے ہم سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف کے مطالعے کے دوران بھی دیکھ چکے ہیں۔ سورۃ الانعام میں آلاء اللہ کے ذریعے تذکیر کی گئی ہے' جبکہ سورۃ الاعراف میں انباء الرسل کا انداز ہے۔ اسی طرح یہ دونوں سورتیں بھی مل کر تذکیر و انذار کے دونوں پہلوؤں کی تکمیل کرتی ہیں۔

﴿فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ ﴿۹﴾﴾ ''تو انہوں نے ہمارے بندے کو جھٹلایا اور کہا کہ یہ تو مجنون ہے اور اُسے جھڑک دیا گیا۔''

اس بدبخت قوم نے ہمارے جلیل القدر رسولؑ کو نہ صرف جھٹلا دیا بلکہ اس کے ساتھ اہانت آمیز سلوک روا رکھا۔

آیت ۱۰ ﴿فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴿۱۰﴾﴾ ''تو اُس نے پکارا اپنے رب کو کہ میں مغلوب ہو چکا ہوں' اب تُو اُن سے انتقام لے۔''

رسولوں کی مدد کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے قانون کا ذکر سورۃ الصّٰفّٰت میں اس طرح آیا ہے: ﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۷۱﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾﴾ ''اور ہماری یہ بات پہلے سے طے شدہ ہے اپنے اُن بندوں کے لیے جن کو ہم (رسول بنا کر) بھیجتے رہے ہیں' کہ اُن کی لازماً مدد کی جائے گی۔ اور یقیناً ہمارا لشکر ہی غالب رہے گا۔''

آیت ۱۱ ﴿فَفَتَحْنَاۤ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ﴿۱۱﴾﴾ ''تو ہم نے کھول دیے آسمان کے دروازے اُس پانی کے ساتھ جو مسلسل چھاجوں برستا رہا۔''

آیت ۱۲ ﴿وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا﴾ ''اور ہم نے زمین کو پھاڑ کر چشمے ہی چشمے کر دیا''

اُس وقت اس علاقے کی صورتِ حال یوں تھی کہ آسمان سے مسلسل موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور نیچے زمین سے جا بجا چشمے اس طرح پھوٹ رہے تھے کہ زمین گویا چشموں میں تبدیل ہو گئی تھی۔

﴿فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝۱۲﴾ ''تو وہ سارا پانی مل گیا ایک ایسے کام کے لیے جس کا فیصلہ ہو چکا تھا۔''

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس نافرمان قوم کو غرق کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کے مطابق آسمان سے برسنے والے اور زمین سے پھوٹنے والے پانی نے مل کر ایک خوفناک سیلاب کی شکل اختیار کر لی۔

آیت ۱۳ ﴿وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ۝۱۳﴾ ''اور ہم نے اُسے سوار کر دیا اُس (کشتی) پر جو تختوں اور کیلوں سے بنی تھی۔''

آیت ۱۴ ﴿تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا ۚ﴾ ''جو چل رہی تھی ہماری نگاہوں کے سامنے۔''

وہ کشتی ہماری نگرانی اور حفاظت میں چل رہی تھی۔

﴿جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ۝۱۴﴾ ''یہ بدلہ تھا اُس شخص کے لیے جس کی ناقدری کی گئی تھی۔''

یوں ہم نے اپنے بندے نوحؑ کی قدر افزائی فرمائی جس کی قوم نے اُسے ٹھکرا دیا تھا۔ اس کشتی کے ذریعے ہم نے اُسے اور اُس کے اہلِ ایمان ساتھیوں کو سیلاب سے محفوظ رکھا۔

آیت ۱۵ ﴿وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝۱۵﴾ ''اور ہم نے اسے چھوڑ دیا ایک نشانی کے طور پر' تو ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا!''

یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی مشیتِ الٰہی سے محفوظ کر لی گئی اور کسی وقت ایک بہت بڑی نشانی کے طور پر دنیا کی نظروں کے سامنے آ جائے گی۔ بالکل اسی طرح جس طرح زیرِ زمین دفن شدہ شداد کی جنتِ ارضی کے بارے میں اب دنیا جان چکی ہے یا بحیرۂ مردار کی تہہ میں قومِ لوطؑ کے شہروں کے کھنڈرات دریافت کر لیے گئے ہیں۔

آیت ۱۶ ﴿فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝۱۶﴾ ''تو کیسا رہا میرا عذاب اور میرا خبردار کرنا!''

آیت ۱۷ ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝۱۷﴾ ''اور ہم نے قرآن کو آسان کر دیا ہے نصیحت اخذ کرنے کے لیے' تو ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا!''

یہ اس سورت کی ترجیعی (بار بار دہرائی جانے والی) آیت ہے اور اس میں ایک چیلنج کا سا انداز پایا جاتا ہے۔ مضمون کی اہمیت کے پیشِ نظر پوری سورت میں اس آیت کو چار مرتبہ دہرایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس اعلان کو پڑھ لینے یا سن لینے کے بعد ایک بندے پر گویا اتمامِ حجت ہو جاتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ قرآن کو سمجھنے اور اس سے ہدایت حاصل کرنے کے لیے استطاعت بھر کوشش شروع کر دے۔ خصوصی طور پر پڑھے لکھے خواتین و حضرات پر تو گویا فرض ہے کہ وہ عربی سیکھیں اور قرآن کے معانی و مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اگر وہ باقی علوم حاصل کر سکتے ہیں تو قرآن کا علم باقاعدہ حاصل نہ کرنے کے بارے میں اللہ

تعالیٰ کے سامنے ان کا کوئی عذر قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ آج ہمارا المیہ یہ ہے کہ اس قدر اہم اور بنیادی فرض کے بارے میں لوگوں کو بتایا ہی نہیں جاتا۔ لیلۃ القدر میں نوافل پڑھنے کی ترغیب بھی دی جاتی ہے' مختلف اذکار و وظائف کے ثواب کے بارے میں بھی بتایا جاتا ہے' لیکن یہ نہیں بتایا جاتا کہ اپنی اپنی استطاعت کے مطابق قرآن کے مطالب و مفاہیم کا سمجھنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

عربی سیکھنے کے حوالے سے ہمارے لیے حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ یہ ایک زندہ زبان ہے۔ دنیا کے ایک بہت بڑے علاقے میں بولی جاتی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر اس کی اہمیت مسلّمہ ہے۔ آج کوئی بین الاقوامی فورم ایسا نہیں جہاں پر عربی ترجمہ پیش کرنے کا انتظام نہ ہو۔ ہم مسلمانوں کو اپنی الہامی کتاب کی زبان کو سیکھنے کے لیے یہودیوں اور ہندوؤں سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ اگر یہ قومیں اپنی مُردہ زبانوں (عبرانی اور سنسکرت) کو زندہ کر سکتی ہیں تو ہم اپنی زندہ زبان کو کیوں نہیں سیکھ سکتے؟ بہرحال آج نوجوان نسل میں یہ احساس اجاگر کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

آیات ۱۸ تا ۳۲

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴿۱۸﴾ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ
نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴿۱۹﴾ تَنْزِعُ النَّاسَ ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ﴿۲۰﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۲۱﴾ وَ
لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۲۲﴾ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ﴿۲۳﴾ فَقَالُوْۤا اَبَشَرًا مِّنَّا
وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ ﴿۲۴﴾ ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ
اَشِرٌ ﴿۲۵﴾ سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ﴿۲۶﴾ اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ
وَاصْطَبِرْ ﴿۲۷﴾ وَ نَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿۲۸﴾ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى
فَعَقَرَ ﴿۲۹﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴿۳۰﴾ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ
الْمُحْتَظِرِ ﴿۳۱﴾ وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۳۲﴾

آیت ۱۸ ﴿كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۱۸﴾﴾ ''جھٹلایا تھا قومِ عاد نے بھی' تو کیسا رہا میرا عذاب اور میرا خبردار کرنا؟''

آیت ۱۹ ﴿اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا﴾ ''ہم نے ان پر مسلط کر دی ایک تند و تیز ہوا''
﴿فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴿۱۹﴾﴾ ''ایک مسلسل نحوست کے دن میں۔''

آیت ۲۰ ﴿تَنْزِعُ النَّاسَ ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ﴿۲۰﴾﴾ ''وہ لوگوں کو یوں اُکھاڑ پھینکتی تھی جیسے وہ کھجور کے تنے ہوں اُکھڑی ہوئی جڑوں والے۔''

طویل القامت ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کو کھجور کے تنوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ ہوا کے اس عذاب کی وجہ سے وہ مُردہ حالت میں زمین پر ایسے پڑے تھے جیسے جڑوں سے اُکھڑے ہوئے کھجوروں کے تنے پڑے ہوں۔

آیت ۲۱ ﴿فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝۲۱﴾ ''تو کیسا رہا میرا عذاب اور میرا خبردار کرنا؟''

آیت ۲۲ ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝۲۲﴾ ''اور ہم نے اس قرآن کو آسان کر دیا ہے نصیحت حاصل کرنے کے لیے' تو ہے کوئی اس سے نصیحت حاصل کرنے والا!''

آیت ۲۳ ﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ۝۲۳﴾ ''قومِ ثمود نے بھی جھٹلایا خبردار کرنے والوں کو۔''

آیت ۲۴ ﴿فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ۙ﴾ ''انہوں نے کہا: کیا ہم اپنے میں سے ہی ایک بشر کی پیروی کریں؟''

﴿اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ۝۲۴﴾ ''پھر تو یقیناً ہم پڑ جائیں گے گمراہی میں اور آگ میں۔''

اپنے جیسے ایک انسان کی اطاعت اور پیروی کرنے کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم نے اپنے آپ کو خود ہی گمراہی میں اور آگ کے گڑھے میں ڈال دیا۔ سُعُر جمع ہے سَعِیر کی اور سَعِیر کے معنی آگ کے ہیں۔ ایسی باتیں کرتے ہوئے وہ لوگ گویا حضرت صالح علیہ السلام ہی کے الفاظ میں آپؑ کو جواب دے رہے تھے۔ حضرت صالح علیہ السلام اُن سے کہتے تھے کہ تم لوگ اگر میری بات نہیں مانو گے تو آخرت میں جہنّم کی آگ کا ایندھن بنو گے۔ جواب میں وہ کہتے تھے کہ تم ہماری ہی طرح کے ایک انسان ہو۔ اگر ہم تمہیں اپنا پیشوا مان کر تمہارے پیچھے چل پڑیں تو یہ گمراہی کا راستہ ہوگا اور ہمارے لیے اسی دنیا میں خود کو آگ میں جھونک دینے کے مترادف ہوگا۔

آیت ۲۵ ﴿ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا﴾ ''کیا یہ ذکر ہمارے مابین اسی پر القا کیا گیا ہے؟''

اگر ہم مان بھی لیں کہ یہ سچ کہہ رہے ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے وحی کے لیے آخر اسی شخص کا انتخاب کیوں کیا؟ اس منصب کے لیے اُس کی نظر ہمارے کسی بڑے سردار پر کیوں نہیں پڑی؟

﴿بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ۝۲۵﴾ ''بلکہ یہ انتہائی جھوٹا اور شیخی خورا ہے۔''

لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے اور صرف اپنی بڑائی جتلانے اور شیخی بگھارنے کے لیے اس نے یہ دعویٰ کر رکھا ہے کہ مجھ پر اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے۔

آیت ۲۶ ﴿سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ۝۲۶﴾ ''جلد ہی انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون انتہائی جھوٹا اور شیخی خورا ہے!''

آیت ۲۷ ﴿اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ۝۲۷﴾ ''ہم بھیجے دیتے ہیں اونٹنی کو ان کی آزمائش کے لیے' تو آپؑ انتظار کیجیے ان کے بارے میں اور صبر کیجیے۔''

یہ خطاب حضرت صالح علیہ السلام سے ہے کہ ہم ان کے مطالبے کے مطابق اونٹنی بطور معجزہ ان کے سامنے لا رہے ہیں' جو ان کے لیے بہت بڑی آزمائش بن جائے گی۔ لیکن ابھی چونکہ ان کی مہلت باقی ہے اس لیے آپؑ صبر کے ساتھ ان کے بارے میں اللہ کے فیصلے کا انتظار کیجیے۔

آیت ۲۸ ﴿وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ۝۲۸﴾ ''اور انہیں بتا دیجیے کہ اب پانی ان کے مابین تقسیم ہوگا' ہر پینے کی باری پر حاضری ہوگی۔''

اللہ تعالیٰ نے ان کے مطالبے پر ایک چٹان سے حاملہ اونٹنی پیدا کر دی اور اس کا نام ناقۃُ اللہ (اللہ کی اونٹنی) [الاعراف: ۷۳ اور ہود: ۶۴] رکھا۔ وہ اونٹنی جب چشمے پر پانی پینے کے لیے آتی تو اس کی ہیبت سے ان کے تمام مویشی بدک کر بھاگ جاتے تھے۔ بالآخر باہمی مشورے سے طے ہوا کہ ایک دن اونٹنی پانی پیے گی اور دوسرے دن ان کے مال مویشی پانی پینے کے لیے آئیں گے۔ چنانچہ جب وہ دوسرے دن چشمے پر آتی تو چشمے کا سارا پانی پی جاتی۔

آیت ۲۹ ﴿فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ۝۲۹﴾ ''تو انہوں نے پکارا اپنے ایک ساتھی کو، پس اُس نے ہاتھ بڑھایا اور اس کی کونچیں کاٹ دیں۔''

انہوں نے اس اونٹنی سے جان چھڑانے کے لیے اپنی قوم کے ایک ایسے شخص کو تیار کیا جو ان میں سب سے زیادہ سخت دل تھا۔ اس بدبخت نے ناقۃ اللہ پر حملہ کر کے اسے مار ڈالا۔

آیت ۳۰ ﴿فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝۳۰﴾ ''پھر کیسا رہا میرا عذاب اور میرا خبردار کرنا؟''

آیت ۳۱ ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ۝۳۱﴾ ''ہم نے اُن پر بس ایک ہی چنگھاڑ بھیجی تو وہ باڑھ لگانے والے کی روندی ہوئی باڑھ کی طرح چُورا ہو کر رہ گئے۔''

اگر جانوروں کا کوئی بڑا سا گلہ کسی کھیت کی باڑھ کو روندتا ہوا گزر جائے تو وہ باڑھ چُورا چُورا ہو جاتی ہے، بالکل اسی طرح وہ نافرمان لوگ بھی چُورا چُورا ہو کر پڑے رہ گئے۔

آیت ۳۲ ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝۳۲﴾ ''اور ہم نے تو اس قرآن کو آسان کر دیا ہے سمجھنے کے لیے، تو ہے کوئی سوچنے سمجھنے والا؟''

آیات ۳۳ تا ۴۲

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍۭ بِالنُّذُرِ ۝۳۳ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ۝۳۴ نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ۝۳۵ وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ۝۳۶ وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝۳۷ وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ۝۳۸ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝۳۹ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝۴۰ وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ۝۴۱ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ۝۴۲

آیت ۳۳ ﴿كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍۭ بِالنُّذُرِ ۝۳۳﴾ ''لوطؑ کی قوم نے بھی خبردار کرنے والوں کو جھٹلایا۔''

آیت ۳۴ ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ۝۳۴﴾ ''ہم نے اُن پر بھیج دی ایک ایسی تیز آندھی جس میں پتھر تھے، سوائے لوط کے گھر والوں کے۔ اُن کو ہم نے نجات دے دی صبح کے وقت۔''

آیت ۳۵ ﴿نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ۝۳۵﴾ ''وہ نعمت تھی ہمارے پاس سے۔ اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں اُس کو جو شکر کرتا ہے۔''

آیت ۳۶ ﴿وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ۝۳۶﴾ ''اور لوطؑ نے اُن کو خبردار کر دیا تھا ہماری پکڑ سے' لیکن انہوں نے شک کیا ان چیزوں پر جن کے بارے میں انہیں خبردار کیا گیا تھا۔''

وہ ہماری تنبیہات کو مشکوک سمجھ کر باتوں میں اڑاتے رہے۔

آیت ۳۷ ﴿وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ﴾ ''اور انہوں نے اُس سے اُس کے مہمانوں کو لے جانا چاہا تو ہم نے ان کی آنکھوں کو مٹا دیا''

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے بدکردار لوگ ان خوبصورت مہمان لڑکوں کو حاصل کرنا چاہتے تھے جو اصل میں فرشتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان سب کو اندھا کر دیا۔ بائبل میں اس کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے کہ ان میں سے ایک فرشتے نے ان لوگوں کی طرف اپنا ہاتھ پھیلایا تو وہ سب کے سب اندھے ہو گئے۔

﴿فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝۳۷﴾ ''تو مزا چکھو اب میرے عذاب کا اور میرے خبردار کرنے کا۔''

آیت ۳۸ ﴿وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ۝۳۸﴾ ''اور اُن پر صبح ہی صبح آدھمکا ایک عذاب جو کہ ٹھہر چکا تھا۔''

آیت ۳۹ ﴿فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝۳۹﴾ ''تو چکھو مزا اب میرے عذاب کا اور میرے خبردار کرنے کا۔''

آیت ۴۰ ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝۴۰﴾ ''اور ہم نے آسان کر دیا ہے قرآن سمجھنے کو' تو ہے کوئی سوچنے سمجھنے والا؟''

یہ آیت یہاں چوتھی اور آخری مرتبہ آئی ہے۔

آیت ۴۱ ﴿وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ۝۴۱﴾ ''اسی طرح قومِ فرعون کے پاس بھی آئے تھے خبردار کرنے والے۔''

آیت ۴۲ ﴿كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا﴾ ''انہوں نے ہماری تمام نشانیوں کو جھٹلا دیا''

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۰۱ میں ان نشانیوں کی تعداد نو (۹) بتائی گئی ہے: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ﴾ ''اور ہم نے موسیٰ کو نو کھلی نشانیاں دیں''۔ ان میں دو نشانیاں تو آپؑ کو ابتدا میں عطا ہوئی تھیں یعنی عصا کا اژدھا بن جانا اور ہاتھ کا چمکدار ہو جانا۔ جبکہ سات نشانیاں وہ تھیں جن کا ذکر سورۃ الاعراف کے سولہویں رکوع میں آیا ہے۔ یہ نشانیاں قومِ فرعون پر وقتاً فوقتاً عذاب کی صورت میں نازل ہوتی رہیں۔

﴿فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ۝۴۲﴾ ''پھر ہم نے انہیں پکڑا' ایک زبردست' صاحبِ قدرت کا پکڑنا۔''

یعنی یہ کوئی معمولی اور کمزور پکڑ نہیں تھی کہ اس سے کوئی نکل بھاگتا' بلکہ اُس اللہ کی پکڑ تھی جو زبردست طاقت کا مالک ہے اور کائنات کے ہر معاملے میں اُسے پوری قدرت حاصل ہے۔

ان پیغمبروں اور ان کی نافرمان قوموں کے انجام کا ذکر کرنے کے بعد اب روئے سخن حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور کفارِ مکہ کی طرف پھیرا جا رہا ہے۔

آیات ۴۳ تا ۵۵

اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴿۴۳﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ﴿۴۴﴾
سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴿۴۵﴾ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ ﴿۴۶﴾ اِنَّ
الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ﴿۴۷﴾ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ﴿۴۸﴾
اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ﴿۴۹﴾ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ﴿۵۰﴾ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ
اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۵۱﴾ وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ﴿۵۲﴾ وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ
مُّسْتَطَرٌ ﴿۵۳﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ﴿۵۴﴾ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۵۵﴾ ع

آیت ۴۳ ﴿اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ﴾ ''(تو اے قریش!) کیا تمہارے کفار اُن (کفار) سے کچھ بہتر ہیں؟''

زمانہ سابق میں جن قوموں نے کفر کی روش اختیار کی اُن کے انجام سے متعلق تمام تفصیلات تم لوگ جان چکے ہو۔ اب ذرا سوچو کہ تم میں سے جو لوگ ہمارے رسول ﷺ کا انکار کر کے کفر کے مرتکب ہو رہے ہیں' کیا وہ کسی خاص خوبی کے حامل ہیں کہ گزشتہ کافر اقوام کی طرح ان پر عذاب نہیں آئے گا؟

﴿اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ﴾ ''یا تمہارے لیے سابقہ الہامی کُتب میں کوئی فارغ خطی آچکی ہے؟''

تم میں آخر کیا خوبی ہے کہ جس تکذیب اور ہٹ دھرمی کی روش پر پچھلی قوموں کو سزا دی گئی ہے وہی روش تم اختیار کرو تو تمہیں سزا نہ دی جائے؟ کیا تمہارے لیے آسمانی صحیفوں میں کوئی براءت نامہ لکھا ہوا ہے کہ تم پر عذاب نہیں آئے گا؟

آیت ۴۴ ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ﴾ ''یا یہ کہتے ہیں کہ ہم ایک طاقتور جمعیت ہیں اور بدلہ لینے پر قادر ہیں؟''

آیت ۴۵ ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ﴾ ''عنقریب ان کی جمعیت شکست کھا جائے گی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔''

یہ پیشین گوئی جو ہجرت سے پانچ سال پہلے کر دی گئی تھی' میدانِ بدر میں حرف بحرف پوری ہوئی۔ روایات میں آتا ہے کہ غزوۂ بدر سے پہلی رات میں حضور ﷺ نے سجدے کی حالت میں رو رو کر دعا کی۔ آپؐ کا یہ سجدہ بہت طویل تھا اور دعا بھی بہت طویل تھی۔ آپؐ کی اس دعا کا لُبِّ لُباب یہ تھا کہ اے اللہ! میں نے اپنی پندرہ سال کی کمائی لا کر اس میدان میں ڈال دی ہے۔ میں آخری رسول ہوں' میرے بعد کوئی نبی یا رسول نہیں آئے گا۔ اے اللہ! اس معرکے میں اگر یہ لوگ ہلاک ہو گئے تو پھر قیامت تک اس زمین پر تیری بندگی کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اس رات آپ ﷺ کے عریشے پر پہرے کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مامور تھے' وہ سجدے میں آپؐ کی کیفیت کا مشاہدہ کر رہے تھے اور دعا کے رِقّت آمیز الفاظ سن رہے تھے۔ اس دوران ایک موقع ایسا بھی آیا جب حضرت ابوبکرؓ سے رہا نہ گیا اور وہ پکار اُٹھے: حَسْبُكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ..... کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! اب بس کر دیجیے۔ پھر جب حضور ﷺ

نے سجدے سے سر مبارک اٹھایا تو آپؐ کی زبان مبارک پر یہی الفاظ تھے: ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴿۴۵﴾﴾ کہ یہ لوگ اپنی طرف سے بہت بڑا لشکر لے کر آئے ہیں۔ ان کا یہ لشکر یہاں شکست سے دوچار ہوگا اور یہ سب پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔[۲]

آیت ۴۶ ﴿بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ ﴿۴۶﴾﴾ ''بلکہ ان کے اصل وعدے کا وقت تو قیامت ہے اور قیامت بہت بڑی آفت ہے اور بہت زیادہ کڑوی ہے۔''

عربی میں کڑوی چیز کو مُرٌّ کہتے ہیں اور اَمَرُّ کے معنی ہیں بہت ہی زیادہ کڑوی۔ سیاقِ مضمون میں اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ حق و باطل کی اس کشمکش میں پے در پے شکست مشرکینِ عرب کا مقدر ہے۔ عنقریب (۹ ہجری میں) ان پر ایک ایسا وقت بھی آنے والا ہے جب جزیرہ نمائے عرب کی سرزمین ان پر تنگ ہو جائے گی۔ اس وقت ان کے پاس اسلام قبول کرنے یا حدودِ عرب سے باہر چلے جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ ایک مضبوط جمعیت اور اعلیٰ پائے کی جنگی صلاحیت کے باوجود ان کی یہ ہزیمتیں' نقصانِ مال و جان اور ذلت و رسوائی اللہ کے عذاب ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ لیکن یہ تو چھوٹے چھوٹے عذاب ہیں اور دنیا کی زندگی کی حد تک عارضی نوعیت کی تکالیف ہیں۔ جبکہ انہیں بہت بڑے اور دائمی عذاب کا سامنا تو آخرت میں کرنا پڑے گا۔

آیت ۴۷ ﴿اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ﴿۴۷﴾﴾ ''یقیناً یہ مجرمین گمراہی میں ہیں اور یہ آگ (کے مختلف طبقات) میں ہوں گے۔''

آیت ۴۸ ﴿يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ۭ﴾ ''جس دن یہ گھسیٹے جائیں گے آگ میں اپنے چہروں کے بل۔''
﴿ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ﴿۴۸﴾﴾ ''(ان سے کہا جائے گا:) اب چکھو آگ کی لپٹ کا مزا!''

آیت ۴۹ ﴿اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ﴿۴۹﴾﴾ ''یقیناً ہم نے ہر چیز ایک اندازے کے مطابق پیدا کی ہے۔''

آیت ۵۰ ﴿وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۢ بِالْبَصَرِ ﴿۵۰﴾﴾ ''اور ہمارا امر تو یکبارگی ہوتا ہے' جیسے نگاہ کا لپک جانا۔''

یعنی اللہ تعالیٰ کا امر بیک دفعہ پلک جھپکنے کی طرح پورا ہوتا ہے۔ اللہ کے امر کی یہ وہی شان ہے جو قرآن حکیم میں جگہ جگہ ''کُن فیکون'' کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ یعنی وہ جب کسی چیز کو حکم دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ اس کی مشیت کے مطابق اُسی وقت ہو جاتی ہے۔

آیت ۵۱ ﴿وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۵۱﴾﴾ ''تو (اے قریشِ مکہ) ہم نے تم جیسے بہت سے لوگوں کو ہلاک کیا ہے' تو کوئی ہے اس سے سبق حاصل کرنے والا؟''

تمہاری تذکیر اور یاد دہانی کے لیے قرآن حکیم میں سابقہ اقوام کے انجام کی عبرت انگیز تفاصیل بار بار بیان کی گئی ہیں۔ تاریخی حوالوں سے بھی ان اقوام کے حالات سے تم لوگ اچھی طرح واقف ہو۔ اب تم لوگ چاہو تو ان کے انجام سے سبق حاصل کر سکتے ہو۔ اس کے علاوہ بے شمار آیاتِ آفاقی و انفسی بھی تمہارے سامنے ہیں۔ اگر تم لوگ کبھی ان آیات کا مشاہدہ دل کی آنکھ سے کرو تو وہ بھی تمہاری ہدایت کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔

۲۔ صحیح البخاری' کتاب تفسیر القرآن' باب قوله ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴿۴۵﴾﴾' ومتعدد مقامات' ح: ۳۹۵۳' ۴۸۷۷' ۲۹۱۵۔

آیت ۵۲ ﴿وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ۝۵۲﴾ ''اور وہ تمام اعمال جوان لوگوں نے کیے ہیں وہ صحیفوں میں محفوظ ہیں۔''

آیت ۵۳ ﴿وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ۝۵۳﴾ ''اور ہر ایک چھوٹی اور بڑی چیز لکھی ہوئی ہے۔''

قیامت کے دن یہ لوگ اپنے اعمال ناموں میں اپنے ہر چھوٹے بڑے عمل کا اندراج دیکھ کر حیران وششدر رہ جائیں گے۔ سورۃ الکہف کی یہ آیت اس منظر کا نقشہ دکھاتی ہے جب سرِ محشر ان مجرمین کے سامنے ان کے اعمال نامے کھولے جائیں گے:

﴿وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۝۴۹﴾

''اور رکھ دیا جائے گا اعمال نامہ چنانچہ تم دیکھو گے مجرموں کو کہ ڈر رہے ہوں گے اس سے جو کچھ اس میں ہوگا اور کہیں گے: ہائے ہماری شامت! یہ کیسا اعمال نامہ ہے؟ اس نے تو نہ کسی چھوٹی چیز کو چھوڑا ہے اور نہ کسی بڑی کو، مگر اس کو محفوظ کر رکھا ہے۔ اور وہ اسے موجود پائیں گے جو عمل بھی انہوں نے کیا ہوگا۔ اور آپ کا رب ظلم نہیں کرے گا کسی پر بھی۔''

آیت ۵۴ ﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ۝۵۴﴾ ''یقیناً متقین باغات اور نہروں (کے ماحول) میں ہوں گے۔''

یہ مقام ان خوش نصیب لوگوں کو عطا ہوگا جو اپنی دنیا کی زندگی میں اللہ سے ڈرنے والے، آخرت کے خیال سے ہر وقت لرزاں و ترساں رہنے والے، اللہ کے احکام کی پابندی کرنے والے، اُس کی نافرمانی سے پرہیز کرنے والے اور اس حوالے سے پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے تھے۔

آیت ۵۵ ﴿فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝۵۵﴾ ''بہت اعلیٰ راستی کے مقام میں اُس بادشاہ کے پاس جو اقتدارِ مطلق کا مالک ہے۔''

ان خوش قسمت لوگوں کے مقام و مرتبہ کا ذکر ایسے ہی الفاظ کے ساتھ سورۂ یونس کی اس آیت میں بھی ہوا ہے: ﴿اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ﴾ (آیت ۲) ''اُن کے لیے اُن کے رب کے پاس بہت اونچا مرتبہ ہے''۔ یعنی ان لوگوں کو آخرت میں شہنشاہِ ارض وسما کا خصوصی قرب حاصل ہوگا۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! آمین یاربَّ العَالَمین!!

سُوْرَۃُ الرَّحْمٰنِ

تمہیدی کلمات

قبل ازیں سورۂ قٓ کے تمہیدی کلمات میں بھی ذکر ہو چکا ہے کہ زیر مطالعہ سات مکّی سورتوں میں سے سورۂ قٓ منفرد ہے جبکہ باقی چھ سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ پہلا جوڑا سورۃ الذّاریات اور سورۃ الطور کا ہے' دوسرا سورۃ النجم اور سورۃ القمر کا اور تیسرا سورۃ الرحمٰن اور سورۃ الواقعہ کا۔ چنانچہ اب ہم ان میں سے تیسرے جوڑے کا مطالعہ کرنے جا رہے ہیں۔ یہ دونوں سورتیں (سورۃ الرحمٰن اور سورۃ الواقعہ) اس لحاظ سے پورے قرآن میں منفرد ہیں کہ ان میں نبوت' رسالت اور وحی کا سرے سے ذکر ہی نہیں۔ پھر سورۃ الرحمٰن پورے قرآن میں واحد ایسی سورت ہے جس میں جنّوں اور انسانوں سے مسلسل اور متوازی خطاب ہو رہا ہے۔

اس حوالے سے ضمنی طور پر یہاں ایک نکتہ یہ بھی سمجھ لیں کہ جنّوں کے ہاں نبوت اور وحی کا کوئی تصوّر نہیں ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ''عالَمِ خلق'' (دنیا) میں وحی الٰہی کے نزول کی متحمل صرف ''روح'' ہو سکتی ہے اور روح اللہ تعالیٰ نے صرف انسانوں کو عطا کی ہے۔ جنّوں میں روح نہیں ہوتی۔ اس لیے جنّات ان ہی انبیاء و رسل علیہم السلام کے پیروکار رہے ہیں جو انسانوں کی طرف مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ اس لحاظ سے ان میں اہلِ ایمان اور کافر جن بھی ہیں اور نیک و بد بھی۔ سورۃ الاحقاف میں ہم جنّات کی ایک جماعت کا ذکر پڑھ آئے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تورات کے ماننے والے تھے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سن کر ایمان لائے اور پھر انہوں نے ایمان و قرآن کی دعوت اپنی قوم تک بھی پہنچائی۔ بہرحال سورۃ الرحمٰن اس حوالے سے پورے قرآن میں منفرد سورت ہے کہ اس میں جنّوں اور انسانوں سے خطاب کے لیے بار بار تثنیہ کا صیغہ آیا ہے' بلکہ خصوصی طور پر یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ کے الفاظ میں بھی خطاب ہوا ہے۔ اس طرح اس سورت میں تخصیص کے ساتھ واضح کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے مخاطب ان دونوں نسلوں کے افراد ہیں۔ لہٰذا قرآن مجید میں جہاں کہیں یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ کے الفاظ میں خطاب کیا گیا ہے اس سے مراد اگرچہ نوعِ انسانی ہے لیکن اس صیغہ تخاطب میں جنّوں کو انسانوں کے تابع سمجھا جائے گا' چنانچہ ایسے ہر خطاب میں انسانوں کے ساتھ جن بھی مخاطب ہیں۔

سورۃ الرحمٰن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں دو دو جنتوں کا دو مرتبہ تذکرہ ہے اور سورۃ الواقعہ میں بھی ایسا ہی ہے۔ ان دونوں سورتوں کے مضامین کی ترتیب میں ایک انوکھی اور عجیب مناسبت پائی جاتی ہے۔ اس ترتیب کو معکوس ترتیب یا mirror image کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یعنی ایک سورۃ کے مضامین جس ترتیب سے آئے ہیں دوسری سورت میں وہی مضامین اس کے برعکس ترتیب میں ہیں۔ آج کل بعض لوگ جڑواں گھر اس طرح بناتے ہیں کہ دونوں کا نقشہ ایک جیسا ہوتا ہے لیکن ایک گھر میں کمروں وغیرہ کی location کی ترتیب دوسرے کی ترتیب کے برعکس ہوتی ہے۔ اس طرح ایک گھر دوسرے گھر کا mirror image محسوس ہوتا ہے۔ دونوں سورتوں کے مضامین اور ان مضامین کی ترتیب میں گہری مناسبت پائی جاتی ہے۔

سورۃ الرحمٰن کی ترجیعی آیت ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾ ہے جو اس سورت میں ۳۱ مرتبہ آئی ہے' جبکہ اس سورت کی کُل آیات ۷۸ ہیں۔ آیات کی ترجیع کا اسلوب اگرچہ قبل ازیں ہم سورۃ الشعراء اور سورۃ القمر میں بھی دیکھ چکے ہیں۔ سورۃ الشعراء میں یہ دو آیات آٹھ بار دہرائی گئی ہیں: ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ﴾ جبکہ سورۃ القمر میں ان دو آیات کی تکرار چار مرتبہ آئی ہے: ﴿فَکَیْفَ کَانَ عَذَابِیْ وَنُذُرِ وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ﴾۔ بہرحال یہ خاص اسلوب سورۃ الرحمٰن میں بہت زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

آیات ۱ تا ۲۵

سُوْرَۃُ الرَّحْمٰنِ مَدَنِیَّۃٌ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اٰیَاتُھَا: ۷۸ رُکُوْعَاتُھَا: ۳

اَلرَّحْمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ﴿۲﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ﴿۳﴾ عَلَّمَہُ الْبَیَانَ ﴿۴﴾ اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۬ۙ﴿۵﴾ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدٰنِ ﴿۶﴾ وَالسَّمَآءَ رَفَعَھَا وَوَضَعَ الْمِیْزَانَ ۙ﴿۷﴾ اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ ﴿۸﴾ وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ ﴿۹﴾ وَالْاَرْضَ وَضَعَھَا لِلْاَنَامِ ۙ﴿۱۰﴾ فِیْھَا فَاکِھَۃٌ ۙ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَکْمَامِ ﴿۱۱﴾ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَ الرَّیْحَانُ ۚ﴿۱۲﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۱۳﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ کَالْفَخَّارِ ۙ﴿۱۴﴾ وَ خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ۚ﴿۱۵﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۱۶﴾ رَبُّ الْمَشْرِقَیْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَیْنِ ۚ﴿۱۷﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۱۸﴾ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ ۙ﴿۱۹﴾ بَیْنَھُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ ۚ﴿۲۰﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۲۱﴾ یَخْرُجُ مِنْھُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ۚ﴿۲۲﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۲۳﴾ وَ لَہُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِی الْبَحْرِ کَالْاَعْلَامِ ۚ﴿۲۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۲۵﴾ ع ۱۱

آیت ۱ ﴿اَلرَّحْمٰنُ ۙ﴿۱﴾﴾ ''رحمٰن نے''

آیت ۲ ﴿عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ﴿۲﴾﴾ ''قرآن سکھایا۔''

رحمٰن' اللہ تعالیٰ کا خاص نام ہے۔ اس کا مادہ ''رحم'' ہے اور یہ فَعلان کے وزن پر ہے۔ اس وزن پر جو الفاظ آتے ہیں ان کے مفہوم میں بہت زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔ جیسے قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے دو مرتبہ (الاعراف: ۱۵۰ اور طٰہٰ:۸۶) غَضْبان کا لفظ آیا ہے' یعنی غصے سے بہت زیادہ بھرا ہوا۔ اسی طرح اَنَا عَطْشَان کا مطلب ہے کہ میں پیاس سے مرا جا رہا ہوں اور اَنَا جَوْعَان: بھوک سے میری جان نکلی جا رہی ہے۔ چنانچہ لغوی اعتبار سے رحمٰن کے مفہوم میں ایک طوفانی شان پائی جاتی ہے (لفظ ''طوفان'' بھی اسی وزن پر ہے' اس لیے اس لفظ کے مفہوم میں بھی مبالغہ پایا جاتا ہے)۔ اس مفہوم کو ہم اپنی زبان میں اس طرح ادا کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں کہ رحمٰن وہ ذات ہے جس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح ہے۔ اس کی رحمت تمام مخلوقات کو ڈھانپے ہوئے ہے۔ کسی مخلوق کا کوئی فرد بھی اس کی رحمت سے مستغنی نہیں۔ خاص طور پر بنی نوعِ انسانی تو دنیا میں بھی اُس کی رحمت کی

محتاج ہے اور آخرت میں بھی۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بارے میں ایک موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ کوئی شخص صرف اپنے اعمال کی بنیاد پر جنّت میں نہیں جا سکے گا جب تک کہ رحمت خداوندی اُس کی دستگیری نہ کرے۔ اس پر صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! کیا آپؐ بھی نہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ((وَلَا اَنَا' اِلَّا اَنْ یَتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِمَغْفِرَۃٍ وَرَحْمَۃٍ))[1] ''ہاں میں بھی نہیں' اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی مغفرت اور رحمت سے ڈھانپ لے''۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں رحمٰن چوٹی کا نام ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کے ناموں میں چوٹی کا نام رحمٰن ہے' اسی طرح اللہ نے انسان کو جو علم سکھایا ہے اس میں چوٹی کا علم قرآن ہے۔ اکتسابی علم (acquired knowledge) میں تو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق انسان رفتہ رفتہ ترقی کی منازل طے کر رہا ہے' لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو جو الہامی علم (revealed knowledge) عطا ہوا ہے اس میں چوٹی کا علم قرآن ہے' جو ہر قسم کے تمام علوم کا نقطۂ عروج ہے۔

آیت ۳ ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝۳﴾ ''اُسی نے انسان کو بنایا''

اس سلسلے کا تیسرا اہم نکتہ یہ نوٹ کر لیں کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی معراج (climax) انسان ہے۔ انسان کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ نے عالَمِ امر اور عالَمِ خلق (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سورۃ النحل' آیت ۴۰ کی تشریح) دونوں کو جمع فرما دیا ہے۔ اسی لیے انسان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا: ﴿خَلَقْتُ بِیَدَیَّ﴾ (ص:۷۵) کہ میں نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے۔

آیت ۴ ﴿عَلَّمَہُ الْبَیَانَ ۝۴﴾ ''اس کو بیان سکھایا''

یعنی اسے بولنا سکھایا' اسے گویائی کی صلاحیت بخشی۔ آیات زیر مطالعہ کے حوالے سے یہاں چوتھا اہم نکتہ یہ ہے کہ انسان کی صلاحیتوں میں سے جو چوٹی کی صلاحیت ہے وہ قوتِ بیان (گویائی) ہے۔ آج میڈیکل سائنس کی تحقیق سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ انسان کی قوتِ گویائی کا تعلق اس کے دماغ کی خصوصی بناوٹ سے ہے۔ سائنس کی زبان میں تو انسان بھی حیوان ہی ہے' لیکن اس کے بولنے کی صلاحیت کی وجہ سے اسے حیوانِ ناطق (بولنے والا حیوان) کہا گیا ہے۔ دماغ تو ظاہر ہے انسان سمیت تمام جانوروں میں موجود ہے' لیکن ہر جانور کے دماغ کی بناوٹ اور صلاحیت مختلف ہے۔ اس لحاظ سے انسان کا دماغ تمام حیوانات کے دماغوں میں سب سے اعلیٰ ہے اور اس میں ایسی صلاحیتیں بھی پائی جاتی ہیں جو کسی اور جانور کے دماغ میں نہیں ہیں۔ بہرحال استعداد کے حوالے سے حیوانی دماغ کی بناوٹ نچلی سطح سے ترقی کر کے گوریلوں اور چمپنزیز (champenzies) کے دماغ کی سطح تک پہنچتی ہے' اور پھر اس ترقی کی معراج انسان کا دماغ ہے۔ انسانی دماغ کے مختلف حصے ہیں' مثلاً سماعت سے متعلقہ حصہ' بصارت سے متعلقہ حصہ وغیرہ۔ حواس (آنکھ' کان وغیرہ) سے حاصل ہونے والی معلومات پہلے دماغ کے متعلقہ حصے میں جاتی ہیں اور پھر وہاں سے gray matter کے پچھلے حصے میں پہنچتی ہیں۔ لیکن انسانی دماغ کا سب سے اہم اور بڑا حصہ speech centre ہے' اور پھر اس میں بھی کلام کے فہم اور ابلاغ سے متعلق دو الگ الگ حصے ہیں' یعنی ایک حصے میں دوسروں کی بات سمجھنے کی صلاحیت ہے جبکہ دوسرا حصہ دوسروں تک بات پہنچانے سے متعلق ہے۔

۱۔ صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب القصد والمداومة علی العمل' ح:۶۴۶۷۔ وصحیح مسلم' کتاب صفة القیامة والجنة والنار' باب لن یدخل احد الجنة بعمله بل برحمة الله تعالیٰ' ح:۲۸۱۶۔

ویسے تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے' لیکن قوتِ گویائی کے علاوہ انسان کی باقی تقریباً تمام صلاحیتیں کسی نہ کسی سطح پر کسی نہ کسی درجے میں دوسرے حیوانات کو بھی ملی ہیں' بلکہ بعض حیوانات کی بعض صلاحیتیں تو انسان کے مقابلے میں کہیں بہتر ہیں۔ بعض جانوروں کی بصارت ہمارے مقابلے میں بہت زیادہ تیز ہے' کئی جانور اندھیرے میں بھی دیکھ سکتے ہیں جبکہ ہم دیکھنے کے لیے روشنی کے محتاج ہیں۔ گھوڑے کی قوتِ سماعت انسان کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے۔ چنانچہ ذرا سی آہٹ پر گھوڑے کے کان (antenna کی طرح) کھڑے ہو جاتے ہیں' جبکہ گھڑسوار نے ابھی کچھ دیکھا ہوتا ہے نہ سنا ہوتا ہے۔ اسی طرح کُتوں کے دماغ میں سونگھنے کا حصہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے سونگھنے کی حس انسان کے مقابلے میں سو گنا سے بھی زیادہ تیز ہے۔ بہرحال باقی صلاحیتیں تو دوسرے جانوروں میں بھی پائی جاتی ہیں' لیکن بیان اور گویائی کی صلاحیت صرف اور صرف انسان کا طُرّۂ امتیاز ہے۔

اس تمہید کے بعد اب ان آیات کو دوبارہ پڑھئے۔ ان چار آیات سے تین جملے بنتے ہیں۔ پہلی آیت ﴿اَلرَّحْمٰنُ ۝۱﴾ جملہ نہیں ہے' یہ مبتدأ ہے اور ﴿عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝۲﴾ اس کی خبر ہے۔ چنانچہ پہلی اور دوسری آیت کے ملنے سے مکمل جملہ بنتا ہے یعنی ''رحمٰن نے قرآن سکھایا''۔ اس کے بعد آیت ۳ ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝۳﴾ ''اُس نے انسان کو پیدا کیا'' بھی مکمل جملہ ہے اور آیت ۴ ﴿عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝۴﴾ ''اسے بیان کی صلاحیت عطا کی'' بھی مکمل جملہ ہے ـــــ اب ان آیات پر اس پہلو سے غور کیجیے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے سب سے اعلیٰ نام کے حوالے سے سب سے اعلیٰ علم (قرآن) کا ذکر کیا۔ پھر اپنی چوٹی کی مخلوق اور اس مخلوق کی چوٹی کی صلاحیت (بیان) کا ذکر کیا۔ اس زاویے سے غور کیا جائے تو یہ تین جملے ریاضی کے کسی سوال کی طرح ''جواب'' کا تقاضا کرتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ جس طرح ریاضی کے ''نسبت وتناسب'' کے سوالات میں تین رقموں (values) کی مدد سے چوتھی رقم معلوم کی جاتی ہے' اسی طرح ان تین جملوں پر غور کرنے سے اس عبارت کے اصل مدعا تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ''رحمٰن نے قرآن سکھایا۔ اُس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بیان کی صلاحیت عطا فرمائی''۔ کس لیے؟ ـــــ جواب بالکل واضح ہے: ''قرآن کے بیان کے لیے!'' ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی اعلیٰ ترین مخلوق کو ''بیان'' کی انمول صلاحیت سے اس لیے تو نہیں نوازا کہ وہ اسے لہو ولعب میں ضائع کرتا پھرے' یا دلائل کے انبار لگانے والا وکیل یا شعلہ بیان مقرر بن کر اسے حصولِ دولت وشہرت کا ذریعہ بنا لے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ توپ اس لیے تو نہیں بنائی جاتی کہ اس سے مکھیاں ماری جائیں۔ چنانچہ انسان کی اس بہترین صلاحیت کا بہترین مصرف یہ ہوگا کہ وہ اسے بہترین علم کے سیکھنے سکھانے کا ذریعہ بنائے۔ یعنی اپنی قوتِ بیان کو قرآن کی تعلیم اور نشر واشاعت کے لیے وقف کر دے۔ ان آیات کے اس مفہوم کو حضور ﷺ کے اس فرمان کی روشنی میں بہتر انداز میں سمجھا جا سکتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ))[۲] یہاں خَيْرُكُمْ کا صیغہ تفضیل کُل (superlative degree) کے مفہوم میں آیا ہے کہ تم سب میں بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔ اس حدیث کے حوالے سے ضمنی طور پر یہاں یہ نکتہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ اس کے راوی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے نام اور حدیث کے لفظ ''قرآن'' کے قافیے بھی زیر مطالعہ آیات کے قافیوں کے ساتھ مل رہے ہیں۔ یعنی ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے اس حدیث کی ان آیات کے ساتھ خصوصی نسبت ہے۔ سورۃ الرحمٰن کی ان ابتدائی آیات کا مطالعہ کرتے ہوئے اگر سورۃ القمر کی ترجیعی آیت ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ ...﴾ کے مفہوم اور اس کے پُرشکوہ اسلوب کو بھی مدِنظر رکھا جائے اور ان آیات کی

۲۔ صحیح البخاری' کتاب فضائل القرآن' باب خیرکم من تعلم القرآن وعلمه۔

ترتیب پر بھی غور کیا جائے کہ سورۃ القمر کی مذکورہ آیت کو بار بار دہرانے کے فوراً بعد سورۃ الرحمٰن کی یہ آیات آئی ہیں تو ان آیات کا مذکورہ مفہوم واضح تر ہو جاتا ہے۔ بہرحال ان آیات کے بین السطور یہ پیغام بھی مضمر ہے کہ انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کا حق ادا کرنا لازم ہے۔

آیت ۵ ﴿اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝۵﴾ ''سورج اور چاند ایک حساب کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔''

سورج اور چاند کی گردش ایک قطعی اور مربوط نظام کا حصّہ ہے۔ ان کی گردش سے ہی دن رات بنتے ہیں اور دنوں' مہینوں اور سالوں کا حساب ممکن ہوتا ہے۔

آیت ۶ ﴿وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۝۶﴾ ''اور ستارے اور درخت (اللہ کو) سجدہ کرتے ہیں۔''

نَجْم کے معروف معنی ستارے کے ہیں' لیکن عربی میں یہ لفظ ایسے پودوں اور بیل بوٹوں کے لیے بھی بولا جاتا ہے جن کا تنا نہیں ہوتا۔ مثلاً جھاڑیاں اور خربوزے اور تربوز کی بیلیں وغیرہ۔ جس طرح لاتعداد ستارے آسمان پر بکھرے نظر آتے ہیں بالکل اسی طرح بے شمار جھاڑیاں اور بیل بوٹے زمین پر پھیلے دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ پچھلی آیت میں سورج اور چاند کے ذکر کی نسبت سے دیکھا جائے تو یہاں النَّجْم سے ستارے مراد ہوں گے' لیکن اگلے لفظ الشَّجَر کے حوالے سے جھاڑیاں یا بیلیں کا ترجمہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔

آیت ۷ ﴿وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝۷﴾ ''اور آسمان کو اُس نے بلند کیا اور میزان قائم کی۔''

یہاں میزان سے مراد کائناتی نظام کے اندر پایا جانے والا مربوط اور خوبصورت توازن (cosmic balance) ہے جس کی وجہ سے یہ کائنات قائم ہے۔ یہ توازن تمام اجرامِ سماویہ کے اندر موجود کششِ ثقل (gravitational force) کی وجہ سے قائم ہے۔ تمام اجرامِ فلکی اس کشش کی وجہ سے آپس میں بندھے ہوئے ہیں۔ قدرت کی طرف سے ہر کُرّے کا دوسرے کُرّے سے فاصلہ' اس کی کشش کی طاقت کی نسبت سے رکھا گیا ہے۔ اگر کہیں یہ فاصلہ ایک طرف سے معمولی سا کم ہو جائے اور دوسری طرف سے معمولی سا بڑھ جائے تو یہ سارا نظام تلپٹ ہو جائے اور تمام کُرّے آپس میں ٹکرا جائیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی تمام چیزوں میں ایک توازن قائم کر رکھا ہے۔ ☆

آیت ۸ ﴿اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ۝۸﴾ ''تاکہ تم میزان میں زیادتی مت کرو۔''

اس کائناتی توازن کا تقاضا یہ ہے کہ اس کائنات میں رہتے ہوئے تم بھی عدل و انصاف پر قائم رہو۔

آیت ۹ ﴿وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۝۹﴾ ''اور قائم رکھو وزن کو انصاف کے ساتھ اور میزان میں کوئی کمی نہ کرو۔''

کسی بھی نظام میں توازن برقرار رکھنے کے لیے اس نظام کے اندر عدل قائم رکھنا یعنی اس کی ہر چیز کو اس کی اصل جگہ پر رکھنا ضروری ہے' کیونکہ کسی بھی قسم کی کمی بیشی نظام میں خرابی اور عدمِ توازن کا باعث بنتی ہے۔ اسی لیے زیادتی سے بھی منع کر دیا گیا

☆ علامہ اقبال نے ''بانگِ درا'' کی نظم ''بزمِ انجم'' کے اس شعر میں اسی کائناتی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں! (مرتّب)

(لَا تَطْغَوْا) اور کمی کرنے سے بھی روک دیا گیا (لَا تُخْسِرُوا)۔ خالقِ کائنات نے اس کائنات کا پورا نظام توازن اور عدل وقسط پر قائم کیا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ انسان بھی اپنے دائرۂ اختیار میں اسی طرح توازن اور عدل وقسط کو ملحوظ رکھے۔ اس میزان میں کوئی خرابی نہ پیدا کرے' ورنہ سارے نظامِ معاش ومعیشت میں فساد پھیل جائے گا۔ یہاں کوئی بڑا ظلم تو درکنار' ترازو میں ڈنڈی مار کر اگر کوئی شخص خریدار کے حصے کی تھوڑی سی چیز بھی مار لیتا ہے تو میزانِ عالم میں خلل برپا کر دیتا ہے۔

آیت ۱۰ ﴿وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۝۱۰﴾ ''اور زمین کو اُس نے بچھا دیا مخلوق کے لیے۔''

ظاہر ہے مخلوق میں انسان بھی شامل ہیں اور جنّات بھی۔ نوٹ کیجیے کہ پہلے آسمان' سورج اور چاند کا ذکر ہوا ہے اور اب زمین کا۔ گویا ترتیب تدریجاً اوپر سے نیچے کی طرف آ رہی ہے۔

آیت ۱۱ ﴿فِيْهَا فَاكِهَةٌ ۙ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ۝۱۱﴾ ''اس میں میوے ہیں اور کھجوریں ہیں' جن پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔''

آیت ۱۲ ﴿وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ۝۱۲﴾ ''اور بُھس والا اناج بھی ہے اور خوشبودار پھول بھی۔''

بعض مترجمین ''الرَّیْحَان'' سے مختلف النوع غذائیں بھی مراد لیتے ہیں۔

آیت ۱۳ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۱۳﴾ ''تو تم دونوں (گروہ) اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

عام طور پر اٰلَآء کا ترجمہ ''نعمتیں'' کیا جاتا ہے' لیکن اس لفظ میں نعمتوں کے ساتھ ساتھ قدرتوں کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سورت میں بھی اس لفظ سے کہیں اللہ کی نعمتیں مراد ہیں اور کہیں اُس کی قدرتیں۔ تُكَذِّبٰنِ تثنیہ کا صیغہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سورت میں جنّوں اور انسانوں سے مسلسل ایک ساتھ خطاب ہو رہا ہے۔ آگے چل کر آیت ۳۳ میں يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ کے خطاب سے یہ بات مزید واضح ہو جائے گی۔[۳]

آیت ۱۴ ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ۝۱۴﴾ ''اُس نے پیدا کیا انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی ہوئی مٹی سے۔''

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے حوالے سے سورۃ الحجر کے تیسرے رکوع میں تین مرتبہ ﴿صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے مراد ایسا گارا ہے جس میں سڑاند پیدا ہو چکی ہو' یعنی سنا ہوا گارا۔ ایسا گارا خشک ہونے پر سخت ہو جاتا ہے اور ٹھوکر لگنے سے کھنکنے لگتا ہے۔ یہاں پر صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ سے ایسا ہی سوکھا ہوا گارا مراد ہے' یعنی ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتا ہوا گارا۔

۳۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کو سورۃ الرحمٰن شروع سے آخر تک سنائی تو وہ اسے سن کر خاموش رہے۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے لیلۃ الجن میں یہ سورت جنّوں کو سنائی تھی تو وہ تم سے بہتر جواب دینے والے تھے۔ میں جب بھی یہ آیت شریفہ پڑھتا: ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝﴾ تو وہ جواب میں کہتے: لَا بِشَيْءٍ مِنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ' فَلَكَ الْحَمْدُ (پروردگار! ہم تیری نعمتوں میں سے کسی ایک کا بھی انکار نہیں کرتے' پس شکر وتعریف تیرے ہی لیے ہے)''۔ سنن الترمذی' کتاب تفسیر القرآن' باب ومن سورۃ الرّحمٰن' ح:۳۲۹۱۔ (حاشیہ از مرتب)

آیت ۱۵ ﴿وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴿۱۵﴾﴾ ''اور جنات کو اُس نے پیدا کیا آگ کی لپٹ سے۔''

مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ سے آگ کی لو یا لپٹ مراد ہے۔ اس کا اطلاق آگ کے شعلے کے اس حصے پر ہوتا ہے جو نظر نہیں آتا لیکن انتہائی گرم ہوتا ہے۔ شعلے کے اندر سب سے زیادہ درجہ حرارت اسی نظر نہ آنے والے حصے میں ہوتا ہے۔ سورۃ الحجر کی آیت ۲۷ میں آگ کی اس لپٹ کو نَارِ السَّمُوْمِ کا نام دیا گیا ہے۔

آیت ۱۶ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۱۶﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۱۷ ﴿رَبُّ الْمَشْرِقَیْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَیْنِ ﴿۱۷﴾﴾ ''وہ ربّ ہے دونوں مشرقوں کا اور دونوں مغربوں کا۔''

یہاں پر رَبُّ الْمَشْرِقَیْنِ اور رَبُّ الْمَغْرِبَیْنِ تثنیہ کے اس صیغہ کی مناسبت سے آیا ہے جو پوری سورت میں بار بار آ رہا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید میں ﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ (المزمل:۹) اور ﴿رَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ﴾ (المعارج:۴۰) کی تراکیب بھی آئی ہیں۔ بہرحال واحد' تثنیہ اور جمع کے یہ تینوں صیغے اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں۔ واحد کے صیغے میں مشرق اور مغرب تو معروفِ عام ہیں۔ دو مشرقوں اور دو مغربوں کے تصور کو یوں سمجھیں کہ ایک وقت میں سورج جہاں سے طلوع ہو رہا ہے گلوب کی دوسری طرف وہیں پر وہ غروب ہوتا بھی نظر آ رہا ہے۔ اسی طرح جس نقطے پر سورج غروب ہوتا نظر آتا ہے دوسری طرف اسی جگہ سے طلوع ہوتا بھی دکھائی دیتا ہے۔ گویا سورج طلوع ہونے کا ہر نقطہ مقامِ غروب بھی ہے اور اسی طرح ہر مقامِ غروب گویا مقامِ طلوع بھی ہے۔ اس لحاظ سے گویا مشرق بھی دو ہیں اور مغرب بھی دو۔ پھر کسی ایک مقام سے بظاہر نظر آنے والے مشرق و مغرب کے درمیان زمین پر ہر ہر نقطہ گلوب میں کسی کے لیے مقامِ طلوع ہے اور کسی کے لیے مقامِ غروب۔ اس طرح گویا بہت سے مشرق ہیں اور بہت سے مغرب۔

آیت ۱۸ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۱۸﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۱۹ ﴿مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ ﴿۱۹﴾﴾ ''اُس نے چلا دیے دو دریا جو آپس میں ملے ہوئے بھی ہیں۔''

آیت ۲۰ ﴿بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ ﴿۲۰﴾﴾ ''لیکن ان کے مابین ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔''

دونوں دریا باہم مل کر چلتے ہیں لیکن ایک دوسرے میں گھستے نہیں' اپنی اپنی حد میں رہتے ہیں۔ جیسے ٹھنڈے پانی کے سمندروں میں گرم پانی کی رو ئیں بہتی ہیں اور کھاری سمندروں میں میٹھے پانی کی رو ئیں بہتی ہیں۔ اسی طرح کئی دریا باہم ملتے ہیں لیکن دور تک الگ الگ نظر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں دریائے کابل کا پانی جب دریائے سندھ میں ملتا ہے تو بہت دور تک دونوں پانی اپنے رنگ کی وجہ سے الگ الگ نظر آتے ہیں۔ اٹک کے پُل پر کھڑے ہو کر دونوں پانیوں کا الگ الگ رہتے ہوئے ایک ساتھ چلنے کا یہ منظر دیکھا جا سکتا ہے۔ ایسا ہی منظر مظفر آباد کے قریب ''دومیل'' کے مقام پر نظر آتا ہے جہاں دریائے نیلم دریائے جہلم میں ملتا ہے۔

آیت ۲۱ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۲۱﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۲۲ ﴿یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۲۲﴾﴾ ''ان دونوں سے نکلتے ہیں موتی بھی اور مونگے بھی۔''

آیت ۲۳ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۲۳﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۲۴ ﴿وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِی الْبَحْرِ کَالْاَعْلَامِ ﴿۲۴﴾﴾ ''اور اُسی کے ہیں یہ جہاز جو سمندر میں پہاڑوں کی مانند اونچے اٹھے ہوئے ہیں۔''

یعنی اُسی کی قدرت کا نمونہ ہیں اور اُسی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ پچھلے زمانے کے جہاز اگرچہ دورِ جدید کے جہازوں کے مقابلے میں چھوٹے ہوتے تھے لیکن جب ان کے بادبان کھلتے تھے تو وہ بھی اونچائی میں پہاڑوں جیسے نظر آتے تھے۔ اور آج کل کے جہاز تو واقعتاً پہاڑوں سے مشابہ ہیں۔

آیت ۲۵ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۲۵﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کو جھٹلاؤ گے؟''

یہاں ایک دفعہ پھر نوٹ کرلیں کہ سورت کے آغاز سے لے کر اب تک جو آیات ہم نے پڑھی ہیں ان میں پہلے قرآن کی عظمت کا ذکر آیا ہے اور اس کے بعد اللہ کی صناعی اور اس کی قدرتوں کا بیان ہے۔ ابتدائی آیات میں انسان کی قوتِ بیان کے تذکرے کے ساتھ قرآن کی عظمت کا ذکر کر کے انسان کو یاد دلایا گیا ہے کہ اس کی اس صلاحیت کا بہترین مصرف یہی ہے کہ وہ قرآن سیکھے اور سکھائے۔ اس کی مزید وضاحت نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان میں ملتی ہے: ((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ)) کہ تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں۔ بہرحال انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں اور صلاحیتوں کو بہترین طور پر صَرف کرے۔ علامہ اقبال کے اس شعر میں اسی جذبے کو ترغیب وتحریک دی گئی ہے:

اگر یک قطرہ خوں داری' اگر مشتِ پرے داری بیا مَن با تو آموزم طریقِ شاہبازی را!

(کہ اے نغمی چڑیا! اگر تیرے پاس چند پَر ہیں اور ایک قطرۂ خون بھی ہے تو میرے پاس آ' میں تجھے شاہین کی سی اڑان کا طریقہ سکھا دوں!)

جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے' یہ موضوعات (قرآن کی عظمت اور اللہ کی صناعی کا بیان) ہم سورۃ الواقعہ میں بھی پڑھیں گے' لیکن وہاں ان کی ترتیب سورۃ الرحمٰن کے مضامین کی ترتیب کے بالعکس ہے۔ یعنی قرآن کی عظمت کا بیان جو سورۃ الرحمٰن کے آغاز میں ہے سورۃ الواقعہ میں بالکل آخر پر ہے۔ پھر سورۃ الرحمٰن میں اللہ تعالیٰ کی خلاقی وصناعی کا ذکر عظمتِ قرآن کے بعد ہے جبکہ سورۃ الواقعہ میں یہ موضوع عظمتِ قرآن کے ذکر سے پہلے بیان ہوا ہے۔ یعنی دونوں سورتوں میں ایک جیسے موضوعات بیان ہوئے ہیں لیکن معکوس ترتیب سے۔ اس ترتیب کو قبل ازیں mirror image کا نام دیا گیا ہے۔

آیات ۲۶ تا ۴۵

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿۲۶﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۲۷﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۸﴾ يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴿۲۹﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ
رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۰﴾ سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ﴿۳۱﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۲﴾ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ
وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا
تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿۳۳﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۴﴾ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّ
نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ﴿۳۵﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۶﴾ فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً
كَالدِّهَانِ ﴿۳۷﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۸﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ﴿۳۹﴾

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۳۰﴾ یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰهُمْ فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَ
الْاَقْدَامِ ﴿۳۱﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۳۲﴾ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ یُکَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۳۳﴾
یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا وَ بَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ ﴿۳۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۳۵﴾ ع

آیت ۲۶ ﴿کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ ﴿۲۶﴾﴾ ''جو کوئی بھی اس (زمین) پر ہے فنا ہونے والا ہے۔''

آیت ۲۷ ﴿وَّیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۲۷﴾﴾ ''اور باقی رہے گا صرف تیرے رب کا چہرہ جو بہت بزرگی اور بہت عظمت والا ہے۔''

اللہ کے چہرے کا تصور ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اس لحاظ سے اگرچہ یہ آیت آیاتِ متشابہات میں سے ہے لیکن اس کا عمومی مفہوم بالکل واضح ہے کہ باقی رہنے والی صرف ایک اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات ہے' جس کے علاوہ ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور ان میں کوئی ایک مخلوق بھی ایسی نہیں جو اپنے بل پر اپنا وجود قائم رکھے ہوئے ہو۔ ہر چیز اور ہر مخلوق کا وجود اللہ تعالیٰ کی منشاء و مرضی کا مرہونِ منت ہے۔ جب تک وہ چاہتا ہے کسی چیز کا وجود برقرار رہتا ہے اور جب وہ چاہتا ہے اسے فنا کر دیتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ القصص کی اس آیت میں فرمایا گیا ہے: ﴿کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۸﴾﴾ ''ہر چیز فنا ہونے والی ہے سوائے اُس کے چہرے کے۔ فرماں روائی اُسی کی ہے اور اُسی کی طرف تم سب لوٹا دیے جاؤ گے۔''

آیت ۲۸ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۲۸﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۲۹ ﴿یَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''اُسی سے مانگتا ہے جو کوئی بھی آسمانوں اور زمین میں ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کے لیے اللہ ہی کے در کی سوالی ہے۔ ہر کسی کو وجود بھی اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے۔ ہر زندہ وجود کی زندگی بھی اُسی کی دین ہے' کسی مخلوق میں اگر کوئی صلاحیت ہے تو وہ بھی اُسی کی بخشی ہوئی ہے اور تمام مخلوقات کے ایک ایک فرد کی ضرورتوں کا خبر گیر و نگہبان بھی وہی ہے۔ اس حوالے سے سورۂ محمد کی آیت ۳۸ کے یہ الفاظ بہت واضح ہیں: ﴿وَاللّٰهُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ﴾ کہ اللہ غنی اور بے نیاز ہے اور تم سب اُس کے محتاج ہو۔ یعنی تمہارا وجود' تمہاری زندگی' تمہاری صلاحیتیں' غرض تمہارا سب کچھ اُسی کا عطا کردہ ہے۔ تم اپنے تمام تر وسائل سے بس وہی کچھ کر سکتے ہو جس کی وہ اجازت دیتا ہے اور صرف اسی قدر جان سکتے ہو جس قدر وہ چاہتا ہے۔ اُس کی مخلوق کے تمام افراد پر یہ حقیقت واضح ہونی چاہیے: ﴿وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ﴾ (البقرۃ:۲۵۵) کہ وہ سب کے سب اُس کے احاطۂ علم میں مقید و محصور ہیں اور وہ اُس کی معلومات میں سے کسی چیز تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے' مگر اسی قدر جس قدر وہ چاہتا ہے۔

﴿کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ ﴿۲۹﴾﴾ ''ہر دن وہ ایک نئی شان میں ہے۔''

ہر دن اُس کی ایک نئی شان کا ظہور ہوتا ہے۔ میرے نزدیک اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی تدبیرِ امر کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر سورۃ السجدۃ میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۵﴾﴾ ''وہ تدبیر کرتا ہے اپنے امر کی آسمان سے زمین کی طرف' پھر وہ (امر) چڑھتا ہے اُس کی طرف' (یہ سارا معاملہ طے پاتا ہے) ایک دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار کے مطابق ایک ہزار برس ہے''۔ یعنی کائنات اور مخلوق کو پیدا کرنے کے بعد اللہ

تعالیٰ فارغ ہو کر نہیں بیٹھ گیا' بلکہ اس کائنات کے نظام اور ارض وسماء میں پھیلی ہوئی مخلوقات سے متعلق تمام امور کو وہ لمحہ بہ لمحہ اپنی تدبیر سے چلا رہا ہے۔ اس تدبیر کی منصوبہ بندی کے لیے اُس کا ایک دن ہمارے ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ چنانچہ اُس کے ہاں ایک ایک دن کی منصوبہ بندی ہوتی ہے' اہم فیصلے کیے جاتے ہیں' احکام جاری ہوتے ہیں' ان احکام کی تعمیل وتنفیذ عمل میں لائی جاتی ہے اور پھر جائزہ رپورٹیں اُسے پیش کی جاتی ہیں۔ اس طرح ہر دن کے لیے اُس کی نئی شان ہے اور نئی مصروفیات!

آیت ۳۰ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۳۰﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کو جھٹلاؤ گے؟''

آیت ۳۱ ﴿سَنَفْرُغُ لَکُمْ اَیُّهَ الثَّقَلٰنِ ۳۱﴾ ''ہم جلد ہی فارغ ہو جائیں گے تمہارے لیے' اے دو بھاری قافلو!''

اس آیت میں اشارۃً اور آگے آیت ۳۳ میں باقاعدہ نام لے کر تثنیہ (تُکَذِّبٰنِ) کے صیغے کی وضاحت کر دی گئی کہ اے جن وانس کے قافلوں کے افراد! ہم تم سے مخاطب ہیں۔ یاد رکھو! تم دونوں گروہ اپنے اعمال کے لیے ہمارے سامنے جواب دہ ہو۔ یاد رکھو! ہم اس کائنات کو ''مہلت'' کے اصول پر چلا رہے ہیں۔ اس کے لیے ہم نے کائنات کی ایک عمر ﴿اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی﴾ مقرر کر رکھی ہے' اسی اصول کے تحت ہر قوم کو بھی ہم ایک وقتِ معیّن تک مہلت دیتے ہیں: ﴿لِکُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ﴾ (الاعراف:۳۴) اور ہر فرد کو بھی۔ چنانچہ ہماری عطا کردہ مہلت سے تم یہ مت سمجھو کہ تمہارا احتساب نہیں ہوگا' بلکہ ہم عنقریب تم سب لوگوں کو اپنے حضور حاضر کرنے والے ہیں' جہاں تمہیں اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہوگا۔

آیت ۳۲ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۳۲﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۳۳ ﴿یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ﴾ ''اے گروہِ جن وانس! اگر تم طاقت رکھتے ہو کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل بھاگو تو نکل بھاگو۔''

﴿لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۳۳﴾ ''تم نکل نہیں سکو گے مگر (اللہ کی) سند کے ساتھ۔''

یہ آیت مشکلات القرآن میں سے ہے۔ جب تک کائنات (cosmos) کی وسعتوں کے بارے میں انسان کا علم مزید ترقی نہیں کر جاتا' اس آیت کا مفہوم شاید ہم پوری طرح سمجھ نہ پائیں۔ موجودہ صورتحال یہ ہے کہ اپنی تمام تر سائنسی ترقی کے باوجود ابھی تک انسان زمین کی ''حدود'' سے نکل کر نظامِ شمسی کے کسی ایک سیارے تک بھی رسائی حاصل نہیں کر سکا۔ اس کی اس رفتار سے تو یہی لگتا ہے کہ نظامِ شمسی کی وسعتوں تک بھی اس کی رسائی کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ جہاں تک اس معاملے میں جنوں کی ''استطاعت'' کا تعلق ہے اس کے بارے میں قبل ازیں سورۃ الحجر کی آیت ۱۷ کے ضمن میں وضاحت کی جا چکی ہے کہ وہ نظامِ شمسی کی حدود کے اندر آسانی سے گھوم پھر سکتے ہیں' لیکن نظامِ شمسی کی حدود کو پھلانگنے کی استطاعت وہ بھی نہیں رکھتے۔ دوسری طرف اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی وسعتوں کا عالم یہ ہے کہ ان وسعتوں کے اندر خود نظامِ شمسی کی حیثیت ایک نقطے کی سی ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں گروہِ جن وانس کی اس بے بسی اور بے بضاعتی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس کی طرف آیت زیر مطالعہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

قرآن حکیم میں جب آسمانوں اور زمین کا ذکر آتا ہے تو اس سے پوری کائنات مراد ہوتی ہے۔ میرا گمان یہ ہے کہ یہاں پوری کائنات کے کناروں سے نکل بھاگنے کے معنی معدوم ہونے کے ہیں۔ جیسا کہ قیامت کے دن عذاب کے مستحق لوگ خواہش کریں گے: ﴿یَوْمَئِذٍ یَّوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰی بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا یَکْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِیْثًا ۴۲﴾ (النساء)

''اُس دن تمنا کریں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا اور رسولؐ کی نافرمانی کی تھی کہ کاش ان کے سمیت زمین برابر کر دی جائے۔ اور وہ اللہ سے کوئی بات بھی چھپا نہیں سکیں گے''۔ لیکن ہمارا یہ وجود چونکہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر یہ معدوم بھی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس آیت کا مفہوم میرے خیال میں یہ ہے کہ تم لوگ اگر معدوم بھی ہونا چاہو تو اللہ کی مرضی اور اجازت کے بغیر (اِلَّا بِسُلْطٰنٍ) ایسا نہیں کر سکو گے۔ واللہ اعلم!

آیت ۳۴ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۳۴﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۳۵ ﴿یُرْسَلُ عَلَیْکُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ﴿۳۵﴾﴾ ''تم پر پھینکے جائیں گے بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے اور دھواں' تو تم لوگ بدلہ نہیں لے سکو گے۔''

آیت ۳۶ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۳۶﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۳۷ ﴿فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَکَانَتْ وَرْدَۃً کَالدِّهَانِ ﴿۳۷﴾﴾ ''پھر جب آسمان پھٹ جائے گا اور ہو جائے گا گلابی تیل کی تلچھٹ جیسا۔''

آیت ۳۸ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۳۸﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۳۹ ﴿فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ﴿۳۹﴾﴾ ''تو اُس روز پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی' نہ کسی جن سے اور نہ انسان سے اُس کے گناہوں کے بارے میں۔''

اگرچہ سوال و جواب بھی ہوں گے اور ایک ایک عمل کا حساب بھی ہوگا' لیکن چونکہ ہر انسان اپنے اندرونی احوال کو خوب سمجھتا ہے: ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَۃٌ ﴿۱۴﴾﴾ (القیامۃ) اس لیے میدانِ حشر میں ہر شخص کا چہرہ ہی گویا اُس کے انجام کی خبر دے رہا ہوگا۔ اس کیفیت کا نقشہ قرآن مجید میں جا بجا دکھایا گیا ہے' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اُس دن کئی چہرے تر و تازہ ہوں گے' جبکہ کچھ چہروں پر مردنی چھا رہی ہوگی۔ اس کیفیت کی عملی مثال ہمارے ہاں اسکولوں کے سالانہ نتائج کے اعلان کے موقع پر دیکھنے میں آتی ہے۔ چونکہ ہر طالب علم کو امتحان کے دوران اپنی کارکردگی کے بارے میں پہلے سے معلوم ہوتا ہے' اس لیے نتائج کے باقاعدہ اعلان سے پہلے ہی ہر ایک کا نتیجہ اس کے چہرے پر سے پڑھا جا سکتا ہے۔

آیت ۴۰ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۴۰﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۴۱ ﴿یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰهُمْ فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَالْاَقْدَامِ ﴿۴۱﴾﴾ ''پہچان لیے جائیں گے مجرم اپنے چہروں سے' پھر ان کو پکڑا جائے گا پیشانی (کے بالوں) سے اور پاؤں سے۔''

اُس دن مجرمین کے اترے ہوئے چہرے ہی ان کی پہچان ہوں گے۔ چنانچہ فرشتے انہیں ٹانگوں اور پیشانی کے بالوں سے پکڑ پکڑ کر جہنّم کی طرف اُچھالتے جائیں گے۔

آیت ۴۲ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۴۲﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۴۳ ﴿هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ یُکَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۴۳﴾﴾ ''(اُس وقت ان سے کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ جہنّم

جسے مجرمین جھٹلایا کرتے تھے۔''

آیت ۴۴ ﴿يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ۝۴۴﴾ ''اب وہ چکر لگاتے رہیں گے اس (آگ) کے اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان۔''

آگ کی تپش سے گھبرا کر پانی کی طرف لپکیں گے اور جب کھولتے ہوئے پانی کا مزہ چکھیں گے تو پھر واپس بھاگیں گے۔ اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْ ذٰلِکَ!

آیت ۴۵ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۴۵﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

یہ اہلِ جہنم کا تذکرہ تھا' اب اس کے بعد آئندہ آیات میں اہلِ جنت کا بیان ہوگا۔ البتہ سورۃ الواقعہ میں پہلے اہلِ جنت کا ذکر ہے اور اس کے بعد اہلِ جہنم کا۔ یعنی جیسا کہ قبل ازیں بھی وضاحت کی جا چکی ہے کہ ان دونوں سورتوں کے مضامین باہم عکسی ترتیب میں ہیں۔

آیات ۴۶ تا ۷۸

وَ لِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۚ۝۴۶ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۴۷ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ۚ۝۴۸ فَبِاَيِّ
اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۴۹ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ۚ۝۵۰ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۵۱ فِيْهِمَا مِنْ
كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ۚ۝۵۲ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۵۳ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَآئِنُهَا مِنْ
اِسْتَبْرَقٍ ؕ وَ جَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ ۚ۝۵۴ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۵۵ فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ۙ
لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ۚ۝۵۶ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۚ۝۵۷ كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَ
الْمَرْجَانُ ۚ۝۵۸ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۵۹ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۚ۝۶۰ فَبِاَيِّ
اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۶۱ وَ مِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ۚ۝۶۲ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۙ۝۶۳
مُدْهَآمَّتٰنِ ۚ۝۶۴ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۚ۝۶۵ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ۚ۝۶۶ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ۝۶۷ فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّ نَخْلٌ وَّ رُمَّانٌ ۚ۝۶۸ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۚ۝۶۹ فِيْهِنَّ
خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ۚ۝۷۰ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۚ۝۷۱ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ۚ۝۷۲ فَبِاَيِّ
اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۚ۝۷۳ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَ لَا جَآنٌّ ۚ۝۷۴ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ۚ۝۷۵ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّ عَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ۚ۝۷۶ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۷۷
تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝۷۸ ع ۲۳

آیت ۴۶ ﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۝۴۶﴾ ''اور جو کوئی اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا اُس کے لیے دو جنتیں ہیں۔''

اہلِ جنّت کی صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ دنیا میں اپنے رب کے حضور پیشی سے لرزاں و ترساں رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا جادۂ مستقیم پر قائم رکھنے والی واحد چیز یہی اللہ تعالیٰ کے حضور پیشی کا خوف ہے۔

دو جنّتوں کے بارے میں مفسرین نے مختلف آراء نقل کی ہیں' تاہم دو جنّتوں کی توجیہہ جو میری سمجھ میں آئی ہے اور مجھے اپنی اس رائے پر اطمینان اور انشراح ہے کہ یہ انسانوں اور جنّوں کے لیے الگ الگ جنّتوں کا بیان ہے۔ چونکہ اس سورت میں خطاب بھی مسلسل ان دونوں سے ہے اور جہنّم کی وعید بھی دونوں گروہوں کو دی گئی ہے' اس لیے جنّت کی نوید بھی دونوں کے لیے ہونی چاہیے تھی۔ اب چونکہ انسانوں اور جنّوں کا مادۂ تخلیق اور ان کی فطرتیں الگ الگ ہونے کی وجہ سے ان کی ضرورتیں' پسند و ناپسند' رنج و غم کے معیار' راحت و سکون کے پیمانے اور کیف و سرور کے انداز' سب کچھ ہی ایک دوسرے سے مختلف اور جُدا ہیں' اس لیے ظاہر ہے جنّت میں بھی ان کے لیے الگ الگ ماحول کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میرے خیال میں یہی وجہ ہے کہ یہاں ان دونوں گروہوں کے لیے الگ الگ جنّتوں کا ذکر ہوا ہے۔ اس حوالے سے یہ نکتہ بھی مدِّنظر رہے کہ آیت زیر مطالعہ میں جن دو جنّتوں کا ذکر ہوا ہے وہ نچلے درجے کی جنّتیں ہیں' جبکہ آگے چل کر آیت ۶۲ میں جن دو جنّتوں کا ذکر ہوا ہے وہ اونچے درجے کی جنّتیں ہیں۔ گویا اس سورت میں کل چار جنّتوں کا ذکر ہوا ہے۔ ہر گروہ کے لیے دو جنّتیں ہوں گی' ان میں سے ایک جنّت نچلے درجے میں ہوگی اور دوسری نسبتاً برتر درجے میں۔

آیت ۴۶ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۴۶﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۴۸ ﴿ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴿۴۸﴾﴾ ''دونوں بہت سی شاخوں والی ہوں گی۔''

آیت ۴۹ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۴۹﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۵۰ ﴿فِیْهِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ ﴿۵۰﴾﴾ ''ان دونوں میں دو چشمے بہہ رہے ہوں گے۔''

یعنی ہر جنّت میں ایک ایک چشمہ رواں ہوگا۔

آیت ۵۱ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۱﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۵۲ ﴿فِیْهِمَا مِنْ کُلِّ فَاکِهَةٍ زَوْجٰنِ ﴿۵۲﴾﴾ ''ان دونوں میں ہر قسم کے میوے ہوں گے جوڑوں کی شکل میں۔''

یعنی ہر پھل کی دو قسمیں ہوں گی۔

آیت ۵۳ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۳﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۵۴ ﴿مُتَّکِـِٕیْنَ عَلٰی فُرُشٍۭ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ؕ﴾ ''وہ وہاں تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے ایسے بچھونوں پر جن کے اُستر گاڑھے ریشم کے ہوں گے۔''

یہاں پر جنّت کے بچھونوں کے اندرونی کپڑے (اُستر) کا ذکر ہوا ہے کہ وہ گاڑھے یعنی موٹے ریشم کے بنے ہوں گے لیکن ان کے بیرونی غلافوں کا ذکر نہیں ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے بیرونی غلافوں کی کیفیت ہمارے احاطہ خیال میں آ ہی نہیں سکتی۔

﴿وَجَنَا الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ ﴿۵۴﴾﴾ ''اور دونوں جنّتوں کے پھل جھکے ہوئے ہوں گے۔''

یعنی وہ اہلِ جنّت میں سے ہر ایک کی پہنچ میں ہوں گے۔

آیت ۵۵ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۵۵﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۵۶ ﴿فِیْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ۙ﴾ ''ان میں ایسی عورتیں ہوں گی جن کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی۔''

عورت کی جھکی ہوئی نگاہیں شرم وحیا کی علامت ہیں اور شرم وحیا نسوانیت کا خاص زیور بھی ہے اور اس کے اخلاق کا سب سے بڑا محافظ بھی۔ جنتی عورتوں کی جھکی ہوئی نظروں کا ذکر گویا ان کے حسنِ ظاہری و باطنی کا بیان ہے۔

﴿لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ۵۶﴾ ''ان کو چھوا نہیں ہوگا ان سے پہلے نہ کسی انسان نے اور نہ کسی جن نے۔''

جنتی جنوں کی بیویاں ظاہر ہے انہی کی جنس سے ہوں گی جنہیں پہلے کسی جن نے نہیں چھوا ہوگا' جبکہ انسانوں کی بیویاں انسان ہوں گی اور انہیں بھی پہلے کسی انسان نے نہیں چھوا ہوگا۔

آیت ۵۷ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۵۷﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۵۸ ﴿کَاَنَّهُنَّ الْیَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ۵۸﴾ ''وہ ایسی ہوں گی گویا لعل اور مونگے ہوں۔''

آیت ۵۹ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۵۹﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۶۰ ﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۶۰﴾ ''کیا بھلائی کا بدلہ بھلائی کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے؟''

نیک لوگوں نے اللہ تعالیٰ اور اُس کے دین کے لیے جو قربانیاں دیں' اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرنے کے حوالے سے انہوں نے جو مشقتیں اٹھائیں' ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کا بدلہ تو دینا ہے۔ لہٰذا جنت کی مذکورہ نعمتوں کی صورت میں انہیں بدلہ دے کر اللہ تعالیٰ ان کی محنتوں اور کوششوں کی قدر افزائی فرمائے گا۔

آیت ۶۱ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۶۱﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۶۲ ﴿وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ۶۲﴾ ''اور ان سے پرے دو جنتیں اور بھی ہیں۔''

مفسرین نے ان دو جنتوں کی مختلف توجیہات کی ہیں' لیکن جیسا کہ قبل ازیں آیت ۴۶ کی تشریح میں ذکر ہو چکا ہے' میرے نزدیک ان میں سے دو جنتیں جنوں اور انسانوں کے لیے الگ الگ نچلے درجے میں ہیں اور دو جنتیں ان دونوں گروہوں کے لیے الگ الگ اونچے درجے میں ہیں۔ اہلِ جنت کے ان درجات کی وضاحت اگلی سورت یعنی سورۃ الواقعہ میں ملے گی (یاد رہے کہ سورۃ الرحمٰن اور سورۃ الواقعہ کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے)۔ سورۃ الواقعہ میں اہلِ جہنم (اَصْحٰبُ الشِّمَال) کے مقابلے میں اہلِ جنت کے دو گروہوں کا ذکر ہوا ہے۔ ان میں ایک گروہ تو اَصْحٰبُ الْیَمِیْن (دائیں جانب والوں) کا ہے۔ ان کے لیے الگ جنت کا ذکر ہے جو نسبتاً نچلے درجے کی جنت ہوگی۔ جبکہ دوسرا گروہ مقربینِ بارگاہ کا ہے: ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۱۰ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۱۱﴾ ''اور آگے نکل جانے والے تو ہیں ہی آگے نکل جانے والے۔ وہ تو بہت مقرب ہوں گے''۔ یہ وہی خوش نصیب لوگ ہیں جن کا ذکر سورۃ التوبہ میں بایں الفاظ آیا ہے:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا

عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۰۰﴾

''اور پہلے پہل سبقت کرنے والے مہاجرین اور انصار میں سے' اور وہ جنہوں نے اُن کی پیروی کی نیکوکاری کے ساتھ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے' اور اُس نے ان کے لیے وہ باغات تیار کیے ہیں جن کے نیچے ندیاں بہتی ہوں گی' ان میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ یہی ہے بہت بڑی کامیابی۔''

سورۃ الواقعہ میں ان مقربینِ بارگاہ کے لیے بہت خصوصی انداز میں جنّت کا ذکر ہوا ہے۔ ظاہر ہے ان لوگوں کے لیے بہت اونچے درجے کی جنّت ہو گی۔ چنانچہ میری رائے میں سورۃ الرحمٰن کی آیت ۴۶ میں جن دو جنّتوں (جنوں اور انسانوں کے لیے الگ الگ) کا ذکر ہوا ہے وہ اصحاب الیمین کے لیے ہیں' جبکہ زیر مطالعہ آیات میں جنوں اور انسانوں میں سے مقربینِ بارگاہ کی جنّتوں کا ذکر ہونے جا رہا ہے۔

آیت ۶۳ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۳﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۶۴ ﴿مُدْهَآمَّتٰنِ ﴿۶۴﴾﴾ ''دونوں گہرے سبز رنگ کی ہوں گی۔''

ان دونوں جنّتوں کا رنگ سیاہی مائل سبز ہو گا۔ یعنی بہت گھنی اور سرسبز و شاداب۔ اس رنگ کے ذکر کی توجیہہ آگے آیت ۶۸ کے ضمن میں بیان کی گئی ہے۔

آیت ۶۵ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۵﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۶۶ ﴿فِیْهِمَا عَیْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ﴿۶۶﴾﴾ ''ان میں دو چشمے ہوں گے اُبلتے ہوئے۔''

یعنی ہر جنّت میں ایک ایک ایسا چشمہ ہو گا۔

آیت ۶۷ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۷﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۶۸ ﴿فِیْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴿۶۸﴾﴾ ''ان دونوں میں میوے' کھجور اور انار ہوں گے۔''

ان جنّتوں کی کیفیت کے بیان میں ایک طرف گویا عجمی پسند کی جھلک نظر آتی ہے تو دوسری طرف عربی ذوق کی عکاسی۔ عجمی علاقوں کے درختوں اور باغات کے جوبن کا کمال یہ ہے کہ ان کے سبز پتّوں کا رنگ گہرا ہوتے ہوتے سیاہی مائل ہو جائے۔ ایسے درختوں اور پودوں کا سایہ بھی مثالی ہوتا ہے اور ان کے پھلوں کی پیداوار اور کوالٹی بھی بہترین ہوتی ہے۔ دوسری طرف سرزمینِ عرب خصوصاً نزولِ قرآن کے علاقے حجاز کے ذوق کے مطابق ایک مثالی باغ کا نقشہ بھی دکھایا گیا ہے۔ یعنی پہاڑی ڈھلوان سے ابلتا ہوا چشمہ' چشمے کے نشیب میں کھجور اور انار کے درختوں کا جھنڈ اور ان درختوں کے جھرمٹ میں انگور کی لہلہاتی بیلیں!

آیت ۶۹ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۹﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۷۰ ﴿فِیْهِنَّ خَیْرٰتٌ حِسَانٌ ﴿۷۰﴾﴾ ''ان میں ہوں گی نہایت نیک سیرت اور خوبصورت عورتیں۔''

آیت ۷۱ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۱﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۷۲ ﴿حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ ﴿۷۲﴾﴾ ''یعنی حوریں' جو قیام پذیر ہوں گی خیموں میں۔''

یہاں پر ''خیموں'' کا ذکر خصوصی طور پر عرب کے ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت عرب میں شہروں کی تعداد

بہت تھوڑی تھی اور زیادہ تر لوگ خیموں میں رہتے تھے۔ اس لیے یہاں پر گھر یا محل کے بجائے خیمے کا ذکر آیا ہے۔ یہاں ﴿مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ﴾ کے الفاظ میں ﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾ (الاحزاب:۳۳) کے حکم کی عملی جھلک دکھائی دیتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ دراصل عورت کا وہ روپ ہے جس روپ میں اسلام اسے دیکھنا چاہتا ہے۔ اسلام عورت کو ''چراغ خانہ'' بن کر رہنے کی ترغیب دیتا ہے اور اسے ''شمع محفل'' بننے سے منع کرتا ہے۔

یہاں پر ایک بہت اہم نکتہ یہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ ان آیات میں جن دو جنتوں کا ذکر ہو رہا ہے ان میں ''حوریں'' ہوں گی جبکہ قبل ازیں جن جنتوں کا ذکر ہوا تھا ان میں حوروں کا نہیں بلکہ ''جنتی عورتوں'' کا تذکرہ تھا: ﴿فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ﴾ ''ان میں ایسی عورتیں ہوں گی جن کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی''۔ اسی طرح سورۃ الواقعہ میں اصحابُ الیمین کی جنت میں خوبصورت عورتوں ﴿اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً﴾ کا ذکر ہے جبکہ ''مقربین'' کے لیے جنت کے حوالے سے ''حُوْرٌ عِيْنٌ'' (آیت ۲۲) کا تذکرہ ہے۔

آیت ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ﴿لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ﴾ ''نہیں چھوا ہوگا ان سے پہلے انہیں نہ کسی انسان نے اور نہ کسی جن نے۔''

یہاں خصوصی طور پر جن اور انسان کے ذکر سے بھی میری اس رائے کو تقویت ملتی ہے کہ یہ جنوں اور انسانوں کے لیے الگ الگ جنتوں کا بیان ہے۔ اس اعتبار سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جنوں کی جنت کی حوروں کو ان کے خاوندوں سے پہلے کسی جن نے نہیں چھوا ہوگا اور انسانوں کی جنت کی حوروں کو قبل ازاں کسی انسان نے ہاتھ نہیں لگایا ہوگا۔

آیت ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ﴿مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ﴾ ''وہ تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے سبز مسندوں اور بہت نفیس بچھونوں پر۔''

آیت ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ﴿تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ﴾ ''بہت بابرکت نام ہے تیرے رب کا جو بہت عظمت والا' بہت اکرام والا ہے۔''

سُوْرَةُ الْوَاقِعَةِ

تمہیدی کلمات

جیسا کہ قبل ازیں سورۃ الرحمٰن کے تمہیدی کلمات میں بھی ذکر ہو چکا ہے' سورۃ الرحمٰن اور سورۃ الواقعہ کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے۔ اس اعتبار سے ان سورتوں کی باہمی مناسبت اور مشابہت بہت گہری ہے۔ دونوں سورتیں اس لحاظ سے پورے قرآن میں منفرد ہیں کہ ان میں نبوت' رسالت یا وحی کا کوئی ذکر نہیں۔ البتہ دونوں سورتیں اللہ تعالیٰ کی صناعی و خلاقی کے تذکرے' جنت و دوزخ کے احوال' آیاتِ انفسی و آفاقی کے بیان اور تذکیر بآلاء اللہ جیسے مضامین کی حامل ہیں۔ یہ مضامین ان دونوں سورتوں میں عکسی ترتیب سے بیان ہوئے ہیں۔

آیات ۱ تا ۴۰

سُوْرَةُ الْوَاقِعَةِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۹۶ رُكُوْعَاتُهَا: ۳

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ﴿۱﴾ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۘ﴿۲﴾ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۙ﴿۳﴾ اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۙ﴿۴﴾ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۙ﴿۵﴾ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ۙ﴿۶﴾ وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۭ﴿۷﴾ فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۭ﴿۸﴾ وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۭ﴿۹﴾ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۙ﴿۱۰﴾ اُولٰۗىِٕكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۚ﴿۱۱﴾ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۭ﴿۱۲﴾ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۙ﴿۱۳﴾ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ۭ﴿۱۴﴾ عَلٰي سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ۙ﴿۱۵﴾ مُّتَّكِـــِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ۭ﴿۱۶﴾ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۙ﴿۱۷﴾ بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ ۙ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ۙ﴿۱۸﴾ لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ۙ﴿۱۹﴾ وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ۙ﴿۲۰﴾ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ۭ﴿۲۱﴾ وَحُوْرٌ عِيْنٌ ۙ﴿۲۲﴾ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ۚ﴿۲۳﴾ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۭ﴿۲۴﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ۙ﴿۲۵﴾ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ۭ﴿۲۶﴾ وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۭ﴿۲۷﴾ فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ۙ﴿۲۸﴾ وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ۙ﴿۲۹﴾ وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ۙ﴿۳۰﴾ وَّمَاۗءٍ مَّسْكُوْبٍ ۙ﴿۳۱﴾ وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ۙ﴿۳۲﴾ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ۙ﴿۳۳﴾ وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ۭ﴿۳۴﴾ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَاۗءً ۙ﴿۳۵﴾ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ۙ﴿۳۶﴾ عُرُبًا اَتْرَابًا ۙ﴿۳۷﴾ لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۭ﴿۳۸﴾ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۙ﴿۳۹﴾ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ۭ﴿۴۰﴾

آیت ۱ ﴿اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ﴿۱﴾﴾ ''جب وہ ہونے والا واقعہ رونما ہو جائے گا۔''

اس آیت کا ترجمہ یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ ''جب وہ وقوع پذیر ہونے والی وقوع پذیر ہو جائے گی''۔ یعنی جس قیامت کی خبر تم لوگوں کو دی جا رہی ہے جب وہ آ جائے گی۔

آیت ۲ ﴿لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝۲﴾ ''(اور جان لو) اس کے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں ہے۔''

یعنی وہ ہر صورت وقوع پذیر ہو کر رہے گی۔

آیت ۳ ﴿خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝۳﴾ ''وہ پست کرنے والی اور بلند کرنے والی ہوگی۔''

بہت سے ایسے لوگ جو دنیا میں بہت بلند مقام و مناصب کے مالک تھے' قیامت انہیں ذلیل و رسوا کر دے گی۔ اس کے برعکس کئی فقراء و مساکین جن کا دنیا میں کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا' اس دن بہت بلند مقامات پر فائز نظر آئیں گے۔ اُس دن حضرت ابو ہریرہؓ حضرت ابو درداءؓ حضرت ابوذر غفاری اور دوسرے فقراء صحابہ رضی اللہ عنہم کو ایسے اعلیٰ مراتب عطا ہوں گے جن کے بارے میں آج ہم لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔

آیت ۴ ﴿اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۝۴﴾ ''جب زمین ہلا ڈالی جائے گی جیسے کہ زلزلہ آتا ہے۔''

آیت ۵ ﴿وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝۵﴾ ''اور پہاڑ بالکل ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے۔''

آیت ۶ ﴿فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ۝۶﴾ ''پس وہ ہو جائیں گے اُڑتا ہوا غبار۔''

آیت ۷ ﴿وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۝۷﴾ ''اور تم تین گروہوں میں منقسم ہو جاؤ گے۔''

ان تین گروہوں کا ذکر بالواسطہ طور پر سورۃ الرحمٰن میں دو جنّتوں کے حوالے سے ہوا ہے۔ یعنی اہلِ جہنّم' نچلے درجے کی جنّت کے مستحق اور اونچے درجے کی جنّت کے باسی۔

آیت ۸ ﴿فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝۸﴾ ''تو جو داہنے والے ہوں گے' کیا خوب ہوں گے وہ داہنے والے!''

داہنے والوں کی خوش نصیبی کا کیا کہنا ہوگا —— یا تم لوگوں کو کیا معلوم کہ وہ داہنے والے لوگ کون ہوں گے' ان کی کیا شان ہوگی اور وہ کس کیفیت میں ہوں گے۔ مَیْمَنَة ''یمین'' سے بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی سیدھے ہاتھ کے ہیں' اور ''یُمن'' سے بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی برکت اور خوش نصیبی کے ہیں۔ اس اعتبار سے اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَة کا ترجمہ مبارک لوگ یا خوش نصیب اور نیک بخت لوگ بھی ہو سکتا ہے۔

آیت ۹ ﴿وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۝۹﴾ ''اور جو بائیں والے ہوں گے' تو کیا حال ہوگا بائیں والوں کا!''

مَشْئَمَة ''شئوم'' سے ہے' جس کے معنی بدنصیبی اور نحوست کے ہیں۔ عربوں کے ہاں جس طرح داہنی جانب خوش قسمتی اور برکت کی علامت سمجھی جاتی تھی اسی طرح بائیں جانب کو منحوس خیال کیا جاتا تھا۔ اس وجہ سے ان دونوں مادوں میں مستقل طور پر برکت اور نحوست کے معنی بھی شامل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَة کا دوسرا ترجمہ بدقسمت' بدبخت اور بُرے لوگ بھی کیا گیا ہے۔ اردو لفظ ''شوم'' (شومئ قسمت وغیرہ) بھی اسی سے مشتق ہے۔ بہرحال دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہوگا جو دربارِ الٰہی میں بائیں جانب کھڑے کر دیے جائیں گے اور بہت بُرے انجام سے دوچار ہوں گے۔

آیت ۱۰ ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝۱۰﴾ ''اور آگے نکل جانے والے تو ہیں ہی آگے نکل جانے والے۔''

آیت ۱۱ ﴿اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝۱۱﴾ ''وہی تو بہت مقرب ہوں گے۔''

یعنی تیسرا گروہ مقربینِ بارگاہ پر مشتمل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ انسان کو اپنے قُرب سے نوازنا چاہتا ہے اور اس کے لیے قرآن میں جابجا ترغیبی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ سورۃ المائدۃ میں تو امر کے صیغے میں فرمایا گیا: ﴿وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ﴾ (آیت ۳۵) کہ تم اس کا قُرب تلاش کرو اور اس کے لیے اُس کی راہ میں جہاد کرو۔ ظاہر ہے جو کوئی اللہ کی راہ میں جان و مال کے ساتھ جہاد کے لیے نکلے گا اللہ تعالیٰ اُسے ضرور اپنے مقربین میں شامل فرمائیں گے۔

آیت ۱۲ ﴿فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝۱۲﴾ ''یہ نعمتوں والے باغات میں ہوں گے۔''

آیت ۱۳ ﴿ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۳﴾ ''یہ بڑی تعداد میں ہوں گے پہلوں میں سے۔''

آیت ۱۴ ﴿وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ۝۱۴﴾ ''اور تھوڑے ہوں گے پچھلوں میں سے۔''

بعض مفسرین کے نزدیک یہاں اَوَّلِیْن سے پہلی اُمتیں اور اٰخِرِیْن سے یہ اُمت مراد ہے۔ لیکن اگر اس مفہوم کو درست سمجھا جائے تو اس سے الٹا یہ ثابت ہوگا کہ پہلی اُمتیں اس اُمت کے مقابلے میں بہتر اور افضل تھیں۔ اس لیے زیادہ صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس فقرے کو ہر اُمت کے اولین اور آخرین سے متعلق سمجھا جائے۔ یعنی ہر اُمت کے اَوَّلِیْن (ہر نبی کے ابتدائی پیروکاروں) میں سے مقربین کی تعداد زیادہ ہوگی، جبکہ ہر اُمت کے اٰخِرِیْن میں سے بہت کم لوگ اس درجے تک پہنچ پائیں گے۔ اور یہی معاملہ اس اُمت کا بھی ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((اِنَّ خَيْرَكُمْ قَرْنِيْ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ)) [1] یعنی اس اُمت کا بہترین زمانہ حضور ﷺ کا زمانہ تھا۔ اُس دور کے لوگ کثیر تعداد میں مقربینِ بارگاہ کے درجے تک پہنچے کیونکہ جس قدر قربانیاں ان لوگوں نے دیں پچھلے زمانہ کے لوگوں نے نہیں دیں۔ تاہم یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ یعنی ہر دور میں لوگ صِدّیقین کے مقام تک بھی پہنچیں گے اور شہادتِ عظمیٰ کا درجہ بھی حاصل کریں گے، لیکن ان کی تعداد بہت کم ہوگی، جبکہ زیادہ تر مؤمنین ''صالحین'' کے درجے تک پہنچ پائیں گے۔ جیسا کہ سورۃ التوبہ کی اس آیت سے واضح ہے: ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ...﴾ (آیت ۱۰۰) ''اور پہلے پہل سبقت کرنے والے مہاجرین اور انصار میں سے، اور وہ جنہوں نے اُن کی پیروی کی احسان کے ساتھ.....'' یعنی ''سابقون الاولون'' تو آگے نکل جانے والے ہوں گے جبکہ کچھ لوگ اسی راستے پر ان کے پیچھے آنے والے بھی ہوں گے۔ یہ عام مؤمنین صالحین ہوں گے جنہیں آیات زیرِ مطالعہ میں اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ اور اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ کے القاب سے نوازا گیا ہے۔ چنانچہ ہر اُمت کے پہلے دور کے اہلِ ایمان میں سے نسبتاً زیادہ لوگ ''مقربین'' ہونے کی سعادت حاصل کریں گے جبکہ بعد کے ادوار میں بہت کم لوگ اس درجہ تک پہنچ پائیں گے۔ جیسے آج حضور ﷺ کی اُمت کی تعداد ڈیڑھ ارب کے لگ بھگ ہے لیکن ان میں مقربین آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہوں گے۔

۱۔ صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ ومتعدد مقامات، ح: ۶۴۲۸، ۶۶۹۵۔ وصحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فضل الصحابة ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم، ح: ۲۵۳۵۔ واللفظ لہ۔

آیت ۱۵ ﴿عَلٰی سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ۙ﴾ ﴿مُّتَّكِـِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ۙ﴾ ''جڑاؤ تختوں پر ٹیک لگائے بیٹھے ہوں گے آمنے سامنے۔''

آیت ۱۷ ﴿يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۙ﴾ ''ان پر گردش کر رہے ہوں گے وہ لڑکے جو سدا اسی طرح رہیں گے۔''

عام طور پر گھروں میں چھوٹی عمر کے لڑکوں کو ملازم رکھا جاتا ہے اور وہ آپ کے مزاج اور ذوق سے واقف ہو جاتے ہیں' لیکن بڑے ہونے پر انہیں نہ چاہتے ہوئے بھی گھر سے نکالنا پڑتا ہے۔ جبکہ جنت میں چھوٹے لڑکے (غلمان) جو اہلِ جنت کی خدمت پر مامور ہوں گے وہ ''بڑے'' نہیں ہوں گے بلکہ ہمیشہ لڑکپن کی عمر میں ہی رہیں گے۔

آیت ۱۸ ﴿بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ ۙ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ۙ﴾ ''آب خورے' صراحیاں اور شرابِ خالص کے جام لیے ہوئے۔''

اہلِ جنت کی محفلوں میں خوبصورت غلمان نہایت شفاف قسم کی شراب کے مینا و جام لیے ہر وقت محوِ گردش رہیں گے۔

آیت ۱۹ ﴿لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ۙ﴾ ''(اس سے) نہ تو ان کے سروں میں کوئی گرانی ہوگی اور نہ ہی وہ بہکیں گے۔''

دنیا کی شراب پینے سے تو سر چکرانے لگتا ہے اور آدمی مدہوش ہو جاتا ہے' بہکی بہکی باتیں کرنے لگتا ہے' لیکن جنت کی ''شرابِ طہور'' کو اس شراب پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ اس میں ایسی کسی خرابی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

آیت ۲۰ ﴿وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ۙ﴾ ''اور میوے جو وہ پسند کریں گے۔''

آیت ۲۱ ﴿وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ۭ﴾ ''اور پرندوں کے گوشت جو انہیں مرغوب ہوں گے۔''

خوب صورت ابدی لڑکے یہ سب نعمتیں اہلِ جنت کی خدمت میں پیش کر رہے ہوں گے۔

آیت ۲۲ ﴿وَحُوْرٌ عِيْنٌ ۙ﴾ ''اور حوریں ہوں گی بڑی بڑی آنکھوں والی۔''

نوٹ کیجیے یہاں اس جنت کی نعمتوں میں حوروں کا ذکر بھی ہوا ہے لیکن اگلی آیات میں اصحاب الیمین کی جنت کے تذکرے میں ''حُور'' کا لفظ نہیں آیا۔ یاد رہے کہ سورۃ الرحمٰن میں نچلے درجے کی جنت کا ذکر پہلے جبکہ حوروں والی جنت (اونچے درجے کی جنت) کا ذکر بعد میں آیا ہے۔ دونوں سورتوں کے مضامین کی اسی ترتیب کو میں نے ابتدا میں عکسی ترتیب (mirror image) کا نام دیا ہے۔

آیت ۲۳ ﴿كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ۚ﴾ ''جیسے موتی ہوں چھپا کر رکھے گئے۔''

آیت ۲۴ ﴿جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۚ﴾ ''یہ بدلہ ہوگا ان کے اعمال کا جو وہ کرتے رہے تھے۔''

یہ ان قربانیوں کا صلہ ہوگا جو انہوں نے اپنی دنیوی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے دی ہوں گی۔

آیت ۲۵ ﴿لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ۙ﴾ ''وہ نہیں سنیں گے اس میں کوئی لغو بات اور نہ ہی کوئی الزام۔''

آیت ۲۶ ﴿اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ۭ﴾ ''مگر (ان کے لیے' ہر طرف سے) سلام سلام ہی کی آوازیں ہوں گی۔''

یہ تو تھا مقربین اور ان کی جنت کا بیان' اب آگے اصحاب الیمین اور ان کی جنت کا ذکر ہے۔

آیت ۲۷ ﴿وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۭ﴾ ''اور اصحاب الیمین! کیا کہنے ہیں اصحاب الیمین کے!''

آیت ۲۸ ﴿فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ۙ﴾ ''وہ ہوں گے بیری کے درختوں میں جن میں کانٹے نہیں ہوں گے۔''

آیت ۲۹ ﴿وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ۝۲۹﴾ ''اور تہ برتہ کیلے۔''

آیت ۳۰ ﴿وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ۝۳۰﴾ ''اور پھیلے ہوئے سائے۔''

آیت ۳۱ ﴿وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ۝۳۱﴾ ''اور بہتا ہوا پانی۔''

آیت ۳۲ ﴿وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ۝۳۲﴾ ''اور کثرت کے ساتھ میوے۔''

آیت ۳۳ ﴿لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ۝۳۳﴾ ''نہ ٹوٹے ہوئے اور نہ ہی پہنچ سے باہر۔''

جنت کے پھل درختوں سے توڑ کر انہیں پیش نہیں کیے جائیں گے بلکہ جب وہ پھل حاصل کرنا چاہیں گے درخت خود ان کے سامنے جھک جائیں گے۔ تمام پھل بکثرت بے روک ٹوک ملیں گے۔ کوئی پھل ایسا نہیں ہوگا جو اُن کی پہنچ سے باہر ہو یا اسے کھانا ممنوع قرار دیا گیا ہو۔

آیت ۳۴ ﴿وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ۝۳۴﴾ ''اور اونچے اونچے بچھونے۔''

آیت ۳۵ ﴿اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ۝۳۵﴾ ''ان (کی بیویوں) کو اٹھایا ہے ہم نے بڑی اچھی اُٹھان پر۔''

آیت ۳۶ ﴿فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ۝۳۶﴾ ''پس ہم نے بنایا ہے انہیں کنواریاں۔''

آیت ۳۷ ﴿عُرُبًا اَتْرَابًا ۝۳۷﴾ ''پیار دینے دلانے والیاں، ہم عمر۔''

آیت ۳۸ ﴿لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۝۳۸﴾ ''(یہ سب کچھ ہوگا) اصحاب الیمین کے لیے۔''

آیت ۳۹ ﴿ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝۳۹﴾ ''جو پہلوں میں سے بھی بہت ہوں گے۔''

آیت ۴۰ ﴿وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ۝۴۰﴾ ''اور پچھلوں میں سے بھی بہت ہوں گے۔''

اب اس کے بعد اہلِ جہنم کا تذکرہ ہے۔

آیات ۴۱ تا ۵۶

وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۝۴۱ فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ۝۴۲ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ۝۴۳ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ۝۴۴ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ۝۴۵ وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ۝۴۶ وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ ۙ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝۴۷ اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ۝۴۸ قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ۝۴۹ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝۵۰ ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ۝۵۱ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ۝۵۲ فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ۝۵۳ فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ۝۵۴ فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ۝۵۵ هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ ۝۵۶

آیت ۴۱ ﴿وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۝۴۱﴾ ''اور بائیں والے! کیا (ہی بُرا) حال ہوگا بائیں والوں کا!''

آیت ۴۲ ﴿فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ۝۴۲﴾ ''وہ ہوں گے تیز لُو اور کھولتے ہوئے پانی میں۔''

آیت ۴۳ ﴿وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ﴿۴۳﴾﴾ ''اور کالے دھوئیں کے سائے میں۔''

آیت ۴۴ ﴿لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ﴿۴۴﴾﴾ ''نہ وہ ٹھنڈا ہوگا اور نہ ہی سکون بخش۔''

آیت ۴۵ ﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ﴿۴۵﴾﴾ ''یہ لوگ اس سے پہلے (دنیا میں) بڑے خوشحال تھے۔''

دنیا میں انہیں ہر طرح کا عیش و آرام میسّر تھا۔ وہاں انہوں نے خوب مزے کیے۔

آیت ۴۶ ﴿وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ﴿۴۶﴾﴾ ''اور یہ اصرار کرتے تھے بہت بڑے گناہ پر۔''

بہت بڑے گناہ سے یہاں شرک مراد ہے' جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورۃ النساء میں حتمی فیصلہ دیا جا چکا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ﴾ (آیت ۴۸ و ۱۱۶) کہ اللہ تعالیٰ اپنے ساتھ کیے گئے شرک کو کبھی نہیں بخشے گا' اس کے علاوہ جس کسی کو جو چاہے گا بخش دے گا۔

آیت ۴۷ ﴿وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ ۙ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۴۷﴾﴾ ''اور وہ یہ کہا کرتے تھے کہ کیا جب ہم مر جائیں گے اور ہو جائیں گے مٹی اور ہڈیاں تو کیا پھر سے اُٹھا کھڑے کیے جائیں گے؟''

آیت ۴۸ ﴿اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴿۴۸﴾﴾ ''اور کیا ہمارے آباء و اجداد بھی جو پہلے گزر چکے ہیں؟''

آیت ۴۹ ﴿قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۹﴾﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے کہ یقیناً پہلے بھی اور پچھلے بھی۔''

آیت ۵۰ ﴿لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۵۰﴾﴾ ''لازماً جمع کیے جائیں گے ایک مقرر دن کے طے شدہ وقت پر۔''

آیت ۵۱ ﴿ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ﴿۵۱﴾﴾ ''پھر تم' اے گمراہو اور جھٹلانے والو!''

آیت ۵۲ ﴿لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ﴿۵۲﴾﴾ ''ضرور کھاؤ گے زقوم کے درخت سے۔''

تم بھٹکے ہوئے تھے' ہم نے تمہاری راہنمائی کے لیے اپنا رسولؐ بھیجا' کتابِ ہدایت بھیجی: ﴿تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ﴿۸﴾﴾ (ق) یہ سب کچھ تمہاری آنکھیں کھولنے کے لیے تھا۔ لیکن اس کے باوجود تم نے ہمارے رسولؐ کو بھی جھٹلا دیا' ہماری کتاب کی بھی تکذیب کی اور گمراہ رہنے کو ہی ترجیح دی۔ تو اے بھٹکے ہوئے اور ہماری ہدایت کو جھٹلانے والے لوگو! اب جہنّم کے اندر تمہاری ضیافت زقوم کے درخت سے ہی کی جائے گی۔ (۲)

آیت ۵۳ ﴿فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۵۳﴾﴾ ''پس اسی سے تم اپنے پیٹ بھرو گے۔''

آیت ۵۴ ﴿فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ﴿۵۴﴾﴾ ''پھر پیو گے اس پر کھولتا ہوا پانی۔''

آیت ۵۵ ﴿فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ﴿۵۵﴾﴾ ''اور ایسے پیو گے جیسے پیاس کا مارا اونٹ پیتا ہے۔''

۲۔ زقوم کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَوْ اَنَّ قَطْرَةً مِنَ الزَّقُّوْمِ قُطِرَتْ فِيْ دَارِ الدُّنْيَا لَاَفْسَدَتْ عَلٰى اَهْلِ الدُّنْيَا مَعَايِشَهُمْ فَكَيْفَ بِمَنْ يَكُوْنُ طَعَامَهُ)) (سنن الترمذی' کتاب صفة جهنم' باب ما جاء فی صفة شراب اهل النار)

''اگر زقوم کا ایک قطرہ بھی دنیا میں ٹپکا دیا جائے تو دنیا والوں کے لیے ان کی زندگی برباد کر دے' تو پھر ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جن کی غذا ہی یہی ہوگی!'' ←

جس طرح پیاس زدہ اونٹ جلدی جلدی اپنے پیٹ میں پانی بھرتا چلا جاتا ہے تم بھی وہ کھولتا ہوا پانی اسی طرح اپنے پیٹوں میں بھرو گے۔

آیت ۵۶ ﴿هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ ۝۵۶﴾ ''یہ ہوگی اُن کی ابتدائی ضیافت جزا کے دن۔''

یہاں پر ان تینوں گروہوں کا بیان مکمل ہو گیا۔ یاد رہے کہ سورۃ الرحمٰن میں جہنّم اور جنّت کے حوالے سے ان تینوں گروہوں کا تذکرہ سورۃ کے آخر میں آیا تھا' جبکہ یہاں ان کا ذکر سورت کے آغاز میں آیا ہے۔ یعنی دونوں سورتوں کے مضامین معکوس ترتیب سے بیان ہوئے ہیں۔ اسی عکسی ترتیب کے تحت اب سورت کے دوسرے رکوع میں وہ مضمون آ رہا ہے جو سورۃ الرحمٰن کے پہلے رکوع میں بیان ہوا ہے۔ سورۃ الرحمٰن کے آغاز میں اللہ تعالیٰ کی خلّاقی اور صنّاعی کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان بنائے' زمین بنائی' زمین میں دریا چلائے' سمندر پھیلائے۔ دریاؤں اور سمندروں کی تہوں میں عجیب و غریب قسم کے موتی اور مونگے پیدا کیے اور پہاڑوں جیسے بڑے بڑے جہازوں کا پانی کی سطح پر تیرنا ممکن بنایا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی شان اور اُس کی قدرتوں کے مظاہر ہیں۔ چنانچہ اسی انداز سے یہاں اس سورت میں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور صنّاعی کا ذکر ہونے جا رہا ہے' لیکن پے در پے سوالات کے ساتھ بہت ہی خوبصورت اور مؤثر انداز میں:

آیات ۵۷ تا ۷۴

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ۝۵۷ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ۝۵۸ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ
الْخٰلِقُوْنَ ۝۵۹ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ۝۶۰ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ
وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۶۱ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۶۲ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا
تَحْرُثُوْنَ ۝۶۳ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝۶۴ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ
تَفَكَّهُوْنَ ۝۶۵ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ۝۶۶ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝۶۷ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ۝۶۸
ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۝۶۹ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْ

← ''زقّوم'' صحرائے عرب کا ایک درخت ہے' جس کے بارے میں مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے:

''زقّوم ایک قسم کا درخت ہے جو تہامہ کے علاقے میں ہوتا ہے۔ مزہ اس کا تلخ ہوتا ہے' بو ناگوار ہوتی ہے اور توڑنے پر اس میں سے دودھ کا سا رس نکلتا ہے جو اگر جسم کو لگ جائے تو ورم ہو جاتا ہے۔ غالباً یہ وہی چیز ہے جسے ہمارے ملک میں تھوہر کہتے ہیں۔''

(تفہیم القرآن' جلد ۴' ص ۲۸۹)

اس کے بارے میں مفتی محمد شفیعؒ رقم طراز ہیں:

''بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سانپ بچھو وغیرہ دنیا میں بھی ہوتے ہیں اسی طرح دوزخ میں بھی ہوتے ہیں' لیکن دوزخ کے سانپ بچھو یہاں کے سانپ بچھوؤں سے کہیں زیادہ خوفناک ہوں گے' اسی طرح دوزخ کا زقّوم بھی اپنی جنس کے لحاظ سے تو دنیا ہی کے زقّوم کی طرح ہوگا' لیکن یہاں کے زقّوم سے کہیں زیادہ کریہہ المنظر اور کھانے میں کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوگا' واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم!''

(معارف القرآن' جلد ۷' ص ۲۴۱)

لَا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۰﴾ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ﴿۷۱﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ
ع ۱۵ الْمُنْشِـُٔوْنَ ﴿۷۲﴾ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ﴿۷۳﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾

آیت ۵۸ ﴿نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ﴿۵۷﴾﴾ ''ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے' تو تم لوگ تصدیق کیوں نہیں کرتے؟''

جب یہ تسلیم کرتے ہو کہ تم سب کو اللہ نے پیدا کیا ہے تو پھر تم لوگوں کو یہ یقین کیوں نہیں آتا کہ وہی اللہ تمہیں دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ اس میں آخر تعجب اور شک والی کون سی بات ہے؟

آیت ۵۹ ﴿اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ﴿۵۸﴾﴾ ''کیا تم نے کبھی غور کیا اس پر جو (منی) تم ٹپکا دیتے ہو؟''

آیت ۶۰ ﴿ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۵۹﴾﴾ ''کیا اس کی تخلیق تم کرتے ہو یا ہم تخلیق کرنے والے ہیں؟''

تم تو پانی کی وہ بوند ٹپکا کر فارغ ہو جاتے ہو۔ اس کے بعد رحم مادر میں ایک حیرت انگیز تخلیقی عمل کا آغاز ہو جاتا ہے۔ وہ نطفہ علقہ میں تبدیل ہوتا ہے' علقہ سے مضغہ بنتا ہے۔ پھر ہڈیاں بنتی ہیں' جوڑ بند درست ہوتے ہیں' آنکھوں' کانوں اور دوسرے اعضاء کا نقشہ تیار ہوتا ہے اور یہ سارا عمل تین پردوں ﴿فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ﴾ (الزمر:۶) کے اندر پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ کیا اس سارے عمل میں تمہارا بھی کوئی حصہ ہے؟ ماں کے پیٹ میں مختلف پیچیدہ تخلیقی مراحل سے گزرتے ہوئے بچے کے کسی عضو کے بنانے میں کیا کوئی تمہارا کردار بھی ہے؟ یا اس کی تذکیر و تانیث میں تمہارا کچھ اختیار ہے؟ ظاہر ہے اس پورے تخلیقی عمل میں تمہارا حصہ یا کردار بالکل نہیں ہے' اور تم تسلیم کرتے ہو کہ نہیں ہے' تو پھر اس حقیقت کو قبول کیوں نہیں کر لیتے ہو کہ یہ سب کچھ اللہ کی مرضی و منشاء اور صناعی و خلاقی کا مظہر ہے۔

جب ہم ان آیات کی تلاوت کریں تو ہر سوال کے جواب میں عجز و انکساری سے عرض کرنا چاہیے: بَلْ اَنْتَ يَارَبِّ! کہ اے میرے پروردگار! یہ سب تیری کاریگری' تیری صناعی اور تیری خلاقی کا مظہر ہے' اس میں سے ہمارے بس میں کچھ بھی نہیں۔ (تفسیر عثمانی کے مطابق بعض روایات کی بنا پر علماء نے یہ مستحب سمجھا ہے۔)

آیت ۶۱ ﴿نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۶۰﴾ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ﴾ ''ہم نے تمہارے مابین موت کو ٹھہرا دیا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری مثل بدل کر لائیں''

یہ مقام بھی مشکلات القرآن میں سے ہے۔ بہرحال اس کی ایک توجیہہ جو میری سمجھ میں آتی ہے' وہ یہ ہے کہ یہاں دو انسانی زندگیوں اور ان کے درمیان طے شدہ موت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی ایک دنیا کی زندگی ہے اور دوسری آخرت کی زندگی اور درمیان میں اللہ تعالیٰ نے موت کا پردہ حائل کر دیا ہے۔ موت کی اس سرحد کے اس طرف بھی تم ہو اور دوسری طرف بھی تم ہو۔ گویا موت کے وقفے کے بعد زندگی کا تسلسل پھر سے بحال ہو جائے گا۔ بقول میرؔ ؎

موت اِک ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر!

یہاں سمجھنے کا اصل نکتہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کا جسم تو مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے' جبکہ اس کی روح کو موت نہیں آتی' روح زندہ رہتی ہے۔ قیامت میں انسان کو جس جسم کے ساتھ دوبارہ زندہ کیا جائے گا وہ بعینہٖ اس کا دنیا والا جسم نہیں ہوگا' بلکہ ''اس جیسا'' جسم ہوگا۔ اس حوالے سے یہ نکتہ بھی سمجھنے کا ہے کہ انسان کا دُنیوی زندگی والا جسم تو اس زندگی میں بھی مسلسل بدلتا رہتا ہے۔ زندہ جسم کے اربوں خلیے

مسلسل ختم ہوتے رہتے ہیں اور ایسے ہی نئے خلیے مسلسل بنتے رہتے ہیں۔ جلد کی جھلی بھی بدلتی رہتی ہے اور ناخن بھی لگا تار گھستے اور نئے بنتے رہتے ہیں۔ اس عمل کو ذہن میں رکھیں تو یہ حقیقت بخوبی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ایک انسان کا چند سال پہلے جو جسم تھا آج اس کا جسم وہ نہیں ہے اور جو جسم اس کا آج ہے چند سال بعد بعینہٖ یہ نہیں رہے گا۔ چنانچہ جب انسان کا جسم مسلسل تبدیل ہو رہا ہے تو آخرت میں اسے بعینہٖ دنیا والا جسم ملنا ویسے ہی بعید از قیاس ہے۔ اگر وقتی طور پر یہ فرض کر لیا جائے کہ انسان کو آخرت میں دنیا والا جسم ملے گا تو پھر اس سوال کا جواب بھی دینا پڑے گا کہ وہ اس کا کون سا جسم ہوگا؟ بیس برس کی عمر والا؟ چالیس سال کی عمر والا؟ یا ساٹھ سال کی عمر والا؟ لہٰذا یہ بات عقل اور منطق ہی کے خلاف ہے کہ انسان کو دوبارہ دنیا والے جسم کے ساتھ زندہ کیا جائے گا۔

چنانچہ آخرت میں انسان کو دنیا کے جسم جیسا جسم دیا جائے گا اور اس کی روح کو اس کے اس جسم سے ملا کر اسے نئی زندگی بخشی جائے گی۔ یہ مضمون قرآن میں تین مقامات (بنی اسرائیل:۹۹، یٰسٓ:۸۱، الدھر:۲۸) پر آیا ہے۔ بہر حال دوبارہ زندہ ہونے کے بعد انسان کی جان اور روح جب نئے جسم میں منتقل ہو جائے گی تو اس کے شعور اور اس کی یادداشت کا دنیوی تسلسل بعینہٖ بحال کر دیا جائے گا۔ دنیا میں وہ کیا تھا؟ وہاں اُس نے کب کیا کیا تھا؟ زندہ ہوتے ہی اسے سب کچھ یاد آ جائے گا۔ کیونکہ دُنیوی زندگی کے دوران اس کا جسم تو بدلتا رہا تھا لیکن اس کے شعورِ ذات کا تسلسل بغیر کسی خلل کے آخر تک برقرار رہا تھا۔ اس لیے وہ سلسلہ موت کے باعث جہاں سے ٹوٹا تھا عین وہیں سے اسے جوڑ دیا جائے گا۔ چنانچہ ان آیات کا سادہ مفہوم یہ ہے کہ اے لوگو! تمہاری دو زندگیوں کے درمیان ہم نے ہی موت کا پردہ حائل کر رکھا ہے' تو کیا ہم اس پر قادر نہیں ہیں کہ تم جیسے وجود دوبارہ پیدا کر دیں۔

﴿وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾﴾ ''اور تمہیں ایسی تخلیق میں اٹھائیں جسے تم نہیں جانتے!''

اس کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ تمہیں ہم ایسے عالَم میں اٹھا کھڑا کریں گے جس کی کیفیت سے آج تم واقف نہیں ہو یعنی عالَمِ آخرت میں۔

آیت ۶۲ ﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى﴾ ''اور تم (اپنی) پہلی زندگی کے بارے میں تو جانتے ہی ہو''

یعنی اپنی دنیوی تخلیق سے متعلق تمام مراحل کے بارے میں تو تم جانتے ہو۔ انسانی تخلیق کے مختلف مراحل کا ذکر قرآن مجید میں تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ لیکن جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے' سورۃ المؤمنون کی یہ آیات اس موضوع پر قرآن کے ذروۂ سنام کا درجہ رکھتی ہیں:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۤ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾﴾

''ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹی کے خلاصے سے۔ پھر ہم نے اسے بوند کی شکل میں ایک محفوظ ٹھکانے میں رکھا۔ پھر ہم نے اس نُطفہ کو عَلَقہ کی شکل دے دی' پھر علقہ کو ہم نے گوشت کا لوتھڑا بنا دیا۔ پھر ہم نے گوشت کے اس لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں' پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا' پھر ہم نے اسے ایک اور ہی تخلیق پر اٹھا دیا۔ پس بڑا بابرکت ہے اللہ' تمام تخلیق کرنے والوں میں بہترین تخلیق کرنے والا۔''

تو جب اس حیرت انگیز اور پیچیدہ تخلیقی عمل کے مختلف مراحل تمہارے علم اور مشاہدے میں آ چکے ہیں:

﴿فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾﴾ ''تو پھر تم سمجھتے کیوں نہیں ہو؟''

تم عقل سے کام کیوں نہیں لیتے؟ تم اس سے نصیحت اور یاددہانی کیوں اخذ نہیں کرتے؟ —— اللہ تعالیٰ کی قدرت اور صناعی کے ان مظاہر کا ادراک کر لینے کے بعد بھی تمہیں یہ بات کیوں سمجھ میں نہیں آتی کہ جس اللہ نے اس عمل سے گزار کر ہمیں ابتدا میں پیدا کیا ہے وہ دوبارہ بھی ہمیں پیدا کر سکتا ہے؟

آئندہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی خلاقی کی چند اور مثالیں بیان کی جا رہی ہیں:

آیت ۶۳ ﴿اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴿۶۳﴾﴾ ''کیا تم نے کبھی غور کیا کہ یہ بیج جو تم بوتے ہو؟''

تم لوگ تو بیج کو مٹی میں دبا کر آ جاتے ہو۔ اس کے بعد تم کیا جانو کہ وہ بیج کس کس مرحلے سے گزرتا ہے' کس طرح اس کی جڑیں نکل کر زمین میں پیوست ہوتی ہیں اور کس طرح اس کی کونپلیں زمین کو پھاڑ کر باہر نکلتی ہیں!

آیت ۶۴ ﴿ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿۶۴﴾﴾ ''کیا تم اسے اُگاتے ہو یا ہم اُگانے والے ہیں؟''

یہاں ہماری زبانوں پر بے اختیار یہ الفاظ آ جانے چاہئیں: بَلْ اَنْتَ یَارَبِّ! کہ نہیں! اے ہمارے پروردگار! اسے تو ہی اُگاتا ہے' اس میں ہمارا کچھ بھی اختیار نہیں! علامہ اقبال کی نظم لِلّٰہِ الْاَرْضُ کے درج ذیل اشعار میں ان ہی آیات کے اسلوب اور مضمون کی جھلک نظر آتی ہے: ؎

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ — کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟ — خاک یہ کس کی ہے' کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟ — موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
وہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں' تیری نہیں! — تیرے آباء کی نہیں' تیری نہیں' میری نہیں!

یعنی یہ زمین' یہ کائنات' کائنات کا پورا نظام یہ سب کچھ اللہ ہی کا ہے اور اسی کی قدرت و مشیت سے اس کائنات کا یہ نظام چل رہا ہے۔

آیت ۶۵ ﴿لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا﴾ ''اگر ہم چاہیں تو اسے چورا چورا کر دیں''

اگر ہم چاہیں تو کسی آسمانی آفت' طوفان' جھکڑ یا ژالہ باری سے تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہاری لہلہاتی فصلوں کو برباد کر کے رکھ دیں۔

﴿فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ﴿۶۵﴾﴾ ''پھر تم بیٹھے رہو باتیں بناتے ہوئے۔''

آیت ۶۶ ﴿اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ﴿۶۶﴾﴾ ''(کہ لو جی!) ہم پر تو بڑا تاوان پڑ گیا۔''

کہ ہم نے محنت کی' ہل چلائے' بیج ڈالا' آبیاری کی اور بہت سے دوسرے اخراجات کیے' لیکن ہم پر تو الٹی چٹی پڑ گئی۔

آیت ۶۷ ﴿بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۶۷﴾﴾ ''بلکہ ہم تو بالکل ہی محروم ہو کر رہ گئے۔''

ہمارا تو سب کچھ برباد ہو گیا۔

آیت ۶۸ ﴿اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ﴿۶۸﴾﴾ ''کبھی تم نے غور کیا کہ وہ پانی جو تم پیتے ہو؟''

آیت ۶۹ ﴿ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿۶۹﴾﴾ ''کیا بادلوں سے تم نے اسے برسایا ہے یا ہم ہیں

برسانے والے؟''

آیت ۷۰ ﴿لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا﴾ ''اگر ہم چاہیں تو اسے کڑوا کر دیں''

﴿فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ﴾ ''تو تم کیوں شکر ادا نہیں کرتے؟''

آیت ۷۱ ﴿اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ﴾ ''کبھی تم نے سوچا کہ وہ آگ جو تم جلاتے ہو؟''

آیت ۷۲ ﴿ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ﴾ ''کیا اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا ہے' یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟''

بَلْ اَنْتَ یَارَبِّ! نوٹ کیجیے پے در پے سوالات کا یہ تیکھا اسلوب پورے قرآن میں اور کہیں نہیں ہے۔

آیت ۷۳ ﴿نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ﴾ ''ہم نے بنا دیا اس کو ایک نشانی یاد دلانے کو اور ایک بہت فائدہ مند چیز صحرا کے مسافروں کے لیے۔''

جیسا کہ سورۂ یٰسین کی آیت ۸۰ کے ضمن میں بھی وضاحت کی جا چکی ہے' بعض صحراؤں میں ایسے درخت پائے جاتے ہیں جن کی سبز گیلی شاخوں کو آپس میں رگڑنے سے آگ پیدا ہوتی ہے۔ یہاں پر شَجَرَتَهَآ سے وہ مخصوص درخت بھی مراد ہے اور عام درخت بھی۔ کیونکہ درختوں کی لکڑی آگ جلانے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اور یہ درخت ظاہر ہے اللہ نے پیدا کیے ہیں اور اُسی نے ان میں جلنے کی خصوصیت رکھی ہے۔

آیت ۷۴ ﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ﴾ ''پس تم تسبیح بیان کرو اپنے رب کے نام کی جو بہت عظمت والا ہے۔''

سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم!

اب اگلی آیات میں قرآن مجید کی عظمت کا بیان ہے۔ ان آیات کے مطالعہ سے پہلے عظمتِ قرآن کے حوالے سے سورۃ الرحمٰن کے آغاز کی یہ عظیم آیات بھی ذہن میں تازہ کر لیجیے: ﴿اَلرَّحْمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ﴿۲﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿۴﴾﴾ قرآن کی عظمت کے اس بیان کے بین السطور میں یہ پیغام بھی مضمر ہے کہ انسانوں پر اس عظیم کتاب کا حق ادا کرنا لازم ہے۔ اس حوالے سے حضور ﷺ کا یہ فرمان بھی ہم ان آیات کے ضمن میں پڑھ آئے ہیں: ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ)) کہ تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو خود قرآن سیکھتے اور دوسروں کو سکھاتے ہیں۔ ان دونوں سورتوں کے مضامین چونکہ عکسی ترتیب سے بیان ہوئے ہیں' اس لیے عظمتِ قرآن کا وہ مضمون جو سورۃ الرحمٰن کے آغاز میں آیا تھا' اس سورت کے آخر میں آ رہا ہے اور سورۃ الرحمٰن کی مذکورہ چار آیات کے مقابلے میں یہاں اس موضوع پر آٹھ آیات آئی ہیں۔

آیات ۷۵ تا ۸۲

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۙ﴿۷۵﴾ وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۙ﴿۷۶﴾ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۙ﴿۷۷﴾ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۙ﴿۷۸﴾ لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ؕ﴿۷۹﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ۙ﴿۸۱﴾ وَ تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۸۲﴾

آیت ۷۵ ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝۷۵﴾ ''پس نہیں! قسم ہے مجھے اُن مقامات کی جہاں ستارے ڈوبتے ہیں۔''

بعض مفسرین نے مَوٰقِعِ النُّجُوْمِ کی وضاحت شہابِ ثاقب کے حوالے سے کی ہے' حالانکہ شہابِ ثاقب بالکل مختلف چیز ہے اور قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اسے شیاطین کو عالمِ بالا سے مار بھگانے کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ موجودہ دور میں سائنس کی فراہم کردہ معلومات کی مدد سے اس آیت کو نسبتاً بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے' اگرچہ ابھی بھی اس کا مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہوا۔

یہاں ضمنی طور پر یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ حلال و حرام' جائز و ناجائز' فرائض اور دین کے عملی پہلو سے متعلق قرآنی احکام کی تفہیم و تعمیل کے حوالے سے ہمیں راہنمائی کے لیے ''دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو!'' کے مصداق پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہیے۔ اس ضمن میں ہماری نظری و عملی اطاعت کا کمال یہ ہوگا کہ ہم اپنے اسلاف کا دامن تھامے رکھیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اتباع کو لازم جانیں۔ یہاں تک کہ اس حوالے سے خود کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں میں پہنچا دیں' بقول اقبال: ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است!

البتہ دوسری طرف کائنات کی تخلیق' کائنات میں زندگی کی ابتدا' تاریخی حوالہ جات اور سائنس کے مختلف شعبوں سے متعلق قرآنی آیات کی تشریح و تعبیر کے لیے ہمیں ہر دور کے اجتماعی انسانی شعور اور دستیاب حقائق و معلومات کو مدِنظر رکھنا چاہیے' پھر جہاں مناسب معلوم ہو ان معلومات سے استفادہ بھی کرنا چاہیے اور جب ممکن نظر آئے تکلف سے اجتناب کرتے ہوئے فطری انداز میں قرآنی الفاظ و معانی کا زمینی حقائق کے ساتھ تطابق ڈھونڈنے کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔ اس حوالے سے یہ نکتہ بھی ذہن نشین کر لیجیے کہ ایسی آیات کا جو مفہوم آج سے ہزار سال پہلے سمجھا گیا تھا آج ہم اس مفہوم کو ماننے اور درست جاننے کے پابند نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ایسی آیات کا تعلق حکمت سے ہے' کسی حکم سے نہیں ہے۔ چنانچہ حکمت اور سائنس کے میدان میں تو نئے نئے افق تلاش کرنے کے لیے مستقبل کی طرف دیکھنا چاہیے' لیکن احکام اور دین کے عملی پہلو کو سمجھنے' سمجھانے کے لیے ماضی سے تعلق جوڑنے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ کو مشعلِ راہ بنائے رکھنے کی ضرورت ہے۔

اب آیئے آیت زیرِ مطالعہ کو موجودہ دور کی سائنسی معلومات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں۔ موجودہ دور میں سائنس دانوں نے کائنات کے اندر ایسے بے شمار بڑے بڑے اندھے غاروں کا کھوج لگایا ہے جو اپنے پاس سے گزرنے والی ہر چیز کو نگل جاتے ہیں۔ سائنس دانوں نے ان ''غاروں'' کو Black Holes کا نام دیا ہے۔ ایسے کسی ایک بلیک ہول کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے اندر ہمارے سورج سے کروڑوں گنا بڑے ستارے پلک جھپکنے میں غائب ہو جاتے ہیں' بلکہ ایسے کروڑوں ستاروں پر مشتمل کہکشائیں بھی ایسے بلیک ہولز کے اندر گم ہو کر معدوم ہو جاتی ہیں۔ سائنسی تحقیقات سے یہ بھی پتا چلا ہے کہ کائنات کے اندر مسلسل نئے نئے ستارے جنم لے رہے ہیں اور نئی نئی کہکشائیں وجود میں آ رہی ہیں' جبکہ ساتھ ہی ساتھ بے شمار کہکشائیں اپنے اَن گنت ستاروں کے ساتھ مسلسل بلیک ہولز کی نذر ہو کر معدوم ہو رہی ہیں۔ اگرچہ کائنات کے اسرار و رموز سے متعلق آج بھی انسان کی معلومات بہت محدود ہیں لیکن پھر بھی بلیک ہولز کے متعلق اب تک حاصل ہونے والی یہ معلومات بہت ہوشربا ہیں۔

اب اگر ہم اپنی زمین کی جسامت اور وسعت کا نقشہ ذہن میں رکھیں' پھر اس کے مقابلے میں سورج کی جسامت کا اندازہ کریں' پھر یہ تصور کریں کہ کائنات میں ہمارے سورج سے کروڑوں گنا بڑے اربوں کھربوں ستارے بھی موجود ہیں اور ان ستاروں کے

درمیان اربوں نوری سالوں کے فاصلے ہیں' پھر یہ تصوّر کریں کہ ایسے اَن گنت ستاروں پر مشتمل اَن گنت کہکشائیں ہیں' اور ان کہکشاؤں کے درمیانی فاصلے بھی اسی تناسب سے ہیں۔ کہکشاؤں اور ستاروں سے متعلق یہ تمام معلومات ذہن میں رکھ کر اگر ہم کائنات کے طول و عرض میں موجود لاتعداد بلیک ہولز کا تصوّر کریں اور پھر یہ نقشہ ذہن میں لائیں کہ ان میں سے ایک ایک بلیک ہول اتنا بڑا ہے کہ وہ اپنے پاس سے گزرنے والی کسی بڑی سے بڑی کہکشاں کو آنِ واحد میں ایسے نگل جاتا ہے کہ اس کا نام ونشان تک باقی نہیں رہتا اور پھر ان بلیک ہولز کا اطلاق مَوٰقِعِ النُّجُوْم پر کریں تو شاید ہمیں کچھ کچھ اندازہ ہو جائے کہ اس آیت میں جس قسم کا ذکر ہوا ہے وہ کتنی بڑی قسم ہے۔

آیت ۷۶ ﴿وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝۷۶﴾ ''اور یقیناً یہ بہت بڑی قسم ہے اگر تم جانو!''

یعنی ابھی تم مَوٰقِعِ النُّجُوْم کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ایک وقت آئے گا جب تمہیں ان کی حقیقت سے متعلق معلومات حاصل ہو جائیں گی' پھر تمہیں احساس ہوگا کہ ہم نے تمہارے سامنے یہ کس قدر عظیم قسم پیش کی ہے۔

آیت ۷۷ ﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝۷۷﴾ ''یقیناً یہ بہت عزّت والا قرآن ہے۔''

یہاں پر ہم میں سے ہر شخص کو پوری دیانت داری سے اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ اس نے اپنی حد تک قرآن مجید کی کیا قدر کی ہے اور کس حد تک اس کے حقوق پورے کیے ہیں؟ بہرحال جہاں تک ان حقوق کی ادائیگی کا تعلق ہے ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر کسی انسان کو ہزاروں زندگیاں مل جائیں اور وہ انہیں ''قرآن'' کے لیے وقف کر دے' تب بھی قرآن کا حق ادا نہیں ہو سکے گا۔

آیت ۷۸ ﴿فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝۷۸﴾ ''ایک چھپی ہوئی کتاب میں۔''

یہ قرآن کریم ایک پوشیدہ کتاب میں محفوظ ہے۔ سورۃ الزخرف کی آیت ۴ میں اس کِتابِ مَکْنُوْن کو اُمِّ الْکِتٰب کا نام دیا گیا ہے: ﴿وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝۴﴾ ''اور یہ اُمّ الکتاب میں ہے ہمارے پاس بہت بلند و بالا' بہت حکمت والی!'' جبکہ سورۃ البروج میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝۲۱ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝۲۲﴾ ''بلکہ یہ قرآن عظیم الشان (کتاب) ہے۔ لوحِ محفوظ میں (لکھا ہوا)۔''

آیت ۷۹ ﴿لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝۷۹﴾ ''اسے چھو نہیں سکتے مگر وہی جو بالکل پاک ہیں۔''

یعنی اسے فرشتے ہی چھو سکتے ہیں جو بالکل پاک مخلوق ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی عظمت کے ضمن میں سورۂ عبس میں فرمایا گیا ہے: ﴿كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝۱۱ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝۱۲ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝۱۳ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝۱۴ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۝۱۵ كِرَامٍۢ بَرَرَةٍ ۝۱۶﴾ ''ہرگز نہیں' یہ تو ایک نصیحت ہے۔ پس جو کوئی چاہے اسے قبول کرے۔ یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو باعزّت ہیں' بلند مرتبہ ہیں' پاکیزہ ہیں۔ ایسے کاتبوں کے ہاتھوں میں ہیں جو معزز اور نیک ہیں۔''

آیت زیر مطالعہ میں الْمُطَهَّرُوْنَ سے مراد فرشتے ہیں اور یَمَسُّهٗ میں ہٗ کی ضمیر کا تعلق ''کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ'' سے ہے۔ مَوٰقِعِ النُّجُوْم کی قسم کا مُقسَم علیہ یہ ہے کہ یہ ایک نہایت باعزّت اور برتر کلام ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے پاس ایک محفوظ کتاب میں ہے' جس تک اُس کے پاک فرشتوں کے سوا کسی کی بھی رسائی نہیں۔ یعنی اس کو صرف ملائکہ مقربین ہی ہاتھ لگا سکتے ہیں' جنّات اور شیاطین وہاں پھٹک بھی نہیں سکتے۔

فقہاء نے اس آیت سے یہ حکم بھی استنباط کیا ہے کہ قرآن مجید کو ناپاکی کی حالت میں چھونے کی اجازت نہیں ہے۔ اس بارے

میں فقہاء کے موقف کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید کو چھونے اور چھو کر پڑھنے کے لیے وضو ضروری ہے' جبکہ زبانی تلاوت بغیر وضو بھی کی جاسکتی ہے' البتہ جنابت کی حالت میں قرآن مجید کے الفاظ کو زبانی پڑھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔

اس کے علاوہ اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ قرآن کے اصل لُبِّ لُباب تک پہنچنے اور اس کی ہدایت سے مستفیض ہونے کے لیے باطنی صفائی ضروری ہے۔ اس نکتے کو سمجھنے کے لیے قرآن کے ظاہر اور باطن کے فرق کو سمجھنا ضروری ہے۔ جس طرح ہم اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں پڑھتے ہیں: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ﴾ (الحدید: ۳) ''کہ وہ اول بھی ہے' آخر بھی ہے' ظاہر بھی ہے اور باطن بھی ہے''۔ اسی طرح قرآن کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ قرآن کا ظاہر اس کی عبارت اور اس کے الفاظ ہیں۔ جہاں تک قرآن کے اس ظاہر کا تعلق ہے ہر عربی دان شخص اس کے معانی و مطالب کو سمجھ سکتا ہے اور اس کی صَرف و نحو پر بحث کر سکتا ہے۔ اس اعتبار سے کئی ایسے غیر مسلموں کی مثالیں بھی موجود ہیں جنہوں نے عربی میں مہارت حاصل کر کے قرآن کے تراجم کیے اور تفسیریں لکھیں۔ لیکن ایسے لوگ قرآن کے باطن تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ اقبال نے اسی مفہوم میں ایسی ہی بات بندۂ مؤمن کے بارے میں کہی ہے:

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے!

اقبال نے اس شعر میں بندۂ مؤمن کے وجود کے مرکز کا ذکر کیا ہے۔ بالکل اسی مفہوم میں قرآن مجید کا بھی ''مرکز'' ہے۔ قرآن کے مرکز سے مراد اس کی روحِ باطنی' اس کی ہدایت' اس کا اصل علم اور اس کا لُبِّ لُباب ہے۔ اس لحاظ سے آیت زیر مطالعہ اس حقیقت کی طرف ہماری راہنمائی کرتی ہے کہ قرآن مجید کے مرکز (nucleus) تک رسائی حاصل کرنے کے لیے تزکیۂ باطنی ضروری ہے۔ اس تزکیۂ باطنی کا ذکر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی اس دعا میں بھی ہے:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ﴾

(البقرۃ: ۱۲۹)

''پروردگار! ان لوگوں میں اٹھائیو ایک رسول خود انہی میں سے جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک کرے۔''

یہاں پر یہ نکتہ لائقِ توجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اس دعا میں تعلیمِ کتاب و حکمت کا ذکر پہلے کیا اور تزکیہ کو آخر پر رکھا' لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے ان ہی چار امور کا ذکر خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو ترتیب بدل دی۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے تین مقامات (البقرۃ: ۱۵۱' آل عمران: ۱۶۴' الجمعۃ: ۲) پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان ذمہ داریوں کا ذکر کیا اور تینوں مقامات پر تزکیہ کا ذکر تعلیمِ کتاب و حکمت سے پہلے کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص قرآن مجید کی روحِ باطنی تک رسائی کا طالب ہو اُسے چاہیے کہ وہ اپنے دل کو تکبّر' حسد' حُبِّ دُنیا سمیت تمام خباثتوں سے پاک کرے' ورنہ قرآن مجید کا نُور اس کے باطن میں کبھی سرایت نہیں کرے گا اور نہ ہی اس کا اصل فہم اس پر کبھی منکشف ہوگا' اگرچہ بظاہر وہ قرآن کا بہت بڑا مفسّر ہی کیوں نہ بن جائے۔ تزکیۂ باطن کے حوالے سے یہاں سورۂ یونس کی آیت ۵۷ کا پیغام بھی ذہن میں تازہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کو انسانی دل کی تمام باطنی اَمراض کے لیے شفا قرار دیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾﴾

''اے لوگو! آ گئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے اور تمہارے سینوں (کے اَمراض) کی شفا اور اہلِ ایمان کے لیے ہدایت اور (بہت بڑی) رحمت۔''

آیت ۸۰ ﴿تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾﴾ ''اس کا اُتارا جانا ہے ربّ العالمین کی جانب سے۔''

اور اس کے بعد اب یہ چبھتا ہوا سوال (piercing question) پوچھا جا رہا ہے:

آیت ۸۱ ﴿اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿۸۱﴾﴾ ''تو کیا تم لوگ اس کتاب کے بارے میں مداہنت کر رہے ہو؟''

اس آیت کا مفہوم ہمیں تب سمجھ آئے گا جب ہم میں سے ہر ایک خود کو اس کا مخاطب سمجھے کہ یہ آیت براہِ راست اس سے پوچھ رہی ہے کہ اے اللہ کے بندے! کیا تم اپنے دُنیوی معاملات و مفادات کو اللہ کی اس نعمت کے مقابلے میں ترجیح دے رہے ہو؟ کیا تم اس عظیم کتاب کو سیکھنے سکھانے اور سمجھنے میں سستی اور کاہلی کا مظاہرہ کر رہے ہو؟ ذرا سوچو تو! تم نے کیسے کیسے مشکل علوم و فنون میں مہارت حاصل کر لی ہے۔ ان علوم کو سیکھنے کے لیے تم نے کیسی کیسی محنت کی ہے اور کتنا وقت کھپایا ہے! اس کے مقابلے میں قرآنی زبان سیکھنے کے لیے تم نے کتنی کوشش کی ہے؟ تو کیا تم نے اپنی دنیا کے لیے اللہ تعالیٰ کی اس قدر عظیم نعمت کو پسِ پشت ڈالنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟

آیت ۸۲ ﴿وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۸۲﴾﴾ ''اور تم نے اپنا نصیب یہ ٹھہرا لیا ہے کہ تم اس کو جھٹلا رہے ہو!''

اس حوالے سے یہ نکتہ بھی یاد رکھیں کہ قرآن کا جھٹلانا ایک تو زبانی ہے اور دوسرا عملی۔ زبانی اور نظریاتی طور پر تو قرآن مجید کو مشرکینِ عرب جھٹلاتے تھے یا ہر زمانے کے بہت سے غیر مسلم جھٹلاتے ہیں کہ یہ اللہ کا کلام نہیں بلکہ خود محمد (ﷺ) کی تصنیف ہے۔ جبکہ عملی طور پر اسے ہم مسلمان جھٹلاتے ہیں۔ ہم نظریاتی طور پر تو اسے اللہ کا کلام مانتے ہیں اور زبان سے اس کا اقرار بھی کرتے ہیں مگر اس کے احکام ماننے سے کھلم کھلا اعراض کرتے ہیں۔ ہماری اس کیفیت کی مثال اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے حوالے سے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ﴾ (الجمعۃ:۵) کہ جو لوگ حاملِ تورات بنائے گئے اور پھر انہوں نے اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا' ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو۔ اگر آپ ایک گدھے پر مکالماتِ افلاطون اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی تمام جلدیں لاد دیں تو ان کتابوں کو اٹھا لینے سے وہ ان کا عالم تو نہیں بن جائے گا۔ اس آیت کی روشنی میں یہودیوں کے طرزِ عمل کا جائزہ لیں تو انہوں نے زبان سے کبھی تورات کی تکذیب نہیں کی' بلکہ وہ ابھی تک اسے اپنے سینوں سے لگائے بیٹھے ہیں۔ اس لیے قرآن مجید نے مذکورہ آیت میں ان کی جس تکذیب کا ذکر کیا ہے وہ عملی تکذیب ہے۔ بالکل اسی طرح ہم بھی آج قرآن مجید کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں' لیکن عملی طور پر اس کے احکام کی تعمیل سے روگردانی کر کے مذکورہ بالا مثال کے مصداق بنے ہوئے ہیں۔ ایک حدیث کے مطابق تو ہمارے اس طرزِ عمل سے قرآن مجید پر ہمارے زبانی ایمان کی بھی تکذیب ہوتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((مَا آمَنَ بِالْقُرْآنِ مَنِ اسْتَحَلَّ مَحَارِمَهُ)) [۳] ''جس نے قرآن کی حرام کردہ اشیاء کو اپنے لیے حلال ٹھہرا لیا اس کا قرآن پر کوئی ایمان نہیں۔''

قرآن مجید کی اس عملی تکذیب کے علاوہ آج ہم مسلمان اس کی ''تکذیبِ حالی'' کے بھی مرتکب ہو رہے ہیں۔ تکذیبِ حالی یہ

۳۔ سنن الترمذی' کتاب فضائل القرآن' باب ما جاء فیمن قرأ حرفًا من القرآن ماله من الاجر' ح: ۲۹۱۸۔ والمعجم الاوسط للطبرانی: ۳۳۷/۴۔

ہے کہ کسی شخص کا حال اس حقیقت کی گواہی دے رہا ہو کہ اس کے نزدیک فلاں چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ قرآن مجید کے حوالے سے اپنی تکذیبِ حالی کو سمجھنے کے لیے آپ اپنے ہاں کے ایک عام ڈاکٹر کی مثال لے لیں۔ اس نے رات دن ایک کر کے پچیس سال کی عمر میں ایم بی بی ایس کیا۔ پھر FRCS کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد وہ امریکہ گیا' وہاں جا کر امتحان دیا۔ وہاں کے بورڈز سے یہ ڈپلومہ وہ ڈپلومہ.....! اس پڑھائی میں اُس نے اپنی زندگی کے پینتیس چالیس سال کھپا دیے۔ اس کے بعد وہیں ملازمت اختیار کر لی..... واپس آ کر اپنی ملازمت اور پریکٹس میں کولہو کے بیل کی طرح جُت گیا۔ مشن کیا ہے؟ معاش اچھی ہو جائے اور معیارِ زندگی بلند ہو جائے۔ یہ مشن تو اُس نے حاصل کر لیا' لیکن اپنی زندگی کے ماہ و سال میں سے اُس نے قرآن مجید سیکھنے کے لیے کوئی وقت نکالا اور اس کے لیے کوئی محنت کی؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے تو اس کا حال گویا چیخ چیخ کر گواہی دے رہا ہے کہ اس شخص کی زندگی میں قرآن مجید کی کوئی اہمیت نہیں۔ اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کے بارے میں یقین نہیں۔

یاد رہے کہ سورۃ الرحمٰن کی ابتدائی آیات میں قرآن مجید کے حقوق ادا کرنے کی ترغیب مثبت انداز میں دلائی گئی تھی' جبکہ یہاں سورۃ الواقعہ کے اختتام پر اسی ترغیب کے لیے منفی انداز اپنایا گیا ہے۔ یعنی سورۃ الرحمٰن کی چار ابتدائی آیات کے بین السطور میں یہ پیغام مضمر تھا کہ اگر رحمٰن نے اپنا کلام ''قرآن'' تمہارے پاس بھیجا ہے اور تمہیں ''بیان'' کی صلاحیت سے بھی نوازا ہے تو تمہاری اس طلاقتِ لسانی کا بہترین اور لازمی مصرف یہی ہے کہ تم اس صلاحیت کو قرآن کے لیے وقف کر دو۔ جبکہ یہاں سورۃ الواقعہ کی ان آیات میں یہ تنبیہہ مضمر ہے کہ جو لوگ قرآن کے حقوق کما حقہٗ ادا نہیں کرتے آخرت میں انہیں اس کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا اور کوتاہی ثابت ہونے پر ان کی سخت گرفت ہوگی۔

آیات ۸۳ تا ۹۶

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ﴿۸۳﴾ وَ اَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا
تُبْصِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴿۸۶﴾ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَاَمَّآ اِنْ كَانَ
مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۸۸﴾ فَرَوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ ۙ وَّ جَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴿۸۹﴾ وَ اَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۹۰﴾
فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۹۱﴾ وَ اَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۹۲﴾ فَنُزُلٌ مِّنْ
ع حَمِيْمٍ ﴿۹۳﴾ وَّ تَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ﴿۹۴﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿۹۵﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۹۶﴾

جیسا کہ قبل ازیں بھی بار بار ذکر ہوا ہے کہ سورۃ الرحمٰن اور سورۃ الواقعہ باہم جوڑا ہیں اور ان کے مضامین بھی باہم مشابہ و مربوط ہیں۔ البتہ زیر مطالعہ آیات کا مضمون صرف اسی سورت میں آیا ہے۔ اس کے مقابل سورۃ الرحمٰن میں ایسا کوئی مضمون نہیں ہے۔ گویا یہ مضمون اس سورۃ کی اضافی شان ہے۔

آیت ۸۳ ﴿فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ﴿۸۳﴾﴾ ''تو کیوں نہیں' جب جان حلق میں آ (کر پھنس) جاتی ہے۔''

آیت ۸۴ ﴿وَ اَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ﴿۸۴﴾﴾ ''اور تم اُس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو۔''

ان آیات میں ایک انسان کے وقتِ نزع کی کیفیت کا عبرت انگیز نقشہ پیش کر کے دعوتِ فکر دی گئی ہے کہ ذرا سوچو! جب تم میں سے کسی کی جان حلق میں پھنسی ہوتی ہے۔ تم اُس وقت کا تصور کرو جب تم میں سے کسی کے بیٹے' کسی کے بھائی' کسی کے والد' کسی کی والدہ یا کسی کی بیوی پر نزع کا عالم طاری ہوتا ہے اور وہ بے بسی کی تصویر بنے اپنے اس عزیز کی اس کیفیت کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔

آیت ۸۵ ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴿۸۵﴾﴾ ''اور ہم تمہارے مقابلے میں اس سے قریب تر ہوتے ہیں لیکن تم دیکھ نہیں پاتے۔''

یہ تو تخصیص کے ساتھ عالمِ نزع کی کیفیت کا ذکر ہے' لیکن اس کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ ہر وقت ہر بندے کے ساتھ ہوتا ہے' جیسا کہ سورۂ قٓ میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿۱۶﴾﴾ ''اور ہم تو انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہوتے ہیں۔''

آیت ۸۶ ﴿فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴿۸۶﴾ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۸۷﴾﴾ ''تو اگر تم کسی کے اختیار میں نہیں ہو' تو اس (جان) کو لوٹا کیوں نہیں لیتے اگر تم سچے ہو؟''

یہاں الفاظ کی ترتیب اس طرح ہے کہ ان دونوں آیات کو ملانے سے ایک فقرہ مکمل ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے خصوصی اسلوب کی وجہ سے لَوْلَا پہلی آیت کے شروع میں آ گیا ہے' لیکن اس کا مفہوم دوسری آیت کے ساتھ ملنے سے واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ مفہوم کی وضاحت کے لیے یوں سمجھیں کہ ان دونوں آیات میں الفاظ کی اصل ترتیب یوں ہے: فَاِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ' لَوْلَا تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ؟ کہ تم لوگ آئے دن اپنے عزیز و اقارب کی اموات کا مشاہدہ کرتے رہتے ہو۔ تم میں سے جب کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو تم سب مل کر بھی اور اپنے تمام وسائل استعمال میں لا کر بھی اس کو بچا نہیں پاتے ہو۔ اس معاملے میں تمہارے بڑے بڑے صاحبِ اختیار و اقتدار لوگ بھی بالکل بے بس ہو جاتے ہیں۔ شاہی اطباء اور ماہر ڈاکٹرز کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں اور بادشاہ سلامت ان کی آنکھوں کے سامنے لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ تم لوگ دعویٰ کرتے ہو کہ تم خود ہی پیدا ہوتے ہو اور خود ہی مرتے ہو اور تمہاری زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں نہیں ہے۔ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو اپنے پیاروں کو موت کے مُنہ میں جاتے دیکھ کر بے بسی کی تصویر بن کر کیوں رہ جاتے ہو؟ اپنے وسائل کو استعمال میں لا کر انہیں بچا کیوں نہیں لیتے ہو؟

اس کے بعد اگلی آیات میں ان تین گروہوں کی جزا و سزا کا تذکرہ ہے جن کا ذکر سورۃ کے آغاز میں ہوا تھا۔

آیت ۸۸ ﴿فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۸۸﴾﴾ ''پھر اگر وہ مقربین میں سے تھا۔''

یعنی اگر مرنے والا شخص سابقون میں سے تھا۔ اپنی زندگی میں ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ﴾ (المائدۃ:۴۸) کے حکم پر عمل کرتے ہوئے نیکی اور بھلائی کے کاموں میں مسابقت کرتے ہوئے دوسروں کے لیے مثال بنا رہا تھا:

آیت ۸۹ ﴿فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴿۸۹﴾﴾ ''تو اُس کے لیے راحت اور سرور اور نعمتوں والی جنت ہے۔''

آیت ۹۰ ﴿وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۹۰﴾﴾ ''اور اگر وہ اصحاب الیمین میں سے تھا۔''

اگرچہ وہ 'سابقون' میں سے تو نہیں تھا لیکن نیک تھا اور دین کی خدمت میں حسبِ استطاعت کوشاں رہتا تھا:

آیت ۹۱ ﴿فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۹۱﴾﴾ ''تو سلامتی پہنچے آپ کو اصحاب الیمین کی طرف سے۔''

اے نبی ﷺ! آپ اطمینان رکھیں کہ آپ کی اُمت کے اصحابُ الیمین بھی عیش میں ہوں گے اور جنّت کی ان نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے جن کا ذکر سورۃ کے آغاز میں ہو چکا ہے۔ (۴)

آیت ۹۲ ﴿وَاَمَّآ اِنۡ كَانَ مِنَ الۡمُكَذِّبِيۡنَ الضَّآلِّيۡنَ ﴿۹۲﴾﴾ ''اور اگر وہ تھا جھٹلانے والوں اور گمراہوں میں سے۔''

یہاں یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ قبل ازیں دوسرے رکوع میں جب اس گروہ کا ذکر ہوا تو وہاں ان لوگوں کو ''اَيُّهَا الضَّآلُّوۡنَ الۡمُكَذِّبُوۡنَ'' کہہ کر مخاطب فرمایا گیا تھا' لیکن یہاں پر انہیں ''الۡمُكَذِّبِيۡنَ الضَّآلِّيۡنَ'' کہا گیا ہے۔ یعنی یہاں پر الفاظ کی ترتیب بدل گئی ہے۔ بظاہر اس کی توجیہہ یہ سمجھ آتی ہے کہ سزا کے حوالے سے ان کے بڑے اور اصل جرم کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔ حق کو جھٹلا دینے کے مقابلے میں گمراہی نسبتاً چھوٹا جرم ہے' کیونکہ کسی گمراہ اور بھٹکے ہوئے شخص کو اگر کوئی سیدھا راستہ دکھا دے تو ممکن ہے وہ اسے قبول کر لے' لیکن جو حق کو جھٹلا دے اس کا سیدھے راستے پر گامزن ہونا ممکن نہیں۔

آیت ۹۳ ﴿فَنُزُلٌ مِّنۡ حَمِيۡمٍ ﴿۹۳﴾﴾ ''تو اُس کے لیے مہمانی ہے کھولتے پانی سے۔''

آیت ۹۴ ﴿وَّتَصۡلِيَةُ جَحِيۡمٍ ﴿۹۴﴾﴾ ''اور جہنّم میں جلنا۔''

یعنی ان لوگوں کی ابتدائی تواضع تو کھولتے ہوئے پانی سے ہوگی۔ اس کے بعد ان کو جہنّم کے اصل عذاب میں جھونک دیا جائے گا۔

آیت ۹۵ ﴿اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الۡيَقِيۡنِ ﴿۹۵﴾﴾ ''یقیناً یہ سب کچھ قطعی حق ہے۔''

بے شک یہ ساری باتیں سچی اور یقینی ہیں۔ یہ سب تفصیلات جو اس سورت میں بیان ہوئی ہیں ان کے بارے میں تمہیں یقین ہونا چاہیے کہ یہ سب کچھ ہو کر رہنا ہے۔ قیامت کے دن تمام نوعِ انسانی کو مذکورہ بالا تین گروہوں میں تقسیم کر کے ہر گروہ کے افراد کو ان کے اعمال و اعتقادات کے مطابق بدلہ دیا جانا ہے۔

آیت ۹۶ ﴿فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الۡعَظِيۡمِ ﴿۹۶﴾﴾ ''پس آپ تسبیح کیجیے اپنے رب کے نام کی جو کہ بہت عظمت والا ہے۔''

اس کے جواب میں امتثالِ امر کے طور پر کہا جائے گا: سُبۡحَانَ رَبِّيَ الۡعَظِيۡمِ! یہ آیت اس سورت میں دو مرتبہ آئی ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے فرمایا: ((اِجۡعَلُوۡهَا فِيۡ رُكُوۡعِكُمۡ)) (۵) کہ اس کو تم لوگ اپنے رکوع میں رکھ دو۔ چنانچہ حضور ﷺ کے اس فرمان کے مطابق رکوع کی تسبیح سُبۡحَانَ رَبِّيَ الۡعَظِيۡمِ اس آیت سے اخذ کی گئی ہے۔

۴۔ اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی لیا گیا ہے کہ اصحابِ یمین کی طرف سے اُس کا استقبال کیا جائے گا اور اُسے سلام کہا جائے گا۔ جب کہ بعض مفسّرین نے اس جملے میں اَنۡتَ محذوف مانا ہے۔ یعنی تقدیرِ عبارت یوں ہے: فسلم لک انت من اصحٰب الیمین کہ تیرے لیے اب سلامتی ہی سلامتی ہے' تُو اصحابِ یمین میں شامل ہے! (حاشیہ از مرتّب)

۵۔ سنن ابی داؤد' کتاب الصلاۃ' باب ما یقول الرجل فی رکوعہ وسجودہ' ح: ۸۶۹ وصحیح ابن حبّان' ح: ۱۸۹۸ — اسی طرح جب آیت ﴿سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّكَ الۡاَعۡلَى ﴿۱﴾﴾ (الاعلیٰ) نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((اِجۡعَلُوۡهَا فِيۡ سُجُوۡدِكُمۡ)) کہ اس کو تم لوگ اپنے سجدوں میں رکھ دو۔

سُوْرَۃُ الْحَدِیْدِ

تمہیدی کلمات

سورۃ الحدید سے قرآن حکیم کی مکّی مدنی سورتوں کے چھٹے گروپ کی مدنی سورتوں کے سلسلے کا آغاز ہو رہا ہے جو سورۃ التحریم پر اختتام پذیر ہوگا۔ اس ضمنی گروپ میں دس مدنی سورتیں ہیں۔ ان سورتوں کا حجم تقریباً سوا پارے کے برابر ہے‘ لیکن تعداد کے اعتبار سے یہ پورے قرآن میں مدنی سورتوں کا سب سے بڑا گلدستہ ہے۔ اس حوالے سے پہلے پانچ گروپس کی مدنی سورتوں کی ترتیب کو ایک دفعہ پھر سے ذہن میں تازہ کر لیں۔ پہلے گروپ میں سورۃ البقرۃ‘ سورۂ آل عمران‘ سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ چار مدنی سورتیں ہیں جو تقریباً سوا چھ پاروں پر پھیلی ہوئی ہیں اور حجم کے اعتبار سے یہ مدنی قرآن کا سب سے بڑا گلدستہ ہے۔ اس کے بعد دوسرے گروپ میں سورۃ الانفال اور سورۃ التوبہ دو مدنی سورتیں ہیں۔ پھر تیسرے اور چوتھے گروپ میں صرف ایک ایک مدنی سورت ہے‘ یعنی تیسرے گروپ میں سورۃ النور اور چوتھے گروپ میں سورۃ الاحزاب۔ جبکہ پانچویں گروپ میں سورۂ محمدؐ‘ سورۃ الفتح اور سورۃ الحجرات تین مدنی سورتیں ہیں۔

زیر مطالعہ گروپ کی ان مدنی سورتوں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سے پانچ سورتوں کا آغاز سَبَّحَ لِلّٰہِ یا یُسَبِّحُ لِلّٰہِ سے ہوتا ہے۔ یعنی ان کے آغاز میں اللہ کی تسبیح کا ذکر فعل ماضی میں بھی ہے اور فعل مضارع میں بھی۔ عربی کا فعل مضارع چونکہ حال اور مستقبل دونوں زمانوں کے معنی دیتا ہے اس لیے ماضی اور مضارع کے ان دو صیغوں سے گویا پورے زمانے کا کُلّی طور پر احاطہ ہو گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین کے اندر جو چیز بھی ہے اس نے ہمیشہ اللہ کی تسبیح بیان کی ہے‘ ہر چیز اب بھی اُس کی تسبیح بیان کر رہی ہے اور آئندہ بھی ہمیشہ اس کی تسبیح کرتی رہے گی۔ ان سورتوں کے آغاز کے اس مضمون کی مناسبت سے انہیں اَلْمُسَبِّحَات کا نام دیا گیا ہے۔ بعض لوگ سورۃ الاعلیٰ کو بھی اَلْمُسَبِّحَات کے اس گروپ میں شامل کرتے ہیں‘ لیکن یہ سورت اس لحاظ سے ان سے مختلف ہے کہ اس کے آغاز میں تسبیح کا صیغہ فعل امر ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى ۝۱﴾ یعنی حکم کی صورت میں آیا ہے۔ اب تک کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ مکّی مدنی سورتوں کے زیر مطالعہ (چھٹے) گروپ میں دس مدنی سورتیں ہیں جن میں سے پانچ اَلْمُسَبِّحَات ہیں اور سورتوں کی تعداد کے اعتبار سے یہ مدنی سورتوں کا سب سے بڑا گلدستہ ہے۔

ان مدنی سورتوں کے بارے میں تیسری اہم بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ یہ سب سورتیں (سوائے سورۃ التغابن کے) آنحضور ﷺ کے مدنی دور کے نصف آخر میں یعنی سن ۵ ہجری کے بعد نازل ہوئیں۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمانوں کی صفوں میں جوشِ جہاد‘ ذوقِ شہادت‘ جذبۂ انفاق وغیرہ کے حوالے سے بحیثیت مجموعی ضعف و اضمحلال کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ اس کا مطلب‘ معاذ اللہ‘ یہ ہرگز نہیں کہ ’’السابقون الاوّلون‘‘ کے جذبے میں کوئی کمی آ گئی تھی‘ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اب مسلمانوں کی مجموعی تعداد میں

اکثریت ان لوگوں کی تھی جو ہجرت کے بعد ایمان لائے تھے اور وہ سب لوگ تربیت اور آزمائش و ابتلاء کے ان تمام مراحل سے نہیں گزرے تھے جن کا سامنا مکی دور کے اہلِ ایمان کر چکے تھے۔ چونکہ ابتدائی دور کے مسلمانوں کے مقابلے میں نئے شامل ہونے والوں کی تعداد زیادہ تھی' اس لیے جماعت کے اجتماعی کردار و عمل پر بھی ان ہی کا رنگ غالب تھا۔ ظاہر ہے اس رنگ کے ''اوسط معیار'' کو السابقون الاوّلون کے خصوصی معیار کے پیمانہ سے نہیں پرکھا جا سکتا تھا۔

مسلمانوں کی صفوں میں مذکورہ ضعف کا ذکر سورۃ الانفال کی آیت ۶۶ میں ﴿عَلِمَ اَنَّ فِیْکُمْ ضَعْفًا ؕ﴾ کے الفاظ میں بھی آیا ہے۔ آیات ۶۵' ۶۶ کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے تو ایک مؤمن دس کفار پر بھاری ہو سکتا تھا' لیکن اب چونکہ تم میں کمزوری آ چکی ہے اس لیے اب ہم نے تمہارے مقابلے کے معیار میں بھی نرمی کر دی ہے۔ چنانچہ اب اگر تم اپنے سے دوگنا کفار کا مقابلہ بہادری اور جواں مردی سے کرو گے تو ہم ان پر تم لوگوں کو فتح دیں گے۔ بہرحال مذکورہ کمزوری کے اثرات کے باعث ان سورتوں میں جا بجا مسلمانوں کو جھنجوڑنے اور ان کی گرفت کرنے کا انداز ملتا ہے۔ اس حوالے سے سورۃ الصف کی دوسری آیت کا اسلوب بہت واضح ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۲﴾ ''اے اہلِ ایمان! کیا ہو گیا ہے تمہیں' کیوں کہتے ہو وہ جو کرتے نہیں ہو؟'' زیر مطالعہ سورت یعنی سورۃ الحدید کی اس آیت کا انداز بھی بالکل ایسا ہی ہے: ﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ﴾ (آیت ۸) ''تمہیں کیا ہے' تم اللہ پر پختہ ایمان کیوں نہیں رکھتے؟'' پھر سورۃ الحدید کی اس آیت کا لب و لہجہ بھی ملاحظہ کریں: ﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ (آیت ۱۰) ''تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے؟'' سورۃ الجمعہ کی آخری آیت کا یہ انداز بھی بہت سخت ہے: ﴿وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا ِ انْفَضُّوْۤا اِلَیْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآىِٕمًا ؕ﴾ ''جب انہوں نے دیکھا کسی کاروبار یا کسی اور دلچسپی کی چیز کو تو وہ اس کی طرف لپک گئے اور چھوڑ گئے آپ کو (اے نبی ﷺ!) کھڑے ہوئے۔''

اس سورت میں یقیناً روئے سخن منافقین کی طرف بھی ہے (ان سورتوں میں منافقت کے موضوع پر ایک مکمل سورت (سورۃ المنافقون) بھی موجود ہے اور پھر سورۃ الحدید میں منافقت کے مرض کی علامات سے لے کر تشخیص تک گویا پوری پیتھالوجی بیان ہوئی ہے) لیکن مجموعی طور پر اصل خطاب منافقین سے نہیں بلکہ ''ضُعفاء'' سے ہے۔ یعنی ان میں ان کمزور مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا ہے جو ''ہر چہ باداباد'' کے سے جذبے کے ساتھ ہر حالت اور ہر قیمت پر اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے تقاضوں کو کما حقہ پورا کرنے سے معذور ہیں۔ چنانچہ منافقت یا منافقین کے معاملے میں ان سورتوں کا انداز سورۃ النساء اور سورۃ التوبہ جیسا نہیں ہے' کیونکہ ان دو سورتوں کی متعلقہ آیات میں اصل خطاب ہی منافقین سے ہے' جبکہ زیر مطالعہ سورتوں میں اگر کہیں مسلمانوں کی صفوں کے اندر موجود کمزوری کو موضوع بنایا گیا ہے تو وہاں اصل خطاب ضعفاء سے ہے نہ کہ منافقین سے۔

جہاں تک ایمان کی پختگی اور کمزوری کے حوالے سے اہلِ ایمان کے درمیان انفرادی سطح پر فرق و تفاوت کا تعلق ہے تو یہ ایک فطری بات ہے اور یہ فرق شروع سے تھا۔ جیسا کہ سورۃ التوبہ کی اس آیت میں بیان ہوا ہے:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ (آیت ۱۰۰)

''اور پہلے پہل سبقت کرنے والے مہاجرین اور انصار میں سے' اور وہ جنہوں نے اُن کی پیروی کی نیکوکاری کے ساتھ' اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ ترین درجات پر فائز اہلِ ایمان کے درمیان بھی فرق تھا۔ کچھ لوگ ''السابقون الاوّلون'' تھے اور کچھ وہ تھے جو ان کے نقشِ قدم پر چلے رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ! (اس مضمون کی مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ التوبہ کی آیت ۱۰۰ کی تشریح۔) سورۃ التوبہ کی درج بالا آیت سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ اہل ایمان کے درجات کے فرق کو سمجھنا اور ان کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے: ع ''گر حفظِ مراتب نہ کُنی زندیقی!'' بہرحال جب تک اس فلسفے کو نہیں سمجھا جائے گا نہ ''کمزور مسلمان'' کی اصطلاح سمجھ میں آئے گی اور نہ ہی ان آیات کا مفہوم واضح ہوگا جن میں ''ضُعفاء'' یعنی کمزور مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔

''حفظِ مراتب'' کا یہ فلسفہ آج کل ہم جیسے مسلمانوں کو ''اہلِ ایمان'' کی صفوں میں جگہ دلانے کا جواز اور راستہ بھی فراہم کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم لوگ ''نسلی مسلمان'' ہیں۔ یعنی ہم میں سے اکثر اس لیے مسلمان ہیں کہ ہم مسلمان والدین کے گھر پیدا ہوئے ہیں۔ اس میں ہمارے ارادے، اختیار یا انتخاب کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ہمارا عام مسلمان اپنے حالات اور ماحول کے مطابق اللہ، رسول، آخرت، نماز روزہ وغیرہ کا تعارف تو بچپن میں ہی سیکھ لیتا ہے، لیکن ایمانِ حقیقی اور عمل کے اعتبار سے اس کا دامن خالی ہی رہتا ہے (اِلّا ماشاء اللہ)۔ اس اعتبار سے آج ہم مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا تعلق اس ''مسلمانی'' سے ہے جس کا ذکر سورۃ الحجرات کی اس آیت میں ہوا ہے:

﴿قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَلٰکِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَلَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ﴾ (آیت ۱۴)

''یہ بدو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے ہیں۔ (اے نبی ﷺ!) ان سے کہہ دیجیے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو، بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں (یعنی ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے) جبکہ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

سورۃ الحجرات کے مطالعے کے دوران اس آیت کا پس منظر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ بہرحال جس طرح اس آیت کے مخاطب لوگوں کی اکثریت نے حالات کا رخ دیکھ کر ''حادثاتی'' طور پر اسلام قبول کیا تھا، اسی طرح ہم بھی اپنی پیدائش کے ''حادثے'' کی وجہ سے مسلمان ہیں۔ ہم نے اسلام کو ایک موروثی نظریے کے طور پر تو قبول کیا ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری اکثریت ایمان اور اسلام کے تقاضے پورے کرنے کی فکر سے بالکل ہی لاتعلق ہو چکی ہے (اِلّا ماشاء اللہ)۔ دوسری طرف یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ایسے تمام لوگ حقیقی ایمان سے تہی دامن ہونے کے باوجود منافق نہیں، اس لیے کہ وہ کسی کو دھوکہ دینے کے لیے اسلام نہیں لائے۔ چنانچہ ان سب لوگوں کے بارے میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ وہ ''کمزور مسلمان'' ہیں۔

اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ سب مسلمان ''بحیثیت مسلمان'' برابر نہیں ہیں۔ ایمان کی پختگی اور عمل کے معیار سے ان کے اپنے اپنے درجات ہیں اور ان درجات کے فرق کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ جن لوگوں نے مسلمانوں کے درجات میں پائے جانے والے اس فرق کو نہیں سمجھا انہیں سورۃ الحجرات کی مذکورہ آیت کے بارے میں بھی مغالطہ ہوا ہے کہ اس میں منافقین کا تذکرہ ہے۔ حالانکہ اسی آیت میں آگے ان اسلام قبول کرنے والوں کو یہ ضمانت بھی دی گئی ہے: ﴿وَاِنۡ تُطِیۡعُوا اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ لَا یَلِتۡکُمۡ مِّنۡ اَعۡمَالِکُمۡ شَیۡئًا ؕ﴾ ''اور اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کرتے رہو گے تو تمہارے اعمال میں کچھ بھی کمی نہیں کی جائے گی''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاں وہ مسلمان ہی تھے، کیونکہ منافق کا تو کوئی عمل قابلِ قبول ہے ہی نہیں۔ بلاشبہ ان لوگوں کی صفوں میں منافق بھی تھے لیکن مذکورہ آیت میں خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے جو اگرچہ دیکھا دیکھی مسلمان ہوئے تھے، لیکن اس میں ان کی بدنیتی شامل نہیں تھی۔

آج ہماری غالب اکثریت بلاشبہ ''کمزور مسلمانوں'' پر مشتمل ہے' اس لیے آج ہماری ہدایت کے لیے قرآن کا یہ حصہ (سورۃ الحدید تا سورۃ التحریم) بہت اہم ہے۔ آج کا مسلمان اگر ان دس سورتوں کو سمجھ لے تو اس کا یہ عمل ایسے ہوگا جیسے اس نے پورے قرآن کو سمجھ لیا۔ کیونکہ ان دس سورتوں میں پورے قرآن حکیم کا خلاصہ آ گیا ہے۔ مثلاً منافقت اور منافقین کا تذکرہ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ خصوصاً سورۃ النساء' سورۃ التوبہ اور سورۂ محمد میں یہ مضمون تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ لیکن اس مجموعے میں شامل گیارہ آیات پر مشتمل ایک مختصر سی سورت یعنی سورۃ المنافقون میں اس پورے مضمون کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح ایمان کی بحث سے پورا قرآن بھرا پڑا ہے۔ دو تہائی قرآن مکی سورتوں پر مشتمل ہے اور ان مکی سورتوں میں تذکیر بآلاء اللہ کے علاوہ توحید' رسالت اور آخرت کے موضوعات کے تحت ساری بحث ایمان سے ہی متعلق ہے۔ اس قدر وسیع اور مفصل مضمون کو اس مجموعے کی سورۃ التغابن (۱۸ آیات) میں سمو دیا گیا ہے۔

بہر حال واقعہ یہ ہے کہ ان دس سورتوں میں پورے قرآن کے مضامین کا عطر کشید کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے چھ سورتوں (سورۃ الحدید' سورۃ الصف' سورۃ الجمعہ' سورۃ المنافقون' سورۃ التغابن اور سورۃ التحریم) کو ہم نے اپنے منتخب نصاب میں شامل کیا ہے۔ جہاں تک سورۃ الحدید کے تعارف کا تعلق ہے' یہ بہت جامع اور بہت بلند مرتبہ سورت ہے۔ اَلْمُسَبِّحَات میں ممتاز مقام کی وجہ سے اسے اُمُّ الْمُسَبِّحَات کہا جاتا ہے۔ ہمارے منتخب نصاب کا حصہ ششم اسی سورت کے ۷ دروس پر مشتمل ہے۔ میں اکثر تحدیثِ نعمت کے طور پر ذکر کیا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے اس سورت کا خصوصی فہم اور انشراح عطا فرمایا ہے' بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص مہربانی سے مجھے یہ سورت عطا فرما دی ہے۔ پچھلی نصف صدی سے اس پر میرا غور و فکر جاری ہے اور میں نے اس پر بہت طویل اور مفصل دروس بھی دیے ہیں۔ بہر حال اس مضمون کے لیے یہ سطور زیادہ تفصیل کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ اس سورت پر میرے سلسلہ وار دروس کی آڈیو وڈیو ریکارڈنگ موجود ہے۔ مفصل دروس کی ریکارڈنگ ۱۵ گھنٹے پر مشتمل ہے' جبکہ نسبتاً مختصر دروس کا دورانیہ چھ گھنٹے ہے۔ مزید تفصیل جاننے کے خواہش مند حضرات میرے ان دروس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ [1]

آیات ۱ تا ۶

سُوْرَةُ الْحَدِيْدِ مَدَنِيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۲۹ رُكُوْعَاتُهَا: ۴

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ ۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۳ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ؕ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ

۱۔ محترم ڈاکٹر صاحبؒ کے متذکرہ بالا دروس کی ترتیب و تدوین کے بعد انہیں ۳۶۸ صفحات پر مشتمل کتاب بعنوان ''اُمّ المُسبّحات یعنی سورۃ الحدید کی مختصر تشریح'' کی صورت میں مکتبہ خدام القرآن لاہور نے شائع کیا ہے۔ (مرتب)

مَا يَعْرُجُ فِيْهَا ؕ وَ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ؕ وَهُوَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

آیت ۱ ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ﴾ ''تسبیح کرتی ہے اللہ کی ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔''

ان سورتوں (اَلْمُسَبِّحَات) کا یہ مضمون بہت اہم ہے۔ آگے چل کر سورۃ الحشر اور سورۃ الصف میں یہ آیت ''مَا فِیْ'' کے اضافے کے ساتھ اس طرح آئے گی: ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ﴾ اور پھر سورۃ الجمعہ اور سورۃ التغابن میں مزید پُرزور انداز میں فعل مضارع کے ساتھ یوں آئے گا: ﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾۔ کائنات کی ہر چیز کس طرح اللہ کی تسبیح کرتی ہے؟ اس کی ایک صورت تو ''تسبیح حالی'' کی ہے جو ہماری سمجھ میں آتی ہے کہ ہر چیز اپنی زبانِ حال سے اللہ کی تسبیح کر رہی ہے۔ اس کی مثال ایک تصویر ہے جو اپنے مصور کے کمالِ فن یا عدمِ مہارت پر دلالت کرتی ہے۔ چنانچہ جس طرح ایک خوبصورت تصویر زبانِ حال سے اپنے مصور کی تعریف کرتی نظر آتی ہے اسی طرح اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ اپنے وجود سے گواہی دے رہا ہے کہ میرا پیدا کرنے والا' میرا صانع' میرا خالق' میرا مصور ہر عیب سے پاک' ہر نقص سے بالا اور ہر لحاظ سے کامل و اکمل ہے' اُس کے علم' اُس کی قدرت اور اُس کی حکمت میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہے۔ دوسری صورت ''زبانی تسبیح'' کی ہے جو کہ خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔ سورۂ حٰمٓ السّجدۃ کی آیات ۲۰ اور ۲۱ میں قیامت کے اس منظر کا ذکر ہے جب انسانوں کے اعضاء ان کے خلاف گواہی دے رہے ہوں گے۔ اس پر وہ لوگ حیرت سے اپنی کھالوں سے پوچھیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی؟ جواب میں ان کی کھالیں کہیں گی: ﴿اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (آیت ۲۱) کہ آج اُس اللہ نے ہمیں بھی زبان دے دی ہے جس نے ہر شے کو زبان دی ہے۔ اس کے علاوہ سورۂ بنی اسرائیل کی اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اپنی تسبیح کے لیے ایک طریقہ تفویض کر رکھا ہے:

﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ﴾ (آیت ۴۴)

''اُسی کی تسبیح میں لگے ہوئے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور (وہ تمام مخلوق بھی) جو ان میں ہے۔ اور کوئی چیز نہیں مگر یہ کہ وہ تسبیح کرتی ہے اُس کی حمد کے ساتھ' لیکن تم نہیں سمجھ سکتے ان کی تسبیح کو۔''

بہرحال کائنات کی ہر چیز اپنی زبانِ حال سے بھی اللہ کی تسبیح کر رہی ہے اور اللہ کی عطا کردہ اپنی مخصوص زبان سے بھی اس کی تعریف و توصیف میں مشغول و مصروف ہے۔ اس کے علاوہ اس کی تسبیح کی اور صورتیں بھی ہو سکتی ہیں جو کہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔

﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾ ''اور وہ بہت زبردست ہے' کمال حکمت والا۔''

ان سورتوں میں اللہ تعالیٰ کے یہ دو اسماء اکٹھے ایک ساتھ بہت تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ اسمائے حُسنیٰ کا یہ جوڑا معنوی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ العزیز وہ ہستی ہے جس کا اختیار مطلق ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ انسانی سطح پر مطلق العنانیت کا تجربہ ہمیشہ بہت تلخ رہا ہے۔ عملی طور پر ہمارے ہاں ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ جہاں مطلق العنانیت آتی ہے' وہاں اختیارات کا ناجائز استعمال ضرور ہوتا ہے۔ بلکہ

پولیٹیکل سائنس کا تو اس حوالے سے آزمودہ فارمولا یہ ہے:

"Authority tends to corrupt and absolute authority corrupts absolutely."

چنانچہ جب کسی ملک کا آئین بنایا جاتا ہے اور معاشرے کے لیے قوانین وضع کیے جاتے ہیں تو متعلقہ ماہرین کی ساری کوشش اختیارات کو مشروط کرنے اور ان میں توازن قائم کرنے پر مرکوز ہوتی ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ ایسی صاحبِ اختیار ہستی ہے جس کے اختیارات کی نہ تو کوئی حد ہے اور نہ ہی اس کے اختیارات کسی شرط سے مشروط ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ''الحکیم'' بھی ہے۔ وہ اپنے مطلق اختیارات میں خود ہی اپنی حکمت سے توازن قائم رکھتا ہے۔ چنانچہ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ زبردست ہے' وہ اپنی تمام مخلوقات پر غالب ہے' اس کے اختیارات مطلق ہیں' لیکن اس کا کوئی کام' اس کا کوئی عمل اور اس کا کوئی فیصلہ حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

آیت ۲ ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ﴾ ''اُسی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی۔''

آیت کے آغاز میں جو حرفِ جار ''ل'' آیا ہے یہ تملیک کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور استحقاق کے لیے بھی۔ یعنی آسمانوں اور زمین کی بادشاہی de facto بھی اُسی کی ہے اور de jure بھی —— اُسی کو حاکمیت کا حق پہنچتا ہے اور بالفعل بھی وہی حاکم ہے۔ اُسی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ مالک ہو اور بالفعل بھی وہی مالک ہے۔

اس سورۂ مبارکہ میں دین کا ذکر خصوصی طور پر بطور ایک نظام کے کیا گیا ہے اور یہ نظام صرف حکومتِ الٰہیہ کے زیر سایہ ہی قائم ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی ایسی صفات بار بار نمایاں کی گئی ہیں جن کا تعلق طاقت' حکومت' قدرت اور اختیار سے ہے۔

﴿يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲﴾ ''وہی زندہ رکھتا ہے' وہی مارتا ہے۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

اس سورۂ مبارکہ کی پہلی چھ آیات پورے قرآن حکیم میں اس اعتبار سے منفرد و ممتاز ہیں کہ ان میں اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کا ذکر فلسفے اور منطق کی سطح پر جامع ترین انداز میں ہوا ہے۔ لیکن ظاہر ہے یہ موقع ایسی تفصیلات میں جانے کا نہیں۔

آیت ۳ ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ﴾ ''وہی اوّل ہے' وہی آخر ہے' وہی ظاہر ہے' وہی باطن ہے۔''

ایک انسان کے لیے اس کیفیت کو سمجھنا یقیناً مشکل ہے کہ ہر زمان' ہر مکان اگر وہ ہی وہ ہے تو پھر باقی سب کیا ہے۔ غالبؔ نے اس صورتِ حال سے متعلق انسانی حیرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے: ؎

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود　　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

اس آیت کے بارے میں امام رازیؒ کا درج ذیل قول بہت فکر انگیز ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اس آیت کو پڑھ کر وہ جلالِ ذات کے رعب کے باعث ساکت و ششدر رہ گئے ہیں۔ لکھتے ہیں: اِعْلَمْ اَنَّ هٰذَا الْمَقَامَ مَقَامٌ غَامِضٌ عَمِيْقٌ مُهِيْبٌ ''جان لو کہ یہ بہت مشکل' بہت گہرا اور بڑا پُرہیبت مقام ہے!'' اس کی حقیقت کا سمجھنا آسان کام نہیں ہے۔ گویا بقول شاعر ع ''ہشدار کہ رہ بردمِ تیغ است قدم را!'' اس راستے پر خبردار ہو کر چلنا' اب تمہارا پاؤں تلوار کی دھار پر آ گیا ہے!

صوفیاء نے ''وحدت الوجود'' کا فلسفہ اسی آیت سے اخذ کیا ہے' لیکن یہ فلسفے کا بھی مشکل ترین مسئلہ ہے۔ ''وحدت الوجود'' کی تعبیر میں کچھ لوگوں نے ''ہمہ اوست'' کا تصور گھڑا ہے جس کے کفر و شرک ہونے میں کسی اہلِ علم کو اختلاف نہیں ہے۔ بہرحال ''وحدت

الوجود'' کے بارے میں یہ حقیقت بھی واضح رہنی چاہیے کہ یہ عام لوگوں کی سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ البتہ میں نے اپنے مذکورہ دروس میں اپنی حد تک اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم (۱۸۹۶۔ ۱۹۸۴ء) سے مجھے اپنی اس وضاحت کی سند بھی مل چکی ہے۔ ایک مرتبہ اسی سورت کے میرے ایک درس میں پروفیسر صاحب بھی موجود تھے۔ درس کے بعد مجھ سے کہنے لگے کہ اس ''وحدت الوجود'' کے مسئلے کو پڑھتے پڑھاتے اور سمجھتے سمجھاتے مجھے پچاس برس ہو گئے ہیں' لیکن آپ نے اس ایک درس میں اسے جس انداز میں واضح کیا ہے میں آج تک نہیں کر سکا۔ یہاں ان سطور میں اس مسئلے کی وضاحت کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ تفصیل معلوم کرنے کے خواہش مند حضرات سورۃ الحدید پر میرے متعلقہ دروس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ بہر حال اس آیت کا آسان مفہوم یہ ہے کہ یہ کائنات ''حادث'' ہے۔ ایک وقت تھا جب یہ موجود نہیں تھی اور جب یہ موجود نہیں تھی اُس وقت کون موجود تھا؟ ظاہر ہے اللہ اُس وقت بھی موجود تھا۔ تو اس کائنات کا آغاز کہاں سے ہوا؟ اللہ سے! پھر ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب اس کائنات میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿٢٦﴾﴾ (الرحمٰن) ''جو کوئی بھی اس (زمین) پر ہے فنا ہونے والا ہے۔'' تو جب یہ سب کچھ نہیں رہے گا تو اُس وقت کون موجود ہو گا؟ ﴿وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ﴿٢٧﴾﴾ (الرحمٰن) ''اور باقی رہے گا صرف تیرے رب کا چہرہ جو بہت بزرگی والا اور بہت عظمت والا ہے۔'' تو جب کچھ نہیں رہے گا تو اللہ اُس وقت بھی موجود ہو گا۔ تو پھر ''آخر'' کون ہوا؟ ظاہر ہے کہ اللہ! اب یوں سمجھیں کہ اوّل اور آخر کے مابین ظاہر بھی وہ ہے اور باطن بھی وہ ہے۔

اس مشکل مضمون کو درج ذیل حدیث نے عام لوگوں کے لیے آسان کر دیا ہے۔ حضور ﷺ اکثر یہ دعا کیا کرتے تھے:

((اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمَاوَاتِ وَرَبَّ الْاَرْضِ وَرَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ فَالِقَ الْحَبِّ وَالنَّوٰى وَمُنْزِلَ التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْفُرْقَانِ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ شَيْءٍ اَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهٖ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الْاٰخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُوْنَكَ شَيْءٌ))[۲]

''اے اللہ آسمانوں اور زمین کے رب! اے عرشِ عظیم کے مالک! اے ہمارے رب اور ہر چیز کے پروردگار! اے دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والے اور تورات' انجیل اور فرقان کو نازل کرنے والے! میں ہر چیز کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں جس کی پیشانی تیرے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اے اللہ! تُو ہی اوّل ہے' پس تجھ سے پہلے کوئی چیز نہ تھی اور تُو ہی آخر ہے' تیرے بعد کوئی چیز نہ ہو گی' اور تُو ہی ظاہر ہے' تجھ سے بالاتر کوئی چیز نہیں' اور تُو ہی ایسا باطن ہے کہ تجھ سے مخفی کوئی چیز نہیں۔''

﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٣﴾﴾ ''اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔''

جب ہر زمان' ہر مکان وہ ہی وہ ہے' وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی تو کائنات کی کوئی ذرّہ بھر چیز بھی اُس سے پوشیدہ کیسے ہو سکتی ہے! بلکہ وہ تو انسان کے دل میں پیدا ہونے والے خیالات سے بھی آگاہ ہے۔ اس حوالے سے سورۂ قٓ کی یہ آیت ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿١٦﴾﴾ ''اور ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم خوب جانتے ہیں جو اُس کا نفس وسوسے ڈالتا ہے' اور ہم تو اُس سے اُس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں''۔ پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے ہر چیز پر قادر (عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ) ہونے کا اعلان ہوا ہے' جبکہ زیر مطالعہ آیت میں اُس کے علمِ کُل کا

۲۔ صحیح مسلم' کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار' باب مایقول عند النوم واخذ المضجع۔

بیان ہے کہ اُسے ہر چیز کا علم ہے (وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ)۔ اللہ تعالیٰ کی یہ دو صفات ایسی ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔

آیت ۴ ﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ؕ﴾ ''وہی ہے جس نے پیدا کیا آسمان اور زمین کو چھ دنوں میں' پھر وہ متمکن ہوا عرش پر۔''

﴿يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ؕ﴾ ''وہ جانتا ہے جو کچھ داخل ہوتا ہے زمین میں اور جو کچھ نکلتا ہے اس سے' اور جو کچھ اترتا ہے آسمان سے اور جو کچھ چڑھتا ہے اس میں۔''

بالکل یہی الفاظ اس سے پہلے سورۂ سبا کی آیت ۲ میں بھی آ چکے ہیں۔ اس فقرے میں بہت سی چیزوں کا احاطہ ہو گیا' مثلاً زمین میں پانی جذب ہوتا ہے' مختلف قسم کے بیج بوئے جاتے ہیں' مُردے دفن ہوتے ہیں۔ اسی طرح آسمان سے بارش نازل ہوتی ہے اور فرشتے احکامِ الٰہی لے کر اُترتے ہیں۔ آسمان کی طرف چڑھنے کی مثال بخارات کی ہے' اور پھر فرشتے بھی فوت ہونے والے انسانوں کی ارواح اور دنیا کے حادثات و واقعات کی رپورٹس لے کر اوپر جاتے ہیں۔

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۴﴾ ''اور تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔''

جو کچھ اچھے یا بُرے اعمال تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ بذاتِ خود ان کا چشم دید گواہ ہے۔

آیت ۵ ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اُسی کی ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی ''بادشاہی'' کے بارے میں تکرار و تاکید کا خصوصی اسلوب ملاحظہ ہو۔ آیت ۲ کے الفاظ ہو بہو یہاں پھر دہرائے گئے ہیں۔ اس مضمون کے حوالے سے یہ نکتہ بھی سمجھنے کا ہے کہ جس طرح اللہ کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں اسی طرح اس کے علاوہ کوئی اور حاکم و مقتدر بھی نہیں۔ چنانچہ جس طرح اللہ کو اکیلے معبود کے طور پر ماننا ضروری ہے' اسی طرح توحید کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اللہ کی زمین پر صرف اُسی کی بادشاہی قائم ہو اور اُس کے تمام احکام عملاً نافذ ہوں۔

﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۵﴾ ''اور تمام معاملات اُسی کی طرف لوٹا دیے جائیں گے۔''

آیت ۶ ﴿يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ؕ﴾ ''وہ پرو لاتا ہے رات کو دن میں اور پرو لاتا ہے دن کو رات میں۔''

یہ مضمون ان ہی الفاظ کے ساتھ قرآن حکیم میں متعدد بار آیا ہے۔

﴿وَهُوَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۶﴾ ''اور وہ جانتا ہے اس کو بھی جو سینوں کے اندر ہے۔''

نوٹ کیجیے! ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے علم کا ذکر بہت تکرار کے ساتھ ہوا ہے' پہلے فرمایا: ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۳﴾ پھر فرمایا: ﴿يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا...﴾ (آیت ۴) اور اب یہاں اس آیت میں بتایا گیا کہ وہ سینوں کے رازوں کا بھی علم رکھتا ہے۔

ان چھ ابتدائی آیات پر مشتمل یہ پُرشکوہ تمہید گویا ایک اعلان ہے کہ خبردار! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم یہ کس کا کلام پڑھ رہے ہو' کس سے ہم کلام ہو رہے ہو! ان تمہیدی آیات میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت' اُس کی قدرت' اُس کی بادشاہی اور خصوصی طور پر اُس

کے علم کا تعارف ہے۔ یہ گویا توحید فی العقیدہ کا بیان ہے۔ توحید کا یہ عقیدہ عملی میدان میں بندوں سے کیا تقاضا کرتا ہے اس کا ذکر اب آگے آ رہا ہے۔ چنانچہ اگلی آیات میں توحید کے دو بنیادی تقاضے بتائے گئے ہیں۔

آیات ۷ تا ۱۱

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۷ وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۸ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۹ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۰ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝۱۱ ع

آیت ۷ ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ﴾ ’’ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر اور خرچ کرو اُن سب میں سے جن میں اُس نے تمہیں خلافت عطا کی ہے۔‘‘

خلافت کے حوالے سے انسان کو سب سے زیادہ اختیار تو اپنے جسم پر عطا کیا گیا ہے۔ اس میں اس کے مختلف اعضاء ہیں‘ طاقتِ جسمانی‘ طلاقتِ لسانی‘ ذہانت و فطانت اور دوسری بہت سی صلاحیتیں ہیں۔ پھر مال و دولت‘ اولاد اور دوسری بے شمار نعمتیں ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کو معبود ماننے کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی ان خداداد صلاحیتوں اور نعمتوں کو اللہ کی رضا کے لیے اس کے راستے میں خرچ کرنے کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہے۔ واضح رہے کہ ’’نفق‘‘ کا لفظ مال و دولت خرچ کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور جان خرچ کر دینے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ نَفَقَتِ الدَّرَاهِم کے معنی ہیں رقم ختم ہو گئی اور نَفَقَ الْفَرَس کے معنی ہیں گھوڑا مر گیا۔ یہاں یہ آیت پڑھتے ہوئے ضروری ہے کہ سورۃ الحجرات کی اس آیت کو بھی ذہن میں تازہ کر لیں:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝۱۵﴾

’’مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اُس کے رسولؐ پر‘ پھر شک میں ہرگز نہیں پڑے اور انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ یہی لوگ ہیں جو (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔‘‘

ان دونوں آیات میں دو دو مطالبات آئے ہیں‘ پہلا مطالبہ دونوں میں مشترک ہے یعنی ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ کہ ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسولؐ پر‘ جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے۔ جبکہ دوسرے مطالبے کے حوالے سے سورۃ الحجرات کی مذکورہ بالا آیت میں جہاد کا ذکر ہے کہ اپنے جان و مال کے ساتھ جہاد کرو‘ اور زیر مطالعہ آیت میں ہر اُس چیز کے انفاق کا حکم ہے جس پر انسان کو خلیفہ بنایا گیا ہے۔

ظاہر ہے اس میں انفاقِ مال بھی شامل ہے اور بذلِ نفس یعنی انفاقِ جان بھی۔

﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۷﴾ ''پس جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور انہوں نے (اپنے مال و جان کو) خرچ کیا' ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔''

جس خوش نصیب نے مذکورہ دونوں مطالبات پورے کر دیے' یعنی اسے یقین والا ایمان بھی نصیب ہو گیا اور اس نے اپنی زیرِ ملکیت ہر چیز کو اللہ کی رضا کے لیے پیش بھی کر دیا تو اس کے گویا وارے نیارے ہو گئے۔ وہ بہت بڑے اجر کا مستحق ٹھہرا ——— مضمون کے حوالے سے یہاں آیات کے ربط و نظم کی خوبصورتی اور مندرجات کی ترتیب ملاحظہ کیجیے کہ پہلے ایک آیت میں دو مطالبات کا ذکر کر کے ان کے بارے میں ترغیب دی گئی ہے۔ اب اس کے بعد ان میں سے ہر مطالبے سے متعلق دو دو آیات اس طرح آ رہی ہیں کہ پہلی آیت میں زجر یعنی ڈانٹ ڈپٹ کا انداز ہے' جبکہ دوسری میں راہنمائی اور ترغیب دی گئی ہے۔

آیت ۸ ﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ﴾ ''اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم نہیں ایمان رکھتے اللہ پر!''

یہ پہلے مطالبے یعنی ''ایمان'' سے متعلق گویا زجر و ملامت اور ایک طرح سے تنبیہ کا انداز ہے۔

﴿وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ﴾ ''جبکہ رسول (محمد ﷺ) تمہیں دعوت دے رہے ہیں کہ تم ایمان رکھو اپنے رب پر''

ہمارے رسولؐ ابھی تمہارے مابین موجود ہیں' اور وہ تم لوگوں کو براہِ راست ایمان کی دعوت دے رہے ہیں۔

﴿وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ﴾ ''اور دیکھو! وہ تم سے عہد بھی لے چکا ہے''

اگر تم ایمان کے دعوے دار ہو تو ذرا غور کرو کہ تم نے اپنے رب کے ساتھ کتنے عہد کر رکھے ہیں۔ ایک عہد تو وہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے تم سے عالمِ ارواح میں لیا تھا: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟'' اور تم سب نے اس سوال کے جواب میں ﴿بَلٰى﴾ کہا تھا (بحوالہ الاعراف: ۱۷۲)۔ اس کے بعد تم ﴿سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ (بحوالہ البقرۃ: ۲۸۵ والمائدۃ: ۷) کا عہد بھی کر چکے ہو۔ اس عہدِ اطاعت کے علاوہ تم نے اپنی جانوں اور اپنے مالوں کو اللہ کے ہاتھ بیچنے کا عہد بھی کر رکھا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ (التوبۃ: ۱۱۱) ''یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں اہلِ ایمان سے ان کی جانیں بھی اور ان کے مال بھی اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے''۔ تو تم لوگ اپنے رب کے ساتھ کیے ہوئے اپنے وعدوں اور معاہدوں کا تو لحاظ کرو:

﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۸﴾ ''اگر تم حقیقتاً مؤمن ہو!''

یہ ڈانٹ سننے کے بعد ہر بندۂ مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنے گریبان میں جھانکے اور اپنا جائزہ لے کہ کیا اس کے دل میں حقیقی ایمان موجود ہے یا کچھ خلا سا ہے؟ الحمد للہ ہم سب مسلمان تو ہیں' کسی نہ کسی درجے میں نماز روزہ وغیرہ کا تقاضا بھی پورا کر رہے ہیں' لیکن اللہ کرے ہمیں احساس ہو جائے اور ہم اپنا اپنا جائزہ لیں کہ اسلام کے ساتھ ساتھ کیا ابھی تک ہمیں حقیقی ایمان بھی نصیب ہوا ہے یا نہیں! اور اگر کسی کو یہ محسوس ہو کہ واقعی اس کے دل میں اس پہلو سے ابھی خلا موجود ہے تو پھر اسے یہ معلوم کرنے کے لیے بھی تگ و دو کرنی چاہیے کہ وہ یقین والا ایمان کہاں سے ملے گا۔ اگلی آیت میں اس حوالے سے راہنمائی فرمائی جا رہی ہے۔

آیت ۹ ﴿هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ﴾ ''وہی تو ہے جو اپنے بندے (ﷺ) پر یہ آیاتِ بینات نازل کر رہا ہے تاکہ نکالے تمہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف۔''

یعنی یقین والے ایمان کا منبع و سرچشمہ اللہ کی یہ کتاب ہے۔ اگر تم اس کتاب کو سمجھ کر پڑھو گے' اس پر فکر و تدبر کرو گے تو تمہارے اندر ایک ہلچل برپا ہو جائے گی' تمہاری روح کے تاروں میں خود بخود سرسراہٹ پیدا ہو گی اور تم خود محسوس کرو گے۔ بقولِ اقبال ؎

مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بُوئے نیاز — تُو ذرا چھیڑ تو دے' تشنۂ مضراب ہے ساز
نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے — طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لیے!

دراصل ایمان تمہاری روح کے اندر خفتہ (dormant) حالت میں پہلے سے موجود ہے' بس اسے فعال (active) کرنے کی ضرورت ہے۔ اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایمان کو فعال کرنے کا نسخہ پہلے سے تمہارے پاس موجود ہے' یعنی آیاتِ قرآنیہ۔

﴿وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝۹﴾ ''اور یقیناً اللہ تمہارے حق میں بہت رؤف اور رحیم ہے۔''

وہ تمہارے حال پر نہایت ہی شفیق اور مہربان ہے۔

اس آیت میں واضح طور پر بتا دیا گیا کہ ایمانِ حقیقی کا منبع اور سرچشمہ قرآن ہے۔ اس سے پہلے سورۃ الشوریٰ میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ خود حضور ﷺ کو بھی ایمان قرآن مجید ہی سے ملا:

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝۵۲﴾

''اور (اے نبی ﷺ!) اسی طرح ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے ایک روح اپنے امر میں سے۔ آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے' لیکن اس (قرآن) کو ہم نے ایسا نُور بنایا ہے جس کے ذریعے سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں۔ اور آپ یقیناً سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتے ہیں۔''

یعنی اس سے پہلے نہ تو آپ تورات سے واقف تھے اور نہ ہی آپ انجیل کے بارے میں کچھ جانتے تھے۔ آپ تو اُمّی تھے۔ لیکن جب ہم نے قرآن کریم کو نُور بنا کر آپ کے دل پر اُتارا تو اس سے آپ کا باطن نُورِ ایمان سے جگمگا اٹھا اور آپ نوعِ انسانی کے لیے روشنی کا مینار بن گئے۔ اب آپ لوگوں کو ہدایت دیں گے اور انہیں سیدھے راستے کی طرف بلائیں گے۔ اسی مضمون کو مولانا ظفر علی خان نے بڑی خوبصورتی اور سادگی سے یوں بیان کیا ہے: ؎

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

ان دو آیات میں پہلے مطالبے یعنی ''ایمان'' سے متعلق پہلے ڈانٹ پلائی گئی کہ تمہارا ایمان پختہ کیوں نہیں ہے؟ یہ ڈھل مل ایمان لیے کیوں پھر رہے ہو جس میں شکوک و شبہات کے کانٹے چبھے ہوئے ہیں؟ اگر تمہارے ایمان میں کمزوری ہے تو اس کمزوری کو دور کیوں نہیں کرتے ہو؟ کمزور ایمان کے ساتھ گزارا کیوں کر رہے ہو؟ پھر دوسری آیت میں راہنمائی بھی کر دی گئی کہ ایمان کی کمزوری کو دور کرنے اور حقیقی ایمان کے حصول کے لیے قرآن کی طرف رجوع کرو! قرآن کا یہی مطالبہ ہم سے بھی ہے۔ اس حوالے سے ایک

اہم بات ہمیشہ کے لیے پلّے باندھ لیجیے کہ قرآن کا ترجمہ پڑھنے سے نہ تو قرآن دل میں اترتا ہے اور نہ ہی اس سے جذبے کو تحریک ملتی ہے۔ ترجمہ پڑھنے سے آپ کچھ آیات کا مفہوم تو سمجھ لیں گے اور کچھ معلومات بھی آپ کو حاصل ہو جائیں گی' مگر قرآن آپ کے دل کے تاروں کو چھوئے گا نہیں' اور نہ ہی اس کی تاثیر آپ کی روح تک پہنچے گی۔ لہٰذا اگر آپ چاہتے ہیں کہ قرآن آپ کی روح کو فیوضِ ملکوتی سے سیراب اور آپ کے دل کو نورِ ایمانی سے منور کرے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ قرآن کو اس کی زبان میں پڑھیں اور سمجھیں۔ بقول اقبال : ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف!

ظاہر ہے کسی کے ضمیر پر قرآن کا نزول تبھی ممکن ہے جب وہ قرآن کی زبان یعنی عربی سے واقف ہوگا اور قرآن کے الفاظ اور اس کی عبارت کو براہِ راست سمجھے گا۔ اس کے لیے وہ پڑھے لکھے حضرات جو عربی زبان سے نابلد ہیں خصوصی طور پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاں جواب دہ ہوں گے کہ وہ اپنی زندگی میں ایک سے بڑھ کر ایک علوم وفنون سیکھتے رہے لیکن قرآن کی زبان سیکھنے کے لیے انہوں نے کوئی منصوبہ بندی اور کوئی کوشش نہ کی۔ ایسے تمام حضرات کو میرا مشورہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کا ایک سال اس کام کے لیے ضرور وقف کریں اور کم از کم اس حد تک عربی زبان ضرور سیکھیں کہ قرآن مبین کو پڑھتے ہوئے انہیں اس کی آیاتِ بیّنات کا مفہوم تو معلوم ہو۔ (خواہش مند حضرات اس مقصد کے لیے قرآن اکیڈمی کے تحت چلنے والے رجوع الی القرآن کورس میں داخلہ لے سکتے ہیں۔) ——

یہ تو تھی توحید کے پہلے مطالبے (ایمان) سے متعلق ڈانٹ ڈپٹ اور راہنمائی۔ اور اب دوسرے مطالبے سے متعلق ڈانٹ:

آیت ۱۰ ﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں' جبکہ اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی وراثت!''

یہ جو تم بڑے بڑے محل تعمیر کر رہے ہو اور فیکٹریوں پر فیکٹریاں لگاتے چلے جا رہے ہو' ان سے آخر کب تک استفادہ کرو گے؟ تم تو آج ہو' کل نہیں ہو گے۔ تمہارے بعد تمہاری اولاد میں سے بھی جو لوگ ان جائیدادوں کے وارث بنیں گے وہ بھی اپنے وقت پر چلے جائیں گے۔ پھر جو اُن کے وارث بنیں گے وہ بھی نہیں رہیں گے۔ بالآخر تمہارے اس سب کچھ کا اور پوری کائنات کا حقیقی وارث تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ تو جب یہ سب کچھ تم نے اِدھر ہی چھوڑ کر چلے جانا ہے تو پھر غیر ضروری دولت اکٹھی کرنے میں کیوں وقت برباد کر رہے ہو؟ اور کیوں اسے سینت سینت کر رکھ رہے ہو؟ واضح رہے کہ انفاق سے مراد یہاں انفاقِ مال بھی ہے اور بذلِ نفس (جان کھپانا) بھی۔

یہ نکتہ قبل ازیں آیت ۷ کے مطالعے کے دوران بھی زیر بحث آیا تھا اور اب اگلے فقرے میں مزید واضح ہو جائے گا:

﴿لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ﴾ ''تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے انفاق کیا اور قتال کیا فتح سے پہلے وہ (فتح کے بعد انفاق اور قتال کرنے والوں کے) برابر نہیں ہیں۔''

وضاحت کے لیے یہاں انفاق اور قتال کا ذکر الگ الگ آ گیا ہے۔ یعنی 'انفاق' مال خرچ کرنے کے لیے اور 'قتال' جان کھپانے کے لیے۔ چنانچہ یہاں واضح کر دیا گیا کہ آیت ۷ میں جس انفاق کا ذکر ہوا تھا اس سے مال و جان دونوں کا انفاق مراد تھا اور ظاہر ہے انفاقِ جان کا سب سے اہم موقع تو قتال ہی ہے۔ میدانِ جنگ سے غازی بن کر لوٹنے کا انحصار تو حالات اور قسمت پر ہے' لیکن میدانِ

کارزار میں اترنے کا مطلب تو بہر حال یہی ہوتا ہے کہ اس مردِ مجاہد نے اپنی نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر قربانی کے لیے پیش کر دی۔

اس آیت میں خاص بات یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اہلِ ایمان جنہوں نے ابتدائی دور میں اس وقت قربانیاں دیں جبکہ اسلام کمزور تھا اور مسلمانوں کی طاقت بہت کم تھی' ان کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے۔ وہ اور بعد کے مسلمان جنہوں نے یہی اعمال بعد میں سرانجام دیے ثواب و مرتبہ میں برابر نہیں۔

﴿اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ﴾ ''ان لوگوں کا درجہ بہت بلند ہے ان کے مقابلے میں جنہوں نے انفاق اور قتال کیا فتح کے بعد۔''

﴿وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۰﴾ ''اگرچہ ان سب سے اللہ نے بہت اچھا وعدہ فرمایا ہے۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

حضور ﷺ کی سربراہی میں کفر و باطل سے جنگ میں پہلی واضح فتح تو صلح حدیبیہ تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے خود فتح مبین قرار دیا: ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝۱﴾ (الفتح)۔ یہ فتح مبین مسلمانوں کو ۶ ہجری میں عطا ہوئی جبکہ ظاہری فیصلہ کن فتح انہیں ۸ ہجری میں فتح مکہ کی صورت میں حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس آیت میں فتح کے ذکر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سورۃ الحدید کم از کم ۶ ہجری یعنی صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی۔

اب سنیے' کھلے اور بیدار دل کے ساتھ ایک اہم پکار! ذرا دھیان سے سنیے! میرا خالق' آپ کا خالق' میرا مالک' آپ کا مالک اور پوری کائنات کا مالک کیا ندا کر رہا ہے؟

آیت ۱۱ ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ ''کون ہے جو اللہ کو قرض دے قرضِ حسنہ؟''

﴿فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝۱۱﴾ ''کہ وہ اُس کے لیے اسے بڑھاتا رہے اور اُس کے لیے بڑا باعزت اجر ہے۔''

اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اور بھلا کون اجر دے سکتا ہے؟ ایسا منافع اور بھلا کہاں سے مل سکتا ہے؟ چنانچہ اے اہلِ ایمان! آگے بڑھو! لبیک کہو اپنے رب کی اس پکار پر! اور اپنا مال اور اپنا وقت قربان کر دو اُس کی رضا کے لیے! اپنی صلاحیتیں اور اپنی جان کھپا دو اُس کی راہ میں!

یہاں پر یہ نکتہ ایک دفعہ پھر سے ذہن نشین کر لیجیے کہ انفاقِ مال اور انفاقِ جان ایک اعتبار سے ایک ہی چیز ہے۔ مال اور جان کے باہمی تعلق کو اس پہلو سے بھی سمجھنا چاہیے کہ ایک شخص اپنی جان' یعنی جسمانی قوت' ذہانت اور دیگر صلاحیتوں کی مدد سے مال کماتا ہے۔ پھر اپنے اس مال سے ایک طرف وہ اپنی جان کی بقا کا سامان پیدا کرتا ہے تو دوسری طرف اسی کی مدد سے وہ دوسروں کی قوت' ذہانت اور دیگر صلاحیتوں کو خریدنے کی استعداد بھی حاصل کر لیتا ہے۔ اسی طرح انسان کی مہلتِ زندگی یعنی ''وقت'' بھی اُس کی دولت ہے جس کے ذریعے سے وہ مال کماتا ہے۔ چنانچہ عام طور پر کہا جاتا ہے: time is money کہ وقت اصل دولت ہے۔ گویا انسان کی جان' اُس کا مال اور وقت باہم یوں متعلق و مربوط ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کے انفاق میں عملی طور پر باقی دو چیزوں کا انفاق بھی شامل ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں جس انفاق کی بات ہو رہی ہے اس میں آپ کا مال' آپ کا وقت' آپ کی جسمانی قوت' ذہانت' فطانت' جان وغیرہ سب شامل ہیں۔

اب اگلی آیات میں روزِ محشر کے اس مرحلے کا نقشہ دکھایا جا رہا ہے جب منافقین کو چھانٹ کر سچے اہلِ ایمان سے الگ کر دیا جائے گا۔ اس مرحلے کو ہمارے ہاں عموماً ''پُل صراط'' کا مرحلہ کہا جاتا ہے۔ میدانِ حشر کا یہ نقشہ ذہن میں رکھیے کہ وہاں مختلف مواقع پر مختلف قسم کے لوگوں کی چھانٹی ہوتی چلی جائے گی۔ اس چھانٹی کے عمل کو سمجھنے کے لیے بجری بنانے والے کرشرز (crushers) میں لگی چھلنیوں کی مثال ذہن میں رکھیے۔ جس طرح ان مشینوں میں لگی مختلف قسم کی چھلنیاں مختلف سائز کے پتھروں کو الگ کرتی چلی جاتی ہیں بالکل اسی طرح میدانِ محشر میں مختلف مراحل پر مختلف قسم کے انسان بھی اپنے اعتقادات و اعمال کی بنیاد پر الگ ہوتے چلے جائیں گے۔ چنانچہ سب سے پہلی چھانٹی میں تمام کفار و مشرکین کو الگ کر لیا جائے گا۔ پھر کسی مرحلے پر ایمان کے دعوے داروں میں سے سچے مؤمنین اور منافقین کو الگ الگ کرنے کے لیے چھانٹی کی جائے گی اور یہی وہ مرحلہ ہے جس کا نقشہ آئندہ آیات میں دکھایا جا رہا ہے۔ اس چھانٹی کے لیے تمام مسلمانوں کو گھپ اندھیرے میں پُل صراط پر سے گزرنا ہوگا جس کے نیچے جہنم بھڑک رہی ہوگی۔ جن لوگوں کے دلوں میں سچا ایمان تھا اور انہوں نے ایمان کی حالت میں نیک اعمال بھی کیے تھے ان کے قلوب اور داہنے ہاتھوں سے اُس وقت نُور پھوٹ رہا ہوگا اور وہ اس روشنی میں راستہ پار کر کے جنت میں پہنچ جائیں گے۔ لیکن جو لوگ دنیا میں سچے ایمان سے محروم رہے اور اعمالِ صالحہ کی پونجی بھی ان کے پاس نہیں ہوگی، وہ خواہ دنیا میں مسلمانوں ہی کے ساتھ شریک رہے ہوں اور خواہ وہ مسلمانوں کے بڑے بڑے قائدین بن کر رہے ہوں اُس وقت وہ روشنی سے محروم کر دیے جائیں گے۔ اس حالت میں وہ ٹھوکریں کھاتے جہنم میں گرتے چلے جائیں گے۔ آئندہ آیات میں اس مرحلے کا تفصیلی نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس کے بعد روزِ محشر کے اس مرحلے کی ایک جھلک سورۃ التحریم کی آیت ۸ میں بھی دکھائی گئی ہے۔

آیات ۱۲ تا ۱۵

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾ يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿۱۳﴾ يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۱۴﴾ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ؕ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾

آیت ۱۲ ﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ﴾ ''جس دن تم دیکھو گے مؤمن مَردوں اور مؤمن عورتوں کو کہ ان کا نُور دوڑتا ہوگا اُن کے سامنے اور اُن کے داہنی طرف''

بعض مفسرین کی رائے کے مطابق ''یَوْمَ'' سے پہلے ''اُذْکُرْ'' محذوف ہے۔ یعنی ذرا تصوّر کرو اُس دن کا جس دن مؤمن مَردوں اور مؤمن عورتوں پر یہ عنایت خاص ہوگی۔ اُن کے سامنے اُن کے ایمان کا نُور ہوگا جبکہ داہنی طرف اعمالِ صالحہ کی روشنی ہوگی۔

(یہ مضمون سورۃ التحریم میں مکرر آئے گا۔ وہاں اس پر اِن شاء اللہ قدرے تفصیل سے گفتگو ہوگی۔)

﴿بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ﴾ ''(ان سے کہا جائے گا:) آج تمہارے لیے بشارت ہے ان جنتوں کی جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں' تم رہو گے ان میں ہمیشہ ہمیش۔''

﴿ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ⑫﴾ ''یقیناً یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔''

آیت ⑬ ﴿يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ﴾ ''جس دن کہیں گے منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں سے کہ ذرا ہمارا انتظار کرو کہ ہم بھی تمہاری روشنی سے فائدہ اٹھالیں۔''

اس صورتِ حال کو یوں سمجھیں جیسے کچھ مسافر ایک خطرناک جنگل کے اندر تنگ پگڈنڈی پر گھپ اندھیرے میں سفر کر رہے ہوں۔ ان میں سے جن لوگوں کے پاس ٹارچ ہے وہ تو تیز تیز قدموں کے ساتھ پگڈنڈی پر رواں دواں ہیں' لیکن جن کے پاس ٹارچ نہیں ہے' وہ ان کی منتیں کر رہے ہیں کہ خدارا ذرا رکو' ذرا ٹھہرو' ہم پر عنایت کرو' ہمیں بھی ساتھ لے لو۔ نَقْتَبِسْ کا مادہ ق ب س ہے' جس کے لغوی معنی ہیں کسی کی آگ سے چنگاری لے کر اپنی آگ جلانا۔ لفظ ''اقتباس'' اردو میں quotation کے معنی میں مستعمل ہے۔ آپ نے اپنے مضمون میں کسی اور کی تحریر سے اقتباس شامل کیا تو گویا آپ نے کسی کے چولہے کی ایک چنگاری لا کر اپنے چولہے میں شامل کی ہے۔

﴿قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ﴾ ''کہا جائے گا: لوٹ جاؤ پیچھے کی طرف اور تلاش کرو نُور!''

انہیں بتا دیا جائے گا کہ یہ نُور یہاں سے نہیں ملتا۔ اس وقت جن لوگوں کے پاس تمہیں نُور نظر آ رہا ہے وہ اسے دنیا سے کما کر لائے ہیں۔ چنانچہ اب اگر تمہیں اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے تو اس کے لیے تمہیں واپس دنیا میں جانا ہوگا اور وہاں جا کر اسے تلاش کرنا ہوگا' جس کا اب کوئی امکان نہیں ہے۔ یہاں پر یہ لطیف نکتہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ منافقین روشنی کے لیے درخواست تو اہلِ ایمان سے کریں گے لیکن اس کا جواب کوئی اور دے گا' کیونکہ یہاں قَالُوْا نہیں بلکہ قِيْلَ (کہا جائے گا) کا صیغہ آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان کی مروّت اور شرافت سے بعید ہوگا کہ وہ انہیں کورا جواب دیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوئی فرشتہ انہیں ان کی مذکورہ درخواست کا جواب دے گا۔

﴿فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ﴾ ''پھر ان کے درمیان ایک فصیل کھڑی کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا۔''

﴿بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ⑬﴾ ''اس (فصیل) کی اندرونی جانب رحمت ہوگی اور اس کے باہر کی طرف عذاب ہوگا۔''

یعنی اس دیوار کے اندر کی طرف رحمت باری تعالیٰ کا نزول شروع ہو جائے گا' اہلِ ایمان کی ابتدائی مہمان نوازی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا' جبکہ اس فصیل کے باہر کی طرف عذابِ الٰہی کا نزول شروع ہو جائے گا۔ اس طرح اس چھلنی سے گزار کر منافقین کو سچے اہلِ ایمان سے الگ کر لیا جائے گا۔

اب اگلی دو آیات میں منافقت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ مرض کیسے پیدا ہوتا ہے اور اس کی پیتھالوجی کیسے ارتقاء پاتی ہے۔

آیت ⑭ ﴿يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ﴾ ''وہ (منافق) انہیں پکار کر کہیں گے: کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟''

ہم تمہارے ساتھ مسجد نبویؐ میں نمازیں پڑھا کرتے تھے۔عیدوں کی نمازوں میں بھی ہم تمہارے ساتھ ہوتے تھے۔ہم نے تمہارے ساتھ فلاں فلاں مہمات میں بھی حصہ لیا۔ ہر جگہ ہر مقام پر ہم تمہارے ساتھ ہی تو تھے۔ پھر آج تمہارے اور ہمارے مابین اتنا فرق وتفاوت کیوں ہے؟

﴿قَالُوْا بَلٰی﴾ ''وہ کہیں گے: ہاں کیوں نہیں! (تم تھے تو ہمارے ساتھ ہی)۔''

﴿وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ﴾ ''لیکن تم نے اپنے آپ کو (اپنے ہاتھوں) فتنے میں ڈالا''

فتنہ کیا ہے؟ قرآن مجید میں فتنے کی تین نسبتیں بیان کی گئی ہیں۔کہیں تو اللہ تعالیٰ اس کی نسبت اپنی طرف کرتا ہے کہ ہم نے ان کو فتنے میں ڈالا ہے کہ ہم آزما کر ظاہر کر دیں کہ کون کھرا ہے' کون کھوٹا ہے۔ دوسری نسبت ان کفار کی طرف کی گئی جو مسلمانوں کو ستا رہے تھے اور انہیں فتنے میں ڈال رہے تھے۔تیسری نسبت یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو خود فتنے میں ڈالتا ہے۔یعنی جو لوگ اہل وعیال اور متاعِ دنیوی کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور ان کی محبت کو اللہ کی محبت پر ترجیح دیتے ہیں وہ اپنے آپ کو فتنے میں مبتلا کر لیتے ہیں۔اس فتنے کا ذکر سورۃ التغابن میں بایں الفاظ فرمایا گیا: ﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ﴾ (آیت ۱۵) ''بلاشبہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد (تمہارے حق میں) فتنہ ہیں''۔ اللہ تعالیٰ اُس کے رسولؐ اور جہاد فی سبیل اللہ کے مقابلے میں اپنے مال ومتاع اور اہل وعیال کو عزیز تر جاننا سب سے بڑا فتنہ ہے۔یہاں پر سورۃ التوبہ کی یہ آیت بھی ذہن میں تازہ کر لیں:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾

''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ' تمہارے بیٹے' تمہارے بھائی' تمہاری بیویاں (اور بیویوں کے لیے شوہر)' تمہارے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے بہت محنت سے کمائے ہیں' اور وہ تجارت جس کے مندے کا تمہیں خطرہ رہتا ہے' اور وہ مکانات جو تمہیں بہت پسند ہیں' (اگر یہ سب چیزیں) تمہیں محبوب تر ہیں اللہ' اُس کے رسول اور اُس کے راستے میں جہاد سے' تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے۔اور اللہ ایسے فاسقوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔''

اس آیت نے گویا ایک ترازو نصب کر کے اس کے ایک پلڑے میں آٹھ اور دوسرے میں تین محبتیں رکھ دی ہیں۔اب ہر کوئی اپنے اپنے پلڑوں کی کیفیت کو دیکھ کر اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔تو اے گروہِ منافقین! تم خود بتاؤ تم نے اپنی زندگیوں میں ان میں سے کون سے پلڑے کو جھکا کر رکھا تھا؟ آٹھ محبتوں والے پلڑے کو یا اللہ و رسولؐ اور جہاد کی محبت والے پلڑے کو؟ ظاہر ہے دنیا میں تم لوگ دنیاداری کے تقاضوں کو' اپنے مال ومنال اور اہل وعیال کو اللہ کی رضا اور اُس کے رسولؐ کی محبت پر ترجیح دیتے رہے ہو۔یہ تمہارا اپنا فیصلہ تھا۔یہ فیصلہ کر کے تم نے اپنے آپ کو خود فتنے میں ڈالا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟

﴿وَتَرَبَّصْتُمْ﴾ ''اور تم گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے''

یہ وہی لفظ ہے جو سورۃ التوبہ کی مذکورہ بالا آیت کے آخر میں (فَتَرَبَّصُوْا) آیا ہے۔ تَرَبُّص کے معنی انتظار کے بھی ہیں کہ آدمی کسی جگہ پر ٹھٹک کر کھڑا ہو جائے۔ایمان وعمل کے معاملے میں یہ ''انتظار'' ہی دراصل فتنہ ہے۔یہ ایمان کی ڈانواں ڈول کیفیت کا نام ہے جس کی وجہ سے آدمی فیصلہ نہیں کر سکتا کہ آگے بڑھوں یا نہ بڑھوں! آگے بڑھتا ہوں تو جان ومال کو شدید خطرات لاحق ہوتے ہیں

اور رُکتا ہوں تو باز پُرس کا ڈر ہے۔ ایسی صورتِ حال میں وہ سوچنے لگتا ہے کہ کچھ دیر انتظار کرتا ہوں' اگر خطرہ ٹل گیا تو آگے بڑھ جاؤں گا' ورنہ پیچھے مڑ جاؤں گا۔ اور باز پُرس ہوگی تو جھوٹ بول کر جان بچالوں گا۔

﴿وَارْتَبْتُمْ﴾ ''اور تم لوگ شکوک وشبہات میں پڑ گئے''

پھر تمہاری منافقت کا مرض بڑھ کر اگلے مرحلے میں داخل ہو گیا۔ یعنی پہلے اللہ کے مقابلے میں مال واولاد کی محبت نے فتنے میں ڈالا' اس کا نتیجہ ''تَرَبُّص'' (گومگو کی کیفیت) کی صورت میں سامنے آیا۔ پھر اس کے بعد ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب بچے کھچے ایمان میں شکوک وشبہات کے کانٹے چبھنے شروع ہو گئے کہ کیا پتا قیامت آئے گی بھی کہ نہیں! معلوم نہیں یہ مر کر زندہ ہونے کی باتیں سچی اور واقعی ہیں یا محض افسانے ہیں! یہ دنیا تو ایک حقیقت ہے' لیکن آخرت کا کیا اعتبار! یہاں کا عیش اور یہاں کے مزے تو نقد ہیں۔ اس آرام وآسائش کو اگر میں آخرت کے موہوم وعدے پر قربان کر دوں تو پتا نہیں اس کا اجر ملے گا بھی یا نہیں! اس کے بعد اس مرض کی آخری نشانی بتائی گئی:

﴿وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ﴾ ''اور تمہیں دھوکے میں ڈال دیا تمہاری خواہشات نے''

ان خواہشات کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اللہ بڑا غفورٌ رحیم ہے۔ وہ بڑے بڑے گناہگاروں کو بخش دیتا ہے۔ ہم جو بھی ہیں' جیسے بھی ہیں' اللہ تعالیٰ کے محبوب ﷺ کی اُمّت ہیں۔ بالکل ایسا ہی زعم یہودیوں کو بھی تھا کہ ہم اللہ کے محبوب و برگزیدہ بندے ہیں: We are the chosen people of the Lord۔ چنانچہ تم لوگ اپنی انہی خوش فہمیوں میں مگن رہے۔ اس مرحلے میں اگر کبھی توبہ کرنے اور روش تبدیل کرنے کا خیال تمہیں آیا بھی تو خوشنما آرزوؤں (wishful thinkings) کے تصور نے تمہارے ضمیر کو تھپک تھپک کر پھر سے سلا دیا۔

﴿حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۱۴﴾﴾ ''یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آ گیا اور تمہیں خوب دھوکہ دیا اللہ کے معاملے میں اُس بڑے دھوکے باز نے۔''

یعنی شیطانِ لعین نے تم لوگوں کو اللہ کے نام پر دھوکہ دیا۔ اس حوالے سے سورۂ لقمان میں ہم یہ تنبیہہ پڑھ چکے ہیں: ﴿فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۪ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۳۳﴾﴾ ''تو (دیکھو!) تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے دُنیا کی زندگی اور (دیکھنا!) تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے اللہ کے حوالے سے وہ بڑا دھوکے باز۔''

زیر مطالعہ اس آیت میں بہت جامع انداز میں منافقت کے مدارج اور مراحل کے بارے میں بتا دیا گیا ہے۔ مرض کا نقطۂ آغاز مال واولاد کی حد سے بڑھی ہوئی محبت سے ہوتا ہے۔ ان چیزوں میں انہماک کی وجہ سے انسان کے دل میں اللہ' اُس کے رسولؐ اور جہاد کی محبت بتدریج کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس صورتِ حال کے نتیجے میں تَرَبُّص کی کیفیت پیدا ہوتی ہے' جس کی وجہ سے ایمان کے اندر شکوک وشبہات کے رخنے پڑ جاتے ہیں اور یہ وہ مرحلہ ہے جب نفاق اپنی اصلی شکل میں نمودار ہو کر دل میں مستقل ڈیرے جما لیتا ہے۔

آیت ۱۵ ﴿فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ﴾ ''تو آج نہ تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ ہی کافروں سے۔''

ان الفاظ میں گویا واضح کر دیا گیا کہ دنیا میں تمہارا شمار بے شک مسلمانوں میں ہوتا رہا تھا لیکن یہاں تمہارا حشر کافروں کے ساتھ ہوگا۔ دنیا میں تو منافق خود کو مسلمان ہی کہتا ہے اور قانوناً بھی وہ مسلمان ہی شمار ہوتا ہے' لیکن اللہ خوب جانتا ہے کہ اُس کا دل ایمان سے خالی ہے اور وہ صرف ایک زبانی عقیدہ (dogma) لیے پھرتا ہے۔ ظاہر ہے جب دل میں ایمان ہی نہیں تو اس کے نیک اعمال بھی ریاکاری اور دکھاوے پر مبنی ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کو ان کے نیک اعمال کا بھی بالکل کوئی اجر نہیں ملے گا۔ بہرحال میدانِ محشر میں یہ لوگ نُور سے محروم ہوں گے اور ان کا حشر کافروں کے ساتھ ہوگا۔

﴿مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ؕ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾﴾ ''تمہارا ٹھکانہ آگ ہے' وہی تمہاری غم خوار ہے' اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔''

''مَاْوٰی'' سے مراد ہے پناہ گاہ' جس کی طرف انسان کسی خطرے سے بچنے کے لیے دوڑتا اور لپکتا ہے۔ یہاں طنزاً فرمایا کہ اب تمہاری پناہ گاہ اور ٹھکانہ یہی آگ ہے۔ اسی طرح یہاں ''مَوْلٰی'' کا لفظ بھی طنزاً استعمال ہوا ہے۔ مَوْلٰی کا مطلب ہے ہمدرد' مونس و غم خوار' غم گسار' مددگار' دوست' پشت پناہ' دمساز' ساتھی وغیرہ۔ چنانچہ فرمایا کہ اب یہی آگ تمہاری ہمدرد' غم گسار اور خبر گیری کرنے والی ہے' دکھ درد کہنا ہے تو اس سے کہو' نالہ وشیون ہے تو اسی سے کرو! مزید فرمایا کہ وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔ ''مَصِیْر'' کا مطلب ہے لوٹنے کی جگہ' وہ جگہ جہاں انسان بانجامِ کار پہنچا دیا جائے ـــــ اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْ ذٰلِکَ!

آیات ۱۶ تا ۱۹

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَ مَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَ اَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَ لَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۸﴾ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۚ وَ الشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۹﴾ ع

اب اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ ہر اُس شخص سے سوال کر رہے ہیں جس نے اب تک کی یہ سب باتیں پڑھ کر یا سن کر اپنے دل میں اتار لی ہیں۔ سوال و خطاب کا یہ بہت جذباتی انداز ہے:

آیت ۱۶ ﴿اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ﴾ ''کیا ابھی وقت نہیں آیا ہے اہلِ ایمان کے لیے کہ ان کے دل جھک جائیں اللہ کی یاد کے لیے اور اُس (قرآن) کے آگے کہ جو حق میں سے نازل ہو چکا ہے؟''

یہاں قرآن کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ؕ﴾ یہی بات سورۂ بنی اسرائیل میں زیادہ پُرزور انداز میں فرمائی گئی ہے: ﴿وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ﴾ (آیت ۱۰۵) ''اور ہم نے اس کو نازل کیا ہے حق کے ساتھ اور یہ نازل ہوا ہے حق کے ساتھ۔''

دین یا نیکی کے معاملے میں فیصلہ کرتے ہوئے انسان ہمیشہ تاخیر وتعویق سے کام لیتا ہے کہ یہ کرلوں' وہ کرلوں' بس اس کے بعد اپنا طرزِ زندگی درست کرلوں گا! ابھی ذرا بچیوں کے ہاتھ پیلے کرلوں! بس ذرا یہ بچوں کی تعلیم مکمل ہو لے وغیرہ وغیرہ۔ اور دیکھا جائے تو بچوں کی تعلیم ہے کیا؟ صرف دنیا بنانے اور دنیا کمانے کے علم وفن کی تحصیل! گویا جس کوئے ملامت کے طواف میں خود ساری عمر برباد کردی انہی راستوں پر اپنی اولاد کو گامزن کرنے کے خواب دیکھے جا رہے ہیں! پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ بچوں کے کیریئر بنانے کے جنون میں انہیں کچی عمر میں برطانیہ اور امریکہ بھیجنے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ وہاں جا کر بچے جب ''ترقی'' کی منازل طے کرتے کرتے اس ''مقام'' پر پہنچ جاتے ہیں کہ مذہب واخلاق سے اپنے تعلق کو باعثِ عار سمجھنے لگتے ہیں تو پھر یہ لوگ بیٹھ کر روتے ہیں اور لادینی تہذیب وتمدن کو کوستے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس سوال پر لازم ہے کہ ہم سب اپنے اپنے ضمیر کی عدالت میں پیش ہو کر خود سے پوچھیں کہ کیا ہماری زندگیوں میں وہ وقت ابھی نہیں آیا کہ ہم اللہ اور قرآن کے احکام کے سامنے جھک جائیں؟

﴿وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ﴾ ''اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی''

﴿فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ﴾ ''تو جب ان پر ایک طویل مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے۔''

یہاں پر ﴿فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ کے یہ الفاظ پڑھتے ہوئے سورۃ البقرۃ کی آیت ۷۴ کا وہ حصہ بھی ذہن میں تازہ کرلیں جس میں بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ﴾ ''پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس سب کچھ کے بعد' پس اب تو وہ پتھروں کی مانند ہیں' بلکہ سختی میں ان سے بھی زیادہ شدید ہیں۔''

﴿وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۱۶﴾ ''اور ان کی اکثریت اب فاسقوں پر مشتمل ہے۔''

آیت زیر مطالعہ کے الفاظ ﴿وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ﴾ میں واضح طور پر بتا دیا گیا کہ بنی اسرائیل بھی تمہاری طرح اپنے زمانے کی اُمتِ مسلمہ تھے۔ ان کی روش کو بھی تم جانتے ہو اور ان کے انجام سے بھی تم آگاہ ہو۔ دیکھ لو! اگر تم نے اب بھی توبہ نہ کی اور اپنی روش تبدیل نہ کی تو یہ مت بھولو کہ اُن کی طرح تمہیں بھی نشانِ عبرت بنایا جا سکتا ہے۔

اس ڈانٹ کے بعد اب اگلی آیت میں ہمت افزائی کی جا رہی ہے کہ دیکھو! اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہارے دل کی ''زمین'' ایمان کی فصل کے قابل نہیں رہی' تو بھی تمہیں گھبرانے یا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔

آیت ۱۷ ﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ﴾ ''جان لو کہ اللہ زندہ کر دیتا ہے زمین کو اُس کے مرنے کے بعد۔''

تم اکثر دیکھتے ہو کہ بے آب وگیاہ بنجر زمین پر جب بارش برستی ہے تو اس کے ذرّے ذرّے میں زندگی رواں دواں ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اگر تم لوگ بھی خلوصِ نیت کے ساتھ توبہ کرلو گے اور اللہ کے حضور جھک جاؤ گے تو وہ اپنی نظرِ رحمت سے تمہارے دلوں کی زمین کو بھی ازسرِنو زندگی بخش دے گا اور اسے پھر سے ایمان کی فصل کے قابل بنا دے گا۔

﴿قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۱۷﴾ ''ہم نے تو تمہارے لیے اپنی آیات خوب واضح کر دی ہیں تاکہ تم عقل سے کام لو۔''

لہٰذا تم عقل سے کام لیتے ہوئے اس مثال سے سبق سیکھو! تم خوب سمجھتے ہو کہ فصلیں کب برباد ہوتی ہیں اور زمینیں کیونکر بنجر بنتی ہیں' تمہیں بنجر زمینوں کو پھر سے سرسبز وشاداب بنانے کا نسخہ بھی معلوم ہے۔ یہی نسخہ ذرا اپنے دل کی زمین پر بھی آزماؤ اور اس زمین کو

بھی پھر سے آباد کرنے پر کمرِ ہمت باندھو۔ توکل علی اللہ کا سرمایہ اکٹھا کرو‘ انفاق فی سبیل اللہ کے ہل چلا کر حُبِّ مال کے جھاڑ جھنکاڑ سے جان چھڑاؤ‘ پھر اللہ کی اطاعت و محبت کے بیج بو کر اس کے ذکر کے پانی سے مسلسل آبیاری کرتے چلے جاؤ اور دل میں یقین رکھو کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ مُردہ زمینوں کو پھر سے زندہ کر دیا کرتا ہے۔

آیت ۱۸ ﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۱۸﴾ ’’یقیناً صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور جو قرض دیں اللہ کو قرضِ حسنہ‘ اُن کو کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور اُن کے لیے بڑا باعزّت اجر ہے۔‘‘

سورۃ البقرۃ کے رکوع ۳۵ اور ۳۶ کے مطالعہ کے دوران بھی یہ نکتہ واضح کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے مال خرچ کرنے کی دو مدّیں ہیں: ایک صدقہ اور دوسری انفاق فی سبیل اللہ یا اللہ کے لیے قرضِ حسنہ۔ چنانچہ وہ مال جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے غرباء‘ مساکین‘ بیواؤں‘ یتیموں‘ بیماروں‘ مسافروں‘ مقروضوں‘ محتاجوں اور ضرورت مند انسانوں کی مدد اور حاجت روائی کے لیے خرچ کیا جائے وہ صدقہ ہے۔ اسی مفہوم میں سورۃ التوبہ کی آیت ۶۰ میں زکوٰۃ کو بھی ’’صدقہ‘‘ قرار دیا گیا ہے‘ کیونکہ زکوٰۃ بنیادی طور پر غرباء و مساکین اور محتاجوں کے لیے ہے۔ اس میں اللہ کے لیے (فی سبیل اللہ) صرف ایک مدّ رکھی گئی ہے۔ اس حوالے سے دوسری اصطلاح ’’انفاق فی سبیل اللہ‘‘ یا اللہ کے لیے قرضِ حسنہ کی ہے۔ واضح رہے کہ یہ باقاعدہ ایک اصطلاح کی بات ہو رہی ہے‘ ورنہ عرفِ عام میں تو صدقہ بھی فی سبیل اللہ ہی ہے‘ کیونکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے لیے اور اُس کی رضا جوئی کے لیے ہی دیا جاتا ہے۔ بہرحال ایک باقاعدہ اصطلاح کے اعتبار سے انفاق فی سبیل اللہ ایسا انفاق ہے جو اللہ کے دین کے لیے‘ دین کی نشر و اشاعت کے لیے اور اس کے غلبہ و اقامت کی جدّوجُہد کے لیے کیا جائے اور یہی وہ انفاق ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے ذِمّہ ’’قرض‘‘ قرار دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت سے مُردہ زمین کے زندہ ہو جانے کے ذکر کے بعد یہاں صدقہ اور اللہ کے لیے قرضِ حسنہ کی ترغیب میں گویا دل کی مُردہ زمین کو پھر سے ایمان کی فصل کے لائق بنانے کی ترکیب پنہاں ہے۔ یعنی اگر تم نے دل کی مردہ زمین کو زندہ کرنا ہے تو اس میں انفاقِ مال کا ہل چلاؤ اور اس میں سے حُبِّ دنیا کی جڑوں کو کھود کھود کر نکال باہر کرو۔ یقین رکھو کہ جیسے جیسے تم اللہ کی رضا کے لیے مال خرچ کرتے جاؤ گے‘ ویسے ویسے تمہارے دل کی زمین میں ایمان کی فصل جڑیں پکڑتی چلی جائے گی۔ دنیا کی محبت کو میں عام طور پر گاڑی کی بریک سے تشبیہہ دیا کرتا ہوں۔ جس طرح گاڑی کو بریک لگی ہو تو وہ حرکت میں نہیں آ سکتی‘ اسی طرح اگر دنیا کی محبت آپ کے دل میں پیوست ہو چکی ہے تو اس میں اللہ کے راستے پر گامزن ہونے کی امنگ پیدا نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ دل کی گاڑی کو رضائے الٰہی کی شاہراہ پر رواں دواں کرنے کے لیے اس کی بریک سے پاؤں اٹھانا بہت ضروری ہے۔ یعنی اس کے لیے مال کی محبت کو دل سے نکالنا ناگزیر ہے۔ اور اس محبت کو دل سے نکالنے کی ترکیب یہی ہے کہ اپنے مال کو زیادہ سے زیادہ اللہ کے راستے میں خرچ کیا جائے۔

آیت ۱۹ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ﴾ ’’اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسولوں پر وہی ہیں صِدّیق اور شہداء اپنے رب کے پاس۔‘‘

یعنی وہ لوگ جو صدقات کے ذریعے اور اللہ کو قرضِ حسنہ دے کر اپنے دلوں سے مال کی محبت اور اس کی نجاست کو دھو ڈالتے ہیں‘ وہ جب ایمانِ حقیقی سے سرشار ہوتے ہیں تو اب ان کے لیے مقامِ صِدّیقیت اور مرتبۂ شہادت تک پہنچنے کا راستہ کھلا ہوا ہے۔ صدقہ و

خیرات اور انفاق فی سبیل اللہ سے اگر دل کی گاڑی کی بریک کھل گئی اور یہ گاڑی ایمانِ حقیقی کے راستے پر رواں دواں ہوگئی تو پھر اہلِ ایمان میں سے ہر کوئی اپنی ہمت اور کوشش کے مطابق اس راستے کی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ سیاقِ مضمون کے اعتبار سے اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر تم نے انفاقِ مال کے ذریعے مال کی محبت کو دل سے نکال کر اللہ کی محبت سے اپنے دل کو آباد کر لیا تو ایمانِ حقیقی تمہارے دلوں میں راسخ ہوتا چلا جائے گا۔ اس کے بعد تم اپنی اپنی کوششوں اور اپنی اپنی طبائع کے مطابق ترقی کرتے چلے جاؤ گے۔ ترقی کے اس راستے میں تم میں سے بعض لوگ شہادت کے مقام پر بھی فائز ہو سکتے ہیں اور بعض صِدّیقیت کا مرتبہ بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ وہی اعلیٰ مراتب ہیں جن کا ذکر سورۃ النساء کی اس آیت میں ہوا ہے:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾﴾

''اور جو کوئی اطاعت کرے گا اللہ کی اور رسولؐ کی تو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہیں معیت حاصل ہوگی اُن کی جن پر اللہ کا انعام ہوا' یعنی انبیاء کرام' صِدّیقین' شُہداء اور صالحین' اور کیا ہی اچھے ہیں یہ لوگ رفاقت کے لیے!''

چنانچہ تم ہمت کرو' اپنے دل کی گاڑی کی بریک کھولو' ایمان کا ایکسلریٹر (accelerator) دباؤ اور اللہ کے راستے پر نکل پڑو۔ اس ایکسلریٹر کو تم جتنا بڑھاتے چلے جاؤ گے اسی نسبت سے تمہاری منزل قریب سے قریب تر ہوتی چلی جائے گی۔ (انسانی مزاج اور طبائع کے اعتبار سے مقامِ صِدّیقیت اور مقامِ شہادت کی تفصیل جاننے کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ مریم کی آیت ۴۱ کی تشریح۔)

﴿لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ۭ﴾ ''اُن کے لیے ہوگا اُن کا اجر اور اُن کا نُور۔''

انہیں اللہ ربّ العزت کے ہاں سے اجر بھی ملے گا اور نُور بھی۔ نُور تو میدانِ حشر میں پُل صراط سے گزرنے کے لیے ملے گا' جبکہ اجر جنّت میں داخلے اور اس میں درجات کی بلندی کے لیے ملے گا۔

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۹﴾﴾ ''اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہی دوزخ والے ہیں۔''

آیات ۲۰ تا ۲۴

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۲۰﴾ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۱﴾ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۲۲﴾ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَ

اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۙ﴿۲۳﴾ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۴﴾

آیت ﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ﴾ ''خوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل' دل لگی کا سامان اور ظاہری ٹیپ ٹاپ ہے اور تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال واولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش ہے۔''

گزشتہ سطور میں دنیا کی محبت کو گاڑی کی بریک سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حُبِّ دنیا انسان کو اللہ کے راستے پر چلنے سے ایسے روک دیتی ہے جیسے ایک گاڑی کو اس کی بریک جامد وساکت کر دیتی ہے۔ اب اس آیت میں اس بریک یعنی حُبِّ دنیا کی اصل حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ تو آیئے اس آیت کے آئینے میں دیکھئے انسانی زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ انسانی زندگی کا آغاز کھیل کود (لعب) سے ہوتا ہے۔ بچپن میں انسان کو کھیل کود کے علاوہ کسی اور چیز سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ باپ امیر ہے یا غریب' اس کا کاروبار ٹھیک چل رہا ہے یا مندے کا شکار ہے' بچے کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا' اسے تو کھیلنے کودنے کا موقع ملتے رہنا چاہیے اور بس۔ پھر جب وہ لڑکپن کی عمر (teenage) کو پہنچتا ہے تو اس کا کھیل کود محض ایک معصوم مشغولیت تک محدود نہیں رہتا' بلکہ اس میں کسی نہ کسی حد تک تلذذ (sensual gratification) کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اس مشغولیت کو آیت میں لَهْو کا نام دیا گیا ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ عام طور پر قرآن میں انسان کی دنیوی زندگی کی حقیقت بیان کرنے کے لیے لَهْو و لَعب کی ترکیب استعمال ہوئی ہے' لیکن یہاں ان الفاظ کی ترتیب بدل دی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں عمر کی تقسیم کے حساب سے انسانی زندگی کے مراحل کا ذکر ہو رہا ہے اور اس حوالے سے لَعب یعنی کھیل کود کا مرحلہ پہلے آتا ہے جبکہ اس میں لَهْو کا عنصر بعد کی عمر میں شامل ہوتا ہے۔

جوانی کی اسی عمر میں انسان پر اپنی شخصیت کی ظاہری ٹیپ ٹاپ (زِیْنَة) کا جنون سوار ہوتا ہے۔ عمر کے اس مرحلے میں وہ شکل و صورت کے بناؤ سنگھار' ملبوسات وغیرہ کی وضع قطع' معیار اور فیشن کے بارے میں بہت حساس ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد جب عمر ذرا اور بڑھتی ہے تو تَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ کا مرحلہ آتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کا چوتھا اور اہم ترین مرحلہ ہے۔ اس عمر میں انسان پر ہر وقت تفاخر کا بھوت سوار ہوتا ہے' اور وہ عزت' شہرت' دولت' گھر' گاڑی وغیرہ کے معاملے میں خود کو ہر قیمت پر دوسروں سے برتر اور آگے دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد جب عمر ذرا ڈھلتی ہے تو تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ کا دور آتا ہے۔ اس دور میں انسان کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ تفاخر کے دور میں تو سوچ یہ تھی کہ کچھ بھی ہو جائے مونچھ نیچی نہیں ہونی چاہیے' لیکن اب سوچ یہ ہے کہ مال آنا چاہیے' مونچھ رہے یا نہ رہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس عمر میں پہنچ کر انسان اپنے مفاد کے معاملے میں بہت حقیقت پسند (realistic) ہو جاتا ہے' بلکہ جوں جوں بڑھاپے کی طرف جاتا ہے' اس کے دل میں مال و دولت کی ہوس بڑھتی چلی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک مرحلے پر اُسے خود بھی محسوس ہو جاتا ہے کہ اب وہ پاؤں قبر میں لٹکائے بیٹھا ہے' مگر اس کی هَلْ مِنْ مَّزِيْد کی خواہش ختم ہونے میں نہیں آتی۔ انسان کی اسی کیفیت کو سورۃ التکاثر میں یوں بیان فرمایا گیا ہے: ﴿اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ﴿۱﴾ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ﴿۲﴾﴾ ''(لوگو!) تم کو (مال کی) کثرت کی طلب نے غافل کر دیا' یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں۔''

بہر حال وقت کے ساتھ ساتھ انسان کی ترجیحات بدلتی رہتی ہیں' لیکن عمر کے ہر مرحلے میں کسی ایک چیز کی دُھن اس کے ذہن پر

سوار رہتی ہے۔اس موضوع پر یہ قرآن حکیم کی واحد آیت ہے اور اس اعتبار سے بہت اہم اور منفرد ہے' مگر حیرت ہے کہ انسانی زندگی کے نفسیاتی مراحل کے طور پر اسے بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے۔

آیت کے اگلے حصے میں انسانی اور نباتاتی زندگی کے مابین پائی جانے والی مشابہت اور مماثلت کا ذکر ہے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے کہ نباتاتی سائیکل (Botanical cycle) اور انسانی زندگی کے سائیکل (Human life cycle) دونوں میں بڑی گہری مشابہت اور مناسبت ہے۔اس تشبیہ سے انسان کو دراصل یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر تم اپنی زندگی کی حقیقت سمجھنا چاہتے ہو تو کسان کی ایک فصل کے سائیکل کو دیکھ لو۔اس فصل کے دورانیہ میں تمہیں اپنی پیدائش' جوانی' بڑھاپے' موت اور مٹی میں مل کر مٹی ہو جانے کا حقیقی نقشہ نظر آ جائے گا۔

﴿ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ﴾ ''(انسانی زندگی کی مثال ایسے ہے) جیسے بارش برستی ہے تو اس سے پیدا ہونے والی روئیدگی کسانوں کو بہت اچھی لگتی ہے''

﴿ ثُمَّ يَهِيْجُ ﴾ ''پھر وہ کھیتی اپنی پوری قوت پر آتی ہے''

﴿ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ﴾ ''پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہو جاتی ہے''

﴿ ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ﴾ ''پھر وہ کٹ کر چورا چورا ہو جاتی ہے۔''

اس تشبیہ کے آئینے میں انسانی زندگی کی مکمل تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ پھر وہ جوان ہو کر اپنی پوری قوت کو پہنچ جاتا ہے۔ پھر عمر ڈھلتی ہے تو بالوں میں سفیدی آ جاتی ہے اور چہرے پر جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ پھر موت آنے پر اسے زمین میں دبا دیا جاتا ہے جہاں وہ مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے۔لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ تشبیہ صرف دنیوی زندگی کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ہے۔تم اشرف المخلوقات ہو' نباتات نہیں ہو' تمہاری اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے جو کہ دائمی اور ابدی ہے اور اس کی نعمتیں اور صعوبتیں بھی دائمی اور ابدی ہیں۔لہٰذا عقل اور سمجھ کا تقاضا یہی ہے کہ تم اپنی آخرت کی فکر کرو۔

﴿ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ﴾ ''اور آخرت میں بہت سخت عذاب ہے اور (یا پھر) اللہ کی طرف سے مغفرت اور (اُس کی) رضا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے ابتدائی دور کا ایک خطبہ ''نہج البلاغہ'' میں نقل ہوا ہے۔اس کے اختتامی الفاظ یوں ہیں:

((... ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ، ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَ بِالسُّوْءِ سُوْءً ، وَاِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا)) (۳)

''.....پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہوگا اور پھر لازماً تمہیں بدلہ ملے گا اچھائی کا اچھا اور برائی کا برا۔اور وہ جنت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے دائمی۔''

﴿ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴾ ''اور دنیا کی زندگی تو سوائے دھوکے کے ساز و سامان کے اور کچھ نہیں ہے۔''

۳۔ بحوالہ جمهرة الخطب' ص ۵۔ وفقه السيرة للالبانی' ص ۹۷۔

تمہاری دنیوی زندگی کی حقیقت تو بس یہی ہے' لیکن تم ہو کہ اس حقیقت کو فراموش اور نظر انداز کیے بیٹھے ہو۔ تمہارے دل میں نہ اللہ کی یاد ہے اور نہ آخرت کی فکر۔ بس تم اس عارضی اور دھوکے کی زندگی کی آسائشوں میں مگن اور اسی کی رنگینیوں میں گم ہو۔ یاد رکھو! یہ طرزِ عمل غیروں کی پہچان تو ہو سکتا ہے' ایک بندۂ مؤمن کے ہرگز شایانِ شان نہیں ہے۔ بقول علامہ اقبال: ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گُم ہے
مؤمن کی یہ پہچان کہ گُم اُس میں ہیں آفاق!

آیت ۲۱ ﴿سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ ''ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی مغفرت اور اُس جنّت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین جیسی ہے۔''

دنیا کمانے میں تو تم لوگ خوب مسابقت کر رہے ہو۔ اس میدان میں تو تم ہر وقت ع ''ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں!'' کی فکر میں لگے رہتے ہو۔ عارضی دنیا کی اس مسابقت کو چھوڑو' اپنی یہی صلاحیتیں اللہ کی رضا اور جنّت کے حصول کے لیے صَرف کرو۔ اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے محنت کرو اور اس منزل میں بہتر سے بہتر مقام پانے کے لیے دوسروں سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔

جنّت کی وسعت کی مثال کے لیے یہاں ''كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ'' جبکہ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۳۳ میں ''عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ'' کے الفاظ آئے ہیں۔ موجودہ دور میں سائنس کی حیرت انگیز ترقی کے باوجود ابھی تک ارض وسماء کی وسعت کے بارے میں انسان کا علم نہ ہونے کے برابر ہے۔ بہرحال اب تک میسّر ہونے والی معلومات کے مطابق اس کائنات میں ارب ہا ارب کہکشائیں ہیں۔ ہر کہکشاں کی وسعت اور ایک کہکشاں سے دوسری کہکشاں کے فاصلے کو کروڑوں نُوری سالوں پر محیط تصوّر کیا گیا ہے۔ اسی طرح ہر کہکشاں میں اَن گنت ستارے' ہمارے نظامِ شمسی (solar system) جیسے بے شمار نظام اور ہماری زمین جیسے لاتعداد سیارے ہیں۔ اسی طرح ہر ستارے کی جسامت اور ایک ستارے سے دوسرے ستارے تک کے فاصلے کا اندازہ بھی نُوری سالوں میں کیا جا سکتا ہے۔ یہاں اس آیت میں آسمان اور زمین کی وسعت سے مراد پوری کائنات کی وسعت ہے جس کا اندازہ کرنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ بہرحال اس مثال سے جنّت کی وسعت کے تصوّر کو انسانی ذہن کی سطح پر ممکن حد تک قابلِ فہم بنانا مقصود ہے۔ اس حوالے سے میرا گمان یہ ہے (واللہ اعلم!) کہ قیامت برپا ہونے کے بعد پہلی جنّت اسی زمین پر بنے گی اور اہلِ جنّت کی ابتدائی مہمانی (نُزُل) بھی یہیں پر ہوگی۔ اس کے بعد اہلِ جنّت کے درجات ومراتب کے مطابق ان کے لیے آسمانوں کے دروازے کھولے جائیں گے۔ اس حوالے سے سورۃ الاعراف کی اس آیت میں واضح فرما دیا گیا ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ﴾ (آیت ۴۰) کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانے اور ان کے بارے میں تکبّر کرنے والوں کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔ بہرحال اس کے بعد اہلِ جنّت کو ان کے مراتب کے مطابق اُس جنّت میں منتقل کر دیا جائے گا جس کی وسعت کا یہاں ذکر ہوا ہے۔ اہلِ جنّت کو وہاں جانے کے لیے کسی راکٹ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوگی' بلکہ اللہ تعالیٰ انہیں اسی انداز سے آسمانوں پر لے جائے گا جیسے محمد رسول اللہ ﷺ سفرِ معراج میں زمین سے ساتویں آسمان تک چلے گئے تھے اور حضرت جبرائیل علیہ السلام ساتویں آسمان سے زمین پر آتے ہیں۔

﴿ اُعِدَّتْ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ؕ ﴾ ''وہ تیار کی گئی ہے اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسولوں پر۔''

''اِعداد'' (بابِ افعال) کے معنی ہیں کسی خاص مقصد کے لیے کسی چیز کو تیار کرنا۔ یعنی وہ جنّت بڑے اہتمام سے تیار کی گئی ہے' سجائی اور سنواری گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسولوں پر۔

﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۲۱﴾ ﴾ ''یہ اللہ کا فضل ہے جس کو بھی وہ چاہے گا دے گا۔ اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔''

''فَضْل'' سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بغیر استحقاق کے دی جانے والی شے۔ اس کے بالمقابل اجرت اور اجر کے الفاظ عام استعمال ہوتے ہیں' جن کا مطلب ہے بدلہ' جو کسی محنت اور مزدوری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں بالعموم جہاں بھی جنّت کا تذکرہ آیا ہے وہاں لفظ ''فَضْل'' استعمال ہوا ہے۔ گویا قرآن مجید کا تصوّر یہ ہے کہ انسان مجرد اپنے عمل کے ذریعے سے جنّت کا مستحق نہیں بن سکتا جب تک کہ اللہ تعالیٰ کا فضل اُس کی دست گیری نہ کرے۔ (۴)

اب اگلی آیت میں دنیوی زندگی میں پیش آنے والی تکالیف و مشکلات کو قابلِ برداشت بنانے کا نسخہ بتایا جا رہا ہے۔ دراصل اہلِ ایمان کو جس راستے کی طرف بلایا جا رہا ہے وہ بہت کٹھن اور صبر آزما راستہ ہے۔ یہ انفاق' جہاد اور قتال کا راستہ ہے اور اس کی منزل ''اقامتِ دین'' ہے' جس کا ذکر آگے آیت ۲۵ میں آ رہا ہے۔ اس اعتبار سے آیت ۲۵ اس سورت کے ذروۂ سنام (climax) کا درجہ رکھتی ہے۔ بہرحال اہلِ ایمان جب اس راستے پر گامزن ہوں گے تو آزمائشیں' صعوبتیں اور پریشانیاں قدم قدم پر ان کے سامنے رکاوٹیں کھڑی کریں گی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اٹل قانون ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں ارشادِ ربانی ہے: ﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ ﴾ (آیت ۱۵۵) ''اور ہم تمہیں لازماً آزمائیں گے کسی قدر خوف اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور ثمرات کے نقصان سے''۔ جبکہ سورۂ آل عمران میں اس قانون کا ذکر ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: ﴿ لَتُبْلَوُنَّ فِیْۤ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۫ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْۤا اَذًی كَثِیْرًا ؕ ﴾ (آیت ۱۸۶) ''(مسلمانو! یاد رکھو) تمہیں لازماً آزمایا جائے گا تمہارے مالوں میں بھی اور تمہاری جانوں میں بھی' اور تمہیں لازماً سننا پڑیں گی بڑی تکلیف دہ باتیں ان لوگوں سے بھی جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی

۴۔ اس ضمن میں یہ حدیث بھی ذہن میں رہنی چاہیے۔ حضور اکرم ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا: ((لَنْ یُدْخِلَ اَحَدًا عَمَلُهُ الْجَنَّةَ)) ''تم میں سے کسی شخص کا عمل اُسے ہرگز جنّت میں داخل نہیں کرے گا (جب تک کہ اللہ کی رحمت اس کی دستگیری نہ فرمائے)''۔ اب کسی صحابی نے بڑی ہمت' حوصلے اور جرأت سے کام لیتے ہوئے پوچھ لیا: وَلَا اَنْتَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ ! ''اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا آپ بھی (اعمال کی بنیاد پر جنّت میں داخل نہیں ہو سکتے)؟'' اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ((لَا وَلَا اَنَا' اِلَّا اَنْ یَتَغَمَّدَنِیَ اللّٰهُ بِفَضْلٍ وَّرَحْمَةٍ)) ''نہیں' میں بھی نہیں' اِلّا یہ کہ اللہ عزّوجل اپنے فضل و کرم اور اپنی رحمت کی چادر سے مجھے ڈھانپ دے۔'' [صحیح البخاری' کتاب المرضی' باب تمنی المریض الموت' ح: ۵۶۷۳۔ وصحیح مسلم' کتاب صفة القیامة والجنة والنار' باب لن یدخل احد الجنة بعمله...' ح: ۲۸۱۸] (حاشیہ از مرتّب)

تھی اور ان سے بھی جنہوں نے شرک کیا''۔ چنانچہ مشکلات و مصائب کی اس متوقع یلغار کے دوران اہلِ ایمان کو سہارا دینے کے لیے یہ نسخہ بتایا جا رہا ہے:

آیت ۲۲ ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ﴾ ''نہیں پڑتی کوئی پڑنے والی مصیبت زمین میں اور نہ تمہاری اپنی جانوں میں مگر یہ کہ وہ ایک کتاب میں درج ہے اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کریں۔''

اَصَابَ یُصِیْبُ (آ پڑنا' نازل ہونا) سے اسم الفاعل ''مُصِیب'' ہے اور اس کی مؤنث ''مُصِیْبَة'' ہے' جس کے معنی ہیں نازل ہونے یا آ پڑنے والی شے۔ چنانچہ لغوی اعتبار سے تمام حوادث' واقعات' کیفیات جو ہم پر وارد ہوتی ہیں' وہ سب کی سب اس میں شامل ہو جائیں گی' لیکن عام طور پر یہ لفظ تکلیف دہ' ناگوار اور ناپسندیدہ چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس آیت کی رو سے مصیبتیں دو قسم کی ہیں۔ یا تو آفاتِ ارضی و سماوی یعنی آفاقی مصیبتیں' جو زمین پر بڑے پیمانے پر نازل ہوتی ہیں' مثلاً سیلاب' زلزے' طوفانِ باد و باراں وغیرہ' یا انسانوں کی اپنی جانوں پر کوئی مصیبت آن پڑتی ہے' مثلاً کوئی بیماری یا کوئی عارضہ لاحق ہو گیا یا کوئی حادثہ پیش آ گیا۔ یہاں واضح فرما دیا گیا کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی انسانوں پر اجتماعی یا انفرادی طور پر کسی بھی شکل میں کوئی مصیبت' آفت یا تکلیف آتی ہے اس کے معرضِ وجود میں آنے سے قبل اس کی پوری تفصیل اللہ تعالیٰ کے علم قدیم میں پہلے سے موجود ہوتی ہے۔

﴿اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۲۲﴾ ''یقیناً یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔''

انسانوں کو یہ بات بے شک عجیب یا مشکل لگے' مگر اللہ کا علم مَا کَانَ وَمَا یَکُوْنُ پر محیط ہے۔ اس کے لیے کائنات کی ایک ایک چیز کا پوری تفصیل سے احاطہ کرنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ یہ بات تم لوگوں کو بھلا کیوں بتائی جا رہی ہے؟ اس لیے:

آیت ۲۳ ﴿لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ﴾ ''تاکہ تم افسوس نہ کیا کرو اُس پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتا رہے''

کوئی اچھا موقع ہاتھ سے نکل جانے پر انسان رہ رہ کر افسوس کرتا اور پچھتاتا ہے کہ اگر میں اس وقت یوں کر لیتا تو میرا یہ کام ہو جاتا' اگر فلاں شخص فلاں وقت فلاں رکاوٹ کھڑی نہ کر دیتا تو میں فلاں نقصان سے بچ جاتا وغیرہ وغیرہ۔ ایسے پچھتاوے بعض اوقات زندگی کا روگ بن جاتے ہیں۔ لیکن اگر اللہ اور اُس کے فیصلوں پر انسان کا ایمان مضبوط ہو تو وہ اپنے بڑے سے بڑے نقصان کو بھی یہ کہہ کر بھلا دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو میرے حق میں ایسا ہی منظور تھا اور اس چیز کے میرے ہاتھ سے نکل جانے میں ہی خیر تھی' کیونکہ میرے لیے کیا بہتر ہے اور کیا بہتر نہیں ہے اس کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ سورۃ البقرۃ کی یہ آیت اس بارے میں بہت واضح ہے:

﴿وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـــًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـــًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۲۱۶﴾

''اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی شے کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو' اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو درآنحالیکہ وہی تمہارے لیے بُری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے۔''

﴿وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۨ ۲۳﴾ ''اور اس پر اترایا نہ کرو جو وہ تمہیں دے دے' اور اللہ کو بالکل پسند نہیں ہیں اترانے والے اور فخر کرنے والے۔''

ایسی کسی صورت میں انسان کے لیے اترانے کا جواز اس لیے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے جو کچھ بھی دیا جاتا ہے دراصل اس کی آزمائش کے لیے دیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے ہمیں اس حقیقت کو کسی وقت بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اس دنیا میں ہمیں جو نعمت' صلاحیت یا دولت ملتی ہے اس کے لیے ہمیں جواب دہ ہونا ہے۔ چنانچہ جس انسان کے پاس دُنیوی نعمتوں کی جس قدر بہتات ہوگی جوابدہی کے حوالے سے اس کی ذمہ داری بھی اسی حد تک بڑھ جائے گی۔ اکاؤنٹس کی زبان میں ایسی ذمہ داری کو liability کہا جاتا ہے۔ جب کسی محکمے یا ادارے کی balance sheet تیار ہوتی ہے تو اس ادارے کو ملنے والا سرمایہ liability کے کھاتے میں لکھا جاتا ہے۔ کھاتے میں liability کا اندراج ہو جانے کے بعد اس کی ایک ایک پائی کا حساب دینا اس ادارے کی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ انسان کو دنیا میں جو کچھ دیتا ہے وہ اس کے ذمہ liability ہے۔ کل قیامت کے دن اس میں سے ہر چیز کا آڈٹ ہونا ہے۔ اس دن اللہ تعالیٰ بندے سے پوچھے گا کہ تمہیں جو مال دیا گیا تھا بتاؤ اس کا تم نے کیا کیا؟ میری طرف سے دی گئی قوت' ذہانت اور دوسری صلاحیتوں کو کہاں کہاں صَرف کیا؟ دنیا بنانے میں کھپایا یا آخرت کمانے میں لگایا؟ اس احتساب یا آڈٹ کا تصور کر کے ہم میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے کھاتے کی فکر کرنی چاہیے۔ جیسے آج ہمارے بہت سے لوگ ورلڈ بینک' آئی ایم ایف اور بین الاقوامی سطح کے دوسرے اداروں میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں اور لاکھوں ڈالر تنخواہ وصول کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک یقیناً یہ بہت بڑے اعزاز اور فخر کی بات ہے' لیکن ایسے لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ وہ کس کی چاکری کر رہے ہیں؟ اور کس کی رتھ میں گھوڑے بن کر جُتے ہوئے ہیں؟ ظاہر ہے وہ باطل نظام کی خدمت کر رہے ہیں اور اسی نظام سے اپنی خدمت کا معاوضہ وصول کر رہے ہیں۔ پھر ایسے لوگوں کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ آخرت کے آڈٹ کے وقت وہ اپنی balance sheet کو کیسے justify کریں گے۔

چنانچہ انسان کو مال و دولت اور دوسری نعمتوں پر اترانے کے بجائے ان کے حساب کتاب کی فکر کرنی چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ چیزیں اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش کے طور پر دی گئی ہیں۔ اگر وہ اس آزمائش میں ناکام ہو گیا تو یہی نعمتیں آخرت میں اُس کے گلے کا طوق بن جائیں گی۔ اس حوالے سے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا ایک واقعہ بہت عبرت انگیز ہے۔ آپؒ کو خلیفہ وقت کی طرف سے "خلقِ قرآن" کے مسئلے پر جیل میں ڈالا گیا۔ خلیفہ آپؒ سے اپنی مرضی کا فتویٰ حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے خلیفہ کے حکم پر جیل میں آپؒ پر بے پناہ تشدد ہوا۔ روایات میں آتا ہے کہ جس انداز میں آپؒ کو پیٹا جاتا تھا ایسی مار کسی ہاتھی کو پڑتی تو وہ بھی بلبلا اٹھتا' مگر اس بے رحم تشدد کو آپؒ نے ایسے حوصلے اور صبر سے برداشت کیا کہ کبھی آنکھوں میں آنسو تک نہ آئے۔ مگر جب نئے خلیفہ کے دور میں آپؒ کو جیل سے رہا کیا گیا اور خلیفہ کے ایلچی آپؒ کی خدمت میں اشرفیوں کے تھیلے لے کر حاضر ہوئے تو ان تھیلوں کو دیکھ کر آپؒ رو پڑے۔ آپؒ نے روتے ہوئے اللہ کے حضور عرض کی: اے اللہ' یہ آزمائش بہت سخت ہے! مَیں اس سے عہدہ برآ ہونے کے قابل نہیں ہوں' مجھے اس امتحان میں مت ڈال! اس حوالے سے دوسری انتہا پر برصغیر کے قوم فروشوں کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ برصغیر میں انگریزوں نے بڑی بڑی جاگیروں' عہدوں اور خطابات کے ذریعے یہاں کے لوگوں کو خریدا اور حکمرانوں کے ہاتھوں بکنے کے بعد وہ لوگ اپنی قوم سے غداری کر کے اپنے آقاؤں کی حکومت کو مضبوط کرنے کے لیے جِدّوجُہد کرتے رہے۔ بہرحال یہ ہر انسان کا اپنا فیصلہ ہے کہ اس کی ترجیح دنیا ہے یا آخرت؟

آیت ۲۴ ﴿الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۭ﴾ "جو لوگ بخل سے کام لیتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں۔"

جو شخص اپنی دولت پر اِتراتا ہے وہ اسے بہت سنبھال سنبھال کر بھی رکھتا ہے' کیونکہ اسی دولت کے بل پر تو اس کی اکڑ قائم ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اس دولت کو بچا بچا کر رکھتا ہے اور نہ صرف خود بخل سے کام لیتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتا ہے۔ دراصل اسے یہ اندیشہ لاحق ہوتا ہے کہ جب دوسرے لوگ اللہ کی راہ میں بڑھ چڑھ کر خرچ کریں گے تو اُس کے بخل کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ اس لیے وہ دوسروں کو بڑے مخلصانہ انداز میں سمجھاتا ہے کہ میاں ذرا اپنی ضروریات کا بھی خیال رکھو' تم نے تو اپنے دونوں ہاتھ کھلے چھوڑ رکھے ہیں۔ آخر تمہاری چار بیٹیاں ہیں' ان کے ہاتھ بھی تم نے پیلے کرنے ہیں۔ آج کی بچت ہی کل تمہارے کام آئے گی.....!

﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿٢٤﴾﴾ ''اور جو کوئی رخ پھیرے گا تو (وہ سن رکھے کہ) اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں خود ستودہ صفات ہے۔''

وہ غنی ہے' اسے کسی کی احتیاج نہیں ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اگر وہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں اپنے جان و مال سے شریک نہ ہوگا تو یہ کام نہیں ہوگا۔ اُسے کسی کی حمد و ثنا کی بھی کوئی احتیاج نہیں ہے' وہ اپنی ذات میں خود محمود ہے۔

آیت ۲۵

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿٢٥﴾

اب آ رہی ہے وہ آیت جو اس پوری سورۂ مبارکہ کا نقطۂ عروج یا ذروۂ سنام (climax) ہے۔ اس آیت کا مضمون خصوصی طور پر آج کے مسلمانوں کے لیے بہت اہم ہے۔ اس لیے کہ آج ہمارے ہاں دین کا اصل تصور مسخ ہو چکا ہے اور یہ آیت دین کے درست تصور کو اجاگر کرتی ہے۔ دراصل انگریزوں کی غلامی کے دور میں ہم مسلمانوں کے ذہنوں میں دین کا عام تصور یہی تھا کہ حکومت انگریز کی ہے تو ہوتی رہے' ہمیں کیا! ہم نے تو نمازیں پڑھنی ہیں اور روزے رکھنے ہیں۔ اس دور میں برصغیر کے ایک بہت بڑے عالم نے کہا تھا کہ ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے انگریزوں کو ہماری طرف سے کوئی تشویش لاحق ہو' اس لیے کہ انہوں نے ہمیں مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔ یعنی انگریز ہمیں نمازیں پڑھنے' روزے رکھنے' حج ادا کرنے اور داڑھیاں رکھنے سے نہیں روکتا۔ مذہبی آزادی کی اسی وکالت پر علامہ اقبال نے یہ چبھتی چست کی تھی: ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

ظاہر ہے انگریز مسلمانوں کو مراسمِ عبودیت ادا کرنے اور داڑھیاں بڑھانے سے کیوں منع کرتے؟ اس سے انہیں بھلا کیا خطرہ ہو سکتا تھا۔ ملک میں قانون تو تاجِ برطانیہ کا نافذ تھا' دیوانی اور فوجداری عدالتیں اسی قانون کے مطابق فیصلے کر رہی تھیں۔ اس ماحول میں اسلام کہاں تھا اور قرآنی قوانین کی کیا حیثیت تھی؟ عام مسلمانوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ تو بس اسی پر مسرور و مطمئن تھے کہ انہیں ''مکمل'' مذہبی آزادی حاصل ہے۔ بہرحال انگریز کی غلامی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارا تصورِ دین سکڑتے سکڑتے صرف چند عبادات

اور رسومات (rituals) تک محدود ہو گیا۔ اسی وجہ سے ہمارے ہاں آج بھی تصورِ دین یہی ہے کہ نماز پڑھو‘ روزے رکھو‘ ہو سکے تو حج کرو‘ قرآن خوانی کی محفلیں سجاؤ اور بس! اور جہاں تک سودی کاروبار اور حرام خوریوں کا تعلق ہے یہ دُنیوی معاملات ہیں‘ اسلام کا ان سے کیا لینا دینا؟ ہاں سال بہ سال عمرہ کر کے پچھلے گناہوں سے پاک ہو جایا کرو‘ جیسے ہندو گنگا میں نہا کر اپنے زعم میں اپنے سارے پاپ دھو ڈالتے ہیں۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر جب آپ اس آیت کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو دین کا روایتی تصور لڑکھڑاتا ہوا محسوس ہو گا۔ اس آیت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں ڈنکے کی چوٹ انقلاب کی بات کی گئی ہے‘ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایسی بے باک اور عریاں انقلابی عبارت پوری انسانی تاریخ کے کسی انقلابی لٹریچر میں موجود نہیں ہے۔ اس تمہید کے بعد آیئے اب اس آیت کا مطالعہ کریں اور اس کے ایک ایک لفظ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

آیت ۲۵ ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ﴾ ’’ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ‘‘

﴿وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ﴾ ’’اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان اُتاری‘‘

یہاں تین چیزوں کا تذکرہ فرمایا گیا ہے جو رسولوں کے ساتھ بھیجی گئیں: (۱) بیّنات (۲) کتاب‘ اور (۳) میزان ـــــ ان میں سب سے پہلی چیز ’’بیّنات‘‘ ہے۔ ’’بیّن‘‘ اُس شے کو کہتے ہیں جو اَز خود ظاہر اور نمایاں ہو اور اسے کسی دلیل اور وضاحت کی حاجت نہ ہو۔ ع ’’آفتاب آمد دلیلِ آفتاب!‘‘ یہ لفظ عام طور پر رسولوں کے تذکرے میں معجزات کے لیے آتا ہے۔

’’کتاب‘‘ کا لفظ عام فہم اور بالکل واضح ہے‘ جبکہ ’’میزان‘‘ سے مراد اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ نظام ہے جس میں حقوق و فرائض کا توازن موجود ہے۔ کسی معاشرے میں اگر حقوق و فرائض کے مابین توازن ہو گا تو وہ معاشرہ صحیح رہے گا‘ اور اگر اس کے اندر عدمِ توازن راہ پا گیا تو اسی کا نام ظلم‘ عدوان‘ زیادتی اور ناانصافی ہے۔

﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ ’’تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔‘‘

یہ ہے اس کتاب یعنی قرآن مجید کے نزول کا اصل مقصد۔ اب اس کے مقابلے میں اپنی موجودہ صورت کا بھی جائزہ لیں کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں سے قرآن کو کس حد تک ’’بے دخل‘‘ کر چکے ہیں۔ کیا قرآن اس لیے نازل ہوا تھا کہ قرآن خوانی کی مجالس سجالی جائیں؟ یا حسنِ قراءت کی محافل کا اہتمام کر لیا جائے‘ یا اس کی آیات کی خطاطی کی نمائشیں لگائی جائیں‘ یا چالیس مَن وزنی قرآن سونے کی تاروں سے لکھ کر لوگوں کی زیارت کے لیے رکھ دیا جائے ـــــ اور زندگی باطل نظام کے تحت ہی بسر کی جائے؟ اس حوالے سے مولانا ماہر القادری کی زبان سے قرآن کا یہ شکوہ کس قدر حقیقت پر مبنی ہے: ؎

یہ میری عقیدت کے دعوے‘ قانون پہ راضی غیروں کے
یوں بھی مجھے رسوا کرتے ہیں‘ ایسے بھی ستایا جاتا ہوں!

ظاہر ہے قرآن تو ایک ضابطہ زندگی اور ایک نظامِ حکومت لے کر آیا ہے۔ یہ اپنے ماننے والوں سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس کے نظام کو عملی طور پر اپنے ملک اور معاشرے میں قائم کریں‘ اس کی لائی ہوئی میزان کو نصب کریں اور اس کی دی ہوئی شریعت کے مطابق اپنے فیصلے کریں ع ’’گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں!‘‘

اس آیت کا مطالعہ کرتے ہوئے یہاں درج ذیل آیات کو بھی دہرانے کی ضرورت ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے بارے میں فرمایا: ﴿قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ﴾ (آیت ۱۸) کہ میں عدل وقسط کو قائم کرنے والا ہوں۔ سورۃ النساء میں اہلِ ایمان کو باقاعدہ حکم دیا گیا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ (آیت ۱۳۵) ''اے اہلِ ایمان! کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے گواہ بن کر''۔ سورۃ المائدۃ میں الفاظ کی ترتیب بدل کر یہی حکم پھر سے دہرایا گیا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫﴾ (آیت ۸) ''اے اہلِ ایمان! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بن جاؤ''۔ پھر سورۃ الشوریٰ میں حضور ﷺ سے اعلان کروایا گیا: ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَكُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۵) ''مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے مابین عدل قائم کروں''۔ پھر سورۃ الشوریٰ ہی میں فرمایا گیا: ﴿اَللّٰهُ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ ؕ﴾ (آیت ۱۷) ''اللہ وہ ہستی ہے جس نے نازل فرمائی کتاب حق کے ساتھ اور میزان بھی''۔ یعنی سورۃ الشوریٰ کی اس آیت میں بھی کتاب اور میزان نازل کرنے کا ذکر ایک ساتھ آیا ہے۔

اس حوالے سے سورۃ المائدۃ کی یہ آیت خصوصی اہمیت کی حامل ہے: ﴿قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَیْءٍ حَتّٰى تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ﴾ (آیت ۶۸) ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ اے اہلِ کتاب! تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے جب تک تم قائم نہیں کرتے تورات کو اور انجیل کو اور اُس کو جو کچھ تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے تمہارے ربّ کی طرف سے''۔ سورۃ المائدۃ کی اس آیت کے مطالعہ کے دوران میں نے کہا تھا کہ مسلمان ''تورات و انجیل'' کی جگہ لفظ ''قرآن'' رکھ کر اس آیت کو اس طرح پڑھ کر دیکھیں اور پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے خود ہی اپنی حیثیت کا تعین کریں: ''قُلْ یٰۤاَهْلَ الْقُرْاٰنِ لَسْتُمْ عَلٰى شَیْءٍ حَتّٰى تُقِیْمُوا الْقُرْاٰنَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ'' کہ اے قرآن والو! تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے جب تک تم قائم نہیں کرتے قرآن کو اور اس کو جو تمہاری جانب تمہارے ربّ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے —— تم قرآن کی تلاوت کر کے سمجھ لیتے ہو کہ تم نے قرآن کا حق ادا کر دیا' یا تراویح میں قرآن ختم کر کے فخر محسوس کرتے ہو کہ تم نے بڑا تیر مار لیا' چاہے تم نے اس کا ایک حرف بھی نہ سمجھا ہو۔ یاد رکھو! جب تک تم قرآن کے احکام کو عملی طور پر خود پر نافذ نہیں کرتے ہو اور قرآن کے نظامِ عدل کو اپنے ملک و معاشرہ میں قائم نہیں کرتے ہو' قرآن پر ایمان کے تمہارے زبانی دعوے کی کوئی حیثیت نہیں۔

قرآن کے نظامِ عدل وقسط کے حوالے سے یہ حقیقت بھی مدِنظر رہنی چاہیے کہ معاشرے کے مراعات یافتہ طبقات کے لیے یہ نظام کسی قیمت پر قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ اس لیے جونہی اس کے قیام کے لیے ٹھوس کوششوں کا آغاز ہوگا یہ طبقات ان کوششوں کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کے لیے آموجود ہوں گے۔ ظاہر ہے جن سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے مفادات (vested interests) پرانے نظام کے ساتھ وابستہ ہیں' وہ کب چاہیں گے کہ معاشرے میں عدل وانصاف کا دور دورہ ہو۔ اگرچہ اس حوالے سے بھی تاریخ میں استثنائی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہما اپنے معاشرے کے اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے' اس کے باوجود ان دونوں حضراتؓ نے اپنے مفادات' کاروبار اور سٹیٹس کی پروا کیے بغیر حق کی آواز پر بلا تاخیر لبیک کہا۔ لیکن مجموعی طور پر اشرافیہ اور دولت مند طبقہ ہمیشہ نظامِ عدل کے قیام کی کوشش میں سب سے بڑی رکاوٹ بنتا ہے۔ مراعات یافتہ طبقات کی سرتوڑ کوشش ہوتی ہے کہ موجودہ نظام کے اندر کوئی تبدیلی نہ آئے۔ چنانچہ باطل نظام کی بیخ کنی اور نظامِ عدل وقسط کے قیام کی جدوجہد کے

لیے اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والوں کو راستے سے ہٹانا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ آیت کے اگلے حصے میں ایسے عناصر کی سرکوبی کا نسخہ بتایا جا رہا ہے:

﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ ''اور ہم نے لوہا بھی اُتارا ہے' اس میں شدید جنگی صلاحیت ہے اور لوگوں کے لیے دوسری منفعتیں بھی ہیں۔''

نوٹ کیجیے! نہ کوئی لگی لپٹی بات کی گئی ہے اور نہ ہی معذرت خواہانہ اسلوب اپنایا گیا ہے۔ جو بات کہنا مقصود تھی وہ دوٹوک انداز میں ڈنکے کی چوٹ کہی گئی ہے۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ یہ ''عریاں ترین'' انقلابی عبارت ہے۔ ظاہر ہے جب انقلاب اپنا راستہ بنائے گا اور جب ظالمانہ نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا مرحلہ آئے گا تو خون بھی ضرور بہے گا اور کچھ سر بھی کچلنے پڑیں گے۔ یہ انقلاب کا ناگزیر مرحلہ ہے' اس کے بغیر انقلاب کی تکمیل ممکن ہی نہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے نظامِ عدل کے لیے انقلاب کی بات ہو رہی ہے جو ساری کائنات کا خالق اور مالک ہے۔ یہاں تو ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ دنیا میں خود انسان عدلِ انسانی کے اپنے تصور کی ترویج و تنفیذ کے لیے طاقت کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں' مخالف ممالک کا گھیراؤ کرتے ہیں' ان پر بے رحمانہ پابندیاں عائد کرتے ہیں۔ ''امن کے لیے جنگ'' (War for Peace) کا نعرہ لگا کر کمزوروں پر چڑھائی کرتے ہیں اور پھر ملکوں کے ملک برباد کر کے رکھ دیتے ہیں' اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس قتل و غارت اور بربریت کو وہ وقت کی اہم ضرورت اور عین انصاف سمجھتے ہیں۔

اس کائنات کا خالق اور مالک بھی اللہ ہے اور زمین پر حکمرانی کا حق بھی اُسی کا ہے۔ اُسی نے اپنی تمام مخلوق کو اپنا تابع فرمان بنایا ہے اور اُسی نے انسان کو ایک حد تک اختیار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اسی اختیار کی وجہ سے انسان اکثر من مانی کرتے ہوئے اُس کی حکمرانی کے مقابلے میں اپنی حکمرانی قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اسی وجہ سے زمین میں فساد برپا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ وہ زمین میں عدل و انصاف کی ترویج اور اپنے قانون کی حکمرانی چاہتا ہے۔ اس کے لیے اس کی مشیت یہی ہے کہ اُس کے حقِ حکمرانی کو چیلنج کرنے والے باغیوں کو حق کی طاقت کے ذریعے سے کچل دیا جائے: ﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ﴾ (الانبیاء:۱۸) ''بلکہ ہم حق کو دے مارتے ہیں باطل پر تو وہ اس کا بھیجا نکال دیتا ہے' تو جبھی وہ نابود ہو جاتا ہے''۔ بہرحال اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اُس کا یہ کام اُس کے نام لیوا کریں۔ اُس کے نام لیوا حق کے علمبردار بن کر اللہ کے باغیوں کا مقابلہ کریں' باطل نظام کو بزورِ بازو اُکھاڑ پھینکیں اور اللہ کی زمین پر اللہ کی حکمرانی کو یقینی بنائیں۔

آیت زیر مطالعہ میں لوہے کا ذکر اسی حوالے سے آیا ہے کہ اہلِ حق حالات و زمانہ کی ضرورت کے مطابق اپنے تمام وسائل بروئے کار لاتے ہوئے سامانِ حرب تیار کریں' رائج الوقت ٹیکنالوجی سے استفادہ کریں اور باطل کے مقابلے کے لیے مطلوبہ طاقت فراہم کریں۔ لیکن اس انقلابی عمل میں سب سے اہم سوال اُفرادی قوت کی فراہمی کا ہے' اور اس عمل کی ابتدا دعوت و تبلیغ سے ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں بارہ سال تک مسلسل دعوت و تبلیغ کا کام کیا۔ حق کو قبول کرنے والے افراد کی تربیت کی' انہیں منظم کیا اور جب مطلوبہ افرادی قوت فراہم ہو گئی تو آپؐ نے اللہ کی مشیت کے عین مطابق طاقت کے اس ''کوڑے'' کو باطل کے سر پر یوں دے مارا کہ اس کا بھیجا نکال کے رکھ دیا۔ آج بھی یہ کام اگر ہوگا تو اسی طریقے سے ہوگا جس طریقے سے حضور ﷺ نے اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کیا۔ آج بھی اہلِ حق کو اسی طرح جانیں قربان کرنا ہوں گی' تکلیفیں جھیلنا پڑیں گی' گھر بار چھوڑنے پڑیں گے اور جان و

مال کے نقصانات برداشت کرنا پڑیں گے۔ گویا یہ انتہائی مشکل کام ہے اور اہلِ حق کی بے دریغ قربانیوں کے بغیر اس کا پایۂ تکمیل تک پہنچنا ممکن نہیں۔

﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝۲۵﴾ ''اور تا کہ اللہ جان لے کہ کون مدد کرتا ہے اُس کی اور اُس کے رسولوں کی غیب میں ہونے کے باوجود۔ یقیناً اللہ بہت قوت والا' بہت زبردست ہے۔''

''تا کہ اللہ جان لے'' کا مفہوم یہ ہے تا کہ اللہ تعالیٰ دکھا دے' ظاہر کر دے' ممیز کر دے کہ کون ہے وہ جو غیب کے باوجود اللہ اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ گویا حق و باطل کی جنگ کے دوران جو مردانِ حق لوہے کی طاقت کو ہاتھ میں لے کر اللہ کے دین کے غلبے کے لیے میدان میں آئیں گے وہی اللہ اور اُس کے رسولؐ کے مددگار ہوں گے۔ دراصل اللہ کے دین کو غالب کرنا بنیادی طور پر حضور ﷺ کا فرضِ منصبی ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اسی مقصد کے لیے مبعوث فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (الصف:۹) ''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ اور دینِ حق کے ساتھ' تا کہ وہ غالب کر دے اس کو کُل کے کُل دین پر''۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ حضور ﷺ کے اس مشن میں تمام اہلِ ایمان آپؐ کے دست و بازو بنیں' بلکہ سورۃ الصف میں تو اس کے لیے براہِ راست حکم آیا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾ (آیت ۱۴) ''اے اہلِ ایمان! اللہ کے مددگار بن جاؤ۔''

یہ مضمون سورۃ الصف میں مزید وضاحت کے ساتھ آئے گا۔ لیکن اس حوالے سے یہاں یہ اہم نکتہ سمجھ لیجیے کہ آیت زیر مطالعہ میں غلبۂ دین کی تکمیل اور نظامِ عدل و قسط کی تنفیذ کے لیے تین چیزوں کا ذکر ہوا ہے: بیّنات' کتاب اور میزان: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ﴾ یعنی حضور ﷺ سے پہلے رسولوں کو اس مشن کے لیے بیّنات (معجزات)' کتاب اور میزان کے ساتھ بھیجا جاتا رہا' جبکہ حضور ﷺ کو اس مشن کے لیے صرف دو چیزیں (الہدیٰ اور دین الحق) عطا کی گئیں: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ﴾ (التوبہ:۳۳' الفتح:۲۸ اور الصف:۹)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کے لیے بیّنات (معجزات) اور الکتاب ایک ہو گئے۔ یعنی الہدیٰ (قرآن) آپؐ کی کتاب بھی ہے' اسی میں قانون ہے اور یہی آپؐ کا سب سے بڑا معجزہ بھی ہے' جبکہ آپؐ کی رسالت میں میزان (شریعت) مکمل ہو کر ''دین الحق'' کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

آیات ۲۶ تا ۲۹

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۲۶ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓي اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ

اَجۡرَهُمۡ ۚ وَ كَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ فٰسِقُوۡنَ ﴿۲۶﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوۡا بِرَسُوۡلِهٖ يُؤۡتِكُمۡ كِفۡلَيۡنِ مِنۡ رَّحۡمَتِهٖ وَيَجۡعَلۡ لَّكُمۡ نُوۡرًا تَمۡشُوۡنَ بِهٖ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۲۸﴾ لِّئَلَّا يَعۡلَمَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ اَلَّا يَقۡدِرُوۡنَ عَلٰى شَىۡءٍ مِّنۡ فَضۡلِ اللّٰهِ وَ اَنَّ الۡفَضۡلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ ﴿۲۹﴾ ع

اس سورۂ مبارکہ کا اصل مضمون تدریجاً آگے بڑھتا ہوا آیت ۲۵ پر اپنے نقطۂ عروج (climax) پر پہنچ گیا ہے۔ اب آئندہ آیات میں گویا اس مضمون کا ضمیمہ اور تکملہ آ رہا ہے (قبل ازیں کبھی میں بغرضِ تفہیم اس کے لیے anti climax کی اصطلاح استعمال کرتا رہا ہوں' لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ یہ اصطلاح مناسب نہیں ہے)۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر مناسب ہوگا کہ متعلقہ آیات کے مطالعے سے پہلے اس مضمون کی روح کو اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے۔ ظاہر ہے زمین پر اللہ کے قانون کی حکمرانی اور معاشرے میں عدل و انصاف کی ترویج شیطان پر بہت بھاری ہے۔ اس لیے اس نے اس ''انقلاب'' کا راستہ روکنے کے لیے یہ چال چلی کہ مخلص اہلِ ایمان کی توجہ ترکِ دنیا اور رہبانیت کی طرف مبذول کرا دی' تاکہ اُسے انسانوں کے معاشرے میں ننگا ناچ ناچنے کی کھلی چھٹی مل جائے۔

اہلِ ایمان کے دلوں میں اللہ کی محبت' دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی طلب کے جذبے کا نتیجہ تو یہ نکلنا چاہیے کہ وہ اللہ کی فوج کے سپاہی بن کر اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے علمبردار بن جائیں اور نتائج سے بے پروا ہو کر ہر زماں' ہر مکاں شیطانی قوتوں کے خلاف برسرِ پیکار رہیں' لیکن شیطان نے ایسے لوگوں کو رہبانیت کا سبق پڑھا دیا کہ اللہ والوں کا دنیا کے جھمیلوں سے کیا واسطہ؟ انہیں تو چاہیے کہ وہ دنیا اور علائقِ دنیا کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں کی غاروں میں بیٹھ کر اللہ کی عبادت کریں اور اللہ کے ہاں اپنے درجات بلند کریں۔ ظاہر ہے ایسی رہبانیت دین کی اصل روح کے خلاف ہے۔ غلبۂ دین کی جدّوجُہد کی راہ میں مصیبتیں جھیلنے' اس میدان میں شیطانی قوتوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے مال و جان کی قربانیاں دینے اور خانقاہوں میں بیٹھ کر عبادت و ریاضت کی سختیاں برداشت کرنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اللہ کے راستے میں جہاد کی سختیاں برداشت کرنے سے معاشرے سے ظلم و ناانصافی کا خاتمہ ہوتا ہے' انسانیت عدل و انصاف کے ثمرات سے بہرہ ور ہوتی ہے اور ماحول میں فلاح و خوشحالی کے پھول کھلتے ہیں' جبکہ رہبانیت کی راہ میں اٹھائی گئی تکالیف سے دنیا اور اہلِ دنیا کو کسی قسم کا فائدہ پہنچنے کا کوئی امکان نہیں۔ بہرحال شیطان کا یہ وار عیسائیت کے حوالے سے بہت کارگر ثابت ہوا۔ اس کے نتیجے میں عیسائیوں کے ہاں نہ صرف خانقاہی نظام کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ''رہبانیت'' اعلیٰ ترین ذریعہ اور وسیلہ قرار پائی۔

(History of Christian Monasticism پر لکھی گئی یورپین مصنفین کی بڑی بڑی ضخیم کتابیں عیسائی راہبوں اور رہبانیت کے بارے میں عجیب و غریب تفصیلات سے بھری پڑی ہیں۔)

اس کے بعد اسلام میں جب خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی اور احیاءِ خلافت کی چند کوششیں ناکامی سے دوچار ہوئیں تو مسلمانوں کے ہاں بھی رہبانیت کے طور طریقے رائج ہونا شروع ہو گئے۔ اس کی عملی صورت یہ سامنے آئی کہ مخلص اہلِ ایمان اور اہلِ علم لوگ بادشاہوں اور سلاطین کے رویّے کی وجہ سے اُمّت کے اجتماعی معاملات سے لاتعلق ہو کر گوشۂ تنہائی میں جا بیٹھے۔ البتہ ان کے

شاگردوں اور عقیدت مندوں نے ان سے اکتسابِ فیض کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس طرح رفتہ رفتہ اہل اللہ اور اہلِ علم کی مسندوں نے خانقاہوں کی شکل اختیار کر لی۔ سلاطین و اُمراء نے اپنے مفاد کے لیے ان خانقاہوں کی سرپرستی کرنی شروع کر دی۔ ایسی خانقاہوں کے لیے بڑی بڑی جاگیریں مختص کر دی گئیں تاکہ خانقاہ اور اس سے متعلقہ تمام لوگوں کے اخراجات احسن طریقے سے پورے ہوتے رہیں اور یہ لوگ حکومت کے معاملات میں دخل اندازی کرنے کے بجائے اطمینان کے ساتھ چلہ کشیوں اور اپنی روحانی منازل طے کرنے میں مصروف و مشغول رہیں۔ دوسری طرف ان خانقاہوں سے متعلقہ لوگوں کے ہاں بھی رفتہ رفتہ دین و دنیا کا یہ تصور جڑ پکڑتا گیا کہ حکومت کرنا اور اجتماعی معاملات نپٹانا سلاطین و اُمراء کا کام ہے' ہمیں ان معاملات سے کیا سروکار؟ ہمارا کام تو دینی تعلیمات کی اشاعت اور لوگوں کی روحانی اصلاح کرنا ہے' تاکہ وہ اچھے مسلمان اور اللہ کے مقرب بندے بن سکیں۔ یوں دین اسلام کا اصل تصور دھندلاتا گیا اور اس کی جگہ خانقاہی نظام کی حوصلہ افزائی ہوتی رہی۔ دین کا درست تصور اور انبیاء و رسل علیہم السلام کی بعثت کا اصل مقصد تو وہی ہے جو ہم گزشتہ آیت میں پڑھ چکے ہیں: ﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ ''تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہو جائیں۔''

چنانچہ آئندہ آیات میں ایک تو یہ نکتہ واضح کیا گیا ہے کہ انسانیت نے ''رہبانیت'' کا غلط موڑ کب اور کیسے مڑا' اور ساتھ ہی مسلمانوں کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اے مسلمانو! بے شک دنیا سے بے رغبتی اختیار کرنا اور دنیا کے مقابلے میں آخرت بنانے کی فکر اختیار کرنا ہی دین کا اصل جوہر ہے' لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم راہب بن کر تمدن کی زندگی کو خیرباد کہہ دو' بن باس لے لو اور جنگلوں میں جا کر چلے کاٹنا شروع کر دو' پہاڑوں کی چوٹیوں اور غاروں میں جا کر تپسیائیں کرو' یا خانقاہوں میں گوشہ نشین ہو جاؤ۔ تمہیں تو دنیا کی منجدھار میں رہتے ہوئے دوسروں کو زندگی کی ضمانت فراہم کرنی ہے۔ تمہیں تو جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے دنیا میں حق کا بول بالا کرنا ہے۔ ظلم و ناانصافی کو جڑ سے اکھاڑ کر معاشرے میں عدل و انصاف کا نظام قائم کرنا ہے' اور اپنے اردگرد ایسا ماحول پیدا کرنا ہے جس میں مظلوم کو اُس کا حق ملے اور ظالم کو سر چھپانے کی جگہ نہ مل سکے۔ اس کے لیے تمہارے سامنے اُسوۂ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قائم کردہ معیار بطورِ نمونہ موجود ہے۔

حضور ﷺ نے عرب کے معاشرے کو حق و انصاف کا جو معیار عطا کیا تھا اس کی جھلک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اس تقریر میں بھی دیکھی جا سکتی ہے جو آپؓ نے لوگوں سے بیعت خلافت لینے کے فوراً بعد کی تھی۔ آپؓ نے بحیثیت امیر المؤمنین اپنے پہلے خطاب میں عدل و انصاف کے بارے میں اپنی ترجیح واضح کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''لوگو! تمہارا کمزور شخص میرے نزدیک بہت قوی ہوگا جب تک کہ میں اُسے اُس کا حق نہ دلوا دوں اور تمہارا قوی شخص میرے نزدیک بہت کمزور ہوگا جب تک کہ میں اُس سے کسی کا حق وصول نہ کر لوں''۔ اسی طرح اس ضمن میں حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کے وہ الفاظ بھی بہت اہم ہیں جو آپؓ نے ایرانی افواج کے سپہ سالار رستم کو مخاطب کرتے ہوئے کہے تھے۔ قادسیہ کے محاذ پر اسلامی افواج کے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جنگ سے پہلے ایرانیوں کے ساتھ مذاکرات کے لیے حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا۔ رستم نے ان سے سوال کیا تھا کہ تم لوگ یہاں کیا لینے آئے ہو؟ اس پر انہوں نے اپنے مشن کی وضاحت ان الفاظ میں کی تھی:

إنَّ اللّٰہ ابتعثنا لنخرج العباد من عبادۃ العباد الی عبادۃ ربِّ العباد' ومن ضیق الدُّنیا الی سِعَۃ الآخرۃ ومن جور الادیان الی عدل الاسلام

''ہمیں اللہ نے بھیجا ہے تاکہ ہم بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر بندوں کے رب کی غلامی میں لے آئیں' اور انہیں دنیا کی تنگی سے نکال کر آخرت کی کشادگی سے ہم کنار کریں' اور باطل نظاموں سے نجات دلا کر اسلام کے عادلانہ نظام سے روشناس کرائیں۔''

یہ ہے اس مضمون کا لُبِّ لُباب جو اس سورت کے آخر میں مرکزی مضمون کے ضمیمے کے طور پر بیان ہوا ہے۔ اب اگلی آیت سے اس مضمون کی تمہید شروع ہو رہی ہے۔

آیت ۲۶ ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ﴾ ''اور ہم نے ہی بھیجا تھا نوحؑ کو بھی اور ابراہیمؑ کو بھی''

﴿وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ﴾ ''اور ہم نے انہی دونوں کی نسل میں رکھ دی نبوت اور کتاب''

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر عذاب کے بعد انسانیت کی نسل حضرت نوحؑ کے تین بیٹوں حضرت سامؑ' حضرت حامؑ اور حضرت یافثؑ سے چلی تھی۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جو انبیاء بھی آئے وہ آپؑ ہی کی نسل سے تھے۔ البتہ قرآن میں صرف سامی رسولوں کا تذکرہ ہے' آپؑ کے دوسرے دو بیٹوں کی نسلوں میں مبعوث ہونے والے پیغمبروں کا ذکر قرآن میں نہیں آیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام خود بھی حضرت نوح علیہ السلام ہی کی نسل سے تھے' لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں جو انبیاء و رسل علیہم السلام آئے ان کا ذکر قرآن میں تخصیص کے ساتھ آپؑ کی نسل یا ذُرِّیت کے حوالے سے ہوا ہے۔ آج حضرت ابراہیم علیہ السلام کو گزرے تقریباً پانچ ہزار برس ہو چکے ہیں۔ اس دوران آپؑ کی اولاد کہاں کہاں پہنچی اور کس کس علاقے میں آباد ہوئی' یہ اپنی جگہ تحقیق کا ایک مستقل موضوع ہے' لیکن اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپؑ کی نسل جس جس علاقے میں بھی آباد ہوئی ان تمام علاقوں میں انبیاء آتے رہے۔

﴿فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۲۶﴾ ''تو ان (کی نسل) میں کچھ تو ہدایت یافتہ بھی ہیں' لیکن ان کی اکثریت فاسقوں پر مشتمل ہے۔''

آیت ۲۷ ﴿ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ﴾ ''پھر ہم نے بھیجے ان کے نقشِ قدم پر اپنے بہت سے رسولؑ اور پھر ان کے پیچھے بھیجا ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو اور اُسے ہم نے انجیل عطا فرمائی''

آیت ۲۶ اور ۲۷ میں حضرت نوحؑ' حضرت ابراہیم اور دوسرے انبیاء و رسل علیہم السلام کا ذکر تمہید کے طور پر آیا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے اصل میں یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ کرنا مقصود ہے جن کے پیروکاروں نے رہبانیت کی ابتدا کی تھی۔

﴿وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ۭ﴾ ''اور جن لوگوں نے اس کی پیروی کی ہم نے ان کے دلوں میں بڑی نرمی اور رحمت پیدا کر دی۔''

رأفت اور رحمت ملتے جلتے مفہوم کے دو الفاظ ہیں۔ رأفت دراصل وہ انسانی جذبہ ہے جس کے تحت انسان کسی کو تکلیف میں دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے۔ بقول امیر مینائی ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!

یعنی یہ جذبۂ رأفت ہی ہے جس کی وجہ سے انسان کسی کے درد کو اپنا درد سمجھتا ہے' جبکہ رحمت کا جذبہ انسان کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ دوسرے انسان کی تکلیف دور کرنے کے لیے کوشش کرے۔ گویا رأفت کا جذبہ بنیادی طور پر انسان کے دل میں تحریک پیدا کرتا ہے اور اس کے ردِّعمل

(reflex action) کا اظہار جذبۂ رحمت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے رأفت اور رحمت باہم تکمیلی (complementary) نوعیت کے جذبات ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے گویا تصدیق فرمائی گئی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں کے دلوں کو خصوصی طور پر رأفت و رحمت کے جذبات سے مزین کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود بھی مزاج کے اعتبار سے انتہائی نرم اور رقیق القلب تھے' آپؑ کی شخصیت میں سختی کا عنصر بالکل نہیں تھا۔ آپؑ کی شخصیت کے اس پہلو کا اندازہ اس مثال سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دفعہ آپؑ نے ایک شخص کو چوری کرتے دیکھا تو پوچھا کہ کیا تم چوری کر رہے ہو؟ اس نے کہا: نہیں میں چوری تو نہیں کر رہا۔ آپؑ نے فرمایا: اچھا تو پھر میری آنکھ نے غلط دیکھا ہے۔ چنانچہ آپؑ کی شخصیت کے زیر اثر آپؑ کے حواریین کی طبیعتوں میں بھی رأفت' رحمت' رقتِ قلب اور شفقت کے غیر معمولی جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ یہ جذبات بلاشبہ اپنی جگہ مستحسن ہیں۔ خود حضور ﷺ کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نے سورۃ التوبہ میں فرمایا ہے کہ آپؐ اہلِ ایمان کے حق میں بہت نرم دل اور شفیق ہیں: ﴿بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (رأفۃ اور رءوف ایک ہی مادے سے ہیں)۔ بہرحال شیطان نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کے مزاج کی نرمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُن کے ان جذبات کا رخ رہبانیت کی طرف موڑ دیا۔

﴿وَرَهْبَانِيَّةَ ۟ابْتَدَعُوْهَا﴾ ''اور رہبانیت کی بدعت انہوں نے خود ایجاد کی تھی''

﴿مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ﴾ ''ہم نے اسے اُن پر لازم نہیں کیا تھا مگر اللہ کی خوشنودی کی تلاش میں''

اس فقرے کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ یہ رہبانیت انہوں نے اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اختیار کی تھی' اس میں ان کی کسی بدنیتی کا عنصر شامل نہیں تھا۔ اس کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ ہم نے تو ان پر کچھ لازم نہیں کیا تھا سوائے اس کے کہ وہ اللہ کی رضا تلاش کریں۔ لیکن انہوں نے اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے نفس کُشی (self annihilation)' ترکِ دنیا' رہبانیت اور تجرد (بغیر نکاح کے) کی زندگی بسر کرنے کا راستہ اختیار کر لیا۔ بہرحال حقیقت میں یہ اللہ کی رضا کا راستہ نہیں تھا۔ اللہ کی رضا حاصل کرنے کا درست راستہ تو جہاد کا راستہ ہے: ﴿وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ﴾ (المائدۃ:۳۵) ''اللہ کا قُرب تلاش کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو!'' یعنی باطل کو ملیامیٹ کرنے' حق کو غالب کرنے' ظلم و ناانصافی کو اکھاڑ پھینکنے اور عدل و قسط کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے مجاہد بن جاؤ! اس راستے پر چلتے ہوئے جان و مال کی قربانیاں دو' فاقے برداشت کرو اور ہر طرح کی تکالیف و مشکلات کا سامنا کرو۔ بہرحال شیطان نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کو اللہ کے مقرب بننے اور اُس کی رضا تلاش کرنے کا یہ راستہ اُن کی نظروں سے اوجھل کر کے رہبانیت کے راستے پر ڈال دیا تاکہ اللہ کے نیک اور مخلص بندے تمدن کے معاملات سے لاتعلق رہیں اور معاشرے کے اندر ابلیسیت کے ننگے ناچ کو روکنے ٹوکنے والا کوئی نہ ہو۔ دنیا میں ظالموں اور شریروں کو کھلی چھوٹ حاصل ہو اور ان کو چیلنج کرنے والا کوئی نہ ہو۔ علامہ اقبال نے ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں اس کی بہترین تعبیر کی ہے کہ ابلیس نے اپنے چیلے چانٹوں کو ہدایات دیتے ہوئے ''مؤمن'' کے بارے میں کہا کہ ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے!

﴿فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ ''پھر وہ اس کی رعایت بھی نہ کر سکے جیسا کہ اس کی رعایت کرنے کا حق تھا۔''

دراصل انسان کے لیے اپنے اوپر کوئی غیر فطری پابندی عائد کرنے کا فیصلہ کر لینا تو آسان ہے مگر پھر ساری عمر اس فیصلے کو نبھانا بہت مشکل ہے۔ یہی مشکل رہبانیت کا راستہ اختیار کرنے والے لوگوں کو پیش آئی۔ راہب اور راہبائیں بظاہر تو مجرد زندگی بسر کرنے کا عہد کرتے' لیکن پھر فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر زنا کاریوں میں ملوث ہو جاتے۔ ان کے اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ راہب خانوں کے تہہ خانے حرامی بچوں کے قبرستان بن گئے۔ History of Christian Monasticism پر لکھی گئی کتابوں میں اس بارے میں لرزہ خیز تفصیلات ملتی ہیں۔ دراصل انسان کے جنسی جذبے کو غیر فطری طور پر دبانا ایسا ہی ہے جیسے بہتے دریا پر بند باندھنا۔ دریا کے پانی کو مناسب راستہ دے کر تو اس پر بند باندھا جا سکتا ہے لیکن دریا کے پورے پانی کو روکنا کسی طور پر بھی ممکن نہیں۔ ظاہر ہے اگر کہیں کوئی ایسی کوشش ہو گی تو اس کے خطرناک نتائج نکلیں گے۔ یہ لوگ خود تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کا جنسی جذبہ بہت منہ زور ہے۔ سگمنڈ فرائڈ عیسائیوں کے گھر کا آدمی ہے اور اس کی گواہی گویا ''شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا'' کا درجہ رکھتی ہے۔ انسان کے جنسی جذبے کو وہ تمام جذبات پر غالب اور باقی تمام جذبات کا محرک قرار دیتا ہے۔ اگرچہ میں ذاتی طور پر فرائڈ کے اس تجزیے سے متفق نہیں ہوں اور میری یہ رائے اکیلے فرائڈ یا اس کے اس تجزیے کے بارے میں ہی نہیں' بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ بیشتر مغربی فلاسفر انسانی زندگی پر فلسفیانہ بحث کے دوران اکثر غلط بینی اور کج روی کا شکار ہو گئے ہیں۔ جیسے فرائڈ کو ہر طرف سیکس ہی سیکس نظر آیا' کارل مارکس کی نظریں انسان کے پیٹ پر مرکوز ہو کر رہ گئیں' جبکہ ایڈلر صاحب کو انسان کے بڑا بننے کا جذبہ (urge to dominate) ہی ہر طرف چھایا ہوا دکھائی دیا۔ بہرحال مذکورہ فلاسفرز نے اپنے اپنے مطالعے اور تجزیے میں انسانی زندگی کے کسی ایک پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے اور بہت سے دوسرے اہم پہلوؤں کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے۔ لہٰذا ان کی ایسی آراء جزوی طور پر ہی درست تسلیم کی جا سکتی ہیں۔ بہرحال اگر یہ درست نہ بھی ہو کہ انسان کا جنسی جذبہ اس کے تمام جذبوں پر غالب اور اس کے باقی تمام جذبوں کا محرک ہے تو بھی اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ انسان کا یہ جذبہ بہت منہ زور ہے اور اس کو غیر فطری طریقے سے قابو میں لانا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس جذبے کو نظم و ضبط میں لانے کے لیے نکاح کا فطری راستہ تجویز کیا ہے۔ رہبانیت کے لیے اختیار کیے گئے طور طریقے زیادہ تر چونکہ غیر فطری تھے اس لیے اسے اختیار کرنے والے لوگ اس کا حق ادا کرنے میں بُری طرح ناکام رہے۔

﴿فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ﴾ ''تو ہم نے اُن میں سے اُن لوگوں کو اُن کا اجر دیا جو ایمان لے آئے۔''

ایک رائے کے مطابق یہ عیسائیوں کے ان لوگوں کا ذکر ہے جو حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے کے زمانے میں صاحبِ ایمان تھے' لیکن اس سے ایک مفہوم یہ بھی نکلتا ہے کہ ان میں سے جو لوگ نبی آخر الزماں ﷺ پر ایمان لا کر مسلمان ہو گئے انہیں ان کا اجر دیا جائے گا۔

﴿وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۲۷﴾ ''لیکن ان کی اکثریت فاسقوں پر مشتمل ہے۔''

آیت ۲۸ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ﴾ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اُس کے رسولؐ (محمد ﷺ) پر ایمان لاؤ!''

اس آیت کی تفسیر دو طرح سے کی گئی ہے ـــــ ایک تو یہ کہ یہاں ''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' کا خطاب محمد رسول اللہ ﷺ پر

﴿فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ ''پھر وہ اس کی رعایت بھی نہ کر سکے جیسا کہ اس کی رعایت کرنے کا حق تھا۔''

دراصل انسان کے لیے اپنے اوپر کوئی غیر فطری پابندی عائد کرنے کا فیصلہ کر لینا تو آسان ہے مگر پھر ساری عمر اس فیصلے کو نبھانا بہت مشکل ہے۔ یہی مشکل رہبانیت کا راستہ اختیار کرنے والے لوگوں کو پیش آئی۔ راہب اور راہبائیں بظاہر تو مجرد زندگی بسر کرنے کا عہد کرتے' لیکن پھر فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر زنا کاریوں میں ملوث ہو جاتے۔ ان کے اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ راہب خانوں کے تہہ خانے حرامی بچوں کے قبرستان بن گئے۔ History of Christian Monasticism پر لکھی گئی کتابوں میں اس بارے میں لرزہ خیز تفصیلات ملتی ہیں۔ دراصل انسان کے جنسی جذبے کو غیر فطری طور پر دبانا ایسا ہی ہے جیسے بہتے دریا پر بند باندھنا۔ دریا کے پانی کو مناسب راستہ دے کر تو اس پر بند باندھا جا سکتا ہے لیکن دریا کے پورے پانی کو روکنا کسی طور پر بھی ممکن نہیں۔ ظاہر ہے اگر کہیں کوئی ایسی کوشش ہو گی تو اس کے خطرناک نتائج نکلیں گے۔ یہ لوگ خود تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کا جنسی جذبہ بہت منہ زور ہے۔ سگمنڈ فرائڈ عیسائیوں کے گھر کا آدمی ہے اور اس کی گواہی گویا ''شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا'' کا درجہ رکھتی ہے۔ انسان کے جنسی جذبے کو وہ تمام جذبات پر غالب اور باقی تمام جذبات کا محرک قرار دیتا ہے۔ اگرچہ میں ذاتی طور پر فرائڈ کے اس تجزیے سے متفق نہیں ہوں اور میری یہ رائے اکیلے فرائڈ یا اس کے اس تجزیے کے بارے میں ہی نہیں' بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ بیشتر مغربی فلاسفر انسانی زندگی پر فلسفیانہ بحث کے دوران اکثر غلط بینی اور کج روی کا شکار ہو گئے ہیں۔ جیسے فرائڈ کو ہر طرف سیکس ہی سیکس نظر آیا' کارل مارکس کی نظریں انسان کے پیٹ پر مرکوز ہو کر رہ گئیں' جبکہ ایڈلر صاحب کو انسان کے بڑا بننے کا جذبہ (urge to dominate) ہی ہر طرف چھایا ہوا دکھائی دیا۔ بہرحال مذکورہ فلاسفرز نے اپنے اپنے مطالعے اور تجزیے میں انسانی زندگی کے کسی ایک پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے اور بہت سے دوسرے اہم پہلوؤں کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے۔ لہٰذا ان کی ایسی آراء جزوی طور پر ہی درست تسلیم کی جا سکتی ہیں۔ بہرحال اگر یہ درست نہ بھی ہو کہ انسان کا جنسی جذبہ اس کے تمام جذبوں پر غالب اور اس کے باقی تمام جذبوں کا محرک ہے تو بھی اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ انسان کا یہ جذبہ بہت منہ زور ہے اور اس کو غیر فطری طریقے سے قابو میں لانا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس جذبے کو نظم و ضبط میں لانے کے لیے نکاح کا فطری راستہ تجویز کیا ہے۔ رہبانیت کے لیے اختیار کیے گئے طور طریقے زیادہ تر چونکہ غیر فطری تھے اس لیے اسے اختیار کرنے والے لوگ اس کا حق ادا کرنے میں بُری طرح ناکام رہے۔

﴿فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ﴾ ''تو ہم نے اُن میں سے اُن لوگوں کو اُن کا اجر دیا جو ایمان لے آئے۔''

ایک رائے کے مطابق یہ عیسائیوں کے ان لوگوں کا ذکر ہے جو حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے کے زمانے میں صاحبِ ایمان تھے' لیکن اس سے ایک مفہوم یہ بھی نکلتا ہے کہ ان میں سے جو لوگ نبی آخر الزماں ﷺ پر ایمان لا کر مسلمان ہو گئے انہیں ان کا اجر دیا جائے گا۔

﴿وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۲۷﴾ ''لیکن ان کی اکثریت فاسقوں پر مشتمل ہے۔''

آیت ۲۸ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ﴾ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اُس کے رسولؐ (محمد ﷺ) پر ایمان لاؤ!''

اس آیت کی تفسیر دو طرح سے کی گئی ہے ـــــ ایک تو یہ کہ یہاں ''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' کا خطاب محمد رسول اللہ ﷺ پر

ایمان لانے والوں سے ہے۔ ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ تم محض زبان سے آپ ﷺ کی نبوت کا اقرار کر کے نہ رہ جاؤ بلکہ صدقِ دل سے ایمان لاؤ اور اپنے ایمان کو پختہ کرو۔ حضور ﷺ پر سچے ایمان کا معیار آپؐ کے اُسوۂ حسنہ کی پیروی ہے۔ سورۃ الاحزاب میں اہل ایمان سے فرمایا گیا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (آیت ۲۱) ''تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ ہے''۔ تم لوگ اللہ کے رسول ﷺ کے اُسوہ کو دیکھو آپؐ کی زندگی کے معمولات کو اپنے لیے مشعلِ راہ بناؤ اور اپنی زندگیوں میں ویسا توازن پیدا کرو جیسا کہ آپؐ کی زندگی میں توازن تھا۔ دیکھو! حضور ﷺ نے ترکِ دنیا کا طریقہ نہیں اپنایا۔ آپؐ نے نکاح کیے' آپؐ کی اولاد بھی ہوئی' آپؐ نے بھرپور زندگی گزاری' اس کے باوجود آپؐ نے اپنی زندگی کی تمام توانائیاں اور تمام صلاحیتیں غلبۂ دین کی جدّوجُہد کی نذر کر دیں۔ تم پر بھی لازم ہے کہ تم لوگ اللہ کے رسول ﷺ کے اس اُسوہ کی پیروی کرو۔

حضور ﷺ کے اسوہ کے حوالے سے یہ اہم نکتہ بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ جیسے آپؐ کا اتباع ضروری ہے' ویسے ہی اس اتباع میں توازن قائم کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر کسی نے حضور ﷺ کی تمام سُنّتوں کو اپنا لیا لیکن اتباع کرتے ہوئے ہر سُنّت کی مطلوبہ ترجیح اور اہمیت کا خیال نہ رکھا تو گویا وہ شخص حضور ﷺ کے اُسوہ کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوا۔ اس نکتہ کو اس مثال سے سمجھیں کہ ایک طبیب نے آپ کو چند دوائیوں پر مشتمل ایک نسخہ لکھ کر دیا۔ ان میں سے ایک دوائی کا مطلوبہ وزن ایک چھٹانک ہے' دوسری کا ایک تولہ اور تیسری کا ایک ماشہ۔ اب اگر آپ اپنی پسند سے تولہ والی دوائی کا وزن ایک چھٹانک کر لیں اور چھٹانک والی دوائی کا وزن ایک تولہ کر لیں تو وہ نسخہ' نسخہ شفا نہیں رہے گا' نسخہ ہلاکت بن جائے گا۔ اس لیے صرف یہ اطمینان کافی نہیں کہ فلاں عمل آپ ﷺ کی سُنّت سے ثابت ہے' بلکہ سُنّت و سیرتِ نبویؐ کو اس اعتبار سے دیکھنا چاہیے کہ حضور ﷺ نے اپنی زندگی مجموعی طور پر کس طرح گزاری۔ آپؐ کی زندگی میں کس چیز کی کتنی اہمیت تھی؟ آپؐ نے کس عمل کو کتنا وقت دیا؟ آپؐ کی ترجیحات کیا تھیں؟ آپؐ کی ترجیحات میں بنیادی نوعیت کی چیزیں کون سی تھیں اور کون سی چیزوں کو ثانوی حیثیت حاصل تھی؟ واضح رہے کہ اگر کسی نے حضور ﷺ کے اُسوہ کا اتباع کرتے ہوئے اس اعتبار سے توازن برقرار نہ رکھا تو اس کا طرزِ عمل حضور ﷺ کے اُسوہ کے اتباع کے بجائے ذاتی پسند و ناپسند کا معاملہ بن جائے گا۔

سیاق و سباق کے اعتبار سے آیت زیرِ مطالعہ کے اس حصّے کا ایک مفہوم اور بھی ہے۔ پچھلی آیت میں چونکہ اہلِ کتاب کا ذکر ہے' اس لیے اس حوالے سے اس خطاب کا رخ اہلِ کتاب کی طرف بھی ہے۔ اس پہلو سے اس فقرے کو اس طرح سمجھنا چاہیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں میں سے جن لوگوں کے اندر اپنے سابقہ ایمان کی کچھ رمق موجود ہے' ان سے کہا جا رہا ہے کہ اے وہ لوگو جو پہلے سے اللہ پر ایمان رکھتے ہو اب اُس اللہ کا تقویٰ اختیار کرتے ہوئے اُس کے آخری رسول ﷺ پر بھی ایمان لے آؤ! اگر تم ایسا کرو گے تو:

﴿يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ﴾ ''وہ تمہیں دہرا حصّہ عطا کرے گا اپنی رحمت سے''

اہلِ کتاب کے ایسے لوگوں کے لیے ہم سورۃ القصص میں بھی یہ خوشخبری پڑھ چکے ہیں: ﴿اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ﴾ (آیت ۵۴) کہ اگر یہ لوگ نبی آخر الزماں ﷺ پر ایمان لائیں گے تو انہیں دہرا اجر ملے گا۔

﴿وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ﴾ ''اور وہ تمہیں ایسا نُور عطا فرمائے گا جس کو لے کر تم چل سکو گے''

اس سے ایک تو وہ نُور مراد ہے جس کا ذکر قبل ازیں آیت ۱۲ میں ہو چکا ہے کہ پُل صراط سے گزرتے وقت تمہیں نُور عطا کیا جائے

گا جس کی مدد سے تم آسانی سے جنت میں پہنچ جاؤ گے۔ لیکن اس کے علاوہ اس سے مراد یہاں ایمان بالرسول اور اُسوۂ رسولؐ کے اتباع کا وہ نُور بھی ہے جو اہلِ ایمان کو دنیوی زندگی میں بھی نصیب ہوتا ہے۔ اس نکتے کو سمجھنے کے لیے آیت کے الفاظ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ کو ذہن میں دوبارہ تازہ کر لیں اور سمجھ لیں کہ یہاں اصل زور (emphasis) ایمان بالرسولؐ پر ہے۔ اس حوالے سے آیت کے اس حصے کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر تم لوگ اُسوۂ رسولؐ کو مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو تمہیں عملی زندگی میں ایک ایسی روشنی عطا ہوگی جو تمہیں کبھی بھٹکنے نہیں دے گی۔ خاص طور پر تم رہبانیت جیسی بدعت میں ملوث ہونے سے محفوظ رہو گے۔ چونکہ زیر مطالعہ آیات کا تعلق اقامتِ دین اور اقامتِ عدل وقسط کے مضمون سے ہے اس لیے سیاقِ مضمون کے اعتبار سے آیت کے اس حصے میں یہ مفہوم بھی پایا جاتا ہے کہ اگر تمہیں نظامِ عدل وقسط کے قیام کی منزل پر پہنچنے کے لیے رہنمائی اور روشنی درکار ہے تو وہ تمہیں ایمان بالرسولؐ اور منہجِ انقلابِ نبویؐ سے ملے گی۔ اور اگر تم نے اپنا یہ ایمان پختہ کر لیا اور منہجِ نبویؐ کو اپنا راستہ بنا لیا تو اس راستے پر ہم تمہیں ایسا نُور عطا کریں گے جس کی راہنمائی میں تمہارے لیے کسی غلطی، کوتاہی یا منزل سے بھٹکنے کا کوئی امکان نہیں رہے گا —— چنانچہ اگر ہمیں عدل وقسط کے قیام کے لیے انقلاب برپا کرنے کی جدّوجُہد کرنی ہے (دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس جدّوجُہد میں اپنا تن من دھن کھپا دینے کی توفیق عطا فرمائے!) تو ہمیں اس کے لیے روشنی اور راہنمائی انقلابِ نبویؐ کے منہج سے حاصل ہوگی۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر ہم حضور ﷺ کے راستے سے ہٹ کر کوئی راستہ اختیار کریں گے تو کبھی منزل پر نہیں پہنچ پائیں گے: ؎

خلافِ پیمبرؐ کسے راہ گزید — کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

سورۃ المائدۃ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ﴾ (آیت ۴۸) کہ ہم نے تم میں سے سب کے لیے علیحدہ علیحدہ شریعتیں اور علیحدہ علیحدہ منہاج بنائے ہیں۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے نبی ﷺ کا منہاج تلاش کریں اور جب تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر ہمیں یقین کر لینا چاہیے کہ ''جا ایں جاست!'' (جس جگہ کی ہمیں تلاش ہے وہ جگہ یہی ہے۔) یعنی ہمیں راہنمائی چاہیے، ہدایت چاہیے یا غلبۂ دین کی جدّوجُہد میں کامیابی چاہیے تو یہ سب کچھ ہمیں سیرتِ محمدیؐ سے ہی ملے گا۔ اس یقین کے بعد ہمیں اپنا تن من دھن سیرتِ محمدیؐ کے اتباع میں کھپا دینے پر کمربستہ ہو جانا چاہیے اور ایسا کرتے ہوئے ہمیں زیرِ زمین تیل تلاش کرنے والی کمپنی کی مثال پیشِ نظر رکھنی چاہیے۔ ایسی کسی کمپنی کے ماہرین کو اگر کسی جگہ کے بارے میں گمان ہو کہ یہاں سے تیل ملنے کا امکان ہے تو وہ صرف اس گمان اور امکان کی بنیاد پر کروڑوں روپے اس جگہ کی ڈرلنگ پر صَرف کر دیتے ہیں۔ لیکن ہمارا تو ایمان ہے، ہمیں تو یقین ہے کہ ''جا ایں جاست''۔ تو پھر ہم کیوں نہ اپنا سب کچھ اس راہ میں نچھاور کر دیں!

﴿وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۸﴾﴾ ''اور وہ تمہیں بخش دے گا، اور اللہ بہت بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے۔''

اگر تم لوگوں نے منہاجِ محمدیؐ کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنا لیا تو تمہارا رخ سیدھا ہو گیا، مجموعی طور پر تم سیدھے راستے پر آ گئے۔ اب اگر اس راستے پر چلتے ہوئے کوئی خطا یا کوئی لغزش ہوگی تو توبہ کا دروازہ کھلا ہے:

﴿اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ﴾ (النساء:۱۷)

''اللہ کے ذمے ہے توبہ قبول کرنا ایسے لوگوں کی جو کوئی بُری حرکت کر بیٹھتے ہیں جہالت اور نادانی میں پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں، تو

یہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرمائے گا۔"

چنانچہ اگر تم سچے دل سے توبہ کرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری خطائیں اور لغزشیں معاف کرتا رہے گا۔ وہ بہت بخشنے والا اور بہت رحم کرنے والا ہے۔

آیت ۲۹ ﴿لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ "(یہ اس لیے ہے) تاکہ اہلِ کتاب یہ نہ سمجھ لیں کہ اللہ کے فضل پر اب ان کا کوئی حق نہیں ہے"

گزشتہ آیت کی تشریح کے دوران میں نے ذکر کیا تھا کہ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ﴾ کے خطاب کا رخ اہلِ کتاب کی طرف بھی ہے۔ یہ بات اس آیت میں اب بالکل واضح ہو گئی ہے۔ جن مفسرین کا ذہن اس طرف نہیں گیا (کہ گزشتہ آیت میں خطاب کا رخ اہلِ کتاب کی طرف بھی ہے) انہیں زیر مطالعہ آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے یہ کہنا پڑا کہ یہاں لِئَلَّا میں لَا زائد ہے اور اصل میں یہاں مراد لِکَیْ یَعْلَمَ ہے۔ چونکہ ان لوگوں کے نزدیک گزشتہ آیت صرف مسلمانوں سے خطاب کر رہی ہے اس لیے انہوں نے زیر مطالعہ آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے: "تاکہ اہلِ کتاب کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ اب انہیں کوئی قدرت حاصل نہیں ہے اللہ کے فضل پر۔"

بہرحال میں نے گزشتہ آیت میں اہلِ کتاب سے خطاب کے پہلو کو مدِنظر رکھتے ہوئے زیر مطالعہ آیت کا جو ترجمہ کیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ اہلِ کتاب یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ ان کے لیے اب اللہ کے فضل کے حصول کا کوئی راستہ رہا ہی نہیں، بلکہ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے لیے راستہ تو اب بھی کھلا ہے۔ وہ آئیں، خود کو محمد رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں ڈال دیں، قرآن پر ایمان لائیں اور اللہ کے فضل میں حصہ دار بن جائیں۔ یہی بات انہیں سورۂ بنی اسرائیل میں بھی بایں الفاظ کہی گئی ہے: ﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ﴾ (آیت ۸) "ہو سکتا ہے کہ اب تمہارا رب تم پر رحم کرے"۔ یعنی بے شک تم اللہ کے بہت لاڈلے تھے اور اب تم اپنے طرزِ عمل کی وجہ سے راندۂ درگاہ ہو گئے ہو، لیکن تمہارا رب اب بھی تم پر رحمت فرمانے پر آمادہ ہے۔ بس تم آخری نبی حضرت محمد ﷺ اور آخری آسمانی کتاب قرآن پر ایمان لے آؤ اور اُس کی رحمت کے مستحق بن جاؤ۔ بلکہ اس سے اگلی آیت میں مزید واضح فرما دیا گیا: ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ﴾ (آیت ۹) "یقیناً یہ قرآن راہنمائی کرتا ہے اُس راہ کی طرف جو سب سے سیدھی ہے"۔ اب ہدایت کا "شاہ درہ" تو بس قرآن ہی ہے، چنانچہ آؤ اور اس راستے سے ہوتے ہوئے اللہ کے قصرِ رحمت میں داخل ہو جاؤ۔ بہرحال آیت زیر مطالعہ میں اہلِ کتاب پر واضح کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل کے دروازے ان پر بند نہیں ہو گئے، یہ دروازے ان کے لیے اب بھی کھلے ہیں۔

﴿وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۲۹﴾ "اور فضل یقیناً اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔"

سُوْرَةُ الْمُجَادَلَةِ

تمہیدی کلمات

سورۃ المجادلہ کا آغاز ایک خاص عائلی مسئلے سے ہوتا ہے' لیکن یہ مسئلہ صرف پہلی چار آیات میں ضمنی مضمون کے طور پر بیان ہوا ہے۔ اس کے بعد اس سورت میں سورۃ الحدید کے مرکزی مضمون ہی کا تسلسل نظر آتا ہے۔ سورۃ الحدید کا مرکزی مضمون نظامِ عدل وقسط کے قیام سے متعلق ہے۔ اس نظام کے قیام کی جدّوجُہد کے لیے ایک منظم اور مربوط جماعت کی ضرورت ہے۔ یہ کسی اکیلے شخص یا دو چار افراد کے بس کا کام نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے تعاون کے بغیر بھی اسے سرانجام دے لیتے۔ آپؑ نے جب اپنی قوم کو جہاد کے لیے نکلنے کا کہا تو انہوں نے صاف جواب دے دیا:

﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿٢٤﴾﴾

(المائدۃ)

انہوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ اے موسیٰ! یہ جنگ جیسا مشکل کام ہم سے نہیں ہوتا' اگر یہ ایسا ہی ضروری کام ہے تو آپؑ اور آپ کا ربّ جا کر لڑو' ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ اُس وقت آپؑ بالکل اکیلے بھی نہیں تھے' بلکہ آپؑ کے ساتھ تین لوگ اور بھی تھے۔ یعنی آپؑ کے بھائی ہارونؑ' حضرت یوشع بن نون اور کالب بن یوفنا۔ اس کے باوجود آپؑ نے حکومتِ الٰہیہ کے قیام کا مشن ادھورا چھوڑتے ہوئے پُرحسرت انداز میں اللہ تعالیٰ سے شکایت کی:

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٥﴾﴾ (المائدۃ)

''موسیٰؑ نے عرض کیا: پروردگار! مجھے تو اختیار نہیں ہے سوائے اپنی جان کے اور اپنے بھائی (ہارونؑ کی جان) کے' تو اب تُو تفریق کر دے ہمارے اور ان نافرمان لوگوں کے درمیان۔''

تو معلوم ہوا کہ یہ کام چند افراد کے بس کا بھی نہیں' بلکہ باطل نظام کو اکھاڑ پھینکنے اور اس کی جگہ نظامِ عدل وقسط کے قیام کے لیے ایک بہت مضبوط اور منظم جماعت درکار ہے۔ اب ظاہر ہے جب یہ جماعت تشکیل پائے گی اور اپنے مشن کی تکمیل کے لیے مصروفِ عمل ہوگی تو شیطان انہیں کھلی چھٹی دے کر آرام سے تو نہیں بیٹھا رہے گا کہ جاؤ بھئی آپ اپنے دینِ حق کا قیام عمل میں لے آؤ' بلکہ وہ بھی فوری طور پر اپنے چیلے چانٹوں کے ہمراہ اس جماعت کا راستہ روکنے کے لیے میدان میں کود پڑے گا۔ اس طرح یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کے مدِمقابل صف آرا ہو جائیں گی۔ چنانچہ اس سورت میں نظامِ عدل وقسط کے قیام یا اقامتِ دین کے لیے جدّوجُہد کرنے والی جماعت ''حزبُ اللہ'' اور اس کے مدِمقابل شیطان کے لاؤلشکر پر مشتمل جماعت ''حزبُ الشیطان'' کا بھی ذکر آیا ہے اور اس حوالے سے حزبُ اللہ کے کارکنوں کو کچھ مفید ہدایات بھی دی گئی ہیں۔ حزب اللہ کا وجود چونکہ شیطان کو بہت کھٹکتا ہے اس لیے وہ اس

میں پھوٹ ڈالنے اور اس کی وحدت کو نقصان پہنچانے کے لیے ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ ایسے شیطانی حملوں کے توڑ کے لیے اہل ایمان کو قرآن میں جا بجا ہدایات دی گئی ہیں۔ سورۃ الحجرات میں دی گئی معاشرتی اور اخلاقی ہدایات کا مقصد بھی یہی ہے کہ مسلمان اپنی صفوں میں اتحاد و یگانگت کو فروغ دیں اور کوئی ایسا عمل نہ کریں جو ان کے اتحاد کو نقصان پہنچانے کا باعث بنے۔ چنانچہ سورۃ الحجرات میں اہلِ ایمان کو ایک دوسرے کا تمسخر اڑانے، باہم الزام تراشی کرنے، دوسروں کو بُرے ناموں سے پکارنے، اپنے بھائی بندوں کے بارے میں بدگمانی کرنے، ان کے معاملات کی ٹوہ میں رہنے، افواہوں پر کان دھرنے اور ایک دوسرے کی غیبت کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے ایسی حرکات سے بالآخر مسلمانوں کی وحدت اور یکجہتی کو نقصان پہنچتا ہے۔ اسی طرح سورۃ الحجرات میں اہلِ ایمان کو یہ ہدایت بھی دی گئی ہے کہ اگر ان کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کی صلح کرا دی جائے تاکہ ''حزب اللہ'' مضبوط و مستحکم رہے۔ بہرحال سورۃ المجادلہ کا مرکزی مضمون حزب اللہ سے متعلق ہے۔ حزب اللہ بھلائی کی علامت اور نیکی کی طاقت ہے۔ اگر یہ جماعت مضبوط ہوگی تو نیکی کا بول بالا ہوگا اور اگر یہ کمزور ہو جائے گی تو پھر ظاہر ہے معاشرے میں حزب الشیطان ہی کا ڈنکا بجے گا۔

آیات ۱ تا ۴

سُوْرَةُ الْمُجَادَلَةِ مَدَنِيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۲۲ رُكُوْعَاتُهَا: ۳

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَ اللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝ اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ۭ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰۗـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ۭ وَ اِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ۭ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝ وَ الَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَاۗسَّا ۭ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ۭ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَاۗسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ۭ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۭ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

الجزء الثامن والعشرون (۲۸)

آیت ۱ ﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا﴾ ''اللہ نے سن لی اُس عورت کی بات (جو اے نبی ﷺ!) آپ سے جھگڑ رہی ہے اپنے شوہر کے بارے میں''

﴿وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾ ''اور وہ اللہ سے بھی فریاد کر رہی ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا﴾ ''اور اللہ سن رہا ہے آپ دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝۱﴾ ''یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔''

''قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ'' کے معنی یہاں محض سن لینے کے نہیں، بلکہ قبول کر لینے اور فریاد رسی کرنے کے ہیں۔ یہ ''ظِہار'' کے معاملے کا ذکر

ہے جو ایک صحابی حضرت اوس بن صامت انصاری رضی اللہ عنہ اور ان کی بیوی حضرت خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا کے درمیان پیش آیا۔ کسی شخص کا اپنی بیوی کو اپنی ماں یا اپنی ماں کے کسی عضو سے تشبیہ دینا اصطلاحاً ''ظِہار'' کہلاتا ہے' مثلاً کسی کا اپنی بیوی کو یوں کہہ دینا کہ تم میرے لیے میری ماں کی طرح ہو یا میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہو۔ عربوں کے ہاں اس کے لیے یہ الفاظ کہے جاتے تھے: ''اَنْتِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّی'' یعنی اب تجھ کو ہاتھ لگانا میرے لیے گویا اپنی ماں کی پیٹھ کو ہاتھ لگانا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں ظہار کو طلاق ہی کی طرح سمجھا جاتا تھا' بلکہ طلاق میں تو حالات و قرائن کے مطابق پھر بھی رجوع کی گنجائش تھی' لیکن ظہار کی صورت میں میاں بیوی میں عمر بھر کے لیے علیحدگی ہو جاتی تھی اور وہ دوبارہ کبھی کسی بھی صورت میں میاں بیوی کے طور پر اکٹھے نہیں ہو سکتے تھے۔

روایات میں مذکورہ معاملے کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے کہ حضرت اوس رضی اللہ عنہ غصے کی حالت میں اپنی بیوی سے ظہار کر بیٹھے۔ اس پر ان کی بیوی حضرت خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا فریاد لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی کہ حضورؐ! اوسؓ نے یہ کر دیا ہے۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں' اب میں ان کو لے کر کہاں جاؤں گی؟ ان کو کیسے پالوں گی؟ آپؐ اس پریشانی کا کوئی حل بتائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ظہار کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ابھی تک کوئی حکم نازل نہیں فرمایا' اس لیے میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے توقف پر وہ بدستور اصرار کرتی رہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ کچھ کریں! 'میرا کیا بنے گا؟ میرے بچے بلاک ہو جائیں گے! اسی کیفیت میں کبھی وہ اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہوتیں کہ اے اللہ! تُو میری فریاد کو سن لے اور میرے لیے کوئی راستہ پیدا کر دے! روایات کے مطابق اس اصرار و تکرار کے دوران ہی زیر مطالعہ آیات نازل ہوئیں۔ پہلی آیت کا انداز خصوصی طور پر بہت شفقت بھرا ہے کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ نے اس خاتون کی اس بحث و تکرار کو سن لیا ہے جو وہ آپؐ کے ساتھ کر رہی ہے۔ حضرت خولہؓ بنت ثعلبہ کی فریاد پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دریا موج میں آیا اور ظہار کے بارے میں مستقل قانون بنا دیا گیا۔ یہ قانون اگلی تین آیات میں بیان ہوا ہے۔

آیت ۲ ﴿اَلَّذِیْنَ یُظٰھِرُوْنَ مِنْکُمْ مِّنْ نِّسَآئِھِمْ مَّا ھُنَّ اُمَّھٰتِھِمْ ؕ﴾ ''(اے مسلمانو!) تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں کو مائیں کہہ بیٹھتے ہیں' وہ ان کی مائیں نہیں بن جاتی ہیں۔''

جس طرح کسی کو کوئی بیٹا کہہ دے تو وہ اس کا بیٹا نہیں بن جاتا اور جس طرح مُنہ بولے بیٹے کی کوئی قانونی و شرعی حیثیت نہیں اسی طرح زبان سے اگر کوئی اپنی بیوی کو اپنی ماں کہہ دے تو ایسے کسی دعوے یا جملے کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔

﴿اِنْ اُمَّھٰتُھُمْ اِلَّا اللّٰٓئِیْ وَلَدْنَھُمْ ؕ﴾ ''ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے انہیں جنا ہے۔''

﴿وَاِنَّھُمْ لَیَقُوْلُوْنَ مُنْکَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ؕ﴾ ''البتہ یہ لوگ ایک نہایت ناپسندیدہ اور جھوٹی بات کہتے ہیں۔''

یہ لوگ اپنی بیویوں کو اپنی مائیں کہہ کر ایک نہایت بے ہودہ' شرمناک اور نامعقول بات مُنہ سے نکالتے ہیں۔ پھر یہ بات جھوٹی بھی ہے کہ ان کی بیویاں ان کے لیے اب مائیں ہو گئی ہیں۔

﴿وَاِنَّ اللّٰہَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝۲﴾ ''اور یقیناً اللہ بہت معاف فرمانے والا' بہت بخشنے والا ہے۔''

ان الفاظ میں یہ اشارہ دے دیا گیا کہ ظہار سے متعلق چونکہ ابھی تک کوئی قانون نازل نہیں ہوا تھا' اس لیے اللہ تعالیٰ مذکورہ صحابیؓ کو اس معاملے میں معاف فرما دے گا' بلکہ اس سے پہلے جس کسی سے بھی یہ حرکت سرزد ہوئی' اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرمائے گا۔

آیت ۳ ﴿وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا﴾ ''اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کر بیٹھیں' پھر وہ اپنی کہی ہوئی بات سے واپس لوٹنا چاہیں''

﴿فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا﴾ ''تو ایک غلام کا آزاد کرنا ہوگا' اس سے پہلے کہ وہ ایک دوسرے کو مس کریں۔''

یعنی اس معاملے کا کفارہ ادا کرو اور پھر سے میاں بیوی کی طرح رہو!

﴿ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۳﴾ ''یہ بات ہے جس کی تمہیں نصیحت کی جا رہی ہے۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

آیت ۴ ﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۭ﴾ ''تو جو کوئی (غلام) نہ پائے وہ دو مہینوں کے روزے رکھے لگاتار' اس سے پہلے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو چھوئیں۔''

یعنی دو ماہ کے روزے اس طرح متواتر رکھے جائیں کہ درمیان میں کسی دن کا روزہ چھوٹنے نہ پائے۔

﴿فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ۭ﴾ ''تو جو کوئی یہ بھی نہ کر سکتا ہو تو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔''

اگر کوئی شخص کمزور ہے' ضعیف العمر ہے یا ایسا مریض ہے کہ دو ماہ کے لگاتار روزے رکھنا اس کے لیے ممکن نہیں تو وہ ساٹھ مساکین کو کھانا کھلائے۔ اس کے لیے اوسط معیار وہی ہوگا جو سورۃ المائدۃ کی آیت ۸۹ میں قسم کے کفارے کے ضمن میں بیان ہوا ہے: ﴿مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ﴾ یعنی جس معیار کا کھانا متعلقہ شخص اپنے اہل و عیال کو معمول کے مطابق کھلاتا ہے' ویسا ہی کھانا وہ ساٹھ مسکینوں کو کھلائے۔

﴿ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ﴾ ''یہ اس لیے تاکہ تم ایمان رکھو اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر۔''

اس فقرے پر میں بہت عرصہ سوچ بچار کرتا رہا' بالآخر مجھے اس بارے میں یہ نکتہ سمجھ میں آیا کہ جب کوئی شخص کفارہ کو اللہ تعالیٰ کا قانون سمجھتے ہوئے اس کی سختی برداشت کرتا ہے تو اس کے ایمان میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح ایمان سے عمل صالح پیدا ہوتا ہے' اسی طرح عمل صالح سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے' جیسے کہ سورۃ الحجرات میں فرمایا گیا:

﴿يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ۭ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۱۷﴾

''(اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ پر احسان دھر رہے ہیں کہ وہ اسلام لے آئے ہیں! ان سے کہیے کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ دھرو' بلکہ اللہ تم پر احسان دھرتا ہے کہ اُس نے تمہیں ایمان کے راستے پر ڈال دیا ہے' اگر تم سچے ہو۔''

یعنی تم لوگ اسلام میں داخل ہو کر گویا ایمان کے راستے پر چل پڑے ہو۔ اس بارے میں تم اللہ کا احسان مانو کہ وہ تمہیں ایمان کے راستے پر لے آیا ہے۔ اگر تم اخلاص کے ساتھ اس راستے پر چلتے ہوئے اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرتے رہو گے تو تم ایمان تک بھی ضرور پہنچ جاؤ گے۔ یہاں ﴿ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ کا بھی یہی مفہوم ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص غلطی کے بعد توبہ کرتے ہوئے

کفّارہ ادا کرے گا تو اللہ کے قانون پر عمل درآمد کرنے کی وجہ سے اس کے دل میں ایمان باللہ اور ایمان بالرسول مزید راسخ اور پختہ ہو جائے گا۔

﴿وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۴﴾ ''اور یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدود ہیں' اور کافروں کے لیے بہت دردناک عذاب ہے۔''

آیات ۵ تا ۱۱

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ قَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۵ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَ نَسُوْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝۶ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَ لَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَ لَاۤ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَ لَاۤ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۷ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَ يَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ مَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ ۫ وَ اِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ ۙ وَ يَقُوْلُوْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ لَوْ لَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ؕ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۸ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ مَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَ تَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۹ اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَ اِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۱ ع

آیت ۵ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ ''یقیناً وہ لوگ جو ٹل گئے ہیں مخالفت کرنے پر اللہ اور اُس کے رسولؐ کی''

اس مضمون کا تعلق سورۃ الحدید کے مرکزی مضمون کے ساتھ ہے۔ سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں انبیاء و رسل علیہم السلام کی بعثت اور کتاب و میزان کے نزول کا مقصد یہ بتایا گیا ہے: لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ تاکہ انسانی معاشرے میں اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے نظامِ عدل و قسط کا قیام عمل میں لایا جا سکے۔ اب ظاہر ہے اہلِ ایمان جونہی اس مشن کے علمبردار بن کر اٹھیں گے تو شیطانی قوتیں بھی ان کا راستہ روکنے کے لیے پوری قوت سے سرگرم عمل ہو جائیں گی۔ ان حالات میں معاشرے کا سرمایہ دار اور جاگیردار طبقہ نظامِ عدل و

قسط کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوگا۔ یہ لوگ تو کبھی بھی نہیں چاہیں گے کہ مزدوروں اور کسانوں کو ان کے حقوق ملیں۔ چنانچہ وہ اپنے تمام تر وسائل کے ساتھ روایتی (ظالمانہ) نظام کے دفاع کے لیے میدان میں کود پڑیں گے۔ اس طرح فریقین کے درمیان ایک بھرپور کشمکش کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ آیت زیر مطالعہ میں انہی قوتوں کی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔ آئندہ آیات میں ان دونوں گروہوں کے کردار اور رویے کا ذکر حزب اللہ اور حزب الشیطان کے نام سے آئے گا۔

واضح رہے کہ لفظ یُحَآدُّوْنَ کا تعلق بھی حدید (سورۃ الحدید' آیت ۲۵) ہی سے ہے۔ یہ حدّ سے باب مفاعلہ ہے' جیسے جہد سے مُجاھَدہ یا قتل سے مُقاتَلہ۔ چنانچہ اس لفظ میں پوری قوت اور منصوبہ بندی کے ساتھ کسی کی مخالفت کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ آیت زیر مطالعہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے مراد اللہ کا دین ہے اور یہ مخالفت جس کا یہاں ذکر ہے وہ دراصل اللہ کے دین کی مخالفت ہے۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کی تکوینی حکومت جو پوری دنیا میں قائم ہے اسے تو سبھی تسلیم کرتے ہیں۔ اس حوالے سے کسی کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی مخالفت کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ سے بھی کسی کو کوئی ذاتی دشمنی نہیں۔ چنانچہ دنیا میں جہاں کہیں اللہ کے رسولؐ کی مخالفت کی جاتی ہے وہ بھی اللہ کے دین کی وجہ سے ہی کی جاتی ہے۔ اس نکتہ کو سورۃ الانعام کی اس آیت میں یوں واضح کیا گیا ہے: ﴿فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝۳۳﴾ ''(اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ کو نہیں جھٹلا رہے بلکہ یہ ظالم تو اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں''۔ چنانچہ باطل قوتوں کی اصل دشمنی اللہ کے دین سے ہے' اور یہ دین بھی جب تک کتابوں اور لائبریریوں تک محدود رہے تب تک اس پر بھی کسی کو کوئی اعتراض نہیں۔ دینی مسائل کے بارے میں کوئی اعلیٰ سطحی تحقیقات کرے' مقالے لکھے' کتابیں تصنیف کرے' کسی کو اس سے کچھ لینا دینا نہیں۔ لیکن جب کوئی اللہ کا بندہ یہ دعویٰ کرے کہ ہم اللہ کے دین اور اُس کے دیے ہوئے نظامِ عدل وقسط کی معاشرے میں بالفعل ترویج وتنفیذ چاہتے ہیں تو اس کی یہ بات باطل پسند قوتوں کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ یہ لوگ ایسی کسی بھی کوشش کا راستہ روکنے کے لیے خم ٹھونک کر میدان میں آ جاتے ہیں۔ اب ایسے لوگوں کے انجام کے بارے میں بتایا جا رہا ہے۔

﴿كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ ''وہ ذلیل وخوار کر دیے جائیں گے جس طرح ان سے پہلے کے لوگ ذلیل و خوار کیے جا چکے ہیں''

ان سے پہلے قومِ فرعون' قومِ عاد اور بہت سی دوسری اقوام نے بھی اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولوںؑ کی مخالفت کی یہی روش اختیار کر کے اپنی بربادی کو دعوت دی تھی۔ چنانچہ جو انجام مذکورہ اقوام کا ہوا ویسے ہی انجام سے اب یہ لوگ یعنی قریشِ مکہ بھی دوچار ہونے والے ہیں۔

﴿وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۭ﴾ ''اور ہم اتار چکے ہیں روشن آیات۔''

یعنی قرآن میں گزشتہ اقوام کے واقعات بہت تفصیل سے بیان کر دیے گئے ہیں۔ ان میں سے اکثر قومیں قریشِ مکہ کی نسبت بہت طاقتور تھیں۔ جب ایسی طاقتور اقوام بھی اپنے پیغمبروں کے انکار کی بنا پر صفحۂ ہستی سے مٹا دی گئیں تو آج ان لوگوں کی سرکشی و نافرمانی کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

﴿وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۵﴾ ''اور کافروں کے لیے بہت ذلت والا عذاب ہے۔''

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مخالفین کو دنیا میں بھی ہزیمت اٹھانا پڑے گی اور آخرت میں بھی انہیں بہت رسوا کن عذاب کا سامنا کرنا ہوگا۔

آیت ۶ ﴿یَوْمَ یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ﴾ ''جس دن اللہ ان سب کو اٹھائے گا' پھر انہیں جتلا دے گا ان کے اعمال کے بارے میں جو انہوں نے کیے تھے۔''

﴿اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ؕ﴾ ''اللہ نے ان (اعمال) کو محفوظ کر رکھا ہے جبکہ وہ انہیں بھول چکے ہیں۔''

یہ لوگ تو بھول چکے ہوں گے کہ انہوں نے اپنی دنیوی زندگی میں کیسی کیسی حرام خوریاں کی تھیں اور کس کس کے ساتھ کیا کیا زیادتی کی تھی۔ لیکن ظاہر ہے اللہ کے ہاں تو ہر شخص کے ایک ایک عمل اور ایک ایک حرکت کا ریکارڈ محفوظ ہوگا۔

﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ۝۶﴾ ''اور اللہ تو ہر چیز پر خود گواہ ہے۔''

آیت ۷ ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ﴾ ''کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ جانتا ہے اس سب کچھ کے بارے میں جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے؟''

﴿مَا یَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ﴾ ''نہیں ہوتے کبھی بھی تین آدمی سرگوشیاں کرتے ہوئے مگر ان کا چوتھا وہ (اللہ) ہوتا ہے''

﴿وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ﴾ ''اور نہیں (سرگوشی کر رہے) ہوتے کوئی پانچ افراد مگر ان کا چھٹا وہ (اللہ) ہوتا ہے''

خفیہ انداز میں سرگوشیاں کرنے کو ''نجویٰ'' کہا جاتا ہے۔ اس حوالے سے یہاں پر ضمنی طور پر یہ بھی سمجھ لیں کہ کسی تنظیم یا جماعت کے اندر نجویٰ کا رجحان یا رواج گروہ بندیوں اور فتنوں کا باعث بنتا ہے۔ کسی بھی اجتماعیت کے افراد میں باہم اختلافِ رائے کا پایا جانا تو بالکل ایک فطری تقاضا ہے' جہاں اجتماعیت ہوگی وہاں لوگ ایک دوسرے کی آراء سے اختلاف بھی کریں گے۔ لیکن ایسے اختلافات کا اظہار اجتماعیت کے قواعد وضوابط کے مطابق متعلقہ فورم پر کیا جانا چاہیے۔ اس کے برعکس عام طور پر یوں ہوتا ہے کہ تخریبی ذہنیت کے حامل کچھ ارکان اپنے اپنے اختلاف کا اظہار نجویٰ کی صورت میں دوسرے ساتھیوں سے کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بات آگے بڑھتی ہے تو چند افراد پر مشتمل ایک مخصوص لابی بن جاتی ہے اور یوں تنظیم یا جماعت کے اندر باقاعدہ گروہ بندی کی بنیاد رکھ دی جاتی ہے۔ اگر اختلافات کا اظہار مناسب فورم پر ہو تو کھلی اور تعمیری بحث کا نتیجہ ہمیشہ مثبت رہتا ہے۔ اس سے غلط فہمیاں ختم ہو جاتی ہیں' ابہام دور ہو جاتا ہے اور اصل حقیقت واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ بہرحال نجویٰ (سرگوشیوں) کی حیثیت اجتماعیت کے لیے سم قاتل کی سی ہے اور اگر یہ زہر کسی جماعت کی صفوں میں سرایت کر جائے تو اس کا اتحاد پارہ پارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

﴿وَلَاۤ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَیْنَ مَا كَانُوْا ۚ﴾ ''اور نہیں ہوتے وہ اس سے کم (یعنی دو افراد سرگوشی میں مصروف) اور نہ اس سے زیادہ مگر یہ کہ وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں کہیں بھی وہ ہوں۔''

سورۃ الحدید کی آیت ۴ میں یہی مضمون ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ﴾ ''اور تم جہاں کہیں

بھی ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔"

﴿ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۷﴾ "پھر وہ ان کو جتلا دے گا قیامت کے دن جو کچھ بھی انہوں نے عمل کیا تھا' یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔"

آیت ۸ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ﴾ "کیا تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جنہیں منع کیا گیا تھا نجویٰ سے' پھر وہ اعادہ کر رہے ہیں اُسی شے کا جس سے انہیں منع کیا گیا تھا"

یہ مدینہ کے منافقین کا ذکر ہے جو یہودیوں کے ساتھ مل کر ہر وقت مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا جال بُننے کی کوششوں میں مصروف رہتے تھے۔ یہاں اَلَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى کے الفاظ میں سورۃ النساء کی آیت ۱۱۴ کے اس حکم کی طرف اشارہ ہے: ﴿لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ﴾ کہ ان لوگوں کی اکثر سرگوشیوں میں خیر کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ آیت زیر مطالعہ میں سورۃ النساء کی آیت کے حوالے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سورۃ المجادلہ' سورۃ النساء کے بعد نازل ہوئی۔

﴿وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ ۭ﴾ "اور وہ سرگوشیاں کرتے ہیں گناہ' زیادتی اور رسولؐ کی نافرمانی سے متعلق۔"

قبل ازیں سورۃ النساء کے مطالعے کے دوران بھی ذکر ہو چکا ہے کہ حضور ﷺ کی ذاتی اطاعت کا حکم منافقین کو بہت بُرا لگتا تھا۔ اس حوالے سے ان کا موقف یہ تھا کہ ہم اللہ کی اطاعت بھی کرتے ہیں' اللہ کی کتاب کے تمام احکام بھی تسلیم کرنے کو تیار ہیں' لیکن اپنے جیسے ایک انسان کی تمام باتوں کو من وعن تسلیم کرنے کو ہم ضروری نہیں سمجھتے۔ اسی سوچ اور اسی موقف کے تحت وہ لوگ حضور ﷺ کے فیصلوں پر گاہے بگاہے اعتراضات بھی کرتے رہتے تھے۔ ان کے ایسے ہی ایک اعتراض کا ذکر سورۂ محمد کی آیت ۲۰ میں بھی آیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے قتال کا کوئی حکم نازل نہیں ہوا تو قریش کے ساتھ خواہ مخواہ چھیڑ چھاڑ شروع کر کے حالات کیوں خراب کیے جا رہے ہیں؟

﴿وَاِذَا جَاۗءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ ۙ﴾ "اور جب وہ آپؐ کے پاس آتے ہیں تو آپؐ کو اُس (کلمہ) سے دعا دیتے ہیں جس سے اللہ نے آپؐ کو دعا نہیں دی"

"تَحِيَّة" کے لغوی معنی کسی کو زندگی کی دعا دینے کے ہیں۔ عربوں کے ہاں رواج تھا کہ وہ ایک دوسرے سے ملتے وقت "حَيَّاكَ اللّٰهُ" کے جملے کا تبادلہ کرتے تھے۔ اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ تمہیں اچھی زندگی دے' یا اللہ تعالیٰ تمہاری زندگی دراز کرے۔ عرفِ عام میں اس دعا کو "تحیہ" کہا جاتا تھا۔ اسلام نے دو مسلمانوں کی ملاقات کے موقع کے لیے دعائیہ کلمہ (greetings) کے طور پر السّلام علیکم کے الفاظ کا انتخاب کیا' لیکن تحیہ کا لفظ عربوں کے ہاں چونکہ بہت معروف تھا اس لیے "السّلام علیکم" کو بھی اصطلاحاً "تحیہ" ہی کہا جانے لگا۔ سورۃ النساء کی آیت ۸۶ میں یہ لفظ "السّلام علیکم" ہی کے مفہوم میں آیا ہے۔ آیت زیر مطالعہ میں منافقین کی اس شرارت کا ذکر ہے جو وہ اس کلمہ تحیہ کے حوالے سے کرتے تھے۔ جب وہ حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوتے تو السّلام علیکم کہنے کے بجائے "السّام علیکم" کہتے۔ "سام" کے معنی موت کے ہیں اور اس طرح اپنی طرف سے وہ لوگ حضور ﷺ اور آپؐ کی محفل میں موجود مسلمانوں کے لیے اس دعائیہ کلمہ کو (معاذ اللہ!) بددعا میں بدل دیتے تھے۔

﴿وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ۭ﴾ ''اور اپنے دل میں کہتے ہیں کہ اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا ہمارے اس طرح کہنے پر؟''

ایسی حرکت کرنے کے بعد وہ سوچتے کہ اگر محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہوتے تو اللہ ان کی یہ توہین کبھی برداشت نہ کرتا اور اس گستاخی پر وہ فوراً ہماری زبانیں کھینچ لیتا۔ چنانچہ ہمارے بار بار ایسا کہنے پر بھی اگر ہمیں کچھ نہیں ہوتا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ اللہ کے رسول نہیں ہیں۔ یہ مرضِ منافقت کی وہ سٹیج ہے جس کا ذکر سورۃ الحدید کی آیت ۱۴ میں آچکا ہے۔ اس سٹیج پر منافق شخص کے بچے کھچے ایمان میں شکوک وشبہات کے کانٹے چبھنے لگتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ایمان کی تھوڑی بہت پونجی بھی برف کی طرح پگھلنے اور ضائع ہونے لگتی ہے۔

﴿حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۸﴾ ''ان کے لیے تو اب جہنم ہی کافی ہے' یہ اس میں داخل ہوں گے' پس وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔''

آیت ۹ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ﴾ ''اے اہلِ ایمان! اگر تمہیں کوئی سرگوشی کرنی ہو''

﴿فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ﴾ ''تو گناہ' زیادتی اور رسولؐ کی نافرمانی کی باتوں سے متعلق ہرگز سرگوشی نہ کرو''

اگر تم میں سے چند لوگوں کا علیحدہ بیٹھ کر کوئی گفتگو یا منصوبہ بندی کرنا ناگزیر ہو تو یاد رکھو' تمہاری اس خفیہ بات چیت یا سرگوشی کا موضوع ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے جس سے گناہ' کسی پر زیادتی یا اللہ کے رسول ﷺ کی نافرمانی کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔

﴿وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۭ﴾ ''ہاں تم نیکی اور تقویٰ کے بارے میں سرگوشی کر سکتے ہو۔''

کسی کو علیحدگی میں لے جا کر کوئی اچھا مشورہ دینا ہو' نیکی کے کسی کام کا بتانا ہو' یا صدقہ وخیرات کی تلقین کرنی ہو تو ایسی سرگوشیوں میں کوئی مضائقہ نہیں۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۹﴾ ''اور اللہ سے ڈرتے رہو جس کی طرف تمہیں جمع کیا جائے گا۔''

آیت ۱۰ ﴿اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ﴾ ''یہ نجویٰ تو شیطان کی طرف سے ہے''

منفی سرگوشیاں کرنا ایک شیطانی عمل ہے۔ جو لوگ اس میں ملوث ہوتے ہیں انہیں اس کی تحریک وترغیب شیطان ہی کی طرف سے ملتی ہے۔

﴿لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''تاکہ وہ اہلِ ایمان کو رنجیدہ کرے''

ان لوگوں کی سرگوشیوں اور خفیہ ملاقاتوں کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اہلِ ایمان کو نقصان پہنچا کر انہیں رنجیدہ' دل گرفتہ اور پریشان کریں۔ آیت کے ان الفاظ سے یہ مفہوم بھی متبادر ہوتا ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کی محفل سے الگ جا کر کُھسر پُھسر اور سرگوشیاں اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے اس عمل کو دیکھ کر مسلمان پریشان ہوں کہ یہ لوگ الگ بیٹھ کر ان کے خلاف نہ جانے کیا سازشیں کر رہے ہیں۔ گویا یہ لوگ ایک نفسیاتی حربے کے طور پر بھی نجویٰ کرتے تھے۔ ظاہر ہے جب بھری محفل سے تین چار لوگ الگ جا کر بیٹھ جائیں اور کُھسر پُھسر کرنا شروع کر دیں تو اہلِ محفل کو فطری طور پر تجسس تو ہوگا کہ ہو نہ ہو یہ لوگ ضرور انہی کے خلاف باتیں کر رہے ہیں۔

﴿وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''حالانکہ یہ (شیطان) انہیں کچھ بھی ضرر پہنچانے پر قادر نہیں مگر اللہ کے اذن سے۔''

شیطان اپنے ارادے اور اختیار سے اہلِ ایمان کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ البتہ اگر اللہ کی طرف سے کسی کے لیے کوئی تکلیف یا آزمائش طے ہے تو وہ ضرور آئے گی' اسے کوئی نہیں روک سکتا۔

﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰﴾ ''اور اہلِ ایمان کو صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیے۔''

اہلِ ایمان کو بھروسہ رکھنا چاہیے کہ اللہ ان کے ساتھ ہے اور شیطانی حربوں یا دشمنوں کی سازشوں سے ان کا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ اسی بھروسے کے ساتھ انہیں ہر وقت اپنے فرائض کی بجا آوری کے لیے کمربستہ رہنا چاہیے۔

آیت ۱۱ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ﴾ ''اے مسلمانو! جب تمہیں کہا جائے کہ مجالس میں کھل کر بیٹھو تو کھل جایا کرو' اللہ تمہارے لیے کشادگی پیدا کر دے گا۔''

یہ سمجھانے کا بہت عمدہ انداز ہے۔ یہ نصیحت بھی دراصل منافقین کے ایک مخصوص طرزِ عمل کی وجہ سے کی جا رہی ہے۔ منافقین کا یہ وطیرہ تھا کہ وہ حضور ﷺ کی محفلوں میں ٹولیوں کی صورت میں باہم جڑ کر بیٹھتے تھے تاکہ درمیان میں کوئی اور (سچا مسلمان) نہ بیٹھ سکے۔ ایسے الگ حلقے بنا کر محفل کے دوران وہ حضور ﷺ کے فرمودات پر اپنی مرضی کے تبصرے کرتے اور استہزائیہ فقرے چست کرتے رہتے۔ ان کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے مسلمانوں کو یہ عمومی ہدایت جاری کی گئی کہ محفل میں حلقے بنا کر بیٹھنے کے بجائے کھل کر بیٹھا کرو تاکہ معلوم ہو کہ یہ ایک اجتماع ہے۔

﴿وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا﴾ ''اور جب کہا جائے کہ اُٹھ جاؤ تو اُٹھ جایا کرو''

اس حکم کا باعث بھی منافقین کا طرزِ عمل ہی تھا۔ ان لوگوں کا معمول تھا کہ وہ مجلس برخاست ہو جانے کے بعد بھی ٹولیوں کی صورت میں اسی جگہ پر بیٹھے محوِ گفتگو رہتے تھے۔ فرض کریں حضور ﷺ نے مسلمانوں کو کسی ضروری مشورے کے لیے بلایا۔ اس پر سب لوگ حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوئے' ضروری گفتگو ہوئی اور صلاح و مشورے کا مرحلہ طے ہو گیا۔ اس کے بعد حضور ﷺ محفل کو برخاست کرنے کا حکم دے کر وہاں سے تشریف لے گئے اور آپؐ کے حکم پر سب مسلمان بھی چلے گئے' مگر یہ منافقین ہیں کہ ابھی بھی ٹولیوں کی صورت میں اسی جگہ پر بیٹھے سرگوشیوں میں مصروف ہیں۔ ان کی یہ حرکتیں نہ صرف اجتماعیت کے نظم و ضبط کے خلاف تھیں بلکہ اس سے بہت سی غلط فہمیاں بھی جنم لے سکتی تھیں۔ اس لیے یہ حکم دیا گیا کہ جب مجلس برخاست کرنے کا کہہ دیا جائے تو وہاں سے اٹھ جایا کرو۔

﴿يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ﴾ ''اللہ بلند فرما دے گا ان لوگوں کے درجات جو تم میں سے واقعی ایمان والے ہیں اور جن کو حقیقی علم عطا ہوا ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۱﴾ ''اور تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔''

آیات ۱۲، ۱۳

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ۭ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ ع

آیت ۱۲ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ۭ﴾ ”اے اہلِ ایمان! جب تم رسول (ﷺ) سے تخلیہ میں کوئی بات کرنا چاہو تو اپنی اس بات چیت سے پہلے کچھ صدقہ دے دیا کرو۔“

اس حکم کا پس منظر یہ ہے کہ منافقین میں سے اکثر لوگ وقتاً فوقتاً بلاوجہ حضور ﷺ سے تخلیہ میں بات کرنے کا تقاضا کرتے تھے۔ حضور ﷺ مروّت کے باعث ہر کسی کی بات مان تو لیتے، لیکن منافقین کا یہ طرزِ عمل آپؐ کے لیے زحمت کا باعث تھا۔ یہ لوگ حضور ﷺ سے ایسی ملاقاتیں محض اپنی اہمیت اُجاگر کرنے کے لیے کرتے تھے، تاکہ لوگ دیکھیں کہ حضور ﷺ سے علیحدگی میں بات کرنے والا یہ شخص حضور ﷺ کے بہت قریب ہے اور حضور ﷺ کو اس پر بہت اعتماد ہے۔ جیسے رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کا معمول تھا کہ حضور ﷺ جب خطبہ جمعہ کے لیے کھڑے ہوتے تو وہ محض اپنی چودھراہٹ جتانے کے لیے فوراً اگلی صف میں کھڑا ہو جاتا اور حاضرین سے مخاطب ہو کر کہتا کہ لوگو! یہ اللہ کے رسولؐ ہیں، ان کی بات غور سے سنو! یہ شخص مدینہ کے سب سے بڑے قبیلے خزرج کا سردار تھا۔ حضور ﷺ کی ہجرت سے قبل اہلِ مدینہ کا اتفاق ہو چکا تھا کہ مدینہ میں ایک مستحکم ریاستی نظام قائم کیا جائے تاکہ روز روز کی جنگوں اور باہمی خون ریزی سے ان کی جان چھوٹ جائے۔ اس کے لیے عبداللہ بن اُبی کو بادشاہ بنانے کا فیصلہ ہو چکا تھا اور اس کے لیے تاج بھی تیار ہو چکا تھا۔ بس رسم تاجپوشی کا انعقاد باقی تھا کہ حضور ﷺ مدینہ تشریف لے آئے اور آتے ہی مدینہ کے بے تاج بادشاہ بن گئے۔ اس طرح آپ ﷺ کی وجہ سے عبداللہ بن اُبی کی بادشاہت کا خواب ناتمام رہ گیا۔ حالات کا رخ دیکھتے ہوئے اُس نے ظاہری طور پر تو مسلمانی کا لبادہ اوڑھ لیا لیکن عمر بھر حضور ﷺ کی مخالفت کا کوئی موقع اُس نے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ بہرحال حالات کی مجبوری تھی کہ ایسا شخص بھی حضور ﷺ سے اپنی قربت جتلانے اور اپنی خصوصی حیثیت نمایاں کرنے کے لیے جمعہ کے اجتماع میں یہ ڈرامہ رچانا ضروری سمجھتا تھا۔

منافقین کے اس طرزِ عمل کی حوصلہ شکنی کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس حکم کے ذریعے حضور ﷺ سے علیحدگی میں بات کرنے پر ایک طرح کا ٹیکس عائد کر دیا کہ اگر تمہارا حضور ﷺ سے علیحدگی میں بات کرنا ایسا ہی ضروری ہے تو پہلے اپنے مال میں سے کچھ صدقہ دو اور پھر آ کر اس مقصد کے لیے حضور ﷺ سے وقت مانگو۔ منافقین چونکہ انفاق سے گھبراتے ہیں اس لیے اس حکم کے بعد ان میں سے کسی ایک شخص نے بھی صدقہ دے کر حضور ﷺ سے علیحدگی میں بات کرنے کی درخواست نہ کی۔ یہ حکم البتہ بہت تھوڑی دیر نافذ رہا اور جلد ہی اسے اگلی آیت کے ذریعے منسوخ کر دیا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں واحد شخص تھا جس نے اس حکم پر عمل کیا اور صدقہ دے کر حضور ﷺ سے علیحدگی میں بات کرنے کی درخواست کی۔

﴿ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ﴾ ''یہ تمہارے لیے بہتر بھی ہے اور زیادہ پاکیزہ بھی۔''

﴿فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾﴾ ''البتہ اگر تم (صدقہ دینے کے لیے) کچھ نہ پاؤ تو اللہ بہت بخشنے والا' بہت رحم کرنے والا ہے۔''

یعنی غریب اور نادار لوگ اس حکم پر عمل نہیں بھی کر سکتے تو کوئی مضائقہ نہیں' اللہ تعالیٰ ان کا عذر قبول فرماتے ہوئے انہیں معاف فرمائے گا۔ لیکن ظاہر ہے جن لوگوں کی وجہ سے یہ حکم نازل ہوا وہ تو سب کے سب متمول' مرفہ الحال اور بڑے لوگ تھے جو حضور ﷺ سے اپنی قربت جتلا کر لوگوں کے سامنے مزید ''بڑے'' بننا چاہتے تھے۔

آیت ۱۳ ﴿ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ؕ﴾ ''کیا تم ڈر گئے اس سے کہ (رسولؐ کے ساتھ) اپنی تنہائی کی باتوں سے پہلے صدقات پیش کرو؟''

﴿فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ﴾ ''پھر جب تم نے یہ نہیں کیا اور اللہ نے بھی تم پر نظرِ عنایت فرما دی''

﴿فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ﴾ ''تو بس نماز قائم رکھو' زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے رہو۔''

﴿وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳﴾﴾ ''اور اللہ باخبر ہے اُس سے جو تم کر رہے ہو۔''

اس آیت کے ذریعے اس حکم کو جلد ہی منسوخ بھی کر دیا گیا' لیکن اس حکم سے ان لوگوں کی قلعی کھل گئی جو محض ریاکاری کے لیے حضور ﷺ سے علیحدگی میں بات کرنے کے شوقین تھے۔ پہلے تو وہ اس مقصد کے لیے بار بار حضور ﷺ کے پاس آتے تھے' لیکن صدقہ کے حکم کے بعد ان میں سے کسی کو بھی علیحدگی میں بات کرنے کی حاجت محسوس نہ ہوئی۔ بہرحال مذکورہ حکم کے بعد جب ان میں سے کوئی شخص بھی صدقہ دے کر حضور ﷺ سے علیحدگی میں بات کرنے کی درخواست لے کر نہ آیا تو اس حکم کی منسوخی کے بعد اپنا پرانا طرزِ عمل دہراتے ہوئے وہ شرم تو محسوس کرتے ہوں گے اور یہی دراصل اس وقتی اور عارضی حکم کا اصل مقصد تھا۔

آیات ۱۴ تا ۲۲

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ ۙ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۶﴾ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۸﴾ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰىهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ

اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ ۝ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَاۗدُّوْنَ مَنْ حَاۗدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَوْ كَانُوْٓا اٰبَاۗءَهُمْ اَوْ اَبْنَاۗءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ۭ وَ يُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ع

آیت ۱۴ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ﴾ ''کیا تم نے غور نہیں کیا ان لوگوں (کے طرزِ عمل) پر جنہوں نے دوستی گانٹھی ہے ان لوگوں سے جن پر اللہ کا غضب ہوا ہے۔''

اللہ کے غضب کے حوالے سے یہاں قومِ یہود (مَغْضُوْب عَلَيْهِمْ) کی طرف اشارہ ہے اور ان سے دوستیاں گانٹھنے والے اوس اور خزرج کے منافقین تھے جو اُن کے ساتھ اپنے پرانے حلیفانہ تعلقات کو ابھی تک نباہے چلے جا رہے تھے۔

﴿مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ ۙ﴾ ''نہ وہ تم میں سے ہیں اور نہ اُن میں سے ہیں''

منافقین کے اس دوغلے کردار کا ذکر سورۃ النساء (آیت ۱۴۳) میں اس طرح ہوا ہے: ﴿لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ ۭ﴾ ''نہ تو یہ ان کی جانب ہیں اور نہ ہی اُن کی جانب ہیں۔''

﴿وَّيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ ''اور وہ جانتے بوجھتے جھوٹ پر قسمیں اٹھاتے ہیں۔''

آیت ۱۵ ﴿اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ﴾ ''اللہ نے تیار کر رکھا ہے ان کے لیے سخت عذاب۔''

﴿اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾ ''یقیناً بہت ہی بُرا ہے وہ طرزِ عمل جو وہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔''

آیت ۱۶ ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً﴾ ''انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے''

یہ لوگ جھوٹی قسموں کو اپنی کمزوریوں کی ڈھال کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ جہاں کہیں کسی کی کسی بات پر گرفت ہوتی' وہ فوراً قسمیں کھانا شروع کر دیتا کہ اللہ کی قسم اصل میں یہ معاملہ یوں نہیں تھا بلکہ یوں تھا۔ اس طرح اُس کا مخاطب مروّت میں آ کر خاموشی اختیار کر لیتا۔

﴿فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝﴾ ''پس وہ اللہ کے راستے سے رک گئے ہیں (اور دوسروں کو بھی روکتے ہیں) پس ان کے لیے اہانت آمیز عذاب ہے۔''

صَدَّ یَصُدُّ کے معنی خود رکنا بھی ہیں اور دوسروں کو روکنا بھی۔

آیت ۱۷ ﴿لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ﴾ ''اُن کے کچھ بھی کام نہیں آئیں گے اُن کے اموال اور نہ ہی اُن کی اولادیں اللہ سے بچانے کے لیے۔''

﴿اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝﴾ ''یہ آگ والے ہیں' اسی میں یہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔''

مقامِ عبرت ہے کہ یہ ''نوید'' ان لوگوں کو سنائی جا رہی ہے جو بظاہر حضور ﷺ کے ماننے والے تھے' آپ ﷺ کی اقتدا میں

نمازیں پڑھتے تھے' اسلام کا دم بھرتے تھے' خود کو مسلمان کہتے تھے اور زبانوں سے گواہی دیتے تھے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ سورۃ المنافقون کی پہلی آیت میں ان کی اس ''شہادت'' کا خصوصی طور پر ذکر کر کے ان کے جھوٹے ہونے پر مہر ثبت کی گئی ہے:

﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱﴾ ''(اے نبی ﷺ!) جب آپ کے پاس منافقین آتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ آپ اُس کے رسول ہیں' اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بلاشبہ یہ منافقین جھوٹے ہیں۔''

آیت ۱۸ ﴿يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ﴾ ''جس دن اللہ ان سب کو اٹھائے گا تو وہ اُس کے سامنے بھی قسمیں کھائیں گے جیسے (آج) تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں''

یعنی یہ لوگ جھوٹی قسمیں کھانے کے اس حد تک عادی ہو چکے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ عزوجل کے سامنے بھی اسی طرح جھوٹی قسمیں کھانا شروع ہو جائیں گے کہ ہم ایسے نہیں کہتے تھے اور ہم ویسے نہیں کرتے تھے۔

﴿وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ ؕ﴾ ''اور وہ سمجھیں گے کہ وہ کسی بات پر ہیں۔''

اللہ کی عدالت میں کھڑے ہو کر بھی وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ ہمارے اعمال کی بھی کچھ نہ کچھ حیثیت تو ہے۔ آخر ہم مسلمان ہوئے تھے' ہم نے اللہ کے رسول ﷺ کی اقتدا میں نمازیں پڑھی تھیں' روزے رکھے تھے' سب مسلمانوں کے ساتھ مل کر مہمات میں حصہ لیتے رہے تھے۔ اس طرح ہم دنیا سے کچھ نہ کچھ نیک اعمال تو لے کر آئے ہی ہیں۔

﴿اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝۱۸﴾ ''آگاہ ہو جاؤ کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔''

آیت ۱۹ ﴿اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰىهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ﴾ ''شیطان نے ان کے اوپر قابو پا لیا ہے' پس انہیں اللہ کی یاد بھلا دی ہے۔''

شیطان اُن پر مسلط ہو چکا ہے اور اُس نے انہیں اللہ کی یاد سے غافل کر دیا ہے۔

﴿اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ﴾ ''یہ لوگ ہیں شیطان کی جماعت۔''

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں شیطان کی یہ جماعت تین گروہوں پر مشتمل تھی۔ ان میں شیطان کا سب سے طاقتور ہتھیار مشرکین عرب تھے۔ انہوں نے اسلام کی مخالفت اور اپنے ''دین'' کی حمایت میں ہر طرح کی قربانیاں دیں' جنگیں بھی لڑیں اور اپنے باطل معبودوں کے لیے گردنیں بھی کٹوائیں۔ دوسرا گروہ یہود مدینہ کا تھا' جبکہ تیسرا گروہ منافقین پر مشتمل تھا۔ منافقین مسلمانوں کے اندر رہتے ہوئے ان کے خلاف fifth columnists کا کردار ادا کر رہے تھے۔ آیات زیر مطالعہ میں خصوصی طور پر ان لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے کہ یہ اگرچہ خود کو مسلمان کہتے ہیں اور مسلمانوں کی صفوں میں بیٹھے ہیں' لیکن اصل میں یہ حزب الشیطان ہی کے ارکان ہیں۔ مسلمانوں کی مخالفت کے حوالے سے ان لوگوں کے کردار کی مزید تفصیل اگلی سورۃ یعنی سورۃ الحشر میں بیان ہوئی ہے۔

﴿اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۱۹﴾ ''آگاہ ہو جاؤ! شیطان کی جماعت کے لوگ ہی حقیقت میں خسارہ اٹھانے والے ہیں۔''

آیت ۲۰ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ ۝۲۰﴾ ''یقیناً جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول کی مخالفت

پر تلے بیٹھے ہیں' وہی ذلیل ترین لوگوں میں سے ہوں گے۔''

ذِلّت کے ذکر کے لیے اَذَلِّیْن (ذلیل ترین) یہاں ''تفضیلِ کُل'' (superlative degree) کے طور پر آیا ہے۔ سورۃ النساء کی اس آیت میں بھی منافقین کے لیے بالکل یہی اسلوب اختیار فرمایا گیا ہے: ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِیْرًا ﴿۱۴۵﴾﴾ ''یقیناً منافقین آگ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے' اور تم نہ پاؤ گے ان کے لیے کوئی مددگار۔''

آیت ۲۱ ﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ ؕ﴾ ''اللہ نے لکھ دیا ہے کہ یقیناً مَیں غالب رہوں گا اور میرے رسول۔''

مَیں اور میرے رسول لازماً غالب ہو کر رہیں گے۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ الصافات کی ان آیات میں بھی آ چکا ہے: ﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۷۱﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾﴾ ''اور ہماری یہ بات پہلے سے طے شدہ ہے اپنے اُن بندوں کے لیے جن کو ہم (رسول بنا کر) بھیجتے رہے ہیں' کہ اُن کی لازماً مدد کی جائے گی' اور یقیناً ہمارا لشکر ہی غالب رہے گا۔''

اس بارے میں قبل ازیں بھی متعدد بار ذکر ہو چکا ہے کہ اہم مضامین قرآن حکیم میں کم از کم دو مرتبہ ضرور آتے ہیں۔ یہ مضمون بھی اسی اصول کے تحت سورۃ الصافات کے بعد یہاں پھر آیا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۲۱﴾﴾ ''بے شک اللہ زبردست ہے' زور آور ہے۔''

حزب الشیطان کے ذکر کے بعد فوری تقابل (simultaneous contrast) کے طور پر اب اگلی آیت میں حزب اللہ کا ذکر ہے۔ یہ آیت حزب اللہ کی رکنیت کے معیار کے حوالے سے litmus test بھی ہے۔ اس ٹیسٹ کا تعلق انسان کے قلبی تعلقات اور قریبی رشتوں سے ہے۔ اگر کسی مسلمان کا کوئی رشتہ دار' چاہے وہ اُس کا باپ' بیٹا یا بھائی ہی کیوں نہ ہو' کافر و مشرک ہے اور وہ اسلام کی مخالفت میں باقاعدہ سرگرمِ عمل ہے' تو اُس مسلمان کے لیے لازم ہے کہ اُس کے ایمان کی تلوار اس دشمنِ خدا کے ساتھ موجود اپنے رشتے کو کاٹ پھینکے۔ لیکن اگر کوئی مسلمان ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا اور کسی ایسے فرد کے ساتھ اس کے قلبی تعلق کا پیوند بدستور اُستوار رہا جو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی مخالفت میں سرگرمِ عمل ہے تو ایسا مسلمان حزب اللہ سے خارج سمجھا جائے گا۔

آیت ۲۲ ﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ ''تم نہیں پاؤ گے اُن لوگوں کو جو حقیقتاً ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور یومِ آخرت پر کہ وہ محبت کرتے ہوں اُن سے جو مخالفت کر رہے ہیں اللہ اور اُس کے رسول کی۔''

یہ حکم ان کفار و مشرکین کے لیے ہے جو اسلام کی مخالفت میں فعال (active) اور سرگرمِ عمل ہوں۔ جہاں تک ان کفار و مشرکین کا تعلق ہے جو ایسی کسی جدّوجُہد میں بالفعل فعال نہ ہوں' ان کے بارے میں حکم آگے سورۃ الممتحنہ میں آئے گا۔

﴿وَلَوْ كَانُوْۤا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِیْرَتَهُمْ ؕ﴾ ''خواہ وہ اُن کے باپ ہوں یا اُن کے بیٹے ہوں یا اُن کے بھائی ہوں یا اُن کے رشتے دار ہوں۔''

آیت کا یہ حصہ پڑھتے ہوئے سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ کا مضمون بھی ذہن میں تازہ کر لیں:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِیْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ

تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾

''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ' تمہارے بیٹے' تمہارے بھائی' تمہاری بیویاں (اور بیویوں کے لیے شوہر)' تمہارے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے بہت محنت سے کمائے ہیں' اور وہ تجارت جس کے مندے کا تمہیں خطرہ رہتا ہے' اور وہ مکانات جو تمہیں بہت پسند ہیں' (اگر یہ سب چیزیں) تمہیں محبوب تر ہیں اللہ' اُس کے رسولؐ اور اُس کے راستے میں جہاد سے' تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے۔ اور اللہ ایسے فاسقوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔''

ان آیات کا پیغام بہت واضح ہے کہ اللہ اور اُس کے رسولؐ سے ایک بندۂ مسلمان کی محبت کا اصل امتحان عشقِ رسول ﷺ کے زبانی دعوے اور نعتیہ اشعار میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے سے نہیں' بلکہ جہاد فی سبیل اللہ کے حوالے سے ہوگا۔ اگر تو وہ اس آیت میں مذکور اپنی آٹھ محبتوں کو تج کر جہاد فی سبیل اللہ کے لیے کمر بستہ ہے تو وہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی محبت میں سچا ہے' لیکن اگر وہ اس کے لیے عملاً تیار نہیں ہے تو اس کے زبانی دعووں کی کوئی حیثیت نہیں۔

﴿اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے''

دلوں کے اندر ایمان لکھ دینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان پختہ کر دیا ہے۔ یعنی ایمان اب اُن کے دلوں میں نقش کالحجر (پتھر پر لکیر) کی صورت اختیار کر چکا ہے۔

﴿وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ﴾ ''اور اُس نے اُن کی مدد کی ہے اپنی طرف سے روح کے ساتھ''

روح سے مراد یہاں فرشتہ بھی ہو سکتا ہے' الہام بھی ہو سکتا ہے اور اللہ کا خصوصی فضل بھی ہو سکتا ہے۔ غرض اللہ کی طرف سے غیر مرئی انداز میں مدد کی کوئی صورت بھی ہو سکتی ہے۔

﴿وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ﴾ ''اور وہ داخل کرے گا انہیں اُن باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی' جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔''

﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ﴾ ''اللہ اُن سے راضی ہو گیا اور وہ اُس سے راضی ہو گئے۔''

اس کا ترجمہ ایسے بھی کیا جا سکتا ہے کہ ''اللہ اُن سے راضی ہو جائے گا اور وہ اُس سے راضی ہو جائیں گے۔''

﴿اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ﴾ ''یہ لوگ ہیں اللہ کی جماعت!''

﴿اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۲۲﴾﴾ ''آگاہ ہو جاؤ! یقیناً اللہ کی جماعت کے لوگ ہی فلاح پانے والے ہیں۔''

سورۃ المائدۃ میں یہ مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾﴾ کہ یقیناً اللہ کی جماعت کے لوگ ہی غالب رہنے والے ہیں۔ اگر حزب اللہ کی جدوجہد کے نتیجے میں اللہ کا دین دنیا میں غالب ہو جاتا ہے تو یہ یقیناً ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ لیکن اصل اور حقیقی کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے' جس کی بشارت ''حزب اللہ'' والوں کو اس آیت میں دی جا رہی ہے۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! آمین یارَبَّ الْعَالمین!

سُوْرَةُ الْحَشْرِ

آیات ۱ تا ۵

سُوْرَةُ الْحَشْرِ مَدَنِيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۲۴ رُكُوْعَاتُهَا: ۳

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱ هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۭ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۡ وَ قَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَ اَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۡ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۝۲ وَ لَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۭ وَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ۝۳ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَ مَنْ يُّشَاۗقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۴ مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَاۗىِٕمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَ لِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۵

آیت ۱ ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ﴾ ''تسبیح کرتی ہے اللہ کی ہر وہ شے جو آسمان میں ہے اور ہر وہ شے جو زمین میں ہے۔''

''المُسَبِّحات'' کے سلسلے کی پہلی سورۃ یعنی سورۃ الحدید کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے: ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ﴾۔ یہاں ''مَا فِی'' کا اضافہ ہے' جس سے گویا مفہوم میں مزید زور (emphasis) پیدا ہو گیا ہے۔ باقی ساری آیت کے الفاظ وہی ہیں۔

﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱﴾ ''اور وہ زبردست ہے' کمال حکمت والا۔''

اُس کے اختیارات مطلق ہیں' لیکن وہ اپنے اختیارات کا استعمال بہت حکمت سے کرتا ہے۔

آیت ۲ ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۭ﴾ ''وہی ہے جس نے نکال باہر کیا اُن کافروں کو جو اہلِ کتاب میں سے تھے اُن کے گھروں سے' پہلے جمع ہونے کے وقت۔''

یہ یہودی قبیلہ بنو نضیر کی مدینہ منورہ سے جلاوطنی کے واقعہ کا ذکر ہے۔ اس واقعہ کا پس منظر یوں ہے کہ حضور ﷺ کی ہجرت کے وقت مدینہ (یثرب) میں تین یہودی قبائل بنو قینقاع' بنو نضیر اور بنو قریظہ آباد تھے۔ حضور ﷺ نے مدینہ تشریف لانے کے فوراً بعد

ان قبائل کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جو تاریخ میں ''میثاقِ مدینہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بنیادی طور پر یہ مدینہ کے ''مشترکہ دفاع'' کا معاہدہ تھا۔ ان میں سے قبیلہ بنوقینقاع نے تو معاہدے کے کچھ ہی دیر بعد مسلمانوں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ چنانچہ معاہدے کی مسلسل خلاف ورزیوں کی بنا پر حضور ﷺ نے غزوۂ بدر کے بعد اس قبیلہ کو مدینہ بدر کر دیا۔ غزوۂ اُحد (۳ ہجری) کے بعد قبیلہ بنونضیر نے بھی مسلمانوں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کی وقتی شکست سے ان کی کمزوری کا تاثر لے کر جہاں عرب کے بہت سے دوسرے قبائل نے سر اٹھانا شروع کیا' وہاں یہ قبیلہ بھی اپنے عہد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف مہم جوئی میں شامل ہو گیا۔ ان کے سردار کعب بن اشرف نے قریشِ مکہ سے گٹھ جوڑ کر کے انہیں مدینہ پر حملہ کرنے کی باقاعدہ دعوت دی اور انہیں یقین دلایا کہ تم لوگ باہر سے حملہ کرو' ہم اندر سے تمہاری مدد کریں گے۔ اسی دوران کعب بن اشرف نے حضور ﷺ کو (نعوذ باللہ) شہید کرنے کی ایک سازش بھی تیار کی۔ اس کے لیے ان لوگوں نے حضور ﷺ کو کسی اہم بات چیت کے بہانے اپنے ہاں بلایا۔ منصوبہ یہ تھا کہ کسی دیوار کے بالکل ساتھ آپؐ کی نشست کا انتظام کیا جائے اور جب آپؐ وہاں بیٹھے ہوں تو دیوار کے اوپر سے چکی کا بھاری پاٹ آپؐ پر گرا دیا جائے۔ آپؐ ان کے بلانے پر ان کے محلے میں تشریف لے گئے مگر اللہ تعالیٰ نے جب وحی کے ذریعے آپؐ کو ان کی اس گھناؤنی سازش سے آگاہ کیا تو آپؐ واپس تشریف لے آئے۔

بنونضیر کی ان ریشہ دوانیوں اور مسلسل بدعہدی کی وجہ سے بالآخر ربیع الاوّل ۴ ہجری میں حضور ﷺ نے ان کے خلاف لشکر کشی کا حکم دے دیا۔ البتہ جب مسلمانوں نے ان کی گڑھیوں کا محاصرہ کیا تو انہوں نے چند دن محصور رہنے کے بعد لڑے بغیر ہتھیار ڈال دیے۔ اس پر حضور ﷺ نے ان کی جان بخشی کرتے ہوئے انہیں مدینہ سے نکل جانے کا حکم دیا' بلکہ آپ ﷺ نے مزید نرمی فرماتے ہوئے انہیں یہ اجازت بھی دے دی کہ جاتے ہوئے وہ جس قدر سامان اونٹوں پر لاد کر لے جا سکتے ہیں' لے جائیں۔ غزوۂ احزاب (۵ ہجری) کے بعد بنوقریظہ کو بھی ان کی عہد شکنی اور سازشوں کی وجہ سے کیفر کردار تک پہنچا دیا گیا۔ اس طرح یہودِ مدینہ کے تینوں قبائل میثاقِ مدینہ کی خلاف ورزی کے باعث ایک ایک کر کے اپنے انجام کو پہنچ گئے۔

آیت میں لِاَوَّلِ الْحَشْرِ کا ایک مفہوم تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مسلمانوں نے پہلی مرتبہ ہی جب ان پر لشکر کشی کی تو انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے علاوہ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ مدینہ سے جلاوطنی تو ان لوگوں کا پہلا حشر ہے' پھر ایک وقت آئے گا جب انہیں خیبر سے بھی نکال دیا جائے گا اور اس کے بعد انہیں جزیرہ نمائے عرب کو بھی خیرباد کہنا پڑے گا (چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں تمام عیسائیوں اور یہودیوں کو جزیرہ نمائے عرب سے نکال دیا گیا) اور پھر ایک حشر وہ ہوگا جو قیامت کے دن برپا ہوگا۔

﴿مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا﴾ ''(اے مسلمانو!) تمہیں یہ گمان نہیں تھا کہ وہ (اتنی آسانی سے) نکل جائیں گے''

﴿وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ﴾ ''اور وہ بھی سمجھتے تھے کہ ان کے قلعے انہیں اللہ (کی پکڑ) سے بچا لیں گے''

﴿فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا﴾ ''تو اللہ نے ان پر حملہ کیا وہاں سے جہاں سے انہیں گمان بھی نہ تھا۔''

﴿وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ﴾ ''اور ان کے دلوں میں اُس نے رعب ڈال دیا''

اللہ تعالیٰ اپنے دشمنوں کو جس طریقے سے چاہے ہزیمت سے دوچار کر دے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے انہیں اس قدر مرعوب

کر دیا کہ وہ اپنے مضبوط قلعوں کے اندر بھی خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگے اور اپنے تمام تر وسائل کے باوجود بھی مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔

﴿يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ''وہ برباد کر رہے تھے اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں سے بھی اور اہلِ ایمان کے ہاتھوں سے بھی۔''

چونکہ انہیں یہ اجازت مل چکی تھی کہ اپنے سامان میں سے جو کچھ وہ اپنے ساتھ اونٹوں پر لاد کر لے جا سکتے ہیں لے جائیں اس لیے وہ اپنے گھروں کی دیواروں اور چھتوں میں سے دروازے' کھڑکیاں' کڑیاں' شہتیر وغیرہ نکالنے کے لیے خود ہی انہیں مسمار کر رہے تھے۔ان کی اس تخریب میں مسلمانوں نے بھی ان کا ہاتھ بٹایا ہوگا۔

﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۝۲﴾ ''پس عبرت حاصل کرو اے آنکھیں رکھنے والو!''

یہ گویا پیچھے رہ جانے والے قبیلے بنی قریظہ کو سنایا جا رہا ہے کہ تم اپنے بھائی بندوں کے اس انجام سے عبرت حاصل کرو اور سازشوں سے باز آ جاؤ!

آیت ۳ ﴿وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ﴾ ''اور اگر اللہ نے پہلے سے نہ لکھ دیا ہوتا ان پر جلاوطن ہونا''

﴿لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۭ وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ۝۳﴾ ''تو انہیں سخت عذاب دیتا دنیوی زندگی میں' اور آخرت میں ان کے لیے آگ کا عذاب ہے۔''

آیت ۴ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ﴾ ''یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) کی مخالفت کی۔''

﴿وَمَنْ يُّشَاۗقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۴﴾ ''اور جو اللہ کی مخالفت پر کمر کس لے تو (سمجھ لو کہ) اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''

آیت ۵ ﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَاۗىِٕمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ ''تم نے کھجور کے جو درخت کاٹے یا جن کو چھوڑ دیا ان کی جڑوں پر کھڑے' تو یہ اللہ کے اِذن سے ہوا''

لِیْنَہ ایک خاص قسم کی کھجور کے درخت کو کہتے ہیں۔ یہودیوں کی گڑھیوں اور حویلیوں کے گرد یہ درخت باڑ کی شکل میں کثرت سے موجود تھے۔مسلمانوں نے جب ان کا محاصرہ کیا تو حملہ کے لیے راستے بنانے کی غرض سے حسبِ ضرورت ان میں سے کچھ درختوں کو انہوں نے کاٹ ڈالا۔ یہودیوں نے مسلمانوں کے اس عمل کو ہدفِ تنقید بنایا اور پروپیگنڈا کیا کہ یہ لوگ خود کو مؤمنین کہتے ہیں اور ان کے قائد اللہ کے رسول (ﷺ) ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں' لیکن ان لوگوں کی اخلاقیات کا معیار یہ ہے کہ پھل دار درختوں کو بھی کاٹنے سے دریغ نہیں کرتے۔ یہودیوں کے اس پراپیگنڈے کا جواب اللہ تعالیٰ نے خود دیا۔ چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے مذکورہ اقدام پر اپنی منظوری (sanction) کی مہر ثبت کرتے ہوئے واضح کر دیا کہ مسلمانوں نے یہ درخت جنگی ضرورت کے تحت اللہ کے رسول ﷺ کی موجودگی میں کاٹے ہیں۔ چنانچہ جب اللہ کے رسول ﷺ نے انہیں ایسا کرنے سے منع نہیں کیا تو پھر سمجھ لو کہ اللہ کی طرف سے اس کی اجازت دی گئی تھی۔

﴿وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۵﴾ ''اور تا کہ وہ فاسقوں کو ذلیل و رسوا کرے۔''

اب اگلی آیات میں مالِ فے کا ذکر آ رہا ہے جو اس سورت کا اہم ترین مضمون ہے۔ چنانچہ ان آیات کے مطالعہ سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ مالِ فے کیا ہے اور یہ مالِ غنیمت سے کس طرح مختلف ہے۔ مالِ غنیمت تو وہ مال ہے جو با قاعدہ جنگ کے نتیجے میں حاصل ہو۔ اس سے پہلے سورۃ الانفال کی آیت ۴۱ میں مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارے میں حکم آ چکا ہے۔ اس حکم کے مطابق مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ' اُس کے رسول ﷺ' رسولؐ کے قرابت داروں' یتیموں' مسکینوں اور مسافروں کے لیے مخصوص ہوگا' جبکہ باقی چار حصے اس جنگ میں حصہ لینے والے مجاہدین کے مابین تقسیم کر دیے جائیں گے' اور اس تقسیم میں سوار کو پیدل کے مقابلے میں دو حصے ملیں گے۔ اس کے برعکس ''مالِ فے'' وہ مال ہے جو مسلمانوں کو کسی جنگ کے بغیر ہی حاصل ہو جائے' جیسے زیر مطالعہ واقعہ میں با قاعدہ جنگ کی نوبت نہیں آئی تھی' مسلمانوں نے بنونضیر کا محاصرہ کیا اور انہوں نے مرعوب ہو کر ہتھیار ڈال دیے۔ چنانچہ اس مہم کے نتیجے میں حاصل ہونے والی زمینیں اور دوسری تمام اشیاء مالِ فے قرار پائیں۔ آگے آیت ۷ میں مالِ فے کے بارے میں واضح کر دیا گیا کہ یہ مال کُل کا کُل اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا ہے۔ اس میں سے اللہ کے رسول ﷺ اپنی مرضی سے غرباء و مساکین کو تو دیں گے لیکن عام مسلمانوں کو اس میں سے حصہ نہیں ملے گا۔

آیات ۶ تا ۱۰

وَ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ
يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۶ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ
اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَ لِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا
يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ وَ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ
فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۷ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا
مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا وَّ يَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ
هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝۸ وَ الَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَ لَا
يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ
وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۹ وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا
اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَ لَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ
اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۰ ع

آیت ۶ ﴿وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ﴾ ''اور جو مال کہ ہاتھ لگا دیا ہے اللہ نے اپنے رسولؐ کے ان (بنونضیر) سے''
﴿فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ﴾ ''تو (اے مسلمانو!) تم نے اس پر نہیں دوڑائے گھوڑے اور نہ اونٹ''

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ﴾ ''لیکن مسلط کر دیتا ہے اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۶﴾ ''اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت اور قدرت سے بنونضیر کے حوصلے پست کر دیے اور انہوں نے تم لوگوں کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اس مہم میں ان کے خلاف تمہیں جنگ تو لڑنا ہی نہیں پڑی۔ لہٰذا تم پر واضح ہونا چاہیے کہ بنونضیر کی جلاوطنی کے نتیجے میں جو مال تمہارے ہاتھ لگا ہے وہ مالِ غنیمت نہیں ہے۔ اب اگلی آیت میں اس مال کے مصارف کے بارے میں حکم دیا جا رہا ہے۔

آیت ۷ ﴿مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى﴾ ''جو مال بھی ہاتھ لگا دے اللہ اپنے رسولؐ کے بستیوں والوں سے''

﴿فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾ ''تو وہ ہے اللہ کے لیے، رسولؐ کے لیے، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے''

واضح رہے کہ اللہ اور رسولؐ سے مراد یہاں اسلامی ریاست ہے۔ پھر چونکہ رسول اللہ ﷺ کا اپنا ذاتی ذریعہ معاش تو کوئی تھا نہیں، اس لیے یہ مال آپؐ کے ذاتی اخراجات مثلاً ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے نان نفقہ اور دوسری معاشرتی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے بھی تھا۔ اس کے علاوہ اس میں حضور ﷺ کے قرابت داروں کی مد بھی رکھی گئی تاکہ آپؐ اپنے قرابت داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کے تقاضے پورے کر سکیں۔ اسی طرح اس مال میں ان تمام اقسام کے ناداروں اور محتاجوں کا بھی حق رکھا گیا جن کا ذکر اس آیت میں آیا ہے۔

﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ﴾ ''تاکہ وہ تم میں سے مال داروں ہی کے درمیان گردش میں نہ رہے۔''

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ معاشرے میں دولت کی تقسیم منصفانہ ہو اور اس کی گردش کے ثمرات معاشرے کے تمام طبقات تک پہنچیں۔ یہ اسلامی معیشت کا بہت اہم اور بنیادی اصول ہے۔ اسی اصول کے تحت اللہ تعالیٰ نے مالِ فے کو زیادہ تر ناداروں اور محتاجوں کی محرومیوں کے ازالے کے لیے مختص فرما دیا۔ مالِ فے بھی اگر مالِ غنیمت کی طرح تقسیم کیا جاتا تو یہاں بھی سواروں کو دوہرا حصہ ملتا اور ظاہر ہے جس شخص کے پاس گھوڑا یا اونٹ ہے وہ تو پہلے ہی سے کچھ خوشحال ہے۔ تو اس تقسیم سے مالِ فے کا بھی زیادہ تر حصہ خوشحال لوگوں کو ہی ملتا۔

واضح رہے کہ اسلام کے نظامِ عدل وقسط میں تمام انسانوں کو معاشی طور پر برابر کر دینے کا تصور نہیں پایا جاتا۔ ایسا ہونا عملی طور پر ممکن بھی نہیں۔ ظاہر ہے ایک سپاہی اور سپہ سالار کسی طرح بھی برابر نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ کمیونزم اپنے تمام تر دعووں اور انقلابی نعروں کے باوجود ایسی ''معاشی مساوات'' کی کوئی ہلکی سی جھلک بھی دنیا کو نہیں دکھا سکا۔ اس کے برعکس اسلام کا نظامِ معیشت معاشرے سے معاشی ناہمواریوں کو ختم کرنے اور امیر وغریب کے درمیان فرق وتفاوت کو کم سے کم کرنے پر زور دیتا ہے۔ اس کے لیے اسلام ہر وہ دروازہ بند کر دینے کا حکم دیتا ہے جس کی وجہ سے چند ہاتھوں میں ارتکازِ دولت کا خدشہ ہو اور ہر وہ راستہ کھولنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جس سے گردشِ دولت کا رُخ اُمراء سے غرباء کی طرف پھرنے اور معاشی محرومیوں کے ازالے کا امکان ہو۔ آج معاشی پیچیدگیوں کی وجہ سے جدید معاشرے میں جو گمبھیر صورتحال جنم لے رہی ہے اس کا ادراک سب سے پہلے جس عالم دین کو ہوا وہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ تھے۔ شاہ ولی اللہؒ ایسی صورتِ حال کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جس ملک یا معاشرے میں تقسیمِ دولت کا نظام

غیر منصفانہ ہوگا وہاں کچھ لوگ دولت کے انبار جمع کر کے مسرفانہ عیاشیوں اور بدمعاشیوں میں مبتلا ہو جائیں گے جبکہ محروم طبقے کے لوگ بار برداری کے جانور بن کر رہ جائیں گے۔ ایسی ہی صورتِ حال کے بارے میں حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا)) [1] کہ محرومی اور احتیاج انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے۔ گویا تقسیم دولت کا غیر منصفانہ نظام ایسی دو دھاری تلوار ہے جس کی دو طرفہ کاٹ سے مذکورہ دونوں طبقوں کے افراد مذہبی و انسانی اقدار سے بیگانہ و بے نیاز ہو کر عملی طور پر معاشرے کے لیے ناسور بن جاتے ہیں۔ اُمراء کو تو اپنے اللّوں تللّوں سے ہی فرصت نہیں ملتی جبکہ غریب و نادار عوام دنیا و مافیہا سے بے خبر صبح سے شام تک کمر توڑ مشقت میں مصروف رہتے ہیں۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شیطان اپنے ایجنڈے کی تکمیل کے لیے آگے بڑھتا ہے اور محروم طبقے کے افراد کے دلوں میں ظالم استحصالی طبقے کے خلاف بغض و عداوت کی آگ سلگانا شروع کر دیتا ہے: ﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ﴾ (المائدۃ: ۹۱) ''شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان دشمنی اور بغض پیدا کر دے''۔ تصور کریں اگر ایک سیٹھ صاحب کی بیٹی کی شادی کے موقع پر کروڑوں روپے کا اسراف صرف بے جا نمود و نمائش کی مد میں ہو رہا ہوگا تو یہ سب کچھ دیکھ کر اس کے اس غریب ملازم کے دل میں نفرت و عداوت کے کیسے کیسے جذبات پیدا ہوں گے جس کی بیٹی گھر میں بیٹھی صرف اس لیے بوڑھی ہو رہی ہے کہ وہ اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ پھر ہمارے معاشرے میں جب ایک کروڑ پتی کی بیٹی لاکھوں کا جہیز لے کر دوسرے کروڑ پتی کی بہو بن جاتی ہے تو دولت مال داروں ہی کے مابین گردش میں رہتی ہے۔

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ﴾ ''اور جو کچھ رسول تم لوگوں کو دے دیں وہ لے لو اور جس چیز سے روک دیں اس سے رک جاؤ''

ان الفاظ میں گویا اہلِ ایمان کو ترغیب دی جا رہی ہے کہ وہ مالِ فے سے متعلق نئے قانون کے تحت رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں کو بخوشی قبول کریں۔ ظاہر ہے لشکرِ اسلام میں شامل لوگ تو بنونضیر کے علاقے سے حاصل ہونے والے مال و اسباب کو مالِ غنیمت سمجھتے ہوئے اس میں سے حصے کی توقع کر رہے تھے۔ اب جب مذکورہ حکم کے تحت اس مال کو مالِ فے قرار دے کر اس کی تقسیم کا نیا قانون بنا دیا گیا تو لشکر کے شرکاء کو طبع بشری کے تحت ایک دھچکا تو ضرور لگا ہوگا۔ چنانچہ اس حکم کے تحت بنونضیر کے محاصرے میں شامل اہلِ ایمان کو بالخصوص اور تمام اہلِ ایمان کو بالعموم دین کا بنیادی اصول بتا دیا گیا کہ تمہارے لیے اللہ کے رسول ﷺ کا ہر فیصلہ آخری حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ معاملہ چاہے کوئی بھی ہو اللہ کے رسول ﷺ تم لوگوں کو جو دے دیں وہ لے لیا کرو اور جس چیز سے آپؐ منع کر دیں اس سے منع ہو جایا کرو۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''

اب اگلی آیات میں مالِ فے کی تقسیم کے بارے میں مزید وضاحت کی جا رہی ہے کہ جب یہ مال مذکورہ قانون کے تحت بیت المال میں آ جائے گا تو اس کی تقسیم میں بنیادی طور پر ضرورت مندوں کی ضروریات کو ترجیح دی جائے گی۔ ظاہر ہے اللہ کے

۱۔ المقاصد الحسنة للسخاوی، ح:۳۶۸۔ اللآلی المنثورہ للزرکشی (بدرالدین)، ح:۲۰۹ [له شاهد]

رسول ﷺ تو اس میں سے اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے وہی کچھ قبول کریں گے جو آپؐ کی انتہائی بنیادی ضروریات کے لیے ناگزیر ہوگا۔ آپ ﷺ نے تو اپنی ذات اور ازواجِ مطہرات ؓ پر شروع دن سے ہی فقر طاری کر رکھا تھا۔ سورۃ الاحزاب کے چوتھے رکوع میں واقعہ ایلاء کے بارے میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ ازواجِ مطہراتؓ کی طرف سے نان نفقہ بڑھانے کے مطالبے پر حضور ﷺ نے انؓ سے علیحدگی اختیار فرمائی تھی۔ چنانچہ مالِ فے کا بڑا حصہ کس کے لیے مختص کیا جائے گا:

آیت ۸ ﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ﴾ ''یہ (خاص طور پر) اُن تنگ دست مہاجرین کے لیے ہے جو نکال دیے گئے اپنے گھروں اور اپنے اموال سے''

﴿يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ﴾ ''وہ اللہ کے فضل اور اُس کی رضا کے متلاشی ہیں اور اللہ اور اُس کے رسولؐ کی مدد کر رہے ہیں۔''

﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۚ۸﴾ ''یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں۔''

یہاں سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ کے یہ الفاظ بھی ذہن میں تازہ کر لیں: ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ﴾ یعنی حق و باطل کی کشمکش سے دراصل اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے (ظاہر کر دینا چاہتا ہے) کہ کون لوگ غیب میں ہونے کے باوجود اُس کی اور اُس کے رسولوں کی مدد کے لیے جاں بکف کھڑے ہوتے ہیں۔ آیت زیر مطالعہ میں نہ صرف مالِ فے کی تقسیم کے حوالے سے فقراء مہاجرین کی ترجیح واضح کر دی گئی بلکہ ان کی بے لوث قربانیوں کی تصدیق و توثیق بھی فرما دی گئی کہ یہ لوگ صرف اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ کر گھروں سے نکلے ہیں۔ اب چونکہ ان کے پاس اپنی بنیادی ضروریات کے لیے بھی کچھ نہیں تو مالِ فے کی تقسیم میں ان کے لیے خصوصی حصہ رکھا جائے گا۔

آیت ۹ ﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ ''اور (اس مال میں اُن کا بھی حق ہے) جو آباد تھے اپنے گھروں میں اور جن کے پاس ایمان بھی تھا ان (مہاجرین کی آمد) سے پہلے''

یہ انصارِ مدینہ کا ذکر ہے کہ مہاجرین کی آمد پر ان کا طرزِ عمل کیا تھا:

﴿يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ﴾ ''وہ محبت کرتے ہیں ان سے جنہوں نے ہجرت کی ان کی طرف''

مدینہ منورہ کے مسلمانوں نے مکہ مکرمہ سے آنے والے مہاجرین کو کھلے دل سے خوش آمدید کہا۔ ان میں سے کسی کے دل میں قطعاً کوئی ایسا خیال نہیں آیا کہ ان لوگوں کے آنے سے ہماری آبادی بڑھ جائے گی اور ان کی ناداری و محرومی ہماری معیشت پر بوجھ بن جائے گی۔

﴿وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا﴾ ''اور وہ نہیں پاتے اپنے سینوں میں کوئی حاجت اس بارے میں کہ جو کچھ ان (مہاجرین) کو دیا جاتا ہے''

انصارِ مدینہ کے دل اپنے مہاجر بھائیوں کے لیے ایثار و قربانی کے اعلیٰ جذبات سے لبریز ہیں' اور یہ جذبات ان کے دلوں میں اس دولتِ ایمان کے باعث پیدا ہوئے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے انہیں بہرہ ور فرمایا ہے۔ یہ آیت دراصل انصارِ مدینہ کی تسکین و تشفی

کے لیے ان کے جذبۂ ایمان کو اپیل کرتے ہوئے نازل ہوئی تا کہ اگر ان میں سے کچھ لوگوں کے دلوں میں بنونضیر کے چھوڑے ہوئے مال سے متوقع حصہ نہ ملنے کے باعث کچھ ملال وغیرہ کے احساسات پیدا ہوئے ہوں تو وہ ختم ہو جائیں۔

﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ﴾ ''اور وہ تو خود پر ترجیح دیتے ہیں دوسروں کو خواہ ان کے اپنے اوپر تنگی ہو۔''

ایثار کے معنی کسی کے لیے قربانی دینے اور دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دینے کے ہیں۔ ظاہر ہے انصارِ مدینہ میں سے بھی سب لوگ دولت مند تو نہیں تھے' ان میں بھی بہت سے لوگ نادار اور تنگ دست تھے' لیکن ان میں سے ہر ایک نے اپنی احتیاج اور ضرورت کو پسِ پشت ڈال کر استطاعت بھر اپنے مہاجر بھائیوں کی مدد کی تھی۔ ان کے اسی جذبۂ ایثار کا اعتراف یہاں اس آیت میں کیا گیا ہے۔

﴿وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝٩﴾ ''اور جو کوئی بھی بچا لیا گیا اپنے جی کے لالچ سے تو وہی لوگ ہیں فلاح پانے والے۔''

اب اس کے بعد جو آیت آ رہی ہے وہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایران' عراق' مصر' شام وغیرہ کے مفتوحہ علاقوں کی زمینوں کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے اس آیت سے استدلال کیا تھا۔ ان علاقوں کی زمینیں بہت زرخیز ہیں' خصوصی طور پر عراق اور شام کے درمیان صحرا میں واقع وہ علاقہ جو Fertile Crescent کہلاتا ہے' اپنی زرخیزی کے اعتبار سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ جب یہ وسیع و عریض علاقے فتح ہوئے تو ان کی زرعی زمینوں کے نظم و نسق کا مسئلہ سامنے آیا۔ اس معاملے میں زیادہ تر صحابہؓ کی رائے یہ تھی کہ مالِ غنیمت کی تقسیم کے اصول کے مطابق پانچواں حصہ بیت المال کے لیے مختص کر کے باقی زمینیں ہر محاذ کے مجاہدین میں تقسیم کر دی جائیں۔ البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس رائے سے متفق نہیں تھے۔ آپ کی رائے یہ تھی کہ ان ممالک کی زمینیں مالِ غنیمت کے بجائے مالِ فے کے زمرے میں آتی ہیں' اس لیے ان پر مالِ فے کے قانون کا اطلاق ہونا چاہیے۔ اس نکتے کی مزید وضاحت یہ ہے کہ مالِ غنیمت صرف وہ مال ہے جو جنگ میں دشمن کو شکست دینے کے بعد عینِ محاذِ جنگ سے مسلمان مجاہدین کے ہاتھ لگے۔ جیسے اسلحہ' راشن' بھیڑ بکریاں' اونٹ گھوڑے' جنگی قیدی وغیرہ۔ لیکن اگر کسی ایک جنگ کے نتیجے میں کوئی پورا ملک فتح ہو جائے (جیسے ابراہیم لودھی پانی پت کے میدان میں بابر سے صرف ایک جنگ ہارا تو اس کے نتیجے میں پورے ہندوستان پر بابر کا قبضہ ہو گیا) تو میدانِ جنگ سے باہر کی اراضی' املاک اور آبادی کو مالِ فے شمار کیا جائے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس معاملے میں اگلی آیت کے ان الفاظ سے استدلال کیا تھا: ﴿وَالَّذِينَ جَاءُو مِن بَعْدِهِمْ﴾ ''اور وہ لوگ جو ان کے بعد آئیں گے''۔ پچھلی آیات کے مضمون سے اس آیت کے ان الفاظ کا ربط یوں بنتا ہے کہ مالِ فے پر حق ہے اللہ و رسولؐ کا' رسول اللہ ﷺ کے عزیز و اقارب کا' غرباء و مساکین کا' انصار و مہاجرین کا (بحوالہ آیات ۷ اور ۸) اور اُن لوگوں کا جو اُن کے بعد آئیں گے۔ ان آیات کے سیاق و سباق میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا موقف یہ تھا کہ آج کے مالِ فے میں اس اُمت کے قیامت تک آنے والے مسلمانوں کا بھی حق ہے اور اگر آج یہ زمینیں چند ہزار مجاہدین میں تقسیم کر دی گئیں تو بعد میں آنے والے مسلمان گویا اس حق سے محروم رہ جائیں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس استدلال سے بعض معتبر صحابہؓ نے اختلاف بھی کیا اور مذکورہ زمینوں کو مالِ غنیمت کے قانون کے تحت

متعلقہ مجاہدین میں تقسیم کرنے پر اصرار کیا۔ اس اختلافِ رائے کے بعد حضرت عمرؓ نے اس معاملے میں غور وخوض کے لیے اوس، خزرج اور مہاجرین میں سے چند صحابہؓ پر مشتمل ایک کمیشن تشکیل دے دیا۔ کمیشن کے ارکان نے مسئلے سے متعلق مختلف آراء اور دیگر پہلوؤں کو مدِنظر رکھتے ہوئے متفقہ طور پر جو فیصلہ دیا وہ حضرت عمرؓ کی رائے کے عین مطابق تھا اور بعد میں اسی فیصلے پر تمام صحابہؓ کا اجماع ہوا۔ صحابہؓ کے اس اجماع یا فیصلے کے مطابق تمام مسلم ممالک کی اراضی دو اقسام میں بٹ گئی۔ جن علاقوں کے لوگ لڑے بھڑے بغیر ایمان لے آئے ان کی زمینیں ''عُشری زمینیں'' (ایسی زمین جو انفرادی ملکیت میں ہو اور اس کی پیداوار سے باقاعدہ عُشر وصول کیا جاتا ہو) قرار پائیں۔ جبکہ بزورِ شمشیر فتح ہونے والے ممالک کی زمینوں کو ''خراجی زمینوں'' (ایسی زمینیں جو بیت المال کی ملکیت ہوں اور ان کو کاشت کرنے والے لوگ اسلامی حکومت کو خراج ادا کریں) کا درجہ دیا گیا۔ مثلاً مدینہ کو حضور ﷺ نے کسی جنگ کے نتیجے میں فتح نہیں کیا تھا بلکہ مدینہ کے لوگوں نے حضور ﷺ کو وہاں آنے کی خود دعوت دی تھی، اس لیے اوس اور خزرج کی تمام زمینیں ''عُشری'' قرار پائیں اور متعلقہ لوگوں کی انفرادی ملکیت میں ہی رہیں، جبکہ ایران، عراق، مصر، شام وغیرہ ممالک کی زمینیں خراجی زمینوں کی حیثیت سے اسلامی حکومت کی تحویل میں چلی گئیں۔ اس طرح حضرت عمرؓ کے اجتہاد کے نتیجے میں انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ زمین کی اجتماعی ملکیت (collective ownership of land) کا نظام متعارف ہوا۔ اس وقت مفتوحہ علاقوں کی زمینیں اگر مالِ غنیمت کی حیثیت سے چند ہزار مجاہدین میں تقسیم کر دی جاتیں تو اسلامی حکومت کے تحت انسانی تاریخ کی سب سے بڑی جاگیرداری وجود میں آجاتی۔ اور پھر یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہ ہوتا بلکہ جس ملک کی اراضی واملاک پر مالِ غنیمت کے قانون کا اطلاق ہوتا اس ملک کی پوری آبادی کو جنگی قیدیوں کی حیثیت سے غلام اور لونڈیاں بنا کر تقسیم کرنے کا مطالبہ بھی آتا۔

اسی قانون کے تحت پچھلی صدی تک ہندوستان کی زمینوں کے بارے میں بھی یہاں کے علماء کا اجماع تھا کہ یہاں کی تمام زمینیں خراجی ہیں اور اس حیثیت سے یہ زمینیں یہاں کے مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت ہیں اور یہ کہ ہندوستان میں کوئی عُشری زمین نہیں ہے۔ اس کا ذکر ہندوستان کے عظیم مفسر ومحدث قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے فقہ کے مسائل سے متعلق اپنے رسالے ''مَالَا بُدَّ مِنْہ'' میں بھی کیا ہے۔ قاضی صاحب موصوف بہت بڑے صوفی اور مفتی بھی تھے۔ ان کی لکھی ہوئی ''تفسیر مظہری'' جسے انہوں نے اپنے مرشد مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کے نام سے منسوب کیا ہے، آج کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ قاضی صاحب کا مرتّب کردہ مذکورہ رسالہ فقہ کے بنیادی اور ابتدائی مسائل پر مشتمل ہے اور برصغیر کے تمام عربی مدارس میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس رسالے میں انہوں نے عُشر سے متعلق مسائل شامل ہی نہیں کیے اور اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ جب ہندوستان میں کوئی عُشری زمین ہے ہی نہیں اور عُشر سے متعلق احکام کی تنفیذ و تعمیل کا کوئی امکان ہی نہیں تو ان مسائل کو لکھنے، پڑھنے یا سمجھنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس علاقے میں جب کبھی اسلامی حکومت قائم ہو تو نئے بندوبست اراضی کے تحت بڑے بڑے جاگیرداروں سے وہ زمینیں واپس لی جاسکتی ہیں جو ماضی کے بادشاہوں، انگریز حکمرانوں اور سپہ سالاروں کی ''نظرِ کرم'' کے باعث انہیں عطا ہوئی تھیں۔

آیت ۱۰ ﴿وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ﴾ ''اور وہ لوگ جو ان کے بعد آئے (مالِ فے پر ان کا بھی حق ہے) وہ کہتے ہیں: اے ہمارے ربّ! تُو بخش دے ہمیں بھی اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ایمان میں ہم سے سبقت لے گئے''

﴿وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۰﴾ ''اور ہمارے دلوں میں اہلِ ایمان کے لیے کوئی کدورت نہ پیدا ہونے دے' اے ہمارے رب' بے شک تُو نہایت شفیق اور رحم فرمانے والا ہے۔''

اس آیت میں واضح کر دیا گیا ہے کہ مالِ فے کی تقسیم میں حاضر و موجود لوگوں کے علاوہ بعد میں آنے والے مسلمانوں اور ان کی آئندہ نسلوں کا حصہ بھی ہے۔ مزید برآں اس میں ایک اہم اخلاقی درس بھی دیا گیا ہے کہ کسی مسلمان کے دل میں کسی دوسرے مسلمان کے لیے کوئی بغض' کینہ یا کدورت نہیں ہونی چاہیے' اور مسلمانوں کے لیے صحیح طرزِ عمل یہی ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے حق میں دعائے مغفرت کرتے رہیں' نہ یہ کہ انہیں سب و شتم کا نشانہ بنائیں۔

یہاں پر پہلا رکوع اختتام پذیر ہوا۔ اس رکوع میں بنونضیر کے مدینہ سے انخلاء اور ان کی چھوڑی ہوئی املاک (مالِ فے) سے متعلق احکام کا ذکر تھا۔ اب اگلی آیات میں منافقین کا تذکرہ ہے کہ ان لوگوں نے غزوۂ بنونضیر کے حوالے سے کیا کردار ادا کیا۔

آیات ۱۱ تا ۱۷

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّ اِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱۱ لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَ لَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝۱۲ لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝۱۳ لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ؕ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّ قُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ۝۱۴ كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱۵ كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۶ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۷ ع

آیت ۱۱ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا﴾ ''کیا تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جو نفاق میں مبتلا ہیں''

﴿يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ﴾ ''وہ کہتے ہیں اپنے اُن بھائیوں سے جنہوں نے اہلِ کتاب میں سے کفر کیا ہے''

﴿لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ﴾ ''کہ اگر تم لوگوں کو (کبھی مدینہ سے) نکالا گیا تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے''

یہودیوں کے ساتھ ان منافقین کے حلیفانہ تعلقات تھے۔ ان تعلقات اور روابط کی بنیاد پر منافقین وقتاً فوقتاً انہیں یقین دلاتے رہتے تھے کہ ہم آخری دم تک تمہارا ساتھ دیں گے اور اگر تم لوگوں کو کبھی مدینہ سے بے دخل کرنے کی کوشش کی گئی تو ایسی مشکل گھڑی میں ہم شانہ بشانہ تمہارے ساتھ کھڑے ہوں گے۔

﴿وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا﴾ ''اور تمہارے معاملے میں ہم کسی کی بھی اطاعت نہیں کریں گے''

﴿وَإِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ﴾ ''اور اگر تمہارے ساتھ جنگ کی گئی تو ہم لازماً تمہاری مدد کریں گے۔''

منافقین انہیں یقین دلاتے رہتے تھے کہ ہم محض وقتی طور پر بعض مصلحتوں کی وجہ سے مسلمانوں میں شامل ہوئے ہیں اور یہ کہ اس وجہ سے تمہارے ساتھ ہمارے پرانے دوستانہ تعلقات بالکل متاثر نہیں ہوں گے۔ چنانچہ تمہارے ساتھ حقِ دوستی نبھانے میں کوئی مصلحت بھی ہمارے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ ہم بعض معاملات میں رسول اللہ ﷺ کا حکم مانتے بھی ہیں' لیکن تمہارے معاملے میں ہم ان کے حکم کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیں گے۔ اگر مسلمانوں نے کبھی تمہارے خلاف کوئی اقدام کرنے کی کوشش کی تو ہم ان کے ساتھ کھڑے ہونے کے بجائے تمہارا ساتھ دیں گے۔

﴿وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿١١﴾﴾ ''اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔''

آیت ۱۲ ﴿لَئِنْ أُخْرِجُوا لَا يَخْرُجُونَ مَعَهُمْ﴾ ''اگر وہ نکالے گئے تو یہ اُن کے ساتھ نہیں نکلیں گے۔''

﴿وَلَئِنْ قُوتِلُوا لَا يَنْصُرُونَهُمْ﴾ ''اور اگر اُن سے جنگ کی گئی تو یہ اُن کی مدد نہیں کریں گے۔''

﴿وَلَئِنْ نَصَرُوهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ ﴿١٢﴾﴾ ''اور اگر انہوں نے کبھی اُن کی مدد کی بھی تو پیٹھ دکھا دیں گے' پھر ان کی کہیں سے مدد نہیں ہو سکے گی۔''

منافقین اپنے کردار و عمل سے ثابت کر چکے ہیں کہ وہ پست حوصلہ' بزدل اور جھوٹے لوگ ہیں۔ اگر ان میں جوانمردی اور غیرت و حمیت کی کوئی رمق ہوتی تو یہ دوغلا پن اختیار نہ کرتے' بلکہ ایمان لانے کے بعد سچے مسلمانوں کا طرزِ عمل اختیار کرتے کہ ع ''ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم!'' لہٰذا اپنے دعووں کے مطابق یہ کبھی بھی یہودیوں کا ساتھ نہیں دیں گے' اور اگر ان میں سے کوئی اِکا دُکا سر پھرے لوگ حقِ دوستی نبھانے کے جوش میں یہودیوں کے ساتھ کہیں کھڑے ہو بھی گئے تو مشکل وقت آنے پر وہ بھی میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔

آیت ۱۳ ﴿لَأَنْتُمْ أَشَدُّ رَهْبَةً فِي صُدُورِهِمْ مِنَ اللَّهِ﴾ ''(اے مسلمانو!) یقیناً تمہارا ڈر ان کے دلوں میں اللہ کی نسبت شدید تر ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا تم لوگوں سے ڈرتے ہیں۔

﴿ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ﴿١٣﴾﴾ ''یہ اس لیے ہے کہ یہ ناسمجھ لوگ ہیں۔''

یہ لوگ سمجھ بوجھ سے عاری ہیں۔ انسان کی اصل سمجھ اور عقل تو وہ ہے جو اسے اللہ سے متعارف کرائے اور ایمان کی راہ سجھائے۔ اسی طرح انسان کے لیے علم بھی وہی فائدہ مند ہے جو اسے اس حقیقت سے آگاہ کر دے کہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے اور دنیا کی زندگی بس کھیل اور تماشا ہے۔ چونکہ منافقین ایسی عقل سے بیگانہ اور ایسے علم سے نابلد ہیں اس لیے وہ اللہ سے ڈرنے کے بجائے انسانوں سے ڈرتے ہیں اور آخرت کی قیمت پر دنیا سنوارنے کی فکر میں مگن ہیں۔

آیت ۱۴ ﴿لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي قُرًى مُحَصَّنَةٍ أَوْ مِنْ وَرَاءِ جُدُرٍ﴾ ''یہ کبھی اکٹھے ہو کر تمہارے خلاف جنگ

نہیں کریں گے‘ سوائے اس کے کہ قلعہ بند بستیوں میں (رہ کر لڑیں) یا دیواروں کے پیچھے سے۔‘‘

﴿بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ؕ﴾ ’’ان کے آپس کے جھگڑے بہت سخت ہیں۔‘‘

ان کے باہمی جھگڑوں اور مخاصمت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بزدلی اور خود غرضی ان میں سے ہر ایک کے مزاج کا جزوِ لاینفک بن چکی ہے۔ ظاہر ہے اگر یہ لوگ اللہ اور رسول ﷺ سے مخلص نہیں ہیں تو آپس میں ایک دوسرے سے کیسے مخلص ہو سکتے ہیں۔

﴿تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ؕ﴾ ’’تم انہیں متحد گمان کرتے ہو‘ حالانکہ ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔‘‘

ہمارے موجودہ زمانے کے سیاسی اتحاد بھی بدقسمتی سے بالکل یہی نقشہ پیش کرتے ہیں‘ حتیٰ کہ ’’تحریک نظامِ مصطفیٰ ﷺ‘‘ کے نام پر بننے والے متحدہ محاذ کے راہنماؤں کے بھی باہمی اختلافات اس قدر شدید تھے کہ ان میں سے کئی علماء ایک دوسرے کی اقتدا میں نماز تک ادا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۴﴾﴾ ’’یہ اس لیے کہ یہ ایک ایسا گروہ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔‘‘

آیت ۱۵ ﴿كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ ۚ﴾ ’’(ان کا وہی حال ہوگا) جیسے اُن لوگوں کا معاملہ ہوا جو ان سے پہلے قریب ہی اپنے کیے کی سزا چکھ چکے ہیں۔‘‘

اس سے یہودی قبیلہ بنوقینقاع کے لوگ مراد ہیں جنہیں ۲ ہجری میں غزوۂ بدر کے بعد مدینہ سے جلاوطن کیا گیا تھا‘ جبکہ بنونضیر کی جلاوطنی‘ جس کا ذکر ہم اس سورت میں پڑھ رہے ہیں‘ ۴ ہجری میں عمل میں آئی۔ اسی طرح ۵ ہجری میں غزوۂ احزاب کے بعد یہود مدینہ کا تیسرا اور آخری قبیلہ بنوقریظہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۵﴾﴾ ’’اور ان کے لیے بہت ہی دردناک عذاب ہے۔‘‘

آیت ۱۶ ﴿كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ﴾ ’’جیسے شیطان کی مثال‘ جب وہ انسان کو کہتا ہے کہ کفر کر!‘‘

﴿فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾﴾ ’’پھر جب وہ کفر کا ارتکاب کر لیتا ہے تو وہ (شیطان) کہتا ہے کہ میں تم سے لاتعلق ہوں‘ میں تو ڈرتا ہوں اللہ سے جو تمام جہانوں کا ربّ ہے۔‘‘

آیت ۱۷ ﴿فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ؕ﴾ ’’تو ان دونوں کا انجام یہ ہے کہ وہ آگ میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔‘‘

﴿وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۷﴾﴾ ’’اور یہی ہے بدلہ ظالموں کا۔‘‘

انسان اور شیطان کی اس ’’جوڑی‘‘ کا ذکر سورۂ قٓ میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ کسی کافر‘ مشرک اور گنہگار کا جو قرین (ساتھی) شیطان ہوگا وہ اس کے بارے میں کیا کہے گا: ﴿وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ﴿۲۳﴾﴾ ’’اور اُس کا ساتھی کہے گا: (اے پروردگار!) یہ جو میری تحویل میں تھا‘ حاضر ہے!‘‘ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کو حکم ملے گا: ﴿اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۲۴﴾﴾ ’’جھونک دو جہنم میں ہر ناشکرے سرکش کو‘‘۔ اس کے بعد کی دو آیات میں اس جہنمی کی مزید صفات بیان کی گئی ہیں۔ وہ شیطان پھر کہے گا: ﴿رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۲۷﴾﴾ ’’پروردگار! میں نے اس کو گمراہ نہیں کیا‘ بلکہ یہ خود ہی بہت بڑی گمراہی میں مبتلا

تھا''۔اس پر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے : ﴿لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ﴿۲۸﴾ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۲۹﴾﴾ ''اب میرے سامنے جھگڑو مت' جبکہ میں پہلے ہی تمہارے پاس وعید بھیج چکا ہوں۔میرے حضور میں بات تبدیل نہیں کی جاسکتی اور میں اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔''

آیات ۱۸ تا ۲۴

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۹﴾ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ﴿۲۰﴾ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰي جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۲۲﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۲۳﴾ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۴﴾ ع

اب ہم اس سورت کے تیسرے اور آخری رکوع کا مطالعہ کرنے جا رہے ہیں جو بہت اہم آیات پر مشتمل ہے۔اس حوالے سے یہ نکتہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ جب قرآن مجید کے کسی مقام یا کسی آیت کی خصوصی اہمیت کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے اس مقام یا آیت کا کوئی خاص پہلو یا خاص موضوع مراد ہوتا ہے' ورنہ قرآن مجید کا تو ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف اہم ہے۔مثلاً قرآن مجید کے بعض مقامات فلسفہ وحکمت کے اعتبار سے اہم ہیں تو بعض دوسرے مقامات سائنسی حوالے سے لائقِ توجہ ہیں۔بعض آیات روحِ دین سے بحث کرتی ہیں تو بعض ایمان کی ماہیت واضح کرتی ہیں۔اسی طرح ہر آیت اور ہر مقام کی اہمیت اپنے موضوع اور مضمون کے اعتبار سے ہے۔چنانچہ سورۃ الحشر کے آخری رکوع کی اہمیت فلسفہ اور تصوف کے موضوع کی وجہ سے بھی ہے اور اسمائے حسنیٰ کے اس عظیم الشان گلدستے کے اعتبار سے بھی جو پورے قرآن میں بالکل یکتا اور منفرد ہے۔اس سورت کی آخری تین آیات اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے ذکر کے حوالے سے سورۃ الحدید کی ابتدائی چھ آیات کے ہم وزن ہیں۔ان تین آیات میں ایک ساتھ سولہ اسمائے حسنیٰ آئے ہیں اور ان میں سے آٹھ اسمائے حسنیٰ تو ایک ہی آیت میں ہیں۔اتنی بڑی تعداد میں اسمائے حسنیٰ کے ایک مقام پر اکٹھے ہونے کی اور کوئی مثال قرآن مجید میں نہیں ملتی۔

آیت ۱۸ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ﴾ ''اے اہلِ ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور ہر جان کو دیکھتے رہنا چاہیے کہ اُس نے کل کے لیے کیا آگے بھیجا ہے!''

ظاہر ہے یہ اُس کل کے دن کی بات ہے جو بعث بعد الموت کے بعد آنے والا ہے' جس دن ہر شخص کو اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر

ہوکر اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہوگا۔ اس دن کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ہر اہلِ ایمان اپنی زندگی اللہ کے تقویٰ کے سائے میں گزارنے کا اہتمام کرے اور اپنے اعمال کا مسلسل جائزہ لیتا رہے کہ اُس نے آخرت کے حوالے سے اب تک کیا کمائی کی ہے اور کائناتی حکومت کے امپیریل بینک میں اپنے کل کے لیے اب تک کتنا سرمایہ جمع کرایا ہے۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۸﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' یقیناً تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔''

اس آیت میں بنیادی طور پر دو باتوں پر زور دیا گیا ہے: اللہ کا تقویٰ اور فکرِ آخرت۔ بلکہ اِتَّقُوا اللّٰهَ کا حکم یہاں خصوصی تاکید کے طور پر دو مرتبہ آیا ہے۔ تقویٰ سے عام طور پر اللہ کا خوف اور ڈر مراد لیا جاتا ہے۔ لیکن اس ضمن میں یہ اہم نکتہ ضرور مدِنظر رہنا چاہیے کہ اس خوف میں شیر یا سانپ کے خوف کی طرح دہشت کا عنصر بالکل نہیں' بلکہ اس کی مثال ایسے خوف کی سی ہے جیسا خوف سعادت مند اولاد اپنے والد سے محسوس کرتی ہے۔ اس خوف میں محبت اور احتیاط کے جذبات غالب ہوتے ہیں کہ ہمارے والد ہم سے ناراض نہ ہو جائیں اور ہم کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے ہمارے والد کے جذبات و احساسات مجروح ہوں۔ چنانچہ تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کے دل میں ہر وقت اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا ڈر رہے —— تقویٰ کے لغوی معنی بچنے کے ہیں' یعنی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچ بچ کر زندگی گزارنا۔

آیت ۱۹ ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ﴾ ''اور (اے مسلمانو دیکھنا!) تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔''

﴿اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۱۹﴾ ''یہی لوگ ہیں جو فاسق ہیں۔''

ہمارے لیے اس آیت کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ علامہ اقبال کے بیان کے مطابق انہوں نے اپنا فلسفہ خودی اسی آیت سے اخذ کیا تھا۔ علامہ کے اس بیان کے راوی سیّد نذیر نیازی ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں اس حوالے سے ایک واقعہ رقم کیا ہے۔ (یہ واقعہ انہوں نے ہمارے ہاں قرآن کانفرنس میں اپنے ایک لیکچر میں بھی بیان کیا تھا۔) وہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ انہوں نے علامہ اقبال سے ان کے فلسفہ خودی کے ماخذ کے بارے میں سوال کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے فلسفہ خودی کے ماخذ کے بارے میں بہت چہ میگوئیاں ہوتی ہیں۔ کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ آپ نے یہ فلسفہ نطشے سے لیا ہے' کوئی اس حوالے سے کسی دوسرے مغربی فلاسفر کا نام لیتا ہے۔ بہتر ہوگا آپ خود واضح فرما دیں کہ آپ کے اس فلسفہ کا ماخذ کیا ہے؟ یہ سن کر علامہ اقبال نے انہیں فرمایا کہ آپ کل فلاں وقت میرے پاس آئیں' میں آپ کو اس کے ماخذ کے بارے میں بتاؤں گا۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے کہ شاعرِ مشرق اور حکیم الامت انہیں یہ اعزاز بخش رہے ہیں کہ انہیں اس موضوع پر تفصیلی ڈکٹیشن دیں گے۔ لیکن اگلے دن جب وہ کاپی پنسل ہاتھ میں لیے مقررہ وقت پر حاضرِ خدمت ہوئے تو علامہ نے انہیں دیکھتے ہی کہا کہ ذرا قرآن مجید اٹھالاؤ۔ پھر انہوں نے کہا کہ سورۃ الحشر کی یہ آیت (آیت ۱۹) نکال کر تلاوت کرو! اور انہیں مخاطب ہو کر کہا کہ یہ ہے میرے فلسفہ خودی کا ماخذ!

اب آیئے فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ کے مفہوم پر غور کریں۔ کیا کوئی شخص اپنے آپ کو اس طرح بھول سکتا ہے کہ وہ خود اپنی شخصیت سے ہی واقف نہ رہے؟ کیا کوئی انسان ایسا بھی ہو سکتا ہے جسے اپنے پیٹ کا خیال نہ رہے؟ یا جسے اپنی کوئی بیماری یاد نہ رہے؟

ظاہر ہے کوئی انسان اپنے جسم اور اس کے تقاضوں سے غافل نہیں ہو سکتا۔ تو معلوم ہوا کہ حیوانی جسم کے علاوہ انسان کی کوئی اور حیثیت بھی ہے جسے وہ بھول جاتا ہے اور وہ ہے انسان کی اصل حقیقت یعنی اس کی ''روح''۔ جہاں تک انسان کے اللہ کو بھلانے کا تعلق ہے اس کا ذکر سورۃ المجادلہ کی آیت ۱۹ میں بھی آیا ہے: ﴿اِسۡتَحۡوَذَ عَلَيۡهِمُ الشَّيۡطٰنُ فَاَنۡسٰهُمۡ ذِكۡرَ اللّٰهِ ؕ﴾ ''شیطان نے ان پر قابو پالیا ہے' پس انہیں اللہ کی یاد سے غافل کر دیا ہے''۔ اب آیت زیر مطالعہ میں ایسے لوگوں کی اس سزا کا ذکر ہے جو انہیں دنیوی زندگی میں ہی مل جاتی ہے۔ یعنی جو لوگ شیطان کے بہکاوے میں آ کر اللہ کو بھول جاتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ان کی اصل حقیقت سے غافل کر دیتا ہے۔ پھر ان لوگوں کو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ انسان ہیں' اشرف المخلوقات ہیں یا اللہ کے بندے ہیں۔ انہیں بس یہی یاد رہ جاتا ہے کہ بہت سے حیوانات کی طرح وہ بھی ایک حیوان ہیں۔

آج ہماری جدید تہذیب بھی مختلف انداز سے ہمیں یہی سبق پڑھانے کی کوشش میں ہے کہ انسان محض ایک حیوان ہے۔ اس فلسفے کو متعارف کرانے اور پروان چڑھانے میں بنیادی کردار ڈارون کے نظریہ ارتقاء (Evolution Theory) نے ادا کیا ہے۔ اس تھیوری کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک حیوان اور انسان میں بنیادی فرق صرف ارتقاء کے مراحل اور مدارج کا ہے۔ جیسے گدھے اور گھوڑے میں صرف یہ فرق ہے کہ گدھا نچلے درجے کا (rough & coarse) جانور ہے' جبکہ گھوڑا ارتقاء کا ایک مزید مرحلہ طے کر کے نسبتاً بہتر درجے میں چلا گیا ہے اور ایک refined اور تمکنت والا جانور ہے' اسی طرح کا فرق ایک گوریلے (chimpanzee) اور انسان میں ہے۔ یعنی گوریلے کے مقابلے میں انسان نسبتاً بہتر قسم کا جانور ہے' باقی ان دونوں کے جبلی تقاضے (instincts) اور محرکات (motives) میں کوئی فرق نہیں ہے ـــــ جدید سائیکالوجی بھی انہی خطوط پر چل رہی ہے۔ چنانچہ آج کے سائیکالوجسٹ کو بھی محرکاتِ عمل کے حوالے سے انسان اور حیوان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ تو جب یہ فرق مٹ گیا اور انسان اپنی اصلیت کو بھلا کر حیوان بن گیا تو گویا وہ ہر قسم کی اخلاقی پابندیوں سے بھی آزاد ہو گیا۔ انیسویں صدی کے فرنچ لٹریچر میں بنیادی طور پر اسی نکتے کو فوکس کیا گیا ہے کہ حیوانات کی زندگی فطرت کے عین مطابق ہے' اس لیے ہم انسانوں کو اُن سے سبق لیتے ہوئے اپنی زندگی کو خواہ مخواہ کے تکلفات سے آزاد کر لینا چاہیے۔ مثلاً تمام حیوانات لباس سے بے نیاز ہیں' اس کا مطلب یہ ہے کہ لباس فطرت کا تقاضا نہیں ہے' انسان کی اپنی ایجاد ہے۔ اسی طرح بیوی' بیٹی اور ماں کی تمیز بھی حیوانات میں نہیں پائی جاتی' یہ پابندی بھی انسان نے اپنے اوپر خود ہی عائد کی ہے۔ یہ ہے آج کے انسان کا المیہ!

بہرحال یہ آیت ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ جو انسان اللہ کو بھلا دیتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اُس کی حقیقت سے غافل کر دیتا ہے۔ انسان کی روح خود اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر پھونکی ہے اور اسی کی وجہ سے وہ ''انسان'' کے مرتبے پر فائز ہوا ہے۔ چنانچہ جب کوئی انسان اپنی روح اور اس کے تقاضوں سے غافل ہو جاتا ہے تو وہ انسان کے درجے سے گر کر حیوان بن جاتا ہے۔ اس حوالے سے اپنشد کا یہ جملہ بہت اہم ہے:

"Man in his ignorance identifies himself with the material sheeths that encompass his real self."

اسی real self کا دوسرا نام ''انا'' ہے' لیکن اس سے اصل مراد انسان کی ''روح'' ہی ہے' جسے علامہ اقبال نے فلسفیانہ انداز میں ''خودی'' کا نام دیا ہے:

؎ نقطۂ نُوری کہ نامِ او خودی ست زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی ست

؎ ہے ذوقِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے!

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان حیوانی جسم اور روح کا مرکّب ہے۔ بقول شیخ سعدی:

آدمی زادہ طرفہ معجون است از فرشتہ سرشتہ وز حیوان

یعنی آدمی ایک ایسی معجونِ مرکب ہے جس میں فرشتہ اور حیوان دونوں گُندھے ہوئے ہیں۔ فرشتے سے مراد یہاں وہ نورانی روح ہے جو عالَمِ امر کی چیز ہے: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۸۵﴾ (بنی اسرائیل) ''اور (اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں روح کے بارے میں۔ آپ فرما دیجیے کہ روح میرے رب کے امر میں سے ہے اور تمہیں نہیں دیا گیا علم مگر تھوڑا سا''۔ چنانچہ انسان کی روح نورانی چیز ہے اور اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔ اگر انسان اللہ کو بھلا دے گا تو اپنی روح یعنی اپنی اصلیت سے بیگانہ ہو کر محض ایک حیوان بن کر رہ جائے گا۔ اس کے بعد اس کی نظر میں اچھے بُرے اور حلال و حرام کی کوئی تمیز نہیں رہے گی۔ انسانی معاشرے کے ایسے ہی افراد آیت زیر مطالعہ کے حکم ''اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ'' کے مصداق ہیں۔

آیت ۲۰ ﴿لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ﴾ ''(دیکھو!) برابر نہیں ہو سکتے آگ والے اور جنّت والے۔''

﴿اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ۝۲۰﴾ ''یقیناً جنّت والے ہی کامیاب ہوں گے۔''

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! اَللّٰھُمَّ اَدْخِلْنَا الْجَنَّۃَ مَعَ الْاَبْرَارِ! اَللّٰھُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ یَا مُجِیْرُ یَا مُجِیْرُ یَا مُجِیْرُ!

آیت ۲۱ ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰي جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ﴾ ''اگر ہم اس قرآن کو اُتار دیتے کسی پہاڑ پر تو تم دیکھتے کہ وہ دب جاتا اور پھٹ جاتا اللہ کے خوف سے۔''

یہ قرآن مجید کی عظمت کا بیان ہے۔ اس موضوع کے حوالے سے یہاں یہ اہم نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ قرآن مجید کی عظمت اور قرآن مجید کی افادیت دو الگ الگ موضوعات ہیں' ان دو موضوعات کو آپس میں گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے۔ جہاں تک قرآن مجید کی افادیت کا تعلق ہے' قرآن کی متعدد آیات اس حوالے سے ہماری راہنمائی کرتی ہیں' لیکن سورۂ یونس کی یہ دو آیات اس لحاظ سے خصوصی اہمیت کی حامل ہیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاۗءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَاۗءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۵۷ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝۵۸﴾

''اے لوگو! آ گئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے اور تمہارے سینوں (کے اَمراض) کی شفا اور اہلِ ایمان کے لیے ہدایت اور (بہت بڑی) رحمت۔ (اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ یہ (قرآن) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے (نازل ہوا) ہے' تو چاہیے کہ لوگ اس پر خوشیاں منائیں! وہ کہیں بہتر ہے ان چیزوں سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔''

یہ تو قرآن مجید کی افادیت کا ذکر ہے' لیکن قرآن مجید فی نفسہٖ کیا ہے؟ انسان کا محدود ذہن اس موضوع کو کما حقہٗ سمجھنے سے قاصر ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی عظمت کے تصوّر کو انسانی ذہن کے لیے کسی حد تک قابلِ فہم بنانے کے لیے آیت زیر مطالعہ میں ایک تمثیل بیان کی

گئی ہے۔اس تمثیل کو سمجھنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہِ طور پر پیش آنے والے واقعہ کی یاددہانی ضروری ہے۔یہ واقعہ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۴۳ میں بیان ہوا ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام جب چالیس راتوں کے لیے کوہِ طور پر گئے تو آپؑ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی: ﴿رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ ؕ﴾ کہ اے میرے رب! مجھے اپنا جلوہ دکھا' میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں۔ ﴿قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ﴾ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ ﴿وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ﴾ البتہ تم اس پہاڑ کو دیکھو' میں اپنی تجلّی اس پر ڈالوں گا۔ ﴿فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ ۚ﴾ تو اگر یہ پہاڑ اپنی جگہ قائم رہ سکا تو پھر تم بھی مجھے دیکھ سکو گے۔ ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ﴾ پھر جب اُس کے ربّ نے پہاڑ پر ایک تجلّی ڈالی یعنی نور کا پرتو جب پہاڑ پر پڑا تو ﴿جَعَلَهٗ دَكًّا﴾ اُس نے اس پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔ ﴿وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ﴾ (الاعراف:۱۴۳) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس بالواسطہ تجلّی کے مشاہدہ کی تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش کر گر پڑے۔اس واقعہ کے ساتھ آیت زیر مطالعہ میں بیان کی گئی تمثیل کی گہری مماثلت ہے۔دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ کوہِ طور پر ''تجلّی ذات'' کا معاملہ تھا اور یہاں اس تمثیل میں ''تجلّی صفات'' کا ذکر ہے۔قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور کلام اپنے متکلم کی صفت ہوتا ہے۔اس لیے جو تاثیر ذاتِ باری تعالیٰ کی تجلّی کی ہے عین وہی تاثیر کلام اللہ کی تجلّی کی ہے۔علامہ اقبال اپنے انداز میں قرآن مجید کی عظمت کا بیان یوں کرتے ہیں: ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست چیزے دیگر است!

کہ اگر میں اپنے دل کی بات کروں تو یہ کہوں گا کہ قرآن مجید محض ایک کتاب نہیں ہے بلکہ کوئی اور ہی چیز ہے۔کیا چیز ہے؟اس کی مزید وضاحت علامہ یوں کرتے ہیں:

مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں زندہ و پائندہ و گویا ست ایں!

یعنی یہ اللہ تعالیٰ ہی کی صفات کا حامل ہے اور اس حیثیت میں یہ پوشیدہ بھی ہے اور عیاں بھی۔ہمیشہ زندہ رہنے والا بھی ہے اور گویا (بولتا ہوا) بھی۔قرآن حکیم کی عظمت کے حوالے سے سورۃ الواقعہ کی آیت ﴿لَا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿۷۹﴾﴾ کی تشریح کے تحت یہ نکتہ بھی زیر بحث آ چکا ہے کہ قرآن مجید کی حقیقی معرفت' اصل ہدایت اور روحِ باطنی تک رسائی کے لیے انسان کے باطن کا پاک ہونا ضروری ہے۔اگر کوئی شخص اپنے باطن کا تجزیہ کیے بغیر قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرے گا تو وہ صرف اس کی عبارت اور لغت کے ظاہری مطالب و معانی تک ہی رسائی حاصل کر پائے گا۔

﴿وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کریں۔''

اب وہ تین عظیم آیات آ رہی ہیں جن کا ذکر اس رکوع کے آغاز میں اسمائے حسنیٰ کے حوالے سے ہوا تھا۔واضح رہے کہ صفاتِ باری تعالیٰ کے موضوع پر سورۃ الحدید کی پہلی چھ آیات قرآن مجید کے ذروۂ سنام کا درجہ رکھتی ہیں۔(عربی میں اونٹ کی کوہان کو سنام اور کسی چیز کی چوٹی یا بلند ترین حصے کو ذُروہ/ذِروہ کہتے ہیں۔چنانچہ ذروۂ سنام کا مطلب ہے کوہان کی بھی چوٹی۔یعنی سب سے اونچا مقام یا کسی چیز کا نمایاں ترین حصہ!) جبکہ اسمائے حسنیٰ کے ذکر کے اعتبار سے سورۃ الحشر کی آخری تین آیات پورے قرآن میں منفرد و ممتاز مقام کی حامل ہیں۔اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے حوالے سے یہاں ''ایمانِ مجمل'' کے یہ الفاظ بھی اپنے حافظے میں تازہ کر لیں:

آمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ یعنی ہم اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء وصفات کے ساتھ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے تمام احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔

آیت ۲۲ ﴿ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۚ﴾ ''وہی ہے اللہ جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔''

﴿عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ ۚ﴾ ''وہ جاننے والا ہے چھپے کا اور کھلے کا۔''

یہ پورا مرکب اللہ تعالیٰ کے ایک اسم پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ اُسے بھی جانتا ہے جو ہمارے سامنے ہے اور اُسے بھی جو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ قرآن میں جہاں اللہ کے لیے غیب اور شہادۃ کے الفاظ آتے ہیں' وہ ہم انسانوں کے لیے ہیں۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کے لیے تو سب شہادہ ہی شہادہ ہے' اُس کے لیے تو کوئی چیز بھی غیب نہیں۔ ہم انسانوں کے لیے کچھ چیزیں تو وہ ہیں جنہیں ہم اپنے حواسِ خمسہ سے محسوس کر سکتے ہیں۔ ایسی تمام اشیاء ہمارے لیے ''ظاہر'' (الشَّھَادَۃ) کے زمرے میں آتی ہیں۔ مثلاً اگر کسی چیز کو ہم مائیکروسکوپ یا ٹیلی سکوپ سے بھی دیکھ لیں تو اس کی حیثیت بھی ہمارے لیے ''ظاہر'' ہی کی ہے۔ دوسری طرف کچھ ایسے حقائق ہیں جنہیں ہم سے چھپا دیا گیا ہے' انہیں ہم کسی طرح بھی اپنے حواس کے احاطہ میں نہیں لا سکتے۔ ایسی سب چیزیں ہمارے لیے غیب کا درجہ رکھتی ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات' فرشتے' جنت' دوزخ' عالمِ آخرت وغیرہ' سب ہمارے لیے غیب ہیں۔ یہ مضمون سورۃ الجن میں دوبارہ واضح تر انداز میں آئے گا۔

﴿ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ﴿۲۲﴾﴾ ''وہ بہت رحم کرنے والا' نہایت مہربان ہے۔''

سورۃ الفاتحہ کی دوسری آیت ان ہی دو اسمائے حسنیٰ پر مشتمل ہے۔ لغوی اور اشتقاقی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو متعلقہ آیت کی تشریح۔

آیت ۲۳ ﴿ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۚ﴾ ''وہی ہے اللہ جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔''

﴿اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُھَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ ۭ﴾ ''حقیقی بادشاہ' یکسر پاک' سراپا سلامتی (اور ہر اعتبار سے سالم)' امن دینے والا' پناہ میں لینے والا' زبردست (مطلق العنان)' اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا' سب بڑائیوں کا مالک۔''

﴿سُبْحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ﴿۲۳﴾﴾ ''اللہ پاک ہے اُن تمام چیزوں سے جو یہ شرک کرتے ہیں۔''

اس ایک آیت میں آٹھ اسمائے حسنیٰ مسلسل' بغیر حرفِ ''و'' کے آئے ہیں اور اس لحاظ سے یہ آیت پورے قرآن مجید میں منفرد ہے۔

آیت ۲۴ ﴿ھُوَ اللّٰہُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ﴾ ''وہی ہے اللہ' تخلیق کا منصوبہ بنانے والا' وجود بخشنے والا' صورت گری کرنے والا۔''

اس آیت میں (اللہ کے علاوہ) تین اسمائے حسنیٰ آئے ہیں۔ ان تینوں اسماء کا تعلق تخلیقی عمل کے مختلف مراحل سے ہے اور اس لحاظ سے یہاں ان کا ذکر ایک فطری اور منطقی ترتیب سے ہوا ہے۔ ''خلق'' دراصل عملِ تخلیق کا وہ مرحلہ ہے جب کسی چیز کا منصوبہ یا نقشہ

تیار ہوتا ہے۔ بغرضِ تفہیم اگر ہم انسانوں پر قیاس کرتے ہوئے ایک بڑھئی کی مثال سامنے رکھیں تو عملِ تخلیق کے مختلف مراحل اور ان تینوں اسماء کے مابین پائے جانے والے خاص ربط کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ فرض کریں کہ بڑھئی ایک میز بنانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے سب سے پہلے وہ مطلوبہ سائز اور مطلوبہ شکل کی میز کا ایک نقشہ اپنے ذہن میں تیار کرتا ہے۔ یہ اس میز کی ذہنی تخلیق ہے۔ اس کے بعد بڑھئی مجوزہ نقشے کے مطابق لکڑی کا میز بنا کر اپنی ''ذہنی تخلیق'' کو عالمِ واقعہ میں ظاہر کر دیتا ہے۔ پھر تیسرے اور آخری مرحلے میں وہ اسے finishing touches دیتے ہوئے رنگ و روغن کر کے میز کو حتمی طور پر تیار کر دیتا ہے۔

مذکورہ بالا تینوں اسمائے حسنیٰ کا تعلق تخلیق کے ان ہی تین مراحل سے ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی تخلیق کا ایک نقشہ یا نمونہ تیار فرماتا ہے۔ اس مفہوم میں وہ الخَالِق ہے' پھر وہ اس تخلیق کو عدم سے عالمِ وجود میں ظاہر کرتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ البَارِئ ہے۔ (بَرَأَ کے معنی ظاہر کرنے کے ہیں۔ سورۃ الحدید کی آیت ۲۲ میں ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا﴾ ''اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کریں۔'') اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی تخلیق کو باقاعدہ ایک صورت یا شکل عطا کرتا ہے۔ اس معنی میں وہ ''اَلْمُصَوِّر'' ہے۔

﴿لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ﴾ ''تمام اچھے نام اُسی کے ہیں۔''

﴿يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ﴾ ''اُسی کی تسبیح کرتی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔''

﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۴﴾﴾ ''اور وہ بہت زبردست ہے' کمال حکمت والا۔''

اس سورت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے آغاز میں بھی اللہ کی تسبیح کا بیان ہے اور اس کا اختتام بھی اللہ کی تسبیح پر ہوتا ہے۔ آغاز میں تسبیح کے حوالے سے ماضی کا صیغہ (سَبَّحَ) آیا ہے جبکہ اختتام پر مضارع کا صیغہ (یُسَبِّحُ) ہے۔ اسی طرح اس کی ابتدائی آیت کے اختتام پر جو دو اسمائے حسنیٰ (الْعَزِيْزُ الْحَكِيْم) آئے ہیں' آخری آیت کا اختتام بھی ان ہی اسمائے حسنیٰ پر ہوتا ہے۔

سُوْرَةُ الْمُمْتَحِنَةِ

تمہیدی کلمات

سورۃ الممتحنہ کا نزول فتح مکہ سے قبل اسی زمانے میں ہوا جس زمانے میں سورۃ التوبہ کے دوسرے اور تیسرے رکوع کی آیات نازل ہوئی تھیں۔ یہ وہ حالات تھے جب ایک طرف رسول اللہ ﷺ مکہ پر فیصلہ کن چڑھائی کی تیاری کر رہے تھے تو دوسری طرف منافقین اس ممکنہ مہم کے خلاف پراپیگنڈے میں سرگرم عمل تھے۔ (سورۃ التوبہ کے تمہیدی کلمات میں ان حالات پر تفصیل سے تبصرہ کیا جا چکا ہے۔) ان لوگوں کے بعض دلائل ایسے تھے جن سے نومسلم ضُعفاء بھی کسی نہ کسی حد تک متأثر ہو رہے تھے۔ مثلاً اس حوالے سے ان کی ایک دلیل یہ تھی کہ قریشِ مکہ جیسے بھی ہیں آخر وہ حرم کے متولی ہیں اور حاجیوں کی خدمت کرتے ہیں' لہٰذا اُن کی ان نیکیوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ منافقین کے ایسے اعتراضات کے جوابات سورۃ التوبہ کے دوسرے اور تیسرے رکوع میں دیے گئے ہیں۔

اسی دوران وہ واقعہ بھی رونما ہوا جس کا ذکر اس سورہ کے آغاز میں آیا ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل یوں ہے کہ حضور ﷺ مکہ پر چڑھائی کا منصوبہ مکمل طور پر خفیہ رکھنا چاہتے تھے' تاکہ قریش کو اس بارے میں کوئی پیشگی اطلاع نہ ملنے پائے۔ لیکن ایک صحابی حضرت حاطب بن ابی بلتعہ ؓ سے یہ بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی کہ انہوں نے سردارانِ قریش کو ایک خفیہ خط کے ذریعے اس اہم جنگی راز کی اطلاع کرنے کی کوشش کی۔ حضرت حاطبؓ انتہائی مخلص مسلمان اور بدری صحابی تھے۔ انؓ کے اہل وعیال اور کنبے کے کچھ لوگ اُس وقت تک مکہ مکرمہ میں تھے۔ انہیں پریشانی لاحق تھی کہ مسلمانوں کی مکہ پر لشکر کشی کی صورت میں قریش ان کے اہل خانہ کو انتقام کا نشانہ بنائیں گے۔ اس اندیشے کے پیش نظر انہوں نے حملے کی پیشگی اطلاع دے کر قریشِ مکہ پر گویا ایک بہت بڑا احسان کیا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید اس احسان کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ ان کے اہل وعیال کو کوئی گزند نہیں پہنچائیں گے۔ حضرت حاطبؓ نے مذکورہ خط ایک عورت کو دیا جو مکہ جا رہی تھی اور اسے تاکید کی کہ وہ اسے مکمل رازداری سے فلاں شخص تک پہنچا دے۔ اس عورت کے مدینہ سے روانہ ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضور ﷺ کو اس بارے میں مطلع فرما دیا۔ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ' حضرت زبیر اور حضرت مقداد بن اسود ؓ کو اس عورت کے پیچھے روانہ کیا' انہیں تیزی سے جانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ مکہ کے راستے میں روضۂ خاخ کے مقام پر آپ لوگوں کو ایک عورت ملے گی' اس کے پاس ایک خط ہے' وہ خط اس سے لے کر واپس آ جاؤ۔ حضرت علی ؓ تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے حضور ﷺ کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچے تو وہ عورت وہاں موجود تھی۔ آپؓ نے خط مانگا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ آپؓ نے فرمایا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی دی گئی اطلاع غلط نہیں ہو سکتی' لہٰذا تم سیدھے طریقے سے خط ہمارے حوالے کر دو' ورنہ ہم تمہیں

برہنہ کر کے تمہاری تلاشی لیں گے۔ اس پر عورت نے خط اپنی چٹیا سے نکال کر آپؐ کے حوالے کر دیا۔ حضور ﷺ نے جب حضرت حاطبؓ کو بلا کر پوچھا تو انہوں نے اعتراف کیا کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ ﷺ میرے معاملے میں جلدی نہ فرمائیں۔ اصل بات یہ ہے کہ میرے اہلِ خانہ مکہ میں مقیم ہیں۔ مَیں قریش کے قبیلہ کا آدمی نہیں ہوں' بلکہ بعض قریشیوں کی سرپرستی میں وہاں آباد ہوا ہوں۔ میرا کوئی قبیلہ وہاں نہیں ہے جو میرے اہلِ خانہ کو بچا سکے۔ اس لیے مَیں نے یہ خط اس خیال سے بھیجا تھا کہ قریش پر میرا ایک احسان رہے جس کا لحاظ کر کے وہ میرے اہل وعیال کو نقصان نہ پہنچائیں۔ حضرت عمرؓ موقع پر موجود تھے' انہوں نے اٹھ کر عرض کیا: یارسول اللہؐ! مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کی گردن مار دوں' اس نے اللہ اور اُس کے رسولؐ اور مسلمانوں سے خیانت کی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: نہیں! حاطبؓ سے غلطی ضرور ہوئی ہے' لیکن یہ بدری صحابی ہے اور اللہ تعالیٰ بدری صحابہؓ کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کر چکا ہے' امید ہے وہ اس کی یہ خطا بھی معاف فرما دے گا۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ رو دیے اور انہوں نے کہا کہ اللہ اور اُس کے رسولؐ ہی سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ زیر مطالعہ سورت کی پہلی آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

آیات ۱ تا ۶

سُوْرَةُ الْمُمْتَحِنَةِ مَدَنِيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ١٣ رُكُوْعَاتُهَا: ٢

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَ قَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَ اِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ؕ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ۚ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ۚ وَ اَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَ مَآ اَعْلَنْتُمْ ؕ وَ مَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝١ اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّ يَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ۝٢ لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَ لَآ اَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝٣ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَ بَدَا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَ مَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَ اِلَيْكَ اَنَبْنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝٤ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝٥ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝٦ ع

آیت ① ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ﴾ ''اے اہلِ ایمان! تم میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ''

یعنی تم لوگ کفار و مشرکین کی خیر خواہی اور بھلائی کا مت سوچو۔ ان کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنے اور اچھے تعلقات بنانے کی کوشش مت کرو۔ ان آیات کا نزول اس وقت ہوا جب سردارانِ قریش کے نام حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ کا خط پکڑا گیا۔

﴿تُلْقُوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ﴾ ''تم ان کی طرف دوستی اور محبت کے پیغامات بھیجتے ہو''

﴿وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ﴾ ''حالانکہ انہوں نے انکار کیا ہے اُس حق کا جو تمہارے پاس آیا ہے۔''

﴿یُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِیَّاكُمْ﴾ ''وہ رسولؐ کو اور تم لوگوں کو صرف اس بنا پر جلاوطن کرتے ہیں''

﴿اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ﴾ ''کہ تم ایمان رکھتے ہو اللہ اپنے رب پر۔''

﴿اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِیْ سَبِیْلِیْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِیْ﴾ ''اگر تم نکلے تھے میرے راستے میں جہاد کرنے اور میری رضاجوئی کے لیے (تو تمہارا یہ طرزِ عمل اس کے منافی ہے)''

﴿تُسِرُّوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ﴾ ''تم انہیں خفیہ پیغامات بھیجتے ہو محبت اور دوستی کے''

﴿وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَاۤ اَخْفَیْتُمْ وَمَاۤ اَعْلَنْتُمْ﴾ ''اور میں خوب جانتا ہوں جسے تم چھپاتے ہو اور جسے تم ظاہر کرتے ہو۔''

﴿وَمَنْ یَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ①﴾ ''اور جو کوئی بھی تم میں سے یہ کام کرے تو وہ یقیناً سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔''

یہ طویل آیت مدنی سورتوں کے عمومی مزاج کی ترجمانی کرتی ہے۔

آیت ② ﴿اِنْ یَّثْقَفُوْكُمْ یَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً﴾ ''اگر وہ تمہیں کہیں پالیں تو وہ تمہارے ساتھ دشمنی کریں گے''

﴿وَّیَبْسُطُوْۤا اِلَیْكُمْ اَیْدِیَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ﴾ ''اور تمہاری طرف بڑھائیں گے وہ اپنے ہاتھ اور اپنی زبانیں بُرے ارادے کے ساتھ''

تم تو ان کی طرف دوستی کے پیغامات بھیج رہے ہو لیکن اگر تم کہیں ان کے ہتھے چڑھ جاؤ تو وہ تمہارے ساتھ دشمنی کا ہر حربہ آزمائیں گے تم پر دست درازی بھی کریں گے اور زبان درازی بھی اور تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے۔

﴿وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ②﴾ ''اور ان کی شدید خواہش ہوگی کہ تم بھی کافر ہو جاؤ۔''

آیت ③ ﴿لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ ''تمہیں ہرگز نفع نہیں پہنچائیں گے تمہارے رحمی رشتے اور نہ تمہاری اولادیں قیامت کے دن۔''

﴿یَفْصِلُ بَیْنَكُمْ﴾ ''اللہ فیصلہ کر دے گا تمہارے مابین۔''

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ③﴾ ''اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔''

آیت ④ ﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ﴾ ''تمہارے لیے بہت اچھا نمونہ ہے ابراہیمؑ اور

ان کے ساتھیوں (کے طرزِ عمل) میں۔"

﴿اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ "جب انہوں نے اپنی قوم سے برملا کہہ دیا کہ ہم بالکل بری ہیں تم سے اور اُن سے جنہیں تم پوجتے ہو اللہ کے سوا۔"

ہم تم سے بھی اور اُن سے بھی اعلانِ براءت اور اظہارِ لاتعلقی کرتے ہیں۔

﴿كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا﴾ "ہم تم سے منکر ہوئے اور اب ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت اور بغض کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے ہمیشہ کے لیے"

﴿حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ﴾ "یہاں تک کہ تم بھی ایمان لے آؤ اللہ پر توحید کے ساتھ"

گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپؑ کے ساتھی اہلِ ایمان (صلی اللہ علیہم) اپنے کافر اعزّہ و اقارب کے لیے ننگی تلوار بن گئے۔ یہاں یہ اہم نکتہ نوٹ کر لیجیے کہ "حزب اللہ" والوں کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں جدّ و جہد کرتے ہوئے اپنے رحمی رشتوں کو کاٹ پھینکنے کا مشکل مرحلہ بھی لازماً طے کرنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ المجادلہ کی اس آیت میں واضح کیا گیا ہے: ﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ﴾ (آیت ۲۲) "تم نہیں پاؤ گے اُن لوگوں کو جو حقیقتاً ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور یومِ آخرت پر کہ وہ محبت کرتے ہوں ان سے جو مخالفت پر کمربستہ ہیں اللہ کی اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی، خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے ہوں یا ان کے بھائی ہوں یا ان کے رشتے دار ہوں"۔ چنانچہ اسی اصول کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپؑ کے اہلِ ایمان ساتھیوں نے اپنی قوم، برادری اور رشتہ داروں سے نہ صرف اظہارِ لاتعلقی کیا بلکہ انہیں کھلم کھلا عداوت اور مخالفت کا چیلنج بھی دے دیا۔

﴿اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ﴾ "سوائے ابراہیمؑ کے اپنے باپ سے یہ کہنے کے کہ میں آپ کے لیے ضرور استغفار کروں گا"

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے والد کے ساتھ اس گفتگو کا حوالہ ہے جس کی تفصیل سورۂ مریم میں آئی ہے۔ اس موقع پر باپ بیٹے کے درمیان جو آخری مکالمہ ہوا وہ یہ تھا: ﴿قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ﴿٤٦﴾ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ﴿٤٧﴾﴾ "اُس نے کہا: اے ابراہیم! کیا تم کنارہ کشی کر رہے ہو میرے معبودوں سے؟ اگر تم اس سے باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا، اور تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ ایک مدت تک۔ ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا: آپ پر سلام! میں اپنے رب سے آپ کے لیے استغفار کرتا رہوں گا، وہ مجھ پر بڑا مہربان ہے"۔ آیت زیرِ مطالعہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسی وعدے کا حوالہ آیا ہے۔

﴿وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ﴾ "اور میں آپ کے بارے میں اللہ کے ہاں کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا۔"

میں آپ کے لیے دعا ضرور کروں گا، اللہ تعالیٰ دعا قبول کرے نہ کرے، وہ آپ کو معاف کرے نہ کرے، یہ اس کا اختیار ہے۔

اس ضمن میں یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ سورۂ مریم کی مذکورہ آیات ہجرت سے پہلے مکہ میں نازل ہوئی تھیں اور زیرِ مطالعہ

آیت ۸ ہجری میں فتح مکہ سے قبل نازل ہوئی۔ ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جس وعدے کا ذکر ہے اس سے متعلق آخری حکم سورۃ التوبہ کی اس آیت میں آیا ہے' جو ۹ ہجری میں ذیقعدہ کے بعد نازل ہوئی: ﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴾ ''اور نہیں تھا استغفار کرنا ابراہیمؑ کا اپنے والد کے حق میں مگر ایک وعدے کی بنیاد پر جو انہوں نے اُس سے کیا تھا' اور جب آپؑ پر واضح ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو آپؑ نے اس سے اعلانِ بیزاری کر دیا۔ یقیناً ابراہیمؑ بہت دردِ دل رکھنے والے اور حلیم الطبع انسان تھے''۔ چنانچہ سورۃ التوبہ کی یہ آیت جو ۹ ہجری میں ذیقعدہ کے بعد نازل ہوئی' محکم تصور ہو گی اور پہلی آیات اس کے تابع سمجھی جائیں گی۔

﴿رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴾ ''پروردگار! ہم نے تجھ پر ہی توکل کیا اور تیری ہی طرف رجوع کیا اور ہمیں تیری طرف ہی لوٹ کر جانا ہے۔''

آیت ۵ ﴿رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ ''پروردگار! تُو ہمیں کافروں کے لیے تختۂ امتحان نہ بنا دینا''

اے ہمارے پروردگار! ایسا نہ ہو کہ تُو کافروں کو ہمارے ذریعے سے آزمائے۔ ایسا نہ ہو کہ تُو انہیں آزمانے کے لیے ہم پر ظلم کرنے کی چھوٹ دے دے۔ کسی کے لیے فتنہ یا تختۂ مشق بننے کے مفہوم کو حضور ﷺ کے مکی دور میں مسلمانوں اور مشرکین کی مثال سے سمجھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ مشرکینِ مکہ کی رسی دراز کر کے انہیں آزمانا چاہتا تھا کہ ٹھیک ہے تم میرے بندوں پر جتنا ظلم کر سکتے ہو کر لو! مَیں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم کس حد تک جاتے ہو! لیکن مشرکین کی اس آزمائش میں تختۂ ستم تو ظاہر ہے مسلمان بنے ہوئے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا میں اللہ تعالیٰ سے ایسی آزمائش سے بچانے کی درخواست کی گئی ہے۔

﴿وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ ''اور تُو ہمیں بخش دے' اے ہمارے پروردگار! یقیناً تُو ہی زبردست اور حکمت والا ہے۔''

آیت ۶ ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ ''تمہارے لیے یقیناً ان (کے طرزِ عمل) میں ایک بہت اچھا نمونہ ہے''

لیکن یہ نمونہ اور اُسوہ فائدہ مند کس کے لیے ہو سکتا ہے؟

﴿لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ۭ﴾ ''اُس کے لیے جو اللہ تعالیٰ (سے ملاقات) اور یومِ آخرت کی امید رکھتا ہو۔''

بالکل یہی الفاظ سورۃ الاحزاب میں حضور ﷺ کے اُسوہ کے حوالے سے آئے ہیں: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴾ یعنی حضور ﷺ کی شخصیت اور سیرت یقیناً اُسوۂ کاملہ ہے' لیکن اس سے مستفیض صرف وہی لوگ ہو سکیں گے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہوں اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرتے ہوں۔

﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴾ ''اور جو کوئی مُنہ موڑ لے تو یقیناً اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں خود ستودہ صفات ہے۔''

آیات ۷ تا ۹

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ؕ وَ اللّٰهُ قَدِيْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ اَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَ ظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

آیت ۷ ﴿عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ؕ﴾ ''بعید نہیں کہ اللہ تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان جن سے تمہاری دشمنی ہے' دوستی پیدا کر دے۔''

ظاہر ہے اگر وہ بھی ایمان لے آئیں گے تو وہ تمہارے بھائی بن جائیں گے' جیسا کہ سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱ میں فرمایا گیا: ﴿فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ؕ﴾ ''پھر بھی اگر وہ توبہ کر لیں' نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں''۔ اور یہ مرحلہ کوئی زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ زیر مطالعہ آیات فتح مکہ سے قبل ۸ ہجری میں نازل ہوئیں اور اس سے اگلے ہی سال فتح مکہ کے بعد ۹ ہجری میں مشرکینِ عرب کو چار ماہ کا الٹی میٹم دے دیا گیا کہ یا ایمان لے آؤ' یا سب قتل کر دیے جاؤ گے۔ اس کے نتیجے میں سب لوگ ایمان لا کر اسلامی بھائی چارے میں شامل ہو گئے۔ آیت زیر مطالعہ میں دوستی اور محبت کے اسی رشتے کی طرف اشارہ ہے جو ان کے درمیان ایک سال بعد بننے والا تھا۔

﴿وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ ''اللہ ہر شے پر قادر ہے' اور اللہ بہت بخشنے والا' بہت رحم کرنے والا ہے۔''

آیت ۸ ﴿لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ﴾ ''اللہ تمہیں نہیں روکتا ان لوگوں سے جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے کبھی جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا کہ تم ان کے ساتھ کوئی بھلائی کر دیا انصاف کا معاملہ کرو۔''

یعنی وہ غیر حربی کافر جن کے ساتھ تمہاری جنگ نہیں ہے' تم لوگوں کو مکہ سے بے دخل کرنے میں بھی ان کا کوئی کردار نہیں اور نہ ہی انہوں نے تمہارے خلاف تمہارے دشمنوں کی کبھی مدد کی ہے' ایسے لوگوں کے ساتھ احسان اور بھلائی کا سلوک روا رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ دنیوی معاملات کے حوالے سے عدل و انصاف کے تمام تقاضے بھی پورے کرنے چاہئیں۔ البتہ ولایت کا رشتہ اور قلبی محبت کا تعلق ان کے ساتھ بھی قائم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝﴾ ''بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

آیت ۹ ﴿اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ﴾ ''وہ تو تمہیں منع کرتا ہے اُن لوگوں سے جنہوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ کی اور تمہیں تمہارے

گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالنے میں دوسروں کی مدد کی کہ تم ان کے ساتھ ولایت اور دوستی کا رشتہ قائم کرو۔''

﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝٩﴾ ''اور جو کوئی ان کے ساتھ دوستی کرے گا تو وہی لوگ ہیں جو ظالم ہیں۔''

اب اگلی آیات میں خواتین سے متعلق چند مسائل کا ذکر آ رہا ہے جو صلح حدیبیہ (۶ ہجری) کے نتیجے میں سامنے آئے تھے۔ صلح حدیبیہ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر کوئی مسلمان مکہ سے بھاگ کر مدینہ آئے گا تو مسلمان اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے' لیکن اگر مدینہ سے کوئی مسلمان اپنا دین چھوڑ کر واپس مکہ آ جائے گا تو قریش اسے واپس نہیں کریں گے۔ اس معاہدے کے بعد چند مسلمان خواتین مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئیں تو قریش کی طرف سے مطالبہ آیا کہ انہیں واپس کیا جائے۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ معاہدے کی متعلقہ شق مردوں (رِجَال) سے متعلق ہے' اس میں عورتوں (نِساء) کا ذکر نہیں ہے' اس لیے ان خواتین کو واپس نہیں کیا جائے گا۔ اس مثال کے بعد مکہ سے کچھ مزید خواتین بھی آنا شروع ہو گئیں تو ایسی مہاجر خواتین کے بارے میں تحقیق و تفتیش کی ضرورت محسوس ہوئی۔ خدشہ یہ تھا کہ ہجرت کے نام پر مشرک عورتیں جاسوسی وغیرہ کے لیے مکہ سے مدینہ آ کر آباد نہ ہو جائیں اور ان کی وجہ سے بعد میں مسلمان معاشرے میں کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو۔ پھر ان میں کچھ ایسی شادی شدہ خواتین بھی تھیں جو اپنے مشرک شوہروں کو چھوڑ کر آ رہی تھیں۔ ان کے بارے میں بھی یہ سوال اپنی جگہ جواب کا متقاضی تھا کہ کیا وہ مسلمان ہو جانے کے بعد بھی مشرک شوہروں کی زوجیت میں ہیں یا کہ آزاد ہو چکی ہیں؟ اور اسی معاملے سے متعلق یہ مسئلہ بھی اہم تھا کہ کسی ایسی عورت کے مدینہ آ جانے کے بعد کیا کوئی مسلمان اس سے نکاح کر سکتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ اگلی دو آیات میں ان مسائل سے متعلق ہدایات دی گئی ہیں۔ جبکہ اس کے بعد ایک آیت میں مسلمان خواتین کی بیعت کا ذکر ہے۔ قرآن مجید میں ذکر تو مردوں کی بیعت (بیعتِ رضوان) کا بھی ہے' لیکن اس بیعت کے الفاظ کیا تھے' یا بیعتِ عَقَبہ اولیٰ اور بیعتِ عَقَبہ ثانیہ کا مضمون کیا تھا؟ یہ تفصیل ہمیں احادیث سے ملتی ہے' قرآن مجید میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ اس لحاظ سے یہاں خواتین کو مردوں پر ایک طرح سے فضیلت دی گئی ہے کہ آیت ۱۲ میں ان کی بیعت کے حکم کے ساتھ بیعت کا پورا متن بھی دے دیا گیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خواتین کو یہ خصوصی انعام ان کے حقوق کے پلڑے کا توازن درست رکھنے کے لیے دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ قوانین و ضوابط اور حقوق و فرائض کی خصوصیت ہی یہی ہے کہ وہ ہر لحاظ سے متوازن ہیں۔ اگر کسی معاملے میں کوئی ایک حکم زیادہ سخت ہو تو اس کے پہلو میں کہیں کوئی نرم قانون بھی موجود ہوتا ہے۔ اگر کہیں کسی کے فرائض کا وزن زیادہ ہو رہا ہو تو اس کے حقوق کے پلڑے میں کچھ مزید ڈال کر اس کی میزان کو برابر کر دیا جاتا ہے۔ میاں بیوی کے حقوق و فرائض ہی کی مثال لے لیں۔ قرآن مجید نے طلاق کا حق صرف خاوند کو دیا ہے' اس کے مقابلے میں بیوی صرف خلع لے سکتی ہے' طلاق نہیں دے سکتی۔ اسی طرح اگر میاں بیوی میں طلاق ہو جائے تو اولاد قانوناً والد کی شمار ہوتی ہے۔ ان دو مثالوں سے خاوند کے حقوق یا اختیارات کا پلڑا غیر معمولی طور پر جھکتا ہوا نظر آتا ہے' لیکن دوسری طرف دیکھیں تو اولاد کے لیے ماں کا حق باپ کے حق کے مقابلے میں تین گنا زیادہ رکھا گیا ہے اور جنت کی بشارت صرف ماں کے قدموں کے حوالے سے دی گئی ہے۔ یوں اللہ تعالیٰ اپنے قوانین و ضوابط کو متوازن بناتے ہیں اور ہر کسی کے حقوق و فرائض کی ترازو کے ہر دو پلڑوں کو برابر رکھتے ہیں۔

آیات ۱۰‘۱۱

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ۭ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ۡ وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۭ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَسْـَٔـلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔـلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا ۭ ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ۭ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۱۰ وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝۱۱

آیت ۱۰ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ۭ﴾ ’’اے اہلِ ایمان! جب تمہارے پاس آئیں مؤمن خواتین ہجرت کر کے تو ان کا امتحان لے لیا کرو۔‘‘

یعنی ہر خاتون سے ضروری حد تک جانچ پڑتال اور تحقیق و تفتیش کر لیا کرو کہ آیا واقعی وہ سچی اور مخلص مؤمنہ ہے۔

﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ﴾ ’’اللہ تو ان کے ایمان کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتا ہے۔‘‘

کسی کے دل میں ایمان ہے یا نہیں‘ اور اگر ہے تو کتنا ایمان ہے‘ اس کا صحیح علم تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ تم لوگ اپنے طور پر کسی کے ایمان کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتے۔ لیکن محض ایک احتیاطی تدبیر کے طور پر مناسب طریقے سے کسی نہ کسی درجے میں ایک اندازہ لگانے کی کوشش ضرور کیا کرو کہ ہجرت کرنے والی خواتین کیا واقعی مؤمنات ہیں اور کیا واقعی وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہجرت کر کے مدینہ آئی ہیں۔

﴿فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ﴾ ’’پھر اگر تم جان لو کہ وہ واقعی مؤمنات ہیں‘‘

﴿فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ۭ﴾ ’’تو انہیں کفار کی طرف مت لوٹاؤ۔‘‘

﴿لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ۡ﴾ ’’نہ اب یہ ان (کافروں) کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ ان کے لیے حلال ہیں۔‘‘

﴿وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا ۭ﴾ ’’اور ان (کافروں) کو ادا کر دو جو کچھ انہوں نے خرچ کیا تھا۔‘‘

یعنی ان کے کافر شوہروں نے ان کو جو مہر دیے تھے وہ انہیں بھجوا دو۔ اگر کسی مشرک کی بیوی مسلمان ہو کر مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آ گئی ہے تو اب وہ اس کی بیوی نہیں رہی‘ ان کے درمیان تعلقِ زوجیت ختم ہو چکا ہے‘ لیکن عدل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ مہر کی وہ رقم جو وہ شخص اس خاتون کو اپنی بیوی کی حیثیت سے ادا کر چکا ہے وہ اسے لوٹا دی جائے۔ اس حکم سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام بلاتفریق مذہب و ملت کسی حق دار کا حق اس تک پہنچانے کے معاملے کو کس قدر سنجیدگی سے لیتا ہے۔ اور یہ سنجیدگی یا تاکید صرف قانون سازی کی حد تک ہی نہیں بلکہ حضور ﷺ نے قرآنی قوانین و احکام کے عین مطابق ایسا نظامِ عدل و قسط بالفعل قائم کر کے بھی

دکھا دیا جس میں حق دار کو تلاش کر کے اس کا حق اس تک پہنچایا جاتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں شام کے محاذ پر حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ سپہ سالار تھے۔ انہوں نے رومیوں کے خلاف یرموک کے میدان میں صدی کی سب سے بڑی جنگ لڑی۔ جنگ یرموک کی تیاری کے دوران ایک ایسا مرحلہ بھی آیا جب مسلمانوں کو جنگی حکمت عملی کے تحت کچھ مفتوحہ علاقوں کو خالی کر کے پیچھے ہٹنا پڑا۔ ان علاقوں کی عیسائی رعایا سے مسلمان جزیہ وصول کر چکے تھے۔ جزیہ ایک ایسا ٹیکس ہے جو اسلامی حکومت اپنے غیر مسلم شہریوں سے ان کے جان و مال کی حفاظت کی ذِمّہ داری کے عوض وصول کرتی ہے۔ اسی لیے یہ ٹیکس ادا کرنے والے شہری "ذِمّی" کہلاتے ہیں۔ بہرحال مذکورہ علاقوں سے مسلمان وقتی طور پر چونکہ واپس جا رہے تھے اور اپنی غیر مسلم رعایا کے جان و مال کی حفاظت کی ذِمّہ داری نبھانے سے قاصر تھے، اس لیے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے حکم پر جزیہ کی تمام رقم متعلقہ افراد کو واپس کر دی گئی۔ مسلمانوں کے اس عمل نے عیسائیوں کو اس قدر متاثر کیا کہ ان کے واپس جانے پر وہ لوگ دھاڑیں مار مار کر روتے رہے۔ یہ ہے اس دین کے نظامِ عدل و قسط کے تحت حق دار کو اس کا حق پہنچانے کی ایک مثال، جس کے ماننے والوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ وہ مسلمان عورتوں کے مہر کی رقوم ان کے مشرک شوہروں کو لوٹا دیں۔

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۭ﴾ "اور (اے مسلمانو!) تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم ان خواتین سے نکاح کر لو جبکہ تم انہیں ان کے مہر ادا کر دو۔"

﴿وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ﴾ "اور تم کافر خواتین کی ناموس کو اپنے قبضے میں نہ رکھو"

یعنی اگر تم میں سے کچھ لوگوں کی بیویاں ایمان نہیں لائیں اور ابھی تک مکّہ ہی میں ہیں تو تم ان کو اپنے نکاح میں روکے نہ رکھو بلکہ انہیں طلاق دے دو اور انہیں بتا دو کہ اب تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

﴿وَاسْـَٔـلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔـلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا ۭ﴾ "اور تم مانگ لو وہ مال جو تم نے (بطورِ مہر) خرچ کیا ہے، اور وہ (کافر) بھی مانگ لیں جو کچھ انہوں نے خرچ کیا ہے۔"

یعنی جو مہر تم نے اپنی کافر بیویوں کو دیے تھے وہ تم واپس مانگ لو، اور جو مہر کافروں نے اپنی مسلمان بیویوں کو دیے تھے انہیں وہ واپس مانگ لیں۔

﴿ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ۭ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۭ﴾ "یہ اللہ کا حکم ہے، وہ تمہارے مابین فیصلہ کر رہا ہے۔"

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۱۰﴾ "اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔"

آیت ۱۱ ﴿وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ﴾ "اور اگر تمہاری بیویوں (کے مہر میں) سے کچھ کفّار کی طرف رہ جائے"

اس صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے فرض کریں کہ ایک مسلمان مرد ہجرت کر کے مدینہ آ گیا اور اس کی مشرکہ بیوی مکّہ میں ہی رہ گئی۔ بعد میں اس مسلمان نے اس خاتون کو پیغام بھجوایا کہ میرا تمہارا تعلقِ زوجیت ختم ہو چکا ہے لہٰذا تم مہر کی رقم مجھے لوٹا دو۔ اب اگر اس عورت نے مہر کی رقم واپس نہیں کی تو اس مسئلے کا حل بتایا جا رہا ہے کہ ایسی صورت میں تمہیں کیا کرنا ہے۔

﴿فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا﴾ ''تو جب تمہیں موقع ہاتھ آ جائے تو جن لوگوں کی بیویاں جاتی رہی ہیں انہیں اتنی رقم ادا کر دو جتنی انہوں نے خرچ کی ہے۔''

اگر کسی جنگ سے تمہیں کچھ مالِ غنیمت ملے تو اس میں سے ان لوگوں کو تلافی کے طور پر کچھ مال دے دو جن کی بیویاں ایمان نہ لانے کی وجہ سے ان کی زوجیت میں نہیں رہیں اور وہ انہیں مہر کی رقوم بھی لوٹانے کو تیار نہیں' تاکہ اس رقم سے مہر ادا کر کے وہ لوگ مکہ سے ہجرت کر کے آنے والی ان خواتین سے نکاح کر سکیں جن کے مشرک خاوند مکہ میں رہ گئے ہیں۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿١١﴾﴾ ''اور اُس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جس پر تمہارا ایمان ہے۔''

آیات ۱۲' ۱۳

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٢﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَىِٕسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَىِٕسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ﴿١٣﴾ ع ٨

آیت ۱۲ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ﴾ ''اے نبی (ﷺ) جب آپ کے پاس آئیں مؤمن خواتین آپ سے بیعت کرنے کے لیے''

اب آگے بیعت کا وہ متن دیا گیا ہے جس کا ذکر سطورِ بالا میں ہوا تھا:

﴿عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا﴾ ''اس بات پر کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گی''

﴿وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ﴾ ''اور نہ چوری کریں گی' نہ بدکاری کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی''

﴿وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ﴾ ''اور نہ وہ کوئی بہتان باندھیں گی جو اُن کے ہاتھوں اور پاؤں کے مابین سے ہو''

یعنی یہ کہ وہ کسی پر زنا کی تہمت نہیں لگائیں گی' کوئی جنسی سکینڈل نہیں گھڑیں گی۔ اس تہمت کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کوئی عورت کسی مرد پر الزام لگا دے کہ اُس نے اس کی آبروریزی کی ہے۔ ایسے الزامات انبیاء کرام علیہم السلام پر بھی لگتے رہے ہیں۔ اس بیعت کی آخری شق یہ ہے کہ:

﴿وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ﴾ ''اور وہ آپؐ کی نافرمانی نہیں کریں گی معروف میں''

﴿فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٢﴾﴾ ''تو (اے نبی ﷺ) آپ ان سے بیعت لے

لیں اور ان کے لیے استغفار کریں۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا' بہت رحم کرنے والا ہے۔''

احادیث میں بیعتِ عَقَبہ اولیٰ کا جو مضمون ملتا ہے وہ بھی خواتین کی اس بیعت کے مضمون سے ملتا جلتا ہے' اسی لیے بیعتِ عَقَبہ اولیٰ کو ''بیعت النساء'' بھی کہا جاتا ہے۔ بیعتِ عَقَبہ اولیٰ کے زمانے تک اہلِ ایمان چونکہ ایک باقاعدہ جماعت کی شکل میں منظم نہیں ہوئے تھے اس لیے اس بیعت کے مضمون میں جماعتی نظم وضبط سے متعلق کوئی شق موجود نہیں۔ اسی طرح ہمارے ہاں صوفیاء اپنے عقیدت مندوں سے جو 'بیعتِ ارشاد' لیتے ہیں اس کا مضمون بھی تقریباً انہی نکات پر مشتمل ہوتا ہے کہ میں شرک نہیں کروں گا' چوری نہیں کروں گا' بدکاری نہیں کروں گا' وغیرہ۔ گویا بیعتِ عَقَبہ اولیٰ' بیعتِ خواتین اور بیعتِ ارشاد تینوں کا مضمون تقریباً ایک ہی ہے۔ البتہ بیعت جس کی بنیاد پر مسلمان باقاعدہ ایک جماعت کے طور پر منظم ہوئے وہ بیعتِ عَقَبہ ثانیہ ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ ایک متفق علیہ حدیث میں اس بیعت کے مضمون کا پورا متن موجود ہے۔ حضرت عبادہؓ بن صامت روایت کرتے ہیں: بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ کہ ہم نے بیعت کی تھی اللہ کے رسول ﷺ سے عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ اس بات پر کہ ہم آپؐ کا ہر حکم سنیں گے اور اطاعت کریں گے فِی الْعُسْرِ تنگی اور مشکل میں بھی وَالْیُسْرِ اور آسانی میں بھی وَالْمَنْشَطِ اور اس حالت میں بھی کہ ہماری طبیعتوں میں انشراح ہو کہ ہاں یہ کام واقعی بہت مفید ہے اور درست ہے وَالْمَکْرَہِ اور اس حالت میں بھی کہ ہمیں اپنی طبیعتوں پر جبر کرنا پڑے۔ یعنی ہمیں کسی فیصلے سے اتفاق نہ ہو تب بھی ہم آپؐ کا فیصلہ مانیں گے۔ وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا اور اس کے باوجود کہ دوسروں کو ہم پر ترجیح دے دی جائے۔ یعنی ہمارے مقابلے میں اگر کسی نووارد کو بھی امیر بنا دیا جائے گا تب بھی ہم اعتراض نہیں کریں گے۔ وَعَلٰی اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ اور جنہیں آپؐ ذمہ دار یا امیر بنائیں گے ان سے ہم جھگڑا نہیں کریں گے' بلکہ ان کا ہر حکم مانیں گے[1]۔ وَعَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا اور یہ کہ ہم حق بات ضرور کہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں گے لَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ[2] اور ہم کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کے خوف سے اپنی زبان بند نہیں کریں گے۔

بیعتِ عَقَبہ ثانی کے اس مضمون کو ہم نے صرف ایک فقرے کے اضافے کے ساتھ تنظیم اسلامی کی بیعت کے لیے اختیار کیا ہے اور وہ اضافی فقرہ یہ ہے: اُبَایِعُ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ فِی الْمَعْرُوْفِ کہ میں بیعت کرتا ہوں اس بات پر کہ ہر وہ حکم سنوں گا اور مانوں گا جو شریعت کے دائرے سے باہر نہ ہو! آج ایسی کسی بھی بیعت کے لیے اس فقرے کا اضافہ اس لیے ضروری ہے کہ حضور ﷺ کی اطاعت تو مطلق تھی' آپؐ کا تو ہر حکم ہی معروف کے دائرے میں تھا' لیکن آپؐ کے بعد کسی بھی شخصیت کی مطلق

۱۔ اطاعتِ اُمراء کے حوالے سے حضور ﷺ کا یہ فرمان بہت اہم ہے:

((مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ، وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰہَ، وَمَنْ اَطَاعَ اَمِیْرِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ، وَمَنْ عَصٰی اَمِیْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ))

''جس نے میری اطاعت کی اُس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی' اور جس نے میری نافرمانی کی اُس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور جس نے میرے (مقرر کیے ہوئے) امیر کی اطاعت کی اُس نے گویا میری اطاعت کی اور جس نے میرے (مقرر کیے ہوئے) امیر کی نافرمانی کی اُس نے گویا میری نافرمانی کی''۔ (صحیح البخاری' کتاب الجہاد والسیر' باب یقاتل من وراء الامام ویتقی بہ۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ...)

۲) صحیح البخاری' کتاب الاحکام' باب کیف یبایع الامام الناس' وکتاب الفتن' باب قول النبی ﷺ سترون بعدی امورا تنکرونھا۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ...

اطاعت پر بیعت کرنا درست نہیں۔ اسی لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی خلیفہ بننے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جو بیعت لی وہ بھی مشروط تھی۔ یعنی آپؓ کی بیعت کرنے والا ہر شخص آپؓ کا صرف وہی حکم ماننے کا پابند تھا جو قرآن وسنت کے دائرے کے اندر ہو۔

بیعتِ عقبہ ثانیہ کے مذکورہ مضمون کا تعلق ایک جماعت اور تنظیم کے نظم ونسق سے ہے۔ چنانچہ اسی بیعت کی بنیاد پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مضبوط جماعت منظم فرمائی اور مدینہ منورہ میں بارہ نقیب (نو قبیلہ خزرج اور تین قبیلہ اوس سے) مقرر فرما کر اہلِ ایمان کی جماعت کے ذیلی تنظیمی ڈھانچے کی بنیاد بھی رکھ دی۔ اس سے پہلے مسلمانوں کی تعداد بھی کم تھی اور تمام اہلِ ایمان مکہ کی حدود میں ہی رہتے تھے۔ مکہ ایک چھوٹا سا شہر تھا اور اہلِ ایمان کے امیر یا سربراہ کی حیثیت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود شہر میں موجود تھے۔ اس لیے کوئی نقیب یا ذیلی امیر مقرر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب مسلمان مکہ سے دور مدینہ میں بھی موجود تھے اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ بھی ہو رہا تھا اس لیے وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے الگ تنظیمی ڈھانچہ تشکیل فرمایا۔

جماعتی زندگی میں عملی جدّ وجُہد کے دوران چونکہ جہاد وقتال کے مراحل بھی آتے ہیں اور ایسے مراحل میں خواتین بالواسطہ طور پر ہی حصہ لیتی ہیں' اس لیے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے روایت کردہ متن کے مطابق خواتین سے بیعتِ جہاد نہیں لی گئی' بلکہ ان سے آیت زیر مطالعہ کے مضمون کے مطابق ہی بیعت لی گئی کہ وہ فلاں فلاں افعال نہیں کریں گی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو بھی بھلائی کا حکم دیں گے اس کی نافرمانی نہیں کریں گی۔

ہمارے ہاں تنظیم اسلامی میں بھی خواتین سے بیعت کے لیے بعینہٖ یہی الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جو اس آیت میں آئے ہیں۔ دراصل خواتین کی بیعت سے مقصود یہ نہیں کہ وہ بھی غلبۂ دین کی جدّ وجُہد میں مَردوں کی طرح عملی کردار ادا کریں یا جہاد وقتال میں حصہ لیں' بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ جماعتی زندگی کے ساتھ تعلق کی بنا پر ﴿كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ کے حکم کی مصداق بن کر جماعتی زندگی کے فیوض وبرکات سے وہ بھی بہرہ ور ہوتی رہیں اور جماعتی زندگی کے لزوم سے متعلق احکامات پر بھی ان کا عمل ہوتا رہے۔ لزومِ جماعت کے حوالے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی درج ذیل احادیث بہت قطعی اور واضح ہیں:

(۱) ((عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ، وَإِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةَ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ مَعَ الْوَاحِدِ، وَهُوَ مِنَ الْاِثْنَيْنِ اَبْعَدُ))[۳]

''تم پر جماعت کی شکل میں رہنا فرض ہے' اور تم تنہا مت رہو' اس لیے کہ اکیلے شخص کا ساتھی شیطان بن جاتا ہے' لیکن اگر دو (مسلمان) ایک ساتھ رہیں تو وہ دُور ہو جاتا ہے۔''

(۲) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((يَدُ اللّٰهِ مَعَ الْجَمَاعَةِ، وَمَنْ شَذَّ شَذَّ إِلَى النَّارِ))[۴]

''اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے' اور جو شخص خود کو جماعت سے کاٹ لیتا ہے وہ آگ میں ڈالا جائے گا۔''

جماعتی زندگی کی اہمیت اور ''جماعت'' کے ڈسپلن سے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان بھی بہت واضح ہے:

إِنَّهُ لَا إِسْلَامَ إِلَّا بِجَمَاعَةٍ وَلَا جَمَاعَةَ إِلَّا بِإِمَارَةٍ وَلَا إِمَارَةَ إِلَّا بِطَاعَةٍ[۵]

۳۔ سنن الترمذی' کتاب الفتن' باب ماجاء فی لزوم الجماعة۔

۴۔ سنن الترمذی' کتاب الفتن' باب ماجاء فی لزوم الجماعة۔

۵۔ سنن الدارمی' المقدمة' باب فی ذهاب العلم۔

''یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام نہیں ہے بغیر جماعت کے اور کوئی جماعت نہیں ہے بغیر امارت کے اور امارت کا کوئی فائدہ نہیں اگر اس کے ساتھ اطاعت نہ ہو۔''

بہر حال جماعت سازی کا مسنون' منصوص اور ماثور طریقہ بیعت کا طریقہ ہی ہے' لیکن آج کل اکثر دینی جماعتوں نے یہ مسنون طریقہ ترک کر کے دوسرے طریقے اپنا لیے ہیں۔ اگرچہ رائج الوقت سب طریقے بھی مباح ہیں' لیکن ظاہر ہے مباح اور سنت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسی لیے ہم نے تنظیم اسلامی کی اساس بیعت کے نظام پر رکھی ہے۔ اس پر ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اُس نے ہمیں اس اہم سنت کو زندہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی جو آج کل جماعت سازی کے حوالے سے بالکل متروک ہو چکی تھی۔

آیت ۱۳ ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ﴾ ''اے اہلِ ایمان! ان لوگوں کے ساتھ دوستی مت کرو جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا ہے''

نوٹ کیجیے' جس مضمون سے سورت کا آغاز ہوا تھا اختتام پر وہی مضمون دوبارہ آ گیا ہے۔ قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ سے یہودی مراد ہیں اور یہاں اہلِ ایمان کو واضح طور پر منع کیا گیا ہے کہ ان کے ساتھ تمہاری دوستی نہیں ہونی چاہیے۔

﴿قَدْ یَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا یَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ﴿۱۳﴾﴾ ''یہ لوگ آخرت سے مایوس ہو چکے ہیں جیسے کہ کُفار مایوس ہو چکے ہیں اصحابِ قبور میں سے۔''

آیت کے اس حصے کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ یہ لوگ آخرت سے ایسے مایوس ہو چکے ہیں جیسے قبروں میں پڑے ہوئے کُفار اپنی نجات سے مایوس ہیں۔ ظاہر ہے مرنے کے بعد کُفار پر تمام حقائق منکشف ہو چکے ہیں اور ان حقائق کو دیکھتے ہوئے انہیں سزا سے بچنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ دوسرا مفہوم یوں ہے کہ یہ لوگ آخرت سے ایسے مایوس ہو چکے ہیں جیسے کُفار اصحاب القبور کے دوبارہ اٹھنے سے مایوس ہیں۔ یہ دونوں مفاہیم اپنی اپنی جگہ درست ہیں' اس لیے اس فقرے کے تراجم دونوں طرح سے کیے گئے ہیں۔

سُوْرَةُ الصَّفِّ

تمہیدی کلمات

سورۃ الصف اور سورۃ الجمعہ کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے۔ زیر مطالعہ مدنی سورتوں کے گروپ (سورۃ الحدید تا سورۃ التحریم) کے اندر ان دو سورتوں کی ظاہری مماثلت بہت نمایاں نظر آتی ہیں۔ ان دونوں کا آغاز تسبیح سے ہو رہا ہے اور المُسَبِّحات میں سے صرف یہی دو سورتیں ہیں جو ترتیب میں اکٹھی ایک ساتھ ہیں۔ باقی تینوں المُسَبِّحات (سورۃ الحدید، سورۃ الحشر اور سورۃ التغابن) میں سے کوئی بھی دو سورتیں اکٹھی نہیں ہیں۔

ان دونوں سورتوں کے آغاز میں تسبیح کے صیغے ان کی نسبتِ زوجیت کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ (دو جنسوں یا دو چیزوں کے مابین نسبتِ زوجیت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بعض پہلوؤں سے ان میں باہم مشابہت ہونے کے علاوہ دونوں ایک دوسرے کے لیے تکمیلی خصوصیت کی حامل ہیں، یعنی دونوں مل کر کسی خاص مقصد کی تکمیل کرتی ہیں۔) سورۃ الصف کی پہلی آیت میں تسبیح کے ذکر کے لیے ماضی کا صیغہ (سَبَّحَ لِلّٰهِ .....) آیا ہے، جبکہ سورۃ الجمعہ کے آغاز میں مضارع کا صیغہ (یُسَبِّحُ لِلّٰهِ .....) ہے اور فعل مضارع میں زمانہ حال اور زمانہ مستقبل دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس طرح ان سورتوں کے آغاز کی آیات میں تینوں زمانے (ماضی، حال اور مستقبل) اکٹھے ہونے سے تسبیح کے دائمی اور ابدی ہونے کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے، کہ کائنات کی ہر شے اللہ کی تسبیح کر رہی ہے، یہ تسبیح ہمیشہ سے ہوتی رہی ہے، ہر دم ہو رہی ہے اور ہمیشہ ہوتی رہے گی۔

سورۃ الصف کا مضمون غلبۂ دین اور اس کے لیے عملی و انقلابی جِدّوجُہد سے متعلق ہے۔ اس اعتبار سے اس سورت کے چار حصے ہیں۔ پہلے تین حصے چار چار آیات پر مشتمل ہیں، جبکہ آخری حصے میں دو آیات ہیں۔ پہلی چار آیات کی حیثیت تمہید کی بھی ہے، اور ایک اعتبار سے ان میں اصلی پیغام کا خلاصہ بھی آ گیا ہے۔ دوسرے حصے کی چار آیات میں سابقہ اُمّتِ مُسلمہ یعنی یہود کے طرزِ عمل کا ذکر ہے۔ تیسرے حصے میں بعثتِ محمدی ﷺ کا مقصد بیان ہوا ہے اور اہلِ ایمان کو جہاد کی پُرزور دعوت دی گئی ہے، جبکہ آخری حصے یعنی آخری دو آیات میں اس سورت کے پیغام کو قبول کرنے والے لوگوں کا ذکر ہے کہ دنیا میں بھی ان لوگوں کو فتح و کامرانی سے ہمکنار کیا جائے گا اور آخرت میں بھی انہیں اعلیٰ مدارج و مراتب سے نوازا جائے گا۔

یہاں پر یہ فلسفہ بھی اچھی طرح سے سمجھ لیجیے کہ غلبۂ دینِ اسلام کے لیے جہاد یا انقلابی جِدّوجُہد کا بنیادی مقصد اور اصل ہدف انسانیت کی فلاح و بہبود ہے۔ انسانی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ "انسان" نے بادشاہوں اور سرمایہ داروں کی غلامی میں بہت سختیاں جھیلی ہیں اور اس غلامی کا طوق اپنی گردنوں سے اتار پھینکنے کے لیے قربانیاں بھی بہت دی ہیں۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ نادار

ومحروم عوام اگر کبھی استحصالی طبقے کے ظلم سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے بھی تو وہ ''آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا'' کے مصداق پہلے سے بڑے ظالم کے پنجے میں جا پھنسے۔ گویا کھجور سے گر کر کسی گہری کھائی میں جا گرے۔ فرانس میں بھوکوں مرتے مظلوم مزدوروں اور کسانوں نے بادشاہوں کی لوٹ کھسوٹ اور عیاشیوں کے خلاف عَلَم بغاوت بلند کیا اور جانوں کی قربانیاں دیں تو اس کا نتیجہ انقلابِ فرانس کی صورت میں سامنے آیا۔ اَن گنت قربانیوں اور خوفناک خونریزی کے نتیجے میں نظام تو بدل گیا لیکن عوام الناس کی مصیبتوں اور محرومیوں کا ازالہ نہ ہو سکا۔ کہنے کو تو بادشاہت کی جگہ عوام الناس کی اپنی حکومت (جمہوریت) نے لے لی' لیکن حقیقت میں وہ سرمایہ داروں کی آمریت ہی کا ایک بہروپ تھا۔ چنانچہ ظالمانہ ٹیکسوں کا سلسلہ جمہوری حکومت کے تحت بھی حسبِ سابق جاری رہا اور مزدور کو اس کی محنت کا منصفانہ معاوضہ ملنے کا خواب اس کی ''اپنی حکومت'' میں بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ البتہ اتنا فرق ضرور پڑا کہ پہلے اس کی خون پسینے کی کمائی پر بادشاہ اور شہزادے عیش کرتے تھے' اب ان کی جگہ کارخانہ دار اور سرمایہ دار اس کا خون نچوڑ نچوڑ کر اپنی شام کی محفلوں کو رنگین کرنے لگے۔ علامہ اقبال نے اس تلخ حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے: ع ''خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب'' کہ سرمایہ دار مزدوروں کی رگوں سے خون نچوڑ کر اپنے لیے سرخ شراب تیار کرتے ہیں۔ دوسری طرف انقلابِ روس کا نتیجہ بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ وہاں کے عوام بھی زار کے آہنی شکنجے سے نکل کر یک جماعتی آمریت (one party dictatorship) کے سنہری پنجرے میں آپھنسے۔ غرض آقا بدلتے رہے' نظاموں کے نام بدلتے رہے' لیکن نہ بدلی تو مزدور کی قسمت نہ بدلی۔ اس طبقے کی محرومیاں جیسی کل تھیں ویسی ہی آج بھی ہیں۔ کل مزدور کے بچے تختِ شاہی کے سائے تلے بھوکے سوتے تھے اور آج مزدور کے بچے شجرِ جمہوریت کی چھاؤں میں بیٹھ کر روٹی کو ترستے ہیں۔

دراصل یہ مسئلہ کسی ایک طبقے کا مسئلہ نہیں' اور نہ ہی یہ کسی ایک ملک کے مزدوروں اور کسانوں کا مسئلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی انصاف کا شفاف نظام پوری دنیا کی ضرورت ہے جس کی تلاش میں نسلِ انسانی صدیوں سے در بدر ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ اُس نے دنیا میں جتنے بھی رسول بھیجے ان سب کا مشن یہی تھا کہ انسانیت کو عدل وقسط کے شفاف نظام کے ثمرات سے بہرہ ور کیا جائے۔ مَیں عرض کر چکا ہوں کہ سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں فلسفۂ انقلاب عریاں ترین صورت میں موجود ہے: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ ''ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان اُتاری تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں۔''

سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۸ میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے بارے میں بھی فرمایا ہے کہ وہ قسط (عدل) کو قائم کرنے والا ﴿قَآىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ﴾ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بحیثیتِ اُمت اس دنیا میں جو کردار ادا کرنے کا فریضہ سونپا وہ بھی بنیادی طور پر یہی ہے کہ وہ یہاں عدل وانصاف قائم کریں: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ (النساء:۱۳۵) ''اے اہلِ ایمان! کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے گواہ بن کر''۔ سورۃ المائدۃ میں یہی حکم الفاظ کی دوسری ترتیب کے ساتھ اس طرح آیا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫﴾ (آیت ۸) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بن جاؤ!''

اللہ تعالیٰ کی طرف سے مذکورہ مشن کے ساتھ انبیاء ورسلؑ تو پے در پے آتے رہے اور نسلِ انسانی تک اللہ تعالیٰ کا پیغام بھی

پہنچاتے رہے' لیکن اس کے باوجود لوگ بار بار گمراہ ہوتے رہے۔ کسی قوم نے جوشِ عقیدت میں اپنے پیغمبر کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دے دیا تو کسی نے اپنے پیغمبر کی باقاعدہ پوجا شروع کر دی' لیکن معاشرے کے اجتماعی نظام کو اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کسی نے نہ کی' تاوقتیکہ اجتماعی عدل وقسط کے قیام کا یہ مشن نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کو سونپا گیا۔ چنانچہ سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں ''رسالت'' کے جس مشن کا ذکر جمع کے صیغے (لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا) میں آیا ہے' حضور ﷺ کے حوالے سے سورۃ الصف کی اس آیت میں اس کے لیے واحد کا صیغہ استعمال ہوا ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (التوبہ: ۳۳' الفتح: ۲۸' الصف: ۹) ''وہی تو ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسولؐ کو الہدیٰ اور دینِ حق دے کر تاکہ غالب کر دے اسے کُل کے کُل دین (نظامِ زندگی) پر۔''

بہرحال پوری انسانی تاریخ میں یہ اعزاز صرف اللہ کے آخری رسول حضرت محمد عربی ﷺ کو حاصل ہوا کہ آپ ﷺ نے عرب معاشرے سے ظالمانہ نظام کی بیخ کنی کر کے اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ نظامِ عدل وقسط بالفعل قائم کر دیا۔ گویا آپ ﷺ نے تمام انبیاء ورسل علیہم السلام کے اس مشن کی تکمیل فرما دی جس کا ذکر سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں آیا ہے اور اسی لیے آپؐ رسولِ کامل ہیں۔ حضور ﷺ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد پوری دنیا کے حوالے سے نظامِ عدل وقسط کے قیام کا یہ مشن اب آپؐ کی اُمت کو منتقل ہو چکا ہے' جس کے لیے اُمت کو منظم اور مسلسل جدّوجُہد کرنی ہے۔

سورۃ الصف اپنے موضوع کے اعتبار سے اس قدر جامع اور پُرتاثیر سورت ہے کہ اگر کسی بندۂ مسلمان کو یہ ایک سورت بھی سمجھ میں آ جائے تو اُس کے لیے زندگی کا راستہ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ البتہ جہاد وقتال کے حوالے سے اس سورت کے احکام پر عمل کرنے کے لیے اُسوۂ رسولؐ اور منہجِ نبویؐ کا اتباع ضروری ہے۔ اگر کوئی جماعت منہجِ نبویؐ کی ترتیب کو پیشِ نظر رکھے بغیر جوشِ جہاد میں ہتھیار اُٹھا کر میدان میں کود پڑے گی تو اس کا یہ عمل خودکُشی کے مترادف ہوگا۔ چنانچہ منہجِ نبویؐ سے راہنمائی لیتے ہوئے اس کٹھن راستے پر باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت مرحلہ وار آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ پہلے مرحلے میں دعوت وتبلیغ کے ذریعے ''مردانِ کار'' کو جمع کرنا ہوگا۔ ایسے مردانِ کار جو اللہ کی محبت کے مقابلے میں دُنیوی محبتوں کو تج کر کے واقعتاً آخرت کے طالب بن چکے ہوں اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا ایک ایک لفظ ان کی روحوں کی گہرائیوں میں جذب ہو چکا ہو: ﴿فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝﴾ (الشوریٰ) ''پس جو کچھ بھی تمہیں دیا گیا ہے وہ دنیا ہی کی زندگی کا ساز وسامان ہے' اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے ربّ پر توکّل کرتے ہیں''۔ پھر ان مردانِ کار کا تربیت کے ضروری مراحل سے گزرنا اور اپنے لیڈر کے ساتھ سمع وطاعت کے سخت ڈسپلن کے تحت مربوط ہونا بھی ضروری ہے۔ بہرحال جب مذکورہ صفات کے حامل افراد اچھی خاصی تعداد میں اکٹھے ہو جائیں اور تربیت وتنظیم کے ضروری مراحل بھی طے کر چکیں تب ان کے امیر یا لیڈر کو حالات وماحول کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے اقدام کے مرحلے میں داخل ہونے کا فیصلہ کرنا ہوگا۔

مختصراً یوں سمجھیں کہ منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ کے بنیادی مراحل دو ہیں: تیاری کا مرحلہ اور تصادم یا ٹکراؤ کا مرحلہ۔ مَیں نے اپنی کتاب ''منہجِ انقلابِ نبویؐ'' میں پہلے مرحلے کو منہجِ انقلابِ نبویؐ کا ''اساسی منہاج'' جبکہ دوسرے مرحلے کو ''تکمیلی منہاج'' کا نام دیا

ہے اور ظاہر ہے اس پورے منہاج کا مرکز و محور تو قرآن ہی ہے۔ علامہ اقبال نے انقلابِ اسلامی کے ان دو مراحل کا ذکر بایں الفاظ کیا ہے: ؎

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن — چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!

جبکہ اکبر الٰہ آبادی نے ان دو مراحل کی ترتیب کا فلسفہ بڑی سادگی اور خوبصورتی سے ان دو مصرعوں میں بیان کر دیا ہے: ؎

خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے — نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے!

گویا بدر کے میدان میں اہلِ ایمان نے جو کامیاب معرکہ لڑا اس کی تیاری کا آغاز بہت پہلے غارِ حرا کی تنہائیوں میں فردِ واحد کی سوچ بچار سے ہوا تھا۔ حضور ﷺ نے مکہ کی گلیوں میں دعوت و تبلیغ کی صبر آزما مہم تن تنہا شروع کی۔ پھر اس دعوت پر لبیک کہنے والے ''مردانِ کار'' نے آپ ﷺ کی نگرانی و راہنمائی میں ۱۳ سال تک تزکیہ و تعلیم' ذہنی و نفسیاتی تربیت' سخت سے سخت جسمانی تشدد کی برداشت' ہر صورت میں ہاتھ بندھے رکھنے کی مشق اور ایسے کئی جاں گداز مراحل کامیابی سے طے کیے تو تب کہیں جا کر وہ تصادم کے مرحلے میں قدم رکھنے اور بدر و حنین جیسے معرکے سر کرنے کے قابل ہوئے۔ آج ہمیں بھی غلبۂ دین کی جدّ و جُہد کے دوران حضور ﷺ کے اسی منہج کی پیروی کا اہتمام کرنا ہے۔

آیات ۱ تا ۴

سُوْرَةُ الصَّفِّ مَدَنِيَّةٌ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اٰيَاتُهَا: ۱۴ — رُكُوْعَاتُهَا: ۲

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۲ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۳ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝۴

آیت ۱ ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱﴾ ''تسبیح کرتی ہے اللہ کی ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے' اور وہ بہت زبردست ہے' کمال حکمت والا۔''

آیت ۲ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۲﴾ ''اے مسلمانو! تم کیوں کہتے ہو وہ جو کرتے نہیں ہو؟''

اس آیت میں زجر و توبیخ اور جھنجھوڑنے کا وہی انداز پایا جاتا ہے جو اس سے قبل ہم سورۃ الحدید میں بھی دیکھ چکے ہیں۔ بلکہ یہ اسلوب زیر مطالعہ مدنی سورتوں میں جگہ جگہ پایا جاتا ہے۔ قبل ازیں سورۃ الحدید کے تمہیدی کلمات میں اس اسلوب کی وجہ بھی بیان کی گئی ہے کہ ان سورتوں کے زمانہ نزول (۵ ہجری کے بعد) تک پرانے مسلمانوں کی نسبت نومسلموں کی تعداد زیادہ ہو چکی تھی۔ ایمان کی گہرائی اور جذبہ ایثار و قربانی کے حوالے سے نو وارد مسلمانوں کی کیفیت چونکہ ''السابقون الاولون'' اور ابتدائی دور کے اہلِ ایمان کی سی نہیں تھی' اس لیے مسلمانوں کے ایمان و عمل کے اجتماعی معیار کے اوسط میں قدرے کمی واقع ہوئی تھی اور اسی وجہ سے انہیں اس انداز میں جھنجھوڑا جا رہا ہے۔ لیکن قرآن مجید چونکہ ہر زمانے کے لوگوں سے مخاطب ہے' اس لیے اس آیت کو پڑھتے ہوئے یوں سمجھیں کہ

آج یہ ہم سے سوال کر رہی ہے کہ اے ایمان کے دعوے دارو! تم کیسے مسلمان ہو؟ تمہارے قول و فعل میں اتنا تضاد کیوں ہے؟ تم اللہ پر ایمان کا اقرار بھی کرتے ہو اور دن رات اُس کے احکام کو پاؤں تلے روندتے بھی رہتے ہو! تم رسول اللہ ﷺ کی ذات سے عشق و محبت کے دعوے بھی کرتے ہو لیکن جب عمل کے میدان میں آتے ہو تو آپ ﷺ کی سُنّتوں کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیتے ہو! ذرا تصور کیجیے! آج اگر اللہ کا کلام نازل ہو تو ہمارے ایمان، ہمارے کردار اور ہمارے عمل پر کیا کیا تبصرہ کرے! اور اگر آج حضور ﷺ خود تشریف لا کر اپنی اُمّت کی حالت دیکھ لیں تو کیسا محسوس کریں!

آیت ۳ ﴿كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۳﴾ ''بڑی شدید بیزاری کی بات ہے اللہ کے نزدیک کہ تم وہ کہو جو تم کرتے نہیں۔''

یہ بہت سخت الفاظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں سے اس سے بڑی ڈانٹ اور گرفت اور بھلا کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن اس ڈانٹ اور اظہارِ بیزاری کے بعد اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا اور محبت کا معیار بھی بتا دیا ہے کہ اگر تم جاننا چاہتے ہو کہ اللہ کو کیسے لوگ پسند ہیں اور یہ کہ وہ کیسے لوگوں سے محبت کرتا ہے تو سنو!

آیت ۴ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝۴﴾ ''اللہ کو تو محبوب ہیں وہ بندے جو اُس کی راہ میں صفیں باندھ کر قتال کرتے ہیں، جیسے کہ وہ سیسہ پلائی دیوار ہوں۔''

آج کے زمانے میں ''بنیانِ مرصوص'' reinforced concrete wall کو کہا جائے گا۔ ایسی دیواریں بڑے بڑے dams کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ البتہ پرانے زمانے میں اگر کسی دیوار کو غیر معمولی طور پر مضبوط کرنا مقصود ہوتا تو چنائی کرنے کے بعد اس کے اندر پگھلا ہوا تانبا ڈالا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں عام طور پر ''بنیانِ مرصوص'' کا ترجمہ ''سیسہ پلائی ہوئی دیوار'' کے الفاظ میں کیا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں اس طریقہ سے ''سیسہ پلائی ہوئی دیوار'' بنانے کا تصور سورۃ الکہف کی آیت ۹۶ میں بھی ملتا ہے۔ ذوالقرنین بادشاہ نے یاجوج ماجوج کے حملوں سے حفاظت کے لیے لوہے کے تختوں کی مدد سے دیوار کھڑی کرنے کے بعد حکم دیا تھا: ﴿اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ۝۹۶﴾ ''اب لاؤ میں اس پر پگھلا ہوا تانبا ڈال دوں''۔ بہرحال یہاں ''بنیانِ مرصوص'' سے مراد میدانِ جنگ میں مجاہدین کی ایسی صفیں ہیں جن میں کوئی رخنہ یا خلا نہ ہو اور ایک ایک مجاہد اپنی جگہ پر اس قدر مضبوطی سے کھڑا ہو کہ دشمن کے لیے صف کے کسی ایک حصّے کو بھی دھکیلنا ممکن نہ ہو۔

یہاں ضمنی طور پر یہ مسئلہ بھی سمجھ لیں کہ نماز کے لیے ہماری صف بندی کی بھی یہی کیفیت ہونی چاہیے۔ ایک صف کے تمام نمازیوں کو کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہونا چاہیے اور ان کے پیروں کے محاذات بھی ایک ہونے چاہئیں، یعنی تمام لوگوں کے پاؤں ایک سیدھ میں ہوں تاکہ صف سیدھی رہے۔ دو آدمیوں کے درمیان خلا بالکل نہیں ہونا چاہیے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ جماعت کی صف میں دو نمازیوں کے درمیان خلا کی جگہ سے شیطان گزر جاتا ہے۔ جماعت کے لیے صف بندی کا اہتمام کرانا دراصل امام کی ذمہ داری ہے، لیکن مقامِ افسوس ہے کہ ہمارے اکثر ائمہ مساجد اس طرف کوئی توجہ ہی نہیں دیتے۔ البتہ اس ضمن میں ضرورت سے زیادہ شدّت بھی مناسب نہیں، جیسے بعض لوگ غیر معمولی طور پر ٹانگیں پھیلا کر دوسرے نمازی کے پاؤں پر اپنا پاؤں چڑھا دیتے ہیں اور دوسروں کے لیے کوفت کا باعث بنتے ہیں۔

بہرحال ہمارے لیے اس آیت کا اصل پیغام یہ ہے کہ اسلام میں سب سے بڑی نیکی اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے پسندیدہ عمل ''قتال فی سبیل اللہ'' ہے۔ فلسفے کی اصطلاح میں سب سے اعلیٰ خیر یا نیکی کو summum bonum کہتے ہیں۔ ہر فلسفۂ اخلاق میں ایک ''خیر اعلیٰ'' (summum bonum) یا بلند ترین نیکی (highest virtue) کا تصور ہوتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کے اصل پیغام کو اگر فلسفہ کی زبان میں بیان کریں تو یوں کہیں گے کہ اسلام کے نظامِ فکر اور اس کے نظریۂ اخلاق میں بلند ترین نیکی یا ''خیر اعلیٰ'' (summum bonum) قتال فی سبیل اللہ ہے۔ چنانچہ جو کوئی اللہ کا قرب حاصل کرنا چاہتا ہو اُسے اپنی سب سے قیمتی متاع یعنی اپنی جان اُس کی راہ میں قربانی کے لیے پیش کرنا ہوگی۔ جو شخص اس قربانی کے لیے تیار نہ ہو اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت و قربت کا دعویٰ بھی نہ کرے۔ بقول غالبؔ ع ''جس کو ہو جان و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں!''

یہاں سورت کے پہلے حصے کا مطالعہ مکمل ہو گیا۔ اب آئندہ چار آیات میں بنی اسرائیل کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبروں کے ساتھ اُن کا طرزِ عمل کیا تھا۔ یہود کی تاریخ کے حوالے سے دراصل مسلمانوں کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ قول و عمل کا تضاد اور ایمان کے عملی تقاضوں کی ادائیگی سے پہلوتہی ہی وہ اصل جرم تھا جس کی پاداش میں یہود اس مقام اور منصب سے معزول کر دیے گئے جس پر اب تم فائز کیے گئے ہو۔

آیات ۵ تا ۸

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَ قَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ ؕ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۝ وَ اِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُوَ یُدْعٰۤی اِلَی الْاِسْلَامِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ اللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝

آیت ۵ ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ﴾ ''اور یاد کرو جب کہ موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم کے لوگو! تم کیوں مجھے ایذا دے رہے ہو؟''

یہ جس ایذا کا ذکر ہے وہ ذاتی نوعیت کی بھی ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے انبیاء و رسل علیہم السلام بھی آخر انسان تھے اور طبع بشری کے تحت ہر طرح کی تکلیف کو محسوس بھی کرتے تھے۔ جیسے سورۃ الاحزاب کی آیت ۶۹ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ایک تکلیف دہ معاملے کا ذکر آیا ہے یا جیسے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکینِ مکہ کی طرف سے بھی ذاتی نوعیت کی تکالیف پہنچائی جاتی رہیں اور منافقین کے طرزِ عمل سے بھی شدید ذہنی و قلبی اذیت سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے بنی اسرائیل کی طرف سے اصل اور سب سے بڑی ایذا وہ تھی جو حکمِ جہاد سے ان کے انکار کی وجہ سے آپؑ کو پہنچی تھی۔ اپنی قوم کے اس انکار کے بعد آپؑ نے اللہ تعالیٰ سے جو دعا کی تھی اس کے ایک

ایک لفظ میں شدتِ تکلیف کے احساسات کی جھلک نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہوں آپؑ کی دعا کے یہ الفاظ:

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ لَاۤ اَمۡلِكُ اِلَّا نَفۡسِیۡ وَاَخِیۡ فَافۡرُقۡ بَیۡنَنَا وَبَیۡنَ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۵﴾﴾ (المائدۃ)

''موسیٰؑ نے عرض کیا: پروردگار! مجھے تو اختیار نہیں ہے سوائے اپنی جان کے اور اپنے بھائی (ہارونؑ کی جان) کے تو اب تفریق کر دے ہمارے اور ان نافرمان لوگوں کے درمیان۔''

﴿وَقَدۡ تَّعۡلَمُوۡنَ اَنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَیۡكُمۡ﴾ ''جبکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں۔''

میرے نزدیک یہاں لفظ ''رسول'' نبی کے معنی میں آیا ہے۔ دراصل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت اپنی قوم یعنی بنی اسرائیل کی طرف ''نبی'' کی حیثیت سے تھی بطور ''رسول'' نہیں تھی۔ جبکہ قومِ فرعون کی طرف آپؑ بحیثیت ''رسول'' مبعوث ہوئے تھے:

﴿وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی بِاٰیٰتِنَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۶﴾﴾ (الزخرف)

''اور ہم نے بھیجا تھا موسیٰؑ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اُس کے سرداروں کی طرف تو اُس نے کہا کہ (دیکھو) میں تمام جہانوں کے پروردگار کا بھیجا ہوا (رسول) ہوں۔''

کسی قوم کی طرف ''رسول'' کی بعثت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قانون ہمیشہ یہ رہا ہے کہ متعلقہ قوم پر اپنے رسول کی فرمانبرداری لازم ہوتی تھی۔ چنانچہ جو قوم اپنے رسولؑ کی دعوت کو رد کر دیتی تھی اسے ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس قانون کا اطلاق بنی اسرائیل پر نہیں ہوا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پے در پے نافرمانی کے باوجود انہیں ہلاک نہیں کیا گیا۔ دوسری طرف قومِ فرعون آپؑ کی نافرمانی کی وجہ سے ہلاک کر دی گئی۔ چنانچہ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیثیت نبی کی تھی جبکہ آلِ فرعون کی طرف آپؑ ''رسول'' مبعوث ہو کر آئے تھے۔

﴿فَلَمَّا زَاغُوۡۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوۡبَهُمۡ﴾ ''پھر جب وہ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے اُن کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔''

یہ آیت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں لوگوں کی ہدایت کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا ایک بنیادی اصول اور قانون بیان ہوا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں قرآن مجید کی اُن آیات کو سمجھنا بھی آسان ہو جاتا ہے جن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو گمراہ کرنے یا اُن کے دلوں پر مہر کر دینے کا ذکر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قانون کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ہدایت کے راستے کو پہچان لینے کے بعد بھی اسے اختیار نہ کرے بلکہ گمراہی کی روش پر ہی چلتے رہنے کو ترجیح دے پھر وہ اس راستے پر چلتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ مہلت کی حدود پھلانگ کر ایسے مقام پر پہنچ جائے جہاں سے اس کی واپسی کا کوئی امکان نہ ہو (point of no return) تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ اُس شخص کے دل پر مہر لگا دیتا ہے اور اس پر ہدایت کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیتا ہے' یعنی بندہ جب سمجھتے بوجھتے ہوئے ٹیڑھا راستہ اختیار کرتا ہے تو اس کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ اس کا دل ہمیشہ کے لیے ٹیڑھا کر دیتا ہے۔ (اعاذنا اللہ من ذلک!)

﴿وَاللّٰهُ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۵﴾﴾ ''اور اللہ فاسقوں کو (زبردستی) ہدایت نہیں دیتا۔''

آیت ۶ ﴿وَاِذۡ قَالَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَیۡكُمۡ﴾ ''اور یاد کرو جب عیسیٰؑ ابن مریم نے کہا کہ اے بنی اسرائیل! میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف''

اس آیت میں بنی اسرائیل کے دوسرے دور کا ذکر ہے جب اُن کی طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام رسول بن کر آئے۔ بحیثیت رسول آپؑ کی بعثت کا ذکر سورۂ آل عمران کی آیت ۴۹ کے الفاظ ﴿وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ﴾ میں آیا ہے۔

﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ﴾ ''مَیں تصدیق کرتے ہوئے آیا ہوں اُس کی جو میرے سامنے موجود ہے تورات میں سے''

﴿وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ﴾ ''اور بشارت دیتا ہوا ایک رسول کی جو میرے بعد آئیں گے' ان کا نام احمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہوگا۔''

﴿فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝۶﴾ ''پھر جب وہ (عیسیٰؑ) آئے اُن کے پاس واضح نشانیوں کے ساتھ تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔''

اس کے بعد حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے ساتھ بنی اسرائیل کا تیسرا دور شروع ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کے بعد بنی اسرائیل کو واضح طور پر بتا دیا گیا: ﴿عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ﴾ (بنی اسرائیل: ۸) ''ہوسکتا ہے کہ اب تمہارا رب تم پر رحم کرے' اور اگر تم نے وہی روش اختیار کی تو ہم بھی وہی کچھ کریں گے''۔ یعنی اے بنی اسرائیل! تم ہمارے لاڈلے تھے' ہم نے تمہیں خود برگزیدہ کیا تھا: ﴿وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰی عِلْمٍ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ۝۳۲﴾ (الدّخان) مگر تم نے اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے اپنے آپ کو راندۂ درگاہ بنا لیا۔ بہرحال ہماری رحمت اور محبت کے دروازے اب بھی تمہارے لیے کھلے ہیں۔ اگر تم لوگ توبہ کر کے اپنی روش درست کر لو تو ہم اب بھی تمہیں اپنی آغوشِ رحمت میں لینے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن اس کے لیے تمہیں خود کو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قدموں میں ڈالنا ہوگا اور قرآن کو اپنا راہبر ماننا ہوگا: ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ وَیُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِیْرًا ۝۹﴾ (بنی اسرائیل) ''یقیناً یہ قرآن راہنمائی کرتا ہے اُس راہ کی طرف جو سب سے سیدھی ہے اور بشارت دیتا ہے اُن اہلِ ایمان کو جو نیک عمل بھی کریں کہ اُن کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔''

تم پر واضح ہونا چاہیے کہ اب ہمارے قصرِ رحمت کا شاہدرہ ''قرآن'' ہے۔ اگر تم ہماری رحمت کی پناہ میں آنا چاہتے ہو تو تمہیں اسی شاہدرہ کی راہ سے گزر کر آنا ہوگا۔ لیکن اگر تم نے اپنے طرزِ عمل کی اصلاح نہ کی' اپنی نافرمانیاں اسی طرح جاری رکھیں تو پھر ہم بھی تمہارے ساتھ ویسا ہی سلوک کریں گے جیسا کہ ماضی میں تمہارے ساتھ ہوتا رہا ہے: ﴿وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا﴾۔ جیسے ماضی میں ہمارے حکم پر تم لوگ بخت نصر (Nebukadnezar)' یونانیوں' شامیوں' رومیوں وغیرہ کے ہاتھوں بار بار نشانِ عبرت بنتے رہے ہو ویسے ہی ایک مرتبہ پھر ہم تمہیں تمہاری بداعمالیوں کی سزا دلوائیں گے۔ (بیسویں صدی میں نازیوں کے ہاتھوں یہود کا جو انجام ہوا وہ بھی عبرت انگیز ہے۔ ان کا اپنا دعویٰ ہے کہ ''ہولوکاسٹ'' میں ۶۰ لاکھ افراد مارے گئے۔)

آیت ۷ ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ﴾ ''اور اُس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تراشے''

﴿وَهُوَ یُدْعٰۤی اِلَی الْاِسْلَامِ ؕ﴾ ''درآں حالیکہ اُسے بلایا جا رہا ہو اسلام کی طرف!''

یعنی اب اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم لوگوں کو دعوتِ ایمان و اسلام دے رہے ہیں اور تم لوگ اس دعوت پر لبیک کہنے کے بجائے اُنؐ کی نبوت و رسالت اور قرآن کے بارے میں اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہو۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۷﴾ ''اور اللہ ایسے ظالموں کو (زبردستی) ہدایت نہیں دیتا۔''

اب اگلی آیت میں یہودیوں کی ان کوششوں اور سازشوں کا ذکر ہے جو انہوں نے حضور ﷺ اور قرآن کے خلاف شروع کر رکھی تھیں۔ یہ آیت زیر مطالعہ مضمون کے کلائمکس کا درجہ رکھتی ہے:

آیت ۸ ﴿يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ﴾ ''وہ تُلے ہوئے ہیں کہ اللہ کے نُور کو اپنے مُنہ (کی پھونکوں) سے بجھا کر رہیں گے''

﴿وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝۸﴾ ''اور اللہ اپنے نُور کا اتمام فرما کر رہے گا' خواہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔''

یہ آیت الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ سورۃ التوبہ میں اس طرح آئی ہے: ﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝۳۲﴾ ''یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نُور کو بجھا دیں اپنے مُنہ (کی پھونکوں) سے اور اللہ کو ہرگز منظور نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے' چاہے یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔''

اللہ کے نُور کو مُنہ کی پھونکوں سے بجھانے کے استعارے میں یہودِ مدینہ کی ان بودی کوششوں کی طرف اشارہ ہے جو وہ حضور ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف اُس وقت کر رہے تھے۔ یعنی وہ سامنے آ کر براہِ راست مقابلہ کرنے کے بجائے مسلمانوں کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈا کرتے' افواہیں اڑاتے' درپردہ سازشوں کے جال بُنتے رہتے' کبھی قریش کے پاس جاتے کہ تم مدینہ پر حملہ کرو اور کبھی کسی دوسرے قبیلے کو سبز باغ دکھا کر مسلمانوں کے خلاف ابھارتے۔ سورۃ الحشر میں ان کی بزدلی اور اندرونی کمزوری کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے: ﴿لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ﴾ (آیت ۱۴) کہ یہ لوگ کھلے میدان میں اکٹھے ہو کر تمہارا مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے' ہاں چھپ چھپا کر دیواروں کی اوٹ سے وہ تم پر ضرور وار کریں گے۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس آیت کے مضمون کی ترجمانی اپنے ایک شعر میں یوں کی ہے: ؎

نُورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن　　پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا!

یہاں یہ اصولی نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس آیت اور اس مضمون کی حامل قرآن کی اور بہت سی دوسری آیات کے مفہوم کا دائرہ صرف حضور ﷺ کے زمانے کے یہودیوں اور ان کی اسلام دشمن سرگرمیوں تک ہی محدود نہیں' بلکہ ان میں تا قیامِ قیامت ہر زمانے کے یہودیوں اور ان کی ان سازشوں کا ذکر ہے جو وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مسلسل کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ موجودہ دور میں اگرچہ یہ لوگ پوری عیسائی دنیا کو اپنی مُٹھی میں لے کر عالمِ اسلام کے خلاف صف آراء ہو چکے ہیں' مگر قرائن بتاتے ہیں کہ ان کے فیصلے کا وقت اب قریب آ لگا ہے۔ آیت زیر مطالعہ کے الفاظ کے مطابق اللہ کے نور کا اتمام یعنی روئے ارضی پر دینِ اسلام کا غلبہ تو ایک طے شدہ امر ہے۔ اس کے لیے قیامت سے پہلے دنیا کو ایک انتہائی خوفناک جنگ کا سامنا کرنا ہے۔ اس جنگ میں یہودی اور عیسائی مل کر مسلمانوں کے خلاف لڑیں گے۔ احادیث میں اس جنگ کو اَلْمَلْحَمَةُ الْعُظْمٰی کا نام دیا گیا ہے' جبکہ عیسائیوں اور یہودیوں کی اصطلاح میں اسے ''ہرمجدون'' (Armageddon) کہا جاتا ہے۔ اس جنگ کے نتیجے میں یہودی مکمل طور

پر نیست و نابود ہو جائیں گے اور اسلام واحد طاقت کے طور پر پوری دنیا پر غالب آ جائے گا۔ یہ ہے آیت کے الفاظ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ کے مفہوم کا خلاصہ جس کی تفصیل ہمیں احادیث میں ملتی ہے۔

آیات ۹ تا ۱۲

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ
ع الْمُشْرِكُوْنَ ۝۹ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۱۰
تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ
اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۱ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ يُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ
مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۲

یہاں سے اس سورت کے تیسرے حصے کا آغاز ہو رہا ہے۔ آیت ۹ میں حضور ﷺ کی بعثت کا ذکر ہوا ہے:

آیت ۹ ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ ''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسولؐ کو الہدیٰ اور دینِ حق کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اس کو پورے نظامِ زندگی پر''

حضور ﷺ کے مقصدِ بعثت کے حوالے سے یہ آیت خصوصی اہمیت کی حامل ہے اور اسی اہمیت کے باعث قرآن مجید میں اسے تین بار (اس مقام کے علاوہ سورۃ التوبہ' آیت ۳۳ اور سورۃ الفتح' آیت ۲۸ کے طور پر) دہرایا گیا ہے۔ تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کے لیے قرآن مجید میں بشیر' نذیر' مذکر' شاہد' معلم وغیرہ الفاظ مشترک استعمال ہوئے ہیں' لیکن اس آیت کا مضمون اور اسلوب صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے خاص ہے۔ الھُدٰی سے مراد یہاں وہ ہدایت نامہ (قرآن) ہے جو آپ ﷺ پر کامل ہو گیا' جبکہ آپ سے پہلے تمام انبیاء کو اپنے اپنے دور میں جو میزان (شریعت) عطا ہوتی رہی تھی حضور ﷺ کی بعثت میں وہ کامل ہو کر ''دین الحق'' یعنی سچے اور عادلانہ نظامِ زندگی کی شکل اختیار کر گئی۔ چنانچہ آپ ﷺ کو الہدیٰ اور دینِ حق کے ساتھ اس لیے بھیجا گیا تاکہ اللہ تعالیٰ کے نظامِ عدل و قسط کو دنیا کے تمام نظاموں پر غالب کر دیا جائے۔ یہ تھا حضور ﷺ کی بعثت کا مشن جسے تکمیل کے لیے آپؐ ہمارے سپرد فرما گئے تھے۔ لیکن ہم نے تو اس مشن کو کبھی اپنایا ہی نہیں۔ ہمارا مشن تو یہ ہے کہ حلال و حرام طریقے سے جیسے بھی ہو' دولت اکٹھی کرو' پھر اسی دولت سے صدقہ و قربانی دو' حج کرو اور رمضان میں ہر سال عمرے کے لیے چلے جایا کرو۔ ہمارا سارا زور rituals پر ہے اور دین اگر دنیا میں پامال ہے تو ہوتا رہے' ہماری بلا سے! تصور کریں' اگر آج صرف ایک سال میں حج پر اکٹھے ہونے والے افراد ہی سروں پر کفن باندھ کر غلبۂ دین کی جدّ و جُہد کے لیے میدان میں کود پڑیں تو دنیا کو بدل سکتے ہیں۔ مگر افسوس' صد افسوس! ؎

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی!

﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝۹﴾ ''اور خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو!''

ظاہر ہے مشرکین کب چاہیں گے کہ دنیا میں اسلام کا غلبہ ہو' نظامِ توحید کا نفاذ ہو اور اللہ کی حکومت بالفعل قائم ہو جائے۔ یہاں پر

مُشْرِکُوْنَ کا لفظ خاص طور پر لائقِ توجہ ہے۔ اس سے مراد صرف وہ مشرکین ہی نہیں ہیں جو بتوں اور دیوی دیوتاؤں کو پوجتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے حضور ان کی سفارش کر دیں گے' بلکہ سب سے بڑے شرک تو وہ ہیں جو دنیا میں خدائی کے دعوے دار بنے بیٹھے ہیں' جو نمرود اور فرعون کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں اور جن کا دعویٰ ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ (sovereignty) کے مالک ہم ہیں۔ فرعون بھی تو یہی کہتا تھا: ﴿اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ﴾ (الزخرف: ۵۱) کہ دیکھو! کیا یہ مصر کی حکومت میری نہیں ہے؟ اور کیا یہ پورا نہری نظام میرے تابع نہیں ہے؟ تو فرعون کے اس دعوے اور ''عوام کی حاکمیت'' کے نعرے میں کیا فرق رہ گیا؟ صرف یہی نا کہ وہاں اقتدار کا دعویٰ کرنے والا ایک فرد تھا اور یہاں پوری قوم حاکمیت کی دعوے دار ہے۔ اب ظاہر ہے اگر اس ماحول میں آپ اللہ کی حاکمیت کا نعرہ لگائیں گے اور اللہ کے نظامِ عدل و قسط کے قیام کے مشن کو لے کر آگے بڑھنا چاہیں گے تو ''اپنی حاکمیت'' کے یہ دعوے دار خم ٹھونک کر آپ کے مقابلے میں آ کھڑے ہوں گے۔ اس کے بعد بھی اگر آپ اپنے موقف پر قائم رہیں گے تو ان سے آپ کا تصادم ناگزیر ہو جائے گا اور آپ کو مال و جان کی قربانی کی صورت میں اپنے اس موقف کی قیمت چکانا پڑے گی۔

چنانچہ اب اگلی آیات میں اسی صورتِ حال کا ذکر کیا جا رہا ہے:

آیت ۱۰ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۱۰﴾ ''اے ایمان کے دعوے دارو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت کے بارے میں بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے چھٹکارا دلا دے؟''

آیت ۱۱ ﴿تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ﴾ ''(وہ یہ کہ) تم ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسولؐ پر اور جہاد کرو اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔''

یعنی اللہ اور اُس کے رسولؐ پر ایسے ایمان لاؤ جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے۔ سورۃ النساء کی یہ آیت بھی اسی مفہوم میں اہلِ ایمان کو ایمان لانے کا حکم دے رہی ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ...﴾ (آیت ۱۳۶) ''اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر.....'' گویا یہ ایمان کے دعوے داروں کے لیے ایسا مؤمن بننے کی دعوت ہے جو سورۃ الحجرات کی اس آیت کے معیار پر پورے اترتے ہوں: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ﴾ (آیت ۱۵) ''مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اُس کے رسولؐ پر' پھر شک میں ہرگز نہیں پڑے اور انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔''

﴿ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۱﴾ ''یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔''

آیت ۱۲ ﴿يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ ''وہ تمہارے لیے تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں داخل کرے گا اُن باغات میں جن کے دامن میں نہریں بہتی ہوں گی''

﴿وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۲﴾ ''اور بہت پاکیزہ مساکن عطا کرے گا رہنے کے باغات میں۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔''

اصل اور سب سے بڑی فوز و فلاح اور کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے۔ ایک بندۂ مؤمن کو چاہیے کہ دنیا کی کامیابیوں سے

بے نیاز ہو کر اسی کامیابی کو اپنا ہدف بنائے۔ حتیٰ کہ غلبۂ دین یا اقامتِ دین کے لیے جدّوجُہد کا نصب العین بھی آخرت کی کامیابی ہی ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اگر ہم اس جدّوجُہد میں دُنیوی کامیابی پر نظر رکھیں گے تو اپنی کوششوں کو کامیاب نہ ہوتے دیکھ کر یا تو مایوس ہو کر بیٹھ جائیں گے یا الٹے سیدھے طریقے سے (by hook or by crook) مثبت نتائج حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ تاریخ گواہ ہے کہ دنیوی نتائج کو منزل سمجھ لینے کی وجہ سے اس راہ کی بڑی بڑی تحریکیں یا تو مایوسی کے قبرستان میں دفن ہو گئیں یا شارٹ کٹ لگانے کی کوشش میں غلط موڑ مُڑ کر اصل راستہ ہی گم کر بیٹھیں۔ چنانچہ اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے دوران ہمیں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کی کامیابی پر نظر رکھنی چاہیے اور دنیا کی کامیابی یا ناکامی کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔

اس حوالے سے یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ ہم صرف کوشش کرنے کے مکلّف ہیں' اس کوشش کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے ہم مکلّف نہیں۔ ہاں اپنی جدّوجُہد کے طریقِ کار پر حالات و ماحول کے مطابق نظرِ ثانی ضرور کرتے رہنا چاہیے' لیکن بنیادی طور پر ہمارا طریقہ اور راستہ وہی رہنا چاہیے جو منہجِ نبویؐ سے ماخوذ ہو۔ یہ منہج حضور ﷺ کے توسط سے ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ﴾ (المائدۃ:۴۸) ''تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک شریعت اور ایک راہِ عمل طے کر دی ہے''۔ چنانچہ ہم پر لازم ہے کہ ہم اقامتِ دین کی جدّوجُہد کی راہیں متعیّن کرتے ہوئے روشنی اور راہنمائی منہجِ محمدی (ﷺ) سے ہی حاصل کریں۔

آیات ۱۳' ۱۴

وَ اُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَ كَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ﴿۱۴﴾

اب اگلی آیت میں اس ''بونس'' کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کبھی کبھی اس دنیا میں بھی عطا کر دیتا ہے' چنانچہ فرمایا:

آیت ۱۳ ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ﴾ ''اور ایک اور چیز جو تمہیں بہت پسند ہے۔''

یعنی اس جہاد میں تمہیں دنیا کی کامیابی بھی مل سکتی ہے۔ اگرچہ تمہاری یہ کامیابی اللہ تعالیٰ کے ہاں اس قدر اہم نہیں جس قدر تم اسے اہم سمجھتے ہو۔ وہ غلبۂ دین کے لیے تمہاری کوششوں کا محتاج نہیں۔ وہ چاہے تو آنِ واحد میں دین کو غالب کر دے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو چیز اہم ہے وہ تمہاری جدّوجُہد اور اس جدّوجُہد میں تمہارا جذبۂ ایثار و خلوص ہے' اور یہی تمہارا اصل امتحان ہے۔ اگر تم اس امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہو تو اللہ کے ہاں کامیاب ہو' چاہے دنیوی لحاظ سے تم ناکام ہی رہو۔ لیکن اللہ کو معلوم ہے کہ بربنائے طبع بشری تم لوگ اپنی اس جدّوجُہد کے مثبت نتائج اس دنیا میں بھی دیکھنا چاہتے ہو اور دُنیوی فتح حاصل ہونے پر تم لوگ بہت خوش ہوتے ہو' اس لیے اللہ تعالیٰ تمہاری خوشی کے لیے وہ بھی تمہیں عطا فرمائے گا۔

﴿نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ﴾ ''اللہ کی طرف سے مدد اور قریبی فتح۔''

بس اب اللہ تعالیٰ کی مدد آیا ہی چاہتی ہے اور دنیوی فتح بھی تمہارے قدم چومنے ہی والی ہے۔ یہ کس مدد اور کونسی فتح کی بشارت ہے؟ یہ سمجھنے کے لیے غزوۂ احزاب کے حالات و واقعات کو ایک دفعہ پھر سے ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ اس اعتبار سے یوں سمجھئے کہ سورۃ الصف کی حیثیت سورۃ الاحزاب کے ضمیمے کی سی ہے۔

﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۳﴾ ''اور (اے نبی ﷺ) آپ مؤمنین کو خوشخبری سنا دیجیے۔''

غزوۂ احزاب کے بعد حضور ﷺ نے صحابہؓ کو یہ خوشخبری ان الفاظ میں سنائی تھی: ((لَنْ تَغْزُوَكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ)) (تفسیر ابن کثیر: ۳۹۶/۶) کہ اب اس سال کے بعد قریش تم پر کبھی چڑھائی نہیں کر سکیں گے' بلکہ آئندہ تم لوگ ان پر چڑھائی کرو گے۔ یہ ان کی طرف سے آخری حملہ تھا' کفر کی کمر ٹوٹ چکی اور کفار حوصلہ ہار گئے' اب اقدام تمہاری طرف سے ہوگا۔ چنانچہ اس کے بعد اگلے سال ۶ ہجری میں حضور ﷺ نے چودہ سو صحابہ کے ساتھ عمرے کی نیت سے مکہ کا سفر اختیار فرمایا' جس کے نتیجے میں مسلمانوں اور قریش کے مابین حدیبیہ کے مقام پر صلح کا معاہدہ طے پایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس معاہدے کو ''فتح مبین'' قرار دیا: ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝۱﴾ (الفتح) ''یقیناً ہم نے آپ کو ایک بڑی روشن فتح عطا فرمائی ہے۔''

دوسری طرف اس بشارت کا تعلق آخرت سے بھی ہے کہ اپنے مال و جان کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کے نتیجے میں مؤمنینِ صادقین کو جنت کی نعمتیں بھی ملیں گی اور اللہ کے ہاں انہیں ایک خاص مقام بھی عطا ہوگا۔ اور وہ ہوگا اللہ کے مددگار ہونے کا مقام!

یہاں یہ بات خصوصی طور پر لائقِ توجہ ہے کہ ان آیات میں عذابِ الیم سے چھٹکارے کو ایمانِ حقیقی اور جہاد فی سبیل اللہ کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے۔ آیت ۱۰ میں یہ بات جس دوٹوک انداز میں واضح کی گئی ہے اسے فزیالوجی کی زبان میں "All or none Law" کہتے ہیں۔ یعنی ایسی صورتِ حال جس میں کوئی چیز واقع ہوتی ہے تو پوری ہوتی ہے اور اگر نہیں واقع ہوتی تو بالکل نہیں ہوتی۔ اس میں کوئی درمیانی راستہ یا تناسب ممکن نہیں ہوتا۔ ہمارے ارادی عضلات (voluntary muscles) کے سکڑنے کا معاملہ ایسا ہی ہے' اگر محرک (stimulus) پورا مل جاتا ہے تو متعلقہ muscle کی پوری contraction ہوتی ہے اور اگر stimulus کم ہوتا ہے تو contraction بالکل نہیں ہوتی۔ اس مفہوم میں آیت ۱۰ تا ۱۳ کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ یہ راستہ اختیار کریں گے ان کے سب گناہ بھی معاف ہو جائیں گے (بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے ایمان و عمل کو درجہ قبولیت مل جائے)' انہیں عذابِ الیم سے چھٹکارا بھی ملے گا اور جنتِ عدن میں ٹھکانہ بھی نصیب ہوگا۔ صرف یہی نہیں' بلکہ دنیا میں انہیں اللہ کی مدد سے فتح بھی ملے گی اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مددگار قرار پائیں گے ـــــ اس کے برعکس اگر ہم لوگ ایمان کے دعوے تو بہت کریں اور اللہ و رسولؐ سے محبت کے نعرے بھی لگائیں' لیکن مذکورہ دو شرائط (ایمانِ حقیقی اور جہاد فی سبیل اللہ) پوری کرنے میں سنجیدہ نہ ہوں تو ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارا رویہ اللہ تعالیٰ کی بیزاری کو دعوت دینے کے مترادف ہے: ﴿كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۳﴾ (الصف) ''بڑی شدید بیزاری کی بات ہے اللہ کے نزدیک کہ تم وہ کہو جو کرتے نہیں''۔ چنانچہ جو لوگ مذکورہ شرائط کا حق ادا کیے بغیر ہی سمجھتے ہیں کہ وہ آخرت میں نجات پا جائیں گے وہ ایک خود ساختہ خیال کے سہارے زندگی بسر کر رہے ہیں اور اپنی سوچ سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان آیات کے الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یعنی یہ 'معاذ اللہ' کلامِ مہمل ہے۔

اس سورۂ مبارکہ کی آخری آیت ایک طویل آیت ہے اور منطقی اعتبار سے یہ اس سلسلہ مضمون کا ایک انتہائی اہم اور بلند ترین مقام ہے جو گزشتہ آیات میں چلا آ رہا ہے۔ فرمایا:

آیت ۱۴ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾ ''اے اہلِ ایمان! تم اللہ کے مددگار بن جاؤ''

اللہ کے مددگار بننے کا طریقہ یہ ہے کہ تم اللہ کے دین کا جھنڈا سربلند کرنے پر کمربستہ ہو جاؤ۔ اور اگر تم اس مشن کو آگے بڑھانے کے لیے جدّوجُہد کرو گے تو تم محمد عربی ﷺ کے مددگار بھی بن جاؤ گے' کیونکہ غلبۂ دین کا یہ مشن اصل میں تو اللہ کے رسول ﷺ کا مشن ہے۔ تو اے اہلِ ایمان! آؤ آگے بڑھو! اللہ کے دین کا جھنڈا اٹھاؤ! جان و مال کا سرمایہ لگاؤ اور اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے مددگاروں میں اپنا نام لکھوالو۔

﴿كَمَا قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ﴾ ''جیسے کہا تھا عیسیٰؑ ابن مریم نے اپنے حواریوں سے''

﴿مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ﴾ ''کون ہے میرا مددگار اللہ کی طرف؟''

یعنی کون ہے جو میری مدد کرے اللہ کی راہ میں؟ مدد مجھے درکار ہے' لیکن مشن اللہ کا ہے۔ اس فقرے میں وہی دو نسبتیں نظر آ رہی ہیں جن کا ذکر سورۃ الفتح کی اس آیت میں حضور ﷺ کی بیعت کے حوالے سے آیا ہے: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ ۚ﴾ (آیت ۱۰)۔ یعنی بیعت حضور ﷺ کے ہاتھ پر ہو رہی ہے لیکن سودا اللہ تعالیٰ سے ہے۔ گویا عملی طور پر اس بیعت میں دو کے بجائے تین ہاتھ ہیں: بیعت کرنے والے کا ہاتھ' حضور ﷺ کا ہاتھ اور اللہ کا ہاتھ۔ چنانچہ اللہ کی مدد کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ آپ اُس ''بندے'' کی مدد کریں جو اللہ کے مشن کو لے کر اُس کے راستے پر نکلا ہو۔ اسی فلسفے کے تحت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے اللہ کی مدد کے لیے آپؑ کی آواز پر لبیک کہا تھا اور اسی جذبے کے ساتھ حضور ﷺ کے صحابہؓ نے اپنا سب کچھ آپؐ کے قدموں میں نچھاور کر کے ﴿وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ﴾ (الفتح:۲۹) کی فہرست میں اپنے نام لکھوائے تھے۔ چنانچہ آج بھی اس مشن کو آگے بڑھانے کا یہی طریقہ ہے کہ اللہ کی توفیق سے اللہ کا کوئی بندہ خود کو اس مشن کے لیے وقف کر کے ﴿مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ﴾ کی صدا بلند کرے کہ اے اللہ کے بندو! میں نے تو یکسو ہو کر اللہ کی طرف رجوع کر لیا ہے۔ مجھے تو اب اس راستے پر چلنا ہی چلنا ہے۔ کوئی ساتھی ملے گا تب بھی چلوں گا اور اگر کوئی ساتھی نہیں ملے گا تب بھی چلوں گا۔ تو آؤ آگے بڑھو اور میرے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اللہ کے مددگار بن جاؤ!

﴿قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ ''حواریوں نے کہا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار!''

یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے مددگار بن گئے۔ بنیادی طور پر اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے خلوص و ایثار کا ذکر ہے کہ انہوں نے ﴿مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ﴾ کی دعوت پر بلا تأمل خود کو پیش کر دیا۔

﴿فَاٰمَنَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَ كَفَرَتْ طَّآىِٕفَةٌ ۚ﴾ ''تو بنی اسرائیل کا ایک گروہ (حضرت مسیح علیہ السلام پر) ایمان لے آیا اور دوسرا گروہ کفر پر اڑا رہا۔''

﴿فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ﴾ ''تو ہم نے مدد کی اُن کی جو ایمان لائے تھے ان کے دشمنوں کے خلاف''

﴿فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِیْنَ ﴿۱۴﴾﴾ ''تو (بالآخر) وہی غالب ہوئے۔''

اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام لیوا دنیا میں غالب ہوئے اور اللہ کے رسولؑ کا انکار کرنے والے یہودی مغلوب ہوئے ـــــ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کو یہ کامیابی آسانی سے نہیں ملی تھی' اس کے لیے ان لوگوں کو تین سو سال تک جاں گداز جدّوجہد کرنی پڑی اور بڑی بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ (اس کے مقابل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کی ابتلاء و آزمائش کا دورانیہ چند سال کے عرصے میں سمٹ گیا تھا۔) بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جتنے طویل عرصے تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں نے مخالفین کی طرف سے تکلیفیں اور سختیاں برداشت کی ہیں اس کی کوئی مثال کسی اور نبیؑ یا رسولؑ کے پیروکاروں میں نہیں ملتی۔ قرآن مجید میں ان کی آزمائشوں اور قربانیوں کا ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً سورۂ یٰسین کے آغاز میں جن تین رسولوں کا ذکر آیا ہے ان کے بارے میں زیادہ تر مفسرین کی رائے یہی ہے کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں میں سے تھے۔ یعنی وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے فرستادہ (رسولؑ کے رسول) تھے۔ اسی طرح سورۃ البروج میں جن اہلِ ایمان کا واقعہ بیان ہوا ہے وہ بھی عیسائی تھے اور انہیں بادشاہِ وقت 'ابونواس' نے خندقوں میں ڈال کر زندہ جلا دیا تھا۔ پھر اصحاب الکہف جو رومی بادشاہ کے تشدد کے خوف سے غار میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے وہ بھی عیسائی تھے۔ بہرحال حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروکاروں کی تین صدیوں پر محیط لازوال قربانیوں کے بعد بالآخر ۳۰۰ عیسوی میں رومی سلطنت نے عیسائیت قبول کر لی۔ آیت میں اسی غلبے کا ذکر ہے۔

اس کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروکار جب گمراہ ہونے پر آئے تو انہوں نے شرک بھی بدترین ایجاد کیا۔ یعنی انہوں نے اپنے پیغمبر کو بربنائے عقیدت اللہ کا صُلبی بیٹا بنا ڈالا (نعوذ باللہ)۔ اس ضمن میں آج ہمیں بھی اپنا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں بھی بعض نعت خواں حضرات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عقیدت اور عشق و محبت کے نام پر اتنا غلو کرتے ہیں کہ آپؐ کو اللہ کے برابر بٹھانے سے کم پر ان کی تسلی ہی نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ ایسے لوگوں نے ہندوؤں کی دیکھا دیکھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ''اوتار'' کا عقیدہ بھی گھڑ لیا ہے۔ عبرت کے لیے ملاحظہ ہوں یہ اشعار: ؎

وہی جو مستویٔ عرش تھا خدا ہو کر — اُتر پڑا وہ مدینے میں مصطفیٰ ہو کر!

اور: ؎

مدینے کی مسجد میں منبر کے اوپر — بغیر عین کا اِک عرب ہم نے دیکھا!

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ﴾ (النساء:۱۷۱) کہ اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم صرف یہود و نصاریٰ کے لیے ہی نہیں تھا' ہمارے لیے بھی ہے۔ لیکن افسوس کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے احکام کو بھی درخورِ اعتناء نہیں سمجھا اور ہر اُس گناہ اور جرم میں بے دھڑک اپنا حصہ ڈالنے کی کوشش کی جس کا ارتکاب کر کے پچھلی اُمتیں راندۂ درگاہ ہوئی تھیں۔ سوائے اس کے کہ قرآن کے متن میں ہم تحریف نہیں کر سکے اور وہ بھی اس لیے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی تحفظ حاصل ہے۔ ورنہ اگر ممکن ہوتا تو اس میدان میں بھی ہم کسی سے پیچھے نہ رہتے۔

سُوْرَةُ الْجُمُعَةِ

تمہیدی کلمات

سورۃ الصف اور سورۃ الجمعہ کا آپس میں جوڑے اور زوجیت کا تعلق بہت نمایاں ہے‘ اس لیے کہ یہ دونوں سورتیں نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے دو پہلوؤں سے بحث کرتی ہیں۔ ان دونوں سورتوں کے مضامین کی تقسیم اس طرح ہے کہ سورۃ الصف میں انقلاب کے تکمیلی منہاج (مرحلہ تصادم)‘ جبکہ سورۃ الجمعہ میں اساسی منہاج (مرحلہ تیاری) کا ذکر ہے۔ سورۃ الصف کا مرکزی مضمون نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت ہے‘ جبکہ سورۃ الجمعہ کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ اس مقصدِ بعثت کے حصول اور اس عظیم مشن کی تکمیل کے لیے آپ ﷺ کا بنیادی طریق کار کون سا تھا۔ اپنے مضمون کے اعتبار سے سورۃ الجمعہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلی چار آیات میں قرآن کے ذریعے دعوت و تبلیغ اور مردانِ کار کی تیاری کا ذکر ہے۔ اس کے بعد چار آیات میں بنی اسرائیل کے تذکرے کے پردے میں ہمارے لیے عبرت کا سامان فراہم کیا گیا ہے‘ جبکہ آخری تین آیات میں نمازِ جمعہ کا فلسفہ زیر بحث آیا ہے۔

آیات ۱ تا ۴

سُوْرَةُ الْجُمُعَةِ مَدَنِيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۱۱ | رُكُوْعَاتُهَا: ۲

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝۱ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۲ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۳ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۴

آیت ۱ ﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝۱﴾ ”تسبیح کرتی ہے اللہ کی ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے‘ جو بادشاہ ہے‘ (ہر عیب سے) پاک ہے‘ بہت زبردست ہے‘ بہت حکمت والا ہے۔“

یہ آیت گویا اس سورۂ مبارکہ کے لیے ایک نہایت پُرشکوہ اور پُرجلال تمہید اور آغازِ کلام ہے۔ سورۃ الصف کے آغاز میں تسبیح باری تعالیٰ کا ذکر صیغہ ماضی میں تھا‘ جبکہ یہاں فعل مضارع آیا ہے۔ اس طرح تسبیح باری تعالیٰ کے ضمن میں گویا زمان و مکان کا احاطہ

کرلیا گیا ہے۔ اس آیۂ مبارکہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حُسنیٰ میں سے چار اسماء وارد ہوئے ہیں اور یہ ایک غیر معمولی بات ہے' اس لیے کہ عام طور پر آیات کے اختتام پر اسماءِ باری تعالیٰ دو دو کے جوڑوں کی صورت میں آتے ہیں۔

آیت ۲ ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ ''وہی تو ہے جس نے اٹھایا اُمّیین میں ایک رسول ان ہی میں سے' جو ان کو پڑھ کر سناتا ہے اُس کی آیات اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں تعلیم دیتا ہے کتاب وحکمت کی۔''

﴿وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝۲﴾ ''اور یقیناً اس سے پہلے تو وہ کھلی گمراہی میں تھے۔''

اس سورت کی یہ آیت انقلابِ نبویؐ کے اساسی منہاج کے حوالے سے اسی طرح اہم ہے جس طرح سورۃ الصف کی آیت ۹ تکمیلی منہاج کے اعتبار سے اہم ہے۔ سورۃ الصف کی مذکورہ آیت میں حضور ﷺ کا مقصدِ بعثت بیان ہوا ہے تو آیت زیر مطالعہ میں آپؐ کے فرائضِ منصبی کا ذکر ہے۔ سورۃ الصف کی وہ آیت اپنی اہمیت کی وجہ سے قرآن مجید میں تین مرتبہ (سورۃ الصف کے علاوہ سورۃ التوبہ' آیت ۳۳ اور سورۃ الفتح' آیت ۲۸ کے طور پر) آئی ہے' تو اس آیت میں مذکور ''انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج'' قرآن حکیم میں چار مرتبہ (سورۃ الجمعہ کی اس آیت کے علاوہ سورۃ البقرۃ کی آیات ۱۲۹' ۱۵۱ اور سورۂ آل عمران کی آیت ۱۶۴ میں) بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ کے اساسی منہج کے عناصرِ اربعہ بیان کیے گئے ہیں: (۱) تلاوتِ آیات (۲) تزکیہ (۳) تعلیمِ کتاب (۴) تعلیمِ حکمت۔

اس آیت کی بنیادی اہمیت یہ ہے کہ اس میں مطلوبہ انقلاب کی تیاری اور اس کے لیے مردانِ کار کی فراہمی کا مکمل طریقہ اور نصاب بیان کر دیا گیا ہے کہ ان کی تعلیم' تربیت' تذکیر' ان کا تزکیہ' ان کا انذار سب کچھ قرآن کریم کے ذریعے سے ہوگا۔ حضور ﷺ نے لوگوں کو قرآن مجید سنانا شروع کیا تو سلیم الفطرت لوگ قرآن کی مقناطیسی تاثیر کی وجہ سے اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس کی طرف کھنچے چلے آئے۔ کسی نے فوراً ہی لبیک کہہ دیا' کوئی قدرے تامل کے بعد راغب ہوا اور کسی نے نسبتاً زیادہ دیر بعد فیصلہ کیا۔ چنانچہ جس طرح دودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے بالکل اسی طرح مکّہ کی آبادی کو بارہ سال کے عرصے میں آیاتِ قرآن کی تلاوت کے ذریعے سے بار بار جھنجھوڑ کر تمام سلیم الفطرت (زندہ ارواح کے حامل) افراد کو چھانٹ کر الگ کر لیا گیا۔ پھر ان منتخب افراد کا تزکیہ بھی قرآن مجید کی تلاوت سے ہی ہوا۔ قرآن مجید بلاشبہ ﴿شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ﴾ (یونس:۵۷) ہے۔ جیسے جیسے یہ کلام ان لوگوں کے سینوں میں اترتا گیا دلوں کی بیماریاں دور ہوتی چلی گئیں۔ یہاں پر یہ اہم نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ دل کی بیماریاں تو بے شمار ہیں لیکن ان تمام بیماریوں کو اگر کوئی ایک نام یا کوئی ایک عنوان دیا جائے تو وہ ''حُبِّ دُنیا'' ہے۔ حُبِّ دُنیا کی گندگی جب کسی دل کے اندر ڈیرہ جما لیتی ہے تو اس کے تعفن سے نت نئی بیماریاں جنم لیتی چلی جاتی ہیں' جبکہ خود حُبِّ دنیا کے جراثیم کو غذا انسان کی سوچ اور اُس کے نظریے سے ملتی ہے۔ ظاہر ہے انسان کی زندگی کا انداز اور اس کی دوڑ دھوپ کا رخ اس کا نظریہ متعین کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی تعلیم کے ذریعے ان لوگوں کے نظریات درست ہو گئے تو حُبِّ دنیا سمیت تمام باطنی بیماریوں کی گویا جڑ کٹ گئی اور بُرے اعمال و خصائل ان کی شخصیات سے ایسے غائب ہو گئے جیسے موسم خزاں میں درختوں سے پتے جھڑ جاتے ہیں۔

یہاں ضمنی طور پر یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ اس آیت میں حضور ﷺ کے جن فرائضِ منصبی کا ذکر ہوا ہے ان میں ''تعلیمِ حکمت'' کا تعلق

عام لوگوں سے نہیں ہے' بلکہ یہ حضور ﷺ کی تعلیم و تربیت کا شعبہ تخصص (area of specialization) ہے۔ ہر کوئی اس میدان کا شہسوار نہیں بن سکتا۔ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ﴾ (البقرۃ:۲۶۹) ''وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے' اور جسے حکمت دے دی گئی اُسے تو خیرِ کثیر عطا ہو گیا'' —— بہرحال یہ آیت ہم پر یہ حقیقت واضح کرتی ہے کہ حضور ﷺ کے منہجِ انقلاب میں آلۂ دعوت اور آلۂ انقلاب قرآن مجید ہے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو دعوت بھی قرآن کے ذریعے دی' اُن کی تذکیر و تبشیر کے لیے بھی قرآن پر ہی انحصار کیا۔ پھر اس دعوت پر لبیک کہنے والوں کا تزکیہ بھی قرآن سے ہی ہوا اور ان کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ بھی قرآن ہی بنا۔ آپ ﷺ نے قرآن کی بنیاد پر ۲۳ سال کے مختصر عرصے میں انسانی تاریخ کا عظیم ترین انقلاب برپا کر کے جزیرہ نمائے عرب میں اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نظامِ عدل و قسط کو بالفعل نافذ کر دیا۔ اس کے بعد پوری دنیا میں دین کو غالب کرنے کا مشن اُمت کے سپرد کر کے آپ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ یہ مشن منتقل کرتے ہوئے بھی حضور ﷺ نے اُمت کو جو وصیت کی تھی وہ بھی قرآن کے بارے میں تھی۔ آپ نے فرمایا: ((قَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدَهُ إِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهِ : كِتَابَ اللّٰهِ))(۱) ''میں تمہارے درمیان وہ شے چھوڑے جا رہا ہوں کہ جسے تم مضبوطی سے تھام لو گے تو ہرگز گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ ہے اللہ کی کتاب!''

چنانچہ آج ہمارے لیے بلکہ تا قیامِ قیامت ہر زمانے کے مسلمانوں کے لیے قرآن مجید گویا محمد رسول اللہ ﷺ کے قائم مقام ہے۔ اس حیثیت میں یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا سے کئی گنا بڑا معجزہ ہے۔ عصائے موسیٰؑ تو صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں معجزہ تھا' آپؑ کے بعد تو وہ معجزہ نہیں رہا۔ اگر آج بھی وہ کہیں موجود ہے' جیسا کہ یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے پاس محفوظ ہے' تو اس کی حیثیت بس ایک لاٹھی کی سی ہے۔ اس کے برعکس حضور ﷺ کا معجزۂ رسالت یعنی قرآن مجید قیامت تک کے لیے معجزہ ہے اور ہر اُس شخص کے لیے معجزہ ہے جو اس کا حق پہچانے اور ادا کرے۔ اس حوالے سے میرا ایمان تو حق الیقین کی حد تک ہے کہ اگر کوئی شخص خلوص و اخلاص کے ساتھ قرآن مجید میں ایسی ''محنت'' کرے کہ قرآن اس کو possess کر لے تو پھر اُسے دنیا کی ہر چیز بے وقعت نظر آئے گی اور قرآن کے علاوہ کسی اور چیز میں اس کا دل نہیں لگے گا۔ لیکن مقامِ افسوس ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی نعمت کو بالکل ہی پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ ہم دنیا بھر کے علوم سیکھتے ہیں مگر اس قدر عربی نہیں سیکھ سکتے جس سے قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھا جا سکے۔ اس لیے کہ یہ نہ تو ہماری ترجیح ہے اور نہ ہی اس کے لیے ہمارے پاس وقت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام کو نظر انداز کرنے کا ہمارا یہ انداز حیرت انگیز حد تک جسارت آمیز ہے۔ اس حوالے سے ذرا قرآن کی یہ وعید بھی سنیے: ﴿اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ۝ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ۝﴾ (الواقعۃ) کہ اے اللہ کے بندو! ذرا سوچو تو! کیا تم اس عظیم الشان کلام کے بارے میں مداہنت کرتے ہو؟ اور کیا اس کی تکذیب کو تم نے اپنا وطیرہ بنا لیا ہے؟

قرآن مجید تو ظاہر ہے ہر زمانے کے لوگوں کے لیے ہے۔ یہ آیات اپنے نزول کے وقت تو مشرکینِ مکہ سے مخاطب تھیں' جبکہ آج ان کے مخاطب ہم ہیں۔ وہ لوگ تو نظریاتی طور پر قرآن مجید کو اللہ کا کلام نہیں مانتے تھے اور اپنی زبانوں سے اس کی تکذیب کرتے تھے' جبکہ آج ہم اپنی زبانوں سے اس کے کلام اللہ ہونے کی تصدیق کرنے کے بعد اپنے عمل سے اس کی تکذیب کر رہے ہیں۔ مقامِ

۱۔ صحیح مسلم' کتاب الحج' باب حجة النبی ﷺ۔ وسنن ابی داود' کتاب المناسک' باب صفة حجة النبی ﷺ۔

عبرت ہے! قرآن مجید کی طرف تو پلٹ کر دیکھنے کے لیے بھی ہمارے پاس وقت نہیں جبکہ دنیا کے حقیر مفادات کے لیے ہم دن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔ کیا ہمیں اسی لیے پیدا کیا گیا تھا؟ یہی سوال تھا جس نے ابراہیم بن ادھمؒ کی زندگی بدل دی تھی۔ ابراہیم بن ادھمؒ بادشاہ کی حیثیت سے غفلت اور عیش وعشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایک دن شکار کھیلنے میں مصروف تھے کہ انہوں نے ایک آواز سنی: یَا اِبْرَاهِیْمُ اَلِهٰذَا خُلِقْتَ اَمْ لِهٰذَا اُمِرْتَ؟ کہ اے ابراہیم ذرا سوچو! کیا تمہیں اسی کام کے لیے پیدا کیا گیا تھا؟ اور کیا تمہیں اسی کام کا حکم ہوا تھا؟ اللہ جانے یہ کسی فرشتے کی آواز تھی یا اُن کے اپنے دل کی صدا۔ بہرحال جو بھی صورتِ حال تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بات ان کے دل میں گھر کر گئی اور ان کی زندگی کی کایا پلٹ گئی۔

آیت ۳ ﴿وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ﴾ ''اور ان ہی میں سے ان دوسرے لوگوں میں بھی جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے۔''

﴿وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝۳﴾ ''اور وہ بہت زبردست ہے' کمال حکمت والا ہے۔''

وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ کا عطف اُمِّیّٖنَ پر ہے۔ یعنی دوسرے کچھ اور بھی ہیں جن کی طرف آپؐ کو مبعوث فرمایا گیا۔ حضور ﷺ کی بعثت تو قیامت تک کے لیے ہے۔ ظاہر ہے آپؐ کی اُمت میں ہر نسل' ہر ملک اور ہر قوم کے لوگ شامل ہوں گے۔ متفق علیہ احادیث کے مطابق حضور ﷺ سے جب اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؐ نے اپنا دست مبارک حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے کندھے پر رکھ کر فرمایا کہ ''یہ اور اس کی قوم کے لوگ''۔ مزید فرمایا کہ دین اگر ثریا پر بھی ہوگا تو اس کی قوم کا ایک شخص اس تک پہنچ جائے گا۔ حضور ﷺ کے اس فرمان کے بارے میں تمام حنفی علماء متفق ہیں کہ اس کے مصداق حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ہیں' جو ایرانی النسل ہیں۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ ایرانی قوم بحیثیت مجموعی بہت ذہین ہے۔ اس قوم نے ایک سے بڑھ کر ایک فلاسفر پیدا کیا ہے' بلکہ ہمارے علمائے کلام تو سب کے سب ایرانی ہیں۔ اس حوالے سے ایرانی قوم کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یوں لگتا ہے جیسے فلسفہ اور منطق ان کی گھٹی میں شامل ہے۔ ماضی میں یونان اور ہندوستان کے ساتھ ساتھ ایران بھی فلسفہ و منطق کے ایک اہم مرکز کے طور پر جانا جاتا تھا۔ بعد میں جرمن قوم نے بھی اس میدان میں نام پیدا کیا۔ یہ سب اقوام حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے حضرت حام کی نسل سے ہیں۔ اس ضمن میں میری تحقیق یہ ہے کہ حضرت سام کی نسل کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے لیے چُن لیا تھا' جبکہ حضرت حام کی نسل کو حکمت میں برگزیدہ کیا تھا۔

میں نے آیت زیر مطالعہ کو ایٹم (atom) اور اس کے مرکزہ (nucleus) کے گرد مختلف دائروں میں گھومنے والے الیکٹرانز کی مثال سے سمجھا ہے۔ اس مثال کے مطابق اُمتِ مُسلمہ کا مرکزہ (nucleus) ''اُمّیّٖن'' پر مشتمل ہے۔ یعنی بنو اسماعیل اور حضور ﷺ کے زمانے کے تمام اہلِ عرب جو اُس وقت آپؐ کے براہِ راست مخاطب تھے۔ اس کے بعد نیوکلیس کے گرد پہلا دائرہ ایرانیوں کے الیکٹرانز سے بنا۔ پھر رومی' قبطی' سندھی' ہندی وغیرہ اقوام کے الیکٹرانز کے دائرے بنے اور پھیلتے گئے۔ یہ دائرے ظاہر ہے قیامت تک مزید بھی پھیلیں گے لیکن اُمّیّٖن (نیوکلیس) کے علاوہ باقی تمام اقوام کا شمار ''آخرین'' میں ہوگا۔ حضور ﷺ کی دعوت کے حوالے سے ''اُمّیّٖن'' اور ''آخرین'' میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اُمّیّٖن پر وہی قانون لاگو ہوا جو سابقہ رسولوں کی اقوام پر ہوا تھا۔ یعنی اِتمامِ حُجّت کے بعد بھی جو لوگ ایمان نہ لائیں انہیں نیست و نابود کر دیا جائے۔ چنانچہ حضور ﷺ کی طرف سے اِتمامِ حُجّت ہو جانے

کے بعد ''اُمّیین'' کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی گئی۔ ۹ ہجری میں ان کو ایک اعلانِ عام (سورۃ التوبہ' رکوع اوّل) کے ذریعے متنبہ کر دیا گیا کہ چار ماہ کے اندر اندر ایمان لے آؤ ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔ اس کے برعکس ''آخرین'' پر مذکورہ قانون کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ان میں سے کوئی اسلام کی دعوت کو مانے یا نہ مانے' ایمان لائے یا نہ لائے' اُسے اختیار ہے۔ حتیٰ کہ اسلام کے مکمل غلبے کی صورت میں بھی کسی سے اس کے مذہب کے بارے میں تعرض نہیں ہوگا۔ البتہ ملک کا نظام اللہ کے قانون کے مطابق چلایا جائے گا' اس پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہوگا۔

آیت ۴ ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ ''یہ اللہ کا فضل ہے وہ دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۴﴾ ''اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے فضل کے بہت سے درجات ہیں اور ان میں سب سے اونچا اور اعلیٰ درجہ پوری کائنات میں محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے مختص ہے: ﴿اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ۝۸۷﴾ (بنی اسرائیل) ''اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس کا فضل آپؐ پر بہت بڑا ہے''۔ حضور ﷺ کے بعد ہر اُس شخص پر بھی اللہ کا بہت بڑا فضل ہے جو حضور ﷺ کے دامن سے وابستہ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہمیں اس نے اپنا یہ فضل پیدائشی طور پر عطا فرما دیا اور ہمیں ایسے گھروں میں پیدا کیا جہاں پیدا ہوتے ہی ہم نے اپنے کانوں میں اذان اور اقامت کی آوازیں سنیں۔ سورۃ الحجرات میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ﴾ (آیت ۱۷) کہ تم پر یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اُس نے تمہیں ایمان کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ اب اگر ہم اپنے رویے سے اللہ کے اس فضل اور احسان کی ناقدری کریں اور اللہ کی نافرمانی کے راستے پر چل کر راندۂ درگاہ ہو جائیں تو ہم سے بڑا بدنصیب کون ہوگا!

اس حوالے سے ایک اہم نکتہ یہ بھی سمجھنے کا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل کا تعلق دنیوی آسائش و آرام اور مال و دولت سے نہیں ہے۔ اس ضمن میں خود حضور ﷺ کی مثال ہی لے لیجیے۔ دُنیوی لحاظ سے تو آپؐ کو بہت سی محرومیوں کا سامنا تھا۔ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے یتیم پیدا کیا۔ آپؐ کی پیدائش کے وقت گھر کی مالی حالت ایسی تھی کہ کوئی دایہ آپؐ کی پرورش کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا نے بھی آپؐ کو صرف اس لیے قبول کیا کہ انہیں کوئی اور بچہ ملا نہیں تھا۔ اس کے بعد آپؐ کے لڑکپن اور جوانی کا دور بھی سخت مشقت اور مزدوری میں گزرا۔ آپؐ خود فرماتے ہیں کہ میں چند ٹکوں کے عوض قریش کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ متعلقہ حدیث میں درہم یا دینار کا ذکر نہیں بلکہ ''قراریط'' کا لفظ آیا ہے جو یومیہ کاری کے لیے استعمال ہوتا تھا' یعنی چند ٹکے یا پیسے۔ آپؐ کی اس دور کی زندگی کی جھلک سورۃ الضحیٰ کی ان آیات میں بھی نظر آتی ہے:

﴿اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝۶ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۷ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝۸﴾

''کیا اُس نے آپ کو یتیم نہیں پایا پھر آپ کو ٹھکانہ دیا! اور آپ کو تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو راہ دکھائی! اور آپ کو نادار پایا تو مال دار کر دیا!''

اس کے بعد دورِ نبوت میں بھی آپؐ کی زندگی مسلسل فقر و فاقہ اور مصائب و مشکلات میں گزری۔ آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے۔ آپؐ کو شاعر اور مجنون کہا گیا' اوباش اور آوارہ لڑکوں نے پتھراؤ کر کے آپؐ کو لہولہان کر دیا۔ غرض آپؐ کی دنیوی زندگی مجموعی طور پر سخت مشکلات اور مشقت میں گزری۔ جبکہ دوسری طرف آپؐ کی شان یہ ہے کہ پوری کائنات میں اللہ کا سب سے بڑا فضل آپؐ

پر ہے۔ چنانچہ اللہ کے فضل کے اپنے انداز اور اپنے پیمانے ہیں۔ دنیوی ناز و نعم، عیش و عشرت، عزت و شہرت وغیرہ کو اس کا معیار نہیں سمجھنا چاہیے۔

یہاں پر سورۃ کی پہلی چار آیات کا مطالعہ مکمل ہو گیا ہے۔ ان آیات میں حضور ﷺ کی بعثت کے حوالے سے آپؐ کے فرائضِ منصبی کا ذکر ہے اور اس اُمت کی ''آفاقی'' حیثیت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یعنی سابقہ اُمتِ مُسلمہ (بنی اسرائیل) یک نسلی (uni racial) اُمت تھی، جبکہ موجودہ اُمتِ مُسلمہ ملٹی نیشنل اُمت ہے، جس میں عربی، فارسی، ہندی، چینی وغیرہ ہر قوم اور ہر نسل کے لوگ شامل ہیں، بلکہ اس وقت دنیا میں شاید ہی ایسی کوئی قوم یا نسل موجود ہو جس کے افراد اس امت میں شامل نہ ہوں۔ ان آیات میں دوسری بات یہ واضح کی گئی ہے کہ حضور ﷺ کا آلۂ دعوت اور آلۂ تربیت صرف اور صرف قرآن تھا۔ اسی سے آپؐ نے لوگوں کو اکٹھا کیا اور اسی سے انہیں انقلابی جدّ و جُہد اور جہاد و قتال کے لیے تیار کیا۔

اب اگلی چار آیات میں بنی اسرائیل کی مثال کا آئینہ دکھا کر ہمیں ہمارے مجموعی طرزِ عمل سے آگاہ کیا جا رہا ہے:

آیات ۵ تا ۸

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ ع

آیت ۵ ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ﴾ ''مثال اُن لوگوں کی جو حاملِ تورات بنائے گئے، پھر وہ اس کے حامل ثابت نہ ہوئے، اُس گدھے کی سی (مثال) ہے جو اٹھائے ہوئے ہو کتابوں کا بوجھ۔''

جب وہ لوگ حاملِ تورات ہو کر بھی تورات سے بے گانہ رہے تو ان میں اور اس گدھے میں کیا فرق رہ گیا جو اپنی پیٹھ پر کتابوں کا بوجھ اٹھائے پھر رہا ہے۔ ظاہر ہے ایک گدھے پر آپ مکالماتِ افلاطون لاد دیں یا انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کی تمام جلدیں رکھ دیں، اس سے اس کے اندر نہ تو کوئی فلسفیانہ بصیرت پیدا ہو گی اور نہ ہی اس کے دماغ میں کوئی معلومات منتقل ہو سکیں گی —— آیت کے اس حصے میں لفظ حمل مختلف صیغوں میں تین مرتبہ آیا ہے۔ حمل ایسے بوجھ کو کہا جاتا ہے جسے آدمی اٹھا کر چل سکے۔ اسی معنی میں حمّال (قُلی) اس شخص کو کہا جاتا ہے جو بوجھ وغیرہ ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ لے جائے اور یہی مفہوم عورت کے حمل کا بھی ہے: ﴿حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ﴾ (لقمٰن: ۱۴) ''اس کو اٹھائے رکھا اُس کی ماں نے (اپنے پیٹ میں) کمزوری پر کمزوری جھیل کر''۔ عورت کو

یہ حمل اٹھانے میں مشقت اور تکلیف کا سامنا تو کرنا پڑتا ہے' لیکن اس کے لیے اس بوجھ کو اٹھائے پھرنا ممکن ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اِصْر (البقرۃ:۲۸۶' الاعراف:۱۵۷) ایسا بوجھ ہے جس کا اٹھانا انسان کے لیے ممکن نہ ہو اور وہ اس کے نیچے دب کر رہ جائے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ جس قوم کو اپنی کتاب عطا کرتا ہے اُس قوم پر اُس کتاب کے حقوق کا بوجھ بھی ڈالتا ہے۔ ان حقوق میں کتاب پر ایمان لانے' اس کے احکام پر عمل کرنے اور اس کی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت کی ذمہ داری کا بوجھ بھی شامل ہے: ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۡ﴾ (آل عمران:۱۸۷) ''اور یاد کرو جبکہ اللہ نے ان لوگوں سے ایک قول و قرار لیا تھا جن کو کتاب دی گئی تھی کہ تم لازماً اُسے لوگوں کے سامنے واضح کرو گے اور اسے چھپاؤ گے نہیں''۔ یہ میثاق اہل تورات سے لیا گیا تھا جبکہ قرآن مجید میں اہلِ کتاب سے متعلق ایسے واقعات اور ایسی مثالوں کا ذکر ہمیں خبردار کرنے کے لیے آیا ہے کہ اے اہلِ قرآن تمہیں بھی اپنی کتاب کے حقوق کما حقہٗ ادا کرنے ہیں اور اس کی تعلیمات کو لوگوں کے لیے عام کرنا ہے۔ ورنہ کتابوں کا بوجھ اٹھانے والے گدھے کی مثال کا اطلاق تم پر بھی ہوگا۔ اس حوالے سے حضرت عبیدہ المُلَیکی رضی اللہ عنہ کا روایت کردہ حضور ﷺ کا یہ فرمان بہت اہم ہے:

((يَا اَهْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ ' وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ مِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ' وَافْشُوْهُ وَتَغَنَّوْهُ وَتَدَبَّرُوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ))[۲]

''اے قرآن والو! تم قرآن کو تکیہ (ذہنی سہارا) نہ بنا لینا' بلکہ تمہیں چاہیے کہ رات اور دن کے اوقات میں اس کی تلاوت کیا کرو جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے' اور اس کو پھیلاؤ' اور اس کو خوش الحانی سے پڑھو' اور اس میں تدبر کرو' تاکہ تم فلاح پا جاؤ''۔

مقامِ عبرت ہے! آج ہم قرآن مجید کے حقوق ادا کرنے کے لیے تو غور کرنے کو بھی تیار نہیں' لیکن اس کو تکیہ بنانے کے نت نئے طریقے ایجاد کرنے میں ہم بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ اس کی زندہ مثال ایوبی دور کی یادگار' سونے کی تاروں سے لکھا ہوا چالیس مَن وزنی قرآن مجید کا وہ نسخہ ہے جسے ہم نے پچھلے پچاس سال سے لاہور میں نمائش کے لیے رکھا ہوا ہے۔

﴿بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''بہت بُری مثال ہے اُس قوم کی جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا۔''

یہ یہودیوں کی طرف سے کلام اللہ کی عملی یا حالی تکذیب کا ذکر ہے۔ قبل ازیں سورۃ الواقعہ کی آیت ۸۲ کے حوالے سے وضاحت کی جا چکی ہے کہ بالکل اسی طور سے ہم بھی قرآن مجید کو جھٹلا رہے ہیں۔ ظاہر ہے اپنی زبان سے نہ تو یہودی تورات کی تکذیب کرتے تھے اور نہ ہی ہم قرآن کے بارے میں ایسا سوچ سکتے ہیں۔ لیکن کیا ہم واقعی قرآن مجید کی عملی یا حالی تکذیب کے مرتکب ہو رہے ہیں؟ اس سوال کا جواب جاننے کے لیے ایک ایسے تعلیم یافتہ نوجوان کا تصور کریں جو مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے پاکستان سے امریکہ گیا ہے۔ اُس نوجوان سے اگر پوچھا جائے کہ کیا قرآن مجید اللہ کا کلام ہے تو وہ کہے گا کیوں نہیں! مَیں مانتا ہوں کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ لیکن اگر اس سے دوسرا سوال یہ کیا جائے کہ آپ نے اس کو کتنا پڑھا ہے اور اس کی تعلیمات کو جاننے اور سمجھنے کے لیے آپ نے کس قدر محنت کی ہے تو وہ (اِلّا ماشاء اللہ) یہی جواب دے گا کہ مجھے اس کا موقع نہیں ملا۔ تو کیا اس نوجوان کا یہ عمل

۲۔ رواہ البیھقی فی شعب الایمان' بحوالہ مشکاۃ المصابیح' کتاب فضائل القرآن' باب آداب التلاوۃ و دروس القرآن۔

قرآن مجید کی تکذیب نہیں کر رہا ہے؟ کیا اس کا حال چیخ چیخ کر گواہی نہیں دے رہا کہ اس کے نزدیک اس کی وہ ڈگری قرآن مجید سے زیادہ اہم ہے' جس کے لیے وہ سات سمندر پار جا کر دیارِ غیر کی خاک چھان رہا ہے' لیکن قرآن مجید کو سمجھنے کی کبھی اس نے ہلکی سی کوشش بھی نہیں کی۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۵﴾ ''اور اللہ ایسے ظالموں کو (زبردستی) ہدایت نہیں دیتا۔''

اللہ تعالیٰ کی ہدایت' معاذ اللہ' کوئی ایسی حقیر شے نہیں جسے ہر شخص کی جھولی میں زبردستی ڈال دیا جائے۔ یہ تو صرف اُسی شخص کو ملے گی جس کے دل میں اس کے حصول کی تمنا ہوگی اور جو اس کے حصول کے لیے تگ و دو کرے گا۔

آیت ۶ ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ اے وہ لوگو جو یہودی ہو گئے ہو' اگر تمہیں واقعی یہ گمان ہے کہ بس تم ہی اللہ کے دوست ہو باقی سب لوگوں کو چھوڑ کر''

زعم کا لفظ ''خیالِ خام'' کے معنی میں ہم اردو میں بھی استعمال کرتے ہیں کہ فلاں شخص کو فلاں چیز کا بڑا زعم ہے۔ تو اگر تم لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے چہیتے اور محبوب ہونے کا ایسا ہی زعم ہے:

﴿فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۶﴾ ''تو تم موت کی تمنا کرو اگر تم واقعی سچے ہو۔''

اگر تم واقعی اللہ کے محبوب اور دوست ہو تو تمہیں اپنے دوست سے وصل کی تمنا ہونی چاہیے' اور یہ تمنا چونکہ موت کے ذریعے پوری ہو سکتی ہے اس لیے تمہارے دلوں میں ہر وقت موت کی خواہش موجزن رہنی چاہیے۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ البقرۃ (آیات ۹۴' ۹۵' ۹۶) میں بھی آ چکا ہے۔

آیت ۷ ﴿وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ﴾ ''اور (حقیقت یہ ہے کہ) یہ لوگ ہرگز کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے اپنے ان اعمال کے سبب جو ان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں۔''

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝۷﴾ ''اور اللہ ان ظالموں سے خوب واقف ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰي نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝۱۴﴾ (القیامۃ) کے مصداق یہ لوگ اپنے کرتوتوں کو خوب جانتے ہیں۔ اس لیے یہ نہیں چاہتے کہ انہیں موت آئے اور وہ اپنی بداعمالیوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہوں۔

ہم مسلمانوں کے لیے بنی اسرائیل سے متعلق ان آیات کی حیثیت ایک آئینے کی سی ہے۔ اس آئینے میں اگر ہم اپنی تصویر دیکھیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ یہ زعم صرف بنی اسرائیل میں ہی نہیں پایا جاتا تھا بلکہ آج ہم مسلمانوں کی اکثریت بھی اسی سوچ کی حامل ہے' اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب اللہ کی کتاب سے ہمارا ذہنی و قلبی رشتہ نہ رہا تو اپنی تسلی کے لیے ہمیں خود ساختہ خوش فہمیوں (wishful thinkings) کا سہارا لینا پڑا۔ ان میں سب سے بڑی اور سب سے مؤثر خوش فہمی تو یہی ہے کہ ہمارے پاس اللہ کی کتاب ہے' ہم اللہ کے محبوب ترین نبی حضرت محمد ﷺ کی اُمت ہیں اور اس رشتے سے اللہ کے بہت ہی لاڈلے اور چہیتے ہیں۔ چنانچہ ہم جیسے بھی گناہگار سہی' آخرت میں ہمارے نبیؐ یقیناً ہماری شفاعت کریں گے اور دوزخ سے ہماری خلاصی کو یقینی بنائیں گے۔

اگر خدانخواستہ ہم میں سے کوئی فرد کسی بڑے جرم میں پکڑا بھی گیا تو اسے بھی بہت جلد دوزخ سے نکال کر جنت میں پہنچا دیا جائے گا۔ ہمارے ہاں یہ خوش فہمیاں پختہ ہو کر باقاعدہ عقائد کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ اب ایسی ضمانتوں کے ہوتے ہوئے بھلا کون احمق ہوگا جو نیک اعمال کے لیے مشقتیں اٹھائے اور رشوت' چور بازاری اور دوسری حرام کاریوں سے اجتناب کرتا پھرے: ؎

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا' خدا فریبی کہ خود فریبی؟ عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ!

اقبال کا یہ شعر اس حوالے سے آج ہم پر ہو بہو صادق آتا ہے۔ پہلے تو ''مسلمان'' کے پاس عمل سے بچنے کے لیے صرف تقدیر کا بہانہ تھا' اب ہم نے مذکورہ بالا عقائد کی صورت میں بہت مضبوط سہارا بھی تلاش کر لیا ہے۔

آیت ۸ ﴿قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو وہ تم سے ملاقات کر کے رہے گی''

﴿ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ ''پھر تمہیں لوٹا دیا جائے گا اُس ہستی کی طرف جو پوشیدہ اور ظاہر سب کا جاننے والا ہے''

اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے' جو کچھ تمہارے سامنے ہے اس کا بھی اور جو کچھ تمہارے پیچھے ہے اس کا بھی۔ جو کچھ بحیثیت نوعِ انسانی تمہارے لیے واضح کر دیا گیا ہے اس کا بھی اور جو کچھ تم سے غیب میں رکھ دیا گیا ہے اس کا بھی۔

﴿فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۠﴾ ''پھر وہ تمہیں جتلا دے گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔''

یہاں پر چار آیات پر مشتمل سورت کے دوسرے حصے کا مطالعہ بھی مکمل ہو گیا۔ جیسا کہ قبل ازیں بھی وضاحت ہو چکی ہے کہ ان آیات میں تذکرہ تو یہود کا ہے لیکن یاددہانی ہماری مقصود ہے۔ چنانچہ ان آیات کی تلاوت کرتے ہوئے ہمیں ضرور سوچنا چاہیے کہ قیامت کے دن اگر تورات کے حقوق کے حوالے سے یہودیوں کا احتساب ہوگا تو ہم سے بھی پوچھا جائے گا کہ اللہ کے رسول ﷺ جو کتاب تم لوگوں کے حوالے کر کے گئے تھے اس کے حقوق کی ذمہ داری کو تم نے کس حد تک نبھایا؟ حضور ﷺ نے تو حجۃ الوداع کے موقع پر موجود لوگوں کو گواہ بنا کر قرآن مجید کے پیغام کو تمام نوعِ انسانی تک پہنچانے کی ذمہ داری اُمت کے کندھوں پر ڈال دی تھی۔ اس حوالے سے آپؐ نے حاضرین کو مخاطب کر کے پوچھا تھا: ((اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ)) کہ کیا میں نے تم لوگوں کو اللہ کا پیغام پہنچا دیا؟ تمام حاضرینِ مجمع نے جواب میں یک زبان ہو کر کہا تھا: اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّیْتَ وَنَصَحْتَ[۳] ''ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے حقِ تبلیغ ادا کر دیا' حقِ امانت ادا کر دیا' حقِ نصیحت ادا کر دیا''۔ بعض روایات میں حاضرین کے یہ الفاظ بھی نقل ہوئے ہیں: نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ رِسَالَاتِ رَبِّكَ ' وَنَصَحْتَ لِاُمَّتِكَ ' وَقَضَیْتَ الَّذِیْ عَلَیْكَ[۴] ''ہم گواہ ہیں کہ آپ نے اپنے رب کے پیغامات کما حقہ پہنچا دیے' اور اپنی اُمت کے لیے حقِ نعمت ادا کر دیا' اور اپنی ذمہ داری کما حقہ ادا کر دی!'' لوگوں کے اس جواب پر آپ ﷺ نے تین مرتبہ اللہ کو بھی گواہ بنایا: ((اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ ' اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ ' اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ)) کہ اے اللہ تو بھی گواہ رہ! یہ لوگ اعتراف کر رہے ہیں کہ میں نے تیرا پیغام ان تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے حاضرین سے مخاطب

۳۔ صحیح مسلم' کتاب الحج' باب حجة النبی ﷺ۔ وسنن ابی داؤد' کتاب المناسک' باب صفة حجة النبی ﷺ۔

۴۔ مستدرک حاکم: ۱/۶۴۵' صحیح ابن خزیمہ: ۱۳۹۷' صحیح ابن حبان: ۲۸۵۶۔

ہوکر فرمایا: ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ))[۵] کہ اب جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ یہ پیغام ان لوگوں تک پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ اس طرح آپؐ نے قرآن مجید کی دعوت و تبلیغ پوری نوعِ انسانی تک پہنچانے کی بھاری ذمہ داری اپنی اُمت کی طرف منتقل فرما دی۔ ظاہر ہے اس ذمہ داری کے بارے میں کل ہم سے پوچھا تو جائے گا۔

آیات ۹ تا ۱۱

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَۨا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَاۗىِٕمًا ۭ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ ع

سورت کے تیسرے اور آخری حصے میں نمازِ جمعہ کا ذکر ہے۔ نمازِ جمعہ دراصل ''حزب اللہ'' کا ہفتہ وار تعلیمی و تربیتی اجتماع ہے۔ ایسے اجتماعات کا انعقاد ہر انقلابی تحریک کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی زمانے میں کمیونسٹوں کے ہاں بھی اپنے کارکنوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ہفتہ وار ''سٹڈی سرکلز'' کا انعقاد بڑے اہتمام سے کیا جاتا تھا۔ دراصل حزب اللہ کا نصب العین بہت عظیم اور راستہ بہت کٹھن ہے۔ اس راستے پر سفر جاری رکھنے کے لیے غیر معمولی صبر اور استقامت درکار ہے۔ اس صورتِ حال کا تقاضا ہے کہ انقلابی کارکنوں کے ذہنوں میں ان کے بنیادی نظریے اور نصب العین کا شعور ہر لحظہ مستحضر رہے۔ چنانچہ جمعہ کے اجتماع کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ ہر سات دن کے بعد باقاعدگی کے ساتھ دور و نزدیک سے سب اہلِ ایمان اکٹھے ہوں اور اللہ کا کوئی بندہ نائب رسولؐ کی حیثیت سے ان کے لیے ''يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ'' کا فریضہ سرانجام دے' تاکہ تعلیم و تربیت اور تزکیۂ نفس کا عمل حضور ﷺ کے بعد بھی قیامت تک جاری و ساری رہے۔

اجتماعِ جمعہ کے اس پہلو کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کے لیے ظہر کی نماز مختصر کر دی گئی۔ یعنی ظہر کے چار فرائض کے بجائے صرف دو رکعتیں رہ گئیں اور باقی دو رکعتوں کی جگہ خطبہ یعنی ''تعلیم و تعلّم'' کو لازم کر دیا گیا۔ اس لحاظ سے اجتماعِ جمعہ کو تعلیمِ بالغاں کا ہفتہ وار پروگرام بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس پروگرام کی اہمیت پچھلے زمانے میں اور بھی زیادہ تھی' جب نہ سکول کالج تھے' نہ یونیورسٹیاں تھیں' نہ کتابیں دستیاب تھیں' نہ اخبار چھپتے تھے اور نہ ہی آڈیو ویڈیو کی سہولیات میسّر تھیں۔ برعظیم پاک و ہند میں اجتماعِ جمعہ کی تعلیمی اہمیت کا شعور ماضی قریب کے زمانہ تک بھی موجود تھا۔ مَیں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جمعہ کے دن شہر کی جامع مسجد میں دور دراز دیہات سے لوگ صبح سات آٹھ بجے ہی پہنچنا شروع ہو جاتے تھے۔ اس دور میں جمعہ صرف شہروں میں ادا کیا جاتا تھا'

۵۔ صحیح البخاری' کتاب الحج' باب خطبة ایام منی۔ و صحیح مسلم' کتاب القسامة والمحاربین والقصاص والدیات' باب تغلیظ تحریم الدماء والاعراض والاموال۔

دیہات میں جمعہ نہیں ہوتا تھا۔ جمعہ کے لیے فقہاء نے ''مصرِ جامع'' کی شرط عائد کی ہے۔ یعنی جمعہ ہر بستی میں نہیں بلکہ صرف اُس شہر میں ہوسکتا ہے جس میں بازار ہوں' قیامِ امن کا انتظام ہو' جامع مسجد ہو۔ لیکن جب ہر چھوٹی بڑی بستی میں جمعہ پڑھنا شروع کر دیا گیا تو مجموعی طور پر اجتماعِ جمعہ کی اہمیت کم ہونا شروع ہوگئی۔ ظاہر ہے جب ہر بستی میں جمعہ ہو رہا ہو تو لوگ اس کے لیے سفر کر کے شہر کی جامع مسجد میں بھلا کیوں جائیں گے؟

جمعہ کے اجتماعات تو آج بھی منعقد ہوتے ہیں' لوگ جوق در جوق ان میں شرکت بھی کرتے ہیں' خطبے بھی پڑھے اور سنے جاتے ہیں' لیکن یہ سب کچھ ایک ''رسمِ عبادت'' کے طور پر ہو رہا ہے' جبکہ اس اجتماع کا بنیادی فلسفہ اور اصل مقصد مجموعی طور پر ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ بقول اقبال: ؎

رہ گئی رسمِ اذاں' روحِ بلالیؓ نہ رہی　　فلسفہ رہ گیا' تلقینِ غزالی نہ رہی!

بہرحال آج کل اجتماعِ جمعہ کے حوالے سے جو ظاہری اہتمام دیکھنے میں آتا ہے اس کی حیثیت اس عمارت کے کھنڈرات کی سی ہے جو عرصہ دراز سے زمین بوس ہو چکی ہے' لیکن ان کھنڈرات کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ عمارت بہت عظیم الشان تھی۔

آیت ۹ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۭ﴾ ''اے ایمان والو! جب تمہیں پکارا جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن تو دوڑو اللہ کے ذکر کی طرف اور کاروبار چھوڑ دو۔''

نماز تو بہرحال اللہ کا ذکر ہے ہی' لیکن یہاں اللہ کے ذکر سے خصوصی طور پر خطبۂ جمعہ مراد ہے ـــــ ''اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو'' کا مطلب یہ نہیں کہ بھاگتے ہوئے آؤ' بلکہ اس سے مراد مستعدی سے چل کھڑے ہونا ہے' یعنی جلدی جلدی وہاں پہنچنے کی کوشش کرو۔ نماز کے لیے بھاگ کر آنے سے نبی اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

﴿ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ ''یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو۔''

آیت ۱۰ ﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ ''پھر جب نماز پوری ہو چکے تو زمین میں منتشر ہو جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔''

یعنی جمعہ کے حوالے سے اسلام میں یہودیوں کے یومِ سبت جیسی سختی نہیں ہے کہ پورا دن اللہ کی عبادت کے لیے مخصوص کر دو۔ بلکہ مسلمانوں سے اس دن صرف یہ تقاضا ہے کہ وہ نمازِ جمعہ سے قبل اپنے تمام کام کاج چھوڑ دیں۔ نہائیں دھوئیں' اچھے کپڑے پہنیں' خوشبو لگائیں اور بروقت مسجد میں پہنچ جائیں' تاکہ تعلیمی و تربیتی نشست سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔ اسی لیے نمازِ جمعہ کے لیے اوّل وقت مسجد میں آنے والے کو حدیث میں اونٹ کی قربانی کے برابر ثواب کی بشارت دی گئی ہے۔ دوسری طرف نمازِ جمعہ ترک کرنے والے کے لیے حضور ﷺ نے سخت وعید سنائی ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

((مَنْ تَرَكَ ثَلَاثَ جُمُعَاتٍ مِنْ غَيْرِ عُذْرٍ طُبِعَ عَلٰى قَلْبِهٖ))[۶]

''جو شخص بغیر کسی عذر کے مسلسل تین جمعے ترک کر دے اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔''

اس وعیدی حکم میں بھی یہی فلسفہ کارفرما ہے کہ مسلمانوں کے درمیان کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ ہو جو تعلیم و تربیت کے اس اجتماعی

۶۔ معجم الاوسط للطبرانی: ۱۶۹/۳۔

پروگرام سے مستقل طور پر کٹ کر رہ جائے۔ بہر حال جمعہ کے دن ''شرعی مصروفیت'' صرف نمازِ جمعہ کی ادائیگی تک ہی ہے' اس کے بعد ہر کوئی اپنی دنیوی مصروفیات کے لیے آزاد ہے۔ اس لیے حکومت کو بھی چاہیے کہ وہ جمعہ کے دن ''آدھی چھٹی'' قرآن مجید کے مذکورہ حکم کے مطابق کرے۔ یعنی اگر جمعہ کے دن لوگوں کو آدھی چھٹی دینا ضروری ہے تو یہ چھٹی صبح کے وقت ہونی چاہیے تاکہ لوگ آسانی سے نماز جمعہ کی تیاری کریں' نماز ادا کریں اور نماز کے بعد معمول کے مطابق اپنے کام نپٹائیں۔

﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۱۰﴾ ''اور اللہ کو یاد کرو کثرت سے تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

آیت ۱۱ ﴿وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا نِ انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا﴾ ''اور جب انہوں نے دیکھا تجارت کا معاملہ یا کوئی کھیل تماشا تو اس کی طرف چل دیے''

﴿وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا ؕ﴾ ''اور آپؐ کو کھڑا چھوڑ دیا۔''

یہ خاص طور پر منافقین کے طرزِ عمل کا ذکر ہے کہ وہ تجارت اور کھیل تماشے کو اللہ کے ذکر پر ترجیح دیتے ہیں۔

اس آیت کا شانِ نزول یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مدینہ طیبہ میں شام سے ایک تجارتی قافلہ عین نمازِ جمعہ کے وقت آیا اور اہلِ شہر کو اطلاع دینے کے لیے ڈھول بجانے شروع کر دیے۔ چونکہ قحط کا زمانہ تھا' لہٰذا حاضرینِ مسجد قافلے کی آمد کی اطلاع پا کر فوراً اس کی طرف لپکے۔ رسول اللہ ﷺ اُس وقت خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ اکثر لوگ اس دوران اٹھ کر چلے گئے اور تھوڑے لوگ باقی رہ گئے جن میں عشرۂ مبشرہ بھی شامل تھے۔ واضح رہے کہ یہ واقعہ ہجرت کے بعد بالکل قریبی دور کا ہے جبکہ لوگوں کو صحبتِ نبویؐ سے فیض یاب ہونے کا موقع بہت کم ملا تھا۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ ابتدا میں عیدین کے خطبہ کی طرح جمعہ کا خطبہ بھی نماز کے بعد ہوتا تھا' اس لیے خطبہ کے دوران اٹھ کر جانے والے لوگوں نے یہی سمجھا ہوگا کہ نماز تو پڑھی جا چکی ہے اس لیے اب اُٹھ جانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بہر حال اس آیت میں بھی ڈانٹ کا انداز ہے اور اس میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے اس سے بھی مسلمانوں کی صفوں میں اسی کمزوری کی نشاندہی ہوتی ہے جس کا ذکر قبل ازیں سورۃ الحدید کے مطالعہ کے دوران تفصیل سے کیا جا چکا ہے۔

﴿قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝۱۱﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کہیں بہتر ہے کھیل کود اور تجارت سے۔ اور اللہ بہترین رزق عطا کرنے والا ہے۔''

سُوْرَۃُ الْمُنٰفِقُوْنَ

تمہیدی کلمات

زیر مطالعہ مدنی سورتوں کے گروپ میں چوتھا جوڑا سورۃ المنافقون اور سورۃ التغابن پر مشتمل ہے۔ ان میں سورۃ المنافقون کے آغاز میں تسبیح کا ذکر نہیں ہے جبکہ سورۃ التغابن کا آغاز تسبیح سے ہو رہا ہے۔ جہاں تک ان سورتوں کے مضامین کا تعلق ہے' سورۃ المنافقون میں نفاق اور منافقین کا تذکرہ ہے' جبکہ سورۃ التغابن کا بنیادی موضوع ایمان ہے۔ جیسا کہ قبل ازیں بھی وضاحت کی جا چکی ہے' قرآن مجید کے وہ موضوعات جو طویل سورتوں میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں ان کا خلاصہ مختصر سورتوں میں دے دیا گیا ہے۔ نفاق اور ایمان کا تعلق بھی ایسے ہی موضوعات سے ہے۔ نفاق کا ذکر تمام مدنی سورتوں میں ملتا ہے' کہیں ڈھکے چھپے انداز میں اور کہیں کھلم کھلا۔ سورۃ النساء اور سورۃ التوبہ میں یہ موضوع اس لحاظ سے خصوصی طور پر نمایاں ہے۔ اسی طرح ایمان کا موضوع پورے مکی قرآن میں پھیلا ہوا ہے' بلکہ اس بحث کے خاص خاص نکات کہیں کہیں مدنی سورتوں کے اندر بھی آ گئے ہیں۔ جیسے سورۃ البقرۃ کی آیٹ الآیات (آیت ۱۶۴) اور آیت الکرسی (آیت ۲۵۵) اس موضوع پر انتہائی جامع آیات ہیں۔ اس حوالے سے زیر مطالعہ دو سورتوں کی اہمیت یہ ہے کہ ان میں قرآن مجید کے ان دو اہم موضوعات پر طویل بحثوں کا خلاصہ سمو دیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں سورتیں اپنے اپنے موضوع پر قرآن کی جامع ترین سورتیں ہیں۔

اس سورت کے باقاعدہ مطالعہ سے پہلے نفاق کے بارے میں چند اہم نکات کا تذکرہ ضروری ہے۔ یہ نکات اگرچہ قبل ازیں بھی کئی مرتبہ زیر بحث آ چکے ہیں' لیکن موضوع کے حوالے سے یہاں انہیں ایک مرتبہ پھر سے دُہرا لینا مفید رہے گا۔ اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ بنیادی طور پر نفاق کی دو قسمیں ہیں: شعوری نفاق اور غیر شعوری نفاق۔ شعوری نفاق یہ ہے کہ کوئی شخص سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اہلِ ایمان کو دھوکہ دینے کے لیے ایمان کا اقرار کرے۔ ایسا شخص تو گویا شروع سے ہی منافق ہے اور اسے ایک لمحے کے لیے بھی ایمان نصیب نہیں ہوا۔ ایسے منافقین کا ذکر سورۂ آل عمران کی آیت ۷۲ میں آیا ہے۔ وہ لوگ باقاعدہ ایک سازش کے تحت صبح کے وقت ایمان لانے کا ڈھونگ رچاتے تھے اور شام کو اسلام سے پھر جانے کا اعلان کر دیتے تھے' تاکہ اسلام کی ساکھ کو نقصان پہنچا سکیں۔ ظاہر ہے ان کے دلوں میں تو ایمان ایک لمحے کے لیے بھی داخل نہیں ہوتا تھا۔ ایسے لوگوں کی کیفیت سورۃ المائدۃ کی آیت ۶۱ میں یوں بیان کی گئی ہے: ﴿وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ﴾ کہ وہ کفر کے ساتھ اسلام میں داخل ہوئے اور کفر کے ساتھ ہی نکل گئے۔ بہرحال یہ شعوری نفاق کی مثال ہے۔ عملی طور پر اس قسم کے منافقین بہت کم پائے جاتے تھے۔

اس کے برعکس غیر شعوری نفاق کی مثال یوں سمجھیں کہ ایک شخص کے پاس اسلام کی دعوت پہنچی۔ اُس کے دل نے اس کی تصدیق

کی اور وہ اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ایمان لے آیا۔ لیکن بنیادی طور پر وہ چونکہ ایک کم ہمت شخص تھا' اس لیے ایمان کے عملی تقاضے پورے کرنے اور انقلاب کے راستے کی آزمائشوں کا سامنا کرنے سے گھبراتا رہا۔ خاص طور پر جب باقاعدہ تصادم کا مرحلہ آیا اور اہلِ ایمان سے تقاضا ہوا کہ وہ اپنی نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آ جائیں تو ایسے کمزور لوگوں کی جان پر بن گئی۔ اب ان میں سے کچھ لوگ تو اپنی کم ہمتی کے باوجود بھی سچے دل سے مسلمانوں کے ساتھ چمٹے رہے۔ اس طرح کہ کبھی کوئی اچھا کام کر لیا تو کبھی کوئی نافرمانی بھی ہو گئی۔ کبھی کسی تقاضے پر لبیک بھی کہہ لیا تو کہیں بہانہ بنا کر کھسک بھی گئے' لیکن جب جوابدہی ہوئی تو اپنی غلطی کو تسلیم کر کے خود کو سزا کے لیے پیش کر دیا۔ سورۃ التوبہ میں ایسے لوگوں کے کردار کی کیفیت ﴿خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ﴾ (آیت ۱۰۲) کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ جن لوگوں کا معاملہ یہیں تک رہا کہ ان سے جب بھی کوئی کوتاہی ہوئی انہوں نے صاف گوئی سے اسے تسلیم کر لیا اور کوئی بہانہ نہ بنایا تو وہ نفاق سے بَری رہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ضُعفِ ایمان کے درجے میں تھے۔

البتہ ایسے معاملے میں اکثر انسان کی نام نہاد عزّتِ نفس آڑے آ جاتی ہے: ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ﴾ (البقرۃ:۲۰۶) یعنی جب انسان کو اللہ سے ڈرنے کا کہا جاتا ہے تو اس کی عزّتِ نفس کی عصبیت اسے نافرمانی کی طرف گھسیٹ لے جاتی ہے' کہ دیکھو تم ایک عزّت دار آدمی ہو' اپنی زبان سے خود ہی اپنی غلطیاں تسلیم کر کر کے کب تک لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہو گے؟ بس بہت ہو گئی' اب اس کے بعد یہ نہیں چلے گا! چنانچہ جو شخص اپنے نفس کے اس بہکاوے میں آ کر خدا خوفی کی حد پار کر گیا اور اپنی غلطیاں چھپانے کے لیے جھوٹے بہانوں پر اُتر آیا اُس نے گویا نفاق کی سرحد میں پہلا قدم رکھ دیا۔ بس یہ پہلا قدم رکھنے کی ہی دیر تھی' اب یوں سمجھئے کہ وہ جھوٹ کی دلدل میں پھنس گیا۔ اس کے بعد وہ جو قدم بھی اٹھائے گا وہ اس کے لیے اس دلدل میں مزید نیچے دھنستے جانے کا ہی سبب بنے گا۔ صبح جھوٹ' دوپہر جھوٹ' شام جھوٹ' بلکہ بات بات پر جھوٹ۔ پھر ایسا شخص جب دیکھتا ہے کہ اس کے جھوٹ بولنے اور جھوٹے بہانے بنانے پر لوگ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہیں تو وہ اپنے جھوٹے بہانوں کو سچا ثابت کرنے کے لیے جھوٹی قسموں کا سہارا لینا شروع کر دیتا ہے۔ اگر نفاق کے مرض کو ٹی بی کے مہلک مرض سے تشبیہہ دیں تو قسموں کے اس مرحلے سے جان لینا چاہیے کہ اب متعلقہ شخص کا مرض دوسرے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔

جب قسموں کو تکیہ کلام بنا لینے سے اس کی اصل حقیقت سب پر عیاں ہونے لگتی ہے اور اسے خود بھی احساس ہونے لگتا ہے کہ لوگوں نے اس پر اعتماد کرنا چھوڑ دیا ہے تو ردِّ عمل کے طور پر اس کے دل میں ایمان اور اہلِ ایمان کے خلاف شدید نفرت اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس دشمنی کا اصل ہدف اہلِ ایمان کے قائد کی شخصیت بنتی ہے' جیسے منافقینِ مدینہ محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اکثر ہرزہ سرائی کرتے رہتے تھے کہ دیکھیں مدینہ میں سب لوگ آرام و سکون سے رہ رہے تھے۔ اس ایک شخص (ﷺ) کے آ جانے سے ہمارے لیے طرح طرح کے مسائل کھڑے ہو گئے ہیں' اس (ﷺ) نے بھائی کو بھائی سے جُدا کر دیا ہے' خاندانوں میں کبھی نہ ختم ہونے والی رنجشیں پیدا کر دی ہیں۔ اسی (ﷺ) کی وجہ سے یہودی قبائل کے ساتھ ہمارے حلیفانہ تعلقات ختم ہو کر رہ گئے ہیں اور پورے عرب سے ہمیں لڑائیاں مول لینا پڑی ہیں۔ بہرحال جب یہ مرحلہ آ جائے تو سمجھ لیں کہ اب یہ مرض تیسری اور آخری سٹیج میں داخل ہو گیا ہے۔ کسی زمانے میں ٹی بی کے بارے میں یہی سمجھا جاتا تھا کہ تیسری سٹیج پر پہنچ کر یہ مرض لاعلاج ہو جاتا ہے۔

اس بارے میں ایک اہم بات یہ بھی جان لیجیے کہ منافقین صرف انقلابی تحریک کی صفوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے آج ہمارے معاشرے کے جو لوگ دین کے تحریکی اور انقلابی تصور سے آشنا ہی نہیں وہ ضعیف الایمان تو ہو سکتے ہیں منافق نہیں۔ کیونکہ ان بے چاروں کو تو دین کا صحیح تصور دیا ہی نہیں گیا۔ انہیں تو مولویوں اور ان کے پیروں نے یہی بتایا ہے کہ دین بس نماز روزہ ہی کا نام ہے اور اگر رمضان میں لیلۃ القدر کی عبادت نصیب ہو گئی تو سمجھو زندگی بھر کے تمام گناہ دھل گئے۔ اور جس نے حج یا عمرہ کر لیا وہ گناہوں سے بالکل ہی پاک ہو گیا' چاہے اس نے ساری عمر حرام خوریوں میں ہی کیوں نہ گزاری ہو۔ اب جس مسلمان کے ذہن میں دین کا یہ تصور ہو اس بے چارے کو منافقت سے کیا لینا دینا۔ منافقت تو وہاں جنم لیتی ہے جہاں قدم قدم پر تکلیفوں اور آزمائشوں کے پہاڑ عبور کرنے پڑتے ہیں۔ جہاں دین اپنے نام لیواؤں سے ان کے عیش و آرام اور جان و مال کی قربانیاں مانگتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص دین کے تحریکی اور انقلابی فلسفے کو اچھی طرح سے سمجھ لے اور اقامتِ دین کی جدوجہد کو فرضِ عین سمجھتے ہوئے کسی حقیقی انقلابی جماعت یا تحریک میں شمولیت اختیار کر لے اور پھر اس کے بعد امیر کے ڈانٹنے کی وجہ سے یا ایثار و قربانی کے تقاضوں سے گھبرا کر یا ایسی ہی کسی دوسری وجہ سے پیچھے ہٹ جائے تو وہ مرضِ نفاق کا شکار ہو جائے گا۔ البتہ اگر اس کے پیچھے ہٹنے کی وجہ کچھ اور ہو' مثلاً اس کو وہ تحریک اپنے مقصد سے ہٹتی ہوئی محسوس ہو یا تحریک کے طریق کار سے اسے اصولی اختلاف ہو جائے یا قائدین کے کردار میں اسے واضح خامیاں نظر آئیں تو یہ دوسری بات ہے۔ ایسی کسی صورت میں اگر وہ اس تحریک یا تنظیم کو چھوڑ دے گا تو وہ نفاق کا مرتکب نہیں ہوگا۔ لیکن ایسی صورت میں بھی وہ کسی مخصوص جماعت کو تو چھوڑ سکتا ہے' اقامتِ دین کی جدوجہد کو ترک کر کے نہیں بیٹھ سکتا۔ اقامتِ دین کی ضرورت' اہمیت اور فرضیت کو ایک دفعہ سمجھ لینے کے بعد اب اس جدوجہد کو جاری رکھنا اُس پر فرض ہے' چاہے یہ فرض وہ کسی دوسری جماعت میں شامل ہو کر ادا کرے یا اس مقصد کے لیے خود کوئی نئی جماعت تشکیل دے۔ اس حوالے سے ہمیں حضور ﷺ کے اس فرمان سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ فجر اور عشاء کی نماز با جماعت میں شریک نہ ہونے والوں کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ أَثْقَلَ صَلَاةٍ عَلَى الْمُنَافِقِيْنَ صَلَاةُ الْعِشَاءِ وَصَلَاةُ الْفَجْرِ' وَلَوْ يَعْلَمُوْنَ مَا فِيْهِمَا لَأَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبْوًا ' وَلَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ آمُرَ بِالصَّلَاةِ فَتُقَامَ ثُمَّ آمُرَ رَجُلًا فَيُصَلِّيَ بِالنَّاسِ ثُمَّ أَنْطَلِقَ مَعِيَ بِرِجَالٍ مَعَهُمْ حُزَمٌ مِنْ حَطَبٍ إِلَى قَوْمٍ لَا يَشْهَدُوْنَ الصَّلَاةَ فَأُحَرِّقَ عَلَيْهِمْ بُيُوْتَهُمْ بِالنَّارِ))[1]

''منافقوں پر سب سے بھاری نماز عشاء اور فجر کی نماز (باجماعت) ہے۔ اگر یہ ان دونوں نمازوں کی اہمیت کو جان جائیں تو ان میں شرکت کے لیے ضرور آئیں خواہ انہیں گھٹنوں کے بل آنا پڑے۔ اور میں نے تو پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ نماز کھڑی کرنے کا حکم دوں' پھر کسی کو حکم دوں کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائے' پھر ایسے لوگوں کی طرف جاؤں جو نماز (باجماعت) میں شریک نہیں ہوتے اور میرے ہمراہ ایسے ساتھی ہوں جن کے پاس لکڑیوں کے گٹھے ہوں اور میں جماعت میں نہ پہنچنے والوں کے گھروں کو اُن کے سمیت آگ سے جلا دوں۔''

اگر جماعت سے نماز نہ پڑھنے والوں پر حضور ﷺ کی ناراضی کا یہ عالم ہے تو جماعتی نظم کو ترک کر کے زندگی گزارنے کے انجام کا ہمیں خود اندازہ کر لینا چاہیے۔

۱۔ صحیح مسلم' کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ' باب فضل صلاۃ الجماعۃ ...' ح: ۶۵۱ ۔ یہ حدیث صحیح بخاری اور دیگر کتبِ حدیث میں متعدد مقامات پر کم و بیش الفاظ کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

آیات ۱ تا ۸

سُوْرَةُ الْمُنٰفِقُوْنَ مَدَنِيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۱۱ رُكُوْعَاتُهَا: ۲

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ
يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ﴿۱﴾ اِتَّخَذُوْۤا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ
سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا
يَفْقَهُوْنَ ﴿۳﴾ وَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ وَ اِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ
مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۫ اَنّٰى
يُؤْفَكُوْنَ ﴿۴﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَ رَاَيْتَهُمْ
يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۵﴾ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ لَنْ يَّغْفِرَ
اللّٰهُ لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۶﴾ هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ
عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَ لِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا
يَفْقَهُوْنَ ﴿۷﴾ يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَاۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ
وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸﴾ ع

آیت ۱ ﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) جب منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں۔''

﴿وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ﴾ ''اور اللہ جانتا ہے کہ یقیناً آپ اُس کے رسول ہیں۔''

﴿وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ﴿۱﴾﴾ ''اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین یقیناً جھوٹے ہیں۔''

یعنی آپ کی رسالت کی گواہی یہ لوگ صرف اپنی زبانوں سے دیتے ہیں' ان کے دل اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے' اس لیے یہ لوگ جھوٹے (کٰذِبُوْنَ) ہیں۔ جیسا کہ تمہیدی کلمات میں ذکر ہوا ہے بات بات پر جھوٹ بولنا مرضِ منافقت کی پہلی سٹیج ہے۔

آیت ۲ ﴿اِتَّخَذُوْۤا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور یہ اللہ کے راستے سے رُک گئے ہیں۔''

جہاد و قتال سے بچنے کے لیے یہ لوگ قسمیں کھا کھا کر جھوٹے بہانے بناتے تھے کہ اللہ کی قسم میری بیوی سخت بیمار ہے' گھر میں کوئی دوسرا اس کی دیکھ بھال کرنے والا بھی نہیں' وغیرہ وغیرہ۔ جب نوبت قسموں تک پہنچ گئی تو گویا مرض دوسری سٹیج میں داخل ہو گیا۔

﴿اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲﴾﴾ ''بہت ہی بُرا کام ہے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔''

آیت ۳ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا﴾ ''یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ ایمان لائے پھر کافر ہو گئے''

یعنی ان کی منافقت شعوری نہیں ہے کہ وہ بدنیتی سے دھوکہ دینے کے لیے ایمان لائے ہوں۔ دینِ اسلام کی دعوت جب ان لوگوں تک پہنچی تھی تو ان کی فطرت نے گواہی دی تھی کہ یہ سچ اور حق کی دعوت ہے اور اُس وقت وہ نیک نیتی سے ایمان لائے تھے۔ کچھ دیر کے لیے انہیں ایمان کی دولت نصیب ہوئی تھی' لیکن ایمان لاتے وقت انہیں معلوم نہیں تھا کہ ع ''یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے''۔ اہلِ ایمان کے لیے اللہ تعالیٰ کا واضح حکم ہے: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۵۵) کہ ہم تمہیں کسی قدر خوف' بھوک اور مال وجان کے نقصانات جیسی سخت آزمائشوں سے ضرور آزمائیں گے۔ لیکن منافقین کو اس صورتِ حال کا اندازہ نہیں تھا۔

منافقینِ مدینہ میں بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے قبیلے کے سردار کے پیچھے ایمان لے آئے تھے۔ جیسے اوس اور خزرج کے قائدین ایمان لے آئے تو پورا پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ انہیں کیا پتا تھا کہ عملی طور پر ایمان کے تقاضے کیا ہیں۔ وہ تو برف کے تودے کی اوپری سطح (tip of the iceberg) ہی کو دیکھ رہے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس تودے کے نیچے کیا ہے۔ بہرحال ایسے لوگ ایمان تو سچے دل سے لائے تھے' لیکن ان کا ایمان تھا کمزور۔ اسی لیے تکلیفیں اور آزمائشیں دیکھ کر ان کے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ البتہ ضعیف الایمان مسلمانوں میں بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو اپنی تمامتر کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود ایمان کے دامن سے وابستہ رہے۔ ان سے جب کوئی کوتاہی ہوئی تو انہوں نے اس کا اقرار بھی کیا اور اس کے لیے وہ معافی کے طلب گار بھی ہوئے۔ سورۃ التوبہ میں ان لوگوں کا ذکر گزر چکا ہے اور وہاں ان کے ضُعفِ ایمان کا علاج بھی تجویز کر دیا گیا: ﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ﴾ (التوبۃ:۱۰۳) ''ان کے اموال میں سے صدقات قبول فرمالیجیے' اس (صدقے) کے ذریعے سے آپ انہیں پاک کریں گے اور ان کا تزکیہ کریں گے' اور ان کے لیے دعا کیجیے''۔ یعنی انفاق فی سبیل اللہ سے ان کے ایمان کی کمزوری دور ہو جائے گی۔ بہرحال جو لوگ ایک دفعہ ایمان لانے کے بعد مشکلات سے گھبرا کر ایمان کے عملی تقاضوں سے جی چرانے لگے اور اپنی اس خیانت کو جھوٹے بہانوں سے چھپانے لگے وہ منافقت کی راہ پر چل نکلے۔

﴿فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝۳﴾ ''تو ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی' پس یہ سمجھنے سے عاری ہو گئے۔''

ان کی منافقانہ روش کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی۔ چنانچہ اب ان کی سمجھ بوجھ کی صلاحیت مفقود ہو چکی ہے اور یہ حقیقی تفقہ سے عاری ہو چکے ہیں۔

آیت ۴ ﴿وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) جب آپ انہیں دیکھتے ہیں تو ان کے جسم آپ کو بڑے اچھے لگتے ہیں۔''

جسمانی طور پر ان کی شخصیات بڑی دلکش اور متاثر کن ہیں۔

﴿وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ﴾ ''اور اگر وہ بات کرتے ہیں تو آپ ان کی بات سنتے ہیں۔''

ظاہر ہے یہ لوگ سرمایہ دار بھی تھے اور معاشرتی لحاظ سے بھی صاحبِ حیثیت تھے۔ اس لحاظ سے ان کی گفتگو ہر فورم پر توجہ سے سنی جاتی تھی۔

﴿كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ﴾ ''(لیکن اصل میں) یہ دیوار سے لگائی ہوئی خشک لکڑیوں کی مانند ہیں۔''

حقیقت میں ان لوگوں کی حیثیت ان خشک لکڑیوں کی سی ہے جو کسی سہارے کے بغیر کھڑی بھی نہیں ہو سکتیں اور انہیں دیوار کی ٹیک لگا کر کھڑا کیا جاتا ہے۔

﴿يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ﴾ ''یہ ہر زور کی آواز کو اپنے ہی اوپر گمان کرتے ہیں۔''

اندر سے یہ لوگ اس قدر بودے اور بزدل ہیں کہ کوئی بھی زور کی آواز یا کوئی آہٹ سنتے ہیں تو ان کی جان پر بن جاتی ہے۔ یہ ہر خطرے کو اپنے ہی اوپر سمجھتے ہیں اور ہر وقت کسی ناگہانی حملے کے خدشے یا جہاد و قتال کے تقاضے کے ڈر سے سہمے رہتے ہیں۔

﴿هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ﴾ ''(آپؐ کے) اصل دشمن یہی ہیں' آپ ان سے بچ کر رہیں!''

یہ ان کے مرضِ نفاق کی تیسری سٹیج کا ذکر ہے۔ ان کی دشمنی چونکہ دوستی کے پردے میں چھپی ہوتی ہے اس لیے یہاں خصوصی طور پر ان سے ہوشیار رہنے کی ہدایت کی جا رہی ہے کہ اے نبی ﷺ! یہ لوگ آستین کے سانپ ہیں۔ مشرکینِ مکہ کے لشکر آپ لوگوں کے لیے اتنے خطرناک نہیں جتنے یہ اندر کے دشمن خطرناک ہیں۔ لہٰذا آپؐ ان کو ہلکا نہ سمجھیں اور ان سے ہوشیار رہیں۔ ایسی صورتِ حال کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ قول بہت اہم ہے کہ ''فاختہ کی مانند بے ضرر لیکن سانپ کی طرح ہوشیار رہو''۔ منافقین اگرچہ حضور ﷺ سے دشمنی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے' لیکن حضور ﷺ کی شان یہی تھی کہ آپؐ ان کی غلطیاں اور گستاخیاں مسلسل نظر انداز فرماتے رہتے تھے' بلکہ آپؐ اپنی طبعی شرافت اور مروّت کی وجہ سے ان کے جھوٹے بہانے بھی مان لیتے تھے۔ یہاں تک کہ غزوۂ تبوک کی تیاری کے موقع پر جب آپ ﷺ نے بہت سے منافقین کو جھوٹے بہانوں کی وجہ سے پیچھے رہ جانے کی اجازت دے دی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہہ آگئی: ﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾﴾ (التوبۃ) ''(اے نبی ﷺ!) اللہ آپ کو معاف فرمائے (یا اللہ نے آپ کو معاف فرما دیا) آپ نے انہیں کیوں اجازت دے دی؟ یہاں تک کہ آپ کے لیے واضح ہو جاتا کہ کون لوگ سچے ہیں اور آپ (یہ بھی) جان لیتے کہ کون جھوٹے ہیں!''

﴿قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۴﴾﴾ ''اللہ ان کو ہلاک کرے' یہ کہاں سے پھرائے جا رہے ہیں!''

تصور کیجیے یہ لوگ کس قدر قابلِ رشک مقام سے ناکام و نامراد لوٹے ہیں! ان کو نبی آخر الزماں ﷺ کا زمانہ نصیب ہوا' آپؐ کی دعوتِ ایمان پر لبیک کہنے کی توفیق ملی' آپؐ کے قدموں میں بیٹھنے کے مواقع ہاتھ آئے۔ کیسی کیسی سعادتیں تھیں جو ان لوگوں کے حصے میں آئی تھیں۔ بقول ابراہیم ذوق: ع ''یہ نصیب اللہ اکبر! لوٹنے کی جائے ہے''۔ مگر دوسری طرف ان کی بدنصیبی کی انتہا یہ ہے کہ یہاں تک پہنچ کر بھی یہ لوگ نامراد کے نامراد ہی رہے۔ مقامِ عبرت ہے! کس بلندی پر پہنچ کر یہ لوگ کس اتھاہ پستی میں گرے ہیں: ؎

قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند — دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا!

آیت ۵ ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ﴾ ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ (اپنی غلطی مان لو) تاکہ اللہ کے رسولؐ تمہارے لیے استغفار کریں''

ظاہر ہے ان کے دلوں میں تو نبی اکرم ﷺ کے خلاف بغض اور عناد پیدا ہو چکا تھا تو ان حالات میں وہ کیسے آتے اور کیونکر اپنی غلطی تسلیم کرتے؟

﴿لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ﴾ ''تو وہ اپنے سروں کو مٹکاتے ہیں''

کہ ہاں ہاں! ٹھیک ہے ہم آئیں گے ضرور آئیں گے۔

﴿وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝۵﴾ ''اور آپ انہیں دیکھتے ہیں کہ وہ رک جاتے ہیں تکبر کرتے ہوئے۔''

ان کے دلوں میں چونکہ تکبر ہے اس لیے وہ آپؐ کے پاس آ کر معافی مانگنے کو اپنی ہتک سمجھتے ہیں کہ دیکھیں جی آخر ہماری بھی کوئی عزت ہے اب کون روز روز وہاں جا کر مجرموں کی طرح اقبالِ جرم کرے اور ڈانٹ سنے!

آیت ۶ ﴿سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ان کے لیے برابر ہے کہ آپ ان کے لیے استغفار کریں یا ان کے لیے استغفار نہ کریں۔''

﴿لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ﴾ ''اللہ ان کو ہرگز معاف نہیں کرے گا۔''

یہی مضمون اس سے زیادہ سخت الفاظ میں سورۃ التوبہ میں بھی آ چکا ہے۔ وہاں ان لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ﴾ (آیت ۸۰) ''(اے نبی ﷺ!) آپ خواہ ان کے لیے استغفار کریں یا ان کے لیے استغفار نہ کریں۔ اگر آپ ستر مرتبہ بھی ان کے لیے استغفار کریں گے تب بھی اللہ انہیں ہرگز معاف نہیں فرمائے گا''۔ لیکن حضور ﷺ کی نرم دلی اور مروت کی اپنی شان ہے۔ آپؐ نے اس آیت کے نزول کے بعد ایک موقع پر مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا: ((لَوْ اَعْلَمُ اَنِّيْ اِنْ زِدْتُ عَلَى السَّبْعِيْنَ غُفِرَ لَهٗ لَزِدْتُ عَلَيْهَا))[۲] ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ستر سے زیادہ مرتبہ استغفار کرنے سے اس کی معافی ہو سکتی ہے تو میں اس پر اضافہ کر لیتا''۔ واضح رہے کہ یہاں ستر کا عدد محاورے کے طور پر آیا ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ اب ان کے لیے آپؐ کا استغفار کرنا انہیں کچھ بھی فائدہ نہیں دے سکتا۔ ان کے دلوں میں آپؐ کی عداوت اب اس نہج پر پہنچ چکی ہے کہ ان کی بخشش ممکن ہی نہیں۔

اب آئندہ آیات میں ایک واقعہ کے حوالے سے اہلِ ایمان کے ساتھ منافقین کی عداوت کا نقشہ دکھایا جا رہا ہے۔ یہ واقعہ غزوۂ بنی مصطلق سے واپسی کے سفر میں پیش آیا تھا۔ مریسیع کے کنویں کے قریب جہاں لشکر کا پڑاؤ تھا دو مسلمانوں کا پانی بھرنے پر آپس میں جھگڑا ہو گیا۔ ان میں سے ایک انصار کا حلیف تھا جبکہ دوسرا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خادم تھا جس نے جذبات میں آ کر اس کو ایک لات رسید کر دی۔ اس پر منافقین نے اس کو بڑھا چڑھا کر مہاجرین اور انصار کے مابین جھگڑے کا رنگ دے دیا۔ عبداللہ بن اُبی نے جو اس طرح کے مواقع کی ہمیشہ گھات میں رہتا موقع سے فائدہ اٹھا کر مہاجرین کے خلاف انصار کے جذبات بھڑکانے کے لیے نہایت زہر آلود فقرے کہے۔ اس نے انصار کو مخاطب کر کے کہا: اے مدینہ والو! یہ ہمارے گھر میں پناہ پا کر اب ہمیں پر غرانے لگے ہیں۔ سچ کہا ہے جس نے کہا ہے کہ سَمِّنْ كَلْبَكَ يَاْكُلْكَ کہ تم اپنے کتے کو کھلا پلا کر خوب موٹا کرو تا کہ وہ تم ہی کو کاٹے۔ تم نے ان بے گھر

۲۔ احکام الجنائز للالبانی، ح: ۱۲۱، راوی: عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ۔

لوگوں کو سر چھپانے کی جگہ دی' ان کی مدد کی' انہیں کھلایا پلایا اور اپنے مال میں ان کو حصہ دار بنایا۔ یہ تمہاری اپنی غلطی کا خمیازہ ہے جو تمہیں بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اگر تم ان کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیتے تو یہ کب کے یہاں سے بھاگ کھڑے ہوتے ـــــ خدا کی قسم! اب ہم پلٹے تو جو باعزت ہیں وہ رذیلوں کو مدینہ سے نکال باہر کریں گے۔ عبداللہ بن اُبی کی یہ بکواس وہاں موقع پر موجود ایک نوجوان صحابی حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سن رہے تھے۔ انہوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں پیش ہو کر سارا واقعہ بیان کر دیا۔ حضور ﷺ نے عبداللہ بن اُبی کو بلا کر دریافت فرمایا تو وہ صاف مکر گیا' بلکہ اس نے الٹا احتجاج کیا کہ کیا آپؐ میرے معاملے میں اس چھوکرے (حضرت زید بن ارقمؓ) کی بات پر یقین کریں گے؟ اس طرح حضرت زیدؓ کی پوزیشن بڑی خراب ہو گئی۔ ان آیات کے نزول کے بعد جب واقعہ کی تصدیق ہو گئی تو حضور ﷺ نے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی خصوصی طور پر دلجوئی فرمائی اور شفقت سے ان کا کان مروڑتے ہوئے فرمایا کہ لڑکے کے کان نے غلط نہیں سنا تھا۔

اس واقعہ کے حوالے سے یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ عبداللہ بن اُبی کا جرم ثابت ہو جانے کے بعد بھی حضور ﷺ نے اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک عملاً اسلامی ریاست قائم نہیں ہوئی تھی۔ اس بارے میں عام طور پر تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ حضور ﷺ کے مدینہ تشریف لے جانے کے فوراً بعد ہی وہاں باقاعدہ اسلامی ریاست وجود میں آ گئی تھی اور حضور ﷺ کو باقاعدہ ایک سربراہِ ریاست اور سربراہِ حکومت کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی' لیکن اُس دور کے معروضی حقائق اور واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ خیال درست نہیں ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر اسلامی لشکر کو چھوڑ کر جانے والے تین سو افراد سے کسی قسم کا کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ منافقینِ مدینہ اپنے فیصلے حضور ﷺ کے بجائے یہودیوں سے کرواتے تھے۔ ظاہر ہے کسی ریاست میں تو ایسا نہیں ہوتا کہ اس کی ایک تہائی فوج دشمن کے مقابلے سے بھاگ جائے اور ان میں سے کسی ایک فرد سے بھی اس بارے میں کوئی باز پرس نہ ہو' اور نہ ہی کسی ریاست کی عملداری میں یہ ممکن ہے کہ اس کا کوئی شہری ریاست کی عدالت کو چھوڑ کر اپنا مقدمہ کہیں اور لے جائے۔ بہرحال اس حوالے سے اصل صورتِ حال یہ تھی کہ علاقے کی واحد منظم اور طاقتور جماعت کے سربراہ کی حیثیت سے حضور ﷺ کو مدینہ میں معاشرتی و سیاسی لحاظ سے ایک خصوصی اور ممتاز مقام تو ہجرت کے فوراً بعد ہی حاصل ہو گیا تھا۔ البتہ آپؐ کے تحت ایک باقاعدہ ریاست فتح مکہ کے بعد قائم ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ۹ ہجری میں غزوۂ تبوک سے رہ جانے والے لوگوں کا سخت مؤاخذہ ہوا۔

بہرحال عبداللہ بن اُبی کے معاملے میں حضور ﷺ نے بہت درگزر سے کام لیا۔ واقعۂ اِفک میں اس کے کردار سے حضور ﷺ بہت آزردہ ہوئے تھے۔ اس دوران تو ایک موقع پر آپ ﷺ نے یہاں تک فرما دیا تھا کہ کیا کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو اس شخص کی ایذا سے مجھے بچا سکے؟ لیکن آپؐ کا یہ فرمان بھی محض آپؐ کے جذبات کا اظہار تھا' جبکہ آپؐ نے اس کے خلاف کسی عملی اقدام کا حکم اس وقت بھی نہیں دیا۔ البتہ اس موقع پر اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: حضور! آپؐ مجھے حکم دیں' میں اس شخص کا کام تمام کرتا ہوں۔ اس پر خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے حضرت سعدؓ بن معاذ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے عبداللہ بن اُبی کے قتل کی بات اس لیے کی ہے کہ اس کا تعلق قبیلہ خزرج سے ہے! اور پھر حضرت سعد بن عبادہؓ ہی نے حضور ﷺ کو مشورہ دیا تھا کہ حضور! آپ اس شخص کے معاملے میں نرمی سے کام لیں۔ اس کا اصل مسئلہ یہ ہے

کہ ہم اسے اپنا بادشاہ بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے اور اس کے لیے ہم نے سونے کا تاج بھی تیار کر لیا تھا کہ اسی اثنا میں آپؐ مدینہ تشریف لے آئے۔ اس طرح اس کے سارے خواب بکھر گئے۔ ہمارے قبیلے پر ابھی تک اس کا اثر و رسوخ موجود ہے' اس لیے حکمت اور مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے خلاف سختی نہ کی جائے۔ بہر حال اس ساری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اُس وقت تک باقاعدہ اسلامی ریاست اور حکومت بھی وجود میں نہیں آئی تھی اور ابھی قبائلی عصبیتیں بھی کسی نہ کسی حد تک موجود تھیں۔ یعنی مجموعی طور پر حالات ایسے نہیں تھے کہ حضور ﷺ ان پہلوؤں کو نظر انداز کر کے عبداللہ بن اُبی کے خلاف کوئی سخت اقدام کرنے کا حکم دیتے۔ اس لیے آپؐ نے اس کا یہ جرم بھی نظر انداز کر دیا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۶﴾ ''یقیناً اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

آیت ۷ ﴿هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ﴾ ''یہی ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ مت خرچ کرو ان پر جو اللہ کے رسول (ﷺ) کے گرد جمع ہو گئے ہیں' یہاں تک کہ یہ منتشر ہو جائیں۔''

منافقین سمجھتے تھے کہ اگر اہلِ مدینہ مہاجر مسلمانوں پر خرچ کرنا بند کر دیں گے تو چند ہی دنوں میں یہ ساری بھیڑ چھٹ جائے گی۔ یہی بات عبداللہ بن اُبی نے متذکرہ بالا جھگڑے کے موقع پر انصارِ مدینہ سے کہی تھی۔

﴿وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝۷﴾ ''حالانکہ آسمانوں اور زمین کے خزانے تو اللہ ہی کے ہیں' لیکن منافقین اس حقیقت کا فہم نہیں رکھتے۔''

یہاں آسمانوں اور زمین سے مراد پوری کائنات ہے۔

آیت ۸ ﴿يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَاۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ﴾ ''وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ لوٹ گئے تو جو طاقتور ہیں وہ لازماً نکال باہر کریں گے وہاں سے ان کمزور لوگوں کو۔''

عربی میں عزّت کا اصل مفہوم طاقت اور غلبہ ہے' جبکہ ذلیل کے معنی کمزور اور بے حیثیت کے ہیں۔ مذکورہ واقعہ چونکہ غزوۂ بنی مصطلق سے واپس آتے ہوئے راستے میں پیش آیا تھا اس لیے منافقین کے مکالمے میں یہاں مدینہ پلٹنے کا ذکر آیا ہے۔ عبداللہ بن اُبی نے لوگوں کے جذبات بھڑکاتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ جب ہم مدینہ واپس پہنچیں تو بالکل متفق الرائے ہو کر یہ طے کر لیں کہ جو صاحبِ عزّت ہیں' جو مدینہ کے قدیم باشندے (sons of the soil) ہیں وہ ان مہاجروں کو جو بڑے کمزور ہیں' جن کی کوئی حیثیت نہیں' مدینہ سے نکال باہر کریں گے۔

﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۸﴾ ''حالانکہ اصل عزّت تو اللہ' اُس کے رسولؐ اور مؤمنین کے لیے ہے' لیکن یہ منافق جانتے نہیں۔''

عبداللہ بن اُبی کے بیٹے کا نام بھی عبداللہ رضی اللہ عنہ تھا' جو بہت مخلص' صادق القول اور صادق الایمان صحابی تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میرے باپ نے یہ بکواس کی ہے تو انہوں نے اپنے باپ کو سبق سکھانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ لشکر جب واپس مدینہ پہنچا تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ ننگی تلوار سونت کر اپنے باپ کے راستے میں کھڑے ہو گئے۔ انہوںؓ نے عبداللہ بن اُبی سے کہا اب جب تک تم یہ نہیں کہو گے کہ میں ذلیل ہوں اور تمام عزّت اللہ' اُس کے رسولؐ اور اہلِ ایمان کے لیے ہے' اُس وقت تک میں تمہیں شہر میں داخل نہیں ہونے

دوں گا۔ عبداللہ بن اُبی نے اُس پر حضور ﷺ سے بھی فریاد کی' لوگوں کے سامنے بھی دہائی دی کہ دیکھو میرا اپنا بیٹا میرے قتل کے درپے ہے۔ لیکن حضرت عبداللہؓ اپنے موقف پر قائم رہے اور انہوں نے اپنی مذکورہ شرط منوا کر ہی اپنے باپ کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت دی۔

یہ آٹھ آیات تو نفاق کے مراحل اور اس کی تشخیص اور پیش بینی (prognosis) کے بارے میں تھیں۔ ان میں گویا مرضِ نفاق' اس کی علامات' اس کا نقطۂ آغاز' اس کا سبب' اس کے مختلف مراتب و مدارج اور اس کی ہلاکت خیزی' یہ تمام چیزیں زیر بحث آ گئیں۔ ان آیات کا خلاصہ یہی ہے کہ نفاق کی وجہ سے بالآخر انسان کے دل میں اللہ کے رسول ﷺ اور اہلِ ایمان کے خلاف شدید دشمنی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ بیماری انسان کو ہلاکت و بربادی کے راستے پر وہاں تک پہنچا دیتی ہے جہاں اللہ کے رسولؐ کا استغفار بھی اس کے کام نہیں آ سکتا۔

آیات ۹ تا ۱۱

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَ لَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۹ وَ اَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَ اَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۱۰ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۱ ع

اب دوسرے رکوع کی تین آیات میں اس بیماری کا علاج بتایا گیا ہے۔ جس طرح طب میں ایک مرض کا علاج دو طرح سے کیا جاتا ہے' ایک حفاظتی (preventive) قسم کا علاج ہے اور دوسرا معالجاتی (curative) طرز کا' اسی طرح یہاں بھی مرضِ نفاق کے علاج کے ضمن میں یہ دونوں پہلو سامنے آ رہے ہیں۔ ظاہر ہے کسی بیماری کے حوالے سے انسان کی پہلی کوشش تو یہی ہونی چاہیے کہ وہ اس بیماری کی چھوت سے بچا رہے۔ اس کے لیے ظاہر ہے اسے پرہیزی اقدام (preventive measures) اپنانے کی ضرورت ہوگی۔ جیسے آج کل کسی بیماری سے بچنے کا مؤثر طریقہ یہی ہے کہ آپ متعلقہ ویکسی نیشن کا انجکشن لگوا لیں۔ چنانچہ اب اگلی آیت میں اس اقدام کا ذکر ہے جسے نفاق کی بیماری سے بچنے کے لیے حفظِ ماتقدم کے طور پر اپنانا ضروری ہے۔

آیت ۹ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ﴾ ''اے اہلِ ایمان! تمہیں غافل نہ کرنے پائیں تمہارے اموال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے۔''

یہاں دو چیزوں کو معین کیا گیا ہے جو انسان کو اللہ کی یاد سے غافل کرنے کا باعث بنتی ہیں' یعنی مال اور اولاد۔ یہی مضمون آگے چل کر سورۃ التغابن میں نہایت واضح شکل میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ﴾ (آیت ۱۵) ''جان لو تمہارے مال اور تمہاری اولاد ہی ذریعۂ آزمائش ہیں''۔ یہی تو وہ کسوٹی ہے جس پر تمہیں پرکھا جا رہا ہے۔ چنانچہ متنبہ کر دیا گیا کہ اہلِ ایمان! دیکھنا تمہیں تمہارے اموال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔

﴿ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۹ ﴾ ''اور جو کوئی ایسا کریں گے تو وہی خسارے میں رہیں گے۔''

یہاں اللہ کے ذکر سے مراد صرف یہی نہیں کہ انسان ہر وقت تسبیحات وغیرہ پڑھتا رہے' بلکہ اس کا وسیع تر مفہوم یہ ہے کہ انسان کو ہر وقت اللہ یاد رہے اور اسی بنا پر وہ اپنے جملہ فرائض کی ادائیگی کے لیے ہر وقت کمربستہ رہے۔ تو اے اہلِ ایمان! کہیں ایسا نہ ہو کہ اموال واولاد کے معاملات میں منہمک ہو کر تم لوگ اللہ ہی کو بھلا دو۔ جیسا کہ آج کل ہماری اکثریت کا حال ہے۔ آج اگر آپ لوگوں کو اللہ اور دین کی طرف بلائیں تو آپ کو عام طور پر یہی جواب ملے گا کہ کیا کریں جی وقت ہی نہیں ملتا! اب ظاہر ہے جو شخص ایک خاص ''معیارِ زندگی'' کو اپنا معبود بنا کر دن رات اس کی پوجا میں لگا ہو تو اُس کے پاس معبودِ حقیقی کی طرف رجوع کرنے کے لیے وقت کیونکر بچے گا؟ چنانچہ مرضِ نفاق کی چھوت سے بچنے کے لیے پرہیزی اقدام یہ بتایا گیا کہ اللہ کی یاد کسی وقت بھی تمہیں بھولنے نہ پائے۔ اور ساتھ ہی اللہ کی یاد کو بھلانے والے دو اہم ترین عوامل کی نشاندہی بھی کر دی گئی۔ ظاہر ہے کسی بھی بیماری کا علاج کرنے کے لیے اس کے اصل اور بنیادی سبب کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ جب بیماری کا سبب ڈھونڈ کر اس کی بیخ کنی کر دی جائے گی تو وہ بیماری دور ہو جائے گی۔ نفاق کی بیماری کا اصل سبب چونکہ دنیا کی محبت ہے اور دنیا کی محبت کا سب سے بڑا مظہر مال کی محبت ہے' لہٰذا اس بیماری سے نجات حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دل سے مال کی محبت ختم کر دی جائے اور اس محبت کو ختم کرنے کا مؤثر طریقہ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے:

آیت ۱۰ ﴿ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ ﴾ ''اور خرچ کر دو اس میں سے جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس سے پہلے پہلے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے''

﴿ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۱۰ ﴾ ''پھر وہ اُس وقت کہے کہ اے میرے رب! تُو نے مجھے ایک قریب وقت تک کیوں مہلت نہ دی کہ مَیں صدقہ کرتا اور نیک لوگوں میں سے ہو جاتا!''

گویا نفاق کی بیماری کا بالمثل علاج انفاق ہے۔ سورۃ الحدید کی آیت ۱۸ کے تحت وضاحت کی جا چکی ہے کہ مال کی محبت کو دل سے نکالنے کے لیے دل کی زمین میں ''انفاق'' کا ہل چلانا پڑتا ہے اور جو لوگ یہ ہل چلانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اصل کامیابی انہی کے حصے میں آتی ہے:

﴿ اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝۱۸ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ... ﴾

''یقیناً صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور جو اللہ کو قرضِ حسنہ دیں' ان کو کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور ان کے لیے بڑا باعزت اجر ہوگا۔ اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسولوں پر انہی میں سے صِدّیق اور شہداء ہوں گے اپنے رب کے پاس.....''

زیر مطالعہ آیت میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ ایک بڑا حسرت کا وقت آئے گا جب انسان کفِ افسوس ملے گا کہ اے کاش! مَیں اس مال کو اللہ کی راہ میں صدقہ کر سکتا۔ آج یہ لوگ دونوں ہاتھوں سے مال جمع کر رہے ہیں اور گھروں کی آرائش وزیبائش پر بے تحاشا خرچ کر رہے ہیں' لیکن ایک وقت آئے گا جب اہل وعیال' عزیز واقارب' مال ودولت اور جائیداد' سب کو چھوڑ کر یہاں سے جانا ہوگا۔ اُس

وقت انسان حسرت سے کہے گا کہ پروردگار! کیوں نہ تُو نے مجھے ذرا اور مہلت دے دی! تُو اگر ذرا اس وقت کو ٹال دے تو پھر مَیں یہ سب کچھ تیری راہ میں لٹا دوں' سارا مال صدقہ کر دوں اور میں بالکل سچائی اور نیکوکاری کی راہ اختیار کر لوں۔ لیکن اُس وقت اس حسرت کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اللہ کی یہ سُنّتِ ثابتہ ہے کہ جب کسی کا وقتِ معیّن آ جائے تو پھر اسے مؤخر نہیں کیا جاتا!

آیت ۱۱ ﴿وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ؕ﴾ ''اور اللہ ہرگز مہلت نہیں دے گا کسی جان کو جب اُس کا وقتِ معیّن آ پہنچے گا۔''

قوموں کی ''اجل'' مؤخر ہونے کی ایک مثال تو موجود ہے' حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے معاملے میں عین وقت پر عذاب ٹالنے کا فیصلہ ہوا تھا' لیکن انسانوں کی انفرادی اجل کبھی مؤخر نہیں کی گئی۔

﴿وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۱﴾ ''اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔''

اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اس وقت کی یہ جزع فزع اور نالہ وشیون بھی فی الحقیقت منافقانہ ہوگی۔ اگر کہیں بالفرض کوئی مہلت مل بھی جائے تو پھر دوبارہ مال کی محبت عود کر آئے گی اور پھر تم اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے کنی کترا ؤ گے۔

سُوْرَةُ التَّغَابُنِ

تمہیدی کلمات

سورۃ التغابن ایمانی مباحث کے حوالے سے قرآن مجید کی جامع ترین سورت ہے۔ اس سے پہلے سورۃ المنافقون میں نفاق کا بیان تھا۔ نفاق انسان کے ''باطن'' کا منفی پہلو ہے' جبکہ اس کا مثبت پہلو ایمان ہے۔ مُصحف میں سورۃ المنافقون کے بعد سورۃ التغابن کو لاکر گویا تصویر کے دونوں رخ یکجا کر دیے گئے ہیں۔ یہاں میں تحدیثِ نعمت کے طور پر یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ سورۃ الحدید کے بعد دوسرے نمبر پر اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ سورت عطا کی ہے۔ اس سورت کا نظم اور اس کے اَسرار و رموز اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میرے ذہن میں بہت واضح ہیں۔

اس سورت کے نظم کا مختصر تعارف یہ ہے کہ پہلے رکوع کی ابتدائی سات آیات میں ایمانیاتِ ثلاثہ کا ذکر ہے' یعنی ایمان باللہ اور صفاتِ باری تعالیٰ' ایمان بالرسالت' اور ایمان بالآخرۃ یا ایمان بالمعاد۔ پھر اگلی تین آیات میں ایمان کی زوردار دعوت دی گئی ہے کہ یہ واقعی حقائق ہیں' ان کو قبول کرو' تسلیم کرو اور انہیں حرزِ جان بناؤ اور ان پر یقین سے اپنے باطن کو منور کرو۔ دوسرے رکوع کی پہلی پانچ آیات میں ایمان کے ثمرات اور ایمان کے نتیجے میں انسان کے فکر و نظر اور اس کی شخصیت میں جو تبدیلیاں رونما ہونی چاہئیں' ان کا بیان ہے۔ جیسے آم کا درخت اگر صحت مند ہوگا تو اس پر آم ضرور لگیں گے' اسی طرح ایمانِ حقیقی کے ظاہری و باطنی ثمرات بھی ضرور ظاہر ہوتے ہیں۔ ایمان کے ثمرات کے بیان کے بعد آخری تین آیات میں ایمان حقیقی کے تقاضوں کو عملی طور پر پورا کرنے کی نہایت زوردار اور مؤثر ترغیب و تشویق ہے' اور ان میں تقویٰ' سمع و طاعت اور انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ سورۂ مبارکہ چار حصوں میں منقسم ہے۔

آیات ۱ تا ۷

سُوْرَةُ التَّغَابُنِ مَدَنِيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ١٨ رُكُوْعَاتُهَا: ٢

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۚ لَهُ الْمُلْكُ وَ لَهُ الْحَمْدُ ۫ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝١ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۭ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝٢ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝٣ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ۭ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝٤ اَلَمْ

يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۫ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝٥ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۫ فَكَفَرُوْا وَ تَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝٦ زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ؕ قُلْ بَلٰى وَ رَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ وَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝٧

آیت ۱ ﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ ''تسبیح کرتی ہے اللہ کی ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ شے جو زمین میں ہے۔''

سورۃ التغابن اَلْمُسَبِّحات کے سلسلے کی آخری سورت ہے۔ اس سلسلے کی سورتوں میں سے یہ دوسری سورت ہے جس کے آغاز میں يُسَبِّحُ کا صیغہ آیا ہے۔ اس سے پہلے یہ صیغہ سورۃ الجمعہ کی پہلی آیت میں آیا ہے۔ باقی تینوں اَلْمُسَبِّحات کی ابتدا میں سَبَّحَ کا صیغہ آیا ہے۔

﴿لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ﴾ ''اُسی کی بادشاہی ہے اور اُسی کے لیے حمد ہے۔''

کُل کائنات کی بادشاہی بھی اللہ ہی کی ہے اور کُل شکر و سپاس اور تعریف و ثنا کا مستحق حقیقی بھی صرف وہی ہے۔

﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝١﴾ ''اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

آیت ۲ ﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ؕ﴾ ''وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے' پھر تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مؤمن۔''

ظاہر ہے تمام انسانوں کا خالق اللہ ہے۔ اس لحاظ سے ہر انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے خالق کا شکر گزار بن کر رہے' اسی کو اپنا معبود جانے اور اسی کے آگے جھکے۔ لیکن بہت سے انسان اللہ تعالیٰ کے منکر اور نافرمان ہیں۔ بظاہر تو یہ بہت عجیب بات ہے کہ مخلوق کا کوئی فرد اپنے خالق کا منکر یا نافرمان ہو لیکن واقعہ بہرحال یہی ہے۔

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝٢﴾ ''اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔''

آیت کے مضمون کے اعتبار سے اس جملے میں بہت بڑی وعید بھی پنہاں ہے اور ایک بشارت بھی مضمر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ایک ایک انسان کے اعتقاد و نظریہ سے باخبر ہے۔ وہ ایک ایک انسان کی ایک ایک حرکت کو بھی دیکھ رہا ہے۔ وقت آنے پر وہ اپنے سب نافرمانوں سے نپٹ لے گا۔ ان الفاظ کا بشارت والا پہلو یہ ہے کہ جو اُس کے شکر گزار اور مطیع فرمان ہوں گے ان کو وہ انعام و اکرام سے نوازے گا۔ اس لیے کہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور سب کی روش سے آگاہ ہے!

آیت ۳ ﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ﴾ ''اُس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا حق کے ساتھ''

اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات عبث پیدا نہیں کی' بلکہ یہ ایک بہت ہی بامقصد اور نتیجہ خیز تخلیق ہے اور انسان اُس کی تخلیق کی معراج ہے۔ چنانچہ کائنات کی تخلیق کے ذکر کے بعد خاص طور پر تخلیقِ انسانی کا ذکر فرمایا:

﴿وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ﴾ ''اور اُس نے تمہاری صورت گری کی تو بہت ہی عمدہ صورت گری کی۔''

انسانی ڈھانچے کی ساخت' جسم کی بناوٹ' چہرے کے خدوخال' غرض ایک ایک عضو کی تخلیق ہر پہلو سے کامل' انتہائی متناسب اور دیدہ زیب ہے۔

﴿وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝۳﴾ ''اور اُسی کی طرف (سب کو) لوٹنا ہے۔''

کیا تم لوگ سمجھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں تخلیق کے بہترین درجے پر (فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ) بنا کر اور بہترین صلاحیتوں سے نواز کر جانوروں اور کیڑوں مکوڑوں کی سی بے مقصد زندگی گزارنے کے لیے چھوڑ دیا ہے؟ یا کیا تمہاری حیثیت اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک کھلونے کی سی ہے جسے اُس نے صرف دل بہلانے کے لیے بنایا ہے اور اس کے علاوہ تمہاری تخلیق کا کوئی سنجیدہ مقصد نہیں ہے؟ نہیں' ایسا ہرگز نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اپنی نسل کے اعتبار سے تم اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی معراج ہو۔ تمہاری تخلیق ایک بامقصد تخلیق ہے۔ ابھی تم محض ایک وقفہ امتحان سے گزر رہے ہو' اس کے بعد تمہیں پلٹ کر اللہ تعالیٰ کے پاس جانا ہے اور اپنی دنیوی زندگی کے اعمال و افعال کا حساب دینا ہے۔

اگلی آیت ''ایمان بالعلم'' کے حوالے سے قرآن مجید کی جامع ترین آیت ہے' بلکہ یوں سمجھئے کہ اس موضوع پر قرآن مجید کی بہت سی آیات میں جو تفصیلات آئی ہیں ان کا خلاصہ اس ایک آیت میں آ گیا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے علم کی تین جہتیں (dimensions) بیان ہوئی ہیں۔ پہلی جہت کیا ہے؟

آیت ۴ ﴿يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے''

اب دوسری جہت ملاحظہ کیجیے:

﴿وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۭ﴾ ''اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو۔''

اور تیسری جہت کیا ہے؟

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۴﴾ ''اور اللہ اُس سے بھی باخبر ہے جو تمہارے سینوں کے اندر ہے۔''

اس آیت کے الفاظ اور مفہوم کے حوالے سے میں بہت عرصہ متردّد رہا کہ بظاہر تو یہاں الفاظ کی تکرار نظر آتی ہے کہ جو کچھ ہم چھپاتے ہیں وہی تو ہمارے سینوں میں ہوتا ہے' لیکن تکرارِ محض چونکہ کلام کا عیب سمجھا جاتا ہے اس لیے مجھے یقین تھا کہ آیت کے تیسرے حصے میں ضرور کوئی نئی بات بتائی گئی ہے۔ پھر یکایک میرا ذہن اس طرف منتقل ہو گیا کہ مَا تُسِرُّوْنَ کے لفظ میں ہمارے اُن خیالات و تصورات کا ذکر ہے جنہیں ہم ارادی طور پر چھپاتے ہیں' جبکہ ''سینوں کے رازوں'' سے ہماری سوچوں کے وہ طوفان مراد ہیں جو ہمارے تحت الشعور (subconscious mind) میں اُٹھتے رہتے ہیں اور جن سے اکثر و بیشتر ہم خود بھی بے خبر ہوتے ہیں' بلکہ بسا اوقات ان خیالات کے بارے میں ہم دھوکہ بھی کھا جاتے ہیں۔ چنانچہ آیت کے اس حصے کا مفہوم یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ تو تمہارے تحت الشعور کی تہوں میں اٹھنے والے ان خیالات کو بھی جانتا ہے جنہیں تم خود بھی نہیں جانتے' کیونکہ وہ تو تمہارے جینز (genes) سے بھی واقف ہے: ﴿هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ﴾ (النجم:۳۲) ''وہ تمہیں خوب جانتا ہے اُس وقت سے جب اس نے تمہیں زمین سے اٹھایا تھا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں جنین کی شکل میں تھے۔''

آیت ۵ ﴿اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۠﴾ ''کیا تمہارے پاس خبریں آ نہیں چکی ہیں اُن لوگوں کی جنہوں

نے کفر کیا تھا اس سے پہلے‘‘

قومِ نوحؑ‘ قومِ ہودؑ‘ قومِ صالحؑ اور دوسری اقوام کے واقعات مکّی قرآن میں بار بار دہرائے گئے ہیں۔

﴿فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ﴾ ’’تو انہوں نے اپنے کیے کی سزا چکھ لی‘‘

انہوں نے اللہ تعالیٰ کے رسولوں کو جھٹلایا اور اس کفر کی پاداش میں انہیں ہلاک کر دیا گیا۔

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۵﴾ ’’اور ان کے لیے دردناک عذاب بھی ہے۔‘‘

دنیا کی سزا بھگتنے کے بعد ان اقوام کے افراد ابھی تو عالمِ برزخ میں ہیں‘ لیکن ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو بہت بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے وہ بھی ان کا منتظر ہے۔ اس بڑے عذاب کا سامنا انہیں آخرت میں کرنا پڑے گا۔ اب اگلی آیت میں ان کے کفر کے سبب کا تجزیہ کیا جا رہا ہے۔

آیت ۶ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ﴾ ’’یہ اس لیے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول آتے رہے واضح نشانیاں لے کر‘‘

﴿فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا﴾ ’’تو انہوں نے کہا کہ کیا انسان ہمیں ہدایت دیں گے؟ پس انہوں نے کفر کیا اور رُخ پھیر لیا‘‘

﴿وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝۶﴾ ’’اور اللہ نے بھی (ان سے) بے نیازی اختیار کی۔ اور اللہ تو ہے ہی بے نیاز‘ ستودہ صفات۔‘‘

یعنی ہر قوم کے لوگ صرف اس بنا پر اپنے رسولؑ کا انکار کرتے رہے کہ یہ تو ہماری طرح کا بشر ہے۔ یہ رسول کیسے ہو سکتا ہے؟ ان کے اس رویّے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بھی ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا کہ تم جدھر جانا چاہتے ہو چلے جاؤ۔ یہاں پر یہ نکتہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ جیسے رسالت کا انکار بربنائے بشریت (کہ بشر رسول نہیں ہو سکتا) غلط ہے‘ ایسے ہی بشریت کا انکار بربنائے رسالت (کہ رسول بشر نہیں ہو سکتا) بھی غلط ہے۔ یہ دراصل ایک ہی سوچ کے دو رُخ ہیں۔ جیسے انسانی جسم کے اندر ایک بیماری کسی ایک عضو پر کینسر کی شکل میں حملہ کرتی ہے تو کسی دوسرے عضو پر اثر انداز ہونے کے لیے کسی اور روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نظریاتی بیماری کی ابتدائی صورت یہ سوچ تھی کہ ایک انسان یا بشر اللہ تعالیٰ کا رسول نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ہر قوم نے اپنے رسولؑ پر بنیادی اعتراض یہی کیا کہ یہ تو بشر ہے‘ یہ بالکل ہمارے جیسا ہے‘ ہماری طرح کھاتا پیتا ہے اور ہماری طرح ہی چلتا پھرتا ہے۔ فلاں کا بیٹا ہے‘ فلاں کا پوتا ہے‘ ہمارے سامنے پلا بڑھا ہے۔ یہ رسول کیسے ہو سکتا ہے؟ یعنی انہوں نے بشریت کی بنیاد پر رسولؑ کی رسالت کا انکار کر دیا۔ بعد میں اس بیماری نے دوسری شکل اختیار کر لی۔ وہ یہ کہ جس کو رسول مان لیا پھر اسے بشر ماننا مشکل ہو گیا۔ کسی نے اپنے رسول کو خدا بنا لیا تو کسی نے خدا کا بیٹا۔ صرف اس لیے کہ اسے بشر ماننا انہیں گوارا نہیں تھا۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں حضور ﷺ سے بار بار کہلوایا گیا: ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ﴾ (الکہف: ۱۱۰) کہ اے نبی ﷺ! آپ ڈنکے کی چوٹ پر کہیے اور بار بار کہیے کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں۔ ہاں مجھے یہ امتیاز حاصل ہے کہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ لیکن قرآن مجید کے واضح اور تاکیدی احکام کے باوجود مذکورہ نظریات کے اثرات ہماری صفوں میں بھی در آئے‘ بلکہ ہمارے ہاں تو یہ بھی ہوا کہ اس مسئلے کے تدارک کے نام پر کچھ

لوگ دوسری انتہا پر چلے گئے۔ چنانچہ اس حوالے سے اگر کسی نے ''بڑے بھائی'' کی مثال بیان کی یا اسی نوعیت کی کوئی دوسری دلیل پیش کی تو اُس نے بھی حدِ ادب سے تجاوز کیا۔ ظاہر ہے جب فریقین ایک دوسرے کو غلط ثابت کرنے کے لیے بحث وتکرار کریں گے تو نامناسب الفاظ کا استعمال بھی ہوگا اور غلطیاں بھی ہوں گی۔

بہرحال اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبر انسان ہی تھے' لیکن پیغمبروں کے بعض خصائص ایسے بھی ہوتے ہیں جو عام انسانوں کے نہیں ہو سکتے۔ حضور ﷺ کی سیرت میں ایسے کئی خصائص کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ سے عرض کی کہ آپؐ خود تو صومِ وصال (کئی کئی دنوں کا روزہ اور اس طرح کے یکے بعد دیگرے کئی روزے رکھنے) کا اہتمام فرماتے ہیں لیکن ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتے' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَیُّکُمْ مِثْلِیْ؟ اِنِّیْ اَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِ))[1] ''تم میں سے کون ہے جو مجھ جیسا ہے؟ میں تو اس حال میں رات گزارتا ہوں کہ میرا رب مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے''۔ اسی طرح حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((فَوَ اللّٰہِ مَا یَخْفٰی عَلَیَّ رُکُوْعُکُمْ وَلَا سُجُوْدُکُمْ' اِنِّیْ لَاَرَاکُمْ وَرَاءَ ظَھْرِیْ))[2] ''اللہ کی قسم! (نماز باجماعت میں) تمہارے رکوع اور تمہارے سجدے مجھ پر مخفی نہیں ہوتے' میں تو اپنے پسِ پشت بھی تمہیں دیکھ رہا ہوتا ہوں''۔ صحیح بخاری کی روایات میں وَلَا خُشُوْعُکُمْ کے الفاظ بھی ہیں کہ نماز میں تمہارا خشوع بھی مجھ سے مخفی نہیں ہوتا۔ پھر معراج کے موقع پر آپ ﷺ کا راتوں رات مکہ سے بیت المقدس تشریف لے جانا' اس کے بعد آسمانوں کی سیر کرنا اور سدرۃ المنتہیٰ کے مقام پر خصوصی کیفیات کا مشاہدہ کرنا' یہ سب آپؐ کے امتیازی خصائص ہیں۔

دوسری طرف اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ بنیادی طور پر آپؐ انسان تھے اور انسانی داعیات ومیلانات رکھتے تھے۔ آپؐ کو چوٹ لگتی تو درد محسوس کرتے' غزوۂ اُحد میں زخم آیا تو خون کا فوارہ چھوٹ پڑا' بیٹا فوت ہوا تو آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ کبھی جذبات کی ایسی کیفیت بھی ہوئی کہ زبان سے بددعا بھی نکل گئی: ((کَیْفَ یُفْلِحُ قَوْمٌ خَضَّبُوْا وَجْہَ نَبِیِّھِمْ بِالدَّمِ!))[3] ''وہ قوم کیسے کامیاب ہوگی جس نے اپنے نبیؐ کا چہرہ خون سے رنگین کر دیا!''

بہرحال آپ ﷺ بلاشبہ بشر تھے' جیسا کہ قرآن مجید ہمیں تکرار کے ساتھ بتاتا ہے' لیکن آپؐ کی بشریت کو اللہ تعالیٰ نے وہ مقام عطا فرمایا تھا جو آپؐ کے شایانِ شان تھا —— اب اگلی آیت میں ایمان بالآخرت کا ذکر ہے:

آیت ۷ ﴿زَعَمَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ یُّبْعَثُوْا ؕ﴾ ''کافروں کو یہ زعم ہے کہ وہ (مرنے کے بعد) ہرگز اٹھائے نہیں جائیں گے۔''

﴿قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے: کیوں نہیں! مجھے میرے رب کی قسم ہے' تم لازماً اٹھائے جاؤ گے' پھر تمہیں لازماً جتلایا جائے گا ان اعمال کے بارے میں جو تم نے کیے ہیں۔''

۱۔ صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب التنکیل لمن اکثر الوصال' ح: ۱۹۶۵۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب النھی عن الوصال فی الصوم۔ ح: ۱۱۰۳۔

۲۔ صحیح مسلم' کتاب الصلاۃ' باب الامر بتحسین الصلاۃ واتمامھا والخشوع فیھا۔

۳۔ صحیح ابن ماجہ للالبانی' ح: ۳۲۶۹۔

اس اسلوب میں جو زور اور تاکید ہے انسانی زبان سے اس کا بیان ناممکن ہے! اللہ عزّ وجل کا فرمان' رسول اللہ ﷺ کی قسم اور انتہائی تاکیدی صیغوں کا استعمال! اس سے بڑھ کر زوردار عبارت بھلا اور کون سی ہوگی۔ حضور ﷺ نے بنو ہاشم کو دعوت کے سلسلے میں جو خطبہ دیا تھا اس کا مضمون اور اسلوب بھی اس جملے سے ملتا جلتا ہے۔ میرے کتابچے ''دعوت اِلی اللہ'' میں اس خطبے کا پورا متن موجود ہے۔ اس کتابچے کا انگریزی ترجمہ بھی Call to Allah کے عنوان سے ہو چکا ہے۔ اس خطبے کا اسلوب ملاحظہ ہو:

((وَاللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ ، ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُوْنَ ، ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ، ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَ بِالسُّوْءِ سُوْءًا ، وَاِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا)) (۴)

''خدا کی قسم تم سب مرجاؤ گے جیسے (روزانہ) سوجاتے ہو! پھر یقیناً تم اٹھائے جاؤ گے جیسے (ہر صبح) بیدار ہوجاتے ہو۔ پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہوگا' اور پھر لازماً تمہیں بدلہ ملے گا اچھائی کا اچھائی اور بُرائی کا بُرائی' اور وہ جنت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے دائمی۔''

﴿وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝۷﴾ ''اور یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔''

یہ ابتدائی سات آیات ایمان کے بیان سے متعلق تھیں۔ ان میں پہلی چار آیات ذات وصفاتِ باری تعالیٰ پر ایمان سے متعلق ہیں۔ پھر دو آیات ایمانِ رسالت کے بارے میں ہیں' جبکہ ساتویں آیت کا تعلق ایمان بالآخرت سے ہے۔ اب اگلی تین آیات میں ایمان کی زوردار دعوت دی جارہی ہے:

آیات ۸ تا ۱۰

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۸ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۹ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۱۰ ع ۱۵

آیت ۸ ﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ ''پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول (ﷺ) پر''

یہاں آیت کے آغاز کی ''ف'' بہت اہم ہے۔ گویا گزشتہ چار آیات کے مضمون کا ربط اگلی تین آیات کے مضمون کے ساتھ اس ''ف'' سے قائم ہو رہا ہے۔

﴿وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ۭ﴾ ''اور اُس نُور پر جو ہم نے نازل کیا ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۸﴾ ''اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

اس آیت میں اللہ' رسولؐ اور آخرت سے متعلق تینوں ''ایمانیات'' کا ذکر آ گیا ہے۔ اللہ اور رسولؐ کا ذکر تو واضح ہے لیکن آخرت کا ذکر آیت کے آخری حصے ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ میں اشارتاً ہوا ہے۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ ہر انسان کے ایک ایک عمل کی نگرانی

۴۔ بحوالہ جمھرۃ الخطب' ص ۵۔ وفقہ السیرۃ للالبانی' ص ۹۷۔

محض تحقیق وتدقیق کی غرض سے ہی تو نہیں کر رہا ہے' بلکہ آخرت میں انہیں سزا یا جزا دینے کے لیے کر رہا ہے ـــــ اب اگلی دو آیات خاص طور پر ایمان بالآخرت کی دعوت سے متعلق ہیں:

آیت ۹ ﴿يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۭ﴾ ''جس دن کہ وہ تمہیں جمع کرے گا جمع ہونے کے دن کے لیے' وہی ہے ہار اور جیت کے فیصلے کا دن۔''

اصل جیت بھی اُس دن کی جیت ہے اور اصل ہار بھی اُس دن کی ہار ہے۔ اس کے مقابلے میں دنیا کی ہار یا جیت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ دنیا کی ہار جیت تو کسی ڈرامے کے کرداروں کی ہار جیت کی طرح ہے' جس کا متعلقہ کردار کی حقیقی زندگی سے کچھ بھی تعلق نہیں ہوتا ـــ اب آگے وضاحت کی جا رہی ہے کہ قیامت کے دن کی جیت کس کے حصے میں آئے گی اور اُس دن کی ہار کس کے گلے کا ہار بنے گی۔

﴿وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا﴾ ''اور جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور نیک اعمال کرے''

ان اعمال کی تفصیل آگے آئے گی۔

﴿يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ﴾ ''وہ اس کی برائیوں کو اس سے دور کر دے گا اور اسے ان باغات میں داخل کرے گا جن کے دامن میں نہریں بہتی ہوں گی' وہ اس میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔''

﴿ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۹﴾ ''یہ ہے بہت بڑی کامیابی۔''

یہ جیت کی شرح ہو گئی' یعنی جنت میں داخلہ اور ہمیشہ کا خلود! گویا یہ ہے مستقل' واقعی اور حقیقی جیت! اس کے برعکس ہار کیا ہے؟ اسے اگلی آیت میں واضح فرما دیا گیا:

آیت ۱۰ ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ﴾ ''اور جنہوں نے انکار کیا اور تکذیب کی ہماری آیات کی وہی ہوں گے جہنمی' وہ ہمیشہ رہیں گے اس میں۔''

﴿وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۱۰﴾ ''اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔''

گزشتہ دس آیات میں ایمانیاتِ ثلاثہ (ایمان باللہ' ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت) کی بہترین اور جامع ترین تعبیر بیان ہوئی ہے اور پھر ایمان کے لیے زوردار دعوت دی گئی ہے۔ اس طرح کہ جس موضوع کا بیان مفصل ہے اس کے لیے دعوت مختصراً دی گئی ہے اور جو موضوع مختصر طور پر بیان ہوا ہے اس کی دعوت نسبتاً مفصل انداز میں آئی ہے۔ یعنی ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کا بیان چھ آیات میں ہوا ہے اور ان کے لیے دعوت صرف ایک آیت (آیت ۸) میں دی گئی ہے۔ اس کے مقابل ایمان بالاخرت کا بیان صرف ایک آیت (آیت ۷) میں ہوا ہے لیکن اس کی دعوت کا ذکر دو آیات (آیت ۹ اور ۱۰) میں نسبتاً تفصیل سے ہوا ہے۔

آیات ۱۱ تا ۱۵

مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ‌ؕ وَ مَنۡ يُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ يَهۡدِ قَلۡبَهٗ‌ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۱۱﴾ وَ اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ‌ۚ فَاِنۡ تَوَلَّيۡتُمۡ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ﴿۱۲﴾ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ‌ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۳﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ مِنۡ اَزۡوَاجِكُمۡ وَ اَوۡلَادِكُمۡ عَدُوًّا لَّكُمۡ فَاحۡذَرُوۡهُمۡ‌ۚ وَ اِنۡ تَعۡفُوۡا وَ تَصۡفَحُوۡا وَ تَغۡفِرُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّمَاۤ اَمۡوَالُكُمۡ وَ اَوۡلَادُكُمۡ فِتۡنَةٌ‌ؕ وَ اللّٰهُ عِنۡدَهٗۤ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۵﴾

دوسرے رکوع کی پہلی پانچ آیات میں ثمراتِ ایمانی کا ذکر ہے۔ ان میں سے پہلا ثمرہ یہ ہے:

آیت ۱۱ ﴿مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ‌ؕ﴾ ''نہیں آتی کوئی مصیبت مگر اللہ کے اذن سے۔''

﴿وَمَنۡ يُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ يَهۡدِ قَلۡبَهٗ‌ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۱۱﴾﴾ ''اور جو کوئی اللہ پر ایمان رکھتا ہے' وہ اُس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

ایمانِ حقیقی کی بدولت انسان کے دل کی گہرائیوں میں یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر ایک پتّا تک جنبش نہیں کر سکتا۔ اس لیے اگر اس پر کوئی مصیبت بھی آ جاتی ہے تو اس کا دل مطمئن رہتا ہے کہ یہ اللہ کے حکم سے ہی آئی ہے اور یہ کہ میری بہتری اسی میں ہے: ﴿وَعَسٰۤى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـًٔا وَّهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ‌ۚ وَعَسٰۤى اَنۡ تُحِبُّوۡا شَيۡـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۱۶﴾﴾ (البقرۃ) ''اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی شے کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو درآنحالیکہ وہی تمہارے لیے بُری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے''۔ چنانچہ اپنے اس ایمان اور یقین کی وجہ سے ایک بندۂ مؤمن بڑی سے بڑی تکلیف اور مشکل سے مشکل حالات میں بھی نہ تو دل میں شکوہ کرتا ہے اور نہ ہی حرفِ شکایت زبان پر لاتا ہے' بلکہ وہ ہر حال میں پیکرِ تسلیم و رضا بنا رہتا ہے کہ اے اللہ! میری بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے: بِيَدِكَ الْخَيْرُ! تیری طرف سے میرے لیے خوشی آئے یا غم' مجھے قبول ہے' تیری جو بھی رضا ہو اس کے سامنے میرا سرِ تسلیم خم ہے! بقول غالبؔ:

ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے بے نیازی تری عادت ہی سہی!

ظاہر ہے اس مقامِ خاص تک صرف سچے اور مخلص اہلِ ایمان ہی پہنچ پاتے ہیں۔ ایمانِ حقیقی سے محروم دلوں کے نصیب میں تسلیم و رضا کی حلاوت کہاں: ؎

نہ شود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی!

علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں مقامِ تسلیم و رضا کی برکات کا ذکر بڑے پُرشکوہ انداز میں کیا ہے: ؎

بروں کشید ز پیچاکِ ہست و بود مرا چہ عقدہ ہا کہ مقامِ رضا کشود مرا!

(اس مقامِ رضا نے میرے کیسے کیسے عقدے حل کر دیے ہیں اور مجھے دنیا کی کیسی کیسی پریشانیوں سے نجات دلا دی ہے۔)

خوئے تسلیم و رضا کی وجہ سے انسان اپنا بڑے سے بڑا مسئلہ بھی اللہ کے سپرد کر کے مطمئن ہو جاتا ہے اور جو انسان اس یقین سے محروم ہے وہ دن رات اسی پیچ و تاب میں پڑا رہتا ہے کہ یہ سب کیسے ہو گیا؟ آخر یہ میرے ساتھ ہی کیوں ہوا؟ اگر میں اس وقت ایسا کر لیتا تو اس نقصان سے بچ جاتا! اگر میرا فلاں دوست عین وقت پر ایسا نہ کرتا تو ایسا نہ ہوتا! کاش میں یوں کر لیتا! کاش' اے کاش! .....گویا انسان اگر مقامِ تسلیم و رضا سے نا آشنا ہو تو چھوٹے چھوٹے واقعات بھی اس کے دل کا روگ بن جاتے ہیں اور اس کے پچھتاوے کبھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔ (سورۃ الصف' سورۃ الجمعہ' سورۃ المنافقون اور سورۃ التغابن' یہ چاروں سورتیں ہمارے ''مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب'' میں شامل ہیں' جس کے مفصل دروس کی ریکارڈنگ موجود ہے۔ مزید تفصیل کے لیے اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔)

اس حوالے سے یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اللہ کی رضا پر راضی رہنے اور ہر سختی یا تکلیف کو اُس کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لینے کا تعلق انسان کے ایمان اور دل سے ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آپ کسی جرم کے خلاف قانونی چارہ جوئی نہ کریں یا اپنے ساتھ ہونے والی کسی زیادتی کا بدلہ نہ لیں۔ بہرحال ایمان کے ثمرات میں سے پہلا ثمرہ یہ ہے کہ حقیقی ایمان انسان کو مقامِ تسلیم و رضا سے آشنا کرتا ہے۔ لیکن اس کا تعلق چونکہ انسان کے احساسات سے ہے اس لیے یوں کہہ لیجیے کہ یہ وہ پھول ہے جو ایک بندۂ مؤمن کے دل کے اندر کھلتا ہے' باہر سے نظر نہیں آتا۔ باہر سے نظر آنے والے بڑے پھول کا ذکر اگلی آیت میں آ رہا ہے۔

آیت ۱۲ ﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ ''اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی۔''

﴿فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۝۱۲﴾ ''پھر اگر تم نے پیٹھ موڑ لی تو جان لو کہ ہمارے رسول (ﷺ) کے ذمے تو صرف صاف صاف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔''

اللہ کے رسول ﷺ نے اللہ کے احکام لوگوں تک پہنچا کر اپنی ذمہ داری پوری کر دی ہے۔ ان احکام کے بارے میں اب ہر کوئی خود جواب دہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے واضح احکام کے مقابلے میں اب کسی انسان کی دلیل بازی نہیں چلے گی۔ جیسے سود کی حرمت کا حکم سن کر بعض لوگوں نے کہا تھا: ﴿اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾ کہ کاروبار کا منافع بھی تو ربا (سود) ہی کی مانند ہے! ایسے لوگوں کو واضح طور پر بتا دیا گیا کہ: ﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ (البقرۃ:۲۷۵) کہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے۔ اب بھلا تم کون ہو اللہ کے واضح حکم کے بعد اپنی منطق بگھارنے والے؟ اگر تم اللہ کو مانتے ہو' اُس کے رسولؐ کو مانتے ہو' اُس کے قرآن کو مانتے ہو تو پھر اللہ' اُس کے رسول ﷺ اور قرآن کے احکامات کے مقابلے میں تمہاری کوئی دلیل نہیں چلے گی۔ تمہیں سب احکام بے چون و چرا تسلیم کرنے ہوں گے۔ بقول اکبر الٰہ آبادی: ؎

رضائے حق پر راضی رہ' یہ حرفِ آرزو کیسا! خدا خالق' خدا مالک' خدا کا حکم' تو کیسا؟

اور اگر نہیں مانتے ہو تو سیدھی طرح اقرار کرو کہ ہم نہیں مانتے۔ بس تمہارے پاس یہی دو راستے ہیں' یا تو اطاعت و فرمانبرداری کی روش اپناؤ یا پھر اُس کے در سے اُٹھ کر چلے جاؤ! (either obey or go away)۔ تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔

آیت ۱۳ ﴿اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَعَلَی اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۳﴾ ''اللہ وہ ہے کہ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ پس اہلِ ایمان کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے۔''

اے اہلِ ایمان! اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو تمہیں یقین ہونا چاہیے کہ اللہ کی مرضی کے بغیر ایک ذرّہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے کرنے سے کچھ نہیں ہوگا' جو کچھ بھی ہوگا وہ اللہ کی مشیت اور مرضی سے ہوگا۔ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ محنت کرو اور اس کا نتیجہ اللہ پر چھوڑ دو۔ اگر تم کوئی کام کرنے کی استطاعت بھی رکھتے ہو' تمہارے پاس تمام وسائل بھی موجود ہیں اور تم حالات کو بھی کلّی طور پر سازگار دیکھتے ہو تو بھی کبھی مت کہنا کہ مَیں یہ کام ضرور کر لوں گا۔ اگر تم ایسا دعویٰ کر بیٹھو گے تو ایمان سے دور ہو جاؤ گے: ﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (الکھف) ''اور کسی چیز کے بارے میں کبھی یہ نہ کہا کریں کہ مَیں یہ کام کل ضرور کروں گا۔ مگر یہ کہ اللہ چاہے!'' کثرتِ وسائل کے زعم میں فتح کی امید رکھو گے تو وہی حال ہوگا جو لشکرِ اسلام کا وادیٔ حنین میں ہوا تھا۔ وادیٔ حنین میں دشمن کی تیراندازی کی وجہ سے اہلِ ایمان کی صفوں میں ایسی بھگدڑ مچی تھی کہ بارہ ہزار کے لشکر میں سے' سیّد سلیمان ندویؒ کی تحقیق کے مطابق تین چار سو اور اُن کے استاد مولانا شبلی نعمانیؒ کے مطابق صرف تیس چالیس لوگ حضور ﷺ کے ساتھ کھڑے رہ گئے تھے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۲۵ میں اس کا سبب بھی بتا دیا گیا: ﴿اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ﴾ (التوبۃ:۲۵) کہ اُس دن اہلِ ایمان میں سے بعض لوگوں کے دلوں میں اپنی کثرتِ تعداد کا زعم پیدا ہو گیا تھا۔ بہرحال مؤمنین کو ہر طرح کے حالات میں اللہ تعالیٰ پر ہی توکّل کرنا چاہیے اور صادق الایمان مؤمنین ہر حالت میں بلاشبہ اللہ پر ہی توکّل کرتے ہیں۔ یہ توکّل علی اللہ بھی شجرِ ایمان کا وہ پھول ہے جو اہلِ ایمان کے دلوں اور ذہنوں کے اندر کھلتا ہے۔ گویا یہ ایمان کا تیسرا ثمرہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں تہذیب و تمدن کی گاڑی کو چلانے کے لیے ''علائقِ دنیوی'' کے ضمن میں بہت سی فطری محبتیں انسان کے دل میں ڈال دی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان محبتوں میں سب سے زیادہ قوی محبت بیویوں اور اولاد کی محبت ہے۔ اس طبعی محبت کی طرف اگلی آیت میں متنبہ فرمایا گیا کہ اگر اس میں حدِ اعتدال سے تجاوز ہو جائے تو یہی محبت انسان کے لیے دشمنی کا روپ دھار لے گی۔ لہٰذا اس کے ضمن میں احتیاط کی ضرورت ہے:

آیت ۱۴ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ﴾ ''اے ایمان کے دعوے دارو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں' سو اُن سے بچ کر رہو۔''

یہ بہت مشکل اور نازک معاملہ ہے۔ گزشتہ سورت میں رسول اللہ ﷺ کو منافقین کی عداوت سے بھی انہی الفاظ میں خبردار کیا گیا تھا: ﴿هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ﴾ (المنٰفقون:۴) کہ یہ لوگ تمہارے دشمن ہیں' ان سے بچ کر رہیے! جس طرح منافقین کی دشمنی تمہارے لیے نقصان دہ ہے' اسی طرح تمہارے بیوی بچوں کی محبت بھی تمہیں نقصان پہنچا سکتی ہے۔ نقصان بے شک کسی کی دشمنی کی وجہ سے ہو یا محبت کی وجہ سے' نقصان ہی ہے اور جو کوئی بھی آپ کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو وہ ظاہر ہے آپ کا دشمن ہے۔ بیوی کی بے جا فرمائشیں اور بچوں کی حد سے بڑھی ہوئی ضروریات اگر حلال کی کمائی سے پوری نہیں ہوں گی تو انسان کیا کرے گا؟ ظاہر ہے حرام میں منہ مارے گا۔ اور اگر کوئی یہ نہیں کرے گا تو ڈالر اور پیٹرو ڈالر کمانے کے چکر میں ملک سے باہر چلا جائے گا۔ پیچھے سے بیوی بچے کیا کرتے ہیں؟ بوڑھے والدین کس حال میں ہیں؟ انہیں بیماری کی حالت میں ڈاکٹر کے پاس کون لے کر جائے گا؟ اُس کی بلا جانے! اس کی اپنی مجبوری ہے' مکان بنانا ہے' بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانی ہے' ان کی شادیاں کرنی ہیں اور اس سب کچھ کے لیے سرمایہ چاہیے۔ اور ظاہر ہے سرمایہ گھر بیٹھے تو نہیں ملتا' نہ ہی حلال کی کمائی سے ملتا ہے۔

اگر کسی کو اللہ تعالیٰ نے دین کی سمجھ اور آخرت کی فکر عطا کی ہے اور وہ حرام سے بچتے ہوئے روکھی سوکھی کھا کر گزارا کرنا چاہتا ہے تو اسے صبح و شام بیوی کے طعنے چین نہیں لینے دیتے کہ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے' تمہیں بچوں کے مستقبل کی فکر بھی نہیں۔ ذرا ہمسائے سے ہی سبق حاصل کر لیتے' کیا وہ مسلمان نہیں ہیں؟ وہ تم سے زیادہ نمازیں پڑھتے ہیں' ان کی داڑھی بھی تم سے لمبی ہے' مگر وہ دین کے ساتھ ساتھ دنیا کو بھی نبھا رہے ہیں۔ ذرا دیکھو ان کے بیوی بچے کیسے عیش کر رہے ہیں اور کون نہیں جانتا کہ یہ سب کچھ اوپر کی کمائی سے ہو رہا ہے۔ اب تم کیا ان سے بھی بڑے دین دار ہو کہ جو سب کچھ ان کے لیے حلال ہے تم اسے اپنے اوپر خواہ مخواہ حرام کر کے بیٹھ گئے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔

آج ہمارے ہاں کے روایتی مسلمانوں کو تو بیوی بچوں کی دشمنی والی یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی' لیکن اگر کوئی بندۂ مؤمن اللہ تعالیٰ کی توفیق سے کسی انقلابی تحریک کے کارکن کی حیثیت سے اقامتِ دین کی جدّ و جہد میں مصروف ہے تو اس پر یہ حقیقت بہت جلد واضح ہو جائے گی کہ اس راستے میں بیوی بچوں کی محبت کس طرح پاؤں کی زنجیر بنتی ہے۔ یہ معاملہ چونکہ بہت نازک اور حساس ہے اس لیے اس سخت حکم کے بعد اگلے جملے میں اس ضمن میں نرمی اختیار کرنے کی ہدایت بھی کی جا رہی ہے۔ قوانین اور احکام کا یہ توازن کلامِ الٰہی کا خاص معجزہ ہے اور اس اعتبار سے یہ آیت اعجازِ قرآن کی بہت بڑی مثال ہے۔ ایک طرف متنبہ بھی کر دیا کہ تمہیں اپنے اہل و عیال کے معاملے میں سانپ کی طرح ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بیوی اور اولاد کی محبت تمہیں کسی غلط راستے پر ڈال دے۔ لیکن اگلے جملے میں عفو و درگزر کا حکم بھی دے دیا کہ تم اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے اپنے اہل و عیال کے معاملات کو نرمی اور حکمت سے نبٹاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا گھر صبح و شام میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کرنے لگے:

﴿وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٤﴾﴾ ''اور اگر تم معاف کر دیا کرو اور چشم پوشی سے کام لو اور بخش دیا کرو تو اللہ بہت بخشنے والا' نہایت مہربان ہے۔''

اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ بھی عفو و درگزر کا معاملہ فرمائے تو تم بھی اپنے اہل و عیال کے ساتھ ایسا ہی رویہ اختیار کرو۔ سورۃ النور کی اس آیت میں بھی بالکل یہی اسلوب نظر آتا ہے: ﴿وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٢﴾﴾ ''اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر سے کام لیں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے؟ اور اللہ بہت بخشنے والا' نہایت مہربان ہے''۔ یہ آیت واقعہ افک کے حوالے سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ آپؓ نے اپنے ایک نادار رشتہ دار (حضرت مِسطحؓ) کی کفالت کا ذمہ لے رکھا تھا' لیکن جب آپؓ کو معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر کیچڑ اچھالنے میں اس کا بھی حصہ تھا تو آپؓ نے اس کی مدد سے ہاتھ روک لیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اگر تم خود اللہ سے معافی کے خواستگار ہو تو تم اسے معاف کر دو۔ بہرحال ان دونوں آیات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف اللہ تعالیٰ خود بہت معاف اور درگزر کرنے والا ہے بلکہ اپنے بندوں سے بھی وہ ایسے ہی رویے کو پسند کرتا ہے۔

زیر مطالعہ آیات میں اب تک ایمان کے چار ثمرات کا ذکر ہوا ہے۔ ان میں سے پہلے تین کا تعلق تو ایک فرد کی انفرادی زندگی سے ہے' جبکہ چوتھا ثمرہ فرد کے گرد بننے والی اجتماعیت کے پہلے حلقے یعنی اس کے افرادِ خانہ سے متعلق ہے۔ انفرادی سطح کے تین ثمرات کو میں نے بندۂ مؤمن کی شخصیت کے چمن میں کھلنے والے خوبصورت پھولوں سے تشبیہہ دی ہے۔ ان میں سے دو پھول تو وہ ہیں جو

اس کے دل کے اندر کھلتے ہیں اور باہر سے ہر کسی کو نظر نہیں آتے' یعنی خوئے تسلیم و رضا اور توکل علی اللہ۔ جبکہ تیسرا پھول اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کا پھول ہے' جو شخصیت کے خارج میں کھلتا ہے۔ ظاہر ہے اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کے حکم میں تو پورے کے پورے دین کا احاطہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے معاشرے میں رہتے ہوئے یہ پھول بجا طور پر بندۂ مؤمن کی شخصیت کا طُرّۂ امتیاز بنتا ہے۔

ایمان کے چوتھے ثمرے کا تعلق بندۂ مؤمن کی عائلی زندگی سے ہے۔ اس حوالے سے آیت زیر مطالعہ ہمیں انتہائی متوازن اور معتدل رویے کا شعور عطا کرتی ہے۔ اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے ہمیں اہل و عیال کی طبعی محبتوں کے منفی اثرات سے ہوشیار بھی رہنا ہے اور ساتھ ہی ساتھ عفو و درگزر کی حکمتِ عملی اپناتے ہوئے گھر کی فضا کو محاذ آرائی اور نفرت کے تکدر سے محفوظ رکھنے کی کوشش بھی کرتے رہنا ہے —— اب اسی حوالے سے دوسری اصولی اور انتہائی اہم بات:

آیت ۱۵ ﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ﴾ ''تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے امتحان ہیں۔''

تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ مال و دولت دنیا' یہ رشتہ و پیوند تمہاری آزمائش کا ذریعہ ہیں: ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاۗءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ﴾ (آل عمران:۱۴) ''مزین کر دی گئی ہے لوگوں کے لیے مرغوباتِ دنیا کی محبت جیسے عورتیں اور بیٹے اور جمع کیے ہوئے خزانے سونے کے اور چاندی کے اور نشان زدہ گھوڑے اور مال مویشی اور کھیتی''۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے دلوں میں یہ محبتیں پیدا ہی ان کو آزمانے کے لیے کی ہیں۔ اس کا تو اعلان ہے کہ میرے جس بندے کے دل میں مجھ تک پہنچنے کی تڑپ ہے' اسے ان تمام رکاوٹوں اور آزمائشوں کو عبور کر کے آنا ہوگا: ؎

انہی پتھروں پہ چل کر اگر آ سکو تو آؤ — مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے!

حضور ﷺ کا فرمان ہے:

((حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ وَحُجِبَتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ))(۵)

''جہنم کو نفس کی مرغوب چیزوں سے ڈھانپ دیا گیا ہے اور جنت کو ناپسندیدہ چیزوں سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔''

ان ناپسندیدہ چیزوں میں مال و اولاد کی محبتوں کی قربانی سرِفہرست ہے۔ آج اگر کسی شخص کے بارے میں آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ اس کے دل میں کتنا ایمان ہے تو یہ دیکھ لیجیے کہ وہ اپنی اولاد کو کیا بنانا چاہتا ہے۔ بظاہر ایک شخص اگر بہت بڑا عالمِ دین' صوفی' مسند نشین اور پیرِ طریقت ہے لیکن اپنی اولاد کو وہ ایمان و آخرت کے راستے پر ڈالنے کے بجائے پیسے بنانے والی مشین بنانے کی کوشش میں ہے تو جان لیجیے کہ اس کے باطن میں دین اور دینی اقدار کی کوئی اہمیت نہیں ہے —— اب اس سلسلے کی تیسری بات سنیے:

﴿وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۱۵﴾ ''اور اللہ ہی کے پاس اجرِ عظیم ہے۔''

تمہارے اعمال کا اصل اجر اور بدلہ تمہیں اللہ تعالیٰ سے ملے گا' لہٰذا کسی اور سے کسی اجر کی توقع نہ رکھنا۔ اولاد کے بارے میں بھی مت امید رکھنا کہ وہ تمہارے بڑھاپے کا سہارا بنے گی۔ ہو سکتا ہے یہی اولاد جس کے لیے آج تم اپنا ایمان تک داؤ پر لگانے کو تیار ہو جاتے ہو' بڑھاپے میں تمہیں ٹھوکریں مارے اور بعض اوقات اولاد کی زبان کی ٹھوکریں والدین کے لیے ان کی پاؤں کی ٹھوکروں

۵۔ صحیح الجامع للالبانی' ح:۳۱۲۶۔

سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ اس تکلیف کی کیفیت اُس باپ سے پوچھیں جس کا بیٹا اس کے سامنے سینہ تان کر کہتا ہے: ابا جان آپ ہمیشہ بے موقع بات کرتے ہیں‘ اس معاملے میں آپ خاموش رہیں‘ آپ کو کیا معلوم کہ زمانہ کہاں سے کہاں چلا گیا ہے!

آیات ۱۶ تا ۱۸

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَ اسْمَعُوْا وَ اَطِيْعُوْا وَ اَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾

اس سورۂ مبارکہ کی آخری تین آیات ایمان کے عملی تقاضوں کو بالفعل ادا کرنے کی دعوت پر مشتمل ہیں۔

آیت ۱۶ ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا﴾ ’’پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اپنی حدِ امکان تک‘ اور سنو اور اطاعت کرو‘‘

گویا ایمان باللہ کا عملی تقاضا یہ ہے کہ انسان میں اللہ کا تقویٰ پیدا ہو جائے‘ اور تقویٰ بھی تھوڑا بہت نہیں‘ بلکہ امکانی حد تک‘ جتنا اس کے حدِ استطاعت میں ہے —— البتہ کسی انسان میں کتنی استطاعت و استعداد اور وسعت و طاقت ہے جس کے مطابق وہ مکلف اور جواب دہ ہے‘ اس کا صحیح شعور و ادراک بسا اوقات اسے خود نہیں ہوتا اور وہ اپنے آپ کو دین کے عملی تقاضوں کے ضمن میں رعایتیں دیتا چلا جاتا ہے‘ حالانکہ انسان کا خالق خوب جانتا ہے کہ اس نے اس میں کتنی استطاعت‘ استعداد اور وسعت رکھی ہے۔ چنانچہ وہ اسی کے مطابق ہر انسان کا محاسبہ اور مؤاخذہ فرمائے گا۔

ایمان کے بیان میں دوسرے نمبر پر ذکر تھا ایمان بالرسالت کا‘ لہٰذا یہاں ایمان کا دوسرا عملی تقاضا ’’سمع و طاعت‘‘ کے حوالے سے بیان ہوا‘ جس کا نقطۂ آغاز عملی اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کی ذات و شخصیت ہے —— سمع و طاعت کا تعلق اصلاً ایمان باللہ سے ہے‘ لیکن عملاً اس کا تعلق ایمان بالرسالت سے ہے‘ اس لیے کہ اگرچہ مُطاعِ حقیقی تو اللہ ہی ہے‘ مگر اللہ کا نمائندہ اور اُس کے اِذن سے بالفعل ’’مُطاع‘‘ بن کر رسول آتا ہے تو اُس کی اطاعت گویا اللہ کی اطاعت ہی ہے۔ جیسے سورۃ النساء میں فرمایا گیا: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ (آیت ۸۰) ’’جس نے رسولؐ کی اطاعت کی درحقیقت اُس نے اللہ کی اطاعت کی۔‘‘

دوسری بات یہ ہے کہ یہاں پر وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا کا حکم خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس حوالے سے قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ قبل ازیں آیت ۱۲ میں جب وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ کا واضح حکم آ چکا ہے تو اب یہاں کون سی اطاعت کے لیے بلایا جا رہا ہے؟ اس مسئلے کو یوں سمجھئے کہ حضور ﷺ اپنی حیاتِ مبارکہ میں مختلف مواقع پر مختلف امور کے لیے امیر مقرر فرمایا کرتے تھے۔ حضور ﷺ کے مقرر کردہ امیر کی اطاعت بھی متعلقہ اہلِ ایمان پر اسی طرح لازم تھی جیسے کہ خود حضور ﷺ کی اطاعت۔ اس بارے میں حضور ﷺ کا یہ فرمان بہت واضح ہے:

((مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ، وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ ، وَمَنْ اَطَاعَ اَمِيْرِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ ، وَمَنْ

عَصٰی اَمِیْرِی فَقَدْ عَصَانِی))(۶)

''جس نے میری اطاعت کی اُس نے اصل میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی' اور جس نے میری نافرمانی کی اُس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ اور جس نے میرے (مقرر کیے ہوئے) امیر کی اطاعت کی اُس نے گویا میری اطاعت کی اور جس نے میرے (مقرر کیے ہوئے) امیر کی نافرمانی کی اُس نے گویا میری نافرمانی کی۔''

غزوۂ اُحد میں تیراندازوں کی جس نافرمانی پر سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۲ میں بھی وعید آئی اور جس کی وجہ سے مسلمانوں کو اجتماعی سزا بھی دی گئی وہ دراصل حضور ﷺ کی براہِ راست نافرمانی نہیں تھی بلکہ آپؐ کے مقرر کردہ کمانڈر کے حکم کی نافرمانی تھی۔ اسی حوالے سے یہاں یہ نکتہ بھی ذہن نشین کر لیجیے کہ امیر کی اطاعت صرف حضور ﷺ کی زندگی میں ہی لازم نہیں تھی بلکہ قیامت تک کے لیے لازم ہے اور آیت زیر مطالعہ میں دراصل اسی اطاعت کا ذکر ہے۔ مطلب یہ کہ دعوت و اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے مشن کو تو قیامت تک زندہ رہنا ہے۔ ہر زمانے میں اللہ کی مشیت اور توفیق سے اللہ کے بندے اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے اٹھتے رہیں گے اور اہلِ ایمان کو دعوت دیتے رہیں گے۔ چنانچہ ہر دور کے اہلِ ایمان پر لازم ہے کہ جب بھی اللہ کا کوئی بندہ رسول اللہ ﷺ کے مشن کا علمبردار بن کر اٹھے اور مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ کی صدا بلند کرے تو وہ اس کی بات سنیں۔ پھر اگر ان کا دل گواہی دے کہ اس کی دعوت خلوص و اخلاص پر مبنی ہے تو اُس کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اس کے اعوان و انصار بنیں اور اس کی اطاعت کریں۔ جیسے ماضی قریب میں سید احمد بریلوی' حسن البناء شہید' مولانا الیاس اور مولانا مودودی رحمہم اللہ اپنے اپنے زمانے میں پورے خلوص کے ساتھ دعوت و اقامتِ دین کے علمبردار بن کر کھڑے ہوئے تھے اور بہت سے اہلِ ایمان نے اللہ کی توفیق سے ان کی آواز پر لبیک بھی کہا۔

یہ آیت آج ہم سے بھی تقاضا کرتی ہے کہ ہم ایسے ''داعی الی اللہ'' کی تلاش میں رہیں۔ پھر اگر ہمارا دل گواہی دے کہ اللہ کا فلاں بندہ واقعی خلوصِ نیت سے رسول اللہ ﷺ کے مشن کو لے کر کھڑا ہوا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اُس کی پکار پر لبیک کہیں' تاکہ اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے لیے سمع و طاعت کی بنیاد پر ایک مربوط و مضبوط و منظم جماعت وجود میں آ سکے۔ ظاہر ہے اگر مسلمان خود کو ایک امیر کے تحت ایسی جماعت کی شکل میں منظم نہیں کریں گے تو ان کی حیثیت ایک ہجوم کی سی رہے گی۔ ذرا تصور کریں! ہر سال حج کے لیے لاکھوں مسلمانوں کا جو ''ہجوم'' اکٹھا ہوتا ہے' اگر یہ لوگ کسی ایک امیر کے تحت ایک جماعت کی شکل میں منظم ہوتے تو ایک عظیم الشان انقلاب برپا کر دیتے۔ اس موضوع پر علامہ اقبال کا یہ شعر بہت بصیرت افروز ہے: ؎

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں　　عیدِ محکوماں ہجومِ مؤمنیں!

ایمانیات کے ضمن میں آخر میں ایمان بالآخرت کا ذکر تھا' جس کا اہم ترین عملی مظہر انفاق فی سبیل اللہ ہے:

﴿وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِکُمْ ؕ﴾ ''اور خرچ کرو (اللہ کی راہ میں) یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔''

﴿وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۶﴾﴾ ''اور جو کوئی اپنے جی کے لالچ سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ ہوں گے فلاح پانے والے۔''

۶۔ صحیح البخاری' کتاب الجهاد و السیر' باب تعامل من وراء الامیر ویتقی به۔ و صحیح مسلم' کتاب الامارة' باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصیة...

یعنی جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ نے تمہیں دے رکھا ہے وہ اُس کے راستے میں نچھاور کر دو۔ جیسا کہ سورۃ الحدید میں فرمایا گیا ہے:

﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝﴾

''ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول (ﷺ) پر اور خرچ کرو اس سب میں سے جس پر اس نے تمہیں خلافت عطا کی ہے۔ تو جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور انہوں نے (اپنے مال و جان کو بھی) خرچ کیا' ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔''

آیت ۱۷ ﴿اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ﴾ ''اگر تم اللہ کو قرضِ حسنہ دو گے تو وہ اسے تمہارے لیے کئی گنا بڑھا دے گا اور تمہیں بخش دے گا۔''

﴿وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝۱۷﴾ ''اور اللہ شکور (یعنی قدر دان) بھی ہے اور حلیم (یعنی بُردبار) بھی۔''

وہ ایسا شکور ہے کہ بندہ جو کچھ بھی اُس کی راہ میں خرچ کرتا ہے وہ اس کی قدر کرتا ہے اور حلیم ایسا ہے کہ اُس کے بار بار ترغیب دلانے کے باوجود بھی اگر کوئی شخص کچھ نہیں دیتا وہ فوری طور پر اس کی گردن نہیں ناپتا۔

آیت ۱۸ ﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱۸﴾ ''جاننے والا ہے چھپے اور کھلے سب کا' وہ بہت زبردست ہے' کمال حکمت والا ہے۔''

یعنی وہ غائب و حاضر' چھپے اور کھلے سب کا جاننے والا ہے۔ اس میں ایک جانب تقویٰ' اطاعت اور انفاق پر کاربند رہنے والے اہلِ ایمان کے لیے بشارت اور یقین دہانی مضمر ہے کہ وہ مطمئن رہیں کہ ان کی کوئی نیکی ضائع جانے والی نہیں ہے اور دوسری طرف اعراض و انکار کی روش اختیار کرنے والوں کے لیے تہدید و تنبیہہ بھی ہے کہ تمہاری کوئی حرکت اللہ سے پوشیدہ نہیں اور وہ تمہیں کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے کامل غلبہ و اقتدار کا مالک ہے۔ اس لیے کہ وہ ''العزیز'' ہے۔ اور اگر وہ تمہاری گرفت فوری طور پر نہیں کر رہا بلکہ تمہیں مہلت اور ڈھیل دیے جا رہا ہے تو یہ اُس کی حکمتِ کاملہ کا مظہر ہے' اس لیے کہ جہاں وہ ''العزیز'' ہے وہاں وہ ''الحکیم'' بھی ہے۔

نوٹ کیجیے! اس سورت کا اختتام الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ پر ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہ دو اسماء گزشتہ چاروں المُسَبِّحات (سورۃ الحدید' سورۃ الحشر' سورۃ الصف' سورۃ الجمعہ) کے آغاز میں آئے ہیں۔ گویا ان اسماء کو المُسَبِّحات کے ساتھ خصوصی نسبت ہے۔ چنانچہ زیر مطالعہ سورت (سورۃ التغابن بھی المُسَبِّحات میں سے ہے) کے آغاز میں یہ دونوں نام نہیں آئے تو اختتام پر آ گئے ہیں۔

سُوْرَۃُ الطَّلَاقِ

تمہیدی کلمات

زیر مطالعہ مدنی سورتوں کے گلدستے کا آخری اور نہایت ہی حسین جوڑا سورۃ الطلاق اور سورۃ التحریم پر مشتمل ہے۔ ان دونوں سورتوں کی باہمی مناسبت اور مماثلت کی ایک علامت تو یہ ہے کہ دونوں کا آغاز یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ کے کلمہ سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا مضمون بھی مشترک ہے۔ دونوں سورتوں میں اسلام کے معاشرتی نظام بلکہ خاص طور سے عائلی نظام سے متعلق نکات زیر بحث آئے ہیں۔ عائلی قوانین اور معاشرتی اقدار کی جزئیات وتفصیلات کو قرآن مجید میں جس اہتمام سے بیان کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ موضوع خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس حوالے سے قرآن مجید پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ سورۃ البقرۃ کے مسلسل چار رکوع اور سورۃ النساء کے متعدد مباحث اس موضوع کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ پھر سورۃ النور اور سورۃ الاحزاب میں بھی اس موضوع سے متعلق تفصیلی ہدایات دی گئی ہیں۔ سورۃ المجادلہ کا آغاز بھی ایک عائلی مسئلے (ظہار) سے ہوتا ہے اور پھر سورۃ الطلاق اور سورۃ التحریم دو مکمل سورتیں بھی اسی مضمون سے متعلق ہیں۔

میاں بیوی کا جوڑا چونکہ انسانی معاشرے کی بنیادی اکائی ہے اس لیے معاشرے کو درست رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان دو افراد کے باہمی تعلقات توازن اور اعتدال کی حدود کے اندر رہیں۔ اس کی مثالی صورت تو یہ ہے کہ دونوں میاں بیوی بحیثیت مسلمان ایک طرف اللہ تعالیٰ کے حقوق کما حقہٗ ادا کرنے والے ہوں اور دوسری طرف وہ ایک دوسرے کے ان حقوق کی ادائیگی پر بھی کمربستہ رہتے ہوں جو اسلام نے ان پر عائد کیے ہیں۔ یہاں ضمنی طور پر یہ بھی سمجھ لیجیے کہ مرد اور عورت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ بنیادی دینی فرائض تو ایک جیسے ہی ہیں' مثلاً نماز' روزہ' زکوٰۃ' حج وغیرہ کی ادائیگی کا اہتمام شرعی احکام وحدود کی روشنی میں اپنی اپنی جگہ دونوں کو کرنا ہے۔ البتہ دعوت وتبلیغ کی فرضیت کے حوالے سے عورت کا دائرۂ عمل عورتوں اور محرم مَردوں تک محدود ہو جاتا ہے۔ جبکہ اقامتِ دین کی جدّوجُہد (خصوصی طور پر جہاد وقتال) میں عورتیں حسبِ استطاعت بالواسطہ کردار ادا کرنے کی ہی مکلّف ہیں۔ مثلاً وہ اپنے بیٹوں' بھائیوں اور شوہروں کو ایسے سازگار حالات اور مواقع فراہم کر سکتی ہیں جن میں وہ اقامتِ دین کے حوالے سے اپنی ذِمّہ داریاں یکسوئی کے ساتھ ادا کر سکیں۔ بہرحال ایک مثالی اور متوازن عائلی زندگی کا نقشہ یہی ہے کہ میاں بیوی دونوں اپنے اپنے فرائض ذِمّہ داری اور خوش اسلوبی سے ادا کرنے والے ہوں۔

اس حوالے سے دوسری امکانی صورت یہ ہے کہ میاں بیوی کی طبیعتوں میں عدم موافقت کی وجہ سے گھر کے معاملات معمول کے مطابق نہ چل رہے ہوں اور حقوق وفرائض کی ادائیگی میں بھی مسلسل کوتاہی ہو رہی ہو۔ ظاہر ہے اس کی وجہ سے گھر میں ہر وقت لڑائی جھگڑے کا ماحول رہے گا' اور اگر یہ اختلاف بڑھتا جائے گا تو طلاق کی نوبت بھی آ سکتی ہے۔ چنانچہ ایسی صورتِ حال سے متعلق مسائل

سورۃ الطلاق میں بیان ہوئے ہیں (واضح رہے کہ طلاق کے مسائل اور قوانین وضوابط کا ذکر سورۃ البقرۃ اور سورۃ النساء میں بھی آیا ہے)۔ گھریلو زندگی میں عدمِ توازن کی دوسری انتہا یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی اور اہل وعیال کی اس حد تک دلجوئی کرے کہ اس میں شریعت کے احکام اور دعوت واقامتِ دین کی جدّوجُہد کے تقاضوں کا بھی خیال نہ رہے۔ یہ موضوع سورۃ التحریم میں آئے گا۔

یہاں پر یہ نکتہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ اگرچہ ان دونوں سورتوں میں خصوصی طور پر یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ کے الفاظ میں براہِ راست حضور ﷺ کو مخاطب کیا گیا ہے، لیکن اصل میں اس سے اُمّت کی تعلیم مقصود ہے اور اس مقصد کے لیے حضور ﷺ کو اُمّت کے معلّم کی حیثیت سے مخاطب کیا گیا ہے۔ یہ نکتہ سورۃ الطلاق کی پہلی آیت کے حکم سے مزید واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی اس حکم کا حضور ﷺ کی ذات سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ آپؐ نے نہ تو اپنی کسی زوجہ کو طلاق دی اور نہ ہی آپؐ کو طلاق دینے کی اجازت تھی۔ اس لیے کہ سورۃ الاحزاب کی آیت ۶ میں حضور ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو اُمّت کی مائیں قرار دیا گیا ہے اور سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۳ کے مطابق حضور ﷺ کے بعد بھی وہ کسی اور سے نکاح نہیں کر سکتی تھیں۔ لہٰذا آپؐ کا اپنی ازواجِ مطہراتؓ میں سے کسی کو طلاق دینے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اسی لیے سورۃ الاحزاب ہی کی آیت ۵۰ میں آپؐ کو چار ازواج کے بعد مزید نکاح کرنے کی خصوصی اجازت مرحمت فرمائی گئی —— ان دونوں سورتوں پر میرے مفصّل لیکچرز کی ریکارڈنگ دستیاب ہے۔ مزید تفصیل جاننے کے خواہش مند خواتین وحضرات اس ریکارڈنگ سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

آیات ۱ تا ۷

سُوْرَةُ الطَّلَاقِ مَدَنِيَّةٌ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اٰيَاتُهَا: ۱۲ — رُكُوْعَاتُهَا: ۲

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۭ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۝ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ۭ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝ وَالّٰٓـِٔيْ يَىِٕسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَاۗىِٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ ۭ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۭ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ۝ ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗٓ اِلَيْكُمْ ۭ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا ۝ اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَاۗرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ۭ

وَ اِنۡ كُنَّ اُولَاتِ حَمۡلٍ فَاَنۡفِقُوۡا عَلَيۡهِنَّ حَتّٰى يَضَعۡنَ حَمۡلَهُنَّ ۚ فَاِنۡ اَرۡضَعۡنَ لَكُمۡ فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ ۚ وَاۡتَمِرُوۡا بَيۡنَكُمۡ بِمَعۡرُوۡفٍ ۚ وَاِنۡ تَعَاسَرۡتُمۡ فَسَتُرۡضِعُ لَهٗۤ اُخۡرٰى ۞ لِيُنۡفِقۡ ذُوۡ سَعَةٍ مِّنۡ سَعَتِهٖ ؕ وَ مَنۡ قُدِرَ عَلَيۡهِ رِزۡقُهٗ فَلۡيُنۡفِقۡ مِمَّاۤ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰىهَا ؕ سَيَجۡعَلُ اللّٰهُ بَعۡدَ عُسۡرٍ يُّسۡرًا ۞ ع

آیت ① ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوۡهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحۡصُوا الۡعِدَّةَ ۚ﴾ ''اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم!) جب آپ لوگ اپنی عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدّت کے حساب سے طلاق دو اور عدّت کا پورا لحاظ رکھو۔''

نوٹ کیجیے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صیغہ واحد میں مخاطب کرنے کے بعد فوراً جمع کا صیغہ (طَلَّقْتُمْ) آ گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مسئلہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے نہیں' عام اہلِ ایمان سے متعلق ہے اور آپؐ کو اہلِ ایمان کے نمائندہ' معلّم اور ہادی کی حیثیت سے مخاطب کیا گیا ہے۔ عدّت کے حساب سے طلاق دینے اور عدّت کا لحاظ رکھنے کے بہت سے پہلو ہیں۔ مجموعی طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نازک اور حساس معاملے میں شریعت کی طے کردہ حدود و قیود کا لحاظ رکھو اور متعلقہ قوانین کی سختی سے پابندی کرو۔ مثلاً حیض کی حالت میں طلاق نہ دو' تینوں طلاقیں اکٹھی نہ دو' ہر طلاق کی عدّت کا حساب رکھو' عدّت کے دوران عورت کا نکاح نہ کرو۔ میاں بیوی کے درمیان ایک یا دو طلاقوں کے بعد ہونے والی علیحدگی کی صورت میں ان دونوں کے آپس میں دوبارہ نکاح کے حق کو تسلیم کرو' وغیرہ وغیرہ۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمۡ ۚ﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جو تمہارا ربّ ہے۔''

﴿لَا تُخۡرِجُوۡهُنَّ مِنۡۢ بُيُوۡتِهِنَّ﴾ ''انہیں مت نکال باہر کرو ان کے گھروں سے''

ایسا نہ ہو کہ غصے میں طلاق دی اور کہا کہ نکل جاؤ میرے گھر سے' ابھی اور اسی وقت! یہ طریقہ قطعاً غلط ہے۔

﴿وَلَا يَخۡرُجۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيۡنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ؕ﴾ ''اور وہ خود بھی نہ نکلیں' سوائے اس کے کہ وہ ارتکاب کریں کسی کھلی بے حیائی کا۔''

عام حالات میں تو طلاق کے فوراً بعد عورت کو گھر سے نہیں نکالا جا سکتا' اور نہ ہی اسے از خود نکلنے کی اجازت ہے۔ لیکن اس دوران اگر وہ بدکاری وغیرہ میں ملوث ہو جائے تو ایسی صورت میں اسے اس گھر سے نکالا جا سکتا ہے۔

﴿وَتِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور یہ اللہ کی حدود ہیں۔''

﴿وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ ؕ﴾ ''اور جو کوئی اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا تو اُس نے اپنی ہی جان پر ظلم کیا۔''

﴿لَا تَدۡرِىۡ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِكَ اَمۡرًا ۞﴾ ''تمہیں نہیں معلوم کہ شاید اس کے بعد اللہ کوئی نئی صورت پیدا کر دے۔''

طلاق کے بعد اگر عورت شوہر کے گھر میں ہی عدّت گزار رہی ہو تو حالات بہتر ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ کیا معلوم

اللہ تعالیٰ ان دونوں میں بہتری کی کوئی صورت پیدا کر دے اور وہ پہلی طلاق کے بعد ہی رجوع کر لیں اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی مشیت سے حالات ہمیشہ کے لیے سازگار ہو جائیں۔

آیت ۲ ﴿فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾ ''پھر جب وہ اپنی (عدت کی) میعاد کو پہنچنے لگیں تو اب ان کو یا تو (اپنے نکاح میں) روک رکھو معروف طریقے سے' یا جدا کر دو معروف طریقے سے''

یعنی ایک یا دو طلاق دینے کی صورت میں عدت پوری ہو جانے سے پہلے مرد کو حتمی فیصلہ کرنا ہوگا۔ اگر تو وہ رجوع کرنا چاہتا ہے تو شریعت کے طے کردہ طریقے سے رجوع کر لے اور اگر اس نے طلاق ہی کا فیصلہ کر لیا ہے تو پھر بھلے طریقے سے عورت کو گھر سے رخصت کر دے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اسے ستانے کی غرض سے روکے رکھے۔

﴿وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾ ''اور اپنے میں سے دو معتبر اشخاص کو گواہ بنا لو''

یعنی اگر کوئی طلاق کے بعد رجوع کرنا چاہے تو وہ اپنے لوگوں میں سے کم از کم دو معتبر اشخاص کی موجودگی میں ایسا کرے۔

﴿وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ﴾ ''اور گواہی قائم کرو اللہ کے لیے۔''

﴿ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ''یہ ہے جس کی نصیحت کی جا رہی ہے ہر اُس شخص کو کہ جو ایمان رکھتا ہو اللہ پر اور یوم آخر پر۔''

اس سے ملتے جلتے الفاظ سورۃ الاحزاب کی آیت ۲۱ میں حضور ﷺ کے اُسوہ اور سورۃ الممتحنہ کی آیت ۶ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کے اُسوہ کے بارے میں بھی آئے ہیں۔ مطلب یہ کہ حضور ﷺ کا اُسوۂ کاملہ تو اپنی جگہ پر موجود ہے' اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کی زندگی بھی مثالی نمونہ ہے' لیکن کس کے لیے؟ ﴿لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ﴾ یعنی حضور ﷺ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اُسوۂ حسنہ سے استفادہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور یوم آخرت کی حاضری کی امید رکھتا ہے۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ کے اس جملے کا مفہوم بھی یہی ہے کہ مسائلِ طلاق سے متعلق یہ وعظ اور نصیحت صرف اسی شخص کے لیے فائدہ مند ہو سکتی ہے جو واقعی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو۔

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝۲﴾ ''اور جو شخص اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا' اللہ اُس کے لیے (مشکلات سے) نکلنے کا راستہ پیدا کر دے گا۔''

اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کا مقام و مرتبہ واضح کرنے کا یہ بہت حسین اور دلکش انداز ہے اور اس اعتبار سے یہ قرآن مجید کا منفرد مقام ہے۔ یہاں پر ایک اہم نکتہ یہ سمجھ لیں کہ حقیقی تقویٰ دل کا تقویٰ ہے' جس کے بارے میں حضور ﷺ نے ایک مرتبہ اپنے دست مبارک سے اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ((اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا، اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا، اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا))[1] کہ اصل تقویٰ یہاں (دل کے اندر) ہوتا ہے۔ آپؐ نے یہ بات تین مرتبہ ارشاد فرمائی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تقویٰ کا براہِ راست تعلق

۱۔ صحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب تحریم ظلم المسلم وخذله... وسنن الترمذی' کتاب البر والصلة والآداب' باب ما جاء فی شفقة المسلم علی المسلم۔

انسان کے دل کے ساتھ ہے۔ اگر دل میں تقویٰ نہیں تو جبہ و دستار کا اہتمام اور متقیانہ وضع قطع کی حیثیت بہروپ سے زیادہ کچھ نہیں۔ چنانچہ اس آیت میں اہلِ تقویٰ کو بہت بڑی بشارت سنائی جا رہی ہے کہ اگر کسی بندۂ مؤمن کا تقویٰ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں مقبول و منظور ہوا تو اُس کے لیے مشکل سے مشکل صورتِ حال سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور پیدا کر دیا جائے گا' جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے تو فرعون نے انہیں ساحلِ سمندر پر جا لیا۔ اب آگے سمندر تھا اور پیچھے فرعون کا لشکر۔ بظاہر بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا' مگر اللہ تعالیٰ نے سمندر کو پھاڑ کر ان کے لیے راستہ پیدا کر دیا۔

اسی طرح جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم غارِ ثور میں تشریف فرما تھے تو مشرکینِ مکہ میں سے کچھ لوگ آپؐ کے کھوج میں غار کے دہانے پر پہنچ گئے تھے۔ انہیں دیکھ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم! اگر ان لوگوں نے نیچے اپنے قدموں کی طرف بھی دیکھ لیا تو ہم انہیں نظر آ جائیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: ﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ﴾ (التوبۃ: ۴۰) کہ آپ فکر مت کریں' اللہ ہمارے ساتھ ہے! اس موقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے ایسی صورتِ حال پیدا فرما دی کہ مشرکین آپؐ کو نہ دیکھ سکے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ طائف کی مثال لیں تو بظاہر وہاں سے آپؐ خالی ہاتھ واپس آئے تھے' لیکن اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لیے مدینہ سے کھڑکی کھول دی اور ایسے حالات پیدا فرما دیے کہ آپؐ کے مدینہ تشریف لے جانے سے پہلے ہی وہاں انقلاب آ گیا۔ یہ مثالیں گواہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ مشکل سے مشکل حالات میں بھی اپنے متقی بندوں کے لیے ضرور ''مخرج'' پیدا فرماتا ہے۔ چنانچہ اقامتِ دین کی جدّ و جُہد میں مصروف اہلِ ایمان کے لیے آیت زیرِ مطالعہ کے ان الفاظ میں یہ خوشخبری ہے کہ وہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرتے ہوئے اپنی کوششیں پورے خلوص سے جاری رکھیں۔ جب اللہ تعالیٰ کو ان کوششوں کی کامیابی منظور ہو گی تو حیرت انگیز طریقے سے منزل خود چل کر ان کے سامنے آ جائے گی۔

آیت ۳ ﴿وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ﴾ ''اور اسے وہاں سے رزق دے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہو گا۔''

اس دنیا میں رہتے ہوئے انسان کا سب سے بڑا مسئلہ رزق یعنی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کا ہے۔ اس لیے جب کوئی اللہ کا بندہ اپنے دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے فرمانِ الٰہی: ﴿اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (الانعام) کو اپنا نصب العین بنانا چاہتا ہے تو اُس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ یہ اندیشہ بنتا ہے کہ ضروریاتِ زندگی کیسے پوری ہوں گی؟ چنانچہ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اہلِ ایمان کے لیے بہت بڑی خوشخبری ہے کہ اے میرے بندو! تمہارا رازق تو میں ہوں اور تمہیں رزق دینے کے لیے میں وسائل و اسباب کا محتاج نہیں ہوں۔ تم لوگ ایمان و یقین کے ساتھ مجھ پر اعتماد کر کے دیکھو' میں تمہیں وہاں سے رزق دوں گا جہاں سے تمہیں گمان بھی نہیں ہو گا۔

﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ﴾ ''اور جو کوئی اللہ پر توکل کرتا ہے تو اُس کے لیے وہ کافی ہے۔''

جو شخص اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے اپنے معاملات اُس کے سپرد کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات و حاجات کو اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔ اسی بات کو کسی شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے: ؎

کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما ۔۔۔ فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما!

کہ ہمارا کارساز تو اللہ ہے' اور وہ ہمارے کاموں کی فکر میں مصروف ہے' اس لیے ہم اپنے کاموں کی فکر کے جھنجھٹ میں کیوں پڑیں!

ظاہر ہے اگر ہم خود اپنے کاموں کی فکر کریں گے تو غلطیاں بھی کریں گے نقصان بھی اٹھائیں گے اور ٹھوکریں بھی کھائیں گے' تو کیوں نہ ہم اپنے کام اُسے سونپ کر خود کو اُس کے کام (اقامتِ دین کی جدّوجُہد) میں لگا دیں۔ اللہ تو ایسا قدردان ہے کہ اگر اس کا کوئی بندہ اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرتا ہے تو وہ بدلے میں اس کا مددگار بن جاتا ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((مَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ أَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهٖ))[۲] کہ جو کوئی اپنے مسلمان بھائی کی کوئی ضرورت پوری کرنے میں اپنا وقت صَرف کرتا ہے تو اللہ اس کی ضرورتیں پوری کرنے میں لگ جاتا ہے۔ چنانچہ اگر اللہ کا کوئی بندہ اپنی ذاتی ترجیحات کو پسِ پشت ڈال کر خود کو براہِ راست اللہ تعالیٰ کے کام میں لگا دے گا تو کیا اللہ اس کے معاملات کو خراب ہونے کے لیے چھوڑ دے گا؟ ہرگز نہیں! ایسا تو دنیا میں ہم انسانوں کے ہاں بھی نہیں ہوتا' بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس انسان میں تھوڑی سی بھی شرافت اور مروّت ہوتی ہے وہ دوسرے انسان کی وفاداری کا بدلہ ضرور چکاتا ہے۔ چنانچہ جب ایک انسان بھی دوسرے انسان کی وفاشعاری کا صلہ دینا ضروری سمجھتا ہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ایک وفاشعار اور متوکل بندے کی کس کس انداز سے دست گیری فرمائے گا۔ یاد رکھیں! توکّل کا تعلق بندے کے ایمان سے ہے۔ جس قدر گہرا اور پختہ کسی کا ایمان ہوگا' اسی قدر مضبوط اس کا توکّل ہوگا۔ آج ہمارے لیے اللہ تعالیٰ پر بھرپور توکّل کرنا اس لیے مشکل ہے کہ ہمارا ایمان کمزور ہے۔ تو آیئے! ہم اپنا ایمان مضبوط کر کے اللہ پر توکّل کریں۔ اپنے معاملات کی منصوبہ بندیوں کا دردِ سر مول لینے کے بجائے تفویض الامر الی اللہ کی حکمت عملی اپنائیں۔ اپنے معاملات اُس کے سپرد کر دیں اور اُس کے کام کو اپنا کام سمجھ کر اُس کے لیے اپنا تن من دھن کھپا دیں! ——— ﴿وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۴۴﴾ (المؤمن)

﴿اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ﴾ ''اللہ تو یقیناً اپنا کام پورا کر کے ہی رہتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے تو اپنے دین کو غالب کرنا ہی ہے' لیکن اس عظیم الشان کام کے لیے جدّوجُہد کی سعادت وہ اپنے بندوں کے نام کرنا چاہتا ہے۔ اب اس کے لیے ہر انسان کو خود فیصلہ کرنا ہے کہ وہ اس منافع بخش ''کاروبار'' میں شریک ہونا چاہتا ہے یا اپنی محرومی پر قناعت کر کے بیٹھے رہنے کو پسند کرتا ہے۔ جیسے حضرات ابوبکر' عمر' عثمان' علی' عبدالرحمٰن بن عوف اور ان کے ساتھی (رضی اللہ عنہم) اس جدّوجُہد میں شریک ہو کر ہمیشہ کے لیے سرخرو ہو گئے' جبکہ ابوجہل' ابولہب اور ان کے ہم نواؤں نے اس سے بے اعتنائی دکھائی اور ابدی محرومیاں اپنے نام کرا لیں۔ آج ہمیں سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ قیامِ قیامت سے پہلے پہلے اس کرۂ ارضی پر دینِ اسلام کو غالب تو ہونا ہے اور یقیناً ہم جیسے انسانوں کی کوششوں اور قربانیوں سے ہی ہونا ہے' تو کیا ہم اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کو تیار ہیں یا محرومین کی صفوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارا تن من دھن غرض سب کچھ اس جدّوجُہد میں کھپ جائے اور ہماری ہڈیاں چُورا بن کر بھی اسلام کی تعمیرِ نو میں کام آ جائیں تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی اور خوش قسمتی ہوگی۔

﴿قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝۳﴾ ''اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔''

یہ بہت خوبصورت اور سبق آموز جملہ ہے۔ غلبۂ دین کی جدّوجُہد کے تناظر میں دیکھیں تو اس کا مفہوم واضح تر ہو جاتا ہے' کہ اے راہِ حق کے مسافرو! تمہاری محنت اور جدّوجُہد کس کس گھاٹی سے ہوتی ہوئی کب' کہاں پہنچے گی اور اللہ کی مدد کب تمہارے شاملِ حال

۲۔ صحیح البخاری' کتاب المظالم والغصب' باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمه' ح: ۲۴۴۲ و ۶۹۵۱۔ وصحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب تحریم الظلم' ح: ۲۵۸۰۔

ہوگی‘ اللہ کے ہاں یہ سب کچھ طے ہے۔ یقیناً اس راستے میں کامیابی کا دارومدار اللہ کی مدد پر ہے‘ لیکن اللہ کی مدد تو تبھی آئے گی جب تم خود کو اس کا اہل ثابت کرو گے۔ اس کے لیے تمہیں منہجِ نبوی ﷺ کو اپناتے ہوئے ہر اُس راستے سے گزرنا ہوگا جس راستے سے حضور ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین گزرے اور ہر وہ سختی برداشت کرنا ہوگی جو آپؐ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر برداشت کی۔ جب ان تمام امتحانات سے سرخرو ہو کر آگے بڑھو گے تو خود کو ایک ایسے میدان میں کھڑا پاؤ گے جس کے نشیب و فراز سرزمینِ بدر کے نشیب و فراز سے ملتے جلتے ہوں گے۔ اس میدان کی مخالف سمت سے اسلحہ کی جھنکار اور ’’لَا غَالِبَ لَکُمُ الْیَوْمَ‘‘ کے نعروں کی گونج سنائی دے رہی ہوگی‘ جبکہ اس کی فضا ملکوتی تقدس کے احساس سے معمور ہوگی۔ جب تم یہ سب کچھ دیکھو اور محسوس کرو تو جان لینا کہ تمہاری جدّ و جُہد کا فیصلہ کن موڑ آ پہنچا ہے۔ بس اس موقع پر تم سجدے میں گر جانا اور رو رو کر دعا کرنا کہ اے اللہ! ہم نے تیرے داعی کی دعوت پر لبّیک کہا! ہم تیرے پیغام کو لے کر قریہ قریہ گھومے! گلی گلی پھرے! ایک عرصہ تک ہم نے اپنی صُبحیں اور اپنی شامیں اسی فکر میں بتا دیں! ہم نے اس راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو پھلانگنے اور ہر مشکل گھاٹی کو عبور کرنے کی کوشش کی! اے اللہ! ہم نے یہ سب کچھ تیری رضا کے لیے کیا‘ اور تیری ہی توفیق اور مشیت سے کیا۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں معلوم ہے کہ اس راستے پر چلتے ہوئے ہم کوشش‘ محنت‘ ایثار اور قربانی کا حق ادا نہیں کر سکے! لیکن ہم سے جو ہو سکا وہ ہم نے پوری دیانت داری اور اخلاص سے کیا۔ پروردگار! ہم نے اپنی سالہا سال کی محنت کو آج اس میدان میں تیرے حضور پیش کر دیا ہے! اے گناہوں کو معاف کرنے والے! تُو ہمارے گناہوں کو معاف کر دے اور ہماری کوتاہیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ہماری اس حقیر سی کمائی کو قبول فرما لے.....!

اگر یہ دعائیں مذکورہ تمام مراحل طے کرنے کے بعد مانگی جائیں گی تو ضرور قبول ہوں گی‘ تب اللہ کی مدد بھی آئے گی‘ فرشتے بھی اُتریں گے اور دنیوی کامیابی بھی نصیب ہوگی۔ لیکن اگر کوئی سمجھتا ہے کہ کاروبار بھی چلتا رہے‘ معیارِ زندگی بھی برقرار رہے‘ معمولاتِ زندگی میں بھی خلل نہ پڑے‘ مال و جان بھی محفوظ رہے‘ بچوں کے کیریئرز بھی بن جائیں اور ہمارے ہی ہاتھوں سے اقامتِ دین کا ’’کارنامہ‘‘ بھی انجام پا جائے تو یہ اُس کی خوش فہمی ہے۔ ایسے لوگ کسی جماعت کے اراکین کی فہرست میں نام لکھوا کر سمجھتے ہیں کہ بس انہوں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ اس کے بعد وہ انتظار میں بیٹھ جاتے ہیں کہ اب اللہ تعالیٰ کی مدد آئے گی‘ دین غالب ہو جائے گا اور اس کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر کے مستحق ٹھہریں گے۔ گویا اللہ تعالیٰ کو تو معلوم ہی نہیں کہ کس نے کیا قربانی دی ہے‘ کس نے کتنا وقت لگایا ہے‘ کس نے کس مرحلے پر کس مہم میں کتنا حصہ ڈالا ہے۔ نہیں! یہ کوئی اندھیر نگری نہیں! اللہ کے ہاں ہر چیز اور ہر انسان کے ہر عمل کا حساب موجود ہے! قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا اُس نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے!

اب آئندہ آیات میں پھر طلاق سے متعلق مسائل کا ذکر ہے:

آیت ۴ ﴿وَالّٰٓـِٔیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ﴾ ’’اور تمہارے ہاں کی خواتین میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں‘‘

یعنی ایسی عمر رسیدہ خواتین جن کے حیض کا سلسلہ بند ہو چکا ہو۔

﴿اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُہُنَّ ثَلٰثَۃُ اَشْہُرٍ﴾ ’’اگر تمہیں شک ہو تو اُن کی عدّت تین ماہ ہوگی‘‘

ایسی خواتین کے معاملے میں چونکہ تین طہر اور تین حیض کا حساب کرنا ممکن نہیں‘ اس لیے ان کی عدّت کا شمار مہینوں میں کیا جائے گا۔ چنانچہ ان کی عدّت کی مدت تین ماہ ہوگی۔

﴿وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ ؕ﴾ ’’اور (ان کی بھی) جن کو ابھی حیض آیا ہی نہیں۔‘‘

اگر کسی لڑکی کا کم سنی میں نکاح ہو گیا اور ابھی اسے حیض آنا شروع نہیں ہوا تھا کہ طلاق ہو گئی تو اس کی عدّت بھی تین ماہ ہی شمار ہوگی۔

﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ﴾ ’’اور حاملہ خواتین کی عدّت یہ ہے کہ ان کا وضع حمل ہو جائے۔‘‘

ایسی صورت میں وضع حمل جب بھی ہو جائے گا عدّت ختم ہو جائے گی‘ چاہے اس میں نو ماہ لگیں یا ایک ماہ بعد ہی وضع حمل ہو جائے ـــــ اس کے بعد پھر سے تقویٰ کے بارے میں یاد دہانی کرائی جا رہی ہے۔ اس سے قبل پہلی اور دوسری آیت میں بھی تقویٰ کا ذکر آ چکا ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ۝۴﴾ ’’اور جو کوئی اللہ کا تقویٰ اختیار کرتا ہے وہ اُس کے کاموں میں آسانی پیدا کر دیتا ہے۔‘‘

جیسا کہ سورۃ الیل میں فرمایا گیا ہے: ﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝۵ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝۶ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝۷﴾ ’’تو جس نے (اللہ کی راہ میں) مال دیا اور (اللہ کی نافرمانی سے) پرہیز کیا‘ اور بھلائی کو سچ مانا‘ اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے۔‘‘

آیت ۵ ﴿ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗۤ اِلَيْكُمْ ؕ﴾ ’’یہ اللہ کا حکم ہے جو اُس نے نازل کر دیا ہے تمہاری طرف۔‘‘

یعنی اُس حکم کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ذمہ داری لے لی ہے کہ میرے بندوں میں سے جو کوئی میرا تقویٰ اختیار کرے گا میں اُس کے معاملات میں ضرور آسانیاں پیدا فرماؤں گا۔

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ﴾ ’’اور جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا وہ اُس کی بُرائیوں کو اس سے دُور فرما دے گا‘‘

اس حکم کا تعلق خصوصی طور پر آخرت سے ہے۔ یعنی اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے والے شخص کے دنیوی معاملات میں بھی آسانیاں پیدا کر دی جائیں گی اور آخرت کے احتساب کے حوالے سے بھی اس کے نامہ اعمال کو گناہوں سے پاک کر دیا جائے گا۔

﴿وَيُعْظِمْ لَهٗۤ اَجْرًا ۝۵﴾ ’’اور اسے بہت بڑا اجر و ثواب عطا کرے گا۔‘‘

آیت ۶ ﴿اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ﴾ ’’اور ان عورتوں کو وہیں رکھو جہاں تم خود رہتے ہو اپنی حیثیت کے مطابق‘‘

پہلی آیت میں واضح حکم آ چکا ہے: ﴿لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ﴾ کہ طلاق کے بعد انہیں فوری طور پر گھر سے مت نکالو اور نہ ہی وہ از خود نکلیں۔ اسی حوالے سے اس آیت میں مزید وضاحت کی جا رہی ہے کہ عدّت کے دوران مطلقہ خاتون کو

بدستور ویسی ہی رہائش فراہم کی جائے جیسی کہ تمہارے اپنے استعمال میں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اُسے گھر سے تو نہ نکالو لیکن کسی ملازمہ کی کوٹھڑی میں ڈال دو۔

﴿وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ؕ﴾ ''اور انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ انہیں تنگ کرنے کے لیے۔''

گھر سے نکالنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حیلے بہانے سے اسے بار بار اس قدر ستایا جائے کہ وہ تنگ آ کر خود ہی گھر سے نکل جائے۔ چنانچہ بدنیتی پر مبنی یہ طریقہ استعمال کرنے سے بھی منع کر دیا گیا۔

﴿وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ﴾ ''اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر خرچ کرتے رہو یہاں تک کہ وہ حمل سے فارغ ہو جائیں۔''

دینِ اسلام ہمدردی اور غم گساری کا دین ہے اور اس کا ایک ثبوت مندرجہ بالا حکم ہے۔ حاملہ عورت کو انتہائی نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے یہاں خصوصی طور پر حکم دیا گیا کہ طلاق دینے کے بعد بھی حاملہ عورت کا خیال رکھتے ہوئے اس کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتے رہو۔

﴿فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ﴾ ''پھر اگر وہ تمہارے لیے (تمہارے بچے کو) دودھ پلائیں تو انہیں ان کا معاوضہ ادا کرو۔''

﴿وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۚ﴾ ''اور آپس میں مشورہ کر لیا کرو بھلے طریقے سے۔''

یعنی دودھ پلانے کی اُجرت اور عدت سے متعلق معاملات مناسب طور سے آپس کے مشورے سے طے کیے جانے چاہئیں۔ اگر طلاق کے بعد وہ دونوں میاں بیوی نہیں رہے تو کیا ہوا آخر دونوں انسان تو ہیں۔ چنانچہ انہیں چاہیے کہ تمام معاملات باہمی گفت و شنید سے طے کریں اور ایک دوسرے سے ایسا رویہ اختیار کریں جیسا کہ ایک شریف انسان کو دوسرے شریف انسان سے اختیار کرنا چاہیے۔

﴿وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ﴾ ''اور اگر تم ایک دوسرے سے تنگی محسوس کرو''

مثلاً خاتون ضد میں آ کر دودھ پلانے سے انکار کر دے یا اس قدر معاوضہ مانگے جو مرد ادا نہ کر سکے یا مرد معاوضہ دینے سے انکار کر دے یا کسی اور طریقے سے ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرنے کی ٹھان لے:

﴿فَسَتُرْضِعُ لَهٗۤ اُخْرٰى ۝۶﴾ ''تو پھر کوئی اور عورت اس کے لیے دودھ پلائے گی۔''

آیت ۷ ﴿لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ﴾ ''چاہیے کہ خرچ کرے وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق۔''

﴿وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّاۤ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ﴾ ''اور جس پر اس کا رزق تنگ کر دیا گیا ہے وہ خرچ کرے اس میں سے جو اللہ نے اس کو دیا ہے۔''

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰىهَا ؕ﴾ ''اللہ کسی جان کو ذمہ دار نہیں ٹھہراتا مگر اسی قدر جو اُس نے اسے دے رکھا ہے۔''

یعنی عدت کے دوران مطلقہ کی رہائش، حمل کے دوران اس کا نان نفقہ، رضاعت کی اجرت وغیرہ کے معیار کا انحصار مرد کی مالی

حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے۔ اگر کشادگی ہے تو مطلقہ پر بھی اسے اسی انداز سے خرچ کرنا چاہیے اور اگر تنگ دستی کی کیفیت ہے تو ظاہر ہے وہ اسی حد تک مکلف ہے جس حد تک اس کی استطاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر کسی کے حالات سے باخبر ہے۔

﴿سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ۝۷﴾ ''عنقریب اللہ تنگی کے بعد آسانی بھی پیدا کر دے گا۔''

آیات ۸ تا ۱۲

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّ عَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ۝۸ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَ كَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ۝۹ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ ۚ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۬ۛ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝۱۰ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَ مَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَ يَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ۝۱۱ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝۱۲ ع

آیت ۸ ﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ﴾ ''اور کتنی ہی بستیاں ایسی ہیں جنہوں نے اپنے رب کے حکم اور اُس کے رسولوں سے سرکشی کی''

﴿فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ۝۸﴾ ''تو ہم نے ان کا محاسبہ کیا بہت شدید محاسبہ اور ہم نے ان کو عذاب دیا بہت ہولناک عذاب۔''

آیت ۹ ﴿فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا﴾ ''تو انہوں نے اپنے معاملے کی پوری سزا بھگت لی''

﴿وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ۝۹﴾ ''اور ان کے کام کا انجام خسارہ ہی تھا۔''

آیت ۱۰ ﴿اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ﴾ ''اللہ نے ان کے لیے بہت شدید عذاب تیار کر رکھا ہے''

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ ۚ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۬ۛ﴾ ''تو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اے ہوش مندو! جو ایمان بھی لائے ہو!''

نوٹ کیجیے! یہاں پھر تقویٰ کے بارے میں تاکید کی جا رہی ہے۔ قبل ازیں پہلے رکوع میں چار مرتبہ تقویٰ کا ذکر آ چکا ہے۔

﴿قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝۱۰﴾ ''اللہ نے تمہاری طرف ذکر نازل کر دیا ہے۔''

آیت ۱۱ ﴿رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى

النُّوْرِ ﴾ ''(یعنی) ایک رسولؐ جو اللہ کی آیاتِ بیّنات تم لوگوں کو پڑھ کر سنا رہا ہے' تاکہ وہ نکالے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے اندھیروں سے نور کی طرف۔''

یہاں وضاحت کر دی گئی کہ ذکر سے مراد اللہ کا رسولؐ اور اللہ کی کتاب (اٰیٰتِ اللّٰہِ مُبَیِّنٰتٍ) ہے۔ سورۃ البیّنہ میں اس موضوع کی مزید وضاحت آئی ہے۔

﴿ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا ﴾ ''اور جو کوئی اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے''

دین کے تقاضوں کا درست فہم نہ ہونے کی وجہ سے آج ہمارے ہاں ''اعمالِ صالحہ'' کا تصور بھی محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اعمالِ صالحہ سے اصل مراد یہ ہے کہ ایک بندۂ مؤمن ایمان کے جملہ تقاضوں کو پورا کرے۔ مکّی دور میں جبکہ ابھی شراب' جوا' سود وغیرہ کی حرمت نہیں آئی تھی اور نماز' روزہ' جہاد وقتال وغیرہ کا حکم نہیں آیا تھا' اُس دَور میں اہلِ ایمان کے لیے ''اعمالِ صالحہ'' یہی تھے کہ وہ ایمان کی دعوت دیں اور اس راستے پر جو تکلیفیں اور آزمائشیں آئیں انہیں استقامت سے برداشت کریں۔ پھر مدنی دَور میں جیسے جیسے مزید احکام آتے گئے ویسے ویسے ایمان کے تقاضے بھی بڑھتے گئے اور رفتہ رفتہ نماز' روزہ' زکوٰۃ' عُشر' حج' انفاق' جہاد وقتال وغیرہ بھی اعمالِ صالحہ میں شامل ہو گئے۔ گویا جس وقت ایمان کا جو تقاضا ہو اُسے پورا کرنے کا نام ''عملِ صالح'' ہے۔ آج ایک عام مسلمان جب قرآن میں ''عملِ صالح'' کی اصطلاح پڑھتا ہے تو اس سے اس کے ذہن میں صرف نماز' روزہ اور ذکر اذکار کا تصور ہی آتا ہے' جبکہ منکرات کے خلاف جدوجہد اور اقامتِ دین کے لیے محنت جیسے اہم تقاضوں کو آج اعمالِ صالحہ کی فہرست سے ہی خارج کر دیا گیا ہے۔ تو جو کوئی ایمان لانے کے بعد ایمان کے تقاضوں کو بھی پورا کرے گا:

﴿ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴾ ''وہ اُسے داخل کرے گا اُن باغات میں جن کے نیچے ندیاں بہتی ہوں گی' جن میں وہ لوگ رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔''

﴿ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ﴾ ''اللہ نے اُس کے لیے بہت عمدہ رزق فراہم کیا ہے۔''

آیت ۱۲ ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ﴾ ''اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے ہیں اور زمین میں سے بھی انہی کی مانند۔''

یہ آیت ''آیاتِ متشابہات'' میں سے ہے۔ ابھی تک انسان سات آسمانوں کی حقیقت سے بھی واقف نہیں ہو سکا۔ ''زمین میں سے انہی کی مانند'' کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جتنے آسمان بنائے اتنی ہی زمینیں بھی بنائیں' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جیسے اُس نے متعدد آسمان بنائے ہیں ویسے ہی متعدد زمینیں بھی بنائی ہیں۔ قرآن حکیم کے بعض مقامات پر ایسے اشارے ملتے ہیں کہ جاندار مخلوقات صرف زمین پر ہی نہیں ہیں' عالمِ بالا میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مفسّرین نے اپنے اپنے اندازوں سے اس آیت کی تفسیر کی ہے' لیکن اس کا قطعی مفہوم ہم ابھی نہیں جان سکتے۔ بہرحال کسی وقت اس کی حقیقت انسان پر منکشف ہو جائے گی۔

﴿ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ ﴾ ''ان کے درمیان (اللہ کا) امر نازل ہوتا ہے''

اس سے مراد تدبیرِ کائنات سے متعلق اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں۔ اس بارے میں مزید وضاحت سورۃ السجدۃ کی اس آیت میں ملتی ہے:

﴿يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ ۝۵﴾

''وہ تدبیر کرتا ہے اپنے امر کی آسمان سے زمین کی طرف پھر وہ (اَمر) چڑھتا ہے اُس کی طرف (یہ سارا معاملہ طے پاتا ہے) ایک دن میں جس کی مقدار تمہاری گنتی کے حساب سے ایک ہزار برس ہے۔''

گویا یہ اللہ تعالیٰ کی ہزار سالہ منصوبہ بندی سے متعلق احکام کا ذکر ہے جو زمین کی طرف ارسال کیے جاتے ہیں۔ متعلقہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ان احکام کی تنفیذ عمل میں لاتے رہتے ہیں' یہاں تک کہ ہزار سال کے اختتام پر یہ ''امر'' اٹھا لیا جاتا ہے اور اگلے ہزار سال کا امر نازل کر دیا جاتا ہے۔

﴿لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ﴾ ''تاکہ تم یقین رکھو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے''

اس دورۂ ترجمہ قرآن کے دوران کئی مرتبہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں دو صفات خصوصی اہمیت کی حامل ہیں اور قرآن مجید میں ان دو صفات کی بہت تکرار ملتی ہے۔ یعنی اللہ کا عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اور بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ہونا۔ لہٰذا ان دو صفات کے بارے میں ایک بندۂ مؤمن کا مراقبہ بہت گہرا ہونا چاہیے' تاکہ اللہ تعالیٰ کے علم اور اختیار کے بارے میں اُس کے یقین میں کسی لمحے کوئی کمزوری نہ آنے پائے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی ان دونوں صفات کا ذکر آیا ہے۔

﴿وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝۱۲﴾ ''اور یہ کہ اللہ نے اپنے علم سے ہر شے کا احاطہ کیا ہوا ہے۔''

پہلے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بارے میں بتایا گیا اور اب اُس کے علم کا ذکر آ گیا۔ یعنی کائنات کی کوئی چیز اُس کی قدرت سے باہر نہیں اور نہ ہی کوئی چیز اس کے علم سے پوشیدہ ہے۔

سُوْرَةُ التَّحْرِيْمِ

تمہیدی کلمات

جیسا کہ قبل ازیں سورۃ الطلاق کے تمہیدی کلمات میں بھی ذکر ہو چکا ہے' سورۃ الطلاق میں میاں بیوی کے اختلافات کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے جبکہ سورۃ التحریم کے آغاز میں عائلی زندگی کے دوسرے رخ کو نمایاں کیا گیا ہے۔ یعنی شوہر اپنی بیوی کی محبت یا اس کے جذبات کا پاس کرتے ہوئے کوئی ایسا کام کر بیٹھے جو شریعت میں جائز نہ ہو یا بیوی کی دلجوئی کے لیے کوئی ایسا کام نہ کرنے کی قسم کھالے جو کہ شریعت کے مطابق جائز ہو۔ اگرچہ یہ مضمون یہاں پر حضور ﷺ کی ذات کے حوالے سے بیان ہوا ہے لیکن اصل مقصد اس سے اُمت کی تعلیم ہے۔ ظاہر ہے حضور ﷺ کے لیے تو یہ قطعاً ممکن نہیں تھا کہ آپؐ اپنی کسی بیوی کی دلجوئی کے لیے کوئی خلافِ شریعت عمل کرتے۔ البتہ آپؐ کی سیرت میں دو تین واقعات ایسے ملتے ہیں کہ آپؐ نے اپنی بیویوں کی دلجوئی کے لیے کوئی ایسی چیز نہ کھانے کی قسم کھائی تھی جو کہ آپؐ کے لیے حلال تھی۔ سورت کی ابتدائی آیات میں یہی موضوع زیر بحث آیا ہے۔

آیات ۱ تا ۵

سُوْرَةُ التَّحْرِيْمِ مَدَنِيَّةٌ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اٰيَاتُهَا: ١٢ — رُكُوْعَاتُهَا: ٢

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝١ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝٢ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ۭ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝٣ اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ۝٤ عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰۗىِٕبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰۗىِٕحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۝٥

آیت ۱ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ﴾ ''اے نبی (ﷺ!) آپ کیوں حرام ٹھہرا رہے ہیں (اپنے اوپر) وہ شے جو اللہ نے آپ کے لیے حلال کی ہے؟''

﴿تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ﴾ ''آپ چاہتے ہیں اپنی بیویوں کی رضا جوئی!''

﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝١﴾ ''اور اللہ بہت معاف کرنے والا' بہت رحم کرنے والا ہے۔''

یعنی اللہ کو یہ بات پسند نہیں آئی' لیکن اُس نے معاف فرما دیا ہے۔

آیت ۲ ﴿قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ﴾ ''اللہ نے تمہارے لیے اپنی قسموں کو کھولنے کا طریقہ مقرر کر دیا ہے۔''

یعنی کفارہ دے کر قسموں کی پابندی سے نکلنے کا جو طریقہ سورۃ المائدۃ کی اس آیت میں بتایا گیا ہے:

﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝٨٩﴾

''اللہ تعالیٰ مؤاخذہ نہیں کرے گا تم سے تمہاری ان قسموں میں جو لغو ہوتی ہیں لیکن وہ (ضرور) مؤاخذہ کرے گا تم سے ان قسموں پر جن کو تم نے پختہ کیا ہے' سو اس کا کفارہ ہے کھانا کھلانا دس مساکین کو' اوسط درجے کا کھانا جیسا تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو' یا ان کو کپڑے پہنانا' یا کسی غلام کو آزاد کرنا۔ پھر جو کوئی اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھے۔ یہ کفارہ ہے تمہاری قسموں کا جب تم قسم کھا (کر توڑ) بیٹھو۔ اور اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو۔ اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیات کو واضح فرما رہا ہے تاکہ تم شکر کرو۔''

گویا آپ اپنی یہ قسم توڑ دیجیے اور اس ضمن میں کفارہ ادا کیجیے۔ بعض مترجمین نے یہاں ''قَدْ فَرَضَ'' کا ترجمہ ''فرض کر دیا ہے'' بھی کیا ہے اور اس کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ خلافِ شرع قسم کا توڑنا فرض ہے۔

﴿وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝٢﴾ ''اور اللہ تمہارا مددگار ہے' اور وہ سب کچھ جاننے والا' کمال حکمت والا ہے۔''

آیت ۳ ﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ﴾ ''اور جب نبی (ﷺ) نے رازداری سے اپنی کسی زوجہ کو ایک بات بتائی۔''

یہاں اس تفصیل میں جانے کا موقع نہیں کہ حضور ﷺ نے اپنی کسی زوجہ محترمہؓ کو راز کی کون سی بات بتائی تھی یا آپؐ نے کن حالات میں کس چیز کو استعمال نہ کرنے کی قسم کھائی تھی۔ تفاسیر میں ان آیات سے متعلق واقعات بڑی تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ مزید معلومات کے لیے کسی بھی تفسیر سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال یہاں جو اصل بات سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی ایک زوجہ محترمہؓ کو ایک بات بتائی اور فرمایا کہ یہ میرا راز ہے کسی اور سے اس کا ذکر نہ کرنا۔

﴿فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ﴾ ''تو جب اُس نے اس کو ظاہر کر دیا''

عورتوں کے بارے میں عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ راز چھپانے کے حوالے سے طبعی طور پر کمزور ہوتی ہیں' لیکن اس میں

بھی کوئی شک نہیں کہ یہ کمزوری بہت سے مَردوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ بہرحال ''نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد''۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ کمزوری انسان میں طبعی طور پر پائی جاتی ہے اور اسی بنا پر اس کا صدور ازواجِ مطہرات ؓ سے بھی ہوا۔ چنانچہ جس زوجہ محترمہؓ کو وہ بات بتائی گئی تھی انہوںؓ نے اس کا اظہار آپؐ کی کسی دوسری زوجہ محترمہؓ سے کر دیا۔

﴿وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ﴾ ''اور اللہ نے اس بارے میں اُنؐ کو مطلع کر دیا''

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو آگاہ کر دیا کہ آپؐ کا وہ راز اب راز نہیں رہا۔

﴿عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ﴾ ''تو نبی (ﷺ) نے اس پر کسی حد تک (اس بیوی کو) خبردار کیا اور کسی حد تک اس سے چشم پوشی کی۔''

یعنی حضور ﷺ نے اس بات کا جزوی انداز سے ذکر فرما کر اپنی زوجہ محترمہؓ کو اشارتاً بتا دیا کہ مجھے اس راز کے افشا ہونے کا علم ہو چکا ہے۔

﴿فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ﴾ ''تو جب آپؐ نے اسے یہ خبر دی''

﴿قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ﴾ ''اُس نے کہا کہ آپؐ کو یہ کس نے بتایا؟''

عام میاں بیوی کے درمیان تو ایسے مکالمے میں کوئی حرج نہیں' لیکن یہاں معاملہ اللہ کے رسول ﷺ کا تھا۔ اس حوالے سے سورۃ الحجرات میں یہ تنبیہہ ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۷) ''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے درمیان اللہ کے رسولؐ ہیں''۔ یعنی آپ ﷺ کے ساتھ تم لوگ دنیوی تعلقات اور رشتہ داریوں کی بنیاد پر معاملہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اس معاملے میں محتاط طرزِ عمل تو یہی تھا کہ فوراً معذرت کر لی جاتی کہ حضور ﷺ مجھ سے واقعتاً غلطی ہو گئی' بس بے دھیانی میں بات میرے منہ سے نکل گئی.....

﴿قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝۳﴾ ''آپؐ نے کہا: مجھے اُس نے بتایا ہے جو العلیم اور الخبیر ہے۔''

مجھے اس اللہ نے بتایا ہے جو سب کچھ جاننے والا ہے اور ہر چیز سے باخبر ہے۔ اس جواب کے اسلوب اور انداز میں حضور ﷺ کے اظہارِ ناراضی کی جھلک محسوس کی جا سکتی ہے۔

آیت ۴ ﴿اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ﴾ ''اگر تم دونوں اللہ کی جناب میں توبہ کرو تو (یہی تمہارے لیے بہتر ہے' کیونکہ) تمہارے دل تو مائل ہو ہی چکے ہیں۔''

اس آیت کی تعبیر میں اہل تشیع کا نقطہ نظر یقیناً انتہا پسندانہ ہے' لیکن مقامِ حیرت ہے کہ ہمارے بعض مترجمین اور مفسرین نے بھی انہی کی روش اختیار کی ہے۔ البتہ مولانا حمید الدین فراہیؒ نے عربی اسلوب کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس آیت کی جو وضاحت کی ہے میری رائے میں وہ بہت جامع اور بالکل درست ہے۔ اس حوالے سے میں ذاتی طور پر خود کو مولانا صاحب کا احسان مند مانتا ہوں کہ ان کی اس تحریر کی بدولت مجھے قرآن کے اس مقام کا درست فہم اور شعور نصیب ہوا۔

اہلِ تشیع کے ہاں ﴿فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا﴾ کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ تم دونوں کے دل ٹیڑھے ہو چکے ہیں۔ دراصل صَغَتْ

ایسا لفظ ہے جس میں منفی اور مثبت دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔ جیسے مَالَ اِلٰی کے معنی ہیں کسی کی طرف میلان یا توجہ ہونا جبکہ مَالَ عَنْ کے معنی ہیں کسی سے نفرت ہو جانا۔ اسی طرح لفظ رَغِبَ اِلٰی راغب ہونا' محبت کرنا اور رَغِبَ عَنْ ناپسند کرنا کے معنی دیتا ہے۔ صَغٰی کا معنی ہے جھک جانا' مائل ہو جانا۔ جب ستارے ڈوبنے لگتے ہیں تو عرب کہتے ہیں: صَغَتِ النُّجُوم۔ چنانچہ یہاں اس لفظ کا درست مفہوم مائل ہو جانا ہی ہے کہ اب تمہارے دل میں تو یہ بات آ ہی چکی ہے اور تمہارے دل تو خطا کو تسلیم کر ہی چکے ہیں' بس اب تم زبان سے بھی اس کا اعتراف کر لو۔ جیسے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی خطا کا احساس ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو اعتراف اور توبہ کے الفاظ بھی سکھا دیے: ﴿فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ﴾ (البقرۃ:۳۷) اور آپؑ نے سکھائے ہوئے طریقے سے توبہ کر لی۔

اس بارے میں عام رائے یہ ہے کہ مذکورہ بات حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتائی تھی۔ چونکہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو دربارِ رسالت میں خصوصی مقام و مرتبہ حاصل تھا اسی نسبت سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں ممتاز تھیں۔

﴿وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ﴾ ''اور اگر تم دونوں نے ان کے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا ہے''

یہ بہت سخت الفاظ ہیں۔ قرآن مجید کے ایسے مقامات کو سمجھنے کے لیے بنیادی طور پر یہ اصول ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اَلرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَنَزَّلَ ' وَالْعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَرَقّٰی ۔ اور یہ بھی کہ جن کے مراتب جتنے بلند ہوں ان کا ہلکا سا سہو بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں قابلِ گرفت ہو جاتا ہے۔ جیسے عربی کا مقولہ ہے: حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْن یعنی عام لوگوں کے لیے جو کام بڑی نیکی کا سمجھا جائے گا ہو سکتا ہے کہ وہی کام اللہ تعالیٰ کے مقربین اولیاء اور محبوب بندوں کے لیے تقصیر قرار پائے اور ان کے مرتبہ کے اعتبار سے قابلِ گرفت شمار ہو جائے۔ اسی قاعدہ اور اصول کے تحت یہاں یہ سخت الفاظ آئے ہیں کہ اگر آپ لوگوں نے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کوئی متحدہ محاذ بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو سن لو:

﴿فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ۝﴾ ''اُنؐ کا پشت پناہ تو خود اللہ ہے اور جبریل اور تمام صالح مؤمنین' اور مزید برآں تمام فرشتے بھی اُنؐ کے مددگار ہیں۔''

لہٰذا بہتر تو یہ ہے کہ تم لوگ ہمارے رسولؐ کے ساتھ جو بھی معاملہ کرو اُن کے مقام و مرتبے کی مناسبت سے کیا کرو۔ تمہارا میاں بیوی کا رشتہ اپنی جگہ لیکن یہ حقیقت کسی لمحہ بھی نظر انداز نہیں ہونی چاہیے کہ وہ اللہ کے رسولؐ ہیں اور تم سب لوگ اُمتی ہو۔ تمہارا اُنؐ کے ساتھ بنیادی تعلق یہی ہے۔ اس تعلق کے مقابلے میں تمہارے باقی تمام رشتوں کی حیثیت ثانوی ہے۔ اس کے بعد آگے مزید سخت الفاظ آ رہے ہیں:

آیت ۵ ﴿عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ﴾ ''بعید نہیں کہ اگر وہ تم سب کو طلاق دے دیں تو ان کا رب انہیں تم سے کہیں بہتر بیویاں عطا کر دے''

﴿مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۝﴾ ''اطاعت شعار' ایمان والیاں' فرمانبردار' توبہ کرنے والیاں' عبادت گزار' لذاتِ دنیوی سے بیگانہ' شوہر دیدہ بھی اور کنواری بھی۔''

ان الفاظ میں ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی سیرت و کردار کی ایک جھلک بھی سامنے آتی ہے کہ تمہارے اندر جو یہ اوصاف ہیں کہ تم

اطاعت شعار ہو' ایمان والیاں ہو' فرماں بردار ہو' توبہ کرنے والیاں ہو' زُہد وقناعت کرنے والیاں ہو' ان پر تمہیں ناز اں نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ان اوصاف کی حامل تم سے بہتر خواتین اپنے نبی مکرم ﷺ کے لیے ازواج کے طور پر فراہم کر سکتا ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ مذکورہ اوصاف کے درمیان ''و'' بطور حرفِ عطف نہیں آیا' سوائے ایک ''و'' کے جو کہ آخر میں آیا ہے۔ یہ ایک غیر معمولی اسلوب ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خواتین ایسی شخصیات ہوں گی جن میں یہ تمام اوصاف بیک وقت موجود ہوں گے۔ سوائے آخری دو اوصاف کے کہ وہ دونوں اوصاف ایک شخصیت میں بیک وقت اکٹھے نہیں ہو سکتے' اس لیے ان کے درمیان میں ''و'' عطف آگئی ہے —— ثَیِّبٰتٍ سے مراد ایسی عورتیں ہیں جنہیں نکاح کے بعد طلاق ہو گئی ہو یا وہ بیوہ ہو گئی ہوں۔ یہاں ضمنی طور پر یہ بھی جان لیجیے کہ سوائے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے باقی تمام ازواجِ مطہراتؓ ثَیِّبٰت ہی کی حیثیت سے حضور ﷺ کے نکاح میں آئیں۔

ان ابتدائی پانچ آیات کا تعلق عائلی زندگی سے ہے۔ اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ میاں بیوی کے درمیان روز مرہ زندگی کے معاملات کو حدِ اعتدال میں رہنا چاہیے۔ ایک دوسرے کے حقوق کا خیال بھی رکھا جائے اور دوسرے کے حوالے سے اپنے فرائض کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے' لیکن اللہ تعالیٰ کے حقوق کو تمام معاملات پر فوقیت دی جائے۔ اگر میاں بیوی میں اختلافات پیدا ہو جائیں اور اصلاح کی کوئی صورت نہ رہے تو قواعد وضوابط کو مدِنظر رکھتے ہوئے شرافت کے ساتھ علیحدگی اختیار کر لی جائے۔ لیکن اگر گھر کے ماحول میں محبت ویگانگت کا رنگ غالب ہو تو بھی محتاط رہا جائے کہ کہیں بے جا محبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود نہ ٹوٹنے پائیں اور ایسا نہ ہو کہ بیوی بچوں کی محبت انسان کو غلط راستے پر لے جائے۔

اس کے بعد کی تین آیات کا تعلق خصوصی طور پر مَردوں سے ہے اور یہ دراصل سورۃ الحدید ہی کے مضمون کا تسلسل ہے جو یہاں اس گروپ کی آخری سورت کے اختتام پر آ گیا ہے۔

آیات ٦ تا ٨

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝٦ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝٧ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٨

آیت ٦ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ ''اے اہلِ ایمان! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اُس آگ سے''

اس سے پہلے سورۃ التغابن میں اہلِ ایمان کو اُن کے اہل وعیال کے بارے میں اس طرح متنبہ کیا گیا ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ﴾ (آیت ۱۴) ''اے ایمان کے دعوے دارو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں تمہارے دشمن ہیں' پس ان سے بچ کر رہو''۔ سورۃ التغابن کے اس حکم کے تحت اہلِ ایمان کو منفی انداز میں متنبہ کیا گیا ہے' جبکہ آیت زیر مطالعہ میں انہیں ان کے اہل وعیال کے بارے میں مثبت طور پر خبردار کیا جا رہا ہے کہ بحیثیت شوہر اپنی بیویوں کو اور بحیثیت باپ اپنی اولاد کو دین کے راستے پر ڈالنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ یہ مت سمجھو کہ ان کے حوالے سے تمہاری ذمہ داری صرف ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کی حد تک ہے' بلکہ ایک مؤمن کی حیثیت سے اپنے اہل وعیال کے حوالے سے تمہارا پہلا فرض یہ ہے کہ تم انہیں جہنّم کی آگ سے بچانے کی فکر کرو۔ اس کے لیے ہر وہ طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کرو جس سے ان کے قلوب واذہان میں دین کی سمجھ بوجھ' اللہ کا تقویٰ اور آخرت کی فکر پیدا ہو جائے تاکہ تمہارے ساتھ ساتھ وہ بھی جہنّم کی اس آگ سے بچ جائیں:

﴿وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ ''جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر''

﴿عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ﴾ ''اس پر بڑے تُندخُو' بہت سخت دل فرشتے مامور ہیں''

وہ فرشتے مجرموں کو جہنّم میں جلتا دیکھ کر ان پر رحم نہیں کھائیں گے' اور نہ ہی وہ ان کے نالہ وشیون سے متأثر ہوں گے۔ تو کیا ہم ناز ونعم میں پالے ہوئے اپنے لاڈلوں کو جہنّم کا ایندھن بننے کے لیے ان سخت دل فرشتوں کے سپرد کرنا چاہتے ہیں؟ بہرحال ہم میں سے ہر ایک کو اس زاویے سے اپنی ترجیحات کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کیا ہم اپنے اہل وعیال کو جنّت کی طرف لے جا رہے ہیں یا جہنّم کا راستہ دکھا رہے ہیں؟ اپنے بہترین وسائل خرچ کر کے اپنی اولاد کو ہم جو تعلیم دلوا رہے ہیں کیا وہ ان کو دین کی طرف راغب کرنے والی ہے یا ان کے دلوں میں دین سے بغاوت کے بیج بونے والی ہے؟ اگر تو ہم اپنے اہل وعیال کو اچھے مسلمان بنانے کی کوشش نہیں کر رہے اور ان کے لیے ایسی تعلیم وتربیت کا اہتمام نہیں کر رہے جو انہیں دین کی طرف راغب کرنے اور فکرِ آخرت سے آشنا کرنے کا باعث بنے تو ہمیں جان لینا چاہیے کہ ہم محبت کے نام پر ان سے عداوت کر رہے ہیں۔

﴿لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ﴾ ''اللہ ان کو جو حکم دے گا وہ فرشتے اس کی نافرمانی نہیں کریں گے''

اللہ تعالیٰ جس کو جیسا عذاب دینے کا حکم دے گا وہ فرشتے اسے ویسا ہی عذاب دیں گے۔ کسی کے رونے دھونے کی وجہ سے اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتیں گے۔

﴿وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝٦﴾ ''اور وہ وہی کریں گے جس کا انہیں حکم دیا جائے گا۔''

آیت ۷ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۭ﴾ ''(اُس دن کہہ دیا جائے گا:) اے کافرو! آج تم عذر مت پیش کرو۔ آج تم معذرتیں نہ تراشو' بہانے مت بناؤ!

﴿اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝٧﴾ ''آج تمہیں بدلے میں وہی کچھ دیا جا رہا ہے جو تم عمل کر کے لائے ہو۔''

آیت ۸ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ﴾ ''اے اہلِ ایمان! توبہ کرو اللہ کی جناب میں خالص توبہ۔''

یہ آیت اپنے مضمون اور اسلوب کے اعتبار سے زیر مطالعہ سورتوں کے گروپ میں منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ اس میں پُل صراط

کے اس ماحول کی جھلک بھی دکھائی گئی ہے جس کی تفصیل سورۃ الحدید میں آئی ہے۔ اس آیت کے ابتدائی حصے میں اہلِ ایمان کو توبہ سے متعلق جو حکم دیا گیا ہے اس حکم میں بہت جامعیت ہے۔ اس سے مراد صرف کسی ایک بُرے عمل کی توبہ نہیں کہ کوئی شخص شراب نوشی سے توبہ کر لے یا کوئی رشوت خوری سے باز آ جائے' بلکہ اس سے مراد غفلت کی زندگی اور معصیت کی روش سے توبہ ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ یہ زندگی کا رخ بدلنے کا حکم ہے' کہ اے ایمان کے دعوے دارو! ذرا اپنی زندگی کے شب و روز پر غور تو کرو کہ تمہارا رخ کس طرف ہے؟ تمہاری زندگی کے سفر کی منزل کیا ہے؟ تم محمد رسول اللہ ﷺ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہو یا کسی اور کی پیروی کر رہے ہو؟ ﴿فَاَیْنَ تَذْهَبُوْنَ ۝۲۶﴾ (التکویر) —— تو اے اللہ کے بندو! اپنی زندگی کے شب و روز اور معمولات کا جائزہ لو' اپنی دوڑ دھوپ اور اپنی ترجیحات پر غور کرو۔ پھر اگر تم محسوس کرو کہ تم غلط رخ پر جا رہے ہو تو اپنے بڑھتے ہوئے قدم فوراً روک لو ﴿فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؕ﴾ (الذاریات: ۵۰) اور کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے رب کی طرف پلٹ آؤ! تمہارے پلٹنے کے لیے اللہ کی رحمت کا دروازہ اس وقت تک کھلا ہے جب تک تمہاری موت کے آثار ظاہر نہیں ہوتے۔ چنانچہ ابھی موقع ہے کہ اس کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرو' زندگی کے جو ماہ و سال غفلت کی نذر ہو گئے ہیں ان پر اشکِ ندامت بہاؤ' صدقِ دل اور اخلاصِ نیت سے معافی مانگو اور غلط روش کو ترک کرنے کے بعد زندگی کا سفر از سرِ نو شروع کرو۔

یہاں پر یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ سفرِ زندگی کی سمت درست کرنے کے لیے فرائضِ دینی کا درست فہم اور ادراک بھی ضروری ہے۔ ظاہر ہے دین صرف نمازیں پڑھنے اور رمضان کے روزے رکھنے ہی کا نام نہیں' بلکہ ایک بندۂ مؤمن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی معاشرت اور معیشت کو بھی ''مسلمان'' کرے۔ پھر یہ کہ جو ہدایت اسے نصیب ہوئی ہے اسے دوسروں تک پہنچانے کا اہتمام کرے اور کسی جماعت میں شامل ہو کر دین کے سب سے اہم فرض کی ادائیگی یعنی باطل نظام کے خاتمے اور اللہ تعالیٰ کی حکومت کے قیام کی جدوجہد میں سرگرمِ عمل ہو جائے۔ اس کے لیے انقلابِ نبویؐ کے منہج کو سمجھنا اور اس منہج کی پیروی کرنا بہت ضروری ہے۔ آج ہماری جدوجہد میں حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محنت اور کوشش کی سی کیفیت تو پیدا نہیں ہو سکتی کہ ع ''وہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا!'' لیکن ہمیں آپؐ کے منہج پر چلنے کی کوشش تو کرنی چاہیے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ درجے میں سہی آپؐ کی تحریک کے ساتھ اپنی جدوجہد کی کچھ نہ کچھ مماثلت اور مشابہت تو پیدا کرنی چاہیے۔ چنانچہ ایک ایک گھر اور ایک ایک فرد تک دعوت پہنچانے کا اہتمام' دعوت پر لبیک کہنے والوں کی تنظیم و تربیت کا انتظام' صبر و مصابرت کی حکمت عملی' جیسے ضروری مراحل ہمیں اسی طریقے سے طے کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جس طریقے سے خود حضور ﷺ نے یہ مراحل طے فرمائے تھے۔ اس موضوع پر مزید معلومات کے لیے میری کتاب ''منہجِ انقلابِ نبویؐ'' اور اسی عنوان سے تقاریر کی ریکارڈنگ سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ﴾ ''امید ہے تمہارا رب تم سے تمہاری بُرائیوں کو دور کر دے گا''

تمہارے توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہارے نامہ اعمال سے تمام دھبے دھو ڈالے گا اور تمہارے دامنِ کردار کے تمام داغ صاف کر دے گا۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ))[1] کہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسے ہو جاتا

---

[1] سنن ابن ماجه' كتاب الزهد' باب ذكر التوبة- صحيح الجامع للالبانی' ح: ۳۰۰۸- راوی: عبدالله بن مسعود وابو سعيد الخدری رضی الله عنهما- السنن الكبرىٰ للبيهقی: ۱۵۴/۱۰-

ہے جیسے اس نے وہ گناہ کبھی کیا ہی نہ ہو۔

﴿وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ ''اور تمہیں داخل کرے گا ایسے باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی''

﴿يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ﴾ ''جس دن اللہ اپنے نبی (ﷺ) کو اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو رسوا نہیں کرے گا۔''

﴿نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ﴾ ''(اُس دن) ان کا نُور دوڑتا ہوگا ان کے سامنے اور ان کے داہنی طرف''

یہ مضمون اس سے پہلے انہی الفاظ میں سورۃ الحدید کی آیت ۱۲ میں بھی آ چکا ہے۔ نُورِ ایمان ان کے سامنے ہوگا جبکہ اعمالِ صالحہ کا نُور داہنی طرف ہوگا۔

﴿يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا﴾ ''وہ کہتے ہوں گے: اے ہمارے رب! ہمارے لیے ہمارے نُور کو کامل کر دے''

﴿وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٨﴾ ''اور تُو ہمیں بخش دے، یقیناً تُو ہر شے پر قادر ہے۔''

ہر بندۂ مؤمن کا نُور اس کے ایمان اور اعمالِ صالحہ کی مناسبت سے ہوگا۔ حضرت قتادہؒ سے مرسلاً روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کسی کا نُور اتنا تیز ہوگا کہ مدینہ سے عدن تک کی مسافت کے برابر فاصلے تک پہنچ رہا ہوگا اور کسی کا نُور مدینہ سے صنعاء تک' اور کسی کا اس سے کم' یہاں تک کہ کوئی مؤمن ایسا بھی ہوگا جس کا نُور اُس کے قدموں سے آگے نہ بڑھے گا۔'' (ابن جریر)(۲)

حضور ﷺ کے اس فرمان کے مطابق تصور کریں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نُور کا کیا عالَم ہوگا۔ بہرحال ہم جیسے مسلمانوں کو اُس دن اگر ٹارچ کی روشنی جیسا نُور بھی مل جائے تو غنیمت ہے۔ لیکن ہمارے لیے یہاں توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ اس دن کچھ لوگوں کا نُور کم کیوں ہوگا۔ یقیناً وہ ایسے لوگ ہوں گے جن کے ایمان میں کسی پہلو سے کوئی کمزوری رہ گئی ہوگی اور اعمال میں کوتاہیاں سرزد ہوئی ہوں گی۔ یقیناً انہوں نے اپنی استعداد کو، اپنے مال کو اور اپنی خداداد صلاحیتوں کو بچا بچا کر رکھا ہوگا اور اللہ کے راستے میں انہیں اس حد تک خرچ نہیں کیا ہوگا جس حد تک خرچ کرنے کے وہ مکلّف تھے۔ اس حوالے سے علامہ اقبال کی یہ نصیحت

۲۔ اس ضمن میں ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں:

((... فَمِنْهُمْ مَنْ يُعْطٰى نُوْرَهٗ مِثْلَ الْجَبَلِ الْعَظِيْمِ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ، وَمِنْهُمْ مَنْ يُعْطٰى نُوْرَهٗ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ ، وَمِنْهُمْ مَنْ يُعْطٰى مِثْلَ النَّخْلَةِ بِيَدِهٖ، وَمِنْهُمْ مَنْ يُعْطٰى اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ، حَتّٰى يَكُوْنَ آخِرُهُمْ يُعْطٰى نُوْرَهٗ عَلٰى اِبْهَامِ قَدَمِهٖ يُضِيْءُ مَرَّةً وَيُطْفَأُ مَرَّةً...)) [الترغیب والترھیب للمنذری: ۲۹۶/۴ راوی: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔ امام البانی نے اسے صحیح کہا ہے۔]

''.....پس ان میں سے بعض کو اتنا نُور عطا کیا جائے گا جو بہت بڑے پہاڑ کی مانند ہوگا اور وہ ان کے دائیں طرف دوڑتا ہوگا' اور کسی کو اس سے کم نُور عطا کیا جائے گا۔ اور ان میں کسی کو اتنا نُور عطا کیا جائے گا گویا اس کے ہاتھ میں کھجور کا درخت ہے اور کسی کو اس سے کم نُور عطا ہوگا۔ حتیٰ کہ ان میں سے سب سے آخری شخص کا حال یہ ہوگا کہ اس کو بس اتنا سا نُور عطا کیا جائے گا جو اس کے پاؤں کے انگوٹھے پر ہوگا' جو کبھی جلتا اور کبھی بجھتا ہوگا.....'' (حاشیہ از مرتب)

ہمیں حرزِ جاں بنا لینی چاہیے:۔

تُو بچا بچا کے نہ رکھ اسے' ترا آئینہ ہے وہ آئینہ کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں!

بہر حال پُل صراط کے کٹھن اور نازک راستے پر جن اہلِ ایمان کا نُور کم ہو گا وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے کہ اے اللہ! تُو اپنے فضل اور اپنی شانِ غفاری سے ہماری کوتاہیوں کو ڈھانپ لے اور ہمارے نُور کو بھی مکمل فرما دے۔

آیت ۹

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

آیت ۹ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ﴾ ''اے نبی (ﷺ!) جہاد کیجیے کافروں سے بھی اور منافقوں سے بھی اور ان پر سختی کیجیے۔''

یہ آیت جوں کی توں سورۃ التوبہ میں (آیت ۷۳ کے طور پر) بھی آ چکی ہے۔ منافقین چونکہ بظاہر کلمہ گو اور قانونی لحاظ سے مسلمان تھے' اس لیے حضور ﷺ ان سے مسلمانوں جیسا سلوک روا رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ حضور ﷺ اپنی نرم مزاجی کی وجہ سے ان کی بہت سی شرارتوں کو نظر انداز بھی فرماتے رہتے تھے۔ چنانچہ اپنی مسلسل سازشوں پر جوابدہی نہ ہونے کی وجہ سے ان کے حوصلے بہت بڑھ گئے تھے۔ یہاں تک کہ وہ حضور ﷺ کے بارے میں گستاخانہ جملے بھی کستے رہتے تھے۔ مثلاً کہتے: ﴿هُوَ اُذُنٌ﴾ (التوبۃ:٦١) کہ آپؐ تو نرے کان ہیں۔ ہر بات سن لیتے ہیں' سمجھتے کچھ بھی نہیں (معاذ اللہ!)۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں حضور ﷺ کو ان لوگوں پر سختی کرنے کا کہا جا رہا ہے۔

﴿وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝﴾ ''ان کا ٹھکانہ جہنم ہے' اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔''

آیات ۱۰ تا ۱۲

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ۭ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ۙ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ۝ ع

ان آیات میں عورتوں کا معاملہ ایک اور پہلو سے زیر بحث آ رہا ہے۔ واضح رہے کہ ان دونوں سورتوں (الطلاق اور التحریم) کی ایک مشترک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان دونوں میں عورتوں کے معاملات بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ اب عورتوں پر واضح کیا جا رہا ہے کہ وہ

خود کو اپنے شوہروں کے تابع سمجھتے ہوئے آخرت کے حساب سے نچنت نہ ہو جائیں۔ اسلام میں عورت اور مرد کا درجہ انسان ہونے کی حیثیت سے برابر ہے۔ لہٰذا عورتیں اپنے دین و ایمان اور اعمال و فرائض کی خود ذمہ دار ہیں۔ اگر ان کا ایمان درست ہوگا اور اعمالِ صالحہ کا پلڑا بھاری ہوگا تبھی نجات کی کوئی صورت بنے گی۔ ان کے شوہر خواہ اللہ کے کتنے ہی برگزیدہ بندے کیوں نہ ہوں اس معاملے میں وہ ان کے کچھ کام نہیں آسکیں گے۔ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے ان آیات میں چار خواتین کی مثالیں دی گئی ہیں:

آیت ⑩ ﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ﴾ ''اللہ نے مثال بیان کی ہے کافروں کے لیے نوحؑ کی بیوی اور لوطؑ کی بیوی کی۔''

﴿كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ﴾ ''وہ دونوں ہمارے دو بہت صالح بندوں کے عقد میں تھیں''

﴿فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا﴾ ''تو انہوں نے ان سے خیانت کی' تو وہ دونوں اللہ کے مقابل میں ان کے کچھ بھی کام نہ آسکے''

وہ جلیل القدر پیغمبر علیہما السلام اپنی بیویوں کو اللہ کے عذاب سے نہ تو دنیا میں بچا سکے اور نہ ہی آخرت میں بچا سکیں گے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی سیلاب میں غرق ہوگئی اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی بھی اپنی قوم کے لوگوں کے ساتھ پتھراؤ کے عذاب سے ہلاک ہوئی۔ واضح رہے کہ یہاں جس خیانت کا ذکر ہوا ہے اس سے مراد کردار کی خیانت نہیں ہے' اس لیے کہ کسی نبیؑ کی بیوی کبھی بدچلن اور بدکار نہیں رہی ہے۔ ان کی خیانت اور بے وفائی دراصل دین کے معاملے میں تھی کہ وہ دونوں اپنے شوہروں کی جاسوسی کرتی تھیں اور ان کے راز اپنی قوم کے لوگوں تک پہنچاتی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک شادی شدہ عورت کی عصمت اُس کے شوہر کی عزّت و ناموس ہے جس کی حفاظت کرنا شوہر کی طرف سے اس پر فرض ہے' لیکن اس کے علاوہ ایک بیوی اپنے شوہر کے رازوں اور اس کے مال وغیرہ کی محافظ بھی ہوتی ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۳۴ میں نیک اور مثالی بیویوں کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان میں ایک صفت حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بھی ہے۔ اس کا مفہوم یہی ہے کہ نیک بیویاں اپنے شوہروں کی غیر حاضری میں ان کے گھر بار اور حقوق کی محافظ ہوتی ہیں۔ اب ظاہر ہے اس حفاظت میں شوہر کی عزّت و ناموس کے ساتھ ساتھ اس کے مال اور اس کے رازوں وغیرہ کی حفاظت بھی شامل ہے۔ چنانچہ یہاں خیانت سے صرف عزّت و ناموس ہی کی خیانت مراد لینا درست نہیں۔

﴿وَقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ⑩﴾ ''اور (آخرت میں) کہہ دیا جائے گا کہ تم دونوں داخل ہو جاؤ آگ میں دوسرے سب داخل ہونے والوں کے ساتھ۔''

ان دو عبرت انگیز مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو جانی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے وہ اولوالعزم پیغمبرؑ جنہوں نے ساڑھے نو سو سال اللہ تعالیٰ کے پیغام کی دعوت میں صَرف کیے وہ اگر اپنی بیوی کو بُرے انجام سے نہیں بچا سکے تو اور کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے کسی عزیز رشتے دار کی سفارش کر سکے گا؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کے آغاز میں قبیلہ قریش بالخصوص اپنے قریبی اعزّہ و اقارب کو جمع کر کے فرمایا تھا:

((يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ ! اشْتَرُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ اللّٰهِ لَا اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا، يَا بَنِيْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ! لَا اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا، يَا عَبَّاسَ بْنَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ! لَا اُغْنِيْ عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا، يَا صَفِيَّةُ عَمَّةَ

رَسُوْلِ اللّٰهِ! لَا أُغْنِيْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا، يَا فَاطِمَةُ بِنْتَ رَسُوْلِ اللّٰهِ! سَلِيْنِيْ بِمَا شِئْتِ لَا أُغْنِيْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا))(۳)

''اے قریش کے لوگو! اپنے آپ کو اللہ (کی گرفت) سے بچانے کی کوشش کرو' مَیں اللہ کے مقابلہ میں تمہارے کچھ بھی کام نہ آسکوں گا۔ اے بنی عبدالمطلب! مَیں اللہ کے مقابلہ میں تمہارے کچھ بھی کام نہ آسکوں گا۔ اے عباس بن عبدالمطلب! مَیں اللہ کے مقابلہ میں تمہارے کچھ بھی کام نہ آسکوں گا۔ اے صفیہ' اللہ کے رسول کی پھوپھی! مَیں اللہ کے مقابلہ میں تمہارے کچھ بھی کام نہ آسکوں گا۔ اے فاطمہ' اللہ کے رسولؐ کی بیٹی! تم مجھ سے (میرے مال میں سے) جو چاہو طلب کرلو لیکن مَیں اللہ کے مقابلہ میں تمہارے کچھ بھی کام نہ آسکوں گا۔''

ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں:

((يَافَاطِمَةُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ (ﷺ) أَنْقِذِيْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ' فَإِنِّيْ لَا أَمْلِكُ لَكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا))(۴)

''اے محمد (ﷺ) کی لختِ جگر فاطمہؓ! اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ' کیونکہ مجھے تمہارے بارے میں اللہ کے ہاں کوئی اختیار نہیں ہوگا۔''

آیت ۱۱ ﴿وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ﴾ ''اور اہلِ ایمان (خواتین) کے لیے اللہ نے مثال بیان کی ہے فرعون کی بیوی کی۔''

اُن کا نام حضرت آسیہؓ (بنت مزاحم) بیان کیا جاتا ہے۔ دریائے نیل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا صندوق ان ہی نے نکالا تھا اور حضرت موسیٰؑ کی پرورش کا اہتمام کیا تھا۔ بعد میں وہ مسلمان ہوگئی تھیں اور ہمیشہ فرعون کے مقابلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف داری کیا کرتی تھیں۔ جب فرعون کو پتا چل گیا کہ آسیہ اُسے خدا نہیں مانتی اور موسیٰؑ پر ایمان لا چکی ہے تو اُس نے ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ ڈالے۔

﴿اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ﴾ ''جب اُس نے کہا: اے میرے پروردگار! تُو میرے لیے بنا دے اپنے پاس ایک گھر جنّت میں''

﴿وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ﴾ ''اور مجھے نجات دے دے فرعون سے بھی اور اس کے عمل سے بھی''

﴿وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۱﴾ ''اور مجھے اس ظالم قوم سے (جلد از جلد) چھٹکارا دلا دے۔''

حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا کی اس دعا سے ان کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ ظاہر ہے وہ ایک عظیم الشان سلطنت کے مطلق العنان فرمانروا کی بیوی تھیں۔ اس حیثیت سے انہیں عزّت' دولت' شہرت اور محلات میں ہر طرح کی آسائشیں حاصل تھیں۔ لیکن ان کے ایمان اور اللہ تعالیٰ سے ان کی محبت کی کیفیت یہ تھی کہ وہ اپنے شوہر اور اس کے کافرانہ اعمال سے

۳۔ صحیح البخاری' کتاب الوصایا' باب ھل یدخل النساء والولد فی الاقارب' ح: ۲۷۵۳ و ۴۷۷۱۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب فی قولہ تعالیٰ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ' ح: ۲۰۶ (واللفظ لہ)

۴۔ صحیح مسلم کتاب الایمان' باب فی قولہ تعالیٰ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ' ح: ۲۰۴۔ وصحیح ابن حبان' ح: ۶۴۶ (واللفظ لہ)

بیزار ہو کر موت کی آرزومند تھیں۔

ان دو مثالوں میں دو انتہاؤں کی تصویر دکھا دی گئی ہے۔ یعنی ایک طرف بہترین شوہروں کے ہاں بدترین انجام والی بیویاں ہیں اور دوسری طرف ایک بدترین مرد کے گھر میں بہترین سیرت و کردار کی حامل بیوی ہے۔ ظاہر ہے حضرت آسیہؓ قیامت کے دن حضرت مریمؑ حضرت خدیجہؓ حضرت عائشہؓ اور حضرت فاطمہؓ جیسی عظیم مراتب کی حامل خواتین میں شامل ہوں گی۔

آیت ۱۲ ﴿وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا﴾ ''اور عمران کی بیٹی مریمؑ جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی''

یہ تیسری مثال ایسی خاتون کی ہے جو خود بھی نیک تھیں اور ان کی تربیت بھی انتہائی پاکیزہ ماحول میں ہوئی: ﴿وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا﴾ (آل عمران:۳۷)۔ یعنی انہوں نے اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت زکریا علیہ السلام کی آغوشِ محبت میں پرورش پائی اور یوں ان کی سیرت نُورٌ علیٰ نُور کی مثال بن گئی۔

﴿فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا﴾ ''تو ہم نے اس میں اپنی روح میں سے پھونکا''

﴿وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ﴾ ''اور اُس نے تصدیق کی اپنے رب کی تمام باتوں کی اور اُس کی کتابوں کی''

حضرت مریم سلام علیہا کو وحی کے ذریعے فرشتے جو کچھ بتاتے رہے انہوں نے وہ سب باتیں دل و جان سے تسلیم کیں۔ مثلاً یہ کہ اللہ نے تمہیں دنیا بھر کی عورتوں میں سے چُن لیا ہے اور یہ کہ اللہ کے حکم سے تمہارے ہاں بیٹا ہوگا۔ اسی طرح حضرت مریم نے زبور، تورات اور عہد نامہ قدیم سمیت تمام الہامی کُتب اور صحائف کی تصدیق بھی کی۔

﴿وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ۝۱۲﴾ ''اور وہ بہت ہی فرمانبرداروں میں سے تھیں۔''

ان تین مثالوں کے ذریعے خواتین کے حوالے سے تین ممکنہ صورتیں بیان کی گئی ہیں، یعنی بہترین شوہر کے ہاں بدترین بیوی، بدترین شوہر کے ہاں بہترین بیوی، اور بہترین ماحول میں بہترین خاتون۔ چوتھی ممکنہ صورت یہ ہو سکتی ہے کہ شوہر بھی بدطینت ہو اور اس کی بیوی بھی بدطینت ہو۔ یعنی میاں بیوی دونوں کا ظاہر و باطن ﴿ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ (النور:۴۰) کا نقشہ پیش کرتا ہو اور فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے کہ ان دونوں میں کون زیادہ بدطینت اور بدسرشت ہے۔ اس ممکنہ صورت کی مثال سورۃ اللہب میں ابولہب اور اُس کی بیوی (اُمّ جمیل) کی بیان ہوئی ہے۔

سُوْرَةُ الْمُلْكِ

تمہیدی کلمات

سورۃ التحریم مکّی مدنی سورتوں کے چھٹے گروپ کی آخری سورت تھی۔ یاددہانی کے لیے ایک مرتبہ پھر نوٹ کر لیجیے کہ اس گروپ کا آغاز سورۂ قٓ سے ہوتا ہے (سورۂ قٓ سے ہی قرآن مجید کی ساتویں اور آخری منزل کا آغاز بھی ہوتا ہے)۔ اس گروپ میں سورۂ قٓ سے سورۃ الواقعہ تک سات مکّی سورتیں اور سورۃ الحدید سے سورۃ التحریم تک دس مدنی سورتیں شامل ہیں۔ اب سورۃ الملک کے مطالعہ کے آغاز کے ساتھ ہم پھر سے قرآن کی ''مکّی جنّت'' میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس سورت سے مکّی سورتوں کے آخری گروپ کا آغاز ہوتا ہے۔ اس گروپ کی پہلی چھ سورتیں دو ضمنی گروپس میں تقسیم ہیں۔ ہر ضمنی گروپ میں تین سورتیں ہیں' جن میں ایک منفرد ہے اور دو جوڑے کی شکل میں ہیں۔ سورۃ الملک پہلے ضمنی گروپ کی منفرد سورت ہے۔ اپنے مضمون کی جامعیت کے اعتبار سے اس گروپ میں اس سورت کا وہی مقام ہے جو پچھلے گروپ میں سورۂ قٓ کا تھا۔ سورۃ الملک نبی اکرم ﷺ کو بہت عزیز تھی۔ رات کو سونے سے پہلے اس سورت کی تلاوت کرنا حضور ﷺ کا مستقل معمول تھا۔ آپؐ نے اُمّت کو بھی اس عمل کی خصوصی تلقین فرمائی ہے۔

آیات ۱ تا ۱۴

سُوْرَةُ الْمُلْكِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ٣٠ رُكُوْعَاتُهَا: ٢

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۫ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ۙ﴿١﴾ الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيٰوةَ
لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۙ﴿٢﴾ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا
تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ﴿٣﴾ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ
كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِيْرٌ ﴿٤﴾ وَ لَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَ
جَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ ﴿٥﴾ وَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ
جَهَنَّمَ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿٦﴾ اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّ هِيَ تَفُوْرُ ۙ﴿٧﴾ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ
الْغَيْظِ ؕ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ﴿٨﴾ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ
فَكَذَّبْنَا وَ قُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ﴿٩﴾ وَ قَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ

اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴿١٠﴾ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴿١١﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿١٢﴾ وَ اَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿١٣﴾ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿١٤﴾

آیت ① ﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ﴾ ''بہت ہی بابرکت ہے وہ ہستی جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے''

یہ دینِ اسلام کے سیاسی منشور کی بنیادی شق ہے۔ یعنی پوری کائنات کا اقتدار اور اختیارِ کُلّی طور پر اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے۔ دنیا میں اگر انسانوں کے ہاں اللہ تعالیٰ کے احکام سے کہیں بغاوت دکھائی دیتی ہے تو وہ بھی دراصل اُسی کے عطا کردہ اختیار کی وجہ سے ہے۔ اس میں ایمان کے دعوے داروں کا امتحان بھی ہے کہ وہ بھلا اللہ کے اقتدار کو چیلنج کرنے والوں کے مقابلے میں کیا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ ورنہ سورج' چاند' ستارے' کہکشائیں' ہوائیں اور کائنات کا ذرّہ ذرّہ اللہ تعالیٰ کے حکم کا پابند اور تابع ہے۔

پوری کائنات پر اللہ تعالیٰ کی حکومت اور قدرت کی کیفیت یہ ہے کہ کہیں کوئی ایک ذرّہ بھی اُس کی مرضی کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا اور حرکت کرتا ہوا کوئی ذرّہ اُس کی مشیت کے بغیر ساکن نہیں ہو سکتا۔ اپنی تمام مخلوق میں صرف انسان کو اُس نے ایک حد تک ارادے اور عمل کا اختیار دیا ہے اور وہ بھی اس لیے کہ اس میں انسان کی آزمائش مقصود ہے۔ لیکن انسان ہے کہ ہلدی کی یہ گانٹھ مل جانے پر پنساری بن بیٹھا ہے۔ اب کہیں وہ فرعون بن کر اللہ کے مقابلے میں ''میری حکومت' میرا ملک اور میرا مثالی نظام'' جیسے دعووں کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے تو کہیں کسی فرعون کی چاکری اور وفاداری کی دھن میں مقتدرِ حقیقی کے احکام کو پامال کرتا چلا جاتا ہے۔ جبکہ حقیقت میں انسان کی بے بسی کا عالم یہ ہے کہ خود اپنے جسم پر بھی اُسے کوئی اختیار نہیں۔ ظاہر ہے انسان کے جسم کی فزیالوجی اور اناٹومی کا سارا نظام بھی تو اللہ تعالیٰ کے طے کردہ قانون کے تابع ہے۔ اگر کوئی شخص چاہے کہ وہ اپنے دل کو آرام دینے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے بند کر دے اور پھر اپنی مرضی سے دوبارہ رواں کر لے تو اس کے لیے یہ ممکن نہیں۔

﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ۟ ﴿١﴾﴾ ''اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

آیت ② ﴿الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۚ﴾ ''جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرنے والا ہے۔''

﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ﴿٢﴾﴾ ''اور وہ بہت زبردست بھی ہے اور بہت بخشنے والا بھی۔''

یہ ہے انسانی زندگی اور موت کی تخلیق کا اصل مقصد۔ جو کوئی اس فلسفے کو نہیں سمجھے گا اسے زندگی' موت اور موت کے بعد پھر زندگی کی یہ باتیں محض افسانہ معلوم ہوں گی۔ جیسے ایک معروف جاہلی شاعر نے اپنی بیوی کو مخاطب کر کے کہا تھا:

حَيَاةٌ ثُمَّ مَوْتٌ ثُمَّ بَعْثٌ ۔۔۔ حَدِيْثُ خُرَافَةٍ يَا اُمَّ عَمْرٍو!

''کہ یہ زندگی' پھر موت' پھر زندگی' اے اُمّ عمرو! یہ کیا حدیث خرافات ہے؟'' (معاذ اللہ!) انسانی زندگی کا سفر دراصل عالمِ ارواح سے شروع ہو کر ابدالآباد کی سرحدوں تک جاتا ہے۔ انسان کی دنیوی زندگی' موت اور بعث بعد الموت اس طویل سلسلۂ حیات کے مختلف مراحل ہیں۔ جیسا کہ اس آیت میں آیا ہے: ﴿وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ

تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾ (البقرۃ) ''اور تم مُردہ تھے' پھر اُس نے تمہیں زندہ کیا' پھر وہ تمہیں مارے گا' پھر جلائے گا' پھر تم اُسی کی طرف لوٹا دیے جاؤ گے''۔ زندگی کے اس تسلسل کے اندر موت کے مرحلے کی توجیہہ میر تقی میر نے ان الفاظ میں بیان کی ہے: ؎

موت اِک ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر!

بہرحال انسان کی دُنیوی زندگی ایک وقفہ امتحان ہے اور موت اس وقفے کے اختتام کی گھنٹی ہے: ﴿نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۶۰﴾﴾ (الواقعۃ)۔ اس وقفہ امتحان کا انداز بالکل اسکولوں اور کالجوں کے امتحانات جیسا ہے۔ فرق بس یہ ہے کہ ان امتحانات کے لیے چند گھنٹوں کا وقت دیا جاتا ہے' جبکہ انسانی زندگی کے حقیقی امتحان کا دورانیہ اوسطاً تیس چالیس برس پر محیط ہے۔ ظاہر ہے انسان کی زندگی کے ابتدائی بیس پچیس برس تو بچپنے اور غیر سنجیدہ رویّے کی نذر ہو جاتے ہیں۔ پھر اگر کسی کو بڑھاپا دیکھنا نصیب ہو تو اپنی آخری عمر میں وہ ﴿لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا﴾ (الحج:۵) کی عبرت ناک تصویر بن کر رہ جاتا ہے۔ لے دے کر ایک انسان کو عمل کے لیے شعور کی عمر کے اوسطاً تیس چالیس سال ہی ملتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنی مشہور نظم خضرِ راہ میں ''زندگی'' کے عنوان کے تحت زندگی کے اس فلسفے پر کمال مہارت سے روشنی ڈالی ہے۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

؎ برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی!

؎ تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے ناپ جاوداں' پیہم دواں' ہر دم جواں ہے زندگی!

؎ قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

ان اشعار میں علامہ اقبال نے دراصل قرآنی آیات ہی کی ترجمانی کی ہے۔ مندرجہ بالا آخری شعر (قلزمِ ہستی.....) آیت زیرِ مطالعہ کے مفہوم کا ترجمان ہے' جبکہ پہلے شعر میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۵۴ ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ﴾ کا بنیادی فلسفہ بیان ہوا ہے۔ ظاہر ہے عام طور پر تو زندہ جان کو ہی زندگی کا نام دیا جاتا ہے' لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حقیقی اور دائمی زندگی جان دے دینے (تسلیمِ جاں) سے حاصل ہوتی ہے۔

آیت ۳ ﴿الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۭ﴾ ''(وہ اللہ کہ) جس نے بنائے سات آسمان ایک دوسرے کے اوپر۔''

یہ آیت آیاتِ متشابہات میں سے ہے۔ ابھی تک انسان سات آسمانوں کی حقیقت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

﴿مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ﴾ ''تم نہیں دیکھ پاؤ گے رحمٰن کی تخلیق میں کہیں کوئی فرق۔''

اس کائنات کا نظام اور اس میں موجود ایک ایک چیز کی تخلیق اس قدر خوبصورت' محکم' مربوط اور کامل ہے کہ اس میں کسی خلل' نقص' رخنے' بدنظمی یا عدمِ تناسب کا کہیں شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ اس حقیقت کی گواہی نسلِ انسانی نے اپنے اجتماعی علم کی بنیاد پر ہر زمانے میں دی ہے۔ ہر زمانے کے سائنس دانوں نے فلکیات' ارضیات' طبیعیات' حیوانیات' نباتات غرض سائنس کے تمام شعبوں میں حیران کن تحقیقات کی ہیں' لیکن آج تک کوئی ایک محقق یا سائنسدان یہ نہیں کہہ سکا کہ قدرت کی بنائی ہوئی فلاں چیز میں فلاں نقص ہے یا یہ کہ فلاں چیز اگر ایسے کی بجائے ویسے ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتی۔

﴿فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ﴿۳﴾﴾ ''پھر لوٹاؤ نگاہ کو' کیا تمہیں کہیں کوئی رخنہ نظر آتا ہے؟''

آیت ۴ ﴿ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ﴿۴﴾﴾ ''پھر لوٹاؤ نگاہ کو بار بار (کوئی

رخنہ ڈھونڈنے کے لیے) پلٹ آئے گی نگاہ تمہاری طرف ناکام تھک ہار کر۔"

اندازہ کیجیے کہ کس قدر پُرزور اسلوب ہے اور کتنا بڑا چیلنج ہے! بار بار دیکھو ہر پہلو اور ہر زاویے سے دیکھو! اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں تمہیں کہیں کوئی خلل، نقص یا رخنہ نظر نہیں آئے گا! ظاہر ہے یہ چیلنج پوری انسانیت کے لیے ہے اور قیامت تک کے لیے ہے۔ بہر حال آج تک کوئی سائنس دان اور کوئی دانشور اس چیلنج کا جواب نہیں دے سکا۔ گویا اب تک پوری نوعِ انسانی اس نکتے پر متفق ہے کہ یہ کائنات اور اس کی ایک ایک تخلیق مثالی اور کامل ہے۔ دراصل دنیا بھر کے داناؤں اور دانشوروں کی توجہ اس مثالی تخلیق کی طرف دلا کر انہیں پیغام تو یہ دینا مقصود ہے کہ اے عقل کے اندھو! کائنات کی خوبصورتی اور کاملیت کو دیکھ کر اس پر حیرت کا اظہار کرنے کے بجائے اس کے خالق کو پہچانو اور اس کی عظمت کے سامنے اپنا سرِ نیاز خم کرو۔ لیکن مقامِ حیرت ہے کہ ستاروں اور کہکشاؤں کی دنیا کے اسرار و عجائب کا کھوج لگانے والے بڑے بڑے سائنسدان اور ماہرینِ فلکیات بھی اس معاملے میں اپنے ناک تلے کے پتھر سے ٹھوکریں کھاتے رہے۔ ان لوگوں نے اپنی تحقیقات کے دوران بہت کچھ دریافت بھی کیا اور بہت کچھ دیکھا بھی۔ لیکن اس ساری چھان بین میں انہیں اگر نہیں نظر آیا تو اس کائنات کا خالق کہیں نظر نہیں آیا۔ بقول اقبال: ؎

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا!

آیت ۵ ﴿وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ﴾ "اور ہم نے سب سے قریبی آسمان کو سجا دیا ہے چراغوں سے"

یعنی زمین سے قریب ترین آسمان کو ستاروں سے مزین کر دیا گیا ہے۔

﴿وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ﴾ "اور ان کو بنا دیا ہے ہم نے شیاطین کو نشانہ بنانے کا ذریعہ"

ان ستاروں میں ایسے میزائل نصب کر دیے گئے ہیں جو غیب کی خبروں کی ٹوہ میں عالمِ بالا کی طرف جانے والے شیاطین جن کو نشانہ بناتے ہیں۔

﴿وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ ۝۵﴾ "اور ان کے لیے ہم نے تیار کر رکھا ہے جلا دینے والا عذاب۔"

آیت ۶ ﴿وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۶﴾ "اور جو لوگ اپنے رب کا کفر کریں (چاہے وہ انسان ہوں یا جنات) ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔"

آیت ۷ ﴿اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ ۝۷﴾ "جب وہ اس میں جھونکے جائیں گے تو اسے سنیں گے دھاڑتے ہوئے اور وہ بہت جوش کھا رہی ہوگی۔"

جہنم انہیں دیکھ کر غصے سے دھاڑ رہی ہوگی جیسے کوئی بھوکا بھیڑیا اپنے شکار پر جھپٹتے ہوئے غُراتا ہے۔ سورۂ قٓ میں جہنم کے غیظ و غضب کی ایک کیفیت یوں بیان ہوئی ہے: ﴿يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ۝۳۰﴾ "جس دن کہ ہم پوچھیں گے جہنم سے کہ کیا تو بھر گئی؟ اور وہ کہے گی کیا کچھ اور بھی ہے؟"

آیت ۸ ﴿تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ۭ﴾ "قریب ہوگا کہ وہ غصے سے پھٹ جائے۔"

ایسے معلوم ہوگا کہ ابھی شدتِ غضب سے پھٹ پڑے گی۔

﴿كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝۸﴾ "جب بھی ڈالا جائے گا اس میں کسی ایک گروہ کو

تو اس کے داروغے اُن سے پوچھیں گے: کیا تمہارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تھا؟''

قیامت کے دن ہر قوم کا علیحدہ علیحدہ حساب ہوگا' جیسا کہ سورۃ النمل کی اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے: ﴿وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۸۳﴾﴾ ''اور ذرا تصور کرو اُس دن کا جس دن ہم جمع کریں گے ہر اُمت میں سے ایک فوج اُن لوگوں میں سے جو ہماری آیات کو جھٹلایا کرتے تھے' پھر ان کی درجہ بندی کی جائے گی''۔ گویا جیسے جیسے حساب ہوتا جائے گا' اسی ترتیب سے ہر قوم کے مجرمین کو جہنم کی طرف لے جایا جائے گا۔ ہر گروہ کے پہنچنے پر جہنم پر متعین فرشتے ان سے سوال کریں گے کہ کیا اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تھا؟

آیت ۸ ﴿قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ﴾ ''وہ کہیں گے: کیوں نہیں! ہمارے پاس خبردار کرنے والا آیا تھا''

﴿فَكَذَّبْنَا﴾ ''لیکن ہم نے اُسے جھٹلا دیا''

﴿وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۚ﴾ ''اور ہم نے کہا کہ اللہ نے کوئی شے نہیں اتاری۔''

ہم نے اپنے رسولوںؑ سے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف کوئی کتاب وغیرہ نہیں بھیجی' بلکہ ہم نے تو انہیں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ:

﴿اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ﴿۹﴾﴾ ''تم تو کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گئے ہو۔''

آیت ۱۰ ﴿وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ﴾ ''اور وہ کہیں گے کہ اگر ہم سنتے اور عقل سے کام لیتے''

﴿مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴿۱۰﴾﴾ ''تو ہم نہ ہوتے ان جہنم والوں میں سے۔''

اس آیت میں انبیاء و رسل علیہم السلام کی تکذیب کرنے والوں کے اصل گناہ کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کا یہ مقام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ایسے تمام لوگوں کا بنیادی اور اصل جرم یہ تھا کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی دعوت سنی اَن سنی کر دی تھی۔ اس دعوت پر انہوں نے کبھی سنجیدگی سے غور ہی نہ کیا اور نہ ہی پیغمبروں کی باتوں کو کبھی عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی زحمت گوارا کی۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیکھنے' سننے' سمجھنے وغیرہ کی صلاحیتیں اسی لیے تو دی ہیں کہ وہ ان صلاحیتوں کو کام میں لائے اور اپنے نفع و نقصان کے حوالے سے درست فیصلے کرے۔ اسی بنیاد پر آخرت میں انسان کی ان تمام صلاحیتوں کا احتساب بھی ہوگا: ﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴿۳۶﴾﴾ (بنی اسرائیل) ''یقیناً سماعت' بصارت اور عقل سبھی کے بارے میں باز پرس کی جائے گی''۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے تو انسان کو یہ صلاحیتیں استعمال میں لانے کے لیے دی ہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ حق کی دعوت کے جواب میں اکثر لوگ ان صلاحیتوں سے بالکل بھی کام نہیں لیتے۔ بلکہ اگر بات سمجھ میں آ بھی جائے اور دل اس کی صداقت کی گواہی بھی دے دے' تب بھی عملی طور پر قدم آگے نہیں بڑھتا۔ صرف اس لیے کہ آباء و اَجداد کے اعتقادات و نظریات ہیں' برادری کے رسم و رواج ہیں! انہیں کیسے چھوڑ دیں؟ اور اگر چھوڑیں گے تو لوگ کیا کہیں گے؟ اسی نوعیت کی ایک مجبوری یہ بھی ہے کہ پرانے مسلک سے روگردانی بھلا کیونکر ممکن ہے؟ اتنے عرصے سے اس جماعت میں ہیں' اب یکدم اس سے کیسے بے وفائی کر دیں؟

آیت ۱۱ ﴿فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ﴾ ''پس وہ اپنے اصل گناہ کا اعتراف کر لیں گے۔''

﴿فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴿۱۱﴾﴾ ''پس پھٹکار ہے جہنمی لوگوں کے لیے۔''

اب تقابل کے طور پر آگے اہلِ جنّت کا تذکرہ آ رہا ہے۔

آیت ۱۲ ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یَخۡشَوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَیۡبِ﴾ ''بے شک وہ لوگ جو اپنے ربّ سے ڈرتے ہیں غیب میں رہتے ہوئے'' ﴿لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّ اَجۡرٌ کَبِیۡرٌ ﴿۱۲﴾﴾ ''اُن کے لیے مغفرت بھی ہے اور بہت بڑا اجر بھی۔''

آیت ۱۳ ﴿وَ اَسِرُّوۡا قَوۡلَکُمۡ اَوِ اجۡہَرُوۡا بِہٖ ؕ﴾ ''اور (دیکھو!) چاہے تم اپنی بات کو چھپا کر بیان کرو یا بلند آواز سے بیان کرو (وہ اس کو جانتا ہے)۔''

﴿اِنَّہٗ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۱۳﴾﴾ ''وہ تو اس سے بھی واقف ہے جو تمہارے سینوں کے اندر پنہاں ہے۔''

آیت ۱۴ ﴿اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ ؕ﴾ ''کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے؟''

یہ آیت اپنے مضمون اور اسلوب کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ ہم میں سے جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے دعوت کا فریضہ ادا کرنے کی توفیق دی ہے' انہیں ایسی آیات ازبر ہونی چاہئیں۔ ایک شخص نے اگر گھڑی بنائی ہے تو ظاہر ہے اس سے بڑھ کر بھلا اور کون اس گھڑی کے بارے میں جان سکتا ہے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ جو انسان کا خالق ہے' اس سے اس کے ظاہر اور باطن کا کوئی پہلو بھلا کیسے پوشیدہ رہ سکتا ہے!

﴿وَ ہُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۱۴﴾﴾ ''اور وہ بہت باریک بین ہے' ہر شے کی خبر رکھنے والا ہے۔''

آیات ۱۵ تا ۳۰

ہُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ ذَلُوۡلًا فَامۡشُوۡا فِیۡ مَنَاکِبِہَا وَ کُلُوۡا مِنۡ رِّزۡقِہٖ ؕ وَ اِلَیۡہِ النُّشُوۡرُ ﴿۱۵﴾ ءَاَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ اَنۡ یَّخۡسِفَ بِکُمُ الۡاَرۡضَ فَاِذَا ہِیَ تَمُوۡرُ ﴿۱۶﴾ اَمۡ اَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ اَنۡ یُّرۡسِلَ عَلَیۡکُمۡ حَاصِبًا ؕ فَسَتَعۡلَمُوۡنَ کَیۡفَ نَذِیۡرِ ﴿۱۷﴾ وَ لَقَدۡ کَذَّبَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ فَکَیۡفَ کَانَ نَکِیۡرِ ﴿۱۸﴾ اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اِلَی الطَّیۡرِ فَوۡقَہُمۡ صٰٓفّٰتٍ وَّ یَقۡبِضۡنَ ۚۖ مَا یُمۡسِکُہُنَّ اِلَّا الرَّحۡمٰنُ ؕ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیۡءٍۭ بَصِیۡرٌ ﴿۱۹﴾ اَمَّنۡ ہٰذَا الَّذِیۡ ہُوَ جُنۡدٌ لَّکُمۡ یَنۡصُرُکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ الرَّحۡمٰنِ ؕ اِنِ الۡکٰفِرُوۡنَ اِلَّا فِیۡ غُرُوۡرٍ ﴿۲۰﴾ اَمَّنۡ ہٰذَا الَّذِیۡ یَرۡزُقُکُمۡ اِنۡ اَمۡسَکَ رِزۡقَہٗ ۚ بَلۡ لَّجُّوۡا فِیۡ عُتُوٍّ وَّ نُفُوۡرٍ ﴿۲۱﴾ اَفَمَنۡ یَّمۡشِیۡ مُکِبًّا عَلٰی وَجۡہِہٖۤ اَہۡدٰۤی اَمَّنۡ یَّمۡشِیۡ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۲۲﴾ قُلۡ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَکُمۡ وَ جَعَلَ لَکُمُ السَّمۡعَ وَ الۡاَبۡصَارَ وَ الۡاَفۡـِٕدَۃَ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۲۳﴾ قُلۡ ہُوَ الَّذِیۡ ذَرَاَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ وَ اِلَیۡہِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۲۴﴾ وَ یَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی ہٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۲۵﴾ قُلۡ اِنَّمَا الۡعِلۡمُ عِنۡدَ اللّٰہِ ۫ وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۲۶﴾ فَلَمَّا رَاَوۡہُ زُلۡفَۃً سِیۡٓـَٔتۡ وُجُوۡہُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ قِیۡلَ ہٰذَا الَّذِیۡ کُنۡتُمۡ بِہٖ تَدَّعُوۡنَ ﴿۲۷﴾ قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ اَہۡلَکَنِیَ اللّٰہُ وَ مَنۡ مَّعِیَ اَوۡ رَحِمَنَا ۙ فَمَنۡ یُّجِیۡرُ الۡکٰفِرِیۡنَ مِنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۲۸﴾

قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۹﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ
اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ﴿۳۰﴾ ع

آیت ۱۵ ﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا﴾ ''وہی ہے جس نے تمہارے لیے بنا دیا ہے زمین کو پست''
اُس نے زمین کو تمہارے ماتحت اور تابع حکم کر رکھا ہے۔
﴿فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا﴾ ''تو تم چلو پھرو اس کے کندھوں کے مابین''
زمین کے کندھوں سے مراد اس کے وہ میدان ہیں جو انسان کو بہت وسیع اور کشادہ نظر آتے ہیں۔ جیسے ایک چیونٹی اگر ہاتھی کے کندھوں کے درمیان چل پھر رہی ہوگی تو ظاہر ہے اس جگہ کو وہ بہت وسیع میدان سمجھے گی۔
﴿وَ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَ اِلَيْهِ النُّشُوْرُ ﴿۱۵﴾﴾ ''اور اُس کے (دیے ہوئے) رزق سے کھاؤ پیو اور (یاد رکھو کہ تم نے) اُسی کی طرف زندہ ہو کر جانا ہے۔''

آیت ۱۶ ﴿ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ﴿۱۶﴾﴾ ''کیا تم بے خوف ہو گئے ہو اُس سے جو آسمان میں ہے کہ وہ تمہیں زمین میں دھنسا دے اور وہ یکایک لرزنے لگے۔''
کیا تم اس بات سے خائف نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے زمین پر زلزلہ آ جائے زمین شق ہو جائے اور تم اس کے اندر دھنس جاؤ؟

آیت ۱۷ ﴿اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ؕ﴾ ''کیا تم بے خوف ہو گئے ہو اُس سے جو آسمان میں ہے کہ وہ تم پر پتھر برسانے والی آندھی بھیج دے؟''
﴿فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ ﴿۱۷﴾﴾ ''پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میرا خبردار کرنا کیسا تھا!''

آیت ۱۸ ﴿وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۱۸﴾﴾ ''اور یقیناً ان سے پہلے والوں نے بھی جھٹلایا تھا' تو کیسا ہوا (ان پر) میرا عذاب؟''

آیت ۱۹ ﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ ؘ﴾ ''کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں پرندوں کو اپنے اوپر (اڑتے ہوئے) کبھی پروں کو پھیلائے ہوئے اور کبھی سمیٹے ہوئے؟''
﴿مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ؕ﴾ ''نہیں روکے ہوئے انہیں کوئی (فضا میں) مگر رحمٰن!''
﴿اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۭ بَصِيْرٌ ﴿۱۹﴾﴾ ''یقیناً وہ ہر چیز کو خوب دیکھنے والا ہے!''
یعنی اس کائنات کی ایک ایک مخلوق اور ایک ایک چیز جس قانونِ طبعی پر چل رہی ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کا وضع کردہ ہے۔

آیت ۲۰ ﴿اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ؕ﴾ ''بھلا وہ کون ہے جو تمہارا لشکر بن کر تمہاری مدد کرے رحمٰن کے مقابلہ میں؟''
﴿اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ ﴿۲۰﴾﴾ ''نہیں ہیں یہ کافر مگر دھوکے میں مبتلا ہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ یہ منکرین صرف دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔

آیت ۲۱ ﴿اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ﴾ ''پھر بھلا کون ہے وہ جو تمہیں رزق دے سکے اگر اللہ اپنے رزق کو روک لے؟''

﴿بَلْ لَّجُّوْا فِيْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ ۝۲۱﴾ ''بلکہ یہ لوگ اپنی سرکشی اور حق سے گریز میں بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔''

اگلی آیت فلسفہ و حکمتِ قرآن کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔

آیت ۲۲ ﴿اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۲۲﴾ ''تو کیا وہ شخص جو اپنے منہ کے بل گھسٹ رہا ہے زیادہ ہدایت پر ہے یا وہ جو سیدھا ہو کر چل رہا ہے ایک سیدھے راستے پر؟''

اس آیت میں دو قسم کے انسانوں کے ''طرزِ زندگی'' کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ ایک قسم کے انسان وہ ہیں جو انسان ہوتے ہوئے بھی حیوانی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جیسے ان کی حیوانی جبلّت انہیں چلا رہی ہے بس اسی طرح وہ چلے جا رہے ہیں۔ بظاہر تو وہ اپنی زندگی کی منصوبہ بندیاں بھی کرتے ہیں' معاشی دوڑ دھوپ میں بھی سرگرمِ عمل رہتے ہیں' کھاتے پیتے بھی ہیں اور دوسری ضروریات بھی پوری کرتے ہیں' لیکن یہ سب کچھ وہ اپنے جبلّی داعیات کے تحت کرتے ہیں۔ جبلّی داعیات کی تعمیل و تکمیل کے علاوہ ان کے سامنے زندگی کا کوئی اور مقصد ہے ہی نہیں۔ ان لوگوں کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص فاصلہ طے کرنے کے لیے چوپایوں کی طرح اوندھا ہو کر منہ کے بل خود کو گھسیٹ رہا ہو۔ ظاہر ہے ایسا شخص نہ تو راستہ دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی اسے اپنی منزل کی کچھ خبر ہوتی ہے۔ دوسری مثال اُس شخص کی ہے جو سیدھے راستے پر انسانوں کی طرح سیدھا کھڑے ہو کر چل رہا ہے۔ اس مثال کے مصداق وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی منزل طے کر رکھی ہے۔ وہ طے شدہ منزل پر پہنچانے والے درست راستے کا تعین بھی کر چکے ہیں اور پوری یکسوئی کے ساتھ اس راستے پر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ ظاہر ہے دنیا میں ان لوگوں کی منزل اقامتِ دین ہے جبکہ آخرت کے حوالے سے وہ رضائے الٰہی کے حصول کے متمنی ہیں۔

آیت زیرِ مطالعہ میں جو فلسفہ بیان ہوا ہے اس کی وضاحت قبل ازیں سورۃ الحج کی آیت ۷۳ کے تحت بھی کی جا چکی ہے۔ اس فلسفے کا خلاصہ یہ ہے کہ جو چیز انسان کو حیوانات سے ممیز و ممتاز کرتی ہے وہ اس کا نظریہ اور اس کی سوچ ہے۔ گویا انسان حقیقت میں وہی ہے جس کا کوئی نظریہ ہو' کوئی آئیڈیل اور کوئی نصب العین ہو۔ جو انسان کسی نظریے اور نصب العین کے بغیر زندگی گزار رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾ (الاعراف:۱۷۹) کے مصداق ہیں' یعنی وہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔ ظاہر ہے جانوروں کو تو شعور کی اس سطح پر پیدا ہی نہیں کیا گیا کہ وہ اپنی زندگی کا کوئی نصب العین متعین کر سکیں۔ ان کی تخلیق کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ انسان کسی نہ کسی طور پر انہیں اپنے کام میں لائیں اور بس۔ سورۃ الحج کی مذکورہ آیت (آیت ۷۳) میں بتوں اور ان کے پجاریوں کی تمثیل کے پردے میں یہ حقیقت بھی واضح کر دی گئی ہے کہ جس انسان کا نظریہ یا آئیڈیل بلند ہوگا اس کی شخصیت بھی بلند ہوگی' جبکہ گھٹیا آئیڈیل کے پیچھے بھاگنے والے انسان کی سوچ اور شخصیت بھی گھٹیا ہو کر رہ جائے گی۔

آیت ۲۳ ﴿قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ﴾ ''کہہ دیجیے کہ وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے لیے کان' آنکھیں اور دل بنائے۔''

لغوی اعتبار سے لفظ 'اَنْشَاَ' اٹھانے اور پرورش کرنے کا مفہوم بھی دیتا ہے۔ لفظ ''فواد'' کے مفہوم کی وضاحت سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۳۶ کے تحت گزر چکی ہے۔ عام طور پر اس لفظ کا ترجمہ ''دل'' کیا جاتا ہے' لیکن اصل میں اس سے مراد انسان کی وہ صلاحیت ہے جس کی مدد سے وہ دستیاب معلومات کا تجزیہ کر کے نتائج اخذ کرتا ہے۔ چنانچہ اس لفظ میں عقل یا سمجھ بوجھ کا مفہوم بھی شامل ہے۔

یہاں ایک اہم نکتہ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ قرآن مجید میں جب انسان کی طبعی صلاحیتوں یا حواس کا تذکرہ ہوتا ہے تو السَّمْع (سماعت) کا ذکر پہلے آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی علم کے ذرائع میں پہلا اور بنیادی ذریعہ اس کی سماعت ہے۔ پچھلی نسلوں کے علمی آثار اور تجرباتی علم سے استفادہ کرنا ہر دور کے انسان کی ضرورت رہی ہے۔ اس علم کو بھی نسل در نسل منتقل کرنے کا بنیادی ذریعہ انسان کی سماعت ہی ہے۔ دوسرے حواس یا ذرائع اس میں اپنا اپنا حصہ بعد کے مراحل میں شامل کرتے ہیں۔

﴿قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿٢٣﴾﴾ ''بہت ہی کم شکر ہے جو تم لوگ کرتے ہو۔''

آیت ۲۴ ﴿قُلْ هُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿٢٤﴾﴾ ''کہہ دیجیے اُسی نے تمہیں پھیلا دیا ہے زمین میں اور اُسی کی طرف تم اکٹھے کر دیے جاؤ گے۔''

آیت ۲۵ ﴿وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٢٥﴾﴾ ''وہ کہتے ہیں کب پورا ہوگا یہ وعدہ؟ اگر تم سچے ہو (تو بتاؤ)!''

آیت ۲۶ ﴿قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ﴾ ''کہہ دیجیے کہ یہ علم تو اللہ ہی کے پاس ہے''

قیامت کے وقوع کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی کچھ نہیں جانتا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ﴾ (لقمان:۳۴) ''یقیناً اللہ ہی ہے جس کے پاس ہے قیامت کا علم۔''

﴿وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٢٦﴾﴾ ''اور میں تو بس ایک واضح طور پر خبردار کر دینے والا ہوں۔''

آیت ۲۷ ﴿فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ ''پھر جب وہ دیکھیں گے اس کو اپنے قریب آتے تو ان کافروں کے چہرے بگڑ جائیں گے''

﴿وَقِيْلَ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ﴿٢٧﴾﴾ ''اور کہا جائے گا' یہ ہے وہ چیز جس کا تم مطالبہ کرتے تھے۔''

ہماری وعیدوں اور تنبیہات کے جواب میں تم لوگ طنزیہ انداز میں کہا کرتے تھے کہ لاؤ دکھاؤ کیسی ہے وہ جہنم! لاؤ ابھی لے آؤ ہمارے اوپر وہ عذابِ موعود! تو لو دیکھ لو اب' یہ ہے جہنم! تمہارا اصل اور دائمی ٹھکانہ!

آیت ۲۸ ﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢٨﴾﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ان سے کہیے کہ اگر اللہ مجھے اور جو لوگ میرے ساتھ ہیں اُن کو ہلاک کر دے یا وہ ہم پر رحم کرے' تو کافروں کو دردناک عذاب سے کون بچائے گا؟''

یعنی ہم نے تو اپنا معاملہ اپنے اللہ کے سپرد کر رکھا ہے۔ ہم اللہ کے بتائے ہوئے جس راستے پر چل رہے ہیں اس میں یا تو ہماری جانیں چلی جائیں گی یا ہم فتح یاب ہوں گے۔ ان میں سے جو صورت بھی ہو' ہمارے لیے تو کامیابی ہی کامیابی ہے۔ بلکہ ہماری اصل اور

ابدی کامیابی تو وہ ہے جسے تم ہلاکت سمجھتے ہو۔ بہر حال صورتِ حال جو بھی ہو اُن دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی (اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ) (التوبۃ:۵۲) تو ہمیں مل کر ہی رہے گی۔ ہمارے غلبے اور فتح کی صورت میں تو تم بھی ہمیں کامیاب قرار دو گے' لیکن ہم اگر بقول تمہارے ہلاک بھی ہو گئے تو تم اپنے بارے میں بھی تو سوچو کہ تم لوگوں کو اللہ کے عذاب سے کون بچائے گا؟

آیت ۲۹ ﴿قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے کہ وہ تو رحمٰن ہے' ہم اُس پر ایمان لا چکے ہیں اور اُسی پر ہمارا توکل ہے۔''

یاد رہے کہ زیر مطالعہ مکّی سورتیں بالکل ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی تھیں' اسی لیے ان میں حضور ﷺ اور اہل ایمان کے ساتھ کفار و مشرکین کی بالکل ابتدائی ردّ و قدح کا عکس نظر آتا ہے۔ اس کشمکش کا نقطۂ عروج سورۃ الانعام' سورۃ الاعراف اور سورۂ ہود میں دیکھا جا سکتا ہے۔

﴿فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۲۹﴾ ''تو عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کھلی گمراہی میں کون تھا!''

آنے والا وقت واضح کر دے گا کہ ہم گمراہ تھے یا تم۔

آیت ۳۰ ﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ۝۳۰﴾ ''آپ کہیے کہ ذرا سوچو! اگر تمہارا پانی گہرائی میں اُتر جائے تو کون ہے جو لائے گا تمہارے پاس صاف' نتھرا ہوا پانی؟''

آج کے دور میں اس آیت کا مفہوم واضح تر ہو کر دنیا کے سامنے آیا ہے۔ آج متعلقہ ماہرین بار بار اس خدشے کا اظہار کر رہے ہیں کہ پانی کے بڑھتے ہوئے استعمال اور بارشوں کی کمی کے باعث مستقبل قریب میں زیر زمین پانی کی سطح خطرناک حد تک نیچے جا سکتی ہے۔ بیشتر علاقوں میں انسانی' حیوانی اور نباتاتی زندگی کا زیادہ تر دارومدار زیر زمین پانی پر ہی ہے جو عموماً آسانی سے دستیاب بھی ہے۔ صاف شفاف اور میٹھے پانی کا یہ عظیم الشان ذخیرہ ''زندگی'' کے لیے قدرت کا بہت بڑا عطیہ ہے۔ اگر یہ پانی واقعی ایسی گہرائی میں چلا جائے جہاں سے اس کا نکالنا ناممکن یا مشکل ہو جائے تو اس کے نتائج کا تصور بھی روح فرسا ہے۔

سُوْرَةُ الْقَلَمِ

تمہیدی کلمات

جیسا کہ سورۃ الملک کے تعارف میں بھی بیان ہو چکا ہے' زیر مطالعہ مکی سورتوں میں سے پہلی چھ سورتیں دو ضمنی گروپس پر مشتمل ہیں۔ ہر ضمنی گروپ میں تین سورتیں ہیں' جن میں ایک سورت منفرد ہے اور دو جوڑے کی شکل میں ہیں۔ پہلے ضمنی گروپ کی پہلی سورت یعنی سورۃ الملک منفرد تھی' جبکہ اس کے بعد کی دو سورتیں یعنی سورۃ القلم اور سورۃ الحاقّہ جوڑے کی شکل میں ہیں۔ ان دونوں سورتوں میں انباء الرسل کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ سورۃ القلم اپنے گروپ کی تمام سورتوں میں اس اعتبار سے نمایاں ہے کہ اس میں حضور ﷺ کی دعوت کے بالکل ابتدائی دور کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس حوالے سے اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات کے بعد حضور ﷺ پر نازل ہونے والی دوسری وحی اس سورت کی ابتدائی سات آیات پر مشتمل تھی۔ ذاتی طور پر مجھے بھی اس رائے سے اتفاق ہے۔ ان سات آیات میں اہلِ مکہ کے اُس ردِّعمل کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے جس کا اظہار انہوں نے حضور ﷺ کی پہلی وحی کی خبر پر کیا تھا۔ جب حضور ﷺ نے پہلی مرتبہ لوگوں کو بتایا کہ میرے پاس اللہ رب العزت کی طرف سے فرشتہ وحی لے کر آیا ہے تو لوگوں کا پہلا تاثر یہی تھا کہ آپؐ پر کسی جن یا بدروح کا اثر ہو گیا ہے۔ ان میں بیشتر لوگ اپنی اس رائے کا اظہار آپؐ سے ہمدردی کی بنا پر بھی کرتے تھے کہ دیکھیں یہ اچھے بھلے آدمی تھے' بیٹھے بٹھائے ان کے ساتھ یہ کیا معاملہ پیش آ گیا ہے۔ البتہ کچھ لوگ یہی باتیں آپؐ کو تنگ کرنے کے لیے طنزیہ اور استہزائیہ انداز میں بھی کرتے تھے۔ ظاہر ہے حضور ﷺ کے لیے یہ صورتِ حال بہت تکلیف دہ تھی کہ آپؐ کی اپنی ہی برادری کے وہ لوگ جو کل تک آپؐ کے قدموں میں نگاہیں بچھاتے تھے اور آپؐ کو اپنی آنکھوں کا تارا سمجھتے تھے آج آپؐ کو دیوانہ اور مجنون کہہ رہے تھے۔ چنانچہ اس تکلیف دہ صورتِ حال میں حضور ﷺ کی دلجوئی کے لیے یہ آیات نازل فرمائی گئیں۔ اس سورت کا آغاز اکیلے حرف ''ن'' سے ہوتا ہے۔ سورۂ صٓ اور سورۂ قٓ کے بعد ایک حرف سے شروع ہونے والی یہ تیسری اور آخری سورت ہے۔

آیات ۱ تا ۳۳

سُوْرَةُ الْقَلَمِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۵۲ رُكُوْعَاتُهَا: ۲

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۙ﴿۱﴾ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۚ﴿۲﴾ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ
مَمْنُوْنٍ ۚ﴿۳﴾ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴿۴﴾ فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۙ﴿۵﴾ بِاَيِّيْكُمُ الْمَفْتُوْنُ ﴿۶﴾ اِنَّ رَبَّكَ

هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۷﴾ فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۸﴾ وَدُّوْا لَوْ
تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ﴿۹﴾ وَ لَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ﴿۱۰﴾ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ﴿۱۱﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ
مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ﴿۱۲﴾ عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ﴿۱۳﴾ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِيْنَ ﴿۱۴﴾ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا
قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۵﴾ سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ﴿۱۶﴾ اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَاۤ اَصْحٰبَ
الْجَنَّةِ ۚ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَ لَا يَسْتَثْنُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَ
هُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿۱۹﴾ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ﴿۲۰﴾ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
صٰرِمِيْنَ ﴿۲۲﴾ فَانْطَلَقُوْا وَ هُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ﴿۲۳﴾ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ﴿۲۴﴾ وَّ غَدَوْا
عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْۤا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ﴿۲۶﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ اَوْسَطُهُمْ
اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْ لَا تُسَبِّحُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى
بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ﴿۳۱﴾ عَسٰى رَبُّنَاۤ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَاۤ اِنَّاۤ اِلٰى
رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾ ع

آیت ۱ ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۙ﴿۱﴾﴾ ''ن' قسم ہے قلم کی اور جو کچھ یہ لکھتے ہیں۔''

یعنی قلم بھی اور جو علمی ذخیرہ قلم کے ذریعہ نوعِ انسانی کے ہاں اب تک وجود میں آیا ہے وہ بھی اس حقیقت پر گواہ ہے کہ:

آیت ۲ ﴿مَاۤ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۚ﴿۲﴾﴾ ''آپ (ﷺ) اپنے ربّ کے فضل و کرم سے مجنون نہیں ہیں۔''

اے نبی ﷺ! جو لوگ آپ کو مجنون کہہ رہے ہیں وہ خود احمق ہیں جو یہ تک نہیں جانتے کہ مجنون کیسے ہوتے ہیں۔ کیا ان لوگوں کو آپؐ کی پاکیزہ اور اعلیٰ اخلاق کی حامل سیرت نظر نہیں آتی؟ کیا یہ لوگ واقعتاً سمجھتے ہیں کہ مجنون لوگوں کی زندگی کا نقشہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے؟ تو اے نبی ﷺ! آپ ان لوگوں کی فضول اور لایعنی باتوں سے رنجیدہ نہ ہوں۔

آیت ۳ ﴿وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۚ﴿۳﴾﴾ ''اور یقیناً آپؐ کے لیے تو وہ اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوگا۔''

آیت ۴ ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۚ﴿۴﴾﴾ ''اور آپؐ یقیناً اخلاق کے بلند ترین مرتبے پر فائز ہیں۔''

آپؐ اپنے اخلاق اور کردار کے بلند ترین معیار کے باعث پہلے سے ہی معراجِ انسانیت کے مقام پر فائز تھے جبکہ اب آپؐ معراجِ نبوت و رسالت کے سفر کا آغاز کر رہے ہیں۔

آیت ۵ ﴿فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۙ﴿۵﴾﴾ ''تو عنقریب آپؐ بھی دیکھ لیں گے اور وہ بھی دیکھ لیں گے۔''

یہ بڑا پیارا اور ناصحانہ انداز ہے۔ جیسے کوئی بڑا کسی چھوٹے کو سمجھاتا ہے کہ آپ مخالفانہ باتوں پر آزردہ نہ ہوں' کچھ ہی دنوں کی بات ہے' اصل حقیقت بہت جلد کھل کر سامنے آجائے گی۔ پھر کسی کو کوئی شک و شبہ نہیں رہے گا:

آیت ۶ ﴿بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ۚ﴿۶﴾﴾ ''کہ تم میں سے کون فتنے میں مبتلا تھا!''

بہت جلد دنیا پر واضح ہو جائے گا کہ تم دونوں فریقوں میں سے کون فتنے میں مبتلا ہو گیا تھا اور کون راہِ راست پر تھا۔ کیا محمد بن عبداللہ (ﷺ) کو جنون کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا (معاذ اللہ!) یا آپؐ کے مخالفین جوشِ تعصب میں پاگل ہو گئے تھے؟

آیت ۷ ﴿اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۪﴾ ''یقیناً آپؐ کا رب خوب جانتا ہے کہ کون اُس کی راہ سے بھٹک گیا ہے''

﴿وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝۷﴾ ''اور وہ اُن کو بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت یافتہ ہیں۔''

یہ وہ آیات تھیں جو اکثر مفسرین کے نزدیک دوسری وحی میں نازل ہوئی تھیں۔ یہاں سے آگے نیا مضمون شروع ہو رہا ہے۔

آیت ۸ ﴿فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۸﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ ان جھٹلانے والوں کی باتوں پر دھیان نہ دیں۔''

آیت ۹ ﴿وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝۹﴾ ''وہ تو چاہتے ہیں کہ آپؐ ذرا ڈھیلے پڑیں تو وہ بھی ڈھیلے پڑ جائیں۔''

باطل کا تو وطیرہ ہے کہ پہلے وہ حق کو جھٹلاتا ہے' پھر جب اس کے مقابلے میں کھڑے ہونا مشکل نظر آتا ہے تو مداہنت (compromise) پر اُتر آتا ہے۔ لیکن حق کسی قسم کی مداہنت یا کسی درمیانی راستے کو نہیں جانتا۔ بقول اقبال ؎

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے　　شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

اگلی آیات میں نام لیے بغیر انتہائی سخت الفاظ میں ایک کردار کا ذکر ہوا ہے۔ کسی معتبر روایت سے تو ثابت نہیں لیکن زیادہ تر مفسرین کا خیال ہے کہ ان آیات کا مصداق ولید بن مغیرہ تھا:

آیت ۱۰ ﴿وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝۱۰﴾ ''اور آپؐ مت مانیے کسی ایسے شخص کی بات جو بہت قسمیں کھانے والا انتہائی گھٹیا ہے۔''

ان دونوں خصوصیات کا آپس میں فطری تعلق ہے۔ اپنی شخصیت کے ہلکے پن کی تلافی کرنے کے لیے بات بات پر قسمیں کھانا ہر گھٹیا آدمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لفظ ''مَهِيْن'' ذلیل وحقیر اور گھٹیا آدمی کے لیے بولا جاتا ہے۔

آیت ۱۱ ﴿هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ۝۱۱﴾ ''رُو در رُو طعنے دیتا ہے' چغلیاں کھاتا پھرتا ہے۔''

آیت ۱۲ ﴿مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝۱۲﴾ ''خیر سے روکنے والا' حد سے بڑھنے والا' گنہگار۔''

آیت ۱۳ ﴿عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۝۱۳﴾ ''بالکل گنوار ہے' اس کے بعد یہ کہ بداصل بھی ہے۔''

یعنی مذکورہ بالا خصلتیں تو اس کی شخصیت میں ہیں ہی' سب سے بڑی بات یہ کہ وہ بے نسب بھی ہے۔

آیت ۱۴ ﴿اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ۝۱۴﴾ ''صرف اس گھمنڈ پر کہ وہ مال و دولت اور بیٹوں والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے ولید بن مغیرہ کو کثیر مال و دولت کے علاوہ بہت سے بیٹوں سے بھی نواز رکھا تھا۔ اور بیٹے بھی ایسے کہ ان میں سے ایک کو قبولِ اسلام کے بعد ''سَيْفٌ مِنْ سُيُوْفِ اللّٰهِ'' کا مرتبہ ملا۔ یعنی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ!

آیت ۱۵ ﴿اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۵﴾ ''جب اسے ہماری آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔''

آیت ۱۶ ﴿سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ۝۱۶﴾ ''ہم عنقریب اس کی سُونڈ پر داغ لگائیں گے۔''

ممکن ہے اس کی ناک زیادہ لمبی اور نمایاں ہو۔ وہ خود بھی ازراہِ تکبر اپنے آپ کو بڑی ناک والا سمجھتا تھا' جس کے لیے حقارت کے طور پر سُونڈ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور ناک پر داغ لگانے سے مراد تذلیل ہے۔

اب آئندہ آیات میں ایمان بالآخرت کے حوالے سے بہت عمدہ اور عام فہم تمثیل کے طور پر باغ والوں کا واقعہ بیان کیا جا رہا ہے۔

آیت ۱۷ ﴿اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَاۤ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ﴾ ''یقیناً ہم نے ان (اہلِ مکہ) کو اسی طرح آزمایا ہے جیسے ہم نے باغ والوں کو آزمایا تھا۔''

اللہ تعالیٰ لوگوں کو طرح طرح کے امتحانات سے آزماتا رہتا ہے۔ ایک انسان کو اگر دولت کی آزمائش میں ڈالا جاتا ہے' تو کسی دوسرے کو غربت کے امتحان سے دوچار کر دیا جاتا ہے۔ سورۃ الملک کی اس آیت میں تو انسان کی زندگی اور موت کی تخلیق کا مقصد ہی آزمائش بتایا گیا ہے: ﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ۝۲﴾ ''اُس نے موت اور زندگی کو اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرنے والا ہے۔ اور وہ بہت زبردست بھی ہے اور بہت بخشنے والا بھی۔''

﴿اِذْ اَقْسَمُوْا لَیَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِیْنَ ۝۱۷﴾ ''جبکہ انہوں نے قسم کھائی کہ وہ ضرور اس کا پھل اُتار لیں گے صبح سویرے۔''

آیت ۱۸ ﴿وَلَا یَسْتَثْنُوْنَ ۝۱۸﴾ ''اور انہوں نے (اس پر) ان شاء اللہ بھی نہ کہا۔''

باغ کے پھل پک کر تیار ہو چکے تھے۔ انہوں نے ایک رات پروگرام طے کر لیا کہ وہ صبح سویرے جائیں گے اور سارا پھل اتار لائیں گے۔ گویا وہ اپنے اسباب و وسائل کے گھمنڈ میں مسببِ حقیقی کو بالکل ہی بھول گئے۔

آیت ۱۹ ﴿فَطَافَ عَلَیْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ۝۱۹﴾ ''پس ایک پھرنے والا پھر گیا اس (باغ) پر آپ کے رب کی طرف سے جبکہ وہ ابھی سوئے ہوئے ہی تھے۔''

آیت ۲۰ ﴿فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِیْمِ ۝۲۰﴾ ''تو وہ ایسے ہو گیا جیسے کٹی ہوئی فصل ہو۔''

یعنی رات کو وہ باغ کسی بگولے کی زد میں آیا اور جل کر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔

آیت ۲۱ ﴿فَتَنَادَوْا مُصْبِحِیْنَ ۝۲۱﴾ ''اب صبح ہی صبح انہوں نے ایک دوسرے کو پکارا۔''

آیت ۲۲ ﴿اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِیْنَ ۝۲۲﴾ ''کہ صبح سویرے چلو اپنے کھیت کی طرف اگر تم پھل توڑنا چاہتے ہو۔''

وہ صبح سویرے اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق پھل توڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے' جبکہ ان کا باغ رات کو جل کر تباہ ہو چکا تھا۔ اسی طرح انسان اپنی دھن میں مگن طرح طرح کے منصوبے بناتا رہتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے ایک فیصلے کے سامنے اس کے سارے

منصوبے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کو کوئی جان لیوا مرض لاحق ہو چکا ہوتا ہے' مگر وہ اس سے بے خبر اپنی لمبی لمبی امیدوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے رات دن ایک کیے رہتا ہے۔ پھر جب مرض کی تشخیص ہوتی ہے تب بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

آیت ۲۳ ﴿فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ۝۲۳﴾ ''چنانچہ وہ چلے اور آپس میں چپکے چپکے یہ باتیں کرتے جا رہے تھے۔''

آیت ۲۴ ﴿اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ۝۲۴﴾ ''کہ دیکھو آج کوئی مسکین تمہارے پاس باغ میں ہرگز داخل نہ ہونے پائے۔''

دراصل انہوں نے پھل اتارنے کے لیے منہ اندھیرے جانے کا پروگرام بنایا ہی اس لیے تھا تاکہ ایسے مواقع پر آ جانے والے غرباء و مساکین کو چکمہ دے سکیں۔ ان کا کہنا تھا کہ باغ پر سارا سال محنت ہم نے کی ہے' اس کی حفاظت کی ہے' اب پھل اتارنے کے موقع پر ہم اس میں سے غرباء و مساکین کو کس لیے دیں؟ وہ ہمارے کیا لگتے ہیں؟ یہ تھا ان کا اصل جرم جس کی انہیں سزا ملی۔ انسان کے کردار میں ایسی پستی آخرت پر یقین نہ ہونے کی وجہ سے آتی ہے۔

آیت ۲۵ ﴿وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ۝۲۵﴾ ''اور وہ صبح سویرے چلے جلدی جلدی (یہ سمجھتے ہوئے) کہ وہ اس ارادہ پر پوری طرح قادر ہیں۔''

یہ آیت لفظی تصویر کشی کی بہترین مثال ہے۔ اس وقت ان لوگوں کی جو ذہنی' نفسیاتی اور ظاہری کیفیت تھی ان الفاظ میں اس کی ہو بہو تصویر کھینچ کر رکھ دی گئی ہے۔ انہیں زعم تھا کہ انہوں نے بڑی کامیاب منصوبہ بندی کی ہے' ابھی تھوڑی ہی دیر میں وہ پھل اتار کر لے جائیں گے اور بھیک منگوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ [حَرْد کا معنی قصد اور ارادہ ہے۔ یعنی انہوں نے جو یہ ارادہ کیا تھا کہ آج کسی غریب کو باغ میں داخل نہیں ہونے دیں گے اور صبح سویرے باغ کا پھل اتار لیں گے' وہ خیال کر رہے تھے کہ ہم اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی قدرت رکھتے ہیں۔]

آیت ۲۶ ﴿فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ۝۲۶﴾ ''پھر جب انہوں نے اس (باغ) کو دیکھا تو کہنے لگے کہ ہم تو کہیں بھٹک گئے ہیں۔''

فوری طور پر تو وہ یہی سمجھے کہ وہ اندھیرے میں راستہ بھول کر کسی اور جگہ آ گئے ہیں اور یہ ان کا باغ نہیں ہے۔ پھر جب انہیں اصل صورتِ حال کا ادراک ہوا تو کہنے لگے:

آیت ۲۷ ﴿بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝۲۷﴾ ''نہیں نہیں (باغ تو یہی ہے) بلکہ ہم تو محروم ہو گئے ہیں۔''

ہماری تو قسمت ہی پھوٹ گئی ہے۔

آیت ۲۸ ﴿قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ۝۲۸﴾ ''ان کے درمیان والے نے کہا: میں تمہیں کہتا نہ تھا کہ تم (اپنے رب کی) تسبیح کیوں نہیں کرتے؟''

یہ انہی کے کسی نیک فطرت بھائی کا ذکر ہے جو گاہے بگاہے انہیں روکتا ٹوکتا تھا اور انہیں یاددہانی کراتا رہتا تھا کہ تم اللہ کو بھولے

ہوئے ہو اور اللہ اور اُس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے سے پہلوتہی کرتے ہو۔

آیت ۲۹ ﴿قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝۲۹﴾ ''انہوں نے کہا: (واقعی تم ٹھیک کہتے ہو) ہمارا رب پاک ہے بے شک ہم ہی ظالم تھے۔''

آیت ۳۰ ﴿فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ۝۳۰﴾ ''پھر وہ آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔''

اب وہ اپنی گمراہی اور شومئ قسمت کی ذمہ داری آپس میں ایک دوسرے کے سر تھوپنے لگے۔

آیت ۳۱ ﴿قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ۝۳۱﴾ ''(بالآخر اعتراف کرتے ہوئے) وہ کہنے لگے: ہائے ہماری بدبختی! اصل میں ہم سب ہی اپنی حدود سے تجاوز کرنے والے تھے۔''

آیت ۳۲ ﴿عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ۝۳۲﴾ ''اُمید ہے ہمارا رب ہمیں اس سے بہتر عطا کر دے گا' اب ہم اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔''

اب ہم نے توبہ کر لی ہے۔ اب ہم اپنی روش تبدیل کر لیں گے اور آئندہ باقاعدگی سے اللہ تعالیٰ کے تمام حقوق ادا کیا کریں گے۔ ہمیں اُمید ہے ہمارا رب ہمارے گناہوں کو معاف کرتے ہوئے ہمارے نقصان کی بھی تلافی کر دے گا اور اگلے سال ہمارا باغ اس سے بہتر پیداوار دے گا۔

رَغِبَ جب اِلٰی کے صلے کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی کسی کی طرف رغبت کرنے کے ہوتے ہیں' لیکن جب یہی لفظ عَنْ کے صلے کے ساتھ آئے تو بالکل متضاد معنی دیتا ہے۔ چنانچہ رَغِبَ عَنْ کے معنی ہوں گے: رُخ پھیر لینا اور پہلوتہی کرنا۔ جیسا کہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۳۰ میں آیا ہے: ﴿وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ﴾ ''اور کون ہوگا جو ابراہیمؑ کے طریقے سے مُنہ موڑے؟ سوائے اُس کے جس نے اپنے آپ کو حماقت ہی میں مبتلا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو!''

اب اگلی آیت میں گویا اس تمثیل یا واقعہ کا اخلاقی سبق (moral lesson) بیان ہوا ہے:

آیت ۳۳ ﴿كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ﴾ ''اسی طرح آتا ہے عذاب! اور آخرت کا عذاب تو یقیناً بہت ہی بڑا ہے۔''

اس واقعے میں تو دنیا کے عذاب کا ذکر ہے' لیکن یاد رکھو دُنیا کے عذاب تو نسبتاً چھوٹے اور وقتی ہوتے ہیں اور توبہ کرنے پر ٹل بھی جاتے ہیں۔ مثلاً ایک سال اگر پکی پکائی فصل برباد ہو گئی تو اللہ کی طرف رجوع کرنے سے ہو سکتا ہے اگلے سال اس کی تلافی ہو جائے' لیکن آخرت کا معاملہ یکسر مختلف ہے۔ آخرت کا عذاب بہت بڑا ہوگا اور اُس وقت پلٹنے کا راستہ اور توبہ کا دروازہ بھی بند ہو چکا ہوگا۔

﴿لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۳﴾ ''کاش کہ یہ لوگ (اس حقیقت کو) جانتے!''

آیات ۳۴ تا ۵۲

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۳۴﴾ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ مَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ
تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۶﴾ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ﴿۳۷﴾ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ﴿۳۸﴾ اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ
عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۹﴾ سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ﴿۴۰﴾ اَمْ
لَهُمْ شُرَكَآءُ ۚ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿۴۱﴾ يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّ يُدْعَوْنَ
اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۴۲﴾ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ وَ قَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى
السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَذَرْنِيْ وَ مَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ؕ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَ اُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۴۵﴾ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ
مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۶﴾ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۷﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَ لَا تَكُنْ كَصَاحِبِ
الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰى وَ هُوَ مَكْظُوْمٌ ﴿۴۸﴾ لَوْ لَاۤ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَ هُوَ
مَذْمُوْمٌ ﴿۴۹﴾ فَاجْتَبٰىهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۵۰﴾ وَ اِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ
بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَ يَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۵۱﴾ وَ مَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۲﴾ ع

آیت ۳۴ ﴿اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۳۴﴾﴾ ''متقین کے لیے یقیناً اُن کے ربّ کے پاس نعمت والے باغات ہیں۔''

آیت ۳۵ ﴿اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۵﴾﴾ ''کیا ہم اپنے فرمانبرداروں کو مجرموں کے برابر کر دیں گے؟''

اگر بعث بعد الموت کے منکرین کی منطق درست تسلیم کر لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نیکوکار اور مجرمین میں سرے سے کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ طبعی طور پر تو موت بلاشبہ سب کو برابر کر دیتی ہے' جیسا کہ مشہور انگریزی نظم Death the Leveller میں بتایا گیا ہے۔ یعنی کوئی بادشاہ ہو' کوئی فقیر ہو' کوئی شریف ہو' کوئی مجرم ہو' مرنا سبھی کو ہے۔ اس اعتبار سے تو یقیناً موت کے سامنے سب انسان برابر ہیں' لیکن یہ سمجھنا کہ موت آنے پر اخلاقی لحاظ سے بھی سب انسان برابر ہو جائیں گے انتہائی غیر منطقی اور احمقانہ سوچ ہے۔

آیت ۳۶ ﴿مَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۶﴾﴾ ''تمہیں کیا ہو گیا ہے' تم کیسے حکم لگاتے ہو؟''

کیا تمہاری مت ماری گئی ہے جو ایسی رائے بناتے ہو؟ کیا اللہ کے ہاں ایسا ہی اندھیر مچا ہوا ہے کہ وہاں مسلمین اور مجرمین برابر ہو جائیں گے؟ کیا دنیا میں کہیں ایسا ہوتا ہے کہ کوئی حکومت اپنے باغیوں اور اپنے وفاداروں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دے؟

آیت ۳۷ ﴿اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ﴿۳۷﴾﴾ ''کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم یہ پڑھتے ہو؟''

آیت ۳۸ ﴿اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ﴿۳۸﴾﴾ ''کہ اس (آخرت) میں تمہیں وہ سب کچھ مل جائے گا جو تم پسند کرو گے!''

آیت ۳۹ ﴿اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ۳۹﴾ ''کیا تم نے ہم سے کوئی قسم لے رکھی ہے جو باقی رہنے والی ہو قیامت کے دن تک' کہ تمہارے لیے وہی کچھ ہوگا جو تم فیصلہ کرو گے؟''

آیت ۴۰ ﴿سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ۴۰﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ذرا ان سے پوچھئے کہ ان میں سے کون ہے جو اس کا ضامن ہو؟''

آیت ۴۱ ﴿اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ ۚ﴾ ''کیا ان کے کوئی شریک ہیں؟''

﴿فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۴۱﴾ ''تو لائیں یہ اپنے شریکوں کو اگر یہ سچے ہیں!''

آیت ۴۲ ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾ ''جس دن پنڈلی کھولی جائے گی''

پنڈلی کھولے جانے کا مفہوم ہمارے تصور سے ماوراء ہے۔ ممکن ہے یہ اللہ تعالیٰ کی کسی خاص تجلی کا ذکر ہو جس کا ظہور میدانِ محشر کے کسی مرحلے پر لوگوں کی چھانٹی کرنے کے لیے ہونا ہو۔ واللہ اعلم! اس اعتبار سے یہ آیت آیاتِ متشابہات میں سے ہے۔[1]

﴿وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۴۲﴾ ''اور انہیں پکارا جائے گا (اللہ کے حضور) سجدے کے لیے تو وہ کر نہیں سکیں گے۔''

جیسا کہ قبل ازیں سورۃ الحدید کی آیت ۱۱ کے تحت بھی ذکر ہو چکا ہے' میدانِ حشر میں اچھے اور بُرے لوگوں کو الگ الگ کرنے کے لیے بنی نوع انسان کو مختلف مراحل میں سے گزارا جائے گا۔ ''پنڈلی کا ظہور'' بھی ایسا ہی کوئی مرحلہ ہوگا۔ وہ صاحبِ ایمان لوگ جو اپنی دُنیوی زندگی میں نماز کی پابندی کرتے رہے تھے اس تجلی کو دیکھتے ہی سجدے میں گر جائیں گے' لیکن وہ لوگ جن کی گردنیں اکڑی رہتی تھیں اور جو نماز کی پابندی کا اہتمام نہیں کرتے تھے وہ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود اُس وقت سجدہ نہیں کر سکیں گے۔ گویا اس مرحلے پر ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنے والے لوگوں سے الگ کر لیا جائے گا۔

آیت ۴۳ ﴿خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ﴾ ''ان کی نگاہیں زمین پر گڑی رہ جائیں گی''

﴿تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ﴾ ''ان (کے چہروں) پر ذلت چھا رہی ہوگی۔''

﴿وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ ۴۳﴾ ''اور ان کو (دنیا میں) پکارا جاتا تھا سجدے کے لیے جبکہ یہ صحیح سالم تھے۔''

دنیا میں وہ لوگ اذان کی آواز پر کبھی توجہ ہی نہیں کرتے تھے اور کوئی مجبوری و معذوری نہ ہونے کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز نہیں ہوتے تھے۔ قیامت کے دن میدانِ حشر میں وہ سجدہ کرنا چاہیں گے لیکن نہیں کر سکیں گے۔

آیت ۴۴ ﴿فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ۭ﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ چھوڑ دیجیے مجھے اور ان لوگوں کو جو اس

۱۔ عربی محاورے کے مطابق سخت وقت آ پڑنے کو بھی کشفِ ساق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً گھمسان کی لڑائی شروع ہونے پر کہا جاتا ہے: شَمَّرَتِ الْحَرْبُ عَنْ سَاقِهَا کہ جنگ نے اپنی پنڈلی سے تہبند اوپر اٹھا لیا۔ بعض مفسرین نے کشفِ ساق سے مراد حقائق سے پردہ اٹھانا بھی لیا ہے۔ یعنی جس روز تمام حقیقتیں بے نقاب ہو جائیں گی اور لوگوں کے اعمال کھل کر سامنے آ جائیں گے۔ (حاشیہ از مرتب)

کلام کی تکذیب کر رہے ہیں۔''

جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے اس گروپ کی سورتوں میں یہ کلمہ (ذَرْنِیْ' فَذَرْنِیْ) اور یہ اسلوب بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ اس میں ایک طرف حضور ﷺ کی دلجوئی کا پہلو ہے تو دوسری طرف آپؐ کے مخالفین کے لیے بہت بڑی وعید ہے' کہ اے نبی ﷺ! آپ ان لوگوں کی باتوں سے رنجیدہ نہ ہوں' ان کا معاملہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجیے' ان سے میں خود ہی نمٹ لوں گا۔

﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۴﴾﴾ ''ہم انہیں رفتہ رفتہ وہاں سے لے آئیں گے جہاں سے انہیں علم تک نہیں ہوگا۔''

علماء کے ہاں ''استدراج'' کا لفظ بطور اصطلاح استعمال ہوتا ہے۔ اس سے مراد ایسا عذاب ہے جو اللہ تعالیٰ کی ڈھیل سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے باعث کسی قوم یا کسی فرد پر درجہ بدرجہ (درجہ' تدریج اور استدراج کا مادہ ایک ہی ہے) مسلط ہو۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے غلط راستے پر جا رہا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے کچھ دیر کے لیے ڈھیل دیتا ہے' بلکہ بعض اوقات اس راستے پر اسے طرح طرح کی کامیابیوں سے بھی نوازتا ہے تاکہ اس کے اندر کی خباثت پوری طرح سے ظاہر ہو جائے۔ جب وہ شخص اپنی روش کو کامیاب دیکھتا ہے تو سرکشی میں مزید دیدہ دلیری دکھاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی مہلت کا وقت پورا ہو جاتا ہے اور پھر اچانک اسے عذاب کے شکنجے میں کس لیا جاتا ہے۔

استدراج کی مثال کانٹے کے ذریعے مچھلی کے شکار کی سی ہے۔ شکاری جب دیکھتا ہے کہ مچھلی نے کانٹا نگل لیا ہے تو وہ ڈور کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے اور پھر جب چاہتا ہے ڈور کھینچ کر اسے قابو کر لیتا ہے۔ لفظ استدراج کی وضاحت کرتے ہوئے یہاں مجھے مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کا وہ قول یاد آ گیا ہے جس میں انہوں نے قیامِ پاکستان کے بارے میں کہا تھا کہ یہ استدراج بھی ہو سکتا ہے۔ مولانا صاحب رمضان ہمیشہ سلہٹ میں گزارتے تھے۔ ۱۹۴۶ء کے رمضان میں انہوں نے کہہ دیا تھا کہ ملأ اعلیٰ میں پاکستان کے قیام کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس کے ٹھیک ایک سال بعد اگلے رمضان (لیلۃ القدر) میں پاکستان کا قیام واقعتاً عمل میں آ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مولانا مدنیؒ کو بذریعہ کشف قیامِ پاکستان کے بارے میں جس فیصلے کا علم ہوا تھا' ملأ اعلیٰ میں وہ فیصلہ ۱۹۴۶ء کی لیلۃ القدر میں اس اصول کے تحت ہوا تھا جس کا ذکر سورۃ الدخان کی آیت ۴ میں آیا ہے۔ اس آیت میں لیلۃ القدر (لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ) کے بارے میں فرمایا گیا ہے: ﴿فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ﴿۴﴾﴾ کہ اس رات میں (آئندہ سال کے دوران رونما ہونے والے) تمام اہم امور کے فیصلے کر دیے جاتے ہیں۔

مولانا صاحب نظریاتی طور پر قیامِ پاکستان کے مخالف تھے۔ ان کے اس انکشاف کے بعد ان کے عقیدت مندوں نے بجا طور پر ان سے پوچھا کہ اس فیصلے کا علم ہو جانے کے باوجود بھی آپ قیامِ پاکستان کی مخالفت کیوں کر رہے ہیں؟ اس پر مولانا صاحبؒ نے جو جواب دیا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا تکوینی (کائنات کی سلطنت کا انتظامی) فیصلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس سے کیا منظور ہے' اس کا ہمیں علم نہیں۔ ہمیں چیزوں کے ظاہر اور سامنے نظر آنے والے حالات کو دیکھنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیکھنے سننے' سمجھنے وغیرہ کی صلاحیتیں اسی لیے دی ہیں کہ وہ ان صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے فیصلے کرے۔ چنانچہ اس معاملے میں ہمیں وہی موقف اپنانا چاہیے جس میں ہمیں مسلمانانِ برصغیر کی بہتری نظر آتی ہو۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ اپنی حکمت اور مشیت کے مطابق کیا ہے۔ یہ

بھی تو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فیصلہ ''استدراج'' کی غرض سے کیا گیا ہو۔ یعنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خطے کے مسلمانوں کو ڈھیل دے کر انہیں عذاب میں مبتلا کرنا چاہتا ہو۔

قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مولانا مدنیؒ کا خدشہ کافی حد تک درست تھا۔ اہلِ پاکستان پر عذاب کا ایک کوڑا تو ۱۹۷۱ء میں برسا تھا۔ اس کے بعد بھی ملک کی مجموعی صورتِ حال کبھی تسلی بخش نہیں رہی' بلکہ پاکستان کے موجودہ حالات کو دیکھ کر تو یوں لگتا ہے کہ اب ایک فیصلہ کن عذاب ہمارے سر پر آیا کھڑا ہے۔ لیکن میری رائے میں اس کا سبب ''قیامِ پاکستان نہیں'' بلکہ بحیثیت قوم ہمارا وہ مجموعی طرزِ عمل ہے جو قیامِ پاکستان کے بعد ہم نے نظامِ اسلام کے حوالے سے اختیار کیا ہے۔

آیت ۴۵ ﴿وَأُمْلِيْ لَهُمْ ۭ﴾ ''اور میں ان کو ڈھیل دے رہا ہوں۔''

﴿اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝۴۵﴾ ''بے شک میری تدبیر بہت مضبوط ہے۔''

آیت ۴۶ ﴿اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ۝۴۶﴾ ''(اے نبی ﷺ!) کیا آپ ان سے کوئی اجرت مانگتے ہیں جس کے تاوان کے بوجھ تلے یہ دبے جا رہے ہیں؟''

ان لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے آپؐ سالہا سال سے دن رات محنت کر رہے ہیں۔ اپنی اس محنت کے عوض جب آپؐ ان سے کسی معاوضے یا اُجرت کے طلب گار بھی نہیں ہیں تو یہ لوگ آخر کس لیے پریشان ہیں؟

آیت ۴۷ ﴿اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ۝۴۷﴾ ''یا ان کے پاس غیب کا علم ہے جسے یہ لکھ رہے ہیں؟''

یہ دونوں آیات (۴۶' ۴۷) جوں کی توں سورۃ الطور میں (آیات ۴۰ اور ۴۱ کے طور پر) بھی آ چکی ہیں۔

آیت ۴۸ ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ انتظار کیجیے اپنے رب کے حکم کا''

﴿وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ﴾ ''اور دیکھئے آپ اُس مچھلی والے کی طرح نہ ہو جایئے گا!''

''مچھلی والے'' سے یہاں حضرت یونس علیہ السلام مراد ہیں۔ آپؑ کی قوم پر جب عذاب کا فیصلہ ہو گیا تو آپؑ اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کیے بغیر ہی اپنی قوم کا علاقہ چھوڑ کر چلے گئے۔ اس کا ذکر سورۃ الانبیاء کی آیت ۸۷ میں اس طرح آیا ہے: ﴿اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا﴾ ''جب وہ چل دیا غصے میں بھرا ہوا''۔ آپؑ کا یہ غصہ حمیتِ حق میں تھا اور قوم کی طرف سے مسلسل ہٹ دھرمی اور کفر کی وجہ سے تھا۔ لیکن اس میں خطا کا پہلو یہ تھا کہ آپؑ نے ہجرت کرنے سے متعلق اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار نہ کیا۔

﴿اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ۝۴۸﴾ ''جب اُس نے پکارا (اپنے رب کو) اور وہ اپنے غم کو اندر ہی اندر پی رہا تھا۔''

حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں انتہائی رنجیدہ حالت میں اللہ تعالیٰ سے فریاد کر رہے تھے: ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۡ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۸۷﴾ (الانبیاء) ''تیرے سوا کوئی معبود نہیں' تو پاک ہے اور یقیناً میں ہی ظالموں میں سے ہوں۔''

آیت ۴۹ ﴿لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ۝۴۹﴾ ''اگر اُس کی دست گیری نہ کرتا اُس کے رب کا ایک انعام (اور احسان) تو وہ ملامت زدہ ہو کر پھینک دیا جاتا کسی چٹیل زمین پر۔''

حضرت یونس علیہ السلام قدیم عراق کے شہر نینوا میں مبعوث ہوئے تھے۔ یہ شہر بعلبک کے شمال میں واقع تھا۔ دریائے فرات اور

دریائے دجلہ اس علاقہ سے گزرتے ہوئے خلیج فارس میں آ کر گرتے ہیں۔ آج کل تو یہ دونوں دریا سکڑ کر چھوٹی چھوٹی ندیوں میں تبدیل ہو گئے ہیں' لیکن پرانے زمانے میں تو ظاہر ہے یہ بہت بڑے بڑے دریا ہوں گے۔ حضرت یونس علیہ السلام نینوا شہر سے نکل کر ان میں سے کسی دریا کو پار کرنے کے لیے کشتی میں سوار ہوئے۔ کشتی میں آپؑ کے ساتھ وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر اشارتاً سورۃ الصّٰفّٰت کی آیت ۱۴۱ میں آیا ہے۔ اس کے نتیجے میں آپؑ کو کسی وہیل مچھلی نے نگل لیا۔ وہ مچھلی خلیج فارس سے ہوتی ہوئی مکران کے ساحل پر پہنچی اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس ساحل کے کسی مقام پر اس نے آپؑ کو اُگل دیا۔ اُس وقت آپؑ کی حالت بہت خراب تھی۔ اس موقع پر آپؑ کو سایہ اور غذا وغیرہ فراہم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے 'یقطین' کا وہ پودا اگایا جس کا ذکر سورۃ الصّٰفّٰت' آیت ۱۴۶ میں آیا ہے۔ آیت زیر مطالعہ میں اسی پودے کی طرف اشارہ ہے جو اُس وقت آپؑ کے لیے واقعی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑی نعمت ثابت ہوا۔ یقطین کے بارے میں مزید تفصیل جاننے کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الصّٰفّٰت' آیت ۱۴۶ کی تشریح۔

آیت ۵۰ ﴿فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۵۰﴾ ''تو اُس کے ربّ نے اُس کو چُن لیا اور اسے پھر صالحین میں سے کر دیا۔''

حضرت یونس علیہ السلام کے ذکر کے حوالے سے یہاں حضور ﷺ کا ایک فرمان بھی سن لیجیے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ((لَا تُفَضِّلُوْنِيْ عَلٰى يُوْنُسَ بْنِ مَتّٰى)) [۲] ''کہ مجھے یونسؑ بن متّٰی پر بھی فضیلت نہ دو''۔ اس میں ان لوگوں کے لیے تنبیہ ہے جو اپنا جوشِ خطابت اور زورِ قلم دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام پر حضور ﷺ کی فضیلت ثابت کرنے میں صَرف کرتے ہیں۔ آپ ﷺ بلاشبہ پوری نوعِ انسانی سے افضل اور سیّد الانبیاء والمرسلین ہیں۔ لیکن ع ''حاجتِ مشاطہ نیست روئے دل آرام را''۔ آج پوری دنیا آپ ﷺ کی عظمت کی قائل ہے۔ اس حقیقت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا کہ آج ایک عیسائی دانشور مائیکل ہارٹ اپنی کتاب ''The 100'' میں یہ لکھنے پر مجبور ہے:

"My choice of Muhammad to lead the list of the world's most influential persons may surprise some readers and may be questioned by others, but he was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels."

''حضرت محمد (ﷺ) کو دنیا کی بااثر ترین شخصیات میں سرفہرست رکھنے کے میرے اس فیصلے پر کچھ قارئین کو حیرت ہو گی اور بعض اس پر سوال بھی اٹھائیں گے' لیکن پوری انسانی تاریخ میں صرف اور صرف آپ (ﷺ) ہی واحد شخص ہیں جو مذہبی اور سیکولر دونوں محاذوں پر پوری طرح کامیاب رہے۔''

آیت ۵۱ ﴿وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ﴾ ''اور یہ کافر تو تُلے ہوئے ہیں اس پر کہ اپنی نگاہوں کے زور سے آپؐ کو پھسلا دیں گے جب وہ قرآن سنتے ہیں''

مشرکینِ مکّہ نے حضور ﷺ کی قوتِ ارادی کو توڑنے کے لیے ہر ممکن طریقہ آزمایا اور اس مقصد کے لیے آپؐ کے خلاف ہر حربہ استعمال کیا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ ایک مرحلے پر انہوں نے اس مقصد کے لیے ایسے عاملوں کی خدمات بھی حاصل کیں جو

۲۔ تخریج الکشاف للزیلعی: ۱/۲۶۴ (غریب جدا)

اپنی نگاہوں کی خصوصی طاقت کے ذریعے کسی کو نقصان پہنچانے کی اہلیت رکھتے تھے۔ شاید طبعی طور پر ایسا ممکن ہو۔ ہوسکتا ہے کوئی شخص خصوصی مشقوں (exercises) کے ذریعے اپنی آنکھوں میں اپنی قوتِ ارادی کو اس انداز میں مجتمع کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہو کہ اس کے بعد جب وہ کسی دوسرے شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھے تو وہ اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکے۔ بہرحال اس آیت میں مشرکینِ مکہ کے ایسے ہی اوچھے ہتھکنڈوں کا ذکر ہے۔

﴿وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ۝۵۱﴾ ''اور کہتے ہیں کہ یہ تو دیوانہ ہے۔''

سورت کے آغاز اور اختتام کا باہمی ربط نوٹ کیجیے۔ جس مضمون سے سورت کا آغاز ہوا تھا اسی پر اس کا اختتام ہو رہا ہے۔ کفار حضور ﷺ کو مجنون کہتے تھے۔ ان کے اس الزام کی تردید سورت کے ابتدا میں بھی کی گئی اور آخر میں بھی۔ پھر یہاں یہ نکتہ بھی سمجھ میں آجاتا ہے کہ اس سورت کے آغاز میں حرف ن کیوں آیا ہے۔ دراصل ''ن'' کے معنی ''مچھلی'' کے ہیں' جیسا کہ سورۃ الانبیاء کی آیت ۸۷ میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر ذُوالنُّون (مچھلی والے) کے لقب سے کیا گیا ہے۔ چنانچہ حرف ن کا معنوی ربط سورت کی ان اختتامی آیات کے ساتھ ہے جن میں صَاحِبُ الْحُوت (حضرت یونسؑ) کا ذکر آیا ہے۔

آیت ۵۲ ﴿وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۵۲﴾ ''اور نہیں ہے وہ' مگر ایک یاددہانی تمام جہان والوں کے لیے۔''

یہاں پر هُوَ کی ضمیر قرآن کے لیے بھی ہے اور حضور ﷺ کے لیے بھی۔ قرآن مجید کے ذکر (یاددہانی اور نصیحت) ہونے کا تذکرہ تو قرآن میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے' جبکہ اپنی ذات میں حضور ﷺ بھی قیامت تک کے لوگوں کے لیے یاددہانی ہیں' بلکہ آپ ﷺ اپنی ذات میں مجسم قرآن ہیں۔ جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فرمان ہے: ((كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ)) ''آپ ﷺ کا اخلاق قرآن ہی تو تھا۔''

[بعض مترجمین نے یہاں ''ذِکر'' کا ترجمہ ''شرف'' بھی کیا ہے۔ یعنی آپ ﷺ سارے جہانوں کے لیے وجہِ عزّ و شرف ہیں۔ (مرتب)]

سُوْرَةُ الْحَآقَّةِ

آیات ۱ تا ۳۷

سُوْرَةُ الْحَآقَّةِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۵۲ رُكُوْعَاتُهَا: ۲

اَلْحَآقَّةُ ۙ﴿۱﴾ مَا الْحَآقَّةُ ۚ﴿۲﴾ وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ؕ﴿۳﴾ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَ عَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ﴿۴﴾ فَاَمَّا
ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ﴿۵﴾ وَ اَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۙ﴿۶﴾ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ
لَيَالٍ وَّ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا ۙ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۚ﴿۷﴾
فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ﴿۸﴾ وَ جَآءَ فِرْعَوْنُ وَ مَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ۚ﴿۹﴾ فَعَصَوْا
رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ﴿۱۰﴾ اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۙ﴿۱۱﴾ لِنَجْعَلَهَا
لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ﴿۱۲﴾ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ﴿۱۳﴾ وَّ حُمِلَتِ الْاَرْضُ
وَ الْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۙ﴿۱۴﴾ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ﴿۱۵﴾ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ
يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ۙ﴿۱۶﴾ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ؕ وَ يَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ؕ﴿۱۷﴾
يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿۱۸﴾ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ
اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ۚ﴿۱۹﴾ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ۚ﴿۲۰﴾ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۙ﴿۲۱﴾ فِيْ جَنَّةٍ
عَالِيَةٍ ۙ﴿۲۲﴾ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ﴿۲۳﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔۢا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴿۲۴﴾ وَ اَمَّا
مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ۚ﴿۲۵﴾ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ۚ﴿۲۶﴾ يٰلَيْتَهَا
كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ۚ﴿۲۷﴾ مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ ۚ﴿۲۸﴾ هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ ۚ﴿۲۹﴾ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۙ﴿۳۰﴾ ثُمَّ
الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۙ﴿۳۱﴾ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ؕ﴿۳۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ
بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ۙ﴿۳۳﴾ وَ لَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ؕ﴿۳۴﴾ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ۙ﴿۳۵﴾ وَّ لَا
طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ۙ﴿۳۶﴾ لَّا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِـُٔوْنَ ﴿۳۷﴾ ع

ع ۱ ۳۷ ۵

آیت ۱ ﴿اَلْحَآقَّةُ ۱﴾ ''وہ حق ہو جانے والی!''

یعنی قیامت جس کا وقوع پذیر ہونا حق ہے' اس کا واقع ہونا ایک مسلّمہ صداقت اور اٹل حقیقت ہے جس میں قطعاً کوئی شک نہیں۔

آیت ۲ ﴿مَا الْحَآقَّةُ ۝۲﴾ ''کیا ہے وہ حق ہو جانے والی؟''

آیت ۳ ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ۝۳﴾ ''اور تم نے کیا سمجھا کہ وہ حق ہونے والی کیا ہے؟''

آیت ۴ ﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ۝۴﴾ ''جھٹلایا تھا ثمود نے بھی اور عاد نے بھی اس کھڑکھڑا دینے والی کو۔''

القَارِعَة سے مراد بھی قیامت ہے۔ قَرَعَ کا معنی ہے ایک سخت چیز کو دوسری چیز سے ٹکرانا' کوٹنا' ریزہ ریزہ کر دینا' کھڑکھڑا دینا' یا بہت زور سے کھٹکھٹانا۔ الحَاقَّة اور القَارِعَة ان دونوں الفاظ کے مابین ایک نسبت یہ بھی ہے کہ یہ دو سورتوں کے نام ہیں اور ان دونوں سورتوں کے آغاز کا انداز بھی ایک جیسا ہے۔ چنانچہ سورۃ القَارِعَة کا آغاز بھی بالکل اسی طرح ہو رہا ہے: ﴿اَلْقَارِعَةُ ۝۱ مَا الْقَارِعَةُ ۝۲ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝۳﴾

آیت ۵ ﴿فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ۝۵﴾ ''پس ثمود تو ہلاک کر دیے گئے ایک حد سے بڑھ جانے والی آفت سے۔''

الطَّاغِيَة کے لغوی معنی حد سے گزر جانے والی چیز کے ہیں۔ یعنی انتہائی شدت والی چیز۔ اس کے لیے قرآن حکیم کے مختلف مقامات پر الرَّجْفَة (زبردست زلزلہ)' الصَّيْحَة (زور کا دھماکہ یا کڑک)' صَاعِقَة (گرج) الفاظ مذکور ہیں' جو عذاب کی مختلف کیفیات کو بیان کرتے ہیں۔

آیت ۶ ﴿وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝۶﴾ ''اور عاد ہلاک کر دیے گئے ایک جھکڑ والی تیز آندھی سے۔''

آیت ۷ ﴿سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا ۙ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝۷﴾ ''اللہ نے مسلط کر دیا اسے اُن پر مسلسل سات راتوں اور آٹھ دنوں تک' اُن کی بیخ کنی کے لیے' تو تم دیکھتے اُن لوگوں کو کہ وہاں ایسے پچھڑے پڑے ہیں جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے ہوں۔''

قومِ عاد کے لوگ بہت قد آور تھے' اس لیے انہیں کھجور کے تنوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔

آیت ۸ ﴿فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۝۸﴾ ''تو کیا تم ان میں سے کسی کو دیکھتے ہو باقی بچا ہوا؟''

آیت ۹ ﴿وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ۝۹﴾ ''اور (اسی طرح) فرعون اور اس سے پہلے والوں نے' اور الٹ دی جانے والی بستیوں (کے باسیوں) نے بھی خطا کاری کی روش اختیار کی تھی۔''

الٹائی جانے والی بستیوں سے مراد قومِ لوط کی بستیاں ہیں۔

آیت ۱۰ ﴿فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ﴾ ''تو انہوں نے نافرمانی کی اپنے ربّ کے رسول کی''

﴿فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ۝۱۰﴾ ''تو اللہ نے ان کو اپنی سخت گرفت میں دبوچ لیا۔''

آیت ۱۱ ﴿اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝۱۱﴾ ''جب (سیلابِ نوحؑ کا) پانی طغیانی پر آیا تھا تو ہم نے تمہیں سوار کرا لیا تھا کشتی پر۔''

اس سیلاب کے بعد نوعِ انسانی کی نسل حضرت نوح علیہ السلام کے انہی تین بیٹوں سے چلی جو اس کشتی میں سوار تھے' اس لیے آیت کے اسلوب سے یہ تاثر ملتا ہے جیسے پوری نوعِ انسانی کشتی میں سوار تھی۔

آیت ﴿لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ﴾ ''تاکہ ہم اس کو تمہارے لیے ایک یاددہانی بنادیں اور وہ کان جو حفاظت کرنے والے ہیں اس کو پوری حفاظت سے یاد رکھیں۔''

ان آیات میں ''التذکیر بایام اللہ'' کا بیان تھا۔ اس کے بعد اب آخرت کا ذکر آ رہا ہے۔ ایک لحاظ سے تو یہ بھی اَیَّام اللہ ہی کے تذکرے کا حصہ ہے' کیونکہ وقت کی ڈور میں ایک طرف اگر گزشتہ اقوام کے عبرت ناک واقعات پروئے ہوئے ہیں تو اسی ڈور کا دوسرا سرا آخرت ہے۔

آیت ﴿فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ﴾ ''تو جب صور میں پھونکا جائے گا یکبارگی۔''

یعنی اُس وقت کو یاد رکھو جب ایک ہی بار صور میں پھونک ماردی جائے گی۔

آیت ﴿وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً﴾ ''اور جب زمین اور پہاڑوں کو اُٹھا کر ایک ہی بار میں پاش پاش کر دیا جائے گا۔''

آیت ﴿فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ﴾ ''تو اُس روز وہ واقعہ رونما ہو جائے گا۔''

آیت ﴿وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ﴾ ''اور آسمان پھٹ جائے گا''

﴿فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ﴾ ''تو وہ اُس دن بہت بودا سا ہو جائے گا۔''

آیت ﴿وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا﴾ ''اور فرشتے ہوں گے اس کے کناروں پر۔''

﴿وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ﴾ ''اور اُس دن تیرے رب کے عرش کو اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے آٹھ فرشتے۔''

آیت ﴿يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ﴾ ''اُس دن تمہاری پیشی ہوگی''

﴿لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ﴾ ''تمہاری کوئی مخفی سے مخفی بات بھی چھپی نہیں رہے گی۔''

آیت ﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ﴾ ''تو وہ شخص جس کو اُس کا اعمال نامہ دیا جائے گا اُس کے داہنے ہاتھ میں''

﴿فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ﴾ ''تو وہ کہے گا: آؤ آؤ! دیکھو میرا اعمال نامہ!''

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! آمین!

آیت ﴿اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ﴾ ''(وہ کہے گا:) مجھے یقین تھا کہ مجھے اپنے حساب سے دوچار ہونا ہے۔''

مجھے یقین تھا کہ مجھے میرے اعمال کا بدلہ ضرور ملے گا۔

آیت ﴿فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ﴾ ''پس وہ پسندیدہ زندگی بسر کرے گا۔''

وہ خوش نصیب دل پسند عیش میں ہوگا۔ اسے ایسی زندگی عطا کی جائے گی جس میں ہر طرح کی رضا ہی رضا ہوگی۔

آیت ﴿فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ﴾ ''بڑے ہی بلند باغ میں۔''

آیت ۲۳ ﴿قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ۝۲۳﴾ ''اس کے خوشے جھکے ہوئے ہوں گے۔''

آیت ۲۴ ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا ۢ بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ۝۲۴﴾ ''(کہہ دیا جائے گا:) کھاؤ اور پیو رچتا بچتا ان اعمال کے صلے میں جو تم نے گزرے دنوں میں کیے۔''

آیت ۲۵ ﴿وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ﴾ ''اور جس شخص کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا''

﴿فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ۝۲۵﴾ ''وہ کہے گا: اے کاش! مجھے میرا اعمال نامہ دیا ہی نہ گیا ہوتا۔''

ع ''مرا اے کاش کہ مادر نہ زادے'' کاش! میری ماں نے مجھے جنا ہی نہ ہوتا!

آیت ۲۶ ﴿وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ۝۲۶﴾ ''اور مجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے!''

آیت ۲۷ ﴿يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ۝۲۷﴾ ''اے کاش کہ وہی موت قصہ پاک کر دینے والی ہوتی!''

کاش کہ وہی موت جو مجھے دنیا میں آئی تھی فیصلہ کن ہوتی' اُس موت کے بعد میں معدوم ہو گیا ہوتا اور میرے دوبارہ زندہ ہونے کی نوبت نہ آتی۔

آیت ۲۸ ﴿مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ ۝۲۸﴾ ''میرا مال واسباب کچھ بھی میرے کام نہ آیا۔''

آیت ۲۹ ﴿هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ ۝۲۹﴾ ''میرا اقتدار بھی مجھ سے چھن گیا۔''

میرے دُنیوی اختیار و اقتدار اور میری شان و شوکت میں سے کچھ بھی باقی نہ بچا' سب کچھ نیست و نابود ہو گیا۔ ایسے ہر شخص کے لیے فرشتوں کو حکم دیا جائے گا:

آیت ۳۰ ﴿خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۝۳۰﴾ ''پکڑو اسے اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو!''

آیت ۳۱ ﴿ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۝۳۱﴾ ''پھر اسے جہنم کے اندر جھونک دو!''

آیت ۳۲ ﴿ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ۝۳۲﴾ ''پھر ایک زنجیر میں اس کو باندھ دو جس کا طول ستر گز ہے۔''

آیت ۳۳ ﴿اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ۝۳۳﴾ ''یہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتا تھا جو عظمت والا ہے۔''

آیت ۳۴ ﴿وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝۳۴﴾ ''اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا۔''

اسے خود تو کسی مسکین کو کھانا کھلانے کی کبھی توفیق نہیں ہوئی' کسی دوسرے شخص کو بھی اس نے بھلائی کے اس کام کی کبھی ترغیب نہیں دی۔

آیت ۳۵ ﴿فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ۝۳۵﴾ ''تو اس کے لیے یہاں کوئی گرم جوش دوست نہیں ہے۔''

آیت ۳۶ ﴿وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ۝۳۶﴾ ''اور نہ ہی کچھ کھانے کو ہے سوائے زخموں کے دھوون کے۔''

آیت ۳۷ ﴿لَّا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِـُٔوْنَ ۝۳۷﴾ ''نہیں کھائیں گے اس کو مگر وہی جو خطا کار تھے۔''

آیات ۳۸ تا ۵۲

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَ مَا لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۴۰﴾ وَّ مَا هُوَ بِقَوْلِ
شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَ لَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۳﴾ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا
مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَ اِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِنَّا
لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾ وَ اِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾ وَ اِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿۵۱﴾ فَسَبِّحْ
بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۵۲﴾ ع ۱۵

سورۃ الحاقہ کے دوسرے رکوع کی سورۃ الواقعہ کے آخری رکوع سے گہری مشابہت ہے۔ چنانچہ اگلی آیات کو پڑھتے ہوئے سورۃ الواقعہ کی ان آیات کو بھی ذہن میں تازہ کر لیجیے: ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿۷۵﴾ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ﴿۷۶﴾ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۷﴾﴾ ”تو نہیں! قسم ہے مجھے ان مقامات کی جہاں ستارے ڈوبتے ہیں۔ اور یقیناً یہ بہت بڑی قسم ہے اگر تم جانو! یقیناً یہ بہت عزت والا قرآن ہے۔“

آیت ۳۸ ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۸﴾﴾ ”تو میں قسم کھاتا ہوں اُس کی جو تم دیکھتے ہو۔“

آیت ۳۹ ﴿وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾﴾ ”اور اُس کی بھی جو تم نہیں دیکھتے ہو۔“

آیت ۴۰ ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۴۰﴾﴾ ”یہ قول ہے ایک رسولِ کریم کا۔“

اصل میں تو یہ اللہ کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ سے حضرت جبرائیلؑ نے سنا۔ پھر حضرت جبرائیل سے حضرت محمد ﷺ نے سنا اور اب وہ لوگوں کو سنا رہے تھے۔ چنانچہ ایک لحاظ سے یہ جبرائیلؑ کا قول تھا اور دوسرے لحاظ سے حضور ﷺ کا قول۔

آیت ۴۱ ﴿وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ﴾ ”اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔“

﴿قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾﴾ ”کم ہی ہے جو تم یقین کرتے ہو۔“

آیت ۴۲ ﴿وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ﴾ ”اور نہ ہی یہ کسی کاہن کا کلام ہے۔“

﴿قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾﴾ ”کم ہی ہے جو تم غور کرتے ہو۔“

آیت ۴۳ ﴿تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۳﴾﴾ ”اس کا اتارا جانا ہے تمام جہانوں کے رب کی طرف سے۔“

یہ آیت جوں کی توں سورۃ الواقعہ (آیت ۸۰) میں بھی ہے۔

آیت ۴۴ ﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ﴿۴۴﴾﴾ ”اور (بالفرض) اگر یہ (نبی ﷺ) خود گھڑ کر بعض باتیں ہماری طرف منسوب کر دیتے۔“

تَقَوَّلَ باب تفعّل ہے‘ اس باب میں تکلف کے معنی پائے جاتے ہیں‘ یعنی ارادے‘ محنت اور کوشش سے کوئی بات کہنا۔

آیت ۴۵ ﴿لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝۴۵﴾ ''تو ہم پکڑتے ان کو داہنے ہاتھ سے۔''

اس فقرے کے مفہوم میں دو امکانات ہیں۔ ایک یہ کہ ہم اپنے دائیں ہاتھ سے انہیں پکڑتے' یا یہ کہ ہم انہیں ان کے داہنے ہاتھ سے پکڑتے۔

آیت ۴۶ ﴿ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝۴۶﴾ ''پھر ہم ان کی گردن کاٹ ڈالتے۔''

اس اسلوب اور لہجے میں جو سختی ہے یہ دراصل اُن لوگوں کے لیے ہے جو قرآن کو کلام اللہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھے اور کہتے تھے کہ محمد (ﷺ) خود اپنی طرف سے باتیں بنا کر اللہ کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ انہیں بتایا جا رہا ہے کہ بدبختو! تم ہمارے رسول کریم ﷺ کے مرتبے کو کیا سمجھو! کسی رسول کا یہ مقام نہیں ہے کہ وہ اپنے رب کے کلام میں اپنی طرف سے کوئی ملاوٹ کرے۔ وہ تم لوگوں تک ٹھیک ٹھیک وہی کچھ پہنچا رہے ہیں جو ہمارا کلام ہے۔ بفرضِ محال اگر وہ اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ کر ہماری طرف منسوب کر دیں تو یہ کوئی معمولی سا جرم نہیں ہے جس کا نوٹس نہ لیا جائے۔

آیت ۴۷ ﴿فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۝۴۷﴾ ''پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔''

آیت ۴۸ ﴿وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۴۸﴾ ''اور یقیناً یہ تو ایک یاددہانی ہے متقین کے لیے۔''

یہ کلام اُن لوگوں کے لیے نصیحت ہے جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور نیکی و بدی میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

آیت ۴۹ ﴿وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ۝۴۹﴾ ''اور ہمیں خوب معلوم ہے کہ تم میں کچھ لوگ جھٹلانے والے بھی ہیں۔''

وہ ہمارے کلام کو جھٹلانے پر کمربستہ ہو چکے ہیں کہ جو چاہے ہو وہ اسے اللہ کا کلام نہیں مانیں گے۔

آیت ۵۰ ﴿وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝۵۰﴾ ''اور یقیناً یہ کافروں کے لیے حسرت کا باعث بن جائے گا۔''

ایک وقت آئے گا جب قرآن ان جھٹلانے والوں کے لیے حسرت اور پچھتاوے کا سبب بن جائے گا۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((اَلْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَكَ اَوْ عَلَيْكَ))[1] کہ یہ قرآن حجت ہے تمہارے حق میں یا تمہارے خلاف۔ اگر تو تم اس کے حقوق ادا کرو گے' اس پر ایمان لاؤ گے' اسے اپنا امام بنا کر اس کے پیچھے چلو گے اور اس کا پیغام دوسروں تک پہنچانے کا اہتمام کرو گے تو یہ قیامت کے دن تمہاری شفاعت کرے گا' اور اگر تم اس کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرو گے تو قیامت کے دن یہ تمہارے خلاف گواہ بن کر کھڑا ہو گا۔

آیت ۵۱ ﴿وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ۝۵۱﴾ ''اور یقیناً یہ (قرآن) بالکل یقینی حق ہے۔''

یہ ایسا یقین ہے جو سراسر حق ہے' جس میں باطل کی ذرا ملاوٹ تک نہیں۔

آیت ۵۲ ﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۝۵۲﴾ ''پس آپ تسبیح کیجیے اپنے رب کے نام کی جو کہ بہت عظمت والا ہے۔''

نوٹ کیجیے' سورۃ الواقعہ کا اختتام بھی اسی آیت پر ہوتا ہے۔

۱۔ صحیح مسلم' کتاب الطھارۃ' باب فضل الوضوء۔ وسنن الترمذی' کتاب الدعوات' باب منہ۔

سُوْرَةُ الْمَعَارِجِ

سورۃ المعارج تین سورتوں پر مشتمل دوسرے ضمنی گروپ کی پہلی سورت ہے۔ اس گروپ میں پہلی دو سورتیں یعنی سورۃ المعارج اور سورۂ نوح جوڑے کی شکل میں ہیں' جبکہ تیسری سورت (سورۃ الجن) منفرد ہے۔

آیات ۱ تا ۳۵

سُوْرَةُ الْمَعَارِجِ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۴۴ رُكُوْعَاتُهَا: ۲

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ﴿۱﴾ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ۙ﴿۲﴾ مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ ؕ﴿۳﴾ تَعْرُجُ
الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ﴿۴﴾ فَاصْبِرْ صَبْرًا
جَمِيْلًا ۝﴿۵﴾ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۙ﴿۶﴾ وَّ نَرٰىهُ قَرِيْبًا ؕ﴿۷﴾ يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۙ﴿۸﴾ وَ تَكُوْنُ
الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۙ﴿۹﴾ وَ لَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۚ﴿۱۰﴾ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ؕ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ
عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ بِبَنِيْهِ ۙ﴿۱۱﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَ اَخِيْهِ ۙ﴿۱۲﴾ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ۙ﴿۱۳﴾ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ
جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۙ﴿۱۴﴾ كَلَّا ؕ اِنَّهَا لَظٰى ۙ﴿۱۵﴾ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۚ﴿۱۶﴾ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَ تَوَلّٰى ۙ﴿۱۷﴾ وَ
جَمَعَ فَاَوْعٰى ۝﴿۱۸﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۙ﴿۱۹﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۙ﴿۲۰﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ
مَنُوْعًا ۙ﴿۲۱﴾ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۙ﴿۲۲﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۖ﴿۲۳﴾ وَ الَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ
مَّعْلُوْمٌ ۖ﴿۲۴﴾ لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ۖ﴿۲۵﴾ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۖ﴿۲۶﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ
عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۚ﴿۲۷﴾ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ۝﴿۲۸﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ
حٰفِظُوْنَ ۙ﴿۲۹﴾ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ﴿۳۰﴾ فَمَنِ ابْتَغٰى
وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ﴿۳۱﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۖ﴿۳۲﴾ وَالَّذِيْنَ
هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ۖ﴿۳۳﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۘ﴿۳۴﴾ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ۧ﴿۳۵﴾

آیت ۱ ﴿سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ﴿۱﴾ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ۙ﴿۲﴾﴾ ''مانگا ایک مانگنے والے نے ایک ایسا عذاب جو واقع ہونے والا ہو' کافروں کے لیے' جس کو کوئی ٹال نہ سکے گا۔''

یہاں سَأَلَ سَآئِلٌ سے کون مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ میری رائے بہت پہلے سے یہ تھی کہ یہ عذاب طلب کرنے والے خود حضور ﷺ ہیں' لیکن مجھے اپنی رائے پر اطمینان اُس وقت ہوا جب مجھے معلوم ہوا کہ شاہ عبدالقادر دہلویؒ کی رائے بھی یہی ہے۔ عام مفسرین میں سے بہت کم لوگ شاہ صاحبؒ کی اس رائے سے متفق ہیں کہ اس آیت میں حضور ﷺ کی خواہش یا دعا کا ذکر ہے۔

اس آیت کو سمجھنے کے لیے دراصل اُس دور کا نقشہ ذہن میں لانا ضروری ہے جب حضور ﷺ پر ہر طرف سے طرح طرح کے الزامات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اور مکہ کی گلیوں میں آپؐ کو شاعر' مجنون' ساحر اور کذاب جیسے ناموں سے پکارا جا رہا تھا (معاذ اللہ)۔ اعلانِ نبوت کے بعد تین سال تک تو یوں سمجھئے کہ پورے شہر کی مخالفت کا نشانہ صرف حضور ﷺ کی ذات تھی۔ مشرکین کا خیال تھا کہ اگر وہ آپؐ کی قوتِ ارادی اور ہمت توڑنے یا کسی بھی طریقے سے آپؐ کو آپؐ کے موقف سے ہٹانے میں کامیاب ہو گئے تو یہ تحریک خود بخود ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ اُس دور میں عام اہلِ ایمان کو نظر انداز کر کے صرف آپ ﷺ کی ذات کو نشانے پر رکھا گیا تھا۔ اس دوران اگرچہ آپؐ کو کوئی جسمانی اذیت تو نہ پہنچائی گئی لیکن باقاعدہ ایک منظم مہم کے تحت آپ ﷺ کے خلاف ذہنی' نفسیاتی اور جذباتی تشدد کی انتہا کر دی گئی۔ ان لوگوں کی اس مذموم مہم کی وجہ سے حضور ﷺ مسلسل ایک کرب اور تکلیف کی کیفیت میں تھے۔ اس کا اندازہ ان الفاظ اور جملوں سے بھی ہوتا ہے جو اُس دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں آپؐ کی تسلی کے لیے جگہ جگہ آئے ہیں۔

بہرحال حضور ﷺ بھی تو آخر انسان تھے۔ مسلسل شدید ذہنی اذیت کا سامنا کرتے ہوئے ردِّعمل کے طور پر آپؐ کے دل میں ایسی خواہش کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا کہ اب ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آ جانا چاہیے۔ چنانچہ ان آیات میں آپ ﷺ کی اسی خواہش یا دعا کا ذکر ہے۔ اس حوالے سے یہاں یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رہے کہ اس سورت کا سورۂ نوح کے ساتھ جوڑے کا تعلق ہے اور سورۂ نوح میں بھی حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعا کا ذکر ہے جس میں آپؑ نے اللہ تعالیٰ سے اپنی قوم کے لیے سخت عذاب مانگا تھا۔ گویا ان دونوں سورتوں کے اس مضمون کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ اس تعلق میں یہ مناسبت بھی بہت اہم ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول اور حضور ﷺ آخری رسول ہیں۔ (۱)

۱۔ اس مقام پر جمہور مفسرین کی رائے حضرت شاہ صاحب اور محترم ڈاکٹر صاحب رحمہما اللہ کی رائے سے مختلف ہے۔ بعض مفسرین نے یہاں ''سَأَلَ'' کو دریافت کرنا کے معنی میں لیا ہے۔ ان کے نزدیک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ پوچھنے والے نے پوچھا ہے کہ وہ عذاب جس کی ہمیں خبر دی جا رہی ہے' کن لوگوں پر نازل ہوگا؟ تو اس سوال کا جواب دیا گیا کہ وہ کُفار پر نازل ہوگا اور جب نازل ہوگا تو کوئی اس کو ٹال نہیں سکے گا۔ لیکن اکثر مفسرین نے اس جگہ ''سَأَلَ'' کو مانگنے اور طلب کرنے کے معنی میں لیا ہے۔ ان کے نزدیک ان الفاظ میں نضر بن حارث کی اس دعا کی طرف اشارہ ہے جو سورۃ الانفال میں بایں الفاظ بیان ہوئی ہے: ﴿اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۲﴾﴾ ''اے اللہ! اگر یہ (قرآن) تیری ہی طرف سے برحق ہے تو برسا دے ہم پر پتھر آسمان سے یا بھیج دے ہم پر کوئی دردناک عذاب۔''

مزید برآں قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر کُفارِ مکہ کے اس چیلنج کا ذکر کیا گیا ہے کہ جس عذاب سے آپ ہمیں ڈراتے رہتے ہیں وہ لے کیوں نہیں آتے! اس مطالبے کا جواب یہ دیا گیا کہ وہ عذاب کُفار کے لیے تیار ہے' وہ ضرور انہیں چکھایا جائے گا' لیکن اپنے وقت پر۔ اور جب وہ مقررہ گھڑی آ جائے گی تو دنیا کی کوئی طاقت اس عذاب کو ٹال نہیں سکے گی۔ (حاشیہ از مرتب)

آیت ۳ ﴿مِّنَ اللّٰهِ ذِی الْمَعَارِجِ ۝۳﴾ ''(وہ عذاب اپنے وقت پر آئے گا) اُس اللہ کی طرف سے جو بہت بلند درجات والا ہے۔''

آیت ۴ ﴿تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۝۴﴾ ''چڑھتے ہیں فرشتے اور روح اُس کی جانب ایک دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے۔''

یہ آیت ہمارے لیے آیاتِ متشابہات میں سے ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کے ''ذِی الْمَعَارِجِ'' ہونے کی وضاحت ہے کہ اُس کی بارگاہِ بلند تک پہنچنے کے لیے فرشتوں اور جبریلؑ کو بھی پچاس ہزار سال کی مسافت کے برابر فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ پچاس ہزار برس کے دن سے یہاں قیامت کا دن مراد ہے جو کفار کے لیے تو بہت طویل اور سخت ہوگا' البتہ اہل ایمان کو وہ دن ایسے محسوس ہوگا جیسے انہوں نے دن کا کچھ حصہ یا ایک فرض نماز ادا کرنے کے برابر وقت گزارا ہو۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس دن کے بارے میں پوچھا گیا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ اِنَّهٗ لَيُخَفَّفُ عَلَى الْمُؤْمِنِ حَتّٰى يَكُوْنَ اَهْوَنَ عَلَيْهِ مِنْ صَلَاةٍ مَكْتُوْبَةٍ يُصَلِّيْهَا فِي الدُّنْيَا)) ''اُس ذات کی قسم جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے! یہ دن مؤمن کے لیے بہت مختصر کر دیا جائے گا' یہاں تک کہ جتنے وقت میں وہ دنیا میں ایک فرض نماز ادا کرتا ہے اس سے بھی اسے مختصر معلوم ہوگا۔''

آیت ۵ ﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ۝۵﴾ ''تو آپؐ بڑی خوبصورتی سے صبر کیجیے۔''

یہ ہے وہ اصل پیغام جو ان آیات کے ذریعے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دینا مقصود تھا' کہ ابھی تو سفر کا آغاز ہوا ہے' آنے والا وقت اور بھی کٹھن ہوگا۔ لہٰذا آپؐ اپنے راستے میں آنے والی ہر مشکل کا صبر اور استقامت کے ساتھ سامنا کریں۔ اس سے پہلے سورۃ القلم میں بھی آپؐ کو ایسی ہی ہدایت کی گئی ہے: ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ﴾ (آیت ۴۸) ''تو آپؐ انتظار کیجیے اپنے رب کے حکم کا' اور دیکھئے! آپؐ اُس مچھلی والے کی طرح نہ ہو جائیے گا!''

آیت ۶ ۷ ﴿اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝۶ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۝۷﴾ ''یہ لوگ تو اس (عذاب) کو دور سمجھ رہے ہیں' اور ہم اسے نہایت قریب دیکھ رہے ہیں۔''

ظاہر ہے انسان تو صرف اپنے سامنے کی چیز کو ہی دیکھ سکتا ہے' مستقبل میں جھانکنا تو اس کے بس میں نہیں ہے۔ اسی لیے مستقبل کی چیزیں یا خبریں اسے عام طور پر دور محسوس ہوتی ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے تو مستقبل وغیرہ کچھ نہیں اور نہ ہی کوئی چیز اس سے غائب ہے۔ وہ تو ہر چیز کو بیک وقت اپنے سامنے دیکھ رہا ہے۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ سڑک پر سفر کرتے ہوئے ایک شخص صرف اسی شہر یا مقام کو دیکھ سکتا ہے جو اُس کے سامنے ہے جبکہ اس سے اگلا شہر مستقبل میں ہونے کی وجہ سے اس کی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جو شخص ہوائی جہاز پر سفر کر رہا ہے وہ ان دونوں شہروں کو بیک وقت اپنے سامنے دیکھ سکتا ہے۔ بقول آئن سٹائن every thing is relative کہ دنیا کی ہر چیز کسی دوسری چیز سے متعلق و مشروط ہے۔ چنانچہ کسی بھی چیز یا صورتِ حال کو صرف ایک ہی زاویے سے دیکھ کر کوئی رائے قائم نہیں کر لینی چاہیے۔ دنیا میں ہمارے اعتبار سے بھی قریب اور بعید relative ہیں' جبکہ اللہ تعالیٰ کے

لیے تو کوئی شے بھی بعید نہیں' ہر چیز اُس کے سامنے ہے۔ ماضی' حال اور مستقبل آنِ واحد میں اُس کے سامنے موجود ہیں۔

آیت ۸ ﴿یَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۝۸﴾ ''جس دن آسمان ہو جائے گا جیسے پگھلا ہوا تانبا۔''

آیت ۹ ﴿وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۝۹﴾ ''اور پہاڑ ایسے ہو جائیں گے جیسے دھنکی ہوئی روئی (یا رنگی ہوئی اُون)۔''

آیت ۱۰ ﴿وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۝۱۰﴾ ''اور کوئی دوست کسی دوسرے دوست کا حال نہیں پوچھے گا۔''

آیت ۱۱ تا ۱۴ ﴿يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ؕ﴾ ''وہ سب انہیں دکھائے جائیں گے۔''

وہاں مشکل میں پھنسے ہوئے ہر شخص کو اُس کے دوست احباب' والدین' بیوی بچے غرض اس کے سب پیارے دکھا بھی دیے جائیں گے تاکہ اس کی حسرت میں مزید اضافہ ہو۔

﴿يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ بِبَنِيْهِ ۝۱۱ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۝۱۲ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ۝۱۳ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۝۱۴﴾ ''مجرم چاہے گا کہ کاش وہ اُس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے فدیے میں دے دے اپنے بیٹوں کو' اور اپنی بیوی کو اور اپنے بھائی کو' اور اپنے کنبے کو جو اسے پناہ دیتا تھا' اور روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کو' پھر یہ (فدیہ) اُس کو بچا لے!''

یہ اس کیفیت کی ایک جھلک ہے جس کے بارے میں ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس روز نفسا نفسی کا عالم ہوگا۔ ہر شخص کو اپنی فکر ہوگی اور وہ چاہے گا کہ خواہ اس کے بیوی بچوں اور عزیز و اقارب سمیت سب کو عذاب میں جھونک دیا جائے لیکن اسے چھوڑ دیا جائے۔ اس کیفیت کا بالکل ایسا ہی نقشہ سورۂ عبس کی ان آیات میں بھی دکھایا گیا ہے: ﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝۳۴ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۝۳۵ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ۝۳۶ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ۝۳۷﴾ ''اُس دن بھاگے گا انسان اپنے بھائی سے' اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے' اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے۔ اُس دن ان میں سے ہر انسان کی ایسی حالت ہوگی جو اسے دوسروں سے بے خبر کر دے گی''۔ احادیث میں آتا ہے کہ اُس روز اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر علیہم السلام بھی نَفْسِیْ نَفْسِیْ پکار رہے ہوں گے۔

آیت ۱۵ ﴿كَلَّا ؕ اِنَّهَا لَظٰى ۝۱۵﴾ ''ہرگز نہیں! اب تو یہ بھڑکتی ہوئی آگ ہی ہے۔''

آج تم سے نہ تو کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا' اور نہ ہی کوئی تمہاری مدد کو آئے گا۔ آج جہنم کی اس شعلہ فشاں آگ کا سامنا تمہیں خود ہی کرنا ہوگا۔ جیسا کہ سورۂ مریم کی اس آیت میں واضح کیا گیا ہے: ﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ۝۹۵﴾ ''اور قیامت کے دن سب کے سب آنے والے ہیں اس کے پاس اکیلے اکیلے۔''

آیت ۱۶ ﴿نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝۱۶﴾ ''جو کلیجوں کو کھینچ لے گی۔''

شدت کے اعتبار سے جہنم کی آگ کا دنیا کی آگ سے کوئی موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ سورۃ الہمزہ میں جہنم کی آگ کی ایک خصوصیت یہ بتائی گئی ہے: ﴿تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝۷﴾ کہ وہ براہِ راست دلوں میں جلن پیدا کرے گی۔ آج کل اس کیفیت کو ultra violet rays کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ان شعاعوں کی حرارت کھال کے اندر پہنچ کر اپنا اثر دکھاتی ہے۔

آیت ۱۷ ﴿تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ۝۱۷﴾ ''وہ پکارے گی ہر اُس شخص کو جس نے پیٹھ موڑ لی تھی اور رُخ پھیر لیا تھا۔''

جہنم کی آگ ہر اُس شخص کو پکار پکار کر اپنی طرف بلائے گی اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر شکار کرے گی جس نے حق سے اعراض کیا تھا اور اللہ کے کلام کو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ دین کی دعوت اور نبی کریم ﷺ کے مشن کو کبھی لائقِ اعتناء نہیں سمجھا تھا۔

آیت ۱۸ ﴿وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ۝۱۸﴾ ''اور جو مال جمع کرتا رہا پھر اسے سینت سینت کر رکھتا رہا۔''

جس نے اپنی ساری زندگی مال جمع کرنے اور اسے سنبھال سنبھال کر رکھنے میں بتا دی تھی۔

آیت ۱۹ ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝۱۹﴾ ''یقیناً انسان پیدا کیا گیا ہے تھڑدلا۔''

یہ انسان کی فطری اور جبلی کمزوری ہے کہ وہ تھڑدلا' کم حوصلہ اور بے صبرا ہے۔ قرآن مجید میں انسان کی کئی اور کمزوریوں کا ذکر بھی آیا ہے' مثلاً: ﴿وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۝۲۸﴾ (النساء) کہ انسان فطری طور پر کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ سورۃ الاحزاب کی آیت ۷۲ میں انسان کو ظَلُوْمًا جَهُوْلًا قرار دیا گیا ہے' جبکہ سورۃ الانبیاء کی آیت ۳۷ میں انسان کی طبعی عجلت پسندی کا ذکر آیا ہے: ﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ﴾۔ ظاہر ہے ایک انسان جسم اور روح سے مرکب ہے۔ انسان کے جسم کا تعلق عالمِ خلق سے ہے' جبکہ انسانی روح کا تعلق عالمِ امر سے ہے: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ﴾ (بنی اسراءیل:۸۵) ''اور (اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں روح کے بارے میں۔ آپ فرما دیجیے کہ روح میرے ربّ کے امر میں سے ہے''۔ چنانچہ مذکورہ سب کمزوریوں کا تعلق انسان کی جسمانی خِلقت سے ہے۔ جہاں تک انسانی وجود کے اصل حصے یعنی اس کی روح کا تعلق ہے' بنیادی طور پر اس کا مقام بہت بلند ہے اور اس میں ایسی کوئی کمزوری نہیں ہے۔ انسان کی تخلیق کے اس پہلو کا ذکر سورۃ التین کی اس آیت میں آیا ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝۴﴾ ''بے شک ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا''۔ لیکن افسوس کہ ہم انسانوں کی اکثریت اپنی روح سے بیگانہ ہو چکی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ اللہ کی یاد سے غفلت ہے۔ جو انسان اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ سزا کے طور پر اسے خود اپنی ذات (روح) سے غافل کر دیتا ہے۔ سورۃ الحشر کی آیت ۱۹ میں اہلِ ایمان کو اس حوالے سے یوں متنبہ کیا گیا ہے: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ﴾ ''(اے مسلمانو دیکھنا!) تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔''

اگلی دو آیات هَلُوْعًا کی وضاحت پر مشتمل ہیں:

آیت ۲۰ ﴿اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝۲۰﴾ ''جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جانے والا ہے۔''

جب کوئی انسان اپنی روح سے بیگانہ ہو جاتا ہے تو وہ نرا حیوان بن کر رہ جاتا ہے۔ ایسے حیوان نما انسان کو جب کسی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ صبر کرنے کی بجائے فوراً چیخنا چلّانا شروع کر دیتا ہے اور جزع فزع کرنے لگتا ہے۔

آیت ۲۱ ﴿وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝۲۱﴾ ''اور جب اسے بھلائی ملتی ہے تو بہت بخیل بن جاتا ہے۔''

جب اسے کشادگی حاصل ہوتی ہے تو سب کچھ سمیٹ کر اپنے ہی پاس رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

اب اگلی آیات میں ان انسانی کمزوریوں پر قابو پانے کے لیے راہنمائی فراہم کی گئی ہے۔ اپنے مضمون کے اعتبار سے ان آیات (آیت ۲۲ تا ۳۵) کا سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات کے ساتھ خصوصی تعلق ہے۔ قرآن مجید کے یہ دو مقامات نہ صرف

باہم مشابہ ہیں بلکہ ''اَلْقُرْآنُ یُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا'' کے اصول کے مطابق ایک مقام کی بعض آیات دوسرے مقام کی بعض آیات کی وضاحت بھی کرتی ہیں۔ یہاں ضمنی طور پر یہ بھی جان لیجیے کہ ہمارے ''مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب'' کے تیسرے حصے کا پہلا سبق ان ہی دو مقامات کی آیات (سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات اور زیر مطالعہ سورۃ کی آیت ۲۲ سے آیت ۳۵ تک چودہ آیات) پر مشتمل ہے۔ ان آیات میں دراصل بندۂ مؤمن کی سیرت و کردار کے ان اوصاف کی فہرست دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں مطلوب اور پسندیدہ ہیں۔ گویا یہ اوصاف وہ اینٹیں ہیں جنہیں کام میں لا کر ایک بندۂ مؤمن کو اپنی سیرت کی عمارت تعمیر کرنا ہے۔ اگر یہ اینٹیں کچی ہوں گی تو ان سے بنائی گئی عمارت کمزور اور بودی ہونے کے باعث کفر و الحاد کے سیلاب کا سامنا نہیں کر سکے گی۔ چنانچہ سیل باطل کی بلاخیزیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان ''اینٹوں'' کو خوب پختہ کر کے اپنی سیرت کی عمارت استوار کریں۔ بقول اکبر الٰہ آبادی: ؎

تُو آگ میں جل اور خاک میں مل' جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ' تعمیر نہ کر!

بہر حال گزشتہ آیات میں جن انسانی کمزوریوں کا ذکر ہے' عمومی طور پر انسان ان میں مبتلا ہو کر ان کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ پیدائشی کمزوریاں نا قابلِ تغیر و تبدل نہیں' بلکہ انسان ان سے نجات پا سکتا ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل اوصاف کے حامل لوگ ان سے مستثنیٰ ہیں:

آیت ۲۲ ﴿اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ ۝۲۲﴾ ''سوائے نمازیوں کے۔''

ان کمزوریوں اور خامیوں سے محفوظ رکھنے والی ایک چیز نماز ہے۔ گویا نماز تعمیرِ سیرت کی بنیاد کا پہلا پتھر ہے' لیکن صرف وہ نماز جو خاص اہتمام سے مداومت کے ساتھ ادا کی جاتی ہو۔ چنانچہ مذکورہ استثناء کے اہل صرف وہی نمازی ہوں گے:

آیت ۲۳ ﴿الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝۲۳﴾ ''جو اپنی نمازوں پر مداومت کرتے ہیں۔''

یعنی وہ لوگ جو اپنے روزمرہ معمولات میں نماز کو اوّلین ترجیح دیتے ہیں اور کبھی اس میں کوتاہی نہیں کرتے۔ چنانچہ ایسے ''نمازی'' اس وصف کے مصداق نہیں بن سکتے جو ''فارغ وقت'' میں تو نماز ادا کر لیتے ہیں لیکن جب کوئی اور مصروفیت ہو تو انہیں نماز کا خیال تک نہیں آتا' اور نہ ہی انہیں نماز کے ضائع ہو جانے کا دکھ ہوتا ہے۔ اس آیت کے مشابہ سورۃ المؤمنون میں یہ آیت ہے: ﴿الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝۲﴾ ''وہ جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں۔''

آیت ۲۴ ﴿وَالَّذِیْنَ فِیْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝۲۴ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝۲۵﴾ ''اور وہ جن کے اموال میں معیّن حق ہے' مانگنے والے کا اور محروم کا۔''

ایسے لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ جو کچھ انہوں نے کمایا ہے یا جو کچھ بھی انہیں مل گیا ہے وہ سب اُن کا ہے' بلکہ وہ اپنے اموال میں سے ایک معیّن حصہ معاشرے کے اُن محروم اور نادار افراد کے لیے مختص کیے رکھتے ہیں جو اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے دوسروں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتے۔ دراصل اللہ تعالیٰ آزمائش کے لیے بعض لوگوں کے حصے کا کچھ رزق بعض دوسرے لوگوں کے رزق میں شامل کر دیتا ہے۔ چنانچہ متمول افراد کو چاہیے کہ وہ اپنے اموال میں سے مساکین و فقراء کا حصہ الگ کر کے ''حق بہ حق دار رسید'' کے اصول کے تحت

خود ان تک پہنچانے کا اہتمام کریں۔ یاد رہے سورۃ المؤمنون میں اس آیت کے مقابل یہ آیت ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝۴﴾ ''اور وہ جو ہر دم اپنے تزکیے کی طرف متوجہ رہنے والے ہیں''۔ ان دونوں آیات پر غور کرنے سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ زکوٰۃ (غرباء و مساکین کا حق) ادا کر دینے سے نہ صرف بقیہ مال پاک ہو جاتا ہے بلکہ یہ انفاق انسان کے تزکیۂ باطن کا باعث بھی بنتا ہے۔ اس نکتے کی وضاحت سورۃ الحدید کی آیت ۱۷ اور ۱۸ کے ضمن میں بھی کی جا چکی ہے۔ دراصل مال کی محبت جب کسی دل میں گھر کر جاتی ہے تو یوں سمجھ لیجیے کہ اس دل میں گندگی کے انبار لگ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں دل کی صفائی یعنی تزکیۂ باطن کا مؤثر ترین طریقہ یہی ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے مال کی محبت کو دل سے نکالا جائے۔ لیکن اس کے برعکس اگر کوئی شخص اپنے مال کو تو سینت سینت کر رکھتا ہے اور محض مراقبوں کے بل پر اپنے باطن اور نفس کا ''تزکیہ'' چاہتا ہے تو وہ گویا سراب کے پیچھے بھاگ بھاگ کر خود کو ہلکان کر رہا ہے۔

آیت ۲۶ ﴿وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝۲۶﴾ ''اور جو فیصلے کے دن کی تصدیق کرتے ہیں۔''

زیر مطالعہ آیات کی سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات کے ساتھ مناسبت کے حوالے سے اس آیت کا تعلق سورۃ المؤمنون کی اس آیت سے ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝۳﴾ ''اور جو لغو باتوں سے اعراض کرنے والے ہیں''۔ گویا زیر مطالعہ آیت سورۃ المؤمنون کی مذکورہ آیت کی وضاحت کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے لغویات سے اعراض کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کہ وہ قیامت اور جزا و سزا کے دن پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے جو شخص آخرت پر یقین رکھتا ہے اُس کے لیے تو اس زندگی کا ایک ایک لمحہ اَمر (کبھی نہ مرنے والا دائمی) ہے۔ بظاہر تو انسان کی یہ زندگی فانی (finite) ہے لیکن درحقیقت بالقوہ (potentially) یہ دائمی (infinite) ہے۔ اس لیے کہ اس فانی زندگی کے اعمال کا نتیجہ آخرت کی دوامی زندگی میں نکلے گا۔ دنیا میں انسان اچھے بُرے جو اعمال بھی کمائے گا' ان اعمال کے اثرات و نتائج آخرت کی زندگی میں ہمیشہ ہمیش کے لیے ہوں گے۔ چنانچہ آخرت کی دوامی زندگی کے لیے جو پونجی انسان کو درکار ہے وہ تو دنیوی زندگی کے ''اوقات'' میں ہی کمائی جا سکتی ہے۔ سورۃ العصر کی پہلی آیت میں تیزی سے گزرتے ہوئے وقت کی قسم کے پردے میں بھی دراصل یہی فلسفہ بیان ہوا ہے۔ گویا انسان کا اصل سرمایہ اُس کی مہلتِ عمر یعنی زندگی کے وہ قیمتی لمحات ہیں جو تیزی سے اس کے ہاتھ سے نکلے جا رہے ہیں ؎

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی — گردوں نے گھڑی عمر کی اِک اور گھٹا دی!

آیت ۲۷ ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝۲۷﴾ ''اور جو اپنے ربّ کے عذاب سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔''

آیت ۲۸ ﴿اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ۝۲۸﴾ ''یقیناً اُن کے ربّ کا عذاب ایسا نہیں ہے کہ کوئی اس سے نڈر ہو جائے۔''

آیت ۲۹ ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝۲۹﴾ ''اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

آیت ۳۰ ﴿اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝۳۰﴾ ''سوائے اپنی بیویوں یا اپنی

لونڈیوں کے، تو ان لوگوں پر کوئی ملامت نہیں۔''

آیت ۳۱ ﴿فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝۳۱﴾ ''تو جو کوئی بھی اس کے علاوہ کچھ چاہے گا تو وہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں۔''

آیت ۳۲ ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝۳۲﴾ ''اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس کرنے والے ہیں۔''

یہ چاروں آیات سورۃ المؤمنون میں بھی (آیت ۵، ۶، ۷ اور ۸ کے طور پر) جوں کی توں آئی ہیں۔ البتہ اگلی آیت میں اہلِ ایمان کی سیرت کی ایک اضافی صفت کا ذکر ہے جو سورۃ المؤمنون کی مذکورہ آیات میں بیان نہیں ہوئی:

آیت ۳۳ ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ۝۳۳﴾ ''اور وہ جو اپنی گواہیوں پر قائم رہنے والے ہیں۔''

دراصل گواہی بھی ایک امانت ہے اور جو شخص غلط گواہی دیتا ہے یا گواہی کو چھپا لیتا ہے وہ امانت میں خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۱۴۰) ''اور (کان کھول کر سن لو) اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جس کے پاس اللہ کی طرف سے ایک گواہی تھی جسے اُس نے چھپا لیا؟'' علمائے یہود کے پاس نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت کے بارے میں اللہ کی طرف سے گواہی تھی، انہوں نے اس گواہی کو چھپا کر اللہ کی امانت میں خیانت کی۔ سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں اسی گواہی کو چھپانے کا ذکر ہے۔

آیت ۳۴ ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝۳۴﴾ ''اور وہ لوگ کہ جو اپنی نماز کی محافظت کرتے ہیں۔''

آیت ۳۵ ﴿اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ۝۳۵﴾ ''یہی لوگ ہیں جو جنتوں میں ہوں گے اور وہاں ان کا اعزاز و اکرام ہوگا۔''

آیات ۳۶ تا ۴۴

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ۝۳۶ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ۝۳۷ اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ۝۳۸ كَلَّا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۹ فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ۝۴۰ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ۝۴۱ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ۝۴۲ يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ۝۴۳ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ۝۴۴

آیت ۳۶ ﴿فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ۝۳۶﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ آپ کی طرف دوڑے چلے آتے ہیں۔''

آیت ۳۶ ﴿عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ۝۳۶﴾ ''دائیں اور بائیں سے غول در غول۔''

دراصل مشرکین کو ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ جس کسی نے بھی حضور ﷺ سے قرآن سن لیا وہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اس لیے حضور ﷺ جب لوگوں کو قرآن سنانے کے لیے کہیں کھڑے ہوتے تو وہ ہر طرف سے دوڑیں لگا کر آپؐ کے پاس پہنچ جاتے۔ ایسا دراصل وہ لوگوں کو حضور ﷺ کے گرد جمع ہونے سے روکنے کے لیے کرتے تھے' تاکہ وہ آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے قرآن نہ سن سکیں۔

آیت ۳۸ ﴿اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ۝۳۸﴾ ''کیا ان میں سے ہر ایک واقعتاً اس کا خواہش مند ہے کہ وہ نعمت بھری جنّت میں داخل کیا جائے گا؟''

آیت ۳۹ ﴿كَلَّا ۭ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۹﴾ ''ہرگز نہیں! ہم نے ان کو پیدا کیا ہے اُس چیز سے جس کو وہ جانتے ہیں۔''

یعنی ہر انسان جانتا ہے کہ اس کی تخلیق گندے پانی کی ایک بوند سے ہوئی ہے۔

آیت ۴۰ ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ﴾ ''تو نہیں! قسم ہے مجھے مشرقوں اور مغربوں کے ربّ کی''

قرآن مجید میں صیغہ واحد کے طور پر تو مشرق اور مغرب کا ذکر بہت مرتبہ آیا ہے۔ سورۃ الرحمٰن کی آیت ۱۷ میں رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ بھی ہے' جبکہ آیت زیر مطالعہ میں دونوں سمتوں کے لیے جمع کے صیغے آئے ہیں۔ مشرق و مغرب سے متعلق ان تینوں صیغوں (واحد' تثنیہ اور جمع) کی وضاحت سورۃ الرحمٰن کی آیت ۱۷ کے تحت کی جا چکی ہے۔

﴿اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ۝۴۰﴾ ''یقیناً ہم قادر ہیں۔''

آیت ۴۱ ﴿عَلٰٓي اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ﴾ ''اس پر کہ ہم ان کو ہٹا کر ان سے بہتر لوگ لے آئیں''

یعنی ہم انہیں ختم کر کے ان کی جگہ کسی اور قوم کے افراد کو لے آئیں گے' جو ان سے بہتر ہوں گے۔ جیسے قومِ نوح کو ختم کر کے قومِ عاد کو پیدا کیا گیا اور پھر قومِ عاد کے بعد قومِ ثمود کو عروج بخشا گیا۔ اس فقرے کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ آخرت میں ہم انہیں جو جسم دیں گے وہ ان کے موجودہ جسموں سے بہتر ہوں گے۔ اس بارے میں سورۃ الواقعہ' آیت ۶۱ اور سورۃ الدھر' آیت ۲۸ میں تو یہ اشارہ ملتا ہے کہ آخرت میں انسانوں کو جو جسم دیے جائیں گے وہ ان کے دنیا والے جسموں جیسے ہوں گے' لیکن زیر مطالعہ آیت کے مذکورہ مفہوم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانوں کو آخرت میں دیے جانے والے جسم ان کے دنیا والے جسموں سے بہتر ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بظاہر تو وہ جسم ان کے دنیا والے جسموں جیسے ہی ہوں گے' لیکن برداشت وغیرہ کے حوالے سے ان سے کہیں بڑھ کر ہوں گے۔ مثلاً جہنّم کی آگ جو دنیا کی آگ سے کہیں زیادہ گرم اور شدید ہو گی جب انسانوں کو جلائے گی تو وہ جل کر راکھ نہیں بن جائیں گے' بلکہ اس کی تپش کو برداشت کریں گے۔ اہلِ جہنّم کے جسموں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہو گی کہ ان کی کھالیں جل جانے کے بعد پھر سے اپنی اصل حالت پر آ جائیں گی۔ بہر حال آخرت میں ان لوگوں کو جو جسم دیے جائیں گے وہ خصوصی طور پر آخرت کی سختیاں جھیلنے کے لیے بنائے جائیں گے۔ وہ سختیاں جو دنیا کی سختیوں سے کہیں بڑھ کر ہوں گی۔ (اعاذنا اللہ من ذٰلک)

﴿وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ۝۴۱﴾ ''اور (اس معاملے میں) ہم ہارے ہوئے نہیں ہیں۔''

ہم ان کے ساتھ جیسا چاہیں سلوک کریں' وہ ہماری گرفت سے نکل نہیں سکیں گے۔

آیت ۴۲ ﴿فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ چھوڑ دیجیے انہیں' یہ لگے رہیں بے ہودہ باتوں اور کھیل کود میں''

﴿حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ۝۴۲﴾ ''یہاں تک کہ یہ ملاقات کریں اپنے اُس دن سے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔''

قبل ازیں سورۃ الطور' آیت ۴۵ میں بھی ہم یہی الفاظ ﴿فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا﴾ پڑھ آئے ہیں۔ یہ اسلوب ابتدائی دور کی سورتوں میں عام ملتا ہے۔ اس میں ایک طرف حضور ﷺ کی دلجوئی اور تسلی کا پہلو ہے تو دوسری طرف مشرکین سے نفرت اور غصے کا اظہار بھی ہے۔

آیت ۴۳ ﴿يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ۝۴۳﴾ ''جس دن وہ نکلیں گے اپنی قبروں سے دوڑتے ہوئے' جیسے کہ وہ مقررنشانوں کی طرف بھاگے جا رہے ہوں۔''

''نُصُب'' سے مراد وہ نشان ہیں جو دوڑ کا مقابلہ کرنے کے لیے لگائے جاتے ہیں تاکہ ہر دوڑنے والا دوسرے سے پہلے مقرر نشان پر پہنچنے کی کوشش کرے۔

آیت ۴۴ ﴿خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ﴾ ''ان کی نگاہیں زمین میں گڑی ہوئی ہوں گی' ذلّت ان پر چھائی ہوئی ہوگی۔''

﴿ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ۝۴۴﴾ ''یہ ہے وہ دن جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا۔''

سُوْرَةُ نُوْحٍ

آیات ۱ تا ۲۸

سُوْرَةُ نُوْحٍ مَّكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۲۸ رُكُوْعَاتُهَا: ۲

اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۲ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝۳ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُؤَخِّرْكُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۴ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّ نَهَارًا ۝۵ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيْۤ اِلَّا فِرَارًا ۝۶ وَ اِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَ اسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَ اَصَرُّوْا وَ اسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝۷ ثُمَّ اِنِّيْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝۸ ثُمَّ اِنِّيْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَ اَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝۹ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝۱۰ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝۱۱ وَّ يُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّ يَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝۱۲ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۝۱۳ وَ قَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ۝۱۴ اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝۱۵ وَّ جَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝۱۶ وَ اللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۝۱۷ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَ يُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ۝۱۸ وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۝۱۹ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۝۲۰ ع ۱

آیت ۱ ﴿اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ﴾ ''ہم نے بھیجا تھا نوحؑ کو اُن کی قوم کی طرف''

﴿اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱﴾ ''کہ خبردار کر دو اپنی قوم کو اس سے پہلے کہ آ دھمکے ان پر ایک دردناک عذاب۔''

آیت ۲ ﴿قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۲﴾ ''آپؑ نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! مَیں تمہارے لیے واضح طور پر ایک خبردار کرنے والا ہوں۔''

آیت ۳ ﴿اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ۝۳﴾ ''کہ تم لوگ اللہ کی بندگی کرو، اُس کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔''

یہاں نبیؑ اور رسولؑ میں فرق کے حوالے سے یہ نکتہ نوٹ کر لیجیے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے اپنی اطاعت کا مطالبہ اللہ کے ''رسول'' کی حیثیت سے کیا تھا۔ کسی ''نبیؑ'' نے اپنی قوم سے کبھی یہ نہیں کہا کہ تم لوگ میری اطاعت کرو۔ سورۂ یوسفؑ میں ہم حضرت یوسف علیہ السلام کے تفصیلی حالات پڑھ چکے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نبی تھے۔ آپؑ نے مصر کے بادشاہ کو یہ نہیں کہا کہ میں نبی ہوں' تم میری اطاعت کرو' اور نہ ہی آپؑ نے مصر کے لوگوں سے مخاطب ہو کر یوں کہا کہ مجھ پر ایمان لاؤ ورنہ تم پر اللہ کی طرف سے عذاب آ جائے گا۔ بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دورِ نبوت میں بادشاہ اپنی جگہ پر بادشاہ رہا۔ آپؑ اُس کی بادشاہی میں ایک بڑے عہدے پر کام بھی کرتے رہے اور دعوت و تبلیغ کا فریضہ بھی ادا کرتے رہے۔ گویا انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت عمومی نوعیت کی تھی کہ تم لوگ اللہ کے نیک بندے بنو' اللہ کا حق مانو' وغیرہ۔ لیکن جب کسی نبیؑ کو کسی قوم کی طرف کوئی خاص مشن دے کر بھیجا گیا تو وہ اللہ کے ''رسولؑ'' اور اللہ کے نمائندے بن کر اُس قوم کی طرف گئے اور اسی حیثیت سے انہوں نے متعلقہ قوم سے اپنی اطاعت کا مطالبہ کیا۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ (النساء:۶۴) ''ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس لیے کہ اُس کی اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے''۔ اس لحاظ سے رسول کی اطاعت دراصل اللہ ہی کی اطاعت ہے: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ (النساء:۸۰) ''جس نے اطاعت کی رسول کی اُس نے اطاعت کی اللہ کی۔''

آیت ۴ ﴿يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ﴾ ''اللہ تمہارے کچھ گناہ معاف کر دے گا''

یہاں پر حرف مِنْ (تبعیضیہ) بہت معنی خیز ہے۔ یعنی سب کے سب گناہ معاف ہونے کی ضمانت نہیں' البتہ کچھ گناہ ضرور معاف ہو جائیں گے۔ اس کی تاویل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حقوق تو جسے چاہے گا اور جب چاہے گا معاف کر دے گا' لیکن حقوق العباد کے تنازعات کے حوالے سے وہ انصاف کے تقاضے پورے کرے گا۔ اس کے لیے روزِ محشر متعلقہ فریقوں کے درمیان باقاعدہ لین دین کا اہتمام کرایا جائے گا۔ مثلاً کسی شخص نے اگر کسی کا حق غصب کیا ہوگا' کسی کی عزت پر حملہ کیا ہوگا یا کسی بھی طریقے سے کسی پر ظلم کیا ہوگا تو ایسے ظالم کی نیکیوں کے ذریعے سے متعلقہ مظلوم کی تلافی کی جائے گی۔ اس لین دین میں اگر کسی ظالم کی نیکیاں کم پڑ جائیں گی تو حساب برابر کرنے کے لیے اس کے ظلم کا شکار ہونے والے مظلوموں کے گناہ اس کے کھاتے میں ڈال دیے جائیں گے۔

﴿وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ﴾ ''اور تمہیں مہلت دے دے گا ایک وقت معین تک۔''

یعنی اگر تم لوگ اللہ کو معبود مانتے ہوئے اُس کا تقویٰ اختیار کرو گے اور میرے احکام کی تعمیل کرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ کچھ مدت کے لیے تمہیں بحیثیت قوم دنیا میں زندہ رہنے کی مزید مہلت عطا فرما دے گا۔ لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ مہلت بھی ایک وقتِ معین تک ہی ہوگی۔ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کے قوانین بہت سخت اور اٹل ہیں۔

﴿اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۴﴾ ''اللہ کا مقرر کردہ وقت جب آ جائے گا تو اسے مؤخر نہیں کیا جا سکے گا۔ کاش کہ تمہیں معلوم ہوتا!''

جب کوئی قوم اپنے رسول کی دعوت کو ٹھکرا دیتی ہے اور اسے غور و فکر کرنے کے لیے جو مہلت دی گئی ہو وہ ختم ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے مطابق اس قوم کو نیست و نابود کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیتا ہے تو پھر کوئی طاقت اس فیصلے کو مؤخر نہیں کر سکتی۔

آئندہ آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کے اندازِ دعوت کا پورا نقشہ نظر آتا ہے کہ آپؑ نے اپنی قوم کو راہِ راست پر لانے کے لیے

خود کو کس کس طرح سے ہلکان کیا۔ قوم کو دعوت و تبلیغ کرتے اور پیغامِ حق سناتے ہوئے نو صدیاں بیت گئیں لیکن قوم اس دعوتِ حق پر کان دھرنے پر آمادہ نہیں ہوئی۔ جب آپؑ کو ان کے ایمان لانے کی امید نہ رہی تو آپؑ نے اللہ تعالیٰ کے حضور یہ عرض داشت پیش کی۔

آیت ۵ ﴿قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا ۝۵﴾ ''نوحؑ نے عرض کیا: پروردگار! میں نے تو اپنی اس قوم کو رات دن دعوت دی ہے۔''

آیت ۶ ﴿فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْٓ اِلَّا فِرَارًا ۝۶﴾ ''لیکن میری اس دعوت نے ان میں کچھ اضافہ نہیں کیا سوائے فرار کے۔''

یعنی میری اس شب و روز کی دعوتی مساعی کے نتیجے میں ان کے گریز اور فرار ہی میں اضافہ ہوا۔ جتنا جتنا میں ان کو پکارتا گیا اتنے ہی زیادہ یہ دور بھاگتے گئے۔

آیت ۷ ﴿وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ﴾ ''اور میں نے جب بھی انہیں پکارا تاکہ تُو ان کی مغفرت فرما دے تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں''

﴿وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ﴾ ''اور اپنے کپڑے بھی اپنے اوپر لپیٹ لیے''

﴿وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝۷﴾ ''اور وہ ضد پر اڑ گئے اور انہوں نے استکبار کیا بہت بڑا استکبار۔''

اَصَرَّ یُصِرُّ اِصْرَارًا کے معنی اپنی روش پر اڑ جانے کے ہیں۔ کفر کی روش پر اڑ جانے اور جم جانے کے علاوہ ان کا رویہ اپنے رسولؑ کے ساتھ از حد متکبرانہ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم کیسے آپ کو اپنا پیشوا تسلیم کر لیں جبکہ نچلے درجے کے رذیل قسم کے لوگ آپ کے متبعین ہیں! —— اردو میں لفظ ''اصرار'' اسی معنی میں مستعمل ہے۔

آیت ۸ ﴿ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝۸﴾ ''پھر (اے پروردگار) میں نے انہیں بلند آواز سے بھی پکارا۔''

آیت ۹ ﴿ثُمَّ اِنِّیْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝۹﴾ ''پھر میں نے انہیں اعلانیہ دعوت بھی دی اور خفیہ طور پر بھی سمجھایا۔''

اَسَرَّ یُسِرُّ اِسْرَارًا کے معنی ہیں: بھید چھپانا یا چپکے سے بیان کرنا۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کو کھلم کھلا تبلیغ بھی کرتے اور لوگوں سے تنہائی میں انفرادی ملاقاتیں کر کے بھی ایک ایک کو سمجھاتے۔

آیت ۱۰ ﴿فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ﴾ ''پس میں نے ان سے کہا کہ تم اپنے رب سے استغفار کرو۔''

﴿اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝۱۰﴾ ''یقیناً وہ بہت بخشنے والا ہے۔''

آیت ۱۱ ﴿یُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا ۝۱۱﴾ ''وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا۔''

یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندے بن کر رہو گے تو وہ تمہاری دنیوی زندگی میں بھی تمہارے لیے آسانیاں پیدا کر دے گا اور تمہارے علاقے میں خوب بارشیں برسائے گا' جس سے تمہارے رزق میں اضافہ ہوگا۔ ان الفاظ سے یوں لگتا ہے جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت کے بعد کسی دور میں اس قوم پر خشک سالی اور قحط کا عذاب آیا تھا۔ جیسے قومِ فرعون پر قحط اور دوسرے عذاب بھیجے گئے تھے (الاعراف: رکوع ۱۶)۔ یا جیسے حضور ﷺ کی بعثت کے بعد مکہ میں بہت سخت قحط پڑا تھا (سورۃ الدخان: رکوع ۱)۔ ایسے

چھوٹے چھوٹے عذاب دراصل ہر رسول کی بعثت کے بعد متعلقہ قوم کے لوگوں پر وقتاً فوقتاً اس لیے مسلط کیے جاتے تھے تاکہ وہ خواب غفلت سے جاگ جائیں اور اپنے رسول کی دعوت کو سنجیدگی سے سنیں۔

آیت ۱۲ ﴿وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ﴾ ''اور وہ بڑھا دے گا تمہیں مال اور بیٹوں سے''

﴿وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝۱۲﴾ ''اور تمہیں باغات عطا کرے گا اور تمہارے لیے (چشمے اور) نہریں رواں کر دے گا۔''

آیت ۱۳ ﴿مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۝۱۳﴾ ''تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی عظمت کے امیدوار نہیں ہو؟''

اس آیت کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عظمت کو تسلیم کیوں نہیں کرتے؟ اور دوسرا یہ کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کی عظمت و سطوت سے خوف کیوں نہیں آتا؟ فی الحال اللہ تعالیٰ تمہیں ڈھیل دے رہا ہے' لیکن اس کی ڈھیل کی بھی ایک حد ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے: ﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ۝۱۲﴾ (البروج) کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو پکڑنے پر آتا ہے تو اُس کی گرفت بہت سخت ہوتی ہے۔ تم ان سب باتوں کا خیال کیوں نہیں کرتے ہو؟ آخر تم لوگ اُس کی نافرمانیاں کرتے ہوئے اور اُس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہوئے اُس کے غُصّے اور اُس کی گرفت سے بے خوف کیوں ہو گئے ہو؟

آیت ۱۴ ﴿وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ۝۱۴﴾ ''اور اُس نے تمہیں پیدا کیا ہے درجہ بدرجہ۔''

اللہ تعالیٰ نے رحمِ مادر کے اندر تمہیں خِلقت کے کئی مراحل سے گزار کر انسانی صورت میں ڈھالا ہے۔

آیت ۱۵ ﴿اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝۱۵﴾ ''کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے کیسے پیدا کیا ہے سات آسمانوں کو تہ بر تہ!''

آیت ۱۶ ﴿وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝۱۶﴾ ''اور ان کے اندر اُس نے چاند کو روشنی اور سورج کو (درخشاں) چراغ بنایا!''

آیت ۱۷ ﴿وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۝۱۷﴾ ''اور اللہ نے تمہیں اُگایا ہے زمین سے جیسے (سبزہ) اُگایا جاتا ہے۔''

اُس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا ہے۔ نہ صرف تمہارے جسم کے تمام اجزاء زمین سے لیے گئے ہیں بلکہ اس جسم کی پرورش اور بقا کے لیے تمہیں خوراک بھی اسی زمین سے مل رہی ہے۔ نظریۂ ارتقاء (evolution theory) کے ماننے والے لوگ اس آیت کو اپنے حق میں دلیل کے طور پر لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ زمین سے اُگانے کے مفہوم میں پہلے چھوٹے چھوٹے جانوروں کی تخلیق کے آغاز اور پھر رفتہ رفتہ اس مخلوق کے مختلف ارتقائی مراحل سے گزار کر انسانی نسل (Homo sapiens) تک پہنچنے کا اشارہ موجود ہے۔

آیت ۱۸ ﴿ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ۝۱۸﴾ ''پھر وہ تمہیں لوٹا دے گا اسی میں اور پھر نکالے گا تمہیں جیسے نکالا جاتا ہے۔''

آیت ۱۹ ﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۝۱۹﴾ ''اور اللہ نے تمہارے لیے زمین کو بچھا دیا ہے بچھونے کی طرح۔''

آیت ۲۰ ﴿لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۝۲۰﴾ ''تاکہ تم چلو پھرو اس کے کشادہ راستوں پر۔''

آیات ۲۱ تا ۲۸

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ وَ اتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَ وَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ﴿۲۱﴾ وَ مَكَرُوْا
مَكْرًا كُبَّارًا ﴿۲۲﴾ وَ قَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَ لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّ لَا سُوَاعًا ۙ وَّ لَا يَغُوْثَ
وَيَعُوْقَ وَ نَسْرًا ﴿۲۳﴾ وَ قَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۚ وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ﴿۲۴﴾ مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ
اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ﴿۲۵﴾ وَ قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ
عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَ لَا يَلِدُوْٓا اِلَّا
فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَ لِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ
الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ﴿۲۸﴾ ع

اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی عرض داشت اور روداد الم پیش کرتے ہوئے آخر کار حضرت نوح علیہ السلام یوں فریاد کناں ہوئے:

آیت ۲۱ ﴿قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ﴾ ''نوحؑ نے کہا: پروردگار! انہوں نے میری نافرمانی کی''

﴿وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا ﴿۲۱﴾﴾ ''اور انہوں نے ان لوگوں کی پیروی کی جن کے مال اور اولاد نے ان کے لیے سوائے خسارے کے اور کچھ نہیں بڑھایا۔''

پروردگار! تو نے مجھے ان کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا اور ان پر کسی پس وپیش کے بغیر میری اطاعت لازم تھی' لیکن انہوں نے تو میری جی بھر کر نافرمانی کی اور اپنے ان سرداروں اور وڈیروں کی پیروی کرتے رہے جن کے مال واولاد کی کثرت نے انہیں غرور و تکبر میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہ لوگ میری کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں۔

آیت ۲۲ ﴿وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ﴿۲۲﴾﴾ ''اور ان لوگوں نے ایک چال بھی چلی بہت بڑی چال۔''

یہ قوم نوحؑ کے بڑے بڑے سرداروں کی اس چال کا ذکر ہے جس کے تحت انہوں نے مذہبی اور نسلی عصبیت کا سہارا لے کر عوام کو حضرت نوح علیہ السلام کے خلاف بھڑکایا تھا۔ انہوں نے اپنے اَسلاف میں سے بڑے بڑے اولیاء اللہ کے بُت بنا کر رکھے ہوئے تھے اور انہی بُتوں کی وہ لوگ پوجا کرتے تھے۔ جب حضرت نوح علیہ السلام نے انہیں ان بُتوں کو چھوڑنے اور ایک اللہ کو معبود ماننے کی دعوت دی تو قوم کے سرداروں کو آپؑ کے خلاف یہ دلیل مل گئی کہ آپؑ ان کے بزرگوں اور اولیاء اللہ کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ چنانچہ اس ''مضبوط اور مؤثر'' دلیل کو بنیاد بنا کر انہوں نے اپنے عوام کو اس نعرے پر متحد کر لیا کہ اب جو ہو سو ہو' ہم اپنے ان معبودوں کو نہیں چھوڑیں گے۔

آیت ۲۳ ﴿وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ﴾ ''اور انہوں نے کہا کہ تم اپنے ان معبودوں کو ہرگز چھوڑ نہ بیٹھنا۔''

اس سے ملتا جلتا نعرہ سردارانِ قریش نے بھی حضور ﷺ کے خلاف اپنے عوام کو سکھایا تھا: ﴿وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ﴿۶﴾﴾ (صٓ) ''اور چل پڑے ان کے سردار (یہ کہتے ہوئے) کہ چلو جاؤ اور جمے رہو اپنے معبودوں پر' یقیناً اس بات میں تو کوئی غرض پوشیدہ ہے۔''

﴿وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ﴿۲۳﴾﴾ ''ہرگز مت چھوڑنا وَدّ کو' سواع کو' یغوث کو' یعوق کو اور نسر کو۔''

یہ سب اس قوم کے بُتوں کے نام ہیں اور ان میں سے بیشتر اولیاء اللہ کی شخصیات کے بُت تھے۔ یَغُوْث کے تلفظ میں ''غیاث'' یا ''غوث'' کی مشابہت سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اولیاء اللہ میں سے کسی ایسی شخصیت کا بُت تھا جسے وہ لوگ اپنا فریادرس سمجھتے تھے۔ دراصل حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السلام کے درمیانی زمانے میں بہت سے انبیاء کرامؑ گزرے ہیں۔ حضرت شیث اور حضرت ادریس علیہما السلام اسی دور کے نبی ہیں۔ ظاہر ہے ان پیغمبروں کے پیروکاروں میں بہت سے نیک لوگ اور اولیاء اللہ بھی ہوں گے۔ چنانچہ بعد کی نسلوں کے لوگوں نے عقیدت و احترام کے جذبے کے تحت ان اولیاء اللہ کی مورتیاں بنالیں۔ شروع شروع میں وہ ان مورتیوں کو احتراماً سلام کرتے ہوں گے' لیکن بعد میں رفتہ رفتہ ان کی باقاعدہ پوجا شروع کر دی گئی۔ اسی طرح آج ہمارے ہاں بھی بعض لوگ اپنے گھروں میں اولیاء اللہ اور پیروں کی تصاویر بڑے اہتمام کے ساتھ آویزاں کرتے ہیں' بلکہ ان تصویروں کے گلوں میں باقاعدہ ہار بھی ڈالے جاتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک صاحب کے گھر میں ایک تصویر آویزاں دیکھی جس میں خواجہ معین الدین اجمیریؒ' حضرت بختیار کاکیؒ اور بابا فرید شکر گنجؒ تینوں بیک وقت جمع تھے اور تصویر پر ہار ڈالے گئے تھے۔ ایسی روایات جب نسل در نسل آگے بڑھتی ہیں تو قدرتاً بُت پرستی کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ ظاہر ہے عقائد و نظریات میں بگاڑ ایک دم تو پیدا نہیں ہوتا بلکہ ملتان کی زبان میں اس عمل کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ''بندہ تھیندا تھیندا تھی ویندا اے''۔ بہرحال بعض اوقات انسان نظریاتی طور پر رفتہ رفتہ اس قدر بدل جاتا ہے کہ اسے خود بھی پتا نہیں چلتا کہ وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔

آیت ۲۴ ﴿وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۚ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ﴿۲۴﴾﴾ ''اور انہوں نے تو بہتوں کو بہکا دیا ہے۔ اور (اے اللہ!) اب تُو ان ظالموں کے لیے سوائے گمراہی کے اور کسی چیز میں اضافہ نہ فرما!''

حضرت نوح علیہ السلام کے ان الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مرحلے پر آپؑ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ اب آپؑ کی حمیتِ دینی کو اس ناہنجار قوم کا ایمان لانا بھی گوارا نہیں' بلکہ اللہ تعالیٰ کے حضور فریاد کناں ہیں کہ پروردگار! اب تُو ان گمراہوں کی گمراہی میں ہی اضافہ فرما ـــــ بالکل ایسی ہی کیفیت کی جھلک حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا میں بھی نظر آتی ہے:

﴿وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾﴾

(یونس)

''اور موسیٰؑ نے عرض کیا: اے ہمارے پروردگار! تُو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو سامانِ زیب و زینت اور اموال عطا کر دیے ہیں دنیا کی زندگی میں۔ پروردگار! اس لیے کہ وہ لوگوں کو گمراہ کریں تیرے راستے سے! اے ہمارے رب! اب ان کے اموال کو برباد کر دے اور ان کے دلوں میں سختی پیدا کر دے کہ یہ ایمان نہ لائیں جب تک کہ یہ کھلم کھلا دیکھ نہ لیں عذابِ الیم کو۔''

آیت ۲۵ ﴿مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ﴾ ''اپنی خطاؤں کی وجہ سے ہی وہ غرق کیے گئے اور داخل کر دیے گئے آگ میں''

﴿فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ﴿۲۵﴾﴾ ''تو نہ پایا انہوں نے اپنے لیے اللہ کے مقابل کوئی مددگار۔''

حضرت نوح علیہ السلام کی اس فریاد کا سخت ترین حصہ آگے آ رہا ہے:

آیت ۲۶ ﴿وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾﴾ ''اور نوحؑ نے کہا: اے میرے پروردگار! اب تُو اس زمین پر کافروں کا بستا ہوا ایک گھر بھی مت چھوڑ۔''

آیت ۲۷ ﴿اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾﴾ ''اگر تُو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسلوں میں بھی اب فاجر اور کافر لوگوں کے سوا اور کوئی پیدا نہیں ہوگا۔''

ان لوگوں کی فطرتیں مسخ ہو چکی ہیں جس کی وجہ سے ان کی آئندہ نسلوں سے بھی کسی خیر کی توقع نہیں ہے' اس لیے ان کا نیست و نابود ہو جانا ہی بہتر ہے۔ انسانی تاریخ میں اللہ کے کسی بندے نے شاید ہی ایسی سخت دعا مانگی ہو۔ لیکن حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو برس تک جس طرح صبر و استقامت کے ساتھ اپنی قوم کی زیادتیوں کو برداشت کیا' اس پس منظر میں آپؑ کا یہ غُصّہ حق بجانب تھا۔

آیت ۲۸ ﴿رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا﴾ ''پروردگار! مغفرت فرما دے میری اور میرے والدین کی اور اُس کی جو کوئی بھی میرے گھر میں داخل ہو جائے ایمان کے ساتھ''

﴿وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ﴾ ''اور تمام مؤمن مَردوں اور مؤمن عورتوں کی بھی (مغفرت فرما دے)''

یہ دعا اس لحاظ سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں اگلے اور پچھلے زمانوں کے تمام اہلِ ایمان شامل ہو گئے ہیں۔

﴿وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ﴿۲۸﴾﴾ ''اور ان ظالموں کے لیے تو اب کسی چیز میں اضافہ مت کر سوائے تباہی اور بربادی کے۔''

سورۃ المعارج اور سورۂ نوح کے مطالعے کے بعد یہ نکتہ بھی اچھی طرح سے سمجھ لیجیے کہ اگر ''نظمِ قرآن'' کو مدِنظر رکھتے ہوئے ان دونوں سورتوں کا مطالعہ جوڑے کی حیثیت سے کیا جائے تو نہ صرف سورۃ المعارج کی پہلی آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے' بلکہ سورۂ نوح کے نزول کا سبب اور حضرت نوح علیہ السلام کی مذکورہ دعا کا جواز بھی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ بہر حال اس پہلو سے ان دونوں سورتوں پر غور کرنے سے یہ نکتہ خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ سورۃ المعارج کی ابتدائی آیت خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے متعلق ہے اور یہ بھی کہ سورۃ المعارج کی آیت ۵ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ﴿۵﴾﴾ کی تلقین بھی اسی حوالے سے کی گئی' بلکہ اس کے بعد ایک پوری سورت (سورۂ نوح) نازل کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی کے لیے حضرت نوح علیہ السلام کے حالات و مصائب کا نقشہ بھی دکھا دیا گیا کہ آپؐ کی دعوتی مہم کو شروع ہوئے تو ابھی چار پانچ سال ہی ہوئے ہیں' آپؐ ہمارے اس بندے کی ہمت اور استقامت کو بھی مدِنظر رکھیں جو ایسے مشکل حالات کا سامنا ساڑھے نو سو سال تک کرتا رہا۔

سُوْرَةُ الْجِنِّ

تمہیدی کلمات

سورۃ الجن منفرد سورت ہے' اس کا کوئی جوڑا نہیں۔ یہ قرآن مجید کی واحد سورت ہے جس میں جنات کا تفصیلی ذکر آیا ہے۔ اس کے علاوہ سورۃ الرحمٰن اور سورۃ الاحقاف میں بھی جنات کا تذکرہ ہے۔ سورۃ الاحقاف میں ان جنات کے بارے میں بتایا گیا ہے جو حضور ﷺ سے قرآن مجید سن کر ایمان لے آئے تھے' جبکہ سورۃ الرحمٰن میں انسانوں اور جنوں کو ﴿یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ...﴾ ایک ساتھ مسلسل مخاطب کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے سورۃ الرحمٰن کی ترجیعی آیت ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝﴾ پوری سورت میں اکتیس (۳۱) مرتبہ دہرائی گئی ہے۔

زیر مطالعہ سورت میں جنات کے ایک گروہ کے کچھ افراد کی باہمی گفتگو کا ذکر ہے۔ ممکن ہے یہ وہی گروہ ہو جس کا ذکر سورۃ الاحقاف میں آچکا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ کوئی دوسرا گروہ ہو۔

آیات ۱ تا ۱۵

سُوْرَةُ الْجِنِّ مَكِّيَّةٌ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اٰيَاتُهَا: ۲۸ — رُكُوْعَاتُهَا: ۲

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝١ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۝٢ وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ۝٣ وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ۝٤ وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝٥ وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝٦ وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۝٧ وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۝٨ وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝٩ وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۝١٠ وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا ۝١١ وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِي الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ۝١٢ وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى اٰمَنَّا بِهٖ ؕ فَمَنْ

يُّؤْمِنْ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا ﴿۱۳﴾ وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿۱۴﴾ وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴿۱۵﴾

آیت ۱ ﴿قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے: میری طرف وحی کی گئی ہے کہ جنّات کی ایک جماعت نے بڑے غور سے سنا''

جنّات کی جماعت نے کیا سنا؟ اس کا جواب اگلے جملے میں ہے۔

﴿فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ﴿۱﴾﴾ ''تو انہوں نے (جا کر دوسرے جنّات سے) کہا کہ ہم نے سنا ہے ایک بہت ہی دل کو لبھانے والا قرآن۔''

آیت ۲ ﴿يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ﴾ ''جو راہِ راست کی طرف راہنمائی کرتا ہے' تو ہم اس پر ایمان لے آئے۔''

قرآن کے بارے میں جنّات کا یہ ردِّعمل ہم انسانوں کے لیے باعثِ عبرت اور لمحۂ فکریہ ہے۔ انہوں نے ایک مرتبہ قرآن سنا اور وہ اس پر فوراً ایمان لے آئے' بلکہ قرآن کو سن کر نہ صرف اس پر فوراً ایمان لے آئے بلکہ داعی بن کر اس کا پیغام اپنی قوم تک پہنچانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ دوسری طرف ہم ہیں کہ قرآن کو بار بار پڑھتے ہیں' بار بار سنتے ہیں' لیکن ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کو اس نیت سے اور اس انداز سے پڑھتے یا سنتے ہی نہیں کہ وہ ہمارے دِلوں میں اُترے۔ ہم تو رمضان کے قیام اللّیل کے لیے بھی اُس مسجد کا انتخاب کرتے ہیں جہاں کے قاری صاحب کم سے کم وقت میں ''منزل'' طے کر لیتے ہوں۔ بلکہ آج کل تو باقاعدہ اشتہارات کے ذریعے مختلف مساجد میں ایک سے بڑھ کر ایک ''پُرکشش پیکج'' پیش کیا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں صرف اتنے دنوں میں قرآن ختم کرا دیا جاتا ہے..... ہماری مسجد میں نمازِ تراویح صرف تیس منٹ میں پڑھا دی جاتی ہے' وغیرہ وغیرہ ـــــ اندازہ کیجیے! جہاں قرآن مجید کم از کم وقت میں ختم کرنے کے لیے دوڑیں لگی ہوں وہاں سمجھنے' سمجھانے کی فرصت کسے ہوگی؟ اب ذرا اس طرزِ عمل کے مقابلے میں مذکورہ جنّات کے رویّے کا تصوّر کریں جو ایک ہی مرتبہ قرآن مجید کو سن کر کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ قرآن پر ایمان لانے کا اعلان کرنے کے بعد انہوں نے کہا:

﴿وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ﴿۲﴾﴾ ''اور اب ہم کبھی بھی اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔''

آیت ۳ ﴿وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ﴿۳﴾﴾ ''اور یہ کہ ہمارے ربّ کی شان بہت بلند ہے' اُس نے اپنے لیے نہ کوئی بیوی بنائی ہے اور نہ کوئی اولاد۔''

آیت ۴ ﴿وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ﴿۴﴾﴾ ''اور یقیناً ہمارا بے وقوف (سردار) اللہ کے بارے میں خلافِ حقیقت باتیں کہتا رہا ہے۔''

اپنے ''بے وقوف'' سے ان کا اشارہ اپنے سب سے بڑے جن عزازیل (ابلیس) کی طرف ہے۔

آیت ۵ ﴿وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ﴿۵﴾﴾ ''اور یہ کہ ہم تو اس گمان میں رہے کہ جن اور انسان اللہ پر ہرگز کوئی جھوٹ نہیں باندھیں گے۔''

وہ بدبخت اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتا رہا اور ہم اس خوش فہمی میں اس کی باتوں کو مانتے رہے کہ کوئی انسان یا جن اللہ کے بارے میں کبھی کوئی خلافِ حق بات نہیں کر سکتا۔

آیت ۶ ﴿وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝۶﴾ ''اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ مرد جنات میں سے کچھ مَردوں کی پناہ پکڑتے تھے' تو انہوں نے ان (جنات) کی سرکشی میں مزید اضافہ کیا۔''

عربوں کے ہاں جنات سے پناہ طلب کرنے کا رواج عام تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہر جنگل اور ہر ویرانے میں جنات کا بسیرا ہوتا ہے۔ اس لیے جب ان کا کوئی قافلہ صحرا میں کہیں پڑاؤ کرتا تو قافلے کا سردار بآوازِ بلند پکارتا کہ ہم اس وادی کے سردار جن کی پناہ میں آتے ہیں۔ اب ظاہر ہے جنات تو انسانوں کی ایسی حماقتوں پر ہنستے ہوں گے کہ دیکھو! آج اسی آدمؑ کی اولاد ہمیں معبود بنائے بیٹھی ہے جسے سجدہ نہ کرنے پر ہمارے جدِ امجد کو جنت سے نکال دیا گیا تھا۔ چنانچہ انسانوں کی ایسی حرکتوں سے جنات کے غرور اور سرکشی میں اور بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔

آیت ۷ ﴿وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۝۷﴾ ''اور یہ کہ انہوں نے بھی ایسا ہی سمجھا جیسا کہ تم نے سمجھا ہوا ہے کہ اللہ کسی کو ہرگز نہیں اٹھائے گا۔''

اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو بھی مرنے کے بعد دوبارہ نہیں اٹھائے گا' یعنی بعث بعد الموت کے عقیدے میں کوئی حقیقت نہیں۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اب اللہ تعالیٰ کسی کو بھی رسول بنا کر نہیں بھیجے گا۔ سورۃ الاحقاف میں جنات کے تذکرے کے حوالے سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنات تورات سے واقف تھے اور وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ پچھلے چھ سو برس سے دنیا میں کوئی رسول نہیں آیا (حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور ﷺ کے درمیان تقریباً چھ سو برس کا زمانہ انسانی تاریخ میں سلسلۂ رسالت کے انقطاع کا طویل ترین وقفہ ہے)۔ چنانچہ اپنی ان معلومات کی بنیاد پر جنات یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ رسالت کا دروازہ اب ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے اور یہ کہ اب دنیا میں کوئی رسول نہیں آئے گا۔

آیت ۸ ﴿وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ﴾ ''اور یہ کہ ہم نے ٹٹولا آسمان کو''

ہم نے غیب کی خبروں کی ٹوہ میں آسمان کی پہنائیوں میں حسبِ معمول بھاگ دوڑ کی۔

﴿فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۝۸﴾ ''تو ہم نے دیکھا کہ وہ سخت پہروں اور انگاروں سے بھرا ہوا ہے۔''

ہم نے دیکھا کہ آسمان میں اب جگہ جگہ پہرے مقرر کر دیے گئے ہیں اور شہابِ ثاقب کی قسم کے میزائل نصب کر کے حفاظتی انتظامات غیر معمولی طور پر سخت کر دیے گئے ہیں۔ جیسا کہ قبل ازیں بھی کئی مرتبہ ذکر ہو چکا ہے' آگ اور نور کی کچھ خصوصیات مشترک ہونے کے باعث جنات اور فرشتوں کے مابین تخلیقی اعتبار سے کچھ نہ کچھ قربت پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرشتے جب عالمِ بالا سے احکام لے کر زمین کی طرف آتے ہیں تو شیاطینِ جن ان سے اللہ تعالیٰ کے فیصلوں اور احکام سے متعلق پیشگی خبریں حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسی خبریں وہ اپنے اُن انسان ساتھیوں تک پہنچانے کے لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں جو دنیا میں کاہنوں اور جادوگروں کے روپ میں شرک و ضلالت کی دکانیں کھولے بیٹھے ہیں۔ عام حالات میں تو اللہ تعالیٰ کی مشیت سے شاید ان جنات کو ایسی

خبروں تک کسی نہ کسی حد تک رسائی ہو جاتی ہو مگر نزولِ وحی کے زمانے میں انہیں حساس حدود کے قریب بھی پھٹکنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ آیات زیر مطالعہ میں اسی حوالے سے جنّات کی چہ میگوئیوں کا ذکر ہو رہا ہے۔

آیت ۹ ﴿وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ﴾ ''اور یہ کہ (اس سے پہلے) ہم اس کے بعض ٹھکانوں میں بیٹھا کرتے تھے کچھ سُن گُن لینے کے لیے۔''

﴿فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ﴾ ''لیکن اب اگر کسی نے کچھ سننے کی کوشش کی''

﴿يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۙ﴾ ''تو وہ پائے گا اپنے واسطے ایک انگارہ گھات میں لگا ہوا۔''

آیت ۱۰ ﴿وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْۤ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ﴾ ''اور یہ کہ ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کے لیے کسی شر کا ارادہ کیا جا رہا ہے''

﴿اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۝۱۰﴾ ''یا اُن کے لیے اُن کے رب نے کسی بھلائی کا ارادہ کیا ہے۔''

جنّات کی اس بات سے ایسے لگتا ہے جیسے وہ تورات کے عالم تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جب کسی قوم کی طرف کوئی رسول مبعوث ہوتا ہے تو اس کے دو امکانی نتائج میں سے ایک نتیجہ ضرور سامنے آتا ہے۔ یا تو متعلقہ قوم اپنے رسول پر ایمان لا کر ہدایت کے راستے پر چل پڑتی ہے یا اُس کا انکار کر کے تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ اگر کسی قوم پر عذاب بھیجنا چاہتا ہے تو اس قوم میں رسول مبعوث کر کے اتمامِ حجت ضرور کرتا ہے جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل کی اس آیت میں واضح کیا گیا ہے: ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝۱۵﴾ ''اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ کسی رسول کو نہ بھیج دیں''۔ چنانچہ آسمان پر غیر معمولی سخت حفاظتی انتظامات دیکھ کر جنّات یہ تو سمجھ گئے کہ اہلِ زمین کے لیے وحی و رسالت کا سلسلہ پھر سے شروع ہو چکا ہے لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اس سلسلے کا حتمی نتیجہ کیا نکلے گا۔ کیا اللہ تعالیٰ کو اپنے اس فیصلے سے انسانوں کی بھلائی مطلوب ہے یا اُس نے اہلِ زمین کو قومِ نوحؑ، قومِ ہودؑ اور قومِ صالحؑ کی طرح ایک مرتبہ پھر تباہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور ان پر عذاب بھیجنے سے پہلے رسول مبعوث کر کے وہ ان لوگوں پر اتمامِ حجت کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے نبوت و رسالتِ محمدی ﷺ تو انسانیت کے حق میں سراسر خیر ہی خیر ہے لیکن ان جنّات کو اُس وقت تک اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔

آیت ۱۱ ﴿وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ﴾ ''اور یہ کہ ہم میں نیک لوگ بھی ہیں اور کچھ اس سے مختلف قسم کے بھی ہیں۔''

یہاں نیک کے مقابل میں ان کا اشارہ تو ظاہر ہے سرکش اور فسادی جنّات ہی کی طرف ہے لیکن انہوں نے ان کا ذکر ایسے الفاظ کے ساتھ نہیں کیا۔ یہ دراصل حکمتِ تبلیغ کا اہم اصول ہے کہ بُرے کو بھی بُرا نہ کہو۔

﴿كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا ۝۱۱﴾ ''ہم مختلف راستوں پر پھٹے ہوئے تھے۔''

طَرَائِق جمع ہے طَرِیْقَة کی اور قِدَد جمع ہے قِدَّةٌ کی یعنی مختلف الرائے فرقے۔ قَدَّ یَقُدُّ قَدًّا کے معنی پھاڑنے یا کاٹنے کے ہیں۔ جیسے سورۂ یوسف کی آیت ۲۵ میں آیا ہے: ﴿قَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ﴾ ''اُس (عورت) نے پھاڑ دی آپؑ کی قمیص پیچھے سے۔''

آیت ﴿وَّاَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ تُعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ﴿۱۲﴾﴾ ''اور یہ کہ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ ہم زمین میں اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور نہ بھاگ کر اُسے ہرا سکتے ہیں۔''

آیت ﴿وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰۤی اٰمَنَّا بِهٖ ؕ﴾ ''اور یہ کہ ہم نے جونہی اس ہدایت (الہدیٰ) کو سنا ہم اس پر ایمان لے آئے۔''

﴿فَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا یَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا ﴿۱۳﴾﴾ ''تو جو کوئی بھی ایمان لائے گا اپنے رب پر اُسے نہ تو کسی نقصان کا خوف ہوگا اور نہ زیادتی کا۔''

اللہ تعالیٰ ہر کسی کے نیک اعمال کا پورا پورا اجر دے گا' کسی کے ساتھ کوئی زیادتی یا حق تلفی کا معاملہ نہیں ہوگا۔

آیت ﴿وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ﴾ ''اور یہ کہ ہم میں فرمانبردار بھی ہیں اور بے انصافی کرنے والے بھی۔''

قَسَطَ (ثلاثی مجرد میں) عدل اور ناانصافی دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور قَاسِط (اسم فاعل) کے معنی ''ناانصاف'' کے ہوتے ہیں' لیکن اَقْسَطَ (باب افعال میں) صرف عدل وانصاف کے معنی میں مستعمل ہے۔

﴿فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿۱۴﴾﴾ ''تو جن لوگوں نے اطاعت قبول کر لی تو انہوں نے ڈھونڈ نکالی نیکی کی راہ۔''

آیت ﴿وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴿۱۵﴾﴾ ''اور جو بے انصاف ہیں تو وہ جہنم کا ایندھن بن کر رہیں گے۔''

یہ تو تھا جنات کی اس تقریر کا اقتباس جو انہوں نے قرآن سننے کے بعد اپنی قوم کے لوگوں کے سامنے تبلیغ کی غرض سے کی تھی۔ اس کے بعد خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے کلام کیا گیا ہے۔

آیات ۱۶ تا ۲۸

وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَی الطَّرِیْقَةِ لَاَسْقَیْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ﴿۱۶﴾ لِّنَفْتِنَهُمْ فِیْهِ ؕ وَمَنْ یُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ یَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ﴿۱۷﴾ وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾ وَّاَنَّهٗ لَمَّا
ع ۱۱ قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ یَدْعُوْهُ كَادُوْا یَكُوْنُوْنَ عَلَیْهِ لِبَدًا ﴿۱۹﴾ قُلْ اِنَّمَاۤ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَاۤ اُشْرِكُ بِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۰﴾ قُلْ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ﴿۲۱﴾ قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ
وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۲﴾ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ؕ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ﴿۲۳﴾ حَتّٰۤی اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ
اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا ﴿۲۴﴾ قُلْ اِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْۤ اَمَدًا ﴿۲۵﴾ عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ
مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾ لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا
ع ۱۲ لَدَیْهِمْ وَاَحْصٰی كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا ﴿۲۸﴾

آیت ۱۶ ﴿وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ۝۱۶﴾ ''اور (اے نبی ﷺ! آپ کہیے کہ مجھ پر یہ وحی بھی کی گئی ہے) کہ اگر یہ لوگ درست طریقے پر چلتے رہتے تو ہم انہیں خوب سیراب کرتے۔''

یعنی اگر نسلِ انسانی کے لوگ انبیاء و رسل علیہم السلام کے راستے پر چلتے رہتے تو آخرت کی نجات کے ساتھ ساتھ ہم انہیں دنیا میں بھی خوب نوازتے۔ یہاں پر جس مفہوم میں لفظ ''طَرِیْقَة'' آیا ہے عین وہی مفہوم لفظ ''شَرِیْعَة'' اس آیت میں ادا کر رہا ہے: ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ﴾ (الجاثیۃ: ۱۸) ''پھر (اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو قائم کر دیا دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر''۔ گویا ان دونوں الفاظ کا مفہوم تو ایک ہی ہے لیکن ہمارے ہاں عام طور پر لفظ ''شریعت'' دین کے ظاہری اور قانونی پہلو کے لیے استعمال ہوتا ہے جبکہ ''طریقت'' سے دین کا باطنی پہلو مراد لیا جاتا ہے۔ مثلاً نماز کے فرائض اور واجبات کیا ہیں؟ مختلف ارکان کی ادائیگی کا درست طریقہ کیا ہے؟ کن چیزوں سے نماز ٹوٹ جاتی ہے؟ یہ شریعت کا موضوع ہے۔ ظاہر ہے ایسے مسائل معلوم کرنے کے لیے آپ کو کسی فقیہہ یا مفتی سے رجوع کرنا ہوگا۔ لیکن نماز کی اصل روح کیا ہے؟ نماز میں خشوع و خضوع اور حضورِ قلب کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اور اس کے اثرات کیا ہیں؟ اس قسم کے سوالات طریقت سے متعلق ہیں اور ان کے جوابات آپ کو کسی صوفی سے ملیں گے۔ اوّلین اَدوار کے بزرگانِ دین تو جامع الصفات تھے۔ جو صوفی تھے وہ بہت بڑے عالم اور مفتی بھی ہوا کرتے تھے۔ برصغیر میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ ایسی ہی ایک جامع شخصیت تھے۔ آپ مفتی، مفسر اور محدث بھی تھے اور بہت بڑے صوفی اور مرشد بھی۔ آپ مرزا مظہر جانِ جاناں شہید رحمہ اللہ (آپ اہلِ تشیع کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے) کے خلیفہ تھے۔ آپ کا تعلق شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ کے سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ سے تھا۔ بہرحال ایسی شخصیات کی موجودگی میں تو شریعت اور طریقت کے درمیان کوئی بُعد نہیں تھا لیکن آج بدقسمتی سے دین کے ان دونوں پہلوؤں کو پھاڑ کر بالکل الگ الگ کر دیا گیا ہے۔

آیت ۱۷ ﴿لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ﴾ ''تاکہ ہم اس (فراوانی) میں ان کی آزمائش کریں۔''

یعنی ہم لوگوں کو خوب سیراب کر کے اور انہیں مختلف النوع نعمتوں سے نواز کر ان کا امتحان لیتے ہیں۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کی آزمائش کے انداز مختلف ہیں، وہ کسی کو تونگری اور خوشحالی میں آزماتا ہے تو کسی کو فاقوں میں مبتلا کر کے اس کا امتحان لیتا ہے۔

﴿وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ﴾ ''اور جو کوئی بھی اعراض کرے گا اپنے رب کے ذکر سے''

﴿يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ۝۱۷﴾ ''تو وہ ڈال دے گا اس کو چڑھتے عذاب میں۔''

یعنی اللہ تعالیٰ انہیں ایسے عذاب میں ڈالے گا جس کی شدت ہر لحہ بڑھتی ہی چلی جائے گی۔

آیت ۱۸ ﴿وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ﴾ ''اور یہ کہ مسجدیں اللہ ہی کے لیے ہیں''

یہاں ''مساجد'' سے مراد سجدہ کرنے کی جگہیں یعنی عبادت گاہیں بھی ہیں اور سجدے کے اعضاء (پیشانی، ناک، ہاتھ، پاؤں، گھٹنے) بھی۔ یعنی تمام مساجد اور انسانوں کے اعضائے سجدہ سب اللہ کی ملکیت ہیں۔

﴿فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۝۱۸﴾ ''تو تم اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو!''

آیت ۱۹ ﴿وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ﴾ ''اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ اُس کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے''

﴿كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ۝۱۹﴾ ''تو معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس پر ہجوم کر کے آ جائیں گے۔''

اللہ کے بندے سے مراد یہاں رسول اللہ ﷺ ہیں۔ جب آپؐ نماز کے لیے کھڑے ہوتے اور اس میں قرآن کی تلاوت فرماتے تو مشرکین یہ کلام سننے کے لیے آپ ﷺ کے گرد بڑے تجسس سے جمع ہو جاتے تھے' لیکن ایمان لانے کو تیار نہیں تھے۔ اس کا ایک مفہوم یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مشرکین آپ ﷺ کو نماز میں کھڑا دیکھتے تو ان کے عناد کی آگ بھڑک اٹھتی اور ان کا جی چاہتا کہ آپ ﷺ پر ہلہ بول دیں اور اس شمع ہدایت کو گل کر دیں۔

آیت ۲۰ ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ میں تو اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں''
﴿وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ۝۲۰﴾ ''اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔''

آیت ۲۱ ﴿قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۝۲۱﴾ ''آپؐ کہہ دیجیے کہ مجھے کوئی اختیار نہیں تمہارے لیے کسی نقصان کا اور نہ راہ پر لانے کا۔''

سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہے' میں خود کسی کو ہدایت نہیں دے سکتا۔ اس حوالے سے سورۃ القصص کی یہ آیت بہت واضح ہے:
﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۚ﴾ (آیت ۵۶) ''آپؐ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو چاہیں' بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔''

آیت ۲۲ ﴿قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ﴾ ''آپؐ کہہ دیجیے کہ مجھے اللہ (کی پکڑ) سے کوئی پناہ نہیں دے سکتا''
﴿وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝۲۲﴾ ''اور نہ ہی میں اُس کے علاوہ سر چھپانے کی کوئی جگہ پاؤں گا۔''

آیت ۲۳ ﴿اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ؕ﴾ ''بس (میرا فرض) اللہ کی طرف سے تبلیغ اور اُس کے پیغامات کا پہنچا دینا ہے۔''
یعنی اگر میں نے یہ فریضہ انجام دینے میں کوتاہی کی تو میری جواب دہی ہوگی۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاعراف کی اس آیت میں اپنا قانون واضح طور پر بیان فرما دیا ہے: ﴿فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِیْنَ اُرْسِلَ اِلَیْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِیْنَ ۝۶﴾ ''پس ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے اُن سے بھی جن کی طرف ہم نے رسولوں کو بھیجا اور لازماً پوچھ کر رہیں گے رسولوں سے بھی۔''
﴿وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ ''اور جو کوئی بھی اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) کی نافرمانی کرے گا''
﴿فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ۝۲۳﴾ ''تو اُس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہے گا۔''

آیت ۲۴ ﴿حَتّٰٓی اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ﴾ ''یہاں تک کہ جب وہ دیکھیں گے وہ چیز جس کی انہیں دھمکی دی جا رہی ہے''
﴿فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا ۝۲۴﴾ ''اُس وقت انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون کمزور ہے مددگاروں کے اعتبار سے اور کون اقلیت میں ہے تعداد کے لحاظ سے۔''

سردارانِ قریش کے طعنوں میں سے حضور ﷺ کے لیے ایک طعنہ یہ بھی تھا کہ آپؐ کی محفل کے مقابلے میں ہماری محفلیں زیادہ باوقار اور پُررونق ہوتی ہیں۔ آپؐ تو نچلے طبقے کے چند غریب' کمزور اور نادار افراد کو لے کر بیٹھے ہوتے ہیں جبکہ ہماری محفلوں میں بڑے بڑے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ اس آیت میں ان کے اس طعنے کا جواب دیا گیا ہے کہ قیامت کے دن انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اپنے حمایتیوں کی طاقت اور تعداد کے لحاظ سے کس کی کیا حیثیت ہے۔ سورۂ مریم میں یہ مضمون زیادہ واضح انداز میں آیا ہے۔

آیت ۲۵ ﴿قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْٓ اَمَدًا ﴿۲۵﴾﴾ ''آپ یہ بھی کہہ دیجیے کہ مجھے معلوم نہیں کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ قریب آ چکی ہے یا میرا رب اس کی مدت اور لمبی کر دے گا۔''

مَا تُوْعَدُوْنَ کا ترجمہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ وہ چیز جس کی تم لوگوں کو وعید یا دھمکی دی جا رہی ہے۔ وعدہ اور وعید دونوں الفاظ ایک ہی مادہ (وعد) سے مشتق ہیں۔ اس لحاظ سے وعید (دھمکی) کی حیثیت بھی گویا ایک وعدے کی سی ہے۔ اس آیت کا مضمون ملتے جلتے الفاظ میں سورۃ الانبیاء کی اس آیت میں بھی آ چکا ہے: ﴿وَاِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾﴾ کہ اے نبی (ﷺ) آپ انہیں بتا دیں کہ میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ قریب آ چکی ہے یا ابھی دور ہے۔

آیت ۲۶ ﴿عٰلِمُ الْغَیْبِ﴾ ''وہی ہے غیب کا جاننے والا''

﴿فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾﴾ ''پس وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔''

آیت ۲۷ ﴿اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ﴾ ''سوائے اُس کے جس کو اُس نے پسند فرما لیا ہو اپنے رسولوں میں سے''

اس آیت میں علمِ غیب کے بارے میں بہت اہم اصول بتا دیا گیا ہے۔ یعنی غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ وہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے اور جس قدر چاہتا ہے اس بارے میں مطلع فرماتا ہے۔ اس اصول کے تحت دیکھا جائے تو حضور ﷺ کی ذات سے متعلق علمِ غیب کا مسئلہ خواہ مخواہ متنازعہ بنا دیا گیا ہے۔ اگر تو کوئی شخص علمِ غیب سے مراد ایسا علم لیتا ہے جو بغیر کسی کے بتائے ہوئے حاصل ہو تو ایسا کوئی علم اللہ کی مخلوق میں سے کسی کے پاس بھی نہیں۔ ہر کسی کو جو بھی علم ملا ہے کسی نہ کسی کے سکھانے سے ہی ملا ہے۔ حضور ﷺ کا علم بھی اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بھی علم اللہ تعالیٰ نے ہی عطا کیا ہے۔ ہم جیسے عام انسان بھی اپنے والدین، اساتذہ اور بڑوں سے ہی سیکھتے ہیں۔

اس ضمن میں سب سے پہلے علمِ غیب کی درست تعریف (definition) طے کرنا ضروری ہے۔ یہ حقیقت ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ ''غیب'' کا تعلق مخلوق سے ہے، اللہ تعالیٰ کے لیے تو کوئی چیز ''غیب'' ہے ہی نہیں، ہر شے ہر آن اُس کے سامنے موجود ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں یا خبریں ہم انسانوں سے پوشیدہ رکھی ہیں وہ ہمارے لیے ''عالمِ غیب'' ہے، مثلاً جنت، دوزخ، فرشتے وغیرہ۔ اس بارے میں بھی کسی کو کوئی اختلاف نہیں کہ انبیاء و رسل علیہم السلام کو غیب کی خبریں بھی دی جاتی ہیں اور کسی حد تک انہیں عالمِ غیب کا مشاہدہ بھی کرایا جاتا ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ نُرِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِیَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ ﴿۷۵﴾﴾ (الانعام) ''اور اسی طرح ہم دکھاتے رہے ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کے ملکوت تاکہ وہ پوری طرح یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے''۔ حضور ﷺ کو معراج کے موقع پر جنت، دوزخ اور بہت سی دوسری کیفیات کا مشاہدہ کرایا گیا، بلکہ غیب سے متعلق ایسے مشاہدات آپؐ کو عام معمول کی زندگی میں بھی کرائے جاتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ آپؐ نمازِ کسوف (سورج گرہن کے وقت) پڑھا رہے تھے تو نماز کے دوران آپؐ اچانک ایک دفعہ آگے بڑھے اور پھر اسی انداز میں پیچھے ہٹے۔ بعد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپؐ کے اس عمل کا سبب دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ میرے سامنے اچانک جنت لے آئی گئی تو میں نے چاہا کہ اس کا پھل توڑ لوں، چنانچہ میرا ہاتھ بے اختیار اُس کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے بعد میرے سامنے دوزخ لے آئی گئی تو اس کی تپش کی وجہ سے میں بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ بہر حال علم کے اعتبار سے ایک عام انسان اور ایک نبی میں بنیادی طور پر یہی فرق ہے کہ نبی کو عالمِ غیب کا علم بھی دیا جاتا ہے۔ ورنہ جہاں تک امورِ

دنیا کے علم کا تعلق ہے اس بارے میں حضور ﷺ کا واضح فرمان موجود ہے۔ ایک موقع پر آپؐ نے صحابہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا: ((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْيَاكُمْ))[1] کہ دنیاداری کے اپنے معاملات کے بارے میں تم لوگ بہتر جانتے ہو۔ چنانچہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء و رسل علیہم السلام کو جب چاہے جس قدر چاہے عالمِ غیب کا مشاہدہ کرا دے یا غیب کے علم میں سے جتنا علم چاہے عطا فرما دے۔ البتہ جو کوئی یہ مانے کہ نبی مکرم ﷺ کو کُل غیب کا علم تھا وہ کافر ہے۔

حضور ﷺ کے علمِ غیب کے بارے میں بریلوی مکتبہ فکر کے علماء کا نقطہ نظر کیا ہے؟ اس سوال کا جواب جاننے کے لیے میں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں ذاتی طور پر متعدد بریلوی علماء سے ملاقاتیں کیں۔ میں جتنے علماء سے ملا ان سب کو میں نے مندرجہ ذیل تین نکات پر متفق پایا:

(۱) حضور ﷺ کا علم ذاتی نہیں' عطائی ہے' یعنی اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔

(۲) آپ ﷺ کا علم قدیم نہیں' حادث ہے۔ یعنی پہلے نہیں تھا' جب اللہ نے عطا کیا تو آپؐ کو علم ہو گیا۔

(۳) آپ ﷺ کا علم لامحدود نہیں' محدود ہے۔

دراصل ان تین نکات کے بارے میں مسلمانوں کے کسی مکتبہ فکر میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ اس کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ یہ مسئلہ سرے سے بحث طلب ہے ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو علمِ غیب عطا فرمایا' جب چاہا اور جتنا چاہا عطا فرمایا۔ اب کیا میں اور آپ اس بارے میں بحث کریں گے کہ حضور ﷺ کو کس چیز کا علم تھا اور کس چیز کا علم نہیں تھا؟ میری اور آپ کی حیثیت ہی کیا ہے کہ ہم حضور ﷺ کے علم کے بارے میں ناپ تول کریں۔ معاذ اللہ!

﴿فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾﴾ ''تو اُس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے۔''

یعنی جب اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے غیب کے حقائق کا علم کسی رسول کے پاس بھیجتا تو اُس کی حفاظت کے لیے ہر طرف فرشتے مقرر کر دیتا' تاکہ وہ علم نہایت محفوظ طریقے سے رسول تک پہنچ جائے۔

آیت ۲۸ ﴿لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ﴾ ''تاکہ وہ دیکھ لے کہ انہوں نے واقعتاً اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے ہیں''

یعنی اللہ تعالیٰ یہ بات واضح کر دے۔ اسی حوالے سے اتمامِ حجت کے لیے حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر حاضرین سے پوچھا تھا: ((اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟)) ''کیا میں نے اللہ کا پیغام تم لوگوں تک پہنچا دیا؟'' اس پر تمام حاضرین نے یک زبان ہو کر کہا تھا: نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ[2]

﴿وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ﴿۲۸﴾﴾ ''اور وہ احاطہ کیے ہوئے ہے اس سب کچھ کا جو اُن کے پاس ہے اور اُس نے ہر چیز کا حساب کتاب رکھا ہوا ہے گنتی کے ساتھ۔''

۱۔ صحیح مسلم' کتاب الفضائل' باب وجوب امتثال ماقاله شرعًا... ح: ۲۳۶۳' عن انس ابن مالک رضی اللہ عنہ۔

۲۔ صحیح مسلم' کتاب الحج' باب حجة النبی ﷺ' ح: ۱۲۱۸۔

سُوْرَةُ الْمُزَّمِّلِ

سورۃ المزمل اور سورۃ المدثر کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے' بلکہ اس سے آگے سورۃ الناس تک تمام (۴۰) سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ ان دونوں سورتوں کے آغاز کی آیات لفظی اور معنوی اعتبار سے بالکل ایک جیسی ہیں۔

آیات ۱ تا ۱۹

سُوْرَةُ الْمُزَّمِّلِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۲۰ | رُكُوْعَاتُهَا: ۲

يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ﴿۲﴾ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ﴿۳﴾ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَ رَتِّلِ
الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ؕ﴿۴﴾ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ﴿۵﴾ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ
قِيْلًا ؕ﴿۶﴾ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ؕ﴿۷﴾ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ؕ﴿۸﴾ رَبُّ
الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ﴿۹﴾ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ
هَجْرًا جَمِيْلًا ﴿۱۰﴾ وَ ذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ﴿۱۱﴾ اِنَّ لَدَيْنَاۤ اَنْكَالًا
وَّجَحِيْمًا ۙ﴿۱۲﴾ وَّ طَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ﴿۱۳﴾ يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَ كَانَتِ
الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ﴿۱۴﴾ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۬ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰى
فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ﴿۱۶﴾ فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ
كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبَا ﴿۱۷﴾ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ ۢ بِهٖ ؕ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ﴿۱۸﴾ اِنَّ
هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۱۹﴾ ع

آیت ۱ ﴿يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾﴾ ''اے کمبل میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ)!''

فِدَاهُ آبَاؤُنَا وَاُمَّهَاتُنَا۔

آیت ۲ ﴿قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ﴿۲﴾﴾ ''آپ کھڑے رہا کریں رات کو (نماز میں) سوائے اس کے تھوڑے سے حصے کے۔''

آیت ۳ ﴿نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ﴿۳﴾﴾ ''(یعنی) اس کا آدھا یا اس سے تھوڑا کم کر لیجیے۔''

یعنی آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حضور آدھی رات یا ایک تہائی رات کا قیام کریں۔

آیت ۴ ﴿اَوْ زِدْ عَلَيْهِ﴾ ''یا اس پر تھوڑا بڑھا لیں''

یا پھر رات کا دو تہائی حصہ قیام میں گزاریں۔ گویا آپ ﷺ کے قیام اللیل کا دورانیہ یا نصاب ایک تہائی رات سے لے کر دو تہائی رات تک ہونا چاہیے۔ اس نصاب میں ہمارے لیے رمضان کے قیام اللیل کے حوالے سے بھی راہنمائی موجود ہے۔ رمضان کی راتوں کے قیام کے بارے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حضور ﷺ کا فرمان ہے:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَـهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ ' وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ ' وَمَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ))[1]

''جس نے رمضان کے روزے رکھے ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے گئے' اور جس نے رمضان (کی راتوں) میں قیام کیا (قرآن سننے اور سنانے کے لیے) ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ' اس کے بھی تمام سابقہ گناہ معاف کر دیے گئے' اور جو لیلۃ القدر میں کھڑا رہا (قرآن سننے اور سنانے کے لیے) ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ اس کی بھی سابقہ تمام خطائیں بخش دی گئیں!''

اب ظاہر ہے ''قیام اللیل'' کی اصطلاح کا اطلاق رات کے ایک بڑے حصے کے قیام پر ہی ہو سکتا ہے۔ گھنٹے بھر میں جیسے تیسے بیس رکعتیں پڑھ کر سو جانے کو تو قیام اللیل نہیں کہا جا سکتا۔ اور یہ بیس رکعتوں کا نصاب تو اصل میں اُن لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے سارا دن محنت و مشقت میں گزارنا ہے۔ ایسے لوگوں کی مجبوری کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے قیام اللیل کا ایک کم سے کم معیار مقرر فرما دیا تھا۔ البتہ جن لوگوں کے حالات موافق ہوں انہیں رمضان المبارک میں بہر صورت زیر مطالعہ آیات کے مفہوم و مدعا کے مطابق قیام اللیل کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اسی طرح وہ حضرات جو اپنی ملازمت وغیرہ سے ایک ماہ کی رخصت لے سکتے ہوں انہیں بھی چاہیے کہ وہ اپنی سالانہ چھٹیاں سیر سپاٹوں پر ضائع کرنے کے بجائے رمضان کے لیے بچا کر رکھا کریں' تاکہ قیام اللیل کی برکتوں سے کماحقہ مستفید ہو سکیں۔

﴿وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝۴﴾ ''اور ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھتے جایئے۔''

تَرْتِیْل کے معنی قرآن مجید کو خوب ٹھہر ٹھہر کر اور سمجھ کر پڑھنے کے ہیں۔ گویا قیام اللیل کا اصل لازمہ قرآن مجید کی تلاوت ہے اور وہ بھی ترتیل کے ساتھ۔ واضح رہے کہ حضور ﷺ کو یہ حکم نبوت کے بالکل ابتدائی دور میں دے دیا گیا تھا۔ بعد میں جب باقاعدہ پانچ نمازیں فرض ہو گئیں تو قیام اللیل کو مختصر کر کے تہجد کی شکل دے دی گئی' لیکن اس میں بھی قرآن کی تلاوت پر زور دیا گیا: ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ﴾ (بنی اسرائیل:۷۹) یعنی تہجد بھی قرآن کے ساتھ (بہ) ادا کریں۔ تہجد کا حق یوں ادا نہیں ہوتا کہ چند مختصر سورتوں کے ساتھ آٹھ رکعتیں ادا کیں اور پھر بیٹھ کر دوسرے اذکار میں مشغول ہو گئے۔ بہر حال جسے اللہ تعالیٰ نے تہجد کی توفیق دی ہو اُس کے لیے لازم ہے کہ وہ اتنا قرآن ضرور یاد کرے جس سے تہجد کا کچھ نہ کچھ حق ادا ہو سکے۔

آیت ۵ ﴿اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝۵﴾ ''ہم عنقریب آپؐ پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔''

اس سے مراد رسالت (انذار و تبلیغ) کی ذمہ داری ہے' جس کے بارے میں پہلا حکم سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات میں آیا تھا۔ واضح رہے کہ سورۃ المزمل کی زیر مطالعہ آیات (غالباً ابتدائی نو آیات) تیسری وحی کی صورت میں نازل ہوئیں' جبکہ اس کے بعد نازل

[1] صحيح البخاري' كتاب صلاة التراويح' باب فضل ليلة القدر۔ وصحيح مسلم' كتاب صلاة المسافرين وقصرها' باب في قيام رمضان وهو التراويح۔

ہونے والی چوتھی وحی سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات پر مشتمل تھی۔

اس آیت میں حضور ﷺ کو اس عظیم ذمہ داری کے بارے میں بتایا جا رہا ہے جس کا بوجھ عنقریب آپؐ کے کندھوں پر پڑنے والا تھا۔ اخلاق و کردار کے اعتبار سے تو حضور ﷺ پہلے ہی انسانیت کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز تھے لیکن اب رسالت کی کٹھن ذمہ داریوں کے حوالے سے آپؐ کو مزید ریاضت کرنے کی ہدایت کی گئی کہ اب آپؐ رات کا بیشتر حصہ اپنے رب کے حضور کھڑے ہو کر قرآن مجید پڑھنے میں گزارا کریں اور اس طرح قرآن مجید کو زیادہ سے زیادہ اپنے اندر جذب کریں۔

آیت ۶ ﴿اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً﴾ ''یقیناً رات کا جاگنا بہت مؤثر ہے نفس کو زیر کرنے کے لیے''

﴿وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۝۶﴾ ''اور بات کو زیادہ درست رکھنے والا ہے۔''

یہ نہایت سکون و اطمینان کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت بندے اور اللہ رب العزت کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا۔

آیت ۷ ﴿اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝۷﴾ ''یقیناً دن کے اوقات میں تو آپؐ کے لیے بڑی مصروفیات ہیں۔''

دن کے اوقات میں تو آپ ﷺ کو بہت سی دوسری مصروفیات کا سامنا ہوتا ہے۔ دعوت کے سلسلے میں طرح طرح کے لوگوں سے ملنا اور ان کی کڑوی کسیلی باتیں سننا بذاتِ خود ایک تکلیف دہ عمل ہے۔ ان مصروفیات میں آپؐ کی توجہ بٹی رہتی ہے۔ لیکن رات کی تنہائیوں میں تو بس آپؐ ہیں اور آپؐ کا رب ہے۔ اُس وقت آپؐ پوری توجہ اور دلجمعی سے اپنے رب کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

آیت ۸ ﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝۸﴾ ''اور آپؐ اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کریں اور ہر طرف سے کٹ کر بس اُسی کے ہو رہیں۔''

تبتّل کا معروف مفہوم تو یہی ہے کہ سب سے کٹ کر کسی ایک کا ہو جانا' لیکن عملی طور پر اس حکم کے ذریعے ایک بندۂ مؤمن سے ''بے ہمہ و باہمہ'' کی کیفیت مطلوب ہے۔ یعنی رشتوں اور تعلقات کے ہجوم میں بظاہر سب کے ساتھ نظر آؤ' لیکن حقیقت میں تمہارا تعلق کسی کے ساتھ بھی نہ ہو۔ جیسے قیامت کے دن ہر انسان کو انفرادی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے ہونا ہوگا۔ اُس وقت ماں باپ' اولاد' بیوی' شوہر کوئی بھی ساتھ نہیں ہوگا۔ بہرحال ایک بندۂ مؤمن کو فریضۂ دعوت و تبلیغ کی ادائیگی کے لیے بظاہر تو معاشرے میں رہنا ہے اور خود سے متعلقہ لوگوں کے حقوق کا بھی خیال رکھنا ہے' لیکن باطنی طور پر اسے تمام لوگوں سے ذہنی و قلبی رشتے' دوستیاں' امیدیں اور توقعات توڑ کر صرف اللہ تعالیٰ سے رشتہ استوار کرنا چاہیے۔ یہ ہے وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا کے حکم کا اصل مدعا۔

آیت ۹ ﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ ''وہ رب ہے مشرق کا بھی اور مغرب کا بھی''

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝۹﴾ ''اُس کے سوا کوئی معبود نہیں' بس آپؐ اُسی کو بنا لیجیے اپنا کارساز۔''

آیت ۱۰ ﴿وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ﴾ ''اور جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اس پر صبر کیجیے''

﴿وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝۱۰﴾ ''اور ان کو چھوڑ دیجیے بڑی خوبصورتی سے کنارہ کشی کرتے ہوئے۔''

یہ لوگ آپ ﷺ کے لیے شاعر' جادوگر اور مجنون جیسے نام رکھتے ہیں۔ یہ صورتِ حال آپؐ کے لیے بلاشبہ نہایت تکلیف دہ ہے' لیکن آپؐ ان لوگوں کی باتوں پر صبر کریں اور خوبصورت انداز میں ان کو چھوڑ کر الگ ہو جائیں۔ سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے: ﴿وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝۶۳﴾ کہ جب جاہل لوگ ان سے مخاطب

ہوتے ہیں تو وہ ان کو سلام کر کے گزر جاتے ہیں۔

دعوت و تبلیغ کے مشن کو جاری رکھنے کے لیے اس حکمتِ عملی کو اپنانا بہت ضروری ہے۔ ظاہر ہے انسان کے حالات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔ ہوسکتا ہے آج جن لوگوں کو آپ کی دعوت سے چڑ ہے کل انہیں آپ کی یہی باتیں اچھی لگنے لگیں۔ اس لیے لوگوں سے دوبارہ بات کرنے کا راستہ کھلا رکھنا ضروری ہے۔ یہ آیات نبوت کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوئی تھیں۔ اگلے بارہ سال کے دوران مکہ کے حالات نے ابھی کئی نشیب و فراز دیکھنے تھے۔ اس لیے حضور ﷺ کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ اہلِ مکہ کی اوچھی حرکتوں کی وجہ سے آپؐ ان کو نظر انداز تو کریں' لیکن تعلقات میں اس قدر تلخی نہ آنے دیں کہ دوبارہ انہیں دعوت دینا ممکن نہ رہے۔

آیت ۱۱ ﴿وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ﴾ ''آپؐ مجھے اور ان جھٹلانے والوں کو چھوڑ دیں' جو بڑی نعمتوں سے نوازے گئے ہیں''

ان کو مال و اولاد' بڑی بڑی جائیدادیں اور طرح طرح کی دوسری نعمتیں بھی میں نے ہی عطا کی ہیں اور اب ان کی سرکشی کا مزہ بھی انہیں میں ہی چکھاؤں گا' لہٰذا اُن کا معاملہ آپؐ مجھ پر چھوڑ دیں۔ نوٹ کیجیے ابتدائی دور کی ان سورتوں میں ذَرْنِيْ اور ذَرْهُمْ کے صیغے بار بار آ رہے ہیں۔

﴿وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ۝۱۱﴾ ''اور ابھی آپؐ انہیں تھوڑی سی مہلت دیں۔''

قبل ازیں ہم سورۂ مریم میں اس سے ملتا جلتا یہ حکم بھی پڑھ چکے ہیں: ﴿فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ۝۸۴﴾ ''تو آپؐ ان کے خلاف (فیصلے کے لیے) جلدی نہ کیجیے۔ ہم ان کی پوری پوری گنتی کر رہے ہیں''۔ سورۃ الطارق کی اس آیت میں بھی بالکل یہی مضمون بیان ہوا ہے: ﴿فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝۱۷﴾ ''پس آپ کافروں کو مہلت دیں' بس تھوڑی سی مزید مہلت۔''

آیت ۱۲ ﴿اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ۝۱۲﴾ ''ہمارے پاس ان کے لیے بھاری بیڑیاں اور بھڑکتی آگ ہے۔''

آیت ۱۳ ﴿وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ﴾ ''اور وہ کھانا جو حلق میں اٹک جائے گا''

اس سے مراد ''زقوم'' ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں متعدد بار ہوا ہے۔ (اس کی تفصیل سورۃ الواقعہ آیت ۵۲ کے ضمن میں دیکھی جا سکتی ہے۔)

﴿وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ۝۱۳﴾ ''اور دردناک عذاب ہے۔''

یعنی یہ لوگ جہنم کا ایندھن بننے اور اس کے دردناک عذابوں کا مزہ چکھنے کے لیے کشاں کشاں اس کی طرف جا رہے ہیں' لیکن ابھی ہم کچھ دیر کے لیے انہیں مہلت دینا چاہتے ہیں۔

آیت ۱۴ ﴿يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ۝۱۴﴾ ''جس دن کہ زمین اور پہاڑ لرزنے لگیں گے اور پہاڑ ریت کے بکھرتے تودے بن جائیں گے۔''

کوہ ہمالیہ جیسے بڑے بڑے پہاڑ اُس دن ریزہ ریزہ ہو کر ریت کے ٹیلوں (sand dunes) کی طرح ہو جائیں گے۔ پھر ان ٹیلوں کے پھسلنے اور بکھرنے کے باعث زمین کے تمام نشیب و فراز برابر ہو جائیں گے۔ اس طرح کہ: ﴿لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ۝۱۰۷﴾ (طٰہٰ) ''آپ نہ تو اس میں کوئی ٹیڑھ دیکھیں گے اور نہ کوئی ٹیلا۔''

آیت ۱۵ ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ﴾ ''(اے لوگو!) ہم نے تمہاری طرف ایک رسولؐ بھیج دیا ہے تم پر گواہ بنا کر۔''

ہمارا یہ رسولؐ دنیا میں تمہارے سامنے اپنے قول و عمل سے حق کی گواہی دے گا اور قیامت کے دن تمہارے خلاف گواہی دے گا' کہ اے اللہ! مَیں نے تو تیرا پیغام ان لوگوں تک پہنچا دیا تھا' اب اس حوالے سے یہ لوگ خود جواب دہ ہیں۔

﴿كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ۝۱۵﴾ ''جیسے کہ ہم نے بھیجا تھا فرعون کی طرف بھی ایک رسول۔''

اسی طرح اس سے پہلے ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے رسول کی حیثیت سے فرعون کے پاس بھیجا تھا۔

آیت ۱۶ ﴿فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ﴾ ''پس فرعون نے نافرمانی کی ہمارے رسولؐ کی''

﴿فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ۝۱۶﴾ ''تو ہم نے پکڑ لیا اس کو بڑے وبال والی پکڑ۔''

اب تم خود ہی سوچو کہ اللہ کے رسولؐ کو جھٹلا کر اگر فرعون جیسا مطلق العنان بادشاہ نہیں بچ پایا تھا اور اسی جرم کی پاداش میں اگر عاد و ثمود جیسی طاقتور قوموں کو نیست و نابود کر دیا گیا تھا تو تم لوگ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلا کر کیسے بچے رہو گے!

آیت ۱۷ ﴿فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبَا ۝۱۷﴾ ''اب اگر تم کفر کرو گے تو تم کیسے بچ جاؤ گے اس دن' جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا''

قیامت کا دن اللہ کے نافرمانوں کے لیے بہت سخت ہوگا۔

آیت ۱۸ ﴿السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ ۢ بِهٖ ۭ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ۝۱۸﴾ ''آسمان اس سے پھٹ پڑنے والا ہے' اُس کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔''

قیامت اس کائنات پر کہیں باہر سے نہیں آئے گی' وہ اس وقت بھی اس کے اندر موجود ہے' جیسے کہ سورۃ الاعراف میں فرمایا گیا ہے: ﴿ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (آیت ۱۸۷) کہ وہ آسمان و زمین پر بہت بھاری ہے۔ چنانچہ قیامت کا ''بھاری پن'' کائنات کے لیے ناقابلِ برداشت ہوا جا رہا ہے اور اب اس کے ظہور سے متعلق اللہ کا وعدہ پورا ہونے کا وقت آیا ہی چاہتا ہے۔

آیت ۱۹ ﴿اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ﴾ ''یقیناً یہ ایک یاددہانی ہے۔''

﴿فَمَنْ شَاۗءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝۱۹﴾ ''تو جو کوئی بھی چاہے وہ اپنے رب کی طرف راستہ اختیار کر لے۔''

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو قرآن مجید کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق اور ہمت عطا فرمائے۔ آمین!

آیت ۲۰

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَاۗىِٕفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ۭ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۭ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ

فَضْلِ اللّٰهِ ۚ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۣ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۭ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ۭ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

یہ رکوع صرف ایک آیت پر مشتمل ہے۔ اس آیت کے زمانہ نزول کے بارے میں جو روایات ملتی ہیں ان میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ کوئی روایت بتاتی ہے کہ یہ آیت اس سورت کے پہلے حصے کے نزول کے آٹھ ماہ بعد نازل ہوئی اور اس سے قیام اللیل کا پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ کچھ روایات میں یہ مدت ایک سال اور کچھ میں ۱۶ ماہ بتائی گئی ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ آیت مدنی ہے اور پہلی آیات کے گیارہ سال بعد نازل ہوئی۔ اس آیت کو سمجھنے اور اس سے متعلق روایات میں پائے جانے والے غیر معمولی اختلاف کی وجہ جاننے کے لیے میں ایک عرصہ تک پریشان رہا۔ اس میں حیرت کی بات یہ ہے کہ اس حوالے سے کسی تفسیر سے بھی مجھے کوئی واضح راہنمائی نہ مل سکی۔ پھر کسی زمانے میں علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی کتاب ''الاتقان فی علوم القرآن'' کا مطالعہ کرتے ہوئے اتفاقاً مجھے اس بارے میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول مل گیا کہ یہ ایک نہیں دو آیات ہیں۔ چنانچہ اس قول کی روشنی میں اس نکتے پر میرا دل مطمئن ہو گیا کہ اس کلام کا نزول تو دو حصوں میں' دو الگ الگ مواقع پر ہوا' لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق اسے ایک آیت شمار کیا گیا۔

آیت ۲۰ ﴿اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ﴾ ''(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) یقیناً آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ قیام کرتے ہیں کبھی دو تہائی رات کے قریب' کبھی نصف رات اور کبھی ایک تہائی رات''

﴿وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ۭ﴾ ''اور جو لوگ آپؐ کے ساتھ ہیں ان میں سے بھی ایک جماعت آپؐ کے ساتھ (کھڑی) ہوتی ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ﴾ ''اور اللہ ہی رات اور دن کا اندازہ کرتا ہے۔''

رات دن کے اوقات بھی اللہ نے بنائے ہیں اور انسانوں کو بھی اُسی نے پیدا کیا ہے' اس لیے وہ اپنے بندوں کی استعداد سے خوب واقف ہے۔

﴿عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ﴾ ''اللہ جانتا ہے کہ تم اس کی پابندی نہیں کر سکو گے''

یعنی اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اس انداز سے یہ مشقت زیادہ عرصے تک نہیں جھیلی جا سکتی۔

﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ﴾ ''تو اُس نے تم پر مہربانی فرمائی ہے''

﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۭ﴾ ''تو اب قرآن سے جتنا بآسانی پڑھ سکتے ہو پڑھ لیا کرو۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے مذکورہ قول کی روشنی میں میرا خیال ہے کہ اس آیت کا یہ حصہ پہلی آیات کے گیارہ ماہ یا ایک سال بعد نازل ہوا۔ اس حکم کے ذریعے دو تہائی یا نصف یا ایک تہائی رات تک قیام کرنے کی پابندی ختم کر دی گئی اور یہ سہولت دے دی گئی کہ ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق قیام اللیل میں جتنا ممکن ہو اتنا قرآن پڑھ لیا کرے۔ البتہ آیت کا دوسرا (درج ذیل) حصہ

جس میں قتال کا ذکر ہے اس کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہجرت سے متصلاً قبل یا ہجرت کے متصلاً بعد نازل ہوا۔ چنانچہ گیارہ سال کے وقفے والی روایت اس حصے سے متعلق ہے۔

﴿عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ﴾ ''اللہ کے علم میں ہے کہ تم میں کچھ لوگ مریض ہوں گے''

﴿وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ﴾ ''اور بعض دوسرے زمین میں سفر کریں گے اللہ کے فضل کو تلاش کرتے ہوں گے''

﴿وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ﴾ ''اور کچھ اللہ کی راہ میں قتال کر رہے ہوں گے''

اب ظاہر ہے ایسے لوگوں کے لیے رات کو طویل قیام کرنا ممکن نہیں۔

﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ﴾ ''چنانچہ جس قدر تمہارے لیے آسان ہو اس میں سے پڑھ لیا کرو''

﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ ''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو''

اب اس حکم میں نماز پنجگانہ کی تاکید ہے اور نماز پنجگانہ ظاہر ہے ۱۰ نبوی میں معراج کے موقع پر فرض ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے بھی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے کہ آیت کا یہ حصہ ۱۰ نبوی کے بعد ہجرت سے پہلے یا ہجرت کے فوراً بعد نازل ہوا۔ اس حکم میں پانچ نمازوں کو قیام اللیل کا بدل قرار دے دیا گیا' البتہ رمضان میں قیام اللیل کا معاملہ اس سے مستثنیٰ رہا۔ رمضان چونکہ نزولِ قرآن کا مہینہ ہے — ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ (البقرۃ:۱۸۵) ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا'' — چنانچہ قرآن سے تعلق کی تجدید کے لیے اس مہینے میں قیام اللیل کی خصوصی ترغیب دی گئی ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے رمضان کی آمد پر حضور ﷺ کا ایک خطبہ نقل کیا ہے' جس میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ((جَعَلَ اللّٰهُ صِيَامَهٗ فَرِيْضَةً وَقِيَامَ لَيْلِهٖ تَطَوُّعًا))[۲] ''اس مہینے کے روزے اللہ تعالیٰ نے فرض کیے ہیں اور اس کی راتوں میں بارگاہِ خداوندی میں کھڑا ہونے (یعنی نمازِ تراویح پڑھنے) کو نفل عبادت مقرر کیا ہے (جس کا بہت بڑا ثواب رکھا ہے)''۔ یعنی رمضان کے روزے تو اہلِ ایمان پر فرض کر دیے گئے کہ اہلِ ثروت' نادار' مزدور' کسان وغیرہ سبھی روزہ رکھیں اور بھوک پیاس کی سختیاں برداشت کرنے کے عادی بن کر خود کو جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تیار رکھیں۔ جبکہ رمضان کی راتوں کے قیام کے لیے اختیار دے دیا گیا کہ جو کوئی اس کا اہتمام کر سکتا ہو وہ ضرور اس کی برکتوں سے مستفیض ہو۔ بعد میں خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اسے اجتماعی شکل دے دی گئی۔ چنانچہ اجتماعی قیام اللیل کا وہ سلسلہ جس کا اہتمام ہمارے ہاں باجماعت تراویح کی صورت میں ہوتا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وساطت سے اُمت تک پہنچا ہے۔ یہ دراصل قیام اللیل کا ''عوامی'' پروگرام ہے اور اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ قیام اللیل کی برکتوں سے کوئی شخص بھی محروم نہ رہنے پائے۔ قرونِ اولیٰ کے مخصوص ماحول اور حالات میں اس باجماعت قیام اللیل کی افادیت بہت زیادہ تھی۔ قرآن مجید کی زبان چونکہ ان لوگوں کی اپنی زبان تھی اس لیے امام کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کے مصداق تمام سامعین کے دلوں میں اترتا چلا جاتا تھا' لیکن آج ہمارے ہاں کی تراویح کے اکثر و بیشتر مقتدی تو ''زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم'' کی تصویر بنے سارا وقت رکعتوں کے حساب میں مشغول رہتے ہیں (الا ماشاء اللہ)۔ چنانچہ اس عظیم الشان فورم پر بھی اب قرآن کا سننا

۲۔ رواہ البیھقی فی شعب الایمان۔ مشکاۃ المصابیح' کتاب الصوم' الفصل الثالث۔

بس سننے کی حد تک ہی ہے اور تفہیم وتذکیر کے حوالے سے اس استماع کی افادیت نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔

﴿وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ﴾ ''اور اللہ کو قرضِ حسنہ دو۔'' ☆

﴿وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ؕ﴾ ''اور جو بھلائی بھی تم آگے بھیجو گے اپنی جانوں کے لیے' اسے موجود پاؤ گے اللہ کے پاس بہتر اور اجر میں بڑھ کر۔''

جو نیک اعمال تم نے آگے بھیجے ہوں گے انہیں اللہ تعالیٰ کے پاس تم بہت ہی بہتر حالت میں پاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے ان اعمال کو نہ صرف سات سو گنا تک بڑھا کر تمہیں لوٹائے گا بلکہ اپنے فضلِ خاص سے اس کے بدلے خصوصی اجر بھی تمہیں عطا فرمائے گا۔

﴿وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ﴾ ''اور اللہ سے مغفرت طلب کرتے رہو۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۰﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا' رحمت فرمانے والا ہے۔''

☆ جو انفاق خالص اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے کیا جاتا ہے' اُسے اللہ اپنے ذمے ''قرضِ حسنہ'' سے تعبیر کرتا ہے۔

سُوْرَةُ الْمُدَّثِّرِ

تمہیدی کلمات

سورۃ المدثر اور سورۃ المزمل کی باہمی مشابہت و مناسبت ان دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات کے الفاظ ﴿یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ قُمِ﴾ اور ﴿یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾ قُمْ﴾ سے واضح ہے۔ ان دونوں آیات میں حضور ﷺ کو چادر/کمبل یا لحاف چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس حوالے سے سورۃ المزمل میں قیام اللیل کے اہتمام کی ترغیب ہے تو اس سورت میں قیام النہار (عملی محنت اور مشقت) کی تیاری کا حکم ہے۔ حضور ﷺ اگرچہ پہلے سے ہی معراجِ انسانیت کے درجے پر فائز تھے اور اس حوالے سے آپ کو ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِیْمٍ ﴿۴﴾﴾ (ن) کی سند بھی عطا ہو چکی تھی، لیکن قیام اللیل کی ریاضت کا مقصد یہ تھا کہ رات کی تنہائیوں میں ترتیلِ قرآن کی مشق سے قرآن مجید آپ ﷺ کے پورے وجود میں سرایت کر جائے اور رسالت کی بھاری ذمہ داری اٹھانے کے لیے آپ کی روحانی طاقت میں مزید اضافہ ہو جائے۔ علامہ اقبال نے اپنے اس مصرعے میں قرآن کی تاثیر کے اسی پہلو کا ذکر کیا ہے:

''چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود'' کہ قرآن مجید جس انسان کی روح میں سرایت کر جاتا ہے اُس کی پوری شخصیت ہی بدل جاتی ہے۔

سورۃ المدثر کی پہلی سات آیات کے بارے میں اگرچہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے منقول ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ حضور ﷺ پر نازل ہونے والی پہلی وحی تھی، لیکن تمام اہلِ علم کی متفقہ رائے بہرحال یہی ہے کہ پہلی وحی سورۃ العلق کی پہلی پانچ آیات پر مشتمل تھی۔ (پہلی وحی سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات، دوسری وحی سورۂ ن کی ابتدائی سات آیات اور تیسری وحی سورۃ المزمل کی ابتدائی دس آیات پر مشتمل تھی۔) اس مغالطے اور اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ فترتِ وحی کے بعد وحی کا دوبارہ آغاز سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات سے ہوا تھا۔ دراصل تیسری وحی کے بعد کئی ماہ تک نزولِ وحی کا سلسلہ بند رہا۔ اس وقفے کو سیرت نگاروں نے ''فترتِ وحی'' کا نام دیا ہے۔ اس دوران اللہ تعالیٰ نے حضرت اسرافیل علیہ السلام کے ذریعے حضور ﷺ کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور خصوصی علوم کے بیش بہا خزانے آپ کو عطا فرمائے۔ نزولِ وحی میں مذکورہ وقفے کی وجہ سے آپ ﷺ اکثر رنجیدہ اور پریشان رہتے تھے۔ اسی کیفیت میں ایک دن آپ ﷺ کو حضرت جبرائیل علیہ السلام اپنی اصلی مَلَکی شکل میں نظر آئے۔ اس واقعے کی تفصیل جو احادیث سے ملتی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دن آپ غارِ حرا سے نیچے اتر رہے تھے تو آپ کو ایک آواز سنائی دی: ''یا محمد'' (ﷺ)! آپ نے اِدھر اُدھر دیکھا تو آپ کو کہیں کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ آپ چند قدم آگے گئے تو پھر آواز آئی: ''یا محمد'' (ﷺ)! اس مرتبہ بھی جب پکارنے والا نظر نہ آیا تو آپ کو بجا طور پر گھبراہٹ اور تشویش ہوئی۔ اسی کیفیت میں جب آپ ﷺ مزید آگے بڑھے تو تھوڑی دیر بعد وہی آواز تیسری مرتبہ سنائی دی۔ اس پر جب آپ ﷺ کی نگاہ اٹھی تو سامنے اُفق پر آپ کو حضرت جبرائیل علیہ السلام اپنی اصلی مَلَکی شکل میں اس طرح نظر آئے کہ پورا اُفق ان کی موجودگی کی وجہ سے بھرا ہوا تھا۔ اس منظر کو دیکھنے کے بعد آپ گھبرا گئے اور آپ پر کپکپی

طاری ہوگئی۔ بالکل اسی کیفیت کا سامنا آپ ﷺ کو پہلی وحی کے وقت بھی کرنا پڑا تھا۔ گھر پہنچنے پر آپ کمبل یا لحاف اوڑھ کر لیٹ گئے تو اسی حالت میں آپ پر سورۃ المدثر کی پہلی سات آیات نازل ہوئیں۔ چونکہ یہ ''فترت'' کے بعد پہلی وحی تھی اس لیے بعض روایات میں اس کا ذکر پہلی وحی کے طور پر بھی آیا ہے۔ بہرحال اس وحی کی ایک خصوصی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس سے حضور ﷺ کی ''رسالت'' کا آغاز ہوا جبکہ سورۃ العلق کی پہلی پانچ آیات کے نزول کے ساتھ آپ کی ''نبوت'' کا ظہور ہوا تھا۔ اس حوالے سے یہ نکتہ بھی واضح رہے کہ نبی پیدائشی طور پر نبی ہوتا ہے البتہ نبی کی نبوت کا ظہور پہلی وحی کے نزول کے وقت ہوتا ہے۔

ان دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات (یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ اور یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ) کے مفہوم کا ایک پہلو اور بھی ہے جسے سمجھنے کے لیے حضور ﷺ کی قبل از بعثت زندگی کے شب و روز کا مطالعہ ضروری ہے۔ آپ ﷺ کی زندگی کے اُس دور کا نقشہ ذہن میں لائیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کا بچپن اور لڑکپن عُسرت اور مشقت میں گزرا۔ باقاعدہ طور پر عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد آپ نے دوسروں کے سرمائے سے تجارت شروع کی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کے بعد جب آپ ﷺ کو مالی اعتبار سے فراغت ملی تو آپ نے بھرپور انداز میں تجارت کی۔ سائیکالوجی کی اصطلاح میں بات کریں تو ابتدائی زندگی کے دور میں آپ ﷺ کسی حد تک بیروں بین (extrovert) شخصیت کے حامل تھے۔ لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت کے مطابق لگ بھگ چالیس سال کی عمر میں آپ خلوت گزینی کو پسند فرمانے لگے تھے۔ یعنی اس عمر میں آپ ﷺ کی طبیعت رفتہ رفتہ غور و فکر اور سوچ بچار یعنی دروں بین (introvert) ہونے کی طرف مائل ہوتی چلی گئی۔ غارِ حرا میں آپ ﷺ کا آنا جانا بھی اسی دور میں شروع ہوا۔ یوں سائیکالوجی کی ان دو اصطلاحات کے حوالے سے آپ کی شخصیت میں توازن کا رنگ پیدا ہوگیا۔ اس حوالے سے میری رائے یہ ہے کہ پوری نسلِ انسانی میں صرف ایک ہی شخصیت ایسی ہے جو بیروں بینی اور دروں بینی کے رجحانات میں کلیتاً متوازن ہے اور وہ ہے محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت!

اب سوال یہ ہے کہ غارِ حرا میں جا کر آپ ﷺ کیا کرتے تھے؟ اس سوال کا جواب بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ روایت میں موجود ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ غارِ حرا میں آپ عبادت کیا کرتے تھے (حضرت عائشہؓ نے ''تحنّث'' کا لفظ استعمال کیا ہے جس کی تشریح امام زہریؒ نے ''تعبّد'' سے کی ہے۔) اس حوالے سے شارحینِ حدیث نے آپ ﷺ کے تحنّث یا تعبّد کی کیفیت یہ بیان کی ہے کہ غارِ حرا کی خلوت میں بیٹھ کر آپ اپنا وقت غور و فکر اور سوچ بچار (التفکّر والاعتبار) میں گزارتے تھے۔ ان ہی حالات میں جب آپ پر وحی نازل ہوئی تو ذمہ داری کے شدید احساس کی وجہ سے آپ ﷺ کی سوچ بچار اور تشویش میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو ان دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات میں آپ ﷺ کی چادر یا کمبل اوڑھنے کی کیفیت کا تذکرہ گویا آپ ﷺ کی زندگی کے اس مخصوص دور کا تذکرہ ہے جس دور میں آپ ہر وقت فکر و تدبر کی چادر میں لپٹے رہتے تھے۔ اس حوالے سے ان دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات ﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝۱ قُمِ ... اور یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمْ﴾ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے نبی (ﷺ)! آپ کے سوچ بچار کا دور اب ختم ہوا چاہتا ہے اب آپ اٹھئے اور عملی جدّوجُہد کا آغاز کیجیے۔

مضمون کے اعتبار سے یہ سورت تین حصوں پر مشتمل ہے۔ اس لحاظ سے سورۃ العلق کے ساتھ اس کی خاص مناسبت اور مشابہت ہے۔

آیات ۱ تا ۷

سُوْرَةُ الْمُدَّثِّرِ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۵۶ رُكُوْعَاتُهَا: ۲

يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾ قُمْ فَاَنْذِرْ ۖ﴿۲﴾ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ۖ﴿۳﴾ وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۖ﴿۴﴾ وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۖ﴿۵﴾ وَ لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۖ﴿۶﴾ وَ لِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۖ﴿۷﴾

آیت ۱ ﴿يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾﴾ ''اے کمبل میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ)!''

آیت ۲ ﴿قُمْ فَاَنْذِرْ ۖ﴿۲﴾﴾ ''آپ اٹھئے اور (لوگوں کو) خبردار کیجیے۔''

یہ ہے وہ کٹھن ذمہ داری جس کے بارے میں سورۃ المزمل کی آیت ﴿اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝۵﴾ میں حضور ﷺ کو بہت پہلے اشارہ دے دیا گیا تھا' یعنی انذارِ آخرت کی ذمہ داری' جس کے لیے تمہیدی کلمات میں قیام اللیل کے مقابلے میں ''قیام النہار'' کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ دراصل انبیاء و رسل علیہم السلام کی دعوت کے حوالے سے جو اصطلاح قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آئی ہے وہ ''انذار'' ہی ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ کو بھی بار بار حکم دیا گیا کہ آپؐ قرآن کے ذریعے سے لوگوں کو خبردار کریں: ﴿وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ﴾ (الانعام:۱۹) اے نبی (ﷺ!) آپ ان لوگوں کو بتائیں کہ قرآن مجھ پر نازل ہی اس لیے ہوا ہے کہ میں اس کے ذریعے سے تم لوگوں کو خبردار کردوں۔ تم اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ ترین مخلوق ہو' تمہارے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنی روح پھونکی ہے۔ یہ روح اللہ تعالیٰ کی وہ عظیم امانت ہے جس کی ذمہ داری کے بوجھ سے زمین' پہاڑ اور آسمان تک ڈر گئے تھے۔ اسی امانت کے حوالے سے تمہارا احتساب ہونا ہے۔ اس احتساب کے لیے مرنے کے بعد تمہیں پھر سے زندہ کیا جائے گا:

((وَاللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ ، ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُوْنَ ، ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ، ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَبِالسُّوْءِ سُوْءًا ، وَاِنَّهَا لَجَنَّةٌ لَبَدًا لِمَنْ اَبَدًا وَلَنَارٌ اَبَدًا))[1]

''اللہ کی قسم' تم سب مر جاؤ گے جیسے (روزانہ) سو جاتے ہو! پھر یقیناً تم اٹھائے جاؤ گے جیسے (ہر صبح) بیدار ہو جاتے ہو۔ پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہوگا' اور پھر لازماً تمہیں بدلہ ملے گا اچھائی کا اچھائی اور برائی کا برائی' اور وہ جنت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے دائمی!''

بہرحال آیت زیر مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کی دعوت کا نقطۂ آغاز ''انذارِ آخرت'' ہے۔ اب اگلی آیت میں اس دعوت کے ہدف کے بارے میں بتایا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے حضور ﷺ کی دعوت کا ہدف نہ تو خانقاہی نظام کی تشکیل ہے اور نہ ہی صرف تعلیم و تعلم کے نظام کا قیام ہے' بلکہ اس کا ہدف یہ ہے:

آیت ۳ ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۖ﴿۳﴾﴾ ''اور اپنے رب کو بڑا کرو!''

غور کیجیے! رب کو بڑا کرنے کا کیا مطلب ہے؟ وہ تو اپنی ذات میں خود ہی سب سے بڑا ہے۔ ہم انسان اس کو بھلا کیا بڑا کریں گے؟ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ اس زمین میں اللہ تعالیٰ کی بڑائی عملاً تسلیم نہیں کی جا رہی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو محدود اختیار عطا

۱۔ بحوالہ جمهرة الخطب' ص ۵۔ وفقه السيرة للالبانی' ص ۹۷۔

فرمایا تھا اس کے بل پر اس نے اُسی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دنیا میں ہر جگہ ظلم اور فساد کا بازار گرم ہو گیا ہے: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ﴾ (الروم: ۴۱) ''بحر و بر میں فساد رونما ہو چکا ہے لوگوں کے اعمال کے سبب''۔ چنانچہ اب جو کوئی بھی اللہ کو اپنا الٰہ اور اپنا رب مانتا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پارٹی (حزب اللہ) کا ممبر اور اس کی فوج کا سپاہی بن کر لوگوں سے اُس کی بڑائی کو منوانے اور اُس کی کبریائی کو عملی طور پر دنیا میں نافذ کرنے کی جدّ و جہد میں اپنا تن من اور دھن کھپا دے تاکہ اللہ کی بات سب سے اونچی ہو: ﴿وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ﴾ (الانفال: ۳۹) ''اور دین کُل کا کُل اللہ کے لیے ہو جائے''۔ یہ ہے ''تکبیرِ ربّ'' یا ربّ کو بڑا کرنے کے مفہوم کا خلاصہ۔ گویا ان دو لفظوں میں حضور ﷺ کی بعثت کا مقصد اور آپؐ کے مشن کا پورا فلسفہ بیان کر دیا گیا ہے۔ اس حوالے سے ''تکبیرِ ربّ'' کی اصطلاح کی حیثیت ایک ایسی گٹھلی کی ہے جس میں سے اقامتِ دین' غلبۂ دین' اظہارِ دینِ حق' حکومتِ الٰہیہ وغیرہ اصطلاحات کی کونپلیں پھوٹی ہیں۔

سورت کی ان ابتدائی تین آیات میں حضور ﷺ کی زندگی کے اُس دور کی جھلک بھی نظر آتی ہے جب آپؐ پر تفکر و تدبر بلکہ تشویش اور فکر مندی کا غلبہ تھا۔ غارِ حرا کے اندر پہلی وحی کا نزول آپؐ کے لیے بالکل ایک نیا تجربہ تھا جس پر آپؐ بجا طور پر فکر مند تھے۔ پھر ورقہ بن نوفل نے آپ ﷺ کے آئندہ حالات کے بارے میں جن خدشات کا اظہار کیا تھا اس کی وجہ سے آپؐ کی تشویش میں مزید اضافہ ہوا۔ ورقہ بن نوفل حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچا زاد بھائی تھے۔ پہلی وحی کے واقعہ کے بعد حضرت خدیجہؓ حضور ﷺ کو خصوصی طور پر ان کے پاس لے کر گئیں۔ وہ صاحبِ بصیرت عیسائی راہب تھے۔ انہوں نے آپؐ سے غارِ حرا میں پیش آنے والے واقعہ کی تفصیل سننے کے بعد کہا کہ آپؐ کے پاس وہی ناموس آیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ انہوں نے مزید کہا کہ کاش میں اُس وقت تک زندہ رہوں جب آپؐ کی قوم آپؐ کو اس شہر سے نکال دے گی۔ حضور ﷺ نے ورقہ بن نوفل کی اس بات پر پریشانی اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ کیا میری قوم مجھے یہاں سے نکال دے گی؟ آپ ﷺ کا مطلب تھا کہ وہ سب لوگ تو مجھ سے بے حد محبت کرتے ہیں' مجھے صادق اور امین مانتے ہیں' اور میرے قدموں میں اپنی نگاہیں بچھاتے ہیں' بھلا وہ مجھے کیوں شہر بدر کریں گے؟ اس پر ورقہ بن نوفل نے جواب دیا کہ اللہ کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کی یہ ذمہ داری جس کسی کو بھی ملی اُس کی قوم اُس کی دشمن بن گئی' ہمیشہ سے ایسے ہی ہوتا آیا ہے اور اب بھی ایسا ہی ہوگا۔ حضور ﷺ سے اس ملاقات کے بعد جلد ہی ورقہ بن نوفل کا انتقال ہو گیا۔

اس واقعہ سے حضور ﷺ کی نبوت اور رسالت کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ ورقہ بن نوفل نے حضور ﷺ کی نبوت کی تصدیق تو کر دی تھی لیکن اُس وقت تک حضور ﷺ کو اپنی دعوت کی تبلیغ کا حکم نہیں ملا تھا۔ یعنی اُس وقت تک صرف آپؐ کی نبوت کا ظہور ہوا تھا' رسالت کی ذمہ داری ابھی آپؐ کو نہیں ملی تھی۔ اسی لیے حضور ﷺ نے انہیں ایمان کی دعوت بھی نہیں دی اور اسی لیے ورقہ بن نوفل کا شمار صحابہ میں بھی نہیں ہوتا۔

آیت ۴ ﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝۴﴾ ''اور اپنے کپڑوں کو صاف رکھنے کا اہتمام کیجیے۔''

جس طرح آپؐ کی زندگی کا مقصد پاکیزہ ہے اسی طرح آپؐ کا لباس بھی پاک اور صاف ہونا چاہیے۔ اس آیت کی صوفیانہ انداز میں ایک تعبیر یہ بھی کی گئی ہے کہ ''ثیاب'' سے صرف کپڑے ہی نہیں بلکہ اخلاق و کردار بھی مراد ہے۔ گویا اس حکم میں ظاہری طہارت

کے ساتھ ساتھ باطنی طہارت بھی شامل ہے۔

آیت ۵ ﴿وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝۵﴾ ''اور ہر قسم کی گندگی سے دور رہیے۔''

یعنی ظاہری اور باطنی نجاستوں سے خود کو بچا کر رکھئے۔ ظاہر ہے باطنی گندگیوں میں سب سے بڑی گندگی شرک ہے۔ (اسی لیے بعض مترجمین نے الرُّجْزَ کا ترجمہ ''بتوں کی گندگی'' کیا ہے۔)

آیت ۶ ﴿وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝۶﴾ ''اور زیادہ لینے کے لیے کسی پر احسان نہ کیجیے۔''

اس آیت کا عام اور معروف مفہوم تو یہی ہے کہ کسی پر احسان کرتے ہوئے بدلے کی توقع نہ رکھو' بلکہ احسان برائے احسان کرو۔ لیکن مجھے ذاتی طور پر اس آیت کا وہ ترجمہ پسند ہے جو مولانا اصلاحی صاحب نے کیا ہے: ''اور اپنی سعی کو زیادہ خیال کر کے منقطع نہ کر!'' مَنَّ یَمُنُّ مَنًّا کے معانی احسان کرنا اور احسان جتلانا کے علاوہ توڑنے اور کاٹنے کے بھی ہیں۔ اصلاحی صاحب نے اپنے ترجمے میں اسی معنی کو اپنایا ہے۔ چنانچہ اس معنی میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے نبی ﷺ! آپ اپنے فرضِ منصبی سے متعلق جدوجہد کو منقطع نہ کرنا' یقیناً آپ کی اس دعوت کے بڑے بڑے نتائج نکلیں گے۔ کچھ عرصے تک آپ کو انتظار تو ضرور کرنا پڑے گا لیکن بالآخر آپ کی تحریک کامیاب ہوگی اور آپ کو ڈھیروں کامیابیاں ملیں گی۔

آیت ۷ ﴿وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝۷﴾ ''اور اپنے رب کے لیے صبر کرو۔''

یہ اس آیت کا وہ ترجمہ ہے جو عام طور پر کیا جاتا ہے۔ لیکن میں قبل ازیں متعدد بار یہ وضاحت کر چکا ہوں کہ صبر کے ساتھ جب ''ل'' آتا ہے تو اس کے معنی میں انتظار کا مفہوم آجاتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ آپ اپنے رب کے حکم کا انتظار کیجیے اور جو بھی حکم آئے اس پر عمل کیجیے۔ سورت کا پہلا حصہ ان ابتدائی سات آیات پر مشتمل ہے اور اس حصے میں حضور ﷺ سے خطاب تھا۔ اب اگلی آیت سے اس سورت کے دوسرے حصے کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ حصہ تین مختصر آیات پر مشتمل ہے اور ان آیات میں قیامت کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔

آیات ۸ تا ۱۰

فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ ۝۸ فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ۝۹ عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ ۝۱۰

آیت ۸ ﴿فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ ۝۸﴾ ''جب صور میں پھونکا جائے گا۔''

آیت ۹ ﴿فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ۝۹﴾ ''تو وہ دن بہت سخت دن ہوگا۔''

آیت ۱۰ ﴿عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ ۝۱۰﴾ ''کافروں پر وہ ہلکا نہیں ہوگا۔''

اس کے مقابل سورۃ المزمل میں قیامت کے دن کا ذکر اس طرح آیا تھا: ﴿فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا ۝۱۷ السَّمَاءُ مُنْفَطِرٌ بِهِ ۚ كَانَ وَعْدُهُ مَفْعُولًا ۝۱۸﴾ ''اب اگر تم بھی کفر کرو گے تو تم کیسے بچ جاؤ گے اُس دن جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا۔ آسمان اس کے ساتھ پھٹ پڑنے کو ہے۔ اس کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔''

اس کے بعد سورت کے تیسرے حصے کا آغاز ہو رہا ہے۔ ان آیات کا لہجہ اور انداز بہت سخت ہے۔

آیات ۱۱ تا ۳۱

ذَرْنِیْ وَ مَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا ﴿۱۱﴾ وَّ جَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ﴿۱۲﴾ وَّ بَنِیْنَ شُهُوْدًا ﴿۱۳﴾ وَّ مَهَّدْتُّ لَهٗ
تَمْهِیْدًا ﴿۱۴﴾ ثُمَّ یَطْمَعُ اَنْ اَزِیْدَ ﴿۱۵﴾ كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیْدًا ﴿۱۶﴾ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ﴿۱۷﴾ اِنَّهٗ
فَكَّرَ وَ قَدَّرَ ﴿۱۸﴾ فَقُتِلَ كَیْفَ قَدَّرَ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ قُتِلَ كَیْفَ قَدَّرَ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ نَظَرَ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَ
بَسَرَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ یُّؤْثَرُ ﴿۲۴﴾ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا قَوْلُ
الْبَشَرِ ﴿۲۵﴾ سَاُصْلِیْهِ سَقَرَ ﴿۲۶﴾ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ﴿۲۷﴾ لَا تُبْقِیْ وَ لَا تَذَرُ ﴿۲۸﴾ لَوَّاحَةٌ
لِّلْبَشَرِ ﴿۲۹﴾ عَلَیْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿۳۰﴾ وَ مَا جَعَلْنَاۤ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۙ وَّ مَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا
فِتْنَةً لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۙ لِیَسْتَیْقِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ یَزْدَادَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِیْمَانًا وَّ لَا
یَرْتَابَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَ لِیَقُوْلَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ
مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ؕ كَذٰلِكَ یُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ مَا
یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ؕ وَ مَا هِیَ اِلَّا ذِكْرٰی لِلْبَشَرِ ﴿۳۱﴾ ع ۱۵

آیت ۱۱ ﴿ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا ﴿۱۱﴾﴾ ''آپ چھوڑ دیجیے مجھے اور جس کو میں نے اکیلا پیدا کیا۔''

ذَرْنِیْ کا یہ انداز ہم قبل ازیں سورۂ نٓ اور سورۃ المزمل میں بھی پڑھ چکے ہیں۔ خَلَقْتُ وَحِیْدًا کا مفہوم یہ ہے کہ جب میں نے اُسے پیدا کیا تھا اُس وقت یہ تنہا تھا' کوئی مال' اولاد یا جائیداد وغیرہ لے کر پیدا نہیں ہوا تھا۔ ان آیات کے بارے میں مفسرین کا اجماع ہے کہ یہ ولید بن مغیرہ کے حق میں نازل ہوئی ہیں۔ اس شخص کی مکہ اور طائف دونوں شہروں میں بڑی بڑی جائیدادیں تھیں۔ اللہ نے اسے بہت سے بیٹوں سے بھی نواز رکھا تھا۔

آیت ۱۲ ﴿وَّ جَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ﴿۱۲﴾﴾ ''اور اُسے میں نے بہت سا مال دیا پھیلا ہوا۔''

ان الفاظ میں اشارہ ہے اس شخص کی ان جائیدادوں کی طرف جو زمینوں' باغوں' گھروں وغیرہ کی صورت میں مکہ اور طائف دونوں شہروں میں پھیلی ہوئی تھیں۔

آیت ۱۳ ﴿وَّ بَنِیْنَ شُهُوْدًا ﴿۱۳﴾﴾ ''اور نگاہوں کے سامنے رہنے والے بیٹے دیے۔''

کسی کے بیٹوں کا گھر میں حاضر و موجود رہنا بھی اُس کی تونگری اور خوشحالی کی علامت ہے۔ ورنہ فکرِ معاش جوان بیٹوں کو گھر میں چین سے کہاں بیٹھنے دیتی ہے۔ آج ''حاضر باش'' بیٹوں جیسی نعمت کی قدر پوچھنی ہو تو ان والدین سے پوچھیں جن کے نوجوان بیٹے روزی کی تلاش میں امریکہ اور یورپ میں دھکے کھا رہے ہیں اور وہ محض انہیں ایک نظر دیکھنے کی امید پر جی رہے ہیں۔

آیت ۱۴ ﴿وَّ مَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِیْدًا ﴿۱۴﴾﴾ ''اور میں نے اُس کے لیے ہر قسم کا سامان خوب اچھی طرح سے تیار کر دیا۔''

آیت ۱۵ ﴿ثُمَّ یَطْمَعُ اَنْ اَزِیْدَ ﴿۱۵﴾﴾ ''پھر وہ چاہتا ہے کہ میں اُسے اور بھی دوں!''

آیت ۱۵ ﴿كَلَّا ۭ﴾ ''ہرگز نہیں!''

﴿اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ۝۱۶﴾ ''وہ تو ہماری آیات کا مخالف (اور دشمن بن گیا) ہے۔''

آیت ۱۶ ﴿سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ۝۱۷﴾ ''میں اسے عنقریب ایک سخت چڑھائی چڑھواؤں گا۔''

اس سے مراد ایسا عذاب ہے جس کی شدت ہر آن بڑھتی چلی جائے گی۔ اسی نوعیت کے عذاب کا ذکر سورۃ الجن میں بھی آ چکا ہے: ﴿يَّسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ۝۱۷﴾ ''تو وہ ڈال دے گا اس کو چڑھتے عذاب میں۔''

ولید بن مغیرہ بنیادی طور پر بہت ذہین اور سمجھ دار شخص تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ قرآن اللہ ہی کا کلام ہے اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں' لیکن اپنے ضمیر کی اس آواز پر لبیک کہہ کر وہ اپنی چودھراہٹ اور دُنیوی ٹھاٹھ باٹھ کی قربانی نہیں دے سکتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ واقعتاً بہت مشکل میں تھا۔ اپنی اس مشکل کا حل اسے کسی درمیانی راہ میں نظر آتا تھا۔ چنانچہ قریش میں سب سے بڑھ کر اس شخص نے حضور ﷺ پر سمجھوتے (compromise) کے لیے دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے لیے اس نے حضور ﷺ کو ہمدردانہ انداز میں بھی سمجھایا' پُرکشش پیشکش کا حربہ بھی آزمایا اور برادری کے معاملات کا واسطہ بھی دیا کہ قریش اگر آپس میں تقسیم ہو جائیں گے تو ان کی بنی بنائی ساکھ ختم ہو کر رہ جائے گی۔ غرض اس نے ہر طرح سے کوشش کی کہ حضور ﷺ کچھ اپنی بات منوالیں' کچھ قریش کی مان لیں اور اس طرح فریقین کے اختلافات کو مذاکرات کے ذریعے ختم کر دیا جائے۔

آئندہ آیات میں ایک خاص واقعہ کے حوالے سے اس شخص کی ایک خاص کیفیت کی تصویر دکھائی گئی ہے۔ تفاسیر میں اس واقعہ کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے کہ ایک محفل میں قریش کے بڑے بڑے سردار جمع تھے۔ زیر بحث موضوع یہ تھا کہ محمد (ﷺ) کے بارے میں ہمیں ایک متفقہ موقف اپنانا چاہیے۔ جب ہم میں سے کوئی اسے شاعر سمجھتا ہے' کوئی جادوگر کہتا ہے' کوئی کاہن قرار دیتا ہے تو اس سے خود ہمارا موقف کمزور ہو جاتا ہے کہ ہم خود کسی بات پر متفق نہیں۔ بحث مباحثے کے بعد انہوں نے ولید بن مغیرہ کو حضور ﷺ کے پاس بھیجا کہ وہ جائے اور آپ ﷺ سے تفصیلی بات چیت کر کے انہیں اپنی حتمی رائے سے آگاہ کرے۔ جب وہ حضور ﷺ سے ملاقات کر کے واپس آیا تو انہوں نے اس کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا پایا۔ دراصل حضور ﷺ سے گفتگو کرنے کے بعد وہ پوری طرح قائل ہو چکا تھا کہ آپ ﷺ واقعی اللہ کے رسول ہیں اور جو کلام آپ ﷺ پیش کر رہے ہیں وہ بلاشبہ اللہ ہی کا کلام ہے۔ لیکن یہ بات سردارانِ قریش کے سامنے تسلیم کرنا اُسے کسی قیمت پر گوارا نہیں تھا۔ چنانچہ جب انہوں نے اس سے پوچھا کہ وہ کس نتیجے پر پہنچا ہے؟ کیا ہم محمد (ﷺ) کو محض ایک شاعر سمجھیں؟ تو اُس نے کہا: نہیں اُن (ﷺ) کا کلام شعر نہیں ہے۔ انہوں نے پوچھا تو کیا پھر ہم اُسے (ﷺ) کاہن کہہ سکتے ہیں؟ اس نے جواب دیا: نہیں' کاہنوں کے قول و کردار کو میں خوب جانتا ہوں۔ وہ ذومعنی باتیں کرتے ہیں جبکہ یہ (ﷺ) تو دوٹوک اور سیدھی بات کرتے ہیں۔ اس پر سردارانِ قریش نے کہا کہ لو جی! یہ تو گیا! اس پر بھی محمد (ﷺ) کا جادو چل گیا! اب اس نے اہلِ محفل کے جو تیور دیکھے تو فوراً پینترا بدل کر بولا کہ ہاں اس کے کلام کے بارے میں آپ لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جادو ہے' جو پچھلے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔

اب ظاہر ہے ولید بن مغیرہ جیسے معتبر اور مدبر شخص کا ایک بات پر پوری طرح سے قائل ہونے کے بعد زبان سے اس کی علی الاعلان نفی کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ چنانچہ اس موقع پر وہ اپنے ضمیر کی آواز کو دباتے ہوئے زبان سے جھوٹ کہتے ہوئے اور اس

دوران اپنی پریشانی اور خفت کو چھپاتے ہوئے جس کرب سے گزرا ہے' ان آیات میں اس کی اس پوری کیفیت کی تصویر کھینچ دی گئی ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کا یہ مقام فصاحت و بلاغت کی معراج اور لفظی منظر کشی کی بہترین مثال ہے۔

آیت ۱۸ ﴿اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۝۱۸﴾ ''اُس نے غور کیا اور کچھ اندازہ کیا۔''

اس نے سوچا کہ دل کی بات زبان پر لانے یعنی حق کو مان لینے سے کیا ہوگا اور نہ ماننے کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ پھر جب اسے اپنے دُنیوی مفادات خطرے میں پڑتے نظر آئے تو اس نے ضمیر کی آواز کو دبا لینے کا فیصلہ کر لیا۔

آیت ۱۹ ﴿فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝۱۹﴾ ''پس ہلاک ہو جائے' اُس نے کیسا غلط اندازہ ٹھہرایا۔''

اس کے اندازے کے مطابق تو حق کو مان لینے میں سراسر نقصان ہی نقصان تھا' لیکن اسے اس حقیقت کا تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس نے حق کو حق سمجھتے ہوئے ماننے سے انکار کر کے کتنے بڑے گھاٹے کا سودا کیا تھا۔

آیت ۲۰ ﴿ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝۲۰﴾ ''پھر ہلاک ہو جائے' اس نے کیسا غلط اندازہ ٹھہرایا۔''

آیت ۲۱ ﴿ثُمَّ نَظَرَ ۝۲۱﴾ ''پھر اُس نے دیکھا۔''

یعنی کچھ دیر توقف کیا اور ایسے ظاہر کیا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہے۔

آیت ۲۲ ﴿ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝۲۲﴾ ''پھر تیوری چڑھائی اور مُنہ بسورا۔''

آیت ۲۳ ﴿ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝۲۳﴾ ''پھر پیٹھ پھیری اور تکبر کیا۔''

آیت ۲۴ ﴿فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۝۲۴﴾ ''پھر اُس نے کہا کہ یہ تو بس جادو ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے۔''

آیت ۲۵ ﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝۲۵﴾ ''یہ نہیں ہے مگر انسان کا کلام۔''

یعنی اس کلام میں جادو کا سا اثر تو ہے' لیکن محمد (ﷺ) کا یہ دعویٰ کہ یہ اللہ کا کلام ہے اسے میں نہیں مانتا۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ یہ انسانی کلام ہی ہے ـــــ اب اگلی آیات کو پڑھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُس نے حق کو پہچانتے ہوئے جھٹلا کر اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دے دی۔

آیت ۲۶ ﴿سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ۝۲۶﴾ ''میں عنقریب اسے ڈالوں گا سقر (دوزخ) میں!''

آیت ۲۷ ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ۝۲۷﴾ ''اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ سقر کیا ہے؟''

آیت ۲۸ ﴿لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ۝۲۸﴾ ''وہ نہ تو باقی رہنے دے گی اور نہ چھوڑے گی!''

آیت ۲۹ ﴿لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ۝۲۹﴾ ''انسان کی کھال کو جھلسا ڈالنے والی۔''

نہ تو اس کا عذاب ختم ہوگا اور نہ ہی اس میں جلتے ہوئے انسان کو موت آئے گی۔

آیت ۳۰ ﴿عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ۝۳۰﴾ ''اس پر اُنیس (۱۹) داروغے مقرر ہیں۔''

آغازِ سورت سے یہاں تک پورا کلام ایک ہی اسلوب میں ہے' یعنی چھوٹی چھوٹی آیات اور تیز رد ھم۔ لیکن اب آگے ایک طویل آیت آ رہی ہے۔ ایسی ہی ایک طویل آیت ہم سورۃ المزمل میں بھی پڑھ آئے ہیں' بلکہ سورۃ المزمل کا دوسرا رکوع اسی ایک آیت پر

مشتمل ہے۔ جس طرح سورۃ المزمل کی مذکورہ آیت باقی سورت سے الگ بعد میں نازل ہوئی' اسی طرح اس سورت کی یہ ایک آیت بھی بعد میں نازل ہوئی تھی۔ اس آیت میں دراصل مشرکین کی ان استہزائیہ باتوں کا جواب دیا گیا ہے جو وہ جہنّم کے داروغوں کی تعداد کے بارے میں کرتے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ جہنّم کے داروغوں کی تعداد کے معاملے کو انہوں نے مذاق بنا لیا تھا اور وہ اپنی محفلوں میں اٹھتے بیٹھتے اس بارے میں طرح طرح کے فقرے کستے رہتے تھے۔ ایک محفل میں ابوجہل نے کہا تھا: بھائیو! تم نے سن لیا' اس نبی کے خدا کی فوج صرف انیس سپاہیوں پر مشتمل ہے۔ کیا تم اتنے گئے گزرے ہو کہ تم میں سے دس دس آدمی مل کر بھی ایک ایک سپاہی سے نمٹ نہ لیں گے؟ اس پر بنی جُمَح کا ایک زور آور پہلوان یوں گویا ہوا کہ ان میں سے سترہ کو تو میں اکیلا سنبھال لوں گا' باقی دو سے تم سب مل کر نمٹ لینا۔ غرض وہ لوگ طرح طرح کی باتیں کر کے اللہ کے کلام کا مذاق اڑاتے تھے۔ اب اس آیت میں ان کی ان باتوں کا جواب دیا جا رہا ہے:

آیت ۳۱ ﴿وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۙ﴾ ''اور ہم نے نہیں مقرر کیے جہنّم کے داروغے مگر فرشتے''

ان لوگوں کو فرشتوں کی طاقت کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ فرشتوں کی قوتوں کو انسانی قوتوں پر قیاس کرنا ان کی حماقت ہے۔

﴿وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ﴾ ''اور ہم نے نہیں ٹھہرائی ان کی یہ تعداد مگر کافروں کی آزمائش کے لیے''

﴿لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ ''تاکہ جنہیں کتاب دی گئی تھی انہیں یقین آ جائے''

جامع ترمذی کی ایک روایت کے مطابق جہنّم کے اُنیس داروغوں کا ذکر تورات میں بھی ہے۔ اب ظاہر ہے اہل کتاب کے لیے تو قرآن کے حق میں یہ بہت بڑی دلیل ہے۔

﴿وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا﴾ ''اور جو اہلِ ایمان ہیں وہ ایمان میں بڑھیں''

اہلِ ایمان کے لیے تو ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہر وحی ایمان میں اضافے کا باعث ہی بنتی ہے۔

﴿وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴾ ''اور نہ شک میں پڑیں اہل کتاب اور اہلِ ایمان''

﴿وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۭ﴾ ''اور تاکہ کہیں وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے اور کفّار بھی کہ بھلا اس سے اللہ کی کیا مراد ہے؟''

یعنی منافقین اور کفّار اپنے مَن پسند تبصرے کرتے رہیں کہ جہنّم کے فرشتوں کی تعداد بتانے سے اللہ تعالیٰ کا کیا مقصد ہے۔

﴿كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ﴾ ''اسی طرح اللہ گمراہ کر دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔''

﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۭ﴾ ''اور کوئی نہیں جانتا آپ کے رب کے لشکروں کو سوائے اُس کے۔''

﴿وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ۝۳۱﴾ ''اور یہ آیات صرف انسانوں کی یاددہانی کے لیے ہیں۔''

اس کے بعد سورت کے آخر تک تمام آیات کا اسلوب اور آہنگ وہی ہے جو شروع سورت سے چلا آ رہا ہے۔ یعنی چھوٹی چھوٹی آیات اور تیز ردھم۔

آیات ۳۲ تا ۵۶

كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿۳۲﴾ وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ﴿۳۳﴾ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ ﴿۳۴﴾ إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ ﴿۳۵﴾ نَذِيرًا
لِّلْبَشَرِ ﴿۳۶﴾ لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ ﴿۳۷﴾ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ﴿۳۸﴾ إِلَّا
أَصْحَابَ الْيَمِينِ ﴿۳۹﴾ فِي جَنَّاتٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿۴۰﴾ عَنِ الْمُجْرِمِينَ ﴿۴۱﴾ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ﴿۴۲﴾ قَالُوا
لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ﴿۴۳﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ﴿۴۴﴾ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ﴿۴۵﴾
وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿۴۶﴾ حَتَّىٰ أَتَانَا الْيَقِينُ ﴿۴۷﴾ فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ﴿۴۸﴾
فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ﴿۴۹﴾ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ ﴿۵۰﴾ فَرَّتْ مِن قَسْوَرَةٍ ﴿۵۱﴾ بَلْ
يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَن يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿۵۲﴾ كَلَّا ۖ بَل لَّا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ﴿۵۳﴾ كَلَّا
إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ ﴿۵۴﴾ فَمَن شَاءَ ذَكَرَهُ ﴿۵۵﴾ وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ ۚ هُوَ أَهْلُ التَّقْوَىٰ
وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿۵۶﴾ ع

آیت ۳۲ ﴿كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿۳۲﴾﴾ ''کیوں نہیں' قسم ہے چاند کی۔''

آیت ۳۳ ﴿وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ﴿۳۳﴾﴾ ''اور قسم ہے رات کی جب کہ وہ پیٹھ موڑے۔''

یعنی جب رات رخصت ہو رہی ہو۔

آیت ۳۴ ﴿وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ ﴿۳۴﴾﴾ ''اور قسم ہے صبح کی جبکہ وہ روشن ہو جائے۔''

یہاں چاند کی قسم اور پھر رخصت ہوتی ہوئی رات اور روشن صبح کے ذکر کے پردے میں بہت اہم مضمون بیان ہوا ہے۔ رات کی قسم میں فترتِ وحی کے طویل دور کی طرف اشارہ ہے' یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد نبوتِ محمدیؐ کے ظہور تک چھ سو برس پر محیط وہ عرصہ جس میں وحی کا سلسلہ منقطع رہا۔ اس دوران دنیا میں بلاشبہ جہالت کی تاریکی کا راج تھا۔ سابقہ نبوتوں کی تعلیمات زیادہ تر مسخ ہو چکی تھیں اور مجموعی طور پر دنیا کے اندر ہدایت آسمانی کی روشنی بہت مدھم پڑ چکی تھی۔ چاند کی قسم اسی مدھم اور مستعار روشنی کا اشارہ دے رہی ہے' جبکہ صبح کی روشنی نبوت و رسالتِ محمدیؐ کا استعارہ ہے۔ گویا علامات کے پردے میں ان تین آیات میں جو مضمون بیان ہوا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ پچھلے چھ سو برس سے دنیا پر جہالت و ضلالت کی تاریک رات مسلط تھی' ہدایتِ خداوندی کی روشنی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی' مگر اب رسالتِ محمدیؐ کا خورشید طلوع ہونے سے تاریکی کا دور ختم ہو چکا ہے۔ ان تین قسموں کا حوالہ سورۃ الانشقاق (پارہ تیس) کی آیات ۱۶ تا ۱۹ کے مطالعہ کے دوران دوبارہ آئے گا۔

آیت ۳۵ ﴿إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ ﴿۳۵﴾﴾ ''یقیناً یہ بہت بڑی باتوں میں سے ایک بات ہے۔''

ظاہر ہے نوعِ انسانی کی تاریخ میں نبوتِ محمدی ﷺ کے ظہور سے بڑا واقعہ اور کون سا ہوگا۔

آیت ۳۶ ﴿نَذِيرًا لِّلْبَشَرِ ﴿۳۶﴾﴾ ''خبردار کرنے کے لیے انسانوں کو۔''

آیت ۳۷ ﴿لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ﴿۳۷﴾﴾ ''جو بھی تم میں سے چاہے کہ وہ آگے بڑھے یا پیچھے رہ جائے۔''

اب کامیابی کا دارومدار ہر کسی کی ہمت اور کوشش پر ہے۔ جس کی ہمت جوان ہو وہ سب سے آگے بڑھ کر صدیقیت کا مقام اور ''السابقون الاولون'' کا درجہ حاصل کر لے۔ جو کوئی دوسروں کا انتظار کر کے ذرا دیر سے چلنے میں عافیت سمجھے وہ وَاتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ والوں کی فہرست میں اپنا نام لکھوا لے اور جس کسی کی ہمت اور قسمت ساتھ نہ دے وہ خود کو مستقل طور پر محروم کر لے۔

آیت ۳۸ ﴿كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴿۳۸﴾﴾ ''ہر جان رہن ہے اُس کے عوض جو کچھ کہ اُس نے کمایا ہے۔''

ہر انسان نے اپنی دنیا کی زندگی میں جو کچھ کمایا ہے قیامت کے دن وہ سب کچھ اسے وصول کرنا ہوگا۔

آیت ۳۹ ﴿اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ﴿۳۹﴾﴾ ''سوائے اُن لوگوں کے جو داہنے والے ہوں گے۔''

یعنی جن کا نامہ اعمال ان کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا۔

آیت ۴۰ ﴿فِيْ جَنّٰتٍ ۛ يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۴۰﴾﴾ ''وہ جنتوں میں ہوں گے پوچھتے ہوں گے۔''

آیت ۴۱ ﴿عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۱﴾﴾ ''گنہگاروں کے بارے میں۔''

آیت ۴۲ ﴿مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿۴۲﴾﴾ ''تم لوگوں کو کس چیز نے جہنم میں ڈالا؟''

آیت ۴۳ ﴿قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿۴۳﴾﴾ ''وہ کہیں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے۔''

آیت ۴۴ ﴿وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ﴿۴۴﴾﴾ ''اور نہ ہم مسکین کو کھانا کھلاتے تھے۔''

آیت ۴۵ ﴿وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ﴿۴۵﴾﴾ ''اور ہم کٹ حجتیاں کرنے والوں کے ساتھ مل کر کٹ حجتیاں کیا کرتے تھے۔''

ہم تو دنیا میں بس کھیل تماشوں میں ہی لگے رہے۔ حق کے خلاف باتیں بنانے والوں کے ساتھ مل کر ہم بھی باتیں بنانے لگتے تھے۔ ہم نے اپنی زندگی کے مقصد اور انجام کے بارے میں تو کبھی سنجیدگی سے سوچا ہی نہیں تھا۔

آیت ۴۶ ﴿وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۴۶﴾﴾ ''اور (سب سے بڑھ کر یہ کہ) ہم جزاء وسزا کے دن کا انکار کرتے رہے۔''

آیت ۴۷ ﴿حَتّٰٓى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ﴿۴۷﴾﴾ ''یہاں تک کہ ہمیں موت نے آلیا۔''

آیت ۴۸ ﴿فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿۴۸﴾﴾ ''تو اب اُن کے لیے نفع بخش نہیں ہوگی شفاعت کرنے والوں کی کوئی شفاعت۔''

آیت ۴۹ ﴿فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ﴿۴۹﴾﴾ ''تو انہیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ اس یاددہانی (قرآن) سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے ہیں؟''

آیت ۵۰ ﴿كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ﴿۵۰﴾﴾ ''گویا وہ بدکے ہوئے جنگلی گدھے ہیں۔''

آیت ۵۱ ﴿فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ۝۵۱﴾ ''جو شیر سے ڈر کر بھاگ پڑے ہیں۔''

یہ لوگ ایک اللہ' قرآن اور آخرت کے ذکر سے ایسے بھاگتے ہیں جیسے جنگلی گدھے شیر کی آہٹ پا کر جان بچانے کے لیے بھاگتے ہیں۔ ایسے مناظر اب ٹیلی ویژن پر عام دکھائے جاتے ہیں کہ افریقہ کے جنگلوں میں زیبروں کے غول شیر کی آہٹ محسوس کر کے بگٹٹ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

آیت ۵۲ ﴿بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ۝۵۲﴾ ''بلکہ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کو پکڑا دیے جائیں کھلے صحیفے۔''

یہ ان کی استہزائیہ گفتگو کا ذکر ہے۔ وہ لوگ حضور ﷺ کی دعوت کے جواب میں اکثر ایسی باتیں کرتے تھے کہ یہ حساب کتاب کا معاملہ قیامت پر کیوں ٹالا جا رہا ہے؟ آپ اپنے اللہ سے کہیں کہ وہ مہربانی فرما کر ہمارے اعمالنامے ابھی ہمارے ہاتھوں میں پکڑا دے۔ اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ہم قرآن کو اللہ کا کلام تب مانیں گے جب ہم میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایک صحیفہ پکڑا دیا جائے گا۔

آیت ۵۳ ﴿كَلَّا ۭ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝۵۳﴾ ''ہرگز نہیں! اصل بات یہ ہے کہ وہ آخرت کا خوف نہیں رکھتے۔''

جب ان کے دلوں میں آخرت کا خوف نہیں رہا تو اب وہ جیسی چاہیں باتیں بنائیں۔ فارسی کا مشہور محاورہ ہے: ''بے حیا باش و ہرچہ خواہی کن!'' کہ ایک دفعہ حیا کا پردہ اٹھا دو پھر جو چاہو کرو۔ چنانچہ آخرت سے بے خوف ہو کر وہ ہر طرح کی باتیں بنانے میں آزاد ہیں۔

آیت ۵۴ ﴿كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ۝۵۴﴾ ''ہرگز نہیں! یہ تو بس ایک یاددہانی ہے۔''

آیت ۵۵ ﴿فَمَنْ شَاۗءَ ذَكَرَهُ ۝۵۵﴾ ''اب جو چاہے اس سے نصیحت اخذ کر لے۔''

آیت ۵۶ ﴿وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ ۭ﴾ ''اور یہ لوگ نصیحت اخذ نہیں کریں گے' مگر یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے۔''

﴿هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ۝۵۶﴾ ''وہی ڈرنے کے لائق ہے اور وہی مغفرت کا مجاز۔''

یہ اُسی کا حق ہے کہ اس کا تقویٰ اختیار کیا جائے' اُس کے احکام کی پاسداری کی جائے اور وہی اس کا اہل ہے کہ جس کی چاہے مغفرت فرما دے۔

سُوْرَةُ الْقِيٰمَةِ

تمہیدی کلمات

سورتوں کے نظم کے اعتبار سے سورۃ القیامہ کا جوڑے کا تعلق سورۃ الدھر کے ساتھ ہے۔ سورۃ القیامہ ادبی ولسانی محاسن اور زورِ خطابت کے اعتبار سے قرآن کے عمومی اسلوب کی بھرپور نمائندگی کرتی نظر آتی ہے۔ قرآن کا عمومی اسلوب دراصل خطابت کا اسلوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی ہر سورت اپنی جگہ پر ایک خوبصورت خطبے کی حیثیت رکھتی ہے' بلکہ بعض سورتیں تو کئی کئی خطبات پر مشتمل ہیں۔ اس اعتبار سے ہم قرآن کو ''مجموعہ خطباتِ الٰہیہ'' (A Collection of Divine Orations) بھی کہہ سکتے ہیں۔ قرآن مجید کے اس اسلوب کا رنگ حضور ﷺ کے خطبات میں بھی نظر آتا ہے۔ حضور ﷺ جب قرآن مجید پڑھ کر لوگوں کو سناتے تھے تو بھی آپؐ کا انداز خطیبانہ ہوتا تھا۔ حدیث میں آتا ہے کہ خطبہ دیتے وقت آپؐ کی آواز بلند ہو جاتی تھی' آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں اور آپؐ کے اندازِ خطابت سے ایسے لگتا تھا جیسے کوئی سپہ سالار اپنے سپاہیوں کو للکار رہا ہے۔ بہرحال سورۃ القیامہ کی ایک ایک آیت میں خطابت کا بہت گہرا رنگ نظر آتا ہے۔

سورت کا آغاز اس انداز میں ہوتا ہے جیسے پس منظر میں کچھ لوگ وقوعِ قیامت کو جھٹلانے کے لیے دلیل بازی کر رہے ہوں اور یہ سورت ان کے سلسلۂ بحث کو منقطع کرتے ہوئے جواب کے طور پر نازل ہوئی ہو۔ لیکن چند آیات کے بعد ابتدائی انداز اور خطاب کا رخ تبدیل ہو جاتا ہے۔ صوتی آہنگ اور خطاب کے رخ کی یہ تبدیلی (تحویلِ خطاب) سورت میں تقریباً ہر چار یا چھ آیات کے بعد ہوتی نظر آتی ہے۔ اس طرح پوری سورت چھوٹے چھوٹے کئی حصوں کا مجموعہ نظر آتی ہے جس میں ہر حصے کی آیات کا ردھم اور ہم آواز الفاظ سے پیدا ہونے والا صوتی آہنگ جدا ہے۔ غرض یہ سورت زورِ خطابت' روانی' غنا' فصاحت و بلاغت اور بہت سی دوسری لسانی و ادبی خوبیوں کا مرقع ہے اور اس حیثیت سے یہ قرآن میں منفرد حیثیت کی حامل ہے۔

آیات ۱ تا ۳۰

سُوْرَةُ الْقِيٰمَةِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۴۰ رُكُوْعَاتُهَا: ۲

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ﴿۱﴾ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ؕ﴿۲﴾ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ
عِظَامَهٗ ؕ﴿۳﴾ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ﴿۴﴾ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۚ﴿۵﴾ يَسْـَٔلُ
اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ؕ﴿۶﴾ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۙ﴿۷﴾ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۙ﴿۸﴾ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۙ﴿۹﴾ يَقُوْلُ

الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ﴿١٠﴾ كَلَّا لَا وَزَرَ ﴿١١﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِالْمُسْتَقَرُّ ﴿١٢﴾ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ
يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ ﴿١٣﴾ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ﴿١٤﴾ وَّ لَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ﴿١٥﴾ لَا
تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿١٦﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ﴿١٧﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿١٨﴾
ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿١٩﴾ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿٢٠﴾ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿٢١﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ
نَّاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿٢٣﴾ وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ﴿٢٤﴾ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿٢٥﴾
كَلَّاۤ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿٢٦﴾ وَ قِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ﴿٢٧﴾ وَّ ظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿٢٨﴾ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ
بِالسَّاقِ ﴿٢٩﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِالْمَسَاقُ ﴿٣٠﴾

آیت ۱ ﴿لَاۤ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ﴿١﴾﴾ ''نہیں! مَیں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی۔''

لَا یہاں پر معترضین کے دلائل کی نفی کے لیے آیا ہے۔ مطلب یہ کہ تمہیں تو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ناممکن نظر آ رہا ہے اور اس بنیاد پر تم لوگ وقوعِ قیامت کے بارے میں شکوک وشبہات کا اظہار کر رہے ہو' مگر مجھے اس کے وقوع کے بارے میں اس قدر یقین ہے کہ مَیں اس کی قسم کھا رہا ہوں۔ موقف کے مؤکد اور مؤثر ہونے کے اعتبار سے یہ آیت سورۃ التغابن کی اس آیت سے گہری مشابہت رکھتی ہے: ﴿قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ﴾ (آیت ۷) ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے: کیوں نہیں! مجھے میرے رب کی قسم ہے' تم لازماً اٹھائے جاؤ گے' پھر تمہیں لازماً جتا دیا جائے گا ان اعمال کے بارے میں جو تم نے کیے ہیں''۔ سورۃ التغابن کی اس آیت کا اسلوب اور انداز بہت پُرزور ہے' لیکن دیکھا جائے تو اس میں خارجی دلیل اور منطق کوئی بھی نہیں۔ البتہ ایک شخص اپنے موقف کے حق میں اپنی شخصیت اور اپنے یقین کو دلیل کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ لیکن یہ شخصیت وہ ہے جس کے قول وکردار کی سچائی کو اپنے پرائے سب نے مثالی مانا ہے اور یہی اس قول کے سچا ہونے کی سب سے قوی دلیل ہے۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ کے معاملے میں بھی وقوعِ قیامت کے دعوے کی دلیل محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اور آپؐ کی سیرت ہے۔

آیت ۲ ﴿وَلَاۤ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ﴿٢﴾﴾ ''اور نہیں! مَیں قسم کھاتا ہوں نفسِ لوامہ کی۔''

نفسِ لوامہ کے لغوی معنی ہیں ملامت کرنے والا نفس۔ اس سے مراد انسان کا وہ نفس ہے جسے ہم عرفِ عام میں ضمیر (conscience) کہتے ہیں۔ اس آیت میں نفسِ لوامہ یا انسانی ضمیر کو قیامِ قیامت کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ انسانی نفسِ لوامہ یا ضمیر ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی مسلمان' کافر یا دہریہ انکار نہیں کر سکتا۔ ''میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے'' یا "My conscience is biting me" جیسے جملے دنیا بھر کے انسانوں کے ہاں بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔ آخر سوچنے کی بات ہے کہ اگر آپ کوئی غلط یا بُرا کام کریں تو اندر سے کوئی چیز کیوں بار بار آپ کے دل ودماغ میں چبھن پیدا کرتی ہے؟ اور بعض اوقات اس چبھن کے تسلسل وتکرار کی وجہ سے آپ کی نیند تک کیوں اُڑ جاتی ہے؟ اگر کوئی نیکی نیکی نہیں اور کوئی بُرائی بُرائی نہیں تو بُرے کام پر آپ کے اندر کی یہ چبھن یا خلش آخر آپ کو کیوں تنگ کرتی ہے؟ چنانچہ نیکی اور بدی کے الگ الگ وجود کا سب سے بڑا اور آفاقی سطح پر مسلّمہ ثبوت انسانی نفس کی ملامت یا ضمیر کی خلش ہے۔ اور اگر یہ حقیقت تسلیم کر لی جائے کہ نیکی نیکی ہے اور بدی بدی ہے تو پھر یہ بھی

ماننا پڑے گا کہ انسانوں کے نیک اور بُرے اعمال کا حتمی اور قطعی نتیجہ نکلنا بھی ناگزیر ہے۔ دوسری طرف اس حوالے سے زمینی حقائق سب کے سامنے ہیں۔ یعنی دنیا میں ایسا کوئی حتمی اور قطعی نتیجہ نہ تو نکلتا ہے اور نہ ہی ایسا ممکن ہے۔ اس دلیل کی روشنی میں اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ ہر انسان کو اس کے اچھے بُرے اعمال کی پوری پوری جزا یا سزا دینے کے لیے ایک دوسری دنیا یعنی آخرت کا وجود میں لایا جانا ناگزیر ہے۔ چنانچہ قیامت' آخرت یا بعث بعد الموت کی سب سے بڑی دلیل خود انسان کے اندر موجود ہے' اور وہ ہے انسان کا نفسِ لوّامہ یا اس کا ضمیر۔

آیت ۳ ﴿اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝۳﴾ ''کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع نہیں کر سکیں گے؟''

آیت ۴ ﴿بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰۤی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ ۝۴﴾ ''کیوں نہیں! ہم تو پوری طرح قادر ہیں اس پر بھی کہ ہم اس کی ایک ایک پور درست کر دیں۔''

یہاں پر بَلٰی کے بعد لفظ کُنَّا محذوف ہے' گویا تقدیرِ عبارت یوں ہے: بَلٰی کُنَّا قٰدِرِیْنَ ...

آیت ۵ ﴿بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝۵﴾ ''بلکہ انسان تو یہ چاہتا ہے کہ فسق و فجور آگے بھی جاری رکھے۔''

انسانوں کے ہاں آخرت کے انکار کی سب سے بڑی اور اصل وجہ یہ ہے کہ وہ نیکی و بدی اور جائز و ناجائز کی تمیز ختم کر کے عیش و عشرت کے خوگر ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ حرام خوریاں چھوڑ کر راہِ راست پر آنے کے مقابلے میں انہیں آخرت کا انکار کر دینا آسان محسوس ہوتا ہے۔ آخرت کے بارے میں انسان کا یہ رویہ ایسے ہی ہے جیسے بلّی کو دیکھ کر کبوتر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ لیکن جس طرح کبوتر کے آنکھیں بند کر لینے سے بلّی اپنا فیصلہ نہیں بدلتی اسی طرح ان کے انکار کر دینے سے قیامت کے وقوع میں کوئی خلل نہیں آئے گا۔ وہ ایک حقیقت ہے اور حقیقت کے طور پر اپنے معیّن وقت پر آ دھمکے گی۔

آیت ۶ ﴿یَسْـَٔلُ اَیَّانَ یَوْمُ الْقِیٰمَةِ ۝۶﴾ ''وہ پوچھتا ہے: کب آئے گا قیامت کا دن؟''

مشرکینِ مکہ حضور ﷺ سے یہ سوال طنزیہ طور پر پوچھتے تھے اسی لیے اس کا جواب بھی بہت تیکھے انداز میں دیا گیا ہے۔ سوال و جواب کا یہی انداز اور اسلوب سورۃ الذاریات کی ان آیات میں بھی پایا جاتا ہے: ﴿یَسْـَٔلُوْنَ اَیَّانَ یَوْمُ الدِّیْنِ ۝۱۲ یَوْمَ هُمْ عَلَی النَّارِ یُفْتَنُوْنَ ۝۱۳﴾ ''وہ پوچھتے ہیں کب آئے گا وہ جزا و سزا کا دن؟ جس دن یہ لوگ آگ پر سینکے جائیں گے''۔ مذکورہ سوال کا جواب بھی بالکل اسی انداز میں دیا جا رہا ہے۔ ملاحظہ ہو:

آیت ۷ ﴿فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝۷﴾ ''پس جب نگاہیں چندھیا جائیں گی۔''

آیت ۸ ﴿وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝۸﴾ ''اور چاند بے نور ہو جائے گا۔''

اس کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ چاند سورج کے اندر دھنس جائے گا۔

آیت ۹ ﴿وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝۹﴾ ''اور سورج اور چاند یکجا کر دیے جائیں گے۔''

اس وقت سورج چاند سمیت تمام اجرامِ فلکی کششِ ثقل کے قانون کے تحت اپنے اپنے مدار میں گھوم رہے ہیں۔ جب یہ نظام ڈھیلا پڑے گا تو تمام کُرے آپس میں ٹکرا جائیں گے۔

آیت ۱۰ ﴿يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ۝۱۰﴾ ''اُس دن انسان کہے گا: کہاں ہے کوئی بھاگ جانے کی جگہ؟''

آیت ۱۱ ﴿كَلَّا لَا وَزَرَ ۝۱۱﴾ ''(کہا جائے گا:) ہرگز نہیں' کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔''

آیت ۱۲ ﴿اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ۨ الْمُسْتَقَرُّ ۝۱۲﴾ ''اس روز تمہارے ربّ ہی کے حضور میں جا کر کھڑے ہونا ہے۔''

آیت ۱۳ ﴿يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ ۢ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ۝۱۳﴾ ''جتلا دیا جائے گا انسان کو اُس دن جو کچھ اس نے آگے بھیجا ہوگا اور جو کچھ پیچھے چھوڑا ہوگا۔''

تقدیم و تاخیر کے اس فلسفے کو یوں سمجھیں کہ ہمارے اچھے بُرے اعمال کے بدلے کا ایک حصہ تو ہماری زندگیوں میں ہی آخرت کے لیے ہمارے اعمال نامے میں جمع (credit) ہوتا رہتا ہے' جبکہ ان اعمال کا ایک دوسرا حصہ اچھے یا بُرے اثرات کی صورت میں اسی دنیا میں رہ جاتا ہے۔ یہ ''اثرات'' اس دنیا میں جب تک موجود رہتے ہیں' ان کے بدلے میں بھی ثواب یا گناہ متعلقہ شخص کے اعمال نامے میں متواتر شامل ہوتا رہتا ہے۔ اس وضاحت کی روشنی میں اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص کو واضح طور پر بتا دیا جائے گا کہ تمہاری یہ نیکیاں یا بدیاں تو وہ ہیں جو تم نے براہِ راست خود اپنے لیے آگے بھیجی تھیں اور یہ ثواب یا وبال وہ ہے جو تمہارے اعمال کے پیچھے رہ جانے والے اثرات کی وجہ سے تمہارے حساب میں جمع ہوتا رہا۔

آیت ۱۴ ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝۱۴﴾ ''بلکہ انسان تو اپنے نفس کے احوال پر خود ہی خوب بصیرت رکھتا ہے۔''

قیامت کے دن تو کسی کو بتانے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ ہر انسان کو خود ہی معلوم ہوگا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ دنیا سے وہ کیا کچھ لے کر آیا ہے اور یہ کہ وہ کیسے سلوک کا مستحق ہے۔

آیت ۱۵ ﴿وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۝۱۵﴾ ''اور چاہے وہ کتنے ہی بہانے پیش کرے۔''

ظاہر ہے دنیا میں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی چرب زبان شخص خود ساختہ عذر پیش کر کے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ ایسا کرنے سے ممکن ہے وہ وقتی طور پر متعلقہ لوگوں کو مطمئن کر لے لیکن اس کا ضمیر اس کو مسلسل یاد دلاتا رہتا ہے کہ تم جھوٹے ہو۔

اب آئندہ آیات میں خطاب کا رخ حضور ﷺ کی طرف ہو گیا ہے اور ساتھ ہی کلام کا صوتی آہنگ بھی تبدیل ہو گیا ہے۔ ان آیات کے آخر میں قُرْاٰنَهٗ ، بَيَانَهٗ جیسے الفاظ آ رہے ہیں۔ جیسے کہ آغاز میں ذکر ہوا تھا' یہ سورت اپنے اسلوب اور صوتی آہنگ کے اعتبار سے چھوٹے چھوٹے کئی حصوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ہر حصے کی خوبصورتی اور انفرادیت آیات کے آخر میں آنے والے ہم آواز الفاظ کی وجہ سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ مثلاً ابتدائی آیات کا اختتام قِيَامَه ، لَوَّامه ، عِظَامَه ، بَنَانَه ، اَمَامَه جیسے الفاظ پر ہوتا ہے۔ اس کے بعد چند آیات کے آخر میں الْبَصَر ، الْقَمَر ، الْمَفَر ، وَزَر ، الْمُسْتَقَر جیسے الفاظ آئے۔ جبکہ گزشتہ دو آیات کے اختتامی الفاظ (بَصِيْرَة ، مَعَاذِيْرَه) آپس میں ہم آواز ہیں۔ صوتی آہنگ اور اسلوب کی یہ تبدیلی سورت کی آئندہ آیات میں بھی مسلسل نظر آئے گی۔

آیت ۱۶ ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝۱۶﴾ ''آپؐ اس (قرآن) کے ساتھ اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں۔''

حضور اکرم ﷺ کا معمول تھا کہ جونہی حضرت جبرائیلؑ وحی لے کر آتے آپؐ نئے کلام کو فوری طور پر یاد کرنے کی کوشش کرتے۔ اس پس منظر میں یہاں آپؐ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ اس ضمن میں آپؐ فکرمند نہ ہوں:

آیت ﴿ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴾ ''اسے جمع کرنا اور پڑھوا دینا ہمارے ذِمّہ ہے۔''

یعنی آپ ﷺ خاطر جمع رکھیں، قرآن مجید میں سے کوئی آیت یا کوئی لفظ آپ بھولیں گے نہیں۔ اس پورے کلام کی حفاظت اور ترتیب ہمارے ذِمّہ ہے۔

آیت ﴿ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴾ ''پھر جب ہم اسے پڑھوا دیں تو آپ اس کی قراءت کی پیروی کیجیے۔''

اس میں ترتیبِ مصحف کی طرف اشارہ ہے، یعنی وہ ترتیب جس کے مطابق قرآن مجید کتابی صورت میں مرتب کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے قرآن مجید کے نزول کی ترتیب اور تھی اور مصحف کی ترتیب اور ہے۔ لیکن اس حوالے سے یہ اہم نکتہ مدِنظر رہنا چاہیے کہ ترتیبِ مصحف بھی توقیفی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی طے ہوئی ہے، اور یہ کہ ہر وحی کے ساتھ نئے کلام کی ترتیب کا حکم بھی آتا تھا۔ یعنی ہر وحی میں نازل ہونے والی سورت یا آیات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح کیا جاتا تھا کہ پہلے سے نازل شدہ قرآن کے اندر ان کی جگہ کون سی ہوگی۔

آیت ﴿ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴾ ''پھر ہمارے ہی ذِمّے ہے اس کو واضح کر دینا بھی۔''

قرآن مجید کی تفسیر سے متعلق یہ بہت اہم وضاحت ہے۔ اس کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کے اصل پیغام کی تبیین و تفہیم بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے ذِمّہ لے رکھی ہے۔ عملی طور پر اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ قرآن حسبِ ضرورت خود ہی اپنے احکام کی وضاحت بھی کرتا ہے۔ جیسے سورۃ النساء میں دو احکام کے بارے میں آیا ہے: يَسْتَفْتُوْنَكَ... (آیت ۱۲۷ اور آیت ۱۷۶) کہ اے نبی (ﷺ) یہ لوگ آپ سے فلاں مسئلے کی وضاحت چاہتے ہیں، تو انہیں بتائیں کہ اگر انہیں اس بات کی پوری طرح سمجھ نہیں آئی تو اللہ تعالیٰ اس معاملے کی مزید وضاحت کر دیتا ہے۔ چنانچہ قرآنی احکام کی تبیین و تشریح خود قرآن نے بھی کی ہے اور اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اس کا اہتمام زبانِ رسالت سے بھی کرایا ہے۔ اس کی ضرورت اور اہمیت قرآن میں یوں بیان کی گئی ہے: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل: ۴۴) کہ اے نبی (ﷺ) ہم نے یہ ذکر آپ پر اس لیے نازل کیا ہے کہ آپ اس کو واضح کر دیں لوگوں کے لیے کہ ان پر کیا کچھ نازل ہوا ہے۔ یعنی اگر قرآن کے سمجھنے میں لوگوں کو کہیں کوئی ابہام یا اشکال محسوس ہو تو آپ اس کی وضاحت کر دیا کریں اور اگر انہیں کہیں کوئی حکم اجمال کے پردے میں لپٹا نظر آئے تو آپ اس کی تفصیل بیان کر دیا کریں ـــــ آئندہ آیات میں خطاب کا رخ اور کلام کا آہنگ ایک مرتبہ پھر تبدیل ہو رہا ہے۔

آیت ﴿ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴾ ''ہرگز نہیں! اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ جلدی ملنے والی چیز (یعنی دنیا) سے محبت کرتے ہو۔''

آیت ﴿ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴾ ''اور تم آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔''

یہاں خطاب کا رخ کفّار کی طرف ہے۔ یعنی تمہارا اصل مرض ہی یہ ہے کہ تم لوگ ''حُبِّ عاجلہ'' میں مبتلا ہو، اپنی دنیا کی زندگی اور دنیا کے مال و اسباب سے محبت کرتے ہو اور اس کے مقابلے میں آخرت کو بالکل ہی نظر انداز کیے ہوئے ہو۔

آیت ﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴾ ''بہت سے چہرے اُس دن تر و تازہ ہوں گے۔''

ان آیات میں اب میدانِ محشر میں موجود لوگوں کی کیفیت کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ اس نقشے کو دیکھنے سے یوں لگتا ہے کہ ہر انسان کو

اپنے اعمال کے مطابق اپنے نتیجے کا پہلے سے ہی علم ہوگا۔ جیسے سکول میں اعلانِ نتائج کے موقع پر کچھ بچے پہلے سے مطمئن اور کچھ پہلے سے پریشان ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے ہر بچہ اپنے بارے میں خوب جانتا ہے کہ اس نے امتحان میں کیا کچھ کیا تھا۔

آیت ۲۳ ﴿اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝۲۳﴾ ''اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔''

بعض مفسرین نے اس آیت سے یہ مفہوم مراد لیا ہے کہ وہ اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہوں گے۔ اس لیے کہ رؤیتِ باری تعالیٰ میدانِ حشر میں نہیں ہوگی' بلکہ اہلِ جنت' جنت میں داخلے کے بعد سب سے بڑی جس نعمت سے سرشار ہوں گے وہ دیدارِ الٰہی ہوگی۔ لیکن کچھ علماء کا خیال ہے اور میری رائے بھی یہی ہے کہ اہلِ ایمان کو میدانِ محشر میں بھی کسی نہ کسی درجے میں رؤیتِ باری تعالیٰ سے مشرف کیا جائے گا۔ سورۃ المُطَفِّفِین میں یہ مضمون زیادہ وضاحت کے ساتھ آئے گا۔

آیت ۲۴ ﴿وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۢ بَاسِرَةٌ ۝۲۴﴾ ''اور بہت سے چہرے اُس روز اُترے ہوئے ہوں گے۔''

آیت ۲۵ ﴿تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۝۲۵﴾ ''ان کو یقین ہوگا کہ اب ان کے ساتھ کمر توڑ سلوک ہونے والا ہے۔''

اس کے بعد اب قیامتِ صُغریٰ یعنی انسان کی موت کے وقت کا نقشہ دکھایا جا رہا ہے۔ قیامتِ کُبریٰ کا ذکر تو قبل ازیں ان آیات میں آ چکا ہے: ﴿فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝۷ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝۸﴾ لیکن انفرادی سطح پر تو ہر انسان کی موت ہی اُس کی قیامت ہے۔ اسی لیے قیامتِ کُبریٰ کے مقابلے میں ہر انسان کی موت کو اُس کی ''قیامتِ صُغریٰ'' کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ان آیات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہر انسان کو اپنی 'قیامتِ صغریٰ' کا تصور اپنے ذہن میں مستحضر رکھنا چاہیے۔

آیت ۲۶ ﴿كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۝۲۶﴾ ''ہرگز نہیں! جب کہ جان آ کر پھنس جاتی ہے ہنسلیوں میں۔''

آیت ۲۷ ﴿وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ۝۲۷﴾ ''اور کہا جاتا ہے کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا؟''

یہ اس کیفیت کا نقشہ ہے جب بڑے بڑے ڈاکٹر جواب دے دیتے ہیں' حکماء و اطباء معذرت کر لیتے ہیں اور عزیز و اقارب کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ بس جی اب دعا کریں۔ اُس وقت بڑے سے بڑا عقلیت پسند شخص بھی چاہتا ہے کہ کسی جھاڑ پھونک کرنے والے کو بلا لیا جائے یا کسی تعویذ گنڈے والے کو پوچھ لیا جائے۔ شاید کہ ایسی کسی ترکیب سے اُس کا پیارا موت کے منہ میں جانے سے بچ جائے۔

آیت ۲۸ ﴿وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۝۲۸﴾ ''اور وہ سمجھ جاتا ہے کہ اب جدائی کی گھڑی آن پہنچی ہے۔''

آدمی کو یقین ہو جاتا ہے کہ اب اہل و عیال سے بچھڑنے اور بڑے ارمانوں سے بنائے ہوئے گھر اور مال و اسباب کو چھوڑنے کا وقت آن پہنچا ہے۔

آیت ۲۹ ﴿وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۝۲۹﴾ ''اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ جاتی ہے۔''

یہ عین جان کنی کے وقت کی اس کیفیت کا ذکر ہے جب جسم کے نچلے حصے سے انسان کی جان نکلنا شروع ہو جاتی ہے۔ اُس وقت وہ ناقابلِ بیان کرب اور شدید تکلیف کی کیفیت میں ہوتا ہے۔

آیت ۳۰ ﴿اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ۨ الْمَسَاقُ ۝۳۰﴾ ''اُس دن تو تیرے رب ہی کی طرف دھکیلے جانا ہے۔''

نوٹ کیجیے' گزشتہ آیات کے بعد ہم آواز الفاظ سے بننے والا مخصوص صوتی آہنگ ایک مرتبہ پھر تبدیل ہو رہا ہے۔

آیات ۳۱ تا ۴۰

فَلَا صَدَّقَ وَ لَا صَلّٰى ﴿۳۱﴾ وَ لٰكِنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى ﴿۳۲﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰۤى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿۳۳﴾ اَوْلٰى لَكَ
فَاَوْلٰى ﴿۳۴﴾ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۵﴾ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴿۳۶﴾ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ
مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿۳۷﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ﴿۳۸﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۳۹﴾
اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿۴۰﴾ ع

آیت ۳۱ ﴿فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿۳۱﴾﴾ ''پس اُس نے نہ تو تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی۔''

آیت ۳۲ ﴿وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۳۲﴾﴾ ''بلکہ اُس نے جھٹلا دیا اور پیٹھ موڑ لی۔''

آیت ۳۳ ﴿ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰۤى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿۳۳﴾﴾ ''پھر چل دیا اپنے گھر والوں کے پاس اکڑتا ہوا۔''

ان آیات میں ایک شخص کی حق دشمنی' ڈھٹائی اور اکڑفوں کی لفظی تصویر دکھائی گئی ہے۔ یہ تصویر سردارانِ قریش میں سے کسی خاص شخص کی بھی ہو سکتی ہے اور مجموعی طور پر اُن کے عمومی کردار کی بھی۔ سردارانِ قریش کے اس رویّے کی جھلک سورۂ صٓ کی اس آیت میں بھی دکھائی دیتی ہے: ﴿وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰۤى اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ﴿۶﴾﴾ ''اور چل دیے ان کے سردار (یہ کہتے ہوئے) کہ چلو جاؤ اور جمے رہو اپنے معبودوں پر' یقیناً اس بات میں تو کوئی غرض پوشیدہ ہے۔''

آیت ۳۴ ﴿اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۴﴾﴾ ''افسوس ہے تجھ پر' افسوس ہے!''

آیت ۳۵ ﴿ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۵﴾﴾ ''پھر افسوس ہے تجھ پر' افسوس ہے!''

آیت ۳۶ ﴿اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴿۳۶﴾﴾ ''کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اُسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟''

کیا یہ لوگ اپنی دنیوی زندگی کو ہی اصل زندگی سمجھے بیٹھے ہیں؟ کیا یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا اور ان کا حساب نہیں ہوگا؟ اور انہیں ان کے کرتوتوں کا خمیازہ نہیں بھگتنا پڑے گا؟

آیت ۳۷ ﴿اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿۳۷﴾﴾ ''کیا وہ حقیر پانی کی ایک بوند نہیں تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکائی جاتی ہے؟''

آیت ۳۸ ﴿ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً﴾ ''پھر وہ ایک عَلَقہ بنا''

یعنی پانی کی اس بوند نے جونک جیسی شکل اختیار کر لی جو رحمِ مادر کی دیوار کے ساتھ چمٹی رہی۔

﴿فَخَلَقَ فَسَوّٰى ﴿۳۸﴾﴾ ''پھر اللہ نے اس کو بنایا اور اس کے اعضاء درست کیے۔''

اللہ تعالیٰ نے عَلَقہ کو گوشت کے لوتھڑے (مُضغہ) میں تبدیل کیا اور پھر اس کا جسم بنایا' جس میں آنکھیں' ناک' کان اور اپنی اپنی جگہ پر دوسرے تمام اعضاء بنا دیے۔ اور یہ سب کچھ ہوتا رہا: ﴿فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ﴾ (الزمر:۶) شکم مادر کے تین پردوں کے اندر۔

آیت ۳۹ ﴿فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۳۹﴾﴾ ''پھر اسی سے اُس نے دو زوج بنائے' نر اور مادّہ۔''

کسی کو اُس نے مرد بنا دیا اور کسی کو عورت۔

آیت ﴿اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى﴾ ''تو کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مُردوں کو زندہ کر دے؟''

کیا تم لوگ جانتے نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو گندے پانی کی بوند سے پیدا کیا ہے؟ اولادِ آدمؑ میں سے افلاطون، بقراط اور سقراط کی تخلیق بھی اسی بوند سے ہوئی اور تمام انبیاء اور اولیاء اللہ بھی ایسے ہی پیدا ہوئے۔ حضرت آدمؑ و حوا کے بعد صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے استثناء کے علاوہ نسلِ انسانی کے تمام افراد اللہ تعالیٰ نے اسی طریقے سے پیدا کیے۔ ﴿اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ﴾ (قٓ:۱۵) ''تو کیا پہلی مرتبہ تم لوگوں کو پیدا کرنے کے بعد اب ہم عاجز آ گئے ہیں؟'' اے عقل کے اندھو! کیا تم یہ بھی نہیں سوچتے کہ جو ذات پانی کی ایک بوند سے زندہ سلامت، خوبصورت، بہترین صلاحیتوں کے مالک انسان کو پیدا کر سکتی ہے، کیا وہ مُردہ انسانوں کو زندہ کرنے پر قادر نہیں ہوگی؟ اس آیت کا انداز چونکہ سوالیہ ہے اس لیے اسے سن کر یا پڑھ کر ہماری زبانوں پر بے ساختہ یہ الفاظ آ جانے چاہئیں: ''کیوں نہیں! اے ہمارے پروردگار! تیری ذات پاک ہے۔ ہم گواہ ہیں کہ تُو مُردوں کو زندہ کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔''

متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اس آیت کو پڑھتے تو اس سوال کے جواب میں کبھی بَلٰی (کیوں نہیں!) اور کبھی سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ فَبَلٰی (پاک ہے تیری ذات، اے اللہ! کیوں نہیں!) جیسے الفاظ فرمایا کرتے تھے۔

سُوْرَةُ الدَّهْرِ

سورۃ الدھر اور سورۃ القیامہ کے مابین جوڑے کا تعلق ہے۔ اس تعلق کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ دونوں سورتیں مضمون کے تسلسل کی بنا پر باہم جڑی ہوئی ہیں۔ سورۃ القیامہ کا اختتام انسان کی تخلیق کے ذکر سے ہوا اور اسی مضمون سے سورۃ الدھر کا آغاز ہو رہا ہے۔

آیات ۱ تا ۲۲

سُوْرَةُ الدَّهْرِ مَدَنِيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۳۱ رُكُوْعَاتُهَا: ۲

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ۝۱ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ
نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝۲ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا
كَفُوْرًا ۝۳ اِنَّا اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا۠ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ۝۴ اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ
كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ۝۵ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ۝۶ يُوْفُوْنَ
بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا ۝۷ وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا
وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝۸ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝۹ اِنَّا نَخَافُ
مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ۝۱۰ فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ۝۱۱
وَ جَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ۝۱۲ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا
وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ۝۱۳ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ۝۱۴ وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ
فِضَّةٍ وَّ اَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا۠ ۝۱۵ قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ۝۱۶ وَ يُسْقَوْنَ فِيْهَا
كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ۝۱۷ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ۝۱۸ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ
مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ۝۱۹ وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّ مُلْكًا
كَبِيْرًا ۝۲۰ عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ۖ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ
شَرَابًا طَهُوْرًا ۝۲۱ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّ كَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ۝۲۲ ع ۱۶

آیت ۱ ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ۝۱﴾ ''کیا انسان پر اس زمانے میں ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے جبکہ وہ کوئی قابلِ ذکر شے نہ تھا؟''

''دَهْر'' سے مراد وہ لامتناہی زمانہ ہے جس کی نہ ابتدا انسان کو معلوم ہے نہ انتہا' جبکہ ''حِیْن'' سے مراد وہ خاص وقت ہے جو اس لامتناہی زمانے کے اندر کبھی پیش آیا ہو —— چنانچہ ''دَهْر'' دراصل وقت کا وہ سمندر ہے جس کے اندر سے کائنات میں رونما ہونے والے ہر قسم کے واقعات و حادثات جنم لیتے ہیں۔ وقت کے اسی سمندر میں سے ہم انسان بھی نکلے ہیں۔ ع ''قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب'' (اقبال)۔ چنانچہ اس قلزمِ ہستی کے اندر ہر انسان پر ایک وقت ایسا بھی آیا ہے جب اس کا وجود حقیر پانی کی ایک ایسی بوند کی شکل میں تھا جس کا ذکر کرنا اور نام لینا بھی کوئی پسند نہیں کرتا۔

آیت ۲ ﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ﴾ ''ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے ملے جلے نطفے سے''

موجودہ دور میں سائنس نے اس آیت کا مفہوم بہت اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ مرد کی طرف سے spermatozoon اور ماں کی طرف سے ovum ملتے ہیں تو zygote وجود میں آتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے پندرہ سو سال پہلے صحرائے عرب کا ایک بدو تو لفظ ''اَمْشَاج'' کو اپنی سمجھ اور عقل کے مطابق ہی سمجھا ہوگا۔ گویا قرآن مجید کے اعجاز کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے الفاظ کا مفہوم ہر زمانے کے ہر قسم کے انسانوں کے لیے قابلِ فہم رہا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان الفاظ کے معانی و مطالب میں نئی نئی جہتیں بھی دریافت ہوتی رہتی ہیں۔

﴿نَّبْتَلِيْهِ﴾ ''ہم اس کو اُلٹتے پلٹتے رہے''

یعنی رحمِ مادر میں ہم نے اس ''نُطْفَةٍ اَمْشَاج'' کو مختلف مراحل سے گزارا۔ نطفہ سے اسے عَلَقہ بنایا۔ عَلَقہ کو مُضْغہ کی شکل میں تبدیل کیا اور پھر اس کے اعضاء درست کیے۔ ''نَبْتَلِيْهِ'' کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے ''تاکہ ہم اس کو آزمائیں''۔ یعنی ہم نے انسان کو امتحان اور آزمائش کے لیے پیدا کیا ہے۔

﴿فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝۲﴾ ''پھر ہم نے اس کو بنا دیا سننے والا' دیکھنے والا۔''

آیت ۳ ﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ﴾ ''ہم نے اس کو راہ سجھا دی''

اس سے مراد ''ایمان'' سے متعلق وہ شعور یا وہ ہدایت اور راہنمائی ہے جو ہر انسان کی فطرت کے اندر پیدائشی طور پر موجود ہے۔ یعنی انسان اندھا اور بہرہ پیدا نہیں ہوا' بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ظاہری اور باطنی طور پر بہترین صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ جسمانی حواس بھی دیے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اسے روح کی بصیرت بھی عطا کی ہے۔

﴿اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝۳﴾ ''اب چاہے تو وہ شکر گزار بن کر رہے' چاہے ناشکرا ہو کر۔''

اب ظاہر ہے جس انداز اور طریقے سے انسان زندگی گزارے گا' اسی کے مطابق آخرت میں اس کو بدلہ دیا جائے گا۔

آیت ۴ ﴿اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا۠ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ۝۴﴾ ''یقیناً کافروں کے لیے ہم نے تیار کر رکھی ہیں زنجیریں اور طوق اور دہکتی ہوئی آگ۔''

آیت ۵ ﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ کَاْسٍ کَانَ مِزَاجُهَا کَافُوْرًا ۝۵﴾ ''یقیناً نیکوکار بندے ایسی شراب کے جام نوش کریں گے جس میں کافور کی ملونی ہوگی۔''

ایک طرف کفار و مشرکین زنجیروں اور طوقوں میں جکڑے جہنم کی آگ میں جل رہے ہوں گے تو دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور نیکوکار بندے جنت کی نعمتوں میں دادِ عیش دے رہے ہوں گے۔ جنت میں انہیں آبِ کافور کی آمیزش والی شراب طہور بھی پیش کی جائے گی۔ آگے اس چشمۂ کافور کی مزید وضاحت ہے:

آیت ۶ ﴿عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِیْرًا ۝۶﴾ ''یہ ایک چشمہ ہے جس میں سے اللہ کے خاص بندے پئیں گے اور جدھر چاہیں گے اس کی شاخیں نکال لے جائیں گے۔''

یعنی اگر وہ چاہیں گے تو اس چشمے میں سے اپنی مرضی سے نہریں نکال کر اپنے اپنے علاقے کی طرف لے جائیں گے۔

آیت ۷ ﴿یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا کَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِیْرًا ۝۷﴾ ''وہ نذر کو پورا کرتے ہیں اور ڈرتے رہتے ہیں اُس دن سے جس کا شر ہر سُو پھیل جائے گا۔''

آیت ۸ ﴿وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا ۝۸﴾ ''اور وہ کھانا کھلاتے ہیں اللہ کی محبت میں مسکین کو یتیم کو اور قیدی کو۔''

عَلٰی حُبِّهٖ کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ وہ مال کی محبت کے علی الرغم کھانا کھلاتے ہیں۔ یعنی ایک مفہوم تو یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کی محبت میں بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور دوسرا یہ کہ اگرچہ ان کے دلوں میں بھی مال سے محبت کا جذبہ ہے اور ان کا جی بھی چاہتا ہے کہ وہ اپنے مال کو سنبھال سنبھال کر رکھیں' لیکن اپنے ان جذبات کے باوجود وہ محض اللہ کی رضا کے لیے مستحقین کو کھانا کھلانے میں اپنا مال خرچ کرتے رہتے ہیں۔ ہم پڑھ چکے ہیں کہ حُبِّ مال کا علاج ہی انفاق فی سبیل اللہ ہے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کو قرآن مجید میں جگہ جگہ بشارتیں دی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہو سورۃ الحدید کی یہ آیت: ﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِیْمٌ ۝۱۸﴾ ''یقیناً صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور جو اللہ کو قرضِ حسنہ دیں' ان کو کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور ان کے لیے بڑا باعزت اجر ہوگا۔''

آیت ۹ ﴿اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ﴾ ''(اور کہتے ہیں کہ) ہم تو آپ کو یہ کھانا کھلا رہے ہیں صرف اللہ (کی رضا) کے لیے''

﴿لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝۹﴾ ''ہم آپ سے نہ تو کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ ہی شکریہ۔''

آیت ۱۰ ﴿اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا ۝۱۰﴾ ''ہم تو ڈرتے ہیں اپنے رب کی طرف سے ایک ایسے دن سے جس کی اداسی بڑی ہولناک ہوگی۔''

عَبُوْس کا لفظ ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جس کے چہرے پر کبھی مسکراہٹ نہ آتی ہو بلکہ غصہ اور وحشت برستی ہو۔ جب کہ قَمْطَرِیْر کا معنی ہے بہت سخت' بہت کرخت' ہولناک اور طویل۔ چنانچہ یہاں اس سے مراد میدانِ محشر کی وہ کیفیت ہے جس کی وجہ

سے کھرب ہا کھرب انسان متفکر اور پریشان ہوں گے اور ان میں سے کسی ایک کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کے آثار تک نظر نہیں آئیں گے۔

آیت ۱۱ ﴿فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ﴾ ''تو اللہ انہیں بچا لے گا اُس دن کے شر سے''

﴿وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ۝۱۱﴾ ''اور بخش دے گا انہیں تروتازگی اور مسرت۔''

یعنی چہروں کی تازگی اور دلوں کا سرور۔

آیت ۱۲ ﴿وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ۝۱۲﴾ ''اور بدلے میں دے گا انہیں ان کے صبر کے سبب جنت اور ریشم کا لباس۔''

دنیا میں وہ لوگ مشکل سے مشکل حالات میں بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجاآوری میں لگے رہے۔ انہوں نے فاقوں سے رہنا گوارا کر لیا لیکن حرام کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے انہوں نے اپنی جانیں تک قربان کر دیں۔ ان کے اس صبر کے بدلے میں اللہ تعالیٰ انہیں رہنے کے لیے جنت اور پہننے کے لیے ریشم کی پوشاکیں عطا کرے گا۔

آیت ۱۳ ﴿مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ﴾ ''وہ تکیے لگائے بیٹھے ہوئے ہوں گے اس میں تختوں کے اوپر۔''

﴿لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ۝۱۳﴾ ''نہیں دیکھیں گے وہ اس میں دھوپ کی حدت اور نہ سخت سردی۔''

زَمْهَرِیْر ایسی سخت سردی کو کہتے ہیں جو انسان پر زبردست کپکپی طاری کر دے۔ چنانچہ جنت میں اہلِ جنت کو نہ تو دھوپ کی تپش تنگ کرے گی اور نہ ہی انہیں ٹھٹھرنے والی سردی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ گویا جنت میں مسلسل معتدل موسم کا سماں ہوگا۔

آیت ۱۴ ﴿وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا﴾ ''اور جنت کے سائے ان کے اوپر جھکے ہوئے ہوں گے''

﴿وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ۝۱۴﴾ ''اور اس کے پھلوں کے خوشے نیچے جھکے ہوئے لٹک رہے ہوں گے۔''

آیت ۱۵ ﴿وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا ۝۱۵﴾ ''اور گردش میں ہوں گے ان پر (خُدامِ جنت) چاندی کے برتنوں اور شیشے کے پیالوں کے ساتھ۔''

آیت ۱۶ ﴿قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ﴾ ''ایسا شیشہ جو چاندی کا ہوگا''

دراصل وہ آب خورے یا جام انتہائی نفیس اور شفاف (crystal clear) چاندی سے بنے ہوں گے، لیکن دیکھنے میں وہ شیشے جیسے ہوں گے۔

﴿قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ۝۱۶﴾ ''ان کو (ساقیانِ جنت نے) بھرا ہوگا بھرپور اندازے کے مطابق۔''

آیت ۱۷ ﴿وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ۝۱۷﴾ ''اور ان کو پلایا جائے گا اس میں ایسا جام کہ جس میں ملونی ہوگی سونٹھ کی۔''

آیت ۱۸ ﴿عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ۝۱۸﴾ ''یہ ایک چشمہ ہے اس (جنت) میں جس کا نام سلسبیل ہے۔''

آیت ۱۹ ﴿وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ﴾ ''اور ان پر گردش میں رہیں گے ایسے لڑکے (خُدامِ جنت) جو ہمیشہ اسی

عمر (اور شکل میں رہیں گے۔''

﴿اِذَا رَاَیْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ﴿۱۹﴾﴾ ''جب تم انہیں دیکھو گے تو محسوس کرو گے کہ جیسے وہ موتی ہیں بکھرے ہوئے۔''

یعنی وہ نوعمر خادم نہایت خوبصورت ہوں گے۔

آیت ۲۰ ﴿وَاِذَا رَاَیْتَ ثَمَّ رَاَیْتَ نَعِیْمًا وَّ مُلْكًا كَبِیْرًا ﴿۲۰﴾﴾ ''اور تم جہاں بھی دیکھو گے وہیں نعمتیں ہی نعمتیں اور بہت بڑی بادشاہی دیکھو گے۔''

آیت ۲۱ ﴿عٰلِیَهُمْ ثِیَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّ اِسْتَبْرَقٌ ۫﴾ ''ان کے اوپر لباس ہوں گے باریک سبز ریشم کے اور گاڑھے ریشم کے''

﴿وَّ حُلُّوْۤا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ﴾ ''اور انہیں کنگن پہنائے جائیں گے چاندی کے۔''

﴿وَ سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿۲۱﴾﴾ ''اور پلائے گا انہیں ان کا پروردگار نہایت پاکیزہ مشروب۔''

آیت ۲۲ ﴿اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّ كَانَ سَعْیُكُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۲۲﴾﴾ ''(اور کہا جائے گا:) یہ تم لوگوں کے لیے بدلہ ہے اور تمہاری جدّ و جُہد مقبول ہو چکی ہے۔''

تم لوگ اپنی دنیوی زندگی میں غلبۂ دین کے لیے جو جدّ و جُہد کرتے رہے تھے وہ اللہ کے ہاں قبول کر لی گئی ہے اور اس کی قدردانی کے طور پر تم لوگوں کو جنّت اور اس کی نعمتوں سے نوازا جا رہا ہے۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ!

آیات ۲۳ تا ۳۱

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِیْلًا ﴿۲۳﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَ لَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴿۲۴﴾ وَ اذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا ﴿۲۵﴾ وَ مِنَ الَّیْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَ سَبِّحْهُ لَیْلًا طَوِیْلًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ یُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَ یَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ یَوْمًا ثَقِیْلًا ﴿۲۷﴾ نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَ شَدَدْنَاۤ اَسْرَهُمْ ۚ وَ اِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَاۤ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِیْلًا ﴿۲۸﴾ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِیْلًا ﴿۲۹﴾ وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ﴿۳۰﴾ یُّدْخِلُ مَنْ یَّشَآءُ فِیْ رَحْمَتِهٖ ؕ وَ الظّٰلِمِیْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ﴿۳۱﴾ ع

آیت ۲۳ ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِیْلًا ﴿۲۳﴾﴾ ''(اے نبی ﷺ) ہم نے ہی نازل کیا ہے آپ پر قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے۔''

آیت ۲۴ ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ﴾ ''تو آپ انتظار کیجیے اپنے رب کے حکم کا''

ربطِ مضمون کے اعتبار سے یوں سمجھئے کہ ان آیات کا تعلق سورۃ القیامہ کی ان آیات سے ہے: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ

بِهٖ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾ ''آپؐ اس (قرآن) کے ساتھ اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں۔ اسے جمع کرنا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے''۔ یعنی ہم نے قرآن مجید کو بطرزِ تنزیل (تھوڑا تھوڑا کر کے) ہی نازل کرنا ہے' ہماری مشیت اسی میں ہے۔ ہمارا ہر حکم اور ہر فیصلہ اُسی وقت پر نازل ہوگا جو وقت ہم نے اس کے نزول کے لیے طے کر رکھا ہے۔ چنانچہ آپؐ کو نہ صرف نزولِ قرآن کے حوالے سے صبر کرنا ہے بلکہ مخالفت کا سامنا کرتے ہوئے بھی آپؐ کو اپنے رب کے احکام کا منتظر رہنا ہے۔

﴿وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴿۲۴﴾﴾ ''اور آپؐ ان میں سے کسی گناہگار یا ناشکرے کی باتوں پر دھیان نہ دیجیے۔''

آیت ۲۵ ﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۲۵﴾﴾ ''اور اپنے رب کے نام کا ذکر کیجیے صبح و شام۔''

آیت ۲۶ ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ﴾ ''اور رات کے ایک حصے میں اُس کے لیے سجدہ کیا کیجیے''

﴿وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ﴿۲۶﴾﴾ ''اور رات کے بڑے حصے میں اُس کی تسبیح کیا کیجیے۔''

یہ اسی حکم کا تسلسل ہے جو سورۃ المزمل کی ابتدائی آیات میں دیا گیا تھا۔ یعنی آپؐ رات کا بیشتر حصہ اللہ کے حضور کھڑے ہو کر قرآن پڑھنے' اُس کے حضور سربسجود رہنے اور اُس کی تسبیح کرنے میں صرف کیا کریں۔ اُس وقت تک چونکہ ابھی نماز پنجگانہ کا حکم نہیں آیا تھا' اس لیے سارا زور رات کی عبادت پر تھا۔ بعد میں جب نماز پنجگانہ کی فرضیت کا حکم آ گیا تو اس ''قیام اللیل'' کو مختصر کر کے تہجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ وہ بھی سب کے لیے نہیں صرف حضور ﷺ کے لیے: ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ﴾ (بنی اسراءیل:۷۹)۔ نَافِلَة کے لفظی معنی اضافی اور زائد کے ہیں۔ یعنی حضور ﷺ کے لیے نماز تہجد باقی فرض نمازوں کے علاوہ اضافی فرض کے درجے میں تھی' جبکہ اُمت کے لیے اس کی حیثیت نفل کی ہے۔

آیت ۲۷ ﴿اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ﴿۲۷﴾﴾ ''یقیناً یہ لوگ فوری ملنے والی چیز (دنیا) سے محبت کرتے ہیں اور ایک بھاری دن جو ان کے پیچھے آنے والا ہے' اس کا دھیان چھوڑے بیٹھے ہیں۔''

یعنی قیامت کا سخت دن: ﴿يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ﴿۱۷﴾﴾ (المزمل) ''وہ دن جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا'' ——— زیر مطالعہ آیت کے مضمون کا ربط سورۃ القیامہ کی ان آیات کے ساتھ ہے: ﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿۲۰﴾ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۲۱﴾﴾ ''ہرگز نہیں! اصل میں تم لوگ عاجلہ (جلد ملنے والی چیز) سے محبت کرتے ہو۔ اور تم آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔''

آیت ۲۸ ﴿نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ ۚ﴾ ''ہم نے ہی ان کو تخلیق فرمایا ہے اور ان کے جوڑ بند مضبوط کیے ہیں۔''

﴿وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا ﴿۲۸﴾﴾ ''اور ہم جب چاہیں گے ان جیسے بدل کر اور لے آئیں گے۔''

عام طور پر اس آیت کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے ایک قوم کو ختم کر کے اس کی جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے۔ لیکن اس سے پہلے چونکہ انسانی تخلیق اور انسانی جسم کے جوڑ بند درست کرنے کا ذکر ہوا ہے اس لیے میرے نزدیک اس جملے کا درست مفہوم یہ ہے کہ آخرت میں ہم ان لوگوں کو ان کے دنیوی زندگی والے جسموں جیسے اور جسم عطا کر دیں گے۔ واضح رہے کہ یہ مضمون قبل ازیں سورۂ بنی اسرائیل:۹۹' سورۂ یٰسٓ:۸۱ اور سورۃ الواقعہ:۶۱ میں بھی آ چکا ہے۔

آیت ۲۹ ﴿اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ﴾ ''یقیناً یہ تو ایک یاددہانی ہے۔''

﴿فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝۲۹﴾ ''تو جو چاہے اپنے ربّ کی طرف راستہ اختیار کر لے۔''

یعنی جس کا جی چاہے اپنے رب کے قرب کا راستہ اختیار کر لے۔ اس مضمون کے حوالے سے صوفیاء کے ہاں سیر اِلی اللہ' تقرب اِلی اللہ' سلوک اِلی اللہ وغیرہ اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔

آیت ۳۰ ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ﴾ ''اور تمہارے چاہے کچھ نہیں ہو سکتا' جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۳۰﴾ ''یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا' کمال حکمت والا ہے۔''

آیت ۳۱ ﴿يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ﴾ ''وہ داخل کرے گا اپنی رحمت میں جس کو چاہے گا۔''

ظاہر ہے دنیا و آخرت کا کوئی کام بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ہم اللہ کے حکم اور اذن کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی شخص ایک کام کرنے پر بظاہر قادر بھی ہو تو وہ اس کام کو اُس وقت تک انجام نہیں دے سکتا جب تک اس کی مشیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی شامل نہ ہو۔ اہلِ سُنّت کا عقیدہ ہے کہ جس طرح ہم خود اللہ کی مخلوق ہیں اسی طرح ہمارے تمام اعمال بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ سورۃ الصّٰفّٰت میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۹۶﴾ کہ اللہ نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور تمہارے اعمال کو بھی۔ اس مفہوم میں ہر انسان اپنی نیت اور اپنے ارادے کی بنا پر ''کاسبِ اعمال'' ہے' جبکہ ''خالقِ اعمال'' اللہ تعالیٰ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے گا اسے ایسے اعمال کی توفیق دے گا جن کی بنا پر وہ اُس کی رحمت کا مستحق ٹھہرے گا۔

اس جملے کا ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ داخل کرے گا اپنی رحمت میں اُسے جو چاہے گا۔ یعنی وہ صرف اُسی شخص کو اپنی رحمت کے سائے میں جگہ دے گا جو اُس کی رحمت کا مستحق بننے کے لیے کوشاں ہوگا۔ جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝۱۹﴾ یعنی جس شخص نے آخرت کو اپنا اصل مقصود بنا لیا اور اس کے لیے اس نے مقدور بھر محنت بھی کی اور وہ مؤمن بھی ہو تو اُس کی وہ محنت اور کوشش اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول و مشکور ہوگی۔

﴿وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۳۱﴾ ''اور رہے ظالم' تو ان کے لیے اُس نے بہت دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

اَللّٰھُمَّ اَعِذْنَا مِنْ ذٰلِکَ ! اَللّٰھُمَّ اَجِرْنَا مِنْ ذٰلِکَ!

سُوْرَةُ الْمُرْسَلٰتِ

تمہیدی کلمات

سورۃ المرسلات انتیسویں پارے کی آخری سورت ہے۔ جوڑے کے اعتبار سے اس کا تعلق تیسویں پارے کی پہلی سورت یعنی سورۃ النبا کے ساتھ ہے۔ دونوں سورتوں کے مضمون، اسلوب اور آیات کی ترتیب میں گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔ سورۃ المرسلات پچاس آیات پر مشتمل ہے۔ اس کے پہلے رکوع میں چالیس جبکہ دوسرے رکوع میں دس آیات ہیں۔ سورۃ النبا کی کُل چالیس آیات ہیں۔ اس کے پہلے رکوع میں تیس آیات ہیں، جبکہ سورۃ المرسلات کی طرح اس کا بھی دوسرا رکوع دس آیات پر مشتمل ہے۔ سورۃ المرسلات کے آغاز میں پے در پے قسموں کا ذکر ہے۔ اس خصوصی انداز کے اعتبار سے یہ قرآن مجید کی تیسری سورت ہے۔ اس سے پہلے ہم ایسی دو سورتوں کا مطالعہ کر چکے ہیں جن کا آغاز اسی طرح پے در پے قسموں سے ہوتا ہے۔ یعنی تیئیسویں پارے کی سورۃ الصافات اور چھبیسویں پارے کی سورۃ الذاریات۔ سورۃ الصافات کے آغاز کی قسموں کا مفہوم تو بالکل واضح ہے کہ ان میں فرشتوں کی خصوصیات بیان ہوئی ہیں۔ اسی طرح سورۃ الذاریات کی قسموں کے بارے میں بھی مفسرین کا اجماع ہے کہ ان سے ہوائیں مراد ہیں، لیکن زیر مطالعہ سورت کی قسموں کے بارے میں مفسرین کی آراء مختلف ہیں۔ کچھ مفسرین ان سے ہوائیں مراد لیتے ہیں، جبکہ کچھ کا خیال ہے کہ ان میں فرشتوں کا ذکر ہے۔

آیات ۱ تا ۴۰

سُوْرَةُ الْمُرْسَلٰتِ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۵۰ رُكُوْعَاتُهَا: ۲

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ۙ﴿۱﴾ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ۙ﴿۲﴾ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ۙ﴿۳﴾ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ۙ﴿۴﴾ فَالْمُلْقِيٰتِ
ذِكْرًا ۙ﴿۵﴾ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ۙ﴿۶﴾ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ؕ﴿۷﴾ فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۙ﴿۸﴾ وَ اِذَا السَّمَآءُ
فُرِجَتْ ۙ﴿۹﴾ وَ اِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۙ﴿۱۰﴾ وَ اِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ؕ﴿۱۱﴾ لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ ؕ﴿۱۲﴾ لِيَوْمِ
الْفَصْلِ ۚ﴿۱۳﴾ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ؕ﴿۱۴﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۵﴾ اَلَمْ نُهْلِكِ
الْاَوَّلِيْنَ ؕ﴿۱۶﴾ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۸﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ
لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۙ﴿۲۰﴾ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۙ﴿۲۱﴾ اِلٰى قَدَرٍ
مَّعْلُوْمٍ ۙ﴿۲۲﴾ فَقَدَرْنَا ۟ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۴﴾ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ

كِفَاتًا ﴿۲۵﴾ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ﴿۲۶﴾ وَّ جَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّ اَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ﴿۲۷﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۹﴾ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿۳۰﴾ لَّا ظَلِيْلٍ وَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ﴿۳۱﴾ اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ﴿۳۲﴾ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿۳۳﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۴﴾ هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَ لَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۷﴾ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۚ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ﴿۳۹﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۰﴾ ع

آیت ۱ ﴿وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ﴿۱﴾﴾ ''قسم ہے اُن ہواؤں کی جو چلائی جاتی ہیں بڑی آہستگی سے۔''

اللہ تعالیٰ ان ہواؤں کو خاص مقاصد کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت چلاتا ہے۔

آیت ۲ ﴿فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ﴿۲﴾﴾ ''پھر تیز و تند جھکڑ کی صورت میں چلتی ہیں۔''

آیت ۳ ﴿وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ﴿۳﴾﴾ ''اور اُن ہواؤں کی قسم جو (بادلوں کو) پھیلا دیتی ہیں۔''

آیت ۴ ﴿فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ﴿۴﴾﴾ ''پھر تقسیم کرتی ہیں جُدا جُدا۔''

سورۃ الذّاریات میں ہواؤں کی اس خصوصیت کا ذکر ﴿فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ﴿۴﴾﴾ کے الفاظ میں ہوا ہے۔ یعنی ہوائیں سمندر سے بخارات کو بادلوں کی صورت میں دور دراز علاقوں تک لے جاتی ہیں' پھر وہ اس پانی کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق مختلف علاقوں میں بارش کی صورت میں تقسیم کرتی ہیں۔ اس تقسیم میں ان کا معاملہ ہر جگہ یکساں نہیں ہوتا بلکہ جُدا جُدا ہوتا ہے۔ کہیں اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت سے جَل تھَل ہو جاتا ہے اور کوئی علاقہ خشک رہ جاتا ہے۔

آیت ۵ ﴿فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ﴿۵﴾﴾ ''پھر قسم ہے اُن (فرشتوں) کی جو ذکر کا القاء کرتے ہیں۔''

گزشتہ چار آیات کے بارے میں تقریباً تمام مفسرین متفق ہیں کہ ان میں ہواؤں کا ذکر ہے۔ البتہ اس آیت کے حوالے سے زیادہ تر مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے فرشتے مراد ہیں' جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی لے کر آتے ہیں۔ البتہ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اس آیت میں بھی ہواؤں ہی کا تذکرہ ہے۔ اس حوالے سے ان مفسرین کا استدلال یہ ہے کہ کسی نبی یا کسی داعی کی آواز بھی تو ہوا ہی کے ذریعے سے لوگوں تک پہنچتی ہے۔ یعنی پیغامات و معلومات کی ترسیل و تقسیم کا ذریعہ (medium) تو بہرحال ہوا ہی ہے۔

آیت ۶ ﴿عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ﴿۶﴾﴾ ''عذر کے طور پر یا خبردار کرنے کے لیے۔''

وحی یا ذکر (یاددہانی) کا ابلاغ یا تو اس لیے ہوتا ہے کہ لوگوں پر اتمامِ حُجّت ہو اور ان کا عذر ختم ہو جائے۔ جیسا کہ سورۃ النساء کی آیت ۱۶۵ میں انبیاء و رسل علیہم السلام کی بعثت کا مقصد واضح کرتے ہوئے فرمایا گیا: ﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ﴾ ''تاکہ نہ رہ جائے لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حُجّت (دلیل) رسولوں کے آنے کے بعد''۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام رسولوں کو دنیا میں اسی لیے بھیجا تھا کہ ان کی بعثت کے بعد لوگوں کے پاس اُس کے ہاں پیش کرنے کے لیے کوئی عذر نہ رہ جائے۔ وحی یا یاددہانی کا دوسرا مقصد یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ لوگوں کو خبردار کرنے (نُذْرًا) کے لیے ہوتی ہے کہ اگر وہ جاگنا چاہیں تو جاگ

جائیں اور راہِ راست پر آنا چاہیں تو آ جائیں۔

اب اگلی آیت میں ان قسموں کے مُقسَم علیہ کا ذکر ہے کہ یہ قسمیں کس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کھائی گئی ہیں:

آیت ۷ ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۝۷﴾ ''جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ واقع ہو کر رہے گی۔''

یعنی جس قیامت کے بارے میں تم لوگوں کو بار بار متنبہ کیا جا رہا ہے وہ ضرور آ کر رہے گی۔ واضح رہے کہ سورۂ قٓ سے لے کر سورۃ الناس تک مکّی سورتوں کا موضوع انذارِ آخرت ہے۔ اس لیے سورۃ الذّاریات کی قسموں کا مُقسَم علیہ بھی انذارِ آخرت ہی سے متعلق تھا: ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝۵ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝۶﴾ ''جو وعدہ تمہیں دیا جا رہا ہے وہ یقیناً سچ ہے۔ اور جزا و سزا ضرور واقع ہو کر رہے گی''۔ البتہ سورۃ الصافات کے آغاز میں مذکور قسموں کا انداز تو بالکل ایسا ہی ہے لیکن وہاں ان قسموں کے مُقسَم علیہ کا تعلق توحید سے ہے: ﴿اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۝۴﴾ ''یقیناً تمہارا اِلٰہ ایک ہی ہے''۔ اس لیے کہ سورۃ الصافات کا تعلق سورتوں کے جس گروپ سے ہے اس گروپ کا مرکزی مضمون ہی توحید ہے۔

آیت ۸ ﴿فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۝۸﴾ ''پس جب ستارے مٹا دیے جائیں گے۔''

یعنی بے نور کر دیے جائیں گے اور ان کی روشنی ختم ہو جائے گی۔

آیت ۹ ﴿وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۝۹﴾ ''اور جب آسمان میں شگاف پڑ جائیں گے۔''

ایسی آیات ہمارے لیے آیاتِ متشابہات کا درجہ رکھتی ہیں۔ البتہ توقع کی جا سکتی ہے کہ جیسے جیسے سائنسی ترقی کی بدولت انسان کی معلومات بڑھیں گی' ان آیات کا مفہوم بتدریج واضح ہوتا چلا جائے گا۔

آیت ۱۰ ﴿وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۝۱۰﴾ ''اور جب پہاڑ (ریت بنا کر) اُڑا دیے جائیں گے۔''

قیامت کے زلزلے کے باعث پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر ریت کے ٹیلوں کی مانند ہو جائیں گے اور ان ٹیلوں کے ذرّات ہوا میں اُڑتے پھریں گے۔

آیت ۱۱ ﴿وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ۝۱۱﴾ ''اور جب رسولوںؑ (کے کھڑے ہونے) کا وقت آ پہنچے گا۔''

جب انبیاء و رسل علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی عدالت میں شہادتیں دینے کے لیے کھڑے ہوں گے۔

آیت ۱۲ ﴿لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ ۝۱۲﴾ ''(یہ معاملہ) کس دن کے لیے مؤخر کیا گیا ہے؟''

آیت ۱۳ ﴿لِيَوْمِ الْفَصْلِ ۝۱۳﴾ ''فیصلے کے دن کے لیے۔''

یعنی انبیاء و رسل علیہم السلام کی اپنی اپنی قوموں کے خلاف گواہی (کہ اے اللہ! ہم نے تیرا پیغام ان لوگوں تک پہنچا دیا تھا' اب یہ لوگ خود جوابدہ ہیں) اور خود متعلقہ اقوام کے افراد سے پوچھ گچھ جیسے معاملات اسی فیصلے کے دن کے لیے مؤخر کیے گئے ہیں۔

آیت ۱۴ ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۝۱۴﴾ ''اور تم لوگ کیا سمجھتے ہو کہ فیصلے کا دن کیا ہے؟''

آیت ۱۵ ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۱۵﴾ ''(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔''

لفظ ''وَیْل'' کے معنی تباہی اور بربادی کے بھی ہیں اور یہ جہنّم کی ایک وادی کا نام بھی ہے' جس کی سختیوں سے خود جہنّم بھی پناہ مانگتی ہے۔

آیت ۱۶ ﴿اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶﴾﴾ ''کیا ہم نے پہلوں کو ہلاک نہیں کیا؟''

آیت ۱۷ ﴿ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۷﴾﴾ ''پھر ہم ان کے پیچھے لگاتے رہے بعد میں آنے والوں کو۔''

اس سے نوعِ انسانی کی مختلف نسلوں کا یکے بعد دیگرے معمول کے مطابق دنیا میں آنا بھی مراد ہے اور ایک قوم کی تباہی کے بعد اس کی جگہ دوسری قوم کا اٹھایا جانا بھی۔ جیسے قومِ نوحؑ کی ہلاکت کے بعد قومِ عاد اور قومِ عاد کی بربادی کے بعد قومِ ثمود کو پیدا کیا گیا۔

آیت ۱۸ ﴿كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۸﴾﴾ ''اسی طرح ہم کرتے رہے ہیں مجرموں کے ساتھ۔''

آیت ۱۹ ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۹﴾﴾ ''(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔''

یہ اس سورت کی ترجیعی (بار بار دہرائی جانے والی) آیت ہے جو اس میں دس مرتبہ آئی ہے۔

آیت ۲۰ ﴿اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴿۲۰﴾﴾ ''کیا ہم نے تمہیں حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا؟''

انسان کا مادۂ تخلیق ایسی گھٹیا چیز ہے کہ جس کا نام بھی کوئی اپنی زبان پر لانا پسند نہیں کرتا۔ سورۃ الدھر میں اس حقیقت کا ذکر اس طرح آیا ہے: ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ﴿۱﴾﴾ ''کیا انسان پر اس زمانے میں ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے جبکہ وہ کوئی قابلِ ذکر شے نہیں تھا؟''

آیت ۲۱ ﴿فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۲۱﴾﴾ ''پھر ہم نے اس (نطفے) کو رکھ دیا ایک محفوظ مقام میں۔''

یعنی اس حقیر پانی کی بوند کو مختلف مراحل سے گزارنے کے لیے ہم نے اسے ایک محفوظ مقام یعنی رحمِ مادر میں رکھا جو اس کے لیے ایک مضبوط قلعے کی حیثیت رکھتا ہے۔

آیت ۲۲ ﴿اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۲﴾﴾ ''ایک طے شدہ مدت تک۔''

آیت ۲۳ ﴿فَقَدَرْنَا ۟ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿۲۳﴾﴾ ''تو ہم نے اندازہ مقرر کیا اور ہم کیا ہی اچھے ہیں اندازہ مقرر کرنے والے!''

اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ہم نے یہ سب کچھ اپنی قدرت سے کیا اور ہم کیا ہی اچھی قدرت رکھنے والے ہیں!

آیت ۲۴ ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۴﴾﴾ ''(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔''

آیت ۲۵ ﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ﴿۲۵﴾﴾ ''کیا ہم نے زمین کو نہیں بنا دیا سمیٹ لینے والی؟''

آیت ۲۶ ﴿اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ﴿۲۶﴾﴾ ''زندوں کو بھی اور مُردوں کو بھی!''

اللہ تعالیٰ نے یہ زمین ایسی بنائی ہے کہ یہ اپنے اوپر موجود ہر زندہ وجود کی تمام ضروریات پوری کر رہی ہے اور ہر قسم کے مردہ کو بھی تحلیل کر کے اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ اس حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں ایسی گنجائش رکھی ہے کہ یہ تا قیامِ قیامت تمام زندوں اور تمام مُردوں کے لیے کفایت کرے گی۔

آیت ۲۷ ﴿وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ﴿۲۷﴾﴾ ''اور ہم نے اس کے اندر بنا دیے خوب جمے ہوئے اونچے اونچے پہاڑ اور ہم نے تمہیں پلایا (اس میں سے) تسکین بخش پانی۔''

آیت ۲۸ ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۸﴾﴾ ''(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔''

ان تمام آیات میں تذکیر بآلاء اللہ کا انداز ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرتوں، نعمتوں اور اُس کے احسانات کے ذکر سے یاد دہانی کرائی جارہی ہے۔

آیت ۲۹ ﴿اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰی مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝۲۹﴾ ''چلو اب اُسی چیز کی طرف جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔''

یعنی جہنم کی آگ کی طرف۔ یہ وہ حکم ہے جو میدانِ محشر میں اہلِ جہنم کو سنایا جائے گا۔

آیت ۳۰ ﴿اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰی ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۝۳۰﴾ ''چلو اُس تین شاخوں والے سائے کی طرف!''

میدانِ محشر کی چلچلاتی دھوپ اور شدید گرمی میں جب وہ لوگ جہنم کو دیکھیں گے تو دور سے وہ انہیں تین اطراف میں پھیلے ہوئے سائے والی کسی جگہ کی طرح نظر آئے گی۔ چنانچہ انہیں کہا جائے گا کہ اگر تمہیں وہ سایہ نظر آتا ہے تو چلو اُس سائے کی طرف! لیکن اس ''سائے'' کی حقیقت یہ ہوگی کہ:

آیت ۳۱ ﴿لَّا ظَلِیْلٍ وَّلَا یُغْنِیْ مِنَ اللَّهَبِ ۝۳۱﴾ ''نہ تو وہ سایہ دار ہے اور نہ ہی آگ کی تپش سے بچانے والا۔''

آیت ۳۲ ﴿اِنَّهَا تَرْمِیْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ۝۳۲﴾ ''وہ آگ اتنے بڑے بڑے انگارے پھینک رہی ہوگی جیسے کہ وہ محل ہوں۔''

آیت ۳۳ ﴿كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ۝۳۳﴾ ''(یا) جیسے وہ زرد رنگ کے اونٹ ہوں۔''

آیت ۳۴ ﴿وَیْلٌ یَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ۝۳۴﴾ ''(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔''

آیت ۳۵ ﴿هٰذَا یَوْمُ لَا یَنْطِقُوْنَ ۝۳۵﴾ ''یہ ہے وہ دن جس میں یہ بول نہیں سکیں گے۔''

آیت ۳۶ ﴿وَلَا یُؤْذَنُ لَهُمْ فَیَعْتَذِرُوْنَ ۝۳۶﴾ ''اور نہ ہی انہیں اجازت دی جائے گی کہ وہ کوئی عذر تراشیں۔''

آیت ۳۷ ﴿وَیْلٌ یَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ۝۳۷﴾ ''(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔''

آیت ۳۸ ﴿هٰذَا یَوْمُ الْفَصْلِ ۚ﴾ ''یہ ہے فیصلے کا دن''

﴿جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِیْنَ ۝۳۸﴾ ''ہم نے جمع کرلیا تمہیں بھی اور پہلوں کو بھی۔''

آیت ۳۹ ﴿فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَیْدٌ فَكِیْدُوْنِ ۝۳۹﴾ ''اب اگر تمہارے پاس کوئی چال ہے تو میرے خلاف وہ چال چل دیکھو۔''

آیت ۴۰ ﴿وَیْلٌ یَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ۝۴۰﴾ ''(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔''

آیات ۴۱ تا ۵۰

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ ظِلٰلٍ وَّ عُیُوْنٍ ۝۴۱ وَّ فَوَاكِهَ مِمَّا یَشْتَهُوْنَ ۝۴۲ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِیْٓـًٔۢا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۴۳ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝۴۴ وَیْلٌ یَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ۝۴۵ كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِیْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ۝۴۶ وَیْلٌ یَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ۝۴۷ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا یَرْكَعُوْنَ ۝۴۸ وَیْلٌ یَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ۝۴۹ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ ۝۵۰

اب دوسرے رکوع کی دس آیات میں تصویر کا دوسرا رخ دکھایا جا رہا ہے۔ یہاں شروع میں اہلِ ایمان کا احوال بیان ہوا ہے اور آخر میں انتہائی اختصار کے ساتھ کُفار کا ذکر آیا ہے۔

آیت ۴۱ ﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ۝۴۱﴾ ''(اُس دن) متقین یقیناً سائے اور چشموں کے ماحول میں ہوں گے۔''

آیت ۴۲ ﴿وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ۝۴۲﴾ ''اور ایسے پھلوں کے اندر جو انہیں پسند ہوں گے۔''

انہیں ایسے پھل دیے جائیں گے جنہیں کھانا انہیں بہت مرغوب ہوگا۔

آیت ۴۳ ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۴۳﴾ ''(اور ہم ان سے کہہ دیں گے) کھاؤ' پیو مزے سے رچتا پچتا' ان اعمال کے انعام کے طور پر جو تم کرتے رہے تھے۔''

آیت ۴۴ ﴿اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝۴۴﴾ ''یقیناً ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں اپنے محسن بندوں کو۔''

آیت ۴۵ ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۴۵﴾ ''(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔''

اس کے بعد اب روئے سخن پھر کُفار و مشرکین کی طرف ہو گیا ہے۔

آیت ۴۶ ﴿كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ۝۴۶﴾ ''(اے کُفار و مشرکین!) تم کھا پی لو تھوڑی دیر کے لیے' یقیناً تم لوگ مجرم ہو۔''

تم لوگ اپنی دُنیوی زندگی میں عیش کر رہے ہو تو کرتے جاؤ۔ بالآخر قیامت کے دن تمہیں مجرموں کی حیثیت سے ہمارے سامنے پیش ہونا ہے۔

آیت ۴۷ ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۴۷﴾ ''جس دن ہلاکت اور بربادی ہوگی (تمہارے جیسے تمام) جھٹلانے والوں کے لیے۔''

آیت ۴۸ ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ۝۴۸﴾ ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (اپنے رب کے سامنے) جھکو تو یہ جھکتے نہیں ہیں۔''

آیت ۴۹ ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۴۹﴾ ''(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔''

آیت ۵۰ ﴿فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ۝۵۰﴾ ''تو اب اس (قرآن) کے بعد یہ اور کس کلام پر ایمان لائیں گے؟''

قرآن جیسا کلام سن کر بھی جس انسان کی آنکھیں نہیں کھلیں' تو اس کے بعد اس کی آنکھیں بھلا کب کھلیں گی؟

سُوْرَةُ النَّبَا

آیات ۱ تا ۳۰

سُوْرَةُ النَّبَا مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۴۰ رُكُوْعَاتُهَا: ۲

الجزء الثلاثون (۳۰)

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝۱ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝۲ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝۳ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝۴ ثُمَّ
كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝۵ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝۶ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝۷ وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۝۸ وَّ
جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝۹ وَّ جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۝۱۰ وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝۱۱ وَّ بَنَيْنَا فَوْقَكُمْ
سَبْعًا شِدَادًا ۝۱۲ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۝۱۳ وَّ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۝۱۴ لِّنُخْرِجَ
بِهٖ حَبًّا وَّ نَبَاتًا ۝۱۵ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۝۱۶ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ۝۱۷ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ
فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ۝۱۸ وَّ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۝۱۹ وَّ سُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝۲۰
اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۝۲۱ لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا ۝۲۲ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ۝۲۳ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا
وَّ لَا شَرَابًا ۝۲۴ اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ۝۲۵ جَزَآءً وِّفَاقًا ۝۲۶ اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ۝۲۷ وَّ
ع كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ۝۲۸ وَ كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ۝۲۹ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ۝۳۰

آیت ۱ ﴿عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝۱﴾ ''کس چیز کے بارے میں یہ لوگ آپس میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں؟''

یہ منظر کشی کا بہت خوبصورت انداز ہے۔ ان دو الفاظ میں گویا اس بے چینی اور ہلچل کی تصویر کھینچ دی گئی ہے جو اہلِ مکہ کے ہاں رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے سبب پیدا ہو گئی تھی۔ جیسے ہر شخص کے ذہن میں ایک ہی سوال ہو کہ محمد (ﷺ) نے یہ کیا نئی بات کر دی ہے؟ یہ بھلا کیا بات ہوئی کہ ایک دن یہ دنیا ختم ہو جائے گی! پھر قیامت برپا ہو گی! تمام انسانوں کو پھر سے زندہ کر لیا جائے گا! ہر انسان سے اس کے ایک ایک عمل کا حساب ہو گا! وہاں کوئی کسی کا پُرسانِ حال اور مددگار نہیں ہو گا! بھلا یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟ مرنے کے بعد سب کا پھر سے زندہ ہو جانا؟ اتنے انسانوں کا حساب کتاب؟ ایک ایک عمل کا محاسبہ؟ نہیں، نہیں عقل نہیں مانتی! گویا مکہ کے ہر گھر میں یہی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں، ہر محفل اور ہر چوپال میں انہی سوالات پر تبصرے ہو رہے ہیں، پورے شہر کی فضا میں ایک یہی موضوعِ گردش کر رہا ہے۔ غرض جہاں کہیں چار لوگ اکٹھے ہوتے ہیں ان کی گفتگو کی تان یہیں پر آ کر ٹوٹتی ہے۔

آیت ۲ ﴿عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝۲﴾ ''اُس بڑی خبر کے بارے میں۔''

یعنی قیامت کی خبر کے بارے میں۔ جیسے سورۃ المدثر میں فرمایا گیا ہے: ﴿اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ۝۳۵﴾ ''یقیناً یہ بہت بڑی

باتوں میں سے ایک بات ہے۔''

آیت ۳ ﴿الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝۳﴾ ''جس کے بارے میں یہ اختلافِ رائے میں مبتلا ہو گئے ہیں۔''

قیامت کے بارے میں تفصیلات سن کر ان میں سے کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ کوئی کہتا ہے کہ مرنے کے بعد انسانوں کا دوبارہ زندہ ہونا بالکل بعید از قیاس ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ہمارے معبودوں کے ہوتے ہوئے ہم سے کوئی محاسبہ نہیں ہو سکتا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں! ہر کوئی اپنی اپنی رائے دے رہا ہے۔

آیت ۴ ﴿كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝۴﴾ ''نہیں! عنقریب یہ جان لیں گے۔''

عنقریب اصل حقیقت ان لوگوں پر منکشف ہو جائے گی۔ وقت آنے پر یہ لوگ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیں گے۔ سورۂ قٓ میں اس کیفیت کا ذکر اس طرح ہوا ہے: ﴿لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۝۲۲﴾ ''(اللہ فرمائے گا: اے انسان!) تو اس دن سے غفلت میں رہا تھا نا! تو آج ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا ہے' تو آج تمہاری نگاہ کتنی تیز ہو گئی ہے۔''

آیت ۵ ﴿ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝۵﴾ ''ہاں کوئی بات نہیں! عنقریب یہ جان لیں گے۔''

عالمِ دنیا اور عالمِ برزخ کے درمیان صرف موت کا پردہ حائل ہے۔ جونہی کسی انسان کی آنکھ بند ہوتی ہے یہ پردہ اٹھ جاتا ہے۔ قبر عالمِ برزخ کی پہلی منزل ہے۔ اس منزل پر پہنچتے ہی ہر انسان اصل حقیقت کو جان جاتا ہے۔ چنانچہ وہ وقت دور نہیں جب ان میں سے ہر شخص پر اصل حقائق عیاں ہو جائیں گے۔

آیت ۶ ﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝۶﴾ ''کیا ہم نے نہیں بنا دیا زمین کو بچھونا؟''

آیت ۷ ﴿وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝۷﴾ ''اور پہاڑوں کو میخیں؟''

زمین کا توازن برقرار رکھنے کے لیے پہاڑوں کو اس میں میخوں کی طرح گاڑ دیا۔

آیت ۸ ﴿وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۝۸﴾ ''اور تمہیں ہم نے جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا۔''

آیت ۹ ﴿وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝۹﴾ ''اور تمہاری نیند کو بنا دیا ہم نے تھکان دور کرنے والی۔''

آیت ۱۰ ﴿وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۝۱۰﴾ ''اور رات کو ہم نے بنا دیا ڈھانپ لینے والی۔''

آیت ۱۱ ﴿وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝۱۱﴾ ''اور دن کو ہم نے بنا دیا معاش (کی جدوجہد) کے لیے۔''

آیت ۱۲ ﴿وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝۱۲﴾ ''اور تمہارے اوپر بنا دیے ہم نے سات مضبوط آسمان۔''

آیت ۱۳ ﴿وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۝۱۳﴾ ''اور ہم نے (سورج کو) بنا دیا ایک روشن چراغ۔''

آیت ۱۴ ﴿وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۝۱۴﴾ ''اور ہم نے اتار دیا نچڑنے والی بدلیوں سے چھاجوں پانی۔''

یعنی ہم پانی سے لبریز بادلوں سے موسلا دھار بارش برساتے ہیں۔

آیت ۱۵ ﴿لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۝۱۵﴾ ''تاکہ اس کے ذریعے سے ہم نکالیں اناج اور دوسرے نباتات۔''

آیت ۱۶ ﴿وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ﴿۱۶﴾﴾ ''اور بڑے گھنے باغات بھی۔''

آیت ۱۷ ﴿اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِیْقَاتًا ﴿۱۷﴾﴾ ''یقیناً فیصلے کا دن ایک معیّن وقت ہے۔''

یہ ہے وہ اصل بات جس کے لیے بطور تمہید گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی رنگارنگ نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے بنی نوعِ انسان کے لیے اپنی نعمتوں کا اس قدر وسیع دسترخوان بچھایا ہے تو اس نے انسانوں پر لازماً کچھ ذمہ داریاں بھی ڈالی ہوں گی۔ جب خود انسانوں کے ہاں اصول ہے کہ ذمہ داریاں (responsibilities) اور مراعات (privileges) ایک ساتھ چلتی ہیں تو یہ بھلا کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان پر اپنی عطاؤں کی بارش تو کرتا رہے اور اس پر ذمہ داری کوئی بھی نہ ڈالے۔ اس لیے تم لوگ یہ مت سمجھو کہ تم مَن مانی زندگی گزارتے رہو گے اور تم سے کوئی جوابدہی نہیں ہوگی۔ نہیں، تم سے ایک ایک ذمہ داری اور ایک ایک نعمت کا حساب ہوگا اور اس کے لیے ہم نے فیصلے کا ایک دن پہلے سے مقرر کر رکھا ہے۔

آیت ۱۸ ﴿یَّوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ﴿۱۸﴾﴾ ''جس دن پھونکا جائے گا صور میں تو تم سب چلے آؤ گے فوج در فوج۔''

اس کیفیت کا نقشہ سورۃ المعارج میں اس طرح دکھایا گیا ہے: ﴿یَوْمَ یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰی نُصُبٍ یُّوْفِضُوْنَ ﴿۴۳﴾﴾ ''جس دن وہ نکلیں گے اپنی قبروں سے دوڑتے ہوئے، جیسے کہ نشان زدہ اہداف کی طرف بھاگے جا رہے ہوں۔''

آیت ۱۹ ﴿وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ﴿۱۹﴾﴾ ''اور آسمان کھول دیا جائے گا تو اس میں دروازے ہی دروازے بن جائیں گے۔''

آیت ۲۰ ﴿وَّسُیِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ﴿۲۰﴾﴾ ''اور پہاڑ چلا دیے جائیں گے تو وہ ہو جائیں گے چمکتی ہوئی ریت۔''

آیت ۲۱ ﴿اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ﴿۲۱﴾﴾ ''یقیناً جہنم گھات میں ہے۔''

جہنم تو مجرم انسانوں کی صورت میں اپنے ایندھن کا انتظار کر رہی ہے۔

آیت ۲۲ ﴿لِّلطَّاغِیْنَ مَاٰبًا ﴿۲۲﴾﴾ ''وہ ٹھکانہ ہے سرکش لوگوں کا۔''

آیت ۲۳ ﴿لّٰبِثِیْنَ فِیْهَاۤ اَحْقَابًا ﴿۲۳﴾﴾ ''وہ رہیں گے اس میں قرن ہا قرن۔''

آیت ۲۴ ﴿لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ﴿۲۴﴾﴾ ''وہ نہیں چکھیں گے اس میں کوئی ٹھنڈی شے اور نہ کوئی مشروب۔''

آیت ۲۵ ﴿اِلَّا حَمِیْمًا وَّغَسَّاقًا ﴿۲۵﴾﴾ ''سوائے کھولتے ہوئے پانی اور بہتی ہوئی پیپ کے۔''

آیت ۲۶ ﴿جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿۲۶﴾﴾ ''بدلہ (ان کے اعمال کا) پورا پورا۔''

ان لوگوں نے جیسے اعمال کیے ہوں گے، ویسا ہی ان لوگوں کے ساتھ وہاں سلوک کیا جائے گا۔

آیت ۲۷ ﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا یَرْجُوْنَ حِسَابًا ﴿۲۷﴾﴾ ''یہ لوگ کسی حساب کتاب کی کوئی توقع نہیں رکھتے تھے۔''

آیت ۲۸ ﴿وَّكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا كِذَّابًا ﴿۲۸﴾﴾ ''اور انہوں نے جھٹلا دیا تھا ہماری آیات کو دھڑلے کے ساتھ۔''

آیت ۲۹ ﴿وَكُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ كِتٰبًا ﴿۲۹﴾﴾ ''اور ہم نے تو ہر چیز کو گن گن کر لکھ رکھا ہے۔''

آیت ﴿فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ﴾ ''تو اب چکھو! ہم ہرگز اضافہ نہیں کریں گے تمہارے لیے مگر عذاب ہی میں۔''

تمہارے اس عذاب کی شدت ہر لحظہ بڑھتی چلی جائے گی ـــــ اب اگلی آیات میں اہلِ جنت کا ذکر ہے:

آیات ۳۱ تا ۴۰

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ۝ حَدَآئِقَ وَ اَعْنَابًا ۝ وَّ كَوَاعِبَ اَتْرَابًا ۝ وَّ كَاْسًا دِهَاقًا ۝ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّ لَا كِذّٰبًا ۝ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ۝ رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ۝ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا ۝ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ۝ اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۚ يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَ يَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ۝ ع

آیت ۳۱ ﴿اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ﴾ ''یقیناً اہلِ تقویٰ کے لیے کامیابی ہوگی۔''

آیت ۳۲ ﴿حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا ﴾ ''(اُن کے لیے) باغ اور انگور ہوں گے۔''

آیت ۳۳ ﴿وَّ كَوَاعِبَ اَتْرَابًا ﴾ ''اور نوجوان ہم عمر بیویاں۔''

آیت ۳۴ ﴿وَّكَاْسًا دِهَاقًا ﴾ ''اور جام چھلکتے ہوئے۔''

آیت ۳۵ ﴿لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ﴾ ''وہ نہیں سنیں گے اس میں کوئی لغو بات اور نہ جھوٹ۔''

آیت ۳۶ ﴿جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ﴾ ''یہ بدلہ ہوگا آپ کے رب کی طرف سے، دیا ہوا حساب سے۔''

یہ سب کچھ ان لوگوں کی محنت اور قربانیوں کے بدلے کے طور پر انہیں عطا کیا جائے گا۔

آیت ۳۷ ﴿رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ ﴾ ''جو رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے مابین ہے، جو الرحمٰن ہے۔''

﴿لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ﴾ ''ان (میں سے کسی) کو ہمت نہیں ہوگی اس سے بات کرنے کی۔''

آیت ۳۸ ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ﴾ ''جس دن کھڑے ہوں گے جبرائیل اور تمام فرشتے صفیں باندھے۔''

﴿لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ ﴾ ''وہ کوئی بات نہ کر سکیں گے سوائے اُس کے جسے رحمٰن کی طرف سے اجازت مل جائے''

﴿وَقَالَ صَوَابًا ﴾ ''اور وہ بات بھی درست کرے۔''

آیت ۳۹ ﴿ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ﴾ ''یہ دن حق ہے!''

یعنی قیامت کا دن ایک اٹل حقیقت ہے' جیسا کہ سورۃ الواقعہ میں فرمایا گیا: ﴿اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝۱ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝۲﴾ ''جب وہ ہونے والا واقعہ رونما ہو جائے گا۔ (اور جان لو) اس کے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں ہے''۔ سورۃ الحاقہ میں قیامت کے اٹل ہونے کا ذکر اس طرح آیا ہے: ﴿اَلْحَآقَّةُ ۝۱ مَا الْحَآقَّةُ ۝۲ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ۝۳﴾ ''وہ حق ہو جانے والی۔ کیا ہے وہ حق ہو جانے والی؟ اور تم نے کیا سمجھا کہ وہ حق ہونے والی کیا ہے؟''

﴿فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ۝۳۹﴾ ''تو جو چاہے اپنے رب کی طرف اپنا ٹھکانہ بنا لے۔''

آیت ۴۰ ﴿اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۚ﴾ ''دیکھو! ہم نے تو تمہیں خبردار کر دیا ہے اس عذاب سے جو بالکل قریب ہے۔''

تصور کیجیے' یہ عذاب انسان کے کتنا قریب ہے! ادھر انسان کی آنکھ بند ہوتی ہے' ادھر اسے قبر میں اتارنے کا بندوبست کر دیا جاتا ہے۔ اور قبر کیا ہے؟ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ ((اِنَّمَا الْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ اَوْ حُفْرَةٌ مِنْ حُفَرِ النَّارِ))[1] ''قبر یا تو جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا''۔ گویا ہر زندہ انسان اس باغیچے یا گڑھے سے صرف چند گھنٹوں کے فاصلے پر بیٹھا ہے۔

﴿يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ﴾ ''جس دن انسان دیکھ لے گا جو اُس کے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا تھا''

﴿وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ۝۴۰﴾ ''اور کافر کہے گا: کاش کہ میں مٹی ہوتا!''

کاش مجھے شرفِ انسانیت ملا ہی نہ ہوتا! ''مرا اے کاش کہ مادر نہ زادے!'' کاش میری ماں نے مجھے جنا ہی نہ ہوتا![2]

۱۔ سنن الترمذی' کتاب صفة القیامة والرقائق والورع' باب منه' ح:۲۴۶' راوی: ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ۔

۲۔ بعض روایات کے مطابق اللہ تعالیٰ حیوانات کے درمیان بھی عدل و انصاف کے مطابق فیصلہ فرمائے گا' حتیٰ کہ ایک سینگ والی بکری نے بے سینگ والی پر کوئی زیادتی کی ہوگی تو اس کا بھی بدلہ دلائے گا۔ اس سے فراغت کے بعد اللہ تعالیٰ جانوروں کو حکم دے گا کہ مٹی ہو جاؤ۔ چنانچہ وہ مٹی ہو جائیں گے۔ اس وقت کافر بھی آرزو کریں گے کہ کاش وہ بھی حیوان ہوتے اور آج مٹی بن جاتے۔ (تفسیر ابن کثیر)

سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ

سورۃ الصافات' سورۃ الذاریات اور سورۃ المرسلات کے بعد سورۃ النازعات پے در پے قسموں سے شروع ہونے والی قرآن مجید کی چوتھی سورت ہے۔اس سورت کے آغاز میں مذکور قسموں کے بارے میں اکثر مفسرین کی رائے ہے کہ ان میں فرشتوں کا ذکر ہے۔

آیات ۱ تا ۲۶

سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۴۶ رُكُوْعَاتُهَا: ۲

وَ النّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۙ﴿۱﴾ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۙ﴿۲﴾ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۙ﴿۳﴾ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۙ﴿۴﴾ فَالْمُدَبِّرٰتِ
اَمْرًا ۘ﴿۵﴾ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۙ﴿۶﴾ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ؕ﴿۷﴾ قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ۙ﴿۸﴾ اَبْصَارُهَا
خَاشِعَةٌ ؕ﴿۹﴾ يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ؕ﴿۱۰﴾ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ؕ﴿۱۱﴾ قَالُوْا تِلْكَ
اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۘ﴿۱۲﴾ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ﴿۱۳﴾ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ؕ﴿۱۴﴾ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ
مُوْسٰى ۘ﴿۱۵﴾ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۚ﴿۱۶﴾ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۚ﴿۱۷﴾ فَقُلْ
هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۙ﴿۱۸﴾ وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۚ﴿۱۹﴾ فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ۚ﴿۲۰﴾ فَكَذَّبَ
وَ عَصٰى ۙ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ۚ﴿۲۲﴾ فَحَشَرَ فَنَادٰى ۚ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۚ﴿۲۴﴾ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ
الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ؕ﴿۲۵﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ؕ﴿۲۶﴾ ع

آیت ۱ ﴿وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۙ﴿۱﴾﴾ ''قسم ہے اُن (فرشتوں) کی جو غوطہ لگا کر کھینچتے ہیں۔''

نزع کے معنی سختی سے کھینچنے کے ہیں۔یعنی ان فرشتوں کی قسم جو انسان کے وجود کی گہرائی میں اُتر کر بڑی سختی اور شدت سے اس کی جان کو کھینچ نکالتے ہیں۔

آیت ۲ ﴿وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۙ﴿۲﴾﴾ ''اور اُن (فرشتوں) کی قسم جو گرہیں کھولتے ہیں آسانی سے۔''

یہ بھی انسان کی جان قبض ہونے کی ہی ایک کیفیت کا ذکر ہے۔حضور ﷺ کے ایک فرمان کا مفہوم ہے کہ جب فرشتہ بندۂ مؤمن کی جان قبض کرتا ہے تو اسے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے مشکیزے کے بند مُنہ سے پانی کا ایک قطرہ ٹپک گیا ہے اور جب وہ کسی کافر کی جان قبض کرتا ہے تو اُسے ایسی سختی کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسے سیخ پر سے کباب کھینچا جا رہا ہے (اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْ ذٰلِكَ)۔بہرحال یہاں یہ نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ ان دونوں کیفیات کا تعلق انسان کی روح سے ہے' اس کے ظاہری جسم سے نہیں۔جسمانی طور پر تو اللہ

تعالیٰ کے بہت سے نیک بندوں پر بھی نزع کا وقت سخت انداز میں وارد ہوتا ہے۔ اس معاملے میں ظاہری تکلیف تو خود حضور ﷺ پر بھی طاری ہوئی تھی۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کی تکلیف کو دیکھ کر بار بار روتی تھیں اور اُنؓ کے مُنہ سے بے اختیار یا ابتاہ! یا ابتاہ! (ہائے میرے ابا جانؐ کی یہ تکلیف!) کے الفاظ نکلتے تھے۔ حضور ﷺ یہ سن کر فرماتے کہ بیٹی! آج کے بعد تیرے باپ کے لیے کوئی سختی نہیں ہے۔ فِدَاہ آبائنا وأُمّھاتنا!

آیت ۳ ﴿وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۝۳﴾ ''اور اُن (فرشتوں) کی قسم جو تیزی سے تیرتے ہوئے جاتے ہیں۔''

فرشتے تیرتے ہوئے ان ارواح کو لے کر کہاں جاتے ہیں اور انہیں کہاں رکھا جاتا ہے؟ اس بارے میں وضاحت آگے سورۃ المُطفّفین میں آئے گی۔

آیت ۴ ﴿فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۝۴﴾ ''پھر وہ (تعمیلِ ارشاد میں) ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

آیت ۵ ﴿فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۝۵﴾ ''پھر (حسبِ حکم) معاملات کی تدبیر کرتے ہیں۔''

یعنی ہر مرنے والے کی روح کو فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق سِجّین یا عِلّیّین میں لے جاتے ہیں۔ یہاں پر ان قسموں کا جواب یا مُقسم علیہ چونکہ محذوف ہے' اس لیے ان قسموں کا مُقسم علیہ بھی وہی تصوّر ہوگا جو سورۃ الذّاریات اور سورۃ المرسلات میں مذکور ہے۔ یعنی: ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝۵ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝۶﴾ (الذّٰریٰت) ''جو وعدہ تمہیں دیا جا رہا ہے وہ یقیناً سچ ہے۔ اور جزا و سزا ضرور واقع ہو کر رہے گی''۔ اور: ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۝۷﴾ (المرسلٰت) ''جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ یقیناً واقع ہو کر رہے گی۔''

آیت ۶ ﴿يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝۶﴾ ''جس دن کانپے گی کانپنے والی۔''

یعنی قیامت کے دن شدید زلزلے کی وجہ سے پوری زمین لرز اٹھے گی۔ قیامت کے زلزلے اور اس دن کی ہولناک کیفیات کا ذکر قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ سورۃ الحج کی ابتدائی آیات کا یہ انداز بہت عبرت آموز ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ۝۱ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ۝۲﴾

''اے لوگو! تقویٰ اختیار کرو اپنے رب کا' یقیناً قیامت کا زلزلہ بہت بڑی چیز ہوگا۔ جس دن تم اُس کو دیکھو گے' اُس دن (حال یہ ہوگا کہ) بھول جائے گی ہر دودھ پلانے والی جسے وہ دودھ پلاتی تھی اور (دہشت کا عالم یہ ہوگا کہ) ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا اور تم دیکھو گے لوگوں کو جیسے وہ نشے میں ہوں' حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے' بلکہ اللہ کا عذاب ہی بہت سخت ہے۔''

آیت ۷ ﴿تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝۷﴾ ''اُس کے پیچھے ایک اور جھٹکا آئے گا۔''

اس سے نفخہ ثانیہ مراد ہے' جس کے بعد سب مُردے دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔

آیت ۸ ﴿قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ۝۸﴾ ''کتنے ہی دل اُس دن (خوف کے مارے) دھڑک رہے ہوں گے۔''

آیت ۹ ﴿اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۝۹﴾ ''اُن کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی۔''

فرطِ خوف سے آنکھیں زمین میں گڑی ہوئی ہوں گی' اوپر آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ ہوگی۔

آیت ۱۰ ﴿یَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِی الْحَافِرَةِ ۝۱۰﴾ ''یہ لوگ کہتے ہیں: کیا ہمیں لوٹا دیا جائے گا اُلٹے پاؤں؟''

کہ کیا مرنے کے بعد ہمیں پھر سے زندہ کر دیا جائے گا؟

آیت ۱۱ ﴿ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝۱۱﴾ ''کیا جب ہم کھوکھلی ہڈیاں ہو چکے ہوں گے؟''

آیت ۱۲ ﴿قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۝۱۲﴾ ''کہتے ہیں: تب تو یہ لوٹنا بہت گھاٹے کا سودا ہوگا۔''

قیامت سے متعلق خبروں پر وہ لوگ طنزیہ انداز میں ایسے تبصرے کرتے تھے۔

آیت ۱۳ ﴿فَاِنَّمَا هِیَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝۱۳﴾ ''حالانکہ یہ تو بس ایک ہی ڈانٹ ہوگی۔''

آیت ۱۴ ﴿فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ۝۱۴﴾ ''تو وہ سب کے سب ایک چٹیل میدان میں ہوں گے۔''

نفخہ ثانیہ کے بعد سب کے سب انسان زندہ ہو کر میدانِ حشر میں جمع ہو جائیں گے۔

آیت ۱۵ ﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ مُوْسٰى ۝۱۵﴾ ''کیا آپ تک موسیٰؑ کی خبر پہنچی ہے؟''

آیت ۱۶ ﴿اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝۱۶﴾ ''جب اُس کو پکارا تھا اُس کے پروردگار نے طُویٰ کی مقدس وادی میں۔''

یہ واقعہ سورۃ الاعراف' سورۂ طٰہٰ اور سورۃ القصص میں بہت تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ یہاں اس چھوٹی سورت میں اس کا ذکر نہایت اختصار کے ساتھ آیا ہے۔

آیت ۱۷ ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝۱۷﴾ ''کہ جاؤ فرعون کے پاس' وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس حکم کے تحت اللہ تعالیٰ کے رسول کی حیثیت سے فرعون کے پاس گئے تھے۔

آیت ۱۸ ﴿فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى ۝۱۸﴾ ''اور اسے کہو کہ کیا تُو چاہتا ہے کہ پاک ہو جائے؟''

آپ اس کے پاس جا کر اُسے باقاعدہ دعوت دیں' تاکہ اگر وہ راہِ راست پر آنا چاہے تو آ جائے اور اپنے عقائد و اعمال کو درست کر لے۔

آیت ۱۹ ﴿وَاَهْدِیَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۝۱۹﴾ ''اور میں تمہاری راہنمائی کروں تمہارے رب کی طرف تاکہ تمہارے اندر خشیت پیدا ہو؟''

آیت ۲۰ ﴿فَاَرٰىهُ الْاٰیَةَ الْكُبْرٰى ۝۲۰﴾ ''تو موسیٰؑ نے اُس کو دکھائی بہت بڑی نشانی۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو اپنی رسالت کے بارے میں بھی بتایا' اللہ تعالیٰ کا پیغام بھی اُس تک پہنچایا اور عصا کے اژدھا بن جانے والا معجزہ بھی اُسے دکھا دیا۔

آیت ۲۱ ﴿فَكَذَّبَ وَعَصٰى ۝۲۱﴾ ''لیکن اُس نے جھٹلا دیا اور نافرمانی کی۔''

آیت ۲۲ ﴿ثُمَّ اَدْبَرَ یَسْعٰى ۝۲۲﴾ ''پھر وہ پلٹا بھاگ دوڑ کرنے کے لیے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کرنے کے لیے اس نے ملک بھر سے ماہر جادوگروں کو اکٹھا کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔

آیت ۲۳ ﴿فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿۲۳﴾﴾ ''پھر اس نے (اپنی رعیت کو) جمع کیا اور اعلان کیا۔''

آیت ۲۴ ﴿فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾﴾ ''پس کہا کہ میں ہوں تمہارا سب سے بڑا ربّ!''

ظاہر ہے فرعون نے خود کو ''ربّ'' اس معنی میں نہیں کہا تھا کہ وہ اس کائنات کا یا اپنے ملک کے لوگوں کا خالق ہے' بلکہ وہ تو خود باطل معبودوں کو پوجتا تھا (سورۃ الاعراف کی آیت ۱۲۷ سے ثابت ہوتا ہے کہ فرعون اور اُس کی قوم کے لوگوں نے پوجا پاٹ کے لیے اپنے کچھ معبود بھی بنا رکھے تھے)۔ پھر اس کی رعیت میں بہت سے بڑے بوڑھے لوگ ایسے بھی ہوں گے جن کے سامنے وہ پیدا ہوا ہوگا اور جنہوں نے اس کا بچپن بھی دیکھا ہوگا۔ گویا اُسے خود بھی معلوم تھا اور اُس کی رعیت کے تمام لوگ بھی جانتے تھے کہ وہ عام انسانوں کی طرح پیدا ہوا ہے اور بحیثیت انسان وہ دوسرے عام انسانوں جیسا ہی ہے۔ چنانچہ اس کا مذکورہ دعویٰ دراصل حکومت اور اقتدارِ اعلیٰ کے مالک ہونے کا دعویٰ تھا۔ اپنے اس دعوے کی مزید وضاحت اُس نے ان الفاظ میں کی تھی: ﴿يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ﴾ (الزخرف:۵۱) ''اے میری قوم کے لوگو! کیا مصر کی حکومت میری نہیں ہے؟ اور کیا یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟'' کہ دیکھو اس پورے ملک پر میرا حکم چلتا ہے' پورے ملک کا نہری نظام بھی میرے تابع ہے' میں جسے جو چاہوں عطا کروں اور جسے چاہوں محروم رکھوں' میں مطلق اختیار اور اقتدار کا مالک ہوں۔ یہ تھا اُس کا اصل دعویٰ اور یہی دعویٰ اپنے زمانے میں نمرود کا بھی تھا۔

یہ دعویٰ دراصل اللہ تعالیٰ کے اقتدار و اختیار کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے اور اس لحاظ سے بہت بڑا شرک ہے۔ آج بدقسمتی سے یہ سیاسی شرک ''عوام کی حکومت'' کے لیبل کے ساتھ پوری دنیا میں پھیل چکا ہے۔ نمرودی اور فرعونی دور میں تو شرک کی گندگی کا یہ ٹوکرا کوئی ایک شخص اٹھائے پھرتا تھا' یعنی ''حاکمیت'' کا دعوے دار کوئی ایک شخص ہوا کرتا تھا' جبکہ آج اس گندگی کو تولوں اور ماشوں میں بانٹ کر ملک کے ہر شہری کو اس میں حصہ دار بنا دیا گیا ہے۔ ''جدید دور'' میں اس سیاسی شرک کو نئے بھیس میں متعارف کرانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی تعبیر علامہ اقبال نے اپنی نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں ابلیس کی زبان سے اس طرح کی ہے: ؎

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

آیت ۲۵ ﴿فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾﴾ ''تو پکڑ لیا اُس کو اللہ نے آخرت اور دنیا کی سزا میں۔''

دنیا کی سزا کے طور پر تو اُسے اپنے لاؤ لشکر سمیت غرق کر دیا گیا۔ جہاں تک اُس کی آخرت کی سزا کا تعلق ہے اس کا ذکر قرآن میں جا بجا ہوا ہے کہ وہ بہت بھیانک ہوگی۔

آیت ۲۶ ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿۲۶﴾﴾ ''یقیناً اس میں عبرت ہے اُس کے لیے جو ڈرتا ہے۔''

اشتقاقی اعتبار سے لفظ ''عبرت'' کا تعلق ''عبور'' سے ہے' اور عبور کے معنی ہیں: دریا وغیرہ کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جانا۔ اس حوالے سے لفظ عبرت کے معنی ایک چیز کو دیکھ کر اس سے ملتی جلتی کسی دوسری چیز کی حقیقت کو سمجھنے اور اس خاص معاملے میں سبق حاصل کرنے کے ہیں۔

آیات ۲۷ تا ۴۶

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ﴿۲۷﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾ وَ اَغْطَشَ لَيْلَهَا وَ اَخْرَجَ
ضُحٰىهَا ﴿۲۹﴾ وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ مَرْعٰىهَا ﴿۳۱﴾ وَالْجِبَالَ
اَرْسٰىهَا ﴿۳۲﴾ مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۳﴾ فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿۳۴﴾ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ
الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿۳۵﴾ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴿۳۶﴾ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿۳۷﴾ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۳۸﴾
فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِىَ الْمَاْوٰى ﴿۳۹﴾ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ
الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى ﴿۴۱﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ﴿۴۲﴾ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ﴿۴۳﴾
اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ﴿۴۴﴾ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا ﴿۴۵﴾ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا
عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ﴿۴۶﴾ ع

اب اگلی آیات میں بعث بعد الموت کے حوالے سے مشرکین کے طنزیہ تبصروں کا تفصیلی جواب دیا جا رہا ہے:

آیت ۲۷ ﴿ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ﴿۲۷﴾﴾ ''(اے لوگو! ذرا سوچو!) کیا تمہاری تخلیق زیادہ مشکل ہے یا آسمان کی؟ اُس نے اُسے تخلیق کیا۔''

آیت ۲۸ ﴿رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾﴾ ''اس کے گنبد کو بلند کیا' پھر اسے ہر طرح سے درست کیا۔''

آیت ۲۹ ﴿وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴿۲۹﴾﴾ ''اور اس کی رات کو اندھیرا کر دیا اور اس کے دن کو ظاہر کر دیا۔''

آیت ۳۰ ﴿وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾﴾ ''اور زمین کو اس کے بعد بچھا دیا۔''

آیت ۳۱ ﴿اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ﴿۳۱﴾﴾ ''اس میں سے نکالا اس کا پانی اور اس کا چارہ۔''

یہاں یہ نکتہ خصوصی طور پر لائقِ توجہ ہے کہ اس وقت دنیا میں جتنا پانی موجود ہے اس کا منبع خود زمین ہے۔ آج سائنسی معلومات کی روشنی میں ہم اس کی وضاحت یوں کر سکتے ہیں کہ ابتدا میں زمین آگ کا ایک گولا تھی۔ جوں جوں یہ ٹھنڈی ہوتی گئی اس کے بخارات کل کر فضا میں جمع ہوتے رہے۔ اس طرح زمین کے اردگرد مختلف گیسوں پر مشتمل ایک غلاف سا بن گیا' جسے آج ہم فضا (atmosphere) کہتے ہیں۔ پھر کسی مرحلے پر فضا میں ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ملاپ سے پانی بنا۔ یہ پانی فضا سے بارش کی شکل میں سالہا سال تک زمین پر برستا رہا۔ اس کے بعد سورج کی تپش سے بخارات اٹھنے' بادل بننے اور بارش برسنے کے معمول پر مشتمل پانی کا وہ مربوط نظام بنا جسے آج کی سائنس نے واٹر سائیکل (water cycle) کا نام دیا ہے۔

گویا اللہ تعالیٰ نے ایک خاص مقدار کے مطابق دنیا میں پانی پیدا فرما کر زمین پر موجود ''زندگی'' کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اس کی رسد اور ترسیل کا ایک خوبصورت نظام (cycle) تشکیل دے دیا ہے۔ اس نظام کے تحت سمندروں کے بخارات سے بادل بنتے ہیں۔ ان بادلوں سے اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت کے تحت مختلف علاقوں میں بارش برستی ہے اور برفباری ہوتی ہے۔ پھر پہاڑوں

پر برف کے وسیع ذخائر سے نالوں اور دریاؤں کے ذریعے نشیبی علاقوں کو سارا سال پانی کی سپلائی جاری رہتی ہے۔ گویا بارشوں اور پہاڑی گلیشیرز کے overhead tanks سے حاصل ہونے والے پانی سے پوری دنیا میں زیرِ زمین پانی کے ذخیرے کو رسد بھی مہیا ہوتی رہتی ہے اور ہر طرح کی ''زندگی'' کی تمام ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں۔ اس کے بعد جو پانی بچ رہتا ہے وہ واپس سمندر میں چلا جاتا ہے۔

آیت ۳۲ ﴿وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ۝۳۲﴾ ''اور پہاڑوں کو اس میں گاڑ دیا۔''

آیت ۳۳ ﴿مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝۳۳﴾ ''سامانِ زیست کے طور پر تمہارے لیے اور تمہارے چوپایوں کے لیے۔''

آیت ۳۴ ﴿فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ۝۳۴﴾ ''پھر جب برپا ہوگا وہ بڑا ہنگامہ۔''

آیت ۳۵ ﴿يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ۝۳۵﴾ ''اُس دن انسان یاد کرے گا جو کچھ اُس نے بھاگ دوڑ کی تھی۔''

اُس دن انسان کی آنکھیں کھلیں گی اور جس شخص نے اپنی ساری زندگی دنیا کے مال و متاع کے پیچھے بھاگتے بھاگتے برباد کر دی تھی اُسے معلوم ہو جائے گا کہ اب آخرت کے لیے اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ سورۃ الکہف کی اس آیت میں ایسے ہی لوگوں کا ذکر ہے: ﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝۱۰۳ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝۱۰۴﴾ ''آپؐ کہیے: کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں کون ہیں؟ وہ لوگ جن کی سعی و جُہد دُنیا ہی کی زندگی میں گم ہو کر رہ گئی اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔''

آیت ۳۶ ﴿وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ۝۳۶﴾ ''اور کھول کر رکھ دی جائے گی جہنّم ہر دیکھنے والے کے لیے۔''

آیت ۳۷ ﴿فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۝۳۷﴾ ''پس جس نے سرکشی کی تھی۔''

آیت ۳۸ ﴿وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝۳۸﴾ ''اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی۔''

آیت ۳۹ ﴿فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝۳۹﴾ ''تو یقیناً اُس کا ٹھکانہ اب جہنّم ہی ہے۔''

ایک بندۂ مؤمن کو چاہیے کہ یہ تین آیات ہمیشہ کے لیے اپنی گرہ میں باندھ لے اور اپنی عملی زندگی میں ان کے مفہوم اور پیغام کو اپنے دل و دماغ میں ہر وقت مستحضر رکھے۔ طَغٰی کے معنی ہیں: کسی کا اپنی حدود سے تجاوز کرنا۔ اسی معنی میں ہمارے ہاں طغیانی کا لفظ معروف ہے اور اسی مفہوم میں اس مادہ سے لفظ ''طاغوت'' مشتق ہے۔ چنانچہ ان آیات کے پیغام کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ نے اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝۵۶﴾ (الذّٰریٰت) یعنی جنوں اور انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ اس کے ''بندے'' بن کر رہیں۔ اب جب کوئی انسان ''بندگی'' کی حدود سے آگے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اپنے قانون، اپنے اختیار اور اپنی مرضی کی بات کرے گا تو وہ ''بندے'' کے بجائے ''طاغوت'' بن جائے گا۔ چنانچہ جو ''بندہ'' بندگی کی حدود سے تجاوز کر کے طاغوت بن گیا اور پھر اس نے اپنی سوچ، اپنی مرضی، اپنی منصوبہ بندی اور اپنے فیصلوں میں آخرت کے مقابلے میں دنیا کو ترجیح دینے کی روش اپنائی تو آخرت میں اس کے لیے جہنّم کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا۔

آیت ۴۰ ﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ ﴾ ''اور جو کوئی ڈرتا رہا اپنے ربّ کے حضور کھڑا ہونے (کے خیال) سے''

سورۃ الحاقّہ میں اس پیشی کی کیفیت یوں بیان کی گئی ہے: ﴿يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿۱۸﴾﴾ ''جس دن تم پیش کیے جاؤ گے تمہاری کوئی مخفی سے مخفی شے بھی چھپی نہیں رہے گی۔''

﴿وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾﴾ ''اور اُس نے روکے رکھا اپنے نفس کو خواہشات سے۔''

اس نے اپنی زندگی میں اپنے نفس کی باگیں ہمیشہ کھینچ کر رکھیں اور غلط خواہشات کے معاملے میں اسے مُنہ زوری نہ کرنے دی۔

آیت ۴۱ ﴿فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۴۱﴾﴾ ''تو یقیناً اُس کا ٹھکانہ جنّت ہی ہے۔''

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ ، اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ۔ آمین!

آیت ۴۲ ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ﴿۴۲﴾﴾ ''(اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں قیامت کے بارے میں کہ وہ کب آ کر ٹھہرے گی؟''

آیت ۴۳ ﴿فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ﴿۴۳﴾﴾ ''آپؐ کا کیا تعلق ہے اس کے بیان کرنے سے؟''

آپ ﷺ کو اس لیے تو نہیں بھیجا گیا کہ آپؐ قیامت کے دن اور تاریخ کا تعین کر کے انہیں بتائیں' بلکہ آپؐ تو بشیر و نذیر بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

آیت ۴۴ ﴿اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ﴿۴۴﴾﴾ ''اس کا انجام تو آپ کے رب ہی کی طرف ہے۔''

یہ معاملہ تو آپؐ کے رب ہی کے حوالے ہے۔ اُس کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا کہ قیامت کب آئے گی۔

آیت ۴۵ ﴿اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا ﴿۴۵﴾﴾ ''آپؐ تو بس خبردار کرنے والے ہیں' ہر اُس شخص کو جو اس سے ڈرتا ہو۔''

جو لوگ قیامت کے تصوّر سے ڈرتے ہوں یا جو اس کے ذکر سے ڈر جائیں آپؐ انہیں خبردار کرتے رہیں' آپؐ کے خبردار کرنے سے ایسے لوگوں کا خوف اور تقویٰ مزید بڑھے گا۔ ظاہر ہے جس شخص کی روح میں زندگی کی کوئی رمق موجود ہے اس کے دل میں قیامت کے ذکر سے ضرور خشیت پیدا ہوگی۔

آیت ۴۶ ﴿كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ﴿۴۶﴾﴾ ''جس دن وہ اسے دیکھیں گے (انہیں یوں لگے گا) گویا وہ نہیں رہے (دنیا میں) مگر ایک شام یا اس کی ایک صبح۔''

قیامت کے دن انسان جب اپنی دنیوی زندگی کو یاد کرے گا تو اسے اپنی پوری زندگی ایسے نظر آئے گی جیسے وہ ایک دن کی بھی صرف چند گھڑیاں دنیا میں رہا تھا۔

سُوْرَۃُ عَبَسَ

تمہیدی کلمات

سورۂ عبس کی ابتدائی آیات میں ایک خاص واقعہ کا ذکر ہے۔ سیرت کی کتابوں میں یہ واقعہ یوں بیان ہوا ہے کہ ایک موقع پر حضور ﷺ کے پاس قریش کے چند بڑے سردار (عتبہ، شیبہ، ابوجہل، اُمیہ بن خلف، ولید بن مغیرہ اور عباس بن عبدالمطلب وغیرہ) بیٹھے تھے اور آپؐ ان کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش فرما رہے تھے۔ عین اُس وقت جب آپؐ ان سے محوِ گفتگو تھے ایک نابینا صحابی عبداللہ بن اُمّ مکتوم ؓ وہاں آئے اور آدابِ مجلس کی رعایت کیے بغیر آپؐ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ عرض کر رہے تھے: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ، اَرْشِدْنِیْ ''یارسول اللہ! مجھے سیدھا راستہ بتایئے''۔ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ عَلِّمْنِیْ مِمَّا عَلَّمَکَ اللّٰہُ ''یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے جو علم آپ کو سکھایا ہے اس میں سے مجھے بھی سکھایئے''۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ صورتِ حال کو سمجھتے اور آپؐ کی گفتگو ختم ہونے کا انتظار کرتے۔ ظاہر ہے وہ دیکھ تو نہیں سکتے تھے لیکن سن تو سکتے تھے کہ حضور ﷺ گفتگو میں مصروف ہیں۔ بہرحال انؓ کی بار بار خلل اندازی کی وجہ سے آپ ﷺ کے چہرۂ انور پر کچھ ناگواری کے آثار نمایاں ہوئے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ بعض لوگوں نے محض یہ سمجھتے ہوئے ان آیات کی تاویلات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضور ﷺ کے مقامِ رفیع کی مناسبت سے ایسا ممکن ہی نہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ واقعہ بالکل اسی طرح سے پیش آیا تھا جس طرح یہاں ان آیات میں مذکور ہے۔

اس معاملے کی اصل حقیقت اور منطق کو سمجھنے کے لیے بنیادی طور پر یہ نکتہ مدِنظر رکھنا ضروری ہے کہ حضور ﷺ اپنے فرائضِ رسالت کی ادائیگی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہوئے ہر وہ طریقہ اور راستہ اختیار فرمانے کی کوشش میں رہتے تھے جو انسانی دائرۂ اختیار کی حد تک بہتر سے بہتر ہوتا۔ اب ظاہر ہے عرب کے قبائلی معاشرے میں دعوت و تبلیغ کے کام کو آگے بڑھانے کا مؤثر ترین طریقہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ اہم قبائل کی سرکردہ شخصیات کو اسلام کی طرف راغب کیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے حضور ﷺ مسلسل کوشش بھی کرتے، سردارانِ قریش کو مختلف انداز سے بار بار دعوت بھی دیتے اور دعا بھی فرماتے۔ آپؐ کے نزدیک یہ معاملہ اس حد تک اہم تھا کہ ایک مرتبہ آپؐ نے جھولی پھیلا کر بہت ہی غیر معمولی انداز میں دعا کی تھی کہ اے اللہ! عمر بن خطاب اور عمرو بن ہشام (ابوجہل) میں سے کسی ایک کے ذریعے اسلام کو تقویت عطا فرما! ظاہر ہے معاشرے کے سرکردہ لوگوں میں سے اگر کوئی شخص ایمان لے آتا تو وہ اکیلا عوام الناس کے سینکڑوں افراد سے زیادہ اہم ہوتا۔ ایسی کسی شخصیت کی وجہ سے مجموعی طور پر اسلامی تحریک کو بھی تقویت ملتی اور مکہ کے ان نادار اور بے سہارا اہلِ ایمان کے مصائب میں بھی ضرور کچھ کمی واقع ہوتی جنہیں اس دور میں دن رات تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ چنانچہ اسی بنیاد پر حضور ﷺ مکہ کے صاحبِ حیثیت لوگوں سے اپنی دعوتی ملاقاتوں کو خصوصی اہمیت دیتے تھے اور مذکورہ واقعہ کے وقت بھی آپؐ نے اسی وجہ سے سردارانِ قریش کے ساتھ اپنی گفتگو کو اہم خیال فرمایا۔ اس کے علاوہ اس معاملے کا ایک منطقی اور فطری پہلو یہ بھی ہے کہ ایسے مواقع پر بعض اوقات اپنوں کے مقابلے میں باہر کے لوگوں کو اس لیے بھی

ترجیح دے دی جاتی ہے کہ وہ تو اپنے ہیں، وہ ساری صورتِ حال کو سمجھتے ہیں اور اس وجہ سے وہ اپنے آپ کو نظر انداز کیے جانے پر بُرا نہیں منائیں گے۔

بہرحال نبی بھی آخر انسان ہوتا ہے اور اگر انسانی نفسیات و جذبات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ مذکورہ واقعہ پر حضور ﷺ کا ردِّعمل بالکل فطری تھا اور یہ بھی کہ آپؐ کا یہ ردِّعمل اعلیٰ تر مقصد کے لیے تھا۔ پھر اس معاملے کو حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْن کے تناظر میں بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں جتنا بلند کسی کا مقام ہوتا ہے اس کے لیے کردار و عمل کا معیار بھی اسی نسبت سے اعلیٰ رکھا جاتا ہے۔

ان آیات کے بارے میں حضور ﷺ نے خود بھی ''عتاب'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ ان آیات کے نزول کے بعد جب بھی حضرت عبداللہ بن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ آپؐ کے پاس حاضر ہوتے تو آپؐ انہیں مخاطب کر کے فرماتے: ((مَرْحَبًا بِمَنْ عَاتَبَنِیْ فِیْهِ رَبِّیْ))(۱) ''مرحبا اُس شخص کے لیے جس کے معاملے میں میرے رب نے مجھ پر عتاب فرمایا''۔ بہرحال اس واقعہ سے متعلق اگر مذکورہ تمام پہلوؤں کو مدِّنظر رکھا جائے تو سارا معاملہ آسانی سے سمجھ میں آ جاتا ہے اور متعلقہ آیات کی تاویل ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

سُوْرَةُ عَبَسَ مَكِّيَّةٌ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اٰيَاتُهَا: ۴۲ رُكُوْعُهَا: ۱

عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤى ۙ﴿۱﴾ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ؕ﴿۲﴾ وَ مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰۤى ۙ﴿۳﴾ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ
الذِّكْرٰى ؕ﴿۴﴾ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۙ﴿۵﴾ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ؕ﴿۶﴾ وَ مَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ؕ﴿۷﴾ وَ اَمَّا مَنْ
جَآءَكَ يَسْعٰى ۙ﴿۸﴾ وَ هُوَ يَخْشٰى ۙ﴿۹﴾ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۚ﴿۱۰﴾ كَلَّاۤ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۚ﴿۱۱﴾ فَمَنْ شَآءَ
ذَكَرَهٗ ؕ﴿۱۲﴾ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۙ﴿۱۳﴾ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۙ﴿۱۴﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۙ﴿۱۵﴾ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ؕ﴿۱۶﴾
قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَاۤ اَكْفَرَهٗ ؕ﴿۱۷﴾ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ؕ﴿۱۸﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۙ﴿۱۹﴾ ثُمَّ
السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ۙ﴿۲۰﴾ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ۙ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ؕ﴿۲۲﴾ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَاۤ اَمَرَهٗ ؕ﴿۲۳﴾
فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖۤ ۙ﴿۲۴﴾ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۙ﴿۲۵﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۙ﴿۲۶﴾ فَاَنْۢبَتْنَا
فِيْهَا حَبًّا ۙ﴿۲۷﴾ وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا ۙ﴿۲۸﴾ وَّ زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا ۙ﴿۲۹﴾ وَّ حَدَآئِقَ غُلْبًا ۙ﴿۳۰﴾ وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا ۙ﴿۳۱﴾
مَّتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ ؕ﴿۳۲﴾ فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ۚ﴿۳۳﴾ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۙ﴿۳۴﴾ وَ اُمِّهٖ
وَ اَبِيْهِ ۙ﴿۳۵﴾ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِيْهِ ؕ﴿۳۶﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ؕ﴿۳۷﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ
مُّسْفِرَةٌ ۙ﴿۳۸﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۚ﴿۳۹﴾ وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۙ﴿۴۰﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ؕ﴿۴۱﴾ اُولٰٓئِكَ
هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ؕ﴿۴۲﴾ ع ۱

آیت ۱ ﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰى ۙ﴿۱﴾﴾ ''تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا۔''

۱۔ علوم القرآن، اسباب النزول، ابوالحسن علی بن احمد بن محمد بن علی الواحدی۔

یعنی حضرت عبداللہؓ کی بار بار خلل اندازی پر حضور ﷺ کے چہرۂ انور پر ناگواری کے آثار نمایاں ہوئے اور آپؐ نے چہرۂ مبارک دوسری طرف کر لیا۔

آیت ۲ ﴿اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝۲﴾ ''اس بات پر کہ آیا اُنؐ کے پاس وہ نابینا۔''

آیت ۳ ﴿وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۝۳﴾ ''اور (اے نبی ﷺ) آپ کو کیا معلوم شاید کہ وہ تزکیہ حاصل کرتا۔'' ممکن ہے آپؐ کی گفتگو سے استفادہ کر کے وہ بلند درجات تک پہنچ جاتا۔

آیت ۴ ﴿اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝۴﴾ ''یا وہ نصیحت حاصل کرتا اور وہ نصیحت اُس کے لیے مفید ہوتی۔''

آیت ۵ ﴿اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝۵﴾ ''لیکن وہ جو بے نیازی دکھاتا ہے۔'' ایک ایسا شخص جو آپؐ کی بات سننے کو تیار نہیں ہے۔

آیت ۶ ﴿فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝۶﴾ ''آپؐ اُس کی تو فکر میں رہتے ہیں۔''

آیت ۷ ﴿وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝۷﴾ ''حالانکہ اگر وہ پاکی اختیار نہیں کرتا تو آپؐ پر کوئی الزام نہیں۔''

آیت ۸ ﴿وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۝۸﴾ ''اور وہ جو آپؐ کے پاس دوڑتا ہوا آیا ہے۔''

آیت ۹ ﴿وَهُوَ يَخْشٰى ۝۹﴾ ''اور اُس کے دل میں خشیت بھی ہے۔''

آیت ۱۰ ﴿فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۝۱۰﴾ ''تو اُس سے آپؐ استغناء برت رہے ہیں۔''

آیت ۱۱ ﴿كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝۱۱﴾ ''ایسا ہرگز نہ کیجیے' یہ تو ایک یاددہانی ہے۔''

آیت ۱۲ ﴿فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝۱۲﴾ ''تو جو چاہے اس سے نصیحت اخذ کر لے۔''

آپؐ ان لوگوں کے پیچھے خود کو ہلکان نہ کریں' اگر ابوجہل اور ابولہب اس ہدایت سے مستفید نہیں ہونا چاہتے تو نہ ہوں' آپؐ بھی ان کی پروا نہ کریں۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ جیسے سورۃ الکہف میں فرمایا گیا:

﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ۚ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝۲۸﴾

''اور اپنے آپ کو روکے رکھیے اُن لوگوں کے ساتھ جو اپنے رب کو پکارتے ہیں صبح و شام' وہ اللہ کی رضا کے طالب ہیں اور آپؐ کی نگاہیں ان سے ہٹنے نہ پائیں' (جس سے لوگوں کو یہ گمان ہونے لگے کہ) آپؐ دُنیوی زندگی کی آرائش و زیبائش چاہتے ہیں! اور مت کہنا مانیے ایسے شخص کا جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات کے پیچھے پڑا ہے اور اس کا معاملہ حد سے متجاوز ہو چکا ہے۔''

ظاہر بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا سرداران قریش کی طرف التفات (معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ!) کسی ذاتی غرض کی وجہ سے تو نہیں تھا' بلکہ آپؐ اسلام کی تقویت کے لیے ان کے قبولِ اسلام کے آرزومند تھے — لیکن ان کی موجودگی میں اپنے کسی ساتھی سے بے اعتنائی لوگوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر سکتی تھی کہ آپؐ ان لوگوں کی دولت و ثروت کی وجہ سے ان کی طرف ملتفت ہیں اور اپنے نادار ساتھیوں سے مغائرت برت رہے ہیں۔

اگلی آیات عظمتِ قرآن کے ذکر کے حوالے سے پورے قرآن میں منفرد اور ممتاز حیثیت کی حامل ہیں۔ سیاق و سباق کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان آیات کے بین السطور میں یہ پیغام بھی ہے کہ اے نبی ﷺ! آپ فریضۂ رسالت کی ادائیگی کے لیے ان ''بڑے لوگوں'' کے پیچھے اپنے آپ کو جس انداز میں ہلکان کر رہے ہیں اور یہ لوگ جس ''بے نیازی'' سے قرآن کو نظر انداز کر رہے ہیں اس سے قرآن کے استخفاف کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ لہٰذا آپ ان لوگوں کے پیچھے پڑ کر انہیں دعوت مت دیں۔ ظاہر ہے یہ پیغام قیامت تک کے داعیانِ حق کے لیے بھی ہے۔ اس ضمن میں سمجھنے کا اصل نکتہ یہ ہے کہ گو معاشرے کے صاحبِ حیثیت لوگوں کا کسی جماعت میں شامل ہونا اس جماعت کے مشن کی ترویج و ترقی کے لیے بہت مفید ہے' لیکن ایسے لوگوں کو خصوصی اہتمام سے دعوت دینے اور پھر خصوصی اہتمام سے اپنی جماعت میں خوش آمدید کہنے کا انداز ایسا نہیں ہونا چاہیے جس سے اپنے ''نظریے'' کی بے توقیری کا تاثر ملے یا پرانے کارکنوں کے دلوں میں مغائرت کا احساس پیدا ہو۔ لہٰذا کسی بھی جماعت کے امیر کے لیے اصولوں پر سمجھوتہ کیے بغیر صاحبِ حیثیت لوگوں کو اپنی جماعت کی طرف راغب کرنے کی کوشش دراصل اس پُل صراط پر چلنے کے مترادف ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے خودداری اور تکبّر کے درمیان یا خوش اخلاقی اور خوشامد کے مابین بہت باریک سا فرق ہے' لیکن اگر کوئی انسان اس باریک سے فرق کو ملحوظ نہ رکھے تو اس کی ایک بہت اعلیٰ صفت کو لوگ اس کی بہت بڑی خامی پر بھی محمول کر سکتے ہیں۔ لہٰذا حکمتِ تبلیغ کا تقاضا یہی ہے کہ ایسے حساس فرض کی ادائیگی دو انتہاؤں کے درمیان رہتے ہوئے بہت محتاط انداز میں سرانجام دی جائے۔

آیت ۱۳ ﴿فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝۱۳﴾ ''(یہ قرآن) ایسے صحیفوں میں (درج ہے) جو باعزّت ہیں۔''

یہ مضمون مختلف انداز اور مختلف الفاظ میں قرآن حکیم کے متعدد مقامات پر آیا ہے۔ سورۃ الزخرف میں فرمایا گیا: ﴿وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝۴﴾ ''اور یہ اُمّ الکتاب میں ہے ہمارے پاس بہت بلند و بالا' بہت حکمت والی!'' سورۃ الواقعہ میں ارشاد ہوا کہ یہ قرآن ایک مخفی کتاب میں درج ہے: ﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝۷۷ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝۷۸﴾ ''یقیناً یہ بہت عزّت والا قرآن ہے۔ ایک چھپی ہوئی کتاب میں ہے''۔ پھر سورۃ البروج میں فرمایا گیا: ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝۲۱ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝۲۲﴾ ''بلکہ یہ تو قرآن ہے بہت عزّت والا' لوحِ محفوظ میں''۔ بہرحال اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ اصل قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک خاص مقام پر محفوظ ہے۔ صُحفِ مکرمہ' اُمّ الکتاب' کتابِ مکنون اور لوحِ محفوظ اسی مقامِ خاص کے مختلف نام ہیں۔

آیت ۱۴ ﴿مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝۱۴﴾ ''بلند و بالا' نہایت پاک۔''

آیت ۱۵ ﴿بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۝۱۵﴾ ''ان لکھنے والوں کے ہاتھوں میں۔''

آیت ۱۶ ﴿كِرَامٍۢ بَرَرَةٍ ۝۱۶﴾ ''جو بڑے معزز اور نیک ہیں۔''

اس سے ملتی جلتی بات ہم سورۃ الواقعہ کی اس آیت میں بھی پڑھ آئے ہیں: ﴿لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝۷۹﴾ ''اسے چھو نہیں سکتے مگر وہی جو بالکل پاک ہیں''۔ مراد یہ ہے کہ قرآن مجید کا مقام بہت بلند ہے۔ تو اے نبی (ﷺ) آپ قرآن مجید کے مقام اور مرتبے کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان لوگوں سے معاملہ کیجیے اور جو شخص قرآن مجید سے اعراض کرتا ہے' آپ بھی اس کو مُنہ نہ لگائیے۔ ان کے مقابلے میں آپ زیادہ توجہ ان لوگوں پر دیجیے جو ہدایت کی تلاش میں آپ کے پاس چل کر خود آتے ہیں۔

آیت ۱۷ ﴿قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ﴿۱۷﴾﴾ ''ہلاک ہو جائے انسان' یہ کس قدر ناشکرا ہے!''

آیت ۱۸ ﴿مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ﴿۱۸﴾﴾ ''(ذرا سوچیے کہ) کس چیز سے اللہ نے اسے پیدا کیا ہے؟''

آیت ۱۹ ﴿مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ﴾ ''ایک بوند سے۔''

﴿خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾﴾ ''اُس نے اسے پیدا کیا اور اس کا ایک اندازہ مقرر کر دیا۔''

''اندازے'' سے مراد یہاں ہر انسان کا ''شاکلہ'' ہے' جس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۸۴ میں آیا ہے۔ انسان کا شاکلہ دراصل اس کی فطری یا جبلّی خصوصیات اور اس کے ماحول کے اس کی شخصیت پر مرتب ہونے والے اثرات کے مجموعے سے تشکیل پاتا ہے۔ یعنی ہر انسان کی وہ شخصیت جو اسے پیدائشی طور پر جینز (genes) کی صورت میں اپنے والدین کی طرف سے ملتی ہے' عملی زندگی میں آ کر اپنے ماحول کے مخصوص اثرات کی وجہ سے ایک خاص ''قالب'' میں ڈھل جاتی ہے۔ انسانی شخصیت کے اسی قالب کو اس انسان کا شاکلہ کہا جائے گا۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تشریح آیت ۸۴' سورۂ بنی اسرائیل)

آیت ۲۰ ﴿ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾﴾ ''پھر آسان کر دیا اس پر راستہ۔''

یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں ایسا ماحول فراہم کیا ہے اور اسے ایسی سہولیات سے نوازا ہے جس کی وجہ سے دنیا میں زندگی بسر کرنا اس کے لیے بہت آسان ہو گیا ہے۔ اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ماں کے پیٹ سے انسان کے دنیا میں آنے کا راستہ اللہ تعالیٰ نے آسان کر دیا ہے۔ یعنی وضع حمل کا بظاہر انتہائی پیچیدہ اور مشکل مرحلہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے آسان ہو گیا ہے۔

آیت ۲۱ ﴿ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۱﴾﴾ ''پھر اس پر موت وارد کی اور اسے قبر میں داخل کر دیا۔''

آیت ۲۲ ﴿ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ﴿۲۲﴾﴾ ''پھر جب وہ چاہے گا اسے اٹھا کھڑا کرے گا۔''

دراصل یہاں بتانا یہ مقصود ہے کہ جس ہستی نے انسان کی تخلیق اور اس کی زندگی سے متعلق یہ سب کچھ کیا ہے اس کے لیے انسان کو دوبارہ اٹھانا کیا مشکل ہے۔ چنانچہ اگر انسان خود اپنی تخلیق کے پورے عمل پر غور کر لے تو اس کے پاس بعث بعد الموت سے انکار کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا۔

آیت ۲۳ ﴿كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ﴿۲۳﴾﴾ ''نہیں! اس نے تا حال وہ بات پوری نہیں کی جس کا اللہ نے اسے حکم دیا تھا۔''

آیت ۲۴ ﴿فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ﴿۲۴﴾﴾ ''تو انسان ذرا اپنے کھانے ہی کو دیکھ لے۔''

اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بارے میں اگر پھر بھی کسی کو شک ہو تو وہ اپنی غذا پر ہی غور کر لے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کرنے کے بعد کس کس انداز میں اس کی غذا کا انتظام کیا ہے۔

آیت ۲۵ ﴿اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾﴾ ''کہ ہم نے آسمان سے پانی برسایا جیسے کہ برسایا جاتا ہے۔''

آیت ۲۶ ﴿ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾﴾ ''پھر ہم نے زمین کو پھاڑا جیسے کہ وہ پھٹتی ہے۔''

زمین پھٹتی ہے اور اس میں سے کونپلیں برآمد ہوتی ہیں' جو رفتہ رفتہ پورے پودے بلکہ تناور درخت کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

آیت ۲۷ ﴿فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾﴾ ''پھر ہم نے اُگا دیے اس میں اناج۔''

آیت ۲۸ ﴿وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ﴿۲۸﴾﴾ ''اور انگور اور مختلف ترکاریاں۔''

آیت ۲۹ ﴿وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۝۲۹﴾ ''اور زیتون اور کھجوریں۔''

آیت ۳۰ ﴿وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۝۳۰﴾ ''اور بڑے گھنے باغات۔''

آیت ۳۱ ﴿وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۝۳۱﴾ ''اور میوے اور چارہ۔''

آیت ۳۲ ﴿مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝۳۲﴾ ''ضرورت کا سامان تمہارے لیے بھی اور تمہارے مویشیوں کے لیے بھی۔''

یہ آیت ہو بہو سورۃ النازعات میں (آیت ۳۳ کے طور پر) بھی آ چکی ہے۔ جوڑا ہونے کے اعتبار سے ان دونوں سورتوں کے مضمون اور اسلوب میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے۔

آیت ۳۳ ﴿فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ۝۳۳﴾ ''تو جب وہ آ جائے گی کان پھوڑنے والی (آواز)۔''

یعنی جب قیامت برپا کرنے کے لیے صور میں پھونکا جائے گا تو اس کی آواز سے کان پھٹ جائیں گے۔ اس آیت کی مشابہت سورۃ النازعات کی اس آیت سے ہے: ﴿فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ۝۳۴﴾ ''پھر جب وہ آ جائے گا بڑا ہنگامہ۔''

آیت ۳۴ ﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝۳۴﴾ ''اُس دن بھاگے گا انسان اپنے بھائی سے۔''

آیت ۳۵ ﴿وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۝۳۵﴾ ''اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے۔''

آیت ۳۶ ﴿وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ۝۳۶﴾ ''اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے۔''

آیت ۳۷ ﴿لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ۝۳۷﴾ ''اُس دن ان میں سے ہر شخص کو ایسی فکر لاحق ہوگی جو اُسے (ہر ایک سے) بے پروا کر دے گی۔''

اُس دن ہر انسان نفسانفسی کی کیفیت میں ہوگا۔ ہر انسان کو اپنی پریشانی کی وجہ سے اپنے عزیز ترین رشتوں سمیت کسی دوسرے کی کوئی پروا نہیں ہوگی۔

آیت ۳۸ ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝۳۸﴾ ''کچھ چہرے اُس دن روشن ہوں گے۔''

یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ القیامہ کی ان آیات میں بھی آ چکا ہے: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝۲۲ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝۲۳ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۢ بَاسِرَةٌ ۝۲۴ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۝۲۵﴾ ''بہت سے چہرے اُس دن تروتازہ ہوں گے، وہ اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے۔ اور بہت سے چہرے اُس روز اُترے ہوئے ہوں گے۔ ان کو یقین ہوگا کہ اب ان کے ساتھ کمر توڑ سلوک ہوگا۔''

آیت ۳۹ ﴿ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝۳۹﴾ ''مسکراتے ہوئے خوش وخرم۔''

آیت ۴۰ ﴿وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝۴۰﴾ ''اور کچھ چہرے اُس دن غبار آلود ہوں گے۔''

آیت ۴۱ ﴿تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝۴۱﴾ ''ان پر سیاہی چھائی ہوئی ہوگی۔''

آیت ۴۲ ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۝۴۲﴾ ''یہی ہوں گے وہ کافر اور فاجر لوگ۔''

یہ وہ لوگ ہوں گے جو دنیا میں اپنے نفس کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حدود کو لائقِ اعتناء نہیں سمجھتے تھے۔

سُوْرَةُ التَّكْوِيْرِ

تمہیدی کلمات

سورۃ التکویر اپنے مضمون اور اسلوب کے اعتبار سے اپنے بعد والی تینوں سورتوں سے گہری مشابہت رکھتی ہے۔ اس مشابہت کی وجہ سے یہ چاروں سورتیں (التکویر، الانفطار، المُطفِّفین اور الانشقاق) ایک ضمنی گروپ کی حیثیت سے بھی پہچانی جاتی ہیں۔ البتہ جوڑوں کے نظم کے حوالے سے سورۃ التکویر کا تعلق سورۃ الانفطار سے ہے، جبکہ سورۃ المُطفِّفین اپنے بعد والی سورت یعنی سورۃ الانشقاق کے ساتھ مل کر جوڑا بناتی ہے۔

سُوْرَةُ التَّكْوِيْرِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۲۹ رُكُوْعُهَا: ۱

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝۱ وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝۲ وَ اِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝۳ وَ اِذَا الْعِشَارُ
عُطِّلَتْ ۝۴ وَ اِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝۵ وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝۶ وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝۷ وَ
اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝۸ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝۹ وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝۱۰ وَ اِذَا السَّمَآءُ
كُشِطَتْ ۝۱۱ وَ اِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ۝۱۲ وَ اِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ۝۱۳ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّاۤ اَحْضَرَتْ ۝۱۴
فَلَاۤ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۝۱۵ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۝۱۶ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ۝۱۷ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۝۱۸ اِنَّهٗ
لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝۱۹ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝۲۰ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۝۲۱ وَ مَا
صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۝۲۲ وَ لَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝۲۳ وَ مَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ۝۲۴ وَ مَا هُوَ
بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝۲۵ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ۝۲۶ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۲۷ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ
اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ۝۲۸ وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۲۹ ع

آیت ۱ ﴿اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝۱﴾ ''جب سورج لپیٹ لیا جائے گا۔''

آیت ۲ ﴿وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝۲﴾ ''اور جب ستارے ماند پڑ جائیں گے۔''

آیت ۳ ﴿وَ اِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝۳﴾ ''اور جب پہاڑ چلا دیے جائیں گے۔''

آیت ۴ ﴿وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝۴﴾ ''اور جب گابھن اونٹنیاں چھٹی پھریں گی۔''

العِشار سے دس مہینوں کے حمل والی اونٹنیاں مراد ہیں، یعنی ایسی اونٹنیاں جن کے وضع حمل کا وقت بہت قریب ہو۔ عربوں کے ہاں ایسی اونٹنی بہت قیمتی سمجھی جاتی تھی اور اس لحاظ سے وہ لوگ اس کی خصوصی حفاظت اور خدمت کرتے تھے۔ آیت میں اس حوالے

سے قیامت کی ہولناک کیفیت کی تصویر دکھائی گئی ہے کہ جب قیامت برپا ہوگی تو بہت قیمتی اونٹنیاں بھی لاوارث ہو جائیں گی' انہیں کوئی سنبھالنے والا نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے اُس وقت جبکہ خود عورتوں کو اپنے حمل کی کوئی فکر نہیں ہوگی تو اونٹنیوں کی کسے ہوش ہوگی۔

آیت ۵ ﴿وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝۵﴾ ''اور جب وحشی جانور جمع کر دیے جائیں گے۔''

عام طور پر جنگلی جانور ایک دوسرے سے دور بھاگتے ہیں' لیکن اس دن خوف کے مارے ان کی وحشت بھی جاتی رہے گی اور مختلف اقسام کے جانور بھی اکٹھے ہو جائیں گے۔

آیت ۶ ﴿وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝۶﴾ ''اور جب سمندر دہکا دیے جائیں گے۔''

اگلی سورت یعنی سورۃ الانفطار میں سمندروں کے پھاڑے جانے ﴿وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝۳﴾ کا ذکر ہے۔ ان دونوں آیات پر غور کریں تو یوں لگتا ہے کہ جب زمین کو کھینچ کر پھیلایا جائے گا ﴿وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۝۳﴾ (الانشقاق) تو اس کی اندرونی تپش اوپری سطح پر آ جائے گی۔ چنانچہ دہکتے ہوئے لاوے کے عین اوپر سمندر اُبل رہے ہوں گے اور اس طرح سمندروں کا پانی بخارات بن کر ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔ واللہ اعلم!

آیت ۷ ﴿وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝۷﴾ ''اور جب جانوں کے جوڑ ملائے جائیں گے۔''

یعنی پوری نسلِ انسانی کے مختلف افراد کی گروہ بندی کر دی جائے گی۔ یہ گروہ بندی لوگوں کے اعمال اور انجام کے حوالے سے ہوگی جیسے سورۃ النمل' آیت ۸۳ اور سورۂ حٰمٓ السجدۃ' آیت ۱۹ میں اہلِ جہنم کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیے جانے کا ذکر آیا ہے۔ اس آیت کا مفہوم یہ بھی لیا گیا ہے کہ جب جانیں جسموں کے ساتھ جوڑ دی جائیں گی۔

آیت ۸ ﴿وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝۸﴾ ''اور جب زندہ دفن کی گئی لڑکی سے پوچھا جائے گا۔''

آیت ۹ ﴿بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝۹﴾ ''کہ وہ کس گناہ کی پاداش میں قتل کی گئی تھی؟''

یہ تذکیر و انذار کا بہت لطیف انداز ہے۔

آیت ۱۰ ﴿وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝۱۰﴾ ''اور جب اعمال نامے کھول دیے جائیں گے۔''

آیت ۱۱ ﴿وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ۝۱۱﴾ ''اور جب آسمان کی کھال اُتار لی جائے گی۔''

یعنی آسمان پر سے پردہ اُٹھا دیا جائے گا اور اس کے وہ سب رموز اور مناظر جو انسانوں کی نظروں سے پوشیدہ تھے ان پر ظاہر ہو جائیں گے۔ اس سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ آسمان اس دن' کھال اُترے ہوئے کسی جانور کے جسم کی طرح سرخ نظر آئے گا' جیسا کہ سورۃ الرحمٰن کی اس آیت میں بھی بتایا گیا ہے: ﴿فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۝۳۷﴾ ''پھر جب آسمان پھٹ جائے گا اور ہو جائے گا گلابی' تیل کی تلچھٹ جیسا۔''

آیت ۱۲ ﴿وَاِذَا الْجَحِیْمُ سُعِّرَتْ ۝۱۲﴾ ''اور جب جہنم دہکائی جائے گی۔''

آیت ۱۳ ﴿وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ۝۱۳﴾ ''اور جب جنت قریب لے آئی جائے گی۔''

ان تیرہ آیات میں قیامت کے دن کی مختلف کیفیات کا ذکر کرنے کے بعد جو اہم اور اصل بات بتانا مقصود ہے وہ یہ ہے:

آیت ۱۴ ﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ۝۱۴﴾ ''(اُس دن) ہر جان جان لے گی کہ اُس نے کیا کچھ حاضر کیا ہے۔''

یعنی ہر انسان کے تمام اعمال کی پوری تفصیل اس کے سامنے آجائے گی۔

آیت ۱۵ ۱۶ ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۙ﴿۱۵﴾ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۙ﴿۱۶﴾﴾ ''تو نہیں! میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے' چلنے والے اور چھپ جانے والے ستاروں کی۔''

یعنی ایسے ستارے جو سیدھا چلتے چلتے پھر پیچھے ہٹنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ان آیات کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:

''کئی سیاروں (مثلاً زحل' مشتری' مریخ' زہرہ' عطارد) کی چال اس ڈھب سے ہے کہ کبھی مغرب سے مشرق کو چلیں' یہ سیدھی راہ ہوئی' کبھی ٹھٹک کر اُلٹے پھریں اور کبھی سورج کے پاس آکر کتنے دنوں تک غائب رہیں۔''

بہرحال یہ آیات آج کے ماہرینِ فلکیات کو دعوتِ تحقیق دے رہی ہیں کہ وہ جدید معلومات کی روشنی میں ان الفاظ (الْخُنَّس اور الْجَوَارِ الْكُنَّس) کے لغوی معانی کے ساتھ ستاروں کی دنیا کے رموز و حقائق کی مطابقت ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔

آیت ۱۷ ﴿وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ۙ﴿۱۷﴾﴾ ''قسم ہے رات کی جب وہ روانہ ہونے لگے۔''

یہ آیت اور سورۃ المدثر کی یہ آیت باہم مشابہ اور ہم معنی ہیں: ﴿وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ۙ﴿۳۴﴾﴾ ''اور قسم ہے رات کی جب کہ وہ پیٹھ موڑے۔''

آیت ۱۸ ﴿وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۙ﴿۱۸﴾﴾ ''اور صبح کی جب وہ سانس لے۔''

یعنی صبح صادق کا وہ وقت جب رات کے سناٹے میں سے زندگی انگڑائی لیتی ہوئی آہستہ آہستہ بیدار ہوتی ہے۔

آیت ۱۹ ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۙ﴿۱۹﴾﴾ ''یقیناً یہ (قرآن) ایک بہت باعزت پیغامبر کا قول ہے۔''

یہاں ''رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ'' سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ یہ آیت قبل ازیں سورۃ الحاقہ میں بھی (بطور آیت ۴۰) آچکی ہے اور وہاں ''رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ'' سے مراد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ سورۃ الحج (آیت ۷۵) میں فرمایا گیا ہے: ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ﴾ ''اللہ چُن لیتا ہے اپنے پیغامبر فرشتوں میں سے بھی اور انسانوں میں سے بھی''۔ چنانچہ فرشتوں میں سے اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو چُنا اور انسانوں میں سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اور یوں ان دو ہستیوں کے ذریعے سے ''رسالت'' کا سلسلہ تکمیل پذیر ہوا۔ زیر مطالعہ آیات میں رسولِ کریم بشر (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اور رسولِ کریم ملک (حضرت جبرائیل علیہ السلام) کی ملاقات کا ذکر بھی آرہا ہے کہ رسالت کی ان دو کڑیوں کے ملنے کا ثبوت فراہم ہو جائے۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ النجم میں بھی آچکا ہے۔

آیت ۲۰ ﴿ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۙ﴿۲۰﴾﴾ ''جو (جبرائیل) بہت قوت والا ہے' صاحبِ عرش کے نزدیک بلند مرتبہ ہے۔''

یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے خاص مقربین میں سے ہیں۔

آیت ۲۱ ﴿مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۙ﴿۲۱﴾﴾ ''جس کی اطاعت کی جاتی ہے اور وہ امانت دار بھی ہے۔''

حضرت جبرائیل علیہ السلام تمام فرشتوں کے سردار ہیں۔ اس لحاظ سے آپ تمام فرشتوں کے مُطاع ہیں یعنی تمام فرشتے آپ کی

اطاعت کرتے ہیں۔ اور آپؐ امانت دار ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا پیغام جوں کا توں انبیاء و رسل علیہم السلام تک پہنچاتے رہے ہیں۔

آیت ۲۲ ﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۝۲۲﴾ ''اور تمہارے یہ ساتھی (محمد ﷺ) کوئی مجنون نہیں ہیں۔''

زیر مطالعہ آیات سورۃ النجم کی ابتدائی آیات کے ساتھ خصوصی مناسبت اور مشابہت رکھتی ہیں۔ وہاں بھی اس مضمون کا آغاز ستارے کی قسم (وَالنَّجْمِ) سے ہوا ہے اور یہاں بھی اس موضوع پر بات شروع کرنے سے پہلے آیات ۱۵ اور ۱۶ میں ستاروں کی قسمیں کھائی گئی ہیں۔ وہاں صَاحِبُكُمْ سے بات شروع ہو کر حضرت جبرائیلؑ کے ذکر تک آئی ہے' جبکہ یہاں حضرت جبرائیلؑ کا ذکر پہلے اور صَاحِبُكُمْ کا بیان بعد میں آیا ہے۔ وہاں حضرت جبرائیلؑ کا ذکر شَدِيْدُ الْقُوٰى کے لقب سے ہوا ہے جبکہ یہاں انؑ کی شان میں ذِيْ قُوَّةٍ کے الفاظ آئے ہیں۔

آیت ۲۳ ﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝۲۳﴾ ''اور انہوں نے دیکھا ہے اس کو کھلے اُفق پر۔''

یعنی ہمارے نبی (ﷺ) نے جبریلؑ کو کھلے اور روشن اُفق پر دیکھا ہے' اس میں کوئی اشتباہ نہیں ہے۔ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ کے لیے سورۃ النجم میں 'بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى' (آیت ۷) کی ترکیب آئی ہے۔

آیت ۲۴ ﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ۝۲۴﴾ ''اور وہ غیب کے معاملے میں حریص یا بخیل نہیں ہیں۔''

'ضَنِيْن' کا ترجمہ حریص بھی کیا گیا ہے اور بخیل بھی۔ دراصل بخل اور حرص دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ایک ہی مفہوم کے دو پہلوؤں کو واضح کرتے ہیں۔ حریص کے معنی میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہمارے نبی (ﷺ) کی پوری زندگی تم لوگوں کے سامنے ہے۔ کیا اُنہوںؐ نے کاہنوں اور نجومیوں کے ساتھ کبھی دوستی رکھی ہے؟ یا غیب کی خبریں معلوم کرنے کے لیے کیا انہوںؐ نے کبھی ریاضتیں وغیرہ کرنے کی کوشش کی ہے؟ ظاہر ہے اُنؐ کی زندگی میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ تم لوگ یہ نہیں کہہ سکتے ہو کہ وہ غیب کی خبروں کے معاملے میں شروع ہی سے ''حریص'' تھے۔ اسی طرح وہؐ اس بارے میں بخیل بھی نہیں ہیں اور اس حقیقت کے بھی تم خود گواہ ہو۔ انہیںؐ غیب کی جو خبریں معلوم ہوتی ہیں وہ تم لوگوں کو بتاتے ہیں۔ کیا کاہن اور نجومی بھی غیب کی خبریں اسی طرح کھلے عام لوگوں کو بتاتے ہیں؟ کسی کاہن کے پاس تو غیب کا علم ہوتا ہی نہیں اور جو کسی قیاس آرائی یا ظن و تخمین کی بنا پر وہ کچھ جانتا ہے اس پر وہ اپنا کاروبار چمکاتا ہے۔ گویا ''ہلدی کی گانٹھ'' مل جانے پر وہ پنساری بن کر بیٹھ جاتا ہے اور اپنی ایک ایک بات کے عوض منہ مانگے نذرانے وصول کرتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے رسول (ﷺ) نے اگر فرشتے کو دیکھا ہے تو اُنہوںؐ نے سرِعام تم لوگوں کو بتا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں غیب کا جو علم دیا جا رہا ہے وہؐ من و عن تم لوگوں کو بتاتے ہیں اور اس معاملے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔[1]

آیت ۲۵ ﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝۲۵﴾ ''اور یہ کسی شیطانِ مردود کا قول نہیں ہے۔''

شیاطین جن چونکہ غیب کے نام پر جھوٹی سچی خبریں کاہنوں تک پہنچاتے رہتے تھے اس لیے یہاں اس امکان کی بھی تردید کر دی گئی ہے۔ یعنی تم لوگ یہ مت سمجھو کہ جنوں میں سے کسی شیطان نے انہیںؐ کوئی پٹی پڑھا دی ہے (معاذ اللہ)۔ یہی مضمون سورۃ الحاقہ

۱۔ اس آیت پر مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کا تفسیری حاشیہ ملاحظہ ہو:

''یعنی یہ پیغمبر ہر قسم کے غیوب کی خبر دیتا ہے' ماضی سے متعلق ہوں یا مستقبل سے' یا اللہ کے اسماء و صفات سے یا احکامِ شرعیہ سے یا مذاہب کی حقیقت و بطلان سے یا جنت و دوزخ کے احوال سے یا واقعات بعد الموت سے' اور ان چیزوں کے بتلانے میں ذرا بخل نہیں کرتا نہ اُجرت مانگتا ہے۔''

میں زیادہ وضاحت اور زیادہ پُرزور انداز میں یوں بیان ہوا ہے: ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۙ﴿۳۸﴾ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۙ﴿۳۹﴾﴾ ''میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جو تم دیکھتے ہو اور ان کی بھی جو تم نہیں دیکھتے ہو''۔ (یہاں پر مَا تُبْصِرُوْنَ سے شاعری وغیرہ مراد ہے اس لیے کہ شاعر لوگ اپنی سوچ اور فکر سے شعر کہتے ہیں' جبکہ مَا لَا تُبْصِرُوْنَ کے الفاظ میں شیاطینِ جن کی خبروں کی طرف اشارہ ہے جو وہ کاہنوں تک پہنچاتے تھے)۔ ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۙ﴿۴۰﴾ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۴۱﴾ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۭ﴿۴۲﴾﴾ ''یہ قول ہے رسولِ کریم کا۔ اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔ کم ہی ہے جو تم یقین کرتے ہو۔ اور نہ ہی یہ کسی کاہن کا کلام ہے۔ کم ہی ہے جو تم غور کرتے ہو۔''

آیت ۲۶ ﴿فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ۭ﴿۲۶﴾﴾ ''تو تم کدھر چلے جا رہے ہو؟''

تمہاری بھلائی اور کامیابی تو اس میں تھی کہ تم لوگ ہمارے رسول (ﷺ) پر ایمان لاتے اور اُن کی طرف جو وحی آ رہی ہے اس کے نور سے اپنے دلوں کو منور کرتے' لیکن تم لوگوں نے اس کے بجائے اُن کی تکذیب اور مخالفت کی روش اپنا رکھی ہے۔ تم لوگ کبھی سنجیدگی سے غور تو کرو کہ اللہ کے کلام سے منہ موڑ کر تم لوگ کس طرف جا رہے ہو۔

آیت ۲۷ ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۲۷﴾﴾ ''نہیں ہے یہ مگر تمام جہان والوں کے لیے ایک یاددہانی۔''

قرآن مجید اس مفہوم میں ذکر یعنی یاددہانی ہے کہ یہ انسان کی فطرت میں پہلے سے موجود حقائق کی یاد تازہ کرتا ہے۔ دراصل انسان فطری طور پر اللہ تعالیٰ کی ذات اور توحید کے تصوّر سے آشنا ہے' مگر دنیا میں رہتے ہوئے اگر انسان کی فطرت پر غفلت کے پردے پڑ جائیں تو وہ اللہ تعالیٰ کو بھول جاتا ہے۔ سورۃ الحشر کی آیت ۱۹ میں اس حوالے سے ہم اللہ تعالیٰ کا یہ حکم پڑھ چکے ہیں: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ﴾ کہ اے اہلِ ایمان! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے ہی غافل کر دیا۔ بہرحال اس غفلت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایمان باللہ سے متعلق وہ حقائق جو ہر انسان کی فطرت میں مضمر ہیں پسِ پردہ چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ قرآنی تعلیمات انسانی فطرت میں موجود ان تمام حقائق کو خفتہ (dormant) حالت سے نکال کر پھر سے فعّال (active) کرنے میں اس کی مدد کرتی ہیں۔

آیت ۲۸ ﴿لِمَنْ شَاۗءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ۭ﴿۲۸﴾﴾ ''ہر اُس شخص کے لیے جو تم میں سے سیدھے راستے پر چلنا چاہے۔''

یعنی قرآن ہر اُس شخص کے لیے یاددہانی ہے جو ہدایت کا طالب ہو اور پورے خلوص سے چاہتا ہو کہ وہ گمراہی سے نکل کر ہدایت کے راستے پر آ جائے۔

آیت ۲۹ ﴿وَمَا تَشَاۗءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۹﴾﴾ ''اور تمہارے چاہے بھی کچھ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اللہ نہ چاہے جو تمام جہانوں کا ربّ ہے۔''

یہ مضمون قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے' یعنی کسی انسان کو ہدایت تبھی ملے گی جب وہ خود بھی اس کے لیے ارادہ کرے اور پھر اللہ بھی اسے ہدایت دینا چاہے۔ ظاہر ہے ہر کام اللہ ہی کے اذن اور اُسی کی توفیق سے ہوتا ہے۔ لیکن ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ انسان کی اپنی خواہش اور طلب کا شامل ہونا بہت ضروری ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ زبردستی کسی پر ہدایت مسلط نہیں کرتا۔ اگر ایسا ہو تو پھر سزا اور جزا کا سارا فلسفہ ہی غلط ہو جاتا ہے۔

سُوْرَةُ الْاِنْفِطَارِ

تمہیدی کلمات

سورۃ الانفطار اور سورۃ التکویر کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے اور یہ تعلق اس حد تک گہرا ہے کہ ان دونوں کا مضمون بھی ایک ہے، بلکہ متعلقہ مضمون دونوں سورتوں کے ملنے سے مکمل ہوتا ہے۔ دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات میں قیامت کے حالات کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ سورۃ التکویر میں ان حالات کی تفصیل تیرہ آیات میں بیان ہوئی ہے جبکہ سورۃ الانفطار میں وہی مضمون صرف چار آیات میں سمٹ گیا ہے۔ اس مضمون کے بعد سورۃ التکویر میں جو اہم خبر دی گئی ہے وہ یہ ہے: ﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ﴿۱۴﴾﴾ جبکہ سورۃ الانفطار میں اس کے مقابلے یہ آیت آئی ہے: ﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ﴿۵﴾﴾۔ یہاں تک تو دونوں سورتوں کا مضمون ایک جیسا ہے۔ اس کے بعد سورۃ التکویر میں قرآن مجید کی صداقت کا حوالہ دے کر مخاطبین سے یہ چبھتا ہوا سوال کیا گیا ہے: ﴿فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴿۲۶﴾﴾ کہ تم لوگ نہ اللہ کے رسولؐ کی سیرت کو دیکھتے ہوئے نہ حق کو پہچاننے کی زحمت گوارا کرتے ہو۔ آخر تم لوگ جا کدھر رہے ہو؟ لیکن وہاں یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ جب قیامت برپا ہو جائے گی اور ہر شخص کو اس کے اعمال کی تفصیل سے آگاہ کر دیا جائے گا تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ چنانچہ اس موضوع پر روشنی یہاں سورۃ الانفطار میں ڈالی گئی ہے کہ اگر یہ راستہ اختیار کرو گے تو اس منزل پر پہنچو گے اور اگر دوسرا طرزِ عمل اپناؤ گے تو اس انجام سے دوچار ہو گے۔

سُوْرَةُ الْاِنْفِطَارِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۱۹ رُكُوْعُهَا: ۱

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ﴿۱﴾ وَ اِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ﴿۲﴾ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ﴿۳﴾ وَ اِذَا الْقُبُوْرُ
بُعْثِرَتْ ﴿۴﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ ﴿۵﴾ يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ
الْكَرِيْمِ ﴿۶﴾ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ﴿۷﴾ فِيْۤ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ﴿۸﴾ كَلَّا بَلْ
تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ﴿۹﴾ وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ﴿۱۰﴾ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ﴿۱۱﴾ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۱۲﴾
اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿۱۳﴾ وَ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ﴿۱۴﴾ يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۱۵﴾ وَ مَا هُمْ
عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ﴿۱۶﴾ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۷﴾ ثُمَّ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۸﴾
يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ؕ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾

آیت ۱ ﴿اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ﴿۱﴾﴾ ”جب آسمان پھٹ جائے گا۔“

آیت ۲ ﴿وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ﴿۲﴾﴾ ”اور جب تارے بکھر جائیں گے۔“

آیت ۳ ﴿وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝۳﴾ ''اور جب سمندر پھاڑ دیے جائیں گے۔''

آیت ۴ ﴿وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۝۴﴾ ''اور جب قبریں تلپٹ کر دی جائیں گی۔''

آیت ۵ ﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ۝۵﴾ ''(اُس وقت) ہر جان' جان لے گی کہ اُس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔''

اُس دن ہر شخص کو واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ اُس نے کیا کیا اچھے یا بُرے اعمال آگے بھیجے تھے اور ان کے آثار و نتائج کی شکل میں کیا کچھ وہ اپنے پیچھے دنیا میں چھوڑ آیا تھا۔ اس مضمون کی وضاحت قبل ازیں سورۃ القیامہ کی آیت ۱۳ کے تحت بھی کی جا چکی ہے۔ اس کے علاوہ اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ قیامت کے دن ہر انسان کو بتا دیا جائے گا کہ اس نے کس شے کو آگے کیا تھا اور کس شے کو پیچھے رکھا تھا۔ یعنی دنیا اور آخرت میں سے اس نے کس کو مقدم رکھا تھا اور کس کو مؤخر کیا تھا۔ آیت کے اس مفہوم سے واضح ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کسی انسان کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار کُلی طور پر اس ''طرزِ عمل'' پر ہے جو وہ اپنی زندگی میں دنیا اور آخرت کے بارے میں اختیار کرتا ہے۔ یعنی انسان کا ایک طرزِ عمل یہ ہو سکتا ہے کہ میرا اصل مطلوب و مقصود تو آخرت ہے' دنیا کا کیا ہے جو مل گیا وہی غنیمت ہے اور اگر کبھی نہ بھی ملے تب بھی کوئی بات نہیں۔ دوسرا ممکنہ رویہ یہ ہے کہ میرا اصل مقصود تو دنیا ہے' اس کے ساتھ ساتھ اگر آخرت بھی مل جائے تو اچھا ہے' چاہے وہ کسی کی سفارش سے مل جائے یا کسی اور حیلے سے۔ لیکن میری پہلی ترجیح (Ist priority) بہر حال دنیا اور اس کا مال و متاع ہے' اور زندگی میں میری ساری تگ و دو اسی کے لیے ہے۔

آیت ۶ ﴿يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝۶﴾ ''اے انسان! تجھے کس چیز نے دھوکے میں ڈال دیا ہے اپنے ربِّ کریم کے بارے میں۔''

ظاہر ہے یہ کام شیطان لعین ہی کرتا ہے۔ وہی انسان کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں دھوکے میں ڈالتا ہے۔ اس حوالے سے قرآن مجید میں بنی نوع انسان کو بار بار خبردار کیا گیا ہے' مثلاً سورۂ لقمان میں فرمایا: ﴿وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝۳۳﴾ کہ وہ بڑا دھوکے باز تم لوگوں کو اللہ کے بارے میں کہیں دھوکے میں مبتلا نہ کر دے! لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام تر تنبیہات کے باوجود اکثر انسان شیطان کے اس جال میں پھنس جاتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے شیطان مختلف لوگوں کے ساتھ مختلف چالیں اور حربے آزماتا ہے۔ مثلاً ایک دیندار شخص کو اہم فرائض سے ہٹانے کے لیے وہ نوافل اور ذکر و اذکار کا پُرکشش پیکج پیش کر سکتا ہے کہ تم اقامتِ دین اور دوسرے فرائضِ دینی کا خیال چھوڑو اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے راتوں کو جاگنے اور تہجد کی پابندی پر توجہ دو۔ عام مسلمانوں کے لیے اس کی بہت ہی تیر بہدف چال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے' وہ کوئی خُردہ گیر نہیں کہ اپنے مؤمن بندوں کو چھوٹی چھوٹی خطاؤں پر پکڑے۔ وہ تو بہت بڑے بڑے گناہگاروں کو بھی معاف کر دیتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں بے عملی کی سب سے بڑی وجہ شیطان کی یہی چال ہے' بلکہ اس دلیل کے سہارے اکثر لوگ گناہوں کے بارے میں حیران کن حد تک جری اور بے باک ہو جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے آیت زیر مطالعہ ہم میں سے ہر ایک کو دعوتِ فکر دے رہی ہے کہ اے اللہ کے بندے! تمہاری بے عملی کی وجہ کہیں یہ تو نہیں ہے کہ شیطان نے تمہیں اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاری کے نام پر دھوکے میں مبتلا کر دیا ہے؟

آیت ۷ ﴿الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝۷﴾ ''جس نے تمہیں تخلیق کیا' پھر تمہارے نوک پلک سنوارے' پھر تمہارے اندر اعتدال پیدا کیا۔''

اللہ تعالیٰ نے تمہارے قوائے جسمانی اور قوائے نفسیاتی میں ہر طرح سے اعتدال اور توازن پیدا کیا ہے۔ گویا تمہاری تخلیق اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کی مظہر ہے۔ تمہاری تخلیق کے اندر توازن اور خوبصورتی کا یہ پہلو گویا اس حقیقت پر گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر معاملے میں عدل و اعتدال کو پسند فرماتا ہے اور یہ کہ وہ تم انسانوں کے ساتھ آخرت میں بھی عدل و انصاف کا معاملہ فرمائے گا' تاکہ گناہگاروں کو قرار واقعی سزا مل سکے اور نیکوکار اپنی نیکیوں کا پورا پورا بدلہ پائیں۔ تمہاری مبنی بر اعتدال تخلیق و ترکیب کا تقاضا تو یہ تھا کہ تمہارے خیالات و اعمال بھی اعتدال اور توازن کا مظہر ہوتے' مگر تم لوگ ہو کہ اپنے خالق کے بارے میں ہی دھوکے میں مبتلا ہو گئے ہو۔ تم اس کی شانِ غفاری کو تو بہت اہتمام سے یاد رکھتے ہو جبکہ اس کی صفتِ عدل سمیت بہت سی دوسری صفات کو بالکل ہی بھولے ہوئے ہو۔ تمہاری یہ بے اعتدالی تمہارے اس خالق کو بالکل پسند نہیں ہے جس نے تمہاری تخلیق کا خمیر ہی اعتدال سے اٹھایا ہے۔

آیت ۸ ﴿فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝۸﴾ ''پھر جس شکل میں اُس نے چاہا تجھے ترکیب دے دیا۔''

اللہ تعالیٰ ہر انسان کی شکل اور اس کے مختلف اعضاء اپنی مرضی و مشیت کے مطابق بناتا ہے۔ ظاہر ہے اس معاملے میں کسی انسان کو کوئی اختیار نہیں۔ اس موضوع کی مناسبت سے مجھے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے نعتیہ اشعار یاد آ گئے ہیں۔ آپؓ حضور ﷺ کی شان میں فرماتے ہیں:

وَاَحْسَنُ مِنْكَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَيْنِيْ ۔۔۔ وَاَجْمَلُ مِنْكَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ
خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِنْ كُلِّ عَيْبٍ ۔۔۔ كَاَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

''آپ ﷺ سے زیادہ حسین میری آنکھ نے کبھی نہیں دیکھا اور آپ سے بڑھ کر جمیل عورتوں نے جنا ہی نہیں۔ آپ ہر عیب اور نقص سے مبرا پیدا ہوئے ہیں۔ گویا آپ اس طرح پیدا ہوئے ہیں جس طرح آپ نے خود چاہا۔''

آیت ۹ ﴿كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّیْنِ ۝۹﴾ ''ہرگز نہیں! بلکہ اصل میں تم جزا و سزا کا انکار کر رہے ہو۔''

تم لوگ یہ جو اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاری کے قصیدے پڑھ رہے ہو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم اس کی رحمت اور بخشش پر واقعتاً بہت پختہ یقین بھی رکھتے ہو' بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اپنے اس فلسفے کی آڑ میں تم جزا و سزا کا انکار کرنا چاہتے ہو۔ اسی طرح کے ایک ''قصیدے'' کی یہ جھلک ملاحظہ کیجیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور شانِ غفاری کا اقرار ہے یا اس کے فلسفہ جزا و سزا کا مذاق: ؎

عصیاں سے کبھی ہم نے کنارا نہ کیا ۔۔۔ پر تُو نے دلِ آزردہ ہمارا نہ کیا
ہم نے تو جہنّم کی بہت کی تدبیر ۔۔۔ لیکن تیری رحمت نے گوارا نہ کیا!

اگر کوئی شخص واقعی پوری دیدہ دلیری سے جہنّم کی تدبیر اور کوشش کر رہا ہے تو اللہ تعالیٰ کے عدل کا تقاضا تو یہی ہے کہ اس کی خواہش پوری کرتے ہوئے اسے جہنّم میں جھونک دیا جائے۔ چنانچہ ایسے خیالات و نظریات کے حامل لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور شانِ غفاری کی من مانی تشریح کر کے نہ صرف اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں' بلکہ عملی طور پر جزا و سزا کے فلسفہ کا ہی انکار کر رہے ہیں۔

آیت ۱۰ ﴿وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝۱۰﴾ ''حالانکہ تم پر نگران (فرشتے) مقرر ہیں۔''

آیت ۱۱ ﴿كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝۱۱﴾ ''جو بڑے باعزت لکھنے والے ہیں۔''

آیت ۱۲ ﴿يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝۱۲﴾ ''وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کر رہے ہو۔''

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے بطور نگران مقرر کر رکھے ہیں جو اُس کا ایک ایک عمل لکھ رہے ہیں۔ اب اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو انسانوں کا محاسبہ کرنا منظور نہیں ہے تو گویا وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اس کا فرشتوں کو بطور نگران مقرر کرنا اور ان فرشتوں کا ایک ایک انسان کے ایک ایک عمل کا ریکارڈ مرتب کرنا سب کارِ عبث ہے۔ ایسے خیالات کے حامل لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ''کارِ عبث'' اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں' وہ احتساب ضرور کرے گا اور اس احتساب کے نتائج بھی ضرور نکلیں گے' جن کا ذکر اگلی آیات میں ہے:

آیت ۱۳ ﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝۱۳﴾ ''یقیناً نیکوکار بندے نعمتوں میں ہوں گے۔''

آیت ۱۴ ﴿وَّاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ۝۱۴﴾ ''اور یقیناً فاسق و فاجر جہنّم میں ہوں گے۔''

آیت ۱۵ ﴿يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ۝۱۵﴾ ''داخل ہوں گے اس میں جزا و سزا کے فیصلے کے دن۔''

آیت ۱۶ ﴿وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ۝۱۶﴾ ''اور وہ اس سے کہیں غائب نہیں ہو سکیں گے۔''

ظاہر ہے جہنّم سے بھاگ نکلنے کا نہ کوئی راستہ ہوگا اور نہ ہی کسی میں بھاگ جانے کی طاقت ہوگی۔

آیت ۱۷ ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝۱۷﴾ ''اور کیا تمہیں کچھ معلوم ہے کہ روزِ جزا کیا ہے؟''

آیت ۱۸ ﴿ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝۱۸﴾ ''پھر کیا تمہیں کچھ اندازہ ہوا ہے کہ روزِ جزا کیا ہے؟''

آیت ۱۹ ﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ﴾ ''جس روز کسی جان کو کسی دوسری جان کے لیے کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا۔''

﴿وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ۝۱۹﴾ ''اور امر کُل کا کُل اُس دن اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔''

اُس دن سرِ محشر پکارا جائے گا: ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ﴾ (المؤمن: ۱۶) کہ اے نسلِ انسانی کے لوگو! دیکھو! آج حکومت' اختیار اور اقتدار کس کے ہاتھ میں ہے؟ اور اس سوال کا جواب بھی پھر خود ہی دیا جائے گا: ﴿لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (المؤمن: ۱۶) یعنی آج کے دن اختیارِ کُل کا کُل اللہ ہی کے پاس ہے جو اکیلا ہے اور سب پر غالب ہے۔ اس دن انسانوں کی اکثریت کو بے بسی اور نفسا نفسی کی جس کیفیت کا سامنا ہوگا' سورۃ البقرۃ میں اس کا نقشہ یوں دکھایا گیا ہے: ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝۴۸﴾ ''اور ڈرو اُس دن سے کہ جس دن کام نہ آ سکے گی کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ بھی اور نہ کسی سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ کسی سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ انہیں کوئی مدد ہی مل سکے گی۔''

سُوْرَةُ الْمُطَفِّفِيْنَ

سُوْرَةُ الْمُطَفِّفِيْنَ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۳۶ رُكُوْعُهَا: ۱

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۖ﴿۲﴾ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ
يُخْسِرُوْنَ ؕ﴿۳﴾ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۙ﴿۴﴾ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۙ﴿۵﴾ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ؕ﴿۶﴾ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ؕ﴿۷﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ؕ﴿۸﴾ كِتٰبٌ
مَّرْقُوْمٌ ؕ﴿۹﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۙ﴿۱۰﴾ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ؕ﴿۱۱﴾ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ
اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۙ﴿۱۲﴾ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ؕ﴿۱۳﴾ كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى
قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ﴿۱۵﴾ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا
الْجَحِيْمِ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۷﴾ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ
عِلِّيِّيْنَ ﴿۱۸﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ﴿۱۹﴾ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۙ﴿۲۰﴾ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۱﴾ اِنَّ
الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۙ﴿۲۲﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ۙ﴿۲۳﴾ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ۚ﴿۲۴﴾
يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۙ﴿۲۵﴾ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَ
مِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ۙ﴿۲۷﴾ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ۖ﴿۲۹﴾ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ۖ﴿۳۰﴾ وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا
فَكِهِيْنَ ۖ﴿۳۱﴾ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ۙ﴿۳۲﴾ وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۳۳﴾
فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ۙ﴿۳۴﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ ۙ يَنْظُرُوْنَ ؕ﴿۳۵﴾ هَلْ ثُوِّبَ
الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ ع ۱ ۸

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ①﴾ ''ہلاکت ہے کمی کرنے والوں کے لیے۔''

وَیْل کے معنی تباہی، بربادی اور ہلاکت کے بھی ہیں اور یہ جہنّم کی ایک وادی کا نام بھی ہے۔ 'طف' لغوی اعتبار سے حقیری چیز کو کہا جاتا ہے۔ اسی معنی میں یہ لفظ کم تولنے یا کم ماپنے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مُطَفِّف وہ ہے جو حق دار کو اس کا پورا حق نہیں دیتا بلکہ اس میں کمی کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے جو شخص ماپ تول میں کمی کرتا ہے وہ اپنے اس عمل کے ذریعے متعلقہ چیز کی بہت تھوڑی سی مقدار

ہی ناحق بچا پاتا ہے۔ اس کے باوجود اسے یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ اتنی حقیری چیز کے لیے اپنا ایمان فروخت کر رہا ہے۔ بہرحال اس آیت میں کم تولنے یا کم ماپنے والوں کو آخرت میں بربادی اور جہنم کی نوید سنائی گئی ہے۔

آیت ۲ ﴿الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝۲﴾ ''وہ لوگ کہ جب دوسروں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں۔''

آیت ۳ ﴿وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝۳﴾ ''اور جب خود انہیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کمی کر دیتے ہیں۔''

آیت ۴ ﴿اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝۴﴾ ''کیا ان کو یہ گمان نہیں کہ وہ دوبارہ اٹھائے جانے والے ہیں۔''

آیت ۵ ﴿لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۵﴾ ''ایک بڑے دن کے لیے۔''

آیت ۶ ﴿يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶﴾ ''جس دن کہ لوگ کھڑے ہوں گے تمام جہانوں کے رب کے سامنے۔''

ناپ تول میں کمی کرتے ہوئے ہاتھ کو ہلکی سی جنبش دینا بظاہر تو ایک معمولی سا عمل ہے لیکن ''تل کی اوٹ میں پہاڑ'' کے مصداق ایسا کرنے والے کی اس حرکت سے ثابت ہوتا ہے کہ یا تو اس کا بعث بعد الموت پر یقین نہیں یا پھر اسے اس کی پروا نہیں کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔

آیت ۷ ﴿كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝۷﴾ ''ہرگز نہیں! یقیناً گناہگاروں کے اعمال نامے سجّین میں ہوں گے۔''

عام طور پر کِتٰب سے یہاں اعمال نامہ ہی مراد لیا گیا ہے کہ کافر و فاجر لوگوں کے اعمال نامے ''سِجِّین'' میں، جبکہ نیک لوگوں کے اعمال نامے ''عِلِّیین'' (بحوالہ آیت ۱۸) میں ہوں گے۔ تاہم بعض احادیث سے پتا چلتا ہے کہ ''سجّین'' ایک مقام ہے جہاں اہلِ دوزخ کی روحیں محبوس ہوں گی، جبکہ اہلِ جنّت کی ارواح ''علّیین'' میں ہوں گی۔ چنانچہ سجّین اور علّیین کا یہ فرق صرف اعمال نامے کو رکھنے کے اعتبار سے نہیں ہو سکتا۔ اس حوالے سے میرے غور و فکر کا حاصل یہ ہے کہ انسان کے خاکی جسم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو روح پھونکی گئی ہے وہ ایک نورانی چیز ہے۔ انسان اچھے برے جو بھی اعمال کرتا ہے اس کے اثرات اس کی روح پر مترتب ہوتے رہتے ہیں، جیسے آواز کی ریکارڈنگ کرتے ہوئے ٹیپ کے فیتے، سی ڈی یا مائیکرو کارڈ وغیرہ پر اس آواز کے اثرات نقش ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ انسانوں کی ارواح جب اس دنیا سے جاتی ہیں تو اعمال کے اثرات اپنے ساتھ لے کر جاتی ہیں۔ ان ''اثرات'' کی وجہ سے ہر روح دوسری روح سے مختلف ہو جاتی ہے اور یوں نیک اور برے انسانوں کی ارواح میں زمین آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میری رائے میں انسانی ارواح پر ثبت شدہ اثراتِ اعمال کو یہاں لفظ ''کتاب'' سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی انسانی ارواح اعمال کے اثرات لیے ہوئے جب اس دنیا سے جائیں گی تو بُرے اعمال کے اثرات والی ارواح کو سجّین میں رکھا جائے گا۔ سجن کے معنی ''جیل خانہ'' کے ہیں۔ گویا بُرے لوگوں کی ارواح کو وہاں کسی جیل نما جگہ میں بند کر دیا جائے گا، جیسے ضلعی انتظامیہ کے ''محافظ خانے'' میں پرانی فائلوں کے انبار لگے ہوتے ہیں۔

آیت ۸ ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝۸﴾ ''اور تم نے کیا سمجھا کہ سجّین کیا ہے؟''

آیت ۹ ﴿كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝۹﴾ ''لکھا ہوا دفتر۔''

اس ''کِتٰب'' سے مراد ایک انسان کی جان اور روح کا وہ ملغوبہ ہے جس میں اُس کے اعمال کے اثرات بھی ثبت ہوتے ہیں۔ کسی بُرے انسان کے مرنے پر متعلقہ فرشتہ وہ ملغوبہ لاکر سجین میں ''جمع'' کرا دیتا ہے۔

آیت ۱۰ ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۱۰﴾ ''تباہی اور ہلاکت ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔''

آیت ۱۱ ﴿الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝۱۱﴾ ''جو جھٹلا رہے ہیں جزا و سزا کے دن کو۔''

آیت ۱۲ ﴿وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝۱۲﴾ ''اور نہیں جھٹلاتا اس دن کو مگر وہی کہ جو حد سے بڑھنے والا گناہگار ہے۔''

ایسا شخص جزا و سزا کے دن کو دراصل اس لیے جھٹلاتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں اور حرام خوریوں کی وجہ سے اس دن کے احتساب کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ چنانچہ جس طرح بلّی سے بچنے کے لیے کبوتر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے اسی طرح یومِ حساب کی جواب دہی سے بچنے کے لیے ایسے لوگ اس دن کے وقوع کا ہی انکار کر دیتے ہیں۔

آیت ۱۳ ﴿اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۳﴾ ''جب اسے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں ہماری آیات تو کہتا ہے کہ یہ تو پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔''

یعنی یہ تو وہی باتیں ہیں جو پچھلے زمانے کے لوگوں سے سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہیں۔

آیت ۱۴ ﴿كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۱۴﴾ ''ہرگز نہیں! بلکہ (اصل صورتِ حال یہ ہے کہ) ان کے دلوں پر زنگ آ گیا ہے ان کے اعمال کی وجہ سے۔''

اس 'زنگ' کی تشریح رسول اللہ ﷺ نے یوں فرمائی ہے کہ ''بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اُس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کر لے اس گناہ سے باز آ جائے اور استغفار کرے تو اس کے دل کا یہ داغ صاف ہو جاتا ہے' لیکن اگر وہ گناہوں کا ارتکاب کرتا ہی چلا جائے تو وہ داغ بڑھتے جاتے ہیں' یہاں تک کہ سارے دل کو گھیر لیتے ہیں۔'' (مسند احمد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ وغیرہ)

گناہگار اہلِ ایمان کے دلوں کے اندر ان کی روحوں کا ''نور'' تو موجود ہوتا ہے لیکن دلوں کے ''شیشے'' زنگ آلود ہو جانے کی وجہ سے یہ نور خارج میں اپنے اثرات نہیں دکھا سکتا۔ جیسے کسی فانوس یا لالٹین کا شیشہ اگر دھوئیں سے سیاہ ہو جائے تو اس کے اندر جلنے والے شعلے کی روشنی باہر نہیں آ سکتی اور باہر کی روشنی اندر نہیں جا سکتی۔ انسانی دل کی اس کیفیت کی وضاحت کرتے ہوئے حضور ﷺ نے اس کا علاج بھی تجویز فرما دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيْدُ اِذَا اَصَابَهُ الْمَاءُ)) قِيْلَ : يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا جِلَاءُهَا؟ قَالَ : ((كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةُ الْقُرْآنِ))[1]

1۔ رواہ البیھقی فی شعب الایمان۔ مشکاۃ المصابیح' کتاب فضائل القرآن' الفصل الثالث۔

''ان دلوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے جیسے لوہا پانی پڑنے سے زنگ آلود ہو جاتا ہے''۔ دریافت کیا گیا: یارسول اللہ! اس زنگ کو دور کس چیز سے کیا جائے؟ فرمایا: ''موت کی بکثرت یاد اور قرآن مجید کی تلاوت!''

آیت ۱۵ ﴿كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝۱۵﴾ ''ہرگز نہیں! یقیناً یہ لوگ اُس دن اپنے ربّ سے اوٹ میں رکھے جائیں گے۔''

قیامت کے دن یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے دیدار سے محروم کر دیے جائیں گے۔ اس کے برعکس نیکوکار لوگوں کے لیے سورۃ القیامہ میں یہ خوشخبری سنائی گئی ہے: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝۲۲ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝۲۳﴾ کہ اس دن کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے اور وہ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ میدانِ حشر میں اہلِ ایمان کو اللہ تعالیٰ کے دیدار یا اس کی کسی خاص شان کے مشاہدے سے سرفراز فرمایا جائے گا جس کے باعث اس دن کے سخت مراحل ان کے لیے آسان ہو جائیں گے۔ اس حوالے سے ہمارے عام مفسرین کی رائے بھی یہی ہے کہ میدانِ حشر میں بھی مؤمنین صادقین کو اللہ تعالیٰ کا دیدار کرایا جائے گا۔ یہ آیت زیر مطالعہ سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ اُس وقت میدانِ حشر میں کُفّار و مشرکین بھی کھڑے ہوں گے لیکن انہیں اس نعمت سے محروم کر دیا جائے گا۔ میدانِ حشر کے ایسے ہی ایک منظر کی جھلک سورۂ ن کی اس آیت میں بھی دکھائی گئی ہے: ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝۴۲﴾ ''جس دن پنڈلی کھولی جائے گی' اور انہیں پکارا جائے گا (اللہ کے حضور) سجدے کے لیے' لیکن وہ کر نہیں سکیں گے''۔ یعنی اہلِ ایمان جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے حضور سجدے کرتے تھے وہ تو اس حکم کو سنتے ہی سجدے میں گر جائیں گے لیکن دوسرے لوگوں کی کمریں تختہ ہو کر رہ جائیں گی' وہ تمام تر خواہش اور کوشش کے باوجود سجدہ نہیں کر سکیں گے۔

آیت ۱۶ ﴿ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ۝۱۶﴾ ''پھر انہیں جھونک دیا جائے گا جہنّم میں۔''

اس آیت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ مرحلہ دوزخ میں داخلے سے پہلے کا ہے' یعنی دیدارِ الٰہی سے محروم رکھے جانے کا واقعہ میدانِ حشر میں ہی رونما ہوگا۔

آیت ۱۷ ﴿ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝۱۷﴾ ''پھر ان سے کہا جائے گا: یہ ہے وہ چیز جس کی تم تکذیب کیا کرتے تھے!''

دنیا میں تم لوگ جنّت' دوزخ اور جزا و سزا کو بڑے شد و مد سے جھٹلایا کرتے تھے۔ اب دیکھ لو! دوزخ اور اس کی سزائیں حقیقت بن کر تمہارے سامنے آ گئی ہیں۔

آیت ۱۸ ﴿كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ۝۱۸﴾ ''نہیں! یقیناً نیکوکاروں کے اعمال نامے عِلّیین میں ہوں گے۔''

آیت ۱۹ ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ۝۱۹﴾ ''اور تمہیں کچھ اندازہ ہے وہ عِلّیین کیا ہے؟''

آیت ۲۰ ﴿كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝۲۰﴾ ''لکھا ہوا دفتر۔''

یعنی ان لوگوں کی ارواح کا مقام جن پر ان کے نیک اعمال کے اثرات بھی ثبت ہوں گے۔

آیت ﴿ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴾ ''وہاں موجود ہوں گے ملائکہ مقربین۔''

ان لوگوں کی ارواح کو ملائکہ مقربین کی صحبت میسّر ہوگی۔ اس بلند مقام پر انہیں قیامِ قیامت تک رکھا جائے گا۔

آیت ﴿ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴾ ''یقیناً نیکوکار نعمتوں میں ہوں گے۔''

آیت ﴿ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴾ ''وہ تختوں پر بیٹھے (مناظرِ جنّت) دیکھ رہے ہوں گے۔''

آیت ﴿ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ﴾ ''تم دیکھو گے ان کے چہروں پر تروتازگی کی علامات۔''

جیسے دنیا میں انسان کی خوشحالی اور آسودگی کے اثرات اس کے چہرے پر نمایاں ہوتے ہیں اسی طرح قیامت کے دن اہلِ جنّت اپنے تروتازہ چہروں سے صاف پہچانے جائیں گے۔

آیت ﴿ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴾ ''انہیں پلائی جائے گی خالص شراب جس پر مہر لگی ہوگی۔''

ہندوستان کے معروف اہلِ حدیث عالم دین مولانا صفی الرحمن مبارکپوری نے احادیث کے حوالے سے سیرت پر ایک بہت عمدہ کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کا نام انہوں نے اس آیت سے اخذ کیا ہے۔ انہیں اس کتاب پر شاہ فیصل ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ الرَّحِیقُ المَخْتُوم کے نام سے یہ کتاب اردو میں ہے اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔

آیت ﴿ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ﴾ ''اس کی مہر ہوگی مُشک کی۔''

﴿ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴾ ''اس چیز کے لیے سبقت لے جانے کی کوشش کریں سبقت لے جانے والے۔''

اہلِ ایمان کو چاہیے کہ وہ دنیا کی حقیر چیزوں کے پیچھے دوڑنے کے بجائے ان دوامی نعمتوں کو حاصل کرنے کے لیے محنت اور مسابقت کریں۔

آیت ﴿ وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ﴾ ''اور اس کی ملونی ہوگی تسنیم سے۔''

اس شراب یعنی رحیقِ مختوم میں تسنیم کا مشروب بھی ملایا گیا ہوگا۔ اور یہ تسنیم کیا ہے؟

آیت ﴿ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴾ ''یہ ایک چشمہ ہے جس پر جام نوشی کریں گے مقربین بارگاہ۔''

آیت ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴾ ''یقیناً جو مجرم تھے وہ اہلِ ایمان پر ہنسا کرتے تھے۔''

وہ اہلِ ایمان کا مذاق اڑایا کرتے تھے کہ دیکھو ان بے وقوفوں کو جنہوں نے آخرت کے موہوم وعدوں پر اپنی زندگی کی خوشیاں اور آسائشیں قربان کر دی ہیں۔

آیت ﴿ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ﴾ ''اور جب یہ ان کے قریب سے گزرتے تھے تو آپس میں آنکھیں مارتے تھے۔''

کہ دیکھو! یہ ہیں وہ احمق جو جنّت کی حوروں کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔

آیت ﴿وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ﴾ ''اور جب وہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹتے تھے تو باتیں بناتے ہوئے لوٹتے تھے۔''

آیت ﴿وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ﴾ ''اور جب وہ ان (اہلِ ایمان) کو دیکھتے تھے تو کہتے تھے کہ یقیناً یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں۔''

مخالفین کے ایسے تبصرے طنزیہ بھی ہو سکتے ہیں اور ان میں ہمدردی کا پہلو بھی ہو سکتا ہے۔ جیسے آج کل بھی ہمیں ایسے فقرے اکثر سننے کو مل جاتے ہیں کہ دیکھیں! یہ اچھا بھلا ذہین نوجوان تھا۔ بورڈ ٹاپ کیا' یونیورسٹی میں گولڈ میڈل لیا' ملازمت بھی بہت اچھی ملی' لیکن پھر اچانک خدا جانے اسے کیا ہوا کہ اس کا رجحان مذہب کی طرف ہو گیا' اس کے بعد تو اس کی ترجیحات ہی بدل گئی ہیں' اب اسے نہ اپنا خیال ہے اور نہ ملازمت کی فکر' بس رات دن اس کے سر پر تبلیغ کی دھن سوار ہے۔ بے چارہ' اچھا خاصا کیریئر تباہ کر کے بیٹھ گیا ہے۔

آیت ﴿وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ﴾ ''جب کہ انہیں نہیں بھیجا گیا تھا ان پر نگران بنا کر۔''

آیت ﴿فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ﴾ ''تو آج (قیامت) کے دن اہلِ ایمان ان کفار پر ہنس رہے ہیں۔''

آیت ﴿عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴾ ''وہ تختوں پر بیٹھے (ان کا حشر) دیکھ رہے ہیں۔''

کہ ابوجہل پر کیا بیت رہی ہے اور ابولہب کو کیسے عذاب کا سامنا ہے۔

آیت ﴿هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴾ ''بدلہ مل گیا نا کافروں کو اس کا جو کچھ وہ کیا کرتے تھے!''

سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ

سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۲۵ رُكُوْعُهَا: ۱

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۙ﴿۱﴾ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ۙ﴿۲﴾ وَ اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۙ﴿۳﴾ وَ اَلْقَتْ مَا فِيْهَا
وَ تَخَلَّتْ ۙ﴿۴﴾ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ۙ﴿۵﴾ يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا
فَمُلٰقِيْهِ ۚ﴿۶﴾ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ﴿۷﴾ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۙ﴿۸﴾ وَّ يَنْقَلِبُ اِلٰۤى
اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۚ﴿۹﴾ وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۙ﴿۱۰﴾ فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۙ﴿۱۱﴾ وَّ يَصْلٰى
سَعِيْرًا ؕ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ فِيْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۚ﴿۱۳﴾ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ۛؕ﴿۱۴﴾ بَلٰۤى ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ
بَصِيْرًا ۚ﴿۱۵﴾ فَلَاۤ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۙ﴿۱۶﴾ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۙ﴿۱۷﴾ وَ الْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۙ﴿۱۸﴾ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا
عَنْ طَبَقٍ ؕ﴿۱۹﴾ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۲۰﴾ وَ اِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ؕ﴿۲۱﴾ بَلِ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ۚ﴿۲۲﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ۚ﴿۲۳﴾ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ﴿۲۴﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿۲۵﴾ ع

آیت ۱ ﴿اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۙ﴿۱﴾﴾ ''جب آسمان پھٹ جائے گا۔''

نوٹ کیجیے! ان تمام سورتوں کا بنیادی موضوع ''تذکیرِ آخرت'' ہے۔

آیت ۲ ﴿وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ۙ﴿۲﴾﴾ ''اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گا اور اسے یہی زیب دیتا ہے۔''

اَذِنَتْ لِرَبِّهَا کا لفظی ترجمہ یوں ہوگا کہ وہ اپنے رب کے حکم پر کان لگائے ہوئے ہے اور جو بات کان لگا کر سنی جائے اس کے مطابق عمل بھی کیا جاتا ہے۔ اَذِنَتْ کا معنی اِسْتَمَعَتْ وَانْقَادَتْ کیا گیا ہے یعنی اُس نے غور سے سنا اور تعمیل کی۔ حُقَّتْ یہاں مجہول ہے حَقَّ یَحُقُّ سے۔ یعنی وہ اسی لائق ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ بے چون و چرا اپنے خالق کے حکم پر سرِ تسلیم خم کرے۔

آیت ۳ ﴿وَ اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۙ﴿۳﴾﴾ ''اور جب زمین کو پھیلا دیا جائے گا۔''

آیت ۴ ﴿وَ اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ ۙ﴿۴﴾﴾ ''اور وہ نکال باہر کرے گی جو کچھ اس کے اندر تھا اور خالی ہو جائے گی۔''

سورۃ الزلزال میں یہی بات یوں بیان ہوئی ہے: ﴿وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۙ﴿۲﴾﴾ ''اور جب زمین اپنے سارے بوجھ نکال کر باہر پھینک دے گی''۔ قیامت کے دن زمین اپنے اندر مدفون تمام انسانوں کے اجسام اور ان کے تمام اجزاء کو نکال باہر کرے گی۔ اس کے علاوہ بھی زمین میں جو کچھ معدنیات اور خزانے مخفی ہیں وہ قیامت کے دن نکال کر باہر پھینک دے گی۔

آیت ۵ ﴿وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝۵﴾ ''اور وہ بھی اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اسے یہی زیب دیتا ہے۔''
جس طرح اطاعت و انقیاد کا مظاہرہ آسمان کرے گا اسی طرح زمین بھی حکم الٰہی بجالائے گی۔

آیت ۶ ﴿يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۝۶﴾ ''اے انسان! تُو مشقت پر مشقت برداشت کرتے جا رہا ہے اپنے رب کی طرف' پھر تُو اس سے ملنے والا ہے۔''

یہ دنیا انسان کے لیے دار المحن یعنی مشقتوں کا گھر ہے۔ انسانی زندگی کی اس تلخ حقیقت کو سورۃ البلد میں یوں بیان فرمایا گیا: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ۝۴﴾ کہ انسان تو پیدا ہی مشقت میں کیا گیا ہے۔ گویا مشقتیں برداشت کرنا' دکھ اٹھانا اور سختیاں جھیلنا انسان کا مقدر ہے۔ اس سے کسی انسان کو رستگاری نہیں۔ مزدور ہے تو وہ صبح سے شام تک جسمانی سختیاں سہہ رہا ہے۔ کارخانہ دار ہے تو انتظامی گتھیوں کو سلجھانے میں جگر خون کر رہا ہے۔ اگر کوئی کسی دفتر کی کرسی پر بیٹھا ہے تو ذہنی مشقت کی چکّی میں پس رہا ہے۔ پھر اپنی اور اہل و عیال کی بیماریاں' معاشی مشکلات' معاشرتی الجھنیں' مال و جان کی حفاظت کی فکر وغیرہ کی صورت میں ذہنی و نفسیاتی پریشانیاں الگ ہیں جو ہر انسان کے گلے کا ہار بنی ہوئی ہیں۔ دوسروں سے مسابقت اور مقابلے کا غم اس کے علاوہ ہے جو ہر انسان نے اپنے دل و دماغ میں کسی نہ کسی سطح پر ضرور پال رکھا ہے۔ پیدل چلنے والا سائیکل سوار کو رشک بھری نظروں سے دیکھتا ہے' سائیکل سوار کار والے کے حسد میں مبتلا ہے۔ چھوٹی کار والا بڑی کار والے سے جلن کا شکار ہے۔ غرض مشقت' تکلیف یا غم کی نوعیت تو مختلف ہو سکتی ہے مگر کوئی انسان ایسا نہیں جو کسی نہ کسی دکھ' پریشانی یا مشقت میں مبتلا نہ ہو۔ ان مشقتوں' تکلیفوں اور پریشانیوں کا سامنا انسان کو روزِ اوّل سے ہے اور رہتی دنیا تک رہے گا۔ جیتے جی کوئی انسان اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ مرزا غالبؔ نے اس حوالے سے بڑے پتے کی بات کہی ہے: ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں!

ان مشقتوں اور مصیبتوں میں گھری انسانی زندگی کی یہ سختیاں اور پریشانیاں اپنی جگہ' لیکن انسان کا اصل مسئلہ اس سے کہیں زیادہ گمبھیر اور پریشان کن ہے۔ اور وہ مسئلہ ہے کہ: ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟
(ابراہیم ذوق)

انسان کے اخروی احتساب کا تصور ذہن میں لائیں اور پھر موازنہ کریں کہ باقی جانداروں کے مقابلے میں ''انسان'' کس قدر مشکل میں ہے۔ ایک بار بردار جانور کی زندگی کا معمول چاہے جتنا بھی مشکل ہو لیکن اس کی مشقت اور تکلیف اس کی زندگی کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے ایک بیل جب ہل یا رہٹ چلاتے چلاتے مر جاتا ہے تو اس مشقت سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ جاتا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں ایک انسان ہے جو کوفت پر کوفت برداشت کرتا اور تکلیف پر تکلیف جھیلتا جب اس دنیا سے جائے گا تو اسے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی دنیوی زندگی کے ایک ایک پل کا حساب دینا ہوگا۔ اس ضمن میں حضور ﷺ کا فرمان ہے:

((لَا تَزُوْلُ قَدَمُ ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهٖ حَتّٰى يُسْأَلَ عَنْ خَمْسٍ: عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَا أَفْنَاهُ،

وَعَنْ شَبَابِهِ فِيمَا أَبْلَاهُ، وَمَالِهِ مِنْ أَيْنَ اكْتَسَبَهُ وَفِيمَ أَنْفَقَهُ، وَمَاذَا عَمِلَ فِيمَا عَلِمَ))[1]

''ابن آدم کے پاؤں قیامت کے روز اپنے رب کے حضور اپنی جگہ سے ہل نہیں سکیں گے جب تک اس سے پانچ چیزوں کا حساب نہ لے لیا جائے: اس کی عمر کے بارے میں کہ کہاں فنا کی؟ اس کی جوانی (کی قوتوں' صلاحیتوں اور اُمنگوں) کے دور کے بارے میں کہ کیسے گزارا؟ مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ (حلال ذرائع سے کمایا یا حرام طریقے سے اور اللّوں تللّوں میں خرچ کیا یا ادائے حقوق کے لیے؟) اور جو علم حاصل ہوا تھا اس پر کتنا عمل کیا؟''

یعنی دنیا میں بار برداری بھی کرو' جسمانی' ذہنی اور نفسیاتی اذیتیں بھی برداشت کرو۔ مال و جان اور اولاد سے متعلق رنگا رنگ صدمے جھیلتے جھیلتے زندگی بھر کانٹوں پر بھی لوٹتے رہو اور پھر مرنے کے بعد ایک ایسی ہستی کے سامنے کھڑے ہو کر پل پل کا حساب بھی دو جس سے تمہارے قلوب و اذہان کی گہرائیوں میں پیدا ہونے والے جذبات و خیالات بھی پوشیدہ نہیں۔ یہ ہے ''انسان'' کی اصل ٹریجڈی!

یہ مرحلہ ایک انسان کے لیے ایسا مشکل ہے کہ اسے یاد کر کے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اکثر رویا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ کاش میں ایک چڑیا ہوتا!

دیکھا جائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درج بالا فرمان میں مذکور سوالات میں سے آخری سوال سب سے مشکل ہے۔ جس کسی نے دین اور قرآن کا علم جس قدر زیادہ سیکھا اس کے لیے اس کا حساب دینا اسی قدر مشکل ہوگا۔ اگر کسی انسان تک قرآن کی یہ دعوت پہنچ ہی نہیں پائی تو ممکن ہے کہ اس کی طرف سے کوئی عذر بھی قبول ہو جائے۔ (ایسی صورت میں اس کوتاہی کا کچھ نہ کچھ بوجھ ان لوگوں پر بھی ضرور پڑے گا جنہوں نے اسے دعوت پہنچانے میں تساہل برتا) لیکن جن لوگوں تک قرآن کی دعوت پہنچ گئی اور انہوں نے اپنی استعداد کے مطابق قرآن کے پیغام کو سمجھ بھی لیا تو ظاہر ہے ان کے لیے اس آخری سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہوگا۔

آیت ۷ ﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۝۷﴾ ''تو جس کو دیا جائے گا اس کا اعمال نامہ داہنے ہاتھ میں۔''

آیت ۸ ﴿فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۝۸﴾ ''تو اس سے لیا جائے گا بہت ہی آسان حساب۔''

اس حساب کی کیفیت کیا ہوگی؟ اس کی وضاحت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت کردہ بخاری و مسلم کی اس حدیث میں آئی ہے۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((مَنْ حُوْسِبَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عُذِّبَ)) ''قیامت کے روز جس کا حساب لیا جائے گا اسے تو ضرور عذاب دیا جائے گا''۔ اس پر میں نے عرض کیا: کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے: ﴿فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۝﴾ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((لَيْسَ ذَاكِ الْحِسَابُ، إِنَّمَا ذَاكِ الْعَرْضُ، مَنْ نُوقِشَ الْحِسَابَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عُذِّبَ))[2] ''یہ حساب نہیں ہوگا' یہ تو محض (اعمال نامہ) پیش کیا جانا ہوگا' روزِ قیامت جس کے حساب کی جانچ پڑتال کی گئی اُسے تو ضرور عذاب دیا جائے گا۔''

۱۔ سنن الترمذی' کتاب صفة القيامة والرقائق والورع' باب ما جاء في شان الحساب والقصاص۔ ح:۲۴۱۶۔ راوی: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

۲۔ صحيح البخاري' كتاب العلم' باب من سمع شيئا فلم يفهمه ... ح:۱۰۳۔ وصحيح مسلم' كتاب الجنة وصفة نعيمها واهلها' باب اثبات الحساب' ح:۲۸۷۶ واللفظ له۔

یعنی جس خوش قسمت انسان کا اعمال نامہ اُس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا' اس سے نہ تو کوئی سوال ہوگا اور نہ ہی اس کے مواخذے اور مناقشے کی نوبت آئے گی۔ بس اس کے اعمال نامے کو ایک نظر دیکھ کر اس کی خطاؤں کو معاف کر دیا جائے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص سے نرمی کا معاملہ فرمائے گا۔ (اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ!)

آیت ۹ ﴿وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝۹﴾ ''اور وہ لوٹے گا اپنے گھر والوں کی طرف شاداں وفرحاں۔''

عدالت کے کٹہرے سے وہ شخص جب اپنے ان اہل وعیال' رشتہ دار اور ساتھیوں کی طرف واپس لوٹے گا جو اُسی کی طرح معاف کیے گئے ہوں گے تو بہت خوش ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے میری بھی خلاصی ہوگئی۔

آیت ۱۰ ﴿وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۝۱۰﴾ ''اور جس کو دیا جائے گا اس کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے سے۔''

قرآن کریم کی اکثر آیات میں ایسے لوگوں کو بائیں ہاتھ میں اعمال نامے دیے جانے کا ذکر ہے۔ اس سیاق وسباق میں یہاں وَرَآءَ ظَهْرِهٖ کے الفاظ سے یوں لگتا ہے کہ فرشتہ ایک مجرم شخص کو جب اس کا اعمال نامہ پکڑانے لگے گا تو وہ اس سے بچنے کے لیے اپنا بایاں ہاتھ اپنی کمر کے پیچھے چھپا لے گا۔ چنانچہ اسی حالت میں اعمال نامہ پیچھے سے اس کے بائیں ہاتھ میں تھما دیا جائے گا۔

آیت ۱۱ ﴿فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۝۱۱﴾ ''تو اب وہ موت کی طلب کرے گا۔''

اُس وقت اُس کی ایک ہی خواہش ہوگی کہ مجھے موت آ جائے اور میں مر کر ختم ہو جاؤں۔

آیت ۱۲ ﴿وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ۝۱۲﴾ ''لیکن وہ داخل ہوگا جہنّم میں۔''

آیت ۱۳ ﴿اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝۱۳﴾ ''یقیناً (دنیا میں) وہ اپنے اہل وعیال میں بہت خوش وخرم تھا۔''

دنیا میں وہ حرام کی کمائی سے اپنے اہل وعیال کے ساتھ عیش کرتا رہا اور آخرت کے محاسبے کا کبھی تصور بھی ذہن میں نہ لایا۔ یہاں پر ایک اہم نکتہ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ اگر کوئی شخص اپنی روزی تو سو فیصد حلال ذرائع سے کما رہا ہے لیکن وہ اللہ کے دین کا حق ادا نہیں کر رہا تو ایسے شخص کی حلال ذرائع سے کمائی ہوئی وہ روزی بھی حلال نہیں۔ اس لیے کہ اُس نے اپنی روزی کمانے کی اس تگ ودو میں جو وقت' صلاحیتیں اور وسائل صَرف کیے ہیں ان میں دین کے حقوق کا حصّہ بھی شامل تھا۔ گویا اپنے وقت' وسائل اور اپنی صلاحیتوں کا وہ حصّہ جو اُسے اللہ کے دین کے لیے خرچ کرنا چاہیے تھا اس حصّے کو غصب کر کے وہ اپنے ذاتی استعمال میں لے آیا ہے۔ تو دین کے حقوق کو غصب کر کے کمائی ہوئی ایسی روزی حلال کیسے ہو سکتی ہے؟ دراصل حلال وحرام کے معاملے کو بہت دِقّتِ نظری سے جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں اس معاملے کو عام طور پر بہت سطحی انداز میں دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔ مثلاً ایک عام مسلمان سؤر کا گوشت کھانے کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن وہ اس بکری کا گوشت بہت مزے اور رغبت سے کھا لیتا ہے جو اُس نے کسی کی جیب پر ڈاکہ ڈال کر خریدی ہوتی ہے۔ اب ایسی بکری کے بارے میں کون کہے گا کہ وہ حلال ہے اور حرام نہیں ہے!

اس موضوع کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اگر کوئی مسلمان باطل کے غلبے کے تحت اطمینان وسکون سے زندگی بسر کر رہا ہے اور اس نظام کو تبدیل کرنے کے لیے کوئی جدّوجُہد نہیں کر رہا تو وہ بزعم خویش بے شک ناپ تول کر حلال ہی کیوں نہ کھا رہا ہو' اُس کا کھانا پینا حتیٰ کہ اس ماحول میں سانس لینا سب حرام ہے۔ ایسے شخص کو خود سوچنا چاہیے کہ وہ کس نظام کی چاکری کر رہا ہے؟ کس کے اقتدار کو کندھا دے رہا ہے؟ تنخواہ کہاں سے لے رہا ہے؟ اور اپنا کاروبار کس کی مدد سے آگے بڑھا رہا ہے؟ ظاہر ہے وہ یہ سب کچھ باطل نظام کے لیے

کر رہا ہے اور طاغوت کی فراہم کردہ چھتری کے سائے میں کر رہا ہے۔ چنانچہ کسی مسلمان کا کسی باطل نظام کے تحت ہنسی خوشی زندگی گزارنا کسی طور پر جائز نہیں۔ اِلّا یہ کہ ایسی صورتِ حال میں وہ کراہت اور بے چینی میں زندگی بسر کرے' اپنی ضروریات کو کم سے کم سطح پر رکھے اور باطل نظام کو بدلنے کے لیے اپنا تن من دھن کھپا دینے پر ہمہ وقت کمر بستہ رہے۔ اس طرح امید کی جا سکتی ہے کہ اس کی یہ سوچ اور جدّ و جُہد باطل نظام کے تحت زندگی بسر کرنے کے گناہ کا کفارہ بن جائے گی۔

آیات زیر مطالعہ میں دو انسانی کرداروں کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ ان میں ایک کردار تو اللہ کے اُس بندے کا ہے جو دُنیوی زندگی کے دوران آخرت کی جواب طلبی کے احساس سے ہر وقت لرزاں و ترساں رہتا تھا۔ ایسے لوگوں کے اعصاب پر آخرت کے احتساب کا خوف اس حد تک مسلط ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس کیفیت کو جنّت میں پہنچ کر بھی یاد کریں گے: ﴿قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ﴿۲۶﴾﴾ (الطور) ''وہ کہیں گے کہ ہم پہلے (دنیا میں) اپنے اہل و عیال میں ڈرے ہوئے رہتے تھے''۔ ایسے ہی ایک شخص کے بارے میں یہاں بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ کی عدالت سے اپنی کامیابی کی نوید سننے کے بعد اپنے گھر والوں کی طرف شاداں و فرحاں لوٹے گا۔ اس کے مقابلے میں ایک کردار وہ ہے جو آخرت اور آخرت کے محاسبے سے بے خبر اپنے اہل و عیال کے ساتھ عیش و عشرت میں مست رہا۔ ایسے شخص نے دنیا میں بلاشبہ ایک خوشحال اور خوشیوں بھری زندگی گزاری' لیکن آخرت میں اس کے لیے جہنم کی آگ کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

آیت ۱۴ ﴿اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ﴿۱۴﴾﴾ ''اُسے گمان ہو گیا تھا کہ کبھی لوٹ کر نہیں آنا ہے۔''

آیت ۱۵ ﴿بَلٰٓى ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ﴿۱۵﴾﴾ ''کیوں نہیں! یقیناً اُس کا ربّ تو اُسے خوب دیکھ رہا تھا۔''

اگلی تین آیات میں تین قسمیں کھائی گئی ہیں۔ اپنے مضمون اور اسلوب کے اعتبار سے یہ آیات سورۃ المدثر کی ان آیات کے ساتھ خاص مناسبت اور بہت گہری مشابہت رکھتی ہیں: ﴿كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿۳۲﴾ وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ﴿۳۳﴾ وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ﴿۳۴﴾﴾ ''کیوں نہیں' قسم ہے چاند کی۔ اور قسم ہے رات کی جب کہ وہ پیٹھ موڑے۔ اور قسم ہے صبح کی جبکہ وہ روشن ہو جائے''۔ ان دونوں مقامات کے مابین ایک مشابہت یہ بھی ہے کہ ان دونوں سورتوں میں قسموں پر مشتمل مذکورہ آیات سے بالکل نیا مضمون شروع ہوتا ہے۔ سورۃ المدثر میں بھی ﴿كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿۳۲﴾﴾ سے ایک نئے مضمون کا آغاز ہو رہا ہے اور بالکل ایسی ہی صورتِ حال زیر مطالعہ سورت کے اس مقام پر بھی نظر آتی ہے۔

آیت ۱۶ ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿۱۶﴾﴾ ''تو نہیں' مجھے قسم ہے شام کی سرخی کی۔''

آیت ۱۷ ﴿وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ﴿۱۷﴾﴾ ''اور رات کی اور اُن چیزوں کی جن کو وہ سمیٹے ہوئے ہے۔''

آیت ۱۸ ﴿وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿۱۸﴾﴾ ''اور چاند کی جب وہ پورا ہو جاتا ہے۔''

میری خالص ذاتی رائے کے مطابق (واللہ اعلم!) سورۃ المدثر کی مذکورہ آیات (۳۲' ۳۳' ۳۴) میں بعثتِ محمدی ﷺ کی خبر دی گئی ہے' جبکہ زیر مطالعہ آیات میں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ سورۃ المدثر کے مطالعے کے دوران اس موضوع پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ رات ﴿وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ﴿۳۳﴾﴾ سے مراد چھ سو سال (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد سے حضور ﷺ کی نبوت کے ظہور تک) کا وہ طویل عرصہ ہے جس کے دوران وحی و نبوت کا سلسلہ منقطع رہا اور دُنیا پر مجموعی طور پر کفر و

شرک اور ضلالت و جہالت کے اندھیرے چھائے رہے۔ چاند کی قسم ﴿كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿٣٢﴾﴾ میں علم و ہدایت کی اس مدھم روشنی کا استعارہ ہے جو جن و انس کے نیک افراد کی صورت میں اس دوران کہیں کہیں موجود رہی' جبکہ صبح کی قسم ﴿وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ ﴿٣٤﴾﴾ کے پردے میں نبوتِ محمدی ﷺ کے خورشید کے طلوع ہونے کی خبر دی گئی ہے' اور اس کے بارے میں یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے: ﴿إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ ﴿٣٥﴾﴾ کہ یہ بلاشبہ ایک بہت عظیم واقعہ ہے۔ ظاہر ہے نوعِ انسانی کی تاریخ میں نبوتِ محمدی ﷺ کے ظہور سے بڑا کوئی اور واقعہ کیا ہوگا۔

بہر حال نبوت و رسالتِ محمدی ﷺ کے خورشیدِ جہاں تاب کی تابانیوں سے چھ سو سال کی تاریکیاں چھٹ گئیں۔ حضور ﷺ کی وساطت سے اَبنائے آدم کو ''اَکْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ'' کی خصوصی سند بھی عطا ہوئی' جزیرہ نمائے عرب میں انسانی تاریخ کا عظیم ترین انقلاب بھی رونما ہو گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس انقلاب کی فتوحات و برکات تین براعظموں تک پھیل گئیں۔ لیکن چند ہی دہائیوں کے بعد مشیتِ خداوندی سے نہ صرف مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے' بلکہ رفتہ رفتہ وہ پسپائی پر مجبور ہو گئے۔ پسپائی کا یہ عمل جب شروع ہوا تو صرف جنگی محاذوں سے پیچھے ہٹنے تک ہی محدود نہ رہا بلکہ مسلمان بحیثیت قوم زندگی کے ہر شعبے اور ہر میدان سے دست بردار ہو کر نکبت و ادبار کی پستیوں میں لڑھکتے چلے گئے۔ یہ سفر آج بھی جاری ہے اور ابھی اس کے رکنے کے بظاہر کوئی آثار بھی نظر نہیں آتے۔ یہ گمبھیر صورتِ حال اپنی جگہ پر ایک زمینی حقیقت ہے' لیکن دوسری طرف ہمارا ایمان ہے کہ قیامت سے پہلے اسلام پوری دنیا پر غالب آئے گا۔ اس بارے میں حضور ﷺ کے فرمودات بہت واضح ہیں (اس مضمون کی احادیث ''نویدِ خلافت'' کے عنوان سے ایک کتابچے میں جمع کر دی گئی ہیں۔ تفصیل جاننے کے لیے اس کتابچے سے استفادہ کیا جا سکتا ہے)۔ میں سمجھتا ہوں کہ زیرِ مطالعہ آیات میں اسلام کے اسی غلبے کی بشارت دی گئی ہے جس کی تفصیل حضور ﷺ کے فرمودات میں ملتی ہے۔

میرے نزدیک یہاں پہلی قسم ﴿فَلَآ أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿١٦﴾﴾ میں اسلام کے رفتہ رفتہ زوال پذیر ہونے کی صورتِ حال کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ یعنی سورج غروب ہو چکا ہے اور اب اُفق پر صرف شفق کی سرخی نظر آ رہی ہے۔ دوسری قسم ﴿وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ﴿١٧﴾﴾ میں حالات کے مزید گمبھیر ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ دین پر عمل کے اعتبار سے دنیا میں ایک دفعہ پھر تاریکی چھا جائے گی' صرف مدھم سی روشنی باقی رہے گی جو وقت آنے پر آہستہ آہستہ بڑھتی جائے گی۔ درجہ بدرجہ بڑھتے ہوئے چاند کی قسم ﴿وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ ﴿١٨﴾﴾ اسی مدھم اور تدریجاً بڑھتی ہوئی روشنی کا استعارہ ہے۔ ظاہر ہے جب چاند پورا ہو جاتا ہے تو اس کی چاندنی ایک حد تک رات کو روشن کر دیتی ہے۔ اس کے بعد فرمایا:

آیت ۱۹ ﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿١٩﴾﴾ ''(اسی طرح) تم لازماً چڑھو گے درجہ بدرجہ۔''

یعنی جس طرح چاند درجہ بدرجہ بڑا ہو کر مرحلہ وار رات کو روشن کرتا ہے بالکل اسی طرح تم مرحلہ وار کوششوں سے غلبۂ دین کی منزل تک پہنچو گے۔ واضح رہے کہ لَتَرْكَبُنَّ کے صیغے میں زور اور تاکید بھی ہے کہ تم لوگ اس منزل تک ضرور پہنچو گے۔ ظاہر ہے ہمیں یہ خبر محمد رسول اللہ ﷺ نے دی ہے وَهُوَ الصَّادِقُ وَالْمَصْدُوْق! آپؐ کی دی ہوئی خبر غلط نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا دنیا پر اسلام کا مکمل غلبہ ہو کر رہے گا۔ البتہ اسلام کے پہلے غلبے کی شان اور تھی اور دوسرے غلبے کا انداز اور ہوگا۔ یہ فرق سورۃ المدثر کی آیت ۳۴ اور زیرِ مطالعہ سورت کی آیت ۱۸ پر غور کرنے سے خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی اسلام کے پہلے غلبے کا ظہور صبح کے اُجالے کی طرح ہوا تھا:

﴿وَالصُّبۡحِ اِذَاۤ اَسۡفَرَ ﴿۳۴﴾﴾ (المدثر)۔ اس اُجالے کی شان یہ تھی کہ اِدھر آفتابِ نبوتؐ طلوع ہوا اور اُدھر دیکھتے ہی دیکھتے پورا ماحول منور ہو گیا۔ یعنی حضور ﷺ کی دعوت کے آغاز کے بعد صرف تیئیس (۲۳) برس کے مختصر عرصے میں تاریخِ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا ہو گیا اور جزیرہ نمائے عرب میں اسلام پوری طرح غالب آ گیا۔ ظاہر ہے سورج کے طلوع ہونے کے بعد روشنی ہونے میں زیادہ دیر تو نہیں لگتی۔

البتہ اسلام کے دوسرے غلبہ کی روشنی چاند کی چاندنی کی طرح مرحلہ وار اور تدریجاً پھیلے گی۔ یعنی اب اقامتِ دین اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام کسی ایک داعی یا کسی ایک تحریک کی کوششوں اور کسی ایک نسل کے زمانے میں نہیں بلکہ نسل در نسل جدّوجہد سے قائم ہوگا۔ جیسے برعظیم پاک و ہند میں علامہ اقبال نے ایک فکر کو واضح کیا کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے اور ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور یہ کہ ''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی'' یعنی مسلمان اس ضابطہ حیات کو ایک ''وحدت'' کے طور پر زندگی کے تمام شعبوں میں نافذ کرنے کے لیے جدّوجہد کریں۔ پھر مولانا ابوالکلام آزاد نے ''حزب اللہ'' اور مولانا مودودی نے ''جماعت اسلامی'' کے پلیٹ فارم سے اقامتِ دین کے لیے جدّوجہد کی۔ اسی طرح آئندہ اَدوار میں بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اُس کے بندے اس جدّوجہد کا عَلَم سنبھالے رہیں گے۔ مختلف تحریکیں اس مشن کی ترویج و ترقی کے لیے مختلف انداز میں کردار ادا کرتی رہیں گی اور بالآخر ان اجتماعی اور مرحلہ وار کوششوں کے نتیجے میں جب اللہ کو منظور ہوگا اسلام بطور دین پوری دنیا میں غالب ہو جائے گا۔

آیت ۲۰ ﴿فَمَا لَهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۲۰﴾﴾ ''تو انہیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ ایمان نہیں لاتے؟''

آیت ۲۱ ﴿وَاِذَا قُرِئَ عَلَيۡهِمُ الۡقُرۡاٰنُ لَا يَسۡجُدُوۡنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''اور جب انہیں قرآن پڑھ کر سنایا جاتا ہے تو یہ سجدہ نہیں کرتے؟''

آیت ۲۲ ﴿بَلِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يُكَذِّبُوۡنَ ﴿۲۲﴾﴾ ''بلکہ یہ کافر تو جھٹلا رہے ہیں۔''

اس آیت کے الفاظ سے یہ اہم نکتہ بھی واضح ہوتا ہے کہ کفر اور تکذیب باہم مترادفات نہیں بلکہ الگ الگ معنیٰ کے حامل دو الفاظ ہیں۔ کفر کے لغوی معنی چھپانے کے ہیں۔ اس مفہوم میں کسی انسان کا ''کفر'' یہ ہے کہ اس کی فطرت کے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی معرفت سے متعلق جو گواہیاں رکھی ہیں' وہ جانتے بوجھتے ان گواہیوں کو چھپا دے اور لوگوں کے سامنے ان کا اقرار و اظہار نہ کرے۔ جبکہ تکذیب سے مراد اللہ تعالیٰ کی ان آیات کو جھٹلانا ہے جو انسانی فطرت میں موجود گواہیوں کو اُجاگر (activate) کرنے کے لیے اس کی طرف سے نازل ہوئیں۔ اس لحاظ سے کفر اور تکذیب دو الگ الگ جرائم ہیں۔ بلکہ اس وضاحت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو کفر کے مقابلے میں تکذیب بڑا جرم ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجتے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؑ کو جو چار ٹرعطا کیا گیا تھا اس میں بھی ان دونوں جرائم کا ذکر الگ الگ ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو اس چار ٹر کی عبارت:

﴿قُلۡنَا اهۡبِطُوۡا مِنۡهَا جَمِيۡعًا ۚ فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى فَمَنۡ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَكَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۳۹﴾﴾

''ہم نے کہا: تم سب کے سب یہاں سے اُتر جاؤ۔ تو جب بھی آئے تمہارے پاس میری جانب سے کوئی ہدایت' تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے اُن کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ حزن سے دوچار ہوں گے۔ اور جو کفر کریں گے اور ہماری

آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ والے (جہنمی) ہوں گے اس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔''

ان دونوں جرائم میں سے پہلے جرم یعنی کفر کے بارے میں تو شاید کوئی عذر بھی قبول ہو جائے۔ مثلاً یہ عذر کہ ماحول کے منفی اثرات کی وجہ سے کسی انسان کی روح یا فطرت پر غفلت یا جہالت کے پردے پڑ گئے تھے اور اس وجہ سے اس کی فطرت کے آئینے میں اللہ تعالیٰ کی معرفت پوری طرح سے منعکس نہ ہو سکی۔ مگر جب اللہ تعالیٰ کی واضح آیات کی صورت میں انسان کے سامنے باقاعدہ روشنی آ گئی اور اس روشنی سے بھی اس کو وہی پیغام ملا جو عین اُس کی اپنی فطرت کی پکار تھی تو اس کا جانتے بوجھتے ان آیات کو جھٹلا دینا یقیناً بہت بڑی ڈھٹائی اور بہت بڑا جرم ہے جس کے خلاف کوئی عذر قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

آیت ۲۳ ﴿وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ۝۲۳﴾ ''اور اللہ کو خوب معلوم ہے کہ یہ لوگ (اپنے اندر) کیا بھرے ہوئے ہیں۔''

عام طور پر اس آیت کے بارے میں یہی سمجھا گیا ہے کہ اس میں انسان کے مال و دولت جمع کرنے کی طرف اشارہ ہے، لیکن دراصل اس سے دلوں اور سینوں کی گندگی مراد ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ان لوگوں کے سینے کفر، عداوت، بغض، حسد، تکبر وغیرہ کی غلاظتوں سے بھرے ہوئے ہیں اور اسی وجہ سے یہ اللہ کی آیات کو پہچان لینے کے بعد بھی ان کی تکذیب کر رہے ہیں۔

آیت ۲۴ ﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۲۴﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) ان کو بشارت دے دیجیے دردناک عذاب کی۔''

آیت ۲۵ ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝۲۵﴾ ''البتہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔''

مَنَّ يَمُنُّ مَنًّا کے لغوی معنی کسی چیز کو کاٹ دینے کے ہیں۔ ظاہر ہے جب کسی چیز کو کاٹ دیا جاتا ہے تو اس کی انتہا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْن سے مراد ایسا اَجر ہے جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوگا۔

سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ

تمہیدی کلمات

سورۃ البروج اور اس کے بعد والی سورت یعنی سورۃ الطارق کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے۔ اس سورت کی ابتدائی آیات میں ایک تاریخی واقعہ کا ذکر ہوا ہے جو یمن میں ۵۲۳ عیسوی کے لگ بھگ' حضور ﷺ کی ولادت سے تقریباً پچاس سال قبل پیش آیا۔ قدیم یمن میں بہت عرصہ تک عیسائی بادشاہ برسرِ اقتدار رہے۔ لیکن چھٹی صدی عیسوی کے آغاز کے زمانے میں وہاں 'ذونواس' نامی یہودی بادشاہ کی حکومت قائم ہوگئی جو عیسائیوں کا شدید مخالف تھا۔ یہودی اور عیسائی دراصل شروع ہی سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہے ہیں۔ ان کے باہمی اختلافات کی نوعیت ایسی ہے کہ اصولی طور پر ان کے درمیان کبھی بھی صلح نہیں ہوسکتی۔ ظاہر ہے عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول مانتے ہیں بلکہ ان کی اکثریت تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتی ہے' جبکہ یہودی آپؑ کو مرتد' جادوگر اور ولد الزنا قرار دیتے ہیں (نعوذ باللہ)۔ ظاہر ہے ایسی صورتِ حال میں ان لوگوں کے باہمی اختلافات کیسے ختم ہوسکتے ہیں۔

البتہ آج کل اس حوالے سے بہت غیر معمولی صورتِ حال دیکھنے کو مل رہی ہے۔ آج پوری عیسائی دنیا یہودیوں کی مٹھی میں ہے اور عیسائیوں کی مدد سے انہوں نے یہودی ریاست بھی قائم کرلی ہے۔ اس کے علاوہ بھی وہ عیسائیوں کی معاشی اور جنگی طاقت کو جہاں اور جیسے چاہتے ہیں استعمال کر رہے ہیں۔ یہ دراصل یہودی ذہانت اور محنت کا جادو ہے جو آج پوری دنیا کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اس غیر معمولی صورتِ حال کی وجوہات اور ممکنہ نتائج کے بارے میں میری تقاریر کی ریکارڈنگ موجود ہے۔ مزید معلومات کے لیے ان تقاریر سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال یمن کے یہودی بادشاہ ذونواس نے عیسائی دشمنی کے جنون میں یہ کارنامہ سرانجام دیا کہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت بڑی بڑی خندقیں کھدوا کر ان میں ایندھن بھرا اور پھر وسیع پیمانے پر آگ جلا کر بیس ہزار کے لگ بھگ بے گناہ عیسائیوں کو زندہ جلا دیا۔ اس سورت کی ابتدائی آیات میں اسی واقعہ کا ذکر ہے۔

یہ سورۂ مبارکہ مکہ معظمہ کے اُس دور میں نازل ہوئی جب کفارِ مکہ مسلمانوں کو سخت سے سخت عذاب دے کر ایمان سے پھیر دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ اس میں کفار کو ان کے ظلم وستم کے بُرے انجام سے خبردار کیا گیا ہے اور اہلِ ایمان کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر وہ ان مظالم کے مقابلے میں ثابت قدم رہیں گے تو ان کو اس کا بہترین اجر ملے گا اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے بدلہ ضرور لے گا۔

سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۲۲ رُكُوْعُهَا: ۱

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝۱ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝۲ وَشَاهِدٍ وَّ مَشْهُوْدٍ ۝۳ قُتِلَ اَصْحٰبُ
الْاُخْدُوْدِ ۝۴ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝۵ اِذْهُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝۶ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ

شُهُوْدٌ ۝۷ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۸ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝۹ اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَ
الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَ لَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ۝۱۰ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ۝۱۱ اِنَّ بَطْشَ
رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ۝۱۲ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ۝۱۳ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ۝۱۴ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ۝۱۵
فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝۱۶ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ۝۱۷ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ۝۱۸ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ
تَكْذِيْبٍ ۝۱۹ وَّ اللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ۝۲۰ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝۲۱ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝۲۲ ع

آیت ۱ ﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝۱﴾ ''قسم ہے آسمان کی جو بُرجوں والا ہے۔''

بُرجوں سے مراد آسمان کے عظیم الشان ستارے اور سیارے لیے گئے ہیں۔

آیت ۲ ﴿وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝۲﴾ ''اور قسم ہے اُس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔''

یعنی قیامت کا دن، جو آ کر رہے گا۔

آیت ۳ ﴿وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۝۳﴾ ''اور قسم ہے حاضر ہونے والے کی اور اُس کی جس کے پاس حاضر ہوا جائے۔''

اس آیت کی بہت سی تعبیرات کی گئی ہیں، جن میں سے ایک تعبیر یہ ہے کہ شَاهِد سے مراد جمعہ کا دن ہے، جو شہر شہر بستی بستی لوگوں کے پاس حاضر ہوتا ہے، جبکہ مَشْهُوْد عرفہ (۹ ذی الحجہ) کا دن ہے جس کے پاس لوگوں کو خود میدانِ عرفات میں جا کر حاضر ہونا پڑتا ہے۔

آیت ۴ ﴿قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝۴﴾ ''ہلاک ہو گئے وہ کھائیوں والے۔''

''اصحابُ الأخدود'' سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے خندقیں کھودیں اور اہلِ ایمان کو ان خندقوں میں ڈال کر جلایا۔ بظاہر تو وہاں اہلِ ایمان ہلاک ہوئے تھے، لیکن وہ تو اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر کے آخرت کی نعمتوں اور کامیابیوں کے مستحق ٹھہرے اور واقعتاً ہلاکت اور بربادی ان لوگوں کے حصے میں آئی جنہوں نے خندقیں کھود کر اہلِ ایمان کو ان میں ڈال کر جلایا۔ (۱)

۱۔ مفتی محمد تقی عثمانی ﷾ اپنے ''آسان ترجمۂ قرآن'' کی تشریحات میں ''اَصحابُ الأخدود'' کے واقعہ کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''مشہور تفسیر کے مطابق ان آیتوں میں ایک واقعے کی طرف اشارہ ہے جو حضور اقدس ﷺ سے صحیح مسلم کی ایک حدیث میں منقول ہے۔ اور وہ یہ کہ پچھلی کسی اُمت میں ایک بادشاہ تھا جو ایک جادوگر سے کام لیا کرتا تھا۔ جب وہ جادوگر بوڑھا ہو گیا تو اُس نے بادشاہ سے کہا کہ میرے پاس کوئی لڑکا بھیج دیا کرو جسے میں جادو سکھاؤں، تاکہ میرے بعد وہ تمہارے کام آ سکے۔ بادشاہ نے ایک لڑکے کو جادوگر کے پاس بھیجنا شروع کر دیا۔ یہ لڑکا جب جادوگر کے پاس جاتا تو راستے میں ایک عبادت گزار شخص کے پاس سے گزرتا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصلی دین پر تھا (ایسے شخص کو راہب کہتے تھے) اور توحید کا قائل تھا۔ یہ لڑکا اُس کے پاس بیٹھ جاتا اور اُس کی باتیں سنتا تھا جو اُسے اچھی لگتی تھیں۔ ایک دن وہ جا رہا تھا تو راستے میں ایک بڑا جانور نظر آیا جس نے لوگوں کا راستہ روکا ہوا تھا، (بعض روایتوں میں ہے کہ وہ جانور شیر تھا، اور لوگ اُس سے ڈر رہے تھے) لڑکے نے ایک پتھر اُٹھایا، اور ←

آیت ۵ ﴿النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝۵﴾ ''وہ آگ جو بڑی ایندھن والی تھی۔''

یعنی وہ خوفناک آگ جسے بہت زیادہ ایندھن جمع کر کے بھڑکایا گیا تھا۔

آیت ۶ ﴿اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝۶﴾ ''جبکہ وہ اس (کے کناروں) پر بیٹھے ہوئے تھے۔''

آیت ۷ ﴿وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝۷﴾ ''اور مؤمنین کے ساتھ وہ جو کچھ کر رہے تھے خود اس کا نظارہ بھی کر رہے تھے۔''

ان صاحبِ اقتدار و اختیار لوگوں نے اہلِ ایمان کو زندہ جلانے کے احکام جاری کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان خندقوں کے کناروں پر انہوں نے باقاعدہ براجمان ہو کر اس دلدوز منظر کا نظارہ کرنے کا اہتمام بھی کیا۔ اسی طرح پچھلی صدی میں ہٹلر نے بھی بہت ''پُرتکلف'' منصوبہ بندی کے ساتھ یہودیوں کے قتلِ عام کا اہتمام کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے بڑے بڑے گیس چیمبرز نصب کیے اور انسانی لاشوں کو سائنٹیفک انداز میں ٹھکانے لگانے کے لیے نئے نئے طریقے ایجاد کیے۔

آیت ۸ ﴿وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۸﴾ ''اور وہ نہیں انتقام لے رہے تھے اُن سے مگر اس لیے کہ وہ ایمان لے آئے تھے اللہ پر جو زبردست ہے اور اپنی ذات میں خود ستودہ صفات ہے۔''

آیت ۹ ﴿الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''جس کے لیے بادشاہی ہے آسمانوں کی اور زمین کی۔''

◄ اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ یا اللہ! اگر راہب کی باتیں آپ کو جادوگر کی باتوں سے زیادہ پسند ہیں تو اس پتھر سے اس جانور کو مروا دیجیے۔ اب جو اُس نے پتھر اُس جانور کی طرف پھینکا تو جانور مر گیا' اور لوگوں کا راستہ کھل گیا۔ اس کے بعد لوگوں کو اندازہ ہوا کہ اس لڑکے کے پاس کوئی خاص علم ہے۔ چنانچہ ایک اندھے شخص نے اُس سے درخواست کی کہ اُس کی بینائی واپس آ جائے۔ لڑکے نے اُس سے کہا کہ شفا دینے والا تو اللہ تعالیٰ ہے' اس لیے اگر تم یہ وعدہ کرو کہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان لے آؤ گے تو میں تمہارے لیے اللہ تعالیٰ سے دُعا کروں گا۔ اُس نے یہ شرط مان لی۔ لڑکے نے دُعا کی تو اللہ تعالیٰ نے اُس کو بینائی عطا فرما دی' اور وہ توحید پر ایمان لے آیا۔ ان واقعات کی خبر جب بادشاہ کو ہوئی تو اُس نے اُس نابینا کو بھی گرفتار کر لیا' اور لڑکے اور راہب کو بھی۔ اور ان سب کو توحید کے انکار پر مجبور کیا۔ جب وہ نہ مانے تو اُس نے اُس نابینا شخص اور راہب کو تو آرے سے چروا دیا' اور لڑکے کے بارے میں اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ اُسے کسی اونچے پہاڑ پر لے جا کر نیچے پھینک دیں۔ لیکن جب وہ لوگ لڑکے کو لے کر گئے تو اُس نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی' پہاڑ پر زلزلہ آیا جس سے وہ لوگ مر گئے' اور لڑکا زندہ رہا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اُسے کشتی میں لے جا کر سمندر میں ڈبو دیا جائے۔ لڑکے نے پھر دُعا کی' جس کے نتیجے میں کشتی اُلٹ گئی' وہ سب ڈوب گئے' اور لڑکا پھر سلامت رہا۔ بادشاہ جب عاجز آ گیا تو لڑکے نے اُس سے کہا کہ اگر تم مجھے واقعی مارنا چاہتے ہو تو اُس کا ایک ہی طریقہ ہے' اور وہ یہ کہ تم سب لوگوں کو ایک میدان میں جمع کر کے مجھے سولی پر چڑھاؤ' اور اپنے ترکش سے تیر نکال کر کمان میں چڑھاؤ' اور یہ کہو کہ: بِاسْمِ اللّٰهِ رَبِّ الْغُلَامِ ''اُس اللہ کے نام پر جو اس لڑکے کا پروردگار ہے'' پھر تیر سے میرا نشانہ لگاؤ۔ بادشاہ نے ایسا ہی کیا' اور تیر اُس لڑکے کی کنپٹی پر جا کر لگا' اور اُس سے وہ شہید ہو گیا۔ لوگوں نے جب یہ نظارہ دیکھا تو بہت سے ایمان لے آئے۔ اس موقع پر بادشاہ نے اُن کو سزا دینے کے لیے سڑکوں کے کناروں پر خندقیں کھدوا کر اُن میں آگ بھڑکائی' اور حکم دیا کہ جو کوئی دینِ حق کو نہ چھوڑے' اُسے ان خندقوں میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ اس طرح ایمان والوں کی ایک بڑی تعداد کو زندہ جلا دیا گیا۔'' (صحیح مسلم' ح: ۳۰۰۵)

﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝۹﴾ ''اور اللہ تو ہر چیز پر خود گواہ ہے۔''

آیت ۱۰ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا﴾ ''یقیناً جن لوگوں نے ظلم وستم توڑا مومن مردوں اور مومن عورتوں پر پھر انہوں نے توبہ بھی نہیں کی''

اگر ان میں سے کسی نے مرنے سے پہلے توبہ کر لی اور ایمان لے آیا تو اُس کا یہ جرم معاف ہو سکتا ہے۔

﴿فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ۝۱۰﴾ ''تو ان کے لیے ہوگا جہنم کا عذاب اور جلا ڈالنے والا عذاب۔''

آیت ۱۱ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے''

﴿لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ ''ان کے لیے وہ باغات ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔''

﴿ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ۝۱۱﴾ ''یہ ہے اصل بڑی کامیابی۔''

آیت ۱۲ ﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ۝۱۲﴾ ''یقیناً تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔''

اللہ تعالیٰ حلیم بھی ہے' وہ انسان کو ڈھیل بھی دیتا ہے اور اس کی رسی دراز بھی کرتا ہے (اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا ذکر اگلی سورت میں آئے گا) لیکن جب وہ کسی فرد یا قوم کی گرفت کرتا ہے تو اس کی گرفت بہت سخت ہوتی ہے۔

آیت ۱۳ ﴿اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ۝۱۳﴾ ''وہی ہے جو پہلی مرتبہ پیدا کرتا ہے اور وہی اعادہ بھی کرے گا۔''

جب اُس نے انسان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے تو دوسری مرتبہ وہ اسے پیدا کرنے پر بھلا کیونکر قادر نہیں ہوگا؟

آیت ۱۴ ﴿وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ۝۱۴﴾ ''اور وہ بخشنے والا بھی ہے' محبت کرنے والا بھی ہے۔''

آیت ۱۵ ﴿ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ۝۱۵﴾ ''عرش کا مالک ہے' بڑی شان والا ہے۔''

آیت ۱۶ ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝۱۶﴾ ''وہ جو ارادہ کر لے' کر گزرنے والا ہے۔''

ظاہر ہے اُس کے ارادے کے آگے کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔

آیت ۱۷ ﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ۝۱۷﴾ ''کیا آپ کے پاس لشکروں کی خبر پہنچی ہے؟''

آیت ۱۸ ﴿فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ۝۱۸﴾ ''فرعون اور ثمود (کے لشکروں) کی؟''

آیت ۱۹ ﴿بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ۝۱۹﴾ ''لیکن یہ کافر جو ہیں یہ جھٹلانے ہی میں لگے رہیں گے۔''

آیت ۲۰ ﴿وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ۝۲۰﴾ ''جبکہ اللہ ان کو گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔''

آیت ۲۱ ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝۲۱﴾ ''بلکہ یہ تو قرآن ہے بہت عزت والا۔''

آیت ۲۲ ﴿فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝۲۲﴾ ''لوحِ محفوظ میں (نقش ہے)۔''

یعنی اصل قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے پاس لوحِ محفوظ میں ہے۔ جس مقام کا ذکر یہاں لوحٍ مَّحفوظ کے نام سے ہوا ہے' سورۃ الزخرف کی آیت ۴ میں اسے اُمُّ الْکِتٰب' سورۃ الواقعہ کی آیت ۷۸ میں کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ اور سورۂ عبس کی آیات ۱۳ اور ۱۴ میں اسے صُحُفٍ مُّکَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ کہا گیا ہے۔

سُوْرَةُ الطَّارِقِ

سُوْرَةُ الطَّارِقِ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۱۷ رُكُوْعُهَا: ۱

وَ السَّمَآءِ وَ الطَّارِقِ ۙ﴿۱﴾ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۙ﴿۲﴾ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۙ﴿۳﴾ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا
عَلَيْهَا حَافِظٌ ؕ﴿۴﴾ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ؕ﴿۵﴾ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۙ﴿۶﴾ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ
وَ التَّرَآئِبِ ؕ﴿۷﴾ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ؕ﴿۸﴾ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۙ﴿۹﴾ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّ لَا
نَاصِرٍ ؕ﴿۱۰﴾ وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۙ﴿۱۱﴾ وَ الْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۙ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۙ﴿۱۳﴾ وَّ مَا هُوَ
بِالْهَزْلِ ؕ﴿۱۴﴾ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۙ﴿۱۵﴾ وَّ اَكِيْدُ كَيْدًا ۚ﴿۱۶﴾ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۧ﴿۱۷﴾ ع

آیت ۱ ﴿وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۙ﴿۱﴾﴾ ''قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی۔''

آیت ۲ ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۙ﴿۲﴾﴾ ''اور تم کیا جانتے ہو کہ وہ رات کو نمودار ہونے والا کیا ہے؟''

آیت ۳ ﴿النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۙ﴿۳﴾﴾ ''وہ ستارہ ہے چمکدار۔''

آیت ۴ ﴿اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ؕ﴿۴﴾﴾ ''کوئی جان ایسی نہیں جس پر کوئی نگہبان نہ ہو۔''

سورۃ الانفطار کی ان آیات میں یہ مضمون زیادہ وضاحت کے ساتھ آیا ہے: ﴿وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۙ﴿۱۰﴾ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۙ﴿۱۱﴾ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۙ﴿۱۲﴾﴾ ''جبکہ ہم نے تمہارے اوپر محافظ (فرشتے) مقرر کر رکھے ہیں۔ بڑے باعزت لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کر رہے ہو''۔ انسان کے محافظ فرشتوں کا ذکر سورۃ الانعام کی اس آیت میں بھی ہے: ﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ﴾ (آیت ۶۱) ''اور وہ اپنے بندوں پر پوری طرح غالب ہے اور وہ تم پر نگہبان بھیجتا رہتا ہے''۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ساتھ متعدد فرشتے مقرر کر رکھے ہیں۔ ان میں سے کچھ اس کے اعمال کا ریکارڈ مرتب کرنے میں مصروف ہیں جبکہ کچھ کو اس کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

آیت ۵ ﴿فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ؕ﴿۵﴾﴾ ''تو انسان کو غور کرنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔''

آیت ۶ ﴿خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۙ﴿۶﴾﴾ ''وہ پیدا کیا گیا ہے اُچھلتے ہوئے پانی سے۔''

آیت ۷ ﴿يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۙ﴿۷﴾﴾ ''جو نکلتا ہے پیٹھ اور پسلیوں کے درمیان سے۔''

مرد کے مادہ منویہ کا اصل منبع ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کے درمیان ہے۔ یہاں سے پیدا ہو کر یہ مادہ ان غدودوں تک پہنچتا ہے جو اس کے لیے مخصوص ہیں۔

آیت ۸ ﴿اِنَّهٗ عَلٰی رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ۝۸﴾ ''یقیناً وہ اسے لوٹانے پر بھی قادر ہے۔''

جس اللہ نے پانی کی ایک بوند سے انسان کی تخلیق کی ہے وہ یقیناً اس پر بھی قادر ہے کہ جب چاہے اسے اپنے پاس واپس بلا لے۔ اور یقیناً وہ اس کے مرنے کے بعد اسے دوبارہ زندہ کر دینے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔

آیت ۹ ﴿یَوْمَ تُبْلَی السَّرَآئِرُ ۝۹﴾ ''جس دن تمام چھپے ہوئے رازوں کی جانچ پڑتال ہوگی۔''

آیت ۱۰ ﴿فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ۝۱۰﴾ ''تو نہیں ہوگی کسی انسان کے لیے کوئی طاقت اور نہ ہوگا اس کا کوئی مددگار۔''

آیت ۱۱ ﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝۱۱﴾ ''قسم ہے اس آسمان کی جو بارش برساتا ہے وقفے وقفے سے۔''

آیت ۱۲ ﴿وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۝۱۲﴾ ''اور قسم ہے اس زمین کی جو پھوٹ پڑتی ہے۔''

آسمان سے بارش ہوتی ہے اور بارش کی وجہ سے نباتات زمین کو پھاڑتے ہوئے اُگ آتے ہیں۔ یعنی آسمان اور زمین اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ:

آیت ۱۳ ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝۱۳﴾ ''یہ (قرآن) قولِ فیصل ہے۔''

آیت ۱۴ ﴿وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۝۱۴﴾ ''اور یہ کوئی ہنسی مذاق نہیں ہے۔''

جیسے سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا: ﴿وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ﴾ (آیت ۱۰۵) ''اور اس (قرآن) کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور یہ حق کے ساتھ نازل ہوا ہے۔''

آیت ۱۵ ﴿اِنَّهُمْ یَكِیْدُوْنَ كَیْدًا ۝۱۵ وَّاَكِیْدُ كَیْدًا ۝۱۶﴾ ''(اے نبی ﷺ!) یہ لوگ اپنی سی چالیں چل رہے ہیں اور میں بھی اپنی چال چل رہا ہوں۔''

آیت ۱۷ ﴿فَمَهِّلِ الْكٰفِرِیْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَیْدًا ۝۱۷﴾ ''تو آپ ان کافروں کو ذرا مہلت دے دیجیے' تھوڑی دیر انہیں (ان کے حال پر) چھوڑ دیجیے!''

ابتدائی مکی دور کی سورتوں میں حضور ﷺ کے لیے یہ ہدایت بہت تکرار کے ساتھ آئی ہے کہ آپؐ ان لوگوں کے لیے جلدی نہ کریں' ان کے بارے میں تھوڑی دیر انتظار کریں: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ﴾ (الاحقاف:۳۵) ''تو (اے محمد ﷺ!) آپ بھی صبر کیجیے جیسے اولوالعزم رسولؑ صبر کرتے رہے ہیں اور ان کے لیے جلدی نہ کیجیے!'' اس دور میں چونکہ مشرکینِ مکہ نے اہلِ ایمان پر عرصۂ حیات تنگ کیا ہوا تھا' اس لیے ان آیات کے ذریعے حضور ﷺ کی وساطت سے اہلِ ایمان کو بھی بار بار تسلی دی جاتی تھی اور سمجھایا جاتا تھا کہ ابھی ہم ان لوگوں کو کچھ مزید مہلت دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ آپ لوگ ان کی طرف سے پہنچنے والی تکالیف پر صبر کرتے ہوئے ہمارے فیصلے کا انتظار کریں۔

سُوْرَۃُ الْاَعْلٰی

تمہیدی کلمات

سورۃ الاعلیٰ اور سورۃ الغاشیہ مل کر جوڑا بناتی ہیں۔ حضور ﷺ جمعہ اور عیدین کی نمازوں کی پہلی رکعت میں اکثر سورۃ الاعلیٰ اور دوسری رکعت میں سورۃ الغاشیہ کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ حضور ﷺ کے اس انتخاب کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان دونوں سورتوں میں تذکیر کا خصوصی حکم ہے (سورۃ الاعلیٰ' آیت ۹ اور سورۃ الغاشیہ' آیت ۲۱) جبکہ ان دونوں نمازوں میں بھی تذکیر کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ ظاہر ہے ان دونوں مواقع پر خطبات کا اہتمام خصوصی طور پر تذکیر کے لیے ہی کیا جاتا ہے۔

سُوْرَۃُ الْاَعْلٰی مَکِّیَّۃٌ | بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ | اٰیَاتُھَا: ۱۹ رُکُوْعُھَا: ۱

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۙ﴿۱﴾ الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۪ۙ﴿۲﴾ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۪ۙ﴿۳﴾ وَ الَّذِیْۤ اَخْرَجَ
الْمَرْعٰى ۪ۙ﴿۴﴾ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى ؕ﴿۵﴾ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى ۙ﴿۶﴾ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ یَعْلَمُ
الْجَهْرَ وَ مَا یَخْفٰى ؕ﴿۷﴾ وَ نُیَسِّرُكَ لِلْیُسْرٰى ۚ﴿۸﴾ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ؕ﴿۹﴾ سَیَذَّكَّرُ مَنْ
یَّخْشٰى ۙ﴿۱۰﴾ وَ یَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۙ﴿۱۱﴾ الَّذِیْ یَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ۚ﴿۱۲﴾ ثُمَّ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَ لَا
یَحْیٰى ؕ﴿۱۳﴾ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۙ﴿۱۴﴾ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ؕ﴿۱۵﴾ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ۖ﴿۱۶﴾
وَ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰى ؕ﴿۱۷﴾ اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۙ﴿۱۸﴾ صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰى ﴿۱۹﴾ ع

آیت ۱ ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۙ﴿۱﴾﴾ ''پاکی بیان کرو اپنے ربّ کے نام کی جو بہت بلند و بالا ہے۔''

یہ حکم یوں بھی ہو سکتا تھا کہ ''اپنے ربّ کی پاکی بیان کرو'' لیکن یہاں خصوصی طور پر اسم (نام) کا لفظ اس لیے آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہمارے تصوّر سے وراء الوراء' ثم وراء الوراء ہے۔ اُس کی ذات کے ساتھ ہمارا ذہنی و قلبی تعلق صرف اور صرف اُس کے ناموں کے حوالے سے ہے۔ اسی لیے ہمیں حکم دیا گیا ہے: ﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪﴾ (الاعراف: ۱۸۰) ''اور تمام اچھے نام اللہ ہی کے ہیں' تو پکارو اُسے اُن (اچھے ناموں) سے''۔ چنانچہ ہم انسان اگر اللہ کا ذکر کرنا چاہیں یا اُس کی تسبیح و تحمید کرنا چاہیں تو ظاہر ہے اس کے اسماء کے حوالے سے ہی کر سکتے ہیں۔

آیت ۲ ﴿الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۪ۙ﴿۲﴾﴾ ''جس نے (ہر چیز کو) پیدا کیا' پھر تناسب قائم کیا۔''

آیت ۳ ﴿وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۪ۙ﴿۳﴾﴾ ''اور جس نے (ہر شے کا) اندازہ مقرر کیا' پھر اسے (فطری) ہدایت عطا فرمائی۔''

ان چار الفاظ (خَلَقَ' فَسَوّٰی' قَدَّرَ' فَهَدٰی) میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا بیان بھی ہے اور تخلیقی عمل کے مختلف مراحل کا ذکر بھی۔

اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق کے حوالے سے تین اسمائے حسنیٰ (اَلْخَالِقُ' اَلْبَارِئُ' اَلْمُصَوِّرُ) کا ایک ساتھ ذکر قبل ازیں سورۃ الحشر کی آخری آیت میں بھی آ چکا ہے۔ سورۃ الحشر کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی یہ تین صفات ایک خاص منطقی ترتیب سے بیان ہوئی ہیں۔ یہ ترتیب دراصل تخلیقی عمل کے مرحلہ وار ارتقاء کی نشاندہی کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے کسی چیز کا نقشہ یا نمونہ بناتا ہے' اس لحاظ سے وہ اَلْخَالِقُ ہے۔ پھر وہ مطلوبہ چیز کو طے شدہ نمونے کے مطابق عدم سے عالمِ وجود میں ظاہر فرماتا ہے' اس اعتبار سے وہ اَلْبَارِئُ ہے۔ تیسرے مرحلے میں وہ اس تخلیق کو ظاہری صورت یا شکل عطا فرماتا ہے' اس مفہوم میں وہ اَلْمُصَوِّرُ ہے۔

سورۃ الحشر کی مذکورہ آیت میں تخلیقی عمل کے جن تین مراحل کا ذکر ہوا ہے ان کا تعلق چیزوں کے ظاہری یا مادی وجود سے ہے' جبکہ زیر مطالعہ آیات میں مادّی وجود کی تخلیق کے ساتھ ساتھ چیزوں کے باطنی خصائص کی تخلیق کا ذکر بھی ہے۔ (خَلَقَ فَسَوّٰی کے الفاظ میں چیزوں کے مادّی وجود کی تخلیق کے مراحل کا بیان ہے' جبکہ قَدَّرَ فَهَدٰی کے الفاظ کسی تخلیق کے باطنی پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہیں۔)

اب ہم ان الفاظ کے معانی و مفہوم کو انسانی ماحول کی مثالوں سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ پہلے دو مراحل (تخلیق اور تسویہ) کو ایک عمارت کی مثال کے حوالے سے یوں سمجھئے کہ کسی عمارت کا ڈھانچہ کھڑا کر دینا اُس کی ''تخلیق'' ہے' جبکہ اُس کو سجانا' سنوارنا (finishing) وغیرہ اس کا ''تسویہ'' ہے۔ تخلیق کا تیسرا مرحلہ جس کا یہاں ذکر ہوا ہے وہ ''قدر'' ہے۔ قدر کے لغوی معنی اندازہ مقرر کرنے کے ہیں' جسے عرفِ عام میں ہمارے ہاں تقدیر کہا جاتا ہے۔ اس مفہوم میں کسی تخلیق کے معیار' اس کی صلاحیت' استعداد اور حدود (limitations) سمیت جملہ خصوصیات کو اس کی قدر یا تقدیر کہا جائے گا۔ مثلاً انسان اشرف المخلوقات تو ہے لیکن وہ ہوا میں اُڑنے سے معذور ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک چھوٹی سی چڑیا آسانی سے ہوا میں اُڑتی پھرتی ہے۔ تو گویا ہوا میں اڑنے کی یہ صلاحیت رکھنا چڑیا کی تقدیر کا خاصہ ہے اور اس اعتبار سے معذور ہونا انسان کی تقدیر کا حصہ ہے۔ اس کے بعد تخلیق کے اگلے مرحلے کے طور پر یہاں ''ہدایت'' کا ذکر آیا ہے۔ اس سے مراد وہ فطری اور جبلّی ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر مخلوق کو پیدائشی طور پر عطا کر رکھی ہے۔ اسی ''ہدایت'' کی روشنی میں بکری کو معلوم ہوا ہے کہ اسے گھاس کھانا ہے اور شیر جانتا ہے کہ اس کی غذا گوشت ہے۔ غرض ہر جاندار اپنی زندگی اسی طریقے اور اسی لائحہ عمل کے مطابق گزار رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے طے کر دیا ہے۔

تخلیق کے ان چار مراحل کے حوالے سے اگر ہم انسانی زندگی کا جائزہ لیں تو پہلے دو مراحل یعنی تخلیق اور تسویہ کے اعتبار سے تو انسان میں اور اللہ تعالیٰ کی دوسری مخلوقات میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن اگلے دو مراحل (تقدیر اور ہدایت) کے حوالے سے انسان کا معاملہ دوسری مخلوقات سے الگ ہے۔ اس لحاظ سے ہر انسان کی قدر' صلاحیت اور استعداد اللہ تعالیٰ کے ہاں دو طرح سے طے پاتی ہے۔ اس کا ایک پہلو یا ایک حصہ تو وہ ہے جو اسے پیدائشی طور پر جینز (genes) کی صورت میں عطا ہوا (given) ہے اور دوسرا پہلو یا دوسرا حصہ اس کے ماحول کا ہے جس میں وہ آنکھ کھولتا اور پرورش پاتا ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کے اچھے برے اور مثبت و منفی عوامل کے ملنے سے ہر انسان کی شخصیت کا ایک سانچہ تیار ہوتا ہے جسے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۸۴ میں ''شاکلہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ (سورۂ بنی اسرائیل کی اس آیت کے تحت اس اصطلاح کی وضاحت کی جا چکی ہے۔) اسی سانچہ یا شاکلہ سے ہر انسان کی استعداد کی حدود متعین ہوتی ہیں۔ اور کوئی انسان انگریزی محاورہ "one cannot out grow ones skin" (کوئی انسان اپنی کھال سے باہر نہیں نکل سکتا) کے

مصداق ان حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ ہر انسان نیکی کرے گا تو اپنی اسی استعداد کے مطابق کرے گا اور اگر برائی کمائے گا تو انہی حدود کے اندر رہ کر ایسا کرے گا۔ غرض ہر انسان کی عملی زندگی کی ساری محنت' کوشش اور بھاگ دوڑ اپنے شاکلہ کے مطابق ہی ہوگی اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی جانچ (evaluation) بھی اسی حوالے سے کی جائے گی۔ مثلاً ایک شخص کی صلاحیت پچاس درجے تک پہنچنے کی تھی' اگر وہ چالیس درجے تک پہنچ گیا تو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ کامیاب قرار پائے۔ اس کے مقابلے میں ایک دوسرا شخص جو سو درجے تک جانے کی استعداد رکھتا تھا' وہ ممکن ہے پچاس درجے تک پہنچنے کے بعد بھی ناکام رہے۔ بہرحال اس حوالے سے اللہ تعالیٰ نے ایک اصول طے فرما دیا کہ ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ﴾ (البقرۃ:۲۸۶) ''اللہ تعالیٰ نہیں ذِمّہ دار ٹھہرائے گا کسی جان کو مگر اُس کی وسعت کے مطابق۔''

اسی طرح انسان کی ''ہدایت'' کے بھی دو درجے ہیں۔ پہلا درجہ تو جبلّی ہدایت کا ہے۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر مخلوق کو جبلّی ہدایت سے نواز رکھا ہے اسی طرح اُس نے ہر انسان کو بھی فطری اور جبلّی طور پر ہدایت کا ایک حصہ عطا فرمایا ہے۔ جبکہ انسان کی ہدایت کا دوسرا حصہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے وحی کے ذریعے عطا فرمایا ہے۔ یعنی انسان کی فطرت میں پہلے سے ودیعت شدہ بنیادی ہدایت کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں پیغمبر بھی بھیجے اور کتابیں بھی نازل کیں۔

آیت ۴ ﴿وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۝۴﴾ ''اور جس نے (زمین سے) چارہ نکالا۔''

آیت ۵ ﴿فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى ۝۵﴾ ''پھر اس کو کر دیا سیاہ چورا۔''

یعنی اُسی کے طے کردہ نظام کے تحت گھاس اور نباتات وغیرہ زمین سے اُگتے ہیں اور پھر گل سڑ کر ختم ہو جاتے ہیں۔

آیت ۶ ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝۶﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ہم آپ کو پڑھا دیں گے' پھر آپ بھولیں گے نہیں۔''

یعنی قرآن مجید میں سے کوئی چیز آپ کو بھولے گی نہیں۔ یہ وہی مضمون ہے جو سورۃ القیامہ کی ان آیات میں آیا ہے: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝۱۶ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝۱۷ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝۱۸﴾ ''آپؐ اس (قرآن) کے ساتھ اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں۔ اسے جمع کرنا اور پڑھوا دینا ہمارے ذِمّہ ہے۔ پھر جب ہم اسے پڑھوا دیں تو آپ اس کی قراءت کی پیروی کیجیے۔''

آیت ۷ ﴿اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ﴾ ''سوائے اُس کے کہ جو اللہ چاہے۔''

یہاں یہ کلمہ استثناء صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اظہار کے لیے آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے' اُس کے حکم اور اذن کے بغیر کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی کے حافظہ سے کوئی چیز محو کرنا چاہے تو وہ لاکھ اسے یاد کرتا رہے' یاد نہیں رکھ سکے گا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ قرآن مجید کی کوئی آیت حضور ﷺ بھول بھی گئے تھے۔ اس لحاظ سے اس جملے کی مثال سورۃ الزخرف کی اس آیت جیسی ہے: ﴿قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ۝۸۱﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ ان سے کہیے کہ اگر رحمٰن کا کوئی بیٹا ہوتا تو سب سے پہلا اُس کی عبادت کرنے والا میں ہوتا''۔ ظاہر ہے یہ کلام پرزور دینے کا ایک انداز ہے اور اس کا مقصد تو بالکل پُرزور انداز میں یہ ثابت کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہرگز ہرگز کسی کو اپنا بیٹا نہیں بنایا۔

﴿اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۝۷﴾ ''یقیناً وہ جانتا ہے اونچی آواز میں کہی گئی بات کو بھی اور جو مخفی رکھی جائے اسے بھی۔''

آیت ۸ ﴿وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝٨﴾ ''اور ہم رفتہ رفتہ پہنچائیں گے آپ کو آسانی تک۔''

تَیسِیر یُسر سے بابِ تفعیل ہے۔ اس باب میں تدریج کے معنی پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے نبی ﷺ! ہم مشکلات میں سے رفتہ رفتہ آپ کے لیے راستہ بناتے چلے جائیں گے اور اس آسان راستے پر آپ کو تدریجاً ایک بڑی آسانی کی طرف لے جائیں گے۔ اس سے مراد اس دنیا میں غلبۂ دین کی جدّوجُہد کی کامیابی اور آخرت میں جنت اور اس کی آسائشیں ہیں۔ ہم چاہیں تو آنِ واحد میں آپ کے تمام دشمنوں کو آپ کے سامنے سرنگوں کر دیں اور تمام جن وانس کو ایمان کی توفیق بخش دیں لیکن ہماری حکمت اور مشیت میں اس معاملے کی ایک تدریج ہے۔ چنانچہ ہم آپ کی جدّوجُہد کو مرحلہ وار اور رفتہ رفتہ کامیابی سے ہمکنار کریں گے۔ اس فلسفے کی مزید وضاحت آگے چل کر سورۃ الشمس میں آئے گی۔

آیت ۹ ﴿فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝٩﴾ ''تو آپ یاددہانی کراتے رہیے اگر یاددہانی فائدہ دے۔''

اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ﷺ انذار وتذکیر کا فریضہ تبھی سرانجام دیں جب مخاطب کو اس سے کچھ فائدہ ہو رہا ہو یعنی وہ اس تذکیر کا اثر قبول کر رہا ہو۔ چنانچہ اگلی آیت میں اس حوالے سے وضاحت کر دی گئی ہے۔

آیت ۱۰ ﴿سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝١٠﴾ ''وہ نصیحت حاصل کر لے گا جو ڈرتا ہے۔''

اے نبی ﷺ! آپ لوگوں کو تذکیر ونصیحت کرتے جایئے جس کے دل میں اللہ کا خوف ہوگا وہ اس کا اثر ضرور قبول کرے گا اور اسے فائدہ بھی ہوگا۔ چنانچہ جب بھی آپ پر کوئی نئی وحی آئے تو آپ وہ نیا کلام پڑھ کر لوگوں کو ضرور سنائیں۔ آپ کے اہلِ ایمان ساتھیوں کے علم اور ایمان میں اس سے ضرور اضافہ ہوگا۔

آیت ۱۱ ﴿وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۝١١﴾ ''البتہ جو شقی (بدبخت) ہے وہ اس سے پہلوتہی کرے گا۔''

آیت ۱۲ ﴿الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ۝١٢﴾ ''جو (آخرکار) داخل ہوگا بڑی آگ میں۔''

آیت ۱۳ ﴿ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ۝١٣﴾ ''پھر نہ اس میں وہ مرے گا نہ زندہ رہے گا۔''

جہنم کی یہی خصوصیت سورۃ المدثر میں بایں الفاظ بیان ہوئی ہے: ﴿لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ۝٢٨﴾ ''وہ انسان کو نہ تو باقی رہنے دے گی اور نہ ہی اسے چھوڑے گی۔''

آیت ۱۴ ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝١٤﴾ ''یقیناً وہ کامیاب ہو گیا جس نے خود کو پاک کر لیا۔''

ان آیات میں بہت اہم اور بنیادی نوعیت کے مضامین بیان ہوئے ہیں۔ اگلی سورتوں میں مختلف مقامات پر ان مضامین کی مزید وضاحت آئے گی۔ تَزَکّٰی سے مراد یہاں روح کی پاکیزگی ہے۔ بنیادی طور پر انسان کی روح بہت بلند اور اعلیٰ چیز ہے۔ سورۃ التین کی اس آیت میں دراصل انسان کی روح کی تخلیق ہی کا ذکر ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝٤﴾ کہ ہم نے انسان کو بہت عمدہ تخلیق پر بنایا ہے۔ لیکن جب اس روح کو جسدِ حیوانی میں قید کر کے دنیا میں بھیجا گیا تو وقتی طور پر روح اپنے اعلیٰ مقام سے گر کر پستی میں چلی گئی جس کا ذکر سورۃ التین کی اگلی آیت میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝٥﴾ کہ پھر ہم نے اس کو پست ترین حالت کی طرف لوٹا دیا۔ چنانچہ انسان کی دُنیوی زندگی کا اصل ہدف یہ ہونا چاہیے کہ وہ خود کو پستی سے نکال کر دوبارہ بلندی کی طرف لے جائے۔ اگر تو اس نے یہ ہدف حاصل کر لیا تو وہ کامیاب ہے ورنہ ناکام۔ اس کامیابی کے لیے اسے ایک طرف جسدِ

حیوانی کے داعیات یعنی اپنی نفسانی خواہشات کو دبانا ہوگا اور دوسری طرف اپنی روح کو زیادہ سے زیادہ غذا فراہم کرنے کا سامان کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے حیوانی داعیات کمزور ہوں گے تو تبھی روح کو تقویت ملے گی۔ ماہِ رمضان کے چوبیس گھنٹے کے معمولات کے ذریعے سے اہلِ ایمان کو دراصل اسی ''دوطرفہ'' پروگرام کی مشق کرائی جاتی ہے کہ دن کو روزہ رکھ کر حیوانی جسم اور اس کے داعیات کو کمزور کرو اور رات کو قیام اللیل کے دوران انوارِ قرآن کی بارش سے اپنی روح کو سیراب کرو تاکہ تمہاری روح کو ترفّع اور اللہ کا قُرب حاصل ہو سکے۔ یہ ہے تزکّی کا اصل مفہوم اور اس کا بنیادی فلسفہ۔

آیت ۱۵ ﴿وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝۱۵﴾ ''اور اُس نے اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی۔''

اس آیت کے الفاظ کی عملی تصویر جمعہ کا اجتماع ہے۔ اجتماعِ جمعہ میں بھی پہلے خطبہ کی صورت میں اللہ ربّ العزّت کا ذکر کیا جاتا ہے پھر نماز پڑھی جاتی ہے۔ مسلم شریف کی ایک حدیث میں اجتماعِ جمعہ کے حوالے سے حضور ﷺ کا یہ معمول نقل ہوا ہے:

كَانَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ خُطْبَتَانِ كَانَ يَجْلِسُ بَيْنَهُمَا يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَيُذَكِّرُ النَّاسَ (۱)

''اللہ کے رسول ﷺ کے دو خطبے ہوتے تھے' ان کے دوران آپؐ بیٹھا کرتے تھے۔ آپؐ قرآن حکیم پڑھ کر سناتے اور لوگوں کو نصیحت فرماتے۔''

حضور ﷺ کے دونوں خطبات بہت مختصر ہوتے تھے۔ اس لیے صاف ظاہر ہے کہ ان کے درمیان حضور ﷺ تھکان کی وجہ سے تو نہیں بیٹھتے تھے۔ میری رائے اس حوالے سے یہ ہے کہ یہ دو خطبات نمازِ ظہر کی دو رکعتوں کے قائم مقام ہیں۔ (نمازِ ظہر میں فرضوں کی چار رکعتیں ہیں جبکہ نماز جمعہ میں دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں) چنانچہ اس دوران حضور ﷺ کا بیٹھنا دراصل اپنے خطاب کو باقاعدہ دو خطبوں کی شکل دینے کے لیے ہوتا تھا۔ ان خطبات میں' جیسا کہ حدیث میں ذکر ہوا ہے' حضور ﷺ آیاتِ قرآنی کے ذریعے تذکیر فرماتے تھے۔ آپؐ کے تمام سامعین چونکہ قرآن کی زبان کو بخوبی سمجھتے تھے اس لیے ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کے مصداق قرآن مجید کا مفہوم بغیر کسی وضاحت اور تشریح کے دلوں میں اترتا چلا جاتا تھا۔ ہمارے ہاں چونکہ عام سامعین عربی خطبہ کو نہیں سمجھ سکتے اس لیے ان کی تذکیر کے لیے خطبہ سے پہلے ''خطاب'' کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اجتماعِ جمعہ کے موقع پر ذکر و تذکیر کی اسلام میں کیا اہمیت ہے' اس کا اندازہ درج ذیل حدیث سے ہوتا ہے۔ اجتماعِ جمعہ میں بروقت حاضری کو یقینی بنانے کی ترغیب دیتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا كَانَ يَوْمُ الْجُمُعَةِ كَانَ عَلٰى كُلِّ بَابٍ مِنْ اَبْوَابِ الْمَسْجِدِ الْمَلَائِكَةُ ، يَكْتُبُوْنَ الْاَوَّلَ فَالْاَوَّلَ ، فَاِذَا جَلَسَ الْاِمَامُ طَوَوْا الصُّحُفَ ،وَجَاؤُوْا لِيَسْتَمِعُوْنَ الذِّكْرَ))(۲)

''جب جمعہ کا دن ہوتا ہے تو مسجد کے دروازوں میں سے ہر دروازے پر فرشتے کھڑے ہو جاتے ہیں' وہ پہلے آنے والوں کو پہلے لکھتے ہیں۔ پھر جب امام (منبر پر) بیٹھ جاتا ہے تو فرشتے اپنے رجسٹر سمیٹ لیتے ہیں اور ذکر سننے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔''

۱۔ صحیح مسلم' کتاب الجمعة' باب ذکر الخطبتین قبل الصلاة وما فیهما من الجلسة۔ و سنن ابی داؤد' کتاب الصلاة' باب الخطبة قائمًا' ح:۱۰۹۴۔ راوی: جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ۔

۲۔ صحیح البخاری' کتاب بدء الخلق' باب ذکر الملائکة' ح:۳۲۱۱۔ وصحیح مسلم' کتاب الجمعة' باب فضل التهجیر یوم الجمعة' ح:۸۵۰۔

حضور ﷺ کے دوسرے فرمان میں جمعہ کے لیے جلدی مسجد آنے والوں کے لیے درجہ بدرجہ فضیلت کی وضاحت بھی ملتی ہے:

((مَنِ اغْتَسَلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ غُسْلَ الْجَنَابَةِ ثُمَّ رَاحَ فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ بَدَنَةً ، وَمَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الثَّانِيَةِ فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ بَقَرَةً ، وَمَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الثَّالِثَةِ فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ كَبْشًا أَقْرَنَ ، وَمَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الرَّابِعَةِ فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ دُجَاجَةً ، وَمَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الْخَامِسَةِ فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ بَيْضَةً ، فَإِذَا خَرَجَ الْإِمَامُ حَضَرَتِ الْمَلَائِكَةُ يَسْتَمِعُونَ الذِّكْرَ)) (۳)

''جو آدمی جمعہ کے دن غسلِ جنابت (کی طرح اہتمام کے ساتھ غسل) کرے پھر وہ صبح صبح مسجد میں جائے تو وہ اس طرح ہے گویا اس نے ایک اونٹ قربان کیا' اور جو آدمی دوسری ساعت میں جائے تو گویا اس نے ایک گائے قربان کی' اور جو آدمی تیسری ساعت میں گیا تو گویا اس نے ایک سینگوں والا مینڈھا قربان کیا' اور جو چوتھی ساعت میں گیا تو گویا اس نے ایک مرغی قربان کی' اور جو پانچویں ساعت میں گیا تو گویا اُس نے ایک انڈا قربان کر کے اللہ کا قرب حاصل کیا۔ پھر جب امام (خطبہ کے لیے) نکلے تو فرشتے بھی (اندراج کا سلسلہ ختم کر کے) ذکر سننے کے لیے حاضر ہو جاتے ہیں۔''

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے علماء نے لفظ ''ساعت'' کی مختلف تاویلیں کی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی رائے اس ضمن میں یہ ہے (ذاتی طور پر مجھے اس رائے سے اختلاف ہے) کہ اس لفظ کا تعلق وقت کی ظاہری تقسیم سے نہیں بلکہ ان ''ساعتوں'' سے مخفی ساعتیں مراد ہیں۔ البتہ اس حدیث میں جس خطبہ کا ذکر ہوا ہے اس سے مراد مسنون خطبہ ہے۔ اس حکم کا اطلاق ہمارے ائمہ اور خطباء کی مقامی زبانوں میں کی جانے والی تقاریر پر نہیں ہوتا۔ خطبہ شروع ہونے کے بعد حاضری کا اندراج نہ ہونے کے حوالے سے شاہ ولی اللہؒ کی رائے یہ ہے کہ اس کے بعد آنے والے جمعہ کی فضیلت سے محروم رہیں گے' البتہ ان کے فرض کی ادائیگی ہو جائے گی' حتیٰ کہ اگر کوئی شخص خطبہ کے دوران بھی شامل ہوگا تو فرض کی ادائیگی کی حد تک اس کی حاضری بھی قبول سمجھی جائے گی۔

آیت ۱۶ ﴿بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝۱۶﴾ ''بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔''

دراصل انسان کی اُخروی کامیابی یا ناکامی کا تمام تر انحصار اس کی ترجیحات پر ہے۔ اگر تو وہ اپنے معاملات کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے آخرت کی کامیابی کو مقدم رکھتا ہے اور دنیوی مفادات کے حوالے سے قناعت پسندی کی حکمت عملی پر کاربند رہتا ہے تو وہ کامیاب ہے اور اگر اس کا معاملہ اس کے برعکس ہے تو اس کا راستہ تباہی اور بربادی کا راستہ ہے۔ اس آیت میں اس حوالے سے ہم جیسے دنیادار مسلمانوں کے اصل مرض کی نشاندہی کر دی گئی ہے کہ ہم دنیوی زندگی کے مفادات کو آخرت کے معاملات پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دنیا کا نفع اور نقصان ہمیں نقد نظر آتا ہے جبکہ آخرت کی راحت اور تکلیف ہمیں سامنے نظر نہیں آتی۔ اس لیے دنیا کا معمولی سا مفاد ہم آخرت کے بہت بڑے عذاب کے بدلے میں بھی حاصل کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ جیسے سورۃ النساء کی آیت ۱۰ میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا ہے کہ جو لوگ ظلم و زیادتی سے یتیموں کا مال ہڑپ کر جاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھر

۳۔ صحیح مسلم' کتاب الجمعة' باب الطیب والسواک یوم الجمعة۔ وسنن ابی داؤد' کتاب الطهارة' باب فی الغسل یوم الجمعة۔

رہے ہیں۔لیکن آج دنیا میں جو کوئی ایسا مال کھاتا ہے اُسے ایسا کرتے ہوئے تو محسوس نہیں ہوتا کہ وہ آگ کے انگارے پیٹ میں بھر رہا ہے اس لیے جب وہ ایسے مال کو اپنی پہنچ میں دیکھتا ہے تو اسے غصب کرنے سے باز نہیں رہتا۔انسان کی اس طبعی اور جبلّی کمزوری یا خامی کا ذکر سورۃ القیامہ میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝۲۰ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝۲۱﴾ ''ہرگز نہیں! اصل میں تم لوگ عاجلہ (جلد ملنے والی چیز) سے محبت کرتے ہو۔اور تم آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔''

آیت ۱۷ ﴿وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝۱۷﴾ ''جبکہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی۔''

آیت ۱۸ ﴿اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝۱۸﴾ ''یقیناً یہی بات اگلے صحیفوں میں بھی (درج) ہے۔''

یعنی تذکیر اور ہدایت کا اصل جوہر اور خلاصہ یہی ہے کہ انسان آخرت کو دنیا پر ترجیح دے' کیونکہ دنیا فانی اور وقتی ہے جبکہ آخرت اس سے کہیں بہتر اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ہدایت کے حوالے سے یہ بنیادی نکتہ پہلے آسمانی صحیفوں میں بھی مذکور تھا۔

آیت ۱۹ ﴿صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝۱۹﴾ ''(یعنی) ابراہیم اور موسیٰ (علیہما السلام) کے صحیفوں میں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحائف تو آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں' البتہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحائف کا آج بظاہر کہیں نشان نہیں ملتا۔اس حوالے سے میری رائے یہ ہے اور میں اپنی اس رائے کا اظہار قبل ازیں بھی متعدد بار کر چکا ہوں کہ ہندوؤں کے اُپنشد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحائف ہی کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔

سُوْرَةُ الْغَاشِيَةِ

سُوْرَةُ الْغَاشِيَةِ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۲۶ رُكُوْعُهَا: ۱

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝۱ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝۲ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝۳ تَصْلٰى نَارًا
حَامِيَةً ۝۴ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۝۵ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ۝۶ لَّا يُسْمِنُ وَ لَا
يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ۝۷ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ۝۸ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ۝۹ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝۱۰ لَّا تَسْمَعُ
فِيْهَا لَاغِيَةً ۝۱۱ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۝۱۲ فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ۝۱۳ وَّ اَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ۝۱۴ وَّ
نَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ۝۱۵ وَّ زَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ۝۱۶ اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝۱۷ وَ اِلَى
السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝۱۸ وَ اِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝۱۹ وَ اِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ۝۲۰
فَذَكِّرْ ۗ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝۲۱ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۝۲۲ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَ كَفَرَ ۝۲۳ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ
الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ۝۲۴ اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ۝۲۵ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ۝۲۶

آیت ۱ ﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝۱﴾ ''کیا پہنچ چکی ہے آپؐ کے پاس اس ڈھانپ لینے والی (آفت) کی خبر؟'' یعنی قیامت کی خبر جو پوری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

آیت ۲ ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝۲﴾ ''بہت سے چہرے اُس دن ذلیل ہوں گے۔''

یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ القیامہ اور سورۂ عبس میں بھی آ چکا ہے۔ سورۃ القیامہ میں اس صورتِ حال کا نقشہ یوں دکھایا گیا ہے: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝۲۲ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝۲۳ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۢ بَاسِرَةٌ ۝۲۴ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۝۲۵﴾ ''کچھ چہرے اُس دن تروتازہ ہوں گے اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے اور کچھ چہرے اُس دن افسردہ ہوں گے۔ خیال کر رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ سلوک ہونے والا ہے''۔ جبکہ سورۂ عبس میں یہی کیفیت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝۳۸ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝۳۹ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝۴۰ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝۴۱﴾ ''اُس دن کچھ چہرے روشن ہوں گے۔ مسکراتے ہوئے خوش وخرم۔ اور کچھ چہرے اُس دن غبار آلود ہوں گے۔ اُن پر سیاہی چھائی ہوئی ہوگی۔''

آیت ۳ ﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝۳﴾ ''مشقت زدہ تھکے ماندے۔''

آیت ۴ ﴿تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝۴﴾ ''وہ داخل ہوں گے دہکتی ہوئی آگ میں۔''

آیت ۵ ﴿تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۝۵﴾ ''انہیں پلایا جائے گا پانی ایک کھولتے ہوئے چشمے سے۔''

آیت ۶ ﴿لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ۝۶﴾ ''نہیں ہوگا ان کے لیے کھانے کو کچھ بھی سوائے خاردار جھاڑیوں کے۔''

آیت ۷ ﴿لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ۝۷﴾ ''جو نہ تو موٹا کرے اور نہ ہی بھوک مٹائے۔''

اسے کھانے سے نہ تو انہیں کوئی تقویت ملے گی اور نہ ہی بھوک کا احساس ختم ہوگا۔ کسی بھی غذا کے یہی دو فائدے ہوتے ہیں' لیکن اہل جہنم کو اس کھانے سے ان میں سے کوئی فائدہ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ اب اگلی آیات میں نیک لوگوں کی کیفیت بیان کی جارہی ہے:

آیت ۸ ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ۝۸﴾ ''بہت سے چہرے اُس روز تر وتازہ ہوں گے۔''

ان کے چہرے ناز ونعمت میں پلے بڑھے لوگوں کے چہروں کی طرح بارونق ہوں گے۔

آیت ۹ ﴿لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ۝۹﴾ ''وہ اپنی کوشش (کے نتائج) پر راضی ہوں گے۔''

وہ لوگ اپنی دُنیوی زندگیوں میں آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتے رہے تھے اور آخرت کی کامیابی کے لیے مسلسل کوشاں بھی تھے۔ چنانچہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی کوششیں اور محنتیں قبول فرمائے گا۔ جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل کی اس آیت میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝۱۹﴾ ''اور جو کوئی آخرت کا طلب گار ہو' اور اس کے لیے اس کے شایانِ شان کوشش کرے اور وہ مؤمن بھی ہو تو یہی لوگ ہوں گے جن کی کوشش کی قدر افزائی کی جائے گی۔''

آیت ۱۰ ﴿فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝۱۰﴾ ''(وہ ہوں گے) عالی مقام جنت میں۔''

آیت ۱۱ ﴿لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ۝۱۱﴾ ''وہ اس میں کوئی لغو بات نہیں سنیں گے۔''

وہاں انہیں کوئی ایسی فضول یا غلط بات سنائی نہیں دے گی جس سے انہیں کوفت ہو۔

آیت ۱۲ ﴿فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۝۱۲﴾ ''اس میں ایک چشمہ ہے بہتا ہوا۔''

آیت ۱۳ ﴿فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ۝۱۳﴾ ''اس میں اونچے اونچے تخت ہیں۔''

آیت ۱۴ ﴿وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ۝۱۴﴾ ''اور جام قرینے سے رکھے ہوئے۔''

آیت ۱۵ ﴿وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ۝۱۵﴾ ''اور قالین بچھے ہوئے صف در صف۔''

آیت ۱۶ ﴿وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ۝۱۶﴾ ''اور مخمل کے نہالچے جگہ جگہ پھیلے ہوئے۔''

اگلی چار آیات قرآن مجید کی ان آیات میں سے ہیں جو بقول علامہ اقبال شعوری مشاہدے پر زور دیتی ہیں کہ چیزوں کو دیکھو' ان پر غور کرو اور اپنی عقل اور منطق کے مطابق ان سے نتائج اخذ کرو۔ ظاہر ہے عقل' شعور اور حواس کی صلاحیتیں انسان کو اسی لیے دی گئی ہیں کہ اپنی زندگی میں وہ ان سے کام لے: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ۝۳۶﴾ (بنی اسرائیل) ''اور مت پیچھے پڑو اُس چیز کے جس کے بارے میں تمہیں علم نہیں۔ یقیناً سماعت' بصارت اور عقل سبھی کے بارے میں باز پُرس کی جائے گی''۔ واضح رہے کہ علم کے میدان میں یہ سائنٹیفک رجحان قرآن مجید نے متعارف کرایا

ہے۔ مطلب یہ کہ انسان ہر چیز کو پہلے عقل کی کسوٹی پر پرکھے اور پھر کوئی رائے قائم کرے۔ عقل سے ماوراء صرف الہامی علم ہے۔ اس لیے وحی کی سند کے بغیر انسان کوئی ایسی بات تسلیم نہ کرے جس کے پیچھے کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہ ہو۔ قرآن مجید کا عطا کردہ یہی وہ اندازِ فکر ہے جس نے ہر قسم کی توہم پرستی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے۔

آیت ۱۷ ﴿اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾﴾ ''تو کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں اونٹوں کو کہ انہیں کیسے بنایا گیا ہے!''

کیا یہ لوگ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی اللہ کی نشانیوں پر غور نہیں کرتے؟ اور نہیں تو یہ اونٹ کی تخلیق کو ہی دیکھ لیتے کہ اس جانور کے جسم کی ریگستان کے ماحول کے ساتھ کس قدر ہم آہنگی ہے۔ ریگستان کی گرمی میں یہ کئی کئی دن کھائے پیے بغیر چلتا رہتا ہے۔ اس کے پاؤں ایسے بنائے گئے ہیں کہ ریت میں نہیں دھنستے۔

آیت ۱۸ ﴿وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ﴿۱۸﴾﴾ ''اور (کیا یہ دیکھتے نہیں) آسمان کو کہ کیسے بلند کیا گیا ہے!''

یہ ماہرینِ فلکیات کے لیے صلائے عام ہے کہ وہ اس میدان میں تحقیق کر کے ستاروں اور کہکشاؤں کی دنیا کے اسرار و رموز معلوم کریں۔

آیت ۱۹ ﴿وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ﴿۱۹﴾﴾ ''اور (کیا یہ دیکھتے نہیں) پہاڑوں کو کہ کیسے گاڑ دیے گئے ہیں!''

پہاڑوں کی بناوٹ اور کرۂ ارضی پر ان کے اثرات وغیرہ کے بارے میں تحقیق کرنا ماہرینِ ارضیات کا کام ہے۔

آیت ۲۰ ﴿وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ﴿۲۰﴾﴾ ''اور (کیا یہ دیکھتے نہیں) زمین کی طرف کہ کیسے بچھا دی گئی ہے!''

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی آفاقی نشانیوں میں سے چند نشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ مضمون قرآن میں بار بار آیا ہے لیکن ان آیات میں خصوصی طور پر قرآن مجید کے مخاطبینِ اوّلین سے خطاب ہے۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں سرزمینِ حجاز کے باشندوں کا زیادہ تر وقت صحرائی مسافتوں میں گزرتا تھا' جیسا کہ سورۂ قریش کی آیت ﴿رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ﴾ میں بھی ذکر ہوا ہے۔ چنانچہ اپنے سفروں کے دوران جس ماحول سے ان لوگوں کا دن رات واسطہ رہتا تھا ان آیات میں اسی ماحول کی چار چیزوں کو گنوا کر انہیں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ یعنی ایک وہ اونٹ جو ان کے صحرائی سفر کی واحد سواری تھی' اوپر آسمان' نیچے زمین اور اطراف و جوانب میں پہاڑی سلسلے۔ یہ تھا وہ ماحول جس میں عام طور پر ان لوگوں کے شب و روز گزرتے تھے۔

بہرحال قرآن مجید کی ایسی تمام آیات صاحبِ شعور انسانوں کو دعوتِ فکر دیتی ہیں کہ تم لوگ ان مظاہرِ فطرت کو غور سے دیکھا کرو۔ ان میں سے ایک ایک چیز اللہ تعالیٰ کی نشانی اور اس کی صناعی و خلاقی کا نمونہ ہے:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾﴾

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے اُلٹ پھیر میں اور اُن کشتیوں (اور جہازوں) میں جو سمندر میں (یا دریاؤں میں) لوگوں کے لیے نفع بخش سامان لے کر چلتی ہیں اور اُس پانی میں کہ جو اللہ نے آسمان سے اتارا ہے پھر اس سے زندگی بخشی زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد' اور ہر قسم کے حیوانات (اور چرند پرند) اس کے اندر پھیلا دیے' اور ہواؤں کی

گردش میں اور ان بادلوں میں جو معلق کر دیے گئے ہیں آسمان اور زمین کے درمیان' یقیناً نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں۔''

اسی حقیقت کو شیخ سعدیؒ نے اپنے انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:

برگِ درختانِ سبز در نظر ہوشیار ہر ورقش دفترے است معرفتِ کردگار!

کہ ایک صاحبِ شعور انسان کے لیے سبز درختوں کا ایک ایک پتا گویا معرفتِ خداوندی کا دفتر ہے۔ شیخ سعدیؒ نے تو اپنے زمانے میں یہ بات اپنی خداداد بصیرت کی بنا پر کہی تھی لیکن آج سائنسی تحقیق سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ سبز درختوں کا ایک ایک پتا دراصل photosynthesis کی فیکٹری ہے۔ یہ فیکٹریاں سارا دن آکسیجن بنانے اور سورج کی روشنی کو جذب کر کے درختوں کی لکڑی کی طرف منتقل کرنے میں مصروف رہتی ہیں۔

ظاہر ہے یہ صفحات ایسی مثالوں کی تفصیل کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس حوالے سے انسان کے سمجھنے کی اصل بات یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تخلیقات کو محض حیوانی آنکھ سے نہیں بلکہ عقل اور شعور کی نظر سے دیکھے۔ علامہ اقبال نے اس حوالے سے ''زبورِ عجم'' میں کیا پتے کی بات کہی ہے:

دم چیست؟ پیام است! شنیدی' نہ شنیدی! در خاکِ تو یک جلوۂ عام است' ندیدی!

دیدن دگر آموز' شنیدن دگر آموز!

کہ اے غافل انسان! تمہارا ہر سانس اللہ تعالیٰ کا پیغام ہے۔ کیا تم نے اس پیغام کو کبھی سنا؟ نہیں سنا! اور تمہاری اس خاک (حیوانی جسم) کے اندر ایک جلوۂ ربانی (نورانی روح) بھی پوشیدہ ہے' لیکن تم نے اس جلوے کو کبھی دیکھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ چنانچہ تمہیں چاہیے کہ تم اس کائنات کی چیزوں کو حیوانی آنکھوں سے دیکھنا اور حیوانی کانوں سے سننا چھوڑو اور انسانوں کا سا دیکھنا اور سننا سیکھو۔ تم اشرف المخلوقات ہو' تمہیں اللہ تعالیٰ نے عقل و شعور سمیت بہت سی اعلیٰ صلاحیتوں سے نواز رکھا ہے' ان صلاحیتوں کو استعمال میں لاؤ۔ مظاہرِ فطرت اور دوسری چیزوں کو دیکھو اور ان پر غور کرو: ﴿خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾ (البقرۃ:۲۹) یہ زمین پر جو کچھ ہے سب اللہ نے تمہارے لیے پیدا کیا ہے۔ ان چیزوں پر تحقیق کرو' نئے نئے قوانینِ فطرت کو تلاش کرو' انہیں کام لاؤ۔ تمہیں زمین پر اللہ تعالیٰ کی خلافت عطا ہوئی ہے۔ اس حیثیت سے خود زمین' اس پر موجود تمام چیزیں' یہ ہوائیں' یہ فضائیں' ستارے' سیارے' کہکشائیں سب تمہارے لیے مسخر ہیں۔ یاد رکھو! اگر تم عقل و شعور سے کام لو گے تو ان پر حکومت کرو گے' لیکن اگر تم توہمات میں پڑ جاؤ گے تو ان چیزوں کے غلام بن جاؤ گے۔

آیت ۲۱ ﴿فَذَكِّرْ ۭ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ یاد دہانی کراتے رہیے' آپ تو بس یاد دہانی کرانے والے ہیں۔''

آیت ۲۲ ﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾ ''آپ ان پر کوئی داروغہ نہیں ہیں۔''

آپ ﷺ کی ذمہ داری صرف تذکیر اور نصیحت تک ہے' کسی کو زبردستی راہِ ہدایت پر لانا آپ کا کام نہیں ہے۔

آیت ۲۳ ﴿اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَ كَفَرَ﴾ ''مگر جس نے منہ موڑا اور کفر کیا۔''

آیت ﴿۲۴﴾ ﴿فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ﴿۲۴﴾﴾ ''تو اُس کو اللہ عذاب دے گا سب سے بڑا عذاب۔''

بلاشبہ اللہ کے رسول ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا کلام اور پیغام اپنی بے داغ اور مثالی سیرت کی گواہی کے ساتھ اُمت تک اس انداز میں پہنچا دیا ہے کہ حق کو سمجھنے کے بارے میں کہیں کوئی ابہام نہیں رہا۔ اب اس کے بعد بھی جو شخص حق سے منہ موڑے گا تو وہ گویا حق کو حق سمجھتے ہوئے اسے ٹھکرائے گا اور اس سے یہی ثابت ہوگا کہ اس کے اندر بھلائی اور خیر کی کوئی رمق موجود ہی نہیں۔ چنانچہ ایسا ہر شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے شدید ترین عذاب کا مستحق ہے۔

آیت ﴿۲۵﴾ ﴿اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ﴿۲۵﴾﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ان سب کو ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔''

آیت ﴿۲۶﴾ ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ﴿۲۶﴾﴾ ''پھر ان کا حساب ہمارے ذِمّہ ہے۔''

آپ ﷺ تذکیر اور یاددہانی کے حوالے سے اپنا فرض ادا کرتے جائیے۔ ان کی جوابدہی اور حساب کا معاملہ آپ ہم پر چھوڑ دیں۔ یہ وہی انداز اور اسلوب ہے جو اس گروپ کی سورتوں میں قبل ازیں بھی کئی بار آ چکا ہے۔ اس دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں مشرکین کو مہلت دینے کا ذکر بہت خصوصیت کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً سورۃ المزمّل میں فرمایا گیا: ﴿وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ﴿۱۱﴾﴾ ''آپ مجھے اور ان جھٹلانے والوں کو چھوڑ دیں' جو بڑی نعمتوں سے نوازے گئے ہیں اور ابھی آپ انہیں کچھ مہلت دیں''۔ اسی طرح سورۃ الطارق کی آخری آیت میں بھی یہ مضمون خصوصی اسلوب کے ساتھ آیا ہے۔ اس آیت میں اس مفہوم کے دو صیغے (مَهِّلْ ، اَمْهِلْ) باب تفعیل اور باب افعال سے آئے ہیں۔ یہاں فرمایا کہ ''ان سب کو لوٹ کر ہماری ہی طرف آنا ہے۔ پھر ان کا حساب ہمارے ذِمّہ ہے!''

اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنَا حِسَابًا يَّسِيْرًا ۔آمین یاربّ العالمین!

سُوْرَةُ الْفَجْرِ

سُوْرَةُ الْفَجْرِ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۳۰ رُكُوْعُهَا: ۱

وَالْفَجْرِ ۙ﴿۱﴾ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۙ﴿۲﴾ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۙ﴿۳﴾ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۚ﴿۴﴾ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ
حِجْرٍ ؕ﴿۵﴾ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۙ﴿۶﴾ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۙ﴿۷﴾ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي
الْبِلَادِ ۙ﴿۸﴾ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۙ﴿۹﴾ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ۙ﴿۱۰﴾ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي
الْبِلَادِ ۙ﴿۱۱﴾ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ۙ﴿۱۲﴾ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۚ﴿۱۳﴾ اِنَّ رَبَّكَ
لَبِالْمِرْصَادِ ؕ﴿۱۴﴾ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ
اَكْرَمَنِ ؕ﴿۱۵﴾ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۚ﴿۱۶﴾ كَلَّا بَلْ لَّا
تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۙ﴿۱۷﴾ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۙ﴿۱۸﴾ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۙ﴿۱۹﴾
وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ؕ﴿۲۰﴾ كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۙ﴿۲۱﴾ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ
صَفًّا صَفًّا ۚ﴿۲۲﴾ وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ؕ﴿۲۳﴾
يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ۚ﴿۲۴﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ ۙ﴿۲۵﴾ وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ
اَحَدٌ ؕ﴿۲۶﴾ يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۙ﴿۲۷﴾ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۚ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ
عِبٰدِيْ ۙ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۚ﴿۳۰﴾ ع ۱۴

آیت ۱ ﴿وَالْفَجْرِ ①﴾ ''قسم ہے فجر کی۔''

سورۃ الفجر کی ابتدائی آیات قسموں کے حوالے سے مشکلات القرآن میں سے ہیں اور ان کے بارے میں متعدد اقوال ہیں۔ بہرحال اس پہلی آیت کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ اس سے ۱۰ ذی الحجہ کی فجر مراد ہے جس کے بعد قربانی ہوتی ہے اور یہ دن مناسکِ حج کے حوالے سے بنیادی اور خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

آیت ۲ ﴿وَلَيَالٍ عَشْرٍ ②﴾ ''اور قسم ہے دس راتوں کی۔''

پہلی قسم کی مناسبت سے اکثر مفسرین نے ان راتوں سے ۱۰ ذی الحجہ کی فجر سے پہلے کی دس راتیں مراد لی ہیں۔ ظاہر ہے ۱۰ ذی الحجہ کی فجر سے پہلے ۱۰ ذی الحجہ کی رات گزر چکی ہوتی ہے اس لیے وہ رات بھی ان میں شامل ہے۔

آیت ۳ ﴿وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ③﴾ ''اور قسم ہے جفت کی اور طاق کی۔''

اس سے عموماً رمضان کے آخری عشرہ کی جُفت اور طاق راتیں مراد لی جاتی ہیں اور طاق راتوں میں لیلۃ القدر ہے۔ البتہ دنیا کے تمام علاقوں میں چاند چونکہ ایک ساتھ نظر نہیں آتا اس لیے مختلف علاقوں کی طاق اور جُفت راتوں میں فرق ہوگا۔ مثلاً ہوسکتا ہے ہمارے ہاں پاکستان میں جو رات طاق ہو سعودی عرب میں وہ جُفت ہو۔

آیت ۴ ﴿وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۝۴﴾ ''اور قسم ہے رات کی جب وہ گزرنے لگے۔''

آیت ۵ ﴿هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ۝۵﴾ ''کیا اس میں کوئی قسم (دلیل) ہے اُن لوگوں کے لیے جو عقل مند ہیں؟''

یعنی ان تمام چیزوں کو اگلی آیات کے مضمون پر گواہ ٹھہرایا گیا ہے۔

آیت ۶ ﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝۶﴾ ''کیا آپ نے دیکھا نہیں کیا کیا تھا آپ کے رب نے عاد کے ساتھ؟''

آیت ۷ ﴿اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝۷﴾ ''وہ ارم جو ستونوں والے تھے۔''

''ارم'' کے بارے میں عام مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ قومِ عاد کے شاہی خاندان کا لقب تھا۔ یعنی جس طرح مصر میں فراعنہ، عراق میں نمارودہ اور یمن میں تُبابعہ خاندانوں کی حکومتیں تھیں، اسی طرح قومِ عاد کے علاقے میں ارم خاندان برسرِ اقتدار تھا۔ یہاں ان کے حوالے سے ستونوں کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ وہ لوگ اپنی تعمیرات میں ستونوں کو خصوصی اہمیت دیتے تھے اور دنیا میں ستونوں پر بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کرنے کا طریقہ سب سے پہلے انہوں نے ہی شروع کیا تھا۔ جیسے اس قوم کے ایک شہر کے جو زیرِ زمین آثار دریافت ہوئے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ اس شہر کی فصیل پر تیس ستون یا مینار بنائے گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شہر شداد نے خصوصی اہتمام کے ساتھ بسایا تھا جو اُس قوم کا بہت بڑا بادشاہ تھا۔

آیت ۸ ﴿الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝۸﴾ ''جن کے مانند نہیں پیدا کیے گئے (دنیا کے) ملکوں میں۔''

یعنی قد و قامت اور جسمانی قوت کے لحاظ سے دنیا میں ان کا کوئی ثانی پیدا نہ ہوا۔ ان الفاظ کا ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس قوم نے جس معیار اور جس انداز کی تعمیرات کی تھیں ایسی تعمیرات ان سے پہلے دنیا میں کسی اور قوم نے نہیں کی تھیں۔ شاید اسی لیے تاریخ میں شداد کی ''جنتِ ارضی'' مشہور ہے۔

آیت ۹ ﴿وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝۹﴾ ''اور ثمود کے ساتھ (کیا کیا آپ کے رب نے) جنہوں نے وادی میں چٹانوں کو تراشا تھا۔''

قومِ ثمود کے لوگ پہاڑوں کو تراشنے کے ماہر تھے۔ وہ بڑے بڑے پہاڑوں کو تراش کر خوبصورت کشادہ گھر اور محلات بناتے تھے۔ پہاڑوں سے تراشے ہوئے اُن کے گھر اور محلات آج بھی موجود ہیں۔

آیت ۱۰ ﴿وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ۝۱۰﴾ ''اور فرعون کے ساتھ (کیا کیا) جو میخوں والا تھا۔''

اوتاد (وتد کی جمع) لوہے کی میخوں کو بھی کہتے ہیں اور لکڑی کے کھونٹوں کو بھی جن کے ساتھ خیموں کی رسیاں باندھی جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک رائے تو یہ ہے کہ یہ اُس کے لشکروں کے خیموں کے کھونٹوں کا ذکر ہے۔ اس لیے کہ اس کے لشکر بہت بڑے تھے اور وہ بڑی شان و شوکت کا مالک تھا۔ جب وہ چڑھائی کرتا تو لشکروں کے خیمے نصب کرنے کے لیے کھونٹوں کا ایک بڑا ذخیرہ ان کے ہمراہ ہوتا۔ ایک دوسری رائے یہ بھی ہے کہ وہ جس سے ناراض ہوتا اسے صلیب پر چڑھا کر اس کے جسم میں میخیں لگوا دیتا تھا۔ (واللہ اعلم!)

آیت ۱۱ ﴿الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۱﴾﴾ ''جنہوں نے (اپنے اپنے) ملکوں میں سرکشی اختیار کی تھی۔''

آیت ۱۲ ﴿فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ﴿۱۲﴾﴾ ''سوانہوں نے ان میں بکثرت فساد پھیلا دیا تھا۔''

ظاہر ہے جب اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کے نظام سے سرکشی ہوگی تو اس کا نتیجہ مخلوقِ خدا پر ظلم و زیادتی کی صورت میں سامنے آئے گا اور اسی ظلم و زیادتی کا نام فساد ہے۔ جس طرح آج G-7 اور G-9 ممالک کی انسان دشمن پالیسیاں دنیا میں فساد کا باعث بن رہی ہیں۔ ان ظالمانہ پالیسیوں کے نتیجے میں سرمایہ داروں اور محروم طبقہ کے افراد کے درمیان North versus South کے عنوان سے خطرناک محاذ آرائی شروع ہو چکی ہے۔ لیکن اب وہ وقت بھی دور نہیں جب اس صورتِ حال کے خطرناک نتائج خود اُن کے اپنے گلے کا طوق بنیں گے: ؎

اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے ناز اتنا نہ کریں ہم کو ستانے والے!

بہرحال زمین میں فساد ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے انسانوں کی سرکشی کی وجہ سے ہی پیدا ہوتا ہے' جیسا کہ سورۃ الروم کی اس آیت میں فرمایا گیا ہے: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ﴾ (آیت ۴۱) ''بحر و بر میں فساد رونما ہو چکا ہے' لوگوں کے اعمال کے سبب۔''

آیت ۱۳ ﴿فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ﴿۱۳﴾﴾ ''تو دے مارا ان کے اوپر آپ کے رب نے عذاب کا کوڑا۔''

چنانچہ یہ سب قومیں اپنی سرکشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار بنیں اور دنیا سے ان کا نام و نشان مٹ گیا۔

آیت ۱۴ ﴿اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿۱۴﴾﴾ ''بے شک آپ کا رب تو (سرکشوں اور مفسدوں کی) تاک میں ہے۔''

یعنی کوئی فرد ہو یا کوئی قوم' جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ سے سرکشی کرے گا اللہ تعالیٰ اسے اس جرم کی سزا ضرور دے گا۔

آیت ۱۵ ﴿فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ﴾ ''انسان کا معاملہ یہ ہے کہ جب اُس کا ربّ اُسے آزماتا ہے پھر اُسے عزّت دیتا ہے اور نعمتیں عطا کرتا ہے''

﴿فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ﴿۱۵﴾﴾ ''تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے عزّت دی!''

آیت ۱۶ ﴿وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ﴾ ''اور جب وہ اسے آزماتا ہے پھر اُس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے''

﴿فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ﴿۱۶﴾﴾ ''تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا!''

آیت ۱۷ ﴿كَلَّا﴾ ''ایسا ہرگز نہیں ہے!''

یہ مقام اپنے مضمون کے اعتبار سے پورے قرآن مجید میں منفرد و ممتاز ہے۔ مذکورہ دونوں کیفیات کے حوالے سے انسان کے جن مکالمات کا یہاں ذکر ہوا ہے بظاہر ان میں کوئی خرابی یا شرک کی آلودگی نظر نہیں آتی۔ دونوں کلمات توحید کے عین مطابق ہیں۔ رزق کی فراخی اور تنگی کے حوالے سے عزّت اور ذِلّت کو کسی دیوی یا دیوتا سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے منسوب کیا گیا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزّت دی ہے اور یہ کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کیا ہے۔ بظاہر تو یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۭ﴾ (آلِ عمران: ۲۶) ہی کا اقرار ہے' کہ اے اللہ تُو جس کو چاہتا ہے عزّت دیتا ہے اور تُو جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ تو پھر

یہاں ان جملوں کو آخر قابلِ مذمت کیوں ٹھہرایا گیا ہے؟ اس نکتہ لطیف کو سمجھنے کے لیے اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ توحید تو ہدایت کی جڑ اور بنیاد ہے' جبکہ اس بنیاد سے اوپر بھی ہدایت کی بہت سی منازل ہیں۔ اس لیے ایک بندۂ مؤمن کو زندگی میں راہنمائی کے لیے اپنی نگاہیں صرف مینارۂ توحید پر ہی مرکوز نہیں رکھنی چاہئیں بلکہ اسے شاہراہِ ہدایت کے ہر سنگِ میل اور ہر موڑ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنے اندازِ فکر اور طرزِ عمل کا رخ متعین کرنا چاہیے۔

چنانچہ ان جملوں کے حوالے سے اصل اور بنیادی خرابی یہ ہے کہ یہاں انسانی سوچ نے رزق کی فراخی اور تنگی کو عزّت اور ذِلّت کا معیار سمجھ لیا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے کہ انسان کے رزق کی بست و کشاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیشہ امتحان اور آزمائش کے لیے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو کبھی زیادہ رزق دے کر آزماتا ہے تو کبھی اس کو معاشی تنگی سے دوچار کر کے اس کا امتحان لیتا ہے۔ گویا انسان کے لیے عیش و آرام اور مال و دولت کی فراوانی میں بھی امتحان ہے اور رنج و عسرت اور تنگدستی و ناداری بھی امتحان ہی کے مراحل ہیں۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو جس انسان نے مال و دولت کی کمی یا زیادتی کو ذِلّت اور عزّت کا معیار سمجھ لیا وہ دھوکا کھا گیا ——— ایک بندۂ مؤمن کو تو دنیوی عزّت و ذِلّت کی ویسے بھی پروا نہیں ہونی چاہیے۔ ظاہر ہے اصل اور حقیقی عزّت یا ذِلّت کا فیصلہ تو قیامت کے دن ہوگا۔ چنانچہ جس انسان کو اللہ تعالیٰ رزق کی فراخی سے آزما رہا ہے اس کی عزّت اس میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرے اور اپنے دائیں بائیں محروم و نادار لوگوں کو ان کا وہ حق ادا کرے جو اللہ تعالیٰ نے آزمائش کی غرض سے اس کے مال میں رکھ دیا ہے۔ اسی طرح جس شخص کا امتحان رزق کی تنگی کے ساتھ ہو رہا ہے اس کی عزّت اس میں ہے کہ وہ صبر کرے اور اپنی عزّتِ نفس کو بچا کر رکھے۔

اس معاملے کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اگر رزق کی کمی بیشی اور عزت و ذلت کے حوالے سے مذکورہ فلسفہ واقعتاً ہماری سمجھ میں آ بھی جائے تو بھی ہمارا نفس ہمیں یہ پٹی ضرور پڑھاتا ہے کہ رزق کی فراخی والی آزمائش آسان ہے اور اس کے مقابلے میں غربت و تنگدستی کی آزمائش بہت مشکل ہے' جبکہ اصل حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس حوالے سے اصل حقیقت یہ ہے کہ غربت و تنگدستی کی آزمائش سے سرخرو ہونا انسان کے لیے نسبتاً آسان ہے اور اس کے مقابلے میں مال و دولت کی فراوانی کی آزمائش میں ثابت قدم رہنا بہت مشکل ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آسائش و آرام میں انسان کے غافل ہو جانے اور اللہ تعالیٰ کو بھول جانے کا زیادہ امکان ہے' جبکہ مشکل اور پریشانی کی کیفیت میں انسان ہر وقت اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا رہتا ہے۔ اس حوالے سے حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((مَا قَلَّ وَكَفٰى خَيْرٌ مِّمَّا كَثُرَ وَاَلْهٰى)) [1] ''جو (مال) مقدار میں کم ہو مگر کفایت کر جائے وہ اس سے بہتر ہے جو زیادہ ہو مگر غافل کر دے۔''

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ جب خلیفۂ وقت کے عتاب کا شکار ہوئے تو جیل میں آپ پر بے پناہ تشدد کیا گیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں آپؒ کو جس تشدد کا سامنا کرنا پڑا ویسا تشدد اگر ہاتھی پر بھی کیا جاتا تو وہ بھی بلبلا اٹھتا۔ لیکن آپ نے وہ اذیت ناک آزمائش کمال صبر و استقامت سے برداشت کی اور اس دوران آنکھوں میں کبھی آنسو تک نہ آنے دیے۔ لیکن دوسرے خلیفہ کے دور میں جب آپؒ کو رہائی ملی اور آپؒ کی خدمت میں اشرفیوں کے توڑے بطور نذرانہ پیش کیے گئے تو آپؒ یہ ''نذرانہ'' دیکھ کر بے اختیار رو پڑے

۱۔ رواہ احمد والطبرانی فی الکبیر۔ راوی: ابو الدرداء رضی اللہ عنہ۔

اور اللہ تعالیٰ کے حضور التجا کی کہ اے اللہ! تیری یہ آزمائش بہت سخت ہے' میں اس آزمائش کے قابل نہیں ہوں۔

اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ''توحید'' ہدایت کا پہلا اور بنیادی درجہ ہے۔ اگر انسان اپنے اچھے بُرے ہر طرح کے حالات کو من جانب اللہ سمجھے تو اس کا یہ طرزِ عمل توحید کے عین مطابق ہے۔ لیکن اس کے اوپر بھی ہدایت کے بہت سے درجات ہیں۔ ان درجات میں سے ایک درجہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی آزمائش و ابتلاء کے اصول وضوابط کو سمجھے اور یقین رکھے کہ دنیا کے عیش و آرام اور تنگدستی و عسرت کی کیفیات اللہ تعالیٰ کی آزمائش ہی کی مختلف صورتیں ہیں اور یہ کہ تنگدستی و عسرت کی آزمائش کے مقابلے میں دولت کی فراوانی کی آزمائش کہیں زیادہ سخت اور خطرناک ہے۔

﴿بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۙ﴾ ''بلکہ تم لوگ یتیم کی عزّت نہیں کرتے۔''

آیت ۱۸ ﴿وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰي طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۙ﴾ ''اور نہ ہی تم لوگ آپس میں مسکینوں کو کھلانے کی ترغیب دیتے ہو۔''

کسی دوسرے شخص کو کسی نیکی کی ترغیب دینا اس لیے بھی مشکل ہے کہ اس کے لیے انسان کو پہلے خود اس نیکی پر کاربند ہونا پڑتا ہے۔ آیت زیر مطالعہ میں دراصل اسی انسانی کمزوری کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ نہ تم خود بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہو اور نہ ہی دوسروں کو اس نیک کام کی ترغیب دیتے ہو۔

آیت ۱۹ ﴿وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۙ﴾ ''اور تم ساری کی ساری میراث سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔''

اس آیت میں انسانوں کے بنائے ہوئے غیر متوازن اور ظالمانہ قوانینِ وراثت کی طرف بھی اشارہ ہے اور اس سے یہ بھی مراد ہے کہ تم میں سے جو طاقتور ہے وہ مختلف حیلوں بہانوں سے تمام وراثت پر قبضہ کر لینا چاہتا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن مجید نے دنیا کو مفصّل' جامع اور متوازن قوانینِ وراثت عطا کیے ہیں۔ اسلام سے قبل عرب معاشرے میں باپ کی پوری وراثت بڑے بیٹے کو منتقل ہو جاتی تھی اور چھوٹے تمام بہن بھائیوں کو اس میں سے کچھ بھی نہیں ملتا تھا۔ دنیا کے بعض ممالک میں ایسے ظالمانہ قوانین آج بھی نافذ العمل ہیں۔

آیت ۲۰ ﴿وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۙ﴾ ''اور تم مال سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہو۔''

دنیوی مال و دولت کی محبت تمہارے دلوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ واضح رہے کہ سورتوں کے اس جوڑے یعنی سورۃ الفجر اور سورۃ البلد میں نزولِ قرآن سے قبل کے عرب معاشرے کے تمدن اور رسم و رواج کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ مثلاً طاقتوروں کے میراث کو زبردستی ہڑپ کر جانے' مال و دولت کی غیر معمولی محبت اور اسی محبت کی وجہ سے خدمتِ خلق کے کاموں سے پہلوتہی کرنے کی مثالیں اس معاشرے میں عام تھیں۔

آیت ۲۱ ﴿كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۙ﴾ ''ہرگز نہیں! جب زمین کو کوٹ کوٹ کر ہموار کر دیا جائے گا۔''

اس آیت کا یہ ترجمہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے فرزند ارجمند شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ کے ترجمہ کے مطابق ہے' جبکہ ان کے بھائی شاہ رفیع الدین رحمہ اللہ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ جب زمین کو ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔

آیت ۲۲ ﴿وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۚ﴾ ''اور آپ کا رب جلوہ فرما ہو گا جب کہ فرشتے قطار در قطار حاضر ہوں گے۔''

سورۃ الحاقّہ میں قیامت کے دن کا ایک منظر اس طرح بیان کیا گیا ہے: ﴿وَالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآىِٕهَا ۚ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ ثَمٰنِيَةٌ ﴿۱۷﴾﴾ ''اور فرشتے ہوں گے اس کے کناروں پر' اور اس دن آپ کے ربّ کے عرش کو اٹھائے ہوئے ہوں گے آٹھ فرشتے''۔ سورۃ الرحمٰن میں اس دن کے آسمان کی کیفیت کا ذکر یوں آیا ہے: ﴿فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿۳۷﴾﴾ ''پھر جب آسمان پھٹ جائے گا اور ہو جائے گا گلابی' تیل کی تلچھٹ جیسا۔''

قرآن مجید میں قیامت کے دن سے متعلق جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں ان پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ میدانِ حشر اسی زمین پر قائم ہوگا۔ زمین کو کھینچ کر چپٹا ﴿وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ﴿۳﴾﴾ (الانشقاق) اور کوٹ کوٹ کر ایسے ہموار کر دیا جائے گا کہ اس کے تمام نشیب و فراز ختم ہو جائیں گے ﴿لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾﴾ (طٰہٰ)۔ پہاڑوں کو روئی کے گالوں کی طرح اڑا دیا جائے گا۔ پھر زمین پر اللہ تعالیٰ کا نزولِ اجلال ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی ایک خاص تجلّی کے ساتھ آٹھ فرشتے نازل ہوں گے۔ دوسرے فرشتے صفیں باندھے کھڑے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی عدالت لگے گی' حساب کتاب ہوگا اور یوں قصۂ زمین برسرِ زمین ہی طے ہوگا۔ گویا جس زمین پر انسانوں نے اپنے اچھے بُرے اعمال کا ارتکاب و اکتساب کیا ہے' اسی زمین پر ان کا حساب ہوگا۔

آیت ۲۳ ﴿وَجِايْٓءَ يَوْمَىِٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ﴾ ''اور لے آئی جائے گی اُس روز جہنّم بھی''

جہنّم کا ظہور بھی شاید زمین کے اندر سے ہی ہوگا۔ یعنی جب زمین کو کھینچ کر چپٹا کیا جائے گا تو اس کے اندر کا کھولتا ہوا لاوا باہر نکل آئے گا' جو جہنّم کا سماں پیدا کر دے گا۔ (واللہ اعلم!)

﴿يَوْمَىِٕذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴿۲۳﴾﴾ ''اُس دن انسان کو سمجھ آئے گی' لیکن اب سمجھنے کا کیا فائدہ!''

شاہ عبدالقادرؒ صاحب نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ ''اُس دن سوچے آدمی اور کہاں ملے اس کو سوچنا؟''☆ یعنی اُس دن انسان کو بہت کچھ یاد آ جائے گا کہ وہ دنیا سے اپنے ساتھ کیا لے کر آیا تھا اور اسے نصیحت بھی حاصل ہو جائے گی۔ لیکن اُس وقت کی نصیحت سے اسے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ظاہر ہے فائدہ تو تب ہوتا اگر اس نے دنیا میں نصیحت پکڑی ہوتی۔

آیت ۲۴ ﴿يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ﴿۲۴﴾﴾ ''وہ کہے گا: اے کاش مَیں نے اپنی زندگی کے لیے کچھ آگے بھیجا ہوتا!''

یہاں لفظ حَيَاتِيْ (میری زندگی) خاص طور پر لائقِ توجہ ہے۔ یعنی اُس وقت انسان کو معلوم ہو جائے گا کہ میری اصل زندگی تو یہ ہے جو اَب شروع ہوئی ہے۔ مَیں خواہ مخواہ دنیا کی زندگی کو اصل زندگی سمجھتا رہا جو اس اصل زندگی کی تمہید تھی۔

دراصل انسانی زندگی عالَمِ ارواح سے شروع ہوتی ہے اور دنیا سے ہوتی ہوئی ابدالآباد تک جاتی ہے۔ دنیا کے ماہ و سال اور شب و روز کی گنتی سے زندگی کے اس طویل سفر کا حساب ممکن نہیں۔ علامہ اقبال نے اس فلسفے کی ترجمانی یوں کی ہے: ؎

تُو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ جاوداں' پیہم دواں' ہر دم جواں ہے زندگی!

چنانچہ انسان کو اس حقیقت کا ادراک ہونا چاہیے کہ اُس کی دُنیوی زندگی اُس کی جاودانی زندگی کے تسلسل کا ایک چھوٹا سا حصّہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اُس کے امتحان کے لیے منتخب فرمایا ہے اور اس وقفۂ امتحان کے اختتام کی علامت کے طور پر اُس نے موت کو تخلیق فرمایا ہے

☆ دورۂ ترجمۂ قرآن کے دوران محترم ڈاکٹر صاحبؒ نے شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے ترجمہ کا حوالہ ان الفاظ میں دیا ہے: ''اُس دن انسان چیتے گا'' —— لیکن ایسا سہواً بیان ہو گیا ہے۔ ایڈیٹنگ کے دوران حضرت شاہ صاحبؒ کے اصل الفاظ درج کر دیے گئے ہیں۔ (مرتّب)

تا کہ ہر انسان کے اعمال کی جانچ کی جا سکے: ﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (الملک:۲) ''اُس نے موت اور زندگی کو اس لیے پیدا کیا ہے تا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرنے والا ہے۔''

آیت ۲۵ ﴿فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُعَذِّبُ عَذَابَہٗٓ اَحَدٌ ۲۵﴾ ''تو اُس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب کوئی نہیں دے سکتا۔''

آیت ۲۶ ﴿وَّلَا یُوْثِقُ وَثَاقَہٗٓ اَحَدٌ ۲۶﴾ ''اور اُس کا سا باندھنا کوئی اور نہیں باندھ سکتا۔''

میدانِ حشر میں ایک طرف تو یہ نقشہ ہوگا اور دوسری طرف کچھ ایسے خوش قسمت لوگ بھی ہوں گے جن سے کہا جائے گا:

آیت ۲۷ ﴿یٰٓاَیَّتُہَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ۲۷﴾ ''اے نفسِ مُطمئنّہ!''

جو اس امتحانی زندگی میں مطمئن ہو کر یکسوئی کے ساتھ اپنے رب کی بندگی میں لگا رہا اور اُس کے دین کے ساتھ چمٹا رہا۔

آیت ۲۸ ﴿ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً ۲۸﴾ ''اب لوٹ جاؤ اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تم اُس سے راضی وہ تم سے راضی۔''

سورۃ البیّنہ کی آیت ۸ میں ایسے خوش قسمت لوگوں کی یہی کیفیت ﴿رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ ؕ﴾ ''اللہ اُن سے راضی اور وہ اللہ سے راضی!'' کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

آیت ۲۹ ﴿فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۲۹﴾ ''تو داخل ہو جاؤ میرے (نیک) بندوں میں۔''

اللہ تعالیٰ کے ان نیک بندوں کی نشاندہی سورۃ النساء کی اس آیت میں کی گئی ہے:

﴿وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّہَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا ۶۹﴾

''اور جو کوئی اطاعت کرے گا اللہ کی اور رسولؐ کی تو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہیں معیت حاصل ہوگی اُن کی جن پر اللہ کا انعام ہوا' یعنی انبیاءِ کرام' صدیقین' شہداء اور صالحین۔ اور کیا ہی اچھے ہیں یہ لوگ رفاقت کے لیے!''

آیت ۳۰ ﴿وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۳۰﴾ ''اور داخل ہو جاؤ میری جنّت میں!''

چنانچہ اس نفسِ مُطمئنّہ سے کہا جائے گا کہ آؤ! میرے ان انعام یافتہ بندوں کی صف میں شامل ہو جاؤ۔ ایسے خوش قسمت لوگوں کے مراتب کی بلندی کے تصوّر اور اپنی تہی دامنی کے احساس کے پیشِ نظر ہمارا ان کی معیت کے لیے دُعا مانگنا اگرچہ ''چھوٹا منہ بڑی بات'' کے زمرے میں آتا ہے مگر پھر بھی دل سے بے اختیار دُعا نکلتی ہے: اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ ــــ آمین!

سُوْرَةُ الْبَلَدِ

سُوْرَةُ الْبَلَدِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۲۰ رُكُوْعُهَا: ۱

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ﴿۱﴾ وَ اَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ﴿۲﴾ وَ وَالِدٍ وَّ مَا وَلَدَ ۙ﴿۳﴾ لَقَدْ خَلَقْنَا
الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ؕ﴿۴﴾ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۘ﴿۵﴾ يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ؕ﴿۶﴾
اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗۤ اَحَدٌ ۘ﴿۷﴾ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۙ﴿۸﴾ وَلِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ ۙ﴿۹﴾ وَ هَدَيْنٰهُ
النَّجْدَيْنِ ۚ﴿۱۰﴾ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۚ﴿۱۱﴾ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ؕ﴿۱۲﴾ فَكُّ رَقَبَةٍ ۙ﴿۱۳﴾ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ
يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۙ﴿۱۴﴾ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۙ﴿۱۵﴾ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ؕ﴿۱۶﴾ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ؕ﴿۱۷﴾ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ؕ﴿۱۸﴾ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا
هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ؕ﴿۱۹﴾ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ؕ﴿۲۰﴾

آیت ۱ ﴿لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ﴿۱﴾﴾ ''نہیں! مَیں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی۔''

اس آیت میں بھی لَآ اُقْسِمُ کا مفہوم بالکل وہی ہے جو اس سے پہلے ہم سورۃ القیامہ کی پہلی اور دوسری آیات یا سورۃ الانشقاق کی آیت ۱۶ میں پڑھ چکے ہیں۔ یعنی ان آیات میں لَا نافیہ نہیں ہے بلکہ مخاطبین کے خیالاتِ باطلہ کے ابطال کے لیے ہے۔ چنانچہ سورۃ القیامہ کی پہلی آیت ﴿لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ﴿۱﴾﴾ کا اگر ہم انگریزی ترجمہ کریں تو ہم کہیں گے: Nay, I swear by the Day of Judgement! دراصل انگریزی میں تو Nay کے بعد کو ما(۱) آجانے سے مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے' لیکن عربی میں چونکہ ''کو ما'' وغیرہ کا استعمال نہیں ہوتا اس لیے سننے یا پڑھنے والا لَآ اُقْسِمُ کا مفہوم یوں بھی سمجھ سکتا ہے کہ ''مَیں قسم نہیں کھاتا''۔ بہرحال اس آیت کا مفہوم یہی ہے کہ جو کچھ تم لوگ کہہ رہے ہو وہ درست نہیں' بلکہ مَیں اس شہر یعنی مکہ مکرمہ کی قسم کھاتا ہوں کہ تمہارے خیالات و نظریات باطل ہیں۔ آگے چل کر واضح ہو جائے گا کہ یہاں مکہ مکرمہ کی قسم کیوں کھائی جا رہی ہے۔

آیت ۲ ﴿وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ﴿۲﴾﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) آپ حلال کر لیے گئے ہیں اس شہر میں۔''

کچھ مترجمین نے اس آیت کا ترجمہ یوں بھی کیا ہے کہ ''آپ کے لیے حلال ہو جائے گا یہ شہر''۔ یعنی اگرچہ یہ بلد الحرام ہے یہاں خون ریزی وغیرہ کی اجازت نہیں' لیکن ایک وقت آئے گا کہ آپؐ کو اس کی اجازت مل جائے گی' جیسے فتح مکہ کے دن مکہ مکرمہ حضور ﷺ کے لیے حلال کر دیا گیا اور اس دن لشکر کشی کے دوران مسلح تصادم کے اکا دُکا واقعات بھی ہوئے۔ البتہ میرے نزدیک آیت کا اصل مدعا اور مفہوم وہی ہے جو مَیں نے ترجمے میں اختیار کیا ہے کہ اے نبی (ﷺ) ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس بلد الحرام میں آپؐ کی عزت پر حملے ہو رہے ہیں' آپؐ کی عزتِ نفس کو مجروح کیا جا رہا ہے' آپؐ کو مسلسل ستایا جا رہا ہے۔ اس وادیٔ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ

کے ماحول میں جہاں معمول کی زندگی بھی سراپا مشقت ہے وہاں اہلِ شہر کی مخالفت نے آپؐ کے لیے زندگی کو مزید کٹھن اور مشکل بنا دیا ہے۔ چنانچہ دعوتِ حق کی جدّوجُہد میں مسلسل سختیاں برداشت کرتے ہوئے آپؐ کی زندگی کے شب و روز کی اس وقت جو صورتِ حال اور کیفیت ہے' ہم اس کی قسم کھا رہے ہیں۔

آیت ۳ ﴿وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۝۳﴾ ''اور قسم ہے والد کی اور اولاد کی۔''

اس قسم میں اس مشقت اور ذمہ داری کی طرف اشارہ ہے جو ایک والد کو اپنی اولاد کی پرورش اور تربیت وغیرہ کے حوالے سے برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اب اگلی آیت میں اس حقیقت یعنی مُقسَم علیہ کا ذکر ہے جس پر یہ قسمیں کھائی جا رہی ہیں:

آیت ۴ ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ۝۴﴾ ''بے شک ہم نے انسان کو پیدا ہی محنت اور مشقت میں کیا ہے۔''

سورۃ الانشقاق میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۝۶﴾ ''اے انسان! تُو مشقت پر مشقت برداشت کرتے جا رہا ہے اپنے رب کی طرف' پھر تُو اس سے ملنے والا ہے''۔ انسانی زندگی کے بارے میں یہ تلخ حقیقت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ اس دنیا میں کوئی انسان جیسا ہے' جہاں ہے' غریب ہے' امیر ہے' صاحبِ اقتدار ہے' فقیر ہے' کلفت' مشقت' کوفت' پریشانی اس کا مقدر ہے۔ کوئی انسان جسمانی محنت کے ہاتھوں بے حال ہے تو کوئی ذہنی مشقت کی وجہ سے پریشان۔ کوئی جذباتی اذیت سے دوچار ہے تو کوئی نفسیاتی خلفشار کا شکار ہے۔ کوئی کوڑی کوڑی کا محتاج ہے تو کسی کے لیے دولت کے انبار وبالِ جان ہیں' کسی کے پاس سر چھپانے کو جگہ نہیں تو کوئی مخملی گدیلوں پر لیٹنا نیند کو ترستا ہے۔ غرض مختلف انسانوں کی مشقت کی کیفیت' نوعیت اور شدت تو مختلف ہو سکتی ہے مگر مشقت اور پریشانی سے چھٹکارا جیتے جی کسی کو بھی نہیں ہے۔ بقول غالب ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں!

بظاہر تو یہ صورتِ حال بھی بہت گمبھیر محسوس ہوتی ہے' لیکن انسان کی اصل مشکل اس سے کہیں بڑی ہے اور وہ مشکل یہ ہے کہ اسے دُنیوی زندگی میں پیش آنے والی یہ تمام پریشانیاں اور سختیاں بھی سہنی ہیں اور اس کے بعد اپنے ربّ کے حضور پیش ہو کر اپنے ایک ایک عمل کا حساب بھی دینا ہے۔ سورۃ الانشقاق کی مذکورہ آیت میں اسی ''ملاقات'' کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے انسان کی قسمت کا حتمی فیصلہ تو اسی ملاقات میں ہونا ہے۔ اس ساری صورتِ حال میں انسان کی اصل مشقت' اصل مشکل اور اصل ٹریجڈی کا اندازہ لگانا ہو تو ایک ایسے انسان کا تصوّر کریں جو زندگی بھر ''دنیا'' حاصل کرنے کے جنون میں کولہو کا بیل بن کر محنت و مشقت کی چکّی میں پستا اور طرح طرح کی ذہنی و نفسیاتی اذیتوں کی آگ میں جلتا رہا۔ پھر مشقتوں پر مشقتیں برداشت کرتا اور تکلیفوں پر تکلیفیں جھیلتا یہ انسان جب اپنے رب کی عدالت میں پیش ہوا تو اس کا دامن مطلوبہ معیار و مقدار کی نیکیوں سے خالی تھا۔ چنانچہ اس عدالت سے اسے دائمی سزا کا حکم ہوا: ﴿وَيَصْلٰى سَعِيْرًا ۝۱۲﴾ (الانشقاق) اور اس کے بعد اسے جہنّم میں جھونک دیا گیا —— ہمیشہ ہمیش کے لیے! یہ ہے انسان کی اصل مشکل اور اصل ٹریجڈی جس کا تصوّر بھی روح فرسا ہے۔ چنانچہ ہر انسان کو سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

آیت ۵ ﴿اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۝۵﴾ ''کیا یہ سمجھتا ہے کہ اس کے اوپر کوئی قابو نہیں پا سکے گا؟''

مشقت میں پڑے ہوئے انسان کا حال دیکھو۔ اس حالت میں بھی وہ غرور کرتا ہے۔ ابوجہل کو دیکھو کیسے اکڑا ہوا ہے ——

مقامِ غور ہے! چاروں طرف سے مصائب و مشکلات میں گھرے ہوئے انسان کا اپنے خالق اور مالک کے سامنے یہ حال ہے تو اگر اس کے لیے دنیا میں آسانیاں ہی آسانیاں ہوتیں تو پھر یہ اللہ تعالیٰ سے کیسی کیسی بغاوتیں کرتا اور مخلوقِ خدا پر کیا کیا ستم ڈھاتا!

آیت ۶ ﴿یَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ۝۶﴾ ''کہتا ہے میں نے تو ڈھیروں مال خرچ کر ڈالا۔''

اس فقرے میں سردارانِ قریش کی ذہنیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ لوگ بھلائی اور نیکی کے کام اکثر و بیشتر جذبۂ مسابقت کے تحت کرتے تھے اور پھر اپنی نیکیوں کا خوب چرچا کرتے اور شیخیاں بگھارتے تھے۔ حتیٰ کہ ان میں سے اکثر لوگوں کے ایمان نہ لانے کا سبب بھی یہی جذبۂ مسابقت تھا۔ ظاہر ہے وہ لوگ حضور ﷺ کو اپنے خاندان کے مدِمقابل خاندان کا ایک فرد سمجھتے تھے اور اس حیثیت سے آپؐ کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا انہیں کسی قیمت پر گوارا نہیں تھا۔ اس حوالے سے ابوجہل کا اقراری بیان تو تاریخ کے ریکارڈ پر موجود ہے۔ اس سے جب پوچھا گیا کہ کیا تمہارے خیال میں محمد (ﷺ) جھوٹے ہیں؟ تو اُس نے جواب دیا کہ نہیں! انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اس پر پوچھنے والے نے سوال کیا کہ پھر تم اُن پر ایمان کیوں نہیں لے آتے؟ اس پر اُس نے جو جواب دیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے خاندان کا بنوہاشم کے ساتھ پشتوں سے مقابلہ چلا آ رہا ہے۔ انہوں نے غرباء کو کھانے کھلائے تو ہم نے ان سے بڑھ کر کھانے کھلائے۔ اگر وہ حُجّاج کی خدمت کرنے میں پیش پیش رہے تو اس میدان میں بھی ہم نے انہیں آگے نہیں نکلنے دیا۔ یوں اب تک ہم ان کے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے چلے آ رہے ہیں۔ اب اگر ہم ان کی نبوت کو تسلیم کر لیں تو ہم ہمیشہ کے لیے ان کے غلام بن جائیں گے اور یہ صورتِ حال کم از کم مجھے کسی قیمت پر قابلِ قبول نہیں۔

آیت زیرِ مطالعہ میں سردارانِ قریش کے اسی طرزِ عمل کی تصویر دکھائی گئی ہے کہ اگر ان میں سے کوئی شخص کبھی بھلائی کا کوئی کام سرانجام دے لیتا ہے تو جگہ جگہ اس کا تذکرہ کرتا اور شیخیاں بگھارتا پھرتا ہے کہ فلاں کام میں مَیں نے ڈھیروں مال کھپا ڈالا ہے۔

آیت ۷ ﴿اَیَحْسَبُ اَنْ لَّمْ یَرَهٗۤ اَحَدٌ ۝۷﴾ ''کیا اس کا گمان ہے کہ اُسے کسی نے دیکھا نہیں؟''

کیا وہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو ہر شخص کے ایک ایک عمل سے واقف ہے اس کی اس نیکی سے وہ بے خبر ہے۔ یعنی اگر تو اس نے وہ نیکی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کی تھی تو پھر وہ اس کا ڈھنڈھورا کیوں پیٹ رہا ہے؟

آیت ۸ ﴿اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَیْنَیْنِ ۝۸﴾ ''کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں؟''

آیت ۹ ﴿وَلِسَانًا وَّشَفَتَیْنِ ۝۹﴾ ''اور ایک زبان اور دو ہونٹ (نہیں دیے)؟''

آیت ۱۰ ﴿وَهَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ ۝۱۰﴾ ''اور ہم نے اس کو راہ دکھلا دی دو گھاٹیوں کی۔''

عام مفسرین کے نزدیک دو گھاٹیوں سے مراد نیکی اور بدی کے دو راستے ہیں۔ البتہ ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس سے ماں کی دو چھاتیاں مراد ہیں۔ نجد کے لغوی معنی اُبھری ہوئی چیز کے ہیں۔ بلند سطح پر جو راستہ ہو اس کو بھی نجد کہتے ہیں۔ چنانچہ ''النَّجْدَین'' کے معنی ''دو بلند (واضح) راستے'' بھی ہو سکتے ہیں اور ''دو اُبھار'' بھی۔ اور مجھے مؤخر الذکر رائے زیادہ پسند ہے۔ انسان کی زبان، اس کے دو ہونٹوں اور پھر ماں کی چھاتیوں کے ذکر کے حوالے سے دراصل یہاں انسان کی اس جبلی اور پیدائشی ہدایت کا ذکر مقصود ہے جس کے بارے میں ہم سورۃ الاعلیٰ کی آیت ﴿وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ۝۳﴾ میں پڑھ آئے ہیں۔ ظاہر ہے ایک بچہ اپنی پیدائش کے فوراً بعد نہ صرف ماں کے دودھ کی تلاش شروع کر دیتا ہے بلکہ جونہی اس کی رسائی ماں کی چھاتیوں تک ہوتی ہے تو وہ دودھ چوسنے بھی لگتا ہے۔

اس نومولود کو آخر اپنی غذا کی تلاش کا یہ شعور کس نے دیا ہے؟ اور اس مرحلے پر زبان اور ہونٹوں کے اس خاص استعمال کا طریقہ اسے کس نے سکھایا ہے؟ ظاہر ہے یہ شعور' یہ آگہی اور یہ ہدایت اس کی اس فطرت اور جبلت کا حصہ ہے جو اسے اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے اور اس اعتبار سے بچے کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

آیت ۱۱ ﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ⑪﴾ ''لیکن وہ گھاٹی کو عبور نہ کر سکا۔''

آیت ۱۲ ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ⑫﴾ ''اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ گھاٹی کون سی ہے؟''

آیت ۱۳ ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ ⑬﴾ ''کسی گردن کا چھڑا دینا۔''

یعنی مال خرچ کر کے کسی غلام کو آزاد کرا دینا' یا کسی مقروض کا قرض ادا کر دینا۔

آیت ۱۴ ﴿اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ⑭﴾ ''یا کھانا کھلا دینا بھوک کے دن میں۔''

یعنی کسی شخص کا قحط سالی کے دوران بھوکوں کو کھانا کھلانا۔ خصوصی طور پر ایسی صورتِ حال میں جب اُسے اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضرورت کا خیال بھی پریشان کیے دے رہا ہو۔

آیت ۱۵ ﴿يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ⑮﴾ ''اُس یتیم کو جو قرابت دار بھی ہے۔''

آیت ۱۶ ﴿اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ⑯﴾ ''یا اُس محتاج کو جو مٹی میں رُل رہا ہے۔''

یہ وہ فلسفہ ہے جس پر سورۃ الحدید کے مطالعہ کے دوران تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ یہ مشکل گھاٹی دراصل حُبِّ مال کی وہ چٹان ہے جو متعلقہ انسان کے لیے بھلائی کے راستے کو مسدود کیے کھڑی ہے۔ سورۃ الحدید کی آیت ۱۸ کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے اسے گاڑی کی بریک سے تشبیہہ دی تھی۔ چنانچہ مذکورہ گھاٹی کو عبور کرنے یا گاڑی کی بریک کو کھولنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے مال کو اللہ ربّ العزّت کی رضا کے لیے محتاجوں اور ناداروں کی مدد کرنے اور بھلائی کے دوسروں کاموں پر دل کھول کر خرچ کرے۔ یعنی مال کی محبت کی آلودگی کو دل سے صاف کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ اپنے پیارے مال کو اللہ تعالیٰ کی محبت پر قربان کر دیا جائے۔ یاد رکھیں! حُبِّ مال کی گندگی کو دل سے نکالے بغیر انسان کو ایمان کی حلاوت نصیب نہیں ہو سکتی۔ (اس مضمون کی مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الحدید' آیات ۱۷ تا ۲۰ کی تشریح۔)

آیت ۱۷ ﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''پھر وہ شامل ہو اُن لوگوں میں جو ایمان لائے''

یہاں پر لفظ ثُمَّ بہت اہم اور معنی خیز ہے۔ یعنی پہلے انسان اس مشکل گھاٹی کو عبور کرے' اپنے دل کی زمین میں انفاق فی سبیل اللہ کا ہَل چلائے' اس کے ذریعے سے دل کی زمین سے حُبِّ مال کا جھاڑ جھنکاڑ صاف کرے' اور پھر (ثُمَّ) اس میں ایمان کا بیج ڈالے۔ اگر وہ اس ترتیب اور اس انداز سے محنت کرے گا تو تبھی ایمان کا پودا اُس کے دل کی زمین میں اپنی جڑیں پھیلائے گا اور برگ وبار لائے گا۔

﴿وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ⑰﴾ ''اور جنہوں نے باہم ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی اور باہم ایک دوسرے کو ہمدردی کی نصیحت کی۔''

یہ مضمون سورۃ العصر میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۳﴾﴾ ''سوائے اُن کے جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کیے' اور باہم ایک دوسرے کو حق کی تاکید کی اور باہم ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی''۔ الفاظ اور مفہوم کے اعتبار سے ان دونوں آیات میں گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔ البتہ دونوں جگہ مذکور اصطلاحات کی ترتیب مختلف ہے۔ سورۃ العصر کی اس آیت میں ایمان کے بعد عملِ صالح کا بیان ہے جبکہ آیت زیر مطالعہ میں عملِ صالح (غرباء و مساکین اور یتیموں کے حقوق کی ادائیگی) کے بعد ایمان کا ذکر ہے۔ سورۃ العصر میں تواصی بالحق کے بعد تواصی بالصبر کا تذکرہ ہے' جبکہ یہاں پر پہلے تواصی بالصبر اور بعد میں تواصی بالمرحمۃ کا ذکر آیا ہے۔ اس پہلو سے دونوں آیات کے تقابلی مطالعہ سے بہت سے حقائق و رموز کی نشاندہی ہوتی ہے۔

آیت ۱۸ ﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴿۱۸﴾﴾ ''یہ ہوں گے داہنے والے۔''

یعنی یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے اعمال نامے اُن کے دائیں ہاتھوں میں دیے جائیں گے۔ لفظ یُمن کے معنی برکت اور خوش بختی کے بھی ہیں۔ اس معنی میں آیت کا مفہوم یوں ہوگا کہ یہ وہ خوش قسمت لوگ ہوں گے جو رشد و ہدایت کے راستے پر چلتے ہوئے فوز و فلاح کی منازل تک پہنچ گئے۔

آیت ۱۹ ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا﴾ ''اور جنہوں نے انکار کیا ہماری آیات کا''

﴿هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ﴿۱۹﴾﴾ ''وہ ہوں گے بائیں والے۔''

یعنی اُن کے اعمال نامے اُن کے بائیں ہاتھوں میں پکڑائے جائیں گے۔ لغوی اعتبار سے جس طرح یُمن کے معنی خوش بختی کے ہیں اسی طرح الْمَشْئَمَة کے مادے (ش ء م) میں بدبختی اور نحوست کے معنی پائے جاتے ہیں (شومئ قسمت کی ترکیب اردو میں بھی مستعمل ہے)۔ لہٰذا اس آیت کا دوسرا ترجمہ یہ ہوگا کہ ''یہ بدبختی والے لوگ ہوں گے''۔ قرآن مجید میں آخرت کی کامیابی یا ناکامی کے حوالے سے دائیں والے (اصحاب المیمنۃ یا اصحاب الیمین) اور بائیں والے (اصحاب المشئمۃ یا اصحاب الشمال) کا ذکر بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ البتہ سورۃ الواقعہ کی اس آیت میں نسلِ انسانی کے تین گروہوں کا تذکرہ بھی ہوا ہے: ﴿وَكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ﴿۷﴾﴾ کہ اُس دن تم لوگ تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔ ان میں سے دو گروہ تو یہی (دائیں اور بائیں والے) بتائے گئے ہیں' جبکہ تیسرے گروہ کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے: ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ﴿۱۰﴾ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۱۱﴾﴾ (الواقعۃ) ''اور آگے نکل جانے والے تو ہیں ہی آگے نکل جانے والے۔ وہی تو بہت مقرب ہوں گے''۔ گویا یہ تیسرا گروہ اہلِ جنت میں سے بہت ہی خاص لوگوں یعنی مقربینِ بارگاہ پر مشتمل ہوگا۔ بہرحال آیت زیر مطالعہ میں ان بدقسمت لوگوں کا ذکر ہوا ہے جنہیں بائیں ہاتھ میں اعمال نامے پکڑا کر جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔

آیت ۲۰ ﴿عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ﴿۲۰﴾﴾ ''ان پر آگ بند کر دی جائے گی۔''

تاکہ پریشر ککر کی طرح آگ کی ساری تپش اندر ہی رہے اور انہیں شدید ترین عذاب ملے۔ اللہ کی پناہ! اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ایسے عذاب سے محفوظ رکھے اور اپنی رحمت اور شانِ غفاری کے طفیل اصحابِ جنت میں شامل فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

سُوْرَةُ الشَّمْسِ

تمہیدی کلمات

سورۃ الشمس اور اس کے بعد کی تین سورتوں (سورۃ اللیل، سورۃ الضحیٰ اور سورۃ الانشراح) کے لیے میں نے ''چہار سورۂ نور و ظلمت'' کا مشترک عنوان تجویز کر رکھا ہے۔ ان میں سے پہلی تین سورتوں کا آغاز قسموں سے ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے سورۃ الشمس اور سورۃ اللیل (ان دونوں سورتوں کا باہم جوڑے کا تعلق بھی ہے) کا انداز سورۃ التکویر اور سورۃ الانفطار سے ملتا جلتا ہے۔ یاد رہے کہ سورۃ التکویر کے آغاز میں قسموں والا حصہ زیادہ آیات (۱۳ آیات) پر مشتمل ہے اور جوابِ قسم کے طور پر صرف ایک آیت (آیت ۱۴) آئی ہے، جبکہ اس کی جڑواں سورت یعنی سورۃ الانفطار میں قسموں والا حصہ نسبتاً کم ہے اور بعد کی آیات میں ان دونوں سورتوں کا مرکزی مضمون زیادہ کھل کر سامنے آیا ہے۔ بالکل اسی انداز میں زیر مطالعہ جوڑے کی پہلی سورت یعنی سورۃ الشمس میں قسموں والا حصہ زیادہ (آٹھ آیات پر مشتمل) ہے اور اس کے بعد جواب القسم کے ضمن میں صرف دو آیات آئی ہیں۔ اس کے مقابلے میں سورۃ اللیل میں قسموں کا حصہ نسبتاً کم ہے، جبکہ سورۃ الشمس سے شروع ہونے والا مضمون یہاں آ کر مزید واضح ہو گیا ہے۔ اس طرح یہ مضمون تدریجاً آگے بڑھتا ہوا سورۃ الضحیٰ میں جا کر نقطۂ عروج کو پہنچے گا۔

سُوْرَةُ الشَّمْسِ مَكِّيَّةٌ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اٰيَاتُهَا: ۱۵ رُكُوْعُهَا: ۱

وَ الشَّمْسِ وَ ضُحٰىهَا ۝۱ وَ الْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۝۲ وَ النَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۝۳ وَ الَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ۝۴
وَ السَّمَآءِ وَ مَا بَنٰىهَا ۝۵ وَ الْاَرْضِ وَ مَا طَحٰىهَا ۝۶ وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا ۝۷ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ
تَقْوٰىهَا ۝۸ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝۹ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝۱۰ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ۝۱۱ اِذِ
انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ۝۱۲ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقْيٰهَا ۝۱۳ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۝۱۴
فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۝۱۵ وَ لَا يَخَافُ عُقْبٰىهَا ۝۱۶

آیت ۱ ﴿وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا ۝۱﴾ ''قسم ہے سورج کی اور اس کی دھوپ کی۔''

آیت ۲ ﴿وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۝۲﴾ ''اور قسم ہے چاند کی جبکہ وہ اس کے پیچھے آتا ہے۔''

تَلَا یَتْلُو کے معنی ہیں کسی کے پیچھے آنا۔ تلاوت کا لفظ بھی اسی مادہ سے مشتق ہے۔ لغوی معنی کے اعتبار سے لفظ ''تلاوت'' کے مفہوم میں قرآن مجید کے متن کا پڑھنا (زبان اور نظر سے عبارت کی پیروی کرنا)، اس کے احکام پر عمل کرنا اور اس کا اتباع کرنا شامل ہے۔

آیت ۳ ﴿وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۝۳﴾ ''اور قسم ہے دن کی جب وہ اس (سورج) کو روشن کر دیتا ہے۔''

اگرچہ بظاہر صورت حال تو یہ ہوتی ہے کہ سورج سے دن روشن ہوتا ہے' لیکن یہاں اسی بات کے اندر یہ لطیف نکتہ پیدا کیا گیا ہے کہ دن ہوتا ہے تو سورج نظر آتا ہے۔ گویا دن سورج کو روشن کرتا ہے۔ آیت کے اس اسلوب کا تعلق دراصل اگلی آیت کے اسلوب سے ہے۔ اگلی آیت میں رات کا ذکر بالکل اسی انداز میں ہوا ہے:

آیت ۴ ﴿وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ۝۴﴾ ''اور قسم ہے رات کی جب وہ اس (سورج) کو ڈھانپ لیتی ہے۔''

ان دونوں آیات کا مفہوم یوں ہوگا کہ دن سورج کو نمایاں کر دیتا ہے جبکہ رات اسے ڈھانپ لیتی ہے۔

آیت ۵ ﴿وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا ۝۵﴾ ''اور قسم ہے آسمان کی اور جیسا کہ اسے بنایا۔''

آیت ۶ ﴿وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا ۝۶﴾ ''اور قسم ہے زمین کی اور جیسا کہ اسے بچھا دیا۔''

نوٹ کیجیے! یہ تمام قسمیں جوڑوں کی صورت میں آئی ہیں۔ پہلے سورج اور چاند کا' پھر دن اور رات کا اور اب آسمان اور زمین کا ذکر ہوا۔ ان ظاہری تضادات کی مثالوں سے دراصل نفسِ انسانی کے روشن اور تاریک پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ جس طرح کائنات میں ہر جگہ تم لوگوں کو تضادات نظر آتے ہیں' سورج ہے تو اس کے ساتھ چاند ہے' اندھیرا ہے تو اس کے ساتھ اُجالا ہے' بلندی ہے تو اس کے ساتھ پستی ہے' اسی طرح انسان کی ذات یا شخصیت کے بھی دو رُخ ہیں۔ بظاہر دیکھنے میں تو تمام انسان ایک جیسے نظر آتے ہیں' لیکن حقیقت میں یہ ایک جیسے نہیں ہیں۔ ان میں سے کوئی حیوانی اور نفسانی خواہشات کے راستے پر چل رہا ہے تو کسی نے اپنے نفس کا تزکیہ کر کے فلاح کی منزل حاصل کر لی ہے۔

آیت ۷ ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷﴾ ''اور قسم ہے نفسِ انسانی کی اور جیسا کہ اُس کو سنوارا۔''

آیت ۸ ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸﴾ ''پس اُس کے اندر نیکی اور بدی کا علم الہام کر دیا۔''

اب اگلی دو آیات میں ان قسموں کے جواب مذکور ہے۔

آیت ۹ ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝۹﴾ ''یقیناً کامیاب ہو گیا جس نے اس (نفس) کو پاک کر لیا۔''

آیت ۱۰ ﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝۱۰﴾ ''اور ناکام ہو گیا جس نے اسے مٹی میں دفن کر دیا۔''

یہ اس سورت کا مرکزی مضمون ہے۔ ان دو آیات میں انتہائی اختصار کے ساتھ انسان کی حقیقی کامیابی اور ناکامی کا معیار بیان کر دیا گیا ہے۔ دَسَّ یَدُسُّ کے معنی کسی چیز کو مٹی میں دفن کر دینے کے ہیں۔ سورۃ النحل (آیت ۵۹) میں ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ؕ﴾ اس آیت میں قبل از اسلام زمانے کے عربوں کی ایک خاص ذہنیت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان میں سے جس شخص کے گھر بیٹی پیدا ہوتی ہے وہ یا تو اسے ذِلت آمیز طریقے سے زندہ رکھتا ہے یا زندہ دفن کر دیتا ہے۔ یہاں ''دَسّٰی'' دراصل دَسَّسَ (باب تفعیل) ہے' اس کے آخری سین کو یا سے بدل دیا گیا ہے۔ تو جس انسان نے اپنے نفس کو مٹی میں دفن کر دیا (اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ جس نے اپنی روح کو اپنے خاکی وجود کے اندر دبا دیا۔ یعنی جس کی حیوانی خواہشات و شہوات اس کی روح پر غالب آ گئیں) تو وہ ناکام رہا۔ البتہ جیسا کہ سورۃ الاعلیٰ کے مطالعہ کے دوران بھی نشان دہی کی گئی ہے' زیر مطالعہ سورتوں

کے مضامین میں سے اکثر کا تعلق سورۃ الاعلیٰ کے مضامین کے ساتھ ہے۔ چنانچہ سورۃ الاعلیٰ میں ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۴﴾﴾ کے الفاظ میں جو مضمون انتہائی مختصر انداز میں آیا تھا' یوں سمجھیں کہ اب آیات زیر مطالعہ میں اس مضمون کی مزید تفصیل بیان ہوئی ہے۔ اس مضمون پر قسموں کی صورت میں یہاں مزید گواہیاں بھی لائی گئی ہیں اور زیر مطالعہ آیت کے الفاظ ﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ﴿۱۰﴾﴾ میں تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھایا گیا ہے۔

دراصل انسان کا نفس اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ اس امانت کو پاک صاف رکھنا اس کی ذمہ داری ہے۔ نفس کو پاک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو' یعنی اپنی شخصیت کو تمام رذائل اور باطنی بیماریوں سے پاک کر کے بہترین انسانی خوبیوں کا مرقع بنائے۔ اس کے لیے ہمارے ہاں عام طور پر تزکیۂ نفس' تعمیرِ سیرت' تعمیرِ خودی وغیرہ اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کی نظر میں کامیاب انسان وہی ہے جو اپنے نفس کو پاک کرنے اور پاک رکھنے میں کامیاب ہو گیا' خواہ دنیا والوں کی نظروں میں وہ حقیر' فقیر اور بے نام ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس جس انسان نے اپنے نفس کو رذائل و خبائث سے آلودہ کر لیا' اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ناکام ہے' دنیا میں خواہ وہ غیر معمولی عزت' شہرت اور دولت کا مالک ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ اصل اور حقیقی کامیابی اور ناکامی کا تعلق انسان کے ظاہر سے نہیں بلکہ اُس کی ''ذات'' سے ہے۔

انسان کی ''ذات'' سے کیا مراد ہے؟ فرائڈ نے اسے انسان کی self (انا) کا نام دیا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کی اصل کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنی self کو id اور libido کے تسلط سے آزاد کرا کے اسے مثبت انداز میں ترقی دے۔ علامہ اقبال نے اسے خودی کا نام دیا ہے اور انسان کی ''کامیابی'' کو اس کی خودی کی تعمیر و ترقی سے مشروط کیا ہے۔ بہرحال اس حوالے سے سمجھنے کا اصل نکتہ یہ ہے کہ انسان محض ایک جسم یا ہاتھ پاؤں' سر' دھڑ وغیرہ کے مجموعے کا نام نہیں ہے۔ انسان کہتا ہے میرا ہاتھ' میرا پاؤں' میرا سر وغیرہ۔ یہ تمام اعضاء بے شک اُس کے ہیں' لیکن وہ انسان جو ان اعضاء کو اپنا بتا رہا ہے وہ خود کیا ہے؟ اور کہاں ہے؟ ظاہر ہے اصل انسان اُس جسم یا وجود کے اندر ہے۔ اس کو ایسے سمجھیں کہ جس طرح آم کی گٹھلی کے اندر آم کا پورا درخت موجود ہے' اسی طرح انسانی جسم کے اندر اصل انسان ایک لطیف شخصیت کی صورت میں موجود ہے۔ یہ لطیف شخصیت عبارت ہے اُس روح سے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے حیوانی یا خاکی وجود کے اندر پھونکی ہے: ﴿وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾ (الحجر: ۲۹)۔ روح یا انسان کی انا کا ذکر اپنشد کے اس فقرے میں بھی ہے' جس کا حوالہ میں پہلے بھی دے چکا ہوں:

Man in his ignorance identifies himself with the material sheeths that encompass his real self.

گویا انسان کی self یا انا یا خودی یا روح اُس کے حیوانی وجود کی مٹی کے اندر دفن ایک خزانہ ہے۔ اب جو انسان اس خزانے کو مٹی سے نکال کر کام میں لے آئے گا' یعنی اپنی روح کو صیقل کر لے گا' اُس کا نفس پاک ہو جائے گا (روح کی پاکیزگی نفس کی پاکیزگی کا باعث بنتی ہے۔ دونوں کا تعلق انسان کے باطن سے ہے) اور وہ کامیابی یا فلاح کے راستے پر گامزن ہو جائے گا۔ (فلاح کا لفظ قرآن مجید میں ایک جامع اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اس اصطلاح کے مفہوم کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ المؤمنون کی پہلی آیت کی تشریح۔)

زیر مطالعہ آیات کے حوالے سے یہ نکتہ خصوصی طور پر پیش نظر رہنا چاہیے کہ انسان کی روح اور اس کا نفس دو الگ الگ چیزیں

ہیں اور ان آیات میں انسانی روح کا نہیں بلکہ انسانی نفس کا ذکر ہوا ہے۔ روحِ انسانی دراصل عالمِ امر کی چیز ہے اور یہ معرفتِ خداوندی اور محبتِ خداوندی کی امین ہے' جبکہ نفسِ انسانی کا تعلق عالمِ خلق سے ہے۔ اسی لیے اس کے ذکر سے پہلے جن چیزوں کی یہاں قسمیں کھائی گئی ہیں ان سب (سورج' چاند' دن' رات' آسمان' زمین) کا تعلق بھی عالمِ خلق سے ہے۔ روح تمام مخلوقات میں سے صرف انسان کو عطا ہوئی ہے' جبکہ نفس گدھے' گھوڑے اور چمپنزی وغیرہ سب جانوروں میں ہوتا ہے۔ البتہ انسان کی خصوصیت اس حوالے سے یہ ہے کہ دوسرے جانوروں کے مقابلے میں نفسِ انسانی کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی ارتقائی درجات سے نوازا ہے اور اس کے اندر اخلاقی حس اور نیکی و بدی کی وہ تمیز الہام کر دی ہے جو دوسرے جانوروں کے نفس میں نہیں پائی جاتی۔ اسی حس اور تمیز کی وجہ سے انسانی فطرت آفاقی سطح پر نیکی کو اچھا اور بدی کو برا سمجھتی ہے۔ دنیا میں کسی معاشرے' کسی مذہب اور کسی نسل کا انسان ہو وہ سچ بولنے کو اچھا اور جھوٹ بولنے کو برا سمجھتا ہے۔ اس حوالے سے قرآن میں معروف اور منکر کی اصطلاحات کثرت سے استعمال ہوتی ہیں۔ معروف وہ چیزیں یا افعال یا اعمال ہیں جو نفسِ انسانی کے لیے مانوس ہیں۔ انہیں دیکھ کر یا اپنا کر نفسِ انسانی کو راحت محسوس ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں منکرات وہ چیزیں یا اعمال یا افعال ہیں جنہیں نفسِ انسانی بُرا سمجھتا ہے اور جن کی صحبت و معیت میں وہ اجنبیت اور کوفت محسوس کرتا ہے' بلکہ وہ انسان کو ایسے اعمال و افعال سے ٹوکتا ہے۔ اسی لیے انسان غلطی کرنے کے بعد اکثر یہ کہتا پایا جاتا ہے کہ ''میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے'' (my conscience is pinching me)۔ نفسِ انسانی کی اسی خصوصیت کی وجہ سے سورۃ القیامہ کی آیت ۲ میں اسے نفسِ لوّامہ (ملامت کرنے والا نفس) کا نام دیا گیا ہے۔

اس حوالے سے آیات زیرِ مطالعہ کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ نفسِ انسانی کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیکی اور بدی کی تمیز کا بنیادی بیج ڈال دیا گیا ہے۔ اب انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اس بیج کی حفاظت کرے' اسے سازگار ماحول فراہم کرے اور عملِ صالح کے پانی سے اس کی آبیاری کرے۔ سورۂ فاطر (آیت ۱۰) میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ ؕ﴾ کہ کسی بھی اچھی بات یا اچھے کلام میں اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچنے کی صلاحیت تو ہوتی ہے لیکن عملِ صالح اُس کی اس صلاحیت کو اور بڑھا دیتا ہے۔ چنانچہ انسان جب تزکیۂ نفس اور اعمالِ صالحہ کے حوالے سے محنت کرے گا تو اُسے ایمان کی حلاوت بھی نصیب ہوگی' وہ ایمان کے ان ثمرات سے بھی بہرہ مند ہوگا جن کا ذکر ہم سورۃ التغابن میں پڑھ آئے ہیں اور اسے کامیابی کی ضمانت بھی ملے گی۔ اس کے برعکس جس انسان نے اپنے نفس کو حیوانی وجود کے تابع کیے رکھا اور وہ اس کی آواز کو دبا کر زندگی بھر جسمانی تقاضے پورے کرنے میں لگا رہا وہ گویا خائب و خاسر ہو کر رہ گیا۔

اب اگلی آیات میں ایک قوم یا ایک معاشرے کے اجتماعی ضمیر کے حوالے سے ایک مثال دی گئی ہے۔ ظاہر ہے جس طرح ایک انسان کے اندر نیکی اور بدی کی تمیز ہوتی ہے اسی طرح ہر معاشرے میں اجتماعی طور پر بھی اخلاقی حس پائی جاتی ہے' اور جس طرح ایک انسان میں اچھے بُرے داعیات ہوتے ہیں اسی طرح ہر معاشرے کے اندر بھی نیکی کے علمبردار اور شر پھیلانے والے عناصر موجود ہوتے ہیں۔ غرض جس طرح ایک فرد کا ضمیر ہوتا ہے اسی طرح معاشروں اور قوموں کا اجتماعی ضمیر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی قوم کا اجتماعی ضمیر زندہ ہو' اس کی صفوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ احسن طریقہ سے ادا کیا جا رہا ہو تو اس قوم کے مجموعی حالات بہتر طور پر چلتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کسی قوم کا اجتماعی ضمیر مردہ ہو جائے اور اس کی اخلاقی حس بحیثیت مجموعی اس قدر کمزور ہو جائے کہ

اس کے ماحول میں برائی کو برائی کہنے والا بھی کوئی نہ رہے تو ایسی قوم اپنے زندہ رہنے کا جواز کھو دیتی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں اسی اجتماعی بے حسی کی تصویر پیش کی ہے: ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا!

اس حوالے سے اب ملاحظہ ہو قومِ ثمود کی مثال:

آیت ۱۱ ﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ۝۱۱﴾ ''قومِ ثمود نے بھی جھٹلایا تھا اپنی سرکشی کے باعث۔''

یعنی حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت کو جھٹلا دیا جو اُن کی ہدایت کے لیے مبعوث کیے گئے تھے۔

آیت ۱۲ ﴿اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ۝۱۲﴾ ''جب اُٹھ کھڑا ہوا ان کا سب سے شقی انسان۔''

وہ شخص اپنی قوم کے لوگوں کے کہنے پر اس اونٹنی کو ہلاک کرنے پر کمربستہ ہو گیا جسے اللہ تعالیٰ نے اس قوم کے مطالبے پر بطور معجزہ پیدا کیا تھا۔

آیت ۱۳ ﴿فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ۝۱۳﴾ ''تو اللہ کے رسولؑ نے اُن سے کہا کہ (خبردار!) یہ اللہ کی اونٹنی ہے اور یہ اس کے پانی پینے کا دن ہے۔''

آیت ۱۴ ﴿فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۚ﴾ ''تو انہوں نے اُس کو جھٹلا دیا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔''

﴿فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۝۱۴﴾ ''تو اُلٹ دیا اُن پر عذاب اُن کے ربّ نے اُن کے گناہ کی پاداش میں اور سب کو برابر کر دیا۔''

ان کے جرمِ عظیم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان پر عذابِ استیصال نازل فرمایا اور پوری قوم کو ایک ساتھ پیوندِ خاک کر دیا۔

آیت ۱۵ ﴿وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۝۱۵﴾ ''اور وہ اس کے انجام سے نہیں ڈرتا۔''

اللہ تعالیٰ کو اپنے اُس فعل کے کسی بُرے نتیجے کا کوئی خوف نہیں ہے کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ وہ پوری کائنات کا مالک اور خالق ہے، وہ جو چاہے کرے۔ اُس نے اس پوری قوم کو ختم کر دیا اور ان کی جگہ دوسری قوم کو لے آیا۔ اس سورت میں پہلے انسانی نفس اور ضمیر کے حوالے سے انسان کی انفرادی کامیابی اور ناکامی کا ذکر ہوا اور پھر قومِ ثمود کی مثال دے کر قوموں کی اجتماعی کامیابی اور ناکامی کے معیار کے بارے میں بھی بتا دیا گیا۔ اس سورت کے مضمون کا تسلسل اگلی سورت میں بھی نظر آئے گا۔

سُوْرَةُ الَّيْلِ

سُوْرَةُ الَّيْلِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۲۱ رُكُوْعُهَا: ۱

وَ الَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۙ﴿۱﴾ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۙ﴿۲﴾ وَ مَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰۤى ۙ﴿۳﴾ اِنَّ سَعْيَكُمْ
لَشَتّٰى ؕ﴿۴﴾ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۙ﴿۵﴾ وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۙ﴿۶﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۚ﴿۷﴾ وَ اَمَّا مَنْۢ
بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۙ﴿۸﴾ وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۙ﴿۹﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ؕ﴿۱۰﴾ وَ مَا يُغْنِىْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا
تَرَدّٰى ؕ﴿۱۱﴾ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۖ﴿۱۲﴾ وَ اِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ﴿۱۳﴾ فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ۚ﴿۱۴﴾
لَا يَصْلٰىهَاۤ اِلَّا الْاَشْقَى ۙ﴿۱۵﴾ الَّذِىْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى ؕ﴿۱۶﴾ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۙ﴿۱۷﴾ الَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ
يَتَزَكّٰى ۚ﴿۱۸﴾ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى ۙ﴿۱۹﴾ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۚ﴿۲۰﴾ وَ
لَسَوْفَ يَرْضٰى ۧ﴿۲۱﴾

آیت ۱ ﴿وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۙ﴿۱﴾﴾ ''قسم ہے رات کی جب وہ ڈھانپ لیتی ہے۔''

یعنی تمام چیزوں پر تاریکی کا پردہ ڈال دیتی ہے۔

آیت ۲ ﴿وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۙ﴿۲﴾﴾ ''اور قسم ہے دن کی جب وہ روشن ہو جاتا ہے۔''

رات اور دن اللہ تعالیٰ کی آفاقی نشانیوں میں سے ہیں' جبکہ اگلی قسم کا تعلق انسان کی ذات (اللہ تعالیٰ کی انفسی نشانیوں) سے ہے۔

آیت ۳ ﴿وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰۤى ۙ﴿۳﴾﴾ ''اور (قسم ہے) اُس کی جو اُس نے پیدا کیے نر اور مادہ۔''

ان قسموں سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ کائنات کے اندر نظر آنے والے تضادات دراصل نظامِ کائنات کا حصہ ہیں' بلکہ کائنات کا نظام انہی تضادات کی وجہ سے چل رہا ہے اور ایک جنس سے تعلق رکھنے والی دو متضاد چیزیں باہم مل کر فطرت کے تقاضوں کی تکمیل کرتی ہیں۔ دنیا کا سارا نظام دن اور رات کے ادلنے بدلنے کی وجہ سے قائم ہے۔ زمین پر حیوانی اور نباتاتی زندگی کا وجود اسی گردشِ لیل و نہار کا مرہونِ منت ہے۔ خود نسلِ انسانی کا تسلسل بھی مرد اور عورت کے جنسی اختلاف و تضاد کی وجہ سے چل رہا ہے۔ چنانچہ کائنات کی مختلف تخلیقات میں بظاہر نظر آنے والے ان تضادات کے اندر بھی ایک طرح کا توافق اور تطابق پایا جاتا ہے۔

آیت ۴ ﴿اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ؕ﴿۴﴾﴾ ''بے شک تمہاری کوشش الگ الگ ہے۔''

یعنی جس طرح کائنات کی باقی چیزوں میں اختلاف و تضاد پایا جاتا ہے اسی طرح تمہارے مختلف افراد کی کوششوں اور محنتوں کی نوعیت بھی مختلف ہے۔

ظاہر ہے زندگی کے شب و روز میں محنت' مشقت اور بھاگ دوڑ کرنا تو انسان کا مقدر ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ ۝۴﴾ (البلد) ''بے شک ہم نے انسان کو پیدا ہی محنت اور مشقت میں کیا ہے''۔ ہر انسان اپنا اور اپنے اہل وعیال کا پیٹ پالنے کے لیے بھی مشقت کرتا ہے۔ پھر اگر وہ کسی نظریے کا پیروکار ہے تو اس نظریے کی اشاعت اور سربلندی کے لیے بھی تگ ودو کرتا ہے اور اس نظریے کے تحت ایک نظام کے قیام کے لیے بھی جدّوجُہد کرتا ہے۔ غرض اپنے اپنے ماحول اور حالات کے مطابق محنت اور مشقت تو سب انسان ہی کرتے ہیں لیکن ان کی مشقتوں کے نتائج مختلف ہوتے ہیں۔ ایک شخص اپنی محنت کے نتیجے میں جنت خرید لیتا ہے اور دوسرا اپنی محنت و مشقت کی پاداش میں خود کو دوزخ کا مستحق بنالیتا ہے۔ انسانی محنت میں اس فرق کی وضاحت حضور ﷺ کی اس حدیث میں ملتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((كُلُّ النَّاسِ يَغْدُوْ فَبَائِعٌ نَفْسَهٗ فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوْبِقُهَا)) [1] ''ہر شخص روزانہ اس حال میں صبح کرتا ہے کہ اپنی جان کا سودا کرتا ہے' پھر یا تو وہ اسے آزاد کرالیتا ہے یا اسے تباہ کر بیٹھتا ہے''۔ کوئی اپنی جسمانی قوت کا سودا کرتا ہے' کوئی ذہنی صلاحیت بیچتا ہے' کوئی اپنی مہارت نیلام کرتا ہے' کوئی اپنا وقت فروخت کرتا ہے۔ غرض اپنے اپنے طریقے اور اپنے اپنے انداز میں ہر شخص دن بھر خود کو بیچتا ہے۔ اب ان میں سے ایک شخص وہ ہے جس نے خود کو بیچتے ہوئے حلال کو مدِنظر رکھا' اُس نے جھوٹ نہیں بولا' کسی کو دھوکہ نہیں دیا' کم معاوضہ قبول کرلیا لیکن حرام سے اجتناب کیا۔ ایسا شخص شام کو لوٹے گا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے شاملِ حال ہوگی۔ اس کے مقابلے میں ایک دوسرے شخص نے بھی دن بھر مشقت کی' مگر حلال وحرام کی تمیز سے بے نیاز ہو کر' معاوضہ اُس نے بھی لیا مگر غلط بیانی کر کے اور دوسروں کو فریب دے کر' ناپ تول میں کمی کر کے اور گھٹیا چیز کو بڑھیا چیز کے دام پر بیچ کر۔ اب یہ شخص جب شام کو گھر آئے گا تو جہنّم کے انگاروں کی گٹھڑی اُٹھائے ہوئے آئے گا۔

اب آئندہ آیات میں انسانی زندگی کے دو راستوں میں سے ہر راستے کے تین اوصاف یا تین سنگ ہائے میل کی نشاندہی کر دی گئی ہے' تاکہ ہر شخص کو معلوم ہو جائے کہ اس نے کون سا راستہ اختیار کیا ہے' اس راستے پر اب وہ کس مقام پر ہے اور اگر وہ مزید آگے بڑھے گا تو آگے کون سی منزل اس کی منتظر ہوگی۔ اس مضمون کے اعتبار سے میں سمجھتا ہوں کہ یہ قرآن مجید کی اہم ترین سورت ہے۔ اب ملاحظہ ہوں ان میں سے پہلے راستے کے تین اوصاف:

آیت ۵ ﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝۵﴾ ''تو جس نے عطا کیا اور تقویٰ اختیار کیا''۔

ظاہر ہے یہ خیر کا راستہ ہے اور اس راستے کا پہلا وصف یا پہلا سنگ میل ''اعطاء'' یا انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ سورۃ البلد میں اس عمل کو انسان کے لیے ایک بہت مشکل گھاٹی قرار دے کر اس کی وضاحت یوں فرمائی گئی: ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ ۝۱۳ اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ۝۱۴ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝۱۵ اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝۱۶ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ...﴾ ''کسی گردن کا چھڑا دینا۔ یا کھانا کھلا دینا بھوک کے دن' اُس یتیم کو کہ جو قرابت دار بھی ہے' یا اُس محتاج کو جو مٹی میں رُل رہا ہے۔ پھر وہ شامل ہوا ان لوگوں میں جو ایمان لائے.....''

یعنی جو انسان اس ''مشکل گھاٹی'' کو عبور کرنے کے بعد اہلِ ایمان کی صف میں شامل ہوگا وہ ان شاء اللہ ابوبکر صدّیق' عمر فاروق' عثمان غنی اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم کا پیروکار بنے گا۔ لیکن جس نے یہ امتحان پاس کیے بغیر ہی کلمہ پڑھ لیا تو اس کے بارے میں خدشہ ہے کہ

---

[1] صحیح مسلم' کتاب الطھارۃ' باب فضل الوضوء۔

توحید و رسالت کی گواہی دینے کے بعد بھی اس کے ایمان کی بُو باس عبداللہ بن اُبَی کے ایمان کی سی ہوگی۔ ظاہر ہے جو کلمہ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم نے پڑھا تھا وہی کلمہ عبداللہ بن اُبَی نے بھی پڑھا تھا۔ یعنی ایمان کا بیج تو دونوں طرف ایک سا تھا' مگر یہ زمین اور تھی' وہ زمین اور تھی۔ اس زمین میں انفاق فی سبیل اللہ کا ہل چل چکا تھا اور اُس زمین میں حُبِ دنیا اور شکوک و تردّد کے جھاڑ جھنکاڑ نے قبضہ جما رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عبداللہ بن اُبَی کے دل کی زمین میں ایمان کے بیج کا جماؤ ممکن ہی نہ ہوا۔ اس حوالے سے اگر سورۂ آل عمران کی آیت ۹۲ کے اس جملے کو مدِنظر رکھا جائے تو انفاق و اِعطاء کے اس فلسفے کو سمجھنا بہت آسان ہو جاتا ہے: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ﴾ یعنی جب تک تم لوگ اپنی عزیز ترین چیز کو اللہ کی راہ میں نہ دے ڈالو تم نیکی کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا چاہیے تو مال کی قربانی دو اور قربانی بھی بہترین چیز کی۔ یہ نہیں کہ چھانٹ کر بے کار چیزیں کسی کو دے کر سمجھو کہ تم نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماردی ہے۔

اس راستے کا دوسرا وصف یا سنگِ میل تقویٰ (وَاتَّقٰى) ہے۔ یعنی انسان کا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرتے رہنا۔ ہر لحہ برائی کی خاردار جھاڑیوں سے اپنا دامن بچانے کی فکر میں رہنا اور مسلسل کوشش کرتے رہنا کہ میں کسی کا دل نہ دکھاؤں اور کسی کا حق نہ ماروں۔ لیکن یہ تبھی ممکن ہے جب انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ وہ اخلاقی حس زندہ و بیدار ہو جس کا ذکر سورۃ الشمس کی آیت ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸﴾ میں آیا ہے۔ اگر اس کی اخلاقی حس کی شمع ہوا و ہوس کے طوفان کی نذر ہو چکی ہو تو پھر ظاہر ہے کہاں کا تقویٰ اور کس کا ڈر!

آیت ۶ ﴿وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝۶﴾ ''اور اُس نے تصدیق کی اچھی بات کی۔''

یہ خیر کے راستے کی تیسری شرط یا اس کا تیسرا وصف ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب بھلائی اور حق کی کوئی بات انسان کے سامنے آئے اور اس کا دل گواہی دے دے کہ ہاں یہ بات حق ہے تو وہ بلا تردّد اس کی تصدیق کر دے۔ یعنی وہ بھلائی' سچائی اور حق کی تصدیق کرنے کے لیے عواقب و نتائج کی پروا نہ کرے۔ حق کو حق جان کر اس کی تصدیق و توثیق کے لیے سود و زیاں کا ترازو نصب کر کے نہ بیٹھ جائے اور نہ ہی اس حوالے سے اپنی انا کو آڑے آنے دے۔ جیسے کہ ہماری روزمرہ کی زندگی میں اکثر ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کی بحث کے دوران ایک آدمی پر واضح ہو جاتا ہے کہ دوسرے کی بات درست ہے مگر وہ صرف اپنی انا کی وجہ سے اس کے موقف کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

آیت ۷ ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝۷﴾ ''تو اُس کو ہم رفتہ رفتہ آسان منزل (جنت) تک پہنچا دیں گے۔''

اس حوالے سے سورۃ الاعلیٰ کی یہ آیت بھی ذہن میں تازہ کر لیجیے: ﴿وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝۸﴾ ''اور ہم رفتہ رفتہ پہنچائیں گے آپ کو آسان منزل تک''۔ لیکن سورۃ الاعلیٰ کی نسبت یہاں یہ مضمون زیادہ واضح انداز میں آیا ہے۔ اب اس کے مقابلے میں اگلی آیات میں دوسرے راستے اور اس کے تین سنگ ہائے میل کا ذکر آ رہا ہے:

آیت ۸ ﴿وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ﴾ ''اور جس نے بخل کیا''

پہلی تین خصوصیات کی ترتیب ذہن میں رکھیے اور نوٹ کیجیے کہ ''اِعطاء'' کے مقابلے میں یہاں بخل آ گیا ہے۔

﴿وَاسْتَغْنٰى ۝۸﴾ ''اور بے پروائی اختیار کی۔''

بھلائی اور خیر کے راستے کی تین خصوصیات میں اِعطاء کے بعد تقویٰ یعنی پھونک پھونک کر قدم رکھنے اور ذِمہ داری کے احساس کا بیان تھا۔ اس کے مقابلے یہاں لاأبالی پن' لاپرواہی اور بے نیازی (استغناء) کا تذکرہ ہے۔ گویا ایک شخص حلال وحرام کی تمیز سے ناآشنا اور نیکی و بدی کے تصور سے بیگانہ اپنی دُھن میں مست چلا جا رہا ہے۔ کسی کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے تو اُس کی بلا سے' کسی کی عزّت پر حرف آتا ہے تو آتا رہے' کسی کے جان و مال کی حرمت پامال ہوتی ہے تو بھی پروا نہیں! غرض اپنی سوچ ہے' اپنی مرضی ہے اور اپنے کام سے کام ہے: ؎

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے!

آیت ۹ ﴿وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝۹﴾ ''اور جھٹلا دیا اچھی بات کو۔''

یعنی اُس کے دل نے گواہی دے دی کہ یہ سچ اور حق بات ہے لیکن اس کے باوجود اس نے تعصب یا تکبر یا ہٹ دھرمی یا مفاد یا کسی خوف کی وجہ سے اسے جھٹلا دیا۔ واضح رہے اس آیت کا تقابل آیت ۶ (وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝۶) کے ساتھ ہے۔

آیت ۱۰ ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝۱۰﴾ ''تو اُس کو ہم رفتہ رفتہ مشکل منزل (جہنّم) تک پہنچا دیں گے۔''

یہ ہیں انسانی کوشش اور مشقت کے دو رخ۔ گویا پہلی تین شرائط کو اپنانے کا راستہ صِدقِ یقین اور شہداء کا راستہ ہے۔ اگر کسی نے کوشش کی لیکن وہ مذکورہ تینوں شرائط کو کما حقہ پورا نہ کر سکا تو اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کوشش اور اخلاص کے مطابق ہوگا۔ لیکن جس بدقسمت شخص کی کوشش اور محنت میں ان تینوں اوصاف کا فقدان ہوا اور وہ ان کے مقابلے میں عمر بھر دوسرے راستے (بخل' استغناء اور تکذیب) پر گامزن رہا' ظاہر ہے اس کا شمار ان بدترین لوگوں کے گروہ میں ہوگا جس کے سرغنہ ابولہب اور ابوجہل ہیں۔

یہاں ضمنی طور پر یہ بھی جان لیجیے کہ ابوجہل کے مقابلے میں ابولہب کا کردار کہیں زیادہ گھٹیا اور مذموم تھا' بلکہ قرآن مجید نے جس انداز میں اس کی مذمت کی ہے اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے گروہ کا بدترین فرد تھا۔ بزدلی' بخیلی اور حد سے بڑھی ہوئی خودغرضی اس کے کردار کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ اُس کے بخل اور مال کو سینت سینت کر رکھنے کا ذکر سورۃ اللّہب میں بھی آیا ہے۔ اس کی بزدلی اور خودغرضی کا پول اُس وقت کھلا جب اس کے سامنے اپنے ''دین'' کے لیے جنگ کرنے کا مرحلہ آیا' اُس وقت اس نے اپنی جگہ کرائے کے دو سپاہیوں کو لڑنے کے لیے بھیج دیا۔ اس کے مقابلے میں ابوجہل صاف گو' بہادر اور اپنے نظریے پر مرمٹنے والا شخص تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنے باطل دین کی خاطر بڑے فخر سے گردن کٹوائی۔ انگریزی کی مثل ہے: "give the devil his due" یعنی شیطان کے کردار میں بھی اگر کوئی مثبت خصوصیت ہو تو اس کے اعتراف میں کوئی حرج نہیں۔ ظاہر ہے اس کی شخصیت میں آخر کوئی تو خوبی تھی جس کی بنا پر حضور ﷺ نے اپنی خصوصی دعا میں اُسے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک ہی پلڑے میں رکھا تھا۔ حضور ﷺ نے تو ان دونوں شخصیات کے لیے برابر کی دعا کی تھی کہ اے اللہ! عمر بن الخطاب اور عمرو بن ہشام میں سے کسی ایک کو میری جھولی میں ڈال دے! حضور ﷺ کی اس دعا کی روشنی میں تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر ابوجہل ایمان لے آتا تو وہ حضرت عمرؓ کے پائے کا مسلمان ہوتا' نہ کہ عبداللہ بن اُبَی کے کردار والا مسلمان۔

بہرحال ان آیات میں انسان کی کامیابی اور ناکامی کے معیار اور اوصاف کی واضح طور پر نشاندہی کر دی گئی ہے۔ جو انسان اپنی سیرت و شخصیت کی بنیاد پہلے تین اوصاف (بحوالہ آیت ۵ اور ۶) پر رکھے گا وہ' ان شاء اللہ' کامیابی سے ہمکنار ہوگا اور جو آخری تین

اوصاف (بحوالہ آیت ۸ اور ۹) کا انتخاب کرے گا وہ بدترین خلائق قرار پائے گا۔

آیت ۱۱ ﴿وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ۝۱۱﴾ ''اور اُس کا مال اس کے کچھ کام نہیں آئے گا جب وہ (جہنم کے) گڑھے میں گرے گا۔''

آیت ۱۲ ﴿اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۝۱۲﴾ ''(دیکھو انسانو!) یقیناً ہمارے ذِمّے ہے ہدایت پہنچا دینا۔''

اپنے مضمون کے اعتبار سے یہ بہت اہم آیت ہے۔ اس میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ انسان کو سیدھا راستہ دکھانا اور ''ہدایت'' اس تک پہنچانا اللہ تعالیٰ کے ذِمّہ ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو جبلّی ہدایت بھی عطا کی ہے' اُس کے نفس کے اندر اخلاقی حس بھی الہام کر دی ہے۔ اس کے اندر اپنی روح بھی پھونکی ہے جو اللہ تعالیٰ کی معرفت اور محبت کی امین ہے اور پھر اس ہدایت و معرفت کی تکمیل کے لیے اس نے دنیا میں پیغمبر بھی بھیجے اور کتابیں بھی نازل کیں۔ گویا اللہ تعالیٰ نے کئی ذرائع سے انسان کو راہِ ہدایت دکھانے کا اہتمام فرما دیا ہے۔

آیت ۱۳ ﴿وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ۝۱۳﴾ ''اور ہمارے ہی لیے ہے اختیار آخرت کا بھی اور دنیا کا بھی۔''

ظاہر ہے آخرت میں اللہ تعالیٰ ہی یہ فیصلہ کرے گا کہ کون انسان کامیاب ہوا ہے اور کون ناکام رہا ہے۔ اور دنیا میں بھی وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کون سی قوم اب اُس کی زمین پر بوجھ بننے جا رہی ہے اور اس طرح کے کس بوجھ سے کس وقت اس نے زمین کو آزاد کرنا ہے۔ گزشتہ سورت (سورۃ الشمس) میں قومِ ثمود کے بارے میں اللہ کے ایسے ہی ایک فیصلے کا ذکر ہم بایں الفاظ پڑھ آئے ہیں: ﴿فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۝۱۴﴾ ''تو الٹ دیا اُن پر عذاب اُن کے ربّ نے اُن کے گناہ کی پاداش میں اور سب کو برابر کر دیا''۔ یعنی جب اُس قوم کے پاس اللہ تعالیٰ کا رسولؑ واضح نشانیوں کے ساتھ آ گیا' پھر اللہ کے رسولؑ نے اللہ کا پیغام پہنچا کر اور اپنے کردار و عمل کا نمونہ پیش کر کے اس قوم پر اتمامِ حُجّت کر دیا۔ اس کے بعد بھی جب وہ قوم کفر اور سرکشی پر اڑی رہی تو انہیں ایسے ملیامیٹ کر دیا گیا جیسے کسی باغ کی صفائی کے لیے اس کا سارا کوڑا کرکٹ جمع کر کے اسے آگ لگا دی جاتی ہے۔

آیت ۱۴ ﴿فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ۝۱۴﴾ ''دیکھو! مَیں نے تمہیں خبردار کر دیا ہے بھڑکتی ہوئی آگ سے۔''

جہنم تو بھوکے شیر کی طرح اپنے شکار کی تاک میں ہے: ﴿نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝۱۶ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ۝۱۷﴾ (المعارج) ''وہ کلیجوں کو کھینچ لے گی۔ وہ پکارے گی ہر اُس شخص کو جس نے پیٹھ موڑ لی تھی اور رخ پھیر لیا تھا۔''

آیت ۱۵ ﴿لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ۝۱۵﴾ ''نہیں پڑے گا اس میں مگر وہ جو انتہائی بدبخت ہے۔''

ظاہر ہے جس انسان کو آخری رسول (ﷺ) کے آ جانے کے بعد بھی حقیقت نظر نہ آئی اس سے بڑا بدبخت اور کون ہو سکتا ہے اور اس سے زیادہ جہنم کے گڑھے میں گرنے کا مستحق کون ہو سکتا ہے؟ کیونکہ اگر کوئی شخص اندھیرے میں یا کم روشنی میں ٹھوکر کھا جائے تو اس کی ٹھوکر کا پھر بھی کچھ نہ کچھ جواز بنتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص دن کی روشنی میں اس وقت راستہ پہچاننے سے انکار کر دے جب سورج نصف النہار پر چمک رہا ہو تو ظاہر ہے اس کے لیے وہ خود ہی قصوروار ہو گا۔

آیت ۱۶ ﴿الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝۱۶﴾ ''جس نے جھٹلایا اور مُنہ پھیر لیا۔''

آیت ۱۷ ﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝۱۷﴾ ''اور بچا لیا جائے گا اس سے جو انتہائی متقی ہے۔''

اس آیت کے بارے میں تقریباً تمام مفسرین متفق ہیں کہ اس کے مصداق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ کیونکہ قبل ازیں آیت ۵ اور ۶ میں جن تین اوصاف کا ذکر ہوا ہے وہ اس اُمت کی جس شخصیت میں بتمام و کمال نظر آتے ہیں وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شخصیت ہے۔

''تصدیق بالحسنیٰ'' کے حوالے سے آپؓ کے بارے میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ میں نے جس کسی کو بھی دعوت دی اس نے کچھ نہ کچھ توقف ضرور کیا' سوائے ابوبکرؓ کے۔ انؓ کے سامنے جونہی میں نے اپنی نبوت کا ذکر کیا وہ فوراً مجھ پر ایمان لے آئے۔ آپؓ کے تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ زمانہ جاہلیت میں بھی آپؓ توحید پر کاربند اور بُت پرستی سے دور رہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے میں بھی آپؓ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ آپؓ نے کئی نادار خاندانوں کی کفالت مستقل طور پر اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ مکہ کے بہت سے غلاموں اور لونڈیوں کو آپؓ نے منہ مانگی قیمت میں خرید کر آزاد کرایا تھا اور غزوۂ تبوک کے موقع پر تو آپؓ نے اپنا پورا اثاثہ لاکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈھیر کر دیا تھا۔ غرض مذکورہ تینوں اوصاف بدرجۂ اتم اُمت کے مَردوں میں آپؓ کی شخصیت میں' جبکہ خواتین میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی شخصیت میں پائے جاتے ہیں۔

آیت ۱۸ ﴿الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝۱۸﴾ ''جو اپنا مال دیتا ہے اپنے (نفس) کو پاک کرنے کے لیے۔''

یعنی مال خرچ کرتے ہوئے دنیاداری کا کوئی مفاد اس کے پیش نظر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو آزاد کرانے کے لیے اُمیہ بن خلف کو جب منہ مانگی قیمت ادا کی تو اس پر اُمیہ خود بھی حیران رہ گیا۔ دوسری طرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والد حضرت ابوقحافہ رضی اللہ عنہ (آپؓ فتح مکہ کے بعد ایمان لائے تھے) نے بھی آپؓ سے گلہ کیا کہ اتنی بڑی رقم تم نے کسی طاقتور غلام پر کیوں نہ خرچ کی جو تمہارے کام بھی آتا! (اُس زمانے میں اگر کوئی شخص کسی غلام کو آزاد کراتا تھا تو وہ غلام زندگی بھر اُسی شخصیت کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا اور اخلاقی لحاظ سے بھی وہ اس کے تابع رہتا تھا۔ عرب رواج کے مطابق ایسے آزاد کردہ غلام کو متعلقہ شخصیت کا مولیٰ کہا جاتا تھا' جیسے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مولیٰ تھے۔) بہرحال مال خرچ کرنے کا یہ فلسفہ ان لوگوں کی سمجھ سے بالا ہے جن کی نظر ہر وقت دنیا کے مفادات پر رہتی ہے۔

آیت ۱۹ ﴿وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝۱۹﴾ ''اور اس کے ذمے کسی کا احسان نہیں جس کا وہ بدلہ چکا رہا ہو۔''

آیت ۲۰ ﴿اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝۲۰﴾ ''بلکہ (وہ تو خرچ کر رہا ہے) صرف اپنے بلند و برتر پروردگار کی رضا جوئی کے لیے۔''

آیت ۲۱ ﴿وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝۲۱﴾ ''اور وہ عنقریب راضی ہو جائے گا۔''

یہاں پر یَرْضٰی کی ضمیر کا اشارہ بیک وقت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہے اور اُس شخصیت کی طرف بھی جس کی صفات کا ذکر ان آیات میں ہو رہا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بھی راضی ہو جائے گا اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی راضی ہو جائیں گے۔ گویا یہ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ جیسی بشارت ہے کہ اگر اللہ کا یہ بندہ اپنا مال صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے لٹا رہا ہے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس سے راضی ہو جائے گا اور پھر اللہ تعالیٰ اس کو آخرت میں اتنا کچھ عطا کرے گا کہ وہ بھی خوش ہو جائے گا۔ یہاں یہ اہم نکتہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ

معنوی اعتبار سے اس آیت کا اگلی سورت (سورۃ الضحیٰ) کی آیت ۵ کے ساتھ خصوصی ربط و تعلق ہے جس کی وضاحت سورۃ الضحیٰ کے مطالعہ کے دوران کی جائے گی۔

یہاں پر زیر مطالعہ سورتوں (سورۃ الشمس، سورۃ اللیل، سورۃ الضحیٰ اور سورۃ الانشراح) کے مرکزی مضمون کے اہم نکات ایک دفعہ پھر اپنے ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ سورۃ الشمس کی ابتدائی آٹھ آیات قسموں پر مشتمل ہیں۔ اس کے بعد مُقسَم علیہ کے طور پر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ نفسِ انسانی کے اندر نیکی اور بدی کا شعور ودیعت کر دیا گیا ہے، اور پھر اس کے بعد دو آیات میں اس حوالے سے کامیابی اور ناکامی کا معیار بھی بتا دیا گیا ہے: ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝۹ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝۱۰﴾ کہ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا وہ کامیاب ٹھہرا اور جس نے اسے مٹی میں دفن کر دیا وہ ناکام ہو گیا۔ اگلی سورت یعنی سورۃ اللیل میں نفس کو سنوارنے اور بگاڑنے کے طریقوں یا راستوں کے بارے میں مزید وضاحت کر دی گئی ہے کہ جو انسان اِعطائے مال، تقویٰ اور تصدیق بالحسنیٰ کے اوصاف اپنائے گا وہ صدقِ یقیت اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے راستے پر گامزن ہو جائے گا۔ اس کے برعکس بخل، استغناء (حلال وحرام اور جائز وناجائز سے متعلق لاپرواہی) اور حق کی تکذیب کی راہ پر چلنے والا انسان بالآخر خود کو جہنّم کے گڑھے میں گرائے گا۔ پھر کامیابی کے راستے کی مثال کے طور پر اُمّت کی ایک ایسی شخصیت کی طرف اشارہ بھی کر دیا گیا جسے پہلے تین اوصاف کو اپنانے کے باعث اعلیٰ مدارج و مراتب سے نوازا گیا۔ لیکن ظاہر ہے اس منزل کا بلند ترین مقام تو محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے مختص ہے جو معراجِ انسانیت ہیں۔ چنانچہ اس مضمون کے حوالے سے اب اگلی دو سورتوں کا تعلق خصوصی طور پر حضور ﷺ کی ذاتِ اَقدس سے ہے۔ اسی نسبت سے ان سورتوں کا مطالعہ سیرت النبی ﷺ کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے بھی مفید ہے۔ متقدمین میں سے تصوّف کا ذوق رکھنے والے اکثر مفسّرین نے ان سورتوں میں بعض باطنی حقائق کی نشاندہی بھی کی ہے۔ (متعلقہ آیات کے مطالعہ کے دوران جہاں جس حد تک ممکن ہوا ایسے کچھ نکات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔) ظاہر ہے موجودہ دور کے ''عقلیت پسند'' مفسّرین نہ تو تصوّف کا ذوق رکھتے ہیں اور نہ ہی انہیں ایسے موضوعات سے دلچسپی ہے۔ (الّا ماشاء اللہ!)

سُوْرَۃُ الضُّحٰی

تمہیدی کلمات

سورۃ الضحیٰ کے شانِ نزول سے متعلق مختلف روایات میں جو تفصیل ملتی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتدائے بعثت میں حضور ﷺ پر نزولِ وحی کا سلسلہ کچھ عرصہ جاری رہا اور پھر اچانک رُک گیا۔ جب یہ وقفہ زیادہ طویل ہوا تو اس کا علم آپ ؐ کے مخالفین کو بھی ہو گیا۔ (واضح رہے کہ یہ وقفہ اس وقفے کے علاوہ تھا جو پہلی وحی کے بعد آیا تھا اور جس کا ذکر سیرت کی کتابوں میں عام طور پر ''فترتِ وحی'' کے نام سے ملتا ہے۔) ظاہر ہے حضور ﷺ ہر نئی وحی کا کلام لوگوں کو سناتے تھے۔ جب آپ ؐ نے کافی دنوں تک لوگوں کو قرآن مجید کا کوئی نیا حصہ نہ سنایا تو لوگ سمجھ گئے کہ نزولِ وحی کا سلسلہ رک گیا ہے۔ کچھ روایات میں اس کی وضاحت یوں بھی آئی ہے کہ اس دوران علالتِ طبع کے باعث آپ ؐ چند راتوں تک قیام اللیل کے لیے نہ اُٹھ سکے تو ابولہب کی بیوی اُمّ جمیل' جس کا مکان حضور ﷺ کے مکان سے متصل تھا' آ کر کہنے لگی کہ مَیں دیکھتی ہوں کہ تمہارے شیطان نے تمہیں چھوڑ دیا ہے! بہرحال مشرکین کو جب معلوم ہوا کہ نزولِ وحی کا سلسلہ بند ہو گیا ہے تو انہوں نے آپ ؐ کو طعنے دینے شروع کر دیے کہ محمد (ﷺ) کو خدا تعالیٰ نے چھوڑ دیا ہے اور وہ اس سے ناراض ہو گیا ہے۔

یہ کیفیت خود حضور ﷺ کے لیے بھی بے حد پریشان کن اور ناقابلِ برداشت تھی۔ وحی آپ ؐ کی روح کی غذا تھی۔ ہر نئی وحی سے آپ ؐ کی روح کو تازگی ملتی تھی۔ اس کے علاوہ آپ ؐ کو بار بار یہ خیال بھی آتا تھا کہ شاید مجھ سے کہیں کوئی خطا ہوئی ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو گیا ہے۔ لوگوں کے طعنے اس کے علاوہ تھے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ اس دوران شدید رنج و غم کی وجہ سے کبھی کبھی میرا جی چاہتا تھا کہ مَیں کسی پہاڑ پر چڑھ کر خود کو نیچے گرا دوں۔ بہرحال اس پس منظر میں یہ سورت نازل ہوئی اور اس کی آیت ۳ میں خصوصی طور پر آپ ؐ کو تسلی دی گئی کہ آپ ؐ کے رب نے نہ تو آپ ؐ کو چھوڑا ہے اور نہ ہی وہ آپ ؐ سے ناراض ہوا ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ روحانی انقباض کی کیفیت میں اس سورت کا پڑھنا تریاق کا درجہ رکھتا ہے۔ تصوّف کی زبان میں قبض یا انقباض انسان کی اس روحانی کیفیت کا نام ہے جب اس کی طبیعت میں ناامیدی اور بندش سی آ جاتی ہے اور اسے ہر معاملے کا تاریک و منفی رخ ہی سوجھتا ہے۔ اس کے مقابلے میں انسان کی مثبت روحانی کیفیت کو تصوّف کی اصطلاح میں ''بسط'' کہا جاتا ہے۔ یہ انسان کی وہ روحانی کیفیت ہے جس میں اسے اپنی طبیعت میں انشراح محسوس ہوتا ہے اور ہر معاملے کا روشن اور مثبت پہلو نظر آتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے نفسیاتی طور پر انسان کے مزاج کے دو رخ ہیں۔ کبھی انسان کی طبیعت ہشاش بشاش اور ہنسنے کھیلنے پر آمادہ ہوتی ہے اور کبھی وہ غمگین و افسردہ ہوتا ہے۔

سُوْرَةُ الضُّحٰى مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۱۱ رُكُوْعُهَا: ۱

وَالضُّحٰى ۙ﴿۱﴾ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ﴿۲﴾ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ؕ﴿۳﴾ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ
الْاُوْلٰى ؕ﴿۴﴾ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ؕ﴿۵﴾ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۪﴿۶﴾ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا
فَهَدٰى ۪﴿۷﴾ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ؕ﴿۸﴾ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ؕ﴿۹﴾ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ؕ﴿۱۰﴾
وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴿۱۱﴾

آیت ۱ ﴿وَالضُّحٰى ۙ﴿۱﴾﴾ ''قسم ہے دھوپ چڑھنے کے وقت کی۔''

آیت ۲ ﴿وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ﴿۲﴾﴾ ''قسم ہے رات کی جبکہ وہ سکون کے ساتھ چھا جائے۔''

رات میں اندھیرا اور سکون ہے' جبکہ دن اُجالے اور حرکت کا مظہر ہے۔ ان دو آیات میں رات اور دن کی متضاد خصوصیات کو اس فرمان پر بطور شہادت پیش کیا گیا کہ:

آیت ۳ ﴿مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ؕ﴿۳﴾﴾ ''آپؐ کے ربّ نے آپؐ کو رخصت نہیں کیا اور نہ ہی وہ آپؐ سے ناراض ہوا ہے۔''

یعنی وحی کے تسلسل میں یہ وقفہ اس وجہ سے نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ آپؐ سے ناراض ہو گیا ہے' بلکہ یہ وقفہ ہماری حکمت و مشیت کا حصہ اور آپؐ کی تربیت کا جزو تھا۔ ظاہر ہے نظامِ کائنات میں دن کے اُجالے کے ساتھ رات کی تاریکی کا وجود بھی ناگزیر ہے۔ چنانچہ جس طرح دن کے بعد رات کا آنا ضروری ہے اسی طرح نفسِ انسانی کے لیے بسط و کشاد کی لذت کے ساتھ ساتھ ''انقباض'' کی کیفیت سے آشنا ہونا بھی ضروری ہے۔

آیت ۴ ﴿وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ؕ﴿۴﴾﴾ ''اور یقیناً بعد کا وقت آپؐ کے لیے بہتر ہوگا پہلے سے۔''

یعنی اس وقفے اور 'انقباض' کی کیفیت کے بعد آنے والی اب ہر گھڑی اور ہر ساعت آپؐ کے لیے 'انبساط' اور انشراح کا نیا پیغام لے کر آئے گی۔ ان آیات میں انقباض و انبساط کے حوالے سے جو اصول بیان ہوا ہے اس کی حیران کن حد تک درست ترجمانی غالب نے اپنے اس مصرع میں کی ہے: ع ''رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور!'' یعنی اشعار کی آمد کے حوالے سے کبھی کبھی مجھ پر انقباض کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے' لیکن جب اس وقفے کے بعد دوبارہ آمد شروع ہوتی ہے تو پھر میری طبیعت کی روانی پہلے سے بھی کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ گویا انقباض کے بعد جب انبساط کا مرحلہ آتا ہے تو انسان اپنی پہلی کیفیت کے مقابلے میں ایک درجہ آگے جا چکا ہوتا ہے۔

[اس آیت مبارکہ سے یہ مفہوم بھی متبادر ہوتا ہے کہ ''یقیناً ہر آنے والی گھڑی آپؐ کے لیے پہلی سے (بدرجہا) بہتر ہے''۔ آپؐ پر آپؐ کے رب کے لطف و کرم اور انعام و احسان کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ ہر آنے والا وقت گزشتہ حالات سے بہتر سے بہتر ہوگا۔ اس ایک جملہ میں کُفار کے طعن و تشنیع اور الزام تراشیوں کا بھی سدِّ باب کر دیا گیا اور اسلام کے درخشاں مستقبل کے بارے میں بھی نویدِ جانفزا سنا دی گئی۔]

آیت ۵ ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝۵﴾ ''اور عنقریب آپؐ کا رب آپؐ کو اتنا کچھ عطا فرمائے گا کہ آپؐ راضی ہو جائیں گے۔''

یعنی اب بہت جلد آپ ﷺ کی محنتوں کے ایسے ایسے نتائج آپؐ کے سامنے آئیں گے کہ انہیں دیکھ کر آپؐ خوش ہو جائیں گے۔(۱)

یہاں پر پچھلی سورت کی آخری آیت کے یہ الفاظ بھی ذہن میں تازہ کر لیں: ﴿وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝۲۱﴾ گویا جو خوشخبری یہاں حضور ﷺ کو سنائی جا رہی ہے وہی بشارت سورۃ اللیل میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دی گئی ہے۔ دونوں آیات کا اسلوب اصلاً ایک سا ہے' صرف ضمیر اور صیغے کا فرق ہے۔ حضور ﷺ پر چونکہ وحی آتی تھی اس لیے آپؐ کو صیغہ حاضر (تَرْضٰى) میں براہِ راست مخاطب کیا گیا' جبکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے غائب کا صیغہ (يَرْضٰى) آیا ہے۔

''انقباض'' کی مذکورہ کیفیت کے سیاق و سباق میں اب اللہ تعالیٰ حضور ﷺ پر اپنے احسانات جتا رہا ہے۔ یہ بھی دراصل حضور ﷺ کے لیے تسلی ہی کا ایک انداز ہے۔ جبکہ اس میں ہمارے لیے بھی راہنمائی ہے کہ جب کسی وقت آدمی پر ڈپریشن اور افسردگی کی کیفیت طاری ہو تو اسے چاہیے کہ اس کیفیت میں وہ خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ کے احسانات کو گن گن کر یاد کرے کہ اللہ تعالیٰ کس کس انداز میں اس کی مدد کرتا رہا ہے اور کیسی کیسی مشکلات سے اسے نجات دلاتا رہا ہے۔ ظاہر ہے ماضی کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے احسانات یاد کرنے سے ایک پریشان حال آدمی کا حوصلہ بڑھتا ہے اور اس کی مثبت سوچ کو تحریک ملتی ہے۔

آیت ۶ ﴿اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝۶﴾ ''کیا اُس نے نہیں پایا آپؐ کو یتیم' پھر پناہ دی!''

یہ آیات سیرت النبی ﷺ کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے حوالے سے بھی بہت اہم ہیں۔ حضور ﷺ کے والد آپؐ کی پیدائش سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے' چنانچہ آپؐ پیدا ہی یتیمی کی حالت میں ہوئے۔ چھ سال کی عمر میں والدہ کا سہارا بھی چھن گیا۔ دادا نے اپنی کفالت میں لیا تو دو سال بعد وہ بھی چھوڑ کر چلے گئے۔ تایا زبیر بن عبدالمطلب سرپرست بنے تو کچھ عرصہ بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا (حضور ﷺ کی کفالت کے حوالے سے آپؐ کے تایا زبیر بن عبدالمطلب کا ذکر اکثر تاریخی حوالوں میں موجود ہی نہیں۔ ایسا دراصل جناب ابوطالب کے کردار کو زیادہ نمایاں کرنے کے لیے جان بوجھ کر باقاعدہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا گیا ہے)۔ اس کے بعد جناب ابوطالب نے آپ ﷺ کے سر پر دستِ شفقت رکھا اور انہی کی سرپرستی میں آپؐ جوانی کی عمر کو پہنچے۔ آیت کے لفظ ''فَاٰوٰى'' میں ان تمام دنیوی سہاروں کی طرف اشارہ ہے جو ظاہر ہے آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے فراہم کیے تھے اور اللہ تعالیٰ

۱۔ علامہ سید محمد آلوسی رحمہ اللہ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

(ترجمہ) ''یہ اللہ تعالیٰ کا کریمانہ وعدہ ہے جو ان تمام عطیات کو شامل ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو دنیا میں سرفراز فرمایا۔ یعنی کمالِ نفس' اولین و آخرین کے علوم' اسلام کا غلبہ' دین کی سربلندی' ان فتوحات کے باعث جو عہدِ رسالت میں ہوئیں اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں ہوئیں یا دوسرے مسلمان بادشاہوں نے حاصل کیں اور اسلام کا دنیا کے مشارق و مغارب میں پھیل جانا۔ نیز یہ وعدہ ان عنایات اور عزت افزائیوں کو بھی شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب مکرم ﷺ کے لیے آخرت کے لیے محفوظ رکھی ہیں' جن کی حقیقت اور نہایت کو اللہ تعالیٰ کے بغیر اور کوئی نہیں جان سکتا۔'' (بحوالہ تفسیر ضیاء القرآن' از پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ)

نے ہی ان تمام رشتہ داروں کے دلوں میں آپؐ کے لیے محبت اور چاہت پیدا کی تھی۔ اسی نے آپؐ کی شخصیت ایسی بنائی تھی کہ جو کوئی آپؐ کو دیکھتا آپؐ کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی بچپن میں سہارا دیا تھا۔ سورۂ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ کی اس قدرت اور حکمت کا ذکر اس طرح آیا ہے: ﴿وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ﴾ (آیت ۳۹) کہ اے موسیٰؑ میں نے آپ پر اپنی محبت کا پرتو ڈال دیا تھا' جس کی وجہ سے لوگ آپؑ کو دیکھ کر متاثر ہو جاتے تھے اور یوں وہ آپؑ کو قتل کرنے سے باز رہے۔

آیت ۷ ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۷﴾ ''اور آپؐ کو تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو ہدایت دی!''

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم شعور کی پختگی کی عمر کو پہنچے اور آپؐ نے کائنات کے حقائق کے بارے میں غور و فکر کرنا شروع کیا تو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے آپؐ کو راہنمائی فراہم کر دی۔ (۲)

آیت ۸ ﴿وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝۸﴾ ''اور اُس نے آپؐ کو تنگ دست پایا تو غنی کر دیا!''

اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی ساری دولت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈھیر کر دی۔ حضرت خدیجہؓ بہت مال دار اور صاحبِ حیثیت خاتون تھیں۔ مکہ کے بڑے بڑے سردار اُنؓ سے نکاح کے خواہش مند تھے' مگر اللہ تعالیٰ نے اُنؓ کا دل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھیر دیا اور انہوںؓ نے خود آپؐ کو نکاح کا پیغام بھجوایا۔

گزشتہ آیات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے تین مراحل کے حوالے سے تین احسانات کا ذکر کرنے کے بعد اب اسی ترتیب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تین ہدایات دی جا رہی ہیں:

آیت ۹ ﴿فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝۹﴾ ''تو آپؐ کسی یتیم پر سختی نہ کریں۔''

جیسے آپؐ کی یتیمی میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی کفالت وغیرہ کا بندوبست کیا' اسی طرح اب آپؐ بھی یتیموں کی سرپرستی کریں اور انہیں لوگوں کی زیادتیوں سے بچائیں۔

آیت ۱۰ ﴿وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝۱۰﴾ ''اور آپؐ کسی سائل کو نہ جھڑکیں۔''

ایک وقت تھا جب آپؐ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں تھے اور ہم نے آپؐ کو ہدایت عطا فرمائی تھی۔ اب اگر آپؐ کے پاس کوئی سائل اپنی حاجت لے کر آئے تو اُس کی حاجت روائی کریں اور اسے جھڑکیں نہیں۔ ظاہر ہے سائل بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ کوئی

۲۔ اس آیت کی تفسیر میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:

''جب حضرتؐ جوان ہوئے' قوم کے مشرکانہ اطوار اور بے ہودہ رسم و راہ سے سخت بیزار تھے اور قلب میں خدائے واحد کی عبادت کا جذبہ پورے زور کے ساتھ موجزن تھا۔ عشقِ الٰہی کی آگ سینۂ مبارک میں بڑی تیزی سے بھڑک رہی تھی۔ وصول الی اللہ اور ہدایتِ خلق کی اُس اکمل ترین استعداد کا چشمہ جو تمام عالم سے بڑھ کر نفسِ قدسی میں ودیعت کیا گیا تھا' اندر ہی اندر جوش مارتا تھا' لیکن کوئی صاف کھلا ہوا راستہ اور مفصل راستہ اور مفصل دستور العمل بظاہر وکھائی نہ دیتا تھا جس سے اُس عرش و کرسی سے وسیع قلب کو تسکین ہوتی۔ اسی جوشِ طلب اور فرطِ محبت میں آپؐ بے قرار اور سرگرداں پھرتے اور غاروں اور پہاڑوں میں جا کر مالک کو یاد کرتے اور محبوبِ حقیقی کو پکارتے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے غارِ حرا میں فرشتہ کو وحی دے کر بھیجا اور وصول الی اللہ اور اصلاحِ خلق کی تفصیلی راہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کھول دیں' یعنی دینِ حق نازل فرمایا: ﴿مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ الخ﴾ (الشوریٰ:۵۲)

مالی معاونت کے لیے سوال کرتا ہے تو کوئی علم کی تلاش میں لوگوں کے دروازوں پر دستک دیتا ہے۔

آیت ۱۱ ﴿وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝۱۱﴾ ''اور اپنے رب کی نعمت کا بیان کریں۔''

یہ ہدایت جو آپؐ کو عطا ہوئی ہے' یہ آپؐ کے رب کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر شکر کا تقاضا ہے کہ آپؐ اس کی اس نعمت کا چرچا کریں اور اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پھیلائیں۔ اس حکم میں ہمارے لیے بہت بڑا سبق ہے۔ ہدایت کی نعمت کو اگر انسان اپنی ذات تک محدود کر کے بیٹھ رہے تو اس کا یہ طرزِ عمل بخل کے مترادف ہوگا۔ لہٰذا جس کسی کو اللہ تعالیٰ ہدایت کی دولت سے نوازے اسے چاہیے کہ اس خیر کو عام کرے اور اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرے۔

سُوْرَةُ اَلَمْ نَشْرَحْ

سُوْرَةُ اَلَمْ نَشْرَحْ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ٨ رُكُوْعُهَا: ١

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۙ﴿۱﴾ وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۙ﴿۲﴾ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۙ﴿۳﴾ وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ؕ﴿۴﴾ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۙ﴿۵﴾ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ؕ﴿۶﴾ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۙ﴿۷﴾ وَ اِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ﴿۸﴾ ع

آیت ۱ ﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۙ﴿۱﴾﴾ ''کیا ہم نے آپؐ کے لیے آپؐ کے سینے کو کھول نہیں دیا؟''

یعنی ہم نے آپؐ کا اضطراب کم کر کے آپؐ کے دل کو ایک ٹھہراؤ اور سکون عطا فرما دیا ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں: ''اس میں علوم و معارف کے سمندر اُتار دیے اور لوازمِ نبوت اور فرائضِ رسالت برداشت کرنے کو بڑا وسیع حوصلہ دیا۔''

آیت ۲ ﴿وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۙ﴿۲﴾﴾ ''اور ہم نے اُتار نہیں دیا آپؐ سے آپؐ کا وہ بوجھ؟''

آیت ۳ ﴿الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۙ﴿۳﴾﴾ ''جو آپؐ کی کمر کو توڑے دے رہا تھا!''

آیت ۴ ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ؕ﴿۴﴾﴾ ''اور ہم نے آپؐ کے ذکر کو بلند کر دیا ہے۔''[1]

آیت ۵ ﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۙ﴿۵﴾﴾ ''تو یقیناً مشکل ہی کے ساتھ آسانی ہے۔''

آیت ۶ ﴿اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ؕ﴿۶﴾﴾ ''یقیناً مشکل ہی کے ساتھ آسانی ہے۔''

یہ سورت دراصل مشکلات القرآن میں سے ہے۔ آیت ۲ میں جس بوجھ کا ذکر ہوا ہے اس کے بارے میں عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ اس میں حضور ﷺ کی دعوت و تبلیغ کی مشقتوں اور لوگوں کی طرف سے پہنچائی جانے والی اذیتوں کی طرف اشارہ ہے۔ مَیں

۱۔ صحیح ابن حبان، مسند ابی یعلیٰ الموصلی اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت سعد بن مالک اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اتانی جبریل فقال : اِنَّ رَبِّیْ وَرَبُّکَ یَقُوْلُ لَکَ : اَتَدْرِیْ کَیْفَ رَفَعْتُ ذِکْرَکَ؟ قُلْتُ : اَللّٰهُ اَعْلَمُ۔ قَالَ : اِذَا ذُکِرْتُ ذُکِرْتَ مَعِیْ))

''حضرت جبرائیل علیہ السلام میرے پاس آئے اور کہا کہ میرا اور آپ کا رب پوچھتا ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ مَیں نے آپ کے ذکر کو کس طرح بلند کیا ہے؟ مَیں نے جواب دیا: اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ (آپؐ کے رفع ذکر کی کیفیت یہ ہے کہ) جہاں میرا ذکر کیا جائے گا وہاں آپ کا بھی میرے ساتھ ذکر کیا جائے گا۔'' (حاشیہ از مرتب)

سمجھتا ہوں کہ یہ رائے صرف جزوی طور پر درست ہے‘ اس لیے کہ یہ سورت بالکل ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی تھی۔ اس زمانے میں حضور ﷺ کی مشکلات کا ابھی آغاز ہو رہا تھا اور بعد کے زمانے میں آپؐ کو نسبتاً بہت زیادہ مشکل مراحل سے گزرنا پڑا تھا۔ مثلاً شعبِ ابی طالب میں تین سال کی قید کا واقعہ اس سورت کے نزول کے بعد پیش آیا اور اس کے بعد ہی آپؐ کو یومِ طائف اور یومِ اُحد جیسے گمبھیر حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ دعوت و تبلیغ اور آپؐ کے فریضۂ رسالت سے متعلقہ مشکلات بھی اس سورت کے نزول کے بعد کم ہونے کے بجائے مزید بڑھیں‘ بلکہ بڑھتی ہی چلی گئیں۔ اس لیے یہ حقیقت تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہاں جس بوجھ کے اتار دینے کا ذکر ہوا ہے وہ اصل میں کوئی اور بوجھ تھا۔

اس بوجھ کی کیفیت کے بارے میں جاننے کے لیے پہلے اس حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو اپنے قربِ خاص کی نعمت سے نوازتا ہے۔ چنانچہ قربِ خاص کی لذت سے آشنا ہو جانے کے بعد انبیاء و رسل علیہم السلام کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت اسی کیفیت میں گزاریں۔ لیکن وہاں سے حکم ملتا ہے کہ جاؤ خلقِ خدا تک میرا پیغام پہنچاؤ اور انہیں ہدایت کا راستہ دکھاؤ! مثلاً اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر اپنے قربِ خاص سے نوازا اور آپؑ سے کلام فرمایا تو اُس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خواہش تو یہی ہوگی کہ وہ سدا اسی کیفیت میں رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے مکالمے اور مخاطبے کی لذت سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔ لیکن اس کے فوراً بعد آپؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ملا: ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۴۳﴾﴾ (طٰہٰ) ’’اب جاؤ فرعون کی طرف‘ وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے!‘‘ ظاہر ہے فریضۂ رسالت کی ادائیگی کوئی آسان کام تو نہیں۔ اس بارے میں اصل حقیقت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ پیغمبروں کی دعوت کے جواب میں لوگوں کی طرف سے بے اعتنائی برتی جاتی تھی اور طنز و تمسخر کے تیر برسائے جاتے تھے‘ حتیٰ کہ جسمانی اذیت پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا تھا۔ الغرض اس راستے میں تو ہر قدم پر مخالفت اور ہر موڑ پر تکالیف و مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ایسی صورتِ حال میں پیغمبروں کو دوہری مشکل کا سامنا رہا ہے‘ یعنی ایک طرف قرب و حضوری کی خصوصی کیفیت سے باہر آنے کا ملال اور دوسری طرف لوگوں کے رویے کے باعث دل پر تکدر کا بوجھ۔ کہاں وہ قربِ خاص کا کیف و سرور اور کہاں یہ مشقت بھری مصروفیات۔ روح اور طبیعت کا میلان تو ظاہر ہے اسی طرف ہوگا کہ وہی خلوت ہو‘ وہی حضوری ہو اور وہی کیف و سرور ہو۔ غالبؔ نے اپنی زبان اور اپنے انداز میں محبوب کی قربت کے حوالے سے انسان کی اس کیفیت اور خواہش کی ترجمانی یوں کی ہے: ؎

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت‘ کہ رات دن بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے!

اس صورتِ حال یا کیفیت کو علامہ اقبال کے بیان کردہ اس واقعہ کے حوالہ سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبال اپنے خطبات (چوتھے لیکچر) میں فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ دنیا و مافیہا سے بے خبر مراقبے کی کیفیت میں بیٹھے تھے۔ اسی اثنا میں انہیں اقامت کی آواز سنائی دی۔ آپؒ فوراً نماز کے لیے کھڑے تو ہو گئے مگر جھنجھلا کر کہا: ’’حضوری سے نکال کر دربانی میں کھڑا کر دیا!‘‘ اب ظاہر ہے حضوری کی کیفیت میں تو اور ہی لذت تھی جبکہ نماز میں جماعت کا نظم ملحوظ رکھنے کی پابندی ہے اور ہر صورت میں امام کی اقتدا ضروری ہے۔ فرض کریں مقتدی کو تلاوت سننے میں لذت محسوس ہو رہی ہے اور وہ مزید سننا چاہتا ہے لیکن یہاں وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے جب امام قراءت ختم کر کے رکوع میں جائے گا تو اسے اس کی اقتدا کرنا ہوگی۔ اگر وہ دیر تک سجدہ میں ہی پڑے

رہنا چاہتا ہے تو بھی اسے اپنا سجدہ مختصر کر کے امام کی اقتدا میں سر اٹھانا ہوگا۔

اس تمہیدی وضاحت کو مدِنظر رکھتے ہوئے اب آپ حضور ﷺ کی اس کیفیت کا تصور کیجیے جب حضور ﷺ رات کی تنہائی میں اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے ہو کر قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے۔ اُس وقت آپ کی روح کیسی کیسی قربتوں اور رفعتوں سے آشنا ہوتی ہوگی اور آپ کے قلبِ مبارک پر کیسے کیسے انوار و تجلیات کی بارش ہوتی ہوگی۔ پھر صبح کو جب آپ اہلِ مکہ کے درمیان جا کر ان سے شاعر، مجنون، کذاب (نعوذ باللہ) جیسے القابات سنتے ہوں گے اور ان کے تمسخر بھرے جملوں کا سامنا کرتے ہوں گے تو آپ اپنی طبیعت میں کیسا تکدر اور کیسی کوفت محسوس کرتے ہوں گے۔ چنانچہ حضور ﷺ کے لیے اصل معاملہ یہ تھا کہ ''عروج'' (قربِ خاص) کی لذت کے بعد ''نزول'' کا مرحلہ آپ پر بہت شاق گزرتا تھا۔ اور یہی وہ ''بوجھ'' تھا جو آپ کی کمر کو ہرا کیے دے رہا تھا۔ البتہ رفتہ رفتہ آپ کا مزاج جب اس معمول کا خوگر ہو گیا تو اس بوجھ کے احساس میں کمی واقع ہوتی گئی۔ پھر جب روز بروز اہلِ ایمان کی تعداد بڑھنا شروع ہوئی تو دعوت و تحریک کی مصروفیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے تسکین کا سامان پیدا فرما دیا۔

بہرحال یہاں پر یہ نکتہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ فریضۂ رسالت کی انجام دہی کے لیے عروج اور نزول (ان کیفیات کے لیے صوفیاء کے ہاں ''سیر الی اللہ'' اور ''سیر عن اللہ'' کی اصطلاحات بھی معروف ہیں) کی دونوں کیفیات کا بیک وقت باہم متوازی چلنا ضروری ہے۔ اس نکتۂ لطیف کو مولانا رومؒ نے بارش کی مثال سے بہت مؤثر انداز میں سمجھایا ہے۔ مولانا کی بیان کردہ اس حکایت کا خلاصہ یہ ہے کہ سمندر سے بخارات کی شکل میں بالکل صاف اور پاکیزہ پانی فضا میں پہنچتا ہے۔ بارش برستی ہے تو یہ صاف پانی فضا کی کدورتوں کو بھی صاف کرتا ہے، زمین کی گندگیوں کو بھی اپنے ساتھ بہا کر سمندر میں ڈال دیتا ہے اور اس کے بعد سمندر سے پھر بخارات بن کر صاف اور پاکیزہ حالت میں بارش کے لیے فضا میں پہنچ جاتا ہے۔ اس مثال کو حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس پر منطبق کرتے ہوئے یوں سمجھیں کہ حضور ﷺ کو ''سیر الی اللہ'' (قیام اللیل اور خلوت کی مناجات وغیرہ) کے ذریعے روحانی ترفع حاصل ہوتا۔ پھر جب آپ ''سیر عن اللہ'' کی صورت میں معاشرے کی طرف رجوع فرماتے تو آپ کی رحمت اور روحانیت لوگوں پر بارش کی طرح برستی اور راستے میں آنے والی تمام ظاہری و باطنی آلائشوں اور کدورتوں کو دھو ڈالتی۔ اسی دوران لوگوں کی مخالفت اور گھٹیا حرکات کے باعث آپ کی ''روحانیت'' میں کچھ تکدر بھی پیدا ہوتا، جسے ''سیر الی اللہ'' کے اگلے مرحلے میں صاف کر دیا جاتا اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا۔

یہاں ضمنی طور پر یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ نتائج کے اعتبار سے تو دعوت و تبلیغ کی مصروفیات بھی ''سیر الی اللہ'' ہی کے زمرے میں آتی ہیں، لیکن عملی طور پر اس کی کیفیت بظاہر ''سیر عن اللہ'' جیسی ہے۔ جیسے نماز کی حالت میں انسان کا رخ اللہ کی طرف ہوتا ہے لیکن ایک داعی جب نماز سے فارغ ہو کر تبلیغ کے لیے نکلتا ہے تو بظاہر اس کی پشت اللہ کی طرف ہوتی ہے اور رُخ لوگوں کی طرف ہوتا ہے۔

آیت ۷ ﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝۷﴾ ''پھر جب آپ (فرائضِ نبوت سے) فارغ ہو جائیں تو اسی کام میں لگ جایئے۔''

آیت ۸ ﴿وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝۸﴾ ''اور اپنے ربّ کی طرف راغب ہو جایئے۔''

تو اے نبی ﷺ! جب آپ اپنے فرضِ منصبی سے فارغ ہو جائیں اور اللہ کا دین غالب ہو جائے تو پھر آپ یکسو ہو کر اللہ ربّ العزت کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ نوٹ کیجیے! سورۃ النصر میں بھی حضور ﷺ کے لیے بالکل یہی پیغام ہے:

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝۱ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝۲ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ

وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝۳﴾

یعنی جب غلبۂ دین کے حوالے سے آپؐ کا مشن مکمل ہو جائے تو پھر ہمہ تن ہمہ وقت آپؐ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جایئے گا اور تقرب الی اللہ کے لیے محنت شروع کر دیجیے گا۔ چنانچہ جونہی آپؐ کا مشن پایۂ تکمیل کو پہنچا تو آپؐ نے فوراً محبوب کی طرف مراجعت کا فیصلہ کر لیا (اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقَ الْاَعْلٰی) کہ اے اللہ اب مَیں اپنے فرائضِ منصبی سے فارغ ہو گیا ہوں' اب مجھ میں مزید انتظار کا یارا نہیں! واضح رہے کہ انبیاء و رسل علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ دنیا میں مزید رہنے یا کوچ کرنے سے متعلق اختیار عطا فرماتا تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ آخری ایام میں ایک دن جب حضور ﷺ کے مرض میں افاقہ ہوا تو آپؐ مسجد میں تشریف لے گئے' منبر پر فروکش ہوئے اور خطبہ دیا۔ اس کے بعد منبر سے نیچے تشریف لائے۔ ظہر کی نماز پڑھائی اور پھر منبر پر تشریف لے گئے اور چند اہم نصیحتیں فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا: ''ایک بندے کو اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا کہ یا تو دنیا کی چمک دمک اور زیب و زینت میں سے وہ جو کچھ چاہے اللہ اُسے دے دے' یا اللہ کے پاس جو کچھ ہے اُسے اختیار کر لے' تو اس بندے نے اللہ کے پاس والی چیز کو اختیار کر لیا''۔ یہ بات سن کر ابوبکر رضی اللہ عنہ رونے لگے اور فرمایا: ''ہم اپنے ماں باپ سمیت آپؐ پر قربان!'' اس پر لوگوں کو تعجب ہوا کہ حضور ﷺ کیا ارشاد فرما رہے ہیں اور اس پر ابوبکرؓ کیا کہہ رہے ہیں! لیکن چند دن بعد واضح ہوا کہ جس بندے کو اختیار دیا گیا تھا وہ خود رسول اللہ ﷺ تھے اور ابوبکر صدیقؓ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں سب سے زیادہ صاحبِ علم تھے۔

یہاں حضور ﷺ کے اس فرمان کا ذکر کرتے ہوئے میرے دل کی بات زبان پر آ گئی ہے —— وہ یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل سے مجھے حضور ﷺ کے قدموں میں پہنچا دیا تو مَیں حضور ﷺ سے شکوہ کرنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ حضور! آپؐ نے بہت جلدی کی ..... حضورؐ! مانا کہ ہجر و فراق کا ایک ایک لمحہ آپؐ کے لیے مشکل تھا..... مگر حضورؐ! جو لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہوئے تھے وہ بھی تو آپؐ کے فیضانِ نظر کے محتاج تھے..... حضورؐ! اگر تھوڑا سا وقت ان کو بھی مل جاتا تو..... مہاجرینؓ و انصارؓ کی طرز پر ان کی تربیت بھی ہو جاتی.....!!!

سُوْرَۃُ التِّیْنِ

تمہیدی کلمات

سورۃ التین میں انسانی زندگی کے نفسیاتی اور فلسفیانہ پہلو سے متعلق اہم حقائق بیان ہوئے ہیں۔ بنیادی طور پر اس سورت کا مضمون چونکہ انسان کی تخلیق سے متعلق ہے اس لیے اسے سمجھنے کے لیے نفسِ انسانی کی تخلیق کے بارے میں سورۃ الشمس کی آیت ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸﴾ کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسانی نفس کے بارے میں یہ حقیقت واضح فرمادی ہے کہ اس میں نیکی اور بدی کی تمیز الہام کر دی گئی ہے۔ اب اس حقیقت کو مدِنظر رکھتے ہوئے آپ ایک ایسے انسان کا تصوّر کریں جس کی اخلاقی حس پوری طرح فعال و بیدار ہے۔ ایسا انسان جب ایک بگڑے ہوئے معاشرے کو دیکھتا ہے (بدقسمتی سے آج ہمارا معاشرہ اجتماعی بگاڑ کا مثالی نقشہ پیش کرتا ہے) تو وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ شاید انسان بنیادی طور پر بہت گھٹیا اور گندی مخلوق ہے، اور یہ کہ شاید اس میں خیر نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ اسی وجہ سے دورِ جدید کے تقریباً تمام ماہرینِ نفسیات اس نکتے پر متفق ہیں کہ انسان کے اندر حیوانی داعیات یعنی پیٹ اور شہوت کے تقاضوں اور حُبِّ تفوق (urge to dominate) کے علاوہ اور کوئی حس یا داعیہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ صورتِ حال ایک حساس انسان کے لیے یقیناً بہت مایوس کن ہے۔ لیکن اس کے برعکس یہ سورت ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ انسان صرف شر کا پتلا اور گناہ کی پوٹلی ہی نہیں ہے بلکہ اس میں بہت اعلیٰ بلندیوں کو چھونے کی صلاحیت بھی ہے۔

سُوْرَۃُ التِّیْنِ مَکِّیَّۃٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ | اٰیَاتُهَا: ۸ رُکُوْعُهَا: ۱

وَالتِّیْنِ وَ الزَّیْتُوْنِ ۝۱ وَ طُوْرِ سِیْنِیْنَ ۝۲ وَ هٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ ۝۳ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝۴ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝۵ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۝۶ فَمَا یُکَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ ۝۷ اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِیْنَ ۝۸

آیت ۱ ﴿وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ ۝۱﴾ ''گواہ ہے انجیر اور گواہ ہے زیتون۔''

آیت ۲ ﴿وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ ۝۲﴾ ''اور گواہ ہے طورِ سینا۔''

آیت ۳ ﴿وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ ۝۳﴾ ''اور گواہ ہے یہ امن والا شہر۔''

التِّین کے معنی انجیر کے ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قومِ نوحؑ کے علاقے میں ایک بڑے پہاڑ کا نام بھی جبل التِّین تھا اور یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اسی پہاڑ کے دامن میں ساڑھے نو سو سال تک دعوت و تبلیغ کے فرائض سرانجام دیے۔ اسی طرح الزَّیْتُون سے

مراد زیتون کا پھل اور درخت بھی ہے اور وہ پہاڑی بھی جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اکثر تبلیغی خطبات دیا کرتے تھے۔ ان خطبات میں سے آپؑ کا ایک خطبہ ''پہاڑی کے وعظ'' (Sermon of the Mount) کے نام سے خاص طور پر مشہور ہے۔ تیسری قسم (وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ) کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات سے ہے۔ کوہِ طور پر آپؑ کو اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا۔ اور امن والے شہر سے مکہ مکرمہ مراد ہے جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سورت کے نزول کے وقت دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔

گویا ان آیات میں جن مقامات کی قسمیں کھائی گئی ہیں ان میں سے ہر مقام کا تعلق ایک جلیل القدر شخصیت سے ہے۔ گویا ان شخصیات کو گواہ بنا کر یہاں اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ بنیادی طور پر انسان بہت بلند مرتبت اور صاحبِ عزّت و عظمت مخلوق ہے۔ اگر کسی کو اس حقیقت کے بارے میں کوئی شک ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کے بندے نوح علیہ السلام کی زندگی کے شب و روز کا تصور کرے۔ اُس کے بندے عیسیٰ علیہ السلام کے کردار کا نقشہ ذہن میں لائے' موسیٰ علیہ السلام کی عظیم المرتبت شخصیت کو یاد کرے اور پھر سب سے بڑھ کر اُس کے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بے مثال سیرت کا نمونہ دیکھے۔ یہ شخصیات' ان کے کردار اور ان کی سیرتیں اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ:

آیت ۴ ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝۴﴾ ''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔''

ہم نے تو انسان کو اشرف المخلوقات کے اعلیٰ مرتبے پر فائز کیا تھا: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝۷۰﴾ (بنی اسراءیل) ''اور ہم نے بڑی عزّت بخشی ہے اولادِ آدمؑ کو اور ہم اٹھائے پھرتے ہیں انہیں خشکی اور سمندر میں اور ہم نے انہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا کیا اور انہیں فضیلت دی اپنی بہت سی مخلوق پر' بہت بڑی فضیلت''۔ نسلِ انسانی کی عزّت و تکریم کی انتہا یہ ہے کہ ان کے جدِّ امجد کو ہم نے اپنے دونوں ہاتھوں سے تخلیق کیا (صٓ: ۷۵) اور مسجودِ ملائک بنایا۔

اگر تمہیں یہ دنیا ظالموں' بدکاروں اور گھٹیا انسانوں سے بھری نظر آتی ہے تو اللہ نے بھی تمہارے سامنے اپنے ایسے چار بندوں کی مثالیں پیش کر دی ہیں جو عظمتِ انسانی کے زندہ و جاوید ثبوت ہیں۔ کیا ان مثالوں کو دیکھنے کے بعد بھی کوئی عقل کا اندھا یہ دعویٰ کرے گا کہ انسان کے اندر خیر اور عظمت کا کوئی پہلو سرے سے موجود ہی نہیں؟ بہرحال اگر کوئی شخص عظمت کے ان میناروں کو دیکھ لینے کے بعد بھی انسانی عظمت کا قائل نہ ہو اور اس عظمت و اکرام کو پانے کے لیے اپنا رخ تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرے تو یقیناً اس کا شمار نسلِ انسانی کے ان افراد میں ہوگا جو شرفِ انسانیت سے نیچے گر کر حیوانوں سے بھی بدتر ہو چکے ہیں: ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ﴾ (الاعراف: ۱۷۹)

آیت ۵ ﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝۵﴾ ''پھر ہم نے لوٹا دیا اس کو پست ترین حالت کی طرف۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی اس عظیم المرتبت مخلوق (کی روح) کو اس کے جسدِ خاکی میں بٹھا کر نیچے دنیا میں بھیج دیا۔ لیکن واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر جہالت کی تاریکی میں نہیں بلکہ ہدایت کے اُجالے میں بھیجا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے کامیابی اور ناکامی کے راستوں کا شعور بھی عطا کیا' اس کی فطرت میں نیکی و بدی کی تمیز بھی ودیعت کی اور وقتاً فوقتاً وہ براہِ راست ہدایات بھی بھیجتا رہا: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ﴾ (الحشر: ۱۹) کہ تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو فراموش کر دیا اور اس کی پاداش میں اللہ نے انہیں اپنے آپ سے ہی غافل کر دیا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا

ہے۔اب اگر وہ اپنے شرفِ انسانی کو بھلا کر محض حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتا رہے اور خود کو حیوان ہی سمجھتا رہے تو یہ اس کی مرضی ہے۔

اس فلسفے کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنی سرشت (حیوانی وجود کے تقاضوں) کے اعتبار سے انسان میں کچھ کمزوریاں اور خامیاں پائی جاتی ہیں' لیکن اپنی فطرت (روح) کے لحاظ سے یہ بہت اعلیٰ اور عظیم المرتبت مخلوق ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کی روح کو اس کے حیوانی جسم میں متمکن فرما کر اسے دنیا میں بھیجا تو اس کا ارفع و اعلیٰ روحانی وجود اس کے حیوانی جسم میں قید ہو کر گویا اسفل (نچلی) مخلوق کی سطح پر آ گیا۔ چنانچہ دنیوی زندگی میں اس کے سامنے اصل ہدف یہ ہے کہ وہ اپنے شعور اور اللہ تعالیٰ کی فراہم کردہ ہدایت کے مطابق راستہ اختیار کرے' اس راستے کے تقاضے پورے کرنے کے لیے محنت کرے اور اسفل سطح سے اوپر اٹھ کر اپنی اصل عظمت اور حقیقی منزل کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

اب اگلی آیت میں اس راستے کی نشاندہی اور مطلوبہ محنت کے طریقے کی وضاحت کی گئی ہے:

آیت ۶ ﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے''

اب مذکورہ پستی سے صرف وہی لوگ نکل پائیں گے جو اپنے شعور و حواس سے کام لیتے ہوئے اپنے خالق اور معبود کو پہچانیں گے یعنی اُس پر ایمان لائیں گے اور پھر محنت کر کے اپنے کردار و عمل کو اُس کی منشاء و مرضی کے مطابق ڈھالیں گے' یعنی اعمالِ صالحہ کا اہتمام کریں گے۔

﴿فَلَهُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ۝۶﴾ ''تو اُن کے لیے ایسا اجر ہوگا جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوگا۔''

آیت ۷ ﴿فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعۡدُ بِالدِّیۡنِ ۝۷﴾ ''تو اس کے بعد کیا چیز تجھے آمادہ کرتی ہے جزا و سزا کے انکار پر؟''

تو اے جزا و سزا کے منکر انسان! جب تُو خود دیکھ رہا ہے کہ دنیا میں تمام انسان ایک جیسے نہیں ہیں' ان میں کچھ بہت اعلیٰ سیرت و کردار کے مالک ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو انسانیت کے ماتھے پر بدنما داغ کی حیثیت رکھتے ہیں' تو اس صورتِ حال میں کیا عقل اور انصاف کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ اچھوں کو اُن کی اچھائی اور محنت کا پھل ملے اور بُروں کو اُن کی بُرائی اور نافرمانی کی سزا دی جائے؟ یہ ایسی سیدھی سادی بات ہے جو عام ذہنی سطح کا ایک انسان بھی سمجھ سکتا ہے۔تو یہ سب کچھ دیکھنے' سننے اور سمجھنے کے بعد بھی آخر وہ کون سی منطق ہے جس کے تحت تم جزا و سزا کے انکار پر جمے ہوئے ہو؟

آیت ۸ ﴿اَلَیۡسَ اللّٰهُ بِاَحۡکَمِ الۡحٰکِمِیۡنَ ۝۸﴾ ''کیا اللہ تمام حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟''

دنیا میں تم لوگ چھوٹے چھوٹے حاکموں کو دیکھتے ہو کہ وہ اپنے غداروں اور باغیوں کو عبرتناک سزا دیتے ہیں اور اپنے وفاداروں کو انعام و اکرام سے نوازتے ہیں۔کیا دنیا میں تم نے کوئی ایسا حاکم بھی دیکھا ہے جو اپنے باغیوں اور وفاداروں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دے؟ اگر دنیا میں محدود اختیار کا مالک کوئی حاکم ایسا نہیں کرتا تو وہ اللہ عزّ وجل اپنے فرمانبردار بندوں اور نافرمانوں کو کیسے برابر کر دے گا جو سب حاکموں سے بڑا حاکم ہے؟ کیا تم اللہ تعالیٰ کو احکم الحاکمین نہیں مانتے ہو؟

مسند احمد' سنن الترمذی' سنن ابی داؤد اور دیگر کُتبِ احادیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی سورۃ التین پڑھے اور اَلَیۡسَ اللّٰهُ بِاَحۡکَمِ الۡحٰکِمِیۡنَ پر پہنچے تو کہے: بلٰی وانا علی ذٰلک من الشاھدین ''کیوں نہیں! اور مَیں اس پر شہادت دینے والوں میں سے ہوں''۔بعض روایات میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب یہ آیت پڑھتے تو فرماتے: سُبۡحَانَکَ فَبَلٰی!

سُوْرَۃُ الْعَلَقِ

تمہیدی کلمات

سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات کے بارے میں تمام مفسرین متفق ہیں کہ غارِ حرا میں حضور ﷺ پر جو پہلی وحی آئی تھی وہ ان آیات پر مشتمل تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ پر وحی کی ابتدا سچے خوابوں سے ہوئی۔ رات کو آپؐ جو خواب دیکھتے' دن کو اس کی تعبیر ہُو بہو وہی سامنے آجاتی۔ پھر آپؐ خلوت گزینی کی طرف مائل ہو گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب آپؐ کئی کئی راتوں تک غارِ حرا میں قیام فرمایا کرتے تھے۔ آپؐ فرماتی ہیں: فَیَتَحَنَّثُ فِیْہِ یعنی غارِ حرا میں آپؐ عبادت کیا کرتے تھے۔ غارِ حرا کی خلوت میں آپ ﷺ کی عبادت کی نوعیت کیا تھی' اس بارے میں تمام شارحینِ حدیث کا اجماع ہے کہ وہاں پر آپؐ اپنا وقت غور و فکر اور سوچ بچار (التفکر والاعتبار) میں گزارتے تھے۔ اسی زمانے میں ایک دن آپ ﷺ غارِ حرا میں مصروفِ ذکر و فکر تھے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور آپؐ سے کہا: اِقْرَأْ کہ پڑھئے۔ آپؐ نے فرمایا: مَا اَنَا بِقَارِئٍ کہ مَیں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس پر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو سینے سے لگا کر بھینچا اور پھر پڑھنے کو کہا۔ آپؐ نے پھر فرمایا: مَا اَنَا بِقَارِئٍ۔ حضرت جبرائیلؑ نے پھر وہی عمل دہرایا اور آپ ﷺ نے پھر وہی جواب دیا۔ حتیٰ کہ جب حضرت جبرائیلؑ نے تیسری مرتبہ آپؐ کو بھینچنے کے بعد فرمایا: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝١...الخ﴾ تو مذکورہ آیات آپ ﷺ کی زبانِ مبارک پر جاری ہو گئیں۔ اس حوالے سے مجھے اس روایت سے اتفاق ہے کہ اس وحی کے نزول کے وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام آپؐ کے پاس سونے کی ایک تختی لے کر آئے تھے جس پر یہ آیات لکھی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے اگر حضرت جبرائیلؑ نے آپؐ کو زبانی پڑھانا ہوتا تو آپؐ یقیناً مذکورہ جواب نہ دیتے۔ یعنی ضرور آپؐ کے سامنے کوئی ایسی چیز آئی تھی جسے دیکھ کر پڑھنا تھا۔ تبھی آپ ﷺ نے فرمایا: مَا اَنَا بِقَارِئٍ۔

اس وحی کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس موقع پر حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس اپنی اصلی مَلَکی شکل میں آئے تھے۔ اُس وقت اگرچہ آپ ﷺ نیم بیداری اور نیم خوابیدگی کی کیفیت میں تھے' لیکن آپؐ نے حضرت جبرائیل کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ایک طویل وقفے (فترتِ وحی) کے بعد چوتھی وحی کے نزول کے موقع پر حضرت جبرائیلؑ آپؐ کو اُفق پر نظر آئے (اس واقعہ کی تفصیل سورۃ المدثر کے تمہیدی کلمات میں بیان ہو چکی ہے) تو آپ ﷺ نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو قبل ازیں میرے پاس غارِ حرا میں آیا تھا۔

سُوْرَۃُ الْعَلَقِ مَکِّیَّۃٌ | بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ | اٰیَاتُہَا: ۱۹ رُکُوْعُہَا: ۱

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ۝١ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ۝٢ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ۝٣

الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ﴿۵﴾ كَلَّاۤ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰۤی ۙ﴿۶﴾ اَنْ رَّاٰهُ
اسْتَغْنٰی ؕ﴿۷﴾ اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجْعٰی ؕ﴿۸﴾ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰی ۙ﴿۹﴾ عَبْدًا اِذَا صَلّٰی ؕ﴿۱۰﴾ اَرَءَیْتَ
اِنْ كَانَ عَلَی الْهُدٰۤی ۙ﴿۱۱﴾ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰی ؕ﴿۱۲﴾ اَرَءَیْتَ اِنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰی ؕ﴿۱۳﴾ اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ
اللّٰهَ یَرٰی ؕ﴿۱۴﴾ كَلَّا لَئِنْ لَّمْ یَنْتَهِ ۙ۬ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِیَةِ ۙ﴿۱۵﴾ نَاصِیَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۚ﴿۱۶﴾ فَلْیَدْعُ
نَادِیَهٗ ۚ﴿۱۷﴾ سَنَدْعُ الزَّبَانِیَةَ ۙ﴿۱۸﴾ كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ وَ اسْجُدْ ۩ وَ اقْتَرِبْ ؕ﴿۱۹﴾

آیت ۱ ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾﴾ ''پڑھیے اپنے اُس رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔''

آیت ۲ ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾﴾ ''انسان کو پیدا کیا ہے اُس جونک کی طرح کی چیز سے جو رحمِ مادر میں چمٹ گئی تھی۔''

آیت ۳ ﴿اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ﴿۳﴾﴾ ''پڑھیے اور آپؐ کا رب بہت کریم ہے۔''

آیت ۴ ﴿الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ﴿۴﴾﴾ ''جس نے تعلیم دی ہے قلم کے ساتھ۔''

گویا عام انسانی تعلیم کا ذریعہ قلم ہے' جبکہ حضور ﷺ کی تعلیم کے لیے فرشتہ مقرر ہوا۔

آیت ۵ ﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ﴿۵﴾﴾ ''اور انسان کو وہ کچھ سکھایا ہے جو وہ نہیں جانتا تھا۔''

پہلی وحی ان پانچ آیات پر مشتمل تھی۔ اس وحی میں حضور ﷺ کو تبلیغ و انذار سے متعلق کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ البتہ اس وحی کی خاص اہمیت یہ ہے کہ اس سے آپؐ کی نبوت کا ظہور ہوا (ہر نبی اگرچہ پیدائشی طور پر ہی نبی ہوتا ہے لیکن اس کی نبوت کا باقاعدہ ظہور پہلی وحی کے وقت ہوتا ہے)۔ تبلیغ کا باقاعدہ حکم آپؐ کو سورۃ المدثر کی ان آیات میں دیا گیا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾ قُمْ فَاَنْذِرْ ۪ۙ﴿۲﴾ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ۪ۙ﴿۳﴾﴾ کہ اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ) کھڑے ہو جاؤ اور اپنے رب کی کبریائی کا اعلان کرو۔ یعنی اے نبی (ﷺ) اب آپ اللہ تعالیٰ کی کبریائی کو عملی طور پر نافذ کرنے کے لیے جدّ و جُہد شروع کر دیجیے۔ سورۃ العلق اور سورۃ المدثر کے مابین اس لحاظ سے گہری مشابہت پائی جاتی ہے کہ سورۃ المدثر کی طرح یہ سورت بھی تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پھر جس طرح سورۃ المدثر کی پہلی سات آیات میں حضور ﷺ سے خطاب کے بعد تین آیات میں قیامت کا ذکر آیا ہے' بالکل اسی طرح اس سورت میں بھی پہلی پانچ آیات میں حضور ﷺ سے خطاب ہے اور اس کے بعد درج ذیل تین آیات میں آخرت کا فلسفہ بیان ہوا ہے۔

آیت ۶ ﴿كَلَّاۤ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰۤی ۙ﴿۶﴾﴾ ''کوئی نہیں! انسان سرکشی پر آمادہ ہو ہی جاتا ہے۔''

انسان سرکشی اور ظلم و زیادتی پر کیوں اُتر آتا ہے؟ اس کی وجہ اگلی آیت میں بتائی گئی:

آیت ۷ ﴿اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰی ؕ﴿۷﴾﴾ ''اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو مستغنی دیکھتا ہے۔''

وہ دیکھتا ہے کہ اس پر کوئی پکڑ نہیں۔ دنیا میں نہ تو ظالم کو اُس کے ظلم کی قرار واقعی سزا ملتی ہے اور نہ ہی مظلوم کی کما حقہ دادرسی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس دنیا کا نظام محض طبعی قوانین و ضوابط (physical laws) کے مطابق چل رہا ہے اور یہ کہ یہاں اخلاقی قوانین (moral laws) کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ انسان کی روز مرہ زندگی کا تجربہ بھی اُسے یہی بتاتا ہے کہ زہر

کھانے سے تو آدمی ہلاک ہو جاتا ہے لیکن حرام کھانے سے اُسے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ جب معاشرے کے عام آدمی کو نیکی‘ انصاف‘ دیانت داری جیسے الفاظ عملی طور پر بے معنی اور بے وقعت نظر آتے ہیں تو وہ سرکشی اور مَن مرضی کے راستے پر چل نکلتا ہے ـــــ اب اگلی آیت میں انسان کی اس سرکشی اور بغاوت کا علاج بتایا جا رہا ہے۔ اس کا علاج اس یاد دہانی میں ہے کہ:

آیت ۸ ﴿اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجْعٰی ۝۸﴾ ’’یقیناً تجھے اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔‘‘

گویا انسان کو راہِ راست پر رکھنے کا جو مؤثر ترین علاج ہے وہ ہے عقیدۂ آخرت پر پختہ یقین۔ یعنی یہ یقین کہ ایک دن اُسے اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہو کر اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے اور وہ عدالت بھی ایسی ہے جہاں ذرّہ برابر بھی کوئی چیز چھپائی نہیں جا سکے گی: ﴿فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ ۝۷ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ ۝۸﴾ (الزلزال) ’’جس کسی نے ذرّے کے ہم وزن نیکی کمائی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔ اور جس کسی نے ذرّے کے ہم وزن برائی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا‘‘۔ گویا یہ عقیدۂ آخرت پر پختہ یقین اور قیامت کے دن کی پیشی کا خوف ہی ہے جو انسان کے اندر خود احتسابی کا احساس اُجاگر کرتا ہے۔ یہی یقین اور خوف اسے خلوت و جلوت میں‘ اندھیرے اُجالے میں اور ہر جگہ‘ ہر حال میں غلط روی اور ظلم و تعدّی کے ارتکاب سے باز رکھتا ہے۔ ورنہ انسان کی سرشت ایسی ہے کہ جس مفاد تک اس کا ہاتھ پہنچتا ہو اسے سمیٹنے کے لیے وہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی حدود کی پروا نہیں کرتا۔

اب اگلی آیت سے اس سورت کا تیسرا حصہ شروع ہو رہا ہے۔ سورۃ المدثر کے ساتھ اس سورت کے مضامین کی مشابہت کا انداز ملاحظہ ہو کہ سورۃ المدثر کے تیسرے حصے میں ولید بن مغیرہ کے کردار کی جھلک دکھائی گئی ہے‘ جبکہ یہاں اس کے مقابل ابوجہل کے طرزِ عمل کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

آیت ۹ ﴿اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰی ۝۹﴾ ’’کیا تم نے دیکھا اُس شخص کو جو روکتا ہے۔‘‘

آیت ۱۰ ﴿عَبْدًا اِذَا صَلّٰی ۝۱۰﴾ ’’(ہمارے) ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے۔‘‘

یہ اشارہ ہے ابوجہل کی ان جسارت آمیز حرکات کی طرف جو وہ حضور ﷺ کو نماز سے روکنے کے لیے کیا کرتا تھا۔ مثلاً ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ ابوجہل نے آپؐ کو دیکھا تو اونٹ کی اوجھڑی منگوا کر عین سجدے کی حالت میں آپؐ کی پشت مبارک پر رکھوا دی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ابھی بچی تھیں‘ ان کو پتا چلا تو آپؓ گھر سے بھاگم بھاگ حرم میں پہنچیں اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس غلاظت کو آپؐ کے اوپر سے ہٹایا۔ اسی طرح ایک اور موقع پر ابوجہل نے آپ ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھ کر آپؐ کی گردن مبارک میں چادر ڈال کر اس قدر زور سے مروڑا کہ آپؐ کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ حضور ﷺ کے سفرِ طائف سے واپسی کے زمانے میں بھی پیش آیا۔ اس واقعہ کی تفصیل روایات میں یوں آتی ہے کہ ابوجہل نے لات اور عُزّیٰ کی قسم کھا کر کہا تھا کہ اگر اس نے پھر محمد (ﷺ) کو اس طرح نماز پڑھتے دیکھا تو اُن کی گردن روند ڈالوں گا اور اُن کا مُنہ خاک آلود کر دوں گا۔ ایک دن اُس نے آپ ﷺ کو حرم میں نماز پڑھتے دیکھا تو غصے میں آپؐ کو ڈانٹتے ہوئے آپؐ کی طرف بڑھا تاکہ اپنی قسم پوری کرے‘ مگر پھر یکدم دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ لوگوں نے پوچھا کیا ہوا؟ کیوں پیچھے ہٹ آئے؟ کہنے لگا کہ آگے بڑھنے پر مجھے اپنے اور محمد (ﷺ) کے درمیان حائل آگ سے بھری ہوئی ایک خندق اور ایک پَروں والی کوئی مخلوق دکھائی دی جو میری تِکّہ بوٹی کرنے کو تیار تھی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر وہ میرے قریب پھٹکتا تو فرشتے اس کے چیتھڑے اُڑا دیتے۔ یہاں یہ نکتہ لائقِ توجہ ہے کہ پہلے دونوں واقعات کے حوالے سے ابوجہل کو ایسے کسی غیر معمولی یا غیر مرئی ردِّعمل کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ میرے نزدیک اس کی توجیہہ یہ ہے کہ پہلے دونوں واقعات کے زمانے میں حضور ﷺ کی پشت پناہی کے لیے دنیوی اسباب کے طور پر جناب ابوطالب موجود تھے جبکہ تیسرا واقعہ اس زمانے میں پیش آیا جب یہ دنیوی سہارا بھی موجود نہ رہا اور اب حضور ﷺ کی حفاظت براہِ راست اللہ تعالیٰ خود فرما رہا تھا۔ اس لیے اس وقت غیبی مدد کے ذریعے حضور ﷺ کی حفاظت کو یقینی بنایا گیا۔ آیات زیر مطالعہ میں خاص طور پر اسی واقعہ کا تذکرہ ہے۔

آیت ۱۱ ﴿اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰٓى ﴿۱۱﴾﴾ ''کیا تم نے غور کیا اگر وہ شخص ہدایت پر ہوتا؟''

آیت ۱۲ ﴿اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ﴿۱۲﴾﴾ ''یا وہ تقویٰ کی تعلیم دیتا!''

جیسا کہ سورۃ اللیل کی آیت ۱۰ کے ضمن میں بھی ذکر ہو چکا ہے کہ ابوجہل کے کردار میں بہت سی مثبت خصوصیات بھی پائی جاتی تھیں۔ مثلاً وہ مال خرچ کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ صاف گو بھی تھا۔ اپنے ایمان نہ لانے کی وجہ بتاتے ہوئے اس نے بالکل کھری اور سچی بات کہی تھی کہ میں محمد (ﷺ) کو جھوٹا نہیں سمجھتا' لیکن ہمارے خاندان نے چونکہ غرباء کو کھانے کھلانے اور حاجیوں کی خدمت کرنے میں ہمیشہ بنو ہاشم کا مقابلہ کیا ہے' اس لیے اب میں محمد (ﷺ) کی نبوت کی شہادت دے کر اپنے حریف خاندان کی بڑائی تسلیم نہیں کر سکتا۔ وہ جری اور بہادر ایسا تھا کہ نزع کے وقت بھی اُس نے ہار نہیں مانی اور میدانِ بدر میں اپنا سر قلم کرنے والے شخص کو مخاطب کر کے یہ کہنا ضروری سمجھا کہ اس کی گردن کو ذرا نیچے سے کاٹا جائے تاکہ سر نیزے پر چڑھے تو اونچا نظر آئے۔ بہرحال شخصی اعتبار سے وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرح بہادر' نڈر' بے باک اور صاف گو انسان تھا۔ اگر وہ ایمان لے آتا تو یقیناً حضرت عمرؓ ہی کی طرح اعلیٰ پائے کا مسلمان ہوتا۔ لیکن جب وہ ﴿صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ﴿۶﴾﴾ (الیل) یعنی تصدیقِ حق کی گھاٹی عبور کرنے میں ناکام رہا تو اُس کے کردار کی بہت سی مثبت خصوصیات بھی اس کے کسی کام نہ آ سکیں۔

آیت ۱۳ ﴿اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۱۳﴾﴾ ''کیا تم نے سوچا کہ اس نے جو جھٹلایا ہے اور منہ موڑ لیا ہے۔''

آیت ۱۴ ﴿اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ﴿۱۴﴾﴾ ''کیا یہ جانتا نہیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے!''

آیت ۱۵ ﴿كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ﴾ ''ہرگز نہیں! اگر یہ باز نہ آیا''

﴿لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ ﴿۱۵﴾﴾ ''تو ہم گھسیٹیں گے اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر۔''

آیت ۱۶ ﴿نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴿۱۶﴾﴾ ''وہ پیشانی کہ جو خطاکار ہے' جھوٹی ہے۔''

آیت ۱۷ ﴿فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ﴿۱۷﴾﴾ ''تو وہ بلا لے اپنی مجلس کے لوگوں کو۔''

آیت ۱۸ ﴿سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ﴿۱۸﴾﴾ ''ہم بھی بلا لیں گے جہنم کے فرشتوں کو۔''

آیت ۱۹ ﴿كَلَّا ۭ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴿۱۹﴾﴾ ''کوئی بات نہیں! (اے نبی ﷺ) آپ اس کی بات نہ مانیے' آپ سجدہ کیجیے اور (اللہ سے اور) قریب ہو جائیے!''

آپ ﷺ اس جھوٹے' غلط کار شخص کی ایک نہ سنیے۔ یہ اگر آپؐ کو نماز پڑھنے سے منع کرتا ہے تو اس کی پروا نہ کیجیے۔ آپؐ اپنے پروردگار کی جناب میں سجدے کرتے رہیے اور کثرتِ سجود سے اُس کا قرب حاصل کرتے رہیے۔

سُوْرَةُ الْقَدْرِ

سُوْرَةُ الْقَدْرِ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۵ رُكُوْعُهَا: ۱

اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝۲ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝۳ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝۴ سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝۵ ع ۲۲

آیت ۱ ﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱﴾ ''یقیناً ہم نے اتارا ہے اس (قرآن) کو لیلۃ القدر میں۔''

''اَنْزَلْنٰهُ'' کی ضمیر مفعولی کا مرجع بالاتفاق قرآن مجید ہی ہے۔ نوٹ کیجیے! ان سورتوں کے مضامین کے اندر ایک ربط پایا جاتا ہے' یعنی پہلی وحی (سورۃ العلق) کے فوراً بعد بتایا جا رہا ہے کہ ہم نے اس کلام کو لیلۃ القدر میں نازل فرمایا ہے۔ قدر کا معنی تقدیر اور قسمت بھی ہے اور عزّت و منزلت بھی۔ یہاں دونوں معنی مراد لیے جا سکتے ہیں۔ یعنی ہم نے اس قرآن کو اس رات میں اتارا ہے جو قدر و منزلت کے اعتبار سے بے مثل رات ہے' یا اس رات میں اتارا ہے جو تقدیر ساز ہے۔ سورۃ الدخان میں اس رات کا ذکر لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ کے نام سے آیا ہے: ﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾ (آیت ۳) ''یقیناً ہم نے نازل کیا ہے اس (قرآن) کو ایک مبارک رات میں''۔ یہ کونسی رات ہے؟ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((تَحَرَّوْا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْوِتْرِ مِنَ الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ))[1] ''لیلۃ القدر کو رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرو''۔ زیادہ تر لوگوں کا خیال ہے کہ ستائیسویں رمضان کی شب ہی لیلۃ القدر ہے۔ لیکن جیسا کہ سورۃ الفجر کی آیت ۳ کے ضمن میں بھی وضاحت کی جا چکی ہے' قمری کیلنڈر کی طاق اور جُفت راتوں کی گنتی دنیا کے مختلف خطوں میں مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً آج ہمارے ہاں جو طاق رات ہے سعودی عرب میں ممکن ہے وہ جُفت رات ہو۔ اس لیے لیلۃ القدر کو تلاش کرنے کا محتاط طریقہ یہی ہے کہ اسے رمضان کے آخری عشرے کی تمام راتوں (جُفت اور طاق دونوں) میں تلاش کیا جائے۔ اور اگر واقعی ستائیسویں رمضان کی شب ہی لیلۃ القدر ہے تو اس بارے میں میرا اپنا خیال یہ ہے کہ پھر یہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی ستائیسویں شب ہے۔ واللہ اعلم!

اس رات میں قرآن نازل کرنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس رات کو پورا قرآن مجید لوحِ محفوظ سے حاملینِ وحی فرشتوں کے سپرد کر دیا گیا اور پھر اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ۲۳ سال کے دوران میں حضرت جبرائیل علیہ السلام اس کی آیات اور سورتیں رسول اللہ ﷺ پر نازل کرتے رہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے نزول کی ابتدا اس رات سے ہوئی۔

۱۔ صحیح البخاری' کتاب صلاۃ التراویح' باب تحری لیلۃ القدر فی الوتر من العشر الاواخر۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب فضل لیلۃ القدر...

آیت ۲ ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝۲﴾ ''اور تم کیا جانتے ہو کہ لیلۃ القدر کیا ہے!''

اس استفہام سے اس رات کی عظمت و اہمیت واضح ہوتی ہے۔ گویا مخلوق اس کی تہ تک پوری طرح نہیں پہنچ سکتی' صرف اللہ جل جلالہٗ ہی اس کی قدر و منزلت کو پوری طرح جانتا ہے۔

آیت ۳ ﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝۳﴾ ''لیلۃ القدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔''

یہ بہتری اور افضلیت کس اعتبار سے ہے؟ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ اس رات کا عملِ خیر ہزار مہینوں کے عملِ خیر سے بہتر ہے جس میں لیلۃ القدر نہ ہو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((مَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ)) (۲) ''جو شخص لیلۃ القدر میں ایمان کے ساتھ اور اللہ سے اجر کی امید میں کھڑا رہا اُس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے گئے''۔ اس رات کی افضلیت کے ضمن میں ایک رائے یہ ہے کہ اس ایک رات میں اتنی خیر تقسیم کی جاتی ہے جتنی ایک ہزار مہینہ میں بھی تقسیم نہیں کی جاتی۔ اس رات کی افضلیت کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ انسان کی اصلاح اور فلاح کے لیے جو کام (نزولِ قرآن) اس ایک رات میں ہوا' خیر اور بھلائی کا اتنا بڑا کام کبھی انسانی تاریخ کے کسی طویل زمانے میں بھی نہ ہوا تھا۔ واضح رہے کہ اہلِ عرب بڑی کثیر تعداد کا تصور دلانے کے لیے اَلْف (ہزار) کا لفظ بولتے تھے۔

آیت ۴ ﴿تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝۴﴾ ''(اس رات میں) اُترتے ہیں فرشتے اور روح اپنے رب کے حکم سے ہر کام کے لیے۔''

روح سے مراد یہاں روح الامین یعنی حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ حضرت جبرائیلؑ فرشتوں کے سردار ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں انہیں خصوصی مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ جیسا کہ سورۃ التکویر میں فرمایا گیا: ﴿ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝۲۰ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۝۲۱﴾ ''وہ (جبرائیلؑ) بہت قوت والا ہے' صاحبِ عرش کے قرب میں اس کا ٹھکانہ ہے۔ اس کی اطاعت کی جاتی ہے اور وہاں وہ امانت دار بھی ہے''۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں حضرت جبرائیل علیہ السلام اور فرشتوں کا ذکر آتا ہے تو انؑ (حضرت جبرائیلؑ) کا ذکر عام طور پر علیحدہ کیا جاتا ہے۔

لیلۃ القدر میں حضرت جبرائیل علیہ السلام اور فرشتوں کا خصوصی نزول دراصل اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل و تنفیذ کے حوالے سے ہوتا ہے۔ سورۃ الدخان میں لیلۃ القدر یا لیلۃ مبارکہ کے بارے میں ایک خصوصی بات یہ بتائی گئی ہے: ﴿فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝۴﴾ کہ اس رات میں تمام پُرحکمت امور کے فیصلے صادر کیے جاتے ہیں۔ (اسی لیے اسے ''لَيْلَةُ الْحُكْمِ'' بھی کہتے ہیں) سورۃ الدخان کے مطالعے کے دوران اس آیت کے تحت اس موضوع پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ مختصراً یہ کہ لیلۃ القدر اللہ تعالیٰ کی تکوینی سلطنت سے متعلق فیصلوں کے لیے سالانہ بجٹ سیشن کا درجہ رکھتی ہے۔ اس رات میں اگلے سال کے لیے تمام اہم امور کے فیصلے کر کے تعمیل و تنفیذ کی غرض سے فرشتوں کے حوالے کر دیے جاتے ہیں۔ چنانچہ فرشتے حضرت جبرائیلؑ کی قیادت میں ان احکامات پر عمل

۲۔ صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب من صام رمضان ایمانا واحتسابا ونیۃ۔ وصحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا' باب الترغیب فی قیام رمضان وھو التراویح۔

درآمد کے لیے پوری زمین میں پھیل جاتے ہیں۔ نظامِ کائنات سے متعلق اللہ تعالیٰ کی اس ''تدبیرِ امر'' کا ذکر سورۃ السجدۃ کی اس آیت میں بھی آیا ہے: ﴿يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ﴾ (آیت ۵) ''وہ تدبیر کرتا ہے اپنے امر کی آسمان سے زمین کی طرف، پھر وہ (امر) چڑھتا ہے اُس کی طرف''۔ گویا اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل کے بعد متعلقہ فرشتے تکمیلی رپورٹیں بھی بھیجتے ہیں۔

آیت ۵ ﴿سَلٰمٌ ۛ﴾ ''سراسر سلامتی ہے۔''

اس سلامتی کے بہت سے پہلو ہیں۔ مثلاً اس رات میں لوگوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور عبادت کا ثواب کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔

﴿هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝۵﴾ ''یہ (رات) رہتی ہے طلوعِ فجر تک۔''

سُوْرَةُ الْبَيِّنَةِ

تمہیدی کلمات

سورۃ البیّنۃ کو قرآن مجید کے اکثر نسخوں میں ''مَدَنِیَّة'' لکھا گیا ہے۔ مفسرین کے نزدیک اس کے مکّی یا مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ البتہ حضرت عائشہ صِدّیقہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ یہ مکّی سورت ہے۔ قرآن مجید کی ترتیبِ مصحف میں اس کو سورۃ العلق اور سورۃ القدر کے بعد رکھنا نظمِ قرآن کے اعتبار سے بہت اہم اور معنی خیز ہے۔ سورۃ العلق میں پہلی وحی درج کی گئی ہے۔ سورۃ القدر میں بتایا گیا ہے کہ اس قرآن کا نزول کب ہوا اور اس سورت میں واضح کیا گیا ہے کہ اس قرآن کے ساتھ ایک رسول بھیجنا کیوں ضروری تھا۔

سُوْرَةُ الْبَيِّنَةِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۸ رُكُوْعُهَا: ۱

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۙ﴿۱﴾
رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ﴿۲﴾ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ؕ﴿۳﴾ وَ مَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ؕ﴿۴﴾ وَ مَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ
الدِّيْنَ ۙ۬ حُنَفَآءَ وَ يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ؕ﴿۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ؕ﴿۶﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ؕ﴿۷﴾ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ
عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ
لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ﴿۸﴾ ع

آیت ۱ ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۙ﴿۱﴾﴾ ''نہیں تھے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا اہلِ کتاب میں سے اور مشرکین میں سے الگ ہونے والے (یا باز آنے والے) جب تک کہ ان کے پاس البیّنہ نہ آجاتی۔''

ظاہر ہے وہ لوگ سیدھے راستے سے بھٹک کر گمراہی میں مبتلا ہو چکے تھے۔ اب جب تک ان کے سامنے کوئی بیّن (واضح) دلیل نہ آ جاتی جس سے انہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ گمراہ ہیں یا انہیں بہت واضح انداز میں بتا نہ دیا جاتا کہ وہ جس راہ پر چل رہے ہیں وہ راہِ ہدایت نہیں' اُس وقت تک انہیں رشد و ہدایت کی راہ پر چلنے والوں سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کا مفہوم یوں بھی ہو سکتا ہے کہ جب

تک ان لوگوں کے پاس البیّنہ نہ آ جاتی وہ اپنے کفر سے باز آنے والے نہیں تھے ـــــ مُنْفَكِّيْنَ: اِنْفِكاک (فَکَّ سے باب اِنْفعال) سے ہے‘ جس کا مفہوم ہے کسی چیز کا کسی چیز سے الگ ہو جانا‘ جدا ہو جانا۔

وہ البیّنہ کیا ہے؟ اس کی وضاحت اگلی آیات میں کی جا رہی ہے:

آیت ۲ ﴿رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ﴾ ’’ایک رسول (ﷺ) اللہ کی جانب سے جو تلاوت کرتے ہیں پاکیزہ اوراق کی۔‘‘

ان اوراق میں کیا ہے؟

آیت ۳ ﴿فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ؕ﴾ ’’ان میں بڑے مضبوط احکام (تحریر) ہیں۔‘‘

لفظ ’’کتاب‘‘ کے بارے میں قبل ازیں بھی متعدد بار واضح کیا جا چکا ہے کہ قرآن مجید میں یہ لفظ عام طور پر احکامِ شریعت کے لیے آتا ہے۔ تو پتا چلا کہ اللہ کے رسول ﷺ اور اللہ کی کتاب کا اکٹھا نام البیّنہ ہے۔ یہ وہی بات ہے جو قبل ازیں ہم لفظ ’’ذِکْرًا‘‘ کے حوالے سے سورۃ الطلاق میں بھی پڑھ چکے ہیں۔ وہاں اہلِ ایمان کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے: ﴿قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۙ﴿۱۰﴾ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ...﴾ ’’اللہ نے تمہاری طرف ذکر نازل کر دیا ہے۔ ایک رسولؐ جو اللہ کی آیاتِ بینات تم لوگوں کو پڑھ کر سنا رہا ہے.....‘‘ گویا تعبیر اور تعریف (definition) کے اعتبار سے اَلْبَیِّنَہ اور ذِکْرًا ہم معنی اصطلاحات ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے واضح احکام کتاب کی صورت میں نازل کیے اور اس کتاب کی تفہیم و تعلیم کے لیے رسول ﷺ کو بھی مبعوث فرمایا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے وہ تمام احکام اس انداز میں کھول کر بیان فرما دیے کہ اب اس کے بعد ان مخاطبین کے پاس کفر و شرک کے ساتھ چپٹے رہنے اور ضلالت و گمراہی سے باز نہ آنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا۔

آیت ۴ ﴿وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ؕ﴾ ’’اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی انہوں نے تفرقہ نہیں کیا تھا مگر اس کے بعد جبکہ ان کے پاس البیّنہ آ چکی تھی۔‘‘

یعنی اسی طرح اس سے پہلے بنی اسرائیل کے پاس بھی البیّنہ (اللہ کا رسولؑ اور اُس کی کتاب) آئی تھی‘ مگر وہ لوگ اس کے بعد بھی راہِ راست پر آنے کے بجائے تفرقہ بازی میں پڑ گئے۔ ان میں سے کچھ لوگ یہودی بن گئے اور کچھ نصاریٰ۔ بعد میں نصاریٰ مزید کئی فرقوں میں بٹتے چلے گئے۔ چنانچہ البیّنہ کے آ جانے کے بعد بھی راہِ راست پر نہ آنے کے جرم کی پاداش میں وہ لوگ شدید ترین سزا کے مستحق ہو چکے ہیں۔

آیت ۵ ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ۬ حُنَفَآءَ﴾ ’’اور انہیں حکم نہیں ہوا تھا مگر یہ کہ وہ بندگی کریں اللہ کی‘ اپنی اطاعت کو اُس کے لیے خالص کرتے ہوئے‘ بالکل یکسو ہو کر‘‘

یہ حکم گویا پورے دین کا خلاصہ ہے جو اس سے پہلے سورۃ الزمر (آیات ۲‘ ۳‘ ۱۱ اور ۱۴) میں بہت تاکید اور شد و مد کے ساتھ بیان ہو چکا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت اُس کی پوری اطاعت کے ساتھ کریں۔ یہ نہیں کہ نماز بھی پڑھے جا رہے ہیں اور حرام خوریوں سے بھی باز نہیں آتے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ اپنے نفس کی اطاعت بھی جاری ہے۔ ایسی آیات دراصل ہمیں خبردار کرتی ہیں کہ جزوی بندگی اور ساجھے کی اطاعت اللہ تعالیٰ کو ہرگز قابلِ قبول نہیں۔ اور یہ کہ اگر ہم اس جرم کا ارتکاب کریں گے تو ہم بھی

اسی وعید کے مستحق ہوں گے جو اس حوالے سے بنی اسرائیل کو سنائی گئی تھی۔ ملاحظہ ہوں اس وعید کے یہ الفاظ: ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ﴾ (البقرۃ:۸۵) ''تو کیا تم کتاب کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک کو نہیں مانتے؟ تو نہیں ہے کوئی سزا اُس کی جو یہ حرکت کرے تم میں سے سوائے ذِلّت و رسوائی کے دنیا کی زندگی میں' اور قیامت کے روز وہ لوٹا دیے جائیں گے شدید ترین عذاب کی طرف''۔ بلکہ اس حوالے سے اصل حقیقت تو یہ ہے کہ اس آیت میں دنیا کے جس عذاب کا ذکر ہے ﴿خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ﴾ وہ اس وقت بحیثیت اُمّت ہم پر مسلّط ہو بھی چکا ہے۔ مقامِ عبرت ہے! آج مسلمانوں کی آبادی دو ارب سے بھی زیادہ ہے' دنیا کے بہترین خطے اور بہترین وسائل ان کے قبضے میں ہیں' مگر اس کے باوجود عزّت نام کی کوئی چیز ان کے پاس نہیں۔ بین الاقوامی معاملات کے حوالے سے مسلمان حکمرانوں کی حالت یہ ہے کہ ''کس نمی پرسد کہ بھیّا کیستی؟'' یعنی عالمی معاملات میں کوئی ان کی رائے لینا بھی گوارا نہیں کرتا۔ بلکہ مسلمان ملکوں کی اپنی پالیسیوں کا اختیار بھی ان کے پاس نہیں۔ ان کے سالانہ بجٹ بھی کہیں اور سے بن کر آتے ہیں۔

بہرحال اس آیت کے حکم کا مدعا یہی ہے کہ جسے اللہ کا ''بندہ'' بننا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی اس کے قانون کے تابع کر کے اس کے حضور پیش ہو۔ ''قیصر کا حصّہ قیصر کو دو اور خدا کا حصّہ خدا کو دو'' والا قانون اللہ تعالیٰ کو قابلِ قبول نہیں۔ چنانچہ ایمان کے دعوے داروں کو چاہیے کہ وہ اللہ کی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے پوری یکسوئی کے ساتھ اُس کی عبادت کریں۔

﴿وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝۵﴾ ''اور (یہ کہ) نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں' اور یہی ہے سیدھا (اور سچا) دین۔''

گویا ان الفاظ سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ''بندگی'' اور شے ہے' جبکہ نماز اور زکوٰۃ اس کے علاوہ ہے۔ اس نکتے کو یوں سمجھیں کہ بندگی تو پوری زندگی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں دے دینے کا نام ہے۔ بقول شیخ سعدیؒ:

زندگی آمد برائے بندگی　　زندگی بے بندگی شرمندگی!

جبکہ نماز' زکوٰۃ (عبادات) وغیرہ اس بندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لوازمات ہیں' تاکہ ان کے ذریعے سے بندہ اپنے رب کو مسلسل یاد کرتا رہے اور اس کا تعلق اپنے رب کے ساتھ ہر دم' ہر گھڑی تازہ رہے۔ حفیظ جالندھری کے اس خوبصورت شعر میں یہی فلسفہ بیان ہوا ہے:

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی　　آؤ سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں!

گویا ہمارے ''نقوشِ بندگی'' نفس پرستی کی کثافتوں اور کدورتوں کے گرد و غبار سے اکثر دھندلا جاتے ہیں۔ چنانچہ انہیں تازہ رکھنے کے لیے نماز' روزہ' زکوٰۃ اور دیگر مراسمِ عبودیت کے ذریعے ہمیں اللہ تعالیٰ کے حضور مسلسل حاضری دینے کی ضرورت رہتی ہے۔ جیسے ایک بندۂ مسلمان اپنی نمازِ پنجگانہ کی ہر رکعت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا یہ عہد تازہ کرتا ہے: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ کہ اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں (اور کرتے رہیں گے) اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں (اور مانگتے رہیں گے)۔ تصوّر کیجیے اگر ایک بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہو کر یہ عہد پورے ارادے اور شعور کے ساتھ روزانہ بار بار دہرائے گا تو اس سے اس کے تعلق مع اللہ کے چمن میں تر و تازگی کی کیسی کیسی بہاروں کا سماں بندھا رہے گا۔

آیت ۱ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِیْنَ﴾ ''بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کی روش اختیار کی' خواہ وہ اہلِ کتاب میں سے تھے' خواہ مشرکین میں سے''

﴿فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا﴾ ''وہ ہوں گے جہنم کی آگ میں' اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

﴿اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِیَّةِ ۝۶﴾ ''یہی لوگ بدترین خلائق ہیں۔''

آیت ۷ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''(اس کے برعکس) وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے''

﴿اُولٰٓئِكَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ ۝۷﴾ ''یہی بہترین خلائق ہیں۔''

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ان لوگوں میں شامل ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

آیت ۸ ﴿جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا﴾ ''ان کا بدلہ ہوگا ان کے رب کے پاس دائمی قیام کے باغات کی صورت میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی' ان میں وہ رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔''

یہاں پر ضمنی طور پر یہ علمی نکتہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ قرآن مجید میں دو مقامات ایسے ہیں جہاں اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کے فوری تقابل (simultaneous contrast) میں اہلِ جنت کے لیے ﴿خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا﴾ جبکہ اہلِ جہنم کے لیے صرف ﴿خٰلِدِیْنَ فِیْهَا﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں ایک مقام تو یہی ہے۔ یعنی اس سورت کی زیر مطالعہ آیت میں اہلِ جنت کے لیے ﴿خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا﴾ کے الفاظ آئے ہیں' جبکہ اس سے پہلے آیت ۶ میں اہلِ جہنم کا ذکر کرتے ہوئے ﴿خٰلِدِیْنَ فِیْهَا﴾ کے الفاظ تک اکتفاء فرمایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سورۃ التغابن کی آیت ۹ اور آیت ۱۰ میں بھی اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کے تقابل کے حوالے سے یہی فرق دیکھنے میں آتا ہے۔ ان دونوں مقامات میں مذکورہ فرق کی بنیاد پر اُمتِ مُسلمہ کی دو بہت بڑی علمی شخصیات نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ جنت اور اس کی نعمتیں تو ابدی ہیں' لیکن جہنم ابدی نہیں ہے اور یہ کہ کبھی ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب اہلِ جہنم میں سے خیر کے حامل آخری عناصر کو نکال کر باقی لوگوں کو مدتِ مدید تک مبتلائے عذاب رکھنے کے بعد بالآخر اس میں جلا کر معدوم کر دیا جائے گا اور اس کے بعد جہنم کو بھی ختم کر دیا جائے گا۔ اس موقف کی حامل دو شخصیات میں ایک تو شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ ہیں جن کا شمار چوٹی کے صوفیاء میں ہوتا ہے اور دوسری شخصیت امام ابن تیمیہؒ کی ہے جو سلفی حضرات کے نزدیک اسلامی دنیا کے سب سے بڑے امام اور عالم ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ کا اس نکتے پر محی الدین ابن عربیؒ سے متفق ہو جانا یقیناً ایک اہم بات اور ''متفق گردید رائے بوعلی با رائے من'' والا معاملہ ہے' کیونکہ مجموعی طور پر وہ محی الدین ابن عربیؒ کے خیالات و نظریات سے شدید اختلاف رکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ جہنم کے ابدی نہ ہونے سے متعلق مَیں نے یہاں مذکورہ دو شخصیات کی آراء کا ذکر محض ایک علمی نکتے کے طور پر کیا ہے' عام اہلِ سنت کا عقیدہ بہرحال یہ نہیں ہے۔ اہلِ سنت علماء کے نزدیک جہنم بھی جنت کی طرح ابدی ہی ہے۔

﴿رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ ''اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے۔''

یعنی آخرت میں اللہ تعالیٰ انہیں اتنا کچھ عطا فرمائے گا کہ وہ اللہ سے خوش ہو جائیں گے۔

﴿ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّهٗ ۝۸﴾ ''یہ (صلہ) اُس کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے۔''

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! آمین' ثم آمین!

سُوْرَةُ الزِّلْزَالِ

تمہیدی کلمات

سورۃ الزلزال کے مکّی یا مدنی ہونے کے بارے میں بھی مفسرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے اسلوب اور مضامین پر غور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ مکّی سورت ہے۔ فضیلت کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ نے اسے ایک ہزار آیات کے برابر قرار دیا ہے۔ یہ سورت اور اس کے بعد کی تین سورتیں (سورۃ العادیات' سورۃ القارعہ اور سورۃ التکاثر) انذارِ آخرت کے حوالے سے خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔

سُوْرَةُ الزِّلْزَالِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۸ رُكُوْعُهَا: ۱

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۙ﴿۱﴾ وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۙ﴿۲﴾ وَ قَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا ۚ﴿۳﴾
يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۙ﴿۴﴾ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ؕ﴿۵﴾ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا
ع اَعْمَالَهُمْ ؕ﴿۶﴾ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ؕ﴿۷﴾ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ؕ﴿۸﴾

آیت ۱ ﴿اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۙ﴿۱﴾﴾ ''جب زمین ہلائی جائے گی جیسے کہ ہلائی جائے گی۔''

یعنی تم انسان یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتے کہ اس زلزلے کی کیفیت کیسی ہوگی۔ سورۃ الحج کے آغاز میں اس کیفیت کی شدّت کا نقشہ بایں الفاظ کھینچا گیا ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ۝۱ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّاۤ
اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ
شَدِيْدٌ ۝۲﴾

''اے لوگو! تقویٰ اختیار کرو اپنے رب کا' یقیناً قیامت کا زلزلہ بہت بڑی چیز ہوگا۔ جس دن تم اُس کو دیکھو گے' اس دن (حال یہ ہوگا کہ) بھول جائے گی ہر دودھ پلانے والی جسے وہ دودھ پلاتی تھی اور (دہشت کا عالَم یہ ہوگا کہ) ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا اور تم دیکھو گے لوگوں کو جیسے وہ نشے میں ہوں' حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے' بلکہ اللہ کا عذاب ہی بہت سخت ہے۔''

آیت ۲ ﴿وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۙ﴿۲﴾﴾ ''اور زمین اپنے سارے بوجھ نکال کر باہر پھینک دے گی۔''

یعنی اُس دن زمین اپنے اندر مدفون تمام انسانوں کو' وہ جس حالت میں بھی ہوں گے' نکال کر باہر ڈال دے گی۔ اگر ان کے ذرّات منتشر ہو کر زمین کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہوں گے تو ان کو بھی یکجا کر دیا جائے گا۔ واضح رہے کہ جو انسان اصطلاحی مفہوم

میں زمین کے اندر باقاعدہ دفن نہیں بھی ہوتے' مثلاً سمندر میں غرق ہو جاتے ہیں یا جلا دیے جاتے ہیں' ان کے اجسام کے اجزائی ذرّات بھی کسی نہ کسی شکل میں بالآخر زمین میں ہی جذب ہوتے ہیں اور وہ قیامت کے دن زمین سے ہی برآمد ہوں گے۔ سورۂ طٰہٰ کی یہ آیت اس لحاظ سے بہت واضح ہے: ﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿۵۵﴾﴾ ''اسی (زمین) سے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی میں ہم تمہیں لوٹائیں گے' اور اسی میں سے ہم تمہیں ایک مرتبہ پھر نکالیں گے۔''

آیت ۳ ﴿وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ﴿۳﴾﴾ ''اور انسان کہے گا کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟''

آیت ۴ ﴿يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ﴿۴﴾﴾ ''اُس دن یہ اپنی خبریں کہہ سنائے گی۔''

اُس دن اللہ تعالیٰ زمین کو بھی بولنے کی صلاحیت عطا فرمائے گا اور وہ ہر انسان کے بارے میں ایک ایک خبر دے گی کہ وہ اس کی پشت پر بیٹھ کر کیا کیا حرکتیں کرتا رہا ہے۔ یعنی جس طرح انسان کے ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضاء اُس دن اس کے خلاف گواہی دیں گے اسی طرح زمین کا متعلقہ حصہ اور ٹکڑا بھی اس کے خلاف بطور گواہ کھڑا ہو گا۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ (آیت ۲۱) میں ان گواہیوں کے حوالے سے بہت عبرتناک مکالمات کا ذکر ہے۔ جب انسانوں کی جلدوں سمیت ان کے تمام اعضاء ان کے خلاف گواہیاں دے رہے ہوں گے تو وہ جھنجھلا کر اپنی جلدوں سے کہیں گے: ﴿لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ؕ﴾ کہ تم کیوں ہمارے خلاف بول رہے ہو؟ اس پر وہ تڑ کی جواب دیں گی: ﴿اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ کہ آج ہمیں بھی اُس اللہ نے بولنے کی صلاحیت عطا کر دی ہے جس نے باقی ہر چیز کو بولنا سکھایا ہے۔ بہرحال اس دن اللہ تعالیٰ زمین کو بھی زبان عطا کرے گا اور وہ انسانوں سے متعلق تمام احوال کی ایک ایک تفصیل بیان کرے گی۔

آیت ۵ ﴿بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ﴿۵﴾﴾ ''اس لیے کہ اُسے اُس کے رب نے حکم دیا ہو گا۔''

آیت ۶ ﴿يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ﴾ ''اُس دن لوگ علیحدہ علیحدہ ہو کر نکل پڑیں گے''

اَشْتَاتًا جمع ہے شَتٌّ کی' یعنی منتشر و متفرق۔ نصب حالیت کی وجہ سے ہے۔ اسی معنی میں یہ لفظ سورۃ اللیل کی اس آیت میں بھی آیا ہے: ﴿اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ﴿۴﴾﴾ کہ تم انسان بظاہر ایک جیسے نظر آتے ہو لیکن تمہاری سعی و جُہد کے رخ بالکل مختلف ہیں۔

﴿لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ﴿۶﴾﴾ ''تاکہ انہیں ان کے اعمال دکھا دیے جائیں۔''

اس منظر کی ایک جھلک سورۃ الکہف کی اس آیت میں بھی دکھائی گئی ہے:

﴿وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾﴾

''اور رکھ دیا جائے گا اعمال نامہ' چنانچہ تم دیکھو گے مجرموں کو کہ ڈر رہے ہوں گے اس سے جو کچھ اس میں ہو گا اور کہیں گے: ہائے ہماری شامت! یہ کیسا اعمال نامہ ہے؟ اس نے تو نہ کسی چھوٹی چیز کو چھوڑا ہے اور نہ کسی بڑی کو' مگر اس کو محفوظ کر رکھا ہے۔ اور وہ پائیں گے جو عمل بھی انہوں نے کیا ہو گا اُسے موجود۔ اور آپ کا رب ظلم نہیں کرے گا کسی پر بھی۔''

آج کے ماحول کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اس آیت کا مفہوم یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اُس دن ایک بہت بڑا کمپیوٹر سرِ محشر نصب کر دیا جائے گا جس میں پوری نوعِ انسانی کے ایک ایک فرد کے اعمال سے متعلق تفصیلی ڈیٹا موجود ہو گا۔ جونہی کسی فرد کو حساب کے لیے پیش کیا

جائے گا اس کی پوری زندگی کی آڈیو ویڈیو فلم فوراً سکرین پر چلنا شروع ہو جائے گی۔

آیت ۷ ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝۷﴾ ''تو جس کسی نے ذرّہ کے ہم وزن بھی کوئی نیکی کی ہوگی وہ اُسے دیکھ لے گا۔''

آیت ۸ ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝۸﴾ ''اور جس کسی نے ذرّہ کے ہم وزن کوئی بدی کی ہوگی وہ بھی اُسے دیکھ لے گا۔''

عربی لغت کے مطابق چیونٹی کے انڈے سے نکلنے والے بچے کو ''ذرّہ'' کہا جاتا ہے۔ یعنی بہت چھوٹی اور حقیر چیز۔ اسی مفہوم میں لفظ ''ذرّہ'' اردو میں بھی مستعمل ہے۔

یہ آیت انسان کو اس اہم حقیقت پر متنبہ کرتی ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی بہرحال اپنا ایک وزن اور اپنی ایک قدر رکھتی ہے' اور چھوٹی سے چھوٹی بدی بھی حساب میں آنے والی چیز ہے۔ بسا اوقات انسان نیکی کے چھوٹے سے کام کو حقیر سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے' اور بعض اوقات صغیرہ گناہوں کی پروا نہیں کرتا۔ یہ درست طرزِ عمل نہیں ہے۔ کسی نیکی کو چھوٹا سمجھ کر اسے چھوڑنا نہیں چاہیے اور کسی گناہ کو چھوٹا سمجھ کر اس پر جری نہیں ہونا چاہیے۔

سُوْرَةُ الْعٰدِيٰتِ

تمہیدی کلمات

سورۃ العادیات قرآن مجید کی ان پانچ سورتوں میں پانچویں اور آخری سورت ہے جن کا آغاز ایک جیسے انداز میں پے در پے قسموں سے ہوتا ہے۔ اس فہرست میں اس سورت کے علاوہ سورۃ الصافات' سورۃ الذاریات' سورۃ المرسلات اور سورۃ النازعات شامل ہیں۔ اس سورت کے بھی مکی یا مدنی ہونے کے بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے' لیکن سورت کے مضمون اور اندازِ بیان سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ابتدائی دور کی مکی سورت ہے۔ اس سورت کے آغاز کی قسموں کے بارے میں تمام مفسرین کا اجماع ہے کہ ان میں گھوڑوں کا ذکر ہے۔

سُوْرَةُ الْعٰدِيٰتِ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۱۱ رُكُوْعُهَا: ۱

وَ الْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ﴿۱﴾ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۙ﴿۲﴾ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۙ﴿۳﴾ فَاَثَرْنَ بِهٖ
نَقْعًا ۙ﴿۴﴾ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۙ﴿۵﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۚ﴿۶﴾ وَ اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ
لَشَهِيْدٌ ۚ﴿۷﴾ وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۺ﴿۸﴾ اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۙ﴿۹﴾ وَ
حُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ﴿۱۰﴾ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ۧ﴿۱۱﴾ ع ۱

آیت ۱ ﴿وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ﴿۱﴾﴾ ''قسم ہے اُن گھوڑوں کی جو دوڑتے ہیں ہانپتے ہوئے۔''

آیت ۲ ﴿فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۙ﴿۲﴾﴾ ''پھر وہ سُم مار کر چنگاریاں نکالتے ہیں۔''

جب سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کے سُم کسی پتھر وغیرہ سے ٹکراتے ہیں تو ان سے چنگاریاں نکلتی دکھائی دیتی ہیں۔

آیت ۳ ﴿فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۙ﴿۳﴾﴾ ''پھر وہ علی الصبح غارت گری کرتے ہیں۔''

اس آیت میں گھوڑوں کی خصوصی صفات کے ساتھ ساتھ زمانہ جاہلیت کے عرب تمدن کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ اہلِ عرب جب لوٹ مار یا قتل و غارت کے لیے کسی قبیلے پر حملے کی منصوبہ بندی کرتے تو اس کے لیے علی الصبح منہ اندھیرے کے اوقات (small hours of the morning) کا انتخاب کرتے تھے۔ اس قسم کی غارت گری کے لیے رات کا پچھلا پہر اس لیے موزوں سمجھا جاتا تھا کہ اُس وقت ہر کوئی بڑی سکون کی نیند سو رہا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی مریض تکلیف کی وجہ سے ساری رات سو نہ سکے تو رات کے پچھلے پہر اسے بھی نیند آ جاتی ہے۔

آیت ۴ ﴿فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۙ﴿۴﴾﴾ ''پھر وہ اس سے گرد اُڑاتے ہوئے جاتے ہیں۔''

آیت ۵ ﴿فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۝۵﴾ ''پھر اس کے ساتھ وہ (دشمن کی) جمعیت کے اندر گھس جاتے ہیں۔''

پرانے زمانے کی جنگوں میں گھوڑے بہت مؤثر اور کارآمد ہتھیار کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ حملے کے وقت گھوڑے اپنے سواروں کے حکم پر مخالف فوج کی طرف سے تیروں کی بوچھاڑ اور نیزوں کی یلغار کی پروا نہ کرتے ہوئے ان کی صفوں میں گھس جاتے تھے۔ گھوڑے کا اپنے مالک کی فرمانبرداری میں اپنا خون پسینہ ایک کر دینے کا جذبہ اور اس کی وفاداری میں اپنی جان کی بازی تک لگا دینے کا وصف! یہ ہے دراصل ان قسموں کے مضمون کا مرکزی نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ دلانا مقصود ہے۔ چنانچہ گھوڑوں کے ان اوصاف کے ذکر کے بعد تقابل کے طور پر انسان کے کردار کا ذکر یوں کیا گیا ہے:

آیت ۶ ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝۶﴾ ''یقیناً انسان اپنے ربّ کا بہت ہی ناشکرا ہے۔''

مطلب یہ کہ ایک طرف وہ جانور ہے جو اپنے مالک کے ایک اشارے پر اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے' جو اُس کا خالق نہیں ہے' بلکہ صرف اُس کے دانے پانی کا انتظام کرتا ہے' اور دوسری طرف یہ باشعور' صاحبِ عقل و دانش اشرف المخلوقات انسان ہے جو اپنے خالق اور مالک کا شکر ادا نہیں کرتا۔

آیت ۷ ﴿وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۝۷﴾ ''اور وہ خود اس پر گواہ ہے۔''

وہ اپنے اس طرزِ عمل سے خوب واقف ہے۔ جیسا کہ سورۃ القیامہ میں فرمایا گیا: ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝۱۴﴾ کہ انسان اپنے خیالات' جذبات اور کردار کے بارے میں خود سب کچھ جانتا ہے۔ چنانچہ انسان خوب جانتا ہے کہ وہ قدم قدم پر اپنے رب کی ناشکری کا مرتکب ہو رہا ہے۔

آیت ۸ ﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝۸﴾ ''اور وہ مال و دولت کی محبت میں بہت شدید ہے۔''

مال و دولت کی محبت میں انسان اکثر اوقات حلال و حرام کی تمیز تک بھلا دیتا ہے۔ حتیٰ کہ حرام کھاتے ہوئے وہ اپنے نفسِ لوّامہ (بحوالہ سورۃ القیامہ' آیت ۲) اور ضمیر کی ملامت کی بھی پروا نہیں کرتا۔

آیت ۹ ﴿اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۝۹﴾ ''تو کیا وہ اُس وقت کو نہیں جانتا جب نکال لیا جائے گا وہ سب کچھ جو قبروں میں ہے۔''

آیت ۱۰ ﴿وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۝۱۰﴾ ''اور ظاہر کر دیا جائے گا جو کچھ سینوں میں ہے۔''

آیت ۱۱ ﴿اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ۝۱۱﴾ ''یقیناً اُن کا رب اُس دن اُن سے پوری طرح باخبر ہوگا۔''

اللہ تعالیٰ کو ان کے تمام اعمال و افعال کا علم ہے اور اس دن وہ ان سے ایک ایک چیز کا حساب لے لے گا۔ اَللّٰھُمَّ حَاسِبْنَا حِسَابًا يَّسِيْرًا۔ آمین! انذارِ آخرت کے مضمون کی حامل ان سورتوں میں سے ہر سورت کی تلاوت کے بعد یہ دعا ضرور کرنی چاہیے کہ اے اللہ! تُو ہم سے آسان حساب لینا اور اپنی خصوصی رحمت سے ہمارے گناہوں کو معاف کر دینا۔

سُوْرَةُ الْقَارِعَةِ

سُوْرَةُ الْقَارِعَةِ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۱۱ رُكُوْعُهَا: ۱

اَلْقَارِعَةُ ۙ﴿۱﴾ مَا الْقَارِعَةُ ۚ﴿۲﴾ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ؕ﴿۳﴾ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۙ﴿۴﴾ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ؕ﴿۵﴾ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ﴿۶﴾ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ؕ﴿۷﴾ وَ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ﴿۸﴾ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ؕ﴿۹﴾ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَاهِيَهْ ؕ﴿۱۰﴾ نَارٌ حَامِيَةٌ ۧ﴿۱۱﴾

ع ۱

آیت ۱ ﴿اَلْقَارِعَةُ ۙ﴿۱﴾﴾ ''وہ کھٹکھٹانے والی۔''

آیت ۲ ﴿مَا الْقَارِعَةُ ۚ﴿۲﴾﴾ ''کیا ہے وہ کھٹکھٹانے والی!''

قَرَعَ یَقْرَعُ قَرْعًا کے معنیٰ ایک چیز کو کسی دوسری چیز پر زور سے دے مارنے کے ہیں۔ جیسے دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹانا۔ اس لغوی معنی کی مناسبت سے قَارِعَة کا لفظ ہولناک حادثے اور عظیم مصیبت کے لیے بولا جاتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی قوم کسی حادثہ فاجعہ یا عظیم آفت کا شکار ہو تو عرب کہتے ہیں: قَرَعَتْهُمُ الْقَارِعَةُ کہ ان کو ایک بڑی آفت نے پیٹ ڈالا — وہ قیامت جب آئے گی تو پوری کائنات کو کھٹکھٹا ڈالے گی اور دنیا کی ہر چیز کو تہ و بالا کر دے گی۔ تمام اجرامِ فلکی آپس میں ٹکرائیں گے جس سے خوفناک دھماکے ہوں گے اور دل دہلا دینے والی آوازیں پیدا ہوں گی۔

آیت ۳ ﴿وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۚ﴿۳﴾﴾ ''اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہے وہ کھٹکھٹانے والی!''

آیت ۴ ﴿يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۙ﴿۴﴾﴾ ''جس دن لوگ بکھرے ہوئے پتنگوں کی مانند ہوں گے۔''

آیت ۵ ﴿وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ؕ﴿۵﴾﴾ ''اور پہاڑ دُھنی ہوئی اون کی مانند ہو جائیں گے۔''

العِهْن: رنگ دار اُون کو کہتے ہیں اور مَنْفُوْش کے معنی ہیں دُھنی ہوئی۔ یعنی پہاڑ اپنی جگہ پر قائم نہیں رہیں گے بلکہ ریزہ ریزہ ہو کر رنگ دار اُون کی طرح ہوا میں اُڑ رہے ہوں گے۔

آیت ۶ ﴿فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ﴿۶﴾﴾ ''تو جن لوگوں کے (نیکیوں کے) پلڑے بھاری ہوں گے۔''

یہاں یہ نکتہ خصوصی طور پر لائقِ توجہ ہے کہ ان آیات میں ایک ہی قسم کے وزن یا میزان کے ایک ہی پلڑے کا ذکر آیا ہے۔ اس بارے میں عام رائے یہ ہے کہ ''مَوَازِین'' سے مراد یہاں نیکیوں کا وزن ہے۔ یعنی حساب کے وقت ہر شخص کی نیکیوں کا وزن کر کے دیکھا جائے گا کہ یہ وزن ''مطلوبہ معیار'' کے مطابق ہے یا نہیں۔ اور یہ ''مطلوبہ معیار'' بھی ہر شخص کا الگ الگ اس کے ''شاکلہ'' کے

مطابق ہوگا۔ظاہر ہے ہر شخص کی استطاعت (پیدائشی صلاحیتوں اور ماحول کے منفی و مثبت اثرات کے مطابق) دوسرے شخص کی استطاعت سے مختلف ہوگی اور ہر شخص اپنی استطاعت کی حد تک ہی اللہ تعالیٰ کے ہاں مکلّف ہوگا: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ﴾ (البقرۃ:۲۸۶) ''اللہ تعالیٰ نہیں ذِمہ دار ٹھہرائے گا کسی جان کو مگر اُس کی وسعت کے مطابق''۔ چنانچہ ہر شخص کے شاکلہ یعنی اس کے جینز (genes) کی طرف سے اسے حاصل ہونے والی صلاحیتوں اور ماحول کے اثرات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اس کے لیے نیکیوں کے وزن کا ایک خاص معیار مقرر کیا جائے گا۔ اگر تو اس کی نیکیوں کے وزن (مَوَازِيْنُهٗ) کو اس معیار کے مطابق پایا گیا تو اسے کامیابی کا پروانہ مل جائے گا۔

آیت ۷ ﴿فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝۷﴾ ''تو وہ ہوگا عیش و عشرت کی زندگی میں۔''

آیت ۸ ﴿وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۸﴾ ''اور جس (کی نیکیوں) کے پلڑے ہلکے ہوئے۔''

آیت ۹ ﴿فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝۹﴾ ''تو اُس کا ٹھکانہ ایک گہرا گڑھا ہوگا۔''

''هَاوِيَة'' (گہرا گڑھا) جہنّم کا نام ہے۔ اس کو ''ہاویہ'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ جہنّمی اس کی گہرائی میں گرے گا۔ اور اس کو اُمّ (ماں) سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ جس طرح انسان کے لیے ماں جائے پناہ ہوتی ہے اسی طرح اہلِ جہنّم کا ٹھکانہ جہنّم ہوگا۔

آیت ۱۰ ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ۝۱۰﴾ ''اور تم کیا جانتے ہو کہ وہ کیا ہے؟''

آیت ۱۱ ﴿نَارٌ حَامِيَةٌ ۝۱۱﴾ ''آگ ہے دہکتی ہوئی!''

اَللّٰهُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ! يَا مُجِيْرُ يَا مُجِيْرُ يَا مُجِيْرُ!!

سُوْرَةُ التَّكَاثُرِ

سُوْرَةُ التَّكَاثُرِ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۸ رُكُوْعُهَا: ۱

اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ﴿۱﴾ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ؕ﴿۲﴾ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۳﴾ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ؕ﴿۴﴾ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ؕ﴿۵﴾ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۙ﴿۶﴾ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۙ﴿۷﴾ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَىِٕذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ﴿۸﴾ ع

آیت ۱ ﴿اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ﴿۱﴾﴾ ''تمہیں غافل کیے رکھا ہے بہتات کی طلب نے!''

التَّکَاثُر کے معنی مال جمع کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے بھی ہیں اور مال و دولت کی کثرت پر فخر کرنے کے بھی —— دولت انسان کے پاس چاہے جتنی بھی ہو اس کی طبیعت اس سے بھرتی نہیں اور وہ بدستور مزید حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔

آیت ۲ ﴿حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ؕ﴿۲﴾﴾ ''یہاں تک کہ تم قبروں کو پہنچ جاتے ہو۔''

یعنی انسان اپنی ساری عمر اسی تگ و دو میں کھپا دیتا ہے اور مرتے دم تک یہ فکر اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ انسان کی حرص و ہوس کے پیمانے کو صرف قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے[1]۔ سورۃ الحدید کی آیت ۲۰ میں انسانی زندگی کے جن مراحل کا ذکر ہوا ہے ان میں آخری مرحلہ تکاثر فی الاموال والاولاد کا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آخری عمر میں انسان کی یہ حرص مزید بڑھ جاتی ہے۔

آیت ۳ ﴿كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۳﴾﴾ ''کوئی بات نہیں! بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا۔''

آیت ۴ ﴿ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ؕ﴿۴﴾﴾ ''پھر کوئی بات نہیں! بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا۔''

اپنے اسلوب کے اعتبار سے یہ آیات سورۃ النبا کی ان آیات سے مشابہ ہیں: ﴿كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۴﴾ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ؕ﴿۵﴾﴾۔ یعنی ابھی تم لوگ ''تکاثر'' کے نشے میں مست ہونے کی وجہ سے موت کا تصور بھی ذہن میں لانے کے لیے تیار

۱۔ حضرات عبداللہ بن عباس، ابوموسیٰ الاشعری اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے (الفاظ کی معمولی کمی بیشی کے ساتھ) مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَالٍ لَابْتَغٰى وَادِيًا ثَالِثًا ، وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ اِلَّا التُّرَابُ))

(صحیح البخاری، ح: ۶۴۳۶، صحیح مسلم، ح: ۱۰۵۰ و ۱۰۴۸)

''اگر آدم کے بیٹے کے پاس مال سے بھری دو وادیاں ہوں تو وہ لازماً تیسری وادی کی خواہش کرے گا، اور ابن آدم کے پیٹ کو سوائے مٹی کے اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔'' (حاشیہ از مرتب)

نہیں ہو‘ مگر وہ وقت دُور نہیں جب موت خود آ کر تم سے ملاقات کرے گی: ﴿قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۸﴾ (الجمعۃ) ’’(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو وہ تم سے ملاقات کر کے رہے گی‘ پھر تمہیں لوٹا دیا جائے گا اُس ہستی کی طرف جو غیب اور ظاہر سب کا جاننے والا ہے‘ پھر وہ تمہیں جتلا دے گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے‘‘۔ بہرحال جونہی تمہاری آنکھیں بند ہوں گی‘ وہ تمام حقائق تم پر روشن ہو جائیں گے جن سے تم اس وقت نظریں چرانے کی کوشش کر رہے ہو۔

آیت ۵ ﴿كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْیَقِیْنِ ۵﴾ ’’کوئی بات نہیں! کاش کہ تم علم الیقین کے ساتھ جان جاتے!‘‘

یعنی موت یا قیامت کا علم دراصل یقینی علم ہے‘ کاش کہ تمہیں اس کا شعور ہوتا۔ حکماء کے ہاں ہمیں یقین کے تین درجوں کا ذکر ملتا ہے: علم الیقین‘ عین الیقین اور حق الیقین۔ علم الیقین وہ یقین ہے جو انسان کو علم‘ معلومات یا استدلال کی بنیاد پر حاصل ہو۔ مثلاً آپ نے دور سے دھواں اٹھتا دیکھا تو آپ نے کہا کہ وہاں آگ لگی ہوئی ہے‘ حالانکہ آگ آپ نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھی۔ پھر جب آپ نے وہاں جا کر خود اپنی آنکھوں سے آگ کو دیکھ لیا تو آپ کو عین الیقین حاصل ہو گیا۔ لیکن حق الیقین کا درجہ اس سے بھی آگے ہے۔ یقین کا یہ درجہ باقاعدہ تجربے سے حاصل ہوتا ہے‘ اس لیے کہ آنکھ سے دیکھنے میں بھی دھوکے کا امکان ہے۔ ضروری نہیں کہ کوئی چیز جیسی نظر آ رہی ہے حقیقت میں بھی ویسی ہو۔ جیسے آج کل بعض الیکٹرک ہیٹرز میں انگارے دہکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں‘ لیکن جب آپ غور سے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو محض دکھاوے کا منظر ہے اور حرارت کا اصل منبع کہیں اور ہے۔ چنانچہ آگ کے بارے میں آپ کو ’’علم الیقین‘‘ تو محض دھواں دیکھنے سے ہی حاصل ہو گیا۔ پھر جب آپ نے آگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو آپ کا یقین ’’عین الیقین‘‘ میں بدل گیا۔ اس کے بعد جب آپ نے آگ کو چھو کر یا اس کے قریب ہو کر اس کی حرارت کو عملی طور پر محسوس کیا تو آگ کی موجودگی کے بارے میں آپ کا یقین ’’حق الیقین‘‘ کے درجے میں آ گیا۔

آیت ۶ ﴿لَتَرَوُنَّ الْجَحِیْمَ ۶﴾ ’’تم جہنّم کو دیکھ کر رہو گے۔‘‘

آیت ۷ ﴿ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَیْنَ الْیَقِیْنِ ۷﴾ ’’پھر تم اُس کو عین الیقین کے ساتھ دیکھو گے۔‘‘

آیت ۸ ﴿ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ یَوْمَىٕذٍ عَنِ النَّعِیْمِ ۸﴾ ’’پھر اُس دن تم سے ضرور پوچھا جائے گا نعمتوں کے بارے میں۔‘‘

اُس دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ایک ایک نعمت کے بارے میں تم سے جواب طلبی ہو گی کہ دنیا میں تم نے اُس کی کون کون سی نعمتوں سے استفادہ کیا اور ان کے حقوق کہاں تک ادا کیے۔

سُوْرَةُ الْعَصْرِ

تمہیدی کلمات

سورۃ العصر قرآن مجید کی مختصر ترین اور جامع ترین سورتوں میں سے ہے۔ اس کی جامعیت کے بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے درج ذیل دو اقوال بہت اہم ہیں:

(۱) لَوْ لَمْ يُنَزَّلْ مِنَ الْقُرْآنِ سِوَاهَا لَكَفَتِ النَّاسَ ''اگر قرآن مجید میں سوائے اِس (سورۃ العصر) کے کچھ اور نازل نہ بھی ہوتا تو لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے یہی کافی ہوتی۔''

(۲) لَوْ تَدَبَّرَ النَّاسُ هٰذِهِ السُّوْرَةَ لَوَسِعَتْهُمْ ''اگر لوگ تنہا اسی ایک سورت پر غور کریں تو یہ ان کے لیے کافی ہو جائے۔''

یہ سورت ''مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب'' کا نقطہ آغاز بھی ہے۔ یعنی ہمارے منتخب نصاب کا پہلا درس سورۃ العصر کے بارے میں ہے۔ اس سورت پر میری ایک کتاب اور ایک مختصر کتابچہ بھی موجود ہے۔ تفصیلی معلومات کے لیے ان سے استفادہ کرنا مفید رہے گا۔

سُوْرَةُ الْعَصْرِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۳ رُكُوْعُهَا: ۱

وَ الْعَصْرِ ۙ﴿۱﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۙ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۳﴾ ع

آیت ۱ ﴿وَالْعَصْرِ ۙ﴿۱﴾﴾ ''زمانے کی قسم ہے۔''

یعنی اس حقیقت پر زمانہ گواہ ہے یا پوری تاریخ انسانی شاہد ہے کہ:

آیت ۲ ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ﴿۲﴾﴾ ''یقیناً انسان خسارے میں ہے۔''

اگلی آیت میں اس نقصان اور خسارے سے بچاؤ کے لیے چار شرائط بتائی گئی ہیں' لیکن ان میں سے کوئی ایک یا دو یا تین شرائط پوری کر دینے سے مذکورہ خسارے سے بچنے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ کامیابی کے لیے بہر حال چاروں شرائط پر عمل درآمد ضروری ہے۔

آیت ۳ ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۳﴾﴾ ''سوائے اُن کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور انہوں نے ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور انہوں نے باہم ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔''

ان شرائط میں پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان ایمان لائے۔ اس میں ایمان باللہ' ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت سمیت تمام ایمانیات شامل ہیں۔ یعنی انسان اس کائنات کے مخفی اور غیبی حقائق کو سمجھے' اُن کا شعور حاصل کرے اور اُن کی تصدیق

کرے۔ ایمان لانے کے بعد دوسری شرط اس ایمان کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے سے متعلق ہے۔ یعنی اگر انسان اللہ پر ایمان رکھتا ہے تو اس کے عمل اور کردار سے ثابت ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کا فرمانبردار بندہ ہے اور اُس کی نافرمانی سے ڈرتا ہے۔ غرض وہ ہر اس عمل کو اپنے شب و روز کے معمول کا حصہ بنانے پر کمربستہ ہو جائے جس کا اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے اور ہر اُس فعل سے اجتناب کرنے کی فکر میں رہے جس سے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے منع کیا ہے۔

تیسری شرط ''تواصی بالحق'' کی ہے۔ یعنی جس حق کو انسان نے خود قبول کیا ہے اور اپنی عملی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالا ہے اس حق کی تبلیغ و اشاعت کے لیے وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا علمبردار بن جائے۔ اس کے بعد چوتھی اور آخری شرط ''تواصی بالصبر'' کی ہے اور یہ ''تواصی بالحق'' کا لازمی اور منطقی نتیجہ بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا جو بندہ ''تواصی بالحق'' کا علَم اٹھائے گا اُسے شیطانی قوتوں کی مخالفت مول لے کر آزمائش و ابتلا کی مشکل گھاٹیوں سے بھی گزرنا ہوگا اور اس راستے پر چلتے ہوئے نہ صرف اُسے خود صبر و استقامت کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھنا ہوگا بلکہ اسے اپنے ہمراہیوں اور ساتھیوں کو بھی اس کی تلقین و نصیحت کرنا ہوگی۔ اسی لیے حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو جب امر بالمعروف کی نصیحت کی تو ساتھ ہی صبر کی تلقین بھی کی تھی: ﴿يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ؕ﴾ (لقمٰن: ۱۷) ''اے میرے بچے! نماز قائم کرو اور نیکی کا حکم دو اور بُرائی سے روکو اور جو بھی تکلیف تمہیں پہنچے اس پر صبر کرو!''

بہرحال راہِ حق کے مسافروں کو پہلے سے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ راستہ آزمائش و ابتلا کے خارزاروں سے ہو کر گزرتا ہے: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾ (البقرۃ) ''اور ہم تمہیں لازماً آزمائیں گے کسی قدر خوف اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور ثمرات کے نقصان سے۔ اور (اے نبی ﷺ!) بشارت دیجیے ان صبر کرنے والوں کو۔''

؎ یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! آمین!

سُوْرَۃُ الْھُمَزَۃِ

تمہیدی کلمات

سورۃ العصر میں نسلِ انسانی کو ایک بہت بڑے ممکنہ خسارے کی وعید سنائی گئی ہے اور ساتھ ہی اس خسارے سے بچنے کا طریقہ بھی بتایا گیا ہے۔ اب سورۃ الہمزہ میں تصویر کے دوسرے رخ کے طور پر ان لوگوں کے کردار کی جھلک دکھائی جا رہی ہے جو آخرت کے بارے میں کسی تنبیہ یا وعید کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھتے اور اندھا دھند اسی راستے پر بھاگے چلے جا رہے ہیں جو حقیقت میں خسارے اور بربادی کا راستہ ہے۔ دراصل جب انسان کے سامنے کوئی اعلیٰ نصب العین یا آدرش (ideal) نہیں ہوتا تو اس کی شخصیت پستی کی طرف مائل ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس روش پر چلتے چلتے وہ پستی کی اس حد تک پہنچ جاتا ہے جہاں اُس کے اخلاق و کردار میں خیر اور بھلائی کی کوئی رمق بھی باقی نہیں رہتی۔ ایسا انسان معاشرے میں رہتے ہوئے کسی کی غیبت کرتا ہے تو کسی پر طعنہ زنی کرتا ہے، کسی کی عزّت پر حملہ کرتا ہے تو کسی کا مال ہڑپ کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی وقت وہ کوئی نیک کام بھی کرتا دکھائی دیتا ہے تو اس کے پیچھے بھی اس کا کوئی ذاتی مفاد پوشیدہ ہوتا ہے۔ غرض اُس کی ہر حرکت اُس کی پست سوچ کی مظہر اور اس کا ہر فعل اس کے گھٹیا کردار کا عکاس ہوتا ہے۔ پھر جب کسی معاشرے کے انسانوں کی غالب اکثریت پستی اور گھٹیا پن کا یہ رنگ اپنا لیتی ہے تو وہ معاشرہ مجموعی طور پر ہر قسم کے خیر سے محروم ہو کر گندگی اور غلاظت کے متعفّن ڈھیر کا روپ دھار لیتا ہے۔

ایسے معاشرے کو دیکھ کر ایک حساس انسان بجا طور پر مایوسی کی اَتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے۔ دوسری طرف اس معاشرے کے فلسفی اور حکماء انسان کے بارے میں ایسے فتوے جاری کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھنے لگتے ہیں کہ انسان تخلیقی اعتبار سے محض حیوانی داعیات و شہوات کا پتلا اور گندگی کی ایک پوٹ ہے اور یہ کہ اس میں خیر اور بھلائی کا کوئی عنصر سرے سے موجود ہی نہیں۔ ایسے ہی منفی نظریات و خیالات کے جواب کے طور پر سورۃ التین میں نسلِ انسانی کی چار عظیم شخصیات (حضرت نوح، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے اخلاق و کردار کو بطور نمونہ پیش کر کے ثابت کیا گیا ہے کہ انسان بنیادی طور پر احسنِ تقویم کی سطح پر پیدا ہوا ہے۔ البتہ جب یہ اپنے فطری شرف سے غافل ہو جاتا ہے اور اپنی اصل عظمت کو فراموش کر دیتا ہے تب یہ پستی میں گرتے گرتے اَسفل سافلین کے زمرے میں شمار ہو جاتا ہے۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان جب شرفِ انسانیت کی خلعتِ فاخرہ کو اُتار پھینکتا ہے اور اپنے حیوانی داعیات کی تسکین و تشفّی کو ہی اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتا ہے تو پھر یہ خنزیر سے بڑھ کر شہوت پرست، اونٹ سے بڑھ کر کینہ پرور اور بھیڑیے سے بڑھ کر سفّاک بن جاتا ہے۔ یعنی یہ اشرف المخلوقات جب حیوان بنتا ہے تو بے حیائی، خود غرضی اور خون خواری کی دوڑ میں تمام حیوانوں کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔

سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۹ رُكُوْعُهَا: ۱

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۙ ۝۱ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗۙ ۝۲ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗۚ ۝۳ كَلَّا
لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِۚ ۝۴ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُۭ ۝۵ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُۙ ۝۶ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى
الْاَفْـِٕدَةِؕ ۝۷ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌۙ ۝۸ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝۹

آیت ۱ ﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۙ ۝۱﴾ ''بڑی خرابی ہے ہر اُس شخص کے لیے جو لوگوں کے عیب چُنتا رہتا ہے اور طعنے دیتا رہتا ہے۔''

هُمَزَة اور لُمَزَة دونوں الفاظ معنی کے اعتبار سے باہم بہت قریب ہیں۔ بعض اہلِ لغت کے نزدیک روبرو طعنہ زنی کرنے والے کو هُمَزَة اور پسِ پشت عیب جوئی کرنے والے کو لُمَزَة کہتے ہیں' جبکہ بعض اہلِ لغت نے ان کا معنی برعکس بیان کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ ہر چغلی کھانے والے' دوستوں میں جدائی اور تفرقہ ڈالنے والے' بے قصور اور بے عیب انسانوں میں نقص نکالنے والے کو هُمَزَة اور لُمَزَة کہتے ہیں۔

آیت ۲ ﴿الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝۲﴾ ''جو مال جمع کرتا رہا اور اس کو گنتا رہا۔''

جس نے اپنی زندگی اور زندگی کی ساری جدّوجُہد مال کمانے اور اس کا حساب رکھنے میں برباد کر دی۔ وہ یہی سوچ سوچ کر خوش ہوتا رہا کہ اس ماہ میرے اکاؤنٹس میں اتنے فیصد اضافہ ہو گیا ہے اور پچھلے سال کے مقابلے میں اس سال میرے اثاثہ جات اس قدر بڑھ گئے ہیں۔

آیت ۳ ﴿يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۝۳﴾ ''وہ سمجھتا ہے کہ اُس کا مال اسے ہمیشہ باقی رکھے گا۔''

گویا اُس کے مال نے اسے زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ ایک دولت مند آدمی اپنی دولت کے ذریعے دنیا میں ایسے آثار و نقوش چھوڑ کر جانا چاہتا ہے جن کی وجہ سے اس کا نام دنیا میں ہمیشہ رہے۔ انسان کی اسی خواہش نے اسے اہرامِ مصر جیسے عجائبات کی تخلیق پر مجبور کیا۔ مشہور انگریزی نظم "The Pyramids" کے ان الفاظ میں انسان کی اسی نفسیات کی عکاسی کی گئی ہے:

Calm and self possessed,
Still and resolute,
Pyramids echo into eternity,
They define the cry of man's will
To survive and conquer the storms of time.

آیت ۴ ﴿كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝۴﴾ ''ہرگز نہیں' وہ تو یقیناً جھونک دیا جائے گا حُطَمہ میں۔''

حُطَمَة : حَطَمَ سے ہے' یعنی توڑ ڈالنے والی' پیس ڈالنے والی' چُور چُور اور ریزہ ریزہ کر دینے والی۔ یہ دوزخ کے ایک خاص طبقے کا نام ہے جس کی آگ اتنی تیز ہو گی کہ اس میں جو شے بھی ڈالی جائے گی اس کو آنِ واحد میں پیس کر رکھ دے گی۔

آیت ۵ ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝۵﴾ ''اور کیا تم جانتے ہو وہ حُطمہ کیا ہے؟''

آیت ۶ ﴿نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝۶﴾ ''وہ آگ ہے اللہ کی بھڑکائی ہوئی۔''

آیت ۷ ﴿الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝۷﴾ ''جو دلوں کے اوپر جا چڑھے گی۔''

یعنی اس آگ کی حدت اور تپش انسان کی جلد سے زیادہ اس کے دل پر اثر انداز ہو گی۔ بہرحال آج جب انسان خود Infra red Rays اور Ultra violet Rays سمیت آگ اور حرارت کی رنگا رنگ اقسام ایجاد کر چکا ہے اس کے لیے ''حُطَمَہ'' کی مذکورہ خصوصیت کو سمجھنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ ایک صاحب نے خیال پیش کیا ہے کہ حُطَمَۃ ایٹمی حرارت کی کوئی شکل ہو گی۔ ان کا کہنا ہے کہ ایٹم سے جو حرارت پھیلتی ہے وہ براہِ راست آگ نہیں ہوتی لیکن انسان کے وجود کو چیرتی چلی جاتی ہے۔

آیت ۸ ﴿اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۝۸﴾ ''بے شک وہ (آگ) ان پر بند کر دی جائے گی۔''

تا کہ اس کی تمام تر حرارت ان پر اثر انداز ہو اور انہیں زیادہ سے زیادہ تکلیف پہنچے۔

آیت ۹ ﴿فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝۹﴾ ''بڑے اونچے اونچے لمبے ستونوں میں۔''

اَللّٰھُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ! یَامُجِیْرُ یَامُجِیْرُ یَا مُجِیْرُ!!

سُوْرَةُ الْفِيْلِ

تمہیدی کلمات

سورۃ الفیل اور اس کے بعد کی سورتوں میں سے اکثر کا تعلق حضور ﷺ کی سیرت یا آپ ﷺ کے زمانے کے عرب معاشرے کے ماحول اور حالات سے ہے۔ جیسے سورۃ الفیل میں جس واقعہ کا ذکر ہے یہ واقعہ اُسی سال پیش آیا جس سال حضور ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ آپؐ کی ولادت عین اس واقعہ کے دن ہوئی تھی۔ البتہ کچھ ایسی روایات بھی ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ اس واقعہ کے پچاس دن بعد پیدا ہوئے تھے۔

اس واقعہ کا پس منظر یوں ہے کہ یمن کے عیسائی بادشاہ اَبرہہ نے خانہ کعبہ کے مقابلے میں ایک عالیشان کلیسا اس غرض سے تعمیر کرایا کہ عرب کے لوگ خانہ کعبہ کا حج کرنے کے بجائے اس کلیسا میں حاضری دیا کریں۔ لیکن اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانے میں ناکام رہا۔ اسی دوران کسی عرب نے شرارتاً اس کلیسا میں رفع حاجت کر کے غلاظت بکھیر دی۔ ابرہہ تو پہلے ہی حسد کی آگ میں جل رہا تھا، اس واقعہ کو بہانہ بنا کر اُس نے کعبہ کو مسمار کرنے کے ارادے سے مکہ مکرمہ پر باقاعدہ چڑھائی کر دی۔ مکہ پر حملہ آور ہونے والے ابرہہ کے لشکر کی تعداد ساٹھ ہزار تھی اور ان کے ساتھ بہت سے ہاتھی بھی تھے۔ اسی لیے عربوں نے اس لشکر کو ''اصحابُ الفیل'' کا نام دیا اور جس سال یہ لشکر حملہ آور ہوا تھا وہ سال ان کے ہاں ''عامُ الفیل'' کے نام سے مشہور ہوا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر اپنے گھر کی حفاظت فرمائی اور ابرہہ کے لشکر کو چھوٹے چھوٹے پرندوں کے ذریعے نیست و نابود کر دیا۔

سُوْرَةُ الْفِيْلِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۵ رُكُوْعُهَا: ۱

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝۱ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝۲ وَّ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝۳ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝۴ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝۵

آیت ۱ ﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝۱﴾ ''کیا تم نے دیکھا نہیں کیا حشر کیا تمہارے رب نے اُن ہاتھی والوں کا؟''

آیت ۲ ﴿اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝۲﴾ ''کیا اُس نے اُن کی تمام تدبیروں کو بے کار اور غیر مؤثر نہیں کر دیا؟''

اَبرہہ کی اس لشکر کشی کا مقصد انہدامِ کعبہ کے علاوہ عرب میں عیسائیت پھیلانا اور اُس تجارت پر قبضہ کرنا بھی تھا جو بلادِ مشرق اور رومی مقبوضات کے درمیان عربوں کے ذریعے ہوتی تھی۔

آیت ۳ ﴿وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝۳﴾ ''اور اُن پر بھیج دیے جُھنڈ کے جُھنڈ اُڑتے ہوئے پرندوں کے۔''

آیت ۴ ﴿تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝۴﴾ ''جو اُن پر مارتے تھے کنکر کی پتھریاں۔''

رَمٰی یَرْمِی رَمْیًا کا معنی ہے پھینکنا' مارنا۔ حج کے دوران شیطان کو کنکریاں مارنے کے عمل کو بھی ''رمیٔ جمرات'' کہا جاتا ہے۔ لفظ سِجِّیْل دراصل فارسی ترکیب ''سنگِ گِل'' سے معرب ہے (فارسی کی ''گ'' عربی میں آکر ''ج'' سے بدل گئی ہے)۔ فارسی میں سنگ بمعنی پتھر اور گِل بمعنی مٹی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ سنگِ گِل کے لغوی معنی ہیں مٹی کا پتھر۔ اس سے مراد وہ کنکریاں ہیں جو پتلی زمین پر ہلکی بارش برسنے اور بعد میں مسلسل تیز دھوپ چمکنے کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں۔ یعنی بارش کے ایک ایک قطرے کے ساتھ جو ریت ملی مٹی گیلی ہو جاتی ہے وہ بعد میں مسلسل تیز دھوپ کی حرارت سے پک کر سخت کنکری بن جاتی ہے۔

ابرہہ کے لشکر جرار کو تباہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کو کسی غیر معمولی طاقت کے استعمال کی ضرورت نہ پڑی' بلکہ اُس نے چھوٹے چھوٹے پرندوں کے جُھنڈ بھیج دیے جو ساحلِ سمندر کی طرف سے اُمڈ پڑے اور چند لمحوں کی سنگ باری سے اس لشکر کا بھرکس نکال دیا۔ ان میں سے ہر پرندہ تین چھوٹی چھوٹی کنکریاں اٹھائے ہوئے تھا' ایک اپنی چونچ میں اور دو اپنے پنجوں میں۔

آیت ۵ ﴿فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝۵﴾ ''پھر اُس نے کر دیا ان کو کھائے ہوئے بُھس کی طرح۔''

یعنی اس پورے لشکر کی حالت اُس چارے یا بُھس کی طرح ہو گئی جسے جانوروں نے کھا کر چھوڑ دیا ہو۔

سُوْرَةُ قُرَيْشٍ

سُوْرَةُ قُرَيْشٍ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۴ رُكُوْعُهَا: ۱

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ۙ﴿۱﴾ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۚ﴿۲﴾ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۙ﴿۳﴾ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿۴﴾

آیت ۱ ﴿لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ۙ﴿۱﴾﴾ ''قریش کے مانوس رکھنے کی وجہ سے۔''

آیت ۲ ﴿اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۚ﴿۲﴾﴾ ''(یعنی) سردیوں اور گرمیوں کے سفر سے ان کو مانوس رکھنے کی وجہ سے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ نے قریش کے دلوں میں سردی اور گرمی کے تجارتی سفروں کی اُلفت ومحبت پیدا کر دی۔

اِیْلاف: اَلِفَ یَأْلَفُ اَلْفًا سے باب افعال کا مصدر ہے' یعنی مانوس کرنا اور خوگر بنانا۔ اردو میں اُلفت اور مالوف کے الفاظ بھی اسی سے ماخوذ ہیں۔

سورۂ قریش کی پہلی دو آیات میں قریش کی اس اجارہ داری کی طرف اشارہ ہے جو حضور ﷺ کی پیدائش سے قبل زمانے میں انہیں مشرق اور مغرب کی تجارت پر حاصل تھی۔ اس زمانے میں مشرقِ بعید کے ممالک (ہندوستان' جاوا' ملایا' سماٹرا' چین وغیرہ) سے بحر ہند کے راستے جو سامانِ تجارت آتا تھا وہ یمن کے ساحل پر اترتا تھا۔ دوسری طرف یورپ سے آنے والے جہاز شام اور فلسطین کے ساحل پر لنگر انداز ہوتے تھے۔ اس کے بعد یمن سے سامانِ تجارت کو شام پہنچانے اور ادھر کا سامان یمن پہنچانے کے لیے خشکی کا راستہ استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ یمن اور شام کے درمیان اس راستے کی حیثیت اُس زمانے میں گویا بین الاقوامی تجارتی شاہراہ کی سی تھی۔ ظاہر ہے یورپ کو انڈیا سے ملانے والا سمندری راستہ (around the cape of good hope) تو واسکوڈے گاما نے صدیوں بعد ۱۴۹۸ء میں دریافت کیا تھا' جبکہ بحیرۂ احمر کو بحر روم سے ملانے والی نہر سویز ۱۸۶۹ء میں بنی تھی۔

حضور ﷺ کی ولادت سے تقریباً ڈیڑھ دو سو سال پہلے تک اس تجارتی شاہراہ پر قومِ سبا کی اجارہ داری تھی۔ لیکن جب ''سدِّ مآرب'' ٹوٹنے کی وجہ سے اس علاقے میں سیلاب آیا اور اس سیلاب کی وجہ سے اس قوم کا شیرازہ بکھر گیا تو یہ شاہراہ کلی طور پر قریشِ مکہ کے قبضے میں چلی گئی۔ قریشِ مکہ چونکہ کعبہ کے متولی تھے اس لیے پورے عرب میں انہیں عزّت وعقیدت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں جہاں کوئی بھی تجارتی قافلہ لٹیروں اور ڈاکوؤں کے ہاتھوں محفوظ نہیں تھا وہاں قریش کے قافلوں کو پورے عرب میں کوئی میلی نظر سے بھی نہیں دیکھتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عرب کے تمام قبائل نے اپنے اپنے بُت خانہ کعبہ میں نصب کر رکھے تھے۔ گویا ہر قبیلے کا ''خدا'' قریش کی مہربانی سے ہی خانہ کعبہ میں قیام پذیر تھا' بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ قریش کے پاس یرغمال تھا۔ اس

لیے عرب کا کوئی قبیلہ بھی ان کے قافلوں پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ قریش کے قافلے سارا سال بلاخوف وخطر یمن سے شام اور شام سے یمن کے راستے پر رواں دواں رہتے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں وہ لوگ شام وفلسطین کے سرد علاقوں جبکہ سردیوں میں یمن کے گرم علاقے کا سفر اختیار کرتے تھے۔ آیت زیر مطالعہ میں ان کے اسی تجارتی سفر کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے بین الاقوامی تجارتی شاہراہ پر مکمل اجارہ داری' تجارتی قافلوں کے ہمہ وقت تحفظ کی یقینی ضمانت اور موسموں کی موافقت اور مطابقت سے سرد وگرم علاقوں کے سفر کی سہولت' یہ ان لوگوں کے لیے ایسی نعمتیں تھیں جس پر وہ اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کرتے کم تھا۔ اس لیے ان نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

آیت ۳ ﴿فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝۳﴾ ''پس انہیں بندگی کرنی چاہیے اس گھر کے رب کی۔''

ظاہر ہے ان کے جدِ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کا یہ گھر (ع ''دنیا کے بُت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا'') توحید کے مرکز کی حیثیت سے تعمیر کیا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو اس گھر کے پہلو میں بساتے وقت توحید کے اعتبار سے ان کی ذمہ داری کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا: ﴿لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ تاکہ وہ اللہ کی بندگی کے طور پر نماز قائم کریں۔ چنانچہ چاہیے تو یہ تھا کہ جس کعبہ کی تولیت کی وجہ سے انہیں خوشحالی اور عزت ملی تھی وہ اس گھر کے مالک کو پہچانتے اور اس کا حق ادا کرتے۔ لیکن اس کے برعکس انہوں نے اللہ کے اس گھر میں ۳۶۰ بُت نصب کر کے اسے دنیا کے سب سے بڑے بُت کدے میں تبدیل کر دیا اور اس کے اصل مالک کو بالکل ہی فراموش کر دیا۔

آیت ۴ ﴿الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ﴾ ''جس نے انہیں بھوک میں کھانے کو دیا''

انہیں رزق عطا فرما کر فاقہ کشی سے محفوظ رکھا۔ جب عرب کے عام لوگ غربت اور تنگ دستی کا شکار تھے اُس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے قریشِ مکہ کو کامیاب تجارت اور کعبہ کی تولیت کی وجہ سے معاشی خوشحالی سے نواز رکھا تھا۔

﴿وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝۴﴾ ''اور انہیں خوف سے امن عطا کیا۔''

ان کے قافلے سارا سال یمن اور فلسطین کے درمیان بلاخوف وخطر محوِ سفر رہتے تھے۔ خداداد تحفظ کی یہ ضمانت انہیں اس سرزمین میں میسر تھی جہاں ہر طرف جنگل کے قانون کا راج تھا۔

سُوْرَةُ الْمَاعُوْنِ

تمہیدی کلمات

سورۃ الماعون میں اس معاشرے کے اخلاقی انحطاط کی جھلک دکھائی گئی ہے جس میں حضور ﷺ کی بعثت ہوئی۔ وہ لوگ بظاہر تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیروکار تھے' لیکن عملی طور پر صورتحال یہ تھی کہ ان کے عقائد ونظریات مسخ ہو چکے تھے اور معاشرتی واخلاقی اقدار بھی ان کے ہاں اب محض روایتوں اور رسموں کی حد تک زندہ رہ گئی تھیں۔ بدقسمتی سے آج اُمتِ مُسلمہ بھی ایسے ہی نظریاتی واخلاقی انحطاط کا نقشہ پیش کر رہی ہے۔

سُوْرَةُ الْمَاعُوْنِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۷ رُكُوْعُهَا: ۱

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝۱ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝۲ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝۳ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝۴ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝۵ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝۶ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝۷

آیت ۱ ﴿اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝۱﴾ ''کیا تم نے دیکھا اُس شخص کو جو جزا وسزا کو جھٹلاتا ہے؟''

جو نہ تو بعث بعد الموت کا قائل ہے اور نہ ہی آخرت کی جزا وسزا کو مانتا ہے۔ ایسے لوگ سمجھتے ہیں کہ اس زندگی کے سوا ان کی کوئی اور زندگی نہیں ہے: ﴿وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ﴾ (الجاثیۃ: ۲۴) ''وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہے (کوئی اور زندگی) سوائے ہماری دنیا کی زندگی کے' ہم خود ہی مرتے ہیں اور خود ہی جیتے ہیں اور ہمیں نہیں ہلاک کرتا مگر زمانہ۔''

آخرت کے احتساب کا انکار کر کے انسان دراصل جائز وناجائز اور حلال وحرام کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور اس کا کردار ع ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' کے فلسفے کا چلتا پھرتا اشتہار بن کر رہ جاتا ہے۔

آیت ۲ ﴿فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝۲﴾ ''یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔''

ظاہر ہے جو انسان اچھے بُرے اعمال کی جزا وسزا کو نہیں مانتا وہ معاشرے کے ایسے افراد کے لیے اپنا مال بھلا کیوں ضائع کرے گا جن سے اسے کسی فائدے کی توقع نہیں؟

آیت ۳ ﴿وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝۳﴾ ''اور نہ وہ مسکین کو کھانا کھلانے کی تلقین کرتا ہے۔''

اس میں انسان کی اس اخلاقی کمزوری کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جس نیک کام پر وہ خود کاربند نہیں ہے اس کے بارے میں

دوسروں کو کس مُنہ سے نصیحت کرے۔

آیت ۴ تا ۵ ﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝﴾ ''تو بربادی ہے اُن نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت کے زمانے تک مشرکینِ عرب کے ہاں نماز کا تصور موجود تھا لیکن اس کی عملی شکل بالکل مسخ ہو چکی تھی۔ جیسا کہ سورۃ الانفال کی اس آیت سے بھی ظاہر ہوتا ہے: ﴿وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ۭ﴾ (آیت ۳۵) ''اور نہیں ہے ان کی نماز بیت اللہ کے پاس سوائے سیٹیاں بجانا اور تالیاں پیٹنا''۔ ظاہر ہے جو لوگ برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے اور اس طواف کو سب سے اعلیٰ طواف سمجھتے تھے' ان کے لیے تو نماز میں سیٹیاں بجانا اور تالیاں پیٹنا بھی ایک مقدس عمل اور حصولِ ثواب کا بہت بڑا ذریعہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم مسلمانوں کے ہاں نماز کی ظاہری شکل آج تک اپنی اصلی حالت میں جوں کی توں قائم ہے۔ حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نماز پڑھنے کا طریقہ سکھایا اور پھر حکم دیا: ((صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ))[1] کہ تم لوگ نماز اسی طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔ حضور ﷺ کی نماز کا وہ طریقہ اور عملی نمونہ جو صحابہؓ کی وساطت سے ہم تک پہنچا ہے' آج ہم اس پر تو کاربند ہیں لیکن بدقسمتی سے نماز کی اصل روح سے ہم بالکل غافل ہو چکے ہیں۔ نماز کی اصل روح تو نمازی کا خضوع وخشوع اور یہ احساس ہے کہ وہ کس کے سامنے کھڑا ہے اور کس کے حضور کھڑے ہو کر اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ جیسا عہد و پیمان باندھ رہا ہے۔ بہرحال آج ہماری نمازیں اس روح سے خالی ہو کر محض ایک ''رسم'' کی ادائیگی کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں (الا ماشاء اللہ)۔ اقبال نے اپنے خصوصی انداز میں مسلمانوں کی اس زبوں حالی کی تصویر انہیں بار بار دکھائی ہے:ؔ

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی — فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی!

اور ؔ

نماز و روزہ و قربانی و حج — یہ سب باقی ہیں تُو باقی نہیں ہے!

آیت ۶ ﴿الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جو دکھاوا کرتے ہیں۔''

وہ نماز کی ادائیگی سمیت ہر نیک کام لوگوں کو دکھانے کے لیے کرتے ہیں تاکہ ان کی نیکی کا چرچا ہو۔

آیت ۷ ﴿وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝﴾ ''اور عام استعمال کی چیز بھی (مانگنے پر) نہیں دیتے۔''

مَاعُوْن کے معنی روزمرہ استعمال کی چیزیں ہیں' جو ہر پڑوسی بوقت ضرورت اپنے پڑوسی سے عاریتاً لے لیتا ہے اور اپنی ضرورت پوری کر کے واپس لوٹا دیتا ہے۔ ایسے لوگوں کے کردار کی پستی کا یہ عالَم ہے کہ وہ اپنے پاس سے آگ کی چنگاری (ماچس وغیرہ) اور نمک جیسی معمولی اشیاء تک بھی کسی کو دینا پسند نہیں کرتے۔

۱۔ صحیح البخاری' کتاب الاذان' باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعة...' ح: ۶۳۱۔

سُوْرَةُ الْكَوْثَرِ

تمہیدی کلمات

سورۃ الکوثر اور اس سے پہلے کی تین سورتوں کے مضمون میں باہم گہرا ربط اور تعلق پایا جاتا ہے۔ اس ربط کو یوں سمجھئے کہ پہلی تین سورتوں (سورۃ الفیل، سورۂ قریش اور سورۃ الماعون) میں حضور ﷺ کی بعثت سے قبل کے ماحول کا تاریخی، اقتصادی اور اخلاقی پس منظر دکھایا گیا ہے، جبکہ سورۃ الکوثر میں آپ ﷺ کی بعثت کا ذکر ہے۔ گویا مذکورہ تینوں سورتوں کی حیثیت سورۃ الکوثر کی تمہید کی سی ہے۔ سورۃ الفیل میں اُس دور کے ایک بہت اہم تاریخی واقعہ کا ذکر ہے۔ سورۂ قریش میں قریشِ مکہ کی اقتصادیات کا حوالہ ہے کہ انہیں جو خوشحالی اور امن وامان حاصل ہے وہ صرف اور صرف بیت اللہ کی وجہ سے ہے، جبکہ سورۃ الماعون میں اس معاشرے کی اخلاقی پستی کی نشاندہی کی گئی ہے، اور اب سورۃ الکوثر میں حضور اکرم ﷺ کی بعثت کا ذکر ہے۔

سُوْرَةُ الْكَوْثَرِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۳ رُكُوْعُهَا: ۱

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝۱ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝۲ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝۳

آیت ۱ ﴿اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝۱﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو خیرِ کثیر عطا کیا۔''

الکوثر: کثرت سے ماخوذ ہے، اس کا وزن فَوْعَلٌ ہے جو مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس کا معنی ہے کسی چیز کا اتنا کثیر ہونا کہ اس کا اندازہ نہ لگایا جا سکے۔ چنانچہ اس کا ترجمہ ''خیرِ کثیر'' کیا گیا ہے۔

''الکوثر'' کے بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس سے حوضِ کوثر مراد ہے، جو میدانِ حشر میں ہوگا اور اس سے حضور ﷺ اپنی اُمت کے پیاسوں کو سیراب فرمائیں گے۔ لیکن درحقیقت وہ بھی ''خیرِ کثیر'' ہی میں شامل ہے۔ ''خیرِ کثیر'' کی وضاحت سے متعلق بھی تفاسیر میں لگ بھگ پچیس تیس اقوال ملتے ہیں۔ حضور ﷺ کو عطا ہونے والے خیرِ کثیر کی سب سے بڑی مثال خود قرآن مجید ہے۔ اسی طرح اس کی ایک مثال حکمت بھی ہے۔ ظاہر ہے آپ ﷺ کو اعلیٰ ترین درجے میں حکمت بھی عطا ہوئی تھی، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ﴾ (البقرۃ:۲۶۹) ''وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے، اور جسے حکمت دے دی گئی اسے تو خیرِ کثیر عطا ہو گیا''۔ مزید برآں جنت کی نہر کوثر، نبوت کے فیوض و برکات، دینِ اسلام، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کثرت، رفع ذکر اور مقامِ محمود کو ''کوثر'' کا مصداق سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے نبی (ﷺ) ہم نے آپ کو وہ سب کچھ عطا کر دیا اور کثرت کے ساتھ عطا کر دیا جس کی انسانیت کو ضرورت ہے اور جو نوعِ انسانی کے لیے طرۂ امتیاز بن سکتا ہے۔

آیت ۲ ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝۲﴾ ''پس آپؐ اپنے رب کے لیے نماز پڑھا کیجیے اور قربانی کیا کیجیے۔''

نحر کے لغوی معنی اونٹ ذبح کرنے کے ہیں۔ اس آیت میں جن دو احکام کا ذکر ہے ان دونوں پر عیدالاضحیٰ کے دن عمل ہوتا ہے۔ یعنی عیدالاضحیٰ کے دن پہلے مسلمان نماز پڑھتے ہیں اور پھر جانور قربان کرتے ہیں۔

آیت ۳ ﴿إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ۝۳﴾ ''یقیناً آپ (ﷺ) کا دشمن ہی جڑ کٹا ہوگا۔''

شَانِئ بغض و عداوت رکھنے والے دشمن کو کہتے ہیں۔ اَبْتَر: بتر سے ہے' یعنی کسی چیز کو کاٹ دینا' منقطع کر دینا۔ اہلِ عرب دُم کٹے جانور کو اَبْتَر کہتے ہیں۔ عرفِ عام میں اس سے ایسا آدمی مراد لیا جاتا ہے جس کی نرینہ اولاد نہ ہو اور جس کی نسل آگے چلنے کا کوئی امکان نہ ہو۔ یہ لفظ مشرکینِ مکہ نے (معاذ اللہ) حضور ﷺ کے لیے استعمال کیا تھا' جس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بطن سے حضور ﷺ کی یہ اولاد پیدا ہوئی: قاسم' پھر زینب' پھر عبداللہ' پھر رقیہ' پھر اُمّ کلثوم' پھر فاطمہ۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ پہلے قاسم کا انتقال ہوا۔ پھر عبداللہ (جن کا لقب طیب و طاہر ہے) داغِ مفارقت دے گئے۔ اس پر مشرکین نے خوشیاں منائیں کہ آپؐ کے دونوں فرزند فوت ہو گئے ہیں اور باقی اولاد میں آپؐ کی بیٹیاں ہی بیٹیاں ہیں۔ لہٰذا آپؐ جو کچھ بھی ہیں بس اپنی زندگی تک ہی ہیں' آپؐ کے بعد نہ تو آپؐ کی نسل آگے چلے گی اور نہ ہی کوئی آپؐ کا نام لیوا ہوگا۔ اس پس منظر میں یہاں ان لوگوں کو سنانے کے لیے فرمایا جا رہا ہے کہ اے نبی ﷺ! آپ کا نام اور ذکر تو ہم بلند کریں گے' جس کی وجہ سے آپ کے نام لیوا تو اربوں کی تعداد میں ہوں گے۔ البتہ آپ کے یہ دشمن واقعی اَبْتَر ہوں گے جن کا کوئی نام لیوا نہیں ہوگا۔

سُوْرَةُ الْكٰفِرُوْنَ

تمہیدی کلمات

سورۃ الکافرون گویا حضور ﷺ کا اُن لوگوں سے اعلانِ براءت ہے جن پر ہر لحاظ سے ''حق'' واضح ہو چکا تھا اور وہ اس اتمامِ حُجّت کے باوجود بھی آپؐ کو جھٹلانے پر تُلے ہوئے تھے۔ یہ موڑ ہر رسولؑ کی دعوت کے سفر کے دوران آتا رہا ہے۔ ظاہر ہے ایسے اعلان کا انداز ناصحانہ یا واعظانہ نہیں بلکہ جارحانہ ہوتا ہے۔ یہ سورۂ مبارکہ مکہ مکرمہ کے اُس دور میں نازل ہوئی جب قریشِ مکہ وقتاً فوقتاً رسول اللہ ﷺ کے پاس مصالحت کی مختلف تجویزیں لے لے کر آتے رہتے تھے تاکہ آپؐ ان میں سے کسی ایک کو مان لیں اور وہ نزاع ختم ہو جائے جو آپؐ کے اور اُن کے مابین پیدا ہو چکا تھا۔ اس پر یہ سورۂ مبارکہ نازل ہوئی جس نے کُفّارِ مکہ کی ساری اُمیدوں کو خاک میں ملا دیا اور انہیں ہمیشہ کے لیے مایوس کر دیا۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝۱ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝۲ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝۳ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝۴ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝۵ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝۶

آیت ۱ ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝۱﴾ ''(اے نبی ﷺ) آپ کہہ دیجیے کہ اے کافرو!''

نوٹ کیجیے! یہ داعیانہ طرزِ تخاطب نہیں ہے' بلکہ لاتعلق اور علیحدہ ہونے کا انداز ہے۔ ظاہر ہے ایک داعی تو اپنے مخاطبین کو یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ کہہ کر پکارتا ہے' کہ اے اللہ کے بندو! میری بات سنو! گویا کلمۂ تخاطب میں ہی مفہوم واضح کر دیا گیا کہ اگر میری تمام تر ناصحانہ کوششوں کے باوجود بھی تم لوگوں نے کفر و انکار پر ڈٹے رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو تمہارا یہ فیصلہ اور طرزِ عمل تمہیں مبارک ہو۔ لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے بعد اب میری اور تمہاری راہیں جدا ہو چکی ہیں۔

آیت ۲ ﴿لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝۲﴾ ''مَیں اُن کو ہرگز نہیں پوجتا جن کو تم پوجتے ہو۔''

آیت ۳ ﴿وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝۳﴾ ''اور نہ تم پوجنے والے ہو اُسے جسے مَیں پوجتا ہوں۔''

اس آیت میں ان کے تمام معبودوں کی نفی کر دی گئی ہے۔ وہ لوگ اللہ کی پرستش تو کرتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے دیوی دیوتاؤں کی پوجا کے بھی قائل تھے۔ اس پس منظر میں ان پر واضح کیا جا رہا ہے کہ جس طرح مَیں خالص اللہ کی بندگی کرتا ہوں' اس طرح تم لوگ صرف اور صرف اُس کی پرستش نہیں کرتے ہو۔ چنانچہ تمہاری اس انداز کی پرستش تمہارے اپنے خود ساختہ معبودوں کی پرستش تو ہو سکتی ہے' ایک اللہ کی پرستش نہیں ہو سکتی۔

آیت ۴ ﴿وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۙ﴾ ''اور نہ ہی مَیں آئندہ کبھی پوجنے والا ہوں اُن کو جن کی تم پرستش کر رہے ہو۔''

ان آیات میں بظاہر تکرار نظر آتی ہے' لیکن درحقیقت اس اسلوب میں ماضی' حال اور مستقبل کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یعنی نہ مَیں نے زمانہ ماضی میں کبھی تمہارے معبودانِ باطل کی پرستش کی اور نہ آئندہ کبھی تم مجھ سے اس کی توقع کر سکتے ہو۔

آیت ۵ ﴿وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۭ﴾ ''اور نہ تم پُوجنے والے ہو اُس کو جس کو مَیں پُوج رہا ہوں۔''

آیت ۶ ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۧ﴾ ''اب تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔''

اب میرا تمہارا تعلق ختم۔ تم لوگ جس راستے پر جا رہے ہو تمہیں وہ راستہ مبارک ہو۔ تم اپنے حال میں مست رہو' مَیں اپنے دینِ حق پر ثابت قدم ہوں۔ حق و باطل کا یہ معرکہ اپنے منطقی انجام تک پہنچ کر رہے گا اور تم دیکھو گے کہ جلد ہی جزیرۂ عرب پر دینِ اسلام غالب آ کر رہے گا۔

سُوْرَةُ النَّصْرِ

تمہیدی کلمات

سورۃ النصر کے بارے میں اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ یہ مدنی ہے' لیکن میری تحقیق کے مطابق یہ سورت ابتدائی مکی دور میں نازل ہوئی اور اس میں حضور ﷺ کو خوشخبری سنائی گئی کہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے آپ اپنے مشن میں کامیاب ہو جائیں گے اور لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہونا شروع ہو جائیں گے۔ اس مفہوم میں میرے نزدیک اس سورت کے مضمون کا سورۃ الانشراح کی ان آیات سے گہرا تعلق ہے: ﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝۷ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝۸﴾ ''پھر جب آپ فارغ ہو جائیں تو خوب محنت کیجیے اور اپنے رب کی طرف متوجہ ہو جائیے''۔ بلکہ اس سورت کی آخری آیت کے الفاظ ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ﴾ تو سورۃ الانشراح کی مذکورہ آیات کے مضمون کا تسلسل محسوس ہوتے ہیں۔[1]

واضح رہے کہ قرآن مجید کے مختلف مصاحف میں کسی سورت کے بارے میں مکی یا مدنی لکھا ہونا حرفِ آخر نہیں ہوتا۔ دراصل طویل سورتوں کے زمانۂ نزول کے بارے میں تو تیقن کے ساتھ معلوم ہے کہ یہ مکی ہیں یا مدنی' چنانچہ ان کے بارے میں مفسرین کا اجماع ہے' جبکہ چھوٹی سورتوں میں سے اکثر کے زمانۂ نزول سے متعلق تفاسیر میں بہت سے اقوال ملتے ہیں۔

سُوْرَةُ النَّصْرِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۳ رُكُوْعُهَا: ۱

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝۱ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝۲ فَسَبِّحْ ع ۝۳ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝۳

۱۔ سورۃ النصر کے زمانۂ نزول کے بارے میں مفسرین نے مختلف آراء نقل کی ہیں۔ ایک یہ کہ فتح مکہ کے بعد نازل ہونے والی سورتوں میں یہ سب سے آخری سورت ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ فتح مکہ سے پہلے اس کی بشارت کے طور پر نازل ہوئی ہے۔ بعض روایات میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ بیان نقل ہوا ہے کہ یہ قرآن مجید کی آخری سورت ہے' یعنی اس کے بعد کوئی مکمل سورت رسول اللہ ﷺ پر نازل نہیں ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول روایت کے مطابق یہ سورت حجۃ الوداع کے موقع پر ایامِ تشریق کے وسط میں بمقام منیٰ نازل ہوئی اور اس کے بعد حضور ﷺ نے اونٹنی پر سوار ہو کر اپنا مشہور خطبہ (خطبۂ حجۃ الوداع) دیا۔ روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے میری وفات کی خبر دے دی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ اس میں حضور ﷺ کو خبر دی گئی ہے کہ جب اللہ کی نصرت آ جائے اور فتح نصیب ہو جائے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا وقت آن پورا ہوا۔ اس کے بعد آپ ﷺ اللہ کی حمد اور استغفار کریں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے بھی ابن عباسؓ کے اس قول کی تائید منقول ہے۔ (حاشیہ از مرتب)

آیت ۱ ﴿اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ ۙ﴿۱﴾﴾ ''جب آ جائے مدد اللہ کی اور فتح نصیب ہو۔''

آیت ۲ ﴿وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا ۙ﴿۲﴾﴾ ''اور آپؐ دیکھ لیں لوگوں کو داخل ہوتے ہوئے اللہ کے دین میں فوج در فوج۔''

آیت ۳ ﴿فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَاسۡتَغۡفِرۡهُ ؕ﴾ ''تو پھر آپؐ اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کیجیے اور اُس سے مغفرت طلب کیجیے۔''

﴿اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۚ﴿۳﴾﴾ ''یقیناً وہ بہت توبہ قبول فرمانے والا ہے۔''

یعنی ابھی تو آپؐ کو دعوت و تبلیغ اور فریضۂ رسالت کے سلسلے میں بہت سی مشقتیں اُٹھانی ہیں اور جنگ و قتال کے مراحل سے گزرنا ہے' لیکن جب آپؐ اپنے مشن میں کامیاب ہو جائیں یعنی اللہ کا دین غالب ہو جائے تو آپؐ ہمہ وقت' ہمہ تن اپنے رب کی تسبیح و تحمید میں مشغول ہو جایئے گا۔ نوٹ کیجیے! سورۃ الانشراح کی آخری آیات میں بھی اسی اسلوب و انداز میں بالکل ایسا ہی حکم دیا گیا ہے۔

سُوْرَةُ اللَّهَبِ

تمہیدی کلمات

حضور ﷺ اپنی بعثت کے بعد تقریباً تین سال تک دعوت وتبلیغ کا فریضہ زیادہ تر ذاتی سطح کی انفرادی ملاقاتوں (PP calls) کے ذریعے سرانجام دیتے رہے۔ اسی دوران آپؐ نے اپنے خاندان یعنی بنو ہاشم کے لوگوں کو دعوت کی غرض سے دو مرتبہ کھانے پر مدعو کیا۔ بعض مستشرقین نے آپؐ کے اس دور کے دعوتی رابطوں کو زیر زمین (under ground) سرگرمیوں کا نام دیا ہے جو کہ بالکل خلافِ حقیقت بات ہے' البتہ اسے دھیمے انداز کی (low key) دعوت کہا جاسکتا ہے۔

بہرحال جب سورۃ الحجر کی آیت ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۴﴾﴾ کے ذریعے آپؐ کو حکم ملا کہ آپؐ اپنی دعوت کو ڈنکے کی چوٹ عام کریں تو آپؐ نے قریشِ مکہ کو کھلے عام دعوت دینے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے آپ ﷺ نے معاشرے کے عام رواج کے مطابق ایک دن کوہِ صفا پر کھڑے ہوکر وَاصَبَاحَاہ کا نعرہ بلند کیا۔ اس زمانے میں دستور تھا کہ اگر کوئی شخص لوگوں کو کسی اہم خبر سے متنبہ کرنا چاہتا تو وہ برہنہ حالت میں کسی بلند جگہ پر کھڑے ہوکر وَاصَبَاحَاہ کی آواز بلند کرتا۔ عرب میں یہ نعرہ خطرے کا الارم سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ جو کوئی بھی اُسے اس حالت میں دیکھتا یا اس کی آواز سنتا وہ اس کی بات سننے کے لیے فوراً اس کی طرف دوڑ پڑتا۔ اُس زمانے میں زیادہ تر خبریں مخالف قبیلوں کے حملوں وغیرہ کے بارے میں ہوتی تھیں' اس حوالے سے کلمہ وَاصَبَاحَاہ کا مفہوم یہ تھا کہ کل تم لوگ بہت بُری صبح کا سامنا کرنے جا رہے ہو۔ (اُس زمانے میں یہ گویا ہنگامی پریس کانفرنس کا ایک انداز تھا۔) چنانچہ حضور ﷺ نے اسی رواج پر جزوی انداز سے عمل کرتے ہوئے کوہِ صفا پر کھڑے ہوکر وَاصَبَاحَاہ کے اعلان سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ گویا آپؐ بھی ان لوگوں کو ایک بھیانک صبح کی خبر دینے والے تھے' اگرچہ یہ خبر اگلے دن کی معمول کی صبح کی نہیں تھی بلکہ صبح قیامت سے متعلق تھی: ؎

بات کوئی تو ہنسی کی نکلے　　خندۂ صبحِ قیامت ہی سہی!

بہرحال جب قریش کے لوگ جمع ہو گئے تو آپؐ نے انہیں مخاطب کر کے انذارِ آخرت کے بارے میں ایک مدلّل و مؤثر خطبہ ارشاد فرمایا۔ ابولہب آپؐ کے گھر کھانے کی دعوت میں آپؐ کی یہ باتیں پہلے بھی سن چکا تھا۔ اس نے اس موقع پر انتہائی گستاخانہ انداز میں کہا: تَبًّا لَکَ اَلِھٰذَا جَمَعْتَنَا؟ کہ تیرے ہاتھ ٹوٹ جائیں (معاذ اللہ! نقل کفر کفر نباشد) تم نے صرف اس بات کے لیے ہمیں بلایا تھا؟ چنانچہ اُس کے اس رویّے اور اس جملے کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی اور اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا گیا کہ ہاتھ تو دراصل تمہارے ٹوٹے ہیں اور تم اپنی بیوی سمیت دہکتی آگ کے گڑھے میں بھی گر چکے ہو۔

اپنے مضمون کے اعتبار سے اس سورت کا انداز سورۃ الکوثر کی آخری آیت ﴿اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ﴿۳﴾﴾ سے ملتا جلتا ہے۔

سورۃ الکوثر کی اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے دشمنوں کے گستاخانہ فقروں کا جواب خود دیا تھا اور ان پر واضح کر دیا تھا کہ ''ابتر'' تو حقیقت میں تم لوگ ہو اور تمہارے بعد دنیا میں تمہارا کوئی نام لیوا نہیں ہوگا۔

سُوْرَةُ اللَّهَبِ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۵ رُكُوْعُهَا: ۱

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ۝۱ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ ۝۲ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝۳ وَّامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝۴ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝۵ ع

آیت ۱ ﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝۱﴾ ''ٹوٹ گئے ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ تباہ و برباد ہو گیا۔''

آیت ۲ ﴿مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝۲﴾ ''کچھ کام نہ آیا اُس کے اُس کا یہ مال اور وہ کمائی جو اُس نے کی ہے۔''

آیت ۳ ﴿سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝۳﴾ ''عنقریب وہ جھونکا جائے گا بھڑکتی ہوئی آگ میں۔''

لَھَب کے معنی آگ کے شعلے اور انگارے کے ہیں۔ اس شخص کی کنیت (ابولہب) کے حوالے سے یہاں اس لفظ کا استعمال ''صنعتِ لفظی'' کی بہترین مثال ہے۔ اس کا اصل نام عبدالعُزّیٰ تھا' لیکن اپنی سرخ و سفید رنگت کی وجہ سے ''ابولہب'' (شعلہ رُو) کی کنیت سے مشہور تھا۔ ظاہری اعتبار سے ابولہب بہت وجیہہ اور خوبصورت شخص تھا۔ اس پس منظر میں اس آیت کے الفاظ گویا یہ پیغام دے رہے ہیں کہ اس شخص کو سرخ و سفید رنگت اور خوبصورت شکل و صورت بھی ہم نے عطا کی ہے اور جہنّم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں بھی اسے ہم ہی جھونکیں گے۔

[قرآن مجید کا یہ واحد مقام ہے جہاں دشمنانِ اسلام میں سے کسی شخص کا نام لے کر اس کی مذمت کی گئی ہے' حالانکہ مکّہ' مدینہ اور دیگر قبائلِ عرب میں حضور ﷺ کے دشمنوں اور بدخواہوں کی کمی نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابولہب حضور ﷺ کا حقیقی چچا اور قریب ترین ہمسایہ ہونے کے باوجود آپ ﷺ کی مخالفت میں پیش پیش تھا اور اس شخص نے اسلام کی دشمنی اور کفر کی محبت میں صلہ رحمی اور خاندانی حمیت جیسی عرب روایات کا بھی کچھ پاس نہ کیا۔]

آیت ۴ ﴿وَّامْرَاَتُهٗ ؕ﴾ ''اور اُس کی بیوی بھی۔''

ابولہب کی بیوی بھی حضور ﷺ کی دشمنی میں ہمیشہ پیش پیش رہتی تھی۔ اس کا نام اَروٰی بنت حرب اور کنیت اُمّ جمیل تھی اور اس کے دل میں حضور ﷺ کی عداوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ حضور ﷺ کی دشمنی کے اعتبار سے ان دونوں کے بارے میں جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ میاں بیوی میں سے کون حضور ﷺ کا بڑا دشمن تھا۔

قبل ازیں سورۃ التحریم کے آخری رکوع میں ہم خواتین کے کردار کی تین مثالوں کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ پہلی مثال میں حضرت لوط اور حضرت نوح علیہما السلام کی کافر بیویوں کا ذکر ہے۔ یہ بہترین شوہروں کے گھروں میں بدترین بیویوں کی مثال ہے۔ پھر فرعون کی بیوی آسیہ رضی اللہ عنہا کا ذکر گویا بدترین شوہر کے ہاں بہترین بیوی کی مثال ہے۔ اس کے بعد حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے حوالے سے ایک ایسی خاتون کی مثال بیان کی گئی ہے جو خود بھی نیک فطرت تھی اور حضرت زکریا علیہ السلام کی سرپرستی میں انہیں ماحول بھی ایسا ملا جو نیکی اور پاکیزگی

کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھا۔ گویا وہاں سورۃ التحریم میں خواتین کے حوالے سے تین قسم کی ممکنہ صورتوں کی مثالوں کا ذکر تو ہو چکا ہے' جبکہ اس سلسلے کی چوتھی ممکنہ صورت کا ذکر یہاں اس سورت میں ہوا ہے' یعنی شوہر بھی بدترین اور بیوی بھی بدترین۔

﴿حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝۴﴾ ''جو ایندھن اٹھانے والی ہوگی۔''

روایات میں چونکہ ذکر ملتا ہے کہ یہ دونوں میاں بیوی بہت بخیل تھے' اس لیے بعض لوگوں نے ان الفاظ سے یہ سمجھا ہے کہ یہ عورت جنگل سے لکڑیاں چُن کر لایا کرتی تھی' حالانکہ یہ بات خلافِ عقل و قیاس ہے۔ ابولہب نہ صرف بہت مال دار تھا بلکہ معاشرتی لحاظ سے وہ اپنے زمانے کا بہت بڑا منصب دار بھی تھا۔ وہ حرم کے محکمہ مالیات کا انچارج تھا (اس حیثیت سے اس پر اگرچہ یہ الزام بھی تھا کہ اس نے حرم کے خزانے سے سونے کے دو ہرن چرا لیے تھے)۔ چنانچہ یہ دونوں میاں بیوی اپنے معاشرے کی اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معاشرے کی ایک وی آئی پی خاتون' بنو ہاشم کے رئیس کی بیوی' جسے گویا خاتونِ اوّل کا سا درجہ حاصل تھا' کے بارے میں جنگل سے لکڑیاں چُن کر سر پر گٹھڑ لاد کر لانے والی بات بالکل قرین قیاس نہیں۔ چنانچہ اس آیت کا اصل مفہوم یہ ہے کہ اس عورت کی حرکتیں جہنّم کی آگ کا ایندھن اکٹھا کرنے اور اپنے شوہر کی آگ کو مزید بھڑکانے کے مترادف ہیں۔ جب یہ اپنے شوہر کے ساتھ جہنّم میں جھونکی جائے گی اُس وقت اس کا حال اُس مجرم کا سا ہوگا جو اپنے جلانے کا ایندھن خود اٹھائے ہوئے ہو۔

آیت ۵ ﴿فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝۵﴾ ''اُس کے گلے میں بٹی ہوئی رسّی ہوگی۔''

آج یہ عورت اپنے گلے میں جو خوبصورت ہار پہنے پھرتی ہے کل آخرت میں یہی ہار اس کے گلے میں ایک مضبوط بٹی ہوئی رسّی کی صورت اختیار کر لے گا جیسی رسّی ایندھن ڈھو کر لانے والی لونڈیوں کے گلے میں پڑی ہوتی ہے۔ اس رسّی میں یہ اپنے اعمالِ بد کا ایندھن باندھ کر جہنّم میں لے جائے گی اور اپنی اور اپنے شوہر کی آگ کو مزید بھڑکائے گی۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے لکھا ہے کہ ''شاید م اور ضریع کی (جو جہنّم کے خاردار درخت ہیں) لکڑیاں اٹھائے پھرے اور ان کے ذریعے سے اپنے شوہر پر عذابِ الٰہی کی آگ کو تیز کرتی رہے۔''

سُوْرَۃُ الْاِخْلَاصِ

تمہیدی کلمات

سورۃ الاخلاص قرآن مجید کی مختصر ترین سورتوں میں سے ہے اور توحید باری تعالیٰ کے موضوع پر یہ قرآن مجید کی جامع ترین سورت ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ نے اس سورت کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ 'الاخلاص' اس سورت کا نام ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے مضمون کا عنوان بھی ہے' کیونکہ اس میں خالص توحید بیان کی گئی ہے۔

سُوْرَۃُ الْاِخْلَاصِ مَکِّیَّۃٌ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اٰیَاتُھَا: ۴ رُکُوْعُھَا: ۱

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ يَلِدْ ۙ وَ لَمْ يُوْلَدْ ۙ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۚ ع

آیت ۱ ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ۱﴾ ''کہہ دیجیے وہ اللہ یکتا ہے۔''

اَحَد: وہ اکیلا اور یکتا جس کی ذات اور صفات میں کوئی شریک نہیں۔ وہی اکیلا ربّ ہے' کسی دوسرے کا ربوبیت اور اُلوہیت میں کوئی حصہ نہیں۔ وہی تنہا کائنات کا خالق' مالک الملک اور نظامِ عالم کا مدبر و منتظم ہے۔

آیت ۲ ﴿اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ۲﴾ ''اللہ سب کا مرجع ہے۔''

صَمَد کے لغوی معنی ایسی مضبوط چٹان کے ہیں جس کو سہارا بنا کر کوئی جنگجو اپنے دشمن کے خلاف لڑتا ہے تاکہ دشمن پیچھے سے حملہ نہ کر سکے۔ بعد میں یہ لفظ اسی مفہوم میں ایسے بڑے بڑے سرداروں کے لیے بھی استعمال ہونے لگا جو لوگوں کو پناہ دیتے تھے اور جن سے لوگ اپنے مسائل کے لیے رجوع کرتے تھے۔ اس طرح اس لفظ میں مضبوط سہارے اور مرجع (جس کی طرف رجوع کیا جائے) کے معنی مستقل طور پر آ گئے۔ چنانچہ اَللّٰهُ الصَّمَدُ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوقات کا مرجع اور مضبوط سہارا ہے۔ وہ خود بخود قائم ہے' اُسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ باقی تمام مخلوقات کو اُس کے سہارے کی ضرورت ہے اور تمام مخلوق کی زندگی اور ہر چیز کا وجود اُسی کی بدولت ہے۔ ﴿وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ﴾ (البقرۃ: ۲۵۵) ''اور وہ احاطہ نہیں کر سکتے اللہ کے علم میں سے کسی شے کا بھی سوائے اس کے جو وہ خود چاہے''۔ ظاہر ہے وہ الحیّ اور القیوم ہے' یعنی خود زندہ ہے اور تمام مخلوق کو تھامے ہوئے ہے۔ باقی تمام مخلوقات کے ہر فرد کا وجود مستعار ہے اور کائنات میں جو زندہ چیزیں ہیں ان کی زندگی بھی مستعار ہے۔ جیسے ہم انسانوں کی زندگی بھی ''عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن!'' کے مصداق اُسی کی عطا کردہ ہے۔

آیت ۳ ﴿لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ۳﴾ ''نہ اُس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا۔''

یعنی نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ اُس کی کوئی اولاد ہے۔ یہ نکتہ سورۃ الجن میں بایں الفاظ واضح فرمایا گیا: ﴿مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ۝۳﴾ ''اُس نے اپنے لیے نہ کوئی بیوی اختیار کی ہے اور نہ کوئی اولاد''۔ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دیتے ہیں اور یہودیوں کے بعض فرقے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا مانتے تھے۔ مشرکینِ عرب فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں بتاتے تھے۔ اِس آیت میں ایسے تمام عقائدِ باطلہ کی نفی کر دی گئی ہے۔

آیت ۴ ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝۴﴾ ''اور کوئی بھی اُس کا کفو نہیں ہے۔''

کُفو کے معنی ہم سر کے ہیں' جو قدرت' علم' حکمت اور دیگر صفات میں ہم پلّہ اور ہم پایہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا نہ تو کوئی ہم پلّہ اور برابری کرنے والا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی ضد' ند' مثل' مثال' مثیل وغیرہ ہے۔

سُوْرَۃُ الْفَلَقِ

تمہیدی کلمات

اب ہم قرآن مجید کی آخری دو سورتوں (مُعَوِّذَتَین) کا مطالعہ کرنے جا رہے ہیں۔ یہ سورتیں گویا قرآن مجید کے اختتام پر دو پہرے دار ہیں۔ صحیح بخاری کی ایک روایت میں آتا ہے کہ مدینہ کے ایک یہودی نے حضور ﷺ پر جادو کر دیا تھا۔ اس کی وجہ سے آپؐ بعض باتیں بھول جاتے تھے اور آپؐ کو جسمانی طور پر بھی تکلیف رہتی تھی۔ اس صورت حال پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سورتیں نازل ہوئیں۔ حضور ﷺ ان سورتوں کی کثرت سے تلاوت کرتے رہے تا آنکہ آپؐ سے جادو کے اثرات زائل ہو گئے۔

جدید دور کے عقلیت پسند (rationalists) ''اہلِ علم'' خصوصی طور پر منکرینِ احادیث ایسی روایات کو تسلیم کرنے میں پس و پیش کرتے ہیں' بلکہ ان کے خیال کے مطابق تو ایسا سمجھنا حضور ﷺ کی توہین کے مترادف ہے۔ اس قسم کے دلائل کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ حضور ﷺ کامل ترین انسان ہیں اور معراجِ انسانیت کے درجے پر فائز ہیں۔ آپؐ کی عصمت و عظمت کے مراتب بلاشبہ ہمارے تصور سے بھی ماوراء ہیں' لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عام بشری کیفیات آپؐ کی ذات پر بھی اثر انداز ہوتی تھیں۔ مقامِ غور ہے کہ اگر حضور ﷺ کو بخار ہوتا تھا' اگر آپؐ تلوار کے وار سے زخمی ہوئے تھے' اگر زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے آپؐ پر نقاہت طاری ہوئی تھی اور اگر آپؐ پر نزع کی تکلیف وارد ہوئی تھی تو آخر جادو آپؐ پر کیونکر اثر انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ البتہ یہ بات واضح رہے کہ جادو کا اثر حضور ﷺ کی جسمانی صحت تک محدود تھا' رسالت کا کوئی پہلو قطعاً اس سے متأثر نہ تھا۔ بہرحال جادو اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ حضور ﷺ پر جادو کیا گیا اور اس کے منفی اثرات کی وجہ سے آپ ﷺ کو تکلیف کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اور اسی سبب سے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی اُمت کو ان سورتوں کا بیش بہا تحفہ عطا کیا۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ((اَلَمْ تَرَ آیاتٍ اُنْزِلَتِ اللَّیْلَۃَ لَمْ یُرَ مِثْلُھُنَّ قَطُّ؟ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَقُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ))[1] یعنی تمہیں خبر ہے اللہ تعالیٰ نے آج رات ایسی آیات نازل فرمائی ہیں جن کی پہلے کوئی مثال نظر نہیں آتی؟ وہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ہیں۔

یہ دونوں سورتیں مدنی ہیں اور ان دونوں کا مضمون ایک ہی ہے۔ یہ مضمون ایک سورت کی شکل میں بھی نازل ہو سکتا تھا' لیکن قرآن مجید کا عمومی مزاج چونکہ ایسا ہے کہ زیادہ تر سورتیں جوڑوں کی شکل میں نازل ہوئی ہیں' اس لیے اللہ تعالیٰ نے بنیادی مضمون کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دو الگ الگ سورتوں کی شکل میں نازل فرمایا۔ مضمون کی اس تقسیم کے مطابق سورۃ الفلق میں ان چیزوں یا ان شرور سے پناہ طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو انسان پر باہر سے حملہ آور ہوتی ہیں' جبکہ سورۃ الناس میں اندرونی طور پر اثر انداز ہونے

۱۔ صحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا' باب فضل قراءۃ المعوذتین۔

والے شرور کا ذکر ہے۔ بہرحال ہمیں چاہیے کہ ان تمام شرور کے اثراتِ بد سے بچنے کے لیے ہم ان سورتوں کے ذریعے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے رہیں۔

سُوْرَةُ الْفَلَقِ مَدَنِيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۵ رُكُوْعُهَا: ۱

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۙ﴿۱﴾ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۙ﴿۲﴾ وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۙ﴿۳﴾ وَ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ۙ﴿۴﴾ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۧ﴿۵﴾

آیت ۱ ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۙ﴿۱﴾﴾ ''کہو کہ مَیں پناہ میں آتا ہوں صبح کے ربّ کی۔''

فَلَقَ یَفْلِقُ کے معنی کسی چیز کو پھاڑنے کے ہیں۔ سورۃ الانعام کی آیت ۹۶ میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے حوالے سے ﴿فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ﴾ کے الفاظ آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ رات کی تاریکی کا پردہ چاک کر کے سپیدۂ سحر نمودار کرتا ہے۔ البتہ اسی سورت کی آیت ۹۵ میں یہ لفظ دانوں اور گٹھلیوں وغیرہ کے پھاڑنے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ﴾۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے زمین کے اندر دانوں یا گٹھلیوں کو پھاڑتا ہے تو پودوں یا درختوں کی پتیاں اور جڑیں نکلتی ہیں۔ چنانچہ فلق سے مراد یہاں صرف صبح ہی نہیں بلکہ ہر وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عدم کا پردہ چاک کر کے وجود بخشا ہے۔ جیسے کہ اگلی آیت میں واضح کر دیا گیا:

آیت ۲ ﴿مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۙ﴿۲﴾﴾ ''(مَیں پناہ میں آتا ہوں) اُس کی تمام مخلوقات کے شر سے۔''

یعنی ''شر'' مستقل طور پر علیحدہ وجود رکھنے والی کوئی چیز نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی مختلف مخلوقات کے اندر ہی کا ایک عنصر ہے۔ اس نکتے کو یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر قسم کے نقص یا عیب سے پاک ہے' لیکن اُس کی مخلوق اپنے خالق کی طرح کامل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ہر مخلوق کے اندر کمی یا تقصیر و تنقیص کا کوئی نہ کوئی پہلو یا عنصر بِالقُوّہ (potentially) موجود ہے۔ جیسے خود انسان کی متعدد کمزوریوں کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ سورۃ النساء میں فرمایا گیا: ﴿وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾﴾ کہ انسان بنیادی طور پر کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ﴿وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴿۱۱﴾﴾ کے الفاظ میں انسان کی جلد بازی کا ذکر ہوا۔ سورۃ المعارج میں اس کی تین کمزوریوں کا ذکر بایں الفاظ ہوا: ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿۲۰﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿۲۱﴾﴾ ''یقیناً انسان پیدا کیا گیا ہے تھڑدلا۔ جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جانے والا ہے۔ اور جب اسے بھلائی ملتی ہے تو بہت بخیل بن جاتا ہے۔''

گویا انسان روحانی طور پر اگرچہ احسنِ تقویم کے درجے میں پیدا کیا گیا ہے' لیکن اس کے حیوانی اور مادی وجود میں مذکورہ خامیوں سمیت بہت سی کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح ہر مخلوق میں مختلف کمزوریوں کے متعدد پہلو پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے 'شر' جنم لیتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کا مفہوم یوں ہوگا کہ اے پروردگار! تیری جس جس مخلوق میں شر کے جو جو پہلو پائے جاتے ہیں' مَیں ان میں سے ہر قسم کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔

آیت ۳ ﴿وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝۳﴾ ''اور (خاص طور پر) اندھیرے کے شر سے جب وہ چھا جائے۔''

ظاہر ہے رات کے اندھیرے میں انسانوں' جنّوں اور ضرر رساں جانوروں اور کیڑوں مکوڑوں کی صورت میں شر پھیلانے والے عناصر زیادہ فعال اور مستعد ہو جاتے ہیں۔ گویا رات کا اندھیرا بذاتِ خود ایک بہت بڑا شر ہے جس سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنا ضروری ہے۔

آیت ۴ ﴿وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۝۴﴾ ''اور اُن عورتوں کے شر سے جو گرہیں باندھ کر پھونکیں مارتی ہیں۔''

یعنی وہ تمام ٹونے ٹوٹکے' تعویذ گنڈے اور سفلی عملیات جن کے ذریعے سے کسی انسان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس موضوع کے حوالے سے یہاں یہ نکتہ اچھی طرح سے سمجھ لیجیے کہ کسی چیز کا بالفعل موجود ہونا اور بات ہے اور اس چیز کا حلال' حرام یا جائز' ناجائز ہونا الگ بات ہے۔ مثلاً جادو ایک حقیقت ہے' لیکن کفر ہے۔ شراب اپنی ایک مخصوص تاثیر رکھتی ہے' لیکن حرام ہے۔ اسی طرح علم نجوم' پامسٹری (ہاتھ کی لکیروں کا علم) اور سفلی عملیات کی حقیقت اور تاثیر سے انکار نہیں کیا جا سکتا (ظاہر ہے جب ہم اچھے وظائف و کلمات کی اچھی تاثیر کو مانتے ہیں تو ہمیں سفلی و شیطانی کلمات وغیرہ کی منفی تاثیر کا بھی اقرار کرنا پڑے گا) لیکن شریعت نے ہمیں ایسے علوم سے استفادہ کرنے اور ایسے علوم کی بنیاد پر کیے گئے دعووں پر یقین کرنے سے منع کر دیا ہے۔ ظاہر ہے اس نوعیت کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر نہ تو مؤثر ہو سکتی ہیں اور نہ ہی کسی کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ اس لیے ان کے شر سے بچنے کا آسان اور مؤثر طریقہ یہی ہے کہ انسان خود کو اللہ تعالیٰ کی پناہ میں دے دے۔

آیت ۵ ﴿وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝۵﴾ ''اور حسد کرنے والے کے شر سے بھی (مَیں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں) جب وہ حسد کرے۔''

ظاہر ہے جب ایک انسان کسی دوسرے انسان سے حسد کرتا ہے تو عین ممکن ہے وہ اپنے حاسدانہ جذبات سے مغلوب ہو کر عملی طور پر بھی اسے نقصان پہنچانے کے درپے ہو جائے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((اَلْعَیْنُ حَقٌّ))[۲] یعنی نظر لگ جانا برحق ہے۔ چنانچہ حاسدانہ نگاہ بذاتِ خود بھی منفی اثرات کی حامل ہو سکتی ہے۔ اس لیے حاسد کے شر سے بچنے کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی پناہ کی ضرورت ہے۔

بہرحال جادو' ٹونے' تعویذ گنڈے' نظرِ بد وغیرہ کے اثرات اپنی جگہ مسلّم ہیں۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۰۲ میں شیاطینِ جن کا ذکر آیا ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے۔ بلکہ یہ گھناؤنا کاروبار کسی نہ کسی انداز سے ہر زمانے میں چلتا رہا ہے۔ آج بھی ہمارے معاشرے میں بہت سے لوگ ایسی چیزیں سیکھنے سکھانے اور پھر مختلف دعووں کے ساتھ اپنا کاروبار چمکانے میں مصروف ہیں۔ البتہ جیسا کہ قبل ازیں بھی وضاحت کی جا چکی ہے ہماری شریعت میں ایسی چیزیں سیکھنا اور پھر کسی بھی انداز میں ان سے استفادہ کرنا حرام ہے۔ اس حوالے سے ایک بندۂ مؤمن کو اپنے دل میں پختہ یقین رکھنا چاہیے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر اُسے کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی' جیسا کہ سورۃ البقرۃ کی مذکورہ آیت میں بھی واضح کیا گیا ہے: ﴿وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۱۰۲)۔ ایک بندۂ مؤمن کو یہ بھی یقین رکھنا چاہیے کہ جو تکلیف بھی آئے

۲۔ صحیح البخاری' کتاب الطب' باب العین حق۔ وصحیح مسلم' کتاب السلام' باب الطب والمرض والرقی۔

گی وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہی آئے گی (یہ بھی ممکن ہے کہ کسی وجہ سے اللہ تعالیٰ خود کسی انسان کو کسی تکلیف یا مشکل سے دوچار کرنا چاہے) اور اللہ کے اذن سے ہی دور ہوگی۔ جہاں تک ایسی چیزوں سے حفاظتی تدابیر اپنانے یا ایسے کسی شیطانی حملے کے توڑ کرنے کا تعلق ہے تو ان دو سورتوں (مُعَوِّذَتَین) کے ہوتے ہوئے ایک بندۂ مسلمان کو کسی اور عمل، تعویذ یا تدبیر کی ضرورت نہیں ہے۔ ظاہر ہے یہ سورتیں اسی مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو سکھائی تھیں اور اس لحاظ سے یہ حضور ﷺ کی وساطت سے اُمت کے لیے ایک بیش بہا تحفے کا درجہ رکھتی ہیں۔

حضرت عائشہ صِدِّیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ معمول تھا کہ ہر شب آرام کرنے سے پہلے آخری تینوں سورتیں (سورۃ الاخلاص اور مُعَوِّذَتَین) پڑھ کر اپنے مبارک ہاتھوں پر دم فرماتے اور پھر اپنے سارے جسم پر پھیر لیتے۔ مزید برآں شیطانی اثرات اور نظرِ بد وغیرہ سے حفاظت کے لیے احادیث میں متعدد ادعیہ ماثورہ بھی وارد ہوئی ہیں، جن کو ہمیں اپنا معمول بنانا چاہیے۔

سُوْرَةُ النَّاسِ

تمہیدی کلمات

جیسا کہ سورۃ الفلق کے تعارف کے دوران بھی بتایا جا چکا ہے کہ سورۃ الناس مدنی سورت ہے' بلکہ میری تحقیق کے مطابق تو سورۃ الملک سے شروع ہونے والی سورتوں کے اس آخری گروپ میں صرف یہی دو سورتیں (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) ہی مدنی ہیں۔ یہاں ضمنی طور پر مکّی مدنی سورتوں کے اس آخری گروپ اور پہلے گروپ کے درمیان مدنی اور مکّی قرآن کی مقدار کے حوالے سے پائی جانے والی ایک ''معکوس (reciprocal) نسبت'' کے بارے میں بھی جان لیجیے۔ یعنی جس طرح سورتوں کے پہلے گروپ میں مکّی قرآن بہت تھوڑا (صرف سورۃ الفاتحہ) اور مدنی قرآن کی مقدار نسبتاً بہت زیادہ (سورۃ البقرۃ' سورۂ آلِ عمران' سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ پر مشتمل تقریباً سوا چھ پارے) ہے' اسی طرح زیر مطالعہ آخری گروپ میں مدنی قرآن کی مقدار بہت کم (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) ہے اور اس کے مقابلے میں مکّی قرآن تقریباً دو پاروں پر مشتمل ہے۔

سورۃ الفلق میں ان مضرتوں اور شر انگیزیوں سے پناہ طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو انسان کے ظاہری حالات اور جسمانی کیفیات کو متاثر کرتی ہیں' جبکہ سورۃ الناس میں ایسے شرور سے پناہ طلب کرنے کی ہدایت کی جا رہی ہے جو انسان کے باطن پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کے ایمان و ایقان پر یلغار کرتے ہیں۔

سورۃ الناس کے حوالے سے ایک اہم نکتہ یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ اس سورت کا سورۃ الفاتحہ کے ساتھ بھی جوڑے کا تعلق ہے۔ ان دونوں سورتوں کی آیات میں گہری مشابہت اور مناسبت پائی جاتی ہے۔ دونوں سورتوں کا ایک ساتھ مطالعہ کرنے سے یہ مشابہت اور مناسبت صاف نظر آتی ہے۔ مثلاً سورۃ الفاتحہ کی پہلی اور دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی حمد و صفات کا بیان اور اس کے ربّ العالمین ہونے کا اقرار ہے' جبکہ سورۃ الناس کی پہلی آیت میں تمام انسانوں کے رب سے پناہ طلب کی گئی ہے۔ دونوں سورتوں کی اگلی دونوں آیات (مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ② اور مَلِكِ النَّاسِ ②) کی لفظی و معنوی مشابہت بہت ہی واضح ہے۔ اس کے بعد سورۃ الفاتحہ میں اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے اور اُس کی عبادت کرنے کے عہد کے ساتھ اس سے ہدایت کی درخواست کی گئی ہے' جبکہ اس کے متوازی سورۃ الناس میں اللہ تعالیٰ کی معبودیت (اِلٰهِ النَّاسِ ③) کے اقرار کے ساتھ شیطان کے وساوس کے خلاف اس کی پناہ طلب کی گئی ہے۔ ظاہر ہے سیدھے راستے پر چلنے کے لیے مدد طلب کرنا (استعانت) اور شیطان کے حملوں سے پناہ مانگنا (استعاذہ) باہم ملتی جلتی اصطلاحات ہیں کہ اے اللہ! ہم تیری عبادت کا وعدہ کرتے ہیں مگر ہم تیری مدد کے محتاج ہیں۔ اس کے لیے ہمیں تیرے سہارے اور تیری پناہ کی ضرورت ہے' تاکہ تیری پناہ میں آ کر ہم شیطان کی وسوسہ اندازی سے محفوظ ہو جائیں۔ اس زاویے سے ان دونوں سورتوں کا جائزہ لیا جائے تو سورۃ الناس' سورۃ الفاتحہ کا عکس یا مثنّٰی (duplicate) بنتی نظر آتی ہے۔

سُوْرَةُ النَّاسِ مَدَنِيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ٦ رُكُوْعُهَا: ١

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿١﴾ مَلِكِ النَّاسِ ۙ﴿٢﴾ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ﴿٣﴾ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۪﴿٤﴾ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ﴿٥﴾ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ ﴿٦﴾

آیت ۱ ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿١﴾﴾ ''کہیے کہ مَیں پناہ میں آتا ہوں تمام انسانوں کے رب کی۔''

یہاں سب سے پہلے ''رَبّ النّاس'' (لوگوں کا پروردگار) کے کلمات سے اللہ تعالیٰ کا تعارف کرایا گیا ہے کہ تمہیں ایسی ذات سے پناہ مانگنے کا حکم دیا جارہا ہے جو تمہاری جملہ ضروریات کا کفیل ہے۔

آیت ۲ ﴿مَلِكِ النَّاسِ ۙ﴿٢﴾﴾ ''تمام انسانوں کے بادشاہ کی۔''

وہ تمام انسانوں کا صرف پروردگار ہی نہیں' ان کا بادشاہ اور فرماں روا بھی ہے۔ اُس کا حکم ہر وقت' ہر جگہ اور ہر چیز پر نافذ ہے۔

آیت ۳ ﴿اِلٰهِ النَّاسِ ۙ﴿٣﴾﴾ ''تمام انسانوں کے معبود کی۔''

انسانوں کا رب اور بادشاہ ہونے کے علاوہ وہ ان کا معبود بھی ہے' چنانچہ وہ ان پر کامل اقتدار اور اختیار رکھتا ہے اور ان کی حفاظت پر پوری طرح قادر ہے۔

آیت ۴ ﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۪﴿٤﴾﴾ ''اس بار بار وسوسہ ڈالنے والے' پیچھے ہٹ جانے والے کے شر سے۔''

شیطان کی وسوسہ اندازی کا طریق کار یہ ہے کہ وہ لگاتار اپنی کوشش جاری رکھتا ہے اور انسان کو گمراہ کرنے کی کوششوں سے تھکتا نہیں۔ کبھی حملہ کرتا ہے' کبھی دفاعی پسپائی اختیار کرتا ہے اور پھر پلٹ کر حملہ آور ہوتا ہے۔

آیت ۵ ﴿الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ﴿٥﴾﴾ ''جو لوگوں کے سینوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے۔''

آیت ۶ ﴿مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ﴿٦﴾﴾ ''خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔''

انسان کے دل و دماغ پر شیطانی وساوس کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اس کی وضاحت حضور ﷺ کے اس فرمان سے ملتی ہے۔ اُمّ المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ))[1] ''شیطان انسان کے وجود میں خون کی مانند گردش کرتا ہے''۔ گویا شیطان نفسِ انسانی کے اندر موجود حیوانی شہوات اور سفلی داعیات (فرائیڈ اسے id یا libido کا نام دیتا ہے) کو بھڑکاتا ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ شیطان اپنی تھوتھنی انسان کے دل پر رکھ کر پھونکیں مارتا ہے اور اس طرح اس کے جذبات و شہوات میں اشتعال پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو انسان کے دل میں وسوسے پیدا کرنے اور اس کے جذبات کو انگیخت دینے کی حد تک اختیار دیا ہے۔ اس سے بڑھ کر انسان سے زبردستی کوئی عمل کرانے کا اختیار اسے نہیں دیا گیا۔ بہرحال نفسِ انسانی بعض اوقات شیطان کے بہکاوے میں آکر متعلقہ انسان

۱۔ صحیح البخاری' کتاب الاعتکاف' باب زیارۃ المرأۃ زوجھا فی اعتکافہ۔ وصحیح مسلم' کتاب السلام' باب بیان انہ یستحب لمن رئیَ خالیا بامرأۃ...

کے لیے شیطان کا نمائندہ بن جاتا ہے اور پھر بالکل شیطان ہی کی طرح اس کے دل میں وسوسہ اندازی شروع کر دیتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ قٓ میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ﴾ (آیت ۱۶) ''اور ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم خوب جانتے ہیں جو اُس کا نفس وسوسے ڈالتا ہے''۔ ایسے نفسِ انسانی کو سورۂ یوسفؑ کی آیت ۵۳ میں ''نفسِ امارہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس حوالے سے اہم اور بنیادی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ شیطان اُسی دل پر اپنی تھوتھنی رکھ کر پھونکیں مارتا ہے اور اس پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتا ہے جو دل اللہ کی یاد سے خالی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جو دل اللہ کی یاد میں مشغول اور اس کے ذکر سے معمور ہوتا ہے شیطان اس سے دور رہتا ہے۔ بہرحال شیطان کے تمام وسوسے اور حربے انسان کے اپنے نفس کے ذریعے سے ہی اس پر اثر انداز ہوتے ہیں اور یہ سورت خصوصی طور پر شیطانی وساوس کے توڑ کے لیے نازل ہوئی ہے۔

بارک اللہ لی ولکم فی القرآن العظیم ونفعنی وایاکم بالآیات والذّکر الحکیم ○○

دعائے ختمِ قرآن

اَللّٰھُمَّ آنِسْ وَحْشَتِیْ فِیْ قَبْرِیْ، اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِیْ بِالْقُرْآنِ الْعَظِیْمِ، وَاجْعَلْهُ لِیْ اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّھُدًی وَّرَحْمَةً، اَللّٰھُمَّ ذَکِّرْنِیْ مِنْهُ مَا نَسِیْتُ، وَعَلِّمْنِیْ مِنْهُ مَا جَھِلْتُ، وَارْزُقْنِیْ تِلَاوَتَهٗ آنَاءَ اللَّیْلِ وَآنَاءَ النَّھَارِ، وَاجْعَلْهُ لِیْ حُجَّةً یَّارَبَّ الْعٰلَمِیْنَ!

اب ہم اس دعا کا مطالعہ کریں گے' کیونکہ دعا مانگنے کا مزہ تو تبھی ہے جب انسان اپنی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کا مفہوم بھی سمجھتا ہو۔

اَللّٰھُمَّ آنِسْ وَحْشَتِیْ فِیْ قَبْرِیْ

''اے اللہ! میری قبر کے اندر مجھے جو وحشت ہوگی اُسے میرے لیے مانوس کر دے!''

اس وحشت کو دُور کرنے کے لیے مجھے قرآن مجید کا اُنس عطا کر دے! —— یاد رکھیں! قبر کی وحشت قرآن کے ساتھ تعلق کی بنا پر مانوس ہوگی۔ اپنی جوانی کے ایام میں (جب آتش جوان تھا!) جب مَیں اس دُعا کو پڑھا کرتا تھا تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ قرآن سے متعلق اصل دعا تو اگلے فقرے سے شروع ہوتی ہے اور یہ پہلا جملہ اضافی سا ہے۔ مگر اب جبکہ بڑھاپے میں قبر ہر وقت سامنے نظر آتی ہے تو اب معلوم ہوا ہے کہ اس دعا کا اہم ترین حصہ تو یہی ہے۔

اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِیْ بِالْقُرْآنِ الْعَظِیْمِ

''اے اللہ! مجھ پر رحم فرما قرآنِ عظیم کی بدولت''

وَاجْعَلْهُ لِیْ اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّھُدًی وَّرَحْمَةً

''اور اس کو میرے لیے امام' نُور' ہدایت اور رحمت بنا دے!''

یہ الفاظ زبان سے ادا کرتے ہوئے انسان کو چاہیے کہ قرآن مجید کو اپنا امام بنانے کا ارادہ بھی کرے' کہ اب مجھے قرآن مجید کو اپنا راہبر و راہنما مان کر اس کی پیروی کرنی ہے۔ لیکن اگر دل میں ایسا کوئی شعوری ارادہ سرے سے موجود ہی نہ ہو تو ظاہر ہے ایسی کیفیت میں یہ دعائیہ کلمہ بھی ''ذٰلِکُمْ قَوْلُکُمْ بِاَفْوَاھِکُمْ'' کے مصداق محض مُنہ سے نکلی ہوئی ایک بات بن کر رہ جائے گا اور عملی طور پر اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔

اَللّٰھُمَّ ذَکِّرْنِیْ مِنْهُ مَا نَسِیْتُ،

''اے اللہ! مجھے یاد کرا دے جو کچھ مَیں اس میں سے بھول جاؤں''

وَعَلِّمْنِیْ مِنْهُ مَا جَهِلْتُ

اور مجھے سکھا دے اس میں سے جو میں نہیں جانتا''

ظاہر ہے یہ دعا بھی تبھی کارگر ہوگی جب عملی طور پر قرآن مجید کو سمجھنے کی نیت اور کوشش انسان کے شاملِ حال ہوگی۔ یاد رکھیں! قرآن مجید کا علم بہت قیمتی چیز ہے۔ یہ عظیم دولت اللہ تعالیٰ کسی کی جھولی میں زبردستی نہیں ڈالتا۔ چنانچہ جس طرح انسان دنیا کے دوسرے علوم وفنون کو سیکھنے کے لیے محنت اور کوشش کرتا ہے اسی طرح قرآن مجید کو سیکھنے کے لیے بھی محنت درکار ہے۔ چنانچہ قرآن سیکھنے کے لیے آپ زانوئے تلمذ تہ کریں اور عربی سیکھیں۔ اس حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہ اشعار بہت بصیرت افروز ہیں:

یَغُوْصُ الْبَحْرَ مَنْ طَلَبَ اللَّآلِیْ وَمَنْ طَلَبَ الْعُلٰی سَهِرَ اللَّیَالِیْ

''جو شخص بھی موتیوں کا طلب گار ہوتا ہے اسے سمندر میں غوطہ زنی کرنا پڑتی ہے۔ اور جو شخص کسی بلند مقام تک پہنچنا چاہتا ہے وہ راتوں کو جاگتا ہے (اور محنت ومشقت کرتا ہے)۔''

وَمَنْ طَلَبَ الْعُلٰی مِنْ غَیْرِ کَدٍّ اَضَاعَ الْعُمْرَ فِیْ طَلَبِ الْمُحَالِیْ

''اور جو کوئی بلندی کا طلب گار بن جائے بغیر کوشش کے وہ اپنی عمر ضائع کر بیٹھتا ہے ایک محال چیز کی طلب میں۔''

اس حوالے سے پڑھے لکھے خواتین وحضرات کو خصوصی طور پر بہت سنجیدگی سے سوچنا ہوگا کہ اگر انہوں نے بہت سے دُنیوی علوم وفنون سیکھ رکھے ہیں تو آخر وہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے عربی زبان کیوں نہیں سیکھ سکتے؟ اور یہ کہ قیامت کے دن وہ اپنی اس کوتاہی کے جواز میں آخر کیا عذر پیش کریں گے؟

وَارْزُقْنِیْ تِلَاوَتَهٗ

''اور مجھے توفیق عطا فرما کہ میں اسے پڑھتا رہوں''

اٰنَآءَ الَّیْلِ وَاٰنَآءَ النَّهَارِ

''رات کے اوقات میں بھی اور دن کے اوقات میں بھی۔''

وَاجْعَلْهُ لِیْ حُجَّةً یَّارَبَّ الْعٰلَمِیْنَ!

''اور اے تمام جہانوں کے پروردگار! اس قرآن کو میرے حق میں دلیل اور گواہ بنا دے۔''

اس جملے کا مفہوم سمجھنے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مدِنظر رہنا چاہیے: ((اَلْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَکَ اَوْ عَلَیْکَ)) ''کہ یہ قرآن حُجت (دلیل یا گواہ) ہے تمہارے حق میں یا تمہارے خلاف!'' یعنی قرآن مجید قیامت کے دن ہر انسان کے حساب کے وقت گواہ بن کر کھڑا ہوگا۔ جس کسی نے حسبِ استطاعت اس کے حقوق (یعنی اس پر ایمان لانے' اس کو پڑھنے' سمجھنے' اس پر عمل کرنے اور اس کی ترویج وتبلیغ کے حوالے سے) ادا کیے ہوں گے تو قرآن مجید اُس کے حق میں گواہی دے گا اور اُس کے شافع کی حیثیت سے اس کے ساتھ کھڑا ہوگا۔ لیکن جس شخص نے قرآن مجید کے حقوق ادا کرنے سے بے اعتنائی برتی ہوگی قیامت کے دن وہ اُس کے خلاف گواہی دے گا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں اُس کے خلاف استغاثہ لے کر آئے گا کہ اے اللہ! یہ بدبخت مجھے تیرا کلام تو مانتا تھا مگر

اس کے باوجود اس نے مجھے پڑھنے یا سمجھنے یا میرے احکام پر عمل کرنے کی کبھی زحمت گوارا نہیں کی۔

یہ تو وہ دعا ہے جو قرآن مجید کے نسخوں کے اختتام پر عام طور پر لکھی ہوئی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ نبی مکرم ﷺ سے ایک اور دعا بھی منقول ہے' جسے مَیں نے تین مختلف روایتوں سے جمع کر کے لوگوں کی سہولت کے لیے ترجمے کے ساتھ شائع کروایا ہے۔ اس دعا میں عاجزی اور انکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ عَبْدُکَ، وَابْنُ عَبْدِکَ، وَابْنُ اَمَتِکَ ، فِیْ قَبْضَتِکَ، نَاصِیَتِیْ بِیَدِکَ ، مَاضٍ فِیَّ حُکْمُکَ، عَدْلٌ فِیَّ قَضَاءُکَ، اَسْئَلُکَ بِکُلِّ اسْمٍ ھُوَ لَکَ، سَمَّیْتَ بِہٖ نَفْسَکَ، اَوْ عَلَّمْتَہٗ اَحَدًا مِنْ خَلْقِکَ، اَوْ اَنْزَلْتَہٗ فِیْ کِتَابِکَ، اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِہٖ فِیْ مَکْنُوْنِ الْغَیْبِ عِنْدَکَ، اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ الْکَرِیْمَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ، وَنُوْرَ صَدْرِیْ، وَجِلَاءَ حُزْنِیْ، وَذَھَابَ ھَمِّیْ وَ غَمِّیْ۔ آمِیْنَ یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ!

اس دعا کو پڑھتے ہوئے مجھے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے وہ الفاظ یاد آ جاتے ہیں جو انہوں نے عبادت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہے ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ کے الفاظ میں عبادت ''غَایَۃَ الْحُبِّ مَعَ غَایَۃِ الذُّلِّ وَالْخُضُوْعِ'' کا نام ہے۔ یعنی عبادت یہ ہے کہ انسان خود کو حد درجے کی محبت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے بچھا دے۔ اس دعا کے ایک ایک جملے اور ایک ایک لفظ میں اللہ تعالیٰ کے لیے غایت درجے کی محبت' انکساری' عاجزی اور تذلّل کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ہر بندۂ مؤمن کو چاہیے کہ وہ اس دعا کو زبانی یاد کر لے اور حرزِ جاں بنا لے۔ آیئے اب اس دعا کا مفہوم اچھی طرح سمجھ لیجیے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ عَبْدُکَ ''اے اللہ! مَیں تیرا بندہ ہوں''

وَابْنُ عَبْدِکَ، وَابْنُ اَمَتِکَ ''تیرے ایک ناچیز غلام اور ادنیٰ کنیز کا بیٹا ہوں۔''

میرا باپ بھی تیرا اَدنیٰ غلام تھا اور میری والدہ بھی تیری ادنیٰ کنیز تھی۔

فِیْ قَبْضَتِکَ ''مَیں تیرے قبضہ قدرت میں ہوں۔''

نَاصِیَتِیْ بِیَدِکَ ''میری پیشانی تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔''

مَاضٍ فِیَّ حُکْمُکَ ''میرے پورے وجود میں تیرا ہی حکم جاری وساری ہے۔''

عَدْلٌ فِیَّ قَضَاءُکَ ''میرے بارے میں تیرا ہر فیصلہ عدل ہی پر مبنی ہے۔''

اَسْئَلُکَ بِکُلِّ اسْمٍ ھُوَ لَکَ، سَمَّیْتَ بِہٖ نَفْسَکَ

''مَیں تجھ سے سوال کرتا ہوں ہر اُس پاک نام کے واسطے سے' جس سے تُو نے اپنی ذاتِ مقدس کو موسوم فرمایا۔''

اس جملے میں گویا قرآن مجید کے اس حکم کی جھلک نظر آ رہی ہے: ﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪﴾ (الاعراف: ۱۸۰) کہ سب اچھے نام اللہ ہی کے ہیں' تم اس سے ان ناموں کے حوالے سے دعا کیا کرو۔

اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِیْ کِتَابِکَ

''یا جسے تُو نے اپنی کسی کتاب میں نازل کیا''

اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِنْ خَلْقِکَ

''یا تُو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا''

اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِهٖ فِیْ مَکْنُوْنِ الْغَیْبِ عِنْدَکَ

''یا اسے ابھی تُو نے اپنے پاس اپنے غیب کے خزانے میں محفوظ رکھا ہوا ہے۔''

اب دیکھیں حضور ﷺ نے اپنی عاجزی وانکساری اور اللہ تعالیٰ کے سارے ناموں کا حوالہ دے کر مانگا کیا ہے؟

اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ الْکَرِیْمَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ

''(اے اللہ!) اس قرآن کریم کو میرے دل کی بہار بنا دے''

وَنُوْرَ صَدْرِیْ

''اور اسے میرے سینے کا نور بنا دے''

وَجِلَاءَ حُزْنِیْ

''اور میرے رنج وحزن کا مداوا بنا دے''

وَذَهَابَ هَمِّیْ وَ غَمِّیْ

''اور میرے تفکرات اور غموں کے ازالے کا سبب بنا دے۔''

آمِیْنَ! ثُمَّ آمِیْن!!

نوٹ کیجیے! حضور ﷺ نے عبدیت، تواضع اور تذلل کی انتہا پر جا کر اللہ تعالیٰ سے سوال کیا ہے تو قرآن کریم کی محبت کا، قرآن مجید کی معیت کا اور قرآن حکیم کے سہارے کا۔ ظاہر ہے یہی تو کائنات کی سب سے قیمتی چیز اور سب سے بڑی دولت ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ۬ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾﴾ (یونس)

''اے لوگو! آ گئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے اور تمہارے سینوں (کے امراض) کی شفا اور اہل ایمان کے لیے ہدایت اور (بہت بڑی) رحمت۔ (اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ یہ (قرآن) اللہ تعالیٰ کے فضل اور اُس کی رحمت سے (نازل ہوا) ہے، تو چاہیے کہ لوگ اس پر خوشیاں منائیں! وہ کہیں بہتر ہے ان چیزوں سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔''

بارک اللہ لی ولکم فی القرآن العظیم ونفعنی وایّاکم بالآیات والذِّکر الحکیم ○○

(اختتامی نشست دورۂ ترجمہ قرآن، جامع مسجد قرآن اکیڈمی، ڈیفنس، کراچی،
۲۶ رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ/ ۲۶ جنوری ۱۹۹۸ء)

کلمۂ تشکّر

الحمد للہ، ثم الحمد للہ! بانی تنظیم اسلامی و مؤسس مرکزی انجمن خُدام القرآن لاہور ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن کی ترتیب و تسوید اور تدوین کا کام آج پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے ع ''شکر صد شکر کہ جمازہ بمنزل رسید!''

اس کٹھن کام، جسے خود ڈاکٹر صاحبؒ نے ''پہاڑ ایسا بھاری کام'' قرار دیا تھا، کا آغاز میں نے ۲۰۰۶ء میں ''تعارفِ قرآن'' کی ایڈیٹنگ سے کیا تھا، جبکہ ''بیان القرآن'' کا حصہ اوّل (مشتمل بر ''تعارفِ قرآن'' سورۃ الفاتحہ و سورۃ البقرۃ) ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد حصہ دوم کی ایڈیٹنگ کے دوران مجھے لیفٹیننٹ کرنل (ر) عاشق حسین صاحب (ایجوکیشن کور) کی رفاقت میسّر آ گئی، جس کی حیثیت بلاشبہ تائیدِ غیبی کی تھی۔ محترم کرنل صاحب نے خالصتاً رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر مسلسل چھ برس تک اس مشکل کام میں انتہائی دلچسپی، ذوق و شوق اور لگن سے حصہ لیا اور انشا پردازی کی کمالِ مہارت سے معاونت کا حق ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کی بھرپور جزائے خیر عطا فرمائے۔

''بیان القرآن'' کے قارئین اس امر سے واقف ہوں گے کہ دعوتِ قرآنی کی نشر و اشاعت کے ضمن میں یہ تحریری کاوش محض دروسِ قرآنی کو لفظ بلفظ صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے کتابی صورت میں پیش کر دینے پر منحصر نہیں ہے، بلکہ خطابی انداز کو تحریری اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش ہے، جس میں الفاظ اور جملوں کی تقدیم و تاخیر کے علاوہ کہیں حسبِ ضرورت اختصار سے کام لیا جاتا ہے تو کہیں بعض الفاظ یا جملوں کا اضافہ بھی ناگزیر ہوتا ہے۔ گویا ٹیپ سے اتارے گئے مسودہ کو از سرِ نو تحریر کے قالب میں ڈھالا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ احادیثِ نبویؐ کے صحتِ متن اور تخریج کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ ہم اس کاوش میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں، اس ضمن میں ہمیں قارئین کی آراء، تبصروں اور تجاویز کا انتظار رہے گا۔

''بیان القرآن'' کی تیاری کے ضمن میں شعبہ مطبوعات، قرآن اکیڈمی لاہور کی پوری ٹیم نے بقدرِ استطاعت محنت اور دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے۔ خصوصاً اس کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ، تصحیح اغلاط، تدوین و تزئین اور طباعت کے مراحل میں برادرم حافظ محبوب احمد خان، عزیزم عقیل عباس، عزیزم مرتضیٰ احمد، عزیزم حافظ محمد زاہد اور محترم شیخ رحیم الدین (انچارج پرنٹنگ) کی لگن اور سرگرمی لائقِ تحسین ہے۔ ''بیان القرآن'' کی طباعت کے محرک انجمن خدام القرآن پشاور کے صدر جناب ڈاکٹر اقبال صافی ہیں، جو اس کی تکمیل پر بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ''بیان القرآن'' کو اہلِ علم اور طالبانِ قرآن کے حلقوں میں خاصی پذیرائی حاصل ہو رہی ہے اور اس کا حصہ ہفتم پریس جانے سے قبل حصہ اول کے دس ایڈیشن اور حصہ دوم تا حصہ ششم کے بھی متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ! مکتبہ خُدام القرآن لاہور کے کارکنان جس مستعدی سے اس کی ترسیل و فروخت کی خدمات انجام دے رہے ہیں وہ بھی یقیناً لائقِ ستائش ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ دعوتِ قرآنی کی اس خدمت کو شرفِ قبول عطا فرما کر اسے داعی رجوع الی القرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے لیے صدقۂ جاریہ اور رفع درجات کا ذریعہ بنائے اور اس کی ترتیب وتدوین اور اشاعت وطباعت کی خدمات سرانجام دینے والوں کے لیے اسے سعادتِ دارین کا باعث بنائے۔ آمین یاربّ العالمین!!

۱۷ شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ/۵ جون ۲۰۱۵ء
بروز جمعۃ المبارک

حافظ خالد محمود خضر
مدیر شعبہ مطبوعات

پ ن: ''بیان القرآن'' کی سات حصّوں میں تکمیل کے چھ سال بعد اب اس کی نظرثانی شدہ طبع جدید چار مجلدات میں پیشِ خدمت ہے، جو متعدد ظاہری ومعنوی خوبیوں کی حامل ہے —— فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ!

۱۵ شعبان المعظم ۱۴۴۲ھ/۳۰ مارچ ۲۰۲۱ء



بتاریخ 22-03-2021

حوالہ نمبر _____

سرٹیفکیٹ تصحیح

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ بندہ قاری محمد اسلام خوشابی نے ادارہ "مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور" کی شائع کردہ تفسیر "بیان القرآن از ڈاکٹر اسرار احمد صاحب" کے عربی متن کو حرف بحرف بغور پڑھنے کے بعد اغلاط سے مبرا پایا ہے۔ بندہ تصدیق کرتا ہے کہ میرے علم کے مطابق اب اس کے عربی متن میں کوئی لفظی و اعرابی غلطی نہیں ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ!

M. Islam

قاری محمد اسلام
رجسٹریشن نمبر 042
ملازم محکمہ اوقاف حکومت پنجاب ملتان
0306-6628331

جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ
291 کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور
رجسٹرڈ پروف ریڈر محکمہ اوقاف حکومت پنجاب : 0306-6628331-0335-4274331


اللہ
بانی: ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مرکزی **انجمن خدام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان — اور — **سرچشمۂ یقین**

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک پیدا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دور ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ